پانچ کروڑ سے زیادہ نہیں۔ اس کے بعد اطالوی زبان کا نمبر آتا ہے۔ اور پھر باقی یورپی زبانیں کسی شمار و قطار میں نہیں آتیں۔ ایشیا میں بھی انگریزی کا کوئی رقیب نہیں ہے کیونکہ اگرچہ چینی زبان تیس کروڑ انسانوں کی زبان ہے لیکن چین کے مختلف علاقوں میں زبان کا اتنا اختلاف ہے کہ چینی کو ایک زبان نہیں بلکہ بہت سی زبانوں کے ایک گروہ پر مشتمل سمجھنا چاہیئے۔

چنانچہ انگریزی اس دوڑ میں سب پر سبقت لے گئی ہے۔ اور ابھی سرعت کے ساتھ دور دراز علاقوں میں پھیلتی جا رہی ہے۔ ایک وہ وقت تھا کہ فرانسیسی زبان تمام مسیحی ممالک کی ثانوی زبان تسلیم ہو گئی تھی جیسا اس سے قبل لاطینی تھی۔ اور اس وقت بھی اس زبان کو سیکھنے والوں کی تعداد ان لوگوں سے بہت زیادہ ہے۔ جن کے لئے یہ بمنزلہ مادری زبان کے ہے۔ لیکن بالشویک جو حقیقت پرست واقع ہوئے ہیں۔ اس کی بجائے انگریزی اور جرمن زبانوں کو مروج کر رہے ہیں۔ جرمنی سکنڈے نیویا اور جاپان کے سکولوں میں انگریزی کی تعلیم باقاعدہ دی جا رہی ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ خود فرانسیسی بھی اس سے بہرہ ور ہو رہے ہیں۔

صحیح طور پر اس بات کا اندازہ لگانا کہ انگریزی نے دنیا کی ثانوی زبان کی حیثیت سے کہاں تک ترقی کر لی ہے آسان نہیں ہے۔ لیکن چند حقائق اور اعداد و شمار اس پر کسی حد تک روشنی ضرور ڈال سکتے ہیں۔

بلجیم قونصل مقیم ٹوکیو مسٹر [illegible] کے خیال کے مطابق "جاپان میں انگریزی زبان کا علم یورپین کے لئے لابدی ہے۔ جاپان میں جاپانی زبان کے بغیر گذارہ ہو سکتا ہے لیکن اگر انگریزی زبان سے لاعلمی ہو تو انسان کے لئے کوئی ٹھکانا نہیں ہے۔ انگریزی جاپان کی تجارتی زبان ہے۔" چین میں سالہا سال سے اس کا سکہ رواں ہے اور ہندوستان میں اگرچہ بہت کم باشندے لکھ پڑھ سکتے ہیں۔ لیکن انگریزی نہ صرف ان کی کاروباری زبان ہے بلکہ سیاسیات کی زبان بھی یہی ہے۔

یہ بات بہت حد تک قرین قیاس ہے کہ دنیا کے طول و عرض میں قریباً بیس کروڑ آدمی انگریزی کو اپنی ثانوی زبان کی حیثیت سے بولتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ان میں سے اکثر صحیح طور پر بول نہیں سکتے لیکن اپنا مطلب ضرور واضح کر سکیں۔

اس کی ترویج کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ انگریز قوم کے افراد ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔ انگریز زمانۂ حال کے سب سے بڑے سیاح، جن جوکھوں میں ڈالنے والے سوداگر اور بے جفاکش آبادکار ہیں۔ اس کے علاوہ ان میں یہ کمزوری ہے کہ وہ دوسری زبانوں کے سیکھنے میں عموماً ... ہیں اور اپنی زبان کو ہر ملک میں تبانی کا واحد ذریعہ بناتے ہیں۔

لیکن ان کے علاوہ انگریزی کی مقبولیت کی کچھ اور وجوہات بھی ہیں اور وہ یہ کہ جب اس کا مقابلہ دوسری بلند پایہ زبانوں سے کیا جاتا ہے تو یہ صرف اپنی تعداد اور ناقابل مصالحت خصوصیات کی وجہ سے نہیں بلکہ جیسا کہ جیکب گرم نے آج سے ایک صدی قبل کہا "وسعت الفاظ و معانی اور اختصار کی خوبیوں کے بل پر جیت جاتی اور اس حیثیت سے دنیا کی کوئی زبان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔" پروفیسر ڈاکٹر جسپرسن ان الفاظ کا اضافہ کرتے ہیں کہ "انگریزی زبان بدرجۂ غایت مردانہ زبان معلوم ہوتی ہے۔ جوانمردوں کی ایسی زبان جس میں طفولیت یا نسوانیت کا شائبہ تک نہیں۔" اور اس کے بعد اس کی خصوصیات یوں بیان کرتے ہیں۔ "انگریزی سادہ اور آسان ہے۔ اس کی اصوات صاف ہیں۔ اس کے الفاظ اپنی اپنی جگہ گٹھے ہوئے ہیں۔ ان کی ترتیب منطقیانہ ہوتی ہے۔ اور تفاخرانہ ہزلیات سے منزہ۔ اس کی صرف یہی ایک سادگی کیا کم ہے کہ صیغہ ہائے تذکیر و تانیث کی ضرورت نہیں پڑتی اور پھر مخاطب کے لئے صرف ایک ضمیر یعنی You اختصار۔

جب معلمین انگریزی کی خوبیوں پر وعظ کہتے ہیں تو ہمیشہ اس کی لغت کی وسعت سے ابتدا کرتے ہیں جو دوسری تمام زبانوں کے مقابلے میں کم از کم دگنی ہے۔ لیکن غیروں کے دلوں کو مسخر کرنے والی یہ چیز نہیں ہے۔ بلکہ اس کے برخلاف لغت کی وسعت انہیں ڈرا دیتی ہے اور اس طرح وہ حتی القدور مبادیات کے نزدیک ہی رہتے ہیں۔ اور مبادیات کی سادگی اور اختصار ہی وہ شے ہے جو ان کے دلوں کو مسخر کر لیتی ہے۔

انگریزی نے لاطینی کی لمبی اور طویل ترکیبوں کو اس اختصار کے ساتھ اپنایا ہے کہ اب اُن کی وضع و قطع سے اُن کی لاطینی اصل ظاہر نہیں ہوتی بلکہ وہ خود انگریزی کے چھوٹے چھوٹے الفاظ بن کر رہ گئی

ہیں اور چند سہ حرفی اور چار حرفی الفاظ انگریزی میں موجود ہیں۔ یورپ کی کسی دوسری زبان میں موجود نہیں ہیں انگریزی کا کوئی چھوٹا سا فقرہ لیجئے اور پھر اُس کے تراجم دوسری زبانوں میں دیکھئے۔ جس سادگی، اختصار کو آپ انگریزی میں پائیے اس کی مثال کسی دوسری زبان میں نظر نہ آئے گی۔

کچھ عرصہ ہوا امریکہ کے ایک محقق لسانیات ڈاکٹر والٹر کرونل نے اس بات کا حساب لگایا کہ مرقس کی انجیل کے چالیس مختلف زبانوں کے تراجم میں سے ہر ایک میں کتنے کتنے اجزائے لفظی استعمال ہوئے ہیں عربی، فارسی، ہندوستانی، انگریزی اور فرانسیسی ترجمے بھی شامل تھے۔ اس امتحان میں بھی انگریزی زبان اول نمبر پر رہی کیونکہ اس میں ۲۹۰ اجزائے لفظی استعمال ہوئے تھے۔ طیطوانی زبانوں میں ۳۲۶۰، سلافی زبانوں میں ۳۵۰۰، لاطینی گروہ میں ۳۲۰۰، ایرانی گروہ میں جس میں بنگالی، فارسی، سنسکرت وغیرہ شامل ہیں ۴۱ اوسط رہی۔

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ فرانسیسی بڑی لطیف اور میٹھی زبان ہے۔ اطالوی یا ہسپینی زبانوں کے مقابلے میں واقعی اسے لطیف نہ کہا جا سکتا ہے لیکن جب اس کا مقابلہ انگریزی سے کیا جائے تو اسے مجبوراً کرخت کہنا پڑے گا۔ کیونکہ جس کام میں فرانسیسی کو چھتیس ہزار اجزائے لفظی استعمال کرنے پڑے اسے انگریزی نے صرف اٹھائیس ہزار میں نباہ دیا۔

عام تعلیم یافتہ غیر ملکی اسے اتنا آسان سمجھتے ہیں کہ اسے بچوں کے نرم و نازک الفاظ سے تشبیہ دیتے ہیں۔ یہ صحیح ہے۔ کہ جب وہ اُسے بولنے کے بعد اس کے لکھنے اور پڑھنے کی طرف آتے ہیں تو اُن کا خیال بدل جاتا ہے۔ کیونکہ انگریزی کے بعض ہجے خلاف عقل و قیاس ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن جہاں تک اس کے بولنے اور سمجھنے کا تعلق ہے لوگ اس کے استعمال سے مطمئن ہیں۔

دُنیا کا سرد ترین شہر

سائنس کی جدید ترین تحقیقات نے دنیا کے سرد ترین شہر کا کھوج نکال لیا ہے۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے مشرقی سائبیریا کے ایک شہر ورخویانسک کو سرد ترین مقام سمجھا جاتا تھا جہاں تھرمامیٹر میں پارہ جم کر رہ جاتا ہے۔ لیکن حال کی تحقیقات سے واضح ہوا ہے کہ دنیا کا سرد ترین شہر آئی میکون ہے جو اول الذکر شہر سے کئی سو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔

اس جگہ کا درجہ حرارت منفی ۱۰۲ فارن ہائیٹ سے بھی کم ہے اور سردی اس قدر زیادہ ہے کہ اگر بالٹی میں سے پانی گرایا جائے تو وہ عام قاعدے کے مطابق زمین پر بہتا نہیں بلکہ گرنے کے دوران میں یخ بستہ ہو جاتا ہے اور زمین کے ساتھ ٹکرا کر ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر جاتا ہے۔

باوجود اس قدر سردی کے وہاں کے لوگ موسم سرما میں بھی کوئی خاص تکلیف محسوس نہیں کرتے کیونکہ ہوا کی غیر معمولی خشکی اور فضائی سکون حالات کو قابل برداشت بنا دیتے ہیں۔ چنانچہ انہیں وجوہ کی بنا پر آئی میکون کے باشندے بغیر کسی خاص احتیاط کے سائبیریا کے عام لباس پہنے ہوئے اپنے کاروبار میں مصروف نظر آتے ہیں۔

یہ لوگ بہت کم سفر کرتے ہیں اس لئے دوسرے لوگوں کے ساتھ اپنی زبوں حالی کا مقابلہ کرنے کا انہیں موقع نہیں ملتا۔ ایک یا دو سال کا عرصہ ہوا کہ اس علاقے کے چند آدمی سرکاری کام کے ضمن میں ماسکو بلائے گئے تھے جو اگرچہ اُن کے شہر کے مقابلے میں بہت گرم ہے لیکن اس کے ساتھ ہی مرطوب بھی ہے۔ نو وارد سردی کی شدت سے چلّا اُٹھے۔ اور کئی زکام میں مبتلا ہو کر بیمار پڑ گئے۔

مشہور لوگوں کے کمالات

حال ہی میں یہ خبر سنی گئی تھی کہ برلن میں ایک صاحب ڈاکٹر پال سمتھ بے مثال حافظہ کا نمونہ ہیں کیونکہ وہ ایک سُنی تقریر یا کسی ملاقات کی گفتگو اس کے وقوع کے کئی گھنٹے بعد لفظ بلفظ سنا دیتے ہیں۔ اُن کی اس قابلیت نے قدرتی طور پر ہر طبقے سے خراج تحسین وصول کیا ہے۔

کہتے ہیں کہ اکتساب کمال میں اہلیت اور امامت کا طغرائے امتیاز ہے۔ ہمارے ہاں ہندوستانیوں کی ایسی کئی مثالیں

مثالیں ہیں۔جو اس امتحان میں پوری اُترتی ہیں۔

سر فیروز سیٹھنا اپنے غیر معمولی حافظے کی وجہ سے بجا طور پر مشہور تھے۔ کیونکہ آپ کسی جلسے کی تقریر پہلے تو لکھا دیتے تھے اور پھر اُس کے کئی گھنٹے بعد اور بعض اوقات کئی دن بعد وہی تقریر لفظ بہ لفظ جلسے میں کر دیتے تھے۔

سر سریندر ناتھ بنیرجی کا حافظہ بھی نہایت حیرت انگیز تھا۔ کہتے ہیں۔ کہ احمد نگر کانگریس کا صدارتی خطبہ آپ نے جلسے کے انعقاد سے دو ماہ قبل طباعت کی غرض سے مجلس استقبالیہ کو بھیج دیا تھا۔ صاحب موصوف کو اُس کا طبع شدہ نسخہ اُس وقت ملا جب وہ دیگر حاضرین جلسہ کو تقسیم کیا گیا۔ لیکن سامعین کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اُنہوں نے دیکھا کہ سر سریندر ناتھ نہ صرف لفظ بلفظ کی مطابقت کے ساتھ بلکہ ایک ایک کومے کے وقفے کی صحت کے ساتھ اپنا خطبہ حافظے کے بل پر سُنا رہے ہیں۔

مولانا محمد علی مرحوم کو نہ صرف برسوں کی پڑھی ہُوئی کتابوں کی سطروں کی سطریں اور ابواب ازبر تھے بلکہ آپ اُن مضامین کے صفحوں کے نمبر بھی بتا دیا کرتے تھے۔

اس ضمن میں مسٹر سچدانند کا نام بھی خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ جن کی لائبریری بہ کمال حفاظت اُن کے دماغ میں محفوظ ہے۔

میں نے سُنا ہے کہ گوپال کرشن گوکھلے آنجہانی اعداد و شمار کے بڑے شیدائی تھے۔ اگر ایک مرتبہ آپ اعداد و شمار کی تفصیلات کو دیکھ لیتے تھے تو پھر اُن کے ذہن سے اُترنے کا کوئی امکان نہ رہتا تھا اگرچہ آپ بطور احتیاط انہیں اپنی پاکٹ بک میں بھی لکھ لیتے تھے۔ لیکن ان تحریروں سے یادداشت کا مقابلہ کرنے کی نوبت کبھی نہ آتی تھی۔ لارڈ منٹو اس امر کی تصدیق کرتے ہیں کہ گوکھلے کے حافظے نے کسی ایک موقعہ پر بھی اُن کو دھوکا نہیں دیا حالانکہ ان کے ماتحت ضخیم رجسٹروں اور بڑی بڑی مسلوں کو لئے ہر ایسے موقع کی تلاش میں رہتے تھے۔

چھوٹی چھوٹی تفصیلات کے یاد رکھنے میں ڈاکٹر بدھان چندر رائے کی یادداشت بے مثال ہے آپ کسی واقعے کی تفصیلات جو برسوں پہلے وجود پذیر ہوا ہو ایسی صحت کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ مثلاً آپ کو یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ اُس وقت ہوا کس سمت کو چل رہی تھی۔ اس وقت آپ کیسا لباس پہنے ہوئے تھے۔ اور کس طرح ہوا کے ایک جھونکے نے آپ کا ایک کاغذ اُڑا کر آپ کا مزاج برہم کر دیا تھا۔ اور اس طرح کی بے شمار تفصیلات۔ ڈاکٹر رائے اُن گنتی کے چند اطبا میں سے ہیں جنہیں اپنی ڈائری دیکھے بغیر برسوں کے دیکھے ہوئے مریض کے حالات کمال صحت کے ساتھ یاد آ جاتے ہیں۔

ریاست میسور کے دیوان سر مرزا اسمٰعیل تفصیلات کے یاد رکھنے میں امتیازی درجہ رکھتے ہیں۔ اگر ایک مرتبہ آپ کسی ایسے محکمے کی مسل ملاحظہ کر لیں جس کے حالات کے متعلق آپ قطعاً کچھ نہ جانتے ہوں۔ تو جب کبھی وہ اس محکمے کا جائزہ لینے جائینگے۔ اُن تمام تفصیلات کو زیر بحث لے آئیں گے۔

میں ایک ایسے اخباری نمائندے کو جانتا ہوں جو اگرچہ مختصر نویسی کے علم سے بے بہرہ تھا لیکن مسز اینی بیسنٹ کی تقریر سن کر وہ حرف بحرف اپنے دفتر میں آ کر بیان کر دیا کرتا تھا۔ یہ عجیب بات ہے کہ مسز بیسنٹ کے علاوہ کسی اور مقرر کی تقریر اُسے یوں یاد نہ رہتی تھی۔

لیکن صرف حافظے کی تیزی ہی اعلیٰ کارگزاری کا معیار نہیں۔ مہاتما گاندھی کو دنیا صرف ایک مہاتما یا سیاست دان کی حیثیت سے جانتی ہے۔ لیکن اس بات کا کتنے لوگوں کو علم ہے کہ وہ اعلیٰ کارگذاری کا ایک زندہ نمونہ ہیں۔ آپ کے بعض کام تو نہایت ہی حیرت انگیز ہیں سوائے مسز اینی بیسنٹ کے گاڑی میں بیٹھ کر بلا تکلف لکھتے رہنے کی واحد مثال صرف آپ ہی کی ذات ہے۔

گاندھی جی میں کچھ ایسی صفات بھی ہیں جن کا امکان دوسرے لوگوں میں نہیں۔ آپ چلتی ہوئی گاڑی میں بیٹھ کر بائیں ہاتھ سے حجامت بناتے ہیں۔ دائیں ہاتھ سے اپنے اخبار کے لئے مضمون لکھتے جاتے ہیں۔ اپنے کسی ہم سفر سے ہنسی مذاق بھی کرتے جاتے ہیں۔ کسی ایسی گتھی کو بھی سلجھاتے جاتے ہیں۔ جس کا حل چند ہی گھنٹوں کے بعد انہیں اپنے سفر کے اختتام پر پیش کرنا ہوتا ہے۔ کسی اخباری نمائندے سے گفتگو بھی کر رہے ہوتے ہیں اور اسی دوران میں اپنے کسی ساتھی کے ساتھ سیاسیات پر تبادلہ خیالات بھی کرتے جاتے ہیں۔ ان میں سے ہر بات اپنی اپنی جگہ مکمل ہوتی ہے یہاں تک کہ ان میں سے کسی ایک کو بھی کم توجہی کی شکایت پیدا نہیں ہوتی۔

سر سی پی راما سوامی آئر بھی اپنے طرز کار میں سب سے نرالے ہیں۔ آپ کو صبح کے وقت گھوڑے کی سواری کرنے کا شوق ہے۔ اور اس سے ورزش بھی مقصود ہے۔ سواری کے دوران میں ایک یا دو گھنٹے کے اندر اندر آپ کئی کتابیں اور اخبار پڑھ ڈالتے ہیں۔ لیکن ان کی سواری یا پڑھائی کا مقصد فوت نہیں ہوتا اور نہ دونوں کام ایک دوسرے میں حارج ہوتے ہیں۔

سیلز مین شپ ایک ایسا پیشہ ہے جس میں کوئی امتیازی درجہ مقرر کرنا نہایت مشکل ہے۔ اور پھر اس کے لئے یہ بھی ضروری ہے۔ کہ قوانین اخلاق کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پائے۔ اخبار کے لئے اشتہار حاصل کرنے میں ہمارے ملک میں فیروز لالی کا ہمسر مشکل ہی سے کوئی نظر آئے گا۔ بی۔ پی وادیا ایک کتب خانے کے منیجر کی حیثیت سے آپ کو اتنی کتابیں خریدنے اور پھر اُن کی قیمت ادا کرنے پر مجبور کر دینگے کہ آپ اس بات کا فیصلہ بھی نہ کر سکیں گے کہ ان کتابوں کو کیا کیا جائے

لیکن لارڈ نارتھ کلف کا مندرجہ ذیل واقعہ سیلز مین شپ کے میدان میں ایک ایسا اچھوتا واقعہ ہے کہ اس کی مثال ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ آپ کے ایک ادارے نے ایک سستی سی کتاب "جرمن خطرہ" کے نام سے شائع کی۔ ادارے کے بہترین ایجنٹ باوجود ہزار کوشش کے اس کتاب کی فروخت میں ناکام رہے۔ آخر کار ہارمز ورتھ نے جو ابھی لارڈ نارتھ کلف نہ بنے تھے، اس معاملے کو اپنے ہاتھ میں لیا۔ آپ نے ایک سیکرٹری کو بلا کر مندرجہ ذیل مضمون اپنے ایک اخبار میں شائع کرنے کے لئے لکھایا۔ مضمون کی سرخی تھی ——— "وہ کتاب جو فروخت نہیں ہوتی ——— کیوں؟"

"یہ کتاب ایک ایسے ادارے نے شائع کی ہے۔ جسے اپنے حسن انتخاب اور پبلک کے مذاق کے جاننے پر ناز ہے ——— ایک بہترین کتاب جو اپنے مصنف کا شاہکار ہے اور جس نے نفس مضمون کے مطالعہ کو اپنا مقصد زندگی بنا رکھا ہے دلچسپ اور دلپذیر طرز تحریر کا نمونہ۔ اس کے باوجود یہ کتاب بکتی نہیں کتاب کا موضوع ہر برطانوی باشندے سے عملی دلچسپی کا طلبگار ہے۔ ہر برطانوی کی بیوی سے، ہر برطانوی بچے سے۔ کیونکہ انہیں معلوم کرنا ہے کہ کیا اُن کا ملک ایک سال دو سال کے اندر اُن کے ہاتھوں سے یوں ہی نکل جائے گا۔ جس طرح کارتھیج اور روم نکل گئے تھے ——— لیکن اس کے باوجود یہ نہیں بکتی۔ کتاب ایسی دلچسپ جیسے کوئی ناول۔ لیکن اس کے باوجود یہ نہیں بکتی۔ ہر معقول انسان ماری کوریلی سے لے کر وزیر اعظم تک اُسے پڑھ چکا ہے اور اس کی زبان پر اُسی کا چرچا ہے ——— لیکن اُس کے باوجود عام پبلک اسے نہیں خریدے گی لیکن کیوں؟ بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی ست؟ ——— شاید اخبار کے قارئین میں سے کوئی صاحب وہ بات بتا سکیں جس کے سوچنے سے بڑے بڑے جگادھری عاجز آگئے ہیں۔ اخبار کے کوپن کے ساتھ بہترین توجیہہ بھیجنے والے کو ایک سو پونڈ انعام دیا جائے گا۔ مدیر اخبار کا فیصلہ قطعی ہوگا۔ جوابات آئندہ سوموار کو ڈیڑھ بجے دوپہر سے قبل پہنچ جانے چاہئیں۔"

آئندہ سوموار سے بہت پہلے کتاب کے تمام نسخے فروخت ہو چکے تھے۔

مظفر احمد

ا؎ ایف ایم ساتی؟

جمہوریت کا نازک دور!

چند موجودہ حکومتوں کے بنیادی اصولوں کو زیر بحث لانے کا مقصد یہ ہے کہ اس وقت اور آنے والے وقت میں ہم اس قابل ہو جائیں کہ ہندوستانی حکومت کی تشکیل میں ان اصولوں میں سے اکثر کو کام میں لا سکیں۔ اور ہمیں اُمید ہے اور اعتماد بھی کہ ہم جلد ہی اس مرحلے پر پہنچ جائیں گے۔

"کسی حکومت کی قوت کے کیا معنی ہیں؟ ——— کسی حکومت کے شہریوں ——— عورتوں اور مردوں کی انفرادی قوت کی اجتماعی صورت کا ہی دوسرا نام حکومت کی قوت ہے۔ اور جب یہ منتشر افراد فیصلہ کر لیں کہ وہ اپنے دماغوں اور جسموں کو کبھی غیر کے ماتحت نہیں رہنے دیں گے۔ اور اُنہیں اس بات کا شعور ہو جائے کہ اُنہیں کی اجتماعی حالت کا نام حکومت ہے اور وہی حکومت کی قوت ہیں۔ تو زبان خلق ہی نقارہ خدا بن جاتی ہے۔ اور نئی حکومت کی یہی بنیاد مسلم ہو جاتی ہے۔ یوں گویا حکومت عوام کی تخلیق کی ہوئی ایک چیز ہو گئی۔ یوں حکومت اُن عوام کی تخلیق ہو گئی۔ جنہوں نے اُسے بنایا جن پر اس کا انحصار ہے اور آسمان یا زمین کی کسی بیرونی طاقت سے

اس تخلیق کا کوئی تعلق نہ رہا۔

اس وقت کی بحث کے مقاصد کے لئے ہم نے جدید حکومتوں کے تین تصورات کا انتخاب کیا ہے۔ پہلا تصور قومیت یا قوم پرستی کا ہے ۔ دوسرا تصور جمہوریت یا آزادانہ جمہوری رجحانات کا ہے۔ اور تیسرا مذہبی حکومت کا تصور۔ اگر گذشتہ دو سو سال کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے مختصراً جدید حکومت کے بنیادی اصولوں کو ان ہی تین صورتوں میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ زمانے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ ان کی تعمیل کا درجہ مختلف ہو تو ہو۔ عورتیں اور مرد شہریوں کی حیثیت سے اب نجات کا رستہ دیکھ رہے ہیں۔ خواہ وہ ان تصورات ثلاثہ کے سیل میں ہی کیوں نہ بہہ جائیں۔ پہلا بنیادی تصور قومیت کا تھا۔ دوسرا جمہوریت کا اور تیسرا مذہبیت کا۔ اور ایک لحاظ سے یہ تیسرا تصور پہلے دو تصورات سے اہم تر ہے۔

آئندہ حکومت کا جدید حکومتوں کے تصورات کے ساتھ کہاں تک تعلق ہوسکتا ہے اور آئندہ حکومت کو کس حد تک قومیت کا قائل ہونا چاہیئے؟ آئندہ حکومت صوبجاتی یا نسلی نہیں ہوسکتی۔ یہ بات ہم ایک مثال سے واضح کرتے ہیں۔ جس طرح مذہبی حکومت کی مثال کے طور پر جاپان کو لیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح اس وقت ہم ریاستہائے متحدہ امریکہ کی مثال لیتے ہیں۔ امریکہ کی متحدہ ریاستیں اپنی موجودہ صورت میں ایک ایسی حکومت ہیں جسے قائم ہوئے قریباً ڈیڑھ سو سال ہوئے ہیں۔ نیز یہ حکومت امریکہ کی جنگ آزادی کا نتیجہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ امریکہ کی مثال سے بہت لوگ رشک کھاتے ہیں۔ اور یہ ایک قدرتی بات ہے کیونکہ امریکہ کی متحدہ ریاستی حکومت ہمیں بہت سے اچھے سبق سکھاتی ہے۔ یہ بات تو آپ کے خیال میں ہوگی کہ اس حکومت کی تخلیق سے اب تک کی زندگی ابھی باقی دنیا کی یاد میں تازہ ہے یعنی داستان کہن نہیں بن گئی۔ کم از کم تاریخ نے اس زندگی کی یاد کو تازہ رکھا ہوا ہے۔ نیز اس وقت اس ایک حکومت میں بے حد مختلف قوموں کا اجتماع ہے۔ چینی، جاپانی، جرمن، اطالوی، فرانسیسی، انگریز اور کئی اور قومیں اس میں آباد ہیں۔ اس لئے بہترین جدید جمہوری حکومت کی مثال پیش کرتے ہوئے سب سے پہلا نام امریکہ کا آتا ہے فرض کیجئے کہ اس وقت امریکہ میں نسلی سوال پیدا ہوجائے۔ تو آپ خیال کرسکتے ہیں کہ امریکہ کی صورت حال کیا ہو؟ اگر ریاستہائے متحدہ کا کوئی اطالوی باشندہ یہ کہے کہ اس کا تعلق تو اٹلی ہی سے ہے، امریکہ سے نہیں اور اگر اس وقت امریکہ کے تمام شہری قومیت کے بجائے نسل پرستی کو حکومت کا سچا بنیادی اصول ماننے لگ جائیں تو ہم بہت جلد ریاستہائے متحدہ کا خاتمہ دیکھ لیں گے آپ میں سے بہتوں نے جرمنی کے نازی اقتدار کے بعد امریکہ کی متحدہ ریاستوں میں فتنہ انگیزی کی کوششوں پر غور کیا ہوگا۔ اور ہمیں مسرت ہے کہ جرمنی اب اس بات کو محسوس کرچکا ہے کہ اس کی ایسی حرکتیں مضر قومیت اور خودکشی کے مترادف ہونگی۔ خواہ آپ کی اصل جرمنی سے ہو یا اٹلی، فرانس اور آئرلینڈ سے، آپ جس زمین پر آکر زندگی گزارتے ہیں اور موت سے اس زندگی کی تکمیل کرتے ہیں، آپ کی ہستی اسی سرزمین کا ایک حصہ بن جاتی ہے اور قومی حکومت کی بنیاد اسی خیال پر ہونی چاہیئے۔ قومی حکومت کا بنیادی تصور یہی ہے ۔ یہ اور بات ہے کہ ہم اس وقت آئندہ حکومت کے ماخذ کے متعلق مصروف بحث ہیں۔ اس امر کے باوجود یہ کہا جاسکتا ہے کہ ابھی بہت عرصے تک یہی بنیادی تصور قائم رہے گا۔ حکومت قومی حکومت ہی رہے گی اور مختلف قوموں اور نسلوں کو اپنے میں جذب کرتی رہے گی۔ کیونکہ جو کچھ بھی ہو ہماری اصل تو ایک ہے یعنی ہم سب کے آباؤ اجداد ایک تھے لیکن جہاں تک ہمارا تعلق ہے اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہم بھی اس پرانے ملک میں باہر سے آئے ہوئے لوگ ہیں اگرچہ ہمیں آئے اب ایک عرصہ ہو چکا ہے اس لئے ہماری حکومت کی رہنمائی کے لئے قومیت سے زیادہ مناسب بنیادی اصول اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ اس کے بغیر ایک بدنظمی کا خدشہ ہے۔ باہمی دشمنی، حسد اور تشکیک کا خدشہ ہے اور ایسی فضا میں حب الوطنی کو ہرگز فروغ نہیں ہوسکتا۔ لیکن یہ حب الوطنی کیا شے ہے؟ اس کے معنی جاننے کے لئے آپ کسی بھی زبان کی طرف رجوع کریں بات وہی رہے گی۔ یعنی انسان کا اسی سرزمین سے تعلق جس پر وہ رہتا ہے۔ کیا حب الوطنی کے اس خواب کی تعبیر ہندوستان میں بھی پوری اترے گی اس کا جواب آئندہ زمانہ ہی دے سکتا ہے لیکن آج باقی دنیا کا کیا حال ہے آج کوئی انگریز، فرانسیسی، جرمن، اطالوی ——— ہندوستان کے علاوہ کسی بھی ملک کا رہنے والا ——— اپنے ملک کی نسبت سے پکارا جانا فخر کی بات سمجھتا ہے۔ تمام دنیا کے جغرافئے پر نظر ڈال جائیے

کسی چھوٹے سے چھوٹے ملک کا رہنے والا بھی اپنے آپ کو اپنے ملک کی نسبت کے علاوہ کسی اور نسبت سے پکارے جانے کی اجازت نہیں دیتا۔ ایک طرف افغانستان سے شروع کر کے دوسری طرف چین اور جاپان تک چلے جائیے اور پھر وہاں سے باقی دنیا میں پھر آئیے۔ سب جگہوں پر یہی کیفیت ہے۔ یہ معاملہ آپ کے گہرے غور و فکر کا تقاضا کر رہا ہے اور اب بھی وقت ہے کہ آپ یہ بات سمجھیں کہ قومیت کے بنیادی اصول پر ہی حب الوطنی کی تعمیر ہو سکتی ہے۔ اسی اصول پر حب الوطنی کی تعمیر ہو سکتی ہے۔ کہ آپ کا تعلق اُس سرزمین سے ہو جس پر آپ پیدا ہوئے۔ جس پر آپ زندگی بسر کر رہے ہیں اور جو مرنے کے بعد بھی آپ کو قبول کرے گی صرف یہی ایک راستہ ہے اگر آپ آزادی حاصل کرنا اور اُس کے بعد آزاد رہنا چاہتے ہیں۔ تو آپ کی آئندہ حکومت کی بنیاد صرف حقیقی قومیت پر ہی ہو سکتی ہے۔ اور اُس قومیت کی بنیاد مذہبی حکومت کے طور پر ہو گی۔ اور یہی بات ہمیں جمہوریت کے بڑے اور آخری اصول کی طرف لاتی ہے۔

"یورپ میں آج جو کچھ بھی ہو رہا ہے۔ اس کے باوجود ذہن انسانی ہر وقت ایک ہی نصب العین کی طرف راغب ہے اور وہ نصب العین جمہوریت ہے ہم یہ نہیں کہتے کہ دنیا میں اس وقت ایک مستحکم اور مدلل جمہوریت موجود ہے۔ بلکہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ جن ملکوں میں جدید مفہوم کے مطابق انفرادی آزادی موجود نہیں وہ ملک یکسر جمہوری ہیں ہی نہیں۔ مثال کے طور پر جرمنی کو لیجئے۔ ہم یہ بات ماننے کو تیار نہیں کہ جرمنوں نے اپنی ہستی اور اپنی قوت فیصلہ کو اس قدر بے بس کر دیا ہے۔ اور ہم لوگوں کے لئے جو ابھی غلام ہیں۔ یہ کہنا معمولی بات نہیں کہ فلاں قوم نے اپنی آزادی کھو دی ہے۔

ہمیں کوشش سے سمجھنا چاہیئے کہ آج جرمنی میں کیا کچھ ظہور میں آ رہا ہے۔ یہ جو لوگ کہتے ہیں کہ جرمنی میں ذاتی آزادی مفقود ہے اس کے معنی کیا ہیں؟ جرمنی میں صورتِ حال کس ڈھب پر ہے؟ وہ کیا بات ہے جس نے ۱۹۱۹ء میں ایک مغرور اور شکست خوردہ قوم کو جس کی تمام طاقت اور قوت ضائع ہو گئی از سرِ نو دنیا کی آزاد قوموں کے برابر لا کھڑا کیا ہے؟ ممکن ہے کہ جرمنی نے غلط بنیادوں پر اپنی نئی عمارت کی تعمیر کی ہو۔ کیونکہ یہودیوں پر مظالم کے لحاظ سے میں سمجھتا ہوں کہ اُنہوں نے خام بنیاد عمل رکھی ہے اور ایک حکومت کے لئے یہ مناسب نہیں ہے لیکن اس بات کو ابھی الگ رہنے دیجئے۔ قومی آزادی کے لئے انفرادی آزادی کا ایثار بھی ایک شے ہے۔ اور جرمنی کے حالات کو ہم اس نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ فرد کو وہاں کم آزادی حاصل ہے۔ اُسے پیدائش سے موت تک ایک سخت نظام کے ماتحت رہنا پڑتا ہے۔ ہمیں اس کا پورا احساس ہے اور ہم ان قوانین کے نفاذ کے طریق و انداز کو اچھی طرح سمجھتے ہیں لیکن ہم اس کے ماخذ اور اس کے انجام کو بھی سمجھتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے دیکھتے دیکھتے ہی وہ وقت آ جائے گا کہ جرمنی کے باشندے جان لیں گے کہ نازیت اور ہٹلر کے احکام نے اپنا کام کر لیا اور اب اُن کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور یہ باتیں گئی گذری باتیں ہو کر رہ جائیں گی اور جرمنی کی آئندہ جمہوریت اُن مردوں اور عورتوں پر مشتمل ہو گی جنہیں اگرچہ تنظیم کے کولھو میں پیسا گیا ہے لیکن وہ سیرت جسم، ذہنی اور روحانی لحاظ سے بہتر ہوں گے۔ ہمارے دلوں میں ہٹلر کے لئے ایک جذبۂ ستائش ہے۔ آزادی کو حاصل کرنا اور پھر اُس سے اپنے من مانے طریقوں سے کام لینا ہمارے اپنے بس کی بات ہے۔ اگر آج ضرورت کا تقاضا یہی ہو کہ ہمیں اپنی انفرادی آزادی سے دست بردار ہونا پڑے تاکہ وہی آزادی ہمارے ملک کو حاصل ہو جائے تو ہم سمجھتے ہیں کہ ہماری یہ انفرادی قربانی لاحاصل کبھی نہیں ہو سکتی۔ یہ نہایت معمولی بات ہے اور ایسی قربانی باعثِ فخر ہے۔ لیکن یہ بات وہیں کی وہیں رہتی ہے کہ انسان کو اپنے چلن سے اپنی ذاتی آزادی کی بھینٹ دینے کے لئے تیار رہنا چاہیئے۔ کیونکہ اُس کے ملک کی آزادی ہی اُس کا اصل نصب العین ہے اور اسی نصب العین کے لئے وہ زندہ ہے آزادی کے حصول کا تجزیہ کرنے سے یہ بات نہایت آسانی سے واضح ہو جاتی ہے۔

جرمنی میں زندگی کی ضروریات کے لحاظ سے بڑوں اور چھوٹوں سب کی ضروریات کو یکساں نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ امیر اور غریب سب کے لئے ہر چیز برابر ہے۔ مکمل مساوات کا دَور ہے۔

کہا جاتا ہے کہ انگلستان کے تمام باشندے جمہوریت کے حامی ہیں اور اپنے کو باقی دنیا سے علیحدہ سمجھتے ہیں۔ انگریزوں کی اس جمہوریت کا ہم نے غور سے مطالعہ کیا ہے۔ انگلستان کے لحاظ سے یہ صحیح ہو تو ہو لیکن ہماری جمہوریت کے متعلق کیا کہا جا سکتا ہے؟ اگر آج انگریز جمہوریت کا حامی ہے۔ تو ہندوستان میں اپنی حکومت کے جواز کے لئے کیا دلیل پیش کر سکتا ہے؟ ان باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ وہ لوگ جو جمہوریت کے حامی ہیں اور وہ لوگ جو خود اپنی جمہوریت کو قربان کر دیتے ہیں۔ سب ایک جیسے ہیں۔ مستقبل کی حکومت کی پختہ بنیاد جمہوری اصول کی پہچان ہوگی اور خدا اور حکومت دونوں کی نظروں میں انسانی مساوات کی پہچان ہوگی۔

اس دوران میں جب آپ اپنے وطن کی تعمیر میں حصہ لے رہے ہوں تو آپ کو یہ بات پیش نظر رکھنا ازبس ضروری ہے کہ آپ کی آئندہ حکومت کی بنیاد قومیت ہوگی۔ ایک قسم کی مذہبی حکومت، ایک ایسی حکومت جس کی بنا، آزاد ترین جمہوریت ہوگی۔ ہم اس عظیم ملک کے باشندے ہیں۔ ہمارے اعتقادات خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں۔ ہماری زبان خواہ کوئی ہو۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم اپنی زندگی اور اپنے افعال کو اس ڈھب پر منظم رکھیں کہ ان سے ایک ایسا احساس پیدا ہو جائے کہ ہم سب ایک ہی قوم اور ایک ہی عظیم فرقہ ہیں۔ حکومت کی نوعیت خواہ کچھ ہو۔ ہمارے لئے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے لیکن اس کا ہمیں پختہ یقین ہے کہ حکومت کا نصب العین یہی ہوگا کہ قوم کی حکومت قوم کے لئے ہو اور قوم کے ذریعے سے کی جائے۔ یہی ہماری حکومت کا مذہب ہوگا۔

(بھولا بھائی ڈیسائی)

تجدید پیماں

پھر حسنِ معذرت پہ یقیں لا رہا ہوں آج
پھر چشمِ شرمسار سے شرما رہا ہوں آج

پھر کر رہا ہوں عہدِ محبت پہ اعتبار
پھر جامِ جاں گداز پئے جا رہا ہوں آج

پھر کر رہا ہوں یاس پہ تعمیرِ آرزو
پھر بے طرح فریبِ وفا کھا رہا ہوں آج

پھر چھا رہا ہے عقل پہ افسونِ بےخودی
پھر بے نیازِ ہوش ہوا جا رہا ہوں آج

پھر توبۂ شباب ہے آمادۂ شکست
پھر مست انکھڑیوں کی قسم کھا رہا ہوں آج

پھر لا کے آسماں سے ستاروں کے تازہ پھول
فرطِ طرب میں راہ پہ برسا رہا ہوں آج

سو بار ہو چکا جو شکستوں سے پائمال
اس دل کو پھر امید سے گرما رہا ہوں آج

پھر کائنات میرے قدم پر ہے سجدہ ریز
اور اس کو پائے ناز سے ٹھکرا رہا ہوں آج

شہید ابن علی

سلام کے جواب میں

سلام اُس پہ کہ جس نے سلام بھیجا ہے
نگاہِ لطف کا رنگیں پیام بھیجا ہے

سلام اُس پہ کہ گر اُس کی مدح ناز کروں
ذرا سی عمر کو میں حشر تک دراز کروں

سلام اُس پہ فدا جس پہ ہر چمن کی بہار
بہشت کے گل ونسرین ونسترن کی بہار

سلام اُس پہ جسے حورِ کہکشاں کہیے
زمیں کے شب کدے میں نورِ کہکشاں کہیے

وہ مہ جبیں جسے تارے بھی پیار کرتے ہیں
اور اُس کے قدموں پہ کرنیں نثار کرتے ہیں

مہ و ستارہ کا پیکر رُخِ حسیں اُس کا
بہار و نور کا بُت جسمِ ریشمیں اُس کا

وہ گُل بدن کہ اگر سیرِ گُل کو آ جائے
غرور، گُل کی نزاکت کا سب مٹا جائے

شمیمِ زلف سے سو جنتیں مہک جائیں
نگاہِ مست سے میخانے تک بہک جائیں

وہ زلف تیرہ کہ دن ہو تو رات ہو جائے
سیاہ، نظروں میں کُل کائنات ہو جائے

وہ شوخ آنکھیں جہاں بجلیاں مچلتی ہیں
وہ نظریں جن سے جواں مستیاں اُبلتی ہیں

کشیدہ ابرو، ہلالِ سیاہ کہیے جنہیں
کئی دلوں کا مآلِ سیاہ کہیے جنہیں

شفق سے، گُل سے، سمن سے بنے ہوئے عارض
بہارِ باغِ عدن سے بنے ہوئے عارض

وہ لعل لب کہ جنہیں آرزوئیں پیار کریں
بہشتیں، غنچوں کی شادابیاں نثار کریں

خرامِ ناز کہ موجِ نسیم رُک جائے
صدائے شوخ کہ قدموں پہ زُہرہ جھک جائے

بُتانِ شہر میں وہ اِس طرح نمایاں ہے
کہ جیسے تاروں میں ماہِ جواں درخشاں ہے

نسیم کی طرح جس دم چمن میں آتی ہے
چمن کی ہر کلی مدحت کے گیت گاتی ہے

وہ پھول ہے کہ بہاروں کا جس پہ سایہ ہے
وہ چاند ہے کہ ستاروں کا جس پہ سایہ ہے

برنگِ مدح یہ تازہ کلام حاضر ہے
اور اس زباں میں "جوابِ سلام" حاضر ہے

اُمیدِ دل کی کلی کھل کے پھول ہو جائے!
ہماری نذرِ محبت قبول ہو جائے!!

اختر شیرانی

رس کے نظریے

کسی ادبی تخلیق کے حسن و لطافت کو ذہنی گرفت میں لانے کے لئے ادبی تنقید بہترین ذریعہ ہے۔ شاعر ایک حسن کار ہے، وہ خیالات کو الفاظ کا جامہ پہنا دیتا ہے، اُس کا کام مشاطۂ سخن کا ہے۔ لیکن کیفیتِ شعری کو سمجھنے اور سمجھانے میں تنقید ہی ہماری مدد کر سکتی ہے۔ حقیقتِ شعری کی دریافت کے اصول اور حسن کی ترجمانی میں شاعر کی کامیابی کے درجے کو جانچنے کے لئے جن تجزیاتی قوانین کی ضرورت ہے وہ ہمیں ادبی انتقاد ہی میں مل سکتے ہیں۔ شعر و ادب کا وہ حسن جس سے مذاق سلیم کو کیف و سرور کا عالم مہیّا ہو سکتا ہے اس کو یہی قوانین نمایاں کر سکتے ہیں۔

عام طور پر سنسکرت میں "النکار شاستر" کے معنی ادبی تنقید کے ہیں لیکن اس کے لغوی معنی روزمرّہ یا محاورہ ہیں۔ "النکار شاستر" کا قدیم مفہوم زیادہ وسعت لئے ہوئے ہے۔ پہلے اس کلمے سے "حُسنِ شعری" مراد تھی۔ لیکن "حُسن شعری" میں بھی وہ جزئیاتِ تصور شامل نہیں ہیں جن کا اظہار "ادبی تنقید" سے ہوتا ہے۔ کیوں کہ "ادبی تنقید" میں تفہیم و تحسین —— اور تنقید، تینوں باتیں آجاتی ہیں۔ اس کے علاوہ "النکار" کا لفظ ان تمام انتقادی طریقوں پر بھی حاوی نہیں ہے جو آج تک ایجاد ہو کر سنسکرت نقادوں میں رائج ہوئے۔ کیونکہ النکار طریقے کے علاوہ تنقید کے سات اور طریقے بھی ہیں اور ان میں سے کئی النکار سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ اس لئے سنسکرت میں تنقیدِ ادب کا مفہوم جتانے کے لئے لفظ "النکار" کے استعمال سے جواز کے لئے ایک ہی وضاحت کی جا سکتی ہے اور وہ یہ کہ اس استعمال کا آغاز بھاماہیۃ کی پیروی سے ہوتا ہے۔ بھاماہیۃ کے خیال میں شعر کی نمایاں اور بنیادی خوبی صحیح الفاظ اور محاورات ہی ہیں اور صحیح الفاظ اور محاورات ہی ہمیں شعر و ادب کی جمالیاتی کیفیتوں سے محظوظ کر سکتے ہیں۔

بہر حال اس بات میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا کہ تنقیدِ ادب ہی سے شعر و ادب کی صحیح اور مناسب شرح ہو سکتی ہے اور چونکہ علم ادب کسی قوم کے تمدّن کی ایک اہم شاخ ہوتی ہے اس لئے انسانی کارگذاریوں اور ذہنِ انسانی کے ارتقا کی اعلیٰ اور نفیس فضا سے لطف حاصل کرنے اور انہیں سمجھنے میں جو مدد تنقید ادب سے مل سکتی ہے۔ اُسے دیکھتے ہوئے ادبی تنقید کی اہمیّت سے ہرگز انکار نہیں ہو سکتا اس مضمون سے اِسی خیال کے ایک پہلو کی تکمیل مقصود ہے۔

سنسکرت علم ادب میں تنقید نگاری کے آٹھ مختلف سکول ہیں لیکن "رس" اور "دھوانی" کے سکول اِن میں سب سے زیادہ نمایاں اور اہم ہیں۔ ان آٹھ مختلف گروہوں نے جو قوانین وضع کئے۔ ان کی حیثیت خود مختارانہ ہے۔ وہ ابتدا میں اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے ایک دوسرے کے محتاج نہ تھے۔ لیکن بعد ازاں اُن کی قدر و قیمت "رس" اور "دھوانی" کے گروہوں سے اُن کے تعلق کی نسبت سے قرار پائی اور یہی وجہ ہے کہ اب اگر ہم "رس اور دھوانی" کے نظریوں کو جان لیں تو انہی دو نقاطِ نظر سے . . . بلکہ محض رس کے نقطۂ نظر ہی سے سنسکرت ادبی تنقید کے تمام مسئلے کو کافی حد تک سمجھ سکتے ہیں۔ رس اور دھوانی میں بھی چونکہ "رس" کے نظریوں کا گروہ ہی زیادہ اہم اور نمایاں ہے اس لئے اسی کے لئے ہم آج کی فرصت کو وقف کریں گے۔

"رس" کے سکول کی ابتدا سنسکرت کے پہلے شاعر والمیکی سے ہوتی ہے . . . . لیکن "رس" کے صحیح معنی اور مفہوم کو جان لینا بہت ضروری ہے۔ "رس" ایک فنّی اصطلاح ہے جو قدیم ہندوستانی ادب میں رائج تھی۔ قدیم ہندوستان کے علم فلسفہ میں بھی ایک ایسی ہی اصطلاح "دھرم" کی ہے۔ دھرم اور رس دونوں ایسے لفظ ہیں کہ ترجمے میں ایک ایک لفظ سے ان کے صحیح اور پورے مفہوم کو ادا نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ ان دونوں اصطلاحوں کا آغاز اور نشو و نما قدیم ہندوستان کی خالص فضا اور ماحول میں ہوا۔ سنسکرت نقادوں کے مطابق "رس" وہ سرچشمۂ کیف و سرور ہے جو

ذوقِ سلیم رکھنے والے ذہنوں سے پھوٹتا ہے۔ اول، تخلیقِ شعری کی صورت میں، دوم، داد و تحسین کی صورت میں۔ یہ کیف و سرور شاعری کی شکل اُس صورت میں اختیار کرتا ہے اگر ذوقِ سلیم رکھنے والا شخص اس خداداد شاعرانہ جوہر کا مالک ہو جسے "پرتیبھا" کہتے ہیں اور داد و تحسین کی شکل تب اختیار کرتا ہے کہ متاثر ہونے والا شعری کی بجائے نثری خصوصیاتِ ذہنی کا مالک ہو۔ آنند وردھن سنسکرت نقادوں میں سب سے اونچا درجہ رکھتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ ایک ایسے ذہن سے ہی شاعری کی تخلیق ہوسکتی ہے جس پر "رس" یا کیف و سرور سے متاثر ہونے کی اہلیت پوری طرح حاوی ہو۔ اور اس لئے تخلیق کے بعد اس میں کسی قسم کا کوئی شعوری اضافہ نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ یوں اُس میں رس کی کیفیت کم تر ہو جاتی ہے۔ چنانچہ سنسکرت فنِ تنقید میں "رس" اہم ترین موضوع ہے۔ اور اس کے علمی اور ادبی دونوں پہلوؤں پر بحث کی جاتی ہے۔ مندرجہ بالا وجوہات کی بنا پر ہی ہم "رس" کا مفہوم کسی اور لفظ سے ادا نہیں کر سکتے۔ البتہ اس کی وضاحت کے لئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ "رس" کے معنی کیف و سرورِ شعری ہیں۔

ایک نقاد نے لکھا ہے کہ شعر کا مطالعہ نہیں کیا جاسکتا، اس سے حظ اٹھایا جاسکتا ہے۔ گویا شعر و ادب کی اپیل ذہن کی بجائے دل کو ہوتی ہے۔ اور ذوقِ سلیم عقل کی بجائے احساس کا دوسرا نام ہے۔ والمیکی نے اپنی رامائن کے آغاز میں لکھا ہے کہ "وایا نگیہ" یعنی آکاش بانی الہام، ندائے سروش یا ہاتف کی آواز ہی سے "رس پرتیتی" یعنی کیفِ شعری کا ظہور ہوتا ہے۔ غالب بھی اسی کی تائید کرتا ہے۔ سے

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

شعر و ادب میں بھی گویا آنکھ مچولی کھیلی جاتی ہے اور اسی کی وجہ سے شعر و ادب کی دلکشی (چمتکار) بڑھتی اور قائم رہتی ہے۔ "رس" کے نظریوں سے شعر و ادب کی دلکشی کے پس منظر میں جو نفسیاتی عمل ہوتا ہے اس کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے لیکن رس کے متعلق کسی فیصلہ کن بیان کی تفہیم سے پہلے ضروری ہے کہ اُن تمام اصطلاحات کو پورے طور سے سمجھ لیا جائے جن کا اُس بیان کے ساتھ تعلق ہے۔ مثلاً وبھاؤ، انوبھاؤ، ویابھچاری بھاؤ، ستھائی بھاؤ۔ اور رس۔ رس کو رس اس لئے کہتے ہیں کہ اس سے رس ملتا ہے۔ لطف حاصل ہوتا ہے۔ ایک جمالیاتی کیف سے طبیعت محظوظ ہوتی ہے۔ گویا یہ احساسِ حسن کی ایک ذہنی کیفیت کا نام ہے۔ ستھائی بھاؤ کے معنی ہیں ذہنِ انسانی کی مستقل کیفیت، جو اندرونی طور پر کسی شخصیت میں خوابیدہ ہو۔ یہ کیفیت ہمیشہ ہماری ہستی کا ایک جزو رہتی ہے جیسے یہ ہمیں پچھلے جنموں سے ملی ہو اور نفسیاتی تعبیر کے مطابق اسی کیفیت پر شعر و ادب اپنی دلکشی سے اثر انداز ہو کر "رس" کی کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ چونکہ یہ کیفیت ہمیشہ ہماری ہستی میں موجود رہتی ہے۔ اس لئے اسے "ستھائی بھاؤ" یعنی "مستقل کیفیت" کہا جاتا ہے۔ یہ کیفیت ذہن کی باقی تمام کیفیتوں کو اپنے آپ میں ملا لیتی ہے۔ لیکن اس سے اس کی اپنی ہیئت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ جس طرح سمندر کے پانی میں مختلف دریاؤں کی آمیزش کے باوجود سمندر کی انفرادی شکل قائم رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ کیفیت ہم میں اس استقلال کے ساتھ موجود ہے گویا پچھلے جنموں سے چلی آرہی ہے اور اس کی بنیادی حیثیت کی وجہ ہی سے "رس" کے نظریے سے متعلق بیان میں اس کیفیت کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

"وبھاؤ" وہ خاص محرکات ہیں جو ان آسودہ اور اندرونی احساسات کو برانگیختہ کرتے ہیں۔ اور یہ تحریک کا عمل "ابھینائے" یعنی اظہار کے ذریعے سے پورا ہوتا ہے۔ خواہ وہ اظہار ڈراموں کی اداکاری کے لحاظ سے نظری ہو، خواہ موسیقی کے لحاظ سے سماعی ہو اور خواہ شعر و ادب کے لحاظ سے محض لفظی اور جب "رس" کی کیفیت پیدا ہوتی ہے تو باقی تمام خیالات ذہن سے غیر شعوری طور پر خارج ہو جاتے ہیں اور یہی وہ حالت ہے جب بنیادی کیفیت (ستھائی بھاؤ) "رس" کی کیفیت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ ان بنیادی کیفیتوں کی تعداد نو (۹) ہے۔

۱۔ رتی (عشق و محبت)
۲۔ ہاسیہ (مذاق)
۳۔ شوک (تاثر۔ رحم۔ غم وغیرہ)
۴۔ کرودھ (غصہ۔ غیض و غضب)
۵۔ اُتساہ (زور۔ قوت۔ طاقت)
۶۔ بھئے (خوف)
۷۔ جگپس (نفرت۔ کراہت۔ ناپسندیدگی)
۸۔ وسمائے (تحیّر)
۹۔ سمہ (شان، شکوہ، شوکت، وقار)

آخری بھاؤ یعنی کیفیت کو بعض بنیادی کیفیت نہیں تسلیم کرتے

لیکن ابھینوگپت نے، جو ایک زبردست ادبی نقاد ہے۔ اسے قطعی طور پر ایک بنیادی کیفیت تسلیم کیا ہے۔ ہر ادبی تخلیق میں کوئی نہ کوئی بنیادی کیفیت نمایاں اور ممتاز حیثیت رکھتی ہے۔ مثلاً کالیداس کی شکنتلا اور رگھو ونش، شکسپیر کی رومیو جولیٹ، نواب مرزا شوق کی مثنوی زہرِ عشق اور وارث شاہ کی ہیر (پنجابی) میں رتی بھاؤ ایک بنیادی کیفیت ہے۔

وِیابھچاری بھاؤ وہ ہنگامی یا ثانوی کیفیات ہیں جن کا مستقل یا بنیادی کیفیات کے ساتھ تعلق ہے اور جن سے بنیادی کیفیات کے مکمل اظہار اور ترجمانی میں مدد ملتی ہے۔ مثال کے طور پر نروید (یعنی یاس، ناامیدی یا کم ہمتی اور گلانی یعنی تھکن یا ضعف کا تعلق رتی بھاؤ کے ساتھ بھی ہے اور شوک بھاؤ کے ساتھ بھی اور ہیرو یا ہیروئن میں ان میں سے کسی ذیلی کیفیت کی موجودگی کے بیان سے اُن کی بنیادی کیفیت کی ترجمانی میں مدد مل سکتی ہے۔ مثلاً افسانۂ لیلیٰ مجنوں میں بنیادی کیفیت رتی بھاؤ ہے لیکن مجنوں میں ناامیدی، کم ہمتی اور ضعف کی موجودگی سے رتی بھاؤ کی ترجمانی میں مدد ملتی ہے۔

انو بھاؤ وہ غماز نگاہیں یا رنگ کی تبدیلی (حیا کی سرخی، ڈر کی سفیدی یا زردی) ہے جس سے دل کے اصلی احساسات اور جذبات کا اظہار ہو۔ یہ انو بھاؤ بھی بنفسہٖ "رس" کی اپیل میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔ یہ ایک طرح کی اضطراری کیفیتیں ہیں اور یہ دردمند دل یعنی سَتّو میں لازماً پیدا ہوتی ہیں۔ اس لئے انہیں سَتوِک بھاؤ کہتے ہیں۔ یہ تعداد میں آٹھ ہیں۔ ۱۔ بے حرکتی، سکون، ٹھہراؤ (جیسے وہ تحیر آمیز سکون جو کسی خوب صورت عورت کو دیکھنے پر پیدا ہو)
۲۔ رونگٹے کھڑے ہو جانا۔ ۳۔ پسینہ، ۴۔ رنگ کی تبدیلی۔ ۵ لرزش، کانپنا، ۶۔ آنسو، ۷۔ آواز کی تبدیلی۔ ۸۔ خود فراموشی۔

بنیادی کیفیت کے عین بعد ہی ان ذیلی کیفیات کا غیر شعوری طور پر احساس ہو جاتا ہے۔

وِبھاؤ کے معنی محرک ہیں۔ وہ محرکات جن کے تلازمِ خیال کا نتیجہ بنیادی کیفیت (ستھائی بھاؤ) کی نشو و نما اور پرورش ہو، "وِبھاؤ" کہلاتے ہیں۔ "وِبھاؤ" چونکہ ایک زوردار اور اہم جزوِ کلام ہوتا ہے اس لئے اس کی طرف خاص توجہ کی گئی ہے۔ نقادوں نے "وِبھاؤ" کی دو قسمیں مقرر کی ہیں ——— المبان وِبھاؤ اور اُدّی پان وِبھاؤ۔ محبت، غصہ، رحم ———

یہ سب متعدی جذبات ہیں۔ ان میں فاعل کے علاوہ کسی دوسرے شخص کا تعلق ضروری ہے جس سے محبت ہو، جس پر غصہ یا رحم آئے اور ان جذبات کے مرکز دل ہی سے ان کی ایک معین صورت رونما ہوتی ہے۔ ایسی جذباتی کیفیتوں کو المبان وِبھاؤ کہتے ہیں۔ لیکن چند باتیں ایسی بھی ہیں جن سے ان متعدی کیفیات کو مزید تحریک ملتی ہے مثلاً چاندنی محبت کو، دھوکا یا غداری غصے کو اور دکھ بھری آہیں رحم کو بھڑکاتی ہیں۔ ان مزید تحریک دینے والی باتوں کو اُدّی پان وِبھاؤ کہتے ہیں۔

"رس" کے نظریے کے متعلقہ بیان یعنی "رس سُتر" میں جن اصطلاحات کا دخل ہے، یہاں تک اُن کی وضاحت ہو چکی۔ اب ہم اصل بیان کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔ یہ بیان بھرت کا ہے اور بھرت کو سنسکرت انتقادِ ادب کا آدم کہا جاتا ہے۔ بھرت کہتا ہے:

"وِبھاؤ انو بھاو ویابھچاری سَم یوگدرَسا نِشپاتیہہ" یعنی "بنیادی کیفیت (ستھائی بھاؤ) کے ساتھ محرکات (وبھاؤ) بعد کے اثرات (انو بھاؤ) اور اضطراری کیفیات (ویابھچاری بھاؤ) کی ایک امتیازی آمیزش سے "رس" کا اظہار ہوتا ہے"۔

گویا بنیادی کیفیت پر ادبی محرکات، بعد کے اثرات یعنی غماز اشارات اور اضطراری کیفیات کی مکمل کارفرمائی سے جو پُر کیف احساسات پیدا ہوتے ہیں انہیں "رس پرتیتی" یعنی رس کا اظہار کہتے ہیں۔

یہاں تک تو راؤں میں کوئی اختلاف نہیں۔ لیکن "سَم یوگ" اور "نِشپاتی" کی تشریح میں مختلف خیال پیشِ نظر ہو جاتے ہیں۔ بھٹ لولٹ رائے زنی کرتے ہوئے کہتا ہے کہ سم یوگ (سنجوگ) کے معنی سمبندھ یعنی رشتہ یا تعلق کے ہیں اور نشپاتی کے معنی اُت پاتی یعنی تخلیق کے، بلکہ اپنے اثر اور نتیجے کے لحاظ سے او پائینی لگاؤ یا نسبت کے ہیں۔ دوسری چیزوں اور دبھاؤ کے تعلق سے پہلے پہل "رس" اصلی ہیرو میں پیدا ہوتا ہے اور پھر ہمارے ذریعے سے اُس اداکار (نٹ) میں منتقل ہو جاتا ہے جو ہیرو کا پارٹ کر رہا ہو۔

سری سنکو کا ایک منطقی نقاد ہے، اور وہ "رس" کے عمل کو اخذ اور نتیجے اور علت اور معلول کی توضیح سے بہت غیر شاعرانہ سا نظریہ بنا دیتا ہے۔ اُس کے خیال میں حاصل شدہ اور قابلِ حصول کے باہمی تعلق کا نام سم یوگ ہے، اور نشپاتی، انومیتی یعنی اس استخراج کا نتیجہ ہے۔

بھٹ نائک کہتا ہے کہ جب ہیرو یا ہیروئن کے انفرادی جذبات ایک کلئے کی عمومیت کے حامل ہو جاتے ہیں، تو وہ اپنی وسعت کے لحاظ سے ذوقِ سلیم رکھنے والے دل کے لئے ایک پُر کیف شعور کا باعث بن جاتے ہیں، اور اسی عمل کو "رس پرتیتی" یعنی "رس" کا اظہار کہتے ہیں۔"

"رس" کے نظریے کی آخری اور تسلی بخش شرح ابھینو گپت کی ہے۔ وہ "رس" کو "سمجھائی ہوئی بات" کہتا ہے اور "سم یوگ" کے معنی اس تعلق کے بیان کرتا ہے جو "سمجھانے والے" اور "سمجھائی ہوئی بات" میں ہو۔ نیز "نشپاتی" کے معنی انکشاف یا الہام بتاتا ہے۔

"رس" کے اصول کی الجھنوں کو صاف کرنے میں سب سے پہلی باقاعدہ کوشش بھٹ لولٹ نے کی۔ وہ کہتا ہے کہ (مثال کے طور پر) — "رتی (عشق) کی بنیادی کیفیت (ستھائی بھاؤ) کا محرک (المبان وبھاؤ) کسی دوشیزہ کا وجود ہوتا ہے۔ بعد ازیں محبت کی کیفیت کو چاندنی سے روشن دل پذیر باغات میں ملاقاتوں سے مزید تحریک ملتی ہے اور غماز اشاروں اور دزدیدہ نگاہوں (انو بھاؤ) سے اس کا اظہار ہوتا ہے اور اضطراری کیفیات (ویا بھچاری بھاؤ) یعنی آرزوؤں اور اُمنگوں سے اس میں استقلال اور پائیداری پیدا ہوتی ہے۔ اس تمام عمل سے یہ بنیادی کیفیت جو پہلے صرف ہیرو یا ہیروئن کے دل میں ہی موجود ہوتی ہے، جذبۂ محبت کی ایک علیحدہ اور مستقل صورت اختیار کر لیتی ہے اور پھر تماشائیوں کی طرف سے اُس اداکار کے لئے اس جذبے کی تخصیص ہوتی ہے جو صورت شکل اور لباس اور عمل کے لحاظ سے ہیرو کی شخصیت کی نقل کر رہا ہوتا ہے۔ گویا اس طور پر تماشائی (سامع یا ناظر) کے لئے اُس کی اپنی تفہیم و گرفتِ جذبات ہی باعث کیف ہوتی ہے، جسے وہ اپنے آپ سے اداکار (یا شاعر کے کلام) تک ایک طرح کی تحسین کے لباس میں پہنچاتا ہے۔ اثرات کے لحاظ سے وبھاؤ ایک علت یا وجہ ہے جو ستھائی بھاؤ (بنیادی کیفیت) کو نشو و نما اور تربیت دے کر پھیلاتی ہے۔ "رس" اولاً ناظر یا سامع کے ذہن کے لئے ایک اجنبی کیفیت کی طرح ہوتا ہے اور بعد میں (اور وہ بھی ثانوی حیثیت میں ہی جس کی وضاحت ہمیں معلوم نہیں ہے) اس کے ذہن میں بار پاتا ہے۔ بعد کے ادبی نقاد اس نظریے کو بعینہٖ قبول کرنے میں پس و پیش کرتے ہیں۔ کیوں کہ اس طرح "رس" کے اظہار میں جس نفسیاتی عمل کو دخل ہے۔ اس کی وضاحت سے پوری پوری عہدہ برائی نہیں ہوتی ہے۔ اس وضاحت کے لحاظ سے "رس" کی تخلیق، نشو و نما اور ترجمانی بہت غیر شاعرانہ سی ہو جاتی ہے۔ جیسے یہ بھی کوئی ریاضیاتی اصول ہو۔

دوسرا نقاد سری سنکوکا "رس" کے اظہار کی وضاحت استخراج کے عمل سے کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ حقیقتاً اداکار میں "رس" موجود نہیں ہوتا۔ بلکہ اُس کی مناظرہ حرکتوں اور اصلی ہیرو کے افعال اور خصوصیات کی نقل سے ہم یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ بنیادی کیفیات اس میں موجود ہیں اور یہ احساس رفتہ رفتہ غیر شعوری طور پر تماشائی کو وقتی طور کے لئے یقین دلاتا ہے کہ اصلی ہیرو اور اداکار دونوں ایک ہی شخصیت ہیں۔ اداکار سٹیج پر (اور شاعر اپنے کلام کے ذریعے سے) اصلی ہیرو کے جذبات کی نمایندگی کرتا ہے اور اس میں اُسے اصلی ہیرو کے جذبات کے اکتساب سے مدد ملتی ہے اور ہمارے دل و دماغ ایسے پیش کردہ جذبات کو پہچان اور سمجھ کر اُن سے کیف اندوز ہوتے ہیں اور یوں بنیادی کیفیت تماشائی (یا سامع) کے ذہن میں اپنی آخری منزل یعنی "رس" کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ مختصراً وبھاؤ وہ الفاظ، محاورات، تشبیہیں اور استعارے ہیں جو شاعری میں استعمال کئے جاتے ہیں۔ انو بھاؤ اداکار کی حرکات و سکنات ہیں اور ویا بھچاری بھاؤ انو بھاؤ کی محتاط اور ماہرانہ پیشکش کا نام ہے اور ستھائی بھاؤ یعنی بنیادی کیفیت کسی زوردار ادبی بیان سے برانگیختہ نہیں ہوتی بلکہ اس تمام عمل کے نتیجے کے طور پر ظہور میں آتی ہے اور "رس" کی صورت اختیار کرتی ہے۔ سری سنکوکا کہتا ہے کہ یہی وجہ ہے کہ بھرت کے "رس سُترا" میں بنیادی کیفیت کا ذکر نہیں ہے۔ ہم ایک جذبے کی نقل کو بالکل اسی انداز میں اصل سمجھتے ہیں جیسے ایک بچہ گھوڑے کی تصویر کو گھوڑا کہتا ہے۔ اس تشریح سے ہم یہ تو ثابت کر سکتے ہیں کہ یہ بات غلط ہے کہ "رس" ایک "پراگنت" شے ہے یعنی ہم میں نہیں بلکہ ہمارے علاوہ کسی اور ذات میں اس کا وجود ہوتا ہے۔ لیکن اس سے ایک اور مشکل درپیش آتی ہے اور وہ یہ کہ یہ نئی تشریح ہمارے اپنے ذاتی تجربے کے خلاف معلوم ہوتی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ محبت کی شاعری سے حظ اندوز ہونے کے لئے ہمیں بنفسہٖ محبت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ گویا اصطلاحی زبان میں کیف (رس) حاصل کرنے کے لئے ہمیں بنیادی کیفیت (ستھائی بھاؤ) کی محتاجی نہیں۔ نیز ہم یہ بھی کہہ

سکتے ہیں کہ ہمارے ذہن میں کسی طرح کا "استخراجی" عمل واقع نہیں ہوا۔ ہمیں کسی جمالیاتی تخلیق کو دیکھتے، پڑھتے یا سنتے ہی ایک پرکیف ذہنی حالت مہیا ہو گئی۔ ہمیں چار کا عدد حاصل کرنے کے لئے دو میں دو کو جمع نہیں کرنا پڑا۔ دو اور دو کو دیکھتے ہی ہمیں حاصل جمع کا احساس ہو گیا۔

بھٹ نائک کی تشریح "رس" کے نظریے کو زیادہ واضح کرتی ہے۔ پہلے دو لوں نقاد نظریۂ "رس" کے داخلی وجود کو تسلیم کر کے کہتے ہیں کہ یہ ایک تخلیق کا یا استخراج کا عمل ہے۔ نیز وہ اصلی ہیرو کو "رس" کا ماخذ و منبع معیّن کرتے ہیں لیکن بھٹ نائک اس مرکزِ نقل کو تبدیل کر کے ناظر یا سامع کو "رس" کی اوّلین منزل مقرر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر اداکار یا اصلی ہیرو ہی "رس" کی بنیادی منزل ہے اور وہی پہلے کیف حاصل کرتا ہے تو اس کی حیثیت تو پھر ناظر یا سامع کی ہو گئی وہ اپنا اصلی درجہ کھو بیٹھا۔ اس طرح "رس" ایک خارجی احساسِ کیف بن گیا۔ "رس" کے اس نفسیاتی پہلو پر سب سے پہلے غور کرنے کے لئے بھٹ نائک تعریف کا مستحق ہے۔ اس کے علاوہ "رس" کا نفسیاتی مواد اور وہ طریقہ جس سے اُسے ایک امکانی صورت ملتی ہے، اُسے سب سے پہلے بھٹ نائک ہی نے واضح کیا۔ نیز اُس نے صاف طور پر یہ بیان کر دیا کہ رس (احساسِ کیف) ایک غیر معمولی عمل ہے۔ اور اس کی شرح عام دُنیوی اصول و قوانین کے لحاظ سے کسی صورت میں بھی نہیں کی جا سکتی۔

بھٹ نائک اپنی شرح کو بیان کرنے سے پہلے دوسرے نقادوں کی تشریحات کے کمزور پہلوؤں پر بحث کرتا ہے۔ فرض کیجئے کہ "رس" ایک "پراگت" یعنی خارجی شے ہے۔ خواہ وہ اصلی ہیرو میں ہو یا اداکار میں۔ اس صورت میں اس کا "ردِ عمل" ہم پر نہیں ہو سکتا۔ "رس" کی اپیل ہمارے لئے بے اثر رہتی ہے۔ نیز ہم یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ کسی فن کارانہ تخلیق کے مطالعے یا مشاہدے کے بعد اُن کیفیات سے سامع یا ناظر کو کیف حاصل ہوتا ہے جو اس کے ذہن میں پیدا ہوتی ہیں۔ اس کی وجہ ظاہر ہے۔ اگر احساسِ کیف کا تعلق ہماری ذات سے ہے تو اس میں کسی شک کی گنجائش نہیں کہ "رس" کے اظہار کی نمود ہماری ذات میں ہوتی ہے۔ لیکن یہ بات کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتی کیوں کہ محرکات ادبی کا مقصد یا مرکزِ رجحان تماشائی نہیں بلکہ اصلی ہیرو یا شاعر ہوتا ہے۔ اس کے خلاف ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ محرکات جن سے شاعر یا اصلی ہیرو کو تحریک ہوتی ہے۔ انفرادی نہیں ہوتے بلکہ ان کی حیثیت ہمہ گیر ہوتی ہے اور اسی لحاظ سے یہ ہمارے آسودہ احساسات کو بیدار کرتے ہیں۔ لیکن اس صورت میں ہم دیوتاؤں کی کہانیوں، بہادری کے کارناموں اور عام رزمیہ نظموں سے کیونکر متاثر ہوتے ہیں؟ کیونکہ ایسی تمام بیانیہ چیزیں تو کسی طرح کی داخلی حیثیت نہیں رکھتیں، دیوتاؤں کی کارگزاریوں کا انسانی کارگزاریوں کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہیں۔ ان میں کوئی نسبت ہی نہیں، اس لئے ہم اُن افعال کے بیان سے کیف کیونکر حاصل کرتے ہیں جن کی ہم میں اہلیت نہیں؟ اگر ہم یہ کہیں کہ مخصوص لفظوں سے محرکات بنتے ہیں، تو یہ بھی درست نہ ہوگا کیونکہ مخصوص الفاظ کا نتیجہ "رس" کا اظہار نہیں ہو سکتا اور نہ تخلیق محض یا ادائیگی (اداکاری) کا نتیجہ کیف کی صورت پیدا کر سکتا ہے۔

ان باتوں سے یہ نتیجہ نکلا کہ "رس" کا انحصار نہ تفہیم پر ہے، نہ تخلیق پر، اور نہ شعر کے اظہار پر بلکہ اس کی تشریح صرف اس طریق پر کی جا سکتی ہے۔ ادبی الفاظ کے تین مخصوص پہلو ہیں۔

۱۔ لغوی اور ثانوی مفہوم۔

۲۔ تخئیلی مفہوم جس میں رس کو دخل ہو، اور

۳۔ وہ مفہوم جس کی تکمیل صرف اُن ذہنوں میں ہو جو ذوقِ سلیم کے مالک ہوں۔

ابھینو گُپت اپنی وضاحت کی بنیاد اشارے اور کنائے کے اصول پر رکھتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اُسے اس وضاحت کا خیال کالیداس کے ایک شلوک سے سوجھا ہے۔

راجہ دُشینت اپنے تخت پر بیٹھا ہوا ہے۔ اُسے رانی ہنس پادِک کا ایک شیریں گیت سنائی دیتا ہے جس میں اُس کی بے اعتنائی کا شکوہ ہے۔ اس کی نگاہوں کے سامنے اچھے مناظر بھی موجود ہیں۔ یہ گیت اور یہ مناظر محرکات بن کر اس کے ذہن کو ایک مرکزِ تفکر پر لے آتے ہیں۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ اُسے کچھ یاد آ رہا ہے۔ لیکن وہ یہ نہیں سمجھ سکتا کہ یہ یاد آنے والی بات ہے کیا؟ اور اس کے باوجود کہ ابھی چند لمحے پیشتر وہ اچھا بھلا خوش و خرّم تھا، وہ دیکھتا ہے کہ اب اُس کے ذہن پر کسی ناقابلِ بیان غم نے غلبہ پا لیا ہے۔

اس موقع پر کالیداس کا مذکورہ بالا شلوک اس غم کی ایک وجہ کی طرف اشارہ کرتا ہے "ایسے موقعوں پر ذہن میں غیر شعوری طور پر کسی گذرے ہوئے جنم کی دوستی کی یاد تازہ ہو جاتی ہے کسی گذشتہ زندگی کا یہ تعلق خاطر اس قدر گہرا ہوتا ہے کہ اُس کا اثر یوں ظاہر ہوتا ہے۔ بیتے ہوئے جنموں کے تاثرات اور واقعات ہمارے ذہنوں میں بہت گہری جڑ پکڑ کر ایک پائیدار صورت اختیار کر لیتے ہیں اور وہ ہماری موجودہ زندگی میں محرکات کے باعث نہایت آسانی سے تازہ ہو سکتے ہیں۔ صرف محرکات کی ضرورت ہے۔ ایسے محرکات شاعری یا ادب میں نہایت آسانی سے مل سکتے ہیں جن سے یہ آسودہ تاثرات یا ورثے میں لیا ہوا تجربات کا ذخیرہ گویا بیدار ہو جاتا ہے۔ اور مختلف احساسات وکیفیات کی بنیاد انہیں پر قایم ہوتی ہے اور پھر ان کیفیات کو الںبان وبھاؤ (بنیادی محرک) اور اُدّیپان وبھاؤ (ثانوی محرک)، سے مزید تحریک ملتی ہے اور اس سارے عمل کا نتیجہ رَس کے اظہار کی صورت میں ہوتا ہے۔ لیکن بنیادی کیفیت سے احساسِ کیف تک کا یہ عمل ایک پر اسرار عمل ہے۔ ہمیں احساسِ کیف کا شعور ہوتا ہے لیکن اس عمل کے بھید ہم پر نہیں کھلتے "شکنتلا" کے مندرجہ بالا واقعہ میں راجہ دُشینت کو یہ معلوم تھا کہ وہ خوش آہند گیت سُن رہا ہے لیکن وہ اُس پر اسرار عمل کی تہ تک نہیں پہنچ سکتا تھا جس کی وجہ سے اس کے ذہن پر اچانک مسرت کی بجائے غم وافسوس نے غلبہ پا لیا۔ اسی طرح کسی فن کارانہ تخلیق سے ہمیں احساسِ کیف تو ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر کوئی یہ پوچھے کہ یہ احساسِ کیف کیونکر ہوا؟ تو ہم اس کا جواب دینے سے معذور ہیں۔ ہم ایک ڈرامہ دیکھتے ہیں، ہم کوئی گیت سنتے ہیں، کوئی افسانہ پڑھتے ہیں یا کوئی شعر سنتے ہیں اور ہمیں احساسِ کیف ہوتا ہے۔ اِن تخلیقات کی نوعیت کے لحاظ سے ہمیں مسرت ہوتی ہے، یا ہم پر ملال کا غلبہ ہو جاتا ہے، بلکہ بعض اوقات اس کیفِ غم ومسرت میں ہم اپنے آپ کو بھول جاتے ہیں۔ ہمیں کبھی یہ خیال ہی نہیں آتا کہ اس حظ اندوزی میں کوئی خاص عمل بھی واقع ہوا یا نہیں۔ اس لئے ابھینو گپت کا یہ کہنا بہت صحیح ہے کہ ہمیں ایک ناقابلِ فہم طریق پر احساسِ کیف ہوتا ہے اس عمل کو ابھینو گپت اشارے یا کنایے کا عمل کہتا ہے۔ اس لئے اس کے خیال میں رَس "ایک چھپائی ہوئی بات" ہے۔ یہ گویا ایک طرح کی آنکھ مچولی ہے جس میں ہم بہت سی گم شدہ اشیاء میں سے کسی ایک کو تلاش کر لیتے ہیں۔ آنکھ مچولی میں ہم کیوں زید کو جا پکڑتے ہیں، بکر کیوں ہمارے ہاتھ نہیں آتا، یہ محض حسنِ اتفاق ہے۔ بعض دفعہ ایک نہایت غم گین شعر بھی ہم پر اثر نہیں کرتا اور بعض دفعہ ہم ایک مسرت انگیز شعر سے بھی تلازم خیال کی بنا پر غمگین ہو جاتے ہیں۔

گویا اس وضاحت کی بنا پر ابھینو گپت اِس اعتقاد کا حامی ہے کہ انسان پیدایش پر گذشتہ زندگی کے تاثرات اپنے ساتھ لے کر آتا ہے جو اُس کے ذہن میں آسودہ ہوتے ہیں از تعلیم وتربیت اور موجودہ زندگی کے تجربات اُن آسودہ تاثرات میں ایک ایسی شدّت پیدا کر دیتے ہیں کہ وہ شعر وادب کی تحریک پر بیدار ہو جاتے ہیں۔ ہر ہستی میں پیدائش ہی سے مسرت کی طرف ایک جبلّی میلان اور غم واندوہ سے ایک جبلی نفرت موجود ہوتی ہے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ احساسِ کیف کی تمام صورتوں میں ذہنی فضائے بعید میں تاثرات کی موجودگی ایک لازمی چیز ہے۔ ہم دل ودماغ کو ایک ایسے ساز سے تشبیہہ دے سکتے ہیں جس میں بہت سے تار ہیں اور ہر تار مختلف بیرونی یا خارجی تحریکات کا تابع ہے اور یہ خارجی تحریکات اپنے مخصوص ومعین جذبات و احساسات کی گونج پیدا کرتی ہیں۔ خوشگوار احساسات پیدا ہو کر کسی قسم کی دنیوی یا مادّی صورت نہیں اختیار کر لیتے۔ بالکل اسی طرح ان احساسات کے پیدا ہونے کا عمل کسی واضح ضابطے کا محتاج نہیں ہے۔ یہ ایک تخلیقی اور غیر متعلق سا عمل ہے۔ اثرات اپنی علت کے معدوم ہو جانے کے بعد بھی برقرار رہتے ہیں۔ مثلاً پھول کو سونگھنے کے بعد اُسے ناک سے جتنا جی چاہے دُور کر دیجئے، خوشبو کا اثر ــــ خوشگوار اثر دیر تک قایم رہے گا۔ یا کسی حسین صورت کو دیکھنے سے جو کیف حاصل ہو سکتا ہے، وہ اس حسین صورت کے نظروں سے پنہاں ہو جانے پر بھی جاری رہتا ہے لیکن رَس" کا اظہار یا کسی ادبی تخلیق سے احساسِ کیف جب تک محرکات موجود ہوں تبھی تک رہ سکتا ہے۔ ایک اچھے شعر کا لطف ہمیں اُسی وقت تک آتا ہے جب تک کہ وہ شعر ذہن میں تازہ اور موجود رہے۔ ایک اداکار کی اداکاری سے احساسِ کیف ڈرامے کے دوران میں ہی جاری رہتا ہے۔ ہم منڈوے یا سٹیج سے علیحدہ ہوئے اور لطف ختم ہوا۔ صرف اُس لطف کی یاد ہی باقی رہ جاتی ہے۔ فن کارانہ تخلیق سے پیدا ہونے والے احساسات اُسی وقت تک رہتے ہیں جب تک ذہن اُن کی مخصوص

کیفیت میں ڈوبا رہے۔ محرکات ایک تخلیقی اور تخیلی شئے ہیں۔ جن میں اُن کے انفرادی اور عارضی لوازم نہیں ہوتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ذہن ایک بہجت افروز کیفیت کی بلندی پر جا پہنچتا ہے اور اُس ذہن میں جس کی توجہ ایک مرکز پر ہوتی ہے یہ محرکات ایک خوشگوار کیفیت کی تکمیل کرتے ہیں جس طرح ہمیں صندل کے شربت میں صندل اور مٹھاس کا علیحدہ احساس نہیں ہوتا اسی طرح ہمیں محرکات اور غمازِ اشارات کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ صرف ایک مجموعی لطف حاصل ہوتا ہے۔

لیکن یہاں پر ایک اعتراض کیا جا سکتا ہے۔ محبت اور اسی قسم کے دوسرے خوشگوار جذبات کے متعلق تو ہم مندرجہ بالا وضاحت پیش کر سکتے ہیں۔ لیکن وہ فنکارانہ تخلیق جس میں نفرت یا غم یا خوف وغیرہ کا بیان ہو اُس سے ہمیں کیونکر کیف مل سکتا ہے؟ کیوں کہ نفرت، غم اور خوف کوئی لطف انگیز احساسات نہیں ہیں شیلے کہتا ہے کہ "ہمارے سب سے میٹھے گیت وہ ہیں جن میں ہمارے سب سے غمگین خیالات موجود ہوں" غم گین (ناپسندیدہ) خیالات میٹھے (خوشگوار) گیت کیونکر بن سکتے ہیں۔

اس کے جواب کے لئے ابھینوگپت اپنی تشریح کو دو قدم اور آگے لے جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جبلّی تاثرات وسیع مطالعے سے شدید ہو کر ابھر تو بیدار ہو سکتے ہیں۔ ان جبلّی تاثرات کو ہمارے ذہن میں محرکات اور غمازِ اشارات بیدار کرتے ہیں اور موسیقی اور رقص وغیرہ سے ان از سرِ نو جاگے ہوئے تاثرات میں ایک گہرائی اور شدت پیدا ہوتی ہے۔ ان ذرائع کے علاوہ چند اور (لیکن کم اہم) ذریعے بھی ہیں جن کا مختصر بیان ذیل میں کیا جائے گا۔

محرکات اور غمازِ اشارات اس قسم کے ہونے چاہئیں جو ہمارے ذہنی دائرۂ گرفت میں آ سکیں۔ اگر ڈرامے میں محیرالعقل واقعات یا مافوق العادت کردار رکھنے ہوں تو اس کے لئے دیومالا کے افسانوں کی طرف ہی رجوع ہونا چاہئے۔ اگر افسانہ شاعر کی اپنی اختراع ہو اور اس میں کردار انسانی ہوں تو مافوق العادت واقعات اور افعال نہیں لانے چاہئیں۔ "رس" کی کیفیت کو لانے کے لئے ایسے لسانی اور دوسرے ذرائع استعمال کرنا چاہئیں جو مناسب اور صحیح ہوں۔ نیز تماشائی (ناظر یا سامع) کو کہانی یا نظم اور کسی تخلیق کے مرکزی موضوع یا بنیادی کیفیت کے متعلق شک میں نہیں رکھنا چاہئے۔ جلد سے جلد اس کی وضاحت کر دینا چاہئے۔ کیونکہ اس کے بغیر "رس" کے احساس میں سامع یا ناظر کو بہت مشکل پیش آ سکتی ہے۔ جتنا جلد وہ بنیادی کیفیت کے علم سے نزدیک ہو جائے احساسِ کیف میں اتنی ہی آسانی ہو جائے گی۔

ان باتوں کے علاوہ سب سے آخر میں لیکن سب سے اہم یہ بات ہے کہ اپنے انفرادی جذبات، رنج و غم اور عیش و مسرّت سے تماشائی بے نیاز ہو جائے "رس" کی کیفیت کے اثر سے اُنہیں بھلا دے۔ ایک مصنف لکھتا ہے۔ "ادب کا مقصد خوش کرنا ہے۔ انسان کی زندگی کے بارِ عظیم کو ہلکا کرنا، ادب کا مقصد یہ ہے کہ وہ چند لمحوں کے لئے انسان کو اس کے غم، اُس کے گناہ، اُس کی شکستہ اُمیدیں اور دوسرے تلخ پہلو بھلا دے"۔ اس مقصد کو اسی طور پر پورا کیا جا سکتا ہے کہ محرکات اور غمازِ اشارات کی نوعیت میں ایک وسعت ہو۔ یہ کام ایک اور طریقے سے بھی ہو سکتا ہے۔ اچھا رقص، شیریں موسیقی اور دلپسند منظر ہمارے ذہنوں کو عام ملازمِ خیال سے اوپر اُچھالے جاتے ہیں۔ ابھینوگپت کہتا ہے کہ ایسے محرکات اُس ذہن میں بھی تحریک پیدا کر سکتے ہیں جو "ذوقِ سلیم" کا مالک نہ ہو۔

کیف ایک تسکین ذہنی ہے۔ ایسی تسکین جس میں احساس ذہنی ہر شئے سے ہٹ کر ایک مرکز پر کام کر رہا ہو کسی بات میں کھوئے جانے سے احساسِ کیف حاصل ہو جاتا ہے خواہ وہ غم ہی کیوں نہ ہو۔ غالب نے کہا ہے

رنج کا خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

اور ایک اور جگہ ہے

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہو جانا ؎ درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا

یہی "عشرتِ قطرہ" یہی "مشکلوں کا آسان ہو جانا" ہی احساسِ کیف ہے تسکین تو ذہنی ہے ہمیں تب ہی کسی قسم کا اضطراب ہوتا ہے کہ ہمارا ذہن متضاد مقاصد کا حامل ہو۔ سانکھیہ فلسفی کہتے ہیں کہ تلوّن مزاجی ہی غم کی پرورش کرتی ہے۔ اگر ہمارا ذہن مسرت کی بجائے غم یا غصے میں مکمل طور پر ڈوب جائے تو ہمیں پھر بھی تسکینِ ذہنی مل سکتی ہے، ایک احساسِ کیف ہو سکتا ہے۔ یہ کیف کا منفی تصور ہے۔ محبت یا مسرّت سے حظ اندوز ہونا احساسِ کیف کا مثبت تصور ہے۔ ایچ۔ جی ویلز کا ذیل کا بیان بھی کچھ اسی قسم کی بات سمجھا رہا ہے "موسیقی ہمارے غموں کو مٹا نہیں دیتی، بلکہ انہیں ایک المناک مسرّت میں تبدیل کر دیتی ہے"۔

سنسکرت ادب میں جمالیاتی نظریوں کا یہ مختصر بیان ختم ہوا لیکن ان میں سے صرف آخری نظریہ (ابھینوگپت کا) ہی کسوٹی پر پورا اترتا ہے۔

بسنت سہائے

حسیات

خندہ بہ لب، شگفتہ رُو، ناز سے آ رہے ہو تم
میری نگاہِ شوق پر حُسن لُٹا رہے ہو تم

زلفِ دراز کھول کر خود کو چھپا رہے ہو تم
کیفیت و سرور کا پردہ بنا رہے ہو تم

ہیر کے شعر دمبدم سوز سے گا رہے ہو تم
کس کے کمالِ عشق کا حال سنا رہے ہو تم

طرّۂ زلفِ عنبریں کھول کے میرے روبرو
نکہت و نور و رنگ میں مجھ کو بسا رہے ہو تم

خندۂ دل نواز سے نغمۂ جاں گداز سے
آنکھوں میں بس رہے ہو تم دل میں سما رہے ہو تم

وادیٔ طور کے عوض کس کا مکاں جلاؤ گے؟
چنگ کے تار تار سے شعلے اٹھا رہے ہو تم

ہاتھ میں لے کے میرا ہاتھ کرتے ہو مسکرا کے بات
دونوں جہاں سے چھین کر اپنا بنا رہے ہو تم

ابرِ کرم سے مست ہوں بادہ کشِ الست ہوں
نظریں اُٹھا کے پے بہ پے اور پلا رہے ہو تم

کیف ہے یا سرور ہے خواب ہے یا خیال ہے
رُوٹھ کے سو رہا ہوں میں مجھ کو منا رہے ہو تم

جنبشِ شاخِ گُل نہیں لرزشِ موجِ مُل نہیں
سبز چمن کے واسطے مجھ کو بلا رہے ہو تم

ہیر کے حُسن و عشق کا چھیڑ کے ذکر اے نظیرؔ
عالمِ بود و ہست کو وجد میں لا رہے ہو تم

اصغر حسین خاں نظیرؔ

ایک گیت

چاہے نہ مجھے گو دل تیرا، تو مجھ کو چاہ بڑھانے دے،
اِک پاگل پریمی کو اپنی چاہت کے نغمے گانے دے
تو رانی پریم کہانی کی، چپ چاپ کہانی سنتی جا،
یہ پریم کی بانی سنتی جا، پریمی کو گیت سُنانے دے۔
یہ چاہت میرا جذبہ ہے، میرے دِل کا میٹھا نغمہ،
اِن باتوں سے کیا کام تجھے، اِن باتوں کو کہہ جانے دے
تُو دُور اکیلی بیٹھی ہے سُکھ سُندرتا کی دُنیا میں،
میں دُور بہا جاتا ہوں پریم کی ندّی میں، بہہ جانے دے
گر بھُولے سے اِس جذبے کا تُو گیت جو اپنی گا بیٹھی،
یہ جادُو سب مٹ جائے گا، اِس کو جوبن پر آنے دے
ہاں، جیت میں نشّہ کوئی نہیں، نشّہ ہے جیت سے دُوری میں؛
یہ راہ رسیلی چلتا ہوں، اِس راہ پہ چلتا جانے دے

میراجی

شہر کا جادُو

فن لینڈ سے کوسوں دُور جنگل میں جھیل کے کنارے ایک کسان اپنی بیٹی اینونا کے ساتھ ایک جھونپڑی میں زندگی کے دن گزار رہا تھا۔ وہ موسم سرما میں جھیل کے ارد گرد گاؤں کے مکانوں کی چمنیاں صاف کرتا تھا۔ اس سے دونوں کی گزران ہو جاتی تھی۔ اُن کا گھاس پھونس کا جھونپڑا شہر والوں کے عالیشان محلات سے بہت دُور تھا۔

جھیل کے کنارے ایک اور کٹیا تھی۔ جس میں ایک بُوڑھا ماہی گیر اپنی کہن سال بیوی اور نوجوان بیٹے کے ساتھ رہتا تھا۔ یہ باپ اور بیٹا بھی مکانوں کی چمنیاں صاف کرتے تھے۔ جھیل کا نام اسی لڑکے کے نام پر ورتموڈ پڑ گیا تھا۔

ورتموڈ اکثر جھیل سے مچھلیاں پکڑتا اور شہر میں بیچ آتا تھا۔ چونکہ اُس کا باپ بڑھاپے کی وجہ سے کام نہ کر سکتا تھا۔ اسی لئے ورتموڈ ہی سب کام کاج کیا کرتا تھا۔

یہ دو مختصر خاندان ایک دُوسرے کے رنج و راحت میں برابر کے شریک تھے۔

اینونا کو بچپن میں مچھلیاں پکڑنے کا بہت شوق تھا۔ وہ ہر روز کشتی میں بیٹھ کر جھیل میں اُتر جاتی اور اپنے نازک ہاتھوں سے چپّو چلانے میں مصروف ہو جاتی۔ کشتی آہستہ آہستہ پانی کی لہروں میں ارتعاش پیدا کرتی ہُوئی آگے بڑھتی تھی۔

اینونا کی سریلی اور دلکش آواز پانی کی لہروں پر گونجتی ہوئی جھیل کے اُس پار ورتموڈ کی کٹیا میں جا پہنچتی۔ ورتموڈ اس آواز کو سُن کر اپنا مچھلی پکڑنے کا جال اور کانٹے اُٹھا کشتی میں بیٹھ کر اینونا کے پاس چلا جاتا۔ کئی گھنٹوں تک یہ دو نوجوان ماہی گیر مچھلیاں پکڑتے رہتے۔ شام کے وقت دو کشتیاں سطح آب پر باہم سرگوشیاں کرتی ہُوئی نظر آتیں کنارے پر پہنچ کر دونوں اپنی اپنی مچھلیاں نکالتے۔ اینونا کچھ مچھلیاں پکانے کے لئے الگ کر لیتی اور باقی مچھلیاں ورتموڈ کو بیچنے کے لئے دے آتی۔ پھر یہ دونوں ایک دوسرے سے شب بخیر کہتے ہُوئے اپنے اپنے جھونپڑوں کو روانہ ہو جاتے۔ اینونا کا باپ اپنے بڑھاپے کے سہارے کو دیکھ کر بہت خوش ہوتا۔ اُس کی آنکھوں میں مسرت کے آنسو جھلکنے لگتے اور وہ ہمیشہ اسی قسم کے سوال سے اپنا سلسلہ کلام شروع کرتا "آج کئے مچھلیاں پکڑیں بیٹا؟" "اینونا مچھلیاں ملیں؟" اینونا تمام مچھلیاں باپ کے سامنے رکھ کر یہ کہتی ہُوئی "ابا دیکھئے۔ اور بہت سی مچھلیاں ورتموڈ کو بیچنے کے لئے دے آئی ہوں۔" باپ سے چمٹ جاتی۔ پھر . . .

آہستہ آہستہ ان کی آواز سنائی دیتی۔ اور آگ کی مدھم روشنی ان کے ہنستے ہُوئے چہروں پر پڑتی . . . اور اینونا اپنے کام میں مشغول ہو جاتی۔ یہ اُس کا روزانہ کام تھا۔

(۲)

ورتموڈ نے کبھی اینونا کے سامنے اُس کے حسن یا اُس کے شیریں نغموں کی تعریف نہ کی تھی۔ اُس کو خیال تھا کہ ہر شہری لڑکی اینونا سے اچھا گاتی ہوگی۔ کیونکہ اُس نے کسی اور لڑکی کا گانا نہ سُنا تھا۔

وہ دل ہی دل میں اینونا کے گانے کی تعریف کرتا تھا۔ اُس کو یقین تھا کہ اینونا صرف اُسی کو بُلانے کے لئے راگ الاپتی ہے۔ اُس کا دل ہر وقت اینونا کی یاد میں تڑپتا رہتا تھا۔ وہ ہمیشہ اُس کے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ جہاں اینونا کے میٹھے گیت ہوں اور وہ ہو! لیکن یہ بات ناممکن تھی!

ہر دوسرے روز وہ شہر میں تمام مچھلیاں فروخت کر کے اینونا کے لئے اچھے اچھے فراک، کیک، مٹھائی اور پھل خرید کر لاتا اور اینونا خندہ پیشانی سے اِن سب چیزوں کو قبول کرتی تھی۔ . . . . . آہستہ آہستہ زمانے کے ساتھ ساتھ چمن روزگار کے یہ دو تر و تازہ پودے نشو و نما پانے لگے۔ اب یہ دونوں جوان ہو گئے تھے۔ اُن کا پاک اور بے لوث اُنس اب انتہائی محبت میں تبدیل ہو گیا تھا۔ وہ دنیا والوں سے دُور، بہت دُور رہنا چاہتے تھے۔ اُنہیں ایک لمحہ بھی جُدا رہنا سخت ناگوار تھا۔

اینونا کے باپ نے اُس کو باہر جانے سے منع کر دیا تھا۔ وہ مچھلیاں پکڑنے بھی نہ جا سکتی تھی۔ کیونکہ سردیوں میں جھیل کا پانی جم جاتا اور کشتی چلانا بہت دشوار ہو جاتا تھا۔ اس طرح اب اینونا کا گھر سے نکلنا قریب قریب ناممکن ہو گیا تھا۔

اینونا کو ورموڈ سے ملے کئی ہفتے گزر گئے۔ لیکن پھر بھی وہ ایک دوسرے کو نہیں بھولے۔ وہ ہر وقت ایک دوسرے کے تصور میں ہی کھوئے رہتے تھے۔

ورموڈ کو جھیل سے اس قدر اُنس ہو گیا تھا۔ کہ وہ گھنٹوں اُس کے کنارے بیٹھا اینونا کی باتیں یاد کیا کرتا۔ اُس کے قدم اینونا کی جھونپڑی کی طرف جانے کے لئے بڑھتے مگر نہ جانے پھر کیوں رُک جاتے۔ ورموڈ اُس کشتی کو جس میں اینونا مچھلیاں پکڑا کرتی تھی۔ پہروں دیکھتا رہتا اُس کی معصوم باتوں اس کے بھولے بھالے خوبصورت چہرے کی یاد اُس کے دماغ کو اپنے سحر سے مسحور کر دیتی تھی۔ اور وہ دیوانہ وار اُس کا نام پکارتا ہوا واپس لوٹ جایا کرتا تھا۔ اس کی آواز لہروں پر گونج کر اوپر اُٹھتی مگر اینونا تک نہ پہنچ سکتی تھی۔

ادھر اینونا بھی اکثر چھپ کر اپنی کٹیا سے باہر نکل جاتی اور جھیل تک پہنچ کر اپنی سُریلی اور دلکش آواز میں گانا شروع کرتی۔ وہی گانا جو وہ کشتی میں بیٹھ کر گایا کرتی تھی۔

اُس کی آواز ورموڈ کے کانوں تک پہنچتی۔ وہ جھیل کی طرف دوڑتا ہوا آتا۔ لیکن تلاش کے باوجود اُس کو نہ پا سکتا تھا۔ کیونکہ وہ واپس جا چکی ہوتی۔ ورموڈ افسردہ خاطر واپس لوٹ جاتا۔

(۳)

ان دونوں کی بڑھتی ہوئی محبت اُن کے والدین سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ ایک روز ورموڈ کے ماں باپ ورموڈ کی شادی کا پیغام لے کر اینونا کے بُڈھے باپ کے پاس آئے۔ اور اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اُنھوں نے جھجک جھجک کر اپنا مدعا بیان کیا۔ بڈھے باپ نے اُن کی درخواست بخوشی منظور کر لی۔ . . . . شادی کی تاریخ بھی مقرر ہو گئی۔

دونوں جوان تھے۔ اینونا اور ورموڈ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ وہ شادی کی تاریخ کا بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔ ورموڈ اب ہر روز نئے نئے تحائف خریدتا تھا۔ تاکہ شادی کے موقع پر اپنی اینونا کو دے سکے۔ اُدھر اینونا مچھلی کے چمکیلے پروں کو رنگ کر ہار بناتی تھی۔ لیکن قسمت اُن کی خوشی پر مسکرا رہی تھی۔

وہ دونوں ہر چیز سے بے خبر اُس دنیا میں رہتے تھے۔ جہاں محبت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔

دن گزرتے گئے۔ بہار پھر رنگ برنگے پھولوں سے آراستہ ہو کر چمنستانِ جہاں کی آرائش میں مصروف ہوئی۔ پرندوں نے اپنے چہچہوں سے اُس کا استقبال کیا۔ خاموش کلیاں ایک بار پھر مسکرانے لگیں۔ جھیل ورموڈ کا پانی پوری آب و تاب سے رواں ہو گیا۔

اینونا خنداں و شاداں جھیل کے کنارے پر آئی۔ اُس نے گلابی لباس زیب تن کر رکھا تھا۔ جس سے اُس کا حُسن زیادہ دلکش ہو گیا تھا۔ وہ کشتی میں بیٹھ کر جھیل میں اُتر گئی اور حسب عادت گانا شروع کیا۔ اُس کی آواز میں ایک خاص کشش تھی۔ جو سننے والوں کو اپنی طرف کھینچتی تھی۔ وہ گاتی رہی اور کشتی چلاتی رہی۔ یہاں تک کہ اپنے گاؤں سے بہت دُور نکل گئی۔

اُس پار چند امیر آدمی شکار کے لئے آئے تھے۔ اُن کے کانوں تک اینونا کی دلفریب آواز جھیل کی لہروں پر ناچتی ہوئی پہنچ گئی۔ وہ سب کے سب کیف سے جھومنے لگے۔

یہ لوگ جھیل کے کنارے پر کھڑے تھے۔ اُنھوں نے اینونا کو اشارے سے اپنے پاس بلایا۔ اینونا کشتی کو کنارے پر لے گئی۔ وہ ان کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ کیوں؟ اُس نے تمام عمر کسی شہری کو نہ دیکھا تھا۔ اگرچہ اُس نے کئی مرتبہ ورموڈ سے کہا کہ وہ اُسے شہر لے جائے۔ لیکن کسی نے اُس کی تمنا پوری نہ ہونے دی۔ آج جبکہ عرصہ کی آرزو پوری ہوئی وہ اُس سے لطف اُٹھا رہی تھی۔

نہ معلوم وہ کتنی دیر تک اُن کو دیکھتی رہی کہ ایک نوجوان نے کہا
"آپ کا گانا ہمیں بہت پسند آیا۔ ہمارے شہر میں کوئی بھی لڑکی ایسا نہیں گا سکتی۔ واہ واہ! کیا کہنے!"

اس پر تمام لوگوں نے اُس کی تائید کی اور اینونا کے گانے کو سراہنے لگے۔

اینونا نے تمام عمر میں پہلی مرتبہ اپنے گانے کی تعریف سُنی تو وہ بہت ہی خوش ہوئی اور دل ہی دل میں ورموڈ کو بُرا بھلا کہنے لگی کہ اُس نے تو کبھی بھی اُس کے گانے کی تعریف نہ کی تھی۔ آخر کیوں؟ اینونا سوچ

رہی تھی۔ کہ ایک نوجوان نے کہا۔
"آپ کہاں اور کس کے پاس رہتی ہیں؟ کیا ہمیں ساتھ لے چلیں گی؟"

اینونا نے اس سوال پر بغیر کسی قسم کی حیل و حجت کے اپنی زندگی کا مختصر ورق اُلٹ دیا۔ اور اُن لوگوں کو اپنے باپ کے پاس لے جانے پر آمادہ ہو گئی۔

جب یہ لوگ اینونا کی جھونپڑی میں پہنچے تو اُس کا باپ مچھلی پکڑنے کے بوسیدہ جالوں کی مرمت کر رہا تھا۔ اُس نے جب اپنی بیٹی کو اجنبی آدمیوں کے ساتھ دیکھا تو فوراً ہی اُس کو خیال ہوا۔ شاید یہ امیر آدمی انہیں مچھلیوں کا کام دینے آئے ہیں۔ وہ اپنے خیالات کی منتشر دنیا کو اکٹھا کر رہا تھا۔ کہ ایک نوجوان نے بیس پونڈ کا نوٹ اینونا کے باپ کو دیتے ہُوئے کہا۔

"معزز باپ۔ آپ کی بیٹی بہت اچھا گاتی ہیں۔ کیا آپ انہیں ہمارے ساتھ شہر بھیج دینگے؟ ان کی آواز نہایت سُریلی اور دلکش ہے چند دنوں میں شہرت حاصل کر لینگی۔ اور ہزاروں لاکھوں کی مالک ہو جائیں گی۔"

اینونا کا باپ حیرانی میں ہمہ تن گوش ہو کر اس گفتگو کو سُن رہا تھا۔ وہ جواب دینے ہی کو تھا کہ اینونا نے باپ سے التجا کی کہ وہ اس کو شہر جانے دے۔ کیونکہ اینونا کو یہ اُمید نہ تھی کہ وہ بھی کسی دن شہر دیکھے گی۔ جانے سے پہلے ورموڈ سے شادی ہو جائے تو اچھا ہے۔

وہ جوان اس بات پر ہنسے اور کہنے لگے "ابھی اس بات کا کونسا موقع ہے؟ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ جب تم شہر سے واپس آ جاؤ تو جس سے چاہو شادی کرنا۔ لیکن اس وقت ہمارے ساتھ شہر چلو۔"

شہر کی مشتاق اینونا اُن لوگوں کے ساتھ جانے پر رضامند ہو گئی اینونا کا باپ بیٹی کو جھیل تک پہنچانے آیا۔ وہ لوگ کشتیوں میں بیٹھ گئے۔ بُڈھا باپ اپنی زندگی کے سہارے کو اُن کے سپرد کر کے واپس آنا چاہتا تھا کہ اُس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا آ گیا۔ اُس کی سفید داڑھی آنسوؤں سے تر تھی۔ اُس کی آنکھوں کی روشنی ظالم لوگ اس سے ہمیشہ کے لئے چھین کرلے جا رہے تھے۔ آہ! اس لئے صرف اس لئے کہ وہ غریب تھا اور غریبی نے اُس کو ایسا کرنے پر مجبور کیا تھا۔ وہ اپنی بیٹی کو غریب نہ دیکھ سکا۔ اُس نے اُس کو غیر لوگوں کے سپرد کر دیا۔ کشتیاں پانی پر تیزی سے بہتی جا رہی تھیں۔ اور بُوڑھا باپ بار بار نگاہیں اُٹھا اُٹھا کر اینونا کو دیکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

مگر کشتیاں بہت دور جا چکی تھیں . . . . بُوڑھا گھر لوٹ گیا۔

اینونا جب جھیل کا نصف حصہ طے کر چکی تو اُس کو ورموڈ کا خیال آیا۔ اُس نے واپس جانا چاہا لیکن پرندہ ظالم شکاری کی گرفت میں تھا۔ اُس نے اپنی پُرسوز آواز میں ورموڈ کو الوداع کہی۔ اُس کے درد بھرے گیت نے اُس کے ہمسفروں کو بھی آنسو بہانے پر مجبور کر دیا۔ اب اُس کی خوشی۔ مسکراہٹ۔ سادگی سب کچھ جھیل کے اُس پار . . . . . ایک جھونپڑی میں رہ گئی تھی . . اُس کی خوبصورت نیلی آنکھیں آنسو بہا رہی تھیں۔

(۴)

شہر میں پہنچ کر وہ لوگ ایک نہایت پُر تکلف گاڑی میں سوار ہُوئے۔ ایسی گاڑی اینونا نے کبھی نہ دیکھی تھی۔ وہ بہت خوش تھی۔ شہر کے لوگوں کو گاڑی کی کھڑکیوں سے جھانک جھانک کر دیکھ رہی تھی وہ اپنے آپ کو ایک اور دنیا میں تصور کر رہی تھی۔ گاڑی تیز جا رہی تھی اینونا نے تمام عمر میں اتنے عالیشان مکانات۔ اس قدر خوبصورت اور آراستہ کمرے نہ دیکھے تھے۔ اُس کو نہایت عمدہ بستر دیا گیا۔ اینونا نے آج تک ایسے نرم بستر پر آرام نہ کیا تھا۔ وہ ہر چیز کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھی۔ لیکن اب وہ اپنے آپ کو ایک طائرِ پر شکستہ کی طرح جو ایک قفس میں قید ہو تصور کر رہی تھی۔

اس کے کھوئے ہوئے حواس واپس آ گئے تھے۔ وہ پھر آزاد ہونا چاہتی تھی۔ باپ۔ ورموڈ۔ جھیل کا کنارا۔ ان سب کی یاد یکے بعد دیگرے اُس کے دماغ کو بے چین کر رہی تھی۔ اب شہر کو دیکھنے کا جنون اُس کے سر سے اُتر چکا تھا۔ وہ اُٹھی، دروازہ کو کھٹکھٹایا، خوب زور سے، لیکن دروازہ نہ کھل سکا۔ تمام رات اینونا نے جاگتے گزاری۔ اُس کی آنکھیں آنسو بہا رہی تھیں۔ اُس کو جھیل و ورموڈ کے کنارے یاد آ رہے تھے۔ شہر کو دیکھنے کا پیمانۂ شوق لبریز ہو چکا تھا۔

اینونا روتی رہی، تمام رات۔ وہی اینونا جو آنسو کے نام پر مسکرانے لگتی تھی۔ وہی اینونا جو باپ کے سامنے ایک آنسو بھی نکالتی تو بوڑھا باپ ہزار کوششوں سے اُس کو چپ کراتا۔ طرح طرح کی چیزیں دیتا۔ کھلونے لاتا۔

مٹھائی دیتا تاکہ اینونا آنسو نہ بہائے۔ آج وہی اینونا نہ معلوم کتنے آنسو بیکار بہا چکی تھی۔ اور بہائے جارہی تھی لیکن اس کے باپ کو اس کی خبر بھی نہ تھی رات ختم ہوئی!

صبح ملازم نے دروازہ کھولا اور چائے، بسکٹ، انڈے ایک بڑے سے طشت میں لئے داخل ہوا۔ اینونا اس قسم کی چیزوں سے بخوبی واقف تھی۔ ورتموڈ ہمیشہ شہر سے اُس کے لئے یہ چیزیں لے جایا کرتا تھا۔

بھوک نہ ہونے کے باوجود اُس نے چائے پی لی اور ملازم برتن لے گیا۔ کچھ عرصہ کے بعد اینونا کے مہربان میزبانوں نے اُس کو ایک چمکیلے لباس سے آراستہ کیا۔ اینونا اُس لباس میں بہت خوبصورت نظر آرہی تھی وہ قدآدم آئینہ میں اپنے لباس کو بار بار دیکھتی تھی اور دل ہی دل میں اپنے حسن وجمال پر خوش ہو رہی تھی۔ اُس کے بعد اینونا ایک عالیشان اور وسیع ہال میں پہنچی۔ کمپنی کے مالک اور ڈائرکٹر نے اُس کو بتایا کہ جب اسٹیج کا پردہ اُٹھے تو وہ آہستہ آہستہ اسٹیج پر سامعین کے سامنے آئے اور اپنے سر کو خم دے کر گانا شروع کر دے۔ گانا ختم ہونے پر بھی اپنا سر جھکائے اور پردہ گرنے کے ساتھ ساتھ واپس لوٹے۔ اگر دیکھنے والے تالیاں بجائے تو پھر اسٹیج پر آئے اور جھک کر اس داد وستائش کو قبول کرے اور واپس چلی آئے۔ اس قسم کے کئی سبق نوآموز اینونا کو دیئے گئے۔ جن کو وہ اپنی قابلیت اور ذہانت سے تھوڑے ہی عرصے میں سیکھ گئی۔ ہر روز موسیقی کا اُستاد اُس کو گانا سکھانے آتا تھا۔ وہ کئی روز تک اینونا کو گانا سکھاتا رہا۔

(۵)

آخر وہ دن آپہنچا جب اینونا کو اسٹیج پر آنا تھا۔ صبح سے اُس کو ہدایات دی گئیں اور کئی مرتبہ ریہرسل کرائی گئی۔

اُدھر گھڑی نے چھ بجائے۔ ادھر ہال لوگوں سے بھرنے لگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہال لوگوں سے کچا کھچ بھر گیا۔ تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ لوگ ایک نئی گانے والی کو دیکھنے کے لئے بیتاب ہو رہے تھے۔ آخر گھنٹی بجی اور اسٹیج کا پردہ اُٹھا۔

اینونا رنگ برنگ کے چمکیلے لباس سے آراستہ ہیروں کے زیورات سے مزین اسٹیج پر آئی۔ لوگوں نے اُس کا تالیوں سے استقبال کیا۔

لوگوں کی اتنی زیادہ تعداد دیکھ کر اینونا کے پاؤں اسٹیج پر نہ جم سکے۔ وہ لڑکھڑانے لگی۔ اُس کو جھیل ورتموڈ کا خاموش کنارا یاد آگیا۔ جہاں وہ اور ورتموڈ دونوں سیر کرتے تھے۔ کچھ دیر کیلئے وہ سوائے اس کے کہ وہ جھیل ورتموڈ میں کشتی چلا رہی ہے اور سب کچھ بھول گئی۔ وہ گیت جو اینونا کو اس موقع کے لئے سکھایا گیا تھا۔ اُس نے اپنی سُریلی اور دلکش آواز میں گانا شروع کیا۔ وہی گیت جو ورتموڈ کو بلانے کے لئے وہ جھیل کے کنارے پر گایا کرتی تھی۔ بالکل وہی گیت اُس کے گیت نے ہال میں گونج پیدا کر دی۔ تمام لوگ ہمہ تن گوش سُن رہے تھے۔ اُن کی آنکھیں اینونا کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔ اینونا کا پہلا گیت بہت پسند کیا گیا۔

اینونا گانا ختم کر چکنے کے بعد اسٹیج سے رخصت ہوئی حاضرین کچھ ایسے محو حیرت تھے کہ اُن کو یہ بھی معلوم نہ ہوا۔ کہ اینونا کب اسٹیج سے گئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ لوگوں نے بہت دیر کے بعد محسوس کیا کہ اینونا اسٹیج پر موجود نہیں ہے پھر تالیوں کا شور برپا ہوا۔ اینونا اینونا۔ اینونا کے نعرے بلند ہوئے اور پھر اینونا کو اسٹیج پر لایا گیا۔ اینونا اسٹیج پر آئی تو اُس کے حواس قائم تھے۔ اُس نے سر کو خم کر دیا۔ اور چہرے پر اپنی کھوئی ہوئی ہنسی کو لانے کی کوشش کی۔ اُس نے پھر گانا شروع کیا۔

اس عرصہ میں لوگوں نے تالیاں بجائیں۔ خوب۔ واہ واہ کے نعرے بلند کئے۔ اور آخر . . . محفلِ سرود ختم ہوئی!

دوسری صبح اینونا کے کمرے کا دروازہ کھلا اور ایک پختہ سال آدمی جو کمپنی کا مالک تھا۔ اندر داخل ہوا۔ اُس نے ایک ڈبہ اینونا کی میز پر رکھا۔ جس میں کئی نوٹ اور چمکتے ہوئے سکے تھے۔ جب اینونا کو یہ معلوم ہوا کہ سب روپیہ اُس کا ہے تو اُس نے چاہا کہ روپیہ لے کر واپس اپنے گاؤں چلی جائے۔

اس پر کمپنی کا مالک ہنسا اور اُس نے کہا۔

"نادان لڑکی! ابھی تو یہ پہلا دن ہے اور اس میں کچھ زیادہ آمدنی بھی نہیں ہوئی۔ اگر تم میرے ساتھ تمام ملکوں میں چلو گی۔ تو ایسے ہزاروں ڈبے نوٹوں سے بھر جائیں گے۔ پھر تمہاری شادی بھی ہو جائے گی۔ اور تم ورتموڈ جیسے کئی گاؤں خود خرید سکو گی۔

اینونا، معصوم سادہ لوح لڑکی اس کی بات پر رضامند ہو گئی اور وہ بوڑھا کھوسٹ مالک جو اُس کی آزاد زندگی کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینے پر تُلا ہوا تھا۔ ہنستا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

(۶)

اس عرصے میں اینوٹا اس قدر مشہور ہو گئی تھی۔ کہ ہر شخص اُس کا معترف تھا۔ اخباروں کے صفحات اُس کی تعریف میں سیاہ ہو رہے تھے۔ دیواروں پر اُس کی تعریف کے اشتہار چسپاں تھے۔ وہ دُور دُور کے ملکوں میں کمپنی کے ساتھ گئی۔ اُس کے سراہنے والوں کی تعداد روز بروز زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ جب وہ اسٹیج پر گاتی تو لوگ واہ واہ کے بلند نعرے لگاتے لوگوں نے اُس کو "ملکۂ موسیقی" کا خطاب دیا۔ اب وہ دیہاتی لڑکی اینوٹا نہ تھی بلکہ "ملکۂ موسیقی اینوٹا" تھی۔

اُس کی تعریف سُن کر کئی شہزادوں نے اُسے دعوتیں دیں۔ کئی شہزادیوں نے اُسے مدعو کیا۔ اور انواع و اقسام کے تحائف دے کر اپنی تعریف کی داد چاہی۔ غریب لوگوں نے پھولوں کے گلدستوں سے اپنی عقیدت ظاہر کی۔ اینوٹا کو ہوٹلوں میں ہزارہا تحائف ملے جن کے بھیجنے والوں کے ناموں سے بھی وہ واقف نہ تھی۔

اسی طرح ایک ملک سے دوسرے ملک میں اینوٹا کو لے جایا گیا اُس نے ہزاروں روپے کمائے اور خرچ کر دیئے۔ اُس کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اب وہ کتنی دولت مند ہے۔ اس عرصہ میں اینوٹا نے اپنے باپ کو ایک خط لکھا اور چند پونڈ بھی بھیجے۔ مگر گاؤں کے پادری نے جواب میں لکھا۔ کہ اُس کا باپ مر گیا ہے۔ اینوٹا کو بہت رنج ہوا۔ ---- لیکن فوراً ہی اُسے گانے کے لئے تیار کیا گیا۔ آہ۔ اُس کو گانے سے کام تھا۔ وہ سب کچھ بھول گئی تھی۔ شاید ورموڈ کو بھی۔ اب وہ تھی اور موسیقی!

(۷)

ایک رات اینوٹا اسٹیج پر کھڑی تھی۔ ہال تماشائیوں سے بھرا ہوا تھا۔ سامنے کی گیلری میں بادشاہ شہزادے اور شہزادیاں عمدہ عمدہ لباس پہنے رونق افروز تھے۔ اینوٹا نے گانا شروع کیا۔ جب وہ اپنے گیت کے مشہور اور ہر دلعزیز حصے کو گانے لگی۔ تو اُس نے اپنا سر اُٹھایا۔ اُس نے اوپر کی گیلری میں ایک آدمی کو اپنی طرف گھورتے ہوئے دیکھا۔ جو آگے کی طرف جُھکا ہوا دیکھا۔

اینوٹا کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اُس کی دل میں ورموڈ کی بھولی ہوئی یاد تازہ ہو گئی۔ کیونکہ اُس آدمی کی شکل ہوبہو ورموڈ کی سی تھی اینوٹا بار بار یہی سوچتی تھی۔ "یہ ورموڈ ہی ہے۔" جب تک، وہ گاتی رہی اُس کی آنکھیں اُس کے چہرے پر گڑی رہیں۔ وہ اُس کو پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ اُس کا چہرہ، اُس کی مسکراہٹ، اُس کی زلفوں کے خم سب ورموڈ کے سے تھے۔ "یہ ورموڈ ہی ہے"۔ اینوٹا کو یقین ہو گیا۔ اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اُس کی آواز کانپنے لگی۔ وہ بہت پریشان ہو گئی۔

یہ پریشانی اُس کو ایک مدت کے بعد نصیب ہوئی تھی۔ جب سے وہ گاؤں سے آئی تھی۔ وہ اتنی پریشان کبھی نہ ہوئی تھی۔

اینوٹا نے اُس نوجوان کو بھی اپنے رومال سے آنکھیں پُونچھتے ہوئے دیکھا۔ اینوٹا سب گانے بھول گئی۔ اُس نے پُرانی یاد کو از سرِ نو تازہ کرنے کے لئے وہی گیت جو وہ جھیل ورموڈ کے کنارے گایا کرتی تھی۔ گانا شروع کیا۔ اپنی پوری طاقت سے، پوری آواز سے، دل کے پورے احساس سے، اُس کے گانے سے تمام لوگوں کے دلوں میں ایک جوش سا پیدا ہو گیا اور سب اُس کے درد بھرے گیت کے کیف سے جھومنے لگے۔ کئی شہزادیاں آنسو بہانے لگیں۔

بادشاہ نے اپنا قیمتی ہیروں کا ہار اسٹیج پر پھینکا۔ اُس کے بعد پھولوں کی بارش ہوئی۔ اس قدر پھول برسائے گئے۔ کہ اینوٹا پھولوں میں چُھپ گئی۔ اینوٹا گاتی رہی۔ ایک مرتبہ دو مرتبہ تین مرتبہ وہی گیت گاتی رہی۔ لوگوں کا اشتیاق بڑھتا گیا۔ جب وہ گانا ختم کر کے واپس چلی گئی تو پھر تالیاں بجا بجا کر اُسے اسٹیج پر بلایا گیا۔ تقریباً چھ سات مرتبہ وہ اسٹیج پر آئی۔ جب اُسے آٹھویں مرتبہ بلایا گیا تو اینوٹا ہال سے غائب تھی۔ اس مرتبہ اسٹیج کا سیاہ پردہ نہ اُٹھا۔

اینوٹا اسٹیج سے باہر نکل کر اپنی گاڑی میں سوار ہوئی۔ اور ملازم کو ورموڈ کے بلانے کے لئے بھیجا۔ ...... کچھ عرصہ میں ورموڈ اینوٹا کے پاس آیا۔ دونوں کر خوب روئے۔ ورموڈ بھی گاڑی میں سوار ہو گیا۔

اُس نے اپنی تمام سرگزشت سنانی شروع کی۔ کہ کس طرح اینوٹا اُس سے ملے بغیر گاؤں سے رخصت ہو گئی۔ اور وہ اُس کا منتظر ہی رہا۔ لیکن جب وہ واپس نہ آئی تو وہ اُس کی تلاش میں تمام ملکوں میں سرگرداں پھرا کیا مگر کہیں بھی اُسے پا نہ سکا۔ گاؤں کے لوگ جب اخباروں میں اینوٹا کی شہرت کے متعلق کچھ پڑھتے تو بہت حسد کرتے اور کہتے کہ "ایک چمنی صاف کرنے والے کی بیٹی کیونکر اس رتبہ پر پہنچ گئی"۔

اور جب وہ کہتا کہ اینونا ضرور گاؤں آئے گی تو وہ لوگ اس کی ہنسی اُڑاتے ۔ تمام شہروں میں تلاش کے باوجود جب وہ نہ ملی ۔ تو آخر اس ملک میں پہنچنے پر معلوم ہؤا کہ کل اُس کا گانا ہے چنانچہ وہ بھی بہت مشکل سے گیلری کا ٹکٹ خریدنے میں کامیاب ہوگیا ۔ اور اپنی کھوئی ہوئی اینونا کو پالیا ۔

اینونا اُس کی باتیں غور سے سُن رہی تھی ۔ وہ اُس سے سوال پر سوال کر رہی تھی ۔ گویا پانی کا چشمہ بہا چلا جا رہا تھا ۔

اُس نے گاؤں چھوڑنے کے بعد کسی سے اپنے دل کی بات نہ کی تھی ۔ ان دنوں روپے کے سوا اور کوئی خوشی حاصل نہ ہوسکی وہ دونوں ایک موضوع سے ہٹ کر دوسرے موضوع پر باتیں کئے جا رہے تھے ۔ اینونا اپنی جھونپڑی ۔ بوڑھے کتے اور پادری کے متعلق دریافت کر رہی تھی ۔ پھر جھیل اور پرانی کشتیوں کا خیال آیا ۔

گاڑی تیزی سے جا رہی تھی اور یہ دونوں باتوں میں محو تھے ۔ یہاں تک کہ گاڑی ہوٹل کے دروازے پر رُکی ۔ اینونا اُتر کر اندر گئی اور ورتموڈ دوسرے روز ملنے کا وعدہ کرکے اُس سے رخصت ہؤا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

تمام رات اینونا کو نیند نہ آئی ۔ پرانے خیالات جن کو وہ عرصہ سے بھلا چکی تھی ۔ یکے بعد دیگرے اُس کے دماغ میں آرہے تھے ۔

اُس کو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی کٹیا میں ہے ۔ وہ اور ورتموڈ مچھلیاں پکڑنے جھیل میں جاتے ہیں ۔ ورموڈ تو کئی مچھلیاں پکڑ لیتا ہے ۔ لیکن اینونا تلاش اور کوشش کے باوجود ایک مچھلی بھی نہیں پکڑ سکتی ۔ شاید یہ بھی اینونا سے ناراض ہوں ۔ پھر سوچتی کہ کس طرح وہ ورتموڈ سے شادی کی درخواست کرے ۔ کیا اب وہ اُس کو پسند کرے گا ۔

اسی قسم کے خیالات اُس کو پریشان کر رہے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ کہ دن نکل آیا ۔ سورج اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ نمودار ہُوا ۔

اینونا لباس پہن کر اپنے ورتموڈ کا انتظار کرنے لگی ۔ ۔ ۔ ۔ دروازہ کھلا ورتموڈ کمرے میں داخل ہؤا دونوں بہت دیر تک باتیں کرتے رہے خوب ہنسے ۔ اُن کی باتیں کسی صورت بھی ختم نہ ہوتی تھیں ۔ وہ پرانے واقعات کو بار بار دُہرا رہے تھے ۔ کبھی جھیل ورتموڈ کا ذکر تھا کہ فوراً ہی کٹیا اور کشتیاں یاد آجاتی تھیں ۔

اینونا نے اپنے پرانا گیت گانا شروع کیا ۔ جو وہ جھیل پر گاتی تھی اور جس کا پہلا مصرعہ "ورتموڈ ۔ ورموڈ ۔ آؤ ۔ آ بھی جاؤ" تھا ۔

ابھی وہ اتنا ہی کہنے پائی تھی کہ اُس نے اپنا مُنہ دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا ۔ کیونکہ اُس کو معلوم ہوگیا تھا ۔ کہ اب ورتموڈ اُس سے شادی نہ کرے گا ۔ اس خیال نے اُس کو پھر پریشان کر دیا ۔

اینونا نے چاہا کہ ورتموڈ کو شہر دکھائے ۔ دونوں نے خوب سیر کی شام کے وقت ہوٹل واپس آئے تو اینونا کی میز پر کھانا لگا ہوا تھا ۔

اُس میز پر رنگا رنگ کے پھول ۔ چاندی کے گلدستوں میں نہایت خوش اسلوبی سے سجائے گئے تھے ۔

نوکر انواع و اقسام کے کھانے میز پر رکھتے جاتے تھے ۔ اینونا اور ورتموڈ کھانے میں مشغول تھے ۔ لیکن اُن کو اپنی دیہاتی زندگی کا زمانہ یاد آرہا تھا ۔ وہ جَو کی روٹی کو نہ بھول سکے ۔ وہ بار بار اُس وقت کو یاد کرتے جب دونوں روٹیوں کے بچے کھچے ٹکڑے کشتیوں میں بیٹھ کر کھاتے تھے ۔

کھانا کھانے کے بعد ورتموڈ اینونا سے وعدہ لے کر کہ وہ بہت جلد واپس گاؤں آئے گی ۔ اور اپنی بوسیدہ اور ویران جھونپڑی کو پھر آباد کرے گی ۔ اینونا سے رخصت ہؤا ۔

ورتموڈ نے گاؤں پہنچ کر تمام لوگوں سے کہا کہ اینونا بہت جلد گاؤں آنے والی ہے ۔ لوگ اُس کی اس بات پر بہت ہنسے ۔

لیکن ورتموڈ کو یقین تھا کہ اینونا ضرور آئے گی ۔ ۔ ۔ ۔ ایک شام ورتموڈ مچھلی پکانے میں محو تھا کہ جھونپڑی کا دروازہ کھلا اور اینونا بہت زرق برق لباس میں ملبوس اندر داخل ہوئی ۔ ورتموڈ بہت ہی خوش ہؤا اور اُس نے تمام لوگوں کو اُس کے آنے کی خبر دی ۔ حاسد جل بھُن کر رہ گئے ۔ اینونا نے اپنی جھونپڑی کو مرمت کرایا اور اُس میں رہنے لگی ۔

اُس نے ہفتہ بھر اپنے پیارے گاؤں کی خوب سیر کی ۔ دونو کشتی میں بیٹھ کر جھیل میں اُتر جاتے اور مچھلیاں پکڑتے ۔ بیچنے کے لئے نہیں صرف شوق کے لئے ۔ وہ دونو بہت خوش تھے ۔

اینونا سوچتی کہ وہ گاؤں کی عمدہ صاف ہوا کو چھوڑ کر کیوں اتنی مدت تک شہر میں رہی ۔ اب وہ کبھی اس جگہ سے نہ جائے گی ۔ ایک دن جب اینونا سو کر اُٹھی تو دھند چھائی ہوئی تھی ۔ اور بارش کی زیادتی سے جو تمام رات ہوتی رہی تھی گاؤں کی زمین کیچڑ ہی کیچڑ ہو رہی تھی ۔

اینونا تمام دن اپنی کھڑکی میں بیٹھی رہی ۔ اُس کا خیال تھا ۔ کہ دوسرے روز مطلع صاف ہوگا ۔ مگر دوسرے روز اُس سے بھی زیادہ بارش ہوئی ۔ جھیل لبالب بھر گئی ۔ جنگل میں پانی ہی پانی ہوگیا ۔ ہوا نہایت تندی

اور تیزی سے چلی۔ اینونا اس منظر کو دیکھ کر نہایت اُداس ہوئی۔ کیونکہ وہ تین روز سے جھونپڑی میں بند تھی۔ ورتوڈ بھی پانی کی وجہ سے اُس کے پاس نہ پہنچ سکا۔ اینونا واپس شہر جانے کے لئے تیار ہو گئی۔ اور ورتوڈ کو بتلائے بغیر بصد مشکل جھیل کو عبور کر کے دوسرے کنارے پر پہنچی۔

کمپنی کا مالک اُس کا منتظر تھا۔ وہ دونوں کمپنی کے ساتھ ساتھ ایک ملک سے دوسرے اور تیسرے میں گئے۔ اینونا گاتی رہی۔ دن مہینوں میں۔ مہینے سالوں میں تبدیل ہو گئے۔ کئی بار کونپلیں پھوٹیں اور پھر مرجھا گئیں۔ اُدھر اینونا کی شہرت بھی زمانے کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی۔

اب اینونا کی آواز خراب ہونے لگی۔ کئی ایک ڈاکٹروں کے علاج ہُوئے۔ مگر اُس کی آواز میں وہ لوچ وہ کشش۔ وہ جدت نہ رہی۔ پھر بھی وہ گاتی رہی۔ اخباروں میں اُس کی بُرائیاں لکھی گئیں۔ اُس کے گانوں کے برخلاف احتجاج کیا گیا۔ لوگوں نے اُس کی آواز کو بُرا بھلا کہا۔ مگر کمپنی کے مالک نے اُس کو شہرت دینی چاہی۔ وہ اُسے دوسرے شہروں میں لے گیا۔ لیکن اینونا کی آواز ویسی نہ بن سکی جو دیہاتی اینونا اپنے گاؤں سے لے کر آئی تھی۔

اینونا کی آمدنی کم ہوتی گئی۔ وہ اب بھی شان سے رہتی تھی۔ اُس کو یقین تھا۔ کہ وہ پھر ایک بار چمکے گی۔ پہلے کی طرح۔

اخباروں کے ایڈیٹروں نے صاف صاف لکھنا شروع کیا۔ کہ اینونا نہایت بُرا گاتی ہے پھر اُس کو اسٹیج پر لا کر کیوں روپیہ بٹورا جاتا ہے کمپنی نے اُس کو جواب دے دیا۔ جس سے اینونا کو بہت رنج ہوا۔ اُس نے تمام ہیروں کے زیورات قرض خواہوں کو دے کر اپنا پیچھا چھڑایا۔

وہ اینونا جو کبھی "ملکہ موسیقی" کے نام سے موسوم تھی۔ جس کے ایک ایک قدم پر شہزادے پھولوں کے ڈھیر لگا دیتے تھے شہزادیاں اپنے زیورات دے کر مسرت حاصل کرتی تھیں۔ اُسی اینونا کے لئے اب رہنے کو بھی کوئی جگہ نہ تھی۔ کمپنی کا ظالم۔ بدفطرت۔ لالچی مالک جو اینونا معصوم۔ سادہ لوح۔ دیہاتی اینونا کو اُس کے باپ۔ منگیتر اور گاؤں سے جُدا کر لایا تھا جس نے اُس کی راحت۔ شادمانی۔ ہنسی خوشی سب کچھ چھین لی تھی۔ اُس نے بھی اُس کو ٹھکرا دیا۔

بیکس اینونا کے پاس رہنے کی جگہ بھی نہ تھی۔ اس وقت اینونا کو اپنی کٹیا۔ گاؤں اور جھیل کا کنارا یاد آیا۔ جہاں وہ تمام دن گاتی تھی۔ جہاں کوئی اخبار اُس کے متعلق بُرا بھلا نہ لکھ سکتا تھا۔ کوئی قرض خواہ اُس کو تکلیف دے کہ اُس سے اُس کے پسندیدہ زیورات نہ چھین سکتا تھا۔ وہاں وہ کتنے آرام سے اپنی کٹیا میں زندگی بسر کر رہی تھی۔

(۸)

گرمیوں کی ایک شام تھی۔ ورتوڈ اُداس اور پریشان جھیل کے کنارے بیٹھا ہوا اینونا کی بیوفائی کا خیال کر رہا تھا۔ کہ اُس نے اُس کو کس قدر دھوکا دیا۔ اگر واپس جانا تھا تو بتا دیتی۔ وہ سوچ رہا تھا۔ اُس کے چہرے سے غم و غصہ کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔

اُس نے دُور جھیل میں سے دُھواں اُٹھتا ہوا دیکھا۔ اُس نے سوچا کوئی اجنبی راستہ بھول گیا ہے۔ وہ اُٹھ کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ کشتی تیزی سے اُس کی طرف بہے آ رہی تھی۔ ورتوڈ نظریں گاڑے ہُوئے دیکھ رہا تھا۔ کشتی نزدیک آ رہی تھی۔ "اینونا" ورتوڈ کے مُنہ سے بے ساختہ نکلا۔

اینونا کشتی میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس نے اُداس ہنسی ہنستے ہُوئے کہا۔ "ہاں ورتوڈ میں ہی ہوں۔ کیا میں اپنی کٹیا میں رہ سکتی ہُوں؟ بتاؤ رہ سکتی ہوں نا؟ تم خاموش کیوں ہو؟ بتاؤ آ جاؤں؟"

اینونا نے جلد جلد ورتوڈ سے پُوچھا۔

ورتوڈ خاموش تھا۔

اینونا پھر چلائی۔ "ورتوڈ کیا تم مجھ کو نہیں پہچانتے؟ اب میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ میں ویسی ہی مفلس اور نادار واپس آئی ہوں۔ جیسی یہاں سے گئی تھی۔" ورتوڈ ہنسا اور کہنے لگا۔ "اینونا آؤ۔ یہ گاؤں تمہارا ہے۔ اچھا ہوا جو تمہارے پاس پیسہ نہیں ہے جتنا روپیہ کم ہوگا اُتنی ہی زیادہ دیر تم یہاں رہو گی۔"

اینونا کشتی سے اُتری۔ دونوں جھیل سے روانہ ہُوئے۔

شام کے وقت جھیل کے دونوں کناروں پر دو چراغ ٹمٹما رہے تھے۔ جن کی مدھم روشنی جھیل کے پانی میں آگ کی چنگاری کی طرح روشن تھی۔ اینونا کے آنے پر لوگ بہت حیران تھے۔ کہ وہ اینونا جو دنیا میں چمک کر آئی ہے پھر یہاں کیوں آ گئی۔ . . . . . . ؟

ایک دن اینونا جھونپڑی کے کونے میں بیٹھی مچھلیاں صاف کر رہی تھی۔ ورتوڈ مچھلی کے جال مرمت کرنے میں محو تھا۔ لیکن اُس کی آنکھیں اپنی اینونا کے چہرے پر گڑی ہوئی تھیں۔

دُور ۔ ۔ ۔ جنگل میں ننھے ننھے پرندے چہچہا کر ابنونا کی واپسی پر ورموڈ کو مبارک باد دے رہے تھے۔ اینونا کو اُن کی آواز پر رشک آ رہا تھا۔

سامنے جھیل، ورموڈ کا پانی پوری آب و تاب سے بہہ رہا تھا

جھیل کے کنارے دو کشتیاں ایک رسی کے ساتھ بندھی ہوئی کسی کی منتظر تھیں۔

{ جوناس لائی
ناروجین مصنفہ }

(مس) کے۔ احمد شجاع

رباعی

سب ہو گیا کافور تحمّل نے آج
غم دور کیا ساغرِ تقریب نے آج
وہ توبہ کہ تھی سنگ سے بڑھ کر محکم
توڑا اُسے پھر جامِ بلوریں نے آج

سعید احمد اعجاز

غزل

دُور اس دنیا سے ہو کوئی جہاں میرے لئے
(اس جہاں میں تو نہیں امن و اماں میرے لئے)

اک جہاں جس میں نہ ہو فکر و تردّد کا ہجوم
اک جہاں جس میں نہ ہو شور و فغاں میرے لئے

اک جہاں جس میں نہ ہو کچھ ما و تُو کا امتیاز
اک جہاں آزاد قیدِ این و آں میرے لئے

اک جہاں جس میں نہ ہو علم و خرد کی دار و گیر
ہو نہ جس میں کاوشِ سود و زیاں میرے لئے

اک جہاں جس میں نہ ہو بغض و عداوت کا وجود
اور محبت ہی محبت ہو جہاں میرے لئے

اک جہاں جس میں مجھے امن و فراغت ہو نصیب
زندگی جس میں نہ ہو بارِ گراں میرے لئے

اک جہاں جس میں مرا قول و عمل ہو معتبر
ہر قدم پر ہوں نہ جس میں امتحاں میرے لئے

بے ریائی ہو جہاں کے رہنے والوں کا شعار
اور محبت میں صداقت ہو جہاں میرے لئے

ظاہر و باطن جہاں کے بسنے والوں کا ہو ایک
ہوں نہ خنجر آستینوں میں نہاں میرے لئے

زندگانی ہو جہاں اک خواب شیریں کے مثال
ہر نفس جس کا ہو عمرِ جاوداں میرے لئے

جس کا ہر ذرہ ہو اک دنیائے ناپیدا کنار
جس کا ہر قطرہ ہو بحرِ بے کراں میرے لئے

دُور اس دنیا سے ہو ایسا جہاں میرے لئے
(اس جہاں میں تو نہیں امن و اماں میرے لئے)

جلیل قدوائی

اہتمام

فصلِ گُل آئی ہوا عنبر بداماں ہو گئی
سرزمیں ہر دشت کی رشکِ گلستاں ہو گئی
سبزہ زاروں میں بسنتی کھیت لہرانے لگے
کوئلیں کوکیں پپیہے پی کہاں گانے لگے
اے سکھی سُنتی ہوں میں وہ مہ جبیں آج آئے گا
میرے طالع کو مری تقدیر کو چمکائے گا
شام سے گھر والے ظاہر داریوں میں محو ہیں
اُس کے استقبال کی تیاریوں میں محو ہیں

بڑھ رہی ہیں رفتہ رفتہ رات کی تاریکیاں
اور تاروں سے مزیّن ہو چکا ہے آسماں
وقت ہے اب مَیں بھی کمرے میں دِیا روشن کروں
شوق کی تنویر سے ظلمت کدہ روشن کروں
گو امیدِ التفات اُس سے مجھے اتنی نہیں
لیکن اس پر بھی تمنّا ہے وہ آجائے کہیں
وقت سے کچھ دیر پہلے کر کے تزئینِ جمال
اور سجا کر جھلملاتے موتیوں سے بال بال
معبدِ اُمید کی تعمیر کا ساماں کروں
اپنے پی کے قلب کی تسخیر کا ساماں کروں

تاجور سامری

عید کا تحفہ

میری شادی کو ابھی ایک ہفتہ بھی نہ گذرا تھا کہ مجھے یک ماہہ فوجی ٹریننگ کے لئے پونا جانا پڑا۔ میں تو جانے کا نام بھی نہ لیتا تھا اور میری بیگم بھی اس کے خلاف تھیں۔ مگر کیا کرتا۔ گھر والے مجبور کر رہے تھے۔ مجھے تو قید ہو جانا تک منظور تھا۔ مگر بیگم کی جدائی منظور نہ تھی۔ بیگم بھی چاہتی تھیں کہ میرے نہ جانے کی کوئی صورت نکل آئے۔ مگر گھر والوں کو کیا کہہ سکتے تھے۔ اگر کچھ کہتے تو خدا جانے کیا کیا طعنے سننے پڑتے۔ سب کہتے "توبہ۔ اتنی بھی زن مریدی کیا! کہ سرکاری کام کی بھی کوئی پروا نہیں"۔ میں یہ طعنے بھی برداشت کرنے کو تیار تھا۔ مگر بیگم بیچاری کا خیال تھا۔ اسے لوگ ہدف ملامت بناتے اور کہتے۔

"نگوڑی نے آتے ہی اچھے بھلے آدمی کو ہاتھوں پہ ڈال لیا ہے۔ اب یہ نہ دنیا کا رہے گا۔ نہ دین کا۔ اے توبہ۔ ایک مہینہ کوئی کالے پانی کی قید تھوڑے ہی ہے۔ کہ مرے جا رہے ہیں"۔ غرض معلوم نہیں کیا کیا کچھ سننا پڑتا۔

اس کے علاوہ ایک اور خیال بھی تھا۔ وہ یہ کہ میری شادی پر گھر والوں کا ڈھائی تین سو روپیہ خرچ ہو گیا تھا اور یہ دو تین سو روپیہ خدا کے فضل سے آیا تھا۔ لالہ روپ لعل سنار کے گھر سے۔ جنہوں نے "ٹکا پیسہ" فی روپیہ ماہوار سود لکھوا لیا تھا۔ اگر میں ٹھیک وقت پر ٹریننگ پر جا کر وہاں سے وہ اڑھائی سو روپیہ لے آؤں تو لالہ روپ لعل کے بہت سے "بیہودہ" ارادوں پر پانی پھرتا تھا اور اگر ایک دو مہینے بھی گذرتے ہیں تو پھر تین سو کے پانچ سو تو وہ پڑے ہیں۔

خیر ان اور ان کے علاوہ اور بہت سی مجبوریوں کے تحت مجھے پونا جانا ہی پڑا۔ پونا میں مجھے ایک مہینہ رہنا تھا اور عید میں ابھی ایک مہینہ اور دس دن باقی تھے۔ چلنے سے پہلے بیگم صاحبہ نے رخصت کرتے وقت مجھے تنہائی میں تاکید کی تھی بلکہ سچ پوچھئے تو کان کھینچ دیئے تھے کہ "عید پر ضرور واپس آ جانا۔ میں تمہیں عید پر ایک تحفہ دوں گی"۔

روانہ ہونے کو تو میں گھر سے روانہ ہو آیا۔ مگر میرا حال یا میں جانتا ہوں یا میرا دل۔ آپ نہ جانتے ہیں نہ جان سکتے ہیں۔ ایک مہینہ پہاڑ بن کر سامنے آ گیا۔ خدا ہی جانے کہ یہ مہینہ کتنے سالوں کے برابر تھا۔ ختم ہونے ہی میں نہ آتا تھا۔ میں شب و روز بیگم صاحبہ کے خیال میں محو رہتا اور نماز پڑھ پڑھ کر یہی دعا مانگتا کہ الٰہی مہینہ جلد ختم ہو۔

قیامت کی گھڑیاں بن کر رمضان کی پچیسویں یا چھبیسویں کو کورس کا مہینہ ختم ہو گیا۔ عید میں پانچ یا چار دن باقی تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ وہ حضرات جنہوں نے خدا کے فضل سے روزہ تو ایک بھی نہیں رکھا۔ مگر سحری اور افطاری کے ثواب میں باقاعدہ شامل ہوتے رہے ہیں۔ انتیسویں ہی کو عید کا چاند نکال ماریں گے۔ اسی لئے جلد از جلد گھر روانہ ہو جانا چاہئے۔ چنانچہ فوجی دفتر سے اجازت ملتے ہی میں سب سے پہلی گاڑی پر گھر کو روانہ ہو گیا۔

عید کی نسبت مجھے "بیگم صاحبہ" کے عید کے تحفہ کا بہت انتظار تھا۔ میں سارا مہینہ اسی کشمکش میں رہا۔ کہ بھلا بیگم صاحبہ مجھے کیا تحفہ دیں گی؟ شاید اپنا "دل" نکال کر دے دیں۔ مگر وہ تو پہلے ہی خاکسار کی ملکیت ہو چکا ہے۔ نا معلوم کیا شرارت سوچ رکھی ہو! مجھے اپنی بیگم کی شوخی اور شرارت کا بچپن سے ہی تجربہ تھا۔ زوجیت کے تعلقات تو ابھی شروع ہی ہوئے تھے۔ مگر چونکہ وہ بھی اسی گاؤں میں پروان چڑھی تھیں۔ جہاں میں اپنی زندگی کے دن پورے کر رہا تھا۔ اس لئے علیک سلیک پرانی تھی۔

خیر تو صاحب سارا مہینہ میں اسی کشمکش میں رہا۔ میرا جی چاہتا تھا کہ بیگم صاحبہ کے تحفہ کے جواب میں میں بھی ایک شاندار تحفہ پیش کروں ایسا کہ بیگم صاحبہ دیکھ کر دنگ رہ جائیں۔ چنانچہ پونا کے یک ماہہ قیام کے دوران میں میں کئی بار بازار میں مارا مارا پھرتا رہا۔ تاکہ بیگم صاحبہ کے لئے کوئی تحفہ خرید سکوں۔ تحفے پسند تو بہت آئے۔ مگر خریدا کوئی بھی نہ گیا بعض تو ایسے تھے جو میری بیگم صاحبہ کے قابل نہ تھے اور بعض ایسے کہ اُن کے قابل "وہ" نہ تھیں بعض کو خریدنے کے لئے مجھے اپنی آمدن کے علاوہ

تن کے کپڑے بھی بیچنے پڑتے تھے۔

پھر ایک اور خیال بھی تھا۔ اگر میں بیگم صاحبہ کے لئے تحفہ خریدنے پر کچھ زیادہ رقم خرچ کر دیتا تو گھر والے کہتے "یہ لونڈا تو بالکل ہاتھ سے نکل گیا۔ ارے دیکھو تو اسے ذرا خیال نہ آیا کہ لالہ روپ لال کا قرضہ چڑھ رہا ہے۔ آخر وہ بھی تو ان ہی کی شادی پر چڑھا تھا۔ وہ ادا ہو جاتا تو اچھا تھا یا یہ کہ بیگم صاحبہ کے لئے تحفہ آ گیا! آخر بے چارہ کیا کرے۔ مجبور ہے تحفہ نہ لاتا تو گذر کیسے ہوتی۔"

سارا مہینہ انہی خیالات کی کشمکش میں گذرا اور میں پونا سے کوئی تحفہ نہ خرید سکا۔ ارادہ تھا کہ چونکہ دہلی میں گاڑی بدلنی پڑتی ہے اور وہاں آٹھ دس گھنٹے وقت مل جاتا ہے۔ اس لئے وہاں سے کوئی اچھی اور موزوں چیز خرید لی جائے گی۔ چنانچہ پونا سے میل گاڑی پر سوار ہو کر میں روانہ ہو آیا۔ دوسرے لوگوں کو تو شکایت تھی کہ ٹرین بہت تیز چل رہی ہے اور خطرہ ہے کہ کہیں الٹ نہ جائے مگر مجھے یہ شکایت تھی کہ اڑ کر ابھی کیوں نہیں پہنچ جاتی! اور پھر جب وہ بار بار سٹیشنوں پر کھڑی ہو جاتی تو میرا جی چاہتا کہ اسے کچا ہی چبا جاؤں۔ کم بخت سیدھی جا کر ہماری بیگم صاحبہ کے حضور کیوں نہیں ٹھیرتی! مگر میری اور دوسرے مسافروں کی شکایتوں کا کچھ اثر نہ ہوا اور گاڑی اپنے وقت پر ہی دہلی پہنچی۔

دہلی پہنچتے ہی میں نے سامان سٹیشن پر جمع کرا دیا اور بھاگم بھاگ بازار پہنچا تاکہ بیگم صاحبہ کے لئے دیکھ بھال کر کوئی تحفہ خرید سکوں۔ گاڑی اندازاً بارہ بجے دہلی پہنچی تھی اور شام کو آٹھ بجے پنجاب اکسپریس کو روانہ ہونا تھا۔ مجھے دہلی میں سب سے ضروری کام تو بیگم صاحبہ کے لئے تحفہ خریدنا تھا۔ اور اگر اس فریضہ سے فارغ ہو جاؤں تو ارادہ تھا کہ تاریخی عمارات کو دیکھ لوں۔

میں سارا دن بازار میں مارا مارا پھرتا رہا۔ ساڑھیاں۔ بالوں میں لگانے کے جاپانی۔ ولائتی اور سنہری ہر قسم کے کلپ گلوبند۔ بٹن۔ رومال۔ موزے انگشتریاں۔ بٹوے غرض کوئی چیز نہ تھی جو دیکھی نہ ہو بعض چیزیں پسند آئیں۔ مثلاً ساڑھیاں۔ مگر ساڑھیاں پہننے کا ہمارے دیہات میں رواج نہیں۔ بہت سوچ بچار کے بعد فیصلہ ہوا کہ انگشتری خریدی جائے۔ چنانچہ ایک سنار سے سودا کیا گیا۔ بے شمار نمونے دیکھنے کے بعد ایک انگشتری پسند آئی جو سنہری تھی اور اس پر نہایت عمدہ نگینہ جڑا تھا۔ ۳۵ روپے قیمت ٹھہری مگر میں نے محض تسلی کرنے کے لئے دکاندار سے کہا کہ میں چند اور دکانیں بھی دیکھ لوں اگر ۳۵ روپے ہیں اور ایسی انگشتری خریدی تو آپ ہی سے خریدوں گا۔

بہت دیر تک تو میں دکانوں پر تسلی کرتا پھرا۔ اور آخر میں یہی فیصلہ کیا کہ وہی انگشتری خریدی جائے جس کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ چونکہ وہ دکان سٹیشن کے قریب ہی تھی۔ اس لئے میں واپسی پر خرید لینے کے خیال سے تاریخی عمارات دیکھنے چلا گیا۔ نئی دہلی بھی دیکھی اور چھ ساڑھے چھ بجے کے قریب چاندنی چوک واپس لوٹ آیا۔

مجھے سفر میں صبح کھانا نہیں ملا۔ اس لئے روزہ ہی "کھا" لیا تھا۔ پھر بھی دن بھر احترام رمضان کے خیال سے منہ باندھے رہا۔ چونکہ آٹھ بجے پھر ٹرین پر سوار ہو جانا تھا۔ اسی لئے ایک مسلم ہوٹل میں گھس گیا۔ جہاں عین رمضان شریف میں کئی اللہ کے شیر بیٹھے ڈکار رہے تھے۔ ہوٹل کے مالکوں اور منیجروں کو دیکھئے تو ان کی لمبی لمبی ڈاڑھیاں اور نورانی چہرے قابل رشک تھے مگر کرتوت دیکھئے تو یہ کہ خود بھی پانوں کی جگالی فرما رہے ہیں اور مجھ جیسے اور کئی "خوئے بد را بہانہ بسیار" کے مصداق بزرگوں کو کھانا کھلا رہے تھے۔ میں بھی نہایت تمکنت کے ساتھ میز پر جا بیٹھا اور کھانا کھانے میں مصروف ہو گیا۔

ابھی انگشتری خریدنا باقی تھا مگر دکان قریب ہی تھی۔ اس لئے مجھے اطمینان تھا۔ کہ چلتے چلتے لے لوں گا۔ پسند تو کر ہی چکا ہوں۔ یہ میں نے پہلے ہی پوچھ لیا تھا کہ دکان رات کے نو بجے تک کھلی رہتی ہے۔ کھانا کھا کر میں نے چائے منگائی تاکہ کھانے کو معدے کی تہ تک پہنچا دوں۔ ابھی میں چائے پی ہی رہا تھا کہ قریب کی مسجد سے اذان کی آواز آئی۔ میری شامت جو آئی تو میں نے نماز پڑھ لینے کا ارادہ کر لیا۔ دراصل میرا مطلب یہ تھا کہ نماز سے فارغ ہو کر بدرگاہ قاضی الحاجات دعا مانگ لوں گا کہ میری بیوی کو میرا تحفہ پسند آ جائے۔

مسجد میں نمازیوں کی کثرت دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ میرے خیال میں تو مسجدیں مسلمانوں کی روائتی شان برقرار رکھنے کے لئے ہوتی ہیں ورنہ نمازیوں کی طرف سے عام طور پر "مرثیہ خوان" ہی نظر آتی ہیں۔ کچھ وقت تو نمازیوں کا روزہ افطار کرنے میں لگا۔ اس سے فارغ ہو کر نماز شروع ہوئی۔

میں تین رکعت نماز فرض ادا کرنے کے لئے امام صاحب کے پیچھے "حاضر" کہہ کر کھڑا تو ہو گیا۔ مگر میرے دل میں وقت کی قلت اور انگشتری خریدنے کا خیال جما ہوا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ نماز جلد جلد ختم ہو اور میں بھاگ کر دکان

پہنچوں۔ انگشتری خریدوں اور سٹیشن پر پہنچ کر وطن عزیز اور "دیارِ بیگم صاحبہ" کی طرف روانہ ہو جاؤں۔

ایک طویل خاموشی کے بعد مولوی صاحب نے قرأت شروع کی اور نہایت مولویانہ انداز میں سورہ فاتحہ کی ابتدا کی۔ مجھے چونکہ بہت جلدی تھی۔ اس لئے مولوی صاحب کی سست رفتاری مجھے پسند نہ آئی۔ سورہ فاتحہ ختم ہوئی تو مولوی صاحب نے سورہ واقعہ کو ابتدا سے پڑھنا شروع کیا۔ میں گھبرا سا گیا۔ مولوی صاحب شاید عید پر اپنے کارنامے کو زیادہ شان سے پیش کرنے کی غرض سے مغرب کی نماز میں سورہ واقعہ جیسی لمبی سورتوں کی تلاوت ضروری سمجھتے تھے۔ مگر میں کیا کر سکتا تھا؟ لاچار و مجبور کھڑا رہا۔ جی تو یہی چاہتا تھا کہ صفوں کو چیرتا ہوا آگے بڑھوں۔ اور مولوی صاحب سے مؤدبانہ عرض کروں کہ حضرت نماز میں رکوع بھی ہوتا ہے مگر ساتھ کے مسلمان بھائیوں کے مکوں اور گھونسوں کا رعب یہ ہمت نہ پڑنے دیتا تھا۔

نماز میں میرا خاک بھی دھیان نہ تھا۔ اسی کشمکش میں مبتلا تھا کہ مولوی صاحب نے سورۂ واقعہ ختم کرکے تکبیر کہی اور رکوع میں جھک گئے۔ رکوع بھی طولِ محشر سے کم نہ ہوا۔ رکوع سے فارغ ہوئے تو قیام میں ستون بن کر ڈٹ گئے۔ یہاں تک کہ میں نے تو یقین کر لیا کہ سو گئے ہیں۔

اس سے آگے سجدہ تھا اور سجدہ کی طوالت کا خیال مجھے کھائے جا رہا تھا۔ ہوا بھی وہی کہ جب مولوی صاحب سجدے میں گئے تو میں نے اور غالباً سب دوسرے مقتدیوں نے بھی یقین کر لیا کہ اب مولوی صاحب صور اسرافیل سے قبل سر نہ اٹھائیں گے۔

حالات کے پیش نظر مجھے نماز ختم ہوتی دکھائی نہ دیتی تھی۔ لوگ تو سجدے میں تسبیحیں پڑھ رہے تھے اور میں دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ کل عید ہے۔ مجھے ضرور گھر پہنچ جانا چاہئے۔ اگر میں گاڑی سے رہ گیا تو گھر نہ پہنچ سکوں گا۔ تو پھر اے خدا! میرا کیا حال ہوگا؟ میری بیگم بے چاری کیا کرے گی؟ اے خدا تو مجھ پر رحم فرما"

مولوی صاحب سجدہ میں تھے۔ میں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا اور امام صاحب کو مقتدیوں سمیت سجدہ میں ہی چھوڑ کر بھاگ جانا مناسب خیال کیا۔ چنانچہ یہ خیال آتے ہی میں نے ہمت کرکے سر اٹھایا اور ادھر ادھر دیکھ کر راہِ فرار تلاش کی۔ مگر وہ تنگ نمازیوں کی صفیں تھیں اور ان میں سے بھاگ نکلنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ دل کی بہت ہمت بندھاتی بیگم صاحبہ کی محبت کے واسطے دیئے۔ مگر ہمت نہ پڑی اور ناچار پھر سر بسجود ہو گیا۔

خدا خدا کرکے نماز ختم ہوئی اور میں نماز سنت ادا کئے بغیر بھاگ پڑا۔ صفوں پر سے کودتا پھاندتا باہر آیا تو معلوم ہوا کہ کوئی ذات شریف جوتا نہایت "شرافت" اور "احتیاط" سے اڑا لے گئے۔ جی چاہا کہ امام صاحب اور موذن کو بلا کر جوتے کا مطالبہ کروں۔ مگر ایک تو وقت کم تھا دوسرے سامنے دیوار پر لکھا تھا "اپنے جوتے سنبھال کر رکھئے"۔ یہ موزوں مصرعہ "طبع آزمائی اور احتیاط" کے لئے دیوار پر لکھ دینے کے بعد مولوی صاحب اور موذن صاحب پر کوئی الزام نہ آ سکتا تھا۔ اس لئے میں ہندوستانی مسلمانوں کی اس فرض شناسی کو دعائیں دیتا ہوا باہر نکل آیا ایک تانگہ کرایہ پر لیا۔ پہلے ایک دکان سے جوتا خریدا۔ پھر انگشتری خریدنے کے لئے سنار کی دکان پر پہنچا۔ سنار نے دوپہر کو میرے سامنے انگشتری ایک ڈبے میں محفوظ کر دی تھی میں نے ۲۵ روپے دیئے۔ سنار نے انگشتری دکھلاتے ہوئے وہ ڈبہ میرے حوالے کیا۔ میں نے تانگے پر بیٹھ کر تانگے والے سے کہا کہ "اڑ کر سٹیشن پر پہنچو۔ گاڑی چلنے میں چند منٹ باقی ہیں"

سٹیشن پر پہنچ کر سامان لینے گاڑیبان اور قلیوں سے جھک جھک کرنے میں اتنا وقت لگ گیا کہ ادھر میں نے گاڑی پر قدم رکھا۔ ادھر گاڑی چھوٹ گئی۔ میں نے انگشتری کو "متاعِ گراں مایہ" سمجھ کر سینے سے لگا رکھا تھا اور دل ہی دل میں مسرور ہو رہا تھا کہ بیگم اس انگشتری کو دیکھ کر کس قدر مسرور ہوں گی؟ ان کا تحفہ مجھے عزیز تو بہت ہوگا۔ مگر وہ بیچاری اس کا مقابلہ کیا کر سکیں گی؟ اسی دھن میں محو میں نے چودہ گھنٹے ریل کا سفر کیا اور عین عید کے دن قریباً بارہ بجے اپنے گاؤں میں وارد ہوا۔

گاؤں کے لوگ اور کنبے کے عزیز میرا انتظار کر رہے تھے بیگم صاحبہ تو میرے اس وقت تک نہ آنے کے سبب سے مایوس ہو کر مرجھائی جا رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی پھول کی طرح کھل گئیں۔ مگر جب ان کو معلوم ہوا کہ میں ان کے لئے پچاس روپے خرچ کرکے انگشتری عید کے تحفہ کے طور پر لایا ہوں (یہ پندرہ روپے میں نے انگشتری کی شان کو بڑھانے کے لئے خود اضافہ فرما یا تھا) تو وہ کچھ جھینپ سی گئیں۔ کیونکہ اس بے چاری نے بیس پچیس روز کی محنت سے مجھے تحفہ دینے کے لئے ایک اونی گلوبند تیار کیا تھا۔ جو تھا تو بہت خوب صورت مگر اس بے چارے کی اس تحفہ

کے سامنے کیا حقیقت تھی۔

میں نے جلد جلد غسل کیا کپڑے بدلے۔ اپنے تمام دوستوں اور عزیزوں کو بتایا کہ میں بیگم صاحبہ کے لئے سنہری اور سپیشل ولایت کی بنی ہوئی انگشتری لایا ہوں۔ بیگم صاحبہ بھی پھولی نہ سماتی تھیں۔ اپنی سہیلیوں کے سامنے پنجوں کے بل چلتی اور کسی سے آنکھ نہ ملاتی تھیں۔ کنبے کی بڑی بوڑھیاں انگشتری دیکھ دیکھ کر قربان ہوئی جا رہی تھیں اور بنانے والے کو داد دے رہی تھیں۔ میرے دوست میری پسند اور میرے انتخاب کو سراہ رہے تھے۔ میں مسرت وشادمانی کے دریا میں غرق تھا۔ بیگم کی طرف جو نظر اٹھاتا تھا تو اگرچہ وہ پیار محبت سے بھری ہوتی تھی۔ مگر اس کا انداز فاتحانہ اور مفتخرانہ تھا۔

ابھی ہم بیٹھے ہی تھے کہ لالہ روپ لال صاحب تشریف لے آئے۔ سب نے بڑھ کر ان کا استقبال کیا۔ ہمارے ہاں دستور ہے کہ قرض خواہ ایسے موقعوں پر کچھ نذر نیاز "قبول فرمانے" آجاتے ہیں۔ گو یہ نذر نیاز کسی حساب کتاب میں درج نہیں ہوتی۔ بلکہ محض قرضخواہ کی تشریف آوری کا صدقہ ہوتی ہے تاہم قرض وار دیتے ہیں۔ اس لئے کہ دینے پر مجبور رہیں۔

لالہ روپ لال صاحب آکر بیٹھے تو سب نے ان سے میری لائی ہوئی انگشتری کا ذکر کیا اور بڑھ چڑھ کر اس کی تعریفیں کیں۔ لالہ روپ لال نے نظریں میری طرف اٹھائیں تو میں نے اپنی کٹی ہوئی مونچھوں کو تاؤ دینا شروع کر دیا۔ انگشتری ابھی تک میرے ہی پاس تھی۔ کیونکہ سب لوگوں کے نزدیک یہ گراں بہا تحفہ بیگم صاحبہ تک پہنچانے کا حق مجھے ہی پہنچتا تھا اور وہ بھی تنہائی میں۔ جو اس وقت تک میسر نہ ہو سکی تھی۔

میں نے بڑے ناز و انداز سے ہاتھ جیب میں ڈالا اور انگشتری لالہ روپ لال جی کو دکھائی۔ وہ دیکھ کر پہلے تو بہت خوش ہوئے اور پھر کچھ ناک بھوں سکیڑنے لگے۔ ذرا دیر دیکھ کر اپنے تھیلے میں ہاتھ ڈالا۔ کسوٹی نکالی انگشتری کو ایک دو جگہ سے کسوٹی پر رگڑا۔ کچھ غور سے دیکھا اور کہنے لگے بابو جی یہ کتنے کو آئی؟

میں نے کہا "جی پچاس روپے کو"؟

"پچاس روپے کو؟ سچ سچ"؟

میں نے کہا۔ جی ہاں! سچ سچ نہیں تو کیا جھوٹ!

وہ کہنے لگے۔ "تو بابو جی معاف فرمائیے۔ اگر یہ پچاس روپے کو آئی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو لوٹ لیا گیا ہے"۔

سب لوگ جو مجھ سے ملنے آئے ہوئے تھے۔ سن کر حیران رہ گئے میں نے کہا۔ "لالہ جی۔ آپ کیا فرما رہے ہیں۔ آپ ذرا غور تو فرمائیے"۔

میری بیگم سامنے کھڑی تھیں۔ انہوں نے بھی میری تائید کرتے ہوئے اپنی لچکدار گردن کو دائیں طرف خمیدہ کر دیا۔

لالہ جی نے کہا۔ "تو پھر آپ ذرا مہربانی کر کے آگ لے آئیے۔ میں ذرا اس کا امتحان کئے لیتا ہوں"۔

میں اٹھا۔ دوسرے مکان میں اماں جان چولھے کے پاس بیٹھی بچوں کو کھلا پلا رہی تھیں۔ انہوں نے ایک برتن میں مجھے آگ دی اور میں لالہ جی کے پاس فوراً لے آیا۔

لالہ جی نے آگ اپنے سامنے رکھ لی اور کہنے لگے۔ "جب آپ لوگ ہم سے زیور بنواتے ہیں تو کہتے ہیں کہ لوٹ لئے گئے۔ کچھ پلے نہیں پڑنے دیا"۔ مگر میں آپ کو بتا دوں کہ یہ انگوٹھی زیادہ سے زیادہ روپے ڈیڑھ روپے کی ہے"۔ یہ کہہ کر انہوں نے انگشتری کو آگ میں ڈال دیا۔

تھوڑی دیر انگشتری آگ میں رہی۔ لالہ جی نے اسے نکال کر پانی سے صاف کیا اور جب ہمیں دکھائی تو اس کے اوپر کا سنہرا رنگ اتر چکا تھا اور اندر سے کوئی کالی سیاہ دھات نکل آئی تھی۔ یہ دیکھ کر مجھ پر تو گھڑوں پانی پڑ گیا۔ میں نے نہیں دیکھا کہ میری بیگم کس حال میں تھیں۔ کیونکہ اس کے بعد میری نظریں اوپر نہ اٹھ سکی تھیں۔

آہستہ آہستہ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ میں مکان میں تنہا رہ گیا ہوں۔ تمام لوگ اٹھ اٹھ کر چلے گئے ہیں۔ میں سر جھکائے اپنی عید اور عید کے انجام پر غور کر رہا تھا کہ اتنے میں کھٹ کھٹ کی آواز آئی۔ میں نے نہیں دیکھا یا نہ دیکھ سکا کہ کون ہے؟ جب وہ نزدیک آئی تو پیروں کو دیکھ کر معلوم ہوا کہ میری چھوٹی سالی ہے۔ اس نے آہستہ سے بیگم صاحبہ کا تیار کیا ہوا گلوبند میری گردن میں ڈال دیا اور کہنے لگی۔ "بھائی جان! آپا نے عید کا تحفہ بھیجا ہے اور عید مبارک کہتی ہیں"۔

محمد فاضل

تجلّیات

(۱)

بس کہ پابندِ محبت دلِ خود کام ہوا — موردِ رنج و محن، خوگرِ آلام ہوا

حسنِ بے تابِ محبت کی تجلّی کا وفور — دیکھنے کو جو مجھے جلوہ گرِ بام ہوا

ہائے اُس شوخ کی شفقت بھری آنکھوں کا سرور — جن سے سرمستِ محبت دلِ ناکام ہوا

ہائے اُس زلفِ پریشاں کا وہ کیفِ موفور — جس کا ہر حلقہ مرے دل کے لئے دام ہوا

دلِ آوارہ کہ تھا قیدِ محبت سے نفور — آخرِ کار گرفتار ہوا، رام ہوا

دل نہ دینے پہ جو تھا اکبرِ سرکش مغرور
آخر اُس شوخ کا اک بندۂ بے دام ہوا

(۲)

ہو کے مجبور کوئی مائلِ اکرام ہوا — شوقِ گستاخ سے یہ آج عجب کام ہوا

آرزو کے لئے کچھ ناز کا ساماں نہ رہا — جو کرم مجھ سے کہ مخصوص تھا اب عام ہوا

عمر بھر خدمتِ ساقی میں رہا محوِ نیاز — جب کہیں بادہ پرستی میں مرا نام ہوا

آگ سے خاک بنا، خاک سے اکسیر بنا — دلِ بربادِ محبت کا یہ انجام ہوا

دلِ مجبورِ محبت کی بہانہ جوئی — جس جگہ کوئی گیا اس کو وہیں کام ہوا

اب وہ کہتے ہیں محبت کو تری آگ لگے — ہم کو بدنام کیا آپ بھی بدنام ہوا

کیوں نہ مقبولِ جہاں میرا سخن ہو اکبر
شعر اُس وقت کہا میں نے جب الہام ہوا

جلال الدین اکبر

شامِ سرما

خاتمے کے قریب آیا دن فصلِ سرما کا مختصر سا دن
دھوپ سے تھا مسرت افزا دن اب ہے افسردگی سراپا دن
جس کو کہتے تھے مہرِ عالمتاب
شامِ سرما میں ہوگیا کمتاب

نظر آتی ہے ہر کرن بے جاں شب سرما کے خوف سے لرزاں
گرم رَو ہے یہ نیّرِ تاباں کہ مسافر ہے کوئی بے ساماں
دامنِ کوہسار پر ہے نظر
مامنِ سازگار پر ہے نظر!

پہنچے منزل پہ راہ رو کب کے گھونسلوں میں طیور جا دبکے
کہیں ساماں ہیں راحتِ شب کے کہیں شکوے ہیں نحسِ کوکب کے
بیکسی آہ! اور لمبی رات
بن کے آئی ہے پیکرِ آفات!

دشت و صحرا و کوہسار خموش موجِ دریا و رُود بار خموش
باغ میں مُرغِ نغمہ بار خموش شہر میں اہلِ کاروبار خموش
چل رہی ہے ہوا، مگر چپ چاپ
کانپتی ہے فضا، مگر چپ چاپ!

تکیے خالی ہوئے فقیروں کے ہوئے رخصت مرید پیروں کے
گھر ہیں عشرت کدے امیروں کے رہزنِ ہوش راہ گیروں کے
ہیں غریبوں کے آہ! کاشانے
بے چراغ اور فسردہ غمخانے

مخدوم

ننھّی

ایک نامعلوم خوف اس بچی کے دل میں اپنے باپ کی طرف سے موجود تھا۔ صبح دفتر جاتے وقت وہ عموماً اسے گود میں اُٹھا کر پیار کر لیا کرتے اور وہ اپنی معصومانہ آواز میں جواب دیتی۔ "ابا سلام!" اس کو کس قدر سکون میسر ہوتا تھا جب وہ گاڑی کی ناگوار آواز کو صبح کے خاموش سناٹے میں ڈوبتا ہوا دیکھتی تھی۔

شام کو اُن کی واپسی پر ابا کی آواز ہال میں سے سُنائی دیتی "میری چائے یہیں دے جاؤ . . . . اخبار ابھی تک نہیں آیا؟ ملازموں نے اپنے پاس رکھ لیا ہوگا۔ اماں۔ دیکھنا میرا اخبار وہاں ہے کہ نہیں —— اور میرے سلیپر تو ذرا دے دو۔"

"کینزیا" اماں آواز دیتیں۔ "اچھی بیٹی کی طرح آؤ اور اپنے ابا کے جوتے اُتار دو۔" بچی آہستہ آہستہ دیوار کا ایک ہاتھ سے سہارے کر اُترتی اور انتہائی خاموشی کے ساتھ ہال سے نکل کر ابا کے کمرے کا دروازہ کھولتی تھی۔

اُس وقت وہ عینک لگائے کسی کتاب کے مطالعہ میں مصروف ہوتے اور اپنی نگاہیں اس طرح بلند کرتے۔ کہ معصوم بچی ڈر جاتی۔

"کینزیا۔ لو۔ میرے جوتے اُتار دو اور باہر لے جاؤ۔ آج اچھی بچی تو بنی ہیں نہ؟"

"یہ مجھے ن۔ ن۔ نہیں معلوم ابا!"

"تم کو ن۔ ن نہیں معلوم؟ اگر تم اتنا ہکلاؤ گی تو تمہیں ڈاکٹر کو دکھانا پڑے گا۔"

جب وہ کسی اور سے باتیں کرتی تو ہکلاتی نہ تھی۔ اُس نے اپنی اس دیرینہ عادت پر بہت کچھ قابو حاصل کر لیا تھا۔ مگر ابا کے سامنے اُس کے مُنہ سے [illegible] رُک رُک کر الفاظ نکلتے تھے۔ کیونکہ وہ اس کوشش میں رہتی کہ کسی طرح اپنے کلمات کو خوبی سے ادا کرے۔

"کیوں۔ کیا بات ہے؟ اتنی پریشان کیوں ہو؟ اماں تم اس بچی کو تعلیم دو کہ اپنے کو اس طرح ظاہر نہ کرے۔ گویا خودکشی کرنے کا ارادہ کر رہی ہے . . . . کینزیا۔ چائے کی پیالی میز پر رکھ دو —— دیکھو سنبھال کے۔ کہیں گر نہ پڑے۔ تمہارا ہاتھ تو ایسے کانپتا ہے جیسے کسی بوڑھی عورت کا اور آئندہ سے اپنا رُومال جیب میں رکھو۔ ہر وقت آستین میں لٹکا رہتا ہے۔"

"اچ۔ چ۔ اچھا۔ ابا۔"

اتوار کے دن صبح کو گرجے میں وہ ان کے نزدیک دوزانو ہو کر بیٹھتی۔ اور جب ابا بلند آواز سے دعا مانگتے تو وہ سوچا کرتی کہ خدا ان کی آواز ضرور سُن لیتا ہوگا۔ اور دوپہر کو دادی اماں اسے نئے نئے کپڑے پہنا کر نیچے بھیج دیتی تھیں۔ کہ جا کر ابا اور اماں سے باتیں کر لے۔ لیکن وہ ہمیشہ اماں کو کوئی نہ کوئی رسالہ پڑھتے دیکھتی۔ اور ابا کوچ پر لیٹے رومال چہرے پر رکھے ایک گدگدا تکیہ دونوں ٹانگوں میں دبائے غافل پڑے سوتے ہوتے۔

وہ اُن کے نزدیک جا کر بیٹھ جاتی تھی۔ اور غور سے تکتی رہتی یہاں تک کہ ابا بیدار ہو جاتے اور پیر پھیلا کر وقت دریافت کرتے۔ —— اور پھر اس کی طرف مخاطب ہوتے تھے۔

"ایسے نہیں گھورتے۔ کینزیا۔ معلوم ہوتا ہے جیسے تم ایک اُلّو ہو۔"

ایک روز جب وہ بخار کی حالت میں اندر لیٹی ہوئی تھی تو دادی اماں نے بتایا کہ ابا کی سالگرہ آئندہ ہفتے میں ہے۔ اور وہ انہیں زرد سلک کا ایک کُشن بنا کر تحفتہً پیش کرے۔

انتہائی محنت کے ساتھ ننھی نے تینوں کناروں کو سی دیا۔ مگر اب سوال پیدا ہوتا تھا کہ اس میں بھرا کیا جائے؟ دادی اماں باہر باغ میں تھیں۔ وہ اُٹھی اور اماں کے کمرے میں پھٹے پُرانے کپڑے تلاش کرنے لگی۔ میز پر اُس کو کاغذ کے چند تختے مل گئے۔ اس نے سبھوں کو جمع کر لیا۔ چاک کر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بنا لئے اور کپڑے میں

بھر کر چوتھا کنارہ بھی سی دیا۔

اسی رات تمام مکان میں ایک شور بلند تھا۔ ابا کے بہت سے ضروری کاغذات گم ہوگئے تھے۔ تمام کمروں میں ڈھونڈھ مارا۔ نوکروں سے پوچھ گچھ کی۔ آخرکار اماں آئیں اور کہنے لگیں۔

"کنیریا۔ تم نے میرے کمرے میں کچھ کاغذ تو نہیں دیکھے؟"

"ہاں۔ ہاں" اُس نے کہا" میں نے ان کے ذرا ذرا سے ٹکڑے کر دیئے۔"

"ہیں!" اماں چلائیں۔" فوراً کھانے کے کمرے میں آؤ۔"

اور وہ وہاں آئی جہاں ابا سخت پریشانی کے عالم میں ٹہل رہے تھے۔

"ملے؟" اُنہوں نے زور سے کہا۔

اماں نے تمام واقعہ سُنا دیا۔

وہ رُک گئے اور گھور کر بچی کی طرف دیکھا۔" کیا تم نے لئے ہیں؟"

"ن۔ن۔نہیں"۔ اُس نے آہستہ سے کہا۔

"اماں کمرے میں جاکر اُس بیکار چیز کو میرے پاس لے آؤ ——
دیکھنا بچی فوراً ہی سو جائے"

وہ روئی تاکہ کوئی اُس سے ہمدردی ظاہر کرے۔ اور روتے روتے ہی بستر پر جا لیٹی۔ شام کی سیاہی ہر شے پر محیط تھی۔ ایک سکوت کا عالم تھا۔ اور روشنی برابر والے کمرے کے دریچہ میں سے چھن چھن کر اندر فرش پر طرح طرح کے نقش و نگار بنا رہی تھی۔

ابا ہنٹر اپنے ہاتھ میں لئے کمرے میں داخل ہُوئے۔

"میں تمہیں اس شرارت پر سزا دینے والا ہُوں"۔ اُنہوں نے کہا۔

"ابا۔ نہیں نہیں" وہ چلائی اور کمبل کے نیچے چھُپ گئی۔

اُنہوں نے تمام کپڑوں کو ایک طرف کر دیا۔

"اُٹھ بیٹھو" وہ چلائے "اور اپنا ہاتھ پھیلاؤ۔ تمہیں یہ سیکھنا پڑیگا کہ جو چیز تمہارے کام کی نہیں اُسے ہاتھ نہیں لگانا چاہیئے۔"

"مگر یہ سب تو آپ کی س۔س۔سالگرہ کے لئے تھا۔"

اور ہنٹر اُس کی چھوٹی سی ہتھیلی پر پڑی۔

کچھ دیر بعد جب دادی اماں نے اُسے کمبل اُڑھا دیا۔ اور اپنے کمزور جسم سے چمٹا لیا۔ تو بچی نے رو کر کہا۔

"اللہ میاں نے ابا کیوں بنائے؟"

"بیٹی سو جاؤ۔ صبح کو تمام باتیں بھول جاؤ گی۔ میں نے تمہارے ابا کو سمجھانا چاہا تھا۔ مگر رات کو وہ بہت خفا ہو گئے تھے۔"

لیکن بچی نے ان لمحات کو کبھی فراموش نہ کیا۔ دُوسری مرتبہ جب اُس نے ان کو دیکھا تو دونوں ہاتھ پیچھے کر لئے اور اس کے چہرے کا رنگ متغیر ہو گیا۔

برابر والے مکان میں ایک اور صاحب رہتے تھے۔ شام کے وقت اپنے بچوں کے ساتھ کھیلا کرتے۔ ننھی یہ سب باتیں دیکھا کرتی تھی اور اُس نے اخذ کر لیا تھا۔ کہ دنیا میں بھی مختلف قسم کے باپ ہوتے ہیں۔

اتفاقاً ایک دن اماں بیمار ہو گئیں۔ دادی اماں اور وہ گاڑی میں بیٹھ کر شہر چلی گئیں۔ بچی اور خادمہ مکان میں تنہا رہ گئیں۔ صبح کے وقت تو کوئی بات نہ تھی۔ لیکن شام کو جب خادمہ اپنے بستر پر لیٹی تو اُس کو ڈر لگنے لگا۔

"میں کیا کرونگی اگر مجھے کوئی ڈراؤنا خواب دکھائی دیا؟" اُس نے پوچھا" مجھے بہت دفعہ ڈراؤنے خواب دکھائی دیتے ہیں اور پھر دادی اماں مجھے اپنے بستر پر لے جاتی ہیں —— میں اندھیرے میں نہیں سو سکتی . . . . میں کیا کرونگی اگر مجھے دکھائی دیا؟"

"نہیں۔ تم اب سو جاؤ" خادمہ نے کہا" اور شور مچا کر اپنے ابا کو پریشان مت کرنا۔"

لیکن وہی پُرانا بھیانک خواب دکھائی دیا —— قصائی اپنا چاقو اور رسّی لئے اس کی طرف بڑھا چلا آ رہا ہے۔ اور وہ اپنی جگہ سے ہل بھی نہیں سکتی۔ خاموش کھڑی چلا رہی ہے۔" دادی اماں۔ دادی اماں!" وہ کانپتی ہُوئی اُٹھ بیٹھی۔ ابا سرہانے روشنی لئے کھڑے تھے۔

"کیا بات ہے؟" اُنہوں نے دریافت کیا۔

"ابا۔ ایک قصائی —— ایک چاقو —— دادی اماں کہاں ہیں؟"

اُنہوں نے روشنی بُجھا دی اور بچی کو گود میں اُٹھا کر اپنے کمرے میں لے گئے۔ اخبار بستر پر کھُلا پڑا تھا —— اور ایک جلا ہُوا سگار لیمپ سے لگا رکھا تھا۔ اُنہوں نے اخبار کو فرش پر ڈال دیا۔ سگار آتش دان میں پھینکا اور بچی کو آرام سے لٹا کر خود اُس کے پاس لیٹ گئے۔ ابھی اچھی طرح نیند بھی نہ آئی تھی۔ اور اس قصائی کی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر کھیل رہی تھی کہ ایسا محسوس ہُوا گویا وہ ان سے چمٹ رہی ہے۔ پھر اندھیرے سے وہ خوفزدہ نہ ہُوئی۔

"اپنے پیر میرے پیروں کے نیچے کر دو۔ گرم ہو جائیں گے"۔ آبا نے کہا تکان کی وجہ سے وہ بچی سے پہلے ہی سو گئے۔ ایک دلچسپ کیفیت اس پر طاری ہو گئی۔ بیچارے ابا ایسے امیر بھی نہیں۔ . . . اور کوئی اُن کے آرام کا خیال بھی نہیں رکھتا۔ . . . ان میں دادی اماں سے زیادہ سختی موجود تھی مگر وہ سختی بھی اچھی معلوم ہوتی تھی۔ . . انہیں ہر روز محنت کرنی پڑتی ہے اور اتنے تھک جاتے ہیں۔ کہ ہمسایہ کی سی فرصت اور طبیعت نہیں پا سکتے۔ اور اس نے ان کے تمام کاغذات چاک کر ڈالے . . . وہ دفعتہً ہلی اور ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔

"کیا بات ہے؟" آبا نے پوچھا۔ "کوئی دوسرا خواب؟"

"ابا" بچی نے کہا "میرا سر تمہارے سینہ پر ہے اور میں دل کے چلنے کی آواز سن رہی ہوں۔ پیارے ابا! تمہارا کیسا بڑا دل ہے"۔

(کیتھرین مینسفیلڈ)

منیب الرحمٰن

سلطان شہید

(مجاہد وطن ٹیپو سلطان شہید کی یاد میں)

اے شجاع ازل! اے ہند کے فرزند جلیل
تری جرأت تھی غم سود و زیاں سے آزاد
زندگی خود ہے ترے ذوق شہادت کی قتیل
تو رہا گردش دوران جہاں سے آزاد
نامرادی تری، آئین وفا کی تکمیل
ہے تری یاد زماں اور مکاں سے آزاد

رزم آرا علم جیش صداقت تجھ سے
باطل افگن ہے ترا نعرۂ آزاد ابھی
زندہ ہے آج بھی مشرق کی شجاعت تجھ سے
ہے ترے نام سے لرزاں ستم ایجاد ابھی

لے گئی عرش وفا پر تجھے تقدیر تری!
ہند کو محرم اسرار وفا تو نے کیا!
گونجتی ہے ابھی آفاق میں تکبیر تری!
حق وفاداری مشرق کا ادا تو نے کیا!
عدل کے ہاتھ میں ہے آج بھی شمشیر تری!
پرچم افشاں علم دین خدا تو نے کیا!

لب اقوام پہ جاری ترا افسانہ ہے
حلقۂ جادوئے افرنگ کو توڑا تو نے
سوز آزادی مشرق ترا پروانہ ہے
ہند میں پنجۂ شیطاں کو مروڑا تو نے

ہائے! وہ منزل الفت سے گذرنا تیرا
حریت، سرخی نظم مہ و خورشید ہے پھر
حجلہ آرائے شہادت! وہ سنورنا تیرا
انقلابات کی کچھ اور ہی تمہید ہے پھر
غیرت عشق کے آغوش میں مرنا تیرا
ہاں ترا عہد وفا عازم تجدید ہے پھر

بزم امکاں پہ گراں جب تری تنہائی ہوئی
پھر ہے بیدار جلال و حشم آزادی
موت، آئی ترے آغوش میں شرمائی ہوئی
وقت کے ہاتھ میں ہے پھر علم آزادی

تو ہے وہ بحر، جو شرمندۂ ساحل نہ ہوا
ہند میں آج جو یہ جلوۂ بیداری ہے
وہ مجاہد ہے جو آسودۂ منزل نہ ہوا
سطوت غیر، جو مجبور نگونساری ہے
مصلحت سے کبھی مانوس ترا دل نہ ہوا
یہ ترے شعلۂ ایثار کی گلکاری ہے

عشق سے مرگ کے شعلوں کو بجھایا تو نے
سر تکمیل ترا جذب تمام آپہنچا
جاوداں ہستیٔ فانی کو بنایا تو نے
صبح آزادیٔ مشرق کا پیام آپہنچا

تمکین صدیقی

صرف تین ہی ہفتہ میں
آپ پر ثابت ہو جائیگا کہ
اوکاسا
آپ کو ایک نیا طاقتور آدمی بنا سکتا ہے
OKASA
MADE IN GERMANY
OKASA REJUVENATES THE BRAIN
OKASA REVITALIZES THE NERVES
OKASA FORTIFIES THE LUNGS
OKASA STRENGTHENS THE HEART
OKASA STIMULATES THE LIVER
OKASA INVIGORATES THE STOMACH
OKASA TONES THE KIDNEYS
OKASA STIMULATES INTESTINAL ACTION
اوکاسا جرمنی کے ڈاکٹروں کی ایسی حیرت انگیز ایجاد کردہ دوا ہے کہ جس کے مقابلہ کی یا اس کے برابر اثر رکھنے والی دوسری دوا اب تک تیار نہیں ہو سکی۔ دنیا کے ہر ملک میں لاکھوں مرد و عورت اوکاسا کے استعمال سے اپنی تندرستی۔ زندگی طاقت اور پوری جوانی دوبارہ حاصل کر چکے ہیں ہر سال لاکھوں کی تعداد میں لوگ اوکاسا کا استعمال کر رہے ہیں اوکاسا کے اثرات کا راز اس میں ہے کہ اس کے استعمال سے جسم کے ہر حصہ کو غذا پہنچتی ہے خصوصاً ان غدود یعنی گلینڈز جن پر تمام زندگی اور صحت کا دارومدار ہے یہ بات تصویر میں اچھی طرح ظاہر کی گئی ہے۔ صرف تین ہفتہ کے استعمال سے معلوم ہو جائے گا کہ اوکاسا درحقیقت آپ کو ایک نیا طاقتور آدمی بنا دے گا۔ آپ کی طاقت۔ آپ کی صحت اور جوانی از سر نو واپس آجائے گی۔ آپ کے چہرے پر رونق اور تازگی پیدا ہوگی اور آپ کے جسم کی رگیں اور پٹھے اور تمام اعضا خصوصی طاقت ور بن جائیں گے۔
اوکاسا اشتعال انگیز یا گرمی پیدا کرنے والی دوا نہیں ہے
برخلاف اور تمام طاقت کی دواؤں کے جنمیں کشتہ جات۔ کچلہ۔ دھاتیں پڑی ہوئی ہوتی ہیں اوکاسا بالکل بے ضرر اور قطعی اشتعال انگیز یا گرمی کرنے والی دوا نہیں ہے۔ کیونکہ اوکاسا میں کسی قسم کا کشتہ یا دھات یا کچلہ وغیرہ شامل نہیں ہے اوکاسا ان اجزا سے بنی ہوئی ہے جن کو انگریزی میں گلینڈز کہتے ہیں گلینڈز یا غدود جیسا کہ تصویر میں دکھایا گیا ہے آدمی کے جسم کا اہم ترین جزو ہیں اس لئے اوکاسا آپ کے گلینڈز کو طاقت ور بناتا ہے۔ گرمی پیدا کرنے والی اور اشتعال انگیز نہیں ہے ہر حالت و ہر موسم میں اوکاسا استعمال کر سکتے ہیں اوکاسا کے متعلق مفصل کتاب آپ مفت طلب کیجئے۔ پتہ :- اوکاسا کمپنی برلن (انڈیا) لمیٹیڈ پوسٹ بکس نمبر ۲۹۶ بمبئی
اوکاسا آج ہی استعمال کرنا شروع کر دیجئے

حکمران خواتینِ مشرق

مردوں نے عورتوں کو ضعیف القویٰ اور ضعیف العقل قرار دے رکھا ہے، ہندوستان، مصر، عربستان، ایران اور یورپ کے قدیم حکماء نے علی العموم عورت کی نسبت جن خیالات کا اظہار کیا وہ تنقیص کی طرف مائل تھے۔

یورپ نے بظاہر عورتوں کو سر آنکھوں پر بٹھا کر بھی کوئی باقاعدہ اور باضابطہ کام ان سے نہیں لیا اور نہ عہد حال کے عورتوں سے متعلق لکھنے والے مصنفین نے عورتوں کی قابلیت کے مختلف پہلوؤں اور حیثیتوں کو پیش کرنے کی کوشش کی "دنیا کی عورتیں" "خوبصورت عورتیں" "نامور عورتیں" قسم کی سینکڑوں کتابیں یورپ اور امریکہ سے شائع ہوئیں۔ عورتوں کی نفسیات اور دماغی و جسمانی ساخت وغیرہ پر خاصا ادب فراہم کیا گیا۔ مگر اب تک کسی نے یہ بتانے کی کوشش نہیں کی کہ جو عورت آج عدالت العالیہ میں جج بن کر کام کر رہی ہے۔ بیرسٹر بن کر مقدمہ چلاتی ہے۔ منتظمہ بن کر انتظام کرتی ہے۔ کلرک بن کر دفتری کاروبار کر رہی ہے اور دنیا کے مختلف پیشوں اور فنون میں مرد کے دوش بدوش کام کرتی ہے۔ کبھی اُس نے اپنی انتظامی، سیاسی، فوجی اور اخلاقی جرأت اور قابلیت کے ثبوت بھی دیئے ہیں اور عہدِ قدیم و جدید میں اسی عورت نے حکمرانی کر کے ملک اور رعایا کی حفاظت کی ہے اور اپنی سیاسی قابلیت سے ملکوں کو زیر و زبر کر دیا ہے؟

برادران وطن کو یہ بات معلوم کر کے حیرت ہوگی کہ دارا، سکندر، قاسم، محمود غزنوی، محمد غوری، تیمور، بابر اور نادر شاہ سے بہت پہلے طوفان نوح سے تین سو سال بعد اور جناب مسیح سے دو ہزار سال قبل سیمی رامس نامی ایک عراقی ملکہ نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا ...... ایک عورت نے عراق عرب سے براہ باختر ہندوستان تک فوج کشی کس طرح کی ہوگی غور فرمایئے۔

۱۳۰۱ء میں جزیرہ تھیان کی شہزادی ماہ تاباں بھی ہندوستان کے فتح کرنے کا ارادہ کرتی ہے مگر یہ ارادہ پورا نہیں ہو سکتا صرف ابن بطوطہ کا سفرنامہ اس کا گواہ رہ جاتا ہے۔ مہارانی لچھمی بائی (جھانسی) کو ہندوستان اور خصوصاً اہلِ فرنگ کبھی بھول نہیں سکتے جس نے نہ صرف سر روز کو ناکوں چنے چبوا دیئے بلکہ آزادی کی جنگ میں جون ۱۸۵۹ء اپنی جان تک نذر کر بیٹھی۔

اس مضمون میں آپ کو صنف نازک کی جرأت و ہمت، سعادت و شقاوت، بہادری و شجاعت ہر طرح کے کارنامے ملیں گے۔ آپ اس میں چاند سلطانہ، لچھمی بائی کی طرح فدائے وطن اور آزادی پسند خواتین کے حالات بھی ملاحظہ فرمائیں گے۔ اور سیمیرامس کی طرح "جُوعِ الارض" رکھنے والیوں کے بھی۔

اس کے مطالعہ سے آپ محسوس کر سکیں گے کہ عورت نے دنیا میں کس قدر جدوجہد کی ہے۔ سیاسیات، مذہب، شمشیر زنی، فرمانروائی امور سلطنت اور ملک داری میں بعض عورتیں آپ کو ہٹلر، مسولینی، اتاترک اور رضا شاہ کے مقابلہ کی نظر آئیں گی۔

اتابک عیش

یہ لائق ملکہ منگو تیمور ابن ہلاکو خاں کی بیوی اور سعد بن اتابک ابوبکر کی دختر تھی ۶۶۲ھ میں اپنے خسر کے کہنے سے سریر آرائے تخت شیراز ہوئی اس وقت خاندانِ اتابکیہ میں سوائے اتابک عیش کے کوئی مرد اس قابل نہ تھا کہ سلطنت کا بھاری بوجھ اپنے کندھوں پر لیتا۔ غرض یہ نیک اور ہوشمند ملکہ ۶۶۲ھ سے ۶۸۶ھ تک بہت خوش اسلوبی کے ساتھ حکومت کرتی رہی۔

ارغانہ خاتون

چغتائی خاندان کے حکمران قراہلاکو بن مواتوخاں بن چغتائی بن چنگیز خاں

کی بیوی تھی ۱۶۵۰ء میں قرا الاکو خاں کے انتقال کی وجہ سے تخت نشین ہوئی اور ۱۶۵۹ء تک نہایت عدل و انصاف سے حکومت کرتی رہی۔

اہلیا بائی

ہلکر خاندان کی مشہور رانی ہے جو ۱۷۳۵ء میں پیدا ہوئی۔ قدرت نے صورت شکل معمولی دی تھی مگر بلا کی طبّاع، ذہین اور خلیق تھی۔ تھوڑی بہت پڑھی لکھی بھی تھی اور مذہبی کتب کا مطالعہ ہمیشہ کیا کرتی تھی۔ ملہار راؤ ہلکر کے بیٹے کھنڈے راؤ سے شادی ہوئی اور ایک لڑکا مالے راؤ اور ایک لڑکی مچھا بائی پیدا ہوئی اور ان دونوں بچوں کی ولادت کے بعد ملہار راؤ نے انتقال کیا۔ ملہار راؤ کی وفات کے بعد اہلیا بائی نے اپنے بیٹے مالے راؤ کو تخت نشین کیا۔ مگر وہ شروع سے پاگل اور اعصابی امراض میں مبتلا تھا نو مہینے حکومت کر کے راجہ مالے راؤ بھی بیکنٹھ باشی ہوگیا اور اہلیا بائی نے مجبوراً عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ گنگا دھر نے جو کھنڈے راؤ کا وزیر تھا اُس کی مخالفت کی اور ہلکر خاندان کے کسی دوسرے لڑکے کو متبنّےٰ بنا کر تخت نشین کرنا چاہا۔ جب اہلیا بائی راضی نہ ہوئی تو گنگا دھر نے اس پر فوج کشی کی مگر اہلیا بائی نے پہلے ہی سندھیا، بھونسلہ اور پیشوا کو گنگا دھر کی اس بدمعاشی کی اطلاع دے دی تھی۔ اس لئے ان لوگوں نے گنگا دھر کو امداد دینے سے انکار کیا اور ۱۷۶۵ء میں اہلیا بائی نے عنانِ حکومت باضابطہ اپنے ہاتھ میں لے لی۔

اہلیا بائی نے ملک کا نظم و نسق بڑی عمدگی سے قائم کیا۔ محصلات میں کمی، مالگزاری کی وصولی میں سختی کرنے کی ممانعت کی۔ گونڈ اور بھیل، جو وہاں جرائم پیشہ کی حیثیت رکھتے تھے انہیں زمینیں دیں اور اُن کے لئے کام مہیا کیا۔ جس کی وجہ سے اس کا ملک گونڈوں اور بھیلوں کے ڈاکوں سے محفوظ ہوگیا۔ اُس نے مذہب و ملّت کا امتیاز نہ کرتے ہوئے اپنی رعایا سے شفقت و محبت کا برتاؤ شروع کیا۔ صبح اُٹھ کر پوجا پاٹ کرتی اور پھر اپنے ہاتھ سے دان کرتی اور برہمنوں کو اپنے سامنے بھوجن کراتی اور پھر آپ کھاتی تھی۔ دن بھر میں دو دفعہ دربار کرتی تھی صبح ۹ بجے سے گیارہ بجے تک اور پھر ۲ بجے سے شام کے ۶ بجے تک۔ اس کے دربار میں ہر شخص کو حاضر ہونے کی عام اجازت تھی نہایت عادل، منصف مزاج اور سمجھدار رانی تھی۔ اس نے اپنے ملازم نہایت اچھے انتخاب کئے تھے۔ گوبند پنڈت گھنو اور کھنڈے راؤ اُس کے دو اہم مشیر تھے۔

اپنی رعایا سے اسے بڑی محبت تھی۔ گرمیوں میں ایک دفعہ پانی نہ برسنے کی وجہ سے تمام چشمے سُوکھ گئے اور ملک کا ایک بڑا حصہ پانی کے لئے ترسنے لگا تو اُس نے اس خشک حصۂ ملک کو باہر سے پانی منگوا کر سیراب کیا اور رعایا کی ضروریات کے لئے پانی فراہم کرتی رہی۔

اپنے زمانۂ حکومت میں اُس نے ملک میں بےشمار مندر، دھرم سالے تالاب اور شفاخانے بنوائے، سڑکیں درست کیں۔ جگنا تھ، گیا، بنارس کدار ناتھ، دوارکا اور ست بندھ کے تیرتھوں میں ایک ایک مندر اور دھرم سالہ بنوائی اور وہاں مستقل خیرات جاری کی۔ بنارس میں بشیشر ناتھ کا جو مندر مرجع خلائق ہے وہ اسی رانی کی یادگار ہے۔

۱۷[illegible]ء میں اہلیا بائی نے اپنی راجدھانی آباد کی اور اُس کا نام اندور رکھا جو اب تک موجود ہے۔ اُس کی زندگی کے آخری دن بہت تکلیف میں گذرے پہلے اُس کے اکلوتے بیٹے نے پاگل ہو کر انتقال کیا اور آخر میں اُس کی پیاری بیٹی نے جو اس کی زندگی کا سہارا تھی۔ اپنے شوہر کے ساتھ ستی ہونا چاہا۔ اس کمسن بیوہ ورتا کو سارے عزیز و اقارب اور ملک والوں نے ستی ہونے سے منع کیا مگر اُس نے رنڈاپے کی زندگی پر جل کر بھسم ہو جانے کو ترجیح دی اور اپنی ماں اہلیا بائی کی آنکھوں کے سامنے اپنے شوہر کی لاش کے ساتھ ہنسی خوشی جل گئی۔ جوان اکلوتی بیٹی کا ناوقت رانڈ ہونا اور پھر ماں کی آنکھوں کے سامنے جل کر اپنی جان دینا ایک قیامت خیز منظر تھا۔ اہلیا بائی کا دُکھی دل اسے برداشت نہ کر سکا۔ وہ اپنی بیٹی کو چتا میں دیکھ کر بیہوش ہوگئی۔ برہمنوں نے نربدا کے پوتر پانی سے اُسے نہلا نہلا کر تسلی دینی چاہی مگر ماں کی مامتا کو اس سے تسکین نہ ہوئی اور اہلیا بائی نے اسی غم میں ۱۷۹۵ء میں انتقال کیا۔

اہلیا بائی نے ۶۰ برس کی عمر پائی اور ۳۰ سال تک حکومت کی۔ نہایت سادہ مزاج تھی۔ سوائے ایک مالا کے کوئی زیور اس کے جسم پر نہیں رہتا تھا۔ حد درجہ انصاف پرست، پابند وقت، منتظم، سادگی پسند مستقل مزاج اور نیک طینت تھی، خوشامد سے اسے سخت نفرت تھی اور باوجود غیر برہمن ہونے کے گوشت نہ کھاتی تھی۔

بادشاہ خاتون

سلطان قطب الدین محمد کی بیٹی نہایت خوبصورت، خوب سیرت انصاف پسند اور فاضلہ تھی۔ یہ نیک بخت خاتون اپنے ہاتھ سے

قرآن مجید لکھا کرتی تھی۔ ۶۹۱ھ میں سریر آرائے تخت کرمان ہونے کے بعد کسی وجہ سے اُس نے اپنے بھائی کو قتل کرا دیا جس کی وجہ سے سب رعایا بدظن اور دشمن ہوگئی اور آخر کار ۶۹۴ھ میں اس کو تخت سے اتار کر مار ڈالا گیا۔

اس ملکہ کے دربار میں بڑے بڑے علماء، فضلاء، اور شعراء جمع رہتے تھے یہ اُن کی سرپرستی کرتی تھی اور خود بھی شعر کہتی تھی۔ چنانچہ یہ رباعی اسی کے نام سے مشہور ہے۔

درون پردۂ عصمت کہ تکیہ گاہ منست — مسافران ہوا را گذر بدشواریست
نسیم بادمزن سر ز یر مقنعۂ اُو ! — کہ تار و پود وے از عصمت و نکو کاریست

بغداد خاتون

امیر الامراء امیر چوپان کی بیٹی، حضرت شیخ حسن کبیر کی بیوی نہایت خوبصورت اور شریف خاتون تھی۔ یہ اپنے حسن میں ثانی نہیں رکھتی تھی۔ اس کی خوبصورتی تمام شہر میں مشہور تھی۔ چنانچہ جب سلطان الوقت کو اس کے حسن و خوبصورتی کی خبر ہوئی تو سلطان اس پہ غائبانہ عاشق ہوگیا اور سلطان کا یہ خیال شیخ صاحب کو بھی معلوم ہوگیا۔ شیخ صاحب یہ معلوم کرکے بہت رنجیدہ ہوئے اور اپنی عزیز بیوی کو طلاق دے کر خلیفہ کے حضور میں روانہ کر دیا۔ اس زمانہ میں ملوک چنگیزیہ کا یہ دستور تھا کہ جب بادشاہ وقت کسی منکوحہ پہ عاشق ہوجاتا تو اس کے شوہر کا فرض تھا کہ وہ فوراً اپنی بیوی کو طلاق دے کر بادشاہ کی خدمت میں روانہ کرے۔

جب بغداد خاتون حرم شاہی میں داخل ہوئی تو سلطان اس کو اپنے تصور سے زیادہ حسین پاکر اُس کے عشق میں دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوگیا اور یہ خاتون بادشاہ کی طبیعت سے اتنی واقف ہوگئی تھی کہ جو چاہتی کروالیتی۔

جب سلطان ابوسعید کا انتقال ہوگیا تو یہ خود حکومت کرنے لگی مگر ارپان خان نامی ایک درباری نے جو ملکہ کی حکومت سے متنفر تھا۔ ملکہ پر بادشاہ کے قتل کی تہمت لگائی اور اسی جرم میں اس نے چند اور درباریوں کو ہموار کرکے غریب ملکہ کو مروا ڈالا۔

یہ ملکہ خاص و عام میں "خنگار" کے نام سے مشہور رہی۔

بلقیس

شہر سبا کی ملکہ تھی اس کا باپ ہیلد بن سراخیل یمن کا بادشاہ تھا۔ حضرت سلیمان علیہ السلام نے اس ملکہ کو خداپرستی کی دعوت دی۔ بلقیس نے حضرت سلیمان کے پاس پہنچ کر ملاقات کی اور دعوئی نبوت کی تصدیق کر کے ایمان لاکر حضرت ہی کے عقد میں آئی۔ قرآن مجید و دیگر کتب سماوی میں اس ملکہ کا تذکرہ موجود ہے۔ کہا جاتا ہے کہ بلقیس نے ۴۰ سال تک یمن اور ملک مغرب کی فرمانروائی کی ہے۔ حضرت سلیمان کے پاس بلقیس کے آنے اور آزمانے کے بہت سے قصے مشہور ہیں مگر ہم انہیں ترک کرتے ہیں۔

بیجا بائی

سردار دیوان سرجی راؤ ایک مشہور مرہٹہ سردار کی بیٹی تھی۔ اس کی شادی بہت چھوٹی سی عمر میں پونا کے راجہ دولت راؤ سندھیا سے ہوئی تھی۔ یہ رانی نہایت شریف، اعلیٰ دماغ اور مردانہ مزاج کی عورت تھی۔ دولت راؤ اُس کا بہت ادب کرتا تھا اور امور سلطنت میں اس سے بغیر مشورہ کئے کوئی کام نہ کرتا تھا۔ ۱۸۲۷ء میں جب دولت راؤ لاولد بیکنٹھ باشی ہوا تو بیجا بائی راج گدی پر رونق افروز ہوئی۔ وہ چاہتی تھی کہ اپنے خاندان کے کسی لڑکے کو متبنیٰ کرے مگر بعض وجوہ کی بناء پر اُس کو اپنے شوہر کے ایک عزیز مکٹ راؤ کو متبنیٰ کرنا پڑا۔ ۱۸۳۳ء میں مکٹ راؤ بالغ ہوا تو سرکار انگلشیہ کی مداخلت سے وہ گدی نشین ہوا اور رانی بیجا بائی کو ایک معقول پنشن پر گدی سے دست بردار کر دیا گیا۔

غدر ۱۸۵۷ء کے بعد رانی بیجا بائی نے انتقال کیا۔

بہو بیگم

محمد شاہ بادشاہ کی بیٹی اور شجاع الدولہ والئ اودھ کی بیگم، نہایت رعب داب اور متین خاتون تھیں۔ شجاع الدولہ ان کا حد درجہ احترام کرتے تھے۔ آصف الدولہ نے جب اپنی فضول خرچیوں سے ساری دولت اُڑا دی اور پھر بہو بیگم سے مانگنا شروع کیا تو اُنہوں نے تین چار لاکھ روپیہ نقد اور ۳۶ لاکھ روپیہ کے زیورات اور جواہرات دیئے

دس ہزار پیادے اور سوار ہزارہا ہاتھی گھوڑے اور ایک لاکھ سے زیادہ متوسلین اُن کے پاس تھے۔ اپنے فرزند آصف الدولہ کے انتقال کے بعد فیض آباد کی حکومت بہو بیگم نے اپنے ہاتھ میں لے لی تھی اور داراب علی خاں کے ذریعہ خود انتظام مملکت کرتی تھیں۔ اُن

کی حکومت میں فیض آباد گہوارۂ عدل وعیش بنا رہا تھا۔ نہایت منتظم دریادل سخی اور غریب پرور تھیں۔ ہندوستان کے بیشتر شعراء اسی سرکار سے متوسل تھے۔ چنانچہ شیخ امداد علی بحر مرحوم نے انہیں کے پاس عمر گذار دی۔

بہو بیگم کے انتقال کے بعد چونکہ اُن کے سوتیلے فرزند یمین الدولہ وارث مقرر ہونے والے تھے۔ اس لئے اُنہوں نے ایک وصیت نامہ کی رُو سے تین لاکھ روپیہ اپنے مقبرہ کے لئے اور ایک لاکھ روپیہ مصارف عود و گل کے لئے اور دس ہزار سالانہ کی جائیداد ان لوگوں کی پرورش کے لئے جو فاتحہ خوانی وغیرہ کریں چھوڑی تھی۔

اُن کے انتقال کے بعد داراب علی خاں نے مقبرہ بنوانا شروع کیا مگر مکمل نہ ہوسکا۔

تُرکان خاتون

ترکان سلطان بن ابی بکر والئ شیراز کی ملکہ اور محمد اتابک ولیعہد شیراز کی ماں تھی۔ ۶۵۸ھ میں سعد بن ابی بکر نے انتقال کیا تو ملکہ ترکان نے عنانِ سلطنت اپنے ہاتھ میں لی۔ کیونکہ ولیعہد شیراز خورد سال تھا اس لئے ملکہ ترکان نے سریرآرائے سلطنت ہوکر ایک سفارت ہلاکو خاں کی خدمت میں اس غرض سے بھیجی کہ اس کے خورد سال فرزند کے لئے فرمانِ حکومت جاری کیا جائے۔ چنانچہ ہلاکو خاں نے ملکہ کے حسب خواہش سندِ حکومت بھجوائی مگر افسوس کہ اس کے دو ہی سال بعد خورد سال ولیعہد نے بالاخانہ سے گرکر انتقال کیا۔ اس کے انتقال کے بعد ملکہ ترکان نے اپنے داماد اتابک محمد شاہ کو بڑی دقتوں کے بعد والئ شیراز بنایا مگر یہ نامراد بلا کا عیاش اور شراب خور نکلا۔ اور اپنی ساس کی نصیحتوں کو پس پشت ڈال کر من مانی حکومت کرنے لگا۔ ناچار ملکہ مذکور نے آٹھ ماہ بعد اس نالائق کو تخت سے اتار کر اُس کے بھائی اتابک سلجوق کو بادشاہ بنایا مگر اتابک سلجوق اپنے بھائی سے بھی چار قدم آگے رہا۔ اس نمک حرام نے ایک غلام کے ذریعہ سے ملکہ ترکان کو خفیہ طور پر مروا ڈالا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ملک عجم پر ہلاکو خاں کا غضب نازل ہؤا۔ اور ۶۶۲ھ میں وہ نامراد کیفر کردار کو پہنچا۔

تراکنہ خاتون

چغتائی خاں بن چنگیز خاں کی بیوی اور بڑی صاحب ہمت و تدبر تھی۔ ۶۳۸ھ میں چغتائی خاں نے انتقال کیا تو قبل اس کے کہ چغتائی قبائل اُس کی جانشینی کا تصفیہ کریں اُس نے تخت سلطنت پر قبضہ کرلیا اور تن تنہا حکومت کرنے لگی۔

چنگیز خاں کے چھوٹے بھائی یوتگین خاں نے اس پر حملہ کرنا چاہا اور ایک بڑی فوج لے کر چڑھائی کی اس وقت یہ ملکہ اکیلی تھی اس کا بیٹا کیک خاں بھی اس کے پاس نہ تھا مگر اس نے نہایت جی داری کی اور یوتگین کو لکھا کہ آپ ناحق ادھر حملہ آور ہونے کی تکلیف کر رہے ہیں۔ کیک آپ کے استقبال کے لئے آرہا ہے۔ یوتگین کو یہ خیال ہؤا کہ کیک قبائل کو فراہم کرکے زبردست لشکر کے ساتھ آرہا ہوگا۔ اس سے مقابلہ مشکل ہے اس لئے وہ واپس ہوگیا۔ اس طرح پالیسی کے ساتھ اُس نے یوتگین کو ٹالا۔ اُس کا بیٹا کیک پست ہمت تھا۔ مگر اُس نے اُس کی پیٹھ ٹھونک کر اُسے بادشاہ بنادیا۔ ۶۴۳ھ میں تمام چغتائی قبائل کے سردار جمع ہوئے اور چغتائی خان کی جانشینی کا مسئلہ پیش کرکے اسے منظور کرالیا اور اس شرط پر کیک نے جانشینی قبول کی کہ یہ سلطنت اسی کے خاندان میں ہمیشہ رہیگی۔

تراکنہ خاتون نے ۶۳۸ھ سے ۶۴۳ھ تک پانچ ایک سال نہایت بیدار مغزی سے حکومت کی دیار بکر، حران، رہا، ماردین پر چغتائی قبضہ اسی کے زمانہ میں ہؤا۔

بیٹے کو تخت نشین کرنے کے بعد ۶۴۳ھ سے اُس نے گوشہ نشینی اختیار کی۔

تلسی بائی

اندور کے راجہ جسونت راؤ ہلکر کی رانی تھی۔ ۱۸۰۸ء میں جسونت راؤ فاتر العقل ہوگیا بعض مؤرخین کا خیال ہے کہ تلسی بائی ہی نے اُس کا دماغ خراب کردیا تھا بہرحال ۱۸۰۸ء سے تلسی بائی نے عنانِ حکومت اندور اپنے ہاتھ میں لے کر خود مختار حکومت شروع کی۔ صورت شکل اچھی مگر اخلاقاً بڑی مکروہ تھی۔ اس نے ایک زنانہ گارڈ تیار کیا تھا جو اُس کے جلو میں رہتا تھا۔ خود بھی بڑی شہسوار تھی اور تمام سپاہیانہ فنون سے واقف تھی مردانہ لباس

میں ہتیار سے سج کر گھوڑے پر چڑھتی تھی۔

تقریباً دس سال تک دادِ عیش و عشرت دے کر ملک کے ہزارہا نوخیزوں کو برباد کر کے اُس نے اپنے وجود سے اندر کو پاک کیا۔

تندو

تندو حسین بن اویس ترکمان کی نہایت ہشیار اور مدبر بیٹی تھی۔ یہ اپنے چچا احمد بن اویس کے ساتھ مصر گئی تو مصر کے بادشاہ ملک طاہر نے اس سے نکاح کر لیا مگر چند سال بعد طلاق دے دی۔ طلاق کے بعد اس نے اپنے چچازاد بھائی شاہ ولد سے عقد ثانی کیا۔ جب دونوں میاں بیوی مصر سے بغداد واپس آئے تو شاہ ولد کو بغداد کا تخت ملا کیونکہ ان دونوں کے قیام مصر کے زمانے میں احمد بن اویس والئ بغداد کا انتقال ہو گیا تھا شاہ ولد کے تخت نشین ہونے کے بعد تندو نے اُس کو کسی طرح سے مروا ڈالا اور خود تخت و تاج کی مالک ہو گئی۔ اس کے بعد محمد شاہ بن قرا یوسف نے بغداد پر چڑھائی کی اور ایک سال تک محاصرہ قائم رکھا مگر اس ہشیار ملکہ نے محمد شاہ کو کسی طرح اپنے ارادہ میں کامیاب ہونے نہیں دیا بلکہ دجلہ کی راہ سے واسط چلی گئی اور تستر پر قابض ہو گئی۔ اس کے بعد رعایا نے ملکہ کو شاہ ولد مرحوم کے بیٹے محمود کے ساتھ تخت پر بٹھایا جو کسی دوسری خاتون کے بطن سے تھا مگر ملکہ تندو کو کب گوارا ہو سکتا تھا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ حکومت کرے اس لئے اُس کو بھی مروا ڈالا اور ۸۱۹ھ میں بلا شرکت غیرے راج کرنے لگی۔ مدت تک بصرہ کے عربوں سے لڑتی رہی اور جزیرۂ واسط پر تلوار کے زور سے قابض ہو گئی اس کی تمام قلمرو میں اسی کے نام کا خطبہ اور سکہ جاری تھا۔ بالآخر ایک مدت تک حکومت کر کے ۸۲۲ھ میں انتقال کر گئی۔

جسومتی

یہ رانی راجہ دامودر والئ جموں کی بیوی تھی۔ یہ راجہ ۳۱۲۱ء قبل مسیح لغایت ۳۰۳۶ء قبل مسیح، سری کرشن جی کے بھائی بلبھدر (بلرام) کے ہاتھ سے جمنا کے کنارے متھرا کی لڑائی میں مارا گیا تو جسومتی نے ریاست جموں کا کاروبار سنبھالا۔

راجہ دامودر کے مارے جانے کے وقت رانی جسومتی حاملہ تھی اور کچھ مدت کے بعد اس کے ایک لڑکا ہوا جس کا نام دیال گونند رکھا گیا اور یہی وارث تخت و تاج ہوا۔ دیال گونند کو چودہ برس کی عمر میں گونند دوم کے لقب سے تخت نشین کیا گیا۔ مؤرخین کشمیر راوی ہیں کہ اس کے زمانہ میں مہابھارت کی جنگ ہوئی۔

رانی جسومتی چودہ سال تک جموں پر حکومت کر کے اپنے بیٹے کے لئے دست بردار ہو گئی۔

جنگو

جنگو جاپان کے بادشاہ چوائی کی ملکہ تھی جو شاہ چوائی سے زیادہ بہادر اور ہمت والی تھی۔ اُسے کسی دیوی کی طرف سے کسی طرح یہ معلوم ہوا۔ کہ جاپان کے مشرق کی طرف ایک ملک ہے جہاں لاتعداد خزائن ہیں۔ اُس نے اپنے شوہر کو ان خزائن کے حاصل کرنے کے لئے مجبور کیا مگر شاہ چوائی نے اپنی پست حوصلگی کی وجہ سے آمادگی ظاہر نہیں کی چونکہ جنگو کو دیوی نے ہدایت کی تھی اور چوائی نے اس ہدایت کو جھٹلایا تھا اس لئے چوائی پر دیوی کا غضب نازل ہوا۔ اور وہ ۲۰۰ء میں مر گیا۔ اس کے مرنے کے بعد ملکہ جنگو نے چین کے مشرق کی جانب یعنی کوریا پر فوج کشی کی تیاریاں شروع کیں اور ۲۰۲ء میں ایک بیڑہ لے کر کوریا پر حملہ کر دیا۔ کوریا میں تین بادشاہ حکمران تھے ملکہ جنگو نے یکے بعد دیگرے تینوں کو مطیع کر کے خراج حاصل کیا اور تین سال کے بعد اپنے پایۂ تخت کو واپس ہوئی جہاں اُس کے اں ایک لڑکا اوجن پیدا ہوا۔ ملکہ جنگو کے دو بیٹے سوتیلے بھی تھے مگر جنگو نے اپنے بیٹے اوجن کو ولیعہد مقرر کیا اور وہ دونوں لڑکے رو پیٹ کر بیٹھ رہے۔

ملکہ جنگو نے ۶۸ برس تک جاپان پر نہایت بیدار مغزی اور جفاکشی کے ساتھ حکومت کی اور ۲۶۹ء میں ملک جاپان کی حکومت اپنے بیٹے اوجن کے لئے چھوڑ کر مر گئی۔ ملکہ نے سو برس کی عمر پائی تھی۔

چاند بی بی

نادرۃ الزمان چاند سلطانہ۔ نظام شاہ والئ احمد نگر کی بیٹی اور علی عادل شاہ والئ بیجاپور کی ملکہ تھی۔ علی عادل شاہ کے بعد اُس نے بیجاپور کے تخت کو خود سنبھال لیا تھا۔ نہایت بیدار مغز، عدل پرور، جنگجو اور مردانہ دل گردہ کی خاتون تھی۔ مردانہ لباس میں گھوڑے پر سوار ہو کر نکلتی تھی۔ جب اکبر نے بیجاپور پر لشکر کشی کی تو اُس نے بنفس نفیس مقابلہ کیا اور مغل فوج

کے چھکے چھڑا دیئے۔ چاند بی بی کی زندگی تک مغلوں کو بیجاپور کی طرف رخ کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔

۱۵۹۹ء میں بعض نمک حراموں نے اس بیدار مغز ملکہ کے خلاف سازش کر کے یہ مشہور کر دیا کہ اُس نے مغلوں سے ساز باز کر لی ہے۔ اور اسی جرم میں اس کو شہید کر دیا۔ اس خونِ ناحق کا نتیجہ یہ نکلا۔ کہ تھوڑے ہی زمانے کے بعد بیجاپور کی اینٹ سے اینٹ بج گئی اور سلطنت تباہ و برباد ہو گئی۔

جنداں

جنداں مہاراجہ رنجیت سنگھ والئ پنجاب کی چھوٹی رانی اور دلیپ سنگھ کی ماں تھی۔ ۱۸۳۹ء میں جب رنجیت سنگھ نے انتقال کیا تو اُس وقت دلیپ سنگھ کی عمر ۵ سال کی تھی۔ پنجاب میں ایسی ابتری پھیلی کہ یکے بعد دیگرے دو دیوان مارے گئے اور خالصہ فوج نے مظالم کی انتہا کر دی، رانی جنداں سے ضبط نہ ہو سکا اُس نے اپنے ہاتھ میں سلطنت کی وہام لے کر حکومت شروع کی، باضابطہ دربار کرنے اور احکامات جاری کرنے لگی۔ اُس کی جدوجہد کے باوجود خالصہ فوج نے اطاعت اختیار نہیں کی تو رانی نے مجبور ہو کر خالصہ فوج کا حملہ انگریزی علاقہ پر کرا دیا۔ اس حملہ سے رانی کا مقصد یہ تھا کہ خالصہ فوج کا زور ٹوٹ جائے اور انگریزی فوج خالصہ فوج کی سرکوبی کر دے چنانچہ ایسا ہی ہوا مگر اُس کے بعد انگریزوں نے ملک پر قبضہ کر لیا۔ اور انتظامی اختیارات اپنے ریذیڈنٹ کو دے کر رانی جنداں کو ڈیڑھ لاکھ روپیہ پنشن اس شرط پر مقرر کر دی کہ وہ انتظامی معاملات میں دخل انداز نہ ہو۔ مگر رانی جنداں نے اُس کو پسند نہیں کیا اور گورنمنٹ سے اپنے اختیارات طلب کئے۔ گورنمنٹ نے اس خیال سے کہ رانی کو اُس کے دیوان لال سنگھ نے بہکایا ہے۔ لال سنگھ کو اس سے جدا کر دیا۔ رانی لال سنگھ کو بہت چاہتی تھی۔ چنانچہ لال سنگھ کی معزولی کے بعد رانی نے کشمیر اور کابل کے راجپوتوں کو جمع کر کے بغاوت کرنا چاہی مگر بدنصیبی سے عین وقت پر راز فاش ہو گیا اور رانی قید کر لی گئی۔ مگر جنداں ایسی جی دار عورت تھی کہ بنارس سے جہاں وہ قید میں رکھی گئی تھی فرار ہو کر نیپال پہنچ گئی۔ گورنمنٹ نے نیپال سے جنداں حاصل کرنا چاہا۔ مگر نیپال کے راجہ نے اُس کی حوالگی سے انکار کیا اور مدت تک جنداں نیپال میں رہ کر انتقال[1] کر گئی۔

[1] مہارانی جنداں کا انتقال لندن میں ۱۸۶۳ء میں ہوا جبکہ وہ اپنے بیٹے دلیپ سنگھ کے پاس مقیم تھی۔ ایڈیٹر

درگا بائی

درگا بائی بڑی بہادر اور مدبر عورت تھی۔ ساونت واڑی کے راجہ پھوند ساونت دوم نے ۱۸۱۳ء میں انتقال کیا تو کھیم ساونت سوم گدی نشین کیا گیا جو بہت کم سن تھا۔ کھیم ساونت دوم کی دوسری بیوہ رانی درگا بائی تھی۔ جس نے عنانِ حکومت اپنے ہاتھ میں لے کر بڑی بیدار مغزی سے حکومت کرنی شروع کی۔ انگریزوں نے اس کی حکومت کے دو قلعے راجہ کولہاپور کو دے دیئے تھے۔ حکومت برطانیہ نے رانی کو ڈرایا، دھمکایا اور

الٹیمیٹم دیا مگر رانی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ مجبوراً حکومت برطانیہ نے حملہ کر دیا۔ مگر اس کا صدمہ رانی کو اس قدر پہنچا کہ اسی سال یعنی ۱۸۱۹ء میں انتقال کر گئی۔

درگاوتی

درگاوتی گڈھ کے راجہ کنک کی رانی تھی جس نے اپنے شوہر کے انتقال کے بعد گڈھ کی حکومت اپنے ہاتھ میں لی تھی۔ یہ رانی نہایت بہادر اور بڑی جی دار تھی۔ باز بہادر نے گڈھ پر چڑھائی کی تو درگاوتی نے گونڈوں کی جمعیت لے کر اس سختی کے ساتھ باز بہادر پر حملہ کر کے اُسے محصور کر لیا۔ کہ باز بہادر کو تمام لاؤ لشکر چھوڑ کر بھاگنا پڑا اور باز بہادر نے یک بینی و دو گوش جو فرار پر قرار کیا تو سیدھے سارنگ پور پہنچ کر دم لیا۔ درگاوتی نے باز بہادر کی تقریباً ساری فوج کو تہ تیغ کیا اور اُس کا سازوسامان لوٹ لیا۔ ۹۶۸ھ کا یہ واقعہ تاریخ ہند میں ہمیشہ جلی قلم سے لکھا ہوا نظر آئیگا۔

شہنشاہ اکبر نے آصف خاں ہروی کو گڈھ مانک پور بطور جاگیر عطا کیا تو آصف خاں نے گڈھ پر قبضہ کرنا چاہا جب آصف خاں نے فوج کشی کی اور چھ ہزار سوار اور پیادوں کا لشکر لے کر حملہ کیا تو درگاوتی نے اپنے آٹھ سو جانباز سپاہیوں اور چند ہاتھیوں کو لے کر نہایت جوانمردی سے آصف خاں کا مقابلہ کیا مگر بدنصیبی سے عین میدان جنگ میں ایک تیر رانی کی آنکھ میں لگ کر ترازو ہو گیا جس کی وجہ سے رانی کو یہ احساس پیدا ہوا کہ اب وہ جنگ میں کامیاب نہ ہو سکے گی۔ اس احساس کی شدت نے رانی کے حواس پر ایسا غلبہ پایا کہ اُس نے اپنے فیل بان سے خنجر مانگ کر اپنا کام تمام کر لیا۔ ۱۰۰۶ھ کا یہ واقعہ بھی ہمیشہ تاریخ ہند میں نمایاں نظر آئے گا۔

دیوی چودھرانی

دیوی چودھرانی بنگال کے گورنر جنرل وارن ہیسٹنگز کے زمانہ میں ڈاکوؤں کی سردار تھی۔ اُس کا رعب بنگال پر ایسا چھایا ہوا تھا کہ دیسی رؤسا اس کے نام سے لرزہ جاتے تھے۔ بنگال کے نواب شجاع الدولہ میں اتنی قوت نہ تھی کہ وہ چودھرانی اور اُس کے زبردست گروہ کا استیصال کر سکے۔ ان دنوں انگریز صرف دولت جمع کرنے کی فکر میں کچھ ایسے منہمک تھے کہ اُن کو خبر تک نہ تھی کہ آج کل بنگال میں کیا ہو رہا ہے۔ اس موقعہ کو غنیمت سمجھ کر دیوی چودھرانی بنگال کی رانی ہو گئی۔ نواب صاحب بنگال اور انگریز اس بلائے ناگہانی سے سراسیمہ ہو کر منہ تکتے رہ گئے۔ ایک عرصہ کے بعد انگریز جب دولت کے نشہ سے چونکے تو چودھرانی کے مظالم سے بنگال کو نجات دلانے کی کوشش کی اور ایک فوج چودھرانی کی سرکوبی کے لئے روانہ کی۔ چودھرانی نے اپنے ڈاکوؤں کو ساتھ لے کر بڑی مردانگی سے مقابلہ کیا اور میدان جنگ میں شمشیر بکف جاں بحق ہوئی۔

رانی ترالی

رانی ترالی راجہ تیج سنگھ والی ٹیہری (واقع بندیلکھنڈ) کے متوفی بھائی کی بیوہ تھی۔ جب ۱۸۴۲ء میں راجہ تیج سنگھ لاولد مر گیا تو رانی ترالی اُس کی جانشین ہوئی۔ یہ رانی نہایت سمجھدار، روشن دماغ اور روشن خیال تھی۔ اُس نے ۱۸۴۷ء میں اپنے قلمرو سے رسم ستی کے بیہودہ اور بے رحمانہ رواج کو بند کیا۔ ۲۰۰۰ ہزار مربع میل اُس کی ریاست کا علاقہ تھا اور ڈیڑھ لاکھ نفوس پر حکومت کرتی تھی۔ ۱۸۵۷ء میں چاروں طرف غدر ہوا۔ تو اُس نے انگریزوں کا ساتھ دیا اور بہت مدد کی جس کے صلہ میں انگریزوں نے اُس کے خراج کو بہت کم کر دیا۔

رضیہ بیگم

سلطان شمس الدین التمش کی بیٹی اور نہایت اولوالعزم اور بہادر ملکہ تھی۔ اپنے باپ کے بعد اُس نے لڑ کر تخت سلطنت حاصل کیا اور ۱۲۳۶ء میں خود مختار ملکہ بن گئی۔ یہ پہلی مسلمان ملکہ تھی جس نے ہندوستان پر حکومت کی۔ نہایت بہادر، پڑھی لکھی، سلیقہ شعار اور مدبر تھی۔ خدا نے حُسنِ ظاہری اور باطنی دونوں سے سرفراز کیا تھا۔ چونکہ عنفوانِ شباب تھا اور خود مختار بادشاہت کا زعم بھی تھا۔ اس لئے ذرا شوق جو چرایا تو اپنے اصطبل کے داروغہ سے دلچسپی پیدا کر لی[1]۔ ملک کافور حبشی امیر الامراء کے خطاب سے سرفراز ہوا۔ بھلا درباری اُمرا یہ کس طرح برداشت کر سکتے تھے بغاوت ہو گئی مگر پھر بھی ملکہ نے اپنی بہادری کے زعم میں باغیوں سے مقابلہ شروع کیا اور مردانہ وار لڑ کر ۱۲۳۹ء میں شہید ہوئی۔ تقریباً چار سال تک نہایت عدل وانصاف سے حکومت کی۔

[1] یہ بدگمانی کسی یورپین مورخ کی اختراع معلوم ہوتی ہے ۔ ایڈیٹر

مؤرخین کا بیان ہے کہ رضیہ بیگم شعر بھی کہتی تھی چنانچہ بعض تذکروں میں اُس کے یہ شعر ملتے ہیں۔ شیریں تخلص کرتی تھی۔

غلطیدن نورِ رُخِ خورشید ازیں چہ — بسمل شدۂ تیغ نگاہِ غضب ماست
از ماست کہ بر ماست چہ تقصیرِ دلِ زار — آں کشتۂ انداز غم بے سبب ماست

کنم بہ برکت پا چرخ تخت سلطانی — دہم بہ بالِ ہُما خدمت مگس رانی

سکندر بیگم

۱۲۳۳ھ میں پیدا ہوئیں۔ ۱۲۵۰ھ میں نواب جہانگیر محمد خاں سے شادی ہوئی اور ۱۲۵۳ھ میں تخت نشین اور ملک بھوپال ہوئیں مگر تمام کاروبار نواب جہانگیر محمد خاں ہی کے زیر اہتمام رہا۔ ۱۲۶۰ھ میں نواب جہانگیر محمد خاں نے انتقال کیا تو آپ نے اپنی صاحبزادی نواب شاہجہان بیگم کو تخت نشین کرا دیا مگر کاروبار سلطنت خود انجام دیتی رہیں۔ ۱۲۶۳ھ میں گورنمنٹ نے یہی مناسب تصور کیا کہ سکندر بیگم ہی کو تخت نشین رکھا جائے اس لئے دوبارہ انہی کی باضابطہ تخت نشینی ہوئی اور حسب سابق انتظام سلطنت کرتی رہیں۔

۱۸۵۷ء کے غدر میں بیگم نے انگریزوں کی بڑی مدد کی اور ریاست بھوپال میں کوئی فتنہ پیدا ہونے نہیں دیا۔ اس صلے میں گورنمنٹ نے نہ صرف کامل اختیارات دیئے بلکہ ۱۸۶۰ء میں پرگنہ بیرسیا بھی ریاست بھوپال میں ملا دیا گیا۔

بیگم نے اپنے عہدِ حکومت میں فوجی قوت بڑھائی۔ ملک کو زرخیز بنایا اور مالیہ کو نہایت عمدگی سے استحکام دیا۔ پورے ممالک محروسہ کے تین صوبے مقرر کر کے ہر ایک صوبے پر ایک ایک ناظم مقرر کئے اور خود دورہ کر کے ساری ریاست کی اصلاح کی۔

(۲۳۶۱۸۴۱) روپیہ جو سلطنت کا قرضہ تھا ادا کیا گیا۔ جامع مسجد بھوپال کے کھنڈر جسے ملک مغیث نے ۸۳۲ھ میں بنانا شروع کیا تھا مگر غیر مکمل تھی اور اجاڑ ہو گئی تھی، کو از سر نو بنوایا اور ۱۲۸۱ء میں اس کی تکمیل کرا دی۔ موتی مسجد بھی اسی نمونے پر بنوانی شروع کی مگر اُس کی تکمیل نہ ہو سکی۔ ایک باغ فرحت افزا نام سے نہایت عمدہ بنوایا اور ۱۲ رجب ۱۲۸۵ھ مطابق ۳۰ اکتوبر ۱۸۶۸ء میں اسی باغ میں دفن ہوئیں۔

نہایت خدا ترس، عادل، منتظم، مدبر، اور علم دوست خاتون تھیں مذہبی توکل کا یہ حال تھا کہ مرتے وقت اپنی قبر پر مقبرہ نہ بنوانے کی وصیت کی۔

سلطان جہاں بیگم

ہز ہائینس نواب سلطان جہاں بیگم صاحبہ تاج ہند (کراؤن آف انڈیا) جی، بی، ای، جی، سی، ایس، آئی، ملکۂ بھوپال ۲۷ ذیقعدہ ۱۲۷۵ھ م ۹ جولائی ۱۸۵۸ء کو تولد ہوئیں۔ اپنی والدہ نواب شاہجہان بیگم کی نگرانی میں تعلیم و تربیت پائی۔

۲۴ ذالحجہ ۱۲۹۲ھ کو نواب احمد علی خاں سے شادی ہوئی۔ آپ کے بطن سے دو صاحبزادیاں اور تین صاحبزادے تولد ہوئے۔ نواب حمید اللہ خاں بہادر (موجودہ نواب صاحب بھوپال) آپ ہی کے بطن سے ۸ ربیع الاول ۱۳۱۲ھ م ۹ ستمبر ۱۸۹۴ء کو تولد ہوئے۔

۱۳۱۹ھ میں آپ تخت نشین ہوئیں۔ نہایت بیدار مغزی اور دلچسپی کے ساتھ ریاست کے انتظام کئے۔ تقریباً ہر شعبہ کی اصلاح کی۔ مسلم یونیورسٹی اور دارالمصنفین وغیرہ کی بہت مالی امداد کی۔ انجمن ترقی اُردو کی ابتداً میں بڑی مدد کی۔ ہر تعلیمی اور قومی کام میں مدد دیتی تھیں۔ ترقی و تعلیم نسواں میں بہت کوشاں رہیں اور بھوپال میں تعلیم نسواں کی لہر دوڑا دی۔ بڑی اچھی مصنفہ تھیں۔ آپ کی ۱۸ کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن کے مجموعی صفحات تقریباً پانچ ہزار ہوتے ہیں۔

۱۳۲۱ھ میں حج بیت اللہ کیا۔ ۱۹۱۱ء میں یورپ کا سفر کیا۔ ہندوستان کے بیشتر مقامات دہلی، اندور، آگرہ، شملہ، الہ آباد، بمبئی، علی گڈھ، لاہور، لکھنؤ، نینی تال، گوالیار، حیدرآباد دکن وغیرہ بھی ملاحظہ کر چکی تھیں۔

نہایت فیاض، رحمدل، ذی خلق، منتظم، مدبر خاتون تھیں۔ آج سے چند سال پیشتر نواب حمید اللہ خاں بہادر کو اپنا جانشین بنا کر انتقال فرمایا۔

سوگندا رانی

یہ راجہ شنکر ورما کی رانی، راجہ گوپال ورما اور راجہ سنکٹ ورما کی ماں تھی جو اپنے دونوں بیٹوں کے انتقال کے بعد کشمیر کے تخت پر براجمان ہوئی مگر دو ہی سال کے بعد رعایائے کشمیر نے اُس کو تخت سے اس وجہ سے

آتار دیا کہ یہ اپنے وزیر اور خزانچی دونوں سے بدنام تھی۔ سوگندا رانی ۹۰۰ء کے پس و پیش کشمیر پر حکمران تھی۔

سیّدہ

فخرالدولہ دیلمی کی بیوی اور مجید الدولہ کی ماں تھی ۳۸۷ھ میں فخرالدولہ نے انتقال کیا تو اس کا بیٹا مجید الدولہ تخت نشین کیا گیا۔ چونکہ یہ خورد سال تھا اس لئے کاروبار سلطنت سیّدہ نے سنبھال لیا۔ یہ نہایت مدبّرہ، سلیقہ مند اور سمجھدار خاتون تھی اس نے مجید الدولہ کے بالغ ہونے تک نہایت بیدار مغزی سے حکومت کی اور اُس کے بعد تخت سلطنت بیٹے کے حوالے کر دیا۔ مجید الدولہ نے ایک نالائق شخص کو وزیر بنا کر بہت ظلم و زیادتی شروع کر دی سیّدہ نے یہ حالت دیکھ کر الارستان کا رُخ کیا اور وہاں کے حاکم حسین بن بدر سے فوجی امداد لے کر شیراز پر چڑھائی کی۔ مجید الدولہ نے مقابلہ کیا مگر بددل فوج نے ساتھ نہیں دیا۔ سیّدہ نے مجید الدولہ اور اُس کے وزیر ابو علی کو گرفتار کر لیا اور عراق عجم پر خود مختارانہ حکومت کرنے لگی۔

سیّدہ پردہ میں بیٹھ کر دربار کرتی اور نہایت تدبر سے حکومت کرتی رہی مدت کے بعد محض اس خیال سے کہ اب مجید الدولہ سنبھل گیا ہوگا۔ اُس نے مجید الدولہ کو پھر تخت نشین کر دیا۔ اور خود بھی امور سلطنت میں دخیل رہی ۴۲۰ھ میں سیّدہ نے انتقال کیا اور مجید الدولہ نے اپنی نالائقی سے رعایا کو برافروختہ کر دیا تو محمود غزنوی نے ملک پر قبضہ کر کے مجید الدولہ کو بھی قید کر دیا۔ اس طرح عراق عجم کی وہ حکومت جسے فخرالدولہ دیلمی اور سیّدہ نے اپنے تدبر سے قائم رکھا تھا۔ نالائق مجید الدولہ کی بدولت برباد ہو گئی۔

سیمیرامس

طوفانِ نوح سے تین سو سال بعد اور دو ہزار سال قبل مسیح اسیریا یعنی عراق عرب شاہ پالی نس کے قبضہ میں تھا۔ اس بادشاہ نے انتقال کیا تو اس کی ملکہ سیمیرامس نے تختِ سلطنت پر قدم رکھا۔ بابل کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اُسی نے تعمیر کرایا۔ یہ ایک اولوالعزم اور جنگجو ملکہ تھی۔ ابتدأً اس نے اپنی حکومت لبیا سے حبش تک بڑھالی تھی۔ اور پھر ہندوستان کی زرخیزی کا حال سُن کر اس پر حملے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ بہت کم لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ ہندوستان پر شمال غربی حدود سے دارا، سکندر، قاسم، محمود غزنوی، تیمور، بابر، نادر شاہ سے بہت قبل ایک ملکہ نے بھی فوج کشی کی ہے وہ ملکہ یہی سیمیرامس تھی جس نے ایک عظیم الشان لشکر اور سینکڑوں جنگی جہاز لے کر ہندوستان پر حملہ کیا۔ اپنے گھوڑوں کو ہندوستان کے ہاتھیوں سے مانوس کرانے کے لئے اس ملکہ نے اپنے لشکر میں لکڑی کے ہاتھی بنوائے تھے جو اس کی فوج میں گھوڑوں کے ساتھ تھے اس طرح گھوڑوں کے دلوں سے ہاتھیوں کا خوف نکالا گیا تھا۔ چنانچہ ملکہ سیمیرامس نے ۳۰ لاکھ پیادے ۲۰ لاکھ سوار ایک لاکھ رتھ ایک لاکھ سانڈنیاں ۲ ہزار جہاز لے کر براہ باختر ہندوستان پر حملہ کیا۔ اس زمانہ میں شمال مغربی ہند پر ستابریت کا راج تھا۔ راجہ جی نے مقابلہ تو کیا مگر چھکے چھوٹ گئے اور فوج پسپا ہو کر بھاگ گئی۔ ملکہ نے تعاقب کیا اور دور تک پیچھا کرتی ہوئی چلی گئی۔ راجہ نے اپنی منتشر فوج کو بڑی دقت سے جمع کر کے پھر ایک بار قدم جمائے اور دوبارہ مقابلہ شروع کیا۔ ناچار ملکہ کو واپس ہونا پڑا اور راجہ اُسے دباتا ہوا چلا۔ اس طرح ملکہ کو شکست ہوئی مگر ملکہ نے اپنے آپ کو اس طرح بچایا کہ ایک پل جو دورانِ تعاقب میں ملکہ کے لشکر والوں نے تیار کیا تھا۔ اور ملکہ کے واپس ہونے کے بعد اس پر راجہ کی فوج چڑھی ہوئی تھی۔ کٹوا دیا اس طرح راجہ کے ہزارہا سپاہی کام آئے اور ملکہ نہایت اطمینان کے ساتھ اپنے دار السلطنت کو واپس ہو گئی۔

شاہجہان بیگم

۷ جمادی الاول ۱۲۵۲ھ م ۳۰ جولائی ۱۸۳۶ء کو پیدا ہوئیں۔ اپنی والدہ نواب سکندر بیگم صاحبہ ہی کے دامنِ فیض میں تربیت پائی۔ ۱۲۶۳ھ ۱۸۴۸ء میں اپنے والد نواب جہانگیر محمد خاں بہادر کے انتقال پر گدی نشین ہوئیں۔ مگر کاروبار ریاست اُن کی والدہ ماجدہ سکندر بیگم صاحبہ ہی کے تفویض میں رہے۔ ۱۲۷۱ھ میں نواب بخشی باقی محمد خاں نصرت جنگ سپہ سالار ریاست بھوپال سے شادی ہوئی۔ ۱۲۷۴ھ ۱۸۵۸ء میں آپ کے بطن سے نواب سلطان جہاں بیگم اور ۱۲۷۷ھ میں نواب سلیمان جہاں بیگم تولد ہوئیں ۱۲۸۲ھ میں سلیمان جہاں بیگم نے انتقال کیا اور ۱۲۸۴ھ میں نواب باقی محمد خاں نے انتقال کیا۔

۱۳ رجب ۱۲۸۵ھ کو نواب سکندر بیگم صاحبہ نے انتقال کیا۔ تو غرہ شعبان ۱۲۸۵ھ م ۱۶ نومبر ۱۸۶۸ء کو آپ دوبارہ باضابطہ مسند آرائے

ریاست بھوپال ہوئیں دو سال بیوگی میں گزارنے کے بعد پولٹیکل ایجنٹ اور گورنر جنرل وغیرہ کے اصرار پر آپ نے مولوی سید صدیق حسن خاں سے ۱۷ صفر ۱۲۸۸ھ م ۸ مئی ۱۸۷۱ء کو عقد ثانی کیا۔ نواب صدیق حسن خاں بڑے عالم فاضل بزرگ اور سید جلال بخاری مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے خاندان سے اور نواب سید اولاد علی خاں بہادر انور جنگ جاگیردار حیدر آباد دکن کے پوتے تھے۔ جنہیں گورنمنٹ نے نواب بھوپال تسلیم کیا اور والا جاہ امیر الملک خطاب اور ۱۷ توپوں کی سلامی مقرر کی۔ رجب ۱۳۰۷ھ م ۲۰ فروری ۱۸۹۰ء میں نواب صدیق حسن خاں نے انتقال کیا اور آپ چھبیس سال بعد دوبارہ بیوہ ہوگئیں۔

آپ نے ریاست بھوپال میں بڑی اصلاحات کیں۔ ریاست کی جدید تنظیم کی۔ دواخانہ جات قائم کئے۔ مدارس قائم ہوئے۔ یتیم خانے کھلوائے۔ سرکاری مطبع قائم کرایا۔ ریاست سے اخبار نکلوایا۔ سرائیں نہریں، ریلوے لائن، سڑکیں اور بیسیوں عمارات بنوائیں۔ ڈاک خانہ کا باضابطہ انتظام کیا۔ ریاست کے ٹکٹ جاری کئے۔ ۱۸۷۷ء ۱۸۹۶ء اور ۱۹۰۰ء میں یکے بعد دیگرے تین قحط ہوئے اور آپ نے بڑی دور اندیشی سے ریاست کے بجٹ کو برقرار رکھا۔

نہایت نیک دل، مخیر، انصاف پسند، علم دوست خاتون تھیں ۳۱ سال حکومت کرکے ۲۸ صفر ۱۳۱۹ھ م ۱۶ جون ۱۹۰۱ء کو انتقال کیا۔

شجرۃ الدرر

یہ خاتون یورپین نسل سے تھی جو سلاطین بنی ایوب کے پاس بحیثیت حرم پہنچی اور اس گھرانے کے آخری بادشاہ معظم کی ماں بنی۔ جب معظم قتل ہوگیا۔ تو یہ فرار ہوکر امرائے ممالیک سے جا ملی۔ جن کا ان دنوں بہت زور تھا۔ ممالیک نے اس کے ہاتھ پر بیعت کی اور "عصمت الدین ام خلیل" لقب دیا اور ۶۴۸ھ میں اُس نے تخت مصر پر جلوہ فرمایا۔ یہ نہایت پابند مذہب اور روشن خیال ملکہ تھی۔ محمل مصری جو ہر سال بیت اللہ کو بھیجا جاتا ہے اُسی کی اولیات سے ہے۔ سب سے پہلے محمل لے کر اسی خاتون نے حج کیا اور اس کے بعد سے ہر سال ایک خالی محمل میں بیش قیمت غلاف اور نذر رکھ کر بھیجتی رہی جس کا رواج اب تک ہے۔

شمرو بیگم

اس خاتون کے خاندان کا پتہ نہیں چلتا۔ کسی معمولی کشمیری قبیلہ میں پیدا ہوئی تھی۔ قدرت نے صورت، سیرت اور ذہانت تینوں بہترین عطا کی تھیں۔ ابتداً ایک رقاصہ کی حیثیت سے اس نے زندگی شروع کی اور اس پیشہ میں کمال پیدا کرکے بہت مالدار ہوگئی۔ اُنہیں دنوں جبکہ وہ ایک پیشہ ور مغنیہ اور رقاصہ تھی ایک فرنگو جرمن سے آنکھ لڑ گئی جو والٹیر رین ہارٹ کے نام سے موسوم مگر شمرو مشہور تھا۔ اس زمانہ میں انگریز بنگال میں چھینا جھپٹی کر رہے تھے۔ شمرو ابتداً میر قاسم کے سپہ سالار گرگی خاں کی جمعیت میں ملازم تھا۔ اسی زمانہ (۱۷۶۳ء) میں بڑی بڑی لڑائیاں لڑیں۔ اور گرگی خاں کام آیا۔ تو نواب قاسم کے پاس شمرو نے مختار مطلق کی حیثیت حاصل کرلی مگر جب میر قاسم کو بھی رو بزوال دیکھا تو شاہ دہلی کا نوکر ہوگیا۔ اسی زمانہ میں جبکہ وہ شاہ دہلی کا نوکر تھا اُس نے بیگم شمرو سے عقد کیا۔

بادشاہ دہلی نے نگہداشت جمعیت کے لئے سردہنہ بطور جاگیر عنایت کیا۔ جسے اُس نے اپنے اثر اور اندوختہ روپے کے زور سے صوبہ بنالیا۔ ۱۷۷۸ء میں شمرو مرنے لگا تو اُس نے ایک وصیت نامہ کی رُو سے جائیداد جاگیر وغیرہ بیگم شمرو کے نام لکھ دی اور اپنے بیٹے کو جو پہلی بیوی سے تھا محروم کردیا۔ چونکہ سلطنت نے بھی بیگم شمرو کو جائز جانشین تسلیم کرلیا تھا اس لئے بیگم شمرو اپنے خاوند کے مقبوضات پر شاہانہ حکومت کرنے لگی۔ اُس کے پاس فوج کی بہت بڑی تعداد تھی۔ جو قواعد دان اور بہادر تھی۔

۱۸۰۳ء تک بیگم شمرو بادشاہ دہلی کی طرفدار رہی مگر جب اُس نے شاہ دہلی کی حالت مخدوش دیکھی تو انگریزوں کی اطاعت قبول کرلی۔

بیگم شمرو مسلمان گھرانے کی لڑکی تھی۔ اور شمرو کی زندگی بھر مسلمان اور پابند صوم وصلوٰۃ رہی مگر شمرو کے مرنے کے بعد سے اُس کے عقاید بدلنے لگے اور غالباً انگریزوں کے اثر سے اُس نے ۱۷۸۱ء میں رومن کیتھولک کلیسیا میں اصطباغ لیا۔ اور اس کا عیسائی نام جنا رکھا گیا۔ مگر وہ بیگم شمرو ہی کہلاتی رہی۔

ابتدائی زمانہ بیگم شمرو کا آبرو باختگی میں بسر ہوا۔ مگر نکاح کے بعد سے شوہر کے مرنے تک وہ عصمت مآب بنی رہی۔ شوہر کے مرنے کے بعد اُس نے کھُل کھیلنا شروع کیا اور اپنی ہی فوج کے سرداروں سے جو یورپین

تھے ۔ ہوس پوری کرنے لگی ۔ ایک خاص شخص لیوبیسو اس کا چہیتا تھا ۔ جو یورپین کرنیل اور نہایت خوشرو جوان تھا ۔ چونکہ لیوبیسو سے قبل بہت سے آفیسر اُس کے منظورِ نظر رہ چکے تھے اور اس شخص پر بیگم کے ریجھنے کی وجہ سے بیسیوں کا کام رک گیا تھا اس لئے سب چاہنے والوں نے مل کر شورش شروع کی اور بیگم شمرو نے اس آگ کو دبانے کے لئے اپنے ناجائز تعلقات کو عقد کی زنجیر میں کس لیا ۔ مگر اس سے بجائے فائدہ کے نقصان ہوا کیونکہ ظفریاب خاں (الیاس ایلونی سیس رین ہارٹ) جو اس کا سوتیلا بیٹا تھا آمادۂ فساد ہو گیا اور شورش پسندوں کو ملا کر بلوہ کرا دیا ۔ بیگم شمرو لیوبیسو کو ساتھ لے کر بھاگ کھڑی ہوئی اور بلوائیوں نے تعاقب کر کے گرفتار کر لیا ۔ بیگم اور لیوبیسو نے خودکشی کرنی چاہی ۔ لیوبیسو تو کامیاب ہو گیا مگر بیگم اقدام خودکشی میں کامیاب نہ ہو سکی اور زخمی ہو کر رہ گئی ۔ بلوائیوں نے گرفتار کر لیا اور اُس کی تمام جائیداد ضبط کر کے قید کر دیا ۔

کچھ دنوں بیگم کو قید میں رہنا پڑا ۔ اس کے بعد اسی کے ایک پرانے جنرل جارج ٹامس نے اسے قید سے چھڑا لیا اور وہ پھر ایک مرتبہ فارغ البال ہو گئی اور ساتھ ہی ساتھ اُس کے سوتیلے بیٹے ظفریاب خاں نے بھی انتقال کیا ۔

جارج ٹامس بیگم کا ہوا خواہ اور کارپرداز تھا ۔ خود بیگم نہایت سمجھدار اور منتظم تھی اس نے سردھنہ کے اطراف میں پچاس میل کا علاقہ اپنے مقبوضات میں شامل کر لیا تھا ۔ اور اپنے صوبے کو وسیع بنا کر نہایت ہوشیاری، سلیقے اور دانشمندی سے حکومت کرتی رہی اس کے علاقہ میں نہایت امن وامان تھا ۔ اُس نے زراعت کو بہت ترقی دی ۔ بہت سی اصلاحیں کیں ۔ بیگم بڑی مدبرہ جفاکش اور سخت مزاج تھی ۔

اگرچہ وہ عیسائی ہو چکی تھی مگر لباس وہی ہندوستانی مسلمان عورتوں کا پہنتی اور فارسی اُردو ہی بولتی تھی ۔ دربار میں برقعہ پہن کر نقاب پوش شریک ہوتی تھی ۔ وہ کھانا میز پر کھاتی تھی مگر اُس کی خدمت کرنے والے خدمتگار مرد نہ تھے بلکہ عورتیں تھیں ۔ دسمبر ۱۸۲۲ء میں اس کے متعلق بری خبریں مشہور ہو گئیں ۔ اور بشپ ہیبر اس کی تحقیقات کے لئے آیا اور اُس نے جو کچھ دیکھا ایک رسالہ میں شائع کیا جس کا کچھ حصہ نقل کیا جاتا ہے ۔

" اس کی سکونت جاگیر کے عین وسط میں بمقام سردھنہ ہے (جو میرٹھ سے بارہ میل کے فاصلہ پر ہے) وہ ایک عجیب وغریب بڑھیا ہے اُس کی آنکھیں چمکدار نہیں ہیں ۔ مگر ان سے شرارت ٹپکتی ہے ۔ حسن کے آثار اُس کے خدوخال میں موجود ہیں وہ نہایت ہوشیار، حاضر جواب عورت ہے مگر صرف ہندوستانی بولتی ہے ۔

اس کی عقلمندی اور بہادری کی وجہ سے جو اُس نے مرہٹوں کی لڑائی میں دکھائی تھی (جن میں اس نے خود گھوڑے پر سوار ہو کر اپنی فوج کی کمان کی تھی) اس کے تمام سپاہی اور اُس کی رعایا اور قرب وجوار کے لوگ اس کا ادب اور احترام کرتے ہیں ۔ مگر وہ نہایت بے رحم اور سخت ہے ۔ چونکہ اُس کو اپنی مملکت میں لوگوں کی موت اور زندگی پر اختیار حاصل ہے اس لئے اُس کے مظالم کی بہت سی روائتیں سننے میں آتی ہیں ۔"

ایڈوکیٹ آف انڈیا میں ایک صاحب نے اُس کے حالات شائع کرتے ہوئے لکھا ہے ۔ کہ

" بیگم شمرو میدان جنگ میں ایک بہادر سردار تھی اور انتظام مملکت میں بڑی مدبّر اور قابل حکمران ۔ اُس کا زمانہ نہایت ترقی کا رہا ہے ۔ اور امن وامان کے لئے ضرب المثل ہو گیا ۔ اگرچہ سردھنہ کی یہ حالت ہے کہ وہ ایک معمولی گاؤں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا ۔ مگر اس وقت اس کے تحت ایک صوبے کا صوبہ تھا جس سے بہتر کسی اور صوبے کا انتظام نہ تھا ۔"

حکومت نے بیگم کی خدمات کے مدنظر اُس کو زیب النسا کا خطاب دیا تھا ۔ اُس نے روپے کا استعمال ہمیشہ بڑی عمدگی سے کیا ۔ بڑھاپے میں وہ بالکل سیدھی سادی، نیک دل، حلیم الطبع، مہربان، مہمان نواز ہو گئی تھی ۔ گرجاؤں، محتاج خانوں وغیرہ کی بہت امداد کرتی تھی ۔ کئی ایک محتاج خانے خود اس نے قائم کئے تھے ۔ ہندو مسلمانوں کے اداروں کی بھی بہت قدر کرتی تھی ۔ مسجدوں، مندروں اور خانقاہوں کی امدادیں جاری تھیں ۔ عیدین کے دربار کیا کرتی تھی ۔ اُس کی فوج میں ہندو مسلمان افسر تھے جن سے یکساں بے تعصبی کا برتاؤ کرتی تھی ۔ ۱۸۳۶ء میں اس بیگم نے انتقال کیا اور اب تک لوگ اُس کا نام عزت واحترام سے لیتے ہیں ۔

عائشہ خاتون

عائشہ خاتون اتابک زنگی کی محل خاص اور اتابک خاندان کی آخری ملکہ گذری ہے ۔ تخمیناً ۶۵۹ھ میں سریر آرائے تخت شیراز ہوئی ۔ عائشہ خاتون بہت نیک اور پاکدامن تھی ۔ یہ علماء اور شعراء کی بڑی سرپرست تھی ۔ اور

اُن کو اپنے دربار میں بلا کر اُن کے مباحثوں کو بغور سنتی تھی۔

اتابک زنگی نے شیراز کو حتی الامکان تہذیب و تمدن اور صنعت و حرفت کی معراج تک پہنچانے کا بیڑا اُٹھایا تھا۔ مگر قضا نے اس کے تمام ارادوں پر پانی پھیر دیا۔ لیکن عائشہ خاتون نے کوشش کر کے اپنے شوہر کے ارادوں کی تکمیل کی اور بڑی حد تک اس میں کامیاب رہی۔ اس کا شوہر وہی اتابک زنگی ہے جو شیخ سعدیؒ کا ممدوح تھا۔

عصمت بیگم

نواب حیات محمد خاں کی بیگم تھیں۔ قدرت نے دل و دماغ، تدبر و سیاست کے ساتھ حسن و جمال بھی عطا کیا تھا۔ نواب حیات محمد خاں کی زندگی میں سارا کاروبار عصمت بیگم کرتی تھیں۔ اُن کے زمانے میں بھوپال کا دیوان ایک نومسلم چھوٹے خاں کا بیٹا امیر خاں تھا۔ اُنہوں نے اسے علیحدہ کر کے اپنے خاندان کے ایک شخص سلطان محمد خاں کے پوتے مرید محمد خاں کو دیوانی دی۔ خود پس پردہ بیٹھ کر دادخواہوں کے معروضات سنتی اور احکام صادر کرتی تھیں۔ اُن کی نگرانی میں بھوپال کی رعایا نہایت امن و اطمینان سے زندگی بسر کرتی تھی۔

۱۲۱۱ھ میں مرید محمد خاں نے دغا سے اس بیدار مغز بیگم کو شہید کر دیا۔ بھوپال میں ماجی صاحبہ کے بعد انہیں بیگم کا نام لیا جاتا ہے۔

فاطمہ

ملک شام کی فرمانروا تھی۔ چونکہ کتب سماوی اور فن کہانت میں بہت دخل تھا۔ اس لئے اس نے یہ پتہ چلا لیا تھا کہ ایک نبی مکہ میں پیدا ہوگا۔ جو آخری اور برگزیدہ نبی ہوگا۔ اس خیال نے اُس کے دل میں یہ خواہش پیدا کی کہ نبی آخرالزمان اُس کے بطن سے ظہور میں آئیں تو خوش قسمتی ہوگی۔ چنانچہ اُس دُرِّ نبوت کو اپنے صدفِ بطن میں لینے کے لئے فاطمہ نے مکہ کا سفر کیا۔ مگر پروردگار عالم نے یہ سعادت حضرت آمنہؓ کے لئے مخصوص کر دی تھی۔ بالآخر فاطمہ کو بے نیل و مرام واپس ہونا پڑا۔

قطر الندیٰ

خلیفہ المعتضد باللہ کی حرم تھیں۔ معتضد کی وفات کے وقت چونکہ مقتدر باللہ کمسن تھا اس لئے قطر الندیٰ نے کاروبار سلطنت اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ یہ خاتون خود دربار کرتی تھی۔ سفیروں سے گفتگو کرتی اور محکمۃ المظالم میں بیٹھ کر خود فیصلہ کرتی تھی۔ باہر نکلتی تو امراء اور شرفاء کی بیویاں اسے گھیرے ہوئے رہتیں۔ اپنے محل میں علمی ادبی مجالس کرتی جن میں بڑے بڑے علماء جمع ہوتے تھے۔

علامہ جلال الدین سیوطی کا بیان ہے کہ "محکمۃ المظالم میں دربار کرتی ہر جمعہ کو لوگوں کی عرضیاں لیتی۔ اکثر دربار عام کرتی۔ قاضیوں اور رئیسوں کو حکماً طلب کرتی۔ فرامین شاہی اپنے دستخط سے جاری کرتی تھی۔"

۳۰۶ھ میں اس نے ایک شفاخانہ بھی بغداد میں قائم کیا تھا۔ جس میں مریض رہتے تھے اور اس کے مصارف سالانہ سات ہزار دینار ہوتے تھے۔ یہ خاتون احمد بن طولون کی بیٹی اور خمارویہ کے بطن سے تھی ۲۸۲ھ میں المعتضد باللہ سے عقد ہوا تھا اور یہ اپنے ساتھ دس صندوق جواہرات سے بھرے ہوئے جہیز میں لائی تھی۔ اس کا سنہ جلوس ۲۸۹ھ ہے۔

کاہنہ

یہ حبشی نژاد ملکہ عجیب و غریب دل گردہ کی خاتون تھی۔ موسیو لیبان نے اسے بہت سراہا ہے۔ ابتداً شمالی افریقہ میں اس کی ایک چھوٹی سی ریاست تھی۔ مگر اس نے اپنی تلوار کے زور سے کل شمالی افریقہ پر قبضہ کر لیا تھا، عربوں نے اس حصہ کو اس کے ہاتھ سے چھیننے کی بہت کوشش کی مگر اُس نے طرابلس سے طبخہ تک سارا ملک برباد کر دیا تاکہ عرب قابض نہ ہو سکیں عربوں کی طرح یونانیوں کو بھی اس نے بہت تنگ کیا اور ان دونوں قوموں پر

اپنی عظمت وجبروت کا سکہ بٹھا کر چھوڑا۔ افسوس ہے کہ ایک لڑائی میں کام آگئی۔ ورنہ معلوم نہیں اپنی فتوحات کو کس قدر وسعت دیتی۔

کلیوپیٹرا

۶۹ سنہ ق،م، میں ملکہ کلیوپیٹرا اپنے بھائی کے ساتھ تخت مصر پر جلوہ آرا ہوئی مگر ظالم بھائی نے تھوڑے ہی دنوں کے بعد اسے مصر سے نکال دیا۔ کلیوپیٹرا یوسف بے کارواں بنی ہوئی جولیس سیزر کے پاس پہنچی۔ جولیس سیزر نے اس یوسف صفت ملکہ کو زلیخا بنا کر پھر تخت مصر پر بٹھا دیا۔

مصر پر حکومت تو اس نے خوب کی مگر خواہشات نفس نے اخلاقی پہلو کمزور کر دیا۔ انطونی سے اس کی محبت کی داستان مشہور ہے۔ بالآخر انطونی کے ساتھ اس نے بھی خودکشی کی۔ اس زاہد فریب ملکہ نے مصریاں خوب دادعشرت دی ہے۔ نہایت ذہین، ذکی اور تیز تھی۔ اطراف کی شہنشاہیوں کے جو سفیر آتے یہ ان سے انہیں کی زبان میں گفتگو کرتی تھی۔ مصر میں اُس کے بنائے ہوئے مینار اب بھی باقی ہیں۔

گوہر بیگم

نواب غوث محمد خاں کی صاحبزادی تھیں۔ ۱۲۱۶ھ ۱۷۹۹ء میں پیدا ہوئیں۔ ۱۵ سال کی عمر میں نواب نظر محمد خاں سے عقد ہوا۔ میجر ہیوگ نے اپنی کتاب تاریخ بھوپال (مرتبہ ۱۸۴۴ء) میں لکھا ہے کہ "اُن کی تعلیم باقاعدہ ہوئی تھی اور دماغ نہایت اعلیٰ پایا تھا۔ تھوڑے ہی عرصہ میں ریاست کا کام سنبھالنے اور تمام امور کو خود انجام دینے کے قابل ہوگئیں۔" شادی کے دوسرے سال آپ کے ہاں ایک صاحبزادی تولد ہوئی۔ جس کا نام نواب سکندر بیگم رکھا گیا۔ سکندر بیگم کی ولادت کے دوسرے ہی سال گوہر بیگم بیوہ ہوگئیں اور کاروبار ریاست اُنہیں کو سنبھالنا پڑا۔ ابتداً نواب سکندر بیگم کی نسبت منیر محمد خاں سے ہوئی مگر شادی سے پہلے ہی منیر محمد خاں اور اُن کے والد نے اختیارات حاصل کرنے کی خاطر جنگ شروع کر دی اور گوہر بیگم نے نسبت فسخ کر کے منیر محمد خاں کو نکال باہر کیا۔ اس کے بعد منیر محمد خاں کے چھوٹے بھائی جہانگیر محمد خاں سے نسبت ہوئی۔ اور ۱۲۵۱ھ میں پولٹیکل ایجنٹ نے زبردستی شادی کرا دی۔ ۱۸۳۷ء تک گوہر بیگم ہی انتظام ریاست کرتی رہیں۔ اس کے بعد بڑی ردوکد اور جنگ وجدل کے بعد پولٹیکل ایجنٹ نے اختیارات جہانگیر محمد خاں کے سپرد کر دیئے۔

نواب گوہر بیگم صاحبہ نہایت جی دار، مدبر، رعایا پرور اور سیاسی دماغ رکھنے والی خاتون تھیں۔

لچھمی بائی

رانی لچھمی بائی جھانسی کے راجہ گنگادھر کی مہارانی تھی۔ راجہ گنگادھر نے انتقال کیا تو اُس نے گورنمنٹ سے خواہش کی کہ راجہ کے متبنّیٰ لڑکے کو تخت نشین کیا جائے۔ مگر لارڈ ڈلہوزی نے درخواست نامنظور کی۔ اور جھانسی کو گورنمنٹ نے اپنی سیادت میں لے کر لچھمی بائی کے نام پنشن جاری کر دی اور ریاست جھانسی جن قرضوں میں مبتلا تھی وہ قرضے رانی کی پنشن میں سے ادا کیے جانے لگے۔ حالانکہ قرضے ریاست کے تھے اور رانی کی پنشن ذاتی تھی۔ اس پر برافروختہ ہو کر رانی نے ۱۸۵۷ء میں جھانسی کی سرکاری فوج کو ہموار کر کے بغاوت کر دی۔ اور قلعہ کا محاصرہ کر کے اس میں جس قدر یورپین وغیرہ تھے۔ سب کو قتل کرا دیا۔ اور اپنی مطلق العنانی کا اعلان کر کے حکومت شروع کی۔ پرانی گڑی ہوئی توپیں نکلوا کر انہیں درست کرایا۔ اور بیس ہزار فوج سے ۱۸۵۸ء میں سرہیوروز کے مقابل ہوئی۔ سرہیوروز نے قلعہ فتح کر لیا۔ تو وہ ہزار فوج لے کر رانی فرار ہوگئی۔ اور کالپی کے راستے میں ڈیرے ڈال کر ٹھیر گئی۔ پھر گوالیار ہوتے ہوئے آگے بڑھی۔ مگر راستہ میں بمقام مراد انگریزوں کی فوج نے گھیر لیا۔ اور اس جی دار رانی نے تلوار سونت کر مقابلہ کرتے ہوئے ۱۷ جون ۱۸۵۹ء کو اپنی جان آزادی کی دیوی کی نذر کی۔

ماجی

آپ کا اصلی نام ممولا تھا اور قدسیہ کا خطاب دربار مغلیہ سے سرفراز ہوا تھا۔ ریاست بھوپال کی رعایا آپ کی شفقت مادرانہ کی وجہ سے آپ کو ماجی کہتی تھی۔ آپ کسی شریف ہندو گھرانے سے تھیں اور نواب یار محمد خاں نے آپ سے نکاح کیا تھا۔ آپ کے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ مگر آپ نے اپنے سوتیلے بیٹے فیض محمد خاں کو گود میں لے کر پرورش کیا۔ چونکہ یار محمد خاں کے انتقال کے وقت فیض محمد خاں کمسن تھے۔ اس لئے یار محمد خاں نے انہیں تخت نشین کر کے ماجی ہی کو سارے کاروبار کا اختیار دیا تھا۔ ماجی نے نہایت دوراندیشی سے ریاست سنبھالی اور بھوپال کو یار محمد خاں کے

بھائی سلطان محمد خاں اور مرہٹوں کے شر سے بڑی عمدگی سے بچایا۔

پیشوا اور شاہ دہلی سے بھی آپ نے مصالحت کر لی تھی ۱۲۹۲ھ میں فیض محمد خاں نے انتقال کیا تو ماجی نے حیات محمد خاں کو تخت نشین کیا اور خود بھی مشورہ دیتی رہیں۔ آپ نے ریاست بھوپال میں کئی ایک مسجدیں اور تالاب بنوائے۔ نہایت نیک دل، سخی اور دوراندیش خاتون تھیں۔ سر جان ملکم نے اپنی کتاب ممائرس آف سنٹرل انڈیا میں لکھا ہے کہ

"اس عالی دماغ رئیسہ کی تاریخ حیرت انگیز ہے اس نے اسی سال کی عمر میں وفات پائی اور نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک بھوپال کی کونسل پر اپنا اثر قائم رکھا حالانکہ اسے پورا اختیار نہ تھا۔ . . . وہ جیسی رحمدل تھی ویسی ہی منصف مزاج بھی تھی اور لوگوں میں محبوب بھی۔ بھوپال کے تمام ہندو مسلمان ابھی تک اُسے یاد کرتے ہیں۔ اُس کا زمانہ ایک ایسا نمونہ تھا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ظلم و ابتری کے زمانے میں بھی نیکی اور راست بازی کو احساس او جوش کے ساتھ معہ اُن اعلیٰ اوصاف کے وہ قائم رکھ سکی جو انسانی فطرت کے بہترین جوہر ہیں۔

ماجی نے اسی سال کی عمر پاکر انتقال کیا۔

ماہِ تاباں

ابن بطوطہ ہندوستان سے ہوتا ہُوا جزیرہ ہتیان کے سامنے صوبہ "کوانسی" (ابن بطوطہ نے اُس کو طوالسی لکھا ہے) میں جا پہنچا۔ یہ صوبہ ٹانکن اور کانٹن کے درمیان واقع ہے۔ کوانسی میں شاہ دیدخاں خان ترکستان کی بیٹی اسے یارُوق (ماہ تاباں) حکومت کرتی تھی۔ اُس نے عہد کیا تھا۔ کہ جو شہزادہ مجھے لڑائی میں مغلوب کرے گا اُس سے شادی کرونگی۔ ہزاروں شہزادے اس سے مقابلہ کرنے آئے مگر کوئی بھی مغلوب نہ کر سکا۔ جو شہزادہ اُس کو مغلوب نہ کر سکتا یا اس سے مغلوب ہو جاتا تھا اُس کو شہزادی گرفتار کر لیتی تھی اور سو گھوڑے عمدہ نسل کے لے کر چھوڑ دیتی تھی۔ اس طرح شاہزادی نے دس ہزار گھوڑے جمع کئے تھے۔ جب تک وہ زندہ رہی اسے کوئی مغلوب نہ کر سکا اور نہ اس نے شادی ہی کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۳۰۱ء میں شہزادی ماہ تاباں کا عالم شباب تھا۔ ابن بطوطہ نے اپنے سفرنامے میں لکھا ہے۔

"ملکہ نے اپنے سیّاح اور ناخدا کو بھیج کر مجھے بلوایا۔ وہ دربار میں بیٹھی ہوئی تھی اس کے سامنے عورتیں کھڑی تھیں جن کے ہاتھوں میں عصیاں تھیں اور اکثر عورتیں ملکہ کے پاس بیٹھی ہُوئی تھیں۔ اس کے تخت پر ریشم کا فرش تھا اور ریشم کے پردے بھی لٹک رہے تھے۔ تخت صندل کی لکڑی کا بنا ہُوا تھا اور لکڑی پر سونے کے پترے لگے ہوئے تھے اور تخت کے اطراف میں سونے کے ظروف رکھے ہوئے تھے جن میں شربت تھا۔ جب میں نے ملکہ کو سلام کیا تو اُس نے ترکی زبان میں مزاج پوچھ کر اپنے قریب بٹھا لیا۔ ملکہ عربی لکھنا اچھی طرح جانتی تھی دوات قلم منگوا کر ایک کاغذ پر بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھ کر کہا یہ کیا ہے؟ میں نے کہا یہ خدا کا نام ہے پھر پوچھنے لگی کس ملک سے آرہے ہو میں نے کہا ہندوستان سے۔ کہنے لگی کالی مرچوں کا ملک؟ میں نے کہا ہاں، پھر اس نے ہندوستان کا حال پوچھا اور کہنے لگی میں اُسے ضرور فتح کرونگی۔ پھر مجھے کپڑے۔ دو ہاتھی۔ چاول۔ دو جاموش اور دس بکریاں، چار رطل گلاب اور چار مرتبان ادرک، مرچ، لیمو، آم، کے آچار دیئے۔ ناخدا نے کہا ملکہ کے لشکر میں عورتیں ہیں جو مردوں کو ساتھ لے کر لڑتی ہیں۔ اور مردوں کا دندان شکن مقابلہ کرتی ہیں۔ ناخدا یہ بھی کہتا تھا کہ ملکہ تخت سلطنت پر بیٹھنے سے قبل ایک دفعہ کسی لشکر سے مقابلہ کے لئے گئی۔ دشمن نے ملکہ کے لشکر پر اس زور سے حملہ کیا۔ کہ ملکہ کا لشکر پیچھے ہٹنے لگا۔ ملکہ خود صفیں چیرتی ہوئی آگے بڑھی۔ اور مقابل کے بادشاہ پر اس زور سے نیزے کا وار کیا کہ وہ سنبھل نہ سکا۔ اس کا سر کاٹ کر اپنے نیزے کی انی پر رکھ کر لشکر میں واپس آگئی۔ اسی بہادری کے صلے میں ملکہ کے باپ نے اس کو حاکم شہر کر دیا۔ اکثر شہزادے اس سے نکاح کرنا چاہتے ہیں مگر وہ اس سے نکاح کرنا چاہتی ہے جو اسے زیر کرے۔ لیکن کوئی شہزادہ اس کے مقابلہ کے لئے آگے نہیں آتا۔"

مہارانی سورنمی

مہارانی سورنمی راجہ کرشناناتھ کی رانی تھی اکتوبر ۱۸۴۴ء میں جب راجہ نے خودکشی کی تو گورنمنٹ نے راجہ کی وصیت کی بنا پر اُس کی راجدھانی پر قبضہ کرلیا۔ مگر رانی نے عدالت میں نالش کی اور عدالت العالیہ کی تحقیق سے یہ ثابت ہوگیا کہ راجہ وصیت کرتے وقت اپنے ہوش وحواس میں نہ تھا تمام جائداد رانی کے حوالے کر دی گئی۔ رانی جب پورے طور پر ریاست کی مالک ہوگئی تو اس نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ ریاست کا وہ قرضہ جو راجہ کے زمانہ میں ہوگیا تھا ادا کیا اور آہستہ آہستہ اپنی آمدنی کو بڑھا کر بڑی بڑی ریاستوں کے برابر کر لیا۔ یہ رانی بہت نیک دل اور فیاض تھی۔ اس کی فیاضی اور نیک دلی کی وجہ سے ۱۸۷۲ء میں سرکار انگلشیہ نے اسے مہارانی کے خطاب سے سرفراز کیا۔ ۱۸۷۴ء کے قحط میں اُس نے بہت عمدہ طریقہ سے قحط زدوں کی خدمات کیں۔ جس کی وجہ سے ۱۸۷۵ء میں اسے متبنٰی لینے کی اجازت دی گئی اور ۱۸۷۸ء میں کراؤن آف انڈیا کے اعزاز سے سربلند ہوئی اور اس موقع پر کمشنر صاحب نے قاسم بازار میں سر دربار مہارانی سورنمی کی فیاضیوں کا اعتراف کرتے ہوئے فرمایا۔ کہ مہارانی نے ۱۸۴۷ء سے ۱۸۷۸ء تک رفاہ عام کے مختلف کاموں میں پانچ لاکھ روپیہ کا چندہ دیا ہے۔

ملکہ جہان

سلطان ہمایوں شاہ بہمنی کی بیگم سلطان نظام شاہ اور سلطان محمد شاہ ثانی کی ماں تھی۔ ۱۴۶۱ء میں ہمایوں کا انتقال ہوا تو اُس کا بیٹا سلطان نظام شاہ جس کی عمر آٹھ سال تھی۔ سریر آرائے تخت ہوا لیکن سلطنت کا کاروبار ملکہ جہاں اپنے دو معتبر وزیروں خواجہ محمود گاوان اور خواجہ جہان کے مشورے سے کرتی رہی۔ سلطان نظام شاہ کے تخت نشین ہوتے ہی اطراف واکناف کے راجاؤں نے دکن پر حملہ کیا مگر ملکہ جہاں کی حُسن سعی سے ہر ایک کو شکست ہوئی۔ جب ملکہ جہان کو ان لڑائیوں سے فراغت حاصل ہوئی تو ملکہ نے بڑے تزک واحتشام سے نظام شاہ کی شادی خاندان شاہی کی ایک لڑکی سے کی۔ مگر افسوس ہے کہ شب عروسی کو آدھی رات گئے محلسرا سے رونے اور واویلا کرنے کی آوازیں بلند ہوئیں اور دولہا بستر عروسی پر مردہ پایا گیا اور یہ معلوم نہ ہوسکا کہ نظام شاہ کی موت کس طرح واقع ہوئی۔

نظام شاہ کی ناگہانی موت کے بعد ملکہ جہاں نے نظام شاہ کے دوسرے بھائی سلطان محمد شاہ کو ۱۴۶۳ء میں تخت نشین کیا اور خود بدستور سابق ریاست کا کام کرتی رہی۔ اور چودہ برس کے سن میں محمد شاہ کی شادی ایک بہمنی خاندان کی لڑکی سے کر کے خود کاروبار سلطنت سے دست بردار ہوگئی۔

ملکہ جہان کا نام نرگس بی اور خطاب ملکہ جہاں تھا یہ ملکہ نہایت مدبّر اور دور اندیش تھی۔ سلطنت کے کاروبار پردہ میں بیٹھ کر انجام دیتی تھی۔ اس کے زمانۂ حکومت میں رعایا اس قدر خوش تھی کہ سب لوگ اسے مخدومۂ جہاں پکارتے تھے۔

موتی بیگم

نواب یار محمد خاں کی صاحبزادی اور مجید محمد خاں کی بیوی تھیں۔ قدرت نے آغوشِ شوہر سے بہت جلد جدا کر دیا تھا۔ اس لئے بیوگی میں اپنی زندگی گزارتی تھیں ۱۲۱۱ھ میں عصمت بیگم کے شہید ہونے کے بعد مرید محمد خاں نے قلعہ اسلام نگر پر حملہ کیا۔ تو موتی بیگم نے قادر خاں قلعدار کو مقابلہ کا حکم دیا اور خود کھڑے ہو کر توپیں لگوادیں۔

سر جان ملکم نے لکھا ہے۔ کہ

"مرید محمد خاں نے اپنے معاونین کو اسلام نگر کا قلعہ دے دیا۔ لیکن جو کچھ وزیر نے خوف سے دیا تھا اسے ایک افغان بیوہ موتی بیگم نے بچا لیا۔ مرہٹوں نے جس وقت دروازہ بند کر کے فیر کرنا شروع کر دیا۔ تو اُس نے کہا میں نہیں جانتی کہ کس کے حکم سے مرید محمد خاں نے بھوپال کا قلعہ دے دیا۔ میں ہرگز اپنی قیام کی جگہ میں کسی اجنبی کو قدم رکھنے کی اجازت نہ دونگی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس عالی دماغ عورت کے خیال پر تمام بھوپال کی فوج جھک پڑی کیونکہ تمام مرہٹہ فوج مجبور ہو کر واپس ہوگئی۔"

افسوس ہے کہ اس دلیر خاتون کے اور حالات نہ مل سکے۔

نندو کنور بائی

آپ کو سی۔ آئی کا اعزاز حاصل تھا گونڈل کی مہارانی تھیں ایک طویل علالت کے بعد صحت یاب ہوئیں تو ڈاکٹروں نے سیاحت کا مشورہ دیا آپ

نے ۱۹۱۰ء کے اوائل میں قریب قریب سارے یورپ کا سفر کیا اور ایک نہایت دلچسپ سفرنامہ شائع کیا جو گجراتی زبان میں ہے۔ نہایت فاضل اور علم دوست خاتون تھیں۔

نورجہاں

یہ ستارہ اپنے والدین کے گھر اُس وقت طلوع ہوا۔ جب وہ صعوبت سفر کے ساتھ زحمتِ فاقہ کشی میں بھی مبتلا تھے۔ اس نومولود کو اُنھوں نے جنگل میں چھوڑ دیا۔ اور تقدیر نے بجائے کسی بھیڑیے کی غذا بنانے کے، ایک قافلہ کے متمول سوداگر کی گود میں لا ڈالا اور پھر لطف یہ کہ اُس کی انّا ہی مقرر کی گئی جس نے اسے جنا تھا۔ مہرالنسار نام رکھا گیا اور سوداگر کی بیوی نے بیٹی کی طرح پرورش اور تربیت کی۔ اپنی آغوشی ماں کے ساتھ مہرالنسار محلات میں بھی جانے لگی۔ اور جہانگیر سے محبت ہوگئی۔ جب جہانگیر نے اکبر سے خواہش کی کہ مہرالنسار سے نکاح کر دیا جائے تو اکبر نے مہرالنسار کا نکاح شیرافگن سے کر دیا۔ اور شیرافگن خاں کو کالنجر کی جاگیر دے کر دہلی سے چلتا کیا۔

جہانگیر کو اس کا بڑا صدمہ ہوا۔ اور اس نے ولیعہدی کے سارے زمانے میں یہ داغِ دل روشن رکھا۔ تختِ سلطنت پر متمکن ہوتے ہی اس نے شیرافگن سے خواہش کی کہ مہرالنسار کو طلاق دیدے۔ مگر شیرافگن نے منظور نہیں کیا۔ اس پر بھی جہانگیر نے صبر کیا مگر قسمت تو یہی چاہتی تھی۔ کہ شیرافگن کی مہرالنسار جہانگیری کرے۔ اسی لئے شیرافگن نے انتقال کیا اور نورجہاں بیوہ ہوکر حرم جہانگیری میں داخل ہوئی۔

جہانگیر نے ابتداً نورمحل اور پھر نورجہاں کا خطاب دیا اور خود جام و سبو سنبھال کر اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ نورجہاں نے وہ جہانگیری کی کہ آج بھی جہانگیر کا عدل و انصاف اور انتظامِ مملکت مشہور ہے۔ یہ سارا کام نورجہاں کرتی تھی۔

نورجہاں گھوڑے پر سوار زنانہ گارڈ ساتھ لئے نکلتی۔ جھروکے سے فوج کا معائنہ کرتی اور سلامی لیتی۔ سلطنت کا بجٹ بناتی اور حکومت کا پورا کاروبار کرتی تھی۔ بڑی اچھی شہسوار اور قادر انداز تھی۔ تیر سے شیر کا شکار کرتی تھی۔

بڑی رعایا نواز، انصاف پسند اور علم دوست تھی۔ نورجہاں نے ۱۶۴۶ء میں انتقال کیا اور لاہور میں دفن ہوئی۔

وجیا مکتمیا

رانی وجیا میہی مکتا بائی کے بعد تانجور کی رانی مقرر ہوئیں ۱۸۵۸ء میں تاجِ ہند کا اعزاز ملا۔ اس رانی نے تانجور میں سنسکرت کالج قائم کیا تھا جو اب مدراس یونیورسٹی سے ملحق ہوگیا ہے۔

ویدارانی

راجہ کھیمہ گپت والئ سری نگر کی رانی راجہ لوہر کوٹ کی بیٹی اور راجہ ابھیمنیو کی ماں تھی۔ راجہ کھیمہ گپت کے انتقال کے وقت ابھیمنیو بہت کمسن تھا اس لئے اس کو وارث تخت و تاج ٹھیرا کر ویدارانی خود حکومت کرتی رہی۔ اور ابھیمنیو کے بالغ ہونے کے بعد بھی اس کو کاروبار سلطنت میں دخل دینے نہ دیا۔ ابھیمنیو تیرہ سال دس ماہ برائے نام راجہ رہ کر مرگیا تو اُس کے بیٹے نندی گپت کو ۹۹ء میں تخت نشین کیا گیا مگر اصل حکمران رانی ہی رہی۔ کچھ عرصہ بعد نندی گپت نے کاروبار سلطنت میں مداخلت شروع کی۔ تو ویدارانی کو بہت ناگوار گزرا۔ اور اپنے پوتے کو زہر دے کر ختم کر دیا۔ یہ بدنصیب راجہ صرف ایک سال ایک ماہ نو روز حکمران رہا اس کے بعد اس کا بھائی تریبھون گپت تخت نشین ہوا مگر اس کو بھی ڈائن ویدارانی نے صرف دو سال کی حکومت کے بعد روانۂ ملک عدم کیا۔ اس کے بعد اس کے بیٹے بھیمہ گپت کو جو ابھی نابالغ تھا تخت نشین کیا گیا۔ مگر یہ بھی برائے نام راجہ رہا۔ اسی زمانہ میں سری نگر کا وزیر پھلگن مرگیا تو رانی نے اپنے ایک آشنا کلشن دیو کو وزیر بنایا اور پھلگن وزیر کے ساتھ دوسرے وزیر بوئی نامی کو زہر دے کر ہلاک کر دیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد تونگ نامی ایک گوجر رانی کے نام خطے کر پونچھ سے آیا اور رانی نے بجائے خط لینے کے خود نوجوان گوجر سے آنکھیں لڑائیں۔ اول اول اس سے خفیہ تعلق رکھا۔ مگر بعد کو اس سے شادی کر لی۔ جب بھیمہ گپت نے ہوش سنبھالا تو اُس کو اپنی دادی کی یہ حرکات اور نئے دادا کی اطاعت گراں گزرنے لگی۔ جب رانی کو اپنے پوتے کی ناراضگی کا حال معلوم ہوا تو رانی جی نے نہایت اطمینان سے اپنے پوتے کو اس کے اپنے باپ دادا کے پاس چلتا کر دیا۔ یہ پوتا صرف پانچ سال چار ماہ حکمران رہا۔

آخرکار ویدارانی اپنے بیٹوں، پوتوں اور پرپوتوں کو حکومت اور

ہوس رانی کی خاطر زہر دے دے کر ہلاک کر کے ۹۹۸ء میں بلا شرکتِ غیرے تخت نشین ہوئی اور اٹھارہ سال چار ماہ آٹھ دن حکومت کر کے ۱۰۱۷ء میں اپنے وجود سے دنیا کو پاک کر گئی۔

ہُما

بہمن بن اسفندیار فرمانروائے ایران کی دُختر تھی۔ بہمن کے انتقال کے بعد شہزادی ہُما سریر آرائے تختِ ایران ہُوئی اور ۳۰ برس تک بہت استقلال سے امن و امان کی حکومت کر کے اپنی مرضی سے تخت و تاج سے دست بردار ہو گئی۔ ملکہ ہُما کے عہدِ زریں کا ادبی کارنامہ ہزار افسانہ ہے۔ یہ وہی افسانہ ہے جس کی تقلید میں الف لیلیٰ لکھی گئی۔

حوالے

بیگمات بھوپال — داستان ترکتازانِ ہند۔ دولت یار جنگ
بتانِ حرم — محمد الدین فوق رسالہ زمانہ کانپور۔ مئی و جون ۱۹۱۰ء
تاریخ اسلام۔ امیر علی — رسالہ دلکش لاہور۔ دسمبر ۱۹۱۶ء
تاریخ فرشتہ۔ فرشتہ — سلطنت خداداد۔ محمود مارسٹن
تاریخ روما۔ ایچ۔ الف پیلہم — سفرنامہ۔ ابن بطوطہ
تاریخ سلطنت روما۔ جے بیوری — صحیفۂ زریں۔ پراگ نرائن
تاریخ الخلفاء۔ جلال الدین سیوطی — کارنامۂ حیدری۔
تاریخ ہند۔ ہاشمی — میموائرس آف سنٹرل انڈیا۔ جان ملکم
تاریخ ہند قدیم۔ اے سمتھ مترجمہ خلیل الرحمٰن۔ مشرقی تمدن کا آخری نمونہ۔ شرر
تاریخ دکن۔ اختر یار جنگ و فصاحت جنگ۔ مشاہیر نسواں۔ محمد عباس
تاریخ دکن۔ ابوالاعلا احمد عارف — مخدرات تیموریہ۔ ظہور الحسن۔
تاریخ اودھ۔ کمال الدین حیدر — نگارستانِ کشمیر۔ قاضی ظہور الحسن ناظم
تاریخ بھوپال۔ میجر ہیوگ — واقعات مملکت بیجاپور۔ بشیر الدین احمد
حیدر علی۔ محمود مارسٹن — ہندوستان کی شہزادیاں۔ عبدالرحمٰن شوق
حیاتِ صلاح الدین۔ سراج الدین احمد — ہندورانیاں۔ وکیل ٹریڈنگ کمپنی

تسکین عابدی

غزل

پھول سونگھے، جانے کیا یاد آگیا!!
دل عجب انداز سے لہرا گیا!

اُس سے پوچھے کوئی چاہت کے مزے
جس نے چاہا اور جو چاہا گیا

ایک لمحہ بن کے عیشِ جاوداں
میری ساری زندگی پر چھا گیا

غنچۂ دل ہائے! کیسا غنچہ تھا
جو کھلا اور کھلتے ہی مرجھا گیا

رو رہا ہوں موسمِ گل دیکھ کر
میں سمجھتا تھا مجھے صبر آگیا

یہ ہوا، یہ برگِ گل کا اہتزاز
آج مَیں رازِ مسرّت پا گیا

اختر اب برسات رخصت ہو گئی
اب ہمارا رات کا رونا گیا

اختر انصاری دہلوی

ذیابطیس
خطرناک درجہ پر
ذیابطیس میں متواتر مبتلا رہنے والے بیماروں کا یقین ہے کہ یہ مرض عمر بھر رہتی ہے
اس مرض میں گرفتار شخص پرانی طرز کے علاج معالجہ پر سب کچھ ہی نہیں بلکہ اپنی استطاعت
سے بھی زیادہ خرچ کرکے نہایت ہی قابل رحم حالت پیدا کرلیتا ہے۔ وہ جسم کو کمزور
بنا دینے والے فاقوں اور نہ ختم ہونے والے قیمتی انجکشنوں کی جانب رجوع ہوتا ہے،
لیکن بیماری بدستور قائم رہتی ہے۔
مرض ذیابطیس کی علامتیں یہ ہیں جن کو ہر ایک مریض بخوبی جانتا ہے۔
پہلا درجہ
کمزوری۔ کمی وزن۔ اعصابی (پٹھوں کی) نقاہت۔ مالیخولیا۔ رانوں کا
درد۔ ضعف چشم۔ بدن پر خشکی۔
دوسرا درجہ
کمزوری میں اضافہ۔ بے حد اعصابی ناطاقتی۔ نظر خراب۔ زیریں حصہ
میں احساس کی کمی۔ بھوک پیاس کی شدت۔ جسم میں کمزوری۔ زیادتی پیشاب جسکے
ساتھ شکر بھاری مقدار میں آتی ہے۔
تیسرا درجہ
جسمانی طاقت کا بالکل کم ہوجانا۔ جلد کی مختلف بیماریوں کا ظہور۔ پنڈلیوں
میں گنگرین آنا۔ جوڑوں کا درد۔ گوشت کا گل جانا۔ عام اعضا اور رگوں و پٹھوں کا ڈھیلا پڑجانا
اور بعض حالتوں میں ذیابطیسی غنودگی کا طاری رہنا۔ یہ وہ گہری نیند ہے جو موت کا
موجب ثابت ہوتی ہے۔
لیجئے! یہ ایک جدید علاج ہے جو انجکشن۔ محدود غذا اور فاقوں کا خاتمہ کرتا ہے
موجودہ زمانے میں سائنس کی تحقیقات نے ثابت کردیا ہے کہ ذیابطیس کی کئی کئی وجوہات
ہیں۔ نہ کہ صرف ایک ہی وجہ ہے۔
ڈایامیلن جس کی بنا۔ ایک حیرت انگیز نئی تھیوری پر
قائم ہے اس مرض کے پانچوں اصلی اسباب کا مقابلہ کرتی ہے
ہزاروں مریض کامیابی کے ساتھ
ڈایامیلین
کے استعمال سے شفایاب ہوچکے ہیں
ذیابطیس کے متعلق نئی تھیوری ہوم ٹریٹمنٹ ہے۔
یہ چھوٹی کتاب جو
مفت دی جاتی ہے
آپ اپنے شہر کے کیمسٹ سے۔ یا
دوافروش سے اس پتہ سے طلب
کرسکتے ہیں اس کتاب سے
آپ کو ذیابطیس کے متعلق
مفصل بیان ملیگا۔
اور نئی
ڈایامیلن دریافت کے
متعلق واقفیت حاصل ہوگی۔
DIAMELIN
A Specific for Diabetes
ابھی حاصل کیجئے
کل پر نہ چھوڑیئے
پوسٹ بکس نمبر ۱۰۷ کلکتہ
POST No. 107
CALCUTTA
ڈایامیلن ریسرچ لیباریٹری

غزل

وہ رنگ دے تابِ عاشقی میں جو حُسن کو لاجواب کردے
مری نظر میں وہ برق بھر دے جو تجھ کو بھی بے حجاب کر دے

کہاں ہے وہ لطفِ نازِ تیرا وہ عشوۂ جاں طراز تیرا
نگاہ تیری جو میرے ہر لفظِ آرزو کو کتاب کر دے

مری نظر کو تلاش تیری مری نظر تجھ کو ڈھونڈھتی ہے
مری حقیقت کے خواب رنگیں مجھے بھی نیرنگِ خواب کردے

کہاں ہے اے مست ہوش ساقی سرورِ لرزاں خمارِ رقصاں
مجھے بھی سرجوشِ بے خودی دے مجھے بھی موجِ شراب کردے

غمِ جدائی سے خاک ہوں میں، وہ نالۂ زار اے محبت
وہ کاسہ چشم تر جو گردوں کو بھی طلسمِ حباب کر دے

خرد کی دنیا عتاب میں ہے جنوں مرا پیچ و تاب میں ہے
سکوں بھی اب اضطراب میں ہے سکوں کو بھی اضطراب کردے

غمِ محبت بلائے جاں ہے ستم ہے یارب ستم ہے یارب!
مجھے جنوں کا شباب کردے مری وفا کو خراب کر دے

کہاں کا ذکر بقائے ہستی ؟ ہے کس کو فکر دوامِ مستی ؟
جہان بھر کی ہوس پرستی مرے لئے انتخاب کردے

کہاں کا جبر اختیار کیسا نہ عقل میری نہ عشق میرا،
مرے گناہوں پہ عفو ہی کر مری خطا کو ثواب کر دے

محال ہے ضبطِ شوق تائب میں مضطرب اس نگاہ کا ہوں
جو میرے آئینہ محبت کے حسن کو آب آب کر دے

مراتب علی تائب

پلیکن
کیا آپ نے کبھی کسی بلی کو دودھ
کھانے کا سلیقہ
پینے دیکھا ہے؟ بلی صرف اپنی زبان
کی نوک ہی استعمال کرتی ہے پلیکن
فاؤنٹین پین کا بھی یہی حال ہے۔ اس قلم
کو بھرنے کے لئے صرف ½ انچ سیاہی میں
Rs. 18/-
ڈبونے کی ضرورت ہے اور اسی لئے باقی سارا قلم
صاف ستھرا رہتا ہے۔ اس کے علاوہ پلیکن فاؤنٹین پین
میں اور بھی کئی خوبیاں ہیں جن کی وجہ سے اسے مارکیٹ میں سب سے محفوظ قلم کہا جاتا ہے
اس قلم کو خریدنے سے آپ ایک اچھا سودا کریں گے۔ لوکل سٹاکسٹس:۔
پنجاب ریلیجس بک سوسائٹی۔ انارکلی۔ لاہور
سٹنڈرڈ بک ڈپو۔ مال روڈ۔ لاہور

جلد کو
AFGHAN SNOW
مخمل کی طرح نرم، نازک،
ملائم اور خوبصورت رکھنے کے لئے
افغان سنو
استعمال ہوتی ہے
اس سنو میں وٹامین اے ہے
جس سے چہرے اور جسم کی جلد
کی خوبصورتی اور ملائمی میں اضافہ ہوتا ہے
افغان سنو
سول ایجنٹ:۔ پاٹنوالا لمیٹڈ۔ عبدالرحمن سٹریٹ بمبئی نمبر۳
برانچ:۔ ۲۷ کیننگ سٹریٹ کلکتہ

آپٹریکس
آنکھوں کی ماندگی کے لئے
آپٹریکس سلیوشن سے آنکھوں کو دھو
ڈالئے۔ زمانہ حال کے ضرر رساں حالات میں
کام کرنے سے جس خطرناک نتائج کے پیدا ہونے کا خدشہ ہے
ان کے لئے حفظ ماتقدم کا کام دے گا۔
ہر معزز دوا فروش سے مل سکتا ہے۔
سول ایجنٹ
نوبل اینڈ کمپنی نمبر ۱۹ اپارسی بازار سٹریٹ بمبئی

اثرستان

آج کچھ مہربان ہے صیّاد کیا نشیمن بھی ہوگیا برباد؟

دہر اک جلوۂ خود آرائی اللہ اللہ شوخئ ایجاد!

چمنِ عشق میں بہار آئی گل تیشہ ہے اور سرِ فرہاد

میں ہوں بدنام، حسرتیں بدنام دلِ ناکام! اب ہے کیا ارشاد؟

کوئی ترکِ ستم پہ مائل ہے ہاں دلِ دردمند! ہاں فریاد!!

آرزو تھی کہ وہ اِدھر دیکھیں ہوش رخصت ہوئے مبارکباد!

اب ہے یہ رنگِ یاس و محرومی دل سے پھرتی ہے دُور نیری یاد

غمِ طاقت گداز، دشمنِ صبر نفسِ گرم، رہزنِ فریاد

ایک طوفانِ اشک آنکھوں میں اور ہر اشک "آبلہ بنیاد"

کوئی ہندو کوئی مسلماں ہے عشق ہے اپنا مشرب آزاد!

دل سے کیوں مطمئن ہیں آپ اثرؔ!

پھر یہ حرماں سرا نہ ہو آباد!

جعفر علی خاں اثرؔ بی اے

طاقت
اور
تندرستی کیلئے
بچوں کو
ڈونگرے کا بال امرت
پلانا چاہئیے
اس کے استعمال سے بچوں کی کھانسی بخار رفع ہوتے ہیں
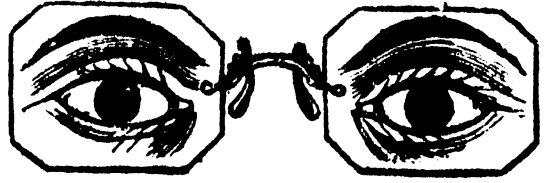
بینائی کی حفاظت اور چہرے کی خوبصورتی
ہمارے یہاں ہر قسم کا سامان نہایت عمدہ اور سستا ملتا ہے
اصلی پتھر کے چشمے۔ آئز گلاس اور نئے ڈیزائن کے فریم بکفایت ملتے
ہیں چشمے ڈاکٹری نسخے کے مطابق بھی نہایت حسن وخوبی سے تیار کئے
جاتے ہیں اور آنکھوں کا معائنہ کیا جاتا ہے۔ بیوپاریوں کیلئے
خاص رعایت ہے۔ باتصویر فہرست مفت طلب کریں ادبی دنیا
کا حوالہ ضرور دیں
دی ایسٹرن آپٹیکل کمپنی رجسٹرڈ
ہول سیل اینڈ ریٹیل ۲۲۳ عبدالرحمن سٹریٹ بمبئی نمبر ۳
برانچ آفس ایسٹرن آپٹیکل کمپنی ۳۰۶/306 بوبازار کلکتہ

دنیائے ادب

معزز الفاظ کی توہین اردو زبان میں

قوموں کی ترقی اور تنزل اور عروج و زوال کے اسباب و محرکات پر غور کرنے والے اور ملکوں کی معاشرتی و تمدنی تاریخ کے ماہر اس امر سے بخوبی واقف ہیں کہ جب کوئی قوم بامِ عروج سے پستی کی طرف گرنی شروع ہوتی ہے تو اس کی ہر حرکت اور اس کے ہر قول میں عام طور پر دنائت کمینگی اور سفلہ پن پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے اخلاق خراب ہو جاتے ہیں۔ اُس کی مالی حالت بدتر ہو جاتی ہے۔ اس کی جسمانی حالت کمزور ہو جاتی ہے۔ اُس کی اولوالعزمی اور ہمت جاتی رہتی ہے۔ علم کا شوق اس میں باقی نہیں رہتا۔ زمانہ بھر کی بدکاریاں بدتمیزیاں اور بے ہودگیاں اس میں آہستہ آہستہ پیدا ہو جاتی ہیں۔ اور سب سے زیادہ بول چال اور زبان اس قدر خراب ہو جاتی ہے جس کی انتہا نہیں۔

بات بات پر مردوں کا گالیاں بکنا اور عورتوں کا کوسنے دینا اس قوم کا روز مرہ معمول ہو جاتا ہے اور پھر گالیاں بھی اتنی فحش اور گندی کہ ایک سنجیدہ آدمی تو ان کو سن کر لرز اٹھے۔ یہ دیوانگی یہاں تک بڑھتی ہے کہ آدمیوں کو چھوڑ کر اس قسم کے وحشی انسان جانوروں یہاں تک کہ بے جان چیزوں کو بھی ایسی ایسی مقفّٰی گالیاں دیتے ہیں کہ آدمی سن کر حیران ہو جائے۔ مبالغہ نہیں واقعہ ہے کہ میں نے بوڑھے بوڑھے مہذب انسانوں کو اپنے لڑکوں اور دوسرے کے بچوں کو نہایت پیار میں "بدمعاش" کہتے سنا ہے اور سچ پوچھو تو یہ بھی بہت ہی معمولی لفظ ہے۔ سامعین میں سے سینکڑوں اصحاب نے لوگوں کو محض پیار میں اپنے شیر خوار بچوں اور گود میں کھیلنے والے لڑکوں کو بہت بڑی بڑی گالیاں دیتے دیکھا اور سنا ہوگا۔ اس واقعہ کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ ہماری گالیاں کھاتے کھاتے اور سنتے سنتے ہمارا معصوم لختِ جگر خود بھی اپنے ہمجولیوں کو گالیاں دینے لگتا ہے۔ اب چونکہ ہمارا بویا ہوا درخت پھل لانے لگتا ہے۔ لہٰذا ہماری خوشی کی کوئی حد نہیں رہتی۔ بہت سی مائیں اس بات کی آرزو کیا کرتی ہیں کہ ہمارا ننھا کب بڑا ہو اور کب وہ باہر سے کسی بچے کو گالیاں دے کر آئے اور ہمارا دل ٹھنڈا ہو۔ اور درحقیقت وہ دن ماں کے لئے عید کا دن ہوتا ہے۔ اس سلسلہ میں اکثر دیکھا گیا ہے کہ والد بزرگوار بڑے شوق سے بیٹے کو سکھا رہے ہیں کہ "ہاں بیٹا! اپنی ماں کو یہ گالی دو" اور جب بچہ اپنی توتلی زبان میں باپ کے حکم کی تعمیل کرتا ہے تو سارا گھر مارے ہنسی کے لوٹن کبوتر بن جاتا ہے۔ بچے کی خوب پیٹھ ٹھونکی جاتی ہے اور اس سے بار بار وہی گالی ماں کو دلوائی جاتی ہے۔ انصاف اور غور کیجئے کہ اس سے زیادہ اخلاق کو تباہ کرنے والی اور کیا چیز ہو سکتی ہے!

معاملہ صرف اسی حد تک نہیں رہتا بلکہ ہم نے ایک قدم آگے بڑھایا ہے اور زبان کے وہ الفاظ جو نہایت مقدس و متبرک یا بے حد معزز اور محترم تھے۔ آج کل ہم نے اُن کو ایک نیا لباس پہنایا ہے۔ جس کے بعد ان لفظوں کی شکل بالکل مسخ اور برعکس ہو گئی ہے اور ہمارے اخلاق کی خرابی اور مذاقِ سلیم کی بد ذوقی کی وجہ سے جو لفظ جتنا زیادہ مقدس تھا وہ اب اُتنا ہی بدترین سمجھا جاتا ہے اور جو لفظ جس قدر زیادہ معزز تھا آج کل وہ اتنے ہی ذلیل معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ مثلاً چند الفاظ عرض کرتا ہوں:۔

(۱) "حضرت" اس سلسلے میں سب سے زیادہ جس مقدس لفظ کی توہین اور بے عزتی کی جا رہی ہے وہ لفظ "حضرت" ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ لفظ خدا تعالیٰ کے پاک نبیوں، اولیاء اور مقدسین مذاہب کے نام کے ساتھ تعظیماً استعمال کرنے کے لئے وضع کیا گیا تھا مگر اردو زبان کی بدقسمتی اور ہماری کور ذوقی دیکھئے کہ آج کل یہی مقدس ترین لفظ بدترین شریر، نہایت اوباش اور چھٹے ہوئے بدمعاش بے حد چالاک، عیار اور مکار انسان کے لئے بولا جاتا ہے۔ افسوس صد افسوس۔

(۲) "خلیفہ" یہ لفظ مذہب اسلام کی نہایت مقدس اصطلاح ہے۔ اللہ تعالیٰ یا انبیائے کرام کے نائبین کو اس معزز لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔ جیسے خلیفۃ اللہ یا خلیفۃ الرسول۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا "انی جاعل فی الارض خلیفۃ" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشینوں کو "خلفائے راشدین" کہتے ہیں لیکن آہ کس قدر افسوس ہے کہ اس قدر متبرک لفظ ہماری زبان میں آ کر اپنی تمام عزت و وقعت کھو بیٹھا اور آج کل نائی اور حجام یا پہلوان کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔

(۳) "صلواۃ" اس لفظ کو دیکھئے اور ہماری اخلاقی حالت پر روئیے۔ کون نہیں جانتا کہ اس کے حقیقی اور واقعی معنی "نماز" "دعا" درود "بخشش اور خدا کی رحمت و سلامتی" کے ہیں۔ مگر درحقیقت رونا آتا ہے جب ہم کسی سے یہ فقرہ سنتے ہیں "خواہ مخواہ اُس نے مجھے ہزاروں صلواتیں سنائیں" مطلب یہ ہے کہ بہت سی گالیاں دیں۔ اب بتلائیے نماز دعا اور گالی اور دشنام میں کتنا فرق ہے؟ مگر ہم روزمرہ یہ لفظ بولتے ہیں اور کبھی قطعاً ہمیں خیال نہیں آتا کہ کس قدر پاک اور متبرک لفظ کو کتنی بُری اور بے ہودہ جگہ استعمال کر رہے ہیں۔

(۴) "علامہ یا علامۂ دہر" فاضل یگانہ اور عالم بے مثل اس لفظ کے معنی ہیں۔ جو ظاہر ہے کہ بہت بڑا لفظ ہے مگر ہماری قدر دانی دیکھئے کہ آج کل یہ لفظ بڑی حرافہ نہایت چالاک، بڑی عیارہ اور نہایت دھوکا باز عورت کے لئے بولا جاتا ہے۔

(۵) "ملا" اس لفظ کا بھی حشر اردو میں آ کر علامہ جیسا ہوا۔ اس کے معنی بھی بہت بڑے عالم اور فاضل ادیب کے ہیں۔ اس سے زیادہ اس لفظ کی بدقسمتی اور کیا ہوگی کہ ایک زمانہ تھا جب کہ یہ لفظ فیضی ابوالفضل اور جامی جیسے فضلائے یگانہ کے ناموں کا جز تھا اور آج کل جاہل، بے وقوف، کودن اور احمق کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ نیز ان فقیر نما انسانوں کے لئے جو مسجدوں کے حجروں میں رہتے اور محلہ کے گھروں کی روٹیوں پر جو بطور خیرات وہ دونوں وقت مانگ کر لے آتے اور گزر کرتے ہیں۔

(۶) "مولوی یا مولانا" اس لفظ کے معنی ہیں وہ شخص جو خدا کا ہو رہے۔ یا صاحب علم۔ مگر اس لفظ کی آج کل وہ مٹی پلید ہوئی ہے کہ خدا کی پناہ مسلمانوں میں ہر وہ شخص جو تحریک خلافت، تحریک ہجرت اور ترک موالات میں شامل تھا یا جس نے ذرا سی داڑھی رکھ لی بس وہ مولوی ہے۔ خواہ کندۂ ناتراش اور جاہل محض ہی ہو۔ یہ لفظ جہلا کے لئے اب اس قدر کثرت سے استعمال کیا جانے لگا ہے۔ کہ اصلی اور حقیقی عالم اپنے آپ کو مولوی کہلاتے ہوئے شرمانے لگے ہیں۔

(۷) "قبلہ" مسلمانوں کے سب سے زیادہ مقدس مقام کعبہ کو قبلہ کہتے ہیں یعنی جدھر منہ کر کے سب مسلمان پانچ وقت نماز ادا کرتے ہیں۔ مگر آج کل اخلاق اس قدر خراب ہو گئے ہیں کہ ہر اچھے لفظ کو قصداً نہایت بُرے معنوں میں ڈھال لیا گیا ہے۔ چنانچہ قبلہ آج کل نہایت عیار مکار اور چالاک آدمی کے متعلق بولتے ہیں۔

(۸) "اللہ" اب بھلا بتائیے کہ خدا تعالیٰ سے زیادہ مقدس ہستی ایک مسلمان کے لئے اور کون سی ہو سکتی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ اس قادر و قیوم ذات کو بھی ہم نے خالی نہ چھوڑا۔ وہ ذات پاک جو آسمانوں اور زمینوں کی مالک اور ان کی خالق ہے، وہ شہنشاہ جو دونوں جہانوں کا مالک اور آقا ہے ہم نے اس کے متعلق جو فقرے اور محاورے ایجاد کر رکھے ہیں۔ وہ انتہائی غریبی اور مفلسی کو ظاہر کرتے ہیں۔ چنانچہ جب ہم کہیں گے کہ "گھر میں اللہ ہی اللہ ہے" یا "اللہ کا نام ہے" تو ہمیشہ اس کے یہی معنی ہوتے ہیں کہ گھر میں نہایت مفلسی غریبی اور محتاجی ہے اور اس وقت محتاج یا سائل کو دینے کے لئے کچھ بھی نہیں۔ کتنے افسوس کا مقام ہے کہ اس مطلب کو ظاہر کرنے کے لئے ہم نے نام بھی چھانٹا تو اس ذات اقدس کا جس کے قبضۂ قدرت میں تمام جہان کے خزانے ہیں اور بڑے بڑے باجبروت شہنشاہوں کو دم کے دم میں خاک میں ملا سکتا ہے۔ کیا ہمیں دنیا جہان میں کوئی اور لفظ اللہ کے سوا اس مطلب کو ظاہر کرنے کے لئے نہیں مل سکتا تھا؟

(۹) "انشاء اللہ" قرآن کریم میں خدا تعالیٰ کا تاکیدی حکم ہے کہ جب تم کسی کام کا وعدہ کرو تو ساتھ ہی یہ بھی کہہ لیا کرو کہ "اگر خدا نے چاہا"۔ اگلے زمانے میں مسلمانوں کا وعدہ پتھر کی لکیر ہوتا تھا۔ اور مخاطب "انشاء اللہ" کا لفظ سنتے ہی پورے طور پر اپنے کام کی طرف سے مطمئن ہو جاتا تھا اور وعدہ کرنے والے شخص پر بھی انشاء اللہ کہنے کے بعد (یعنی خدا کو اپنے وعدے پر گواہ کر لینے کے بعد) اس وعدے کا پورا کرنا بے حد ضروری ہو جاتا تھا۔ مگر یہ سب کچھ پہلے زمانے کی باتیں ہیں جو قصے کہانیوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں آج کل کے مہذب اور روشن زمانے میں جب انشاء اللہ کا لفظ کسی کے منہ سے نکلتا ہے تو مخاطب کو فوراً اس بات کا یقین ہو جاتا ہے کہ یہ سب ٹالنے کی باتیں ہیں اور یہ شخص ہرگز ہرگز میرا کام نہیں کرے گا۔ میں نے اکثر لوگوں کو انشاء اللہ کے جواب میں یہ کہتے سنا ہے کہ "انشاء اللہ نہیں، پکا وعدہ کرو" مطلب

یہ ہے کہ انشاء اللہ کہنا وعدہ خلافی اور کام نہ کرنے کا آج کل یقینی ثبوت سمجھا جاتا ہے۔ افسوس۔[1]

(۱۰) "اُستاد"۔ ماں باپ کے بعد تعظیم و تکریم کے لحاظ سے اُستاد کا درجہ اخلاق کی قدیم کتابوں میں تسلیم کیا گیا ہے۔ مگر ہماری بول چال میں آکر اس لفظ کے معنی نہایت چالاک، فریبی اور دغاباز کے ہو گئے۔ زمانے کا انقلاب ہے۔

(۱۱) "گرُو"۔ اس لفظ کی قسمت بھی بالکل لفظ استاد کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔

(۱۲) "مرشد" اس لفظ کے معنی عربی میں ہادی، رہنمائے مذہبی، ہدایت کرنے والا، راہ بتانے والا۔ اور پیرِ طریقت کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اپنے حقیقی معنوں کے لحاظ سے یہ لفظ کس قدر مقدس اور محترم ہے۔ مگر اردو کے سانچے میں ڈھلا اور بازاری آدمیوں کی زبان پر چڑھا تو اس کے معنی بڑے چلتے پرزے اور عیار و مکار اور چالاک انسان کے ہو گئے۔ نہ معلوم تمام اقسام کے بدترین اور بے ہودہ مطالب کو ظاہر کرنے کے لئے مقدس ترین الفاظ کے خزانے پر کیوں ڈاکہ ڈالا گیا۔ میں نہایت ممنون ہوں گا اگر کوئی صاحب اس کی معقول اور مدلل وجہ بتائیں گے۔

(۱۳) "ولی" اس لفظ کے معنی ہیں خدا کا خاص مقرب بندہ اور اس کے عشق میں سرشار۔ مگر ہمارے ہاں آکر یہ لفظ مرشد سے بھی زیادہ بدترین معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ آپ نے مشہور مصرعہ سنا ہو گا۔

ہم تو مرشد تھے تم ولی نکلے۔

(۱۴) حافظ جی۔ کیسا سیدھا سادا اور عام فہم لفظ ہے۔ اس کے معنی ہیں وہ شخص جس نے قرآن پاک حفظ کر لیا ہو۔ مگر یار لوگوں نے اس کے معنی اندھے کے بنا لئے یا پھر مسجد کے ملا کے چاہے وہ دو لفظ الحمد بھی پڑھے ہوئے نہ ہوں۔

(۱۵) "جہاد" یہ ایک مقدس مذہبی اصطلاح ہے جس کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ کے دین کی اشاعت اور خداوند کریم کی رضا کی خواہش میں اپنی جان لڑا دینا لیکن وائے بدقسمتی کہ آج کل یہی مقدس لفظ ہر بغاوت، ہر سرکشی اور ہر فتنہ و فساد کی آگ کو بھڑکانے کے وقت بہت فخریہ طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ ہندوستان کے موجودہ دور میں کون ہے جس نے "جہاد آزادی" اور "جہاد حریت" کے لفظ نہیں سنے۔؟[2]

(۱۶) "معجزہ" ہندوستان میں آکر جس قدر اس مقدس لفظ کی بے عزتی ہوئی ہے۔ شاید ہی کسی کی ہوئی ہو۔ یہ خالص مذہبی اصطلاح ہے جس کے معنی ہیں وہ عظیم الشان غیر معمولی نشان جو سوائے نبی اور رسول کے دنیا میں کوئی اور شخص نہ دکھا سکے۔ مذہبی اصطلاح میں یہ لفظ صرف نبی کے لئے بولا جاتا ہے کسی اور کے لئے ہرگز نہیں یعنی اگر کسی ولی یا قطب یا غوث یا ابدال سے کوئی نشان ظہور میں آئے تو اُسے بھی معجزہ نہیں کہیں گے۔ مگر یہ مقدس مذہبی اصطلاح آج کل بہت ہی معمولی معمولی کاموں کے لئے استعمال ہونے لگی ہے۔ امراض خبیثہ اور شرمناک بیماریوں کے اشتہارات پر جو ہر اخبار میں بیسیوں ہوتے ہیں۔ آپ اکثر لفظ "معجزہ" موٹے موٹے حروف میں لکھا ہوا پائیں گے۔ للہ مجھے کوئی شخص بتائے کہ کیا یہ حرکت اس مقدس لفظ کی صریح توہین نہیں؟

(۱۷) "مومن"۔ اس لفظ کے معنی ہیں نہایت سچا اور پکا مسلمان اور نیک مرد۔ لیکن اس سے زیادہ ستم ظریفی اور کیا ہوگی کہ آج کل اس لفظ سے نہایت احمق اور بے وقوف مراد لی جاتی ہے اور جلاہے جو بدقسمتی سے بے وقوفی میں ضرب المثل ہو چکے ہیں، اس نام سے پکارے جاتے ہیں۔

(۱۸) "بہشتی" یہ بھی مومن کے ٹائپ کا لفظ ہے۔ لفظی معنی ہیں بہشت میں رہنے والا یا جنت میں جانے والا۔ لیکن ہماری زبان میں سقے اور ماشکی کو کہتے ہیں اور اس کی ایک نہایت بے وقوفانہ تاویل یہ بنا رکھی ہے کہ چونکہ سقا پانی بھرتا ہے۔ اور پانی پلانا چونکہ ثواب کا کام ہے۔ اور ثواب کا کام کرنے کا نتیجہ جنت ہے لہٰذا اس مناسبت سے سقہ کو بہشتی کہا جاتا ہے۔ چاہے وہ صرف ایک ڈول مشک میں ڈال کر پھونک سے ہی ساری مشک پھلا لے مگر کہلائے گا بہشتی ہی۔ ع

بریں عقل و دانش بباید گریست

(۱۹) "قلندر"۔ آج کل کے زمانے میں کون یقین کر سکتا ہے کہ اس لفظ کے معنی تارک الدنیا اور باخدا انسان کے ہیں جب کہ یہ لفظ موجودہ عہد میں بے غیرت اور بے حیا آدمی کے لئے بولا جاتا ہو اور ریچھ اور بندر نچانے والے قلندر پکارے جاتے ہوں۔ اگر مشہور بزرگ حضرت بو علی شاہ قلندر رحمۃ اللہ علیہ پانی پتی کو پتہ ہوتا کہ میرے بعد اس معزز لفظ کی یہ گت بنے گی تو ہرگز اپنے آپ کو قلندر نہ کہلواتے۔

(۲۰) "مجذوب" یہ لفظ بھی قلندر کا بھائی ہے۔ اس کے معنی ہیں خدا کی محبت اور اس کے عشق میں ڈوبا ہوا۔ لیکن آج کل اردو لغت کی کتابیں کھول کر دیکھ لو صاف لکھا ہوا پاؤ گے کہ مجذوب۔ سڑی، پاگل، بے وقوف اور احمق آدمی کو کہتے ہیں۔

---

[1] انشاء اللہ کی تخریب کے متعلق سر سید علیہ الرحمۃ کا مضمون "انشاء اللہ" ملاحظہ فرمایئے۔ (ادبی دنیا) [2] اس سے ہمیں اختلاف ہے۔ (ادبی دنیا)

(۲۱) "مصلی" عربی لفظ ہے جس کے معنی ہیں نماز پڑھنے والا اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے والا۔ لیکن نہ معلوم لوگوں پر کیا مصیبت پڑی کہ انہوں نے ہر اُس چوہڑے اور خاکروب کو مصلی کہنا شروع کر دیا ہے جو اسلام قبول کرے۔ کیا دُنیا بھر میں نو مسلم چوہڑوں کے تعارف کے لئے لوگوں کو کوئی اور لفظ نہیں ملتا تھا؟ مسجد کے ملاّؤں پر بھی یہ لفظ اکثر استعمال کیا جاتا ہے جیسے آج میں نے مصلیوں کی دعوت کی۔

(۲۲) "شہید" یہ بھی ایک مقدس مذہبی اصطلاح ہے اور اس شخص کو شہید کہا جاتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں اس کی رضا اور خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اپنی جان فدا کر دیتا ہے۔ نیز یہ اللہ تعالیٰ کا ایک نام بھی ہے مگر اپنے ہم مشرب اور ہم معنی دوسرے الفاظ کے ساتھ اس مقدس لفظ کی بھی آج کل کے زمانے میں بڑی بے توقیری ہو رہی ہے۔ پچھلے دنوں قطب جنوبی کی تحقیقات کرتا ہوا سیاحوں کا ایک گروہ برف میں دب کر ہلاک ہو گیا تو ایک بہت بڑے مشہور مولوی صاحب نے اپنے بہت مشہور اخبار میں "شہدائے راہ کشف و سیاحت" کے فصیحانہ عنوان سے اس واقعہ کا تذکرہ کیا تھا اور مطلق اس امر کا خیال نہیں کیا کہ شہید ایک خالص اسلامی اصطلاح ہے۔ اور اس کو بے محل استعمال کرنا کسی طرح موزوں نہیں۔ اس کے علاوہ ویسے بھی اس لفظ کی بڑی مٹی پلید ہوتی ہے۔ مقدس بانیان مذاہب کو جو ناپاک انسان اپنی ہر تحریر اور تقریر میں عمر بھر گندی سے گندی گالیاں دیتے رہے۔ آج بڑے فخر کے ساتھ "شہید" کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ وہ شریر انسان جو مذہبی پیشواؤں کی نہایت گندی توہین کے جرم میں باغیرت مگر کم عقل لوگوں کے ہاتھوں دوسرے جہان میں پہنچا دیئے گئے فوراً "شہید" کے اعزاز سے معزز کر دیئے گئے۔ یہی نہیں بلکہ جو مفسدہ پرداز اور باغی انسان حکام پر بم کے گولے پھینک کر پھانسی پر چڑھے فوراً "شہید" بن گئے۔ اب بتایئے اس ذہنیت کا کیا علاج ہے۔

(۲۳) "غازی" یہ معصوم اور مظلوم لفظ بھی بہت ہمدردی کا مستحق ہے۔ اس کے معنی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی راہ میں کافروں سے جنگ کرنے والا جس شخص نے خدا کی راہ میں اپنے سر کی بازی لگا دی ہو یقیناً نہایت تعظیم کا مستحق ہے۔ مگر بوالعجبی دیکھئے کہ لغت تک میں اس کے معنی بازیگر اور نٹ کے لکھے ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر وہ شخص جو ہر قسم کی بداعمالیاں اور بدکاریاں کرتے رہنے کے باوجود ترک موالات کی تحریک میں والنٹیر رہ چکا ہے۔ یا احرار کا سپاہی ہے "غازی" بنا پھرتا ہے۔

(۲۴) "ذات شریف" اس لفظ کے لفظی معنی ہیں نہایت شریف، نیک اور اچھا آدمی۔ لیکن ہم اس پر تلے بیٹھے ہیں کہ ہر اچھے لفظ کا حلیہ ضرور بگاڑنا ہے۔ چنانچہ حسب معمول اس لفظ کے ساتھ بھی ہم نے یہی سلوک کیا اور آج کل ذات شریف نہایت چالاک، ہوشیار اور چالباز انسان کو کہتے ہیں جس سے شریفوں کو بہت بچ کر رہنا چاہیئے۔

(۲۵) "دہقان" اس لفظ کے معنی ہیں۔ گاؤں کا مالک، سردار اور حاکم۔ دہقان خلد جنت کے داروغہ یعنی رضوان کا نام ہے۔ مگر آپ میں سے ہر شخص جانتا ہے کہ آج کل اس بدقسمت لفظ کے معنی جاہل گنوار، وحشی اور اکھڑ آدمی کے ہیں۔

(۲۶) "مہتر" اس سے زیادہ بدسلوکی شاید ہی اردو زبان میں کسی اور لفظ کے ساتھ کی گئی ہو کسی زمانے میں یہ لفظ جس قدر زیادہ معزز، محترم اور مکرم سمجھا جاتا تھا۔ آج اُسی قدر ذلیل حقیر اور بے عزت خیال کیا جاتا ہے اس کے معنی ہیں بزرگ، قوم کا سردار، لشکر کا امیر، نواب، شہزادہ، رئیس اعظم، اسی مناسبت سے والیٔ چترال کو "مہتر چترال" کہتے ہیں لیکن مہتر چترال کو کس قدر شرم و غیرت آئے اگر وہ یہ سنیں کہ اردو دنیا میں یہ لفظ بھنگی، خاکروب اور فضلہ اٹھانے والے ادنیٰ ترین انسان کے لئے بولا جاتا ہے۔ یہ لفظ ان معنوں میں اس قدر کثرت کے ساتھ استعمال ہوتا ہے کہ اب عوام کے وہم میں بھی یہ بات نہیں گذر سکتی کہ یہ لفظ کس قدر معزز اور مکرم ہے اور اگر ان کو یہ بات بتائی جائے تو اُن کی حیرانی کی کوئی حد نہ رہے۔

(۲۷) "خسرا" ہماری زبان کی حالت آج کل واقعی بڑی قابل رحم ہے جس میں خسر جیسا معزز اور قابل عزت لفظ کھلی ہوئی گالی کے طور پر استعمال کیا جاتا ہو۔ افسوس۔

(۲۸) "سالا" یہ لفظ بھی سسرے کی قسم کا ہے اور نہایت محبت اور پیار کے رشتہ کو ظاہر کرتا ہے۔ مگر آج کل کسی شخص کو ذرا کہہ کر تو دیکھو جوشیلا ہو گا۔ تو فوراً تھپڑ کھینچ مارے گا سنجیدہ ہو گا تو آپ سے بولنا چھوڑ دے گا۔

(۲۹) "چچا" نہایت مکرم و معظم لفظ ہے۔ سعادت مند لوگ چچا کی تعظیم و تکریم باپ کے برابر کرتے ہیں۔ مگر آج کل جن معنوں میں یہ لفظ استعمال ہوتا ہے اس سے ہر شخص واقف ہے کون ہے جس نے یہ محاورہ نہ سنا ہو گا کہ "چچا ہی بنا کے نہ چھوڑا تو کہنا"۔ چچا بے چارے کے

متعلق یہ شعر بھی آپ نے بارہا پڑھا ہوگا۔

چچا کے چچا ہم تو مشہور تھے
بھتیجا ہمارا چچا ہوگیا

دیکھا آپ نے! یہ صرف چند الفاظ ہیں جو معمولی اور سرسری طور پر جمع کر دیئے گئے ہیں اگر اس قسم کے الفاظ کی مکمل فہرست مرتب کی جائے تو غالباً سینکڑوں تک پہنچ جائے گی۔ مگر کیا ان محترم اور معزز الفاظ کے اتنے برے اور بے ہودہ معنی کرنے کسی بھی زبان کے لٹریچر میں مفید اضافہ کا باعث ہو سکتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ ہرگز نہیں۔ گالیاں دینے اور مذاق اڑانے کے لئے جن پرانے الفاظ کو ہم نے سانچے میں ڈھالا ہے۔ بلاشبہ وہ انسانیت اور اخلاق کا گلا کاٹنے کے لئے ایک تیز تلوار کی حیثیت رکھتے ہیں اس لئے ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے مقدس الفاظ کی قدر کریں اور ان کو ہمیشہ انہی معنوں میں استعمال کریں جن کے لئے وہ ابتدا میں وضع کئے گئے تھے۔ جب زبان ہی ٹھیک نہ ہوگی تو ہمارے اخلاق و عادات کس طرح مہذب اور شائستہ اور متین و سنجیدہ بن سکتے ہیں۔ پس آؤ اور آج کے دن سے عہد کر لو کہ عمدہ الفاظ کو برے معنوں میں کبھی استعمال نہیں کروگے۔ اگر تم ایسا کرنے پر قادر ہو سکے تو تم یقیناً محسوس کروگے کہ زبان کی درستگی کا اثر تمہاری دوسری عادات و اخلاق پر بھی بہت گہرا پڑا ہے۔ کیونکہ دوسرے اخلاق و عادات عموماً زبان کے ساتھ چکر لگاتے رہتے ہیں۔ زبان اگر اچھی رہی تو سب چیزیں اچھی رہتی ہیں۔ زبان بگڑی تو سب کچھ ملیا میٹ ہو جاتا ہے۔ کاش ہماری سمجھ میں یہ بات آجائے اور ہم اپنی زبان میں سے اس قسم کے الفاظ قطعاً خارج کر دیں۔

"اردو"

محمد اسمٰعیل

نقد و نظر

طلسمِ خیال

(مصنفہ کرشن چندر ایم اے۔ دیباچہ از سید فیاض محمود ایم اے۔ لکھائی چھپائی خاصی۔ کاغذ بہت اچھا۔ حجم اڑھائی سو صفحات۔ سائز درمی۔ مجلد۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے۔ ناشرین۔ مکتبۂ اردو لاہور)

ناظرین ادبی دنیا میں سے کون ہے جو کرشن چندر کی سحر نگاری سے آشنا نہیں اور ہم میں سے کس کے دل کے تاروں میں اس نوجوان افسانہ نویس کے مضرابِ فن نے لرزش پیدا نہیں کی۔ طلسمِ خیال (طلسم ہوش ربا نہیں! کرشن چندر صاحب معاف فرمائیں یہ نام ہمیں بالکل پسند نہیں) کرشن چندر کے بارہ افسانوں کا مجموعہ ہے۔ یہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ یہ اُن کے بہترین افسانے ہیں۔ کیونکہ بعض نہایت اچھے افسانے اس مجموعے میں شامل نہیں، مثلاً "منگلیک" اور "آنسوؤں والی"۔ مگر اس میں بھی شک نہیں کہ جو چیزیں طلسمِ خیال میں شامل ہیں وہ ایک آدھ کے سوا ہر لحاظ سے اچھی ہیں اور "زیرِ قان" اور "لاہور سے بہرام گلہ تک" تو مصنف کے شاہکار ہیں جو علی الترتیب ادبی دنیا اور ہمایوں میں شائع ہو چکے ہیں۔

کرشن چندر عمر کے لحاظ سے اگرچہ نوجوان ہیں لیکن اپنی طرزِ تحریر اور اندازِ خیال کے لحاظ سے پختہ کار ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے لئے ایک نہایت شگفتہ سٹائل مخصوص کر لیا ہے اور جو کچھ وہ لکھتے ہیں ان کے امتیازی رنگ سے رنگین ہوتا ہے۔ ایک اوسط درجے کے پڑھنے والے کی رائے میں اُن کی تحریر کی پانچ خوبیاں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ اوّل اُن کی شاداب اور رنگین تشبیہیں۔ ایسی تشبیہیں جن میں حقیقت کے ساتھ زندگی اور دل آویزی پائی جاتی ہے۔ ایسی تشبیہیں جو پڑھنے والے کو اپنے سیلِ رواں میں بے اختیار بہا لے جاتی ہیں۔ ملاحظہ فرمائیے۔

"اُن آنکھوں میں ایک ہلکی سی چمک پیدا بھی ہوئی، مگر پھر فوراً ہی گم ہوگئی جیسے کوئی حسین سنگریزہ سمندر کے گہرے نیلے پانیوں میں کھو جائے"

اس کا داہنا بازو اوپر اٹھا بھی اور پھر نیچے گر گیا۔ چوڑیوں کی جھنکار پیدا بھی ہوئی اور ایک لمحہ میں لرزتی ہوئی کہیں غائب ہوگئی۔ جیسے آسمان سے کوئی تارا ٹوٹے اور فضا میں گھل جائے۔" (جہلم میں ناؤ پر)

"آسمان کے نیلے چشمے پر چاند اور ستارے پھولوں کی طرح کھلے ہوئے تھے۔" (اندھا چھترپتی)

"اُس کی (نرس کی) آواز (نازک اور) باریک تھی۔ جیسے دوا پینے کے بلوریں گلاس کے ساتھ ایک نقرئی بچہ ٹکرا جائے۔" (مجھے کتے نے کاٹا)

"شاید یہ میرا ہی افلاس تھا جو اس طرح دونوں ہاتھ پھیلائے ہوئے مجھ سے بھیک مانگ رہا تھا۔" (ایضاً)

"ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اُن کی چوٹیوں پر بادلوں کے محل بنے ہیں ...... اُس نے پھر نگاہ اٹھا کر دور آسمان میں تیرتے ہوئے بادلوں کو دیکھا، سپید براق۔ چمکتے ہوئے لاکھوں تاج محل تھے اور چاروں طرف جمنا کا نیلا پانی پھیلا ہوا تھا۔ اُس نے سوچا، ان مرمریں محلوں کو کس شاہجہاں نے بنایا ہے، اور کس محبوب کی یاد میں؟"

"اُس کی سانس میں شہد کی سی مٹھاس تھی۔" (آگہی)

"ہگلی کا پانی شعاعوں کے انعکاس سے سُرخ تھا۔ سروش (مایوس اور بیکار نوجوان) کو احساس ہوا جیسے کسی نے آسمان کے مغربی کونے میں سورج کو قتل کر دیا ہے اور اب اس کا لہو بہہ کر ہگلی میں آ رہا ہے۔" (صرف ایک آنہ)

(آبشار کے) پانی کے ان لاکھوں کروڑوں بلبلوں میں بشریت کی مکمل تاریخ موجود تھی اور قدرت کی ابدیت کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی کی کم مائگی اور بے چارگی کا بھی اعتراف تھا (لاہور سے بہرام گلہ تک)

"ہاں ۔ ۔ ۔ ۔ ہم دونوں کو دیکھتی جاتی تھیں، ان کی آنکھیں پُرنم تھیں۔ آنسوؤں کے ان دھندلے ذروں میں خوشبوؤں کی جل پریاں ناچ رہی تھیں۔"

(رامنتا)

"میں نے پگ ڈنڈی پر نیچے اترتی ہوئی لڑکی کی طرف اشارہ کرکے کہا: وہ دیکھو، ایک مٹی کی ٹھلیا اٹھائے دوشیزہ، اور ٹخنوں پر بجتی ہوئی جھانجھیں، یہی ہندوستانی رقص کی ابتدا اور انتہا ہے۔" (زالاسی حسینہ)

"اس کے بال بہت خوب صورت ہیں سونے کے باریک تاروں کی طرح نرم و نازک اور آپس میں اس طرح الجھے ہوئے کہ گمان ہوتا ہے ڈوبتے ہوئے سورج کی کرنیں ان گیسوؤں میں آکر بند ہو گئی ہیں۔"

(رنسور کی محبت)

"اور ۔۔۔ گُلّی ۔۔۔ کوہستانی گلاب کی ایک کلی ہے حیا سے سمٹی ہوئی اور پتوں میں چھپی ہوئی نرم و نازک۔ مگر وہ کھل رہی ہے، آہستہ آہستہ، ہر روز ایک دو نئی پتیاں کھل جاتی ہیں، اور اپنی رنگینی سے دل کو مسرور کرتی ہیں۔ ایک دن یہ کلی پھول کی طرح کھل جائے گی، شگفتہ اور رنگین پھول پھر میں شاید اس کی تصویر بنا سکوں، ابھی نہیں۔"

(ایضاً)

"وہ نگاہیں جنھوں نے میرے سینے میں امنگوں کا طوفان برپا کر دیا تھا، جنھوں نے محبت کی سوئی ہوئی ندی کو اپنے نازک تیوروں سے متلاطم کر دیا تھا، مگر آج وہ حقیقت محض ایک خواب ہے، شفق کی طرح رنگین، توس قزح کی طرح دور ۔ ۔ ۔"

(بیرقان)

آپ نے دیکھا! ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان تشبیہات میں خود زندگی رقص کر رہی ہے۔ پریم چند مرحوم تشبیہ و تمثیل کے بادشاہ تھے مگر ان کی تشبیہات میں سوز اور درد نمایاں ہوتا تھا اور ایک ایسا روحانی کیف کہ بعض اوقات بے اختیار آنکھوں سے آنسو چھلک پڑتے تھے۔ کرشن چندر کی تشبیہوں میں جو کیف ہے وہ اشک آور نہیں نشاط انگیز ہے۔

کرشن چندر کی دوسری ممتاز خصوصیت ان کے افسانوں کی کھلی فضا، کوہستانی پس منظر اور دل کش سیٹنگ ہے۔ جیسا کہ ہم نے اس سے پہلے بھی کہا ہے۔ وہ اپنے رومانوں کی مصوری کے لئے عموماً کشمیر کی بہاریں وادی کو منتخب کرتے ہیں، اور پھر جب وہ انسانی جذبات کا اتار چڑھاؤ دکھاتے دکھاتے یکایک انہیں قدرت کے ساز سے ہم آہنگ کرتے ہیں تو یقیناً ایک ہی جست میں بہت سی فنی منزلیں طے کرتے ہوئے ایک سچے آرٹسٹ کے مقامِ بلند پر جا پہنچتے ہیں۔ کرشن چندر فطرت کے عاشق ہیں۔ ان کا کوئی افسانہ، کوئی مطالعہ ایسا نہیں جس کی فضا کو انہوں نے نیچر کے بوقلموں مناظر سے روشن نہ کیا ہو اور جس کے کرداروں کو فطرت کی رنگین عکاسی سے نہ رنگا ہو۔ وہ دوشیزۂ فطرت سے اس کی شوخیاں اور رعنائیاں اور انسانی دل سے اس کی بے قراریاں اور کمزوریاں مستعار لے کر دونوں کے تانے بانے سے ایک ایسا دلفریب اور زرنگار افسانوی ملبوس تیار کر لیتے ہیں جس پر نگاہ نہیں ٹھہرتی۔

ذرا دیکھئے:-

"مغرب میں سورج غروب ہو رہا تھا، دریا کی خاموش سطح پر ایک عجیب، نازک، نرالی، سحر طراز روشنی چھیل گئی تھی میں نے سمجھا یہ غروبِ آفتاب نہیں نمودِ سحر ہے، مغرب نہیں مشرق ہے، روشنی کا منبعِ اعظم ہے۔ ہم غیر فانی انسان ہیں جو اس کبھی نہ غرق ہونے والی کشتی پر سوار ہو کر اپنے محبوب سے ملنے جا رہے ہیں۔ اپنے ابدی محبوب سے میں تاں ماہی نوں منا دن چلیاں" چپ ۔ ۔ ۔ ۔ شپ ۔ ۔ ۔ ۔ چپ ۔ ۔ ۔ ۔ شپ، کشتی بھاگی جا رہی تھی۔"

(جہلم میں ناؤ پر)

"آسمان پر بھاگتے ہوئے سفید بادلوں کو دیکھ کر اس کا دل کسی نامعلوم مسرت سے کانپنے لگتا۔ جنگل کے جھینگروں کی آوازیں اس نے ابدی زندگی کے نرالے اور سحر طراز گیت سنے اور پھر خود اس کی اپنی زندگی کے تار ان پُرمسرت نغموں کی لے سے جھنجھنا اُٹھے"

(اندھا چھتر پتی)

"ستو کی شاخوں میں چاند اٹک گیا ہے اور اس اُداس نغمے کو سن رہا ہے جو نوجوان کسان اور ان کی مائیں اور بہنیں اور بیویاں گا رہی ہیں، پھر وہ یکایک چپ ہو جاتے ہیں، خاموشی سے مکّی کے دانوں کو الگ کر رہے ہیں ۔ ۔ ہوا کے ہلکے ہلکے جھونکے آتے ہیں اور ستو کا سارا درخت سانس لیتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ کوئی آگ تاپتا ہوا بوڑھا کسان آہستہ سے کہہ اٹھتا ہے اور گاؤ، بیٹو، اور گاؤ، پھر وہ خود ہی کوئی پرانا گیت شروع کر دیتا ہے، اسے اپنی ختم ہوتی ہوئی زندگی کی بہار یاد آ رہی ہے، زرد زرد شعلوں کی چمک اس کی آنسوؤں سے بھری ہوئی آنکھوں میں لرز لرز جاتی ہے۔ گاتے گاتے گیت کے الفاظ (اس کی زبان پر) لڑکھڑا

جاتے ہیں . . . . پھر کوئی سحر کا نغمہ فضا میں گونج اٹھتا ہے۔ نوجوان چرواہوں کی پتلی پتلی آوازیں بھی اس میں شامل ہو جاتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ کسی بڑے معبد میں بیٹھے ہوئے اپنے معبود کی حمد و ثنا کر رہے ہیں، یہ مکی کے دانے کسی تسبیح کے بے شمار دانے ہیں وہ بوڑھا کسان ایک بوڑھا پجاری ہے، اس آگ میں عنبر اور لوبان جل رہا ہے جس کا دھواں اُمنڈ اُمنڈ کر سارے معبد کو معطر کر رہا ہے۔ یہ نیک نفس روحیں ہیں۔ یہاں ابدی سکون ہے اور خدا کا رحم۔" (آنگی)

"اس کے دل پر ایک عجیب اداسی چھا جاتی ہے اور وہ سوچتا ہے کہ شاید کسی نیلے جھرنے پر ریوڑ کو پانی پلاتے ہوئے ایک غریب لڑکی اس کا انتظار کر رہی ہے، اس کے پاؤں ننگے ہیں، اُس کی نگاہیں اداس ہیں، اُس کے بالوں میں سیب کے پھولوں کا ایک گچھا ہے۔" آنگی۔

"یہاں ہوا میں جاں بخش خنکی تھی اور ایک عجیب سی خوشبو، کچھ کچھ اوزون سے ملتی جلتی ہوئی، اور گو ہم آبشار سے ڈیڑھ دو سو گز کے فاصلے پر تھے۔ پھر بھی آبشار کی ہلکی ہلکی پھوار ہم پر پڑ رہی تھی۔ پانی کی چھوٹی چھوٹی بوندیں لاکھوں، کروڑوں، ان گنت شبنم کے حسین قطروں کی طرح درختوں کے پتوں پر، جھاڑیوں کی جھکی ہوئی شاخوں پر، بنفشہ کے شرمائے ہوئے پھولوں پر پڑ رہی تھیں۔ آبشار کے قریب ہی جہاں یہ نیچے چٹان میں غائب ہو رہا تھا، ایک خوشگوار ہلکا سا دھواں اٹھ رہا تھا اور اس کے بیچ میں ایک دلکش قوس قزح تنی تھی۔ مدہم اور رنگین، یہ قوس قزح ہر لمحہ ٹوٹ جاتی اور ہر لحظہ ٹوٹ کر نئی بن جاتی تھی۔ . . . . وہ چٹان بالکل آبشار کے نزدیک، اس چٹان پر پتھر کی دو کرسیاں بنی ہوئی تھیں، ان پر جہانگیر اور نور جہاں دوپہر کے بعد بیٹھا کرتے تھے . . . . پتہ نہیں رہبر کیا کہہ رہا تھا لیکن میری آنکھوں سے صدیوں کا پردہ ہٹ گیا تھا، میں اپنے سامنے اُن دو کرسیوں پر بیٹھے ہوئے جوڑے کو دیکھ رہا تھا، ایک تھا جہانگیر بادشاہ شہزادہ سلیم انارکلی کا عاشق، اور دوسری ہندوستان کی ملکہ تھی نور جہاں . . . . وہ ایک جام ارغوانی ہاتھ میں لئے ملکہ کے قریب جھک کر کیا کہہ رہا تھا؟ اور ملکہ مسکرا کر اُسے کیا جواب دے رہی تھی؟ کیا اسی آبشار کی پھوار کے قطرے اُس ارغوانی جام میں ٹپک رہے تھے اور کیا ملکہ کی بل کھاتی ہوئی زلفیں اسی پھوار کے موتیوں سے گندھی ہوئی تھیں۔" (لاہور سے بہرام گلہ تک)

کرشن چندر کی تیسری خصوصیت اُن کی آدرشی ہیروئن ہے۔ یہ ہیروئن اُن کے تقریباً ہر افسانے میں اپنے حسنِ صبیح، سادہ فطرت، معصوم جذبات، بھولی اداؤں اور غزالیں آنکھوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ ان کی کوہستانی محبوبہ ایک خود رو پھول ہے جو نسیم شمال کے ہلکے ہلکے جھونکوں میں کھلتا اور اپنی روح افزا خوشبو سے دامن کوہ کی کسی حسین بستی کی فضا کو معطر کر دیتا ہے۔ اسے اس فریب کار دنیا کی ہوا تک نہیں لگی۔ وہ عموماً ایک پردیسی سے محبت کرتی ہے۔ شاید اس لئے کہ وہ اس کی سادہ محدود اور پرسکون دنیا میں یکایک نمودار ہو کر اپنی نمایاں اور دلکش شخصیت سے ایک انقلاب، ایک تلاطم پیدا کر دیتا ہے۔ وہ پردیسی کو چاہتی ہے اور ایک معصوم اور بے لاگ جذبے کی پوری شدت سے چاہتی ہے لیکن پردیسی آخر پردیسی ہے اور اس وارفتگی کا نتیجہ وہی ہوتا ہے جو ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے یعنی ٹریجڈی۔ زیر نظر افسانوں میں کھنی۔ آنگی۔ رُکمن۔ اور رنگی ایک ہی کردار کی چار الگ الگ صورتیں ہیں۔ شاما اُن سے کچھ زیادہ مختلف نہیں اور ناؤ والی دوشیزہ، تالاب کی حسینہ اور گوماں کی تخلیق بھی اسی لطیف مادے سے کی گئی ہے جو پہلی چار دل کی بناوٹ میں صرف ہوا۔ وہی حسنِ صبیح، وہی چشم غزالیں، وہی فطرت معصوم، تصنع سے مبرا، تکلف سے پاک، تمدن سے دور۔

ہمیں بارہا یہ خیال آیا ہے کہ یہ نوجوان افسانہ نگار جس کی عمر کا بیشتر حصہ شہر کے ہنگاموں اور جلوہ زاروں میں بسر ہوا، اپنی ہیروئن کی تلاش میں آخر کوہ و صحرا کا رُخ کیوں کرتا ہے۔ کیا وہ دلفریب تیتریاں جن کے رنگ و بو سے ہماری سوسائٹی کی فضا معمور ہے، اس کی نگاہِ شوق کو دعوتِ نظارہ نہیں دیتیں۔ کیا وہ حسنِ برق پاش جس کی ضیا افروزیوں سے شہر کے تنگ و تاریک مکان روشن ہیں، کسی جھلملاتی ہوئی چلمن سے نکل کر اس کے خرمنِ دل کو آتش اندوز نہیں کرتا۔ مگر نہیں نہیں، کرشن چندر ایک فن کار ہے۔ وہ جس پھول کو خود سونگھ نہیں سکتا اس کی خوشبو سے ہمارے مشامِ جان کو کیونکر معطر کر سکتا ہے۔ ہماری شہری معاشرت ایک بے جان تمثیل ہے جس میں عورت کا وجود ایک سائے کی طرح ہے، ایک پُر اسرار اور گریزاں سائے کی طرح پھر ایک آرٹسٹ

کے لئے کیوں کر ممکن ہے کہ وہ اسے حقیقت کا لباس پہنا کر ہمارے سامنے آئے وہ اس کی فطرت کی پہنائیوں اس کے جذبات کی گہرائیوں اور اس کی ہستی کی بوقلموں کیفیتوں سے کس طرح آشنائی حاصل کرے۔ پھر کیا تعجب ہے کہ کرشن چندر اپنی ہیروئن اُس دختر فطرت کو بناتے ہیں جس کی بڑی بڑی رسیلی آنکھوں میں وہ خود جھانک کر اس کے اضطراب دل کی کیفیتیں دیکھ سکیں، جس کی "شہد جیسی میٹھی سانس" کو وہ آپ محسوس کر سکیں اور حسن کی مسرّتیں اور غم اس کے نقرئی قہقہوں اور نم دار آنکھوں سے بے اختیار ٹپک پڑیں۔ ہماری ناچیز رائے میں افسانہ نگار کا یہ حسن انتخاب اس کے افسانوں کے رومانی پہلو کو ایک مستقل زندگی عطا کرتا ہے۔

کرشن چندر کی چوتھی خصوصیت اُن کی لطیف حسّ مزاح ہے جس کا ایک ہلکا سا اشارہ افسانے کی فضا میں ایک ایسا نرم و نازک تموّج پیدا کر دیتا ہے جیسا کبھی ایک ساکن سطح آب پر ایک چھوٹے سے کنکر کے گرنے سے دیکھنے میں آتا ہے۔ اپنے افسانوں میں وہ بعض دفعہ ایک مشکل صورت حالات یا ایک نازک لمحے کو اسی مزاح کی ایک خفیف سی نمود سے ایسی خوبصورتی سے حل کر دیتے ہیں کہ انسان حیران رہ جاتا ہے۔ امجد ایک نوجوان کا قصہ سنا رہا ہے جسے کتّے نے کاٹ کھایا تھا بظاہر یہ کہانی مبالغہ آمیز ہے لیکن دیکھئے وہ اس کا کس طرح یقین دلاتا ہے۔

"دس پندرہ روز یوں ہی ہلدی پیاز لگاتا رہا، پندرھویں روز اُسے یکایک بخار اور ہذیان ہو گیا۔ خدا کی قسم بستر میں پڑا پڑا چھت تک اچھل اچھل کر جاتا، میرے اللہ! کتنا موذی مرض ہے، آدمی ہوا کا ایک جھونکا تک نہیں سہہ سکتا، سارا بدن کانپتا ہے، اور پانی! . . . پانی تو مطلق نہیں پی سکتا . . . دوسرے دن بیچارا اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ یہ کہہ کر امجد نے اپنی آنکھیں اوپر چڑھالیں اور چھت کی طرف دیکھنے لگا۔"

(مجھے کتّے نے کاٹا)

"ڈاکٹر کے پیچھے پیچھے ایک نرس داخل ہوئی، میں نے ٹوپی اٹھا کر اس [illegible] سلام کیا کہ دونوں خوش ہو جائیں۔ دونوں خوش ہو گئے۔ . . . "ہاں"۔ ڈاکٹر نے کہا زخم گو اتنا گہرا نہیں پھر بھی ٹیکے تو آپ کو پورے چودہ روز لگوانے پڑیں گے" "صرف چودہ روز" میں نے نرس کے سُرخ اور چکیلے لبوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ نرس مسکرا دی"۔ (ایضاً)

"یہ لڑکی گونگی ہے! یہ تو بہت ہی اچھا ہے، کیا کسی نے چغتائی کی تصویر کو بولتے دیکھا ہے، اگر تصویر، خاموش تصویر بول اُٹھا تو اُس کی آدھی شعریت، رنگینی اور سحر پروری فنا ہو جائے، کاش دنیا کی تمام حسین عورتیں گونگی ہوتیں"۔ (تالاب کی حسینہ)

"اب میں تار رہا تھا میں لئے یہ سوچ رہا تھا کہ مجھے گل بخش کی شادی پر جانا چاہیئے یا نہیں، آخر گل بخش دوست ہے اور دوست کی شادی یا موت ہر روز نہیں ہوا کرتی، اسی شش و پنج کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے ناچار "جفت یا طاق" کے عملیہ کو کام میں لانا پڑا۔ ایک پیسہ چہرۂ شاہی کو اونچا ہوا میں پھینک کر اور چہرۂ شاہی کو شادی کا مبارک عنوان سمجھ کر میں خاموش ہو رہا۔ دوسرے لمحہ میں پیسہ زمین پر تھا اور چہرۂ شاہی میری طرف (دیکھ) دیکھ کر مسکرا رہا تھا"۔

(لاہور سے بہرام گلہ تک)

"مگر جو عورت میرے بالکل مقابل بیٹھی تھی اور جو اپنی گود میں ایک چھوٹے سے بچے کو لئے تھی۔ وہ باقی عورتوں سے کم عمر اور زیادہ بدصورت تھی وہ کبھی کبھی گھونگھٹ کی آڑ سے مجھے دیکھ لیتی تھی۔ اس دنیا میں ہر کوئی حسین کی تلاش میں ہے۔ یہ تو میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ میں اس کی آنکھوں میں بچ گیا۔ بہر حال اس میں کوئی شک نہیں کہ میں بھی ایک حسین کی تلاش میں تھا۔ میں نے ٹائی کی گرہ ٹھیک کی اور لاری کے اندر چاروں طرف نگاہ دوڑائی، مگر، آہ، اس مسافروں سے بھری ہوئی لاری میں جو اپنی زندگی کی شاہراہ پر بے تحاشا بھاگی جا رہی تھی۔ مجھے کہیں بھی رومان نظر نہ آیا، دل برداشتہ چہرے تھے اور حقّے یا پھر تھانیدار صاحب کا مورچھل۔ میں نے ایک لمحہ کے لئے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور دل ہی دل میں کہا کہ اس لاری میں سب کچھ ہے مگر حسن ناپید ہے۔ دوسرے لمحہ میں جب میں نے آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ کم عمر بدصورت عورت اپنے چھوٹے بچے پر جھکی ہوئی اُسے نہایت مدھم آواز میں میری گود میں چلے جانے کو کہہ رہی تھی"۔

(جہلم میں ناؤ پر)

"سچ کہنا، کیا تم نے کانن سے زیادہ خوبصورت اور باحیا لڑکی کہیں دیکھی ہے، خصوصاً جس دن وہ سپید ساری اور نقرئی آویزے

پہن کر جماعت میں آتی ہے تو کیسی پیاری معلوم ہوتی ہے۔ ایمان سے کہنا کیا اُس وقت تمہارا دل یہ نہیں چاہتا کہ ایک ہلکا سا چاک کا ٹکڑا اس طرح پھینکا جائے کہ اُس کے کانوں کے قریب اس کی سفید ساری کے دلفریب دھاریے سے چھوتا ہوا گویا اُسے چُومتا ہوا گذر جائے اور ایک چمیلی کے پھول کی طرح اُس کے قدموں میں جاگرے . . . . ایمان سے کلاس روم میں بیٹھے بٹھلائے خراج حسن ادا کرنے کا اس سے بہتر ذریعہ اور کیا ہوسکتا ہے۔" ("قبر")

"جب وہ اپنے شانے سکیڑے گردن نیچی کئے ہوئے بیٹھا ہوتا ہے تو مجھے ایسا احساس ہوتا ہے کہ کوئی منتر پڑھ رہا ہے۔ زمین پر کچھ پڑھ کر پھونک رہا ہے۔ جس کے سحر سے یہ زمین ابھی پھٹ جائے گی اور ایک جن نمودار ہوگا۔ جو رعد کی سی آواز میں سے بولے گا۔ کیا چاہیئے بابا"—— مگر ایسا کبھی نہیں ہوتا، اس روحانیت سے خالی دنیا میں ایسا کبھی نہیں ہوتا، بلکہ ہر بار یہی ہوتا ہے کہ وہ غریب بنیا بول اٹھتا ہے،

"کیا چاہیئے، بابوجی؟"

اور میں جلدی سے گھبرا کر جواب دیتا ہوں "تین انڈے مرغی کے!"

اور پھر مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ الف لیلہ کا بونا نہیں، ایک غریب دکاندار ہے، "گومتی کا خاوند"" (گوماں)

"شاما کے متعلق میں صاف طور پر کہہ دینا چاہتا ہوں کہ میری محبوبہ ہے یعنی میں اُس سے محبت کرتا ہوں، اور وہ اپنے خاوند سے محبت کرتی ہے جو چکوال میں اینٹوں کے ایک بھٹے پر ملازم ہے بیس روپے تنخواہ پاتا ہے اور بھٹے پر کام کرنے والے مزدوروں کی حاضری لگاتا ہے اور کبھی کبھی اپنی حسین بیوی کو خط لکھ دیتا ہے۔ جس میں اکثر سیف الملوک شاہ بہرام اور حسن بانو کے پاکیزہ اشعار درج ہوتے ہیں۔ شاما وہ خط اکثر مجھ سے پڑھوایا کرتی ہے، اُس وقت اُس کا چہرہ شرم سے لال ہو جاتا ہے۔ بچاری ان پڑھ ہے نا اور جب میں سیف الملوک، ملوک الکلام کی تشریح اپنے مخصوص یرقانی انداز میں کرتا ہوں تو کسی قدر گھبرا جاتی ہے، لجاتی ہے اور پیاری معلوم ہوتی ہے۔ گُل عارض پہ چمک اور آنکھوں میں دمک آجاتی ہے، لب کانپتے ہیں اور پھر مجھے یکایک اُس کی مہین آواز سنائی دیتی ہے: "آگے کیوں نہیں پڑھتے؟" اور . . . میں بھلا خط پڑھتے پڑھتے اس کے چہرے کی طرف کیوں دیکھنے لگ گیا تھا، محبت؟ نہیں یرقانیت! یا اللہ مجھے محبت ہے کہ یرقان"؟ (یرقان)

"ہمارا قصبہ بہت چھوٹا ہے۔ اتنا کہ اس میں صرف پانچ حکیم، تین ڈاکٹر اور دو وید پریکٹس کرتے ہیں، سوڈا واٹر کی صرف ایک دکان ہے۔ ملائی کی برف بیچنے والا بھی ایک سے زیادہ نہیں، اور وہ ایک نوجوان ہے اور منچلا اور شاما کا چاہنے والا۔ شاما کی ماں اس سے ہر روز پاؤ آدھ پاؤ ملائی کی برف مفت کھا جاتی ہے۔ صرف دو درزی ہیں، ایک بچارہ ہے سیدھا سادا آدمی، وہ قمیص کی سلائی دو آنے تک خوشی سے قبول کر لیتا ہے، دوسرا راولپنڈی پاس ہے۔ اُس نے تین سال تک راولپنڈی میں ایک مشہور و معروف انگریزی ٹیلرنگ شاپ میں کام سیکھا ہے۔ وہ سلائی صرف اتنی طلب کرتا ہے جتنی کپڑے کی قیمت ہو۔ ہمارے قصبے کے نوجوان اُس سے بڑے شوق سے کپڑے سلواتے ہیں۔ (یرقان)

کرشن چندر کی پانچویں خصوصیت ان کی ٹیکنیک (Technique) کا کمال ہے۔ وہ اپنے افسانے کی تشکیل و تعمیر بہت چابک دستی سے کرتے ہیں۔ مکمل ہونے پر ان کا افسانہ ایک ایسی عمارت معلوم ہوتا ہے جسے ایک ہی پتھر سے تراشا گیا ہو۔ آپ ایک چھوٹی سی تفصیل علیحدہ کر دیں۔ ساری کہانی بے مزہ ہو جائے گی۔ معلوم ہوتا ہے کہ کرشن چندر جزئیات اور تفاصیل کا مطالعہ بڑی گہری نگاہ سے کرتے ہیں اور انہیں اپنے ذہن میں محفوظ رکھ چھوڑتے ہیں۔ پھر جب کبھی کوئی افسانہ لکھنے بیٹھتے ہیں تو ان کے مطالعے کے تاثرات ایک ایک کر کے ان کے نہاں خانۂ دماغ سے نکل کر ان کے قلم سے ٹپک پڑتے ہیں اور ان کے خوبصورت افسانے میں اس طرح سما جاتے ہیں گویا یہ اسی کی خاطر پیدا ہوئے تھے۔

کرشن چندر کو ان جزئیات سے کام لینے کا بڑا سلیقہ ہے۔ وہ ان سے بعض اوقات افسانے کی اہم ترین کڑیاں ڈھال لیتے ہیں اور بعض دفعہ تو ایک ذرا سے مشاہدے کو مرکز بنا کر سارے افسانے کو اس کے گرد گھما دیتے ہیں۔ چنانچہ "یرقان" اور "قبر" اس آخری خصوصیت کی پوری آئینہ داری کرتے ہیں۔ ریشم کے کیڑوں کی باہمی چھیڑ چھاڑ بظاہر افسانے کی کوئی اہم کڑی معلوم نہیں ہوتی [illegible] افسانہ نگار نے شاما اور اس کے مختلف چاہنے والوں کی رنگ برنگ مجسمیں اس چھوٹے سے مطالعے کی کیسی حیرت انگیز عکاسی کی ہے۔ اسی طرح "قبر"

میں کنہیا لال کے اپنی پہلی اور آخری محبت میں ناکام رہنے اور ایک ناخواستہ مناہل زندگی میں گرفتار ہونے کی کیفیت کو اس کے ایام محبت کے ایک چھوٹے سے سانحے سے کیسی خوبی سے ملایا ہے دیکھئے۔

"وہ ایک ٹیلے پر بیٹھ گئی، اور پاؤں سے ریت کرید کرید کر ایک محراب سی بنانے لگی۔ جب محراب بن گئی، تو اُس نے آہستہ سے اپنا پاؤں محراب کے نیچے سے نکال لیا، اب ریت کی محراب تیار ہو چکی تھی رکمن نے فتحمندانہ نگاہوں سے میری طرف دیکھا "یہ کیا ہے"؟
میں نے مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا "تمہاری قبر ہے"!
رکمن نے شوخی سے کہا اور پھر قہقہہ لگا کر ہنس پڑی . . . . . ."

"وہ رک گیا اور پھر میری طرف عجیب نگاہوں سے دیکھ کر بولا "تم جانتے ہو۔ جہاں رومان اور خوشی نہیں ہوتے وہاں کیا ہوتا ہے؟ . . . . وہاں ہوتا ہے! . . . . مذہب، مذہب اور صرف مذہب اب رکمن مجھ سے بات تک نہیں کرتی، وہ دن رات مالا جپتی ہے اور اپنے آپ کو اور مجھے دونوں کو پاپی سمجھتی ہے ہا! ہا! ہا! ہا!
کنہیا لال زور زور سے ہنسنے لگا

. . . .

کنہیا لال کی ہنسی نے بے اختیار میرے جسم کے رونگٹے کھڑے کر دیئے، میرے سارے جسم میں ایک جھرجھری سی آئی اور میرے جسم کے روئیں روئیں کو کانپتا ہوا چھوڑ گئی۔ پتہ نہیں کیوں۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے کہ کنہیا لال کے پچکے ہوئے گالوں کو دیکھ کر مجھے بے اختیار وہ ریت کی قبر یاد آ گئی جو ایک شام غروب آفتاب کے وقت کالجن کے ایک ریتلے میدان میں ایک پنجابی دوشیزہ نے اس کے لئے تیار کی تھی۔

(قبر)

بہرام گلہ ایک زمانے میں جہانگیر اور نور جہاں کی عشرت گاہ تھا۔ اب وہاں چند غریب سنگیل اور جفاکش دیہاتی رہتے ہیں۔

"تاریخ کا اثر دیکھئے۔ صدیاں گزر جانے کے بعد بھی ان لوگوں میں نور جہاں اور جہانگیر نام رکھنے والوں کی کثرت ہے، ہر گھر میں کم از کم ایک نور جہاں اور جہانگیر موجود ہے . . . . . میرے سامنے ایک بوڑھی عورت کھڑی تھی۔ دوہری کمر، چہرے پر لاتعداد جھریاں۔ روئی کی طرح سفید بال اور نحیف آواز میں کہہ رہی تھی "بابا ایک پیسہ۔ خدا کا واسطہ۔ ایک پیسہ" میں نے جلدی سے جیب سے ایک پیسہ نکال کر اُسے دے دیا وہ مجھے دعائیں دینے لگی۔ میں نے آبشار کی طرف دیکھتے ہوئے اُس سے پوچھا "تم اسے جانتی ہو؟ اس کا کیا نام ہے"؟ اس نے رک رک کر کہا "نوری . . . جھنجھم . . . نو . . . . . ری . . . جھنجھم" شاید وہ کوئی بھولا بسرا واقعہ یاد کر رہی تھی۔
معاً مجھے کچھ یاد آ گیا میں نے پوچھا تمہارا نام کیا ہے؟ "نور جہاں" یہ کہہ کر اس نے آہستہ سے سر جھکا لیا۔ اور لکڑی ٹیکتی ہوئی چل پڑی۔ چاندنی میں اس کے پریشان بال چاندی کے تاروں کی طرح چمک رہے تھے۔"

(لاہور سے بہرام گلہ تک)

کرشن چندر کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے افسانوں میں کسی اخلاقی یا معاشرتی مقصد کو پیش نظر نہیں رکھتے۔ مرحوم پریم چند اس بارے میں کچھ مختلف انداز رکھتے تھے اور آج کل بھی کئی افسانہ نگار ایک خاص مقصد کو سامنے رکھ کر قلم اٹھاتے ہیں۔ ہماری رائے میں افسانہ نگار کا کام تصویر کشی ہے نقاشی یا تزئین نہیں ایک افسانہ نگار جب مصلح یا معلم بننے کی کوشش کرتا ہے تو وہ آرٹ کی راہ سے دور چلا جاتا ہے۔ حسن تو دراصل حقیقت ہی کا دوسرا نام ہے پس آرٹسٹ کو تلاش حسن میں راہ حقیقت سے دور جانے کی ضرورت نہیں۔ وہ جو کچھ خود دیکھتا اور محسوس کرتا ہے اگر اپنے مخاطب کو دکھانے اور محسوس کرانے میں کامیاب ہو جاتا ہے تو یہی اُس کا منتہائے کمال اور معراج فن ہے۔ نہ اُسے اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں اور نہ ہمیں کرشن چندر اس معیار پر پوری کامیابی حاصل کرتے ہیں۔

ٹکنیک کے لحاظ سے ہمیں مجموعہ زیر نظر کے دو افسانے کامیاب معلوم نہیں ہوتے۔ "صرف ایک آنہ" اور "اندھا چھتر پتی"۔ "ایک آنہ" میں کرشن چندر کا اپنا رنگ موجود نہیں۔ کچھ روسی اور کچھ فلمی رنگ کی آمیزش ہے اور مطالعہ بھی ناکمل سا ہے۔ افسانے کے عنوان کو اس کے نفس مضمون سے چنداں مناسبت نہیں اور "ایک آنہ" افسانے کی بناوٹ میں مرکزی خیال کی اہمیت نہیں رکھتا۔ نوجوان مصنف افسانے کی مغربی فضا میں یہاں تک کھو گیا ہے کہ فاقہ کش ہیرو کی جیب سے جب فاقہ کش کتے کو کچھ دلواتا ہے تو وہ اس کا آخری بسکٹ ہوتا ہے۔ روٹی کا ٹکڑا نہیں اور ہیرو چاند کو دیکھ کر روغنی نان یا شیرمال کی بجائے ولائتی کیک کا تصور کرتا ہے۔ غرضکہ یہ افسانہ اس قسم کی کمزوریوں سے معمور ہے اور دوسرے افسانوں کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ "اندھا چھتر پتی" "صرف ایک آنہ" سے بہتر ہے اور اس میں زبان و بیان کی بہت سی دل آویزیاں پائی جاتی ہیں لیکن مصنف ٹکنیک کی ایک بڑی

غلطی اُس مقام پر کر گیا ہے جہاں وہ چھتر پتی کی گذشتہ زندگی کی داستان کا آغاز کرتا ہے۔ داستان کا یوں یک بیک بڑے بھائی کے ایک دوست کی زبانی شروع ہو جانا ایسے بلند پایہ مصنف کے تخیل کی اہانت ہے۔

زبان کے لحاظ سے یہ افسانے کافی بلند درجہ رکھتے ہیں۔ کرشن چندر کی شگفتہ بیانی کے متعدد نمونے آپ مندرجہ بالا اقتباسات میں ملاحظہ کر چکے ہیں۔ ان کے شمائل میں جو شیریں روانی پائی جاتی ہے وہ بہت کم لکھنے والوں کو نصیب ہے۔ الفاظ کا انتخاب بہت اچھا کرتے ہیں اور ان کی بندش میں ایک دلکش لوچ پیدا کر لیتے ہیں۔ افسوس ہے کہ مجموعہ زیر نظر میں ایڈیٹنگ کی کمزوری کے باعث زبان و محاورہ کی متعدد غلطیاں بھی پائی جاتی ہیں اور کتابت کی غلطیوں کا تو کوئی شمار ہی نہیں۔ کرشن چندر صاحب کو اس طرف متوجہ ہونے کی ضرورت ہے۔ بیشتر غلطیاں بے پروائی اور بے احتیاطی کا نتیجہ ہیں اگر وہ مسودے پر نظر ثانی کر لیتے یا کسی اچھے ایڈیٹر سے یہ خدمت لے لیتے تو کتاب کا یہ پہلو کمزور نہ رہتا امید ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں یہ نقص دور ہو جائے گا۔ ہم ناظرین ادبی دنیا سے اس کتاب کے مطالعہ کی پُر زور سفارش کرتے ہیں۔

"ص"

فہرستِ مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہِ فروری سنہ ۱۹۳۹ء

جلد ۱۷ — نمبر ۲

تصاویر:- ۱- زیبرا۔ ۲- شیلے ۳- شیلے کا قصرِ ساحل

سالانہ چندہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے۔ ممالک غیر سے دس شلنگ

(گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام مولانا صلاح الدین احمد پرنٹر و پبلشر چھپ کر دفتر ادبی دنیا مال روڈ لاہور سے شائع ہوا)

دنیائے کاروبار

دکن بٹن فیکٹری حیدرآباد دکن

جامہ زیبی ہماری زندگی کی وہ ضرورت ہے۔ جس پر ہماری خوشی کا انحصار بہت بڑی حدتک ہے۔ لباس صرف ہمارے جسم کو ڈھانپنے کا ہی کام نہیں دیتا۔ بلکہ بہت بڑی حدتک شخصیت اور سیرت کے مختلف پہلوؤں پربھی اثرانداز ہوتا ہے۔

بٹن لباس کی ساخت میں جو کام کرتا ہے۔ اُس پر کسی تفصیل سے روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں کیونکہ انسانی لباس کی وہ کیفیات جو "گریبان چاک" کے مخالف حیثیت رکھتی ہیں بٹن ہی کی مرہونِ منت ہیں۔ اس نقطۂ نگاہ سے لباس انسانی کی تعمیر میں بٹن کی ضرورت بین الاقوامی حیثیت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بٹن کی ساخت صنعت کا بہت بڑا حصہ بن چکی ہے۔ اور دوسرے ممالک میں متعدد بٹن فیکٹریاں ملکی ضرورت کو پورا کررہی ہیں۔ یہ امر موجب مسرت ہے کہ ہندوستان کی اس ضرورت کو پورا کرنے کیلئے دکن بٹن فیکٹری حیدرآباد دکن نمایاں اور قابل تعریف خدمات انجام دے رہی ہے۔ یہ بٹن فیکٹری سوٹ۔ شیروانی کی زیبائش کیلئے بہترین قسم کے نفیس بٹن تیار کرتی ہے۔ اور ہندوستان بھر میں اس فیکٹری کے بنائے ہوئے بٹن استعمال کئے جاتے ہیں۔ یہ فیکٹری صرف سو روپے کے قلیل سرمائے کیساتھ ۱۹۱۶ء میں شروع کی گئی تھی۔ اور صرف دو یا تین سال کے عرصے میں اس کے ساخت شدہ بٹنوں نے ہندوستان بھر میں شہرت حاصل کی۔ اس فیکٹری میں بٹن ہاتھ سے نہیں بلکہ مشینری سے بنائے جاتے ہیں۔ اور اس فیکٹری کی مشینری کی قیمت اسوقت کم وبیش ڈیڑھ لاکھ روپے ہے۔ اور ہندوستان بھر میں اسوقت یہ فیکٹری کم وبیش سوا لاکھ روپے سالانہ کے بٹن فروخت کرتی ہے۔ اس فیکٹری کے بنائے ہوئے بٹنوں کی نفاست کو دیکھتے ہوئے اگرچہ یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہ بیش قیمت ہیں لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ مناسب قیمتوں کی بنا پر یہ اس قابل ہیں۔ کہ ہندوستان بھر کا متوسط طبقہ بھی استعمال کرسکے۔ اور یہ طبقہ اسوقت ان بٹنوں کو کثیر تعداد میں استعمال کرکے اپنی ضروریات پوری کررہا ہے۔

اس تمام ترقی کا دارومدار اس فیکٹری کے مالک جناب محمد غوث الدین صاحب کے سر ہے۔ جنھوں نے اپنے تجربے سے اس فیکٹری کی اتنے قلیل سرمایہ سے بنیاد ڈالی۔ اور آج اسے ہندوستانی صنعت کی درجے پر پہنچا دیا۔ کسی صنعت کی مقبولیت کا دارومدار محض پبلک کی سرپرستی پر ہوتا ہے۔ ان تمام واقعات کے پیش نظر اس میں کوئی شک وشبہ ہی نہیں رہتا کہ آپ کے لباس کی ضروریات کے لئے آپکو اس فیکٹری کے تیار شدہ بٹنوں سے بہتر بٹن اور کہیں نہیں ملیں گے۔ لہذا ہم ناظرین ادبی دنیا سے سفارش کرتے ہیں کہ وہ ضرور ان بٹنوں کو استعمال کریں۔ اور ذاتی ضروریات کی تکمیل کے ساتھ ساتھ ہندوستانی صنعت کے مفاد کو بھی فائدہ پہنچائیں۔ جو صاحب تجارت کرتے ہوں وہ ان بٹنوں کی ایجنسی لے سکتے ہیں مفصل اشتہار اس اشاعت میں کسی دوسری جگہ ملاحظہ فرمایئے۔

روزنامہ "اقبال" بمبئی

ہندوستانی صحافت کا سب سے بڑا مرکز لاہور ہے۔ اس شمع فروزاں کی شعاعیں پھیلتے پھیلتے اگرچہ دور تک اجالا کرتی ہیں۔ لیکن اس صحافتی مرکز سے "بہت دور" یعنی عروس البلاد ہند بمبئی میں بھی اقبال کے نام سے ایک شمع روشن ہے۔ صحیفہ "اقبال" روزنامہ ہے۔ جو ہر صبح طلوعِ آفتاب کے ساتھ جب بمبئی کے ہوٹلوں میں سنگل پیننی۔ گلابی اور پونا کی صدائیں گونج رہی ہوتی ہیں۔ ہر جگہ پہنچ جاتا ہے۔ اس مشہور صحیفے کی بنیاد کبیر احمد صاحب مالک بمبئی پریس نے ۹ ستمبر ۱۹۳۸ء کو رکھی۔ عنانِ ادارت جناب ساحل بلگرامی کے ہاتھ میں ہے۔ جو دنیائے ادب میں گیارہ برس سے روشناس ہونے کے علاوہ غالباً ایک درجن کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ صحیفہ ہذا کی پالیسی بالکل قوم پرستانہ ہے اور تنقیدات بالکل بے لاگ ہوتی ہیں صحیفہ ہذا کے کالموں میں ہندوستانی سیاسیات ومسائل پر بحث کیجاتی ہے۔ اشاعت کے اعتبار سے بھی زیادہ ہے ضرورتمند اصحاب اس پتے پر خط وکتابت کرسکتے ہیں:۔ دفتر روزنامہ "اقبال" بمبئی

مہتہ دھرم پال

بزم ادب

ناظرین ادبی دنیا کو یہ سُن کر افسوس ہوگا کہ ہمارے نغز گو قلمی معاون جناب شہید ابن علی عین جوانی میں بعارضۂ نمونیہ وفات پا گئے ہمیں یہ اطلاع جنوری کے آخر میں مظفر گڑھ سے مسٹر بھگوان جمن کے ذریعہ سے ملی۔ مرحوم ایک نہایت خوش ذوق اور خوش گو شاعر تھے۔ اور منصور احمد مرحوم و مغفور کے شاگردوں میں ایک امتیازی درجہ رکھتے تھے۔ جن اصحاب نے شہید کا وہ مرثیہ پڑھا ہے جو انھوں نے منصور مرحوم کی وفات پر لکھا تھا۔ انہیں اُن کے کلام کی پختگی اور اثر آفرینی کا بخوبی احساس ہوگا۔ ادبی دنیا میں وقتاً فوقتاً جو چیزیں اُن کی چھپتی رہی ہیں۔ انہیں خواص تک نے نہایت احترام کی نگاہوں سے دیکھا ہے۔ افسوس کہ اس ہونہار ادیب کو دستِ اجل نے ہم سے بے وقت چھین لیا۔ ہمیں اس سانحۂ جانگداز میں مرحوم کے اقارب سے دلی ہمدردی ہے۔

اس دفعہ سالنامۂ ادبی دنیا اس قدر مقبول ہوا کہ اس کی تمام جلدیں ختم ہو گئیں۔ اب دفتر میں ایک نسخہ بھی باقی نہیں لیکن چونکہ فوراً ہی دوسرے ایڈیشن کا انتظام کر لیا گیا تھا اس لئے چند روز میں بہت سے نسخے مہیا ہو جائیں گے۔ ہم نے جنوری کے پرچے میں اپنے مستقل ناظرین سے گذارش کی تھی کہ جن صاحبوں نے سالنامے کی رجسٹری کے لئے تین تین آنے کے ٹکٹ نہیں بھیجے وہ اب بہت جلد ٹکٹ بھیج کر اپنے اپنے نسخے منگو الیں۔ اس اعلان پر بہت کم اصحاب نے توجہ دی ہے۔ اب انہیں دوبارہ اس ضروری امر کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے۔

سالنامے کے انعامات کے سلسلے میں جو اعلان کیا گیا تھا اس میں ایک نہایت بلند پایہ نظم کا ذکر نہ ہو سکا۔ ہماری مراد روشن دین صاحب تنویر کی نظم "مقصدِ حیات" سے ہے۔ درحقیقت انعام صرف ایک نظم کے لئے مقرر تھا۔ اس لئے ایک ہی نظم یعنی ساقی نامہ کا ذکر کیا گیا۔ مگر بعد میں ہم نے شدید طور پر محسوس کیا کہ مقصدِ حیات پر بھی انعام دیا جانا ضروری ہے۔ چنانچہ یہ نظم بھی انعامی سلسلے میں شامل کر لی گئی ہے اور سات روپے کی حقیر رقم صاحبِ نظم کو پیش کی جا رہی ہے۔

اس ماہ کے مضامین میں سے بہترین مضمون "روسی طالب علم کی زندگی" قرار پایا ہے۔ چنانچہ صاحبِ مضمون مظفر احمد صاحب کو دس روپے کی رقم پیش کی جا رہی ہے۔ افسانے کا فقط ایک انعام دس روپے مقرر ہے۔ لیکن اس دفعہ ایک ترجمہ شدہ افسانہ "فریبِ زندگی" اس قدر بلند اور دلکش ہے کہ طبعزاد افسانے کے ساتھ اسے بھی انعام کا حقدار قرار دیا گیا ہے۔ چنانچہ مجید لشاری صاحب کو اس افسانے پر اور راجندر سنگھ صاحب بیدی کو اُن کے دل آویز افسانے "گرم کوٹ" پر سات سات روپے کے دو انعامات دیئے جا رہے ہیں۔

سالنامے کے متعلق بعض معاصرین اور ادبی دنیا کے قلمی معاونین نے اظہار رائے کیا ہے۔ ہم ان کی اس نوازش کے لئے بے حد ممنون ہیں اور از بسکہ ہم اس مسرت افزا داد میں اپنے ناظرین کو بھی شریک کرنا چاہتے ہیں۔ اس لئے ان گرامی قدر آرا میں سے چند درج ذیل کی جاتی ہیں۔

معزز ہمعصر ہمایوں رقمطراز ہے۔ "اس ریویو میں حامد علی خاں صاحب کی ستمگرانہ ظرافت کار فرما ہے" سالناموں کے میدان میں "ادبی دنیا" اس سال اپنے سب حریفوں یا حلیفوں سے بازی لے گیا ہے۔ سالنامہ ۱۹۳۹ء بڑی تقطیع کے پونے تین سو صفحات پر شائع ہوا ہے۔ مضامین، نظموں، افسانوں اور ڈراموں کی یہ کثرت ہے کہ فہرست مضامین کو دیکھ کر ہوش ٹھکانے نہیں رہتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ موج در موج حروف کا ایک طوفان بر پا ہے۔ مولانا صلاح الدین صاحب بی اے مدیر "ادبی دنیا" کی ادبی اور کاروباری خوش سلیقگی ہر ہر صفحہ سے نمایاں ہے ہندوستان بھر کا کوئی اچھا شاعر، افسانہ نویس، ڈراما نگار، عالم یا ادیب ان کی مدیرانہ حل مرزید کے سامنے سر تسلیم خم کرنے سے نہیں بچ سکا اگر کوئی ادیب اس طویل و عریض فہرست مضامین میں غائب ہے تو وہ بڑا ہی اڑیل ہوگا رنگین اور یک رنگ تصاویر کی کثرت بھی حساب "کتاب" کی قید سے فارغ نظر آتی ہے۔ ان کے گننے کے لئے بہت وقت درکار ہے، اس لئے فی الحال صرف اتنا ہی کہا جا سکتا ہے کہ تصویریں بے شمار ہیں اور اس کثرت کے ساتھ حسن ذوق کا پتہ بھی دیتی ہیں۔

"حقیقت یہ ہے کہ ایک اوسط درجے کا کاروباری آدمی اگر بجز ہیں ادبی دنیا کا یہ سالنامہ خریدے تو وہ سال بھر کے لئے کسی اور رسالہ کی خریداری کی زحمت سے بچ سکتا ہے۔ اب تک جتنے مضامین راقم کی نظر سے گذرے ہیں وہ دلچسپ نکتہ آموز اور صحیح ذوقِ ادب کے آئینہ دار ہیں۔ خود ایڈیٹر صاحب کا ڈراما "سنت کا رام" نظم و نثر یہ ان کی حیرت انگیز قدرت کا گواہ ہے۔ ایڈیٹر صاحب دلکش اور لطیف اشعار بھی نثر کی طرح برداشتہ قلم اور بے تکان لکھتے چلے گئے ہیں۔ یہ ایک ایسا ملکہ ہے جو بہت کم اُدبا کو حاصل ہوتا ہے۔

"ادبی محاسن کے علاوہ ایک قابلِ توجہ چیز اس سالنامے کے بے شمار اور رنگ برنگ خوبصورت زرافشاں اشتہارات ہیں۔ اردو کے کسی موجودہ یا گزشتہ اخبار یا رسالے میں ہم نے کبھی اس کثرت سے اعلیٰ درجہ کے اشتہارات نہیں دیکھے۔ اس کا مبنیٰ یہ ادبی دنیا کے حریف ہی نہیں بلکہ حلیف بھی اگر رشک کھائیں تو بے جا رے حق بجانب ہیں"۔

مولانا تاجورؔ نجیب آبادی مدیر شاہکار فرماتے ہیں۔

"رسالہ ادبی دنیا کا سالنامہ دیکھ کر نگاہیں دنگ اٹھیں۔ یقیناً ادبی دنیا کا اتباع غیر فانی صورت اختیار کر رہا ہے۔ سرورق کا اعتراف گیر جلال، بوقلموں مضامین کی افادت آرائی، نادرہ کار مصوروں کی صنعت فروز تصاویر مختصر یہ کہ اس دل ربا مرقعے کی ہر طلعت نگاہِ شوق کو اسیرِ تماشا بنا رہی ہے۔

"زِدْنَاكَ وَجْهُهُ حُسْنًا ۔ اِذَا مَا زِدْتَهُ نَظَرًا"

خدا سے ... کے بلوں کی ادائگی، خریداروں کی خوش امتیازی، ایجنٹوں کی خوش معاملگی، اور ڈاک والوں کی فرض شناسی سے شاد کام فرمائے۔ آمین"۔

جناب خواجہ عبدالسمیع صاحب پال اثر صہبائی سری نگر سے لکھتے ہیں۔

"سالگرہ نمبر حسبِ معمول نہایت شاندار اور دیگر رسائل کے سالناموں سے بدرجہا بلند ہے مجھے یہ دیکھ کر مسرت ہوئی کہ منصور مرحوم کی یادگار اتنی شاندار ہے۔ آپ کی مساعی جمیلہ کو دیکھ دیکھ کر مرحوم کی روح یقیناً خوش ہوتی ہوگی"۔

قبلہ حکیم الطاف احمد صاحب آزاد انصاری دہلی سے تحریر فرماتے ہیں۔

"ماشاء اللہ ۱۹۳۶ء کا سالنامہ ادبی دنیا لاجواب شائع ہوا ہے۔ بہ ظاہری شکل و صورت اور باطنی خوبیوں کی وجہ سے ایک ایسا دلچسپ رسالہ ہے کہ جس کی نظیر ہندوستانی صحافت میں آج تک میری نظر سے نہیں گذری۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہوں گا کہ آپ کا یہ سالنامہ ایسا سالنامہ ہے جسے بہتر سے بہتر مغربی رسائل کے مقابلہ میں فخریہ پیش کیا جا سکتا ہے قابلِ شکریہ و مبارکباد ہے۔ ادارہ ادبی دنیا جس نے ایسا دیدہ زیب، دلچسپ اور مفید مواد و معلومات کا حامل سالنامہ شائع کر کے ملک و قوم اور اس کے ادب و زبان پر احسان کیا"۔

جناب شبیر حسن صاحب رضوی لکھنؤ سے لکھتے ہیں:۔

"میں نے ادبی دنیا کے صرف تین سالنامے دیکھے ہیں تاہم اتنا کہہ سکتا ہوں کہ وہ تاریخی اہمیت رکھتے ہیں۔ دو سالناموں کو پڑھ کر درمیانی سال کے ادبی رجحانات اور رفتارِ ترقی کا صحیح اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ادب اردو کے آئندہ مورخوں اور محققوں کے لئے جو مفید اور کارآمد مواد آپ فراہم کر رہے ہیں، غالباً کہیں اور اس آسانی کے ساتھ نہ مل سکے گا۔ زیر نظر سالنامے کی ترتیب اور تدوین ذوقِ سلیم اور قابلیت کا زندہ اعجاز ہے۔ فہرستِ مضامین پر نظر دوڑاتے ہی بے ساختہ منہ سے واہ نکلتی ہے۔ ادب اردو کی ترقی اور ترویج کے لئے جو جو نئی راہیں اختیار کی جا رہی ہیں۔ جن جن زاویوں سے اس کے خفیہ اور فراموش شدہ خزانوں پر روشنی ڈالی جا رہی ہے۔ قدیم و جدید کے امتزاج سے جو جو نئی شکلیں پیدا ہو رہی ہیں سب کے بہترین نمونے آپ نے یکجا کر دیئے ہیں۔ سالنامہ پڑھتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی پختہ کار راہبر قلعہ اردو کے در و دیوار، کھنڈر اور دالانوں پر اپنے تاریخ کی روشنی ڈال کر سیاحوں کو دکھا رہا ہے اور عمارت کی موجودہ ساخت کے ساتھ ان ترمیمات پر بھی روشنی ڈالتا جا رہا ہے جو اس میں آئندہ ہونے والی ہیں۔ تاریخی، تحقیقی اور علمی مضامین کے ساتھ ساتھ قدیم و جدید طرز کی شاعری کے بہترین نمونے۔ بلند پایہ افسانے اور ڈرامے سب کچھ موجود ہیں"۔

شاعرِ خوش گفتار جناب سعید احمد صاحب اعجازؔ ادارہ عروسِ بہار سے رقمطراز ہیں:۔

"سالنامہ صوری اور معنوی ہر دو لحاظ سے قابلِ دید ہے۔ افسانے اور ڈرامے بہت بے نظیر ہیں، اُن میں جس چابک دستی سے فطرتِ انسانی کی تصویر کشی کی گئی ہے اُسے سامنے رکھتے ہوئے ہمارے "ادبیات" کا مستقبل نہایت شاندار نظر آتا ہے نظمیں اور غزلیں اور رباعیاں نہایت کیف انگیز ہیں، تصاویر کا انتخاب فنی نقطۂ نظر سے بہت کامیاب ہے۔ علمی اور ادبی مضامین حد درجہ پرمغز اور خیال انگیز ہیں۔ غرض شروع سے آخر تک یہ عالم ہے کہ ع

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست

اس ضمن میں میرے لئے یہ امر نہایت موجبِ مسرت ہے کہ منصور مرحوم ادبی دنیا کو جس مخصوص شاہراہ پر لئے جا رہے تھے، "ادبی دنیا" آج بھی اسی پر گامزن ہے اور اُس کا ہر قدم بڑی سرعت سے منزل کی طرف بڑھ رہا ہے"۔

محبِ گرامی مہر لال صاحب سونی ضیاؔ فتح آبادی دہلی سے لکھتے ہیں۔

"ادبی دنیا جس طرح بذاتِ خود اردو رسالوں میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے اُسی طرح اُس کا سالنامہ بھی سالناموں میں ہمیشہ ممتاز ہوتا ہے اور مجھے مسرت ہے کہ اس سال بھی سالنامہ ادبی دنیا میں وہی امتیازی شان قائم و دائم ہے۔ اس قدر ضخیم

رسالہ شائع کرکے یقیناً آپ نے بڑے ایثار کا ثبوت دیا ہے مضامین کے اعتبار سے آپ کا سالنامہ اردو ادب میں ایک اضافی حیثیت رکھتا ہے۔ ہر مضمون اور ہر نظم اپنی جگہ مکمل اور کامیاب ہے۔ آپ کی نظر انتخاب کا یہ بہترین مرقع ہے۔ جناب کرشن چندر ایم اے اور میراجی کے مضامین پڑھ کر طبیعت بہت مسرور ہوئی۔ یہ دو نوجوان ادیب اپنے ساتھ نہایت روشن مستقبل لائے ہیں۔ میں آپ کو سالنامہ کی اشاعت پر مبارکباد پیش کرتا ہوں"۔

عزیز مکرم سادھو رام صاحب ناجو رسامری لائل پور سے تحریر فرماتے ہیں۔

"سالگرہ نمبر بھی اپنی مثال آپ ہے۔ انعامات کے لئے آپ کا انتخاب قابل قدر ہے۔ مکرمی قیوم نظر کا ساقی نامہ اور میراجی کا مضمون۔ ودیاپتی کے گیت۔ لٹریچر میں ایک مستقل حیثیت کے حقدار ہیں۔ کرشن چندر ایم اے کا افسانہ جنت اور جہنم واقعی ایک پرکیف رومان ہے۔ پڑھنے والا دیر تک اس کی لذت سے محظوظ ہوتا ہے۔ خدا کرے کہ ادبی دنیا دن بدن ترقی کرتا ہوا زندۂ جاوید ہو جائے"۔

احمد علی خاں صاحب شاد رام پور سے ارشاد فرماتے ہیں۔

"ادبی دنیا کے سالنامے کو امید سے زیادہ دیدہ زیب اور معنی خیز پایا جس کے لئے آپ کی کوششیں قابل داد ہیں"۔

مرزا عباس بیگ محشر بنارس سے رقمطراز ہیں۔

"سالنامہ ادبیات کا شاہکار ہے۔ آپ کی کوششوں کا ہر ادبی ذوق رکھنے والے کو ممنون ہونا چاہئے۔ خدا اور ترقی دے"۔

جناب علی منظور صاحب حیدر آباد دکن سے لکھتے ہیں۔

"موقر ادبی دنیا کا سالنامہ بالاستیعاب دیکھا۔ یہ دیدہ زیب بھی ہے۔ دلفریب بھی یعنی اس کو دیکھ کر اصحاب ظاہر بھی خوش ہوں گے ارباب باطن بھی۔ ہر قسم کے مذاق کو مطمئن کرنا آسان کام نہیں، آپ کے یہ دن تو مبارکبادیں بسر ہو رہے ہوں گے۔ پھر میں کیوں خاموش رہوں۔ قبول فرمائیے۔ تحفہ تبریک و تہنیت"!

شیلے کی موت، پر ایک دلچسپ مضمون اور اس کے متعلق دو نہایت دلکش تصویریں بھی شامل اشاعت ہیں۔ ان میں سے ایک تصویر شیلے کی بیوی میری کے پنسلی خاکے سے لی گئی ہے اور دوسری تصویر اس قصر ساحل کو پیش کرتی ہے جس میں شیلے نے اپنی زندگی کے آخری ایام بسر کئے۔ ان تصاویر کے لئے ہم صاحب مضمون محمد صادق صاحب قریشی کے ممنون ہیں۔

صلاح الدین احمد

ہندو شعرا و اُدبا سے ضروری التماس

خاکسار الٰہ آباد یونیورسٹی میں جولائی ۱۹۳۸ء سے بحیثیت ریسرچ اسکالر زیر نگرانی محترمی پروفیسر جناب سید محمد ضامن علی صاحب ایم اے صدر شعبۂ اردو کام کر رہا ہے۔ میرے ریسرچ کا مضمون "اردو ادب میں ہندوؤں کی خدمات" ہے۔ اس کے اندر نہ صرف مختلف اصناف سخن میں ہندو شعرا کی خدمات کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ بلکہ زبان اردو سے متعلق تمام ادبی شاخوں (مثلاً مضمون نگاری۔ ناول نگاری۔ مختصر افسانہ نگاری۔ ڈرامہ نگاری تذکرہ نگاری۔ تاریخ گوئی۔ و نیز تاریخ۔ جغرافیہ۔ فلسفہ۔ سائنس ریاضی وغیرہم) میں خامہ فرسائی کرنے والے ہندو صاحبان کے مختصر حالات زندگی معہ ان کی ادبی خدمات کے لکھے جا رہے ہیں۔ شعرا کا ذکر بلحاظ مختلف دور اور مقام سکونت (دہلی۔ لکھنؤ۔ اکبر آباد۔ الٰہ آباد۔ پنجاب۔ بہار۔ دکن اور دیگر مقامات) کیا جا رہا ہے۔ امید ہے۔ کہ آپ حضرات کی عنایت سے یہ کتاب دور حاضر تک کے لئے ایک نہایت جامع اور مکمل تذکرہ ثابت ہوگی۔ اس لئے ان ہندو حضرات کی خدمت میں جن کی ادبی خدمات کا ذکر بہار گلشن کشمیر۔ خمخانہ جاوید کی مطبوعہ چہار جلد اور بہار سخن مؤلفہ بابو شیام سندر لال صاحب برق سیتا پوری میں ناکافی یا بالکل نہیں کیا جا سکا ہے۔ خاکسار با ادب ملتمس ہے کہ وہ برائے کرم اپنے، نیز اگر ممکن ہو۔ تو اپنے زمانہ حیات کے ان گمنام ہندو شعرا کے جو انہیں معلوم ہیں۔ لیکن عوام کی نظروں سے پوشیدہ رہے یا ہیں۔ مختصر حالات زندگی معہ نمونہ کلام (صرف بیس چیدہ اشعار یا دو تین نیچرل نظموں کے چند منتخب ابیات پابند) اور اپنی، نیز ان کی خود نوشتہ کتابوں کے نام معہ سن تصنیف۔ تالیف یا ترجمہ کے خاکسار کے پاس ذیل کے پتے سے جلد ارسال کرکے مرہون منت فرمائیں۔ فقط

گنپت سہائے سریواستو۔ ایم۔ اے ریسرچ اسکالر
اردو ڈپارٹمنٹ۔ الٰہ آباد یونیورسٹی

آئینۂ عالم

مشرق اور مغرب کی یکرنگی

کپلنگ کو نوبیل انعام ملا اور اس سے اس کے نفاق انگیز مقولے کی بہت ہی تشہیر ہوئی کہ مشرق اور مغرب مل نہیں سکتے۔ لیکن کپلنگ سے کہیں زیادہ روشن دماغ لوگ بھی دنیا میں موجود ہیں اور وہ جان چکے ہیں کہ کرۂ ارض کی یہ دونوں انتہائی سمتیں روز بروز ایک دوسرے کی طرف زیادہ سے زیادہ راغب ہوتی جاتی ہیں۔ بلکہ امریکہ کی مشہور ناول نگار عورت پرل بک تو یہ کہتی ہے کہ اس وقت بھی بنیادی طور پر مشرق اور مغرب یکساں خصوصیات کے مالک ہیں۔

پرل بک کو گذشتہ سال ادب کا نوبل انعام ملا ہے۔ ادب کا یہ انعام امریکہ نے تیسری بار حاصل کیا ہے۔ آج سے آٹھ سال پیشتر یہی انعام امریکہ کے ناول نگار سنکلیئر لیوس کو ملا تھا اور دو سال ہوئے مشہور ڈرامہ نگار یوجین اونیل اس کا مستحق قرار پایا تھا۔ اور اب یہی انعام پرل بک کو ملا ہے۔ پرل بک کی شہرت چینی زندگی کے متعلق اُس کے ناولوں سے ہوئی۔ مغرب والے اس سے پہلے چین کی معاشرتی زندگی اور چینیوں کی نفسیات کے متعلق بہت کم ایسی باتیں جانتے تھے جن کی بنیاد حقیقت پر ہو۔ پرل بک نے پہلی بار چین کو مغرب کے لئے ایک زندہ حقیقت بنا دیا۔

پرل بک امریکہ کی شہری زندگی سے دور دیہات کی کھلی فضا میں اپنے خاوند اور بچوں کے ساتھ رہتی ہے۔ اس کی طبیعت میں ایک ایسی خلوت پسندی ہے جو اس کے مشرقی رجحان طبع کا پتہ دیتی ہے۔ اس کا پتھریلا مکان نہ صرف شہروں سے ہی دور ہے بلکہ قریب ترین گاؤں بھی وہاں سے ایک میل سے زیادہ فاصلے پر ہے۔

پرانے زمانے میں مشرق کے قلعے اور شاہی محلات ایسے محدود اور ناقابل گذر مقامات تھے کہ اُن کی حدوں میں داخل ہونے کے لئے بعض اوقات کھل جا سم سم کا طلسمی کلمہ بھی کارآمد ثابت نہ ہوتا تھا۔ پرل بک کے اکیلے سنسان مکان کی بھی ایک طرح سے یہی کیفیت ہے آپ اس مشہور ناول نگار سے ملنے جائیے گنتی کے دو چار ہمسائے جو آپ کو وہاں ملیں گے انہوں نے پرل بک کے متعلق کوئی پتے کی بات بتانے کے سلسلے میں چُپ کا روزہ رکھا ہوگا۔ وہ اس کے متعلق آپ کو کسی قسم کی آگاہی نہ ہونے دیں گے۔ آپ بڑی دیر تک دلیل و برہان سے کام لیتے رہیں گے۔ جب آپ اپنا تمام ذخیرہ استدلال ختم کر چکیں گے تو یہ وفادار ہمسائے صرف اتنی بات بتائیں گے کہ پرل بک لوگوں سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتی اور اس لئے وہ یہ نہیں بتا سکتے کہ اس کے مکان کا دروازہ کونسا ہے یا اُس کے مکان کو کونسا راستہ جاتا ہے۔

جب پرل بک کو نوبل انعام دئیے جانے کا علم اخباروں کو ہوا تو امریکہ کے ایک مشہور اخبار کا نامہ نگار اس سے ملاقات کی غرض سے اس کے مکان پر پہنچا۔ نامہ نگار نے اس ملاقات کا حال ایک مضمون میں لکھا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ پرل بک نے نوبل انعام کا ذکر آنے پر کہا۔

"بہتر ہوتا اگر ادبیات کی کمیٹی مجھے اس اعزاز کا حقدار ظاہر کرنے میں دس سال اور انتظار کر لیتی۔ کیونکہ مجھے ابھی پہلے سے کہیں بہتر کام کرنا ہے۔ میرے ذہن میں ابھی کئی افسانے ہیں، کئی ایسی کتابیں

موجود ہیں جنہیں ابھی لکھا جانا ہے۔ اس انعام کی خبر سن کر مجھے بہت
حیرانی ہوئی۔ سچ تو یہ ہے کہ مجھے یہ بھی خیال نہ تھا کہ انعامی فیصلے کے
لئے کمیٹی سال کے کون سے مہینے میں بیٹھتی ہے۔ لیکن اب کہ یہ انعام
میں نے جیت لیا ہے ـــــ صرف ایک کتاب کے لئے نہیں بلکہ
اپنی ساری تصنیفات کے لئے ـــــ تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے گویا
میرے سر پر ایک بڑی بھاری ذمہ داری کا بار آن پڑا ہے۔ اس وقت
میں چینیوں اور جاپانیوں کے متعلق ایک کتاب کی تیاری میں مصروف ہوں
امید ہے کہ فروری تک یہ پوری ہو جائے گی۔ اس کے بعد میں ایک ایسی
کتاب لکھوں گی جس کا ماحول امریکہ میں ہوگا۔

لیکن ماحول یا پس منظر سے مجھے اتنی دلچسپی نہیں جتنی کہ
کرداروں سے ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ میں تھیوڈور ڈریزر
کو جو کردارنگاری کا زبردست ماہر ہے بہت پسند کرتی ہوں۔ اگر قوم
نسل اور ملک کے فرق کو نظر انداز کر کے دیکھا جائے تو تمام مرد
اور عورتیں یکساں حالتوں میں یکساں احساس وافعال کا اظہار کرتے
ہیں۔ قوموں اور نسلوں کے اختلافات کا اندازہ لوگوں نے بہت کم
لگا رکھا ہے۔ امریکہ اور یورپ والے چینیوں کو اس نظر سے دیکھتے
ہیں۔ گویا وہ کسی اور نوع سے تعلق رکھتے ہوں۔ لیکن وہ شخص جو چین
میں رہ چکا ہو۔ اور یہاں کے باشندوں کو جانتا ہو اس بات کو اچھی طرح
سمجھتا ہے کہ چند سطحی اختلافات کے علاوہ یہ بھی ویسے ہی خدا کے بندے
ہیں جیسے مغرب والے۔

ایک چینی عادات واطوار کے لحاظ سے بہت شستہ ہوتا ہے
اجنبیوں کے ساتھ شائستگی سے برتاؤ کرتا ہے اور باہمی سلوک میں
ان سے محتاط رہتا ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ وہ اجنبی لوگ اس کی ذات
کو شک کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور اپنے سے ایک علیحدہ قسم کا انسان
سمجھتے ہیں۔ لیکن جب آپ کسی چینی کو اچھی طرح جان لیں اور اس کو بھی
اس بات کا احساس ہو جائے کہ اب آپ اسے مشکوک نگاہوں سے
نہیں دیکھتے تو وہ اپنے رکھ رکھاؤ اور اپنی احتیاط کو بالائے طاق رکھ کر سیدھا
سادا صاف گو انسان بن جاتا ہے اور وہ ناقابل فہم ہالہ جو اس کے ارد گرد
غلط خیالات کی وجہ سے پیدا ہو گیا ہے۔ مٹ جاتا ہے۔

" اس لحاظ سے میں وہ وقت کبھی نہ بھولوں گی جب پہلی بار میں ورجینیا
کے امریکی کالج میں داخل ہوئی۔ اُس وقت میری عمر سترہ سال کی تھی اور
یہ سترہ سال کا عرصہ میں نے چین ہی میں گذارا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اُس
زمانے میں میری سوچ بچار کا انداز بھی مشرقی ہی تھا۔ پہلی دفعہ مجھے
وہاں کی طالبات بہت اجنبی محسوس ہوئیں۔ وہ آپس میں سہیلیاں
بھی تھیں اور انہیں زندگی کی دوسری دلچسپیاں بھی تھیں، ان کا رہنے سہنے کا طریقہ
میرے لئے نیا تھا۔ پہلے پہل مجھ پر ان کی جن باتوں نے اثر کیا وہ اُن کی
بنیادی نہیں بلکہ سطحی خصوصیات تھیں۔ عین ممکن ہے کہ میں بھی انہیں ویسی
ہی عجیب نظر آتی ہوں جیسی وہ مجھے دکھائی دیتی تھیں۔ ان حالات میں میں
الگ رہنے لگی اور اپنے احساسات کے اظہار میں جھجکنے لگی۔ میں اُن کے
لئے ایک عجوبہ تھی اور ہر نئی آنے والی لڑکی کو خصوصاً ایک ایسی
عجیب الخلقت ہستی کے طور پر دکھائی جاتی تھی جو چینی زبان بھی بول
سکتی ہو۔ کالج کے زمانے کے ان تجربات نے میرے لئے اس
بات کا احساس بہت آسان کر دیا کہ پردیس میں پردیسی کے دل
کی کیا حالت ہوتی ہے۔

"بہرحال نسبتاً بہت جلد یہ بات میری سمجھ میں آ گئی کہ اس
کالج میں جو لڑکیاں پڑھتی ہیں وہ ان لڑکیوں سے کچھ خاص مختلف
نہ تھیں جن کے ساتھ میں نے چین میں اپنا بچپن گذارا تھا۔ ان
کے رسم ورواج اور روائتی باتیں یکساں نہ تھیں اور ان کے خیالات
پر ان کے ماحول اور حالات وقت کا اثر قدرتاً ہوتا تھا، لیکن قلبی
لحاظ سے وہ بالکل ویسی ہی تھیں جیسی کہ میری مشرق بعید کی سہیلیاں۔
اُن کی مسرتیں اور ان کے رنج وغم یکساں تھے۔

" اب ہمارے اس موجودہ مکان ہی کو لیجئے، یہاں ہم سب سے
دور اکیلے رہتے ہیں، کسی قسم کے شہری ہمسائے ہمارے قریب نہیں
ہیں۔ جو گنتی کے چند ہمسائے ہیں بھی، وہ اُن دور کے مکانوں میں رہتے
ہیں، یہ سب دیہات کے رہنے والے ہیں اور سالوں سے یہاں رہتے
آ رہے ہیں۔ اور ان سے پہلے ان کے دادا پردادا بھی یہیں رہا کرتے
تھے۔ یہ سب محنت مشقت کرنے والے اچھے بھلے لوگ ہیں اور جس
تنہائی کی ہمیں ضرورت ہے یہ اُس میں مطلق دخل نہیں دیتے اور نہ
ہمارے معاملات میں خواہ مخواہ حصہ لینے کی کبھی کوشش کرتے ہیں۔ یہ
لوگ بالکل میرے لڑکپن کے چینی ہمسایوں کی مانند ہیں۔ اس بات
پر نہ جائیے کہ ان کا لباس، ان کے اطوار اور یہاں کے مکانات چین کے
دیہاتیوں سے مختلف ہیں، اور ان کی زبان ایک نہیں ہے، ان کے

خیالات، ان کی اُمیدیں اور اُن کی امنگیں ایک سی ہیں۔

"جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے مجھے دنیا سے دوری کے احساس کی ضرورت ہے۔ تاکہ میں اطمینان سے اپنا کام جاری رکھ سکوں، ایک بڑے شہر کا پُر حیات اور جستجو اور گرم جوشی مکانات کی دیواروں کو بھی چیر کر اندر آسکتی ہے۔ بند دروازوں سے دوسرے لوگوں کی ہستی کا احساس نہیں مٹ سکتا۔ یہاں جب میں کاغذ اور قلم لے کر کچھ لکھنے بیٹھتی ہوں تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے گویا میں سراسر اکیلی اور تنہا ہوں۔ میں تصنیف کا کام ٹائپ رائٹر پر نہیں کرسکتی۔ اس کی کھٹ کھٹ کا شور میرے خیالات کو پریشان کر دیتا ہے اور مجھے یوں محسوس ہونے لگتا ہے گویا کمرے میں کوئی اور شخص بھی موجود ہے۔"

امریکہ کی یہ ناول نگار عورت جس کا کام چین کے متعلق تصنیفات شائع کرنا ہے۔ امریکہ کی ریاست ورجینیا کے مغربی حصے میں پیدا ہوئی تھی۔ لیکن اس کا باپ ایک مشنری (مبلغ) تھا اور یہ ابھی بچی ہی تھی کہ اُسے باپ کے ساتھ چین جا کر رہنا پڑا۔ چین میں اس کے والدین کی ابتدائی زندگی بہت کٹھن حالتوں میں گذری۔ پرل بک کا صرف ایک بھائی ولایت تعلیم کے لئے آیا۔ باقی سارے بچے جو پرل بک سے بڑے تھے چین ہی میں مر گئے۔ ایک لڑکی چین میں بھی پیدا ہوئی۔ ان دونوں بہنوں کی بچپن کی زندگی اُن تمام باتوں سے عاری تھی جو ایک عام امریکن لڑکی کے لئے باعث مسرت ہوتی ہیں۔ کیونکہ وہاں انہیں کسی قسم کی سماجی زندگی میسر نہ تھی۔ نہ سکول اور نہ گرجا گھر کے معاشی تعلقات، صرف وہ بہنیں اور اُن کی ماں۔

جب پڑھائی کا وقت ختم ہو جاتا تو پرل بک گھر کے آس پاس کے علاقے میں گھوما کرتی اور چینیوں سے ان کی اپنی زبان میں باتیں کرتی اور اُن سے ایسی ایسی کہانیاں سنتی جو اس سے پہلے مغرب کی کسی لڑکی نے نہیں سنی ہوں گی۔ اس زمانے میں اُن کی زندگی میں اہم حصہ لینے والی اس کی ایک بوڑھی چینی انّا بھی تھی۔ یہ انّا پرل بک کو عموماً اپنے بچپن کا حال سنایا کرتی۔ اس بوڑھی انّا کی باتیں اکثر گئے گذرے زمانے کے قحطوں اور طوفان اور بغاوتوں کی داستانوں پر مشتمل ہوتی تھیں۔ چینی ملک کا حُسن اور چینی لوگوں کی موجودگی کا احساس پرل بک کے بچپن کا ایک ایسا بنیادی جزو تھا کہ جب وہ شنگھائی کے سکول میں تعلیم کی غرض سے گئی تو اُسے یہ خیال ہی نہ تھا کہ وہ چین کی رہنے والی نہیں ہے۔ شنگھائی سے ایک بار وہ یورپ کے سفر پر آئی اور پھر امریکہ میں کالج کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے اس نے مشرق کو کچھ عرصے کے لئے چھوڑ دیا۔ کالج کی تعلیم کے بعد وہ پھر چین میں اپنے والدین کے پاس چلی گئی۔ اور اب سے چھ سال پیشتر تک وہ سوائے کبھی کبھار امریکہ آنے کے تمام عرصہ چین ہی میں رہی۔

پرل بک کا خیال ہے کہ شاید بچپن کی زندگی چین میں گذرنے کے سبب ہی سے اُس کے دل میں چین کا ایسا خیال پیدا ہو گیا ہے اور اس مشرقی ملک کی چاہت ایک مغربی عورت کی نمایاں خصوصیت بن گئی ہے۔

اس سوال پر کہ کیا چینی لٹریچر کے مطالعے نے اُس کی انگریزی طرز تحریر پر کچھ اثر کیا، پرل بک نے کہا کہ "ہاں میرا خیال ہے کہ چینی ادب کا میری انگریزی تحریر پر اثر ہوا ہے۔ لیکن اتنا نہیں جتنا کہ بچپن میں اپنے والد سے انجیل سننے کا۔ لیکن چین کی قدیم تحریروں اور انجیل کے انداز میں ایک یکسانیت ہے۔ اس لئے میری انگریزی تحریر پر ان دونوں کا اثر نمایاں ہے۔"

پرل بک کا خیال ہے کہ وہ پھر بھی چین جائے گی۔ لیکن مستقل طور پر وہاں رہنے کا خیال اُسے نہیں ہے۔ چین کی موجودہ حالت پر اُسے بہت ہی رنج و قلق ہے۔ لیکن اُسے اس ملک کے مستقبل پر پورا اعتماد ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ چین کو کبھی فتح نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ مسلح مدافعت کی بہ نسبت اُس کی روحانی مدافعت ایسی مدافعت ہے جو ہمیشہ قائم رہے گی۔ یہ مدافعت جھوٹے پروپیگنڈا اور فوجی فتوحات کے باوجود قائم رہے گی جیسے ماضی شاہد ہے اب بھی چینی مناسب وقت کا انتظار کریں گے۔ منتظر رہنے کے لحاظ سے چین کا ہر فرد ایک زبردست طاقت کا مالک ہے۔ وہ ظلم اور مہربانی کسی چیز کو بھی نہیں بھولتا۔ یہ دونوں انتہائی سلوک اُسے یاد رہتے ہیں۔ خواہ انجام کار چین کو جھکنا ہی کیوں نہ پڑے اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہو سکتا کہ وہ مٹ بھی جائے گا۔ اُسے اصلی اور سچی ہار کبھی نہیں ہو سکتی۔ دنیا کی نظروں میں وہ مفتوح نظر آسکتا ہے۔ لیکن حقیقتاً وہ کچھ بھی نہیں ہارے گا۔ چین کی زندگی جوں کی توں برقرار رہے گی۔

بسنت سہائے

ہندوستان کی غربت کا مسئلہ

ہندوستانیوں کو اس حقیقت کا پورا احساس ہو چکا ہے کہ غربت کے قعرِ مذلّت سے اُبھرنے کے لئے اُنہیں ایک زبردست اقتصادی قوم پرستی کی ضرورت ہے۔ نیز اُن کے لئے ضروری ہے کہ وہ اب اپنے فعل و عمل کو اِس ڈھب پر لے آئیں کہ وہ زندگی سے لطف اندوز ہو سکیں اور اس لطف کی مقدار پہلے سے کہیں زیادہ ہو۔

دو ہی راستے ممکن ہیں۔ یا تو مستقبل کے متعلق ایک معین لائحہ عمل تجویز کر لیا جائے یا تباہی کا سامنا کرنے کے لئے تیاری کر لی جائے غور و تفکر سے پہلو تہی کرنے پر یہی بھیانک صورتِ حال لازمی ہے۔

اگر ہماری تجاویز سے برطانوی صنعت کاروں اور سرمایہ داروں کے دلوں میں اپنی آسائش کے متعلق اندیشے پیدا ہوں۔ تو اس کی ہمیں کوئی پروا نہیں۔ ہمیں اپنی ذات کے لئے راہ پیدا کرنا از بس ضروری ہے۔ اور اس نئے راستے کی تلاش میں ہمیں کسی بیرونی قوت سے پند و نصائح کی ضرورت نہیں ہے۔

حکومت پرست اخبارات اور افراد ہندوستان کی صنعتی تنظیم کے خطرے کو دیکھتے ہوئے اندیشوں سے دُبلے ہوئے جا رہے ہیں۔ لیکن اُن کی اس گھبراہٹ پر ہمیں کوئی حیرانی نہیں ہے۔ بلکہ اُن کی یہ سراسیمگی ہمارے لئے باعثِ صد انبساط ہے۔ ہندوستانی شہسوار میدانِ سیاست میں اپنے جوہر دکھا کر اب اقتصادی میدان میں بھی غیر ملکی اقتدار و اختیار پر حملہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ رفتہ رفتہ پہلے سے زیادہ سیاسی قوت کے حصول نے ان کے حوصلے بڑھا دیئے ہیں اس وقت جبکہ دنیا میں برطانیہ کی سیاسی اہمیت یورپ کے فسطائی آمروں (ہٹلر اور مسولینی) کی چیرہ دستیوں اور زبردستیوں کی وجہ سے کم ہو گئی ہے۔ وہ اس فکر میں ہے کہ کم سے کم اپنی اقتصادی برتری کو کسی قسم کا صدمہ نہ پہنچنے دے۔ اور اس لحاظ سے یہ بات روزِ روشن کی طرح ظاہر ہو چکی ہے۔ کہ ہندوستان پر برطانیہ اپنی فوجوں کی مدد سے صرف اپنی تجارت اور صنعت کے مفاد کی خاطر حکومت کر رہا ہے۔

برطانیہ کے حامی ایک طفلانہ سادگی سے کہتے ہیں کہ ہندوستان کی مجوزہ اقتصادی تنظیم سے ملک کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہے۔ کیونکہ ہندوستان کے اقتصادی نظام کی بنیاد زیادہ تر اس کی زراعتی پیداوار کی برآمد اور کسٹم کی آمدنی پر ہے۔ لیکن یہ حامی ہاتھ میں تلوار لئے بغیر لڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ اس حقیقت کو آسانی سے بھلا رہے ہیں کہ اس طرح کی ساختہ ناموزوں اور ضرر رساں اقتصادی حالت کو برطانوی سرمایہ داری نے اپنے ذاتی مفاد کے لئے پیدا کر رکھا ہے۔ ہندوستانی اقتصادیات میں زراعتی اجناس اور برطانوی صنعتی سامان سے ہندوستان کے خام مواد کا تبادلہ محض برطانیہ کے مفاد کی خاطر روا رکھا گیا ہے۔ ہندوستانی مبادلے کے نرخ درحقیقت برطانوی درآمد کی توسیع کے لئے مقرر کئے جاتے ہیں شرح محصول میں بھی جو پالیسی رکھی گئی ہے۔ اس میں بھی اسی مقصد کو مدِ نظر رکھا گیا ہے۔

ٹریڈ کمشنر نے یہ کہہ کر برطانیہ کے اقتصادی راز کو افشا کر دیا ہے۔ کہ لندن کے ساتھ تبادلے کا توازن قائم رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ ہندوستان اپنے اقتصادی اور مالی نظام کو خام مواد کی برآمد سے برقرار رکھے۔ لیکن ہندوستان اب اس صورت حالات کو برداشت نہیں کر سکتا۔ ہمارا سب سے پہلا مقصد اب یہی ہے کہ ہم ایسے تباہ کن اقتصادی نظام کو توڑ کر ایک ایسی نئی عمارت کی تعمیر کریں۔ جس کی خصوصیت نہ صرف زیادہ سے زیادہ پیداوار کی فراہمی ہو۔ بلکہ زیادہ سے زیادہ مفادِ عامہ بھی اس کا خاصہ ہو۔ ہندوستان کے لئے اقتصادی تنظیم کا یہی مقصد ہے۔

موجودہ وقت میں جن مسائل سے دوچار ہونا ضروری ہے۔ اُن کا حل اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ اندرونی پیداوار کی طاقتوں پر سے پابندیوں کو ہٹا لیا جائے۔ اور اُن کی سائنٹیفک تنظیم کی جائے۔ تاکہ زراعتی اور صنعتی پیداوار کی مقدار کو زیادہ کیا جا سکے۔

وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ سودیشی کی تحریک پر کسی قسم کی پابندی عائد نہ کی جائے۔ ہم اُن کے ممنون رہیں۔ ایک وقت وہ تھا کہ سودیشی کا لفظ ہی بغاوت کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور اس سے دُور رہنے ہی میں ہر طرح کی بہتری تصور کی جاتی تھی۔

جب تک دنیا میں ہندوستان کے علاوہ دوسرے ممالک موجود ہیں۔ زراعتی پیداوار کی برآمد کا مسئلہ کبھی بھی ایک اہم مسئلہ نہیں بن سکتا۔ خود برطانیہ بھی اس محتاجی سے عہدہ برآ نہیں ہو سکتا۔

ہم ہمیشہ اس بات کے لئے تیار رہیں گے کہ برطانیہ اور دوسرے ممالک سے اپنے تجارتی معاہدے قائم رکھیں۔ کیونکہ ہمارے پیش نظر صرف ایک واحد مقصد ہوگا اور وہ مقصد اپنے ملک کی دولت کو بڑھانے کا مقصد ہے

ٹریڈ کمشنر نے اپنے سلسلہ کلام میں یہ بھی کہا ہے کہ گذشتہ دو سالوں میں ہندوستان سلطنت متحدہ برطانیہ کے مال کے لئے سب سے بڑی منڈی نہیں رہا۔ لیکن اس کے جواب میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ہم نے کبھی بڑی منڈی ہونے پر اظہار تفاخر نہیں کیا۔ کہ ہم اپنی دولت کو ضائع کرنے لئے یہ بے مصرف امتیاز حاصل کریں۔ برطانیہ اگر یہ سبق دینا چاہتا ہے کہ اُس کے ماتحت ملک اپنی غلامی اور غربت پر اظہار مسرت کریں۔ تو وہ دوسروں کی طرف توجہ کرے۔ ہندوستان اس سے باز آیا۔ اُسے اس بات کا مکمل شعور ہے کہ غربی اور فلاکت کا جوا گلے سے علیحدہ کرنے کے لئے اقتصادی تنظیم ازبس ضروری ہے۔ نیز اپنے مستقبل کو سدھارنے کے لئے اُسے اپنے بل بوتے پر انحصار کرنا ہوگا۔ اس وقت سرمایہ داری پند و نصائح اور انتباہ پر اُتر آئی ہے۔ لیکن وہ دن دُور نہیں کہ یہ سب اُونچے گھمنڈی التجاؤں کی طرف رجوع ہو جائیں گے۔ سرمایہ داری کی تمام چالیں اب ہماری نظروں میں آ چکی ہیں۔ یہ حیوان پنجہ غُرّاتا اور دانت دکھاتا ہے لیکن بعد ازاں وقت کے مطابق دُم بھی ہلانے لگتا ہے۔

بسنت سہائے

شعر

ٹوٹی ہے کوئی کشتی یا شور ہے ساحل کا
یا کوئی بلاتا ہے مجھ کو لبِ دریا سے

علی حسنین زیبا

غزل

راز الفت چھپا کے دیکھ لیا
دل بہت کچھ جلا کے دیکھ لیا

اور کیا دیکھنے کو باقی ہے
آپ سے دل لگا کے دیکھ لیا

آس اُس در سے ٹوٹتی ہی نہیں
جا کے دیکھا۔ نہ جا کے دیکھ لیا

وہ مرے ہو کے بھی مرے نہ ہوئے
ان کو اپنا بنا کے دیکھ لیا

آج اُن کی نظر میں کچھ ہم نے
سب کی نظریں بچا کے دیکھ لیا

فیض تکمیلِ غم بھی ہو نہ سکی
عشق کو آزما کے دیکھ لیا

فیض

روسی طالب علم کی زندگی

کچھ زیادہ عرصہ نہیں گذرا کہ ہمیں بتایا جاتا تھا کہ روس میں بالشویک بستے ہیں اور بالشویک کا تصور ہمارے دماغ میں کیا تھا؟ داڑھی مونچھوں اور سر کے خوفناک حد تک بکھرے ہوئے بال، بھیڑیے کی طرح تیز دانت، آنکھوں میں خونریزی کی چمک، سینے میں دل کی بجائے پتھر، دماغ میں وحشت و بربریت، ہاتھوں میں بندوق اور بم۔ اور پھر یہ موت کا فرشتہ نہیں بلکہ شیطان جس طرف قدم اٹھاتا تھا، موت تباہی اور بربادی کا ایک تاریک اور بھیانک بگولا اس کے آگے آگے چلتا تھا، اتنے ہی فاصلے پر جتنے فاصلے تک اس کی گولی مار کر سکتی تھی —— نہیں بلکہ اس سے بھی آگے، جہاں تک اس کی حد نگاہ تھی۔ اور پھر اور آگے —— جہاں تک اس کا تخیل کام کر سکتا تھا۔

لیکن آج —— آج ہمیں شاید بتایا تو نہیں جاتا لیکن ہمیں یوں دکھائی دیتا ہے جیسے ظلم و ستم کا غبار دھویا جا چکا ہے۔ برقِ خاطف ظلم کے خرمنوں کو جلا چکی ہے۔ وہ خوفناک گھٹائیں ابرِ رحمت بن کر برس چکی ہیں اور اب دھلی ہوئی فضا میں سے اسی بالشویک کا چہرہ آفتاب کی طرح چمک رہا ہے اور اس کی زندگی بخش شعاعیں ملک کے طول و عرض میں انسانی آبادی کے ٹھٹھرے ہوئے اعضاء کو گرما رہی ہیں۔

آج اسے بالشویک کے نام سے بہت کم لوگ یاد کرتے ہیں کیونکہ اس نام کے ساتھ کچھ بھیانک سی روایات وابستہ ہیں۔ آج اسے سوشلسٹ کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ انسان سے انسانیت کے سلوک کا روادار ہے، اور اسی بات کی تعلیم دوسروں کو دیتا ہے۔ اب اس کا لائحہ عمل بدل چکا ہے کیونکہ وہ پہلے کام کو تکمیل تک پہنچا چکا ہے۔ اب اس کا پروگرام صحیح دل و دماغ کے انسان پیدا کرنا ہے۔ ایسے انسان جن کے سینوں میں پتھر کی بجائے گوشت کے دل ہوں اور ان دلوں میں انسانی درد ہو، حوصلہ ہو، عزم ہو۔ ایسے انسان جن کی رگوں میں پانی کی بجائے سرخ سرخ خون دورہ کر رہا ہو جسے بوقت ضرورت گرمایا بھی جا سکے۔ ایسے انسان جن کے سروں میں دماغ ہو اور اس دماغ میں علم کے دریا موجزن ہوں۔ اور پھر ایسے انسان جو پوست و استخواں کے بجائے فولاد جیسے اعصاب سے بنے ہوئے ہوں۔ جنہیں اپنی ہستی پر یعنی اپنے انسان ہونے پر ناز ہو اور جو دنیا کے ہر فرد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھ سکیں۔ یہ ہے آج کل کا بالشویک، یا سوشلسٹ یا . . . . صرف روسی۔

لینن کہتا ہے "ہر باورچن میں سلطنت کے کاروبار کو سنبھالنے کی اہلیت ہونی چاہیئے" اس قول کو عملی جامہ پہنانے کے لئے روس میں کیا کچھ ہو رہا ہے؟ اس کا کچھ مدھم سا خاکہ مندرجہ ذیل سطور کے ذریعے سے پیش کیا جا رہا ہے، جس کا اہتمام ہر روسی بچے کی پیدائش سے پہلے ہی شروع ہو جاتا ہے۔

ہر حاملہ عورت اپنے حلقے کے زچہ خانے میں اپنا نام درج رجسٹر کرا لیتی ہے۔ زچہ خانے کے کارکن مستقل طور پر اس کی نگہداشت کرتے رہتے ہیں اور بوقت ضرورت ضروری ہدایات بھی دیتے رہتے ہیں۔ اگر عورت کا خاوند اوباش ہو یا کسی اور وجہ سے اس کے اخراجات کا کفیل نہ بننا چاہے تو عورت کے لئے صرف حکومت کو اطلاع کر دینا کافی ہے۔ اس کے اخراجات خاوند کی آمدنی میں سے جبراً وضع کر کے عورت کے گھر ہر ماہ باقاعدگی سے پہنچانا حکومت کا فرض ہے۔ کسی حاملہ عورت کو ملازمت سے برطرف کرنا یا ملازمت دینے سے انکار کرنا قانوناً جرم ہے جس کی سزا ایک ہزار روبل جرمانہ اور چھ ماہ قید بامشقت ہے۔

بہ سزا دو سال تک بڑھائی جاسکتی ہے۔ اِسی قانون کا اثر ہے کہ ایک کارخانہ دار اپنے کارخانے کے اخبار میں فخریہ اعلان کرتا ہے۔

"ہمارے کارخانے میں ۱۴۰۰۰ ملازم ہیں۔ ان میں ۶۰ فی صدی عورتیں ہیں جن میں سے ۱۶۰۰ حاملہ ہیں۔ ہم ان بچوں کا شاندار خیر مقدم کرنے کے لئے نئی عمارتیں تعمیر کر رہے ہیں۔ یہ ۱۶۰۰ عورتیں ہمارے لئے باعثِ فخر ہیں"

ہر حاملہ عورت کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وضع حمل سے آٹھ ہفتے پہلے اور آٹھ ہفتے بعد رخصت بانتخواہ لے سکے۔ اور انہیں آسانیوں کا نتیجہ ہے کہ روس کی آبادی پہلے سے بہت زیادہ سرعت کے ساتھ بڑھ رہی ہے۔

ایک پچیس سالہ حاملہ عورت جو ایک کارخانے میں کام کرتی ہے اور اپنے پہلوٹی کے بچے کی منتظر ہے اپنے خاوند کو یوں خط لکھتی ہے:

"پیارے شاید تمہیں واسیانے بتادیا ہوگا کہ میں کہاں ہوں بچہ مزے سے ترقی کر رہا ہے لیکن میں گرمی کی شدت سے کچھ مضمحل سی ہوگئی تھی۔ چنانچہ کارخانے کی کمیٹی نے مجھے وضع حمل تک کے لئے یہاں بھیج دیا ہے۔ مکان نہایت آرام دہ ہے اور سرسبز جنگل سے گھرا ہوا ہے۔ جہاں ہم برف پر سے پھسلا کرتے تھے وہاں سے کوئی ایک گھنٹے کی مسافت ہے۔ بہرحال جب بھی تم چاہو واسیا تمہیں یہاں لے آئے گا کیونکہ وہ اکثر ماسکو ہی میں رہتا ہے۔ یہاں کُل چار مکان ہیں جن میں سے ایک کلبتہً "ہم ماؤں" کو دے دیا گیا ہے۔ اور باقی تین عام رسٹ ہاؤس ہیں۔ ہم پچاس کے قریب ہیں جن میں ہر قومیت کی مائیں شامل ہیں۔ میری ہمسائی ایک ترکمان ہے۔ اسے روسی زبان اچھی طرح نہیں آتی لیکن ہم اشاروں سے یا منہ بنا بنا کر ایک دوسری کو سمجھا لیتی ہیں اور ایک دوسری کی زبان سیکھتی رہتی ہیں۔ خوب مزے سے گذر رہی ہے۔ اس کے بھی پہلوٹی کا بچہ ہونے والا ہے۔ ہم بڑی پُرامن زندگی گذار رہی ہیں۔ دن میں چار مرتبہ کھاتی ہیں، جنگل میں سیر کرتی ہیں اور سرکاری افسروں سے ملتی ہیں۔ ہماری خوراک انگریزی (یا شاید امریکن؟) وٹامن کے خبط سے پُر ہوتی ہے۔ ناشتہ کے لئے تازہ پھل، اوملٹ اور دوسری چیزیں۔ دوپہر کے وقت پھر تازہ پھل اور اگر ہم تنگ آکر بھوک ہڑتال کر دیں تو یہی پھل سلاد کی صورت میں پوشیدہ اور شام کے کھانے میں سبز ترکاریاں اور ویسا ہی سلاد۔ ان ترکاریوں اور سلاد کے علاوہ جو کچھ ہوتا ہے وہ دودھ اور مچھلی پر مشتمل ہوتا ہے۔ لذیذ سلادوں کے ڈھیروں کے ڈھیر، ضرورت سے بھی زیادہ۔ لیکن ایسے کہ اگر تم اُن کو دیکھ لو تو منہ میں پانی بھر آئے۔ میں گوشت پر جان دیتی ہوں لیکن اس معاملے میں میری پوری طرح شنوائی نہیں ہوتی۔

"اگر تم دوپہر کے کھانے کے بعد آؤ، اور شاید تم اسی وقت آؤ گے، تو اپنی عادت کے مطابق بھونچال کی طرح نہ آنا کیونکہ یہ وقت ماؤں کے آرام کا وقت ہوتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے اس "حملے" کی وجہ سے اُن کے آرام میں خلل پڑے اور تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے۔ چار بجے ہم اکٹھے چائے پئیں گے اور پھر میں تمہیں سیر کرانے چلوں گی۔ ایک نرس یہاں ہر وقت منڈلاتی رہتی ہے لیکن اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ بے چاری بڑی نیک دل اور شریف ہے۔ اور کہتی ہے کہ تمہارے دماغ میں انجنیئری اتنی بھری ہوئی ہے کہ شاید انسانی بچے کے بجائے تم ایک مشین جنوگی۔

"بہرحال تم شام تک ٹھیرنے کے لئے تیار ہو کے آنا۔ میں نے تمہیں صدیوں سے نہیں دیکھا۔ اور اب ساری کسر نکا لنا چاہتی ہوں۔ اس لئے تیرنے، ناچنے، گانا سننے یا باغ میں بیٹھ کر ملائی کی برف اُڑانے کا کوئی بہانا نہ سنوں گی۔ سنا ہے کہ واسیا، میشا اور تم نے مل کر بیلوں تک آئس کریم کا صفایا کر دیا ہے۔ کل وہ آیا تھا، کپڑوں میں پھولا نہیں سماتا تھا۔ کہتا تھا میں نے رمبا (ایک قسم کا ناچ) سیکھ لیا ہے اور پھر بڑے مدبرانہ لہجے میں کہنے لگا "میں بچوں کو چھٹی کے دن باہر لے جاؤں۔ اور انہیں اپنے رمبا کے کمالات دکھاؤں؟" ..... میشا نے اس کی خوب خبر لی۔ کہنے لگا "اگر تم میرے بہنوئی نہ ہوتے اور اگر مجھے اپنی بہن سے اتنی محبت نہ ہوتی، اور اگر تم سوویٹ یونین کے اٹھارہ کروڑ اور ایک باشندوں میں سے ایک کے باپ بننے والے نہ ہوتے اور اگر اتنی "مائیں" تمہیں بحیثیت ایک آبا کے بچانے کے لئے یہاں موجود نہ ہوتیں تو میں تمہیں چیڑ کی خار دار اور نکیلی سوئیوں میں دفن کر دیتا۔

"اور ہاں درزن قسم کھانے کے لئے تیار ہے کہ وہ تمام کپڑے میں نے ہی سئے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ وہ مجھے کاٹنے میں مدد دیتی رہی اور کاٹ کاٹ کے دکھاتی بھی رہی۔ مجھے معلوم تھا کہ تم یقین نہیں کرو گے، واسیا کو بھی یقین نہیں آتا اور اس کے باوجود وہ یہی کپڑے ہر ایک

کو فخریہ طور پر دکھاتا پھرتا ہے۔ کہتا ہے "باوجود تمہاری عقل و دانش کے میں کس طرح یقین کر لوں کہ تم نے ایسا اچھا کوٹ تیار کر لیا ہے۔ حالانکہ اس سے پہلے تمہیں ایک بٹن تک لگانے کا وقوف نہ تھا۔"
اور سنو! اب میں نے اس کوٹ میں سوزن کاری بھی کر دی ہے۔ جب تم نے دیکھا تھا تو وہ بالکل سادہ تھا۔ اس بات پر یہاں کافی بحث چھڑی ہوئی ہے کہ یہ پھول چمبیلی کے ہیں یا مونیا کے یا چمپا کے۔ یہاں ایک نباتات کی طالبہ علم بھی ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ مجورن کے پیوندی پھلوں کی طرح یہ بھی دوغلے پھولوں کی کوئی قسم ہوگی۔ بہر حال یہ ہیں تو پھول ہی
میں اس کے ساتھ کے ننھے ننھے موزے بھی بنا رہی ہوں۔ تم لباس کے بڑے ماہر ہو اس لئے کوئی ٹوپی کا نمونہ تجویز کرتے آنا۔

"کل یہاں پہنچنے کی ضرور کوشش کرنا۔ کلب میں گانے کا ایک جلسہ بھی منعقد ہونے والا ہے۔ ماؤں کو اگلی صف میں جگہ ملتی ہے۔ ہم تمہیں بھی انہی میں بٹھائیں گے (خواہ تم کتنے ہی مرد نظر آؤ) اور باقی لڑکے پیچھے بیٹھیں گے۔

"بچیاں، بچے، بھائی، بہنیں، کارخانے کے لوگ غرضکہ دنیا کا ہر باشندہ یہاں آن پہنچتا ہے۔ واسیا قریباً ہر روز آن دھمکتا ہے۔ اور ہونے والے بچے کے متعلق کچھ نہ کچھ کہتا رہتا ہے۔ اس نے کبھی میرا اتنا خیال نہیں کیا لیکن بات یہ ہے کہ میں اب اکیلی نہیں ہوں بلکہ اب میری ذات میں ایک اور ذات بھی ہے جو اس کے لئے کشش اور دلچسپی کا باعث بنی ہوئی ہے۔

" اور سنو پیارے میں نے واسیا کو سخت ہدایات دے دی ہیں کہ وہ تمہیں میرے لئے کوئی چیز نہ لانے دے۔ لیکن میشا کہتا ہے کہ تم باز آنے والے نہیں۔ اس لئے تمہیں بتا دوں کہ مجھے کس چیز کی ضرورت ہے۔ مجھے نئے کوٹ کے لئے چار بٹنوں کی ضرورت ہے لیکن اس دفعہ نیلے رنگ کے لانا۔

اس خط میں تمہیں بوسوں کا تحفہ بھیج رہی ہوں۔ کل ضرور آجانا۔

تمہاری

لیوبا

یہ خط بادی النظر میں تو آپ کو صرف ایک شوخ اور محبت کرنے والی بیوی کا خط، اپنے محبوب شوہر کے نام نظر آئے گا لیکن ذرا اس خط کے بین السطور پر بھی غور کیجئے۔ کیا اس میں آپ کو مسرت کا ایک چھلکتا ہوا چشمہ نظر نہیں آتا۔ کیا اس میں آپ کو طمانیت کی شفاف اور پرسکون ندی کی میٹھی میٹھی نغمہ خوانی سنائی نہیں دیتی اور پھر زندگی کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر جس کی توقع صرف ایک آزاد قوم کے ایک آزاد فرد ہی سے ممکن ہے۔

کارخانوں یا کاروباری اداروں کے ساتھ بچہ خانے ملحق ہیں۔ جن کا انتظام اس کارخانے کے کارکنوں کی ایک کمیٹی پر مشتمل ہوتا ہے۔ ایسے ہی ایک ادارے کی مہتممہ اپنے دیواری اخبار میں لکھتی ہے:

"ہمارے زیر نگرانی دنیا کی گرانمایہ ترین چیزیں ہیں ــــــ نوع انسانی کے لطیف ترین اور نازک ترین افراد۔ بچہ خانوں میں بچوں کو کافی حرارت، روشنی، آرام، ہمدردانہ توجہ اور محبت کی ضرورت ہے ان میں سے ہر چیز ہمیں مہیا کرنی چاہئے۔ صرف اسی صورت میں ہم تندرست اور تنومند بچے پرورش کر سکتی ہیں اور ان کی ماؤں کو اُن کی ذمہ داری سے سبکدوش کر سکتی ہیں اور صرف اسی صورت میں اُن کی مائیں اپنے بچوں کی طرف سے مطمئن ہو کر اپنے فرایض کو خوش اسلوبی سے سرانجام دے سکتی ہیں۔"

مائیں اپنے بچوں کو ہر صبح اپنے ساتھ لے آتی ہیں اور انہیں بچہ خانوں میں چھوڑ کر اپنے کام میں لگ جاتی ہیں۔ شام کے وقت انہیں پھر اپنے ساتھ گھر لے جاتی ہیں۔ بعض عورتیں پانچ روز کے لئے بچوں کو یہاں داخل کر دیتی ہیں اور چھٹے روز یعنی رخصت کے دن انہیں گھر لے جاتی ہیں۔ اس نگہداشت کا معاوضہ برائے نام ہوتا ہے۔ لیکن اگر ماں اس خرچ کی بھی متحمل نہ ہو سکے تو اس کے اخراجات کمیٹی ادا کر دیتی ہے۔

جو مائیں بچوں کو دودھ پلانے کے لئے ہر تین گھنٹے کے بعد یہاں آتی ہیں۔ اُن کا یہ وقت تفریح کے اوقات کے علاوہ ہوتا ہے۔ گویا یہ کام بھی ان کے معاوضے کے کام میں شمار ہوتا ہے۔ اگر ماں بچوں کے کمرے سے کچھ فاصلے پر کام کر رہی ہو تو اسے آنے کی تکلیف نہیں دی جاتی بلکہ بچے کو اس کے پاس لے جاتے ہیں۔ بچوں کو سرد ترین موسم میں بھی کھلی ہوا میں سلایا جاتا ہے۔ اس صورت میں ان کا اوڑھنا بچھونا گرم کھالوں پر مشتمل ہوتا ہے۔

بچوں کے ایک طبی ادارے کا ڈاکٹر کہتا ہے:-

"میں یہاں قریباً بارہ سال سے کام کر رہا ہوں۔ اس لئے میں اس ضلع کے اکثر بچوں کو جانتا ہوں۔ ہمیں ایک خاص ضلع میں متعین کر دیا جاتا ہے

اور ہم ہر بچے کو اس کی ماں کے زچہ خانہ چھوڑنے کے وقت سے دیکھنا شروع کر دیتے ہیں یہاں تک کہ بچہ تین سال کا ہو جاتا ہے۔ یہ اس صورت میں کہ بچہ کسی بچہ خانے کے زیرِ نگرانی نہ ہو۔ کیونکہ وہاں دوسرا ڈاکٹر متعین ہوتا ہے۔ ہاں، ہم ہر بچے کی صحت کے ضامن ہوتے ہیں۔ شروع شروع میں ہمارا سابقہ ان کے والدین ہی سے پڑتا ہے۔ پہلے معائنے کے بعد ہم ایک نرس کو بچے کا گھر دیکھنے کے لئے بھیج دیتے ہیں۔ وہ بچے کی ماں کو نہلانے دھلانے، لباس پہنانے اور خوراک دینے کے متعلق ضروری ہدایات دیتی ہے۔ نرس ضرورت کے مطابق ماں کو ان معاملات میں عملی مدد بھی دیتی ہے۔

ہم بچے کے وزن کا حساب رکھتے ہیں، اس کی خوراک کے متعلق حسبِ حال ضروری ہدایات دیتے ہیں، اسے ٹیکہ لگاتے ہیں اور اگر وہ کبھی بیمار ہو جائے تو میں خود اس کے گھر جاتا ہوں۔

ہمارے ادارے سے ملحق دُو درسوئیاں ہیں جہاں بچوں کی تیار شدہ خوراک فروخت ہوتی ہے۔ دس روبل ماہوار زیادہ ادا کرنے پر یہ خوراک بچوں کے گھر روزانہ بھیجنے کا انتظام کر دیا جاتا ہے۔

کمزور اور بیمار بچوں کو صحت افزا مقامات پر بھیج دیا جاتا ہے۔ جہاں ماہرین کی نگرانی میں انہیں رکھا جاتا ہے اور انہیں خاص قسم کی طاقتور غذائیں مہیا کی جاتی ہیں۔"

کنڈر گارٹن کا ایک مہتمم کہتا ہے کہ ہم بچوں کو زیادہ سے زیادہ پارٹیاں دیتے ہیں جن میں مٹھائیاں اور کھلونے افراط کے ساتھ تقسیم کئے جاتے ہیں۔ انہیں خوش کرنے کے لئے مختلف قسم کے کھیل دکھائے جاتے ہیں۔ انقلاب کے زمانے میں بچوں کو کھیلنا اور ہنسنا تک بھول گیا تھا۔ اسی لئے ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے بچے دنیا کی مسرتوں سے زیادہ سے زیادہ مستفید ہوں۔

اس کا مقابلہ زمانہ قبل از انقلاب سے کیجیئے۔ ماسکو سوویٹ کا ایک ممبر کاریاف جریدہ "ایوننگ ماسکو" میں لکھتا ہے:۔

"میرا بیٹا وانیا اب ساتویں جماعت میں پڑھتا ہے۔ اگلے روز اس نے مجھ سے نہایت رازدارانہ طریق پر کہا کہ میں ہوا باز بننا چاہتا ہوں۔ مجھے اپنا سکول کا زمانہ یاد آ گیا۔ ہم الگزنڈروکا کے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ تمام گاؤں میں سے صرف پانچ لڑکے سکول جاتے تھے۔ ہم ساتھ کے ضلع میں ایک گرجے کے سکول میں پڑھتے تھے۔ یہ جگہ ہمارے گاؤں سے ۱۴ ورسٹ کے فاصلے پر تھی۔ اکثر بارش میں بھیگتے ہوئے اور کیچڑ سے لتھڑے، سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے ہم پانچوں "تعلیم" حاصل کرنے جاتے تھے۔ جب میں نے تیسری جماعت پاس کی تو تمام گاؤں نے اس تقریب پر چھٹی منائی اور کیوں نہ مناتے؛ "ہمارے گاؤں کے باشندے اب تعلیم یافتہ ہو چلے تھے"۔ میری عمر اس وقت مشکل سے گیارہ سال کی تھی۔

لیکن میں زیادہ دیر تک گاؤں میں نہ ٹھہر سکا۔ ایک روز میرا باپ شہر سے آیا اور کہنے لگا "دیکھو آیئون، اب تم پڑھ سکتے ہو اور تعلیم یافتہ ہو گئے ہو اب کمانے کا وقت ہے"۔ چنانچہ اس سے ایک یا دو دن بعد گھر والوں نے ایک تھیلے میں کچھ روٹی کے ٹکڑے ڈالے اور مجھے اپنی روزی کمانے کے لئے ماسکو بھیج دیا گیا۔

یہ تھا ہمارا بچپن۔ لیکن ہمارے بچے انقلاب اکتوبر کے طالع نیک کے تحت پیدا ہوئے ہیں۔ انہیں ہمارے بچپن کی مصائب کا سامنا نہیں کرنا۔ وہ گھناؤنا زمانہ اب ہمیشہ کے لئے گذر چکا ہے۔ ہمارے بچے انجنیئر، مصنف، ہوا باز، اور ڈاکٹر بننے کے خواب دیکھ رہے ہیں اور ان کی امیدیں یقیناً بارور ہوں گی"۔

میکسم گورکی نے ایک خط میں اگارکا کے دو ہزار بچوں کی طرف لکھا:۔

"پیارے بچو! یہ تمام وسیع و عریض ملک تمہارا ہے۔ لیکن اس پر پوری طرح قبضہ کرنے کے لئے اور اسے مزید ترقی دینے کے لئے یہ ضروری ہے کہ تم علم سے اچھی طرح بہرہ ور ہو جاؤ اور اپنے سکولوں میں نہایت متانت اور ایمانداری کے ساتھ محنت کرو۔ ہمارے ملک کے تمام کام سب کے لئے ہیں اور سب کے کام ہر ایک کے لئے اور ہر ایک کا کام سب کے لئے۔ اس کے علاوہ ہمارے کام تمام دنیا کے مزدوروں کے لئے ایک قابلِ اتباع مثال ہونے چاہئیں۔ تمہیں اپنے دلوں میں علم کے لئے محبت پیدا کرنی چاہیئے تاکہ تمہاری پڑھائی تمہارے لئے ایک دلچسپ کھیل ہو جائے۔ ورزش سے تمہارا دماغ بھی اتنا ہی مستفید ہوتا ہے جتنا کہ تمہارے اعصاب۔ مشینیں ہماری جسمانی اور دماغی محنت کو کم کر رہی ہیں لیکن اچھی مشینیں بنانے کے لئے تمہیں بے حد محنت کرنی چاہیئے تاکہ تمہارے دماغ ترقی پائیں۔ اور اُن مشینوں کے ایجاد کرنے میں ممد و معاون ہوں۔

کوئی علم بے فایدہ نہیں ہوتا اور نہ رائیگاں جاتا ہے"۔

یہ ہے اُن بچوں کی حقیقی تعلیم جو آگے چل کر ملک کے لئے سرمایہ فخر ومباہات ثابت ہونے والے ہیں۔ ان کے ننھے ننھے دلوں میں اپنے راہبروں کے لئے ارادت وعقیدت موجود ہے۔ وہ ان کے تمام اعمال کو اپنے لئے ایک قابل تقلید نمونہ اور صحیح جادۂ عمل سمجھتے ہیں۔ ایک سولہ سال کا بچہ اپنی ڈائری میں لکھتا ہے۔

"مجھے پُشکن کی خوبیوں کا ابھی حال ہی میں احساس ہوا ہے۔ اس سے پہلے میں اسے کچھ اہمیت نہ دیتا تھا۔

ایک دفعہ میں ایک تصویر بنا رہا تھا لیکن کئی روز کی متواتر کوششوں کے باوجود میں اسے مکمل نہ کر سکا۔ گو میں اس میں کوئی خامی یا غلطی نہ نکال سکتا تھا۔ لیکن میں اسے صحیح بھی نہیں سمجھ سکتا تھا ـــــ آخر میں اپنی اس ناکامی سے جھنجلا اٹھا اور کسی خاص ارادے کے بغیر میں نے ایک قریب ترین کتاب اٹھائی اور اسے لے کر جنگل کی طرف نکل گیا۔ اتفاق کی بات کہ یہ پُشکن کے اشعار کا مجموعہ تھا۔ میں نے اسے پڑھا تو اپنی عمر میں پہلی مرتبہ مجھے پُشکن کے اشعار کی قوت، پاکیزگی اور رلطافت کا صحیح احساس ہُوا۔

پھر میں نے پُشکن کے اشعار کا اپنی ناکام تصویر کے ساتھ مقابلہ کرنا شروع کیا اور اب مجھے احساس ہوا کہ میں نے تصویر میں بہت سا وقت ایسی تفصیلات کے بنانے میں ضائع کر دیا ہے جن کا اظہار میں اجمالاً نہ کر سکا تھا۔ پھر مجھے یاد آیا کہ ایک دفعہ میں نے پُشکن کا ایک مسودہ دیکھا تھا جس میں ایک ایک لفظ کو کئی کئی مرتبہ کاٹ کاٹ کر لکھا گیا تھا۔ سطروں کی سطریں اور مصرعوں کے مصرعے کاٹے ہوئے تھے۔ ہر ہر لفظ پر ناقدانہ دماغ سوزی ہوئی ہوگی اور پھر کہیں جا کر اس نے اپنے الفاظ کو اُن سانچوں میں ڈھالا ہو گا اور اُن نقوش سے مزین و مسجع کیا ہو گا جن سے اس کے افسانوں کے ہیرو عالم وجود میں آئے۔ پھر میں نے سوچا" اس آسانی سے شکست ماننا ٹھیک نہیں اصل میں مجھے بھی ویسے ہی دقیق مطالعے اور محنت کی ضرورت ہے جیسی کہ پُشکن کو تھی"۔

آزاد قوم کے افراد کی مصروفیت اور جذبات کا اندازہ کو لیا کے مندرجہ ذیل الفاظ سے لگائیے۔ یہ بچہ "اکتوبری" ہے (یعنی انقلاب اکتوبر کے بعد کی پیدائش) اس کی عمر محض آٹھ سال ہے۔ ممکن ہے اس بچے کے تقسیم اوقات سے ہماری قوم کے تن آسان اور فراغت پسند طبائع میں کچھ بیداری کے آثار نمودار ہوں۔

"میں صبح سات بجے اٹھتا ہوں چائے کے ساتھ مکھن اور روٹی کھا کر مدرسے چلا جاتا ہوں جہاں جماعت اول (ب) میں پڑھتا ہوں۔ چھٹی ہونے پر گھر آ کر کھانا کھاتا ہوں اور اپنا سبق یاد کرتا ہوں۔ صحن میں کچھ دیر کھیلتا ہوں۔ پھر کنڑروبیٹا ز میں جاتا ہوں۔ چائے پیتا ہوں اور سارنگی بجانا سیکھتا ہوں۔ پھر باہر جا کر برف کے گیند بنا کر ہم تمام بچے کھیلتے ہیں۔ بعض اوقات میں اکارڈین بھی بجاتا ہوں۔ ایک دفعہ ریڈیو کے لئے بھی بجایا تھا۔ یہ اکارڈین میرے باپ نے اپنے کارخانے سے میرے لئے خریدا تھا۔

ہم سپینی جنگ کا کھیل بھی کھیلتے ہیں۔ ریڈیو پر جب جنگ کی خبریں سنائی جاتی ہیں تو مجھے فیشسٹوں کی شکست کی خبریں سن کر بڑی خوشی ہوتی ہے۔ میں ان لوگوں کا مخالف ہوں۔ اگر میں سپینی ہوتا تو اینٹوں کی خندقیں بنا کر لڑتا اور سردیوں میں تو برف سے بھی یہی کام لیا جا سکتا ہے۔ میں چھوٹے چھوٹے سپینی بچوں کو محبت کا پیغام بھیجنا چاہتا ہوں"۔

حال ہی کا ذکر ہے کہ ایک ننھا پانچ سال کا لڑکا ایک مقامی اخبار کے دفتر میں درانہ گھس آیا۔ وہ اکیلا تھا اور اس کے ہاتھ میں دس روبل تھے، اس کی ساری جمع شدہ پونجی۔ یہ رقم اس نے اسپین کے بے خانماں بچوں کے لئے بطور چندہ جمع کرا دی اور پھر اپنی توتلی زبان میں بولا" مہربانی فرما کر انہیں لکھ دیجئے کہ اس میں سے پانچ روبل کے کھلونے خرید لیں"۔

ایک سات سالہ بچی جس کا نام "نا نیا" ہے ایک کتاب کی مصنفہ کو لکھتی ہے:

"چچی جان۔ مہربانی فرما کر اماں کو لکھ بھیجئے کہ وہ کتاب کی رونے والی لڑکی "گانیا" کے بجائے میرا نام نہ پڑھا کریں۔ آپ نے یہ کتاب میرے متعلق تو نہیں لکھی ناں؟ از راہ کرم انہیں ہدایت کر دیجئے کہ جو کچھ کتاب میں لکھا ہو وہی پڑھا کریں"۔

تقریبًا چالیس سال کا عرصہ ہوتا ہے کہ میکسم گورکی نے صوبے کے ایک اخبار میں ایک دردمندانہ اپیل شائع کی تھی جس کے الفاظ کچھ اس طرح تھے" اگر کسی کے پاس پرانے سکیٹس ہوں رہیئے دار کھڑاؤں جسے پہن کر برف پر سے پھسلتے ہیں۔ ورزش اور ہوا خوری کا ایک کھیل)

تو وہ ازراہِ کرم اُن ناداروں کے لئے بھیج دیں جو شہر کے تنگ و تاریک کونوں میں رہتے ہیں، تاکہ انہیں سرما کی کھلی اور تازہ ہوا میں پھرنے کا موقع مل سکے۔ اگر کوئی اصحاب مقدرت نقد روپے سے مدد کرنا چاہیں تو وہ شکریے کے مستحق ہوں گے"۔

معلوم نہیں میکسم گورکی کی اس درخواست پر کتنے "اصحاب مقدرت" نے توجہ کی لیکن آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ اسی قوم کے بچوں کی تفریح طبع کے لئے حکومت کے خزانوں کے دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ نہ صرف بچوں کی تفریح گاہوں پر بے دریغ روپیہ صرف کیا جا رہا ہے بلکہ ان کی تفریح اور رہنے اس کے ساتھ ہی علمی تجسس کی پیاس بجھانے کے سامان بھی فراوانی سے موجود ہیں۔

ایسی سینکڑوں تفریح گاہوں میں سے جو ملک کے طول عرض میں جاری کی گئی ہیں ایک وہ ہے جس کا افتتاح حال ہی میں اُنچکاف محل میں کیا گیا ہے۔ پانچ سو سے کچھ اوپر سائنس دان، انجنیئر اور اُستاد اس کے علمی اور صنعتی حصے کی ترتیب و تنظیم میں مشغول رہے ہیں۔ جب آپ اُن آلات اور تجربہ گاہوں ورکشاپوں اور سٹوڈیو کے سامان کی طرف دیکھتے ہیں جو یہاں جمع ہو رہا ہے تو آپ کو ان بچوں پر رشک آنے لگتا ہے اور حسرت بھرے دل کے ساتھ آپ سوچتے ہیں کہ کاش ہماری عمر بھی پھر چودہ یا پندرہ برس ہی کی ہوتی۔ ذرا سوچئے —— ہم آپ کے سامنے دروازہ کھول دیتے ہیں —— ورکشاپ میں ریلوے اور جہاز سازی کا سامان موجود ہے ٹیلیگرافی، آواز محفوظ کرنے اور ٹیلیویژن کے آلات پڑے ہیں۔

آپ پیچیدہ سے پیچیدہ آلات استعمال کر سکتے ہیں کھیل ہی کھیل میں کیمیا کی تعلیم حاصل کر سکتے ہیں بجلی سے منور نقشوں پر سیاحی کے راستے ڈھونڈ سکتے ہیں، خود انہیں استعمال کر سکتے ہیں، موٹریں اور ہوائی جہاز بنا سکتے ہیں، ایک اصلی موٹر کار کو پرزہ پرزہ کر کے کھول سکتے ہیں۔ ایک چھوٹا سا جنگی ٹینک بھی موجود ہے۔ جو اصلی ٹینک کی طرح چل سکتا ہے۔ یہ تمام چیزیں لینن گراڈ کے کارخانے سے آئی ہیں اور ان چیزوں کے علاوہ ہیں جو خود یہاں تیار ہو رہی ہیں۔

ان کے علاوہ ایکس رے کا آلہ۔ فوٹو گرافی اور فلم فوٹوگرافی کے تمام اقسام کے کیمرے اور تمام اقسام کا متعلقہ سامان بھی موجود ہے۔

اور سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس تمام سامان کی تیاری میں لینن گراڈ کے کارخانے کے ماہروں اور انجنیئروں نے کارخانے کے مزدوروں کے بچوں سے اس بارے میں مشورے لئے اور اُن کی آراء کو نہایت وقیع سمجھا۔

کہیں یہ نہ سمجھئے کہ یہ تمام انتظام حکومت کی ذرہ نوازی اور رعایا پروری کا ایک نمونہ ہے اور شاید جس طرح ہمارے غریب بچے کسی درزی بڑھئی یا لوہار کے ہاں با دلِ ناخواستہ بھیج دیئے جاتے ہیں اسی طرح رُوسی بچوں کو بھی ان صنعتی اداروں میں زبردستی ٹھونس دیا جاتا ہے۔ حقیقت اس کے برعکس ہے اور وہ یوں کہ بچے خود ملک کے بڑے بڑے مدبروں، ماہروں اور باکمال انسانوں کے علاوہ خود حکومت سے اس بارے میں رجوع کرتے ہیں۔

بچے اپنی دلچسپی کی کتابیں خود مل کر تصنیف کرتے ہیں اور پھر دوسرے بچوں کے لئے اس کی اشاعت کراتے ہیں۔ اپنے ڈرامے اور کھیلیں خود وضع کرتے ہیں۔ مشہور مصنفوں کی کتابوں پر تنقید کرتے ہیں اور انہیں بتاتے ہیں کہ ہمیں کس قسم کی کتابیں چاہئیں۔ اپنی تفریح کے سامان خود پیدا کرتے ہیں۔

سنئے ایک چودہ سال کا بچہ کہتا ہے:۔

"ہم کارٹون اور فلم خود بناتے ہیں۔ یہ کام کافی پیچیدہ ہے اور اس کی باقاعدہ تعلیم لینی پڑتی ہے۔ سب سے پہلے ہم فلم کی تمام تاریخ پڑھتے ہیں۔ میجک لالٹین سے لے کر جدید ترین مشین تک۔ ہم اپنی فلمیں سکولوں اور کلبوں میں دکھاتے ہیں اور فلم چلانے والی مشین ہم نے خود جدید ترین ایجادات کے مطابق بنائی ہے۔ آپ اس مشین میں اور کارخانے کی بنی ہوئی مشین میں ساخت کے لحاظ سے کوئی امتیاز نہیں کر سکتے، سوائے اس کے کہ ہماری مشین کا روغن کارخانے کی مشین کے روغن سے اچھا ہے . . . ."

کوسٹیا ایک سات سالہ بچہ روس کے مشہور ہوا باز مولوکاف کو لکھتا ہے:۔

"چچا جان! اگر آپ اسے بہت زیادہ صعوبت نہ تصور کریں تو ہمیں لکھ بھیجئے کہ اڑنے والا ہوائی جہاز کس طرح بنتا ہے۔ ہم نے ایک ہوائی جہاز ربڑ سے چلنے والے پنکھے کا بنایا تھا۔ لیکن ربڑ ٹوٹ گیا اور جہاز گر پڑا۔"

مندرجہ ذیل خط سیوا ایک چودہ سالہ لڑکے کا ہے۔ جو اُن

سینکڑوں خطوط میں سے ایک ہے جو مشہور ہوا باز چکیلوف کو موصول ہوتے رہتے ہیں:-

"پیارے چچا چکیلوف

تم اسے دیکھتے ہی کہہ اٹھو گے" یہ کس کا خط ہے - میں تو اسے پہچانتا بھی نہیں" لیکن اس پر حیران نہ ہو جئے آپ نے میرے خط کو یا مجھے کبھی نہیں دیکھا - شاید مجھے یہ خط لکھنا مناسب نہ تھا لیکن میں آپ سے سچ کہتا ہوں کہ یہ میرے بس کی بات نہیں - اس خط کو لکھتے ہوئے میرے ہاتھ بھی کسی قدر کانپ رہے ہیں - بھلا کوئی شخص آپ جیسے اولوالعزم انسان سے کس طرح خطاب کر سکتا ہے ؟ بات یہ ہے کہ ہم بچے اپنے میدان میں آپ کے ہوائی جہاز کی پرواز کا کھیل کھیلتے ہیں اور ہر کوئی چکیلوف بنتا ہے، کوئی بیڈو کاف، اور کوئی بلیا کاف لیکن ہمارا کھیل ہمیشہ جھگڑے کی صورت اختیار کر لیتا ہے کیونکہ ہر بچہ چکیلوف بننا چاہتا ہے - مجھے آپ کی بیوی اور آبیگر پر بڑا رشک آتا ہے کیونکہ وہ اکثر آپ کے ساتھ ہی رہتے ہیں - میں آپ سے ایک عنایت کا طالب ہوں اور وہ یہ کہ کیا میں آپ سے مل سکتا ہوں اور مصافحہ کر سکتا ہوں صرف ایک منٹ کے لئے ؟ میں بائیسکل خریدنے کے لئے پیسے جمع کر رہا ہوں - اس وقت بنک میں میرے ۳۵ روبل جمع ہیں - لیکن اگر آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہو تو میں فوراً بنک سے نکلوا لوں گا - والسلام

" ہاں چچا اس خط کا جواب ضرور دینا اور اگر آپ بے حد مصروف ہوں - تو چچی سے لکھوا بھیجنا "

بچوں نے ایک ریلوے خود بنائی ہے - چودہ ماہ کے عرصے میں ۶۸۰۰۰ بچے اس پر سفر کر چکے ہیں - آج کل اس کی لائن کو اور وسیع کیا جا رہا ہے اور گاڑی کے مزید ڈبے زیر تعمیر ہیں -

دوسری گھنٹی بجتے ہی چیف کنڈکٹر سیٹی بجاتا ہے - پوری کار گن ایک سٹول پر کھڑے ہو کر جوابی سیٹی بجاتا ہے اور انجن آہستہ آہستہ اپنے چار ڈبوں کو لئے ہوئے پلیٹ فارم سے نکل پڑتا ہے - پوری کی عمر سات سال کی ہے اور وہ طفلس کی بچوں کی ریلوے کا سب سے نوعمر ڈرائیور ہے -

ریلوے ملازموں کے پانچ سو بچوں نے یہ ننھی ریلوے نو ماہ کے عرصے میں مع اسٹیشنوں اور پلیٹ فارموں کے تعمیر کر لی تھی - ان ننھے جوشیلے کاریگروں نے لائن کے سلیپر، لائن اور ڈبے بھی خود ہی تیار کئے اس ریلوے کا اسٹاف ۲۷۰ کارکنوں پر مشتمل ہے -

اب روسی طلباء کے خیالات اور جذبات انہیں کی زبانی سنیئے - ساشا آٹھ سال کا بچہ ایک خط میں لکھتا ہے

"پیاری چچی ڈورا -

میں ہوا باز، سپاہی اور ڈاکٹر بننا چاہتا ہوں - دن کے وقت سپاہی کے فرائض انجام دیا کروں گا - رات کے وقت اپنے مریضوں کو دیکھوں گا اور چھٹی کے دنوں میں ہوا باز کے فرائض انجام دوں گا -

براہ کرم مجھے فوراً لکھئے کہ کیا میں یہ تینوں پیشے بیک وقت اختیار کر سکتا ہوں ؟"

ایک پندرہ سالہ لڑکا اپنی ڈائری میں لکھتا ہے:-

" گذشتہ تمام رات میں اپنے مستقبل کے متعلق سوچتا رہا - اس کے نتیجے میں آج سارا دن سر درد رہا اور میں کچھ کھا بھی نہ سکا - آخر میں نے فیصلہ کر لیا کہ میں آرکٹک کو فتح کروں گا - اس کے علاوہ اگر ضرورت آن پڑی تو میں اپنے ملک کے لئے جنگ میں بھی حصہ لوں گا - لیکن میری زندگی کا حقیقی نصب العین آرکٹک ہو گا - اب بھی اگر میں آنکھیں بند کرتا ہوں تو برف کے عظیم الشان تودوں کو سمندر میں تیرتے ہوئے دیکھتا ہوں - لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ ابھی مجھے ایک طویل انتظار کرنا ہے اور ممکن ہے میرے جوان ہونے سے پہلے ہی کوئی منچلا یہ کام کر چکے - اگر میں ابھی بھاگ نکلوں تو مجھے پکڑ کر واپس لے آئیں گے کیونکہ ان معاملات میں ہمارے بزرگ بڑے سخت واقع ہوئے ہیں - بہرحال میں نے اپنے آپ کو سردی اور بھوک کی برداشت کا عادی بنانا شروع کر دیا ہے - کل جب گھر کے تمام آدمی باہر تھے سوائے بوڑھی فروزیا کے، اور وہ بھی بیچاری بہری ہے، میں صحن میں بغیر کوٹ اور ٹوپی کے نکل گیا اور دیر تک سردی میں ٹہلتا رہا - مجھے ہلکا سا زکام ہو گیا ہے لیکن اگر گھر کے لوگ مجھے یوں لپیٹ لپیٹ کر نہ رکھتے تو اتنی شکایت بھی پیدا نہ ہوتی . . . "

ماسکو میں اس وقت لاکھوں طالب علم مختلف یونیورسٹیوں اور صنعتی درسگاہوں میں تعلیم پا رہے ہیں - ان میں زیادہ تعداد ان طالب علموں کی ہے جنہیں حکومت کی طرف سے وظائف ملتے ہیں - ماسکو یونیورسٹی (اول) کے ۴۴۴۵ طالب علموں میں سے ۳۶۹۷ طالب علموں کو وظیفے ملتے ہیں - یونیورسٹی ۰۰۰۰۰۰ ۶۵ روبل سالانہ وظائف میں دیتی ہے -

سلطنت روس میں مجموعی طور پر ابتدائی اور ثانوی درجے کے طلباء کی تعداد دو کروڑ پچپن لاکھ کے قریب ہے - کتابوں کی ساڑھے کروڑ جلدیں سالانہ

طبع ہوتی ہیں اور اخباروں کی ۳ کروڑ ۷۰ لاکھ کاپیاں روزانہ شائع ہوتی ہیں۔

رَبفک وہ ادارہ ہے جہاں اٹھارہ سال کی عمر تک کا ہر باشندہ داخل ہوسکتا ہے۔ یہ ادارہ ان لوگوں کے لئے قایم کیا گیا تھا جو یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم میں داخل ہونے سے پہلے اپنی عام تعلیمی کمزوریوں کو پورا کرنا چاہتے تھے۔ لیکن اب چونکہ عام نوجوان باقاعدہ سکولوں میں تعلیم حاصل کر لیتے ہیں اور عمر لوگ جو تعلیمی کمی کو پورا کرنا چاہتے تھے۔ اب دن بدن کم ہو رہے ہیں اس لئے شاید اب ربفک کی ضرورت باقی نہ رہے۔

زمانہ ماقبل انقلاب کا ایک شخص "پرودا" کو لکھتا ہے:۔

"میں ۱۰ سال کی عمر میں ماسکو کی کرام فیکٹری میں بحیثیت ایک شاگرد کے داخل ہوا۔ مجھے چوبیس گھنٹوں میں سے بارہ گھنٹے تک متواتر کام کرنا پڑتا تھا۔ اس کے بعد اپنے آقا کے جوتے صاف کرنا اور اس کے کمرے سے کوڑا کرکٹ اٹھانا بھی میرے ہی فرائض میں داخل تھا۔ اسی طرح پانچ سال تک متواتر میں کام کرتا رہا۔ لیکن اس کے معاوضے میں مجھے ایک کوڑی بھی ادا نہ کی گئی۔

میں نے ۲۵ سال تک ایک کارخانے میں کام کیا ہے۔ یہی میری تعلیم ہے۔ مجھے آج کل کے بچوں پر کتنا رشک آتا ہے۔ وہ اپنے پیشوں کا انتخاب خود کرتے ہیں۔ اپنے لڑکپن میں ہم تعلیم حاصل کرنے کا خیال بھی نہ کر سکتے تھے۔

بارہ سال کی عمر تک مجھے الف ب بھی نہ آتی تھی۔ آج میرا نوجوان پوتا جس کی عمر سولہ سال ہے۔ ایک کارخانے کے ممتاز ترین طالب علموں میں سے ہے۔"

ہر کارخانے کا اپنا سکول ہے جہاں کارخانے کا کام بچوں کو سکھایا جاتا ہے۔ ان سکولوں میں ثانوی درجے کے فیل شدہ طلبا بھی داخل کر لئے جاتے ہیں۔ ان کی عمر کم از کم پندرہ سولہ سال کے درمیان ہوتی ہے لیکن ان بچوں کو جنہیں بھٹی پر کام کرنا ہو ۱۷ یا ۱۸ سال کی عمر سے پہلے نہیں لیا جاتا۔

۱۸ ماہ کے عرصے میں بچوں کو اوزار بنانا، چکیوں پر کام کرنا یا موٹروں کو جوڑنا اور مرمت کرنا بخوبی آجاتا ہے۔

اگر بچے اعلیٰ صنعتی تعلیم حاصل کرنا چاہیں تو انہیں اس ابتدائی تعلیم کے بعد کسی انجنیئری کے سکول میں چار سال تک علمی تعلیم حاصل کرنی ہوتی ہے۔

ایک طالب علم لکھتا ہے:۔

"میں گذشتہ خزاں کے موسم میں یہاں داخل ہوا تھا۔ میری عمر قریباً ۱۶ سال ہے۔ میرا باپ ایک فوجی ہسپتال میں کام کرتا ہے۔ ماں گھر پر رہتی ہے۔ میں کارخانے میں اس لئے داخل ہوا ہوں کہ صنعتی تربیت کے بعد آدمی اچھے پیسے کما سکتا ہے اور اس کے دوران میں تعلیم بھی جاری رکھ سکتا ہے۔ آج کل کاریگروں کے پہلے درجے میں کام کرتا ہوں۔ صبح کام شروع کرنے سے پہلے ہمیں ورزش کرائی جاتی ہے۔ اس کے بعد ہم چار گھنٹے تک مسلسل کام کرتے ہیں میں ٹرنر کا کام سیکھ رہا ہوں۔ شام کا کھانا کارخانے کے لنگر سے کھاتا ہوں اور یہیں سے باقی تمام کاریگر کھاتے ہیں۔ کام کے بعد میں اکثر لائبریری میں جا کر اخبار پڑھتا ہوں۔ یہاں سے کتابیں بھی عاریتاً مل جاتی ہیں لیکن میں کتابیں پڑھنے کا قائل نہیں ہوں۔ اس کے بجائے میں سینما کو زیادہ پسند کرتا ہوں۔ مجھے صرف وہ کتابیں پسند ہیں جو انقلاب رُوس کے موضوع پر لکھی ہوئی ہیں۔ جنگ آزادی کے ہیرو چیپیو کی فلم مجھے سب سے زیادہ پسند ہے۔ میرے پاس ایک کیمرا بھی ہے۔ میں نے اس کا شیشہ (Lens) بازار سے خریدا تھا اور باقی سب کچھ خود تیار کیا تھا۔ یہ کیمرا نہایت تسلی بخش کام دیتا ہے۔ مجھے انسانوں کی تصویروں کے بجائے نظاروں کی تصویریں اتارنے کا بہت شوق ہے۔ سب انسان قریباً ایک ہی طرح کے ہوتے ہیں۔ لیکن نظاروں میں تنوع بہت ہوتا ہے۔ میں اپنی تصاویر کارخانے ہی میں دھوتا ہوں۔ یہاں ایک کمرہ خاص اسی مطلب کے لئے بنا ہوا ہے۔ کبھی کبھی گھر بھی لے جاتا ہوں لیکن یہاں پر کام زیادہ آسان رہتا ہے۔ میں ایک فلمیں اتارنے کا کیمرہ بھی رکھنا چاہتا ہوں کیونکہ چلتی پھرتی تصویریں متاثر کرنے والی ہوتی ہیں۔ میں تمام فلمیں دیکھتا ہوں۔ ہمیں ٹکٹ رعائتی قیمت پر مل جاتے ہیں اور اکثر ہمیں مفت کے پاس ملتے ہیں۔ تھیئیٹر میں ہمیں مفت جگہ ملتی ہے۔ پچھلے ہفتے میں نے تھیئیٹر دیکھا تھا۔ مجھے بہت ہی پسند آیا لیکن پھر بھی فلم کی اور بات ہے۔ اس میں نظاروں کا تنوع بہت زیادہ ہوتا ہے۔

سردیوں میں ہم سکیٹ کرتے ہیں اور گرمیوں میں والی بال کھیلتے ہیں یا تیرتے ہیں۔ ہماری ایک فٹ بال کی ٹیم بھی ہے۔ کچھ مدت کے

بعد میں ہوابازی کی تعلیم لینی بھی شروع کروں گا۔ ہمارے کارخانے کے چار مزدور یہاں کی تعلیم ختم کرنے سے پہلے ہی ہوابازی کے ماہر ہوگئے تھے۔ بہت سے لڑکوں نے اسی طرح کیا ہے"۔

ماریا کا خط اپنے خاوند کے نام:۔

"پیارے!

بچہ تمہارے متعلق پوچھتا رہتا ہے کہ ابا کہاں ہیں میرے بتانے پر کہ تم ان مشینوں پر کام کرنے گئے ہو جن سے اوزار بنتے ہیں وہ پوچھنے لگا کہ "اوزار کیا ہوتے ہیں؟" اور جب میں نے اسے بتایا تو پھر کہنے لگا "اوزار کس کام آتے ہیں؟" اس سوال کا جواب دینے میں مجھے اتنی دیر لگ گئی کہ اب میں تمہیں جی بھر کے خط بھی نہیں لکھ سکتی۔ اس وقت ایک پیچ کس ہی میرے ہاتھ آسکا جس کا استعمال میں نے اسے عملی طور پر کر کے دکھایا۔ اب اسے بدقت تمام سُلایا ہے لیکن رات اتنی جا چکی ہے کہ میں کل کے لئے اپنی رپورٹ بمشکل مکمل کرسکوں گی۔

ہاں، واقعی تم عملی کام کرنے پر خوش ہوگے۔ مجھے بھی عملی کام نظریات کے مقابلے میں زیادہ پسند ہے۔

بچے کو تمہاری بھیجی ہوئی کتابیں بے حد پسند آئیں۔ بڑی کتاب کی تصویریں اسے بہت پسند ہیں۔ خصوصاً ان کے رنگوں کا وہ بہت مداح ہے چنانچہ جب میں اپنا بلاؤز خریدنے گئی تو ماشا کے علاوہ اسے بھی ساتھ لے گئی لڑکے نے زرد رنگ کا بلاؤز پسند کیا۔ ماشا کی رائے پہلے گلابی کے لئے تھی۔ اس کے بعد جب اس نے زرد بلاؤز کو میرے زرد بالوں سے ملا کر دیکھا تو حیران ہو کر بولی "میں اپنی رائے واپس لیتی ہوں۔ ننھے کی نظر انتخاب قابل داد ہے"۔ لڑکے کو ان الفاظ سے صدمہ ہوا اور وہ تلملا کر بولا "میں ننھا نہیں ہوں۔ میں پڑھ سکتا ہوں"۔ چنانچہ میں نے زرد بلاؤز ہی خریدا۔ کیونکہ حقیقت میں اس سے زیادہ مناسب اور کوئی رنگ نہ تھا۔ تمہاری اماں کل شام وائرلیس سننے کے لئے آئی تھیں۔ کہتی تھیں کہ میرا آلہ کچھ بگڑ گیا ہے۔ تم جب آؤ تو اسے ضرور دیکھنا۔

یہاں ابھی تک خاصی گرمی ہے۔ چنانچہ ہم روز باغ میں سیر کے لئے چلے جاتے ہیں۔ ایک دو روز ہوئے پاشا تھوڑے سے نہایت ہی لذیذ انگور لایا تھا۔ وہ ابھی ابھی گھر والوں سے مل کر آیا ہے۔ ان لوگوں نے اسے بے شمار چیزوں سے اتنا لاد کر بھیجا ہے کہ اس بیچارے کا بہت سا وقت ان کے تقسیم کرنے میں ضائع ہو جاتا ہے۔

پیارے! خوب تندرست اور جمع خاطر سے رہو۔ ہم سب تمہیں پیار بھیجتے ہیں اور آیندہ چھٹی کے روز تمہارے آنے کے منتظر ہیں اور یاد رکھنا۔ لڑکے کے لئے زیادہ مٹھائی نہ لانا ——— بڑی اماں پہلے ہی اسے کافی بگاڑ رہی ہیں"۔

موسیقی کے ابتدائی مدارس سے فارغ ہونے کے بعد (جو ہر بڑے شہر میں موجود ہیں) طالب علم ماسکو کے موسیقی کالج میں داخل ہوتے ہیں۔ یہاں داخل ہونے کے وقت ان کی اوسط عمر بیس سال کی ہے۔ اس صنف میں خداداد قابلیت اور ذہانت رکھنے والے بچوں کے لئے ایک خاص سکول بھی ہے جہاں سکول کے عام تعلیمی کورس کے علاوہ انہیں موسیقی کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ اس سکول کے بچے براہ راست موسیقی کالج میں لے لئے جاتے ہیں۔

یہاں پیانو، ارگن، تار سے بجنے والے ساز، پھونکنے والے باجے اور گانے کا فن بحیثیت استاد فن اور بحیثیت مرتب موسیقی سکھایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ تاریخ نظریات موسیقی اور تربیت استادان موسیقی کا کورس بھی شامل ہے۔ موسیقی اور آلات موسیقی کی تحقیق کا کام بھی کرنا پڑتا ہے۔

ایک کارخانے کے فورمین نے کارکنوں کے اجتماع عمومی میں کہا:۔

"بھائیو! کس قدر شرم کی بات ہے کہ اب تک تانیا الگزنڈروتا کی آواز پر جو میری شاپ میں کام کرتی ہے۔ نہ تو کارخانے کی کمیٹی نے اور نہ کسی اور انجمن نے توجہ کی ہے۔ اس کی آواز بے انتہا شیریں ہے آج میں نے اسے شاپ میں گانے کے جرم میں جرمانے کی سزا دی ہے۔ میں مجبور تھا کیونکہ اس کے گانے سے متاثر ہو کر سب کارندے کام چھوڑ کر بیٹھ گئے تھے۔ مجھے یہ دیکھ کر اور بھی غصہ آیا کہ میں خود کام چھوڑ کر اسی کی طرف کان لگائے سن رہا تھا۔ (قہقہہ) یہ ہنسنے کی بات نہیں ہے۔ کسی نہ کسی کو یہ کام ہاتھ میں لینا چاہئے تاکہ اس لڑکی کو موسیقی کالج میں داخل کرادیا جائے۔"

موسیقی کالج کی لڑکی لکھتی ہے:۔

"ہم میں سے اکثر کو وظیفہ ملتا ہے۔ وظیفہ کی مقدار کام کی خوبی اور مضامین کی نوعیت پر منحصر ہے۔ مجھے ۱۸۰ روبل ماہوار ملتے ہیں۔

بے شمار طالب علم ہوسٹلوں میں رہتے ہیں جن کی رہائش بڑی ارزاں ہے۔ میں اپنے گھر پر رہتی ہوں کیونکہ میں شادی شدہ ہوں۔

میرا خاوند طبابت پڑھتا ہے بلکہ قریباً ڈاکٹر ہے۔ وہ موسیقی کی الف بے بھی نہیں جانتا یا یوں کہئے کہ نہیں جانتا تھا۔ لیکن اب وہ موزارٹ اور بیتھوون میں امتیاز کرنے لگ گیا ہے اور گھنٹوں تک دلچسپی سے سنتا رہتا ہے۔ گانے والوں کا وظیفہ کچھ زیادہ ہوتا ہے۔ کیونکہ انہیں اپنے گلے کو چکنا رکھنے کے لئے زیادہ مکھن کھانا پڑتا ہے۔ ہمیں بحیثیت طالب علم تو وظیفہ ملتا ہی ہے۔ لیکن موسیقی کی تقاریب میں حصہ لینے کی الگ اجرت ملتی ہے اور اس طرح میں کافی سے زیادہ کما لیتی ہوں۔

مظفر احمد

غزل

تمہیں لطف کرنا گوارا نہیں
مرا اور کوئی سہارا نہیں

تمہیں پاس کچھ بھی ہمارا نہیں
مروّت نہیں ہے مدارا نہیں

یہ مانا بجز صبر چارا نہیں
یہاں صبر کا بھی تو یارا نہیں

مرے عجز کی انتہا ہو چکی
غمِ رشک بھی ناگوارا نہیں

جدائی، جدائی کے صدمے نہ پوچھ
مرا حال کیا آشکارا نہیں

یہ حسن و جوانی، یہ ناز و ادا
کسی کا نہیں جو تمہارا نہیں

وہ سنتے نہیں بات اکبرؔ اگر
بجز خامشی کوئی چارا نہیں

جلال الدین اکبرؔ

رباعی

جیتا ہوں سرورِ زندگانی لے کر
صحرا سے مناظر کی جوانی لے کر
کہسار کی رفعت [illegible] خاموشی ہیں
بہتے ہوئے چشموں کی روانی لے کر

سعید احمد اعجاز

غزل

غنچے کہتے تھے کہ اک پھول کہیں اور بھی ہے
تارے کہتے تھے کہ اک چاند کہیں اور بھی ہے

لالہ و گُل ہی پہ موقوف نہیں حُسنِ شگفت
میرے گلشن کی بہاروں کا امیں اور بھی ہے

جس پہ شاعر کی نگاہیں ہی پہنچ سکتی ہیں
چاند تاروں سے پرے ایسی زمیں اور بھی ہے

میں تری چاندنی راتوں میں رہا ہوں بیدار
راز داں کوئی ترا ماہِ مبیں اور بھی ہے؟

میرا ہم سوز ہے زندانِ جہاں میں بلبل
میں ہی اک کشتۂ آلام نہیں اور بھی ہے

اُن سے کہنا ہے فسانہ غمِ ناکامی کا
ایک مشکل ابھی اے قلبِ حزیں اور بھی ہے

ہم تری بزم سے جاتے ہیں اب اے حُسنِ نبا
چارۂ سوزِ غمِ عشق کہیں اور بھی ہے؟

اے ضیاؔ مجھ پہ نہ کیوں ناز ہو میخانے کو
مجھ سا دیوانہ و مدہوش کہیں اور بھی ہے؟

ضیا فتح آبادی ایم اے

جنگل میں ویران مندر

کچھ چاند کی پریاں مندر میں کل رات بُلائی جائیں گی،
ساری دیواریں کلیوں اور پھولوں سے سجائی جائیں گی۔
کچھ کومل، نرم، ہرے پتّوں کے فرش بچھائے جائیں گے،
اور ہلکے ہلکے، میٹھے رسیلے ساز بجائے جائیں گے۔
جب ایسی انوکھی اور من موہن تیاری سب ہولے گی،
تب وقت کی دیوی چاند کے سنگیں دروازوں کو کھولے گی،
پھر دھیرے دھیرے اُڑتی، بہتی چاند کی پریاں آئیں گی،
اور مندر کی سب دیواریں منگل کے گیت سُنائیں گی،
میں مندر کے اک کونے میں چھپ کر چُپکا بیٹھا ہوں گا۔
اور ایسے موہن منظر کو اپنی آنکھوں سے دیکھوں گا۔
میں چاند کی پریوں کے گیتوں کا جادُو دل میں بھر لوں گا۔
اور ناچ کے پھولوں سے اپنی آنکھوں کو روشن کر لوں گا۔
پہلے تو میرے دل پر گہری مستی سی چھا جائے گی،
پھر وقت کی دیوی مجھ کو میرے سپنوں سے چونکائے گی۔
اور چاند کی ناچتی گاتی پریاں ڈر کے ٹھٹھک سی جائیں گی،
اور مجھ کو دیکھ کے سہمی سہمی اپنے پر پھیلائیں گی،
سب پھول پریشاں ہو جائیں گے۔ اور کلیاں مرجھائیں گی،
اور چاند کی پریاں مجھ کو چھوڑ کے مندر سے اُڑ جائیں گی۔

میراجی

فریبِ زندگی

جیکب بندر روڈ پر ایک الگ تھلگ خاموش سی کوٹھی میں قیام پذیر تھا۔ ان دنوں اُس کا کام سورج کی تھرتھراتی ہوئی کرنوں کی حرارت کو محسوس کرنے اور اپنے آوارہ خیالات کو لہروں کی سطح پر رقص کرتے ہوئے دیکھنے کے سوا کچھ نہ تھا۔ اُس کی عمر تیس برس کی تھی۔ لیکن اب وہ اپنے جسم اور دماغ میں ایک تھکاوٹ سی محسوس کرنے لگا تھا۔ اس ماندگی اور کسل کا باعث محبت نہ تھی۔ بلکہ اکثر محبت بھرے جذبات کے ساتھ کھیلنے سے اُس کا دماغ ضعیف ہو چکا تھا اور اس پر ہر وقت اِک پژمردگی سی چھائی رہتی تھی۔

وہ عیش و طرب کا متوالا تھا مگر بوالہوس نہ تھا بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ وہ اپنے مخصوص انداز میں صنفِ نازک کی رعنائیوں اور عورت کے جسم کی لطافتوں سے لطف اندوز ہونے کا قائل تھا۔ اُس کا معیارِ حُسن اور نظریۂ محبت بہت بلند اور نرالا تھا۔ وہ حسّاس عورتوں کو پسند کرتا تھا۔ ہر دفعہ احساسِ محبت کو کسی نئے اور اچھوتے طریق پر محسوس کرنا چاہتا تھا۔ جدت پر جان دیتا تھا۔ مگر اچھوتے احساسات کے لئے اچھوتے ماحول اور حالات کا ہونا لازمی ہے اور یوں وہ اکثر ایسی الجھنوں میں پھنس جاتا جن سے نکلنا محال ہوتا۔ اس لئے ان جاڑوں میں اس نے اپنے دل و دماغ کو بالکل فارغ اور بے کار رکھنے کا تہیّہ کر لیا تھا۔ تقریباً ہر روز اک سر سبز وادی میں جو کہ ساحل سے جا ملتی تھی وہ اپنا وقت گذار دیتا۔ جب کبھی شفاف دھوپ چمکتی اور بادل نہ ہوتے تو ایک عورت اپنی نوجوان لڑکی کے ہمراہ دھوپ میں بیٹھنے کے لئے وہاں آ نکلتی۔ عورت باوقار نظر آتی تھی مگر لڑکی کچھ چُپ چاپ اور افسردہ سی رہتی تھی۔

جیکب نے اُن سے راہ و رسم پیدا کر لی۔ کبھی کبھار راستے میں مل جاتیں تو ایک دو باتیں بھی ہو جاتیں۔ دوشیزہ کی علالت پر اُسے بہت ترس آتا اور جب کبھی علیحدہ ہوتا تو اکثر بڑبڑاتا۔

"بے چاری بدنصیب لڑکی"۔!

اُسے بتایا گیا کہ اسی بیماری سے اول لڑکی کا باپ فوت ہوا اور پھر نوجوان بھائی راہی ملکِ عدم ہوا۔ اب دونوں ماں بیٹی اک قلیل آمدنی میں گذارا کرتی ہیں اور پڑوس ہی میں اک معمولی کرائے کے مکان میں رہتی ہیں اور یہ کہ لڑکی کا نام لُوسی ہے۔ عادات کی بہت اچھی ہیں اور ہر کوئی ان کی تعریف کرتا ہے اور ان کی آزردگی پر اظہارِ افسوس کرتا ہے۔ ان حالات سے آگاہ ہو کر جیکب ان دونوں میں اور بھی دلچسپی لینے لگا۔

جب کبھی لڑکی کی توجہ کسی اور طرف مبذول ہوتی تو ماں کے چہرے پر انتہائی غم و اندوہ کے اثرات نمایاں ہو جاتے جن میں اُمید اور صبر کی جھلک تک نہ ہوتی۔ شاید یکے بعد دیگرے دو اندوہ افزا اموات کے صبر شکن احساس اور ایک نوجوان بیٹی کی درد انگیز موت کے انتظار اور پھر دنیائے رنج و محن میں اکیلے رہ جانے کے خیال سے اس کی روح کانپ جاتی تھی۔

جیکب سب کچھ دیکھتا اور محسوس کرتا تھا۔ اور حیران تھا کہ یہ ستم رسیدہ عورت اپنی بیٹی کی نظروں کے لئے مسکراہٹ کہاں سے چرا لاتی ہے۔ جبکہ وہ بچھڑے ہوؤں کی یاد سینے میں دبائے رکھتی ہے اور ایک لختِ جگر کی بے وقت موت کا انتظار کھینچ رہی ہے

وہ زرد زرد چہرے والی حسینہ جس کی نرگسی آنکھیں۔ بہت پتلی ناک۔ پیاری اور دلکش آواز۔ لمبے اور گھنگھریالے بال۔ رشکِ سنگ ہاتھوں پر نیلی نیلی رگیں۔ بہایت ہی نازک و ناتواں ایسی کہ جسے دیکھ کر بے اختیار آنکھوں میں آنسو امڈ آئیں۔ اتنی کمزور تھی کہ زیادہ دیر تک پڑھ بھی نہ سکتی تھی۔ اس کی کتاب ریت پر گر پڑتی تھی۔ ہاتھوں میں تھامنے کی سکت نہ تھی۔ اکثر چپ چاپ بیٹھی اُفق کے نیلگوں و صندلگوں کی طرف

تکتی رہتی۔

جیکب سوچا کرتا کہ اس وقت خیالات کی لہر اُسے کس طرف بہائے جاتی ہے۔ اور وہ ساکت و دم بستہ بیٹھی کس سوچ میں کھو جاتی ہے۔

ایک دن لوسی بیٹھی اپنی زرد زرد لانبی لانبی اُنگلیوں سے سفید و سیاہ ریشم کی ٹوپی بنا رہی تھی۔

"یہ ٹوپی کتنی خوبصورت ہے ——" جیکب نے کہا "کیا یہ گڑیا کی ٹوپی ہے؟"

"نہیں!" لوسی نے جواب دیا "یہ میری ایک سہیلی کے لئے تحفہ ہے جس کی شادی گذشتہ سال ہوئی تھی اور اب وہ ماں بننے والی ہے۔ وہ خوشی سے پھولی نہیں سماتی ——"

اگلے دن لوسی اپنی ماں کے پہلو میں بیٹھی کچھ پڑھ رہی تھی۔ جو صفحہ اس کے سامنے تھا اُس میں وہ انتہائی دلچسپی لے رہی تھی۔ دیر تک پیوست رہنے والی نگاہوں سے اُس کا انہماک عیاں تھا۔ جیکب نے اس کی نگاہوں کی حرکت سے معلوم کیا کہ وہ بار بار ایک ہی سطر کو پڑھ رہی ہے۔ پھر وہ کسی گہری سوچ میں پڑ گئی اور نہ جانے کن خیالات کی دنیا میں کھو گئی کہ صفحہ بدلنا تک بھول گئی۔ جیکب اُس کے عقب میں جا کھڑا ہوا۔ جونہی اُس نے کھلی ہوئی کتاب پر نگاہ ڈالی تو یہ سطریں اس کے سامنے تھیں۔

"بخدا میں موت سے خوفزدہ نہیں، اگر مرنے سے پہلے میں محبت کر لیتی!"

لوسی سوچ رہی تھی میں زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہوں گی۔ سب لوگ اس حقیقت کو مجھ سے چھپانا چاہتے ہیں مگر میں جانتی ہوں کہ ایسا ہی ہوگا کیونکہ مجھے وہی ہلاک مرض ہے جو میرے باپ اور بھائی کو تھا۔ مجھے جوانی میں مرنے کا افسوس نہ ہوتا بلکہ میں خوشی سے مر جاتی اگر ایک بار موت سے پہلے جی بھر کر پیار کر لیتی۔ جیسا کہ دوسری عورتوں کو نصیب ہے۔ میری بہت سی سہیلیاں سہاگنیں بن چکی ہیں اور جو ابھی کنواری ہیں ان کے پیار کرنے والے موجود ہیں جو اُن کے ہر نقشِ قدم پر سجدے لٹانے کے لئے بے تاب رہتے ہیں۔ ..... کاش کہ میں بھی کسی کی جانِ تمنا ہوتی۔ مجھ سے کسی نے آج تک محبت نہیں کی۔ میں یہ کبھی بھی نہ جان سکوں گی کہ شانِ محبوبی کیسی ہوتی ہے۔ بیوی اور ماں بننا کسے کہتے ہیں ——!

میں بھدی بھی نہیں کیونکہ اکثر نوجوانوں کی نگاہوں کا مرکز رہی ہوں جو آغاز میں یوں نظر آتے تھے کہ مجھ پر فریفتہ ہو گئے ہیں۔ پھر نہ جانے کیوں معًا وہ نظریں پھیر لیتے ہیں۔ شاید جب انہیں معلوم ہوتا ہے کہ میری موت قریب ہے تو وہ مایوس ہو کر لوٹ جاتے ہیں اور پھر وہ پیار کرنے والی نگاہیں صرف رحم بھری نظریں بن کر رہ جاتی ہیں۔ جبکہ وہ پہلی نظریں جان جاتے ہیں کہ میں عنقریب اس دنیا کو چھوڑنے والی ہوں تو پھر انہیں اس طرح پُرشوق انداز میں میری طرف گھورنے کا کیا حق ہے۔ میرے دل کی دھڑکنیں تیز کر کے مجھے عذاب دینے میں انہیں کیا لطف آتا ہے ..... یہی شخص جو ہمیں روز راستہ میں ملتا ہے۔ مجھے اکثر پیار کی نگاہوں سے دیکھتا ہے مگر میں اُس کی طرف آنکھ بھر کر نہیں دیکھتی ..... ڈرتی ہوں ..... کہ وہاں بھی کہیں ایک روگن کے لئے جذبۂ رحم نہ سمایا ہو ..... وہ نظریں میرے لئے زہر سے زیادہ تلخ ہیں جو مجھے رحم کے قابل تصور کرتی ہیں۔ وہ صرف اسی لئے مجھ پر پڑتی ہیں کہ میں ایک دائم المریض عورت ہوں اور موت میری راہ دیکھ رہی ہے!

کاش! مجھے کوئی رحم کی نظروں کی بجائے محبت بھری نگاہوں سے جلاتا اور رُلاتا اور میں اُس کی پرستش کرتی اور میری ناتوانی اور میرے چہرے کی پژمردگی کے باعث مجھ سے پیار نہ کرتا بلکہ ایک دوشیزہ جانتے ہوئے میری آرزو کرتا!

اُدھر جیکب اپنے دل میں سوچ رہا تھا کہ لوسی کے چہرے کی افسردگی میں کس قدر طلسمی کیفیتیں پنہاں ہیں۔ اُس کی خواب آلود آنکھیں اُس کی پیچیدہ زلفیں، اس کے افسردہ رخسار اور اُس کے شیریں لب۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ تندرست ہوتی تو اُس کی آنکھیں اس قدر آرزو انگیز نہ ہوتیں۔ اُس کی ناتوانی ہی اُس کی رعنائی اور دلکشی ہے۔ ورنہ وہ ایک معمولی قبول صورت دوشیزہ ہوتی ..... مگر یہ پژمردگی .... افسردگی ... اور موت ..... نہیں! شگفتگی میں بھی خوب ہوگی .... بیچاری بدنصیب لڑکی!

لیکن بے چاری اور بدنصیب کس لئے؟ کیا وہ اتنی ہی رحم کے قابل ہے؟ ..... نہیں؟

اُسے اس رحم و نرمی کے اظہار سے ضرور دکھ ہوتا ہوگا۔ اُس کی

اُداس جوانی کبھی بڑھاپے کی صورت اختیار نہ کر سکے گی اور وہ زندگی کی تلخیوں سے کبھی بھی آگاہ نہ ہوگی۔ موت ہی اُس کے درد کا درماں بن جائے گی ..... اُس کے دل و دماغ پر اب بھی پاکیزہ۔ حسین اور سنہرے خیالات کی دھند چھائی ہوئی ہوگی اور بادلوں کی دنیا میں چاندی کی کرنوں سے وہ اپنا آشیانہ بنا رہی ہوگی اور موت کے بعد ایک خوشنما پھول کی یاد کی طرح دل میں سمائی رہے گی!

معاً اُس کے خیالات نے کروٹ لی۔ اور وہ سوچنے لگا کہ ہمارے لئے جنہیں صحت نصیب ہے سب کچھ آسان ہے مگر کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ اس کے خیالات کس قدر درد انگیز بھیانک اور تاریک ہیں اور وہ ان طویل خاموشیوں میں کیا سوچتی رہتی ہے!

اگر اُس کے درد انگیز خیالات کو طرب انگیز بنا دیا جائے تو پھر کیا ہو اُسے صحیح معنوں میں عورت کی زندگی سے آگاہ کیوں نہ کیا جائے تاکہ وہ زندگی کے لطیف ترین راز کو پا سکے۔ اُسے فریب محبت کیوں نہ دیا جائے۔ وہ پیاسی ہے کیا اُس کی تشنگی کو مٹانا کارِ ثواب نہ ہوگا۔ اور اس کی ننھی سی روح کو مسرت سے پھڑپھڑاتے ہوئے دیکھنا ایک زبردست نیکی کے مترادف نہیں .... جب کہ اُسے یقین ہو کہ اُس نے رازِ زندگی پا لیا ہے اور موت ایک نئی زندگی سے زیادہ وسیع نہیں ....!"

یکلخت وہ متفکر ہو گیا اور سوچنے لگا کہ میں ایسا اس لئے کرنا چاہتا ہوں کہ مجھے اُس کی موت کا یقین ہے اور اگر وہ زندہ رہی تو پھر!

اگلے دن اُس نے لڑکی کے معالج سے استفسار کیا۔ جس نے بتایا کہ "اُس کی زندگی کی بھول کر بھی اُمید نہیں کرنی چاہئے اور میری حیرت کی کوئی انتہا نہ ہوگی۔ اگر وہ دو ماہ تک اور سانس لیتی رہی"——

"بس اب ٹھیک ہے" جیکب نے اپنے آپ سے کہا "یہ شاید میری زندگی کا عظیم ترین اور پہلا پاکیزہ عمل ہوگا——

جیکب اس کی ماں سے جاملا اور لڑکی کے رشتہ کے لئے درخواست کی۔ وہ یہ سُن کر بہت ہی حیران ہوئی اور جیکب کی عقل پر بھی اُسے شک گذرا مگر جیکب نے ہر اعتراض کے جواب میں صرف یہی کہا کہ مجھے اس سے محبت ہے ...... اُس نے کہا کہ آپ کو میرے مخلص ہونے میں شک نہیں ہونا چاہئے۔ کیونکہ میں متمول ہوں اور لوسی سے صرف لوسی کی خاطر پیار کرتا ہوں۔ جہیز اور کسی اور بات کا مجھے قطعاً لالچ نہیں۔ میں لوسی کو چاہتا ہوں اور لوسی ہی میری منتہائے آرزو ہے —— ہمیں یوں مایوس نہ ہونا چاہئے۔ دنیا میں ہر چیز ممکن ہے۔ ڈاکٹر کی رائے بہت امید افزا ہے۔ لوسی تندرست ہو جائے گی اور یوں ہماری خوش و خرم زندگی رشک کے قابل ہوگی —— اور اگر خدانخواستہ وہ بیمار ہی رہی تو میں آپ کی بیٹی کی اپنی عزیز بہن کی طرح تیمار داری کروں گا۔ ہم دونوں اُس سے پیار کریں گے۔ اور اس کی حفاظت کریں گے"۔

ان تسکین بھری باتوں سے بیوہ کے دل میں بھی امید کی لہر جھلکنے لگی اور آخر کار اُس نے اجازت دے دی۔

محبت کے پہلے الفاظ جو جیکب نے لوسی سے کہے انہیں سُن کر اُس کی آنکھیں ستاروں کی مانند روشن ہو گئیں۔ جن سے مسرت کی شعاعیں پھوٹ پھوٹ کر نکلنے لگیں۔ "تو پھر کیا میری موت یقینی نہیں"؟ لوسی نے کہا۔

"ہاں" جیکب نے کہا "میری یہ خواہش کہ تم میری بیوی بنو اس امر کی دلیل ہے کہ اس سے زیادہ غیر یقینی اور کوئی بات نہیں .... میں ایک ہوشمند انسان ہوں۔ اور اگر مجھے یہ یقین ہوتا کہ تم مجھے بہت جلد داغ مفارقت دے جاؤ گی تو میں کبھی بھی اپنے لئے اتنے شدید صدمے کی بنیاد نہ رکھتا ..... تم زندہ رہو گی اور میرے لئے زندہ رہو گی۔ کیونکہ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔

لوسی کے لئے یہ دلائل بہت کافی تھے۔ اور وہ ان پر یقین لے آئی۔ اور پھر ایک ماہ تک جیکب اپنی منگیتر کے لئے ہر صبح پھول لاتا رہا اور بہت طویل لمحوں تک باہم سوز و گداز سے لبریز سرگوشیاں ہوتی رہتیں۔ لوسی کے نازک سینے میں ہر روز نئی خواہشات۔ نئی اُمنگیں۔ نئے ولولے اور نئے ارمان تلاطم برپا کرتے اور وہ اپنی آنے والی ازدواجی زندگی کے متعلق عجیب و غریب ارادے باندھتی ..... جیکب بھی بہت ہشیار تھا۔ اُس کے ہر ارادے پر نہایت متانت سے بحث کرتا۔ اختلاف اور اتفاق سے اُس کے دل کو گرماتا۔ گاہے فہمائش بھی کر دیتا تاکہ لوسی کو بے جا نرمی سے یہ شک نہ گذرے کہ وہ اُسے موت کے دروازے پر موجود پاتا ہے۔ اُس نے خلوت کدہ کو پھولوں اور طرح طرح کی تصاویر سے آراستہ کیا۔ ریشمی بستر پر کمخواب کے تکئے رکھے۔ جھالروں میں موتی لٹکائے ...... اس مصنوعی زیبائش و آرائش سے یوں نظر آتا تھا کہ اُسے صرف چند دنوں کے لئے ہی سجایا

گیا ہے۔ مگر ادائیگیِ رسم کے بعد وہ لوسی کو وہیں لے آیا۔

لوسی کا رنگ اُس کے عروسی ملبوس سے زیادہ سپید تھا۔ وہ مسرت سے مری جاتی تھی۔ اور تیز تیز سانس لے رہی تھی۔ اُس کے زرد، زردنیم وا لبوں سے موتیوں جیسے دانتوں کی قطار چمک رہی تھی۔ اُس کے نرم۔ نازک اور نحیف بازو اُس کے خاوند کے گلے میں پڑے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں دیوانہ جوش لئے اس کی طرف تک رہی تھی۔ وہ دُنیا و مافیہا کو بھول چکی تھی ——

جب جیکب نے اُس گڑیا کے لمس کو جو کہ محض اک شبریں خیال کی طرح اُس سے لپٹی ہوئی تھی، محسوس کیا تو اُس کی آنکھوں میں جذبہ رحم آنسو بن کر امڈ آیا اور اُس کا دل پدرانہ شفقت سے لبریز ہو گیا۔ وہ اُس کے لبوں کا بوسہ تک لینے کی بھی جرأت نہ کر سکا۔ پھر شب خوابی کا لباس پہنا کر اُس نے اک کھلونے کی طرح اُسے ہاتھوں میں اٹھا لیا اور دیر تک دیکھا کیا۔ پھر خاموشی سے بستر پر لٹا دیا۔ اُس نے تمام رات لوسی کے نرم اور بے جان سے ہاتھ کو ہاتھوں میں لئے اس کے سرہانے بیٹھ کر گذار دی۔

یونہی ایک ہفتہ گذر گیا اور آٹھویں روز موت سے چند لمحے پہلے لوسی نے جیکب کے کان میں سرگوشی کی "میرے دوست میں جانتی ہوں کہ میری موت اب بالکل قریب ہے۔ مگر مجھے اس موت کا کوئی خاص صدمہ نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ تم مجھے ہمیشہ یاد رکھو گے اور کبھی بھی بھول نہیں سکو گے ...... کبھی ... نہیں! میں تمہاری ممنون ہوں کہ تم نے مجھے خیال کے ایک دھوکے ہی سے زندگی کا بھید سمجھا دیا۔ اور میں بھی دوسری عورتوں کی طرح جان گئی کہ بیوی کہلانے میں کیا جادو ہے۔ اور مجھے بھی موقعہ نصیب ہوا کہ تمہیں اپنا خاوند کہہ کر پکاروں —— میرے سرتاج۔ میرے پیارے۔ میرے خاوند میں یہی کچھ کہنے کے لئے ترستی تھی —— !" اس واقعے کے بعد جیکب مغموم اور عمر رسیدہ نظر آنے لگا۔ اُس نے اپنی زندگی میں پہلی بار محبت اور حسرت محسوس کی تھی!

جولیس لیمیتر
Jules Lemaître

مجید لشاری

رباعیات

(۱)

آزارِ حیات جاوداں ہوتا ہے
انجامِ طرب کا ناگہاں ہوتا ہے
جینا ہے نگارِ عالم آرائی میں
مر جانا ہے جب پیچ جواں ہوتا ہے

(۲)

صہبا الاستاقیا بہار آئی ہے
ہر سمت ہے کیفیتِ صہبائی ہے
فتنا ہے ابر کا نظارہ مخمور
سروں پہ ہے مستی کی گھٹا چھائی ہے

سعید احمد اعجاز

محبّت کی داستان

ضیائے انجم و تنویرِ کہکشاں اے دوست
بہار و نکہتِ صد گلشن جناں اے دوست
فروغ دیدۂ بینائے آسماں اے دوست
ہیں میرے دردِ محبت کے رازداں اے دوست!
نہ پوچھ میری محبت کی داستاں اے دوست!

بجا کہا کہ میں ناکام آرزو ہی رہا
دلِ حزیں مرا مجروح جستجو ہی رہا
صبا کی طرح میں آوارہ کوبکو ہی رہا
مگر نہ پایا محبت کا آستاں اے دوست!
نہ پوچھ میری محبت کی داستان اے دوست!

نہ سن سکے گا تو اس غم بھرے فسانے کو
سرودِ یاس میں ڈوبے ہوئے ترانے کو
ہے میرا قصۂ غم تو فقط رُلانے کو
تری بھی آنکھ نہ ہو جائے خونفشاں اے دوست!
نہ پوچھ میری محبّت کی داستاں اے دوست

وہ گیت اس کی محبت کے جو فسانے تھے
جو رنگ و نکہت و تنویر کے ترانے تھے
جو میری حسرتِ خاموش کو لٹانے تھے
ریاضِ خلد کی جانب ہیں پرفشاں اے دوست!
نہ پوچھ میری محبت کی داستاں اے دوست

سمجھ لے میری نگاہوں کی التجاؤں سے
مرے دھڑکتے ہوئے قلب کی دعاؤں سے
کبھی کی روتی ہوئی غمزدہ وفاؤں سے
کہ ہے انہی سے مرا سوزِ غم نہاں اے دوست!
نہ پوچھ میری محبت کی داستاں اے دوست

کہ تھی ازل سے جگہ ان کی خلدزاروں میں
چمک تھی ان کے تاثر سے سب ستاروں میں
وہ رقص کرتے ہیں فردوس کی بہاروں میں
کہ جیسے خلد میں اک خوابِ کہکشاں اے دوست!
نہ پوچھ میری محبت کی داستان اے دوست!

تو میرے رازِ نہفتہ کو آشکار نہ کر
کلی کلی کو گلستاں میں اشکبار نہ کر
تو یاد میری وہ اجڑی ہوئی بہار نہ کر
رہی جو میرے شبستاں پہ گلفشاں اے دوست!
نہ پوچھ میری محبت کی داستاں اے دوست

کیا نہ اس کی جفاؤں نے پائمال مجھے
ہوئی نہ آہ کبھی حسرتِ وصال مجھے،
تباہ کر گئی اک "لغزشِ خیال" مجھے
ہوں آپ اپنی محبت کا نوحہ خواں اے دوست
نہ پوچھ میری محبت کی داستاں اے دوست

میں ہوں جو وقفِ غمِ بے حساب تو کیا ہے؟
ہے میری روح پہ طاری عذاب تو کیا ہے؟
ہے میرا موت سے بدتر شباب تو کیا ہے؟
یہی متاعِ محبت ہیں بے گماں اے دوست!
نہ پوچھ میری محبت کی داستاں اے دوست!

سکوتِ شام ہے اب چھا رہا جوانی پر
مری محبتِ ناکام کی کہانی پر
سحر کا وقت ہے اب شمعِ زندگانی پر
بھڑک اُٹھے نہ کہیں شعلۂ نہاں اے دوست
نہ پوچھ میری محبت کی داستاں اے دوست

تابش صدیقی

گرم کوٹ

میں نے دیکھا ہے۔ معراج الدین ٹیلر ماسٹر کی دُکان پر بہت سے عمدہ عمدہ سوٹ آویزاں ہوتے ہیں۔ انہیں دیکھ کر اکثر میرے دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ میرا اپنا گرم کوٹ بالکل پھٹ گیا ہے اور اس سال ہاتھ تنگ ہونے کے باوجود مجھے ایک نیا گرم کوٹ ضرور سلوا لینا چاہیئے ٹیلر ماسٹر کی دکان کے سامنے سے گذرنے یا اپنے محکمہ کی تفریح کلب میں جانے سے گریز کروں تو ممکن ہے مجھے گرم کوٹ کا خیال بھی نہ آئے۔ کیونکہ کلب میں جب سنتا سنگھ اور یزدانی کے کوٹوں کے نفیس ورسٹڈ (WORSTED) میرے سمندِ تخیل پر تازیانہ لگاتے ہیں تو میں اپنے کوٹ کی بوسیدگی کو شدید طور پر محسوس کرنے لگ جاتا ہوں یعنی وہ پہلے سے کہیں زیادہ پھٹ گیا ہے۔

بیوی بچوں کو پیٹ بھر روٹی کھلانے کے لئے مجھ سے معمولی کلرک کو اپنی بہت سی ضروریات ترک کرنی پڑتی ہیں اور انہیں جگر تک پہنچتی ہوئی سردی سے بچانے کے لئے خود موٹا جھوٹا پہننا پڑتا ہے ...۔

یہ گرم کوٹ میں نے پار سال دہلی دروازے سے باہر پرانے کوٹوں کی ایک دکان سے مول لیا تھا۔ کوٹوں کے سوداگر نے پرانے کوٹوں کی سینکڑوں گانٹھیں کسی مراسجا۔ مراسجا اینڈ کمپنی کراچی سے منگوائی تھیں۔ میرے کوٹ میں نقلی سلک کے استر سے بنی ہوئی اندرونی جیب کے نیچے مراسجا مراسجا اینڈ کو کا لیبل بھی لگا ہوا تھا۔ مگر کوٹ مجھے بلا بہت سستا۔ مہنگا روئے ایک بار سستا روئے سو بار ——— اور میرا کوٹ ہمیشہ ہی پھٹا رہتا تھا۔

اسی دسمبر کی ایک شام کو تفریح کلب سے واپس آنے پر میں اراد تاً انارکلی میں سے گذرا۔ اس وقت میری جیب میں دس روپے کا نوٹ تھا۔ آٹا دال، ایندھن، بجلی، بیمہ کمپنی کے بل چکا دینے پر میرے پاس وہی دس کا نوٹ بچ رہا تھا ...۔ جیب میں دام ہوں تو انارکلی میں سے گذرنا معیوب نہیں۔ اُس وقت اپنے آپ پر غصہ بھی نہیں آتا۔ بلکہ اپنی ذات کچھ بھلی بھلی معلوم ہوتی ہے اس وقت انارکلی میں چاروں طرف سوٹ ہی سوٹ نظر آ رہے تھے اور ساڑھیاں، چند سال سے ہر نتھو خیرا سوٹ پہننے لگا ہے ....۔ میں نے سُنا ہے گذشتہ چند سال میں کئی ٹن سونا ہمارے ملک سے باہر چلا گیا ہے ——— شاید اسی لئے لوگ جسمانی زیبائش کا خیال بھی بہت زیادہ رکھتے ہیں۔ نئے نئے سوٹ پہننا۔ اور خوب شان سے رہنا ہمارے افلاس کا بدیہی ثبوت ہے۔ ورنہ جو لوگ سچ مچ امیر ہیں۔ ایسی شان شوکت اور ظاہری تکلفات کی چنداں پروا نہیں کرتے۔

کپڑے کی دُکان میں ورسٹڈ کے تھانوں کے تھان کھلے پڑے تھے۔ انہیں دیکھتے ہوئے میں نے کہا۔ کیا میں اس مہینے کے بچے ہوئے دس روپوں میں سے کوٹ کا کپڑا خرید کر بیوی بچوں کو بھوکا ماروں؟ لیکن کچھ عرصہ کے بعد میرے دل میں نئے کوٹ کے ناپاک خیال کا ردِ عمل شروع ہوا۔ میں اپنے پرانے گرم کوٹ کا بٹن پکڑ کر اُسے بل دینے لگا۔ چونکہ تیز تیز چلنے سے میرے جسم میں حرارت آ گئی تھی۔ اس لئے موسم کی سردی اور اس قسم کے خارجی اثرات میرے کوٹ خریدنے کے ارادے کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے سے قاصر رہے۔ مجھے تو اس وقت اپنا وہ کوٹ بھی سراسر تکلف نظر آنے لگا۔

ایسا کیوں ہوا؟ میں نے کہا ہے جو شخص حقیقتاً امیر ہوں وہ ظاہری شان کی چنداں فکر نہیں کرتے جو لوگ سچ مچ امیر ہوں۔ انہیں تو پھٹا ہوا کوٹ بلکہ قمیص بھی تکلف میں داخل سمجھنی چاہیئے تو کیا میں سچ مچ امیر تھا۔ کہ ....؟

میں نے گھبرا کر ذاتی تجزیہ چھوڑ دیا اور بمشکل دس کا نوٹ صحیح سلامت لئے گھر پہنچ گیا۔

شمی، میری بیوی، میری منتظر تھی۔

آٹا گوندھتے ہوئے اُس نے آگ پھونکنی شروع کر دی ——— کم بخت منگل سنگھ نے اس دفعہ لکڑیاں گیلی بھیجی تھیں۔ آگ جلنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ زیادہ پھونکیں مارنے سے گیلی لکڑیوں میں سے اور بھی زیادہ دھواں اُٹھا۔ شمی کی آنکھیں لال انگارہ ہو گئیں۔ اُن سے پانی بہنے لگا۔

کم بخت کہیں کا ... منگل سنگھ" میں نے کہا "اِن پُرنم آنکھوں کے لئے منگل سنگھ تو کیا میں تمام دنیا سے جنگ کرنے پر آمادہ ہوں ..."

بہت تگ و دو کے بعد لکڑیاں آہستہ آہستہ جلنے لگیں۔ آخر ان پُرنم آنکھوں کے پانی نے میرے غصے کی آگ بجھا دی ... شمی نے میرے شانہ پر سر رکھا اور میرے پھٹے ہوئے گرم کوٹ میں اپنی پتلی پتلی انگلیاں داخل کرتی ہوئی بولی۔

"اب تو یہ بالکل کام کا نہیں رہا۔"

میں نے دھیمی سی آواز سے کہا۔ "ہاں"۔

"سی دوں ... یہاں سے ..."

"سی دو۔ اگر کوئی ایک آدھ تار نکال کر رفو کر دو تو کیا کہنے ہیں۔"

کوٹ کو الٹاتے ہوئے شمی بولی۔ "استر کو تو موئی ٹڈیاں چاٹ رہی ہیں ... نقلی ریشم کا ہے نا ..... یہ دیکھئے۔"

میں نے شمی سے اپنا کوٹ چھین لیا اور کہا "مشین کے پاس بیٹھنے کی بجائے تم میرے پاس بیٹھو شمی ..... دیکھتی نہیں ہو دفتر سے آ رہا ہوں .... یہ کام تم اُس وقت کر لینا۔ جب میں سو جاؤں۔"

شمی مسکرانے لگی۔

وہ شمی کی مسکراہٹ اور میرا پھٹا ہوا کوٹ!

شمی نے کوٹ کو خود ہی ایک طرف رکھ دیا۔ بولی "میں خود بھی اس کوٹ کی مرمت کرتے کرتے تھک گئی ہوں ..... اِسے مرمت کرنے میں اُس گیلے ایندھن کو جلانے کی طرح جان مارنی پڑتی ہے ..... آنکھیں دُکھنے لگتی ہیں .... آخر آپ اپنے کوٹ کے لئے کپڑا کیوں نہیں خریدتے؟"

میں کچھ دیر سوچتا رہا۔

یوں تو میں اپنے کوٹ کے لئے کپڑا خریدنا گناہ خیال کرتا تھا۔ مگر شمی کی آنکھیں! ..... اُن آنکھوں کو تکلیف سے بچانے کے لئے میں منگل سنگھ تو کیا تمام دنیا سے جنگ کرنے پر آمادہ ہو جاؤں۔ ورسٹڈ کے تھانوں کے تھان خرید لوں۔ نئے گرم کوٹ کے لئے کپڑا خریدنے کا خیال دل میں پیدا ہوا ہی تھا کہ پشپا مُنی بھاگتی ہوئی کہیں سے آ گئی۔ آتے ہی برآمدے میں ناچنے اور گانے لگی۔ اُس کی حرکات کتھاکلی مدرا سے زیادہ کیف انگیز تھیں۔

مجھے دیکھتے ہوئے پشپا منی نے اپنا ناچ اور گانا ختم کر دیا۔ بولی۔

"بابو جی ... آپ آ گئے ——— آج بڑی بہن جی (اُستانی) نے کہا تھا۔ میز پوش کے لئے دوسوتی لانا۔ اور گرم کپڑے پر کاٹ سکھائی جائے گی۔ گُنیا ماپ کے لئے اور گرم کپڑا ..."

چونکہ اس وقت میرے گرم کوٹ خریدنے کی بات ہو رہی تھی۔ شمی نے زور سے ایک چپت اُس کے منہ پر لگائی اور بولی۔

"اِس جنم جلی کو ہر وقت ..... ہر وقت کچھ نہ کچھ خریدنا ہی ہوتا ہے ..... مشکل سے انہیں کوٹ سلوانے پر راضی کر رہی ہوں ..."

——— وہ پشپا منی کا رونا اور میرا اپنا کوٹ!

میں نے خلافِ عادت اونچی آواز سے کہا "شمی"

شمی کانپ گئی۔ میں نے غصے سے آنکھیں لال کرتے ہوئے کہا۔ "میرے اس کوٹ کی مرمت کر دو ..... ابھی ..... کسی طرح کرو ..... ایسے جیسے رو پیٹ کر منگل سنگھ کی گیلی لکڑیاں جلا لیتی ہو ..... تمہاری آنکھیں! ہاں! یا آیا ..... دیکھو تو پشپا منی کیسے رو رہی ہے۔ پوپی بیٹا! اِدھر آؤ نا ..... اِدھر آؤ میری بچی۔ کیا کہا تھا تم نے! بولو تو ..... دوسوتی؟ گُنیا ماپ کے لئے اور کاٹ سیکھنے کو گرم کپڑا؟ ——— بچو ننھا بھی تو ٹرائسکل کا راگ الاپتا اور غبارے کے لئے مچلتا سو گیا ہو گا۔ اُسے غبارہ نہ لے دو گی تو میرا کوٹ سل جائے گا۔ ہے نا! ..... کتنا رویا ہو گا بے چارہ ..... شمی! کہاں ہے بچو؟

"جی سو رہا ہے ...." شمی نے سہمے ہوئے جواب دیا۔

"اگر میرے گرم کوٹ کے لئے تم ان معصوموں سے ایسا سلوک کرو گی۔ تو مجھے تمہاری آنکھوں کی پروا ہی کیا ہے"؟ پھر میں نے دل میں کہا۔ کیا یہ سب کچھ میرے گرم کوٹ کے لئے ہو رہا ہے۔ شمی سچی ہے یا میں سچا ہوں۔ پہلے میں نے کہا ——— دونوں .... مگر جو سچا ہوتا ہے۔ اُس کا ہاتھ ہمیشہ اوپر رہتا ہے۔ میں نے خود ہی دبتے ہوئے کہا۔

"تم خود بھی تو اُس دن کافوری رنگ کے بینا کار کانٹوں کے لئے

کہہ رہی تھیں ۔۔۔۔۔"

"ہاں ۔۔۔۔۔ جی ۔۔۔۔ کہہ تو رہی تھی مگر ۔۔۔۔"

مگر ۔۔۔۔۔ مگر اس وقت تو مجھے اپنے گرم کوٹ کی جیب میں دس روپے کا نوٹ ایک بڑا بھاری خزانہ معلوم ہو رہا تھا!

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

دوسرے دن شمی نے میرا کوٹ کہنیوں پر سے رفو کر دیا۔ ایک جگہ جہاں پر سے کپڑا بالکل اڑ گیا تھا۔ صفائی اور احتیاط سے کام لینے کے باوجود سلائی پر بدنما سلوٹیں پڑنے لگیں۔ اس وقت معراج الدین ٹیلر ماسٹر کی دکان کی دکان میرے ذہن میں گھومنے لگی۔ اور یہ میری تخئیل کی پختہ کاری تھی۔ میری تخئیل کی پختہ کاری اکثر مجھے مصیبت میں ڈالے رکھتی ہے۔ میں نے دل میں کہا "معراج الدین کی دکان پر ایسے سوٹ بھی تو ہوتے ہیں جن پر سلائی سمیت سو روپے سے بھی زیادہ لاگت آتی ہے ۔۔۔۔ میں ایک معمولی کلرک ہوں ۔۔۔۔۔ اس کی دکان میں لٹکے ہوئے سوٹوں کا تصور کرنا عبث ہے ۔۔۔۔ عبث ۔۔۔"

مجھے فرصت میں پا کر شمی میرے پاس آ بیٹھی اور ہم دونوں خریدی جانے والی چیزوں کی فہرست بنانے لگے ۔۔۔۔۔ جب ماں باپ اکٹھے ہوتے ہیں تو بچے بھی آ جاتے ہیں ۔۔۔۔ پشپا منی اور بچو آ گئے۔ آندھی اور بارش کی طرح شور مچاتے ہوئے۔

شمی کو خوش کرنے کے لئے نہیں بلکہ یوں ہی میں نے کافوری رنگ کے مینا کار کانٹے سب سے پہلے لکھے۔ اچانک رسوئی کی طرف میری نظر اٹھی۔ چولھے میں لکڑیاں دھڑ دھڑ جل رہی تھیں ۔۔۔۔۔ اور ادھر شمی کی آنکھیں بھی دو چمکتے ہوئے ستاروں کی طرح روشن تھیں۔ معلوم ہوا کہ منگل سنگھ گیلی لکڑیاں واپس لے گیا ہے۔

"وہ شہتوت کے ڈنڈے جل رہے ہیں۔ اور کھوکھا ۔۔۔۔ " شمی نے کہا۔

"اور اوپلے"

"جی ہاں، اوپلے بھی ۔۔۔"

"منگل سنگھ دیوتا ہے ۔۔۔۔۔ شاید میں بھی عنقریب گرم کوٹ کے لئے اچھا سا ورسٹڈ خرید لوں۔ تاکہ تمہاری آنکھیں یونہی چمکتی رہیں۔ انہیں تکلیف نہ ہو ——— اس ماہ کی تنخواہ میں تو گنجائش نہیں ۔۔۔۔ اگلے ماہ ضرور ۔۔۔۔ ضرور ۔۔۔۔"

"جی ہاں، جب سردی گذر جائے گی ۔۔۔"

پشپا منی نے کئی چیزیں لکھائیں دو سوتی، گنیا ماپ کے لئے گرم بلیزر، سبز رنگ کا ایک گز مربع، ڈی ایم سی کے گولے، گوٹے کی منغزی ——— اور امرتیاں اور بہت سے گلاب جامن ۔۔۔۔ مونی نے سب کچھ ہی تو لکھوا دیا۔ مجھے دائمی قبض تھی۔ میں چاہتا تھا کہ یونانی دوا خانہ سے اطریفل زمانی کا ایک ڈبہ بھی لا رکھوں۔ دودھ کے ساتھ تھوڑا سا پی کر سو جایا کروں گا۔ مگر مونی پشپا نے اس کے لئے گنجائش ہی کہاں رکھی تھی اور جب پشپا منی نے کہا "گلاب جامن" تو اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ میں نے کہا سب سے ضروری چیز تو یہی ہے ۔۔۔۔۔ شہر سے واپس آنے پر میں گلاب جامن وہاں چھپا دوں گا۔ جہاں سیڑھیوں میں باہر جمعدار اپنا دودھ کا کلسہ رکھ دیا کرتا ہے اور پشپا منی سے کہوں گا کہیں تو لانا ہی بھول گیا۔ تمہارے لئے گلاب جامن ۔۔۔۔۔ اوہو ۔۔۔۔ اس وقت اس کے منہ میں پھر پانی بھر آئے گا۔ اور گلاب جامن نہ پا کر اس کی عجیب کیفیت ہوگی۔

پھر میں نے سوچا۔ بچو بھی تو صبح سے غبارے اور ٹرائسکل کے لئے ضد کر رہا تھا۔ میں نے ایک مرتبہ اپنے آپ سے سوال کیا۔ "اطریفل زمانی؟" شمی بچو کو پچکارتے ہوئے کہہ رہی تھی "بچو بیٹے کو ٹرائسکل لے دوں گی اگلے مہینے ۔۔۔۔ بچو بیٹا سارا دن چلایا کرے گی۔ ٹرائسکل ۔۔۔ پوپی منا کچھ نہیں لے گا ۔۔۔۔"

"بچو چلایا کرے گی اور پوپی منا نہیں لے گا!"

——— اور میں نے شمی کی آنکھوں کی قسم کھائی کہ جب تک ٹرائسکل کے لئے چھ سات روپے جیب میں نہ ہوں۔ میں نیلے گنبد کے بازار سے نہیں گذروں گا۔ اس لئے کہ دام نہ ہونے کی صورت میں نیلے گنبد سے گذرنا بہت معیوب ہے۔ خواہ مخواہ اپنے آپ پر غصہ آئے گا۔ اپنی ذات سے نفرت پیدا ہوگی۔

اس وقت شمی بلجیمی آئینے کی بیضوی ٹکڑی کے سامنے اپنے کافوری سپید سوٹ میں کھڑی تھی۔ میں چپکے سے اس کے پیچھے جا کھڑا ہوا اور کہنے لگا "میں بتاؤں تم اس وقت کیا سوچ رہی ہو؟"

"بتاؤ تو جانوں ۔۔۔۔"

"تم کہہ رہی ہو۔ کافوری سپید سوٹ کے ساتھ وہ کافوری رنگ کے مینا کار کانٹے پہن کر ضلع دار کی بیوی کے ہاں جاؤں تو دنگ رہ جائے ۔۔!"

"نہیں تو" شمی نے ہنستے ہوئے کہا "آپ میری آنکھوں کی تعریف
کرتے ہیں۔ میں نے کہا دیکھوں تو ان میں کیا دھرا ہے ..... سچی بات
تو یہ ہے کہ اگر آپ سچ مچ میری آنکھوں کے مداح ہوتے تو کبھی کا گرم..."
میں نے شمی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ میری تمام خوشی بے بسی میں بدل
گئی۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ "بس .... ادھر دیکھو ......
.... اگلے مہینے — ضرور خرید لوں گا ...."

"جی ہاں، جب سردی ...."

— پھر میں اپنی اس حسین دنیا کو جس کی تخلیق پر محض دس
روپے صرف ہوئے تھے۔ تصور میں بسائے بازار چلا گیا۔

. . . .

میرے سوا انارکلی میں سے گذرنے والے ہر ذی عزت آدمی
نے گرم سوٹ پہن رکھا تھا۔ لاہور کے ایک لحیم وشحیم جنٹلمین کی گردن لحمانی
اور سخت بدلیشی کالر کی وجہ سے میرے چھوٹے بھائی کے پالتو "بل ڈاگ
ٹائیگر" کی گردن کی طرح اکڑی ہوئی تھی۔ میں نے ان سوٹوں کی طرف
دیکھتے ہوئے کہا۔

"لوگ سچ مچ بہت مفلس ہو گئے ہیں ..... اس مہینے نامعلوم
کتنے ٹن سونا اور چاندی ہمارے ملک سے باہر چلا گیا ہے۔" کانٹوں کی
دکان پر میں نے کئی جوڑیاں کانٹے دیکھے۔ اپنی تخئیل کی پختہ کاری سے
میں شمی کی کافوری سپید سوٹ میں ملبوس ذہنی تصویر کو کانٹے پہنا کر پسند
یا ناپسند کر لیتا ..... کافوری سپید سوٹ .... کافوری مینا کار
کانٹے ..... کثرت اقسام کے باعث ان میں سے میں ایک بھی
منتخب نہ کرسکا۔

اس وقت بازار میں مجھے یزدانی مل گیا۔ وہ تفریح کلب سے
جو در اصل بریل کلب تھی، پندرہ روپے جیت کر آیا تھا۔ اس کے
چہرے پر اگر سرخی اور بشاشت کی لہریں دکھائی دیتی تھیں تو کچھ تعجب کی بات
نہ تھی۔ میں ایک ہاتھ سے اپنی جیب کی سلوٹوں کو چھپانے لگا۔ نچلی بائیں جیب پر
ایک روپے کے برابر کوٹ سے ملتے ہوئے رنگ کا کپڑا بہت ہی ناموزوں
دکھائی دے رہا تھا ...... میں اسے بھی ایک ہاتھ سے چھپاتا رہا۔ پھر میں
نے دل میں کہا۔ کیا عجب یزدانی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھنے سے
پہلے میری جیب پر کی سلوٹیں اور روپے برابر کوٹ کے رنگ کا پیوند دیکھ
لیا ہو ..... اس کا بھی رد عمل شروع ہوا اور میں نے دلیری سے کہا۔

"مجھے کیا پروا ہے ...... یزدانی مجھے کون سی تحصیل بخش دے گا۔
اور اس میں بات ہی کیا ہے۔ یزدانی اور سنتا سنگھ نے بارہا مجھ
سے کہا ہے کہ وہ رفعت ذہنی کی زیادہ پروا کرتے ہیں اور ورسٹڈ کی کم۔"
مجھ سے کوئی پوچھے۔ میں ورسٹڈ کی زیادہ پروا کرتا ہوں اور رفعت
ذہنی کی کم!

یزدانی رخصت ہوا اور جب تک وہ نظر سے اوجھل نہ ہو گیا میں
غور سے اس کے کوٹ کے نفیس ورسٹڈ کو پشت کی جانب سے دیکھتا رہا۔

پھر میں نے سوچا کہ سب سے پہلے مجھے پشپا منی کے لئے گلاب
جامن اور امرتیاں خریدنی چاہئیں کہیں واپسی پر سچ مچ بھول ہی نہ جاؤں
گھر پہنچ کر انہیں چھپانے سے خوب تماشا رہے گا۔ مٹھائی کی دکان پر
کھولتے ہوئے روغن میں کچوریاں خوب پھول رہی تھیں۔ میرے منہ میں
پانی آ گیا۔ اس طرح جیسے گلاب جامن کے تخیل سے پشپامنی کے منہ
میں پانی بھر آیا تھا۔ قبض اور اطریفل زمانی کے باوجود میں سفید پتھر کی میز پر
کہنیاں ٹکا کر بہت رغبت سے کچوریاں کھانے لگا .....

ہاتھ دھونے کے بعد جب پیسوں کے لئے جیب ٹٹولی تو اس
میں کچھ بھی نہ تھا۔ دس کا نوٹ کہیں گر گیا تھا!

. . . .

کوٹ کی اندرونی جیب میں ایک بڑا سا سوراخ ہو رہا تھا۔
نقلی ریشم کو ٹڈیاں چاٹ گئی تھیں۔ جیب میں ہاتھ ڈالنے پر اس جگہ
جہاں مرانجا مرانجا اینڈ کو کا لیبل لگا ہوا تھا۔ میرا ہاتھ باہر نکل آیا۔ نوٹ
وہیں سے باہر گر گیا ہوگا۔

ایک لمحہ میں میں یوں دکھائی دینے لگا۔ جیسے کوئی بھولی سی
بھیڑ اپنی خوبصورت پشم اتر جانے پر دکھائی دینے لگتی ہے۔

حلوائی بھانپ گیا۔ خود ہی بولا۔

"کوئی بات نہیں بابوجی ..... پیسے کل آ جائیں گے۔"

میں کچھ نہ بولا ..... کچھ بول ہی نہ سکا۔

صرف اظہار تشکر کے لئے میں نے حلوائی کی طرف دیکھا۔ حلوائی
کے پاس ہی گلاب جامن چاشنی میں ڈوبے پڑے تھے۔ روغن
میں پھولتی ہوئی کچوریوں کے دھوئیں میں سے آتشیں سرخ امرتیاں
جگر پر داغ لگا رہی تھیں ..... اور ذہن میں پشپامنی کی دھندلی
سی تصویر پیدا ہو گئی تھی۔

میں وہاں سے بادامی باغ کی طرف چل دیا اور آدھ پون گھنٹہ کے قریب بادامی باغ کی ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔ اس عرصہ میں جنکشن کی طرف سے ایک مال گاڑی آئی۔ اس کے پانچ منٹ بعد ایک شنٹ اکرتا ہوا انجن جس میں سے دہکتے ہوئے سُرخ کوئلے لائن پر گر رہے تھے —— مگر اُس وقت قریب ہی کی سالٹ ریفائنری میں سے بہت سے مزدور اوور ٹائم لگا کر واپس لوٹ رہے تھے ....

میں لائن کے ساتھ ساتھ دریا کے پُل کی طرف چل دیا۔ چاندنی رات میں سردی کے باوجود کالج کے چند منچلے نوجوان کشتی چلا رہے تھے۔

"قدرت نے عجیب سزا دی ہے مجھے" میں نے کہا۔ "پشپامنی کے لئے گوٹے کی مغزی، دوسوتی، گلاب جامن اور شمی کے لئے کافوری مینا کار کانٹے خریدنے سے بھی بڑھ کر کوئی گناہ سرزد ہو سکتا ہے۔ کس بے رحمی اور بے دردی سے میری ایک حسین مگر بہت سستی دنیا برباد کر دی گئی ہے ..... جی تو چاہتا ہے کہ میں بھی قدرت کا ایک شاہکار توڑ پھوڑ کر رکھ دوں مزا آجائے ..... مزا ....."

—— مگر پانی میں کشتی ران لڑکا کہہ رہا تھا۔

"اس موسم میں تو راوی کا پانی گھٹنے گھٹنے سے زیادہ کہیں نہیں ہوتا"

"سارا پانی تو اوپر سے اپر باری دوآب لے لیتی ہے .... اور یوں بھی آج کل پہاڑوں پر برف نہیں پگھلتی" ..... تو دوسرے نے کہا۔

میں ناچار گھر کی طرف لوٹا اور نہایت بے دلی سے زنجیر ہلائی۔

میری خواہش اور اندازے کے مطابق پشپامنی اور بچو ننھا بہت دیر ہوئی دہلیز پر سے اٹھ کر بستروں میں جا سوئے تھے۔ شمی چولھے کے پاس شہتوت کے نیم جان کوئلوں کو تاپتی ہوئی کئی مرتبہ اونگھی اور کئی مرتبہ چونکی تھی۔ وہ مجھے خالی ہاتھ دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ اسی کے سامنے میں نے چور جیب کے اندر ہاتھ ڈالا اور لیبل کے نیچے سے نکال لیا۔ شمی سب کچھ سمجھ گئی۔ وہ کچھ نہ بولی ..... کچھ بول ہی نہ سکی۔

میں نے کوٹ کھونٹی سے لٹکا دیا۔ میرے پاس ہی دیوار کا سہارا لے کر شمی بیٹھ گئی اور ہم دونوں سوتے ہوئے بچوں اور کھونٹی پر لٹکتے ہوئے گرم کوٹ کو دیکھنے لگے۔

اگر شمی نے میرا انتظار کئے بغیر وہ کافوری سوٹ بدل دیا ہوتا۔ تو شاید میری حالت اتنی متغیر نہ ہوتی!

. . . .

یزدانی اور سنتا سنگھ تفریح کلب میں برِج کھیل رہے تھے۔ انہوں نے دو دو، تین تین گھونٹ پی بھی رکھی تھی۔ مجھ سے بھی پینے کے لئے اصرار کرنے لگے۔ مگر میں نے انکار کر دیا۔ اس لئے کہ میری جیب میں دام نہ تھے۔ سنتا سنگھ نے اپنی طرف سے ایک آدھ گھونٹ زبردستی مجھے بھی پلا دیا۔ شاید اس لئے کہ وہ جان گئے تھے کہ اس کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ یا شاید اس لئے کہ وہ رفعت ذہنی کی ورسٹڈ سے زیادہ پرواہ کرتے تھے۔

اگر گھر میں اُس دن شمی کو وہی کافوری سپید سوٹ پہنے ہوئے دیکھ کر نہ آتا تو شاید برِج میں قسمت آزمائی کرنے کو میرا جی بھی نہ چاہتا۔ میں نے کہا۔ کاش! میری جیب میں ایک دو روپے ہوتے تو کیا عجب تھا کہ میں بہت سے روپے بنا لیتا —— مگر میری جیب میں کل پونے چار آنے تھے۔

یزدانی اور سنتا سنگھ نہایت عمدہ ورسٹڈ کے سوٹ پہنے نیک عالم کلب کے سیکرٹری سے جھگڑ رہے تھے۔ نیک عالم کہہ رہا تھا کہ وہ تفریح کلب کو برِج کلب اور مے خانہ بنتے ہوئے کبھی نہیں دیکھ سکتا اُس وقت میں نے ایک مایوس آدمی کے مخصوص انداز میں جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اور کہا۔ "بیوی بچوں کے لئے کچھ خریدنا قدرت کے نزدیک گناہ ہے۔ اس حساب سے برِج کھیلنے کے لئے تو اُسے اپنی گرہ سے دام دے دینے چاہئیں ..... ہی ..... ہی ہی ....."

اندرونی کیسہ ..... بائیں نچلی جیب ..... کوٹ میں پشت کی طرف مجھے کوئی کاغذ سرکتا ہوا معلوم ہُوا۔ اُسے سرکاتے ہوئے میں نے دائیں جیب کے سوراخ کے نزدیک جا نکالا۔

—— وہ دس روپے کا نوٹ تھا جو اُس دن اندرونی جیب کی تہ کے سوراخ میں سے گذر کر کوٹ کے اندر ہی اندر گم ہو گیا تھا!

. . . .

اُس دن میں نے قدرت سے انتقام لیا۔ میں اُس کی خواہش کے مطابق برِج وِرِج نہ کھیلا۔ نوٹ کو مٹھی میں دبائے گھر کی طرف بھاگا۔ اگر اُس دن میرا انتظار کئے بغیر شمی نے وہ کافوری سوٹ بدل دیا ہوتا۔ تو میں خوشی سے یوں دیوانہ کبھی نہ ہوتا۔

ہاں، پھر چلنے لگا وہی تخیل کا دور۔ گویا ایک حسین سے حسین دنیا

کی تخلیق میں دس روپے سے اوپر ایک دمڑی بھی خرچ نہیں آتی۔ جب میں بہت سی چیزوں کی فہرست بنا رہا تھا۔ شمی نے میرے ہاتھ سے کاغذ چھین کر پرزے پرزے کر دیا اور بولی۔

"اتنے قلعے مت بنائیے ..... پھر نوٹ کو نظر لگ جائے گی۔"

"شمی ٹھیک کہتی ہے" میں نے سوچتے ہوئے کہا۔ "نہ تخیل اتنا رنگین ہو اور نہ محرومی سے اتنا دکھ پہنچے۔"

پھر میں نے کہا۔ "ایک بات ہے شمی! مجھے ڈر ہے کہ نوٹ پھر کہیں مجھ سے گم نہ ہو جائے ..... تمہاری کھیمو (پڑوسن) بازار جا رہی ہے۔ اس کے ساتھ جا کر تم یہ سب چیزیں خود ہی خرید لاؤ..... کافوری مینا کا کانٹے ..... ڈی ایم سی کے گولے، مغزی ..... اور دیکھو پوپی منا کے لئے گلاب جامن ضرور لانا ..... ضرور ....."

شمی نے کھیمو کے ساتھ جانا منظور کر لیا اور اُس شام شمی نے کشمیرے کا ایک نہایت عمدہ سوٹ پہنا۔ میں نے دل میں کہا۔

"شاید اب شمی اپنی مفلسی کو شدید طور پر محسوس کرنے لگی ہے ..... وہ حقیقت کے عریاں جسم پر ایک خوبصورت کپڑا ڈال کر اُسے چھپا دینا چاہتی ہے ..... انسان کو کپڑے پہننے کی ضرورت بھی تو اسی وقت محسوس ہوئی تھی۔ جب وہ اپنے خوب صورت جسم کو گناہ کے بعد آلودہ اور مکروہ بنا چکا تھا ..... اور وہ چاہتا تھا کہ حقیقت کو چھپائے ..... وہ پتے وہ کپڑے ....."

پھر میں نے کہا۔ "نا معلوم اب تک کے ٹن سونا ہندوستان سے باہر جا چکا ہوگا۔"

بچوں کے شور و غوغا سے میری طبیعت بہت گھبراتی ہے۔ مگر اس دن میں عرصہ تک بچو ننھے کو اُس کی ماں کی غیر حاضری میں بہلاتا رہا۔ وہ رسوئی میں ایندھن کی کوٹھڑی، غسل خانے، ہم چھت پر — سب جگہ اُسے ڈھونڈتا پھرا۔ میں نے اُسے پچکارتے ہوئے کہا۔

"وہ ٹرائسکل لینے گئی ہے ..... نہیں جانے دو۔ ٹرائسکل گندی چیز ہوتی ہے۔ اخ تھو ..... غبارہ لائے گی بی بی تمہارے لئے بہت خوبصورت غبارہ ....."

"بچو بیٹی" نے میرے سامنے تھوک دیا۔ بولی "اے ..... اِی ..... گندی۔"

میں نے کہا۔ "کوئی دیکھے تو ..... کیسا بیٹیوں جیسا بیٹا ہے۔"

پشپا منی کو بھی میں نے گود میں لے لیا اور کہا۔ "پوپی منا ..... آج گلاب جامن جی بھر کر کھائے گا نا! ....."

اُس کے مُنہ میں پانی بھر آیا۔ وہ گودی سے اُتر پڑی بولی۔ "ایسا معلوم ہوتا ہے ..... جیسے ایک بڑا سا گلاب جامن کھا رہی ہوں۔"

بچو روتا رہا۔ پشپا منی کتھا کلی مدراسے زیادہ حسین ناچ برآمدے میں ناچتی رہی۔

مجھے میرے تخیل کی پرواز سے کون روک سکتا تھا۔ کہیں میرے تخیل کے قلعے زمین پر نہ آ رہیں۔ اسی ڈر سے تو میں نے شمی کو بازار بھیجا تھا۔ میں سوچ رہا تھا۔ شمی اب گھوڑے ہسپتال کے قریب پہنچ چکی ہوگی ..... اب کالج روڈ کی نکر پر ہوگی ..... اب گندے انجن کے پاس .....

اور ایک نہایت دھیمے انداز سے زنجیر ہلی۔

شمی سچ مچ آ گئی تھی۔ دروازے پر۔

شمی اندر آتے ہوئے بولی "میں نے دو روپے کھیمو سے اُدھار لے کر بھی خرچ کر ڈالے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں" میں نے کہا۔

پھر بچو، پوپی منا اور میں تینوں شمی کے آگے پیچھے گھومنے لگے۔

مگر شمی کے ہاتھ میں ایک بنڈل کے سوا کچھ نہ تھا۔ اُس نے میز پر بنڈل کھولا .....

— وہ میرے کوٹ کے لئے بہت نفیس ورسٹڈ تھا!

پشپا منی نے کہا۔ "بی بی میرے گلاب جامن ....."

شمی نے زور سے ایک چپت اس کے منہ پر لگا دی!

راجندر سنگھ بیدی

غزل

محبت کی سزا ہے اور میں ہوں وہی میری خطا ہے اور میں ہوں

نہیں معلوم کیا دنیا نے سمجھا فسانہ آپ کا ہے اور میں ہوں

تلاشِ دوست ہو منزل سے پیدا فریبِ مدعا ہے اور میں ہوں

ترے غم کا دیا سب کچھ ہے لیکن خیالِ ماسوا ہے اور میں ہوں

محبت اور جوانی کی محبت جنونِ شعلہ زا ہے اور میں ہوں

عجب انداز ہیں عشق و جنوں کے زمانے کی ہوا ہے اور میں ہوں

نظرؔ جاں دے کے شاید بچ سکے دل

کسی کا سامنا ہے اور میں ہوں

قیوم نظر

سلمیٰ کی اچانک جدائی پر

ابھی چھیڑا تھا میں نے بربطِ بے تابِ ہستی کو
ابھی تو نے دیا تھا درسِ رفعت میری پستی کو

ابھی تاریک دنیا ہو چلی تھی میری نورانی
ابھی ہر ذرّۂ دل ہو چلا تھا میرا رومانی

ابھی تکمیل کو پہنچا نہ تھا افسانۂ ہستی
ابھی بسنے نہ پائی تھی مری اُمید کی بستی

ابھی کل ہی تو تم نے ساغرِ الفت پلایا تھا
ابھی کل ہی تو تم نے مجھ کو دیوانہ بنایا تھا

نہ رخصت ہو مری سلمیٰ ابھی مجھ سے نہ رخصت ہو

ابھی آراستہ کی تھی محبت کی جبیں میں نے
سنواری تھی ابھی قسمت کی زلفِ عنبریں میں نے

تبسم آ رہا تھا پہلے پہلے میرے ہونٹوں پر
ترنم کھیلتا تھا پہلے پہلے میرے ہونٹوں پر

ابھی فصلِ بہاری میرے کاشانے میں آئی تھی
ابھی موجِ مسرت میرے غم خانے میں آئی تھی

ابھی بادِ صبا نے گدگدایا تھا گلستاں کو
ابھی نکلی تھی نکہت چھوڑ کر پھولوں کے داماں کو

نہ رخصت ہو مری سلمیٰ ابھی مجھ سے نہ رخصت ہو

مری اُمید کی دنیا تجھے کیوں کر بھلا دوں میں
بہاروں کو خزاں کی گود میں کیوں کر سلا دوں میں

ملا دوں خاک میں کیوں کر جوانی کی بہاروں کو
مسل کر پھینک دوں کیوں کر تمناؤں کے ہاروں کو

ابھی میں اپنی بربادی کا ماتم کر نہیں سکتا
ابھی شیرازۂ ہستی کو برہم کر نہیں سکتا

ربابِ غم کے تاروں کو ابھی بجنے نہ دوں گا میں
خزاں کی بزمِ ماتم کو ابھی سجنے نہ دوں گا میں

نہ رخصت ہو مری سلمیٰ ابھی مجھ سے نہ رخصت ہو

افق سے جھانکتا ہے مہر ابھی صبحِ مسرت کا
پیا ہے ایک ہی جرعہ ابھی صہبائے الفت کا

ابھی دنیائے عقل و ہوش پر مستی نہیں چھائی
ابھی لی ہی نہیں تم نے مری باہوں میں انگڑائی

ابھی تو کھیلنا ہے حسن کو گستاخ نظروں میں
ابھی تو جذب کرنا ہے مری نظروں کو جلووں میں

ابھی فرقت کے نغمے کو رہینِ ساز رہنے دے
نیازوں کے لئے وا بارگاہِ ناز رہنے دے

نہ رخصت ہو مری سلمیٰ ابھی مجھ سے نہ رخصت ہو

علی احمد

شیلے کی موت

مجھے او بھولنے والے!
میں جب سو جاؤں گہری نیند۔
تو تم مسکراؤ گے؟ نہیں! آنسو بہاؤ گے؟ ——
مگر اس سرد لاشہ کو
پڑا ہوگا جو تختے پر
کوئی پروا نہ ہوگی آنسوؤں کی، مسکراہٹ کی۔
یہ کیا سرگوشیاں ہیں؟
الوداع! اے باعثِ راحت
یہ زہر آلود ہنسا ہے!
یہ زہر آلود آنسو ہیں!

کبھی اے نیند!
گر تو موت کی مانند ہو جاتی ——
سدا خاموش ہو رہتی
تو میں یہ درد سے لبریز آنکھیں بند کر لیتا۔
کبھی پھر کھولتا؟ ہرگز نہیں۔
لو الوداع لوگو!
سنو اس بانگ رحلت کو،
سنو یہ کہہ رہی ہے . . .
اب جدائی ہونے والی ہے،
فسردہ اور پریشاں دل
بچھڑ جائیں گے حسرت میں۔

شیلے

کاسا میگنی نامی سفید عالی شان محل عین سمندر کے کنارے واقع تھا۔ اطالوی سمندر کی نیلی نیلی لہریں بعض اوقات خود بخود آ کر محل کے مرمریں فرش کو دھو جایا کرتی تھیں۔ جواں سال شیلے اپنی حسین بیوی مریم اور اس کی بہن جین کے ہمراہ اس میں مقیم تھا۔ یہ دونوں مشہور فلاسفر اور مفکر گاڈون کی لڑکیاں تھیں۔ جین کا خاوند اور ننھے ننھے بچے بھی ہمراہ تھے۔ پیغمبر جذبات شیلے کو قصر کا محل وقوع بہت مرغوب تھا۔ سمندر کا کنارا، انتہائی عقبی جنگلات، چٹانیں اور سرسبز خلیجیں اور ماہی گیروں کی جھونپڑیاں —— یہ سب کچھ مل کر ایک انتہائی طور پر حساس دل اور نازک فکر شاعر کے دل و دماغ کو مسحور کئے رکھتی تھیں۔ اس کا ہم وطن شاعر لارڈ بائرن قریب ہی قصبہ پیسا میں رہتا تھا۔ شیلے کے لئے کاسا میگنی دنیا بھر کی مسرتوں کا گہوارہ تھا۔ وہ اکثر اوقات اپنی تفریحی کشتی "ایریل" میں سمندر کے کنارے کنارے دور تک چلا جاتا تھا۔ ایک شام کو وہ کشتی کو محل سے نکال کر سیر کے لئے جانے لگا۔ سامنے ساحل کی ریت پر جین اپنے دو معصوم بچوں کے ہمراہ بیٹھی تھی —— "چلو ذرا سیر کر آئیں"۔ جواں سال حسینہ اور اس کے دونوں بچے کشتی کے فرش پر بیٹھ گئے۔ ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا آیا اور ناؤ چل نکلی۔ جین کا خیال تھا کہ شیلے ساحل کے ساتھ ساتھ جائے گا مگر وہ ایک حسین عورت کو فن کشتی رانی پر اپنا عبور دکھانے کی غرض سے چپوؤں پر جھک گیا۔ کشتی بہت جلد وسیع سمندر کی لہروں میں تھی۔ یکایک شاعر نے چپو چھوڑ دئیے اور کسی گہرے خیال میں گم ہو گیا۔ جین حواس باختہ ہونے لگی۔ دور تک کوئی دوسری کشتی دکھائی نہ دیتی تھی۔ ساحل آنکھوں سے اوجھل ہوا جا رہا تھا اور شاعر تخیلات میں محو تھا۔ اس نے بہت کچھ کہا مگر اسے کوئی جواب نہ ملا۔

پھر یک دم شاعر نے اپنا سر اٹھایا۔ اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔ وہ مسکرایا اور بولا:۔

آؤ اب ہم مل کر کائنات کے عظیم الشان معمہ کو حل کریں۔

جین کا جی چاہتا تھا کہ زور زور سے چیخے۔ مگر اسے بچوں کا خوف

تھا کہ کہیں ہراساں نہ ہو جائیں۔ اس نے جلد جلد کہا۔

"نہیں نہیں۔ ابھی نہیں۔ پہلے گھر لوٹ کر کھانا تو کھا لیں ۔ ۔ ۔ ۔ ایڈورڈ ساحل پر آیا ہوگا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ ہمارے اس وقت باہر نکلنے پر حیران ہوگا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور ایڈورڈ کہتا تھا یہ ناؤ محفوظ نہیں ہے"۔

محفوظ نہیں!" شاعر چلایا۔ "کہو تو میں خلیج کے اس پار لیگھارن تک اسی میں چلا جاؤں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اچھا تم کچھ گا کر سناؤ۔ میں واپس مڑتا ہوں"۔

جوں ہی کنارا قریب آیا جین نے بچے سنبھالے اور اس زور سے باہر کودی کہ کشتی کا بیرونی تختہ الٹ گیا۔ شاعر اس کے نیچے دب گیا۔ پھر وہ تختہ کمر پر لئے یوں اٹھا جیسے کوئی کیکڑا خالی گھونگے میں سے باہر نکلے۔ جین کا خاوند ایڈورڈ ولیمس ساحل پر کھڑا تھا۔ "جین تم دیوانی ہو"۔ وہ تحیر زدہ ہو کر چلایا۔ "ایک منٹ اور صبر کرتیں تو ہم کشتی کو آرام سے اوپر کھینچ لیتے"۔

"نہیں صاحب۔ میں تو بد قسمتی کے چنگل سے بچ نکلی۔ اس تابوت میں پھر قدم نہ رکھوں گی۔ کائنات کے معمہ کو حل کریں۔ کیوں وہ تو خود سب سے بڑا معمہ ہے۔ اس کی حرکات کون سمجھے! وہ تو اس چیز کی تلاش میں ہے جس کا ہم سب سے زیادہ خوف رکھتے ہیں۔ موت۔ میں تو کہوں گی کہ ہم یہاں سے چلے جائیں۔ میرا خوف کبھی دور نہیں ہوگا"۔

——— مگر شاعر کا چہرہ حسبِ معمول کھلا ہوا، بشاش اور روشن تھا ———

گرمیوں کے اس موسم میں وہ چاندنی راتوں میں مریم کے ہمراہ اسی طرح سمندر کی سیر کرنے کا عادی تھا۔ مریم کا سر شاعر کے گھٹنوں پر ہوتا اور وہ وسیع کائنات کے سربستہ رازوں کے متعلق غور کیا کرتا۔ کبھی کبھی جین ستار پر کسی ہندوستانی نغمے کی لے چھیڑ دیتی اور شیلے ماہِ جون کے گہرے اودے آسمان کی طرف دیکھتا رہتا جہاں چاند اپنی روپہلی کرنیں چاروں طرف بکھیرے ہوتا۔ اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ جنت کی مشکبیں اور مترنم لہروں پر تیر رہا ہو۔ وہ کسی اور ہی دنیا میں پہنچ جاتا جو حقیقی اور غیر فانی تھی اور جس کی فضا پر کسی پرکیف نغمہ کی روح بسیط تھی۔ نسوانی رشک و بغض، دام و درم کے تقاضے اور سیاسی الجھنیں اس دنیا کے ادنیٰ سے ادنیٰ گوشہ کو بھی چھو نہیں سکتی تھیں۔ شاعر انہی فضاؤں میں گم ہو جانے کی تمنا رکھتا تھا۔

ایک دفعہ شیلے اپنے ایک دوست مشہور ادیب اور شاعر لیہ ہنٹ سے ملنے لیگھارن گیا۔ ہنٹ بائرن کے ساتھ مل کر کوئی رسالہ جاری کرنا چاہتا تھا۔ شیلے کو بھی مشورہ کی غرض سے بلایا گیا تھا۔ ولیمس اور شیلے کا ایک اور رفیق ٹریلانی بھی وہیں تھا۔ یہ جولائی ۱۸۲۲ء کا ذکر ہے۔ شیلے اس وقت اپنی عمر کے تیسویں سال میں تھا۔ گرمی انتہائی طور پر شدید تھی۔ کسانوں نے دس بجے سے پانچ بجے تک کھیتوں میں کام کرنا چھوڑ رکھا تھا۔ بارش کی سخت قلت تھی۔ اور پادریوں کا جم غفیر اصنام کے گرد بیٹھ کر بارش کے لئے محو دعا تھا۔ آٹھ تاریخ کی صبح کو شیلے اپنے گھر کے لئے کچھ اشیا خرید کر واپس جانے کی تیاری کرنے لگا۔ یکایک بادل امنڈ آئے اور ہلکی ہلکی ہوا چلنے لگی۔ رابرٹس نامی ایک کپتان نے طوفان کی پیش گوئی کی مگر شیلے کا خیال تھا کہ وہ چھ سات گھنٹوں میں گھر پہنچ جائیں گے۔

دوپہر کو شیلے۔ ولیمس اور ان کا ایک اور دوست "ایریل" پر سوار ہوئے اور اپنے محل کی جانب روانہ ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد ٹریلانی جو ساحل پر کھڑا ایریل کو دیکھ رہا تھا بولا۔ "خدا خیر کرے۔ وہ سیاہ سیاہ سی آسمانی لکیریں اور میلے میلے بادل کے لکے بالکل ان کے سر پر ہیں اور یہ سطح آب پر دھواں سا کیسا ہے! شیطان آمادۂ شرارت معلوم ہوتا ہے"۔

کپتان رابرٹس بھی کشتی کو بڑھتے دیکھ رہا تھا۔ جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گئی تو وہ اجازت حاصل کر کے روشنی کے مینار پر چڑھ گیا۔ جہاں سے وہ دس میل تک کشتی کو دیکھ سکتا تھا۔ طوفان کشتی کا تعاقب کر رہا تھا۔ یہاں تک کہ کشتی اس طوفان میں چھپ گئی۔ شیلے غالباً اس وقت تخیلات کی اس غیر فانی دنیا کا تماشا کرنے میں محو تھا جس میں ہمیشہ کے لئے بسنے کی اسے آرزو تھی۔ بیس منٹ کے بعد طوفان فرو ہو گیا۔ ٹریلانی اور کپتان سراسیمہ ہو کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے مگر کشتی کہیں دکھائی نہیں دیتی تھی۔

اس وقت خلیج کی دوسری جانب ساحل پر دو عورتیں متفکر کھڑی تھیں۔ مریم سخت بے چین اور پژمردہ تھی۔ شدید گرمی سے وہ بد حال تھیں۔ چند سال پہلے اسی قسم کی گرمی میں ننھا ولیم ان کو داغ جدائی دے گیا تھا۔ مریم نے اپنے بچے کو چھاتی سے لگا لیا اور سہم گئی۔ معصوم بچہ

ہشاش بشاش تھا۔ اور وسیع سمندر کی طرف ٹکٹکی باندھے تھا مریم کی آنکھوں میں نہ جانے کیوں آنسو بھر آئے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جب وہ ۔ جب میرا شیلے واپس آئے گا تو میرا تمام خوف دور ہو جائے گا۔ وہی میری تسکین ہے ۔ ۔ ۔ ۔"

یہ سوموار کا دن تھا منگل کو تمام دن بارش ہوتی رہی۔ بدھ کو مطلع صاف تھا اور لیگھارن کی طرف سے ہوا آرہی تھی۔ کئی چھوٹی چھوٹی کشتیاں اس طرف سے پہنچیں۔ ایک ملاح نے بتایا کہ "ایریل" سوموار کو لیگھارن سے آ گئی تھی۔ مگر مریم اور جین نے اس کی بات پر یقین نہ کیا۔ جمعرات کے دن بھی ہلکی ہلکی موافق ہوا چل رہی تھی اور دونوں عورتیں محل کے بالائی کمرے میں بیٹھی سمندر کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ ہر لمحہ انہیں امید ہوتی۔ اب بھی ایریل کے لمبے لمبے بادبان دکھائی دیئے۔ اب بھی دکھائی دیئے۔ وہ نصف شب تک وہیں محو انتظار رہیں۔ پھر ان کے دلوں میں غم پیدا ہونے لگا کہ بیماری یا کسی اور سبب نے انہیں اتنی دیر تک لیگھارن سے نکلنے نہیں دیا جین نے ارادہ کر لیا کہ وہ صبح ہوتے ہی کسی کشتی میں لیگھارن پہنچے گی۔ مگر جب دن چڑھا تو سمندر متلاطم تھا اور مخالف ہوا چل رہی تھی۔ کوئی بھی ملاح اس طرف جانے کو آمادہ نہ ہوا۔

دوپہر کو ڈاک آئی ایک خط ہنٹ کی طرف سے شیلے کے نام تھا۔ مریم نے کانپتے ہاتھوں سے اسے کھولا۔ ہنٹ لکھتا تھا "براہ کرم لکھئے کہ گھر کیسے پہنچے۔ کیونکہ سوموار کو جب آپ یہاں سے روانہ ہوئے تھے موسم خراب تھا۔ ہم سخت تشویش میں ہیں"۔

خط اس کے ہاتھوں سے گر پڑا۔ جین نے اسے اٹھایا، پڑھا اور کہا "تو کام ختم ہو گیا"۔

"نہیں میری بہن ابھی ختم کا ہے کو ہوا۔ یہ انتظار حد درجہ خوفناک ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔ ہم خشکی کے راستے لیگھارن پہنچیں گے۔ جلد چلو ہمیں اپنی قسمت کا حال معلوم کرنا ہے"۔

لیگھارن کی طرف جو سڑک وہاں سے جاتی تھی وہ پیسا میں سے گذرتی تھی۔ وہاں وہ لارڈ بائرن کے مکان پر یہ سوچ کر اتریں کہ شاید کوئی خبر وہاں سے مل جائے۔ رات کافی گذر چکی تھی۔ دروازہ کھٹکھٹانے پر ایک ملازمہ باہر آئی اور مریم کا سفید اور وحشت ناک چہرہ دیکھ کر سہم گئی۔

"وہ کہاں ہے؟ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ شیلے" مریم نے کہا۔

اتنے میں بائرن بھی آ گیا اسے اس کے سوا کچھ خبر نہ تھی کہ سوموار کو شیلے دو دوستوں کی معیت میں لیگھارن سے کاسانیگی پہنچنے کے لئے روانہ ہو گیا تھا۔

نصف رات ادھر، نصف ادھر۔ باوجود بائرن کے اصرار کے دونوں خواتین لیگھارن کی سمت چلی گئیں جہاں وہ دو بجے رات پہنچیں صبح ہونے تک وہ ایک سرائے میں ٹھہریں۔ دن چڑھا تو انہوں نے مختلف مہمان خانوں میں پھرنا شروع کیا۔ جلد ہی کپتان رابرٹس انہیں مل گیا۔ اس کے چہرے سے ظاہر تھا کہ خبر نہیں۔ اس نے تمام حالات کہہ سنائے۔

امید پورے طور پر نہیں ٹوٹ چکی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ ایریل کسی جزیرے، کارسیکا، ایلبا، یا کسی اور جزیرے میں پناہ گزین ہو گئی ہو ایک شخص کو ساحل کے ساتھ ساتھ کشتی میں بھیجا گیا کہ وہ کہیں کچھ دیکھے تو پتہ دے۔ نو بجے صبح دونوں عورتیں ٹریلانی کے ہمراہ کاسانیگی کو روانہ ہوئیں۔ ساحل پر ایک جگہ انہیں ایریل کا ایک تیرنے والا تختہ دکھائی دیا۔ اس امر کا امکان تھا کہ شاید انہوں نے موسم خراب دیکھ کر اس بوجھ کو باہر پھینک دیا ہو۔ جب وہ گھر پہنچیں تو گاؤں میں کوئی تقریب تھی۔ ناچ گانے اور قہقہے دور سے سنائی دے رہے تھے۔ تمام رات وہ اس شور و شغب میں سو نہ سکیں۔

ٹریلانی نے اپنے دوستوں کا کھوج نکالنے والے کو انعام دینے کا اعلان کر رکھا تھا۔ پانچ چھ دن کے بعد اسے ایک مقام پر سے بلاوا آیا۔ وہاں ایک انسانی لاش پائی گئی تھی جس کا چہرہ اور ہاتھ مچھلیاں نے کھا لئے تھے۔ مگر دراز قد چھوٹا کوٹ جس کی ایک جیب میں یونانی ڈرامہ نویس سافکلیز کا مجموعہ اور دوسری میں انگریزی شاعر کیٹس کا دیوان تھا۔ واضح طور پر شاہد تھے کہ یہ شیلے کے سوا اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ شعریت کی عالمگیر فضا میں ہلچل پیدا ہو گئی۔ اس وقت شیلے کا عظیم المرتبت مشرقی ہمعصر اپنے غیر شعوری نفس کے زیر اثر انتہائی درد آمیز لہجہ میں گنگنا رہا تھا ؎

یہ لاش بے کفن اسدؔ خستہ جاں کی ہے
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا

"ایریل" کے باقی دو مسافروں یعنی جین کے خاوند ولیمس اور اس کے دوست چارلس کی لاشیں بھی قریب ہی سے مل گئیں۔ ٹریلانی لاشوں کو

عارضی طور پر ریت میں دفن کر واکر کاسامیگنی کی طرف گھوڑے پر بھاگا۔

دروازے پر پہنچا تو کچھ عرصہ قبل کے واقعات اس کی آنکھوں میں پھرنے لگے۔ جب وہ پہلے پہل وہاں آیا تھا اور شیلے اور ولیمس اپنے اہل عیال سمیت انتہائی مسرت میں وہاں دن گذار رہے تھے۔ رات کے سکوت میں شیلے کے قہقہے بلند ہو رہے تھے اور دور سے جین کے ستار پر گانے کی آواز آ رہی تھی۔ پھر وہ بادلِ ناخواستہ وہاں سے واپس ہوا تھا۔ اس کے لئے کاسامیگنی کرۂ ارض پر غیر محدود مسرت و بہجت کا مرکز تھا اور اس کے مکین دنیا بھر سے زیادہ خوش بخت تھے۔

وہ انہی خیالات میں غرق سیڑھیوں کی راستے بالاخانے میں پہنچا اور اطلاع دیئے بغیر اندر داخل ہو گیا۔ دونوں بیوائیں محوِ انتظار بیٹھی تھیں۔ وہ ایک لفظ بھی نہ بول سکا۔ مریم کی پریشان آنکھیں اس کی طرف ٹکٹکی باندھے تھیں۔ وہ چلائی "کوئی امید ہے؟"

ٹریلانی ایک سرد آہ بھر کر جواب دیئے بغیر کمرے سے باہر چلا آیا۔ نیچے آکر اس نے ملازم کو ہدایت کی کہ وہ بچوں کو بالاخانے میں اُن کی ماؤں کے پاس چھوڑ آئے۔

ٹریلانی کے مشورہ سے فیصلہ کیا گیا کہ لاشوں کو قدیم یونانی رواج کے مطابق ساحل پر آگ میں جلانا چاہیئے۔ اس رسم کے لئے ایک دن مقرر کیا گیا۔ بائرن اور ہنٹ بھی پہنچ گئے۔ حکام نے چند سپاہی پہلچوں سے مسلح بھیج دیئے۔ سب لوگ تپتی ہوئی ریت پر کھڑے تھے۔ پہلے ولیمس کی لاش کھودی گئی۔ بڑی بڑی آہنی سلاخوں، کنڈیوں اور دستپناہوں سے کام لیا گیا۔ ہڈیوں اور گوشت کا ایک مضمحل سا ڈھانچا برآمد ہوا۔ چتا تیار کی گئی۔ دوست غمگین صورتیں بنائے کھڑے تھے۔ چتا کو آگ دے دی گئی اور کچھ دیر بعد خاک کا ایک ڈھیر باقی رہ گیا۔

اگلے دن شیلے کی نعش جلائی گئی۔ اس وقت شدید گرمی میں زرد ریت اور گہرے اودے رنگ کا سمندر ایک دلفریب تقابل پیش کر رہے تھے۔ صنوبر کے سبز درختوں کے اوپر برفانی چوٹیاں آسمان کا پس منظر سجا رہی تھیں۔ شیلے انہی مناظر پر فدا تھا۔ گاؤں کے تمام بچے اس غیر معمولی رسم کو دیکھنے کے لئے جمع تھے۔ وہ سب کے سب بالکل خاموش تھے۔ لارڈ بائرن زیرِ لب کہہ رہا تھا "آہ اعزم آہنیں تیری عالیشان ہمت میں سے یہی کچھ ہے جو باقی رہا!... ایک دیو کی طرح تو نے تبلیس کے دیوتاؤں کا مقابلہ کیا اور انجام کار...."

سپاہی قریباً ایک گھنٹے تک ریت کھودتے رہے کیونکہ تدفین کے صحیح مقام کا پتہ نہ تھا۔ اچانک ایک کھوکھلی ہڈی پر بیلچے کی چوٹ لگنے کی آواز آئی۔ یہ شیلے کا سر تھا۔ بائرن کانپ اٹھا۔ اس کی آنکھوں میں جھیل لیمن کے اس طوفان کا منظر پھر رہا تھا جس میں کچھ عرصہ پہلے شیلے نے حیرت انگیز جرأت اور بہادری کا ثبوت دیا تھا۔ "لوگ ظالمانہ طور پر اس کی شخصیت کے متعلق غلط فہمی میں مبتلا رہے ہیں میرے وسیع مشاہدات میں وہ بغیر استثنا بہترین اور بے لوث ترین انسان تھا۔"

نعش پر دفن کرنے کے وقت چونہ لگا دیا گیا تھا جس سے کاربن کا عمل پیدا ہو گیا تھا۔ صنوبر کی خشک لکڑیوں میں شاعر کو لٹا دیا گیا۔ بہت جلد شعلے آسمان کو اٹھنے لگے شعلوں میں شراب، لوبان، تیل اور نمک وغیرہ پھینکا گیا۔ جتنی شراب اس کی لاش پر لنڈھائی گئی وہ تمام عمر میں اتنی نہ پی سکا ہوگا۔ تین گھنٹے تک آگ بھڑکتی رہی مگر حیرت انگیز امر یہ تھا کہ شاعر کا دل اس آگ میں بالکل نہ جل سکا۔ دل غیر معمولی طور پر بڑا تھا۔ ٹریلانی نے اپنے ہاتھ جلاتے ہوئے اسے دہکتے ہوئے کوئلوں سے نکال لیا۔ سر کا بھیجا اُبل اُبل کر جل رہا تھا۔ بائرن اس نظارہ کی تاب نہ لا سکا۔

"آؤ ہم اس ظالم پانی کا مقابلہ کریں جس نے ہمارے دوست ہم سے چھین لئے" یہ کہہ کر وہ سمندر میں کود پڑا اور زور زور سے پانی کو تھپیڑے لگاتا ہوا اپنی کشتی میں پہنچ گیا۔ ٹریلانی نے "پھولوں" کو جمع کیا اور انہیں ایک صندوقچہ میں بحفاظت رکھ دیا۔ صندوقچہ کے گرد سیاہ مخمل کا غلاف چڑھا تھا۔

اس راکھ کو روما کے انگریزی گورستان میں جوانا مرگ شاعر کیٹس کے پہلو میں رکھ دیا گیا۔ رومتہ الکبریٰ کی خاک میں جہاں بے شمار تخت و تاج پنہاں ہیں وہاں یہ دو بے بہا لعل بھی اس کے انتہائی فخر کا موجب ہیں کیٹس اپنے ہم وطن نو وارد سے ایک سال قبل قوموں اور سلطنتوں کی اس ماں کی گود میں ابدی نیند سو چکا تھا۔ دو سال بعد بائرن کی آزاد روح بھی قفس عنصری سے چھوٹ کر اُن سے جا ملی۔

شیلے نے جان کیٹس کی وفات پر ایک درد بھرا طویل نوحہ لکھا تھا۔ اس کے دیباچہ میں اس نے لکھا "جان کیٹس کو روم کے تنہا اور رومانی عیسائی قبرستان میں دفن کیا گیا.... قبرستان کھنڈرات میں ایک کھلی جگہہ واقع ہے۔ سردیوں میں یہ مقام بنفشہ اور سورج مکھی کے پھولوں سے ڈھک جاتا ہے.....

.... صرف اس خیال سے کہ اس قدر دلکش جگہہ بعد مرگ مسکن ٹھہرے گی ہمیں موت سے الفت ہو گئی ہے[5].... آہ اے مرد

[5] صرف چند ماہ اور انتظار کیجئے، پھر آپ ہوں گے اور آپ کی محبوب جگہہ!

ناہنجار! تیرے سفلہ پن کی انتہا نہیں۔ تو نے خالق کی صناعی کے بہترین نمونے کو پامال کر کے رکھ دیا۔ تم قاتل ہو۔ تمہاری خطا کبھی معاف نہیں ہو گی تم نے زبان سے چھریاں چلائیں ....."[51]

یہ نوحہ بہت طویل اور رومانی ہے۔ افسوس کہ ہماری زبان میں اس قسم کی پرمعنی منظومات بہت کم ہیں۔ کیٹس کی وفات کے بعد شیلے کو موت سے ایک گونہ انس ہو گیا تھا۔ نوحہ کا ایک بند یوں ہے:۔

"..... مرے دل! کیوں سکڑتا جا رہا ہے؟ کیوں دھڑکتا ہے!
ترا مڑ مڑ کے پیچھے دیکھنا کیسا!
یہاں کا چھوڑ کر سب کچھ،
ہیں تیرے سامنے وہ جا رہی تیری تمنائیں۔
اُٹھو اور اٹھ کر نہیں رکے، پیچھے پیچھے تو بھی چل دے اب!
مرے پہلو میں اے باد صبا! سرگوشیاں کیسی؟
مجھے مرحوم کا شاید بلاوا آ رہا ہے[52]۔
کہ اس زندگانی کو،
نہ ان میں تفرقہ ڈالے
جنہیں باہم ملا سکتی ہو پیاری موت اک پل میں ....."

"رومانی زندگی کے نیسویں سال" کی منظومات دلی جذبات کی حامل تھیں اور ان میں رومانیت کا پہلو حد سے زیادہ نمایاں تھا۔ یہاں بے ساختہ جی چاہتا ہے کہ نیسویں سال کی نظموں کے بعض مقامات کو درج کیا جائے۔

حکومت

حکومت کون کرتا ہے!
وہی انساں جو اپنا آپ حاکم ہو۔
جو ہے سرتاج اپنے آپ کا، اپنی حکومت کا
جو بیٹھا ہو بجائے تخت اپنے نفس سرکش پر،
نہ جا و بیم کے جھگڑے مٹانا کام ہو جس کا۔"

وقت

زماں! اے بحر بے پایاں!

تری لہریں، مہینے سال۔ اور پانی نرا گہرا ہے نمکیں آنسوؤں سے
آہ! جو انساں گراتا ہے!
کنارا ہے کوئی تیرا!
بتا اے بیکراں طوفاں
فنا کی سب حدیں معدوم ہیں ان تیری لہروں میں
ہمیشہ شور کرتا ہے
سدا لقمے کا بھوکا ہے
اگل دیتا ہے پھر لقمہ کو اپنے خشک ساحل پر[53]
سکوں تیرا ہے فتنہ اور تلاطم خوف کا مرکز،
بھلا ہمت ہے کس کی
سامنا تیرا ہو کر بیٹھے؟
زماں بس ــــ اے بحر بے پایاں!"

اشعار

بجھے جب شمع،
اس کی روشنی مٹی میں مل جائے

---

[51] یہ سکاٹ لینڈ کے اس نقاد کو مخاطب کر کے لکھا گیا ہے جس نے رسالہ "کوارٹرلی ریویو" (زائڈنبرا) میں کیٹس کی ایک نظم "انڈی مین" (محبوب آوارہ) پر سخت ترش لہجہ میں بے جا تنقید کی، جس کو کیٹس کا نازک دل برداشت نہ کر سکا۔ اس تنقید کے صدمہ سے اس کی صحت پر بہت برا اثر پڑا اور اسے مرضِ دق لاحق ہو گیا جو اس کی موت کا باعث ہوا۔ کیٹس کا دل حد سے زیادہ حساس تھا۔ معمولی سے معمولی بات بھی اس کے لئے بہت سریع الاثر ہوتی تھی۔ اسی رسالے میں اس سے قبل لارڈ بائرن کی ایک نظم پر اس سے بھی زیادہ شدید الفاظ میں مخالفانہ تنقید شائع ہوئی تھی مگر بائرن کیٹس کی طرح نازک دل نہیں تھا۔ اس نے "انگریزی شاعر اور سکاٹی نقاد" کے عنوان سے ایک ایسی دنداں شکن ہجو لکھی کہ لوگ اس کی قابلیت کا لوہا مان گئے اور یہی ہجو اس کی شہرت کا باعث ہوئی۔

[52] آہ اے مرد عاقبت شناس!

[53] شاعر خود چند ماہ بعد ایک لقمہ بنا اور خشک ساحل پر اگل دیا گیا۔ مگر آہ یہ سمندر وقت کا استعارہ نہیں تھا ــــ حقیقی، خوفناک سمندر۔

بکھر جائیں جو بادل،
شان مٹ جائے دھنک کی سب۔
جو بربط ٹوٹ جائے،
گم ہوں نغمے سب فضاؤں میں۔
کسی کے مرتعش ہونٹوں سے جب اظہار الفت ہو
یہی ہوتا ہے
وہ الفاظ جلدی بھول جاتے ہیں۔
(شرح آرزو کردن خطاست)

"۔۔۔۔ کے نام"

محبت جس کو کہتے ہیں میں وہ لانے سے قاصر ہوں،
مگر دل کی پرستش پائے گی شرفِ قبولیت؟
نکلتی ہے یہ دل سے رد اسے کر ہی نہیں سکتی
خدائی بھی
دلی خواہش،
جو پروانوں کے دل میں ہوتی ہے
شمع فروزاں کی،
شبِ تاریک کو خواہش ہے جو
صبحِ درخشاں کی
عبادت جس کی ہے مطلوب ہے وہ دور ہم سے، اور
ہمارے حلقۂ غم سے۔

مریم اور جبین دیر تک اطالیہ میں مقیم رہیں۔ پھر دونوں لندن چلی گئیں۔
نوجوان مریم نے تمام عمر دوبارہ شادی نہ کی کیونکہ "مریم شیلے" کا نام اسے اس قدر پیارا تھا کہ وہ اسے ہی اپنے لوحِ مزار پہ دیکھنا چاہتی تھی۔ ٹریلانی کو شادی کی درخواست کر کے مایوس ہونا پڑا۔ جبین نے ایک فوجی سے شادی کر لی۔ مگر اس کا خاوند ملازمت پر ہندوستان گیا اور پھر واپس نہ پہنچا۔
مریم بوڑھی ہو گئی مگر جب کبھی شاعر کا نام اس کی زبان پر آتا اس کی آنکھوں میں طفلانہ شوخی اور چمک پیدا ہو جاتی۔

محمد صادق قریشی

لہ جبین یا مریم۔

ناکام

خاموش سی، بے ضرر سی لڑکی!
معصوم سی، بھولی بھالی!
تو جانتی ہے کہ تجھ میں کتنی طاقت ہے جاں کو روندنے کی؟

تو نے مری پر غرور ہستی
اک جنبش لب سے خاک میں ملا دی،
پندار و سکوں سے مست دُنیا
تپتی ہوئی ریت سی بنا دی۔

دل قابو میں اب نہیں ہے میرے،
کہتا ہے جہاں کو ترک کر دوں،
ہر وقت تری کروں عبادت، ہر وقت رہوں ترے دوارے۔
پر مجھ سے یہ کیسے ہو سکے گا؟

تو جانتی ہے کہ تجھ کو مجھ سے الفت نہیں اور نہ میری پروا
پھر چھوڑ تو دوں جہاں کو، لیکن
کس آس پہ میں رہوں گا زندہ؟
گر گوشۂ دل میں تیرے ہوتی
اک جنتِ شعر و عشق،
جس میں افلاک کی گردشوں سے مجھ کو عافیت اور پناہ ملتی،

میں بندِ ہوس کو توڑ دیتا
پر تیری رضا کہاں سے لاؤں!

بس اب تو ہے ایک ہی سہارا۔
غم پھر سے مجھے پر غرور کر دے، اس پستِ جہاں سے دُور کر دے
میں تیری کشش کو بھول جاؤں، خود داری سکوں سے دل کو بھر دے

ممکن ہے مگر کہ اس سے پہلے
سن لے مری آہیں ربِ فطرت، اور مجھ کو رہینِ موت کر دے
اس حال میں بھولی بھالی لڑکی!
یہ خوں لگے گا تیرے ذمّے۔

اور میری حیات کے سب امکاں
مغرور و جوان دل کے ارماں
تو ان کو مٹانے والی ہو گی (معصوم سی بھولی بھالی ناداں!)

اب سمجھی تو بے ضرر سی لڑکی!
اے چھوٹی سی عافیت کی دیوی!
ہے گرچہ حیات تجھ سے رنگیں، تجھ میں ہیں تباہیاں بھی کتنی!

ظہیر الدین ایم اے

حسیّات

تشویش میں ہے بلبلِ شیدا کئی دن سے
گلشن میں نہیں زمزمہ پیرا کئی دن سے

مضطر ہے بغل میں دلِ شیدا کئی دن سے
بیٹھا ہوں تری یاد میں تنہا کئی دن سے

ہاں قلب کا ہر ذرہ ہے پیاسا کئی دن سے
ہاں ابرِ کرم کی ہے تمنّا کئی دن سے

ہر چند کہ خلوت میں ہے وامق کا تصور
پر گھر سے نکلتی نہیں عذرا کئی دن سے

ہر چند کہ مجنوں کی صداؤں سے ہے بیکل
پردے کو الٹتی نہیں لیلےٰ کئی دن سے

ہر شب کو ضیا ریز ہے حسنِ مہِ کنعاں
پنہاں ہے شبستاں میں زلیخا کئی دن سے

ہیں شام و سحر نالہ کناں ہوں پسِ دیوار
ہے زاویہ افروز سویدا کئی دن سے

ہر چند کہ ہے آرزوئے جلوہ نمائی
مستور ہے وہ شاہدِ رعنا کئی دن سے

جس نخل پہ پڑتی ہے نظر میری چمن میں
ہوتا ہے مجھے آپ کا دھوکا کئی دن سے

اے صبحِ درخشاں تجھے معلوم نہیں ہے
ہے مجھ پہ مسلّط شبِ یلدا کئی دن سے

ہر صبح نظر آتی ہے اک تیری جھلک سی
اب ہے یہی جینے کا سہارا کئی دن سے

ہے کتنی نظیرؔ اس کی جدائی میں اداسی
گھر میرا نظر آتا ہے صحرا کئی دن سے

اصغر حسین خاں نظیرؔ لودیانوی

سنہ ۱۹۳۹ء

(ایک طنزیہ تمثیل)

وقت: ۳۱ دسمبر ۳۸ء کی رات

منظر - ایک بین الاقوامی مجلس - ہٹلر - مسولینی - فرانکو - اُگاکی - دلادیہ اور چمبرلین میز کے گرد بیٹھے ہیں - ہر ایک کے سامنے ایک ایک آئینہ اور میکروفون ہے - جس کا تعلق ہر ایک کے اپنے ہی کانوں سے ہے - دور جام چل رہا ہے - سب خوشی میں کچھ گنگنا رہے ہیں -

(ترجمان اندر داخل ہو کر ایک اخباری نامہ نگار کے آنے کی اطلاع دیتا ہے)

ترجمان - حضرات! نامہ نگار مسٹر پین (PENN) اندر آنے کی اجازت چاہتے ہیں -

(نامہ نگار داخل ہوتا ہے)

نامہ نگار - سالِ نو کا کوئی پیغام!

ہٹلر :- وہی پیغام جو سال گذشتہ دیا تھا -

مسولینی :- جس نے میری مخالفت کی - اُس کا سر کچلنے کے لئے میرے بم تیار ہیں -

فرانکو :- سپین کو تباہ کر دو ——— ہسپانیہ زندہ باد!

اُگاکی :- چیانگ پر لعنت ہو! میرا دل چین پر خون کے آنسو بہا رہا ہے

دلادیہ :- فرانس کی جمہوریت کا راز میری ڈکٹیٹرشپ میں مخفی ہے -

چمبرلین :- دنیا کو امن کی ضرورت ہے - فلسطین میں ہماری گورہ فوج پر نئے سال کی برکتیں نازل ہوں -

---

دوسرا سین

ڈاؤننگ اسٹریٹ - ایک انیس برس کی نوجوان حسینہ خرام ناز کرتی ہوئی مکان نمبر ۱۰ کی طرف جا رہی ہے - وہ شرمیلی اور ناتجربہ کار معلوم ہوتی ہے - اس دوشیزہ کا نام مس ۱۹۳۹ء ہے - نیول چمبرلین ایک ہاتھ میں چھاتا دوسرے میں پورٹ فولیو (Port Folio) تھامے سڑک پر چلا جا رہا ہے -

۱۹۳۹ء - جناب نمبر ۱۰ ڈاؤننگ اسٹریٹ کونسا مکان ہے؟

چمبرلین :- (حیران ہو کر مگر دلچسپی سے) خوب! آپ مس ۱۹۳۹ء تو نہیں ہیں؟ آپ تو بڑی شرمیلی معلوم ہوتی ہیں - ۔ ۔ ۔ ۔ مگر آپ مناسب وقت پر تشریف نہیں لائیں - میں مسولینی سے ملاقات کرنے روم جا رہا ہوں - مجھے افسوس ہے کہ میں ایک منٹ بھی رُک نہیں سکتا ———

۱۹۳۹ء :- تو پھر مجھے کسی اور جگہ جانا ہو گا؟

چمبرلین (چونک کر) حسینہ ایسی غلطی نہ کرنا - تم ابھی نو آموز ہو - اور دنیا کے دھندوں سے بے خبر - دنیا میں بُرے لوگ بھی ہیں - احتیاط لازم ہے - سٹالین تمہیں جاسوس جان کر گولی مار دے گا - ہٹلر کو جانتی ہو - یہودن کہہ کر گردن زدنی قرار دے دیگا - مسولینی وہ بھدا خوفناک اور جنگجو ہے - شاید تم ان لوگوں کو نہیں جانتیں؟

۱۹۳۹ء :- جی نہیں -

چمبرلین - تم ابھی بالکل بچہ ہو - دیکھنا کسی کی مسکراہٹ تمہیں دھوکا نہ دے دنیا میں صرف انگریز قابل اعتماد ہے - مرد دوست بن کر دشمنی کرتے ہیں ——— تم میرے مکان کے اندر جاؤ - وہاں میرے بھائی کی بیوہ تمہاری دیکھ بھال کریگی -

۱۹۳۹ء :- بہت اچھا جناب - (جانے لگتی ہے)

چمبرلین :- (کچھ سوچ کر) ہاں ذرا سنو تو - میرے گھر میں ایک فرانسیسی مہمان ٹھہرا ہوا ہے - فرانسیسی لوگ ذرا جذباتی اور متلون مزاج

ہوتے ہیں۔ اس سے بچ کر رہنا۔

۱۹۳۹ء۔ لیکن مجھے تو سب سے ملنا ہوگا؟

چمبرلین۔ ہاں ہاں، مگر یہ بعد میں دیکھا جائیگا۔ اس عرصہ میں سب کام درست کرلونگا۔ فکر نہ کرنا۔ میں ضرور کامیاب ہونگا۔ جانتی ہو۔ میں روم کیوں جارہا ہُوں؟ مجھے کسی پر اعتماد نہیں۔ اس لئے میں نے جرمنی کو رُوس کے مقابلہ میں لاکھڑا کیا ہے۔ جاپان اور امریکہ کو ایک دوسرے کا دشمن بنا دیا ہے۔ اطالوی فرانسیسیوں سے اُلجھنے کو تیار ہیں۔ اُنہیں آپس میں خوب لڑنے دو۔ پھر ہم مزے سے رہینگے ...... اُمید ہے تم مجھے ضرور مدد دوگی۔ کیوں؟ مگر احتیاط لازم ہے۔ جو ملے اُس سے خوب ہنس ہنس کر باتیں کرنا اور اُسے ہماری دوستی کا یقین دلاتی رہنا ——— مگر مجھے جلد جانا ہے۔ خدا حافظ (جلد جلد قدم بڑھاتا ہے)

(ملڈ ڈاؤننگ سٹریٹ کے زینوں پر مس ۱۹۳۹ء سے بٹلر ملتا ہے)

بٹلر:۔ (آداب تہذیب کے مطابق جُھک کر) مس صاحبہ مسٹر چمبرلین اس وقت کسی سے ملاقات نہیں کر سکتے۔

۱۹۳۹ء:۔ ہاں میں جانتی ہُوں۔ وہ روم گئے ہیں۔ اُنہوں نے ———

بٹلر:۔ (عذر کرتے ہوئے) مس صاحبہ ایسی باتیں کرنے کی مجھے اجازت نہیں۔

۱۹۳۹ء:۔ مگر ایک منٹ گزرا اُنہوں نے خود مجھے بتایا ہے کہ وہ ———

بٹلر:۔ (حیران ہوجاتا ہے) لیکن وہ رات کے وقت تو عورتوں سے نہیں ملتے۔

۱۹۳۹ء۔ کیا لیڈی چمبرلین اندر ہیں؟

بٹلر:۔ جی ہاں مگر ———

(موسیو دلادیہ باہر آتا ہے۔ شاید پیرس جارہا ہے۔ حسینہ کو دیکھ کر رُک جاتا ہے)

دلادیہ۔ مس نوروز خوش آمدی۔ مادام! آج کس قدر حسین معلوم ہوتی ہے۔

۱۹۳۹ء۔ موسیو تم سے ملاقات کرکے مجھے بڑی خوشی ہوئی۔

دلادیہ۔ (تیزی سے مگر کان میں) مادام تم یہاں کیسے؟ یہ انگریز لوگ سنگدل سازش پسند اور بے رحم ہیں۔ تمہاری قسم یہاں زندگی کتنی بے لطف ہے آؤ پیرس چلیں۔ پیرس کی زندگی۔ آہ! (اس کے ہاتھوں کو بوسہ دیتا ہے)

۱۹۳۹ء۔ لیکن ———

دلادیہ:۔ یہ لیکن ویکن رہنے دو۔ پیرس۔ جنت نشان ہے جنت، مادام تمہاری آنکھوں سے محبت کی شراب چھلکی پڑتی ہے۔ میری یوجین۔ میری جوزیفائن۔ میں تمہیں یہاں نہیں چھوڑ سکتا۔ ذرا مسکراؤ تو!

(وہ حسینہ کو دائیں بازو سے تھام کر ڈاؤننگ سٹریٹ سے باہر چلا جاتا ہے)

لیڈی آسٹن چمبرلین (نمودار ہوتی ہے) بٹلر وہ کون تھی؟

بٹلر۔ (کھانستے ہوئے) حضور کوئی آوارہ چھوکری۔

لیڈی آسٹن چمبرلین (اپنے آپ سے پُرمعنی انداز میں) خوب!

بٹلر۔ (رازدارانہ لہجہ میں) مادام! فرانسیسی لوگوں کا اعتبار ہی کیا ہے؟

تیسرا سین

وی آنا۔ میں ہٹلر اور مسولینی کی ملاقات کا میدان۔ نازی اور فسطائی اس تقریب کی خوشی میں جشن منا رہے ہیں۔ دور جام چل رہا ہے۔ باہر جرمن اور اطالوی بینڈ کی آواز سُنائی دیتی ہے۔

ایک نازی۔ (دوسرے سے مگر آہستہ) یہ اطالوی کتے! مجھے ان سے سخت نفرت ہے۔

دوسرا نازی۔ مجھے خود ہے! بے جان مُردے!!

پہلا نازی۔ مگر Fuhrer نے تو ہمیں ان سے خوب گھُل مل کر رہنے کا حکم دیا ہے۔

دوسرا نازی۔ (مایوس ہوکر) اس کا حکم تو یہی ہے۔ مگر پھر بھی ———

پہلا فسطائی (دوسرے سے مگر آہستہ) یہ جرمن قوم! خدا کی پناہ! ذرا ان کی اکڑبازی اور لاف زنی تو دیکھو۔

دوسرا فسطائی۔ بالکل درست۔ یہ انسان ہیں یا سنگدل مشینیں۔

پہلا فسطائی۔ مگر ذرا ان کی باتیں تو سُنو۔ اپنے آپ کو ساری دنیا سے بہتر قوم سمجھتے ہیں۔

دوسرا فسطائی۔ ڈیوس (Duce) کا حکم ہے ورنہ ——

(مس ۱۹۳۹ء داخل ہوتی ہے)

پہرہ دار۔ کون ہے؟ (بندوق کی نالی اُدھر کردیتا ہے)

۱۹۳۹ء (خائف ہوکر) میں نوروز ہوں۔

پہرہ دار۔ (تعجب سے) مس نوروز؟ مگر اس کا تحریری ثبوت؟

۱۹۳۹ء۔ میرے پاس تو کوئی نہیں۔

پہلا نازی۔ یہودن ہے کوئی!

دوسرا نازی۔ جاسوس ہوگی۔ داغ دو بندوق۔

پہلا فسطائی۔ یہ حسینہ یہودن کیسے ہوسکتی ہے۔

نازی۔ ہو کیوں نہیں سکتی؟

دوسرا فسطائی۔ مادام کی آنکھیں کتنی مخمور ہیں۔ مادام جاسوسہ نہیں ہوسکتی مادام میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہاری حفاظت کرونگا۔

(ہٹلر داخل ہوتا ہے۔ اس کے پیچھے گورنگ اور دوسرے فوجی افسر ہیں۔)

سب کے سب۔ (کھڑے ہوکر) ہیل ہٹلر!

ہٹلر۔ ہیل! (۱۹۳۹ء کی طرف متوجہ ہوکر) خاتون تم کون ہو؟

۱۹۳۹ء۔ (لرزتگی سے) میں مس نوروز ہوں۔

ہٹلر۔ نوروز؟ مگر خاتون یاد رکھو۔ جرمنی کی قسمت میں تمام دنیا کی حکومت لکھی جاچکی ہے۔ اس لئے تمہیں جرمنی کا ساتھ دینا ہوگا۔ یہودی کتے ہمارے خلاف طوفان بے تمیزی برپا کررہے ہیں۔ تم اُن کے غلط پراپیگنڈا سے متاثر نہ ہونا۔ جرمنی جو ارادہ کرچکا ہے۔ وہ پورا ہوکر رہیگا۔ مس ۱۹۳۸ء کے تعلقات ہم سے دوستانہ تھے۔ اب تمہیں بھی ہماری ہی حمایت کرنی پڑیگی۔ جانتی ہو۔ ہم طاقتور ہیں۔ مجھے دیکھو میں کس قدر طاقتور ہوں نازی سلام متواتر چھ گھنٹے تک کھڑا رہ کرسکتا ہوں۔ اس نے تمہیں ——

۱۹۳۹ء۔ (خوف زدہ ہوکر) بہت اچھا میں ——

(چپکے سے مسولینی کے خیمہ کی طرف سرک جاتی ہے)

ہٹلر۔ (ناراضگی سے) میں صنف نازک کی نظروں میں ہمیشہ کھٹکتا رہا۔ (گورنگ سے مخاطب ہوکر) ہرمن! مگر سُنا ہے کہ تم طبقہ نسواں میں بہت مقبول ہو۔ اس لڑکی کو کسی طرح سمجھا بجھا کر لے آؤ۔

گورنگ۔ (چونک کر) اوڈلف! مجھے اس حسینہ سے ان سادہ کپڑوں میں ملاقات کرنی ہوگی؟ یہ تو ایرمارشل کی وردی ہے۔ مجھے اس چھوکری کو رام کرنے کے لئے تمغوں اور فوجی امتیازات سے مزین ہوکر جانا چاہیئے۔

ہٹلر۔ (مسولینی کو مس ۱۹۳۹ء کے استقبال کے لئے خیمہ سے باہر نکلتا دیکھ کر) غضب ہوگیا!

مسولینی۔ حسینہ تم کتنی خوبصورت ہو۔ اور تمہارا لباس کس قدر دیدہ زیب ہے

۱۹۳۹ء۔ کیا واقعی تم ایسا ہی خیال کرتے ہو۔

مسولینی۔ ضرور! مگر مادام تمہیں اس طرح اکیلے نہیں پھرنا چاہیئے۔ تم میرے ساتھ آؤ —— میں کچھ نہیں سنونگا۔ اور تمہیں آنا پڑیگا۔

(اُسے بازوؤں میں اُٹھا کر اندر لے جاتا ہے)

پردے کے پیچھے سے ایک زنانہ آواز۔ بنیٹو!! (Benito)

مسولینی۔ کمبخت بُڑھیا! چڑیل!! یہ میرا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ میری پری میں ابھی لوٹا۔ (بوسہ دے کر باہر چلا جاتا ہے)

(مس ۱۹۳۹ء تیزی سے خیمہ سے باہر نکل آتی ہے۔ باہر کونے میں ایک مریضہ زخمی اور لاچار کراہ رہی ہے۔ مرض الموت کا شکار ہے۔)

۱۹۳۹ء۔ (رحم کے جذبہ سے متاثر ہوکر) مادام آپ کا ایسا حال کیونکر ہوا؟

۱۹۳۸ء (نحیف آواز سے) میں مر رہی ہوں۔ (ہاتھ سے باہر دنیا کی طرف اشارہ کرکے) یہ لوگ میری اس حالت اور موت کے ذمہ دار ہیں انہوں نے ہی مجھے اس کرب و بلا میں ڈال رکھا ہے —— مگر بہن تم کون ہو؟

۱۹۳۹ء۔ میں نوروز ہوں۔

۱۹۳۸ء۔ (ایک سرد آہ بھر کر) آہ! میں روز گذشتہ ہوں —— ایک برس کی بات ہے کہ میں بھی بالکل تمہاری طرح نوجوان اور معصوم تھی۔ اُنیس برس کی دوشیزہ، مگر آج میں ایک بڑھیا معلوم ہوتی ہوں۔ اور بدنامی کی موت مر رہی ہوں۔ پیاری بہن۔ مگر تم ——

[قلب کی حرکت بند ہوجاتی ہے]

۱۹۳۹ء [روتی ہے] آہ! بیچاری مرگئی!

نامہ نگار۔ [گویا کہیں سے ٹپک پڑتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں نوٹ بک ہے] میں نے اس کی ساری داستان سن لی ہے۔ مگر مس اب تم اپنی زندگی کا حال بیان کرو (حزن آمیز گانا سنائی دیتا ہے)

پردہ گرتا ہے

شبیر محمد اختر

ہنستا ہوا چہرہ

(۱)

سونا زے کے سہارے
تالاب کے کنارے
وہ آئی مسکراتی
رستے کو جگمگاتی
دل میں سرور آیا
اور میں بھی مسکرایا
لیکن وہ مسکرا کر نظروں سے ہو گئی گم
اور چھین کر مرا سب لیتی گئی تبسم!
پھر میں نہ مسکرایا
وہ وقت پھر نہ آیا!
وہ چھین کر تبسم
نظروں سے ہو گئی گم

(۲)

وہ یوں ہی مسکراتی
ہر جا گذرتی ہوگی
اور سینکڑوں لبوں کا
بس یوں ہی لوٹا ہوگا
اُلفت بھرا تبسم!
شاید اسی سے اُس کا
ہنستا ہوا ہے چہرہ!
ہنستی ہوئی ہیں آنکھیں!
ہنستی ہوئی ہیں باتیں!
ہنستا ہوا ہے چہرہ!!

سعید احمد اعجاز

بغاوت کی سزا

(۱)

آپ کہانی سے پہلے دو باتیں یاد رکھیں۔ ایک یہ کہ وہ ایک کالج کے پروفیسر تھے۔ نام مکرجی تھا بنارس کی طرف کے رہنے والے تھے۔ دُبلا پتلا سا جسم۔ کم گو۔ سنجیدہ مزاج اور تنہائی پسند۔ اور دوسری یہ کہ وہ غیر شادی شدہ تھے۔ ابتدا ہی سے وہ عورت ذات سے متنفر تھے۔ اِسی لئے اُنہوں نے کبھی بھی اپنی والدہ۔ اپنی بہن یا کسی رشتہ دار کو گرمیوں میں کشمیر آنے کی دعوت نہیں دی۔ یا شاید اُن کا ایسا کوئی رشتہ دار ہی نہ تھا۔

(۲)

کل اُنہیں کالج میں حُسن اور شباب پر لیکچر دینا تھا۔ پروگرام کو دیکھتے ہی اُنہوں نے فیصلہ کر لیا کہ موضوع آسان ہے۔ خوبصورتی اور جوانی۔ بس یہی دو چیزیں۔ زیادہ سے زیادہ پندرہ منٹ میں طلبہ سمجھ لیں گے۔

لیکن جب اُنہوں نے کاغذ پر لکھا۔ "حسن کے معنی خوبصورتی اور شباب کے معنی جوانی ہیں"۔ تو جیسے اُن کے دل نے اندر ہی اندر سے اُونچی آواز میں کہا۔ "غلط!"

اُنہوں نے قلم رکھ دیا۔ اور اُٹھ کر ایک الماری سے کتاب نکال لی تھوڑی دیر اُس میں دیکھنے کے بعد اُن کے چہرے پر چمک سی آگئی۔ جیسے کسی گداگر کو اپنا حسین ماضی یاد آگیا ہو۔ وہ دوبارہ میز پر آگئے۔ اور لکھنے لگے۔

"حُسن کے معنی ہیں جسم کی ایسی بناوٹ جو . . . ." اس سے آگے وہ لکھ نہیں سکے۔ لکھنا تو اُنہیں ضرور تھا۔ لیکن خیالات کو ظاہر کرنے کے لئے اُن کے پاس موزوں الفاظ نہ تھے۔ اور جو تھے وہ نامکمل اور اُدھورے سے تھے۔ اُن لفظوں سے وہ بات ظاہر نہ ہوتی تھی۔ جو وہ کہنا چاہتے تھے۔

اُنہوں نے میز پر پڑی ہوئی گھنٹی کو زور سے بجایا۔ تھوڑی دیر میں اُن کا بہرا آگیا۔

مکرجی بولے۔ "چائے بناؤ، اور بہرے سے کہ دو۔ وسکی کا ایک گلاس ہمیں دیتا جائے۔"

بہرہ حیران رہ گیا۔ اُس نے سوچا۔ "آج صاحب کو کیا ہوگیا۔ مجھے پہچانتے تک نہیں۔"

تب اُس نے کہا۔ "بہت اچھا حضور۔ لیکن شنکر آج بیمار ہے اُسے بخار ہو گیا ہے۔"

مکرجی نے بے پروائی سے کہا۔ چائے اور وسکی ہمیں لادو۔ بکواس مت کرو۔"

اور پھر تھوڑی دیر کمرے میں ٹہلنے کے بعد سوچنے کے بعد۔ سر کے لمبے لمبے بالوں میں اُنگلیاں پھیرنے کے بعد اُنہوں نے کاغذ پر لکھا۔ "حسن کے معنی ہیں جسم کی ایسی بناوٹ جو دوسرے کو بہت بھلی معلوم ہو۔ اور شباب کے معنی ہیں بچپن کے بعد کا وہ دَور جب انسان بُرے اور بھلے میں تمیز کر سکتا ہے۔"

لیکن اُن کے بے خوف دل نے پھر زور سے کہا۔ "یہ بھی نہیں"

(۳)

چائے اور وسکی پینے کے بعد جیسے اُن کے سر سے ایک بوجھ سا اُتر گیا۔ اُنہوں نے کُرسی کو میز کے نزدیک کھینچا۔ اور سامنے پڑے ہوئے کاغذ پر لکھنے لگے۔ "حُسن کے معنی ہیں کھِلے ہوئے پھول۔ اُودی اُودی گھٹائیں ہرے بھرے کھیت۔ مسکرانے والی ندیاں اور . . . . شباب کے معنی ہیں جوش۔ غصہ۔ اُمیدوں کا مرکز۔ انسانی زندگی کا درمیانی حصہ۔ خوبصورت آگ"! لیکن پھر یہ تشریح بھی اُنہیں کچھ اچھی معلوم نہ ہوئی۔ اُنہوں نے اپنے آپ سے کہا۔ "یہ بھی نہیں"

وہ با دلِ نخواستہ سیر کے لئے اُٹھے۔ تاکہ سیر کرتے کرتے ہی اُن کے دماغ میں کوئی نیا خیال آجائے۔ وہ نیچے اُترے۔ باورچی خانہ کے نزدیک پہنچ کر اُن کے قدم رُک گئے۔ اندر کوئی میٹھے سُروں میں گنگنا رہا تھا۔ اور پھر گنگنانے کے بعد۔ ایک دل کش اور دل نشین [illegible]ز اُنہوں نے سُنی ؎

اِس دُنیا میں کون ہمارا!
ہم ہیں آپ ہی اپنے ساتھی

مکرجی آہستہ آہستہ نیچے اُترے۔ اُنھوں نے جھروکے سے دیکھا۔ گانے کی آواز بدستور آرہی تھی ؎

ساگر میں جوں موجیں اُٹھیں اُٹھ کر جائیں ڈوب!
دُور کنارے کو وہ دیکھیں
بھیگی نظروں سے پھر گائیں

اِس دنیا میں کون ہمارا ——— ہم ہیں اپنے ساتھی

آگ کی روشنی کے سامنے نرؔدنا کا چہرہ شعلے کی طرح دہک رہا تھا۔ انجان ہونے کی وجہ سے اُس کے بال بکھرے ہُوئے تھے اور سر سے دوپٹہ کھسک کر اُتر گیا تھا۔ اور دُھوئیں سے اُس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

اُس نے مکرجی کو نہیں دیکھا۔ لیکن مکرجی نے اُسے دیکھا اور حیران رہ گئے۔" یہ لڑکی کون ہے۔ یہاں کیونکر آگئی ہے۔ اِسے کس نے بُلوایا ہے۔ شنکر کہاں گیا ہے؟" ایسی ہی باتیں اُن کے دل میں اُٹھیں۔ وہ دبے پاؤں پھر اُوپر چلے گئے۔ گھنٹی بجائی۔

بہرے کو دیکھ کر اُنھوں نے پوچھا "شنکر کہاں ہے؟"

بہرے نے کہا۔" وہ بیمار ہے حضور!"

" ہمارا کھانا کون پکاتا ہے؟"

" اُس کی ——— بیٹی سرکار ——— بڑے سلیقے والی ہے۔"

" اُسے کس نے بُلایا۔ کس کی اجازت سے؟"

بہرے نے کانپتے ہوئے کہا۔" اُسی نے حضور!"

مکرجی نے غصے میں کہا۔" اُسے یہاں سے نکال دو۔ ابھی نکال دو۔ جاؤ۔"

نیچے اُتر کر بہرے نے کہا۔" تم چلی جاؤ نرؔدنا۔ صاحب ناراض ہوگئے ہیں۔ اُٹھو جلدی کرو۔"

رسوئی کے ملحقہ کمرے میں شنکر کھاٹ پر پڑا تھا۔ اُسے تن بدن کا ہوش نہ تھا۔

نرؔدنا نے کہا۔" اس وقت کہاں جاؤں گی۔ چچا! رات کا اندھیرا ہر طرف پھیل گیا ہے۔ کل صبح تک اَبا ٹھیک ہوجائیں گے تو چلی جاؤنگی۔"

لیکن بہرہ مکرجی کی طبیعت سے واقف تھا۔ اُس نے کہا۔" میں کیا کرسکتا ہُوں۔ جہاں جی چاہے۔ چلی جاؤ۔ لیکن یہاں نہیں ٹھہر سکتی ہو۔ اُٹھو بجھا دو یہ آگ!"

نرؔدنا کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئی۔ جہاں اُس کا باپ بستر پر پڑا تھا۔ اُس نے اُسے ہلا ہلا کر کہا۔" بتا جی اس وقت کہاں جاؤں گی؟"

شنکر نے آنکھیں کھولیں اور پھر بند کرلیں۔

اور بہرے نے نرؔدنا کو ہاتھ سے کھینچتے ہوئے کہا۔" اُٹھتی کیوں نہیں؟ اب ہماری کھال کھچوائیگی۔"

اُدھر دالان میں کھڑے کھڑے پروفیسر مکرجی یہ باتیں سُن رہے تھے۔ اور سوچ رہے تھے۔" یہ بھی تو ظلم ہے۔ اس وقت کہاں جائیگی؟"

اِتنی دیر میں بہرہ نرؔدنا کو ہاتھ سے کھینچ کر باہر نکال لایا۔ نرؔدنا رو رہی تھی۔ اُس کی ساڑھی سر سے ہٹ گئی تھی۔ بال بکھر گئے تھے۔ لیکن ظالم بہرہ اُس کو دھکیل دھکیل کر باہر نکالنا چاہتا تھا۔

مکرجی نے اُوپر سے آواز دی۔" رہنے دو آج کی رات۔ لیکن کل صبح میں اِسے یہاں نہیں دیکھنا چاہتا۔"

بہرے نے نرؔدنا کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ نرؔدنا نے بھیگی ہوئی نظروں سے مکرجی کی طرف دیکھا۔ اور ساڑھی کے پلّو سے آنسو پونچھتی ہوئی اندر چلی گئی۔

(۴)

اُس شام صاحب نے کھانا نہیں کھایا۔ صرف سوچتے رہے "میں نے اصول کے خلاف بغاوت کیوں کی؟ اپنے مکان میں ایک عورت ذات کو رہنے دیا۔"

کبھی سوچتے تھے۔" نرؔدنا کتنی بھولی بھالی لڑکی ہے کتنی حسین۔ جیسے کیچڑ میں اُگا ہُوا کنول۔ اس کے گلے میں کتنی مٹھاس ہے۔" اسی کشمکش میں وہ کھوئے گئے۔ کبھی سوچتے۔" کیا ہُوا اگر رات سے میں تو اس کا ذمہ وار نہیں۔ نرؔدنا کو ابھی میرے مکان سے نکل جانا چاہیئے۔ اور کبھی سوچتے کہ رات اب ختم ہُوا ہی چاہتی ہے۔ لیکن نرؔدنا ——— کتنی اچھی ہے۔ اسے دیکھنے کی خواہش کیوں دل میں بار بار پیدا ہوجاتی ہے۔"

ایک بار وہ سچ مچ اُسی کمرے میں آگئے۔ جس میں نرؔدنا باپ کی کھاٹ کے نزدیک سخت فرش پر سو رہی تھی۔ اُنھوں نے ارادہ کیا تھا۔ کہ نرؔدنا کا ہاتھ پکڑ کر اُسے مکان سے باہر نکال دونگا۔ لیکن جب وہاں پہنچے۔ تو دیکھا۔ نرؔدنا پھولوں کے ایک ڈھیر کی طرح سوئی پڑی ہے۔ بے پروا۔ انجام سے بےخبر مست۔ اُس کی مخمور آنکھوں سے گیتوں کی ایک ندی سی بہی جارہی ہے۔ اور

اُس کے ہونٹوں سے مسکراہٹ چھن چھن کر نکل رہی ہے۔

مکرجی نے اُس کے بدن کو آہستہ سے چھوا۔ پھر ہاتھوں کو چھوا، پھر بالوں کو۔ اور جلد جلد اپنے کمرے میں واپس چلے آئے۔ میز پر شام کا لکھا ہوا کاغذ ویسے کا ویسا پڑا تھا۔ لکھی ہوئی دو تین سطروں پر انہوں نے خط کھینچا اور پھر لکھا۔ حُسن کے معنی ہیں زرونا اور شباب کے معنی ہیں زرونا کا تصوّر!

لیکن یہ لکھ کر انہوں نے اپنے آپ سے کہا "طلبہ زرونا کو کیا سمجھیں گے"۔

تب آپ ہی آپ ہنس کر کہنے لگے۔ زرونا ـــ لڑکی ـــ عورت ذات ـــ"

اِسی طرح سوچتے سوچتے اُن کا دماغ تھک گیا۔ کئی بار انہوں نے کاغذ پر لکھا "حُسن کے معنی ہیں ـــ اور شباب کے معنی ـــ" ایک بار جب انہیں بہت غصہ آیا تو انہوں نے لکھا "حُسن کے معنی ہیں مکرجی کا سر اور شباب کے معنی ہیں لڑکوں کا سر ـــ!"

اور آپ ہی آپ دیوانوں کی طرح ہنسنے لگے۔ معاً نہ جانے انہیں کیا خیال آیا۔ اپنے آپ سے بولے۔ "زرونا تم نے ٹھیک کہا۔ میں بھی اکیلا ہوں، تم بھی اکیلی ہو۔ ساگر کی موجوں کی طرح میں بھی کنارے کی طرف دیکھ کر آپ ہی آپ ڈوبے جا رہا ہوں اور تم ـــ شاید تمہارا بھی کوئی ساتھی نہیں۔ میں ایک سوال ہوں، تم اُس سوال کا جواب ـــ میں حُسن ہوں اور تم مکرجی کا شباب!"

لیکن اچانک وہ چونک اُٹھے۔ اپنے آپ سے بولے۔ "پروفیسر! زرونا عورت ہے!"

عورت کا خیال آتے ہی اُن کا حسین خیال نہ جانے کہاں گم ہو گیا۔ اس بار انہیں اپنی زندگی کا وہ اصول جسے وہ معبود کی طرح پوجتے تھے، یاد آ گیا۔ وہ اپنے دل کو مضبوط کر کے اُٹھے اور نیچے اُترے۔

زرونا سو رہی تھی۔

اُس نے نیند ہی میں کروٹ بدل کر کہا۔ "پتاجی! میں جاؤں گی"۔

مکرجی کا دل مینڈک کی طرح اُچھل رہا تھا۔ ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اور زبان سوکھ گئی تھی۔

زرونا نے پھر نیند میں کہا۔ "وہ مجھے نکال رہے ہیں۔ تم نے مجھے بلایا ہی کیوں؟ تم غریبوں کو اپنے پاس کون رہنے دیتا ہے!"

مکرجی نے آہستہ سے زرونا کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ زرونا جاگ اُٹھی۔

حیران نظروں سے اُس نے مکرجی کو دیکھا اور خوف بھرے دل سے کہا۔ "پتاجی!"

مکرجی نے آہستہ سے کہا۔ "زرونا"

زرونا نے سر پر کپڑا ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔ "میں ـــ صبح ہی چلی جاؤں گی"۔

مکرجی بولے۔ "نہیں ـــ اب تم نہیں جا سکتیں۔ زرونا ـــ تم اب یہیں رہو گی ـــ رانی بنو گی ـــ"

دیہاتی لڑکی یہ فلسفہ کیا سمجھ سکتی۔ وہ بے اختیار بول اٹھی ـــ پتاجی! ـــ پتاجی!

مکرجی بولے "کہو۔ نہ جاؤں گی ـــ یہیں رہوں گی ـــ ہاں کہو!"

زرونا نے اُن کی طرف دیکھا، کہا کچھ نہیں۔

اُسی وقت چارپائی پر شنکر نے کروٹ بدلی۔ اور بخار کے زور میں لڑکھڑاتی ہوئی زبان سے کہا۔ زرونا۔ چلی جاؤ۔ یہ شہر ہے ـــ"

مکرجی جلد جلد اپنے کمرے کو لوٹے۔ اُن کا تھکا ہوا دماغ جیسے تازہ ہو گیا تھا۔ جیسے اُنہوں نے ایک مدت کے بعد کوئی چیز ـــ انمول ـــ اور بیش بہا پڑی پائی ہو۔ لیکن دوسری طرف اُن کا دل نیچے ہی نیچے ڈوبتا جا رہا تھا۔

کرسی پر بیٹھ کر انہوں نے نیا کاغذ لیا۔ اور موٹے موٹے حروف میں لکھا۔

حسن ہے نظر کا دھوکا
اور شباب اپنے لہو کی شعلہ بار آگ!

یہ لکھ کر انہوں نے اسے کئی بار اونچے سروں میں گایا۔ سوچتے رہے جب زرونا مسز مکرجی کہلائے گی تو اس لاجواب تشریح کو لکڑی کے فریم میں لکھوا کر کمرے میں لٹکوا دوں گا"۔

صبح وہ بہت سویرے نیچے اترے۔ دیکھا تو پھاٹک کھلا تھا۔ شنکر کے کمرے میں گئے۔ وہاں بھی دروازہ کھلا تھا اور شنکر بے ہوشی کی حالت میں اونگھ رہا تھا۔ زرونا وہاں نہ تھی۔

بہرے نے سلام کر کے کہا۔ "چھوکری چلی گئی ہے، حضور ـــ نہ جانے کس وقت!"

مکرجی نے بے اختیار ہو کر پوچھا۔ "چلی گئی؟"

بہرے نے کہا "ہاں سرکار"۔

اس جواب سے جیسے دنیا بھر کی نااُمیدی مکرجی کے چہرے پر آکر بیٹھ گئی۔ وہ خاموش ——— آہستہ آہستہ اپنے کمرے میں آ گئے۔ رات کے لکھے ہوئے کاغذ کو غور سے دیکھنے لگے جس پر لکھا تھا۔

حسن ہے نظر کا دھوکا

اور شباب اپنے لہو کی شعلہ بار آگ!

اور پھر اپنے آپ سے بولے "ٹھیک ہے۔ یہی حسن اور شباب کے معنی ہیں"

اسی دن کالج میں طلبہ نے حسن اور شباب کے موضوع پر پروفیسر مکرجی کا عالمانہ لیکچر سُنا تو اُن کی ہمہ دانی اور وسعتِ مطالعہ پر دنگ رہ گئے۔ لیکن انہیں معلوم نہ تھا کہ یہ پروفیسر مکرجی کی اُس بغاوت کی سزا ہے جو انہوں نے عمر بھر کے اصول کے خلاف ایک اندھیری رات میں برپا کی تھی۔

رونق کاشمیری

غزل

کرتا ہوں دل سے الفت کی باتیں دیوانہ پن کی۔ وحشت کی باتیں

اچھی ہیں زاہد طاعت کی باتیں لیکن ہیں وہ بھی فرصت کی باتیں

کیا پوچھتے ہو الفت کی باتیں بھولی ہوئی ہیں مدت کی باتیں

کیوں خوش ہیں دشمن ناکامیوں پہ ناکامیاں ہیں قسمت کی باتیں

بیگانہ بن کر دل مانگتے ہو ! بیگانگی میں !! حجت کی باتیں

دیکھو تو منزل وہ سامنے ہے لیکن پہنچنا ہمت کی باتیں

ناصح کی باتیں اچھی ہیں لیکن کب مانتا ہوں حضرت کی باتیں

ہوتے ہیں پہلے بدنام و رسوا۔
جو ڈھونڈتے ہیں شہرت کی باتیں

کشفی ملتانی

عربی خط کی بین الاقوامی حیثیت

کتابت یعنی افکار و خیالات کو تخیل ناپائیدار موجوں سے نکال کر نقوش کی پائیدار صورت میں لانا۔ دور حاضر کی محدود دنیا سے بڑھ کر غائب کی لامحدود دنیا کے لئے محفوظ کرنا آج سے نہیں بلکہ شاید ابتدائے تمدن سے دنیا کا اہم ترین کام رہا ہے۔

کہتے ہیں کہ تمدن کی ابتدا جزیرہ کریٹ میں ہوئی تھی اور اس کے لئے جو کچھ ثبوت دیا جا سکتا ہے۔ وہ آثار کے ساتھ ساتھ کچھ نہ بولنے والے لیکن اپنا حال بتا دینے والے نقوش اور لکیریں بھی ہیں۔ آج سے بہت دن پہلے نہیں صرف بارہ سو سال پہلے کی بات ہے کہ کاتب وزیر اعظم کو کہا جاتا تھا۔ اور قرون وسطیٰ کی سب سے بڑی متمدن اور وسیع سلطنت کا وزیر اعظم اب بھی تاریخ میں عبدالحمید الکاتب کے نام سے مشہور ہے۔ یہ شخص دمشق کی اس عظیم الشان سلطنت کا وزیر اعظم تھا جس کی پہنائیوں میں فرانس کی مشرقی حدود سے لے کر ہندوستان جنت نشان کے گرد گرما و گورستان والے علاقے ملتان کی زمین بھی داخل تھی۔ اور اس زمین پر وہ خونیں مہریں جو مجاہدین کی پرعظمت قبور کی شکل میں دکھلائی دیتی ہیں اس بات کی بڑی شہادت ہیں کہ عبدالحمید الکاتب کے قلم کی نکلی ہوئی سیاہی کی ضوفشانیاں یہاں بھی دکھائی دیتی تھیں۔

یہ باتیں اس وقت کی ہیں جب زمین کی مسافتوں نے انسانی قوت واقتدار کے آگے سرنگوں ہو کر آدم کے بیٹے سے ابھی تک شکست نہیں قبول کی تھی کچھ گھوڑے اور کچھ بیل، اونٹوں کے لمبے قدم اور ہاتھی کے بھاری بھرکم پیر صرف وہ ذرائع تھے جو انسان کو زمین کی مسافتوں پر غالب کرنے کے لئے استعمال کئے جا سکتے تھے۔ لیکن اب ۱۳۵۷ھ اور ۱۹۳۹ء میں زمین نے کانپ کر اپنی طنابیں کھینچ لی ہیں۔ ہوا ہمارے اقتدار میں ہے اور اثیر پر ہماری حکمرانی ہے۔ دنیا تدریجی طور پر مگر بڑی تیزی سے گھر آنگن اور کمرہ و برآمدہ کی شکل میں مبدل ہو رہی ہے۔ آدم علیہ السلام کے بیٹوں کا سارے ربع مسکون پر پھیلا ہوا کنبہ مسافتوں اور دوریوں کے بندھنوں کو توڑ کر ایک ہوتا جا رہا ہے۔

مجھے معلوم ہے کہ آسمانی اور لاہوتی تقسیم کے خلاف انسانوں کو پہاڑوں۔ ندیوں اور دریاؤں پر تقسیم کیا گیا تھا۔ گائے، بیل اور بھینس کی طرح انسانوں کو بھی باپ اور ماں کی قسموں پر تقسیم کرنے کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ لیکن کیا کوئی دانا انسان جس کے دماغ میں فاسفورس کا ایک دانہ بھی موجود ہے وہ اپنی اس بصیرت کی بنا پر جس سے آیندہ پچاس سال تک نکلنے والے آفتاب کی ضیاباریوں کو دیکھ رہا ہے۔ یہ باور کر سکتا ہے کہ مستقبل کا انسان ان وسائل کی موجودگی میں اپنے کو کسی جغرافیہ یا نسل کے اندر قید کرنا گوارا کر سکے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ دیکھنے والے کے سامنے یورپ کا علم گرد وطن اور ہٹلر اور مسولینی کا نسلی صنم اکبر خاک کے ڈھیر کی شکل میں ابھی سے دکھائی دے رہا ہے یاد رکھو کہ شاخ نازک پر بنایا ہوا آشیانہ بدیر قایم نہیں رہ سکے گا اور رفتار عالم کے ایک جھکولے سے یہ نشیمن ناپائدار اسفل السافلین کی گہرائیوں میں نظر آئے گا۔ دیمقراطی فاشستی ہنگامے اس تمدن سے خودکشی کرا کے چھوڑیں گے۔

اس کے بعد غور طلب امر یہ رہ جاتا ہے کہ دنیا میں جو چار ستین خطوط و حروف رائج ہیں ان میں سے کونسا خط موجودہ وقت سے لے کر آیندہ انقلابات کے بعد تک اپنی بین الاقوامی اہمیت قائم رکھ سکے گا۔ آئیے آج اس موضوع پر ہم اور آپ دونوں غور کریں۔ تعصب، ضد اور ہٹ کے سیاہ پردے انسان کو حقائق اور واقعات کے صحیح خدوخال نہیں دیکھنے دیتے ورنہ ہندوستان کے ان گرد وں ضدی

انسانوں کو صاف نظر آجاتا کہ ہندوستان کے گیارہ خطوط میں سے
صرف اردو (یعنی عربی) خط ہی وہ اکیلا خط ہے جس کو اس وقت اور آیندہ
بھی عظیم الشان بین الاقوامی حیثیت حاصل رہے گی۔ بیٹک کھڑ والے
حروف کوئی بین الاقوامی حیثیت نہیں رکھتے اور نہ کبھی حاصل کر سکیں
گے۔ انڈین نیشنل کانگرس سی۔پی۔ مدراس بمبئی یا زیادہ سے زیادہ
ہندوستان کی زمین میں اسے جبری قرار دے کر اس کے سوا کچھ نہیں
کر سکتی کہ انگریزی زبان اور رسم الخط کے لئے یہاں مضبوط قلعہ تعمیر
کر دے۔ تمدن کے انتہائی عروج پر بھی یہ خط بین الاقوامی خط نہیں بن سکتا
جاپان، عزور ایشیا جاپان۔ تمدن اور صنائع کی جس بلند چوٹی پر پاؤں جمائے
ہوئے ہے۔ وہ آپ اور ہم سب کے سامنے ہے لیکن آپ دیکھتے ہیں
کہ جاپان کی بڑی بڑی کمپنیوں کے حساب بیرونی خط وکتابت نیز
دیگر تجارتی ضروریات میں جو خط استعمال ہوتا ہے وہ جاپانی نہیں بلکہ لاطینی
ہے۔ چین دنیا کا سب سے بڑا ملک وسعتوں اور پہنائیوں کے اعتبار سے
تقریباً پورے یورپ کا حریف اپنے خط کو اس قابل نہ بنا سکا اور نہیں بنا
سکتا کہ چین سے باہر والے انسانوں کی آنکھیں اس سے آشنا ہوسکیں
یاد رکھئے کہ جب تک خود خط میں صلاحیت موجود نہ ہو یا دنیا کے ہر حصے میں
کچھ ایسے انسان نہ پائے جاتے ہوں جو کسی وجہ سے اُس خط سے آشنا
ہوں کوئی خط اپنے مرکز سے نکل کر عالم کی وسیع پہنائیوں پر نہیں چھا سکتا۔

اس زمانے میں جبکہ رسل ورسائل، نقل وحمل کی آسانیوں نے
ممالک کے باہمی تعلقات اور تجارتی روابط کو استوار کر دیا ہے۔ بار بار ایک
ایسے خط اور ایسی زبان کا سوال سامنے آرہا ہے جو آسانی کے ساتھ آدم
علیہ السلام کے تمام بیٹوں کے لئے کم از کم مانوس ثابت ہوسکے اس کے
لئے کیا کیا کوششیں نہ کی گئیں۔ اس پرنٹو کی ایجاد افریقہ اور ایشیا میں
جابجا گرامر اسکولوں کا قیام پھر ان کی چار سو سالہ محنتیں، آپ نے دیکھا کہ
ایک ایک کر کے ناکام اور نامراد ثابت ہوئیں۔ مجبوراً مجلس اقوام کو تین
بین الاقوامی زبانیں تسلیم کرنی پڑیں۔ انگریزی، فرانسیسی، اور عربی ان میں
سے دو زبانیں یعنی انگریزی اور فرانسیسی ایک ہی خط میں لکھی جاتی ہیں۔
اس لئے بحث صرف دو خطوط یعنی عربی اور یورپین زبانوں کے موجودہ
خط یعنی لاطینی رسم الخط میں رہ جاتی ہے۔ دنیا میں چھوٹے چھوٹے مقامی
رسم الخط اور بھی بہت سے رائج ہیں جن میں انھری، چینی، جاپانی، ہندی،
ناگری، گجراتی، ملیالم، برمی، مارواڑی کیتھی، منچورین، آسامی، بنگالی،
میکاسار، وغیرہ بہت مشہور ہیں لیکن ان حروف کی حیثیت بالکل
مقامی، محدود اور بین الاقوامی نقطہ نظر سے ایک صفر سے زیادہ
کچھ نہیں۔

لاطینی رسم الخط ارباب ثروت کا خط ہے۔ تجارت اور حکومت
کے پالنوں میں پلا اور پروان چڑھا ہے اس لئے بڑا محیط اور بین الاقوامی
رسم الخط نظر آتا ہے لیکن اس کے فنا اور بقا کا دارومدار استعمار اور
انتداب کی زندگی پر ہے جو روز بروز اپنے قوائے حیات آہستہ آہستہ
تدریجی طور پر کھو رہا ہے حقیقی طور پر اس رسم الخط کا وطن یورپ ہے
اور امریکہ کو اس کا ننھیال کہا جاسکتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس کا طنطنہ
یورپین استعمار کی گرفت کے سست پڑتے ہی ختم ہو جائے گا۔ دیر
سویر مشرق کو اپنی جدوجہد میں کامیاب ہونا ہے اور ہو کر رہے گا۔
اس وقت انتقام اور مخالفت کے جذبات جلد یا بدیر مشرق سے اس
خط کا بستر بند ہوا کے چھوڑیں گے۔ اس وقت انگریزی، اطالوی، جرمن،
نارویجین، ہنگرین، روسی، پرتگالی، اسپینش، پولش، چیکوسلوکین۔
ترکی، اور رومانی زبانیں اس خط میں لکھی جاتی ہیں جن کے بولنے والوں
کی مجموعی تعداد تقریباً ساڑھے سینتالیس کروڑ ہوتی ہے۔

جیسا کہ سب کو معلوم ہے یورپ بہت ہی گھنی اور گنجان آبادی
کا علاقہ ہے اسباب حیات کی اتنی کافی پیداوار نہیں ہوتی کہ وہ افریقہ
اور ایشیا کی خام پیداوار سے کبھی بے نیاز ہو سکے اس لئے یہ کہا جا
سکتا ہے کہ موجودہ تمدن کی سربفلک عمارت ایشیا اور افریقہ کے ساتھ
تجارتی تعلقات پر قائم ہے۔ تجارتی تعلقات میں خط کو جو اہمیت حاصل
ہے محتاج بیان نہیں۔ اسی لئے مجلس اقوام نے ایشیا کی سب سے
بڑی وسیع اور اہم زبان عربی کو بین الاقوامی زبان کی حیثیت سے قبول
کر لیا۔ مجھے معلوم ہے کہ مصر، شام، اور تونس اور الجزائر کی بیسیوں کمپنیاں
اپنے کاروبار اسی خط میں انجام دیتی ہیں اور روز بروز عربی خط کے
استعمال کا جذبہ ناگزیر ضروریات کی بنا پر سخت سے سخت ہوتا جارہا ہے
ابھی کچھ دنوں کی بات ہے کہ عراق نے لاطینی رسم الخط کا استعمال ممنوع
قرار دیا ہے، ایران میں بھی ممانعت کر دی گئی، مصر میں بھی یہ تحریک
بڑے زوروں پر جاری ہے۔ ریلوے اور دیگر چند دفاتر ہیں جن میں
نہر سویز کا بین الاقوامی دفتر بھی شامل ہے۔ عربی جاری کر دی گئی، شام
طرابلس، برقہ، لیبیا، سمالی لینڈ، اری ٹیریا، فارس، جزائر ملایا، بورنیو،

سماٹرا، مارشس، فلیپائن اور سنگاپور وغیرہ میں اسی قسم کی تحریکیں کام کر رہی ہیں۔ فاتح اطالیہ نے حبشہ کی سرکاری زبان عربی قرار دی ہے اس کا مطلب ان واقعات کی موجودگی میں اس کے سوا اور کیا سمجھا جاسکتا ہے کہ ایشیا اور افریقہ یعنی دنیا کی سب سے زیادہ آبادی رکھنے والے حصّوں میں لاطینی رسم الخط کے خلاف مستقل مگر خاموش جدو جہد جاری ہے۔ سیاسی اقتدار کی گرفتیں چاہے دیر میں ڈھیلی پڑیں مگر خط کا قبضہ جلد ہی اکھڑتا نظر آرہا ہے۔ یورپ اپنی تجارتی اور سیاسی دونوں ضرورتوں کے اعتبار سے مجبور ہے کہ صرف خط کی بقا سے قطع نظر کرتے ہوئے حقیقی ٹھوس اور اہم فوائد کے واسطے عربی رسم الخط کو اس کی وسعتوں میں پوری طرح پھولنے پھلنے دے۔

انگلستان میں اطالیہ میں جرمنی میں اور روس میں بیسیوں ایسے مدارس اس وقت جاری ہیں جہاں عربی زبان اور عربی خط کی تعلیم دی جارہی ہے۔ لنڈن، روما، برلن بارسلونا، رومانیہ، وائنا، تیرانہ، بوداپسٹ، ارجنٹائن، امریکہ، کلیفورنیا، وغیرہ سے بیسیوں عربی روزنامے، ہفتہ وار اور ماہوار، رسائل اور کتب شائع ہوا کرتی ہیں۔ بڑے بڑے براڈکاسٹنگ اسٹیشنوں سے انہیں ضروریات کے مدنظر ہفتہ میں دو بار تین بار بعض جگہہ سے روزانہ عربی پروگرام براڈ کاسٹ کیا جارہا ہے۔

چاہے یہ تمام مساعی کسی ضرورت اور فایدہ کے مدنظر ہوں اور کون نہیں جانتا کہ استعمار سیاسی گرفت اور پروپیگنڈا کی غرض سے یہ سب کچھ کیا جاتا ہے۔ لیکن اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ عربی زبان اور عربی خط کی اہمیت روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور لاطینی رسم الخط اپنے گھر اور اپنی سلطنت میں بھی اس کے لئے جگہہ بناتا جارہا ہے اور کچھ دنوں اگر یہی حالت رہی تو جہاں کافی جگہہ کا مالک ہوگا سلطنت چاہے بعد کو بنے یا بنتے بناتے صدی بسر ہوجائے۔ زبان اور خط ابھی سے قابو پارہا ہے۔ ہمیں اسے دیکھنا اور سمجھنا چاہئے۔

کسی زبان کی بین الاقوامی حیثیت کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ ملکوں کے باہمی تعلقات میں وہ خط اور زبان کارآمد ہوسکے اور زمین پر پھیلے ہوئے دور افتادہ ممالک میں سے تمام یا اکثر جگہہ ایسے افراد پائے جاتے ہوں جو ان حروف کے ذریعہ اپنے خیالات منتقل کرسکیں یا دوسرے کے خیالات سے بہرہ اندوز ہونا ممکن ہو۔ اس حیثیت سے جب کسی حرف کو دیکھا جائے توسب سے پہلے یہ معلوم کرنے کی ضرورت پڑے گی کہ دنیا کے بہت سے ممالک میں جن سے ہمارے تجارتی اور سیاسی تعلقات قائم ہیں ان حروف کے جاننے اور پہچاننے والوں کی کیا تعداد ہے

زبان اور حروف سے وابستگی قوموں کی دیرینہ روایات کا نتیجہ ہوتی ہے صرف تجارتی منافع اور مادی ضروریات حرف شناسی کو ایک ملک سے دوسرے ملک تک نہیں پھیلا سکتیں۔ ہندوستان میں انگریزوں کو قدم جمائے دوسو برس سے زیادہ کا عرصہ ہوگیا لیکن انگریزی حروف سے واقف کاروں کی تعداد دفتری اشخاص سے آگے نہ بڑھ سکی۔ جب تک کوئی قوم فریضہ کے طور پر نہ پڑھے حرف شناس نہیں ہوسکتی۔ مجھے بتانے کی ضرورت نہیں کہ پڑھے لکھوں کی تعداد جن ممالک میں زیادہ پائی جاتی ہے۔ وہاں اس کی ابتدائی تحریک مذہبی جذبات کی مرہون منت تھی آپ جانتے ہیں کہ موجودہ یورپ کے اسلاف نے انجیل پڑھنے اور کتاب مقدس سے روشناس ہونے کے لئے لوگوں کو پہلے پہلے پڑھنے پر آمادہ کیا تھا۔ ساری دنیا کے برخلاف صرف ایک قوم نے یہ کیا کہ اپنی مذہبی کتاب کو لوگوں کے سامنے نہ صرف پیش نہیں کیا بلکہ پڑھنا تو الگ رہا۔ سننے والے کے کان میں سیسہ پگھلا کر ڈال دینے کی سزا تجویز کی نتیجہ جو ہوا وہ آپ کے سامنے ہے۔ تین ہزار سال کے قریب ہوتے ہیں کہ آریہ قوم نے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا بادشاہتیں قائم کیں۔ یہ تسلیم ہے کہ ایک تمدن بھی ان کا تھا۔ فاتحانہ طاقتوں سے ہندوستان کے قدیم مذاہب کو ملیامیٹ کر دیا گیا۔ کچھ نئی چیزیں خود اختیار کیں اور کچھ دوسروں سے اختیار کرائیں۔ غرض خیالات نے باہم فعل وانفعال پاکر ایک ہمہ گیر سا مذہب پیدا ہوگیا جس میں ہندوستان کی تقریبًا تمام اقوام شامل ہوگئیں لیکن اسی مذہبی بخالت کا نتیجہ تھا کہ ہندوستان کے تقریبًا تمام قدیم حروف اور زبانیں زندہ رہ گئیں اور آج جب سیاسی ضروریات کے مدنظر مدراس میں ہندی کی جبری تعلیم جاری کی جارہی ہے تو تامل نیڈو کی طرف سے مخالفتیں ہو رہی ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ اس کی کیا وجہ ہے؟ اس کی وجہ ایک اور صرف ایک ہے وہ یہ کہ ہندی حروف سے حقیقتًا کوئی مذہبی روایات وابستہ نہیں ہے اور ایک مدراسی ہندو کے لئے واجب وفرض تو کیا نفل بھی نہیں کہ ہندی حروف سیکھے۔ اسی طرح عرب عیسائی کے لئے عربی میں انگریز عیسائی کے لئے انگریزی میں اطالوی عیسائی کے لئے اطالوی میں اور فرینچ کے لئے فرانسیسی میں بائبل کا پڑھ لینا خیر وبرکت کے لئے کافی ہے۔ گویا عیسائیت کو دنیا کے کسی

رسم الخط سے کوئی مضبوط واسطہ نہیں۔

ان ہی دو پر منحصر نہیں بلکہ دنیا میں کوئی ایسی کتاب آسمانی ہو یا زمینی موجود نہیں ہے جس کا اپنی اصلی عبارت اور اصلی حروف میں پڑھنا واجب ہو۔ بجز ایک اور صرف ایک کتاب کے جسے قرآن مجید کہا جاتا ہے سائبیریا کے برفستانی میدانوں سے لے کر افریقہ کے تپتے ہوئے صحراؤں تک اور پیرس کی خوشنما عمارتوں سے جنوبی افریقہ کے جھونپڑوں تک یہ کتاب جہاں جہاں پڑھی جاتی ہے اپنے اصلی حروف اصلی زبان اور اصلی عبارت میں پڑھی جاتی ہے اور ساری دنیا جانتی ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب قرآن شریف ہی ہے۔ اسی لئے عربی خط ہر مقام کے لئے ایک مانوس رسم الخط کی حیثیت رکھتا ہے۔

دنیا میں شاید ہی کوئی ایسی یونیورسٹی ہو جس میں اسلامیات، عربی، فارسی، یا کسی اور نام سے اس خط کی تعلیم نہ دی جاتی ہو۔

جدید تمدن کے مرکز اعظم پیرس، برلن اور لندن سے لے کر افریقہ کے ناقابل عبور جنگلوں کے جھونپڑوں تک بیسیوں۔ سینکڑوں ہزاروں اور لاکھوں نہیں بلکہ دنیا کی ہر قوم سے زیادہ ستر کروڑ انسانوں کی ایسی آبادی پھیلی ہوئی ہے جو دن اور رات میں پانچ مرتبہ قرآن کریم کو اپنی اصلی عبارت میں پڑھتی ہے اور دنیا کا کوئی شہر موجود نہیں جہاں ایک دو نہیں بیسیوں ان حروف کے جاننے والے نہ پائے جاتے ہوں میں اوپر بتا آیا ہوں کہ ارجنٹائن کیلی فورنیا، امریکہ کے اور روما اور میلانو جیسے یورپ کے دور افتادہ مقامات سے عربی کے ماہوار ہفتہ وار نہیں بلکہ روزنامے تک نکلتے ہیں۔

پچھلے دنوں کی بات ہے کہ ہندوستان میں نہیں جہاں نو کروڑ مسلمان ہیں۔ مشرق قریب میں نہیں جہاں تقریباً سارے کے سارے مسلمان ہی بستے ہیں چین میں نہیں جہاں سات کروڑ اللہ کے نام لیوا موجود ہیں۔ بلکہ دنیا کے مشرق بعید زمین آفتاب یعنی جاپان میں مسجد کا افتتاح ہوا تو مجھے بڑی حیرت ہوئی جب میں نے وہاں کی تصاویر اخبارات میں دیکھیں جھنڈوں اور آرائشی دروازوں پر قرآن مجید کی آیات لکھی ہوئی تھیں۔ میرے ایک دوست نے جنہیں جاپان جانے اور وہاں کے لوگوں سے ملنے کا اتفاق ہوا ہے بیان کیا کہ ٹوکیو، اور کوبے میں ہزاروں آدمی ایسے پائے جاتے ہیں جو عربی حروف اور زبان سے واقف ہیں۔

غرض یہ کہ دنیا کے ہر حصے میں مسلمان موجود ہیں اور جہاں مسلمان موجود ہیں عربی زبان موجود ہے اور عربی خط موجود ہے اور جیسے جیسے اسلام بڑھ رہا ہے عربی زبان اور عربی خط بڑھ رہے ہیں۔ مسلمانوں کی مذہبی طور پر اس خط سے وابستگی کے باعث سارے جہان میں عربی خط رائج ہے۔ آپ کو افریقہ کے نہیں بلکہ ایشیا کے مقامات مل جائیں گے جہاں لاطینی رسم الخط سے واقف کوئی شخص نہیں ملے گا۔ لیکن یورپ میں کوئی ایسا شہر نہیں ملتا جہاں عربی جاننے والا نہ پایا جاتا ہو۔

اس سلسلہ میں مخالفوں کی طرف سے بڑے طنطنہ کے ساتھ ترکی زبان کے لئے لاطینی رسم الخط اختیار کئے جانے کا واقعہ پیش کیا جاتا ہے لیکن انہیں شاید یاد نہیں ہے کہ ترکی زبان نے اپنا قدیم آرمینین اور یونانی رسم الخط چھوڑ کر چوتھی اور پانچویں صدی ہجری میں عربی رسم الخط اختیار کیا تھا اور اس کے بعد بھی ہمیشہ کچھ نہ کچھ لکھنے پڑھنے کا کام آرمینین اور یونانی خطوں میں جاری تھا۔ حالیہ انقلابات میں ترکی نے اگر عربی خط کو چھوڑ کر پھر لاطینی خط اختیار کر لیا تو اُسے معمولی سیاسی انقلاب سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ مذہبی طور پر ترکی مسلمان ہے اور اب بھی وہاں سے قرآن کریم اور دینیات کی کتابیں عربی ہی رسم الخط میں چھپ کر شائع ہوتی ہیں۔ عام طور سے لوگ ہندوستان میں ترکی سے واقف نہیں ہیں اور چینی اور جاپانی زبانوں کی طرح اس کے متعلق بھی بہت ہی کم جانتے ہیں اس لئے سمجھتے ہیں کہ ترکی سے عربی رسم الخط بالکل رخصت ہو گیا۔ حالانکہ واقعہ یہ نہیں ہے ۳۵ء ۳۶ء اور ۳۷ء کی چھپی ہوئی بعض کتابیں اس وقت ہمارے سامنے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اب بھی عربی خط کے لئے ترکی میں کافی جگہ محفوظ ہے۔ پہلے سارے گھر پر اس کا قبضہ تھا مگر اب ایک کمرہ پر ہے۔ اس کو قبضہ کا کمزور ہونا تو کہہ سکتے ہیں لیکن اٹھ جانا نہیں کہہ سکتے۔

دنیا کی کوئی قوم دوسری اقوام سے الگ رہ کر زندہ نہیں رہ سکتی آج کی تو کیا بات ہے رسل و رسائل اور حمل و نقل کی بہتات نے مسافتوں کو ہماری آنکھوں سے دور کر دیا ہے اس وقت بھی جب بیلوں اور گھوڑوں کے علاوہ کوئی ذریعہ معلوم نہ تھا۔ دنیا کی کوئی قوم اوروں سے چھوٹ کر نہیں رہتی تھی۔ ہندوستان کے عربستان سے عربستان کے مصر اور افریقہ سے تجارتی و سیاسی تعلقات

تھے دنیا جیسے جیسے ایک کنبہ کی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے افراد تو کیا قوموں کی انفرادی حیات بھی ختم ہوتی جا رہی ہے اور روز بروز مختلف اقوام کی اجتماعی زندگی مضبوط ہوئی ہے ۔اگر قوموں کی اس گھوڑ دوڑ سے کوئی ملک الگ رہے گا تو حبشہ کی طرح دوسروں کا لقمۂ تر ہو جائے گا۔

ہم جس ملک میں رہتے ہیں یعنی ہندوستان یہ بھی اس مسلّم اور کلی قانون سے مستثنےٰ نہیں ہوسکتا۔ہمیں مادی اور معنوی حیثیت سے ہمسایہ ممالک کی بہت سی چیزیں اپنے لئے لینی اور بہت سی ان کو دینی ہیں۔ادب، انشاء، فنون اور بہت سی کچی پکی اشیا کے بیش بہا خزانے اسی طرح ایک سے دوسرے ملک میں منتقل ہوا کرتے ہیں۔جب ہندوستان کی سرزمین پر مسلمانوں نے اپنے قدم نہیں جمائے تھے۔ اور جب اس ملک کو ان کے علوم و تمدن کا گھر بننا نصیب نہیں ہوا تھا اس وقت بھی راجگانِ ہند کے دربار وں میں فارسی کے لئے ایک نہ ایک انشاء پرداز رکھا جاتا تھا کیونکہ پڑوسی ملک ایران سے سفارتی اور تجارتی تعلقات قائم ہے۔

وہ احباب جن کے سامنے بکرماجیت کے وقت کا موہوم ہندوستان ہے اگر تعصب اور ضد کی سیاہ عینکوں کو اپنی آنکھوں سے ہٹا کر دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ وہ "مادرِ وطن" کی راہ میں کانٹے بچھا رہے ہیں۔قومیں اور ممالک اس قسم کی طفلانہ ضد اور تنگ ظرفیوں سے ترقی نہیں کرسکتے۔ہندوستان کو اپنے پڑوسی علاقوں سے گہرے اور مضبوط روابط قائم رکھنے ہیں۔وہ کلچر اور تمدن جو ہزار سال پہلے ہندوستان میں رائج تھا زندہ نہیں کیا جاسکتا۔یاد رکھئے، آفتاب ہر صبح کو نکل کر کل کی چیزیں مٹاتا جاتا ہے اور دنیا کی کسی انفرادی اور اجتماعی طاقت سے جنوری ۱۹۳۸ء کو واپس نہیں بلایا جاسکتا۔ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم یا ان کے واپس لانے کی سعی لاحاصل آفتاب کی کرنوں کو ضیا باریوں سے نہیں روک سکتی۔آپ نے دیکھا اور دنیا نے دیکھا کہ گاندھی جی کا چرخہ لنکاشائر کے ملوں کا مقابلہ نہیں کر سکا۔صدر کانگرس کا جلوس بیلوں کے رتھوں پر نکالا جاسکتا ہے۔ لیکن انتخابی پروپیگنڈے کے واسطے اس حماقت کو دور پھینک کر ہوائی جہاز پر سفر کرنا ہی پڑے گا۔ہندوستان میں موٹر بنانے کی تجویز ہے معقول اور خوش آیند تجویز ہے بیل گاڑیوں سے کسی دیس کا اب بھلا نہیں ہوسکتا غرض یہ کہ ہندوستان کو بھی اسی راہ پر چلنا ہے۔ جس راہ پر چل کر ممالک اور قومیں باعزت ہوتی ہیں۔یہ اچین بھارت کا خروش بے ہنگام اور کانگرس کے پنڈال میں مصنوعی زبان کی ڈرامائی کیفیتیں ہندوستان کا کوئی بھلا نہیں کرسکتیں۔ہاں یہ البتہ کرسکتی ہیں کہ ہندوستان میں انگریزی زبان اور تمدن کے لئے نہ مٹنے والے نقوش قائم کر دیں اور ایک وہ وقت آئے جبکہ ہندوستان کے دو پڑوسی باشندوں کے درمیان تبادلۂ خیالات کا صرف ایک ذریعہ رہ جائے یعنی انگریزی۔اس اعتبار سے انگریزی سامراج کی مدد کانگرس اور کانگرس والے جتنی اچھی کر رہے ہیں ایک لاکھ رائے بہادروں اور کروڑ خان بہادروں سے بھی نہیں ہوسکتی۔

ذرا نقشۂ عالم پر غور کیجئے جغرافی حالات سامنے رکھئے دیکھئے کہ ہندوستان کے گرد و پیش کون سے ممالک ہیں اور وہاں کون سے خط رائج ہیں۔افغانستان، ایران عرب، افریقہ، جزائر، سماٹرہ، جاوا، سنگاپور، فلپائن، اور ملایا میں کونسا خط رائج ہے سب کو معلوم ہے ہندوستان کے قریب کا سب سے بڑا ملک چین ہے اور چین میں چھ سات کروڑ افراد ایسے پائے جاتے ہیں جو عربی رسم الخط سے مانوس ہیں۔خود ہندوستان کے طول و عرض میں بھی اگر کوئی رسم الخط مشرق سے مغرب اور جنوب سے شمال تک متعارف ہے تو یہی رسم الخط ہے۔

پورے براعظم افریقہ کا عمومی رسم الخط عربی ہے، اور مغربی ایشیا کو تو اس خط کا اصلی وطن کہنا چاہئے۔اردو، عربی، فارسی، پشتو سندھی، پنجابی، بالتی، کریمین، ہوسہ، جاوی، ملائی، کابیلی، قازانی، کمک، کرمانی، منڈینگو، موگی (کاکیشیا) نوبین، سواہیلی، ازبکی، اور ان کے علاوہ نہ جانے کتنی چھوٹی بڑی زبانیں اس خط میں لکھی جاتی ہیں۔اس لئے ہندوستان کو اگر بین الاقوامی حیثیت قائم کرنا اور باعزت و مرفہ الحال ملک بننا ہے تو اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اسی خط کو ہندوستان کے لئے عمومی خط کی حیثیت سے قایم رکھا جائے۔

عبدالقدوس ہاشمی

بانگِ درا

پو پھٹنے لگی دور ہوئی شب کی سیاہی
دینے لگے مرغانِ سحر حق کی گواہی
کرنے لگے پیرانِ حرم یادِ الٰہی
میدان میں آیا ہے کمربستہ سپاہی
جاگ اٹھو۔ کہ ہے منزلِ مقصود بہت دُور

دشوارئ منزل ہے عزیزوں کی نظر میں
لُٹ جاتے ہیں احباب اسی راہگذر میں
ہر وقت ہے اندیشہ لٹیروں کا سفر میں
لٹکا کے چلو خنجر و شمشیر کمر میں
جاگ اٹھو۔ کہ ہے منزلِ مقصود بہت دور

منزل پہ پہنچ بھی گئے یارانِ سبک پے
جو راستے دشوار تھے ہمت نے کئے طے
پیچھے نہ رہو۔ راہ خطرناک بہت ہے
ہے قافلہ سالار کی آواز پیاپے
جاگ اٹھو کہ ہے منزلِ مقصود بہت دور

دیتی ہے یہ پیغام تمہیں بادِ بہاری
یہ نکہتِ گل مشرق و مغرب میں ہے جاری
اک لمحہ بھی بیکار نہیں اس کی سواری
سب مل کے اٹھو کوچ کی آنے کو ہے باری
جاگ اٹھو کہ ہے منزلِ مقصود بہت دور

غلام رسول نازکی بیلی

دنیائے ادب

آغا حشر سے مُلاقات

موسم بہار کی ایک خوشگوار صبح تھی۔ جبکہ میں اور میرے چند احباب آغا صاحب کے عشرت کدے پر چائے پینے کے لئے مدعو تھے۔ خود انہوں نے نو بجے کا وقت مقرر کیا تھا۔ لیکن ہم لوگ ایک گھنٹہ قبل ہی اس جگہ پر پہنچ گئے۔ ہم نے ایک فوٹوگرافر کو بھی اپنے ہمراہ لے لیا تھا۔ آرزو تھی کہ آغا صاحب کی صحبت میں ایک ایسا گروپ کھنچ جائے جو دنیائے ادب میں یادگار ثابت ہو۔ تصویر میں اُن کے ساتھ ہم نشینی ہم سب کے لئے باعثِ فخر تھی۔ لیکن آغا صاحب نے اس تجویز کو کسی عنوان منظور نہ کیا۔ انفرادی اور اجتماعی طور پر ہم سب نے انتہائی اصرار کے ساتھ درخواست کی۔ مگر دنیائے شاعری کے ضدی معشوق کی طرح اُن کا انکار بصورت اقرار نہ بدل سکا۔ اُن کا عذر بھی معقول تھا۔ وہ اپنی زندگی کے دَورِ خزاں کا کوئی نقش مضمحل صفحہ ہستی پر چھوڑ جانا نہیں چاہتے تھے۔ خود اُن کے قول کے مطابق فراوانی عیش و عشرت نے اُن کو قبل از وقت بوڑھا بنا دیا تھا۔ اس لئے عہدِ پیری کی جملہ علامات دوسروں کے مقابلے میں ان پر زیادہ شدت کے ساتھ ظاہر ہو رہی تھیں۔ ؎

آنکھ بیٹھی، گال پچکا، رُخ پہ "صفائی" نہیں
اِس لئے تصویرِ جاناں ہم نے کھنچوائی نہیں

یہ ہے وہ شعر جو خود آغا صاحب نے سُنایا اور ایک قہقہہ کے ساتھ تصویر کشی کے اصل موضوعِ بحث کو بدل دیا۔ مجھے مخاطب کر کے فرمانے لگے:

"غالباً آپ کی نظر میرے مختصر سے لباس کی طرف ہے۔ ریشمی تہمد جس کے دونوں سروں کو جوڑ کر ایک طرف نیفے میں کمربند ڈال لیا ہے۔ یقیناً ساری کے نیچے استعمال ہونے والے پیٹی کوٹ کی طرح معلوم ہوتا ہوگا۔ اور پھر یہ سیدھی سادی پرانی وضع کی ریشمی قمیض۔ بس یہی میری زرق برق پوشاک ہے۔ سال میں اس قسم کے چار جوڑے بنواتا ہوں اور کثرتِ استعمال سے ان کو برابر کر دیتا ہوں لیکن اس سے یہ مت سمجھئے کہ میں مفلس و نادار ہوں۔ میرا ماہوار خرچ دو ڈھائی ہزار روپے سے کم نہیں۔ آٹھ سو روپے کی رقم صرف باورچی خانے کے لئے وقف ہے۔"

اور اس میں شک نہیں کہ اُن کا یہ اِدعا بلا مبالغہ تھا۔ اُن کی فیاضی اور دریا دلی کا ہر شخص کو اعتراف ہے۔ بیسیوں بیوائیں اور یتیم و لاوارث بچے اُن سے وظیفہ پاتے تھے۔ کئی دیرینہ ملازم کسی قسم کا کام کاج نہ کرنے کے باوجود اُن کے در پر پڑے ہوئے تھے۔ آغا صاحب نے بتایا کہ "یہ لوگ چونکہ زندگی کا بیشتر حصہ میرے ساتھ بسر کر چکے ہیں۔ اس لئے مجھے گوارا نہیں کہ اب ان کو اپنے سے جدا کروں۔ مرتے دم تک یہ میرے ساتھ رہیں گے" یہ ان کے بلند کردار کا ایک ادنیٰ نمونہ ہے۔

آغا صاحب کی آمدنی بہت کافی تھی۔ جس کا اندازہ اُن کے اپنے ہی بیان سے نہیں بلکہ اخبارات میں شائع ہونے والے اعداد و شمار سے بھی لگایا گیا ہے۔ بعض فلموں کی سالانہ روائیلٹی اُن کو بیس بیس ہزار روپے ملی ہے اور اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات اُن کی زبانی معلوم ہوئی کہ بعض کمپنیاں تامل اور تلیگو زبان کے فلم کی تیاری سے قبل مکالمہ کا مسودہ آغا صاحب کو محض اظہار رائے اور مناسب ترمیم و تنسیخ کے لئے پیش کرتی تھیں اور اس طرح صرف ان کمپنیوں سے اُن کی ماہوار آمدنی تقریباً ایک ہزار روپیہ تھی۔ اس کے باوجود انہوں نے کبھی ایک پائی تک پس انداز نہیں کی۔ یہ خود ان کا بیان ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ "میرے عزیز و اقارب اور دوست احباب نے میری بالکل مدد نہیں کی۔ میں نے اپنی زندگی کی تعمیر خود اپنے ہاتھوں کی

ہے۔ لہٰذا میں بھی کسی کے واسطے کچھ چھوڑ جانا پسند نہیں کرتا۔ "کھاؤ، پیو اور مزے اڑاؤ" والا اصول میرے پیش نظر ہے لیکن شاید انہوں نے کبھی محسوس بھی نہ کیا ہوگا کہ کچھ نہ چھوڑنے پر بھی وہ ایک ایسا مستقل سرمایۂ ادب اپنی قوم کے لئے چھوڑ جائیں گے جس کے مقابلے میں ہفت اقلیم کی دولت بھی حقیر ہے۔

آغا صاحب نے اپنے مساوی آمد و خرچ کے سلسلے میں بطور مزاح یہ بھی فرمایا کہ "اگر اتفاق سے میرا انتقال دہلی پہنچ کر وقوع میں آیا تو لازمی طور پر وہاں کی مجلس بلدیہ کو میری تجہیز و تکفین کا انتظام کرنا پڑے گا"۔ لاہور میں رہتے ہوئے خصوصیت کے ساتھ دہلی کا ذکر آغا صاحب نے اس لئے کیا تھا کہ میں اور میرے احباب دہلی کے رہنے والے تھے۔

یہ اُن دنوں کا ذکر ہے۔ جبکہ آغا صاحب کی نگاہ حسن نواز کے سامنے مختار بیگم کی قسمت کا ستارہ چمک رہا تھا۔ چنانچہ اس وقت بھی وہ شریک محفل تھیں۔ دوران گفتگو میں چند ایکٹروں اور ایکٹرسوں کا ذکر آگیا۔ آغا صاحب نے کسی قدر طنز کے ساتھ فرمایا کہ "بہت سی ہستیوں کی شہرت میرے دم کی رہین منت ہے۔ میری سرپرستی نے اُن کو مقبول عوام بنا دیا"۔ چنانچہ مثال کے طور پر انہوں نے مختار بیگم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ "اسی کو دیکھ لو۔ امرت سر میں مختاری کے نام سے معمولی طوائف کی زندگی بسر کر رہی تھی۔ آغا حشر نے اس کو بلبل پنجاب مختار بیگم بنا دیا اور اگر آج میری دنیائے فلم کا ڈائرکٹر تک اسے مختاری کہہ دے تو اس گستاخی کی پاداش میں اس کی زبان کھینچ لوں۔ اُس کی یہ قدر و منزلت میری نگاہ میں صرف اُس وقت تک ہے جب تک کہ کسی دوسری جاذب نظر ہستی سے واسطہ نہ پڑے۔ اس صورت میں اُس کا دامن پکڑ لوں گا۔ میں اپنی بساط عشق پر ہمیشہ نئے مُہرے دیکھنے کا دلدادہ ہوں"۔

میں نے محسوس کیا کہ اس حقیقت کی تلخی کا کوئی ناگوار اثر مختار بیگم پر نہیں ہوا۔ بلکہ وہ یہ کہنے کے لئے مجبور ہوگئی کہ آغا صاحب بالکل سچ کہتے ہیں۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ آغا صاحب کے دل میں مختار بیگم کی جگہ نہیں تھی۔ وہ اُس کی محبت میں سرشار نظر آتے تھے۔ چنانچہ ایک دلچسپ واقعہ سے اس امر پر روشنی پڑ سکتی ہے۔ جس کی تفصیل اس طرح ہے کہ جب تمام سامان خورد و نوش میز پر چن دیا گیا اور آغا صاحب نے چائے بنانے کے لئے چائے دانی کا ڈھکنا اٹھایا تو پانی کبوتر کے خون کی مانند سُرخ تھا۔ اور ذائقہ کے اعتبار سے نہایت تلخ۔ ایک دم اُن کے غصے کا پارہ تیز ہوگیا۔ ہر ایک ملازم کا نام لے کر بلا مبالغہ پچاس پچاس گالیاں سناڈالیں اور گالیاں بھی ایسی بے نقط کہ محض ان کی سماعت سے کانوں کے پردے متعفن ہو گئے۔ آتش غضب کسی عنوان سرد نہ پڑتی تھی کہ اچانک مختار بیگم نے مُسکراتے ہوئے اُن کی مشتعل رگوں کو یہ کہہ کر دبا دیا۔

"آغا صاحب! ان بیکس ہستیوں کو ڈانٹنے سے کیا حاصل۔ کبھی ہم پر غصہ کا اظہار کیجئے تو ہم ترکی بہ ترکی جواب دیں"۔

یہ الفاظ شکست طلسم کی عبارت سے زیادہ سریع الاثر ثابت ہوئے۔ غصے سے تمتمائے ہوئے چہرے کی کیفیات ایک دم بدل گئیں۔ گویا تیز آندھی پر پانی کا چھینٹا پڑ گیا۔ آغا مُسکرائے بغیر نہ رہ سکے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی کہا۔ کہ "حشر میں اگر کوئی کمزوری ہے تو صرف یہی کہ عورت کے دلفریب تبسم سے زچ ہو کر بہت جلد مات کھا لیتا ہے"۔ (لیکن ایسی شکست کسے نہیں ہوئی؟)

آغا صاحب کے کردار کا سب سے زیادہ نمایاں پہلو اُن کی صاف گوئی تھی۔ وہ اپنی زندگی کے تاریک رُخ کو پیش کرتے ہوئے بھی بالکل نہ ہچکچاتے تھے۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے اپنی ابتدائی زندگی کا لفظی خاکہ بیان کیا کہ کس طرح وہ دہلی کے ایک نانبائی کی دُکان پر جھوٹے برتنوں کو دھو کر۔ آٹا گوندھ کر۔ اور میلے فرش کو صاف کر کے روزی کماتے تھے اور جب رات ہوتی تو اسی دکان کی تاریک فضا میں تنور کے قریب سو جاتے تھے۔ جس کی ہلکی تپش ان کو موسم سرما کی خنک ہوا سے محفوظ رکھتی تھی۔ کیونکہ اس وقت ان کا نہ کوئی گھر تھا اور نہ گزارے کا سامان۔

اسی طرح بمبئی میں ایک تھیئٹریکل کمپنی سے اُن کے اولین تعلق کی نوعیت کچھ کم حیرت انگیز نہیں ہے۔ کمپنی کے مالک کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آئی ہوگی کہ وہ نوعمر لڑکا جو آج طرح طرح کے روپ بدل کر اپنی حماقت آمیز نقل و حرکت کے ساتھ تھیئٹر کے اشتہار سر بازار تقسیم کیا کرتا ہے۔ کل جوان ہو کر ڈرامہ کی دُنیا میں ہندوستان کا شیکسپیئر کہلائے گا۔

آغا صاحب نے اعتراف کیا کہ انہوں نے ہر قسم کے لہو و لعب میں زندگی بسر کرنے کے علاوہ ہر نوع کے گناہ کا ارتکاب کیا ہے۔ لیکن کبھی اس کو گناہ نہ سمجھ کر۔ بلکہ اس احساس کے ساتھ کہ میں جس ماحول میں پل کر جوان ہوا ہوں۔ اس کا تقاضا یہی ہے کہ میں مستقبل کے ہر گناہ سے بچنے

کے لئے حال کے بہ گناہ میں گھر جاؤں۔ لہٰذا اس نظریے کے ماتحت اُن کی زندگی کی مقدس معصیتیں قابل اعتراض نہیں سمجھی جا سکتیں۔

اس گناہ آلود طرزِ زندگی سے قطع نظر اُن کے کردار کا دوسرا رُخ کہ فطرتاً وہ ایک حد تک متقی و پرہیزگار بھی تھے۔ خاص طور پر توجہ کے لائق ہے۔ اس کی تفصیل خود اُن کے ایک بیان سے واضح ہوتی ہے۔ جسے سن کر ہم سب لوگ ورطۂ استعجاب میں غرق ہو گئے تھے۔

یہ اس زمانے کا واقعہ ہے۔ جب آغا صاحب کا مستقل قیام بمبئی میں تھا۔ اور وہ ایک تھیئیٹریکل کمپنی میں "منشی" کے فرائض انجام دیتے تھے۔ ایک روز ایک نوجوان بیوہ خاتون جس کے چہرے سے شرم و حیا اور خاندانی شرافت ظاہر ہو رہی تھی۔ آپ سے ملنے آئی اور ایکٹرس بن جانے کی دلی تمنا ظاہر کی۔ کیونکہ بیوہ ہونے کے باعث سماج میں اُس کے لئے کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں رہ کر وہ اپنا گزارہ کر سکتی۔ انہوں نے اُس کو سمجھایا کہ وہ اُس خیالِ خام سے باز رہے۔ ایک ایکٹرس کی دنیا جن مکروہات سے عبارت ہوتی ہے اُن کو آغا صاحب سے زیادہ کون جانتا تھا۔ ساتھ ہی کچھ رقم دے کر انہوں نے وعدہ کیا کہ ہر ماہ گزر اوقات کے لئے وہ مناسب امداد دیتے رہیں گے۔ مگر تاکید کی۔ کہ وہ آیندہ بذاتِ خود ان سے ملنے کی کوشش نہ کرے۔ موعودہ رقم کسی دوسرے ذریعہ سے اس کے پاس برابر پہنچتی رہے گی۔ کیونکہ وہ جوان تھی اور ایک حد تک حسین بھی اس لئے آغا صاحب کو اندیشہ تھا کہ مبادا خود اُن سے لغزش ہو جائے۔

گناہ کا فلسفہ ان کی زبان سے سُنا کہ انسان اُس عورت پر نگاہِ بد نہ ڈالے جو معصومہ فضا میں رہنے کی کوشش کر رہی ہو۔ اس کے برعکس جو جان بوجھ کر اپنی زندگی کو گناہ آلود کر لینے پر تُلی ہوئی ہو۔ اُسے روکا نہ جائے بلکہ اس بھیانک غار میں اور زیادہ دھکیل دیا جائے۔ ورنہ اس کا وجود سماج کے لئے زیادہ خطرناک ثابت ہوگا۔

وہ خاتون آغا صاحب کی ہدایت کے خلاف غیر معقول عذروں کے ماتحت کئی بار ان سے ملنے آئی اور ایک مرتبہ ایسے موقعہ پر جبکہ وہ نشے میں مجبور اپنے آپے سے باہر تھے۔ اُسے دیکھ کر بہت غصہ آیا۔ مگر چونکہ اس وقت طبیعت پر قابو پانا مشکل ہی نہیں بلکہ غیر ممکن تھا۔ اس لئے وہ اُن کی نفسانی خواہشات کا شکار بن گئی۔ جس کی ذمہ داری کسی طرح بھی اُن پر عاید نہیں ہو سکتی۔

ابھی گفتگو کا سلسلہ جاری ہی تھا کہ ملازم نے ایک ملاقاتی کارڈ لا کر پیش کیا۔ جس کے ساتھ ہی ہندوستان کے ایک بہت بڑے آدمی کی سفارشی چٹھی بھی تھی۔ آغا صاحب جز بز تو بہت ہوئے۔ مگر نووارد کو اندر طلب کر لیا۔ طالب علم کی قسم کے ایک سادہ لوح نوجوان جن کے سبزۂ خط کا بھی ہنوز آغاز نہیں ہوا تھا۔ اندر تشریف لائے اور بالکل فدویانہ طریقے پر سلام کر کے ایک طرف بیٹھ گئے۔ کچھ دیر کمرے کی فضا پر سکوت طاری رہا۔ پھر آغا صاحب نے اُن سے دریافت کیا:۔

"بتائیے! آخر فلم ایکٹر بننے کا خیال آپ کے دماغ میں کیونکر پیدا ہوا؟ اور اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لئے کیا آپ اپنے اندر وہ کمالات پیدا کر چکے ہیں جو ایک کامیاب ایکٹر کی نجی زندگی کے لئے نہایت ضروری ہیں؟"

ظاہر ہے کہ آغا صاحب کا استفسار کسی قدر مبہم تھا۔ اس لئے انہوں نے خود ہی ذرا واضح طور پر کہنا شروع کیا۔

"ممکن ہو سکتا ہے کہ کالج میں رہ کر آپ نے خوب جمناسٹک کی ہو۔ مختلف کھیلوں میں حصہ لینے سے جسم میں چُستی و چالاکی بھی موجود ہو۔ گھوڑے کی سواری، موٹر چلانا، تیرنا، کشتی چلانا وغیرہ بھی آپ کو آتا ہو۔ آپ کا لب و لہجہ بتا رہا ہے کہ آپ کے گلے میں کچھ رس ہے اور ذرا سی کوشش سے آپ کچھ الاپ لیا کریں گے۔ آپ کے جسم کا چھریرا پن ناچنے میں تھوڑی بہت مدد دے سکے گا لیکن یہ سب بہت معمولی باتیں ہیں اور ان صفات کے حامل سینکڑوں افراد ہندوستان میں موجود ہوں گے۔ لیکن وہ ایکٹر نہیں بن سکتے۔ آپ زیادہ سے زیادہ زنانہ روپ بدل کر سہیلیوں میں پارٹ کر سکتے ہیں۔ ایکٹر بننا آسان کام نہیں ہے۔ آپ یہ بتائیے! کہ عیاشی کے فن میں آپ نے کن کن نعمتوں سے لطف اٹھایا ہے؟ شراب کے کتنے پیپے ایک ماہ میں خالی کر دیتے ہیں؟ کتنی بازاری عورتیں آپ کی زینتِ آغوش بن چکی ہیں؟ قمار خانے میں کتنی بار آپ بیٹھے ہیں؟ ان کے علاوہ کیا آپ اپنے ضمیر کو بالکل مردہ کر چکے ہیں؟ کیا آپ گوارا کر لیں گے کہ ڈائرکٹروں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے ان کی محبوب نظر ایکٹرسوں کی گالیاں سُن لیں؟ یا خود اپنا کوئی مقصد نکالنے کے لئے ان کے پاؤں دابا کریں۔ ان باتوں کو چھوڑیئے۔ کیا آپ جذبۂ خودداری کو فنا کر کے ایک اوّل نمبر کے سزا یافتہ بدمعاش کو "پتاجی" اور ایک بازاری چھنال کو "ماتاجی" کہہ کر مخاطب کرنا گوارا کر لیں گے۔ اگر اتنی پست سطح پر رہ کر زندگی بسر کرنا آپ کے بس کی بات نہیں ہے تو آپ ایکٹر نہیں بن سکتے۔ لہٰذا ابھی یہاں سے چلے جائیے اور اس دنیا میں پھر کبھی قدم رکھنے کی کوشش نہ کیجئے۔ لیکن

اگر آپ مُصر ہیں تو مجھے تھوڑی سی آزمائش کر لینے دیجئے۔ اچھا ذرا اپنی جگہ سے اٹھئے اور ان تمام حضرات کی موجودگی میں جن سے آپ ناواقف ہیں۔ اپنے سامنے بیٹھی ہوئی مختار بیگم کے نازک گالوں کا ایک بوسہ لیجئے۔ تاکہ میں معلوم کر سکوں کہ آپ میں یہ تھوڑی سی جرأتِ رندانہ بھی موجود ہے۔ یا نہیں "۔ اس گفتگو کا جو اثر اس صاحب زادے پر ہوا وہ ظاہر ہے۔

گفتگو کے دوران میں آغا صاحب کے ڈراموں کا بھی ذکر چھڑ گیا اور یہ سُن کر افسوس ہوا کہ فلم کمپنیوں کے ڈائرکٹر اداکاروں کی سہولت اور چار آنے والے تماشائیوں کے ذوق کا لحاظ رکھتے ہوئے اپنی مرضی سے مکالمہ کی قطع و برید کر لیا کرتے تھے۔ اور اس طرح آغا صاحب کا حقیقی اندازِ بیان قائم نہ رہتا تھا۔ بلکہ تمام عبارت بڑی حد تک مسخ ہو جاتی تھی۔ چنانچہ مثال کے طور پر انہوں نے "عورت کا پیار" نامی ڈرامے کا کچھ حصہ اصل مسودے سے پڑھ کر سنایا جس میں فصاحت و بلاغت کے وہ جوہر کُوٹ کُوٹ کر بھرے ہوئے تھے کہ تعریف نہیں کی جا سکتی۔ اس کے مقابلے میں "ادب لطیف" فلم کمپنی کا پیش کردہ ڈرامہ کوئی وقعت ہی نہیں رکھتا۔ معلوم ہوا کہ اُن کے تقریباً ہر ڈرامے پر اسی طرح عمل جراحی کیا گیا ہے۔

اس سے اندازہ لگائیے کہ جس پیکر کے صرف ڈھانچ کی قدر و منزلت کرتے ہوئے پبلک نے آغا صاحب کی خداداد ذہانت و قابلیت کا لوہا مانا ہے۔ اگر وہ پیکر اپنے اصلی روپ میں نظر آ جائے تو پھر اُن کا مرتبہ دنیائے ادب میں کتنا بلند ہو جائے گا۔ میرے اس استفسار پر کہ آخر انہوں نے قطع و برید کی اجازت ہی کیوں دی۔ آغا صاحب نے بتایا کہ بڑھے ہوئے اخراجات پورا کرنے کے لئے انہیں روپے کی سخت ضرورت رہا کرتی تھی اس لئے اعتراض کرنے یا نہ کرنے کا کبھی خیال تک اُن کے دل میں پیدا نہ ہوا۔

اور اسی غرض کے ماتحت ان کے ڈراموں کے مذاقیہ حصّوں میں مزاحِ لطیف کی بجائے سوقیانہ رنگ نظر آتا ہے۔ جس کی بڑی ذمّہ داری خود قوم کے گرے ہوئے مذاق پر عائد ہوتی ہے۔

فضل حق قریشی دہلوی

نقد و نظر

۱۹۳۹ء کے سالنامے اور خاص نمبر

گذشتہ چند ہی سالوں سے اردو دنیا میں کتابوں کی اشاعت ایک ہنگامہ بنی ہے اور ہر سال معنوی اور صوری حسن سے آراستہ کتابیں شائع ہو رہی ہیں لیکن اس گرماگرمی کے باوجود پچھلے پندرہ سال میں اردو کا تمام بیشتر ادبی خزانہ رسائل ہی کے ذریعے سے ظاہر ہوتا رہا ہے اور اردو کے مشہور اور مقبول رسالوں کے سالنامے اور خاص نمبر اس لحاظ سے ایک خاص امتیاز کے مالک ہیں۔ عنوان خواہ کچھ ہو ایسی خاص اشاعتوں کا مقصد ہر صورت میں ایک ہی ہوتا ہے یعنی پڑھنے والوں کے لئے اچھے مضامین نظم و نثر کا ایک قابل قدر مجموعہ مہیا ہو جائے۔ خاص نمبروں کے ابتدائی زمانے میں جو امتیازی شمارے شائع ہوئے وہ علمی اور ادبی پہلوؤں سے عموماً اچھے ہوا کرتے تھے اور ایک نئی چیز ہونے کے لحاظ سے بھی ان میں ایک تازگی اور سرگرمی تھی۔ لیکن رفتہ رفتہ کثرت اور عمومیت کا برا اثر بھی ظاہر ہونا شروع ہو گیا۔ لیکن ان تخریبی اثرات کے باوجود اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو رسائل کے سالنامے اور خاص نمبر ہی اردو ادب کی قبولیت عامہ اور ترقی منازل کا ناقابل تردید ثبوت ہیں۔ امسال بھی حسب معمول ملک کے مؤقر ماہناموں نے اپنے اپنے خاص نمبر شائع کئے ہیں۔ جو سالنامے اور خاص نمبر ہمیں موصول ہو چکے ہیں۔ ہم اُن کے متعلق اپنی آرا ذیل میں درج کرتے ہیں۔

نگار مصحفی نمبر: ۱۶۰ صفحے قیمت ایک روپیہ۔

نگار ایک علمی اور ادبی رسالہ ہے۔ اگرچہ بعض اوقات اس میں ہنگامی مضامین بھی شائع ہو جاتے ہیں لیکن اس پر بھی خالص علمی مضامین کی کثرت اور ادبی خدمت نے نگار کو اردو کے علمی رسائل کی صف اوّل میں لا کھڑا کیا ہے۔ اس ترقی کی واحد ذمہ دار حضرت نیاز فتح پوری کی ہمہ گیر شخصیت ہے۔ نگار کے خاص نمبروں کی خصوصیت یہ ہے کہ اُن کو نہ صرف اچھے مضامین کا مجموعہ بنانے کی کوشش کی جاتی ہے بلکہ ان میں صرف ایک مقررہ موضوع سے متعلق اچھے مضامین یکجا کئے جاتے ہیں۔ چنانچہ علم پرور حضرات کو نگار کے غالب، ظفر اور مومن نمبر اب تک یاد ہوں گے۔ ان ہی نمبروں کے انداز پر جنوری ۱۹۳۹ء کا نگار مصحفی اور ان کی شاعری کے لئے مخصوص ہے۔ اگر مشہور لکھنے والوں کے نام مضامین کی اچھائی کے ضامن ہو سکتے ہیں تو اس شمارے میں عبدالباری آسی، فراق گورکھپوری، حسرت موہانی، مجنوں گورکھپوری، اور حضرت نیاز فتح پوری کے افکار شامل ہیں۔ اور اسی انداز پر موضوع زیر بحث کے مختلف پہلوؤں کو ظاہر کرنے کے لئے مضامین میں سے چند ایک کے عنوان پیش کئے جا سکتے ہیں۔ مثلاً حیات مصحفی، ۲۔ اردو غزل گوئی میں مصحفی کا مرتبہ، ۳۔ مصحفی اور ان کی شاعری، ۴۔ مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں، ۵۔ مصحفی کی دو گم شدہ بیاضیں۔

اس کے علاوہ حضرت نیاز نے اس شمارے میں مصحفی کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کا الگ الگ انتخاب بھی شامل کر دیا ہے۔

عالمگیر (لاہور)

زیر نظر نمبر ضخامت کے لحاظ سے اشتہارات سمیت سوا دو سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ چار سہ رنگ اور آٹھ یک رنگ تصویریں بھی شامل ہیں۔ لیکن ان تصویروں میں سے ایک دو پہلے عالمگیر ہی میں ظاہر ہو چکی ہیں اور ایک دو ایسی ہیں کہ ان کا شائع نہ کرنا حسن مذاق کی دلیل ہو سکتا تھا۔ مضامین میں عام دلچسپی کے مضامین اکٹھے کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ حصۂ نظم معمولی ہے۔ افسانے کافی ہیں۔ عام ادبی ماہناموں میں عالمگیر کی یہ خاص اشاعت ایک امتیاز کی مالک ہے۔ قیمت ایک روپیہ چار آنے

ہمایوں (لاہور)

کا سالگرہ نمبر ایک سو چار صفحوں پر پھیلا ہوا ہے۔ حجم کچھ زیادہ نہیں۔ لیکن مضامین کی نوعیت اس کمی کی تلافی کر دیتی ہے ایک سہ رنگ اور سات یک رنگ تصویریں بھی اس شمارے کی زینت ہیں

اضافہ کر رہی ہیں۔ یک رنگ تصاویر میں فوٹو آرٹ کے بہت ہی اچھے
نمونے ہیں اور ان کے بلاک بڑے سائز پر ہونے سے اصل کی تمام خوبیاں
برقرار رہی ہیں۔ ان میں سے دو تین تصویریں تو ایسی ہیں کہ صرف انہیں کے
لئے یہ سالگرہ نمبر خریدا جا سکتا ہے۔

مضامین میں میاں بشیر احمد صاحب کا مضمون "جہاں نما" فکر انگیز ہے
فلک پیما اور پروفیسر فیاض محمود کے ڈرامے بھی توجہ کے لائق ہیں۔ شرر
کی شاعری کے متعلق ایک تشنہ لیکن قابل قدر مضمون بھی ہے۔ جس میں
عبد العزیز فطرتی نے شرر کو اردو میں آزاد نظم کا موجد ثابت کیا ہے۔
ان مضامین کے علاوہ کرشن چندر کا افسانہ "بے رنگ و بو" بھی نازک احساسات
کی تسکین کر رہا ہے۔

گذشتہ دو سالوں سے اردو ہندی اور قومی زبان کا جو متنازعہ فیہ
مسئلہ چھڑا ہوا ہے اس کے سلسلے میں پنجاب کے رسائل میں سے ہمایوں
نے سب سے زیادہ قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ چنانچہ اس سالگرہ
نمبر میں بھی مخزنی حامد علی خاں نے اردو اور ہندو کے عنوان سے ایک
خیال افروز مضمون لکھا ہے۔ اس نمبر کی قیمت بارہ آنے ہے۔

ادب لطیف (لاہور) نے اپنا سالنامہ قریباً تین سو صفحات
پر شائع کیا ہے۔ پنجاب کے مقامی رنگ کے مصور جناب اللہ بخش صاحب
کی ایک سہ رنگی تصویر کے علاوہ مضمون نگار حضرات کی چند تصویریں بھی شامل
ہیں۔ مضامین میں "ہندوستان کی حرفتی نااہلیت کے اسباب" اور
"آغا حشر سے ملاقات" قابل ذکر ہیں۔ افسانوں کی تعداد اٹھارہ ہے۔
افسانہ نگاروں میں سے چند نام قابل ذکر ہیں۔ مثلاً کرشن چندر ایم اے۔
پروفیسر فیاض محمود۔ جناب امتیاز علی۔ اختر انصاری۔ افسانوں میں
ٹیگور کی ایک قابل ذکر ترجمہ ہے جسے سراج الدین احمد نظامی نے اردو
کا لباس پہنایا ہے۔ ڈرامے چھ ہیں۔ ڈرامہ نگاروں میں حکیم احمد شجاع اور
اُپندر ناتھ اشک کے نام قابل ذکر ہیں۔ اس کا سرورق ایم اسمٰعیل کے
قلم سے ہے۔ اس نمبر کی قیمت ایک روپیہ ہے۔ ایک بات کا ہمیں
افسوس ہے کہ اس سالنامے میں کتابت اور زبان و محاورہ کی غلطیاں
بہت جگہوں پر نمایاں نظر آتی ہیں۔ قیمت ایک روپیہ۔

ساقی (دہلی) کا سالنامہ دو سو اسی صفحات پر شائع ہوا ہے۔
پانچ تصویروں میں سے دو قلمی معاونین کی ہیں اور تین پروفیسر نور الحسن
برلاس کے مضمون "جاپانی پہلوان" سے متعلق ہیں۔ مضامین سے عندلیب
شادانی کا مضمون "فارسی غزل میں جفائے محبوب" اور پروفیسر محمد اسلم
ایم اے کا "جنسی تعلیم" خصوصاً قابل ذکر ہیں۔ ان مضامین کی بے باکی
اور صاف گوئی ایک مبارک اقدام ہے۔ ان مضامین کے علاوہ تعلیم و
تربیت کے چند اصول از مرزا آصف علی خاں، جاپانی پہلوان از
نور الحسن برلاس اور ڈرامے میں مکالمے کی اہمیت از سید بادشاہ حسین حیدرآبادی
مفید اور قابل توجہ ہیں۔

مشہور انگریزی تصانیف کے تراجم کے لحاظ سے مولانا عنایت اللہ
دہلوی اور ان تراجم کو شائع کرنے کے لحاظ سے مجلہ ساقی اردو دنیا میں
ایک خاص شہرت کے مالک ہیں۔ چنانچہ اس نمبر میں بھی شیکسپیئر کے
ڈرامہ "شاہ لیئر" کا ترجمہ شامل ہے۔

مزاحیہ مضامین ساقی کی ایک دیرینہ خصوصیت ہیں جسے اس شمارے
میں بھی قائم رکھا گیا ہے۔ اس نمبر کی قیمت ایک روپیہ چار آنے ہے۔

رہنمائے تعلیم (لاہور) تپ دق نمبر (باتصویر) صفحات۔
اشتہارات سمیت تین سو ساٹھ۔ قیمت دو روپے۔

جدید سیاسی اختیارات کے ساتھ ہی ساتھ ہندوستان میں دو
خاص تحریکات شروع ہوئیں۔ پہلی دیہات سدھار اور دوسری تپ دق
کے خلاف جہاد اور اس دوسری تحریک کے سلسلے میں ہی رہنمائے تعلیم
نے اپنا تپ دق نمبر شائع کیا ہے۔ مہذب ممالک میں عموماً اور ہندوستان
میں خصوصاً تپ دق اپنا مہلک جال پھیلائے ہوئے ہے۔ اور خوش
قسمتی ہے کہ گذشتہ دو سال سے اس جان سوز مرض کے خلاف
ہندوستان میں بھی ایک زبردست جنگ مدافعت شروع کر دی گئی
ہے۔ ان حالات میں رہنمائے تعلیم نے تپ دق کے متعلق ہر قسم کی
معلومات سے پُر مجموعہ شائع کر کے اردو خواں طبقے پر ایک احسان کیا
ہے۔ جس کے لئے اس مجلے کے کار فرما سردار صاحب سردار جگت سنگھ
صاحب لائق صد تحسین ہیں۔

"م"

"پاگل"

(از سید بشیر ہندی۔ لکھائی چھپائی کاغذ نہایت عمدہ۔ سائز ۲۶×۲۰/۱۶ ضخامت ۸۰ صفحات قیمت آٹھ آنے: ناشرین گیلانی الیکٹرک پریس لاہور)

خلیل جبران شام کا ٹیگور ہے اگرچہ زندگی کے متعلق خلیل جو کچھ لکھتا ہے۔ اس میں ایک لطیف اور تلخ طنز پنہاں ہوتی ہے جو اس کے کلام کو حقیقت سے قریب تر لے آتی ہے۔ اردو دان طبقہ پہلے پہل خلیل جبران سے اس وقت آشنا ہوا جب قاضی عبد الغفار صاحب نے اس کی تصنیف لطیف "دی پرافٹ" کو اس نے کہا" کے نام سے اردو میں پیش کیا۔

ہمیں مسرت ہے کہ حال میں سید بشیر ہندی صاحب نے جبران کی ایک اور چھوٹی سی کتاب "دی میڈ مین" کو اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ "پاگل" جبران کے چند نہایت لطیف اقوال اور کہاوتوں کا پاکیزہ ترجمہ ہے اور ہمارے ادب میں ایک خوش آیند اور خیال افروز اضافہ۔ بشیر صاحب نے علی العموم مصنف کے پر زور انداز بیان اور طنزیہ روانی کو نہایت وفاداری سے قائم رکھا ہے۔ دیکھئے:-

"اپنی پیدائش کے تین دن بعد جب میں ریشمی ہنگوڑے میں پڑا اپنی ارد گرد کی نئی دنیا کو حیرت سے دیکھ رہا تھا تو میری والدہ نے انا سے پوچھا "کیسا ہے میرا لال"؟

انا نے جواب دیا "بیگم بہت اچھا ہے، میں نے اسے تین بار دودھ پلایا ہے، میں نے آج تک ایسا بچہ نہیں دیکھا جو اتنا خوش ہو"۔

میں بے قرار ہو کر چلا اٹھا "ماں یہ سچ نہیں، کیونکہ میرا بچھونا سخت ہے، اور میں نے جو دودھ پیا ہے، وہ میرے منہ کو کڑوا لگا ہے۔ اور چھاتی کی بدبو میرے لئے ایک عذاب الیم ہے۔ میں بہت تکلیف میں ہوں"۔

لیکن میری بات نہ میری ماں سمجھ سکی نہ میری انا، کیونکہ میں جس زبان میں بول رہا تھا، وہ اس دنیا کی زبان نہ تھی بلکہ اس دنیا کی زبان تھی، جہاں سے میں آیا تھا۔

اکیسویں دن ہمارے ہاں ایک ملا آیا، اور اس نے میری ماں سے کہا "تمہیں خوش ہونا چاہئے کیونکہ تمہارا بیٹا پیدائشی مومن ہے"

مجھے حیرت ہوئی، اور میں نے ملا سے کہا "پھر تمہاری متوفی والدہ کو افسوس ہونا چاہئے کیونکہ تم ایک پیدائشی مومن نہ تھے" لیکن ملا بھی میری زبان نہ سمجھ سکا۔

سات مہینوں کے بعد ایک دن مجھے ایک جوتشی نے دیکھا اور میری ماں سے کہا "تمہارا بیٹا بہت بڑا سیاست دان اور جلیل القدر رہنما ہوگا"۔

میں چیخ اٹھا کہ "یہ غلط پیش گوئی ہے۔ کیونکہ میں ایک مغنی کے سوا اور کچھ نہ بنوں گا"۔

لیکن اس عمر میں بھی میری زبان کسی کی سمجھ میں نہ آئی اور مجھے سخت حیرت ہوئی اور اب میری عمر تنتیس سال کی ہے، اور میری ماں، میری انا اور ملا سب مر چکے ہیں (خدا انہیں جنت نصیب کرے)، لیکن وہ جوتشی ابھی تک زندہ ہے، اور کل مجھے معبد کے دروازے کے قریب ملا۔ جب ہم ایک دوسرے سے باتیں کر رہے تھے، تو اس نے کہا "میں شروع ہی سے جانتا

تھا، کہ تم مغنی بنو گے، اور میں نے تمہارے بچپن میں بھی یہی پیش گوئی تھی۔"

میں نے اس کی بات پر یقین کر لیا، کیونکہ اب میں خود اپنی پہلی زبان بھول چکا ہوں۔

اس اقتباس کا عنوان "دوسری زبان" ہے۔ اس قسم کے ۳۶ عنوانات ہیں جن میں "رات"، "پاگل"، "گھاس کے ایک تنکے نے کہا"، "جب میرا غم پیدا ہوا"، اور "بلند اراد ے" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس مجموعے میں چند تصویریں بھی ہیں جن کی خوبی اور دلکشی مصنف کے حسن مذاق اور مترجم کے حسن انتخاب کی شاہد ہے۔ کتاب کے آخر میں اساتذہ اردو کے چند چیدہ اشعار بھی درج ہیں۔ جن کا موضوع دیوانگی ہے۔

ہم ناظرین سے اس حسین مجموعے کے مطالعے کی پر زور سفارش کرتے ہیں۔

"ص"

فہرست مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ مارچ سنہ ۱۹۳۹ء

جلد ۱۷ تصاویر:۔ ۱۔ سرگوشیاں۔ ۲۔ انگلستان کا ملک الشعراء جان میسفیلڈ نمبر ۳

سالانہ چندہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے۔ ممالک غیر سے دس شلنگ

(گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام مولانا صلاح الدین احمد پرنٹر و پبلشر چھپ کر دفتر ادبی دنیا مال روڈ لاہور سے شائع ہوا)

دنیائے فلم

طلاق

منروا فلم کمپنی بمبئی سوشل فلمیں بنانے میں غیرمعمولی شہرت حاصل کر چکی ہے۔ ان فلموں میں سہراب مودی کی قابل ڈائرکشن کی وجہ سے وہ تمام نقائص بہت ہی کم نظر آتے ہیں۔ جو دوسری فلموں میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ منروا کی تمام فلمیں ملک میں خاص کامیابی حاصل کرتی ہیں۔ "جیلر" کو جو کامیابی ہوئی اس پر کسی مزید تبصرے کی ضرورت نہیں۔

موجودہ ہندوستانی معاشرتی و تمدنی مسائل میں ہماری ازدواجی زندگی کی ناخوشگوار کشمکش روح فرسا صورت اختیار کر چکی ہے۔ ہمارے قدیم و جدید نظریات میں تصادم کی وجہ سے ایسی ایسی پیچیدہ ترین گتھیاں پیدا ہو رہی ہیں جنہیں حل نہ کر سکنے کی وجہ سے مرد خودکشی تک کرتے ہیں اور عورتیں آگ میں جل کر مرتی ہیں۔ مسلمانوں میں طلاق اگرچہ ایسی ہی پیچیدہ ترین صورت کا علاج پیش کی گئی ہے۔ لیکن ہماری موجودہ گتھیوں کو وہ بھی صحیح طرح سلجھا نہیں سکتی۔

منروا فلم کمپنی کی یہ فلم "طلاق" اسی قسم کی الجھی ہوئی ہندوستانی زندگی کے مسائل کو پیش کرتے ہوئے ہمیں دعوت دیتا ہے کہ ہم اپنی معاشرت میں اصلاح کرنے کی غرض سے ان واقعات پر غور کریں جو ہماری زندگی کو روز بروز تلخ اور ناقابل برداشت بنا رہے ہیں۔

فلم کے پلاٹ میں رتن اور روپا کی ازدواجی زندگی بے نقاب کی گئی ہے۔ جن کی فطرتوں اور مزاج کا اختلاف ان کی زندگی میں مسرت پیدا کرنے کی بجائے تلخی پیدا کر چکا ہے۔

مسلمانوں میں اگرچہ ایسی تاریک زندگی کا علاج طلاق پیش کیا گیا ہے۔ لیکن ہندوستانی موجودہ معاشرتی ماحول میں یہ قدم بھی ہماری الجھنوں کا صحیح علاج نہیں۔ ہندوؤں میں ازدواجی زندگی کی یہ کشمکش اس سے زیادہ نازک صورت اختیار کر چکی ہے۔

ہماری زندگی کے اس پیچیدہ مسئلے کو جس طرح اس فلم میں حل کیا گیا ہے اس کا تعلق صرف دیکھنے سے ہے۔

ہم ناظرین ادبی دنیا سے اس فلم کے دیکھنے کی پرزور سفارش کرتے ہیں۔

سوہنی کمہارن عرف سوہنی مہینوال

سرزمین پنجاب کا افسانہ حسن و عشق سوہنی مہینوال جو شہرۂ آفاق حیثیت حاصل کر چکا ہے وہ کسی مزید تبصرے کی محتاج نہیں۔ اس تاریخی ڈرامے کی ابتدا دیہات کی معصوم فضا میں ہوئی اور دریائے چناب کی رنگین لہروں کے دامن میں اس کی تکمیل۔

ہندوستان کی مشہور فلم کمپنی میسرز موتی محل تھیٹرز نے زر کثیر کے صرف سے اس ڈرامے کو پردہ سیمیں پر منتقل کیا ہے۔ موتی محل تھیٹرز کی فلمیں جس اعلیٰ معیار کی ہوتی ہیں۔ پبلک پر ظاہر ہے۔ سوہنی کمہارن کی ڈائرکشن مسٹر ہنسراج نے کی ہے اور افسانہ ولی صاحب نے لکھا ہے۔

روح پرور نغمون۔ دلفریب گانوں۔ نظر فریب مناظر نے اس فلم میں وہ دلکشی پیدا کی ہے جس کا لطف دیکھنے ہی سے اٹھایا جا سکتا ہے۔ غرضکہ یہ فلم ہر لحاظ سے پنجابی زبان، تمدن اور معاشرت کا صحیح آئینہ ہے اور اس قابل ہے کہ تمدن پنجاب سے محبت رکھنے والا ہر انسان اسے دیکھے اور موتی محل تھیٹرز کی کامیابی کی داد دے۔

پنجابی فلموں کے اس اشتیاق کو دیکھتے ہوئے میسرز موتی محل تھیٹرز اور بھی پنجابی فلمیں تیار کرتے ہیں مصروف ہیں۔ مثلاً روپ بسنت، مرزا صاحبان۔ بھگت کبیر وغیرہ وغیرہ

ہم امید کرتے ہیں کہ پنجاب کے سامنے اس کی گذشتہ تاریخی عظمت کے نقوش کو زندہ کرنے کا یہ عزم موتی محل تھیٹرز اور پبلک کے لئے مفید ہوگا۔

الیف ایم ساقی

صرف تین ہی ہفتہ میں
آپ پر ثابت ہو جائیگا کہ
اوکاسا
آپ کو ایک نیا طاقتور آدمی بنا سکتا ہے
MADE IN GERMANY
OKASA FORTIFIES THE LUNGS
OKASA STIMULATES THE LIVER
OKASA INVIGORATES THE STOMACH
OKASA TONES THE KIDNEYS
OKASA STIMULATES INTESTINAL ACTION

بزم ادب

ماہ رواں کے تینوں مضامین اپنی اپنی جگہہ نہایت قابل قدر ہیں۔ ادبی دنیا کے سرپرست قدیمی رائٹ آنریبل سر شیخ عبدالقادر نے لندن سے ایک نہایت دلچسپ مضمون ارسال کیا ہے۔ جس کا عنوان ہے "کوہِ نور"۔ کوہِ نور پر اردو میں پہلے بھی بہت سے مضامین لکھے جا چکے ہیں۔ لیکن جو دلچسپ اور جدید معلومات اس مضمون میں ہیں شاید اس سے پہلے کسی اور جگہہ جمع نہیں ہو سکیں۔ ہم قبلہ شیخ صاحب کے بے حد ممنون ہیں کہ وہ سات سمندر پار بیٹھے بھی ادبی دنیا کو یاد رکھتے ہیں۔

پروفیسر اظہر علی صاحب فاروقی نے "اردو میں بچوں کی شاعری" کے عنوان سے ایک دلچسپ تحقیقی مضمون لکھا ہے اس موضوع پر شاید یہ اولین مضامین میں سے ہے۔ اور اگرچہ پروفیسر صاحب نے جگہہ کی قلّت کے باعث سیر حاصل بحث نہیں کی تاہم انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ اس موضوع پر آیندہ لکھنے والوں کے لئے دلیل راہ کا کام دے گا۔

رفیق گرامی میراجی نے غیر زبانوں کے شعراء پر تحقیقی مقالات کا جو سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ "انگلستان کا ملک الشعراء جان میسفیلڈ" اس کی تازہ کڑی ہے۔ یہ مضمون حسب معمول اُن کے وسیع اور باریک اندازِ نظر کی ایک روشن مثال ہے۔ اور میسفیلڈ کی چند بہترین نظموں کے دلآویز منظوم ترجموں نے اس کی خوبیوں میں اضافہ کر دیا ہے۔

سر عبدالقادر قبلہ کی خدمت میں اس دفعہ کے بہترین مضمون کا انعام پیش کرنا گستاخی ہے۔ اس لئے یہ انعام پروفیسر اظہر علی صاحب فاروقی کو پیش کیا جا رہا ہے۔ اگرچہ بجائے خود بھی یہ مضمون انعام کے قابل ہے۔

افسانوں میں اُپندر ناتھ صاحب اشک کا افسانہ "ننھا" بہترین سمجھا گیا ہے۔ اگرچہ جناب اختر انصاری کا افسانہ "فریب" بھی کچھ کم نہیں۔

مظفر احمد صاحب نے ایک نہایت اچھی کہانی "نیلا بنگلہ" فرانسیسی سے ترجمہ کی ہے اگر یہ اُن کا اپنا افسانہ ہوتا تو شاید اس دفعہ کا انعام انہیں ہی مل جاتا۔ مگر اب تو اشک صاحب لے گئے۔!

سالنامے کے متعلق ہمارے گرامی قدر معاونین کے اظہار رائے کا سیلِ رواں جاری ہے۔ اور خدا جانے کب تک جاری رہے گا۔ از بسکہ ادبی دنیا کے صفحات کی تنگ دامانی اس سے بخوبی عہدہ برا نہیں ہو سکتی اس لئے صرف چیدہ چیدہ آراء کے خلاصے درج کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

معزز معاصرین میں سے ہمایوں کے بعد ٹریبیون۔ پرتاپ ویر بھارت۔ احسان۔ حمایت اسلام۔ برہمن سندیش منادی اور شالیمار نے سالنامے پر نہایت حوصلہ افزا ریویو لکھے ہیں۔ اور ہم اس نوازش کے لئے اُن کے بے حد ممنون ہیں۔

علّامہ برج موہن صاحب دتاتریہ کیفی:۔

" یہ کہنا کہ رسالہ ادبی دنیا کا تازہ سالنامہ اپنے پچھلے برسوں کی روایات کو قایم رکھے ہوئے ہے۔ ایک قسم کی ستم ظریفی ہوگی۔ یہ درست ہے کہ ایک اعلیٰ معیار کا قایم رکھنا اور اس کا نباہ ٹیڑھی کھیر ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس معیار میں کہاں تک ترقی ہوئی ہے۔ مجھے ابتدا سے ادبی کے دیکھنے کا موقع ملا ہے اور میں یہ دیکھ کر خوش ہوں کہ امتدادِ وقت کے ساتھ اس کا معیار بھی بڑھتا ہی گیا ہے۔

۱۹۳۹ء کا سالنامہ پونے تین سو صفحوں کی ایک نہایت دلچسپ کتاب ہے جس سے کیا مبتدی اور کیا منتہی۔ کیا معلّم اور کیا متعلّم سب مستفید اور محظوظ ہو سکتے ہیں۔ اس بارے میں صلاح الدین صاحب کی وقتِ نظر اور حسنِ انتخاب کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔"

نذیر احمد صاحب مرغوب:۔

سرورق سے لے کر تمت بالخیر تک اس کی دل کشی بڑھتی

ہی گئی ہے۔ معیار کے متعلق صرف اسی قدر کہہ سکتا ہوں کہ اگر خدا دوسرے رسائل کو بھی آپ کی پیروی کی توفیق دے تو ہندوستان میں انگریزی کی بجائے اردو کا سکہ یقیناً چل پڑے۔"

اختر انصاری صاحب دہلوی

"سالنامہ ادبی دنیا صحافتی دنیا کا ایک حیرت انگیز کارنامہ ہے۔ اس شاندار کامیابی پر پُر خلوص مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ میراجی کا مضمون حسب معمول نہایت عمدہ ہے۔ آپ کا ڈراما مجھے بے حد پسند آیا اور قمر صاحب کا ڈراما بھی۔ میرے نزدیک یہ تینوں چیزیں سالنامے کی جان ہیں!!"

جگن ناتھ صاحب آزاد

"صحافت کے اُفق پر نیّرِ نوروز کی صورت — نئے انداز سے یہ سالنامہ جلوہ آرا ہے!
جوابِ دامنِ گلزار ہے پہلا ورق اس کا — مصوّر نے کچھ اس انداز سے اس کو سنوارا ہے
نگاہِ شوق اُٹھے اس کے حسیں صفحات سے کیونکر — کہ ہے ہر سطر اس کی کہکشاں ہر لفظ تارا ہے!
کہوں کیا کس قدر ہے دلنشیں کیفِ شباب اس کا
کہ ہر نقشِ حسیں چغتائی نے جس کا اُبھارا ہے!"

پیارے لال صاحب شاکر میرٹھی

"امسال سالنامہ بہت اچھا رہا اور رسالہائے گزشتہ کے مقابلہ میں ہر لحاظ سے کامیاب۔ اس شاندار کامیابی پر مبارکباد عرض کرتا ہوں۔"

جناب ناکارہ حیدرآبادی

"گو سالنامہ اس وقت میرے پاس نہیں ہے۔ بلکہ 'مفت خور شائقین' کے حلقہ میں چکر لگا رہا ہے ـــــ اور اس کے واپس آنے کی توقع بہت کم ہے ـــــ لیکن شکر ہے کہ اس کے داغِ مفارقت دے جانے سے پہلے ہی میں نے اُسے پڑھ لیا تھا۔ ورنہ افسوس رہ جاتا۔ کیونکہ سالنامہ واقعی بہت اچھا ہے۔ میں نے تنقیدی نظر سے اُس کا مطالعہ کیا تھا۔ فکر یہ تھی، کہ کوئی ایسا مضمون یا افسانہ نظر پڑے۔ جس کا حوالہ دے کر میں آپ کو ایک شانِ بے نیازی سے متنبہ کر سکتا کہ 'دیکھئے! یہ مضمون' ادبی دنیا' کے سالنامہ میں جگہ پانے کا ہرگز مستحق نہ تھا۔ لیکن سچ تو یہ ہے کہ مجھے اپنے مقصد میں کامیابی نہ ہوئی۔ مضامین اور افسانے سب کے سب ایسے ہیں کہ خریدار بھی خوش ہوئے ہوں گے اور 'مفت خور' بھی۔ نظم کا حصہ بھی قابلِ لحاظ ہے۔ تصویریں متعدد ہیں، لیکن ان کی تعداد بھی کافی صلہ نہ ہوتی، اگر حسنِ انتخاب کارفرما نہ ہوتا۔"

جناب آسی رام نگری

"سالنامہ ہر حیثیت سے کامیاب ہے۔ خاص کر افسانوں کا معیار نہایت بلند ہے۔ میں بلا مبالغہ کہہ سکتا ہوں کہ ادبی دنیا کا زیرِ نظر سالنامہ سالِ رواں کے تمام سالناموں پر فوقیت رکھتا ہے۔ میں ادارہ کو اس قابلِ رشک کامیابی پر دلی مبارکباد دیتا ہوں۔"

احمد ندیم صاحب قاسمی

"آپ نے سالنامہ کے ذریعے جدید اردو ادب کی شاندار نمائندگی کی ہے، کیا ہندی نژاد صاحبان اردو کے عروج کا عکس آپ کے اس مرقع میں نہیں دیکھ سکتے؟"

صلاح الدین احمد

رباعیات

(۱)

کیا چیز ہے غمزۂ دیدۂ گریاں کیا ہے

یہ ہے لباس پیچیاں کیا ہے

کرتے ہیں ہے ساغر سے کام

مجھ کو ہے فقط گردش ساغر سے کام

معلوم نہیں گردش دوراں کیا ہے

(۲)

ہیں یاس ہی کو ہمکنار دیکھوں نہ کبھی

اپنے پہلو میں خار دیکھوں نہ کبھی

اپنے پہ نثار ہوں بنفس

عارض سے ترے نثار دیکھوں نہ کبھی

تا شب انتظار دیکھوں نہ کبھی

سعید احمد اعجاز

انجام

میں نے کیا اک سحر ارادہ

وصف اُن کے جمال کا کروں گا

حق نازو کرشمہ و ادا کا

اک گیت میں سب ادا کروں گا

پھر تازہ نفس چمن میں جاکر

کلیوں کی بھری گلے میں نکہت

اور ساز شعاعوں کا بجا کر

گانے لگا نغمۂ محبت

اٹھنے لگا جانفزا ترنم

لہرانے لگی فضا چمن کی

دنیا تھی گلوں کا ایک قلزم

جنت تھی بہار نسترن کی

اُن پھولوں سے بھر کے میں نے دامن

تر کر لیا چشمۂ بقا سے

جب پیش کیا انہیں یہ خرمن

مرجھا گئے پھول سب حیا سے

(انگریزی سے)

مسعود شاہد

آئینۂ عالم

ریڈیم کا انکشاف

شہر پیرس میں ستمبر ۱۸۹۷ء کا ایک خوشگوار دن ہے۔ ایک حصۂ مکان میں جو صرف تین چھوٹے چھوٹے کمروں پر مشتمل ہے، ایک عورت زچگی کے بستر پر اپنے ہفتہ بھر کے پہلوٹی کے بچے کو لئے پڑی ہے۔ یہ اس کی بیٹی ہے۔ اس کے دل میں اپنے لختِ جگر کے لئے بے انتہا محبت ہے۔ کیونکہ یہ نتیجہ ہے اس کی پرستارانہ، استوار اور روحانی محبت کا۔ لیکن اس وقت اس کا دل کسی اور ہی خیال سے معمور ہے —— اُس چھوٹے سے کمرے کے خیال سے جو آہنی کڑاہیوں، سائنس کے آلات اور کیمیائی ادویات کی تیز تیز بو سے معمور ہے۔

وہ اور اس کا خاوند کئی مہینوں سے اسی کمرے میں مشغولِ کار رہے ہیں، اکثر انہوں نے رات کے آرام کی پروا بھی نہیں کی۔ وہ اس نئے عنصر کے راز کو معلوم کرنا چاہتے ہیں جسے وہ بے مثال قوت کا حامل سمجھتے ہیں اس وقت ایک نئے تجربے کا خیال اُسے سُوجھا ہے اور اس کا دل اُسے آزمانے کے لئے بے قرار ہو رہا ہے۔

"اب صبر کی تاب نہیں ہے —— میں اسی وقت اسے آزماؤں گی" اپنے آپ سے کہتی ہوئی کمال نقاہت کے ساتھ وہ اپنے بستر سے اُٹھتی ہے —— ایک محبت بھری نگاہ اپنے سوتے ہوئے بچے پر ڈالتی ہے اور دبے پاؤں کمرے سے نکل کر تجربہ گاہ میں مشغول ہو جاتی ہے۔

یہ غریب "ماں" ماری کلاوڈوسکا کیوری ہے جو سائنس کی تاریخ میں ایک عظیم الشان اور تہلکہ برپا کر دینے والا انکشاف کرنے والی ہے —— ریڈیم کا انکشاف۔ ایسا انکشاف جو ماری کا شمار دنیا کی قابل ترین، ممتاز ترین اور اولوالعزم عورتوں میں کرنے والا ہے۔

ماری پولینڈ میں ۱۸۶۷ء میں پیدا ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اس کا ملک زارِ روس کے مظالم تلے پِسا جا رہا تھا۔ پولینڈ کی قومی زبان کا استعمال مدرسوں، گرجاؤں اور اخبارات کے لئے حکماً روک دیا گیا تھا اور زار کے جاسوسوں سے باشندگانِ ملک ہر وقت سہمے رہتے تھے۔

سترہ سال کی عمر میں ماری ایک معزز روسی خاندان کے ہاں بچوں کی استانی کی حیثیت سے ملازم ہوئی۔ لیکن اُس کے دُکھے ہوئے دل میں زار کی فوج کے مظالم، روسی توپ خانے کی آتش فشانی اور اپنی ملکی بہنوں کی تڑپتی ہوئی لاشوں کی یاد ابھی تک تازہ تھی۔ چنانچہ وہ انقلابی طالب علموں کے گروہ میں شامل ہو گئی اور اُن کے اخبارات میں مضمون لکھتی رہی۔

جب اس گروہ کے چند افراد گرفتار ہو گئے تو ماری کی شخصیت بھی بے نقاب ہو گئی اور وہ پولیس کے نرغے میں آ گئی چوبیس سال کی عمر میں وہ وارسا سے فرار ہوئی اور پیرس میں آ کر ایک مکان کی آخری منزل میں نصف فرانک یومیہ پر گذارا کرنے لگی۔ اس زبوں حالی میں بھی وہ ایک سائنسدان بننے کے خواب دیکھ رہی تھی۔

ماری کی نوعمری کے زمانے میں جبکہ وہ اپنے ایک رشتہ دار کی لیبارٹری میں کچھ تجربے کر رہی تھی، مشہور پروفیسر منڈلیف نے اسے دیکھ کر پیش گوئی کی تھی کہ اس لڑکی کا ستارہ کسی وقت اپنی درخشانی سے اقصائے عالم کو منور کر دے گا۔ اُس وقت ماری کا باپ وارسا کے ایک سکول میں طبیعیات اور ریاضی کا پروفیسر تھا۔

سار بون یونیورسٹی کی لیبارٹری میں بوتلیں صاف کرنے اور دوسری ادنیٰ خدمات انجام دینے کے عوض میں اس کا نام زمرۂ طلباء

میں درج کر لیا گیا۔ ۱۸۹۴ء میں ایک سہیلی کے گھر پر وہ پہلے پہل پائرے کیوری سے ملی جو اس وقت پال شنزن برگر کی لیبارٹری میں کام کرتا تھا۔ پال طبیعیات اور کیمیا کے سکول کا ڈائرکٹر تھا۔

ماری مدن کے پہلے ہی تیر سے گھائل ہو گئی اور کیوری باوجود اپنی پینتیس سال کی عمر کے اس چیستان کو سوچتا ہی رہ گیا کہ ایک اُمنگوں بھری جوان لڑکی اپنی زندگی کو کیسے سائنس کی دقیق تحقیقات کے لئے وقف کر سکتی ہے۔

ماری نے کہا "میں حیران ہوں کہ تم نے عورت کی استعداد کو محدود سمجھنے والے عجیب و غریب خیالات کہاں سے اخذ کئے ہیں؟" اور پھر نوجوان محقق کی باتوں سے مسحور ہو کر سیدھی بوڑھے شنزن برگر کے پاس پہنچی اور بولی "کیا آپ مجھے موسیو پائرے کیوری کے ساتھ مل کر کام کرنے کی اجازت دے سکتے ہیں؟"

پروفیسر مسکراتے ہوئے بولا "ہاں"۔ چنانچہ پائرے اور ماری میونسپل سکول میں استاد اور شاگرد بن گئے ——— اور شاید کچھ اور بھی۔

جولائی ۱۸۹۵ء میں انہوں نے شادی کر لی اور تین کمرے کرائے پر لے کر انہیں نہایت ہی مختصر اور ضروری سامان سے آراستہ کر لیا۔ اس سامان میں دو سائیکلیں بھی تھیں جن پر چڑھ کر وہ ہر ہفتے چھٹی منانے کے لئے دیہات کی طرف نکل جاتے تھے۔

اب اُن کی سائنس کی دنیا میں اہم واقعات ظہور پذیر ہونے شروع ہوئے۔ جنوری ۱۸۹۶ء میں رونٹجن نے ایکس رے کی ایجاد کا اعلان کیا جو ٹھوس مادے میں سے گذر کر انسان کی ہڈیوں کو نمایاں کر دیتی تھی۔ بیکورل سے اتفاقاً اپنے فوٹو گرافی کے تاریک کمرے میں خام یورینیم کا ایک ٹکڑا تصویر اُتارنے کی ایک پلیٹ پر پڑا رہ گیا۔ جب اس نے پلیٹ کو دوبارہ دیکھا تو اس پر ایک داغ پڑ گیا تھا۔ حالانکہ پلیٹ ڈھکی ہوئی تھی۔ اس نے خاص یورینیم کے کچھ اور ٹکڑے لے کر چند اور پلیٹوں پر رکھ دیئے۔ نتیجہ وہی تھا بلکہ جس ٹکڑے میں خالص یورینیم کا عنصر جتنا زیادہ تھا اس کا داغ بھی اتنا ہی گہرا تھا۔ مزید تجربات سے ثابت ہوا کہ کھیل کیا ہُوا خام مواد خود یورینیم سے بھی زیادہ تیز ہے۔ بیکورل ماری کی علمی جستجو اور اپنا ندارانہ کاوشوں کو جانتا تھا چنانچہ اس نے معمہ حل کرنے کے لئے اسی کے سپرد کر دیا۔

ماری کی خوش بختی کا ستارہ طلوع ہو چکا تھا، اس نے اپنے خاوند سے مشورہ کیا اور پھر دونوں اپنی شکستہ حال تجربہ گاہ میں مصروف کار ہو گئے ——— آسٹریا کی کانوں سے ایک ٹن خام مواد منگوایا۔ بڑی بڑی ناندوں میں ڈال کر اُبالا اور مقطر کیا۔ پھر اُبالا اور پھر کیا۔ یہاں تک کہ اس کے انجرات سے دم گھٹنا شروع ہو گیا۔ انہوں نے دنیا و مافیہا کو بھلا رکھا تھا سوائے اس نامعلوم عنصر کے جو اس ٹن بھر کیچڑ کے اندر ایک راز کی طرح چھپا ہوا تھا۔

۱۸۹۶ء کی سردیاں معمول سے زیادہ شدت کے ساتھ پڑیں۔ ماری جو ہڈیوں تک تکان سے چور ہو رہی تھی نمونئے سے ایسی گری کہ تین مہینے تک اُٹھ نہ سکی۔ وہ زندگی کے بجائے موت سے زیادہ قریب پہنچ گئی تھی اور پھر آیندہ ستمبر میں بچہ پیدا ہُوا۔ وہ بچے کی پرورش کرتی یا اپنی تحقیقات کو جاری رکھتی؟ پائرے کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ اس کا باپ انہیں کے گھر آ گیا اور اس نے ننھی آئرین کو اس خوبی سے سنبھالا کہ یہ دونوں پھر اطمینان سے اپنے کام میں مشغول ہو گئے۔

ماری کو لیبارٹری کے کام کے علاوہ گھر بھر کا کھانا بھی پکانا پڑتا تھا۔ چنانچہ کام کی زیادتی کی وجہ سے وہ پھر بیمار پڑ گئی لیکن پائرے کی ہمت بندھاتی رہی کہ کہیں ہار کر وہ کام نہ چھوڑ بیٹھے۔ ماری نے بعد میں ایک دفعہ حسرت بھرے دل کے ساتھ کہا کہ "اُس شکستہ حال سائبان (لیبارٹری) میں ہم نے زندگی کے بہترین اور مسرور ترین سال گذارے ہیں"۔

دو سال تک ——— پورے دو سال کی طویل مدّت انہوں نے گمنامی اور مشقّت میں گذار دی۔ پائرے کو جنیوا کی یونیورسٹی میں پروفیسری کا عہدہ پیش ہوا، وہ سوئٹزر لینڈ چلا گیا۔ لیکن ماری نے اسے فوراً واپس بلا لیا۔ اپنی تحقیقات میں کسی چیز کا حارج ہونا اسے کسی طرح گوارا نہ تھا۔

اب ان کی کامیابی کا آفتاب طلوع ہونے کا وقت آ گیا۔ اُن کے تاریک ماحول میں روشنی کی پہلی کرنیں نمودار ہوئیں۔ سب سے پہلے بسمتھ کے اُس نمک میں جس کی حقیر سی مقدار انہیں حاصل ہوئی تھی ایک ایسا عنصر معلوم ہوا جو یورینیم سے تین سو گنا زیادہ طاقت ور تھا۔ اس کے بعد ایک ایسا مادّہ حاصل ہوا جو نکل سے مشابہت رکھتا تھا شاید یہی اصلی عنصر تھا۔ پھر ۱۸۹۸ء کے موسم گرما میں یقینی طور پر ایک بالکل نئی چیز حاصل ہوئی جس کا نام اُس نے اپنے وطن پولینڈ کے اعزاز میں

پولونیم رکھا اور بالآخر تجربوں پر تجربے کرنے کے بعد وہ ناصاف اور بے ڈول
خام مواد لاتعداد اعمال تقطیر سے گذرا ایک ننھی سی نلکی میں ایک جوہر کی
صورت میں رہ گیا۔ ایک درخشاں معجزہ جس کی ہلکی کرنیں شیشے کی نلکی سے
چھن چھن کر چاروں طرف بکھر رہی تھیں۔

—— نمک کے چند بلوریں ذرّے —— اُس سارے
مٹی کے ڈھیر کا ست ریڈیم!

ماری کہتی ہے وہ چمکتی ہوئی شیشے کی نلکیاں اُس شکستہ حال جھونپڑے
میں یوں نظر آتی تھیں جیسے ستارے جھلملا رہے ہوں۔" ایک زمانہ تھا کہ
اسی کمرے میں لاشوں کی چیر پھاڑ کی جاتی تھی، لیکن آج اسی کے کھنڈر
میں سائنس کا ایک عظیم الشان معجزہ دکھایا جا رہا تھا۔

اس انکشاف کے ساتھ ہی ان کی قسمت کا ستارا بھی چمک
اٹھا۔ پائرے کو ساربون میں طبیعیات کی پروفیسری مل گئی اور ماری
لڑکیوں کے سکول میں لیکچرار مقرر ہو گئی۔ پانچ سال کے اندر اندر
ریڈیائی عمل پر مبسوط مضامین مرتب ہو گئے۔

اس تمام مشقت کے دوران میں وہ ایک فرض شناس ماں کی
طرح اپنے بچے کی پرورش کرتی رہی۔ لیکن اس نے صرف اپنے بچے کو
ہی نہیں پالا بلکہ دنیا کے ایک ایسے کیمیائی اچنبے کو پروان چڑھایا جو اپنی
اندرونی آگ سے اس شدت کی تپش دیتا ہے جو کوئلے کی آگ سے دو
لاکھ گنا زیادہ تیز ہے۔ انسان کے حیطۂ علم میں اس سے زیادہ طاقتور
شئے اور کوئی نہیں ہے۔

ریڈیم کا ایک ننھا سا حقیر ذرہ کسی چوہے کی پشت پر رکھ دیجئے،
وہ سولہ گھنٹے کے اندر اندر مرجائے گا۔ اگر اسی ذرّے کو انسان کی جلد
پر رکھ دیں تو چھالے پڑ جائیں گے۔ ریڈیم زہریلے جراثیم کو مار دیتا ہے،
سرطان کی اکثر قسموں میں شفا بخشتا ہے اور مادے کے اندر گھس جاتا ہے۔

اس شفا بخش جوہر کے برے اثرات کا پہلا شکار خود پائرے ہوا
جس کے بازو اور انگلیاں اس کے رکھنے اٹھانے میں زخمی ہو گئیں۔
بیکو ریل اس کی ایک تھوڑی سی مقدار ایک شیشی میں بند کر کے اور اپنی
واسکٹ کی جیب میں احتیاط سے رکھ کر رائل سوسائٹی میں دکھانے
کے لئے لندن لے چلا۔ راستے میں اس کی جلد بری طرح جل گئی۔

کیوری اور ماری کو ان کی بیش بہا خدمات کے سلسلے میں لیجین
آف آنر اور نوبل پرائز سے سرفراز کیا گیا۔

ماری کے ہاں تحقیقات کے دوران میں ہی دوسری لڑکی پیدا
ہوئی۔ پھر اپریل ۱۹۰۶ء میں اس پر ایک بڑا سانحہ گذرا۔ پائرے پیرس
کے ایک بازار میں سڑک کو عبور کر رہا تھا کہ ناگہاں ایک گاڑی سے ٹکرا
کر گرا۔ ابھی وہ سنبھلنے بھی نہ پایا تھا کہ ایک دوسری گاڑی کے پہیئے اس
کے علم سے بھرپور سر کو کچل کر پاش پاش کر گئے۔

جب یہ المناک خبر ماری کو سنائی گئی تو اسے سکتہ ہو گیا۔ اس
کے منہ سے صرف یہ الفاظ نکلے "پائرے مر گیا —— آہ وہ مر گیا" اس کی
موت کے بعد کچھ عرصے تک تو وہ سب کچھ بھول گئی۔ لیکن پھر اپنی لیبارٹری
کے کام میں تندہی اور استقلال کے ساتھ مشغول ہو گئی جو اس کی تسلی کا
واحد ذریعہ رہ گئی تھی۔

جو اسامی اس کے خاوند کی موت سے خالی ہوئی تھی۔ وہ ماری
کو ملی۔ چنانچہ وہ ساربون کی پہلی خاتون پروفیسر ہے۔

۱۹۱۰ء میں پائرے کے ایک پرانے دوست کی مدد سے اس
نے خالص ریڈیم کو اس کے نمکوں سے جدا کر لیا۔ اس کامیابی کے
صلے میں نوبل پرائز اسے دوسری مرتبہ عطا کیا گیا۔ اب وہ اپنے کام کو تکمیل تک
پہنچا چکی تھی۔

جنگ عظیم کے دوران میں جب جرمنوں نے پیرس کے امن
کو مخدوش کر دیا تو وہ اپنی انمول شیشی لے کر بورڈیو کی طرف بھاگی اور
اُسے حملہ آوروں کی زد سے محفوظ کر کے واپس پیرس میں آ گئی جہاں وہ
رضا کار عورتوں کو علم شعاعی کی تعلیم دیتی رہی۔

اُس مصیبت اور قربانی کے چار سالوں کے دوران میں دو باتیں
ایسی ظہور میں آئیں جن پر وہ بجا طور پر فخر کر سکتی تھی، ایک پولینڈ کی آزادی
اور دوسرے علم معالجہ میں شعاعوں کی مستند اور مستقل حیثیت، کیونکہ میدان
جنگ کے بے شمار زخمیوں کا علاج ایکسرے کی مدد سے کیا گیا۔

فرانس نے پندرہ لاکھ فرانک ماری کو ریڈیم کی مزید تحقیقات کے
ضمن میں ایک مخصوص لیبارٹری اور کارخانہ قائم کرنے کے لئے دیئے جس
کی قیمت اس وقت دس ہزار پونڈ فی گرام ہے۔ ماری نے جولائی ۱۹۳۴ء
میں انتقال کیا لیکن جو عظیم الشان کام اس سفید بالوں پرعزم چہرے
اور پرحکمت دماغ والی عورت نے شروع کیا تھا۔ ابد تک جاری
رہے گا۔

سفید رُوسی

جب بالشویکی انقلاب نے رُوس کو "سُرخ روس" میں تبدیل کر دیا تو باشندگانِ ملک کی ایک بہت بڑی تعداد جنہیں نئے دستورِ حکومت سے اتفاق نہ تھا یا جو اس کے مخالف تھے دوسرے ملکوں کی طرف بھاگ گئے۔ آج قریباً بیس لاکھ روسی یورپ کے مختلف شہروں میں آباد ہیں جن میں سے دو لاکھ کے قریب صرف فرانس میں بستے ہیں۔ اکثر پیرس کے نواحی صنعتی مضافات میں قیام پذیر ہیں۔ اگرچہ ان میں سے ایک خاصی تعداد نے فرانسیسی شہریت قبول کر لی ہے لیکن حقیقت میں وہ آج بھی ویسے ہی روسی ہیں جیسے کہ روس سے رخصت کے دن تھے۔

پیرس "سفید رُوسیوں" کا مرکز بن گیا ہے۔ رؤسا، جاگیردار، ساہوکار، ڈاکٹر، وکیل، تاجر اور وہ لوگ جو حکومت ماسبق کے عہد میں بلند عہدوں پر فائز تھے، سیاسی رہنما، اور بڑے بڑے حاکم جو آخر وقت تک نئی حکومت سے برسرِ پیکار رہے، انقلابیوں کے زور پکڑتے ہی یا تو خود روس سے بھاگ نکلے یا جلا وطن کر دئیے گئے۔ اور یورپ کے مختلف حصوں میں آکر آباد ہو گئے۔ ان میں سے اکثر فرانس میں پناہ گزیں ہوئے کیونکہ روسی اُمرا فرانسیسی تمدّن کے لئے ایک خاص رغبت رکھتے ہیں۔

ان روسیوں کا سلادی الاصل کردار اتنا لچکدار اور نرم ہے اور اس خوبی کے ساتھ فرانسیسی سانچے میں ڈھل گیا ہے کہ اب یہ لوگ عام فرانسیسیوں سے الگ نظر نہیں آتے اور اُن فرانسیسی کاریگروں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملائے مصروفِ کار نظر آتے ہیں جو تہِ دل سے سوویٹ دستور کے حامی ہیں۔ کئی ٹیکسی ڈرائیور یا دُکاندار ہیں۔ روسی عورتوں نے بھی متعدد قسم کے مشاغل اختیار کر رکھے ہیں۔ کچھ تو فرانسیسی گھرانوں میں روزانہ مزدوری کے حساب سے کام کرتی ہیں اور کچھ دُکانوں درزی خانوں وغیرہ میں ملازم ہیں۔ دیکھنے والوں کو حیرت ہوتی ہے کہ وہ کونسا کام ہے جسے یہ رُوسی مرد اور عورتیں کسی چھت کے سائے تلے اپنا سر چھپانے کے لئے اختیار نہیں کرتے۔ پیرس کی سڑکوں پر روسی ٹیکسی ڈرائیور ایک مقبول ہستی ہے۔

فرانس کے یہ سفید رُوسی اپنے گردوپیش کے لوگوں سے اپنے آپ کو ممتاز رکھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ وہ فرانسیسی زبان اس صفائی کے ساتھ بولتے ہیں کہ ان پر غیر ملکی غیر ہونے کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ لیکن اس غریب الوطنی میں بھی وہ اپنے پرانے روسی تمدن کی روایات کو ضائع نہیں ہونے دیتے۔

فرانس میں مجموعی طور پر قریباً ایک سو پچاس انجمنیں سفید روسیوں نے بنا رکھی ہیں اور یہ سب ایک مرکزی کمیٹی کے ماتحت ہیں جس کا صدر سابق حکومت روس کا وزیر اعظم کونٹ کوکوزیف ہے۔ قریب قریب ان تمام انجمنوں کی توجہ ان کے تمدنی اور مذہبی معاملات پر مرکوز ہے۔

فرانس کے ان پناہ گزینوں کی زندگی اور ان کے مشاغل پر مذہب کا بڑا اثر ہے۔ اس وقت ان کے پینتیس گرجے موجود ہیں۔ اور اس کے علاوہ پادریوں کی تعلیم و تربیت کے لئے متعدد دینیات کے مدرسے ہیں۔ روس کی حدود سے باہر روسیوں کو ایک رشتے میں منسلک اور متحد رکھنے کے لئے ان کا مذہب سب سے بڑی طاقت ہے۔

فرانسیسیوں کی عملی امداد و اعانت کے سہارے ان پناہ گزینوں نے مہاجرین کی آسانی کے لئے متعدد ہجرت کمیٹیاں بنائیں۔ جنہوں نے نہ صرف مہاجروں کے اخلاقی معیار کو گرنے سے بچا لیا بلکہ ان کو برسرِ کار کرنے میں بیش بہا خدمات انجام دیں۔ بہت سے ایسے تھے جنہیں قوت لایموت بہم پہنچانا مشکل تھا۔ یہ امر خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ باوجود ان مصائب کے ان سفید روسیوں نے اپنی مشکلات کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ ان لوگوں میں جرائم کا رجحان بالکل مفقود ہے۔

باوجود ان مشکلات و مصائب کے سفید روسی پیرس کے نشاط شبینہ سے پوری طرح لطف اندوز ہوتے ہیں۔ شرابِ ناب کے جام لنڈھاتے ہیں، گاتے ہیں، ناچتے ہیں اور زندگی کے غم و الم کو مسرت انگیز قہقہوں میں غرق کر دیتے ہیں۔ انہیں اس بات کا پورا یقین نہیں ہے کہ ان کی موجودہ نسل روس کے حالات میں کوئی تبدیلی کر سکے گی۔ لیکن اس کے باوجود وہ اپنی پرانی روایات کو زندہ و قائم رکھتے ہیں۔ ایسی کمیٹیاں ہیں جو اعلیٰ درجے کے روسی ادب کو شائع کرتی رہتی ہیں اور پھر وہ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو یکجا ہونے کے مواقع بہم پہنچاتی ہیں تاکہ وہ آپس میں شادی کر کے روسی نسل کی پاکیزگی کو قائم رکھیں۔

ایک نوجوان روسی خاتون سے جو ایک روسی ٹیکسی ڈرائیور کی بیٹی ہے۔ یہ ڈرائیور زار کی فوج میں ایڈمرل تھا، پوچھا گیا کہ کیا پیرس کی سولہ سال کی بود و باش کے بعد وہ اپنے آپ کو کافی حد تک "فرانسیسی" محسوس

نہیں کرتی؟ اس نے جواب دیا "جب میں نوعمر تھی تو اپنے آپ کو بہت بڑی
حد تک فرانسیسی ہی محسوس کرتی تھی لیکن جوں جوں میں بڑی ہوتی جاتی
ہوں میں اپنے آپ کو زیادہ سے زیادہ "روسی" پاتی ہوں" اس معاملے میں
قریباً ہر سفید روسی کے احساسات یکساں ہیں۔

یہ کہنا قطعاً غلط ہے کہ فرانس کے یہ سفید روسی کوئی سیاسی
خواب نہیں دیکھتے۔ یہ لوگ دو بڑے گروہوں میں منقسم ہیں۔ شہنشاہیت
پرست گروہ سمجھتا ہے کہ ایک وقت آئے گا، جب سوویٹ حکومت کا
تختہ اُلٹ جائے گا اور پھر وہی پرانا دستور حکومت قائم ہوگا۔ دوسرا
گروہ جس کی اکثریت فوجی افراد پر مشتمل ہے، بالشویکی حکومت کا مخالف
تو ضرور ہے لیکن شہنشاہیت کے حق میں بھی نہیں۔ یہ لوگ بے وطن
روسی نوجوانوں کا رشتہ اندرون ملک کے روسیوں سے وابستہ
رکھنا چاہتے ہیں تاکہ روسیوں کی دو مختلف نسلیں نہ بن جائیں۔ لیکن
سوویٹ یونین کے ساتھ حکومت فرانس کے دوستانہ تعلقات اُسے
اس بات پر مجبور کرتے ہیں کہ سفید روسیوں کے سیاسی مشاغل پر کڑی نگرانی
رکھی جائے۔ اور سچ یہ ہے کہ یہ لوگ بھی حکومت فرانس کی ذمہ داریوں
کو محسوس کرتے ہیں اور اس کی مہمان نوازی سے ناجائز فایدہ نہیں اٹھاتے
یہی وجہ ہے کہ وہ سوویٹ یونین کے خلاف کوئی سازش کرنے سے
احتراز کرتے ہیں۔

ان سفید روسیوں کا مستقبل خواہ کچھ بھی ہو، یہ بات یقینی ہے کہ
وہ پرامن شہریوں کی طرح فرانس ہی میں رہیں گے اور اپنی قدیم روایات
کو محفوظ رکھیں گے۔ یہ پیش گوئی کرنا محال ہے کہ ان کی اولاد بالشویکی
خیالات کو قبول کئے بغیر کبھی اپنے وطن کو واپس جاسکے گی یا نہیں۔

پانسے کا ہاتھ

قمار بازی کی دیوی کے تمام پرستاروں میں سے جنہوں نے سبز
رنگ کی میزوں پر دولت کو پانی کی طرح بہایا ہے۔ ایسے لوگوں کی تعداد
بہت ہی کم ہے جن کی قسمت کا ستارہ جرنیل ڈارو کی طرح چمکا ہو۔

نپولین جو خود ایک الگ قسم کا قمار باز تھا، ملکوں پر ملک جیت رہا
تھا اور اسی اثنا میں جرنیل ڈارو جوئے کی میزوں پر دولت کے انبار
سمیٹ رہا تھا۔

اس شخص کی قسمت اتنی تیز تھی کہ آخر کار یہی اس کے راستے
میں رکاوٹ ثابت ہونے لگی۔ کیونکہ جو شخص بھی اسے جانتا تھا۔ اس کے
ساتھ جوا کھیلنے سے انکار کر دیتا تھا۔ چنانچہ اُسے ایسے لوگوں کی تلاش
میں یورپ کے طول وعرض میں سفر کرنا پڑا جن تک اس کی شہرت نہ
پہنچی ہو۔ آخر کار جب وہ اپنے طویل سفر کے بعد فرانس میں واپس آیا تو
امیر نوجوانوں کے والدین نے اپنی دولتوں کے ڈھیر برف کی طرح
پگھلتے ہوئے دیکھ کر حکومت سے درخواست کی کہ وہ کسی نہ کسی حیلے
جرنیل ڈارو کو جوا کھیلنے سے باز رکھنے کی کوشش کرے اور ان کے
بچوں کو تباہی سے بچائے۔

لیکن مشکل یہ تھی کہ فرانس کا قانون جوا کھیلنے کی اجازت دیتا
تھا اور ڈارو اتنا صاف کھیلتا تھا کہ اس پر کسی قسم کی دھوکا بازی کا
گمان بھی نہ کیا جاسکتا تھا۔ ظاہر ہے کہ حکومت کوئی قانونی حربہ استعمال
کرنے سے عاجز تھی۔ لیکن اس کے باوجود ایک کوشش کی گئی۔ جرنیل
ڈارو کو چار ہزار پونڈ سالانہ کی رقم اس شرط پر پیش کی گئی کہ وہ فرانس کے
قمار خانوں میں جانے سے محترز رہے۔

ڈارو نے یہ پیش کش نہایت حقارت کے ساتھ رد کر دی
نپولین کی خفیہ پولیس کے افسر اعلیٰ فوشے نے ایک دلیرانہ قدم اٹھایا
اور ڈارو کو آیندہ جوا کھیلنے کی پاداش میں فوری گرفتاری اور ملک
بدر کرنے کی دھمکی دی۔

اگرچہ یہ دھمکی خلاف ضابطہ و قانون تھی لیکن ڈارو ڈر گیا۔
یہ احکام خود اس کی ذات کے لئے تھے، اس لئے اس نے ایک نیا
طریقہ سوچ لیا۔ اب اس نے بجائے خود کھیلنے کے اپنے نائبوں
کو اپنی خاص ہدایات کے ساتھ قمار خانوں میں بھیجنا شروع کیا اور
دولت پھر اسی طرح کھنچی ہوئی اس کے پاس آنے لگی۔

کچھ عرصے کے بعد فوشے کو بھی اس چالاکی کا پتہ مل گیا چنانچہ
اب اس نے ایک نیا طریقہ سوچا۔ ڈارو کو حکومت میں ایک اعلیٰ
اعزازی عہدہ اور معقول تنخواہ اس شرط پر پیش کی کہ وہ فرانس کی حدود
کے اندر جوا نہ کھیلے۔ ڈارو نے اس شرط کو قبول کر لیا اور دوسری
مرتبہ لمبے سفر پر نکل گیا۔

ڈارو ایک سخت دل قمار باز تھا کیونکہ ان لوگوں کے لئے

جو اپنی بیش بہا قوم اس سے ہار جاتے تھے اس کے دل میں ہمدردی کی ایک رمق تک موجود نہ تھی لیکن اس کے باوجود نوجوانی اور ناتجربہ کاری کا سامنا ہوتے ہی اس کا دل پسیج جاتا تھا۔ چنانچہ اس پتھر کے دل سے بعض اوقات لطف وکرم کے چشمے بھی پھوٹ نکلتے تھے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ فلورینس کے ایک ساہوکار نے اس مشہور جرنیل کے مقابلے میں اپنی قسمت آزمانے کے لئے اسے اپنے گھر پر مدعو کیا۔ ساہوکار کے مکان پر دوسرے امرائے شہر کے علاوہ حسین وجمیل شہزادی ڈی ایکوہل بھی موجود تھی۔

ڈارد کو کچھ حیرانی سی ہوئی کیونکہ اس نے آج تک شہزادی کو جوا کھیلتے دیکھا یا سنا نہ تھا۔ چنانچہ پہلا فقرہ جو ڈارد کی زبان سے ادا ہوا وہ شہزادی کے لئے تنبیہہ تھی۔

"محترم شہزادی! فلورینس میں آپ کو دیکھ کر مجھے بے انتہا خوشی ہوئی ہے لیکن میں چاہتا تھا کہ بجائے اس جگہہ ملنے کے میں آپ کو کسی اور جگہہ ملتا"۔

شہزادی نے ہنستے ہوئے جواب دیا "جرنیل صاحب! میں یہاں پہلی مرتبہ آئی ہوں" اور پھر میز پر پڑی ہوئی اشرفیوں کی طرف اشارہ کرکے بولی "دیکھو میں جیت رہی ہوں"۔

"مبتدی عموماً جیتتے ہی دیکھے گئے ہیں" جرنیل نے متانت آمیز لہجے میں کہا "یہی لالچ ہے جو قمار بازی کی دیوی لوگوں کو پھسلانے اور گمراہ کرنے کے لئے دیتی ہے جو کچھ تم نے جیت لیا ہے کیا یہ تمہاری تسلی کے لئے کافی نہیں ہے؟"

"نہیں، نہیں! مجھے تو اس کھیل میں بے انتہا لطف آرہا ہے"۔

اپنے کندھوں کو سکوڑتے ہوئے ڈارد اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا اور کھیلنا شروع کر دیا۔ ڈارد جیت پر جیت سنبھال رہا تھا اور شہزادی جو ہمیشہ ڈارد ہی کے رنگ پر بازی لگاتی تھی اس کے ساتھ ساتھ جیت رہی تھی۔ اگر وہ سرخ رنگ پر لگاتا تو شہزادی کا بھی وہی رنگ ہوتا اور اگر وہ سیاہ پر لگاتا تو شہزادی پھر بھی اسی کی پیروی کرتی اور جیتتی۔

جرنیل شہزادی کے طرز عمل کو جلد ہی بھانپ گیا۔ اس کی ذہنی کلفت بڑھتی چلی جارہی تھی۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ آسان فتوحات آخر کار اسے تباہ کرکے چھوڑیں گی۔ اسے معلوم تھا کہ جوئے کا بھوت جب ایک دفعہ سوار ہو جاتا ہے تو پھر اس وقت تک اپنے شکار کو نہیں چھوڑتا جب تک اسے نکبت وافلاس کے گڑھے میں دھکیل نہ دے۔ اس نے شہزادی کو ایک تلخ سبق دینے کا تہیہ کر لیا۔

یکایک اس کی قسمت ایسی پھوٹی کہ وہ ہر بازی پر ہارنے لگا۔ سونے کا جو ڈھیر اس کے آگے لگا ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ غائب ہونا شروع ہوا اور شہزادی اس کے ساتھ ساتھ ہارنے لگی۔ ڈارد کی زندگی میں یہ پہلا واقعہ تھا کہ بدقسمتی نے اتنی دیر تک اس کا ساتھ دیا۔ اس نے کئی مرتبہ معتدبہ رقوم ہاری تھیں لیکن یہ اپنی نوعیت کا ایک نرالا واقعہ تھا۔

ڈارد اور شہزادی اپنی جیتی ہوئی تمام رقم دے بیٹھے۔ اب انہوں نے خالص اپنی پونجی سے کھیلنا شروع کیا لیکن ہر بازی ہارتے ہی چلے گئے۔ جرنیل کا چہرہ جذبات کے اظہار سے کلیتہً معرّا تھا۔ لیکن شہزادی کی آنکھیں تشویش کا اظہار کر رہی تھیں اور سکّوں کو میز پر آگے کی طرف بڑھاتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

وہ کچھ زیادہ امیر بھی نہیں تھی اور اس وقت اپنی مقدرت سے زیادہ ہار چکی تھی۔ وہ ان قمار باز عورتوں کی طرح نہ تھی جو نقدی ہارنے کے بعد اپنا گلوبند یا مرصع انگوٹھی اتار کر میز پر پھینک دیتی ہیں۔ وہ اپنے زیورات بھی فروخت نہ کر سکتی تھی کیونکہ اس کے تمام زیور بزرگوں کی خاندانی نشانیاں تھے جن میں سے کسی ایک کے بھی غائب ہونے سے لوگوں میں عام چرچا ہو جاتا اور ہر طرف سے سوالوں کی بوچھاڑ ہو جاتی۔

لیکن اس کے باوجود وہ جرنیل کی ہر بازی کا تتبع کرتی چلی گئی۔ اسے یقین تھا کہ جرنیل کی قسمت ضرور پلٹے گی۔ ڈارد نے چپکے سے ایک لاکھ لائیور کا نوٹ نکالا اور لگا دیا۔ شہزادی سر سے پاؤں تک کانپ اٹھی کچھ جھجکی لیکن پھر اتنی ہی رقم نکال کر میز پر رکھ دی۔

جرنیل ڈارد نے سرخ رنگ پر بازی لگائی۔ شہزادی نے بھی اپنا نوٹ وہیں رکھ دیا اور سہمی ہوئی آنکھوں سے آگے کی طرف جھک کر دیکھنے لگی ــــــ سیاہ جیت گیا۔

"میں قلاش ہو گئی ہوں۔ میں سب کچھ ہار گئی ہوں" شہزادی نے کہا۔ وہ جانے کے لئے اٹھی لیکن ٹانگوں میں سکت نہ رہی اور دھڑام سے گر کر بے ہوش ہو گئی۔ جرنیل ڈارد نہایت مطمئن انداز میں مسکراتا ہوا اٹھا اور اسے اٹھا کر ساتھ والے کمرے میں چھوڑ آیا۔

اس رات رخصت ہونے سے پہلے جرنیل ڈارد نے ایک چٹھی

شہزادی کے خدمت گاروں کو دی اور انہیں ہدایت کر دی کہ جب
شہزادی کو ہوش آئے تو اُسے دے دی جائے۔ اس چٹھی میں لکھا تھا:
"محترمہ شہزادی! میں ہمیشہ آپ کا بہی خواہ رہا ہوں اور آج رات
میں نے عملی طور پر اپنی دوستی کا حق ادا کیا ہے۔ تین لاکھ لائیور کا ایک
نوٹ ملفوف کر رہا ہوں۔ اسے قبول فرمائیے۔ لیکن جو سبق آج رات
آپ کو دیا گیا ہے اسے عمر بھر یاد رکھئے۔"

اس کے بعد شہزادی کبھی کسی قمار خانے میں نہیں گئی۔ اس
نے اس سبق کو ہمیشہ یاد رکھا۔

ڈارو اس کے بعد یورپ کے مختلف حصوں میں جوا کھیلتا رہا
لیکن آخر کار اس کام سے اُکتا کر فرانس میں اپنی جاگیر پر واپس آ گیا۔
مرنے پر اس نے ایک خطیر رقم چھوڑی جو تمام کی تمام جوئے کے ذریعے
سے حاصل کی ہوئی تھی۔ واقعی وہ "یورپ کا خوش قسمت ترین قمار باز"
تھا۔

ہنری ویسفورڈ۔ مارکوئیس آف ہیسٹنگز برطانیہ عظمیٰ یا شاید دنیا کا
سب سے بڑا قمار باز تھا۔ اس کی زندگی میں شاید ہی کوئی رات ایسی گذری
ہو کہ اس نے جوا نہ کھیلا ہو۔ بعض اوقات وہ بیس ہزار رقوم ہار جاتا اور
کبھی لاکھوں کی رقمیں چند لمحوں میں جیت جاتا۔ لیکن ہار ہو یا جیت وہ دونوں
کو یکساں سکونِ قلب کے ساتھ برداشت کرتا تھا۔

لیکن جوں جوں وقت گذرتا گیا، اس کی بازیوں کی رقم بڑھتی
ہی چلی گئی، یہاں تک کہ بعض اوقات اس کا تمام تر دنیوی اثاثہ ایک
ہی بازی پر لگا ہوا ہوتا تھا۔

ایک رات کا ذکر ہے کہ وہ دن بھر کے مشاغل سے تھکا ماندہ آرام
کی تلاش میں گھر کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں ایک دوست سے ملاقات
ہو گئی جس نے ایک گھنٹے کیلئے اُسے اپنے کلب میں مدعو کیا اور پھر وہاں جاتے
ہی کھیلنا شروع کر دیا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد مارکوئیس نے بازی کی رقم بڑھا دی، اور
پھر اور بڑھا دی۔ یہاں تک کہ ایک ایک پتّے کے اُلٹنے پر سو سو پونڈ کا
فیصلہ ہونے لگا۔

کچھ دیر تک تو قسمت کی دیوی رُخ بدل بدل کے بیٹھتی رہی ——
کبھی ایک کی طرف اور کبھی دوسرے کی طرف —— لیکن یکایک مارکوئیس
کی طرف سے مُنہ پھیر بیٹھی۔ اس نے بتدریج ہارنا شروع کیا۔

گھنٹوں پر گھنٹے گذرتے گئے لیکن دونوں کھلاڑی اٹل سے ہو کے
بیٹھے رہے۔ پو پھٹ رہی تھی لیکن کھڑکیوں کے بھاری پردے رات
کی تاریکی کو سورج کی کرنوں سے چھپائے کھڑے تھے۔ تاش کے پتوں
کی سرسراہٹ اور قلم کی "چرچراہٹ" برابر سنائی دے رہی تھی۔ مارکوئیس
کی دولت آہستہ آہستہ ختم ہو رہی تھی۔

آخر دن خاصا چڑھ آیا۔ مارکوئیس کا دوست اٹھ کھڑا ہوا۔
"میرا خیال ہے کہ آج کی بازی تو میرے ہاتھ رہی لیکن کل تم خوشی
مجھ سے بدلہ لے سکتے ہو۔"

"اس بات کا کچھ خیال نہ کرو"۔ مارکوئیس نے مطمئن انداز میں جواب دیا
"کُل کتنی رقم بنتی ہے؟"

دوسرے نے کاغذ پر لکھی ہوئی رقوم کو جمع کیا اور آہستہ سے بولا "میرے
حساب سے ۹۸۰۰۰ پونڈ بنتے ہیں۔ کیا آپ گنیں گے؟"

"میں؟ ہرگز نہیں"۔ مارکوئیس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا اور
میز پر سے قلم اٹھا کر اپنی نوٹ بک میں رقم درج کر لی۔

ہیسٹنگز گھر جا کر سارا دن سویا رہا۔ لیکن رات کے وقت پھر
کھیل رہا تھا۔ اُس رات اُس نے دس ہزار پونڈ جیتے اور پھر آیندہ چند ہفتوں
میں اُس نے اپنا سارا نقصان پورا کر لیا۔

لیکن زندگی کا یہ طرزِ عمل ہمیشہ چلنے والا نہیں تھا۔ انجام ایک
نہایت عجیب طریقے پر ہوا۔

مارکوئیس گھوڑ دوڑ کا بڑا شائق اور گھوڑوں کی پہچان کا بڑا ماہر تھا۔
۱۸۶۷ء کی ڈربی کی گھوڑ دوڑ میں ایک ایسا گھوڑا شامل ہوا جس کے جیتنے
کا مارکوئیس کو پورا یقین تھا چنانچہ اُس نے اس گھوڑے پر ایک لاکھ بیس
ہزار پونڈ کے قریب بازی لگا دی۔

اسی گھوڑ دوڑ میں ایک اور گھوڑا بھی شامل ہوا جس کا مالک ہنری
چیپلن تھا جو بعد میں وائیکونٹ چیپلن بنا۔ چیپلن اور مارکوئیس کے درمیان
ایک ذاتی معاملے کی بنا پر سخت دشمنی تھی۔ واقعہ یہ تھا کہ جس لڑکی سے
چیپلن کی شادی ہونے والی تھی اُسے مارکوئیس شادی سے چند روز
پہلے ہی بھگا لے گیا تھا۔

ہمیں یہ تو معلوم نہیں کہ آیا ہیسٹنگز کو چیپلن کے گھوڑے کی طرف
سے کچھ خدشہ تھا یا نہیں۔ لیکن اتنی بات یقینی ہے کہ چیپلن کے دل میں

اپنے گھوڑے پر بھروسہ کرنے کی کافی وجوہات تھیں۔ گھوڑے دوڑائے گئے۔ تماشائی جوش سے اُچھلے پڑتے تھے لیکن قسمت نے چیپلن کے حق میں فیصلہ دیا۔ ہیسٹنگز کے ذاتی نقصان کے علاوہ اُس کے اُن دوستوں کو بے انتہا نقصان ہُوا جنھوں نے اس کی قابلیت پر بھروسہ کرکے بڑی بڑی رقوم اُس کے انتخاب کردہ گھوڑے پر لگا رکھی تھیں۔ لیکن ان سب پر مستزاد چیپلن کی حقارت آمیز مسکراہٹ تھی۔

باوجود اس نقصان عظیم کے مارکوئیس کی طبیعت میں ملال کے آثار نمودار نہ ہوئے۔ کچھ عرصے تک وہ اُسی زندہ دلی کے ساتھ اپنے پرانے اڈّوں پر داد عیش و نشاط دیتا ہُوا دکھائی دیتا رہا۔

پھر ایک رات ایک مشہور قمار خانے میں اس نے آٹھ نو ہزار پونڈ کے قریب رقم جیتی۔ شاید اس کا خیال ہو کہ قسمت نے پھر ایک دفعہ پلٹا کھایا ہے۔ رات وہ گھر آکر سو رہا۔ صبح جب اس کا ملازم اسے جگانے کے لئے گیا تو کمرے سے کوئی جواب نہ آیا۔ وہ اندر گیا اس نے اپنے آقا کو جگانے کے لئے ہاتھ بڑھایا لیکن آقا مر چکا تھا!

ہیسٹنگز کی عمر اس وقت صرف ۲۷ سال کی تھی۔ اس کے کوئی اولاد بھی نہیں تھی۔ انگلینڈ میں اپنے درجے کا وہ آخری قمار باز تھا۔ آج تک اس کا کوئی ہمسر پیدا نہیں ہُوا۔

مظفّر احمد

رباعی

[illegible] صبح کو مینا نے سے

[illegible] یہ صدا [illegible] سے کیا اختر زیبا نے سے

جب سے اس غریب نے کیا پایا

اس ہم سے اس کیا ہوا یہاں آ کے

حاصل [illegible]

سعید احمد اعجاز

غزل

برباد نہ عہدِ رنگ و بُو کر

آ خونِ بہار سے وضو کر

بے گانۂ قبلۂ جنوں! اُٹھ

ویرانۂ دل کی سمت رُو کر

مے ریز گھٹائیں صف بصف ہیں

ان سے نہ رمیدگی کی خو کر

پیراہن چاک کر گوارا

بے بس! نہ عبث غمِ رفو کر

جاں سوز ہیں زندگی کی باتیں

خمخانۂ جم کی گفتگو کر

پیرانِ حرم کی چھوڑ محفل

اور بزمِ رعنا کی جستجو کر

جس رنگ میں روح کا زیاں ہو

وہ رنگ نہ اختیار تُو کر

اس دہر میں سرخوشی نہیں ہے

اِس جنسِ گراں کی آبرو کر

قیوم نظر

آرزو

پریم کی بنسی بجاتا، میں ہوا کے دوش پر
میٹھے میٹھے گیت گاتا میں ہوا کے دوش پر
کس مزے میں چہچہاتا میں ہوا کے دوش پر
ایک خوش آواز طائر آہ! میں ہوتا اگر!

میں جہاں جاتا، جدھر جاتا اک آزادی کے ساتھ
ہوتی سبز منظرِ دنیا اک آزادی کے ساتھ
چھیڑتا وہ سرمدی نغمہ اک آزادی کے ساتھ
ایک خوش آواز طائر آہ! میں ہوتا اگر!

اک سکوں لاتا رمِ گنگ و جمن کے واسطے
اک نشاطِ رنگ و بو لاتا چمن کے واسطے
اک پیامِ امن لے آتا وطن کے واسطے
ایک خوش آواز طائر آہ! میں ہوتا اگر!

گدگدا دیتا کبھی قلبِ سکونِ زندگی
ابر کی بدمستیوں میں کروٹیں لیتا کبھی
اور کھو جاتا کبھی رنگینیوں میں قوس کی
ایک خوش آواز طائر آہ! میں ہوتا اگر!

آسماں کی رفعتوں کی میں خبر لاتا کبھی
بحر و بر کی وسعتوں کی میں خبر لاتا کبھی
کیسے کیسے منظروں کی میں خبر لاتا کبھی!
ایک خوش آواز طائر آہ! میں ہوتا اگر!

سب سے پہلے چاک کرتا رات کا دھندلا نقاب
سب سے پہلے دیکھتا مشرق کی دلہن کا شباب
سب سے پہلے لوٹتا مغرب کے منظر کی شراب
ایک خوش آواز طائر آہ! میں ہوتا اگر!

ایک دُھن میں پار کرتا بحرِ ناپیدا کنار
ڈھونڈھ کر لاتا کہیں سے رنگ و بوئے پائیدار
اور چمن کو لا کے دیتا ایک لافانی بہار
ایک خوش آواز طائر آہ! میں ہوتا اگر!

آم کی شاخوں پہ میرا آشیاں ہوتا کبھی
چاندنی کے مست سایہ میں مکاں ہوتا کبھی
اور اڑ کر ماورائے آسماں ہوتا کبھی
ایک خوش آواز طائر آہ! میں ہوتا اگر!

بوئے گل لاتی مری بہکی ہوئی آنکھوں میں خواب
کالے کالے ابر دیتے مجھ کو تسکینِ شباب
ذوقِ نغمہ چھیڑ دیتا میری ہستی کا رباب
ایک خوش آواز طائر آہ! میں ہوتا اگر!

صبح کی رنگینیاں دیتیں پیامِ بے خودی
شام کی تاریکیاں لاتیں سکونِ زندگی
عمر بھر میں ہوتا اور فطرت کی یہ زندہ دلی
ایک خوش آواز طائر آہ! میں ہوتا اگر!

شارق میرٹھی

انگلستان کا ملک الشعراء

جان میسفیلڈ

مشرق کے حکومت پرست انسانوں نے کلام الملوک کو ملک الکلام بنا دیا لیکن جمہوریت پسند مغرب کے حالات اور خیالات نے جہاں مشرق کی اور باتوں پر اثر اندازی کی وہاں اپنی عام زندگی سے اس خیال کی تکذیب کے بھی دلائل مہیا کر دیئے۔ اس سلسلے میں مشرق اور مغرب میں ایک نمایاں اختلاف تو یہی نظر آتا ہے کہ مغرب کے بادشاہوں نے عموماً ایسا کلام ہی نہیں کہا کہ جسے قابل توجہ سمجھا جا سکے۔ اس کا نتیجہ ان بادشاہوں کے حق میں اچھا نکلا یعنی اُن کی بادشاہت قایم رہی اور اگر کسی صورت میں قائم نہ بھی رہی تو کلام کی ملوکیت اس کا باعث نہ ہوئی۔ مشرق میں صورتِ حال مشرقی ہی رہی یعنی اکثر جب کسی بادشاہ نے "کلام" میں ہمہ تن دلچسپی لی، تو نہ بادشاہت رہی نہ بادشاہ، فقط کلام باقی رہ گیا اور بعض حالتوں میں تو کلام کا نام و نشان بھی آثارِ قدیمہ کے لئے ہی باعثِ رونق ہو سکا۔

جس طرح ایشیا میں تہذیب و تمدن اور ان کے لوازمات کے سب سے بڑے ماخذ چین اور ہندوستان ہیں۔ اسی طرح مغرب میں بالزیادہ تخصیص کرتے ہوئے کہیں گے کہ یورپ میں یہی حیثیت اور درجہ یونان اور روم کو حاصل ہے۔ وہاں کے بیشتر قدیم علوم و فنون کی ابتدا اور نشو و نما انہی چھوٹے چھوٹے ملکوں سے ہوئی یہ بات نہ صرف بڑے بڑے معاملات میں صحیح ہے بلکہ معمولی رسموں کا ماخذ بھی اکثر یہی ممالک ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر ملک الشعراء کا معاملہ ہی لیجئے۔ انگریزی زبان میں ملک الشعراء کو "لاری ایٹ" کہتے ہیں۔ یہ لفظ لاطینی کے لفظ "لاری ایٹس" سے نکلا ہے۔ "لاری ایٹس" کا ماخذ "لارل" کا پیڑ ہے۔ یونان میں اس پیڑ کو اپالو دیوتا سے ایک مقدس نسبت تھی اور اسی لئے اس پیڑ کے پھول پتوں کا ایک تاج یا چکّر شعرا اور غازی جانبازوں کے سروں پر اعزاز کے لئے رکھا جاتا تھا اور یہ رسم قدیم یونان میں بہت عام تھی۔ چنانچہ اسی رسم کی بنا پر ہی انگریزی زبان میں اس لفظ سے امتیاز اور شہرت کا تعلق پیدا ہو گیا۔ خواہ وہ شہرت ادبی حلقے میں ہو یا فوجی حلقے میں۔ چنانچہ کسی جنگ کے اختتام پر وہ مراسلے جن میں فتح کی خبر روانہ کی جاتی تھی "لاری ایٹ لیٹرز" یعنی "فتح کے خطوط" کہے جاتے تھے۔ بلکہ یونی ورسٹیوں کی طرف سے سرکاری طور پر بھی "لاری ایٹ" کا اعزاز مشہور شعرا کو دیا جاتا تھا۔ اس کی مثال کے طور پر جان سکیلٹن کا نام پیش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن رفتہ رفتہ "لاری ایٹ شاعر" کی اصطلاح کا استعمال ایک تخصیص اختیار کر گیا۔ اور یوں ایک ایسا عہدہ بن گیا جس کا تعلق شاہی خاندان سے تھا۔ لیکن یہ رواج صرف انگلستان ہی میں پیدا ہوا اور اس عہدے پر سب سے پہلے انگریزی کے مشہور شاعر بین جانسن کو متعین کیا گیا۔ اس عہدے کو اس کی لازمی خصوصیات کے ساتھ چارلس اول نے ۱۶۳۰ء میں بین جانسن کے لئے تخلیق کیا۔ اگرچہ آغاز میں بین جانسن کو باقاعدگی کے ساتھ "لاری ایٹ شاعر" یا ملک الشعراء نہیں بنایا گیا تھا لیکن اُس کا درجہ بحیثیت ملک الشعراء ہی کی تھی۔ یہ عہدہ حقیقتاً اس پرانے رواج کی ترقی یافتہ صورت تھی کہ قدیم زمانے میں بادشاہوں کے راج درباروں میں درباری شاعر یا بھاٹ وغیرہ بھی ایک لازمہ ہوتے تھے۔ مثلاً تاریخی دستاویزوں سے پتہ چلتا ہے کہ رچرڈ شیر دل کے درباری عملے میں ایک شاہی نظم نگار (شاعر) بھی ہوا کرتا تھا۔ اسی طرح ہنری سوم کا بھی ایک درباری نظم نگار متعین تھا۔ اور پندرھویں صدی عیسوی میں ایڈورڈ چہارم کا ایک نظم نگار "جان کے" نامی تھا۔ ہندوستان میں ان نظم نگاروں کا تطابق پرتھوی راج چوہان کے درباری شاعر چند بردائی سے کیا جا سکتا ہے اور چین میں بھی لی پو اور دوسرے مشہور شعراء درباری شاعر ہی تھے۔ انگلستان میں اس درباری شاعر کے عہدے کے علاوہ بھی شعراء پر حکومت کی طرف سے

نگاہِ کرم کی فراوانی تھی۔ مثلاً ایڈورڈ سوم نے چاسر کو نام پنشن کے علاوہ شراب کی ایک مقررہ مقدار کا وظیفہ جاری کر رکھا تھا۔ ملکۂ الزبتھ کی طرف سے سپنسر کو پنشن ملتی تھی۔ لیکن یہ سب ملک الشعراء ایک طرح سے گویا عطائی ملک الشعرا ہی تھے۔ بین جانسن پہلا باقاعدہ عہدے دار ملک الشعراء تھا اس کے بعد ۱۶۳۷ء میں سر ولیم ڈیونانٹ نے اس کی جگہ لی ۱۶۷۰ء میں ڈرائیڈن کو ملک الشعرا بنایا گیا۔ یہ سر ولیم کی موت کے دو سال بعد کا ذکر ہے۔ ڈرائیڈن کو ملک الشعرا خطاب کے علاوہ تین سو پاؤنڈ کی پنشن اور شراب کی ایک مقررہ مقدار بھی دی گئی۔ ڈرائیڈن کے وقت سے ملک الشعرا کے عہدے میں ایک باقاعدگی آ گئی۔ ڈرائیڈن کے بعد جو شعراء اس عہدے کے مستحق قرار دیئے گئے ان میں سے اردو خواں طبقے کے لئے مانوس نام سودے، ورڈز ورتھ اور ٹینی سن کے ہیں۔ سودے کی نظم آب لوڈور کا آزاد ترجمہ اکبر الہ آبادی نے کیا ہے۔ ورڈز ورتھ کی بہت سی نظموں کے ترجمے بھی اردو میں مختلف شاعروں نے کئے ہیں اور ٹینی سن کی مشہور نظم "بہتی ہوئی ندی" کا ترجمہ مولانا ظفر علی خاں کے قلم سے ایک معیاری چیز ہے۔

سودے ورڈز ورتھ اور ٹینی سن کے ذاتی امتیازات نے ملک الشعرا کے عہدے میں ایک دلچسپی اور رنگینی پیدا کر دی۔ کیونکہ سودے سے پہلے اس عہدے کو کچھ غیر مستحسن نگاہوں سے دیکھا جانے لگا تھا۔ ٹینی سن کی موت پر یہ عام خیال پیدا ہو گیا کہ اس کے بعد کوئی ایسا شاعر موجود نہیں جسے اُس کا جانشین سمجھا جا سکے۔ ولیم مورس اور سون برن کو سرکار دربار سے دور کی نسبت بھی نہ ہو سکتی تھی اور وہ اچھے اور مشہور شاعر ہونے کے باوجود ملک الشعرا نہ بنائے جا سکتے تھے لیکن ان عارضی وجوہات کی بنا پر اس رواج کو توڑنا اچھا نہ معلوم ہوتا تھا کیونکہ یہی ایک تعلق ادب اور حکومت میں سرکاری طور پر تھا۔ اس لئے ٹینی سن کے چار سال بعد الفریڈ آسٹن کو ملک الشعرا مقرر کر دیا گیا۔ اس کے بعد رابرٹ برجز اور پھر جان میسفیلڈ۔

جب ۱۹۳۰ء میں رابرٹ برجز کا انتقال ہوا تو کوئی ایسا شاعر موجود نہ تھا۔ جسے کسی نہ کسی طبقے کے اعتراضات کے بغیر اس کی جگہ مقرر کر دیا جاتا۔ کم سے کم چھ ایسے شاعر اس وقت موجود تھے۔ جن کا شاعرانہ رتبہ اور جن کی قابلیت اس عہدے کی دعوے دار ہو سکتی تھی اور اس لئے مسٹر ریمزے میکڈانلڈ کو جو اس وقت وزیر اعظم تھے ایک مشکل کا سامنا تھا۔

لیکن جب وزیر اعظم نے جان میسفیلڈ کو منتخب کیا تو اس انتخاب کو عموماً نظر استحسان سے دیکھا گیا۔ یہ بات بہت مناسب تھی کہ مزدور حکومت ایک ایسے شاعر ہی کو ملک الشعرا بناتی جو شاعر ہونے کے لحاظ سے جمہور سے ایک خاص نسبت رکھتا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس انتخاب پر کوئی اعتراض ہی نہیں ہوا۔

جس طرح ڈاکٹر رابرٹ برجز کے انتخاب پر خواص مطمئن تھے۔ لیکن عوام کو تجسس تھا کہ یہ نیا ملک الشعرا ہے کون! اسی طرح جان میسفیلڈ کے تعین پر خواص یا یوں کہئے کہ نام نہاد خواص کا یہ استفسار تھا کہ جان میسفیلڈ کون ہے! اس استفسار کی وجہ میں ایک خاص نکتہ پنہاں تھا۔ معترض نقاد اس بات کو نظر انداز کر گئے تھے کہ شاعری کے محل میں کئی ایوان ہیں لیکن آسانی کے لئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایوان دو ہیں۔ ایک ایوان کے شاعر بنفسہٖ حسن محض کو تلاش کرتے ہیں اور دوسرے ایوان کی رونق بڑھانے والے روزمرہ کی عام زندگی میں حسن کی جستجو کرتے ہیں۔ پہلے ایوان کے حامی یہ کہتے ہیں کہ وہی باتیں شعرا کا موضوعِ سخن ہو سکتی ہیں جن میں اندرونی طور پر کلیتہً حسن موجود ہو۔ دوسرے ایوان والے کہتے ہیں کہ ذرا ذرا سی معمولی باتوں میں بھی حُسن موجود ہو سکتا ہے۔ ان دونوں نظریوں کے متعلق قطعی فیصلہ نہ آج تک دیا جا سکا ہے نہ دیا جا سکے گا۔ یہ تنازعہ ابدی ہی رہے گا۔ لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ دونوں قسموں کی شاعری کی ضرورت ہے۔ اور اگرچہ کسی شاعر کے کلام کی نسبت لوگوں کے طبعی رجحان کی آئینہ دار ہوتی ہے لیکن اگر کوئی شخص غالب، سودا اور اقبال کے ساتھ ہی ساتھ داغ، جرأت اور حالی کے کلام کو بھی سراہ سکتا ہو تو اس سے ستائش کرنے والے کی تعریف کا پہلو ہی نکلتا ہے۔

شاعری کے ان دونوں ایوانوں میں سے ہر ایک کی اپنی علٰحدہ شان ہے۔ حسن پرست شعرا کا کمال ہمارے لئے تکمیلِ فن کی ایک بلندی مہیا کر سکتا ہے لیکن اگر وہ راستے سے ذرا بھی بھٹک جائے تو اُس کا کمالِ فن محض تکلف ہو کر رہ جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی حسنِ محض کی پرستش سے موضوع کی گرفت کا دائرہ محدود ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود حسن محض کی پرستش سے زندگی کے رس میں ایک گہرائی ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ صرف ایک خطرہ لاحق ہوتا ہے، کہ حسن محض کا نظریہ تصور اور تخیل کو انسان کی دوسری قابلیتوں سے یکسر علٰحدہ کر دیتا ہے اور یہ پرستش انسان کی گہری ذہنی حرکات اور مقاصد سے دُور ہو جاتی ہے لیکن حقیقت

پرست شعرا اُن جگہوں پر بھی حسن کی تلاش کر لیتے ہیں جہاں کسی کو حسن کی موجودگی کا گمان بھی نہیں ہو سکتا۔ اس طبقے کو صرف باغوں ہی میں پھول دستیاب نہیں ہوتے بلکہ یہ بنجر ریگستان میں بھی پھولوں کی بہار پیدا کر لیتا ہے۔ اس طبقے کے لئے سخت مقام وہ ہے جب تصور کی باگ ذرا سی بھی ڈھیلی ہو جائے اور تخئیل اور شاعری کی جگہ محض صنعت و حرفت لے لے۔

جمالیاتی حلقے کے تنگ خیال حضرات کی نظروں میں جان میسفیلڈ ایسے حقیقت پرست شاعر کو ملک الشعرا مقرر کر دینا مناسب نہ تھا۔ کیونکہ میسفیلڈ نہ صرف ایک حقیقت پرست شاعر ہے بلکہ اس نے بیسویں صدی میں شاعری میں حقیقت پرستی کی طرف سب سے بڑھ کر زوردار اور بے باک قدم اٹھایا ہے۔ اس کے ساتھ ہی حقیقت پرستی کے حامیوں میں بھی میسفیلڈ کے متعلق اختلافات ہیں۔ وہ سوچتے ہیں کہ کیا یہ حقیقت پرستی کا ایک سچا پیغمبر ہے جو شاعری کو ایک نئی سرسبز و شاداب سرزمین کی طرف لے جانے کو کہہ رہا ہے یا ایک جھوٹا رہنما ہے۔ جو شعریت کی تباہی کے درپے ہے؟ کیا اس کی شاعری سے اس کا ثبوت ملتا ہے کہ ہاتفِ غیبی بالا خانوں اور مے کدوں میں جا کر بھی وہاں سے ہوشمند اور پاک و صاف لوٹ سکتا ہے؟

لیکن ظاہر ہے کہ صرف رسم و رواج کے بندھنوں کو توڑنے کا نام ہی ترقی نہیں ہے۔ ترقی کی طرف آج تک جو قدم بھی اٹھایا گیا ہے۔ یا آیندہ اٹھایا جائے گا اُس کا مطلب صرف یہی نہیں کہ پرانے قاعدوں کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے۔ نئے تجربات کرنے کے لئے ہر شاعر کو جان میسفیلڈ کی طرح تجدید کے ساتھ ہی ساتھ رسموں کا پابند بھی رہنا ہی پڑے گا۔ مستقبل کا پھول ماضی کی زمین ہی میں پیدا ہو سکتا ہے، ورنہ بہت جلد ارتقا کا پودا مرجھا کر رہ جائے گا۔

میسفیلڈ نے اپنے آپ کو کبھی باغی یا جدید شاعر نہیں کہا ہے بلکہ اُس نے اپنے آپ پر کبھی کوئی لیبل لگایا ہی نہیں۔ وہ اپنی ادبی تخلیق میں اس قدر ہمہ تن مصروف رہا ہے کہ اس نے کبھی سنجیدگی کے ساتھ اپنی ہستی یا شخصیت کو اپنے کام سے علیحدہ طور پر دیکھا ہی نہیں۔ بے ساختگی، سادگی، اخلاص —— یہی باتیں اُس کے فن کے اصلی اجزا ہیں۔ اُس میں احساسِ نفسی اور انتقادِ نفسی کی بے حد کمی ہے۔

جو لوگ رسموں کے بہت زیادہ پابند ہیں اُن کی نظروں میں وہ اتنا جدید ہے کہ اس کا کلام شاعرانہ بغاوت سمجھا جاتا ہے، اور وہ لوگ جو نئی باتوں کو محض نئی باتوں کے لئے کرتے ہیں ان کی نظروں میں وہ رسموں کے بندھن میں گرفتار ہے۔

ادبی لحاظ سے کسی شخص کے تنقیدی مطالعے کے کئی طریقے ہو سکتے ہیں مثلاً ایک یہ کہ اس کے تمام ادبی کارناموں کا تخلیقی وقت اور موقعے کے لحاظ سے جائزہ لے لیا جائے لیکن انگلستان کے ملک الشعرا یعنی جان میسفیلڈ ایسے پُرگو اور وسیع اظہار و بیان کے مالک انسان کا تنقیدی مطالعہ اس مختصر سے مضمون میں ممکن نہیں ہے۔ کیونکہ وہ نہ صرف ایک شاعر ہے بلکہ اپنی زندگی کے مختلف وقفوں میں ایک شاعر ہونے کے علاوہ ناول نویس ڈرامہ نگار، صحیفہ نگار، مورخ، لیکچرار، خطیب، ایڈیٹر اور نقاد بھی رہ چکا ہے۔ اور اگرچہ جس کام کو بھی اُس نے چھیڑا اُس میں ناکامیوں اور خامیوں کے باوجود ایک زورِ طبع اور حُسنِ طبیعت دکھایا لیکن ہمیں اپنے موضوع کے لحاظ سے اس کے صرف ایک ہی پہلو سے زیادہ تعلق ہے یعنی اس کی شاعری۔

میسفیلڈ کی زندگی کی داستان بھی عجیب ہے۔ لیکن اس داستان سے پہلے اس کے ہیرو کا تصور ذہن میں جما لینا بہتر ہو گا۔ میسفیلڈ کے متعلق ایک مصنف لکھتا ہے کہ "اس میں ایک زبردست اور گہری دلآویزی ہے اور یہ دلکشی اور دلآویزی پہلی نظر میں ہی یہ سُجھا دیتی ہے کہ یہ شخص عام لوگوں سے مختلف ہے۔ لمبا سیدھا قد۔ نیلی آنکھیں، صاف ستھرا رنگ روپ، اُس کی آنکھیں حیرت ناک طور پر شرمیلی ہیں۔ اس کا طور طریقہ بھی جھجکتا ہوا اور شرمیلا سا ہے دیکھنے والے کو اس کی حساس طبیعت کا احساس یک دم ہو جاتا ہے اور اس حساس طبیعت کی وجہ سے اس میں ایک ایسا وقار نمایاں ہے جو اُس کی شرمیلی طبیعت کا محافظ بھی ہے۔ میسفیلڈ کے متعلق بہت سی حکایتیں اور روایتیں مشہور ہیں اور اس کی شخصیت ہی کچھ اس قسم کی ہے کہ جس کے متعلق حکایتوں اور افسانوں کا پیدا ہونا ایک قدرتی بات ہے۔"

میسفیلڈ کی ابتدائی زندگی بہت رنگا رنگ حالتوں میں گذری۔ اس زندگی میں محنت مشقت کا سامنا بھی تھا اور ایسی مشکلات اور خطرات بھی تھے۔ جن سے منچلی سے منچلی طبیعت کی بھی تسکین ہو سکتی ہے۔ اس زندگی کی تفصیلات کے متعلق لوگوں کے اندازے ہی اندازے ہیں اور اگرچہ میسفیلڈ نے اس زمانے کے تجربات اور خام مواد کو اپنے کلام اور اپنی دوسری ادبی تخلیقات میں استعمال کیا ہے، مگر اس نے ان افسانوں کو جو

اُس کے متعلق پیدا ہوگئے ہیں نہ جھٹلایا ہے نہ ان کی تائید کی ہے۔ اس لئے متجسس لوگوں کو انگلستان کے ملک الشعراء کے بارے میں بے حد مختصر حالات وواقعات پر ہی قناعت کرنا ہوگی۔

جان میسفیلڈ یکم جون ۱۸۷۸ء کے روز ہیرفورڈشائر میں پیدا ہوا۔ لیڈبیری کا قصبہ جہاں میسفیلڈ کی پیدائش ہوئی انگلستان کے قدیم باقاعدہ اور صاف ستھرے قصبوں کی ایک بہت اچھی مثال ہے۔ اس قصبے اور اس کے ساتھ کی کھلی فضاؤں کی بہت سی مثالیں میسفیلڈ کی نثر کے علاوہ اس کی لمبی نظموں میں بھی ملتی ہیں لیکن یہاں اس کی ایک مختصر نظم درج کی جاتی ہے۔

شام

جنگل میں ہر سو چھائی خموشی،
پیڑوں کی ساری سرسبز شاخیں
نورِ شفق میں دھندلی ہوئی ہیں!
خاموش خاموش اور چپکی چپکی!

کچھ دور دیکھو سیبوں کی باڑی،
اور راستے میں تھک کر گوالا
گایوں کو گھر کے رستے پہ لاتا!

روشن ستارا آنکھیں جھپکتا،
اور چاند پیلا، رُکتا، جھجکتا!
لیکن ابھی ہے منظر پہ طاری
پچھم کے رُخ پر سرخی ہی ساری!
کالا دھواں بھی چھایا ہوا ہے
شعلوں کا جھرمٹ لہرا رہا ہے!
اور پربتوں کی ہر ایک چوٹی
سر پہ لئے ہے تاج اک سنہری،
اور رفتہ رفتہ یہ سارا منظر،
کالا دھندلکا بنتا ہے یکسر!

شعلوں کا جھرمٹ اب مٹ گیا ہے،
ہر سو دھواں ہی پھیلا ہوا ہے!
اور پیڑ سارے دھندلے سپاہی،
منظر ہے گویا سایوں کی بستی!

اس کے علاوہ قصباتی زندگی کے اثرات میسفیلڈ کے کلام میں اُس نفرت اور ناپسندیدگی سے بھی ظاہر ہوتے ہیں جس کا اظہار وہ شہروں کے متعلق عموماً کرتا رہتا ہے، اور دیہاتی ماحول سے اس کی اس دلبستگی اور اس سے وفاداری پر اس کے بچپن کی مشکلات اور دکھ سے خالی زمانے نے بھی کسی قسم کا بُرا اثر نہیں کیا۔ میسفیلڈ کو بچپن ہی سے اس حقیقت کا احساس ہوگیا کہ اس دنیا میں حسن بھی ہے اور حسن کو زائل کرنے والی باتیں بھی۔ اس نوجوانی کے زمانے میں وہ کون سی ایسی بات ہوئی جس نے شاعر کے دل کو دُکھ دیا، اس کے متعلق میسفیلڈ خاموش ہے اور ہمارا بھی خاموش رہنا ہی مستحسن ہے۔ صرف اس قدر کہنا کافی ہوگا کہ تیرہ سال کی عمر میں اُس نے "کونوے" جہاز پر کام شروع کر دیا اور اس کے بعد کچھ عرصے تک بحری زندگی بسر کرتا رہا۔ اس کی سمندری زندگی کے متعلق مختلف روایات ہیں بعض کہتے ہیں کہ اُس نے امریکہ کی طرف صرف ایک سفر کیا بعض کو اس سے اختلاف ہے ہمیں اس سے غرض نہیں کہ اس نے ایک سفر کیا یا ایک سے زیادہ۔ اس کی تصنیفات سے ظاہر ہے کہ بادبانی جہازوں کے ڈھلتے ہوئے دنوں میں اُس نے سمندری زندگی کے تمام نشیب و فراز دیکھ لئے اور اُسے جہاز کے سب کاموں کا پورا پورا علم ہوگیا۔

اس کے بعد وہ کئی سالوں تک شمالی اور جنوبی امریکہ اور انگلستان میں اِدھر اُدھر گھومتا رہا اور اس دوران میں اُس نے بسر اوقات کے لئے قصبات اور دیہات میں بے حد مختلف کام کئے۔ یہ باتیں بھی اُس کی کتابوں ہی سے معلوم ہوتی ہیں اس لئے انہیں بھی کسی طرح کی تفصیل کے ساتھ بیان نہیں کیا جاسکتا۔ میسفیلڈ کی شاعری کے متعلق ایک روایت بہت مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ جب وہ ریاستہائے متحدہ امریکہ کی ایک غالیچے بنانے والی فیکٹری میں ملازم تھا تو ایک بار اُس نے چاسر کے مجموعۂ کلام کا ایک سستا سا نسخہ خریدا اسے پڑھ کر اُس کی طبیعت کے شاعرانہ پہلو کو تحریک ہوئی۔

ایک اور روایت بتاتی ہے کہ کچھ عرصہ کھیتوں میں چھوٹے موٹے کام کرنے کے بعد وہ نیویارک کے ایک ہوٹل میں جا ملازم ہوا۔ یہاں

دن کی مشقت کے بعد رات کو اپنے معمولی سے تنگ و تاریک کمرے
میں شہری زندگی کے شور و شغب اور ہماہمی کے بار سے رہائی اور
تسکین حاصل کرنے کے لئے اُسے مطالعے کی عادت ہوگئی۔ میسفیلڈ
کی جوانی کے زمانے کے متعلق ایک بیان سر ولیم روتھین سٹائن نے
بھی لکھا ہے کہ کس طرح

"رات کے کھانے کے بعد میسفیلڈ فرش پر بیٹھ جاتا اور ہم
سب اُس کے آس پاس ہو لیتے اور وہ ہمیں اپنی سمندری زندگی
کی داستانیں سناتا کہ کس طرح ایک بار اُسے اور اُس کے جہاز کے
چند ساتھیوں کو جنوبی امریکہ میں بڑی مشکلات درپیش آئیں۔ روپیہ پیسہ
سب ختم ہوگیا اور اُن میں سے کسی کے پاس ایک پائی بھی نہ رہی اور قریب
قریب فاقہ کشی تک نوبت پہنچی۔ اسی طرح ایک بار انہیں ایک زبردست
سمندری طوفان کا سامنا کرنا پڑا۔ متواتر محنت مشقت اور جانفشانی سے
تنگ آکر انہوں نے اپنی ٹوپیوں کے ساتھ چاقو باندھ لئے تاکہ لوہے
کے پھلوں کی وجہ سے اُن پر بجلی گر پڑے اور وہ مر جائیں اور اس مشکل
سے رہائی حاصل کرلیں۔"

اس قسم کے ذاتی واقعات کی بہت سی جھلکیں میسفیلڈ کے ناولوں
میں پائی جاتی ہیں۔ ان ناولوں سے تجزیہ کرنا کہ کس جگہ افسانہ طرازی ہے
اور کس جگہ حقیقت ایک مشکل اور بیش از دقت کام ہے۔ البتہ ہم ایک
بات یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ان جہاں گردی کے سالوں میں میسفیلڈ
نے زندگی کی حقیقتوں کو بالکل عریاں صورت میں دیکھ لیا۔ تجربات کے
ساغر کی تلچھٹ کو بھی نہ چھوڑا۔ کچھ نقادوں کا خیال ہے کہ میسفیلڈ ایک
بے حد حساس انسان ہے اس لئے اس نے زندگی کی پست اور عریاں
حقیقتوں کو بیان کرنے میں دراز بادتی اور تکلف سے کام لیا ہے اور
اس تکلف اور زیادتی سے اس کی آگاہی کی کمی کا اظہار ہوتا ہے لیکن
حساس ہونے کے باوجود اگر میسفیلڈ حقیقت پرستی میں کسی طور پر
ناکام رہا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اُسے ناپسندیدہ اور مردود
چیزوں سے پوری آگاہی نہیں ہے۔

۱۹۰۲ء سے جان میسفیلڈ کی زندگی کے واقعات کا دھندلکا
دُور ہوتا ہے۔ اس سال اُس نے برطانوی مصوری کی ایک نمائش کی تنظیم
کی۔ اگلے سال ایک اور نمائش میں حصہ لیا۔ اس زمانے میں ہی میسفیلڈ
نے فیصلہ کیا کہ وہ مصنف کا پیشہ اختیار کرے گا۔ ساتھ ہی ساتھ اس نے مختلف
رسائل میں مضامین لکھنے بھی شروع کر دیئے تھے۔ ان مضامین کی نوعیت
مختلف تھی۔ جس چیز کی جہاں اور جب ضرورت ہوئی تیار ہوگئی۔

تو دس سال کی صحیفہ نگاری کے بعد ۱۹۱۱ء میں جان میسفیلڈ کی
مشہور نظم "رحمتِ بے پایاں" انگریزی کے مشہور مجلے انگلش ریویو میں شائع
ہوئی۔ اور اس نے تمام ادبی حلقوں کو مبہوت کر دیا۔ اس نظم ہی سے میسفیلڈ
کی شہرت کی بنیاد پختہ ہوگئی۔ اس نظم سے شاعر کی تشہیر بھی ہوئی لیکن
یہ تشہیر کامیابی کا ایک ذیلی حصہ تھی۔ جو لوگ یہ سمجھتے رہے کہ شاعر بدنامی
اور ناموری کو ایک ہی چیز سمجھتا ہے وہ غلطی پر تھے۔

میسفیلڈ کے بقیہ سالوں کا افسانہ لے دے کر اس کی تصنیفات
کا افسانہ ہی ہے۔ رفتہ رفتہ میسفیلڈ کو جو قبولیت حاصل ہوئی اس کا
اندازہ اس حقیقت سے کیا جا سکتا ہے کہ ۱۹۲۳ء میں اس کا جو مجموعۂ
نظم "کلیات شعری" شائع ہوا اُس کے نوے ہزار نسخے صرف برطانیہ میں
فروخت ہوئے۔ لیکن اس قسم کے "قبول خاطر" سے اُس کے "حسن سخن"
میں کوئی فرق نہ پیدا ہو سکا۔ جہاں اُس نے چند ناول لکھ کر کامیابیاں
حاصل کیں وہیں وہ پبلک کے مذاق کا خیال نہ کرتے ہوئے اپنے ذاتی
تھیٹر کے لئے منظوم ڈرامے بھی لکھتا رہا۔ میسفیلڈ لوگوں کو انفرادی طور
پر دل سے پسند کرتا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی اُسے ہجوم کی اجتماعی
بھیڑ چال بھی بہت ناپسند ہے۔ اس نے جب کبھی جو کچھ بھی لکھا ایک
گہری، اندرونی تحریک کے اثر سے لکھا اور کبھی بھی کامیابی کے سستے
ذرائع اختیار کر کے اپنے کو نیچا ثابت نہیں کیا۔

۱۹۱۶ء میں میسفیلڈ نے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا سفر کیا اور
مختلف مقامات پر اتحادیوں کی حمایت میں لکچر دیئے۔ لیکن تحریری مواد کے
لحاظ سے یہ لکچر کچھ خاص اہمیت نہیں رکھتے لیکن ان سے میسفیلڈ کی فطرت
کے ایک پہلو پر ضرور روشنی پڑتی ہے۔ ان لکچروں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جہاں
شاعر کی فطرت کا مردانہ اور مائل عمل پہلو جنگ کی جانبازیوں میں ایک مسرت
محسوس کرتا تھا، وہاں اُس کا حساس تخئیل پرست پہلو جنگ کی حماقت اور
اس کے نقصانات سے گہری نفرت بھی کرتا تھا اور جنگ کی المناک حاجت
کے پرچار کے باوجود اُس کے لکچر جرمنوں کی دشمنی کی تلخی کے خیالات و جذبات
سے یکسر خالی نظر آتے ہیں۔ اس لحاظ سے ان تقریروں سے میسفیلڈ کے
نظریۂ حب الوطنی کی بلندی اور وسعت کا اظہار ہوتا ہے۔

بعض لوگوں کی طبیعت میں ایک غرور ہوتا ہے، ایک جھوٹی خودداری

ایک شرم کا احساس، جو انہیں اپنے ماضی کے متعلق خاموش رہنے پر اُکساتا ہے۔ وہ اپنی غربت اور تنگ دستی کے زمانے کی باتیں دوسروں کو سنانے میں اپنی ہیٹی سمجھتے ہیں لیکن میسفیلڈ میں ایسی کوئی جھوٹی خودداری نہیں ہے وہ اپنی ادبی تخلیقات میں اپنے گذشتہ تکلیف، محنت مشقت اور رنج کے زمانے کے واقعات کو کبھی چھپانے کی کوشش نہیں کرتا۔ اگر وہ انہیں کبھی پوری طرح ظاہر نہیں بھی کرتا تو اس کی وجہ یہ ہوتی ہے۔ کہ وہ یاد اس کے لئے بہت دردناک ہوتی ہے اور فنی تخلیق کی مسرت اُس درد کو کم نہیں کرسکتی۔ اس خاموشی کی وجہ اس کا انکسار بھی ہے اور اس کا یہ اعتقاد بھی کہ کسی شخص کی زندگی کے حالات اسی لحاظ سے کسی قسم کی اہمیت رکھ سکتے ہیں کہ وہ اُس کے اصلی روحانی پہلو پر اثر انداز ہوں یا کسی طرح کی روشنی ڈالیں اور اس انکسار اور اس اعتقاد میں کسی طرح کا تکلف نہیں ہے اور یہ باتیں میسفیلڈ کی نطرت کا بنیادی مواد ہیں۔

میسفیلڈ اپنے دائرۂ نظر کی وسعت اور انداز بیان کے لحاظ سے ایک جدید شاعر ہے لیکن روحانی طور پر اُس کا فن شاعری کی قدیم روایات سے وابستہ ہے۔ اُس کے کلام میں چاسر اور شیکسپیئر کے ساتھ براؤننگ کا اثر بھی نمایاں ہے۔ اس کا یہ اعتقاد ایک لذیذ جذبے کی گہرائی اور شدت لئے ہوئے ہے کہ روحانی قدر و قیمت کلام کا لازمہ ہے اور محض فنی کامیابی کی کوئی حقیقت نہیں۔ شیکسپیئر کے متعلق ایک تنقیدی مطالعہ لکھتے ہوئے اُس نے آرٹ کے متعلق اپنے اس اعتقاد کی وضاحت کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ آرٹ یا فن سرحد ادراک سے پرے دیکھنے والے لوگوں کے خیالات ہی کا دوسرا نام ہے۔ اسی لئے وہ سمجھتا ہے کہ کسی شخص کی زندگی میں قابل قدر چیز اس کے سوانحاتی واقعات نہیں ہوتے بلکہ اس کی روحانی اُمنگوں کا عکس ہی اعتنا کے قابل ہوتا ہے اور بیرونی واقعات اور حالات اسی حد تک اہمیت رکھتے ہیں کہ وہ اس کی روح کو احساس حُسن میں کہاں تک مدد دے رہے ہیں یا وہ اس احساس حسن کے اظہار میں کس حد تک معاون ہیں۔ دکھائی دینے والی اشیا کے پیچھے ہی نہ دکھائی دینے والی باتیں ہیں اور روح کو اس کی بقا اور قرار کے لئے انہی لمحوں میں مواد ملتا ہے جب درمیانی پردہ دور ہو کر نظر میں ایک گہرائی پیدا ہو۔

کیا ایسے روشن لمحے میسفیلڈ کی زندگی میں بھی آئے ؟ — اس کا جواب حاصل کرنے کے لئے ہمارے پاس اس کی نظم "سوانح عمری" ہے۔ یہ نظم شاعر کے ذاتی اظہار نفس کے لحاظ سے ایک واحد چیز ہے۔ اس میں وہ اچھے اور بُرے ان سب لمحوں کا ذکر کرتا ہے جب اس کی روح کو اُجالا دکھائی دیا اور اس بیرونی نور سے اُس کی اندرونی ہستی بھی منور ہوگئی اس کی زندگی کی مشکلات کے لحاظ سے اس نظم میں تلخی کی زیادتی ہونا چاہئے تھی لیکن یوں نہیں ہے وہ ہمیں شگفتہ نظر آتا ہے اس کی وجہ نظم کے آخری مصرعوں میں واضح ہو جاتی ہے۔

"سب سے بڑھ کر مسرت کے لمحوں پر بھروسہ رکھو۔

اُن لمحوں سے جو کچھ حاصل ہو، وہ یقینی موت کا ڈر دل سے کم کر دیتا ہے،

"اور انسان کے کلام میں ایک گداز اور ایک نئی بصیرت پیدا کر دیتا ہے،

"اور وہی لمحے ہمیں دانا بھی بناتے ہیں جن میں ہمیں مسرت حاصل ہو۔"

یہ نظریہ ایک کلیے کی حیثیت اختیار کر چکا ہے کہ کسی شاعر یا ادیب کی قدر و قیمت کا جو اندازہ آنے والی نسلیں کرسکتی ہیں وہ اُس کے ہمعصر نقادوں سے ممکن نہیں اور دوں میں غالب کا کلام اس نظریے کی ناقابل تردید دلیل ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کسی شاعر کے کلام میں سے ہنگامی اجزا کو پائیدار اجزا سے علیحدہ کر کے دیکھنا ایک بہت ہی باریک بیں اور دُور کی بصیرت رکھنے والے شخص کا کام ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ہر شخص کو یہ خصوصیت حاصل نہیں ہوتی۔ ایک اور وجہ بھی ہے کہ اگر کسی شاعر کی شخصیت کسی بھی لحاظ سے دلچسپ ہو تو اس کے ہمعصر اس کی شخصیت سے اپنی دلچسپی کو نظر انتقاد سے علیحدہ نہیں کرسکتے۔ اس کی مثالیں بھی اردو ادب میں ہی مل سکتی ہیں۔ انشا اور میر کی شخصیتیں اپنے زمانے میں ہی لوگوں کے لئے دلچسپی کا باعث تھیں۔ انشا کی نطرت زندہ دلی اور تنوع کا ایک زبر دست مجموعہ تھی۔ میر کی بددماغی ہی نے اس میں ایک دلچسپی پیدا کر دی تھی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انشا کے کلام کی فنی باریکیاں اور میر کی سادگی اور اثر پر فنی بہتر تنقید یں ہوئیں وہ آنے والی نسلوں ہی کی مرہون ہیں۔ اُن کے اپنے زمانوں میں انشا ایک درباری شاعر سے بڑھ کر کچھ خاص ہستی نہ تھے اور میر کے کلام کا صرف درد ہی تھا جو لوگوں کو اپنے دکھ درد کی یاد دلا کر اُن سے جبراً داد لے لیا کرتا تھا۔

اسی بنا پر میسفیلڈ کے متعلق بھی اُس کے ہمعصر نقادوں کی رائیں کو قطعی اور زوردار نہیں سمجھا جاسکتا۔ لیکن یہ بات البتہ کہی جاسکتی ہے کہ

میسفیلڈ جمہور کا شاعر ہے ایک ایسی جمہوریت اُس کا موضوع سخن ہے جو زندگی کے سمندر کی تہ میں جا بیٹھی ہوا اور وہ اب اُسے از سرِ نو نمایاں کر کے اس کے حُسن کا احساس دلا رہا ہے۔ وہ ایک ایسا شاعر ہے جس کے دل میں ہر اُس چیز جاندار اور بے جان دونوں کے لئے جس پر کسی طرح کا ظلم ہوا جس سے ناانصافی ہوئی، جسے اپنی فانی زندگی میں بے اعتنائی اور دل شکستگی کا سامنا کرنا پڑا ایک سوز و گداز ہے۔ ایک رحم کا جذبہ ہے۔ وہ ایک ایسا شاعر ہے جس نے آج کل کے صنعتی زمانے کی بے جان کیفیات میں ایک نئی روح حیات پیدا کر دی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر وہ ایک ایسا شاعر ہے جس نے زندگی کو، انسان اور اُس کی حیوانی زندگی کو اُس کے اصلی رنگ و روپ میں عریاں کر دیا ہے۔

لیکن میسفیلڈ اپنی ادبی تخلیقات میں اب اُس نازک مقام پر آ پہنچا ہے جہاں ایک شاعر اور ادیب کو تکمیل فن کے ساتھ خطرے بھی لاحق ہو جاتے ہیں۔ وہ راہِ حیات کی اُس منزل پر پہنچ چکا ہے۔ جہاں شخصی قوتیں اپنا کام پورا کر کے مزید کام کرنے سے عاجز ہو جاتی ہیں۔ میسفیلڈ نے اپنی تحریکاتِ طبعی سے پورا پورا کام لیا ہے اور اب یہ خطرہ پیدا ہو سکتا ہے کہ وہ جلد ہی کہیں اپنی پہلی کہی ہوئی باتوں کو ہی دہرانا نہ شروع کر دے۔ کیونکہ لامتناہی طور پر نئی باتیں ہی کہتے جانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ یا یوں کہئے کہ جس حسن کی تلاش کے لئے شاعر نے اپنی زندگی کو وقف کیا تھا وہ اُس حُسن کو اب بہت حد تک پا چکا ہے۔ اس لئے منزل پر پہنچ کر ممکن ہے کہ ذوقِ جستجو بیکار ہو جائے مٹ جائے اور وہ اِس حاصل کئے ہوئے حسن سے بڑھ کر کسی اور بلند تر حسن کی تلاش جاری نہ رکھ سکے۔ لیکن ہمیں ایسی یاس پرستی کی باتیں نہیں کرنا چاہئیں۔ وقت کا فیصلہ میسفیلڈ کے حق میں کیسا ہی کیوں نہ ہوا انگلستان کی تاریخِ ادب میں اُس کا نام ایک مستقل جگہہ حاصل کر چکا ہے۔

میسفیلڈ نے شاعری کے ذرائع، ماخذ اور دائرۂ نظر کو بہت وسیع کیا ہے، روز مرّہ کی عامیانہ زندگی میں قدم قدم پر جو حسن پنہاں ہے اُس کو نمایاں کرنے میں اُس نے جس قدر کوشش کی ہے وہی ہمیں داد پر مجبور کرتی ہے اور اس بات کا بہت امکان ہے کہ آیندہ کئی شاعر اس میدان میں زیادہ فنّی تکمیل حاصل کریں گے۔ میسفیلڈ اپنا کام کر چکا وہ جس کام کے لئے سفر پر روانہ ہوا تھا، اُسے پورا کر چکا۔ اس کی کوشش بے غرضانہ، اور اخلاص سے لبریز تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے وقت کی پسند ناپسند کی کبھی پروا نہ کی۔ آیندہ نسلیں اُس کی قدر و قیمت کا اندازہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ کریں، اُس نے موجودہ نسلوں کے لئے جو مفید خدمت کرنا چاہی اُسے کر کے ہی چھوڑا۔

میسفیلڈ کی لمبی نظموں ہی سے اُس کی دھاک بندھی لیکن اس مختصر مضمون میں اُن نظموں کا ترجمہ دینا ممکن نہیں۔ اس لئے اُس کے فن کا اندازہ کرنے کے لئے اس کی چند چھوٹی نظموں کے ترجمے پیش نظر ہیں۔

آگاہی

اے جنگل کی وحشی ہرنی!
گھات میں پنہاں موت ہے تیری!
دیکھی بھی تو دیکھی ادھوری،
جانی بھی تو جانی ادھوری!
شرمیلے قدموں سے چلتی
مدھ متوالی، مست، مدھوری!
پیڑوں کے پتّوں پہ پھسلتی،
ہنس کی سیتل شوبھا والی!
جیسے سونی ندی بہتی!

سوُرگ کے سکھ کا ہلکا جھونکا،
ایک دھندلکا مٹتا جاتا۔
ایک مسرّت، ایک اچنبا،
اک لمحے یا دو لمحوں کا!
ہستی کے سارے عرصے میں،
اک لمحہ آئی دیکھے ہیں!
اک لمحہ ہے جس میں کہہ لوں،
تیری سندرتا کی باتیں؟
اک لمحہ جیتوں میں رہ لوں،
میٹھی میٹھی موہن ماتیں!

جستجو

حسن بغاوت سے میری، میرے قابو میں آئے گا!

رات اندھیری کالی کالی، جھرّیوں والی عورت ہے،
اور اس رات میں نیند نہیں آتی ہے دل کو اذیت ہے!
کوئل کوکو کے نغمے سے اور پپیہا پی پی سے،
اس کٹیا کے بندھن توڑنے پر دل کو اکساتا ہے!
شیطانوں کے ارادوں جیسا ایک اندھیرا چھایا ہے!
میں ڈرتا ہوں ہر شے سے، ہر شے سے، اپنی ہستی سے!

حسن بغاوت سے میری، میرے قابو میں آئے گا۔

سونی اور اکیلی کٹیا پر اک دہشت چھائی ہے،
یہ کیسی منحوس، اندھیری رات کی عورت آئی ہے!
لیکن میں دھرتی کا مالک، ہمّت والا انساں ہوں،
ناممکن ہے فرشتہ ہونا! — اچھا پھر میں شیطاں ہوں!
دھیرے دھیرے، چپکے چپکے، در کٹیا کا کھول دیا،
اور منہ سے بے باک انوکھا نعرہ چِلّا کر مارا
کٹیا سے باہر نکلا اور دیکھے منظر قدرت کے۔
دل پر ہلکے ہلکے نشّے لانے والی راحت کے۔
کاجل جیسی گھٹاؤں سے لو چاند بھی نکلا ڈرتا سا،
نادانی میں دیکھنے والے دل پر جادو کرتا سا!
اوس رسیلی، ننھی منّی کلیوں میں اور پھولوں میں،
جھول رہی ہے اک مستی میں ان پھولوں کے جھولوں میں!
لیکن ہر اک حسن سے بڑھ کر میرے دل میں اُجالا ہے!
میرا دل ہے جانا انوکھا، یہ سب حسن اک ہالا ہے!
میں نے ہی سونی کٹیا کا بندھن دل سے ہٹایا ہے!
حسن بغاوت سے میری، میرے قابو میں آیا ہے!

حسنِ رفتہ کی یاد

کئی دن، کئی سال، صدیاں ہوئیں، جب
یہ دھرتی چمکتی ہوئی ایک جنّت تھی گویا!
جب انسان پھرتے تھے رستوں پہ مست اور شاداں،
کہ جیسے ہوں وہ دیوتاؤں کے آقا!
اُمنگوں بھرے بے خود و خوابگوں تھے مناظر،
ندی کے کنارے اکیلی سی کٹیا میں بھگوان رہتے تھے تنہا!

اُسی پہلے، بیتے، پرانے سمے میں
مجھے حسن نے روپ اپنا دکھایا!
مری لڑکھڑاتی نگاہوں میں آکر،
مرے دل میں سو آرزوؤں کو لاکر،
چھچھلتی ہوئی مختصر سی نظر سے،
مرے دل کو دیوانہ کر ڈالا اپنے اثر سے!

یوں ہی سارا دن ڈھونڈتا ہی رہا میں،
مگر میں نے اُس کو نہ پایا۔
سیہ چشم، انجان، جس نے مجھے اک اشارے سے اپنا بنایا!

ہر اک چیز میں، آہ! ہر شے میں موجود تھی وہ،
ہر اک چیز میں جلوہ افشاں تھی ہر سو،
اُسی کی ہر اک چیز سے بہتی آتی تھی خوشبو!
ہر اک چیز میں تھی،
ہوا میں، ندی میں،
ہر اک پھول میں اور کلی میں،
ہرے گھاس کی سادگی میں،
ہر اک چیز میں، آہ! ہر شے میں محدود تھی وہ،
مگر آج تک بھید اُس کا نہیں میں نے پایا!

زندگی

دیکھا، جیون بھی دیکھا،
(رنگا رنگ دلوں کے موتی کی مالا)!
لیکن یہ ہستی کی ڈوری چیز ہے کیا؟
موہ نہیں ہے اور نہیں یہ سندرتا۔
گل بھی نہیں ہے، پھر بھی ہے یہ بہتیرا!
اس کا رنگ اور روپ نہیں ایسا ویسا۔
اس کے کان نہیں ہیں کوئی اور نہ جوڑ آنکھوں کا۔
ایک لہو کی جنگ ہے جس کا آنسو کرتے ہیں پیچھا۔
وقت کا ہے یہ اک لمحہ۔
اک لمحہ ہے رستے کا۔
نفس ہے اک نشتر اس کا۔
پھر بھی دکھ کی بستی میں
مرد عورت مل جاتے ہیں۔

دھرتی! آن کھلاتی جا!
آئے، چھائے کالی گھٹا۔
جھلکے بھالا سورج کا!
ہم جو انساں آئے ہیں اُن کے آگے ہے کام پڑتا۔

دھرتی کے اندر سے ہی
پھوٹی ندی جیون کی
بات آن جانی، آن جیتی!

شیریں روح

میں نے دیکھے چاند ستارے میں نے دیکھا ہے آکاس،
لیکن اُس ماتھے کی بندی، اُس کا ڈھیلا ڈھالا لباس!
ساون رُت کی بھیگی ہوا میں میں نے سونگھی بھینی باس!
لیکن سانس کی خوشبو، کالے بال بجھائیں میری پیاس!
ناچ بھی دیکھے پریوں والے اور سنے ہنگالی[۵] گیت،
لیکن اُس کی چال انوکھی اور اُس کی باتوں کی ریت!
میں نے ایسے جادو دیکھے سب کے من کو جائیں جیت،
لیکن اُس کے من کی میرے من سے موہن سندر پریت!

اُس کو ہر شے میں دیکھا لیکن اُس میں ہر شے دیکھی!
اور اُس کے ملنے سے میں نے جیون کی آشا پائی!

اُس کے پیامی

بطیں اڑتی جاتی ہیں آکاش منڈل میں دکھن کی جانب!
اور ان کے چمکتے ہوئے پر نظر آ رہے ہیں خموش اور نیلی فضاؤں میں!
اور اک جھیل دھرتی پر سوتی ہوئی ہے خموشی، سکوں میں!
کنارے پہ ہیں نَے کے لمبے سے پودے
ہوا جن میں بھرتی ہے آواز کو ایک حرکت میں لاتی۔
نہیں روحِ انساں پہ افسوس کوئی اس طرح کا
ہے وحشت سی چھائی ہوئی اُس پہ ہر دم!
سکوں اس کو ہو گا نہ پل بھر میسّر
جو روحیں کہ ہیں عقل کی آخری حد پہ پہنچیں۔
جہاں آسماں بند کرتے ہیں رستہ۔
اُنہیں سارے لوگوں کی نفرت ملے گی۔
انہیں دار پر جا چڑھائے گی دنیا!

فریبِ تصوّر

جام پر جام پیئے ہیں مئے عنّابی کے،
اور پھینکا ہے کئی بار اٹھا کر پانسہ!
باوجود اس کے مری آنکھوں نے دیکھا ہے اُسے
اور کانوں نے سنا اُس کی صدا کا نغمہ!

[۵] اصل میں "ہیبلونی گیت" ہے۔ م۔

زرد چہرہ ہے نگاہیں ہیں المناک اُس کی ،
اور آواز کہ جیسے کسی طائر کی صدا !
ہاتھ نازک ہیں کہ جیسے کسی گُل کی پتی ،
آہ! وہ ہاتھ جنہیں میرے لبوں نے چُوما !

اُنہیں ہاتھوں نے مری آنکھوں کو چُھو کر، پل میں،
درد کو دُور کیا ، درد سے آرام دیا
دونوں شانوں پہ دھندلکا تھا کہ گیسو کی گھٹا ،
جیسے فردوس کی خوشبو کی سنہری لہریں!

اُس کی باتیں ہی تو تھیں آہ! مداوا دل کا !
عفوِ شیریں سے گناہوں کا کیا میرے علاج ،
رات میں کھو گئی پھر ڈھونڈ رہا ہوں میں آج ،
تیرہ و تار ہیں رستے نہیں ملتا ہے پتا !

خرابہ

اُستخوانِ خستہ کی مانند ہیں اُجڑے کھنڈر ،
ایسا منظر، جس طرح پھیلے ہوئے ہوں ریت پہ
پسلیاں اور ہڈیاں بازو کی اور بے رنگ سر !
اور ان پر پہلے راجاؤں کی مایا کے نشاں ،
پہلے راجاؤں کی مایا ۔ جھوٹ ، ظلم اور کرّ و فر !
آہ ! جب جمہور پہ جبر و ستم تھا بے گماں !
ہاں وہی راجہ کہ جن سے بحر و بر بھی کانپ اُٹھے ،
ہاں وہی ننگِ بشر جن سے بشر بھی کانپ اُٹھے !

اک زمانہ تھا کہ اُن کے زور کی اک دھوم تھی ۔
اُن کی فوجوں کے سپاہی سلطنت جن سے بنی !
اور بازاروں کی رونق اور تجارت کا فروغ ،
مصلحت سے پُر ہو جو ہر سمت ایسا تھا دروغ !
آج لیکن اس جگہ پر گیدڑوں کا شور ہے !
اور افعی موت کا شبنم سے منہ دھوئے ہوئے!

سامنے منڈی کا دروازہ شکستہ ہے ، یہیں ،
تانبے اور چاندی کے سکّوں میں دیا کرتے تھے لوگ ،
اپنے اپنے مال پر محصول کا بارِ حسرتیں !
اور تھکن کے دور کرنے کو پیا کرتے تھے لوگ
ساغروں میں بھر کے مینا سے مئے رنگیں کے جام!
عورتیں بھی تھیں اور اُن سے دل کو بہلانے کا کام !
دن کی محنت ختم ہو جاتی تھی ، آ جاتی تھی رات ،
چاند کو پہلو میں لے کر سب پہ چھا جاتی تھی رات !
گرم بازاری گناہوں کی ہُوا کرتی تھی تب ،
جاگ ہی اُٹھتا تھا ہر جا محشرِ لہو و لعب !
اور فصیلوں پر کھڑے ہوتے تھے شب کو پہرہ دار ،
دیکھتے تھے دُور تک وہ شاہ راہیں ، سبزہ زار !

میراجی

رباعی

شعرا سے ہے خیال رعنا ہے ترا
مشکیں ہے بہشت نقش تمنا ہے ترا
تنہا ہوں بہشت فطرت یوسف سے غنی
سرمایۂ خواب زلیخا سے بھروسا ہے ترا

سعید احمد اعجاز

بچپن کی یاد

آہ آ، اک بار پھر آ، اے مرے بچپن پھر آ
تجھ سے کہنے ہیں بہت سے ماجرائے دلخراش
اے مرے اچھے لڑکپن جب سے تو رخصت ہوا
ہو گئی سچی خوشی سچی مسرّت پاش پاش

یاد ہیں، اُف یاد ہیں، اب تک مجھے سب یاد ہیں
تیرے وہ بے فکر دن کتنے تھے راحت آفریں
اب وہی بے فکر دن ہیں اس قدر بارِ دماغ
چاہتا ہوں ختم ہوں جلد اور آئے شب کہیں

کیا کہوں میں آہ تجھ سے کیا کہوں ہیں وہ دماغ
جس میں رہتا تھا فقط دلچسپ کھیلوں کا خیال
اب وہی فکروں کی تپ سے اس قدر پُرسوز ہے
برف کے تودوں سے بھی تسکین ہے جس کی محال

تیری پیاری نیند جو دے دے کے میٹھی لوریاں
شام ہی سے گود میں اپنی سلاتی تھی مجھے
منتظر رہتا ہوں اکثر رات بھر آتی نہیں
ہاں بتا دے کچھ سبب معلوم ہے اس کا تجھے؟

گرمیوں کی جانفزا، دلکش، سہانی رات میں
آسماں پر چاند کی رفتار کا پیارا سماں
آہ میرے واسطے کیسا مسرت بخش تھا
اُس خوشی کو ڈھونڈھتا ہے دل مگر اب وہ کہاں

اے مرے اچھے لڑکپن صرف اور صرف ایک بار
آ کے پیشانی سے میری پونچھ دے گردِ ملال
میں خوشی سے آہ لینے کے لئے تیار ہوں
اپنی باقی زندگی دے کر ترے دو ایک سال

مرزا عباس بیگ محشر

زندگی ختم ہوئی

زندگی ختم ہوئی،
لیکن احساس کو حاصل نہیں اب گویائی؛

جب تک اس دِل میں رہا جوشِ جنوں.
تب تک اس دل کو میسّر تھی حیات
اب نہیں، آہ! نہیں ہے وہ بات
زندگی ختم ہوئی!

کیوں چلی بادِ فنا؟
مِٹ گیا عشق کا پہلا نغمہ،
نکہتِ عشرتِ دِل آوارہ،
اب نہیں آہ! وہ منظر باقی
تیرہ و تار ہے، تاریک ہے رات
اب نہیں، آہ! نہیں ہے وہ بات!
زندگی ختم ہوئی!

ایک دن تھا کہ محبت تھی مرے دل کے قریں
تازگی ایسی تھی اِک پھول تھا دل،
چاندنی رات کا نقشہ تھا تمام!
میں تھا، اور آہ! کوئی اور بھی تھا،
صحنِ گلشن میں تھا مستانہ خرام!
مری ہمدم کا تھا پیکرِ نغمہ
اور میں خود بھی تھا پیکرِ نغمہ
آنکھ بھی نغمہ تھی، منظر نغمہ!
کیسے لمحے تھے کہ حاصل مجھے گویائی تھی!

یاس نے آکے مرے دِل کو کیا ہے زخمی
چھین لی، چھین ہی لی یاس نے راحت دل کی!
کس طرح لوٹ کے اب آئے گی حالت پہلی
تیرہ و تار ہے، تاریک ہے رات!
زندگی ختم ہوئی!

میراجی

ننھا

انہوں نے کہا ـــــ تانگہ آگیا ہے۔ جلد چلو، وقت کم ہے۔ اتنا کہہ کر وہ سامان اٹھا اٹھا کر نیچے لے جانے لگے۔

اپنے نحیف و ناتوان جسم کو لے کر میں اُٹھی، اندر بستر پر میرا ننھا پھول سکھ کی نیند سو رہا تھا۔ پلکوں کی پنکھڑیاں بند تھیں۔ اس کے بالوں پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتے ہوئے میں نے بے اختیار اس کے گرم گرم ہونٹوں کو چوم لیا۔ بچہ ایک بار چونکا اور پھر کروٹ بدل کر سو رہا ـــــ میں نے کتنی بار اُن بکھرے ہوئے روکھے بالوں پر پیار کا ہاتھ پھیرا تھا، کتنی بار اُن نازک رخساروں پر اپنے ہونٹ رکھ کر دبائے تھے؟ لیکن کبھی میرا گلا یوں نہ بھر آیا تھا۔ آنکھیں اس طرح پرنم نہیں ہوئی تھیں! سوچنے لگی ـــــ کون جانے یہ ننھی مُنی صورت دکھائی دے گی یا نہیں، آکر پھر اسے پا بھی سکوں گی یا نہیں، جی بھر کے پیار بھی کر سکوں گی کہ نہیں! ـــــ ایک بار گود میں لے کر اسے چوم لینے کو جی بے قرار ہو گیا۔ میں جھکی، اسی لحظہ سیڑھیوں سے آتے ہوئے انہوں نے کہا ـــــ جاگ اٹھے گا۔ پھر میری ساس کی طرف دیکھ کر بولے ـــــ ماں جی۔ اب ننھا تمہارے حوالے ہے۔

اپنی پرنم آنکھوں سے ساس کی طرف دیکھ کر میں نے بھی یہی درخواست دُہرا دی۔ زبان سے بھی کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن گلے نے ساتھ نہ دیا۔ ہاں سر اُن کے قدموں پر جھک گیا۔

ساس بولیں ـــــ پرماتما رکشا کریں گے بیٹی۔ میں تو ایشور سے چاہتی ہوں۔ تم جلد تندرست ہو کر واپس آؤ اور اپنے لال کو سنبھالو۔

چپ چاپ میں سیڑھیاں اُترنے لگی۔ ساس بھی تانگے تک آئیں۔ تب ایک فوری جذبہ کے ماتحت میں ان سے لپٹ گئی۔ اس وقت مجھے اپنی مرحومہ ماں کی یاد آگئی۔ ساس کو میں نے زور سے اپنے بازوؤں میں بھینچ لیا اور سسکیاں اپنے آپ میرے ہونٹوں سے نکلنے لگیں۔

آنچل سے آنکھیں پونچھ کر ساس نے مجھے تانگے میں بیٹھنے کو کہا ـــــ اور دوسرے لمحے میں گھوڑے کے ٹاپوں سے رات کا سناٹا چونک اُٹھا۔

. . . .

سنگ دل، بے حس اور ٹھنڈی سڑک، سوئے ہوئے یا کسی کی یاد میں کھوئے ہوئے اداس مکان، اور کسی نامعلوم خوف کی طرح دنیا پر چھا جانے والی سردی! انہوں نے کچھ کہے بغیر شال کو اور بھی اچھی طرح میرے گرد لپیٹ دیا۔

میں آنکھیں پھاڑے اس متحرک منظر کو دیکھ رہی تھی۔ چاروں طرف خاموشی چھا رہی تھی۔ سناٹا۔ نیند اور تاریکی۔ سڑک کے ایک کنارے فٹ پاتھ پر سڑا گلا لحاف اوڑھے، سنسار سے ٹھکرایا ہوا ایک بھکاری لڑکا سو رہا تھا۔ میرے دل میں اس بے بس یتیم کے لئے ہمدردی کا سمندر اُمڈ آیا اور پھر ایک بے ماں کے بچے کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ گئی ـــــ پھول سے گال مُرجھا گئے ہیں۔ ہونٹوں پر پپڑیاں جم رہی ہیں۔ آنکھیں ہیں کہ مسرت کی قبریں! بے چین ہو کر میں نے کہا ـــــ تانگہ روکنا!

ـــــ کیا بات ہے؟ اُنہوں نے پوچھا۔

ـــــ ایک فقیر لڑکا اتنی سردی میں پٹڑی پر سویا پڑا ہے۔

لیکن تانگہ اتنے میں بہت دور نکل آیا تھا۔ میں نے دور تک نظر دوڑائی۔ سامنے مکان کے اوپر سے غروب ہوتا ہوا چاند جھانک رہا تھا اداس اور غمگین! جیسے اپنی جانی پہچانی دنیا کو چھوڑتے ہوئے اُسے دکھ ہو رہا تھا اور اس کی پھیکی روشنی میں وہ بدقسمت بھکاری ایک سیاہ دھبہ سا بن کر رہ گیا تھا!

بائیں طرف ایک مکان سے بچے کے رونے کی آواز آئی اور کسی ماں نے تھکی ہوئی نیند سے بوجھل آواز میں کہا ـــــ سو جا میرے لال!

بچہ جانے کیوں، اور بھی زور سے رو اُٹھا۔ تب کسی بڑھیا کی کرخت آواز سنائی دی ـــــ سو جا کمبخت سب کی نیند حرام کر دی!

میرا کلیجہ اُچھل پڑا۔ گھر کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھنچ گیا۔ میرا لال رو رہا ہے۔ ماں، ماں، کہہ کر چلا رہا ہے اور ماں اسے جھڑک کر سلا رہی ہے۔ میں لوٹ جانے کے لئے بے چین ہو اُٹھی۔ میں نے کہنا چاہا ـــــ تانگہ روکنا۔

تانگہ خود ہی رک گیا۔ سٹیشن آ گیا تھا۔ اور پلیٹ فارم پر کھڑی ہوئی گاڑی کا انجن شوں شوں کر رہا تھا۔

انہوں نے قلی کو آواز دی اور بازو تھام کر مجھے اتارتے ہوئے کہا ـــــ شیل، ادھر قلی ٹرنک رکھ دیتا ہے۔ تم اس پر بیٹھو اور باقی سامان دھیان سے اتروا لینا۔ میں اتنے میں دوڑ کر ٹکٹ لے آؤں وقت کم ہے۔

میں کہنا چاہتی تھی ـــــ میں واپس جاؤں گی۔ آج نہیں کل چلیں گے لیکن کہتی کس سے؟ وہ تو ٹکٹ لینے چلے گئے اور قلیوں نے سامان اتار کر رکھنا شروع کر دیا۔

دیکھ لینا بہو جی کوئی اور چیز تو نہیں رہ گئی؟ میں جیسے خواب سے جاگی۔ اتنے میں وہ بھی آ گئے۔ سامان گن کر انہوں نے تانگے والے کو پیسے دیئے اور کچھ دیر بعد گاڑی ہمیں اپنی گود میں بٹھائے لئے جا رہی تھی۔

موت اور اس گاڑی میں کوئی بہت فرق نہیں۔ صرف اس قدر ہے کہ موت خاموشی سے آتی ہے اور گاڑی شور مچاتی ہوئی۔ نہیں تو سنگ دل اور بے حس یہ بھی اتنی ہے کہ ہزاروں مسافر اس نے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچا دیئے۔ کبھی کسی میں دلچسپی نہیں لی۔ کبھی کسی کی جدائی پر دو آنسو نہیں بہائے۔ اسے کیا معلوم کہ یہ جو اس کی گود میں بیٹھی جا رہی ہے شاید اپنی زندگی کے آخری سفر پر ہے یہاں کے ڈاکٹروں نے اُس کی زندگی سے نا اُمیدی کا اظہار کیا ہے شاید پھر اس کی گود میں کبھی بیٹھ بھی سکے گی یا نہیں، لیکن اسے کیا....؟

دور درختوں کی چوٹیوں پر چاند چمک رہا تھا۔ اس کی چاندنی اور بھی پھیکی ہو گئی تھی۔ اچانک ایک ننھی سی صورت چاند میں نمودار ہوئی اور اس نے پکارا۔

ـــــ ماں! ـــــ

ـــــ ماں!

میں نے ان کی طرف دیکھا۔ سامنے کی سیٹ پر خاموش اپنے خیالات میں محو بیٹھے تھے۔

میں نے کہا ـــــ آپ نے یوں ہی اتنی جلدی کی۔ ایک دن اور ٹھہر جاتے تو کیا تھا!

کچھ لمحوں کے لئے وہ نظر جما کر میری طرف دیکھتے رہے اور پھر میرے پاس آ بیٹھے۔

میرے سر کو اپنے مضبوط سینے سے لگاتے ہوئے انہوں نے کہا ـــــ شیل تم اتنی بے صبر کیوں ہو رہی ہو۔

میرے آنسو ان کی شاید اسی بات کا انتظار کر رہے تھے۔

. . . .

قہقہہ لگانے کی کوشش کرتے ہوئے انہوں نے کہا ـــــ

شیلا۔ اگر تم اسی طرح روز کڑھا کرو گی تو آرام کیسے آئے گا!

لیکن میں نہیں ہنسی۔ میں نے کہا ـــــ میں منت کرتی ہوں۔ مجھے ننھے کو لا کر دکھا دو۔

وہ چپ چاپ میری طرف دیکھتے رہے۔ پھر انہوں نے کہا ـــــ تم دوسروں کی مشکل کو تو محسوس کرتیں نہیں۔ بچے کو یہاں لانا۔ اتنا سہل نہیں جتنا تم نے سمجھ رکھا ہے۔ اسے لانا چاہوں گا، تو ماں کو بھی اس کے ساتھ لانا پڑے گا اور تمہیں معلوم نہیں، ماں آج کل ایک دن کے لئے بھی گھر سے باہر نہیں نکل سکتیں۔ ہری کرشن کا امتحان ہو رہا ہے اور پھر سنترا کو بھی گھر میں اکیلی نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اب میں تمہیں کیسے سمجھاؤں!

یہ کہہ کر وہ چپ ہو گئے اور میں نے آنچل میں اپنا منہ چھپا لیا۔ آج دو مہینے سے میں ہسپتال میں پڑی تھی۔ رہ رہ کر مجھے اپنے ننھے کی یاد ستاتی تھی۔ صرف اسے ایک نظر دیکھنا چاہتی تھی۔ میں ہمیشہ کے لئے اپنے پاس تو نہیں رکھنا چاہتی تھی۔ لیکن میری اتنی سی خواہش بھی پوری نہیں ہو رہی تھی۔

باہر سڑک پر ہارن بجاتی ہوئی موٹر نکل گئی اور آہستہ آہستہ چلنے والے کسی تانگے کے پہیوں کی آواز آنے لگی۔

میں نے آنکھیں پونچھ کر دُور پڑی ہوئی بملا کی طرف دیکھا۔ دو مہینے سے وہ بھی ہسپتال میں پڑی تھی۔ تبھی سے شاید ایک بچی گھر میں اس کی

راہ تک رہی تھی اور بملا شاید زندگی سے ہی نا امید تھی۔ وہ شاید جانتی تھی کہ اس کی بچی اپنی ماں کو پھر کبھی نہیں دیکھ سکے گی اور تب کبھی کبھی نہایت عاجزی سے وہ اپنے خاوند سے کہہ اٹھتی تھی —— مجھے مُنّی کو دکھا دو۔

بملا کمبل اوڑھے چپ چاپ پڑی تھی۔ کون جانے وہ سوئی ہوئی تھی یا جاگ رہی تھی اور اگر جاگ بھی رہی تھی تو کون جانے بیداری ہی میں وہ اپنی بچی کو پیار نہیں کر رہی تھی۔

دو مہینے پہلے کا ایک واقعہ میری آنکھوں کے سامنے پھر گیا —— جب وہ مجھے لاہور لائے تھے اور ہسپتال میں داخل کرانے سے پہلے اپنے ایک دوست کے گھر انہوں نے مجھے ٹھہرایا تھا انار کلی کے نزدیک ہی گنپت روڈ پر ان کے دوست کا مکان تھا۔ جس کمرے میں مجھے ٹھہرایا گیا تھا۔ وہ کافی کھلا اور روشن تھا۔ میں گاڑی سے اتر کر تانگوں کے اڈے تک آتے آتے نڈھال ہو گئی تھی۔ کچھ کھانے پینے کو اگرچہ طبیعت نہیں چاہتی تھی، پھر بھی اُن کے اصرار پر دودھ کے دو چار گھونٹ پی کر بستر پر دراز ہو گئی تھی۔ میرے آرام کا انتظام کر کے وہ ڈاکٹروں سے مشورہ کرنے باہر چلے گئے تھے اور میں کھڑکی کے باہر کھلے نیلے آسمان کو دیکھتی رہی تھی۔ باہر سے کچھ عجیب طرح کا ملا جُلا شور کانوں میں آرہا تھا —— کبھی موٹروں کی گھر گھر کا کبھی کبھی تانگوں کی کھڑکھڑاہٹ کا۔ کبھی خوانچے والوں کا اور کبھی ان سب کا اکٹھا لیکن اس سارے شور وشغب میں کبھی کبھی ایک دلکش آواز آتی تھی جیسے کوئی دھیرے سے میرے کانوں میں کہہ رہا تھا —— ماں! اور میں کانپ سی جاتی تھی۔

دوپہر کو گھر کی مالکن —— اُن کے دوست کی بیوی میرے پاس آ بیٹھیں۔ بے چاری بڑی اچھی تھیں۔ مجھ سے میری بیماری کے سلسلے میں سوالات کرنے لگیں۔

میں نے کہا —— پتہ نہیں چلتا کیا بیماری ہے؟ بخار رہتا ہے اور گھلی جا رہی ہوں۔ جانے کیا روگ ہے؟ معلوم نہیں زندہ بھی لوٹوں گی یا نہیں!

وہ مسکرائیں۔ آج بھی وہ مسکراہٹ میری آنکھوں کے سامنے ناچ جاتی ہے۔ بولیں —— آپ گھبرائیں نہیں، بخار کی کیا بات ہے۔ .... ایک طرح کا ہو تو کوئی سمجھے۔ میری نند کو سال بھر بخار آتا رہا، ڈاکٹروں نے تو ڈرا ہی دیا تھا لیکن پرماتما نے بھلا کیا۔ جگر کا بخار تھا ڈیڑھ برس بعد آرام ہو گیا اور اب تو وہ دو بچوں کی ماں بھی ہے۔ پرماتما نے چاہا تو آپ بھی جلد تندرست ہو جائیں گی۔

میں نے غم سے مسکرا کر کہا۔ ایشور کرے آپ جیسا کہتی ہیں ویسا ہی ہو۔

اُسی دم ایک چھوٹا سا خوبصورت بچہ ماں، ماں، کہتا ہوا آیا۔ اور اُن کے گلے سے لپٹ گیا۔

دوسرے دن مجھے ہسپتال میں داخل کرا دیا گیا۔ میں نے سکھ کی سانس لی۔ اگر ان کے دوست کے یہاں مجھے کچھ دن اور رہنا پڑتا۔ تو جانے میری کیا حالت ہوتی۔ جب بھی وہ گول مٹول۔ خوب صورت چمکیلی آنکھوں والا بالک آتا میرا دل اُسے گود میں لے کر پیار کرنے کے لئے تڑپ اُٹھتا۔

صاف، روشن، کھلا کمرا۔ شیشے کی طرح چمکتا ہوا فرش، سفید پالش سے دمکتی ہوئی کرسیاں —— مجھے ہسپتال کی فضا بری نہیں لگی تب اس روشنی اور پاکیزگی کے باوجود ہسپتال میں جس کی جو کمی ہوتی ہے اس کی طرف دھیان نہ دے کر۔ کامل سکون پا کر، ننھے بچوں کی دنیا سے بہت دور ہو کر میں مطمئن ہو بیٹھی۔ لیکن اب تو دو مہینے اسی بے حس، لمبے چوڑے، کشادہ اور صاف کمرے میں رہ کر جس میں ذرا بھی اپنائت نہیں تھی۔ میں اُکتا گئی تھی۔ میں چاہتی تھی۔ اپنے چھوٹے سے گھر کا آنگن، اس میں اپنے چہکتے ہوئے ننھے کا شور۔ پیار محبت، روٹھنے اور منانے کی وہ پُر شور دنیا۔ . . .

اور بملا، نہ جانے کب، دھیرے سے اُٹھ کر دیوار کا سہارا لئے میرے پاس آئی، اور اس نے میری نمدار آنکھوں کے سامنے ایک فوٹو رکھ دیا۔

—— شیلا یہ میری مُنّی کی تصویر ہے۔

میں نے اس کی طرف دیکھا، اس کے زرد پیلے چہرے پر ایک مسرّت کھیل رہی تھی۔

—— خوبصورت ہے! میرے بھرے ہوئے گلے سے صرف اتنا ہی نکلا۔

جب بملا چلی گئی تو میں نے نمدار آنکھوں سے ان کی طرف دیکھا اور نہایت التجا آمیز لہجے میں کہا —— ایک بات مانو گے؟

—— کہو!

—— ننھے کو نہیں لا سکتے، تو اس کا فوٹو لا دو!

ایک لمحہ کے لئے ان کا چہرہ اداس ہوگیا۔ پھر ہنس کر انہوں نے کہا ـــ اچھا لادوں گا!

میں نے پوچھا ـــ چہرے پہ اداسی کیوں آگئی؟

وہ ہنسے۔ بولے ـــ میں سوچتا ہوں تم تندرست نہ ہوسکو گی۔ تمہاری صحت ٹھیک ہو رہی ہے۔ دو ایک مہینے تک گھر ہی تو جاؤ گی۔ یہاں بیٹھی اس کا فوٹو دیکھ کر روتی رہا کرو گی۔

میں نے کہا نہیں میں کبھی نہیں روؤں گی۔

. . . .

شام کا وقت تھا۔ دور کسی بڑی عمارت کے پیچھے ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی کھڑکی سے چھن کر اندر آرہی تھی۔ جالی کے پاس میں کب سے بیٹھی ان کا انتظار کر رہی تھی۔ اپنے ننھے کی کئی تصویریں میری آنکھوں کے سامنے آئیں اور چلی گئیں۔ تصور ہی تصور میں میں نے اس سے باتیں کیں۔ اسے پیار کیا، چوما۔ اور پھر گلے سے لگایا۔ ساڑھے پانچ بجنے کو آئے پر ان کا کہیں پتہ ہی نہ تھا۔ کھڑکی میں لگی ہوئی جالی سے متواتر دیکھنے کی وجہ سے میری آنکھیں تھک گئیں۔ دوسرے مریضوں کے رشتے دار آ کر جانے بھی لگے۔ لیکن وہ نہ آئے۔

آج انہوں نے ننھے کا فوٹو ساتھ لانے کو کہا تھا۔ صبح ہی سے آج میں شام کا انتظار کر رہی تھی۔ منٹ منٹ کر کے دن کاٹا تھا۔ چار بجے تھے تو میرا دل خوشی سے دھڑکنے لگا تھا۔ لیکن پانچ بجتے بجتے مسرت کی جگہ آہستہ آہستہ غم نے لے لی تھی اور اب تو . . . . انتہائی مایوسی سے جی چاہتا تھا کہ زور زور سے رو پڑوں۔ جالی کو تار تار کر دوں۔ باہر بھاگ جاؤں۔ سڑک پر۔ پاگلوں کی طرح . . . . اُسی دم بملا کی خالہ نے آواز دی ـــ کیوں بملا کیا حال ہے ـ؟

میں نے اُن کی طرف صرف دیکھا۔ کچھ جواب نہ دے سکی۔

ـــ کہو تمہارا ننھا تو اب اچھا ہے؟

ایک لمحے کے لئے میرا دل دھڑک اُٹھا۔ گھبرا کر میں نے پوچھا ـــ کیوں، اسے کیا ہوا تھا؟

بملا کی خالہ ہمارے شہر ہی میں بیاہی گئی تھیں۔ میں تو انہیں نہ جانتی تھی۔ لیکن وہ ہمارے سب گھر والوں سے واقف تھیں۔ بولیں۔ ـــ سنا تھا، کئی دنوں سے بیمار ہے۔

میں نے اور بھی گھبرا کر کہا ـــ نہیں تو۔ مجھے تو انہوں نے بتلایا تک نہیں۔ ابھی تو اس دن وہ مجھ سے ملنے آئے تھے۔ کہتے تھے ـــ بالکل تندرست ہے پہلے سے تو موٹا ہوگیا ہے اور بیٹھنا بھی اب سیکھ گیا ہے۔

یہ کہہ کر میں نے تجسس بھری نگاہیں بملا کی خالہ کے چہرے پر جمادیں۔

لیکن خالہ نے کچھ بھی نہ کہا۔ کچھ اور سنجیدہ ہو کر بولیں ـــ میں کئی دن سے محلّے میں گئی بھی نہیں۔ اب اچھا ہوگیا ہوگا۔ پھر کچھ مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے انہوں نے کہا ـــ کہو اب تمہارا کیا حال ہے؟

میں نے کہا ـــ پہلے سے اچھی ہوں۔ اور اس سے پہلے کہ میں ان سے ننھے کے متعلق کچھ اور پوچھتی وہ "نمستے" کہہ کر چلی گئیں۔ کھڑکی کی جالی سے باہر کی طرف دیکھا تو اندھیرا بڑھ رہا تھا ـــ اور بیس منٹ اگر وہ نہ آئے تو ہسپتال کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ پھر اگلے ہفتے تک ان کے آنے کا انتظار کرنا پڑے گا۔ پہاڑ سے سات دن کیونکر کٹیں گے۔ میں نے ایک سرد آہ بھری۔ میرا جی پھر رونے کو چاہتا تھا۔ اچانک دیکھا کہ پھاٹک کے اندر وہ تیز تیز، بھاگے چلے آرہے ہیں۔ میں بستر پر لیٹ گئی اور آنچل سے اپنی نمدار آنکھوں کو ڈھانپ لیا۔

ـــ شیل! ـــ شیل ـــ شیل

انہوں نے زبردستی میرا ہاتھ آنکھوں سے ہٹا دیا۔ نہ جانے وہاں کیسے اتنے آنسو نکلے آرہے تھے۔ میں رونا نہیں چاہتی تھی۔ پھر بھی روئے جارہی تھی۔

آخر انہوں نے اس دیر کی صفائی پیش کرنی شروع کی۔ ننھے کی فوٹو ہی کی وجہ سے میں پہلی گاڑی سے رہ گیا۔ کیا کرتا۔ فوٹوگرافر نے ابھی تک تیار ہی نہیں کی تھی۔ میں جا کر سر پر سوار ہوا تو مشکل سے اس نے تیار کی، پھر بھی دوسری گاڑی چھوٹ چکی تھی۔ موٹر میں آیا ہوں . . . . . اور میرے آنسو خود بخود تھم گئے۔ ایک بار آنچل سے آنکھیں پونچھ کر میں اُٹھ بیٹھی ـــ کھنچوا لائے فوٹو؟ دکھاؤ تو!

انہوں نے ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ روکیوں رہی تھیں؟

میں نے کہا۔ فوٹو دکھائیں آپ! اور ان کے ہاتھ سے فوٹو چھین لیا۔ ایک موڑھا الٹا کر کے رکھا ہوا تھا اور اس میں بٹھا کر اس کا فوٹو لیا گیا تھا۔ محبت کے جوش میں میں نے اسے چوم لیا اور پھر سینے سے لگا کر لیٹ گئی۔ اس وقت ایسا محسوس ہوا۔ جیسے دل سے کوئی بوجھ اتر گیا ہے جیسے میلوں

لمبا سفر کرنے کے بعد آرام سے منزل پر پہنچ گئی ہوں۔

....

آج ہسپتال میں میرا آخری دن تھا۔ صبح ہی سے میری طبیعت کچھ بھاری بھاری ہو رہی تھی۔ کچھ عجیب طرح کی اداسی قدرتی مسرت کے ساتھ میری نس نس میں سمائی جاتی تھی۔ سرائے میں بھی چار دن رہو تو کمرے سے محبت ہو جاتی ہے اور رخصت ہوتے وقت آدمی دیواروں پر ہی ایک حسرت بھری نظر ڈال لیتا ہے۔ پھر ہسپتال میں تو میں نے اپنی بیماری کے اتنے مہینے بسر کئے تھے اور وہاں تو جان پہچان والی بے جان دیواریں ہی نہ تھیں۔ نرسیں تھیں، ڈاکٹر تھے، اور پھر وہ بیمار استریاں تھیں، جن سے اِن بیماری کے دنوں میں کچھ بہناپا سا ہو گیا تھا۔ دن بھر میں سب سے رخصت ہوتی رہی۔ بملا صبح ہی سے بے ہوش تھی۔ اس کی بچی کا فوٹو اس کے سینہ پر پڑا تھا۔ زندگی کے اِن آخری دنوں میں اس کی محبت اس کا پیار۔ اس کی ساری آرزوئیں اِسی اپنی ننھی میں مرکوز ہو گئی تھیں جب وہ ہوش میں ہوتی تو اس کے دھیان میں ڈوب جاتی ——— مردوں کا کیا ہے۔ آج ایک عورت کی موت ہوئی۔ کل دوسری آ جائے گی، شاید پہلی سے اچھی ہی، لیکن بچوں کو تو ان کی ماں کبھی نہیں ملتی ——— یہی بات وہ مجھ سے کہا کرتی تھی اور شاید اُس کے اِس قول میں سچائی بھی تھی ——— بیہوش، اپنی بچی کی تصویر اپنے سینے سے لگائے، وہ اپنے بستر پر پڑی تھی اور میں من ہی میں پرماتما کا شکر ادا کر رہی تھی کہ اس نے میرے بچے کو بے ماں کا ہونے سے بچا دیا۔ اپنی موت کے بعد اس کی بے بسی کے تصور ہی سے میرا دل کانپ جاتا تھا۔ اس وقت چاہتی تھی کہ بملا کو ہوش آ جائے تو اس سے دو باتیں کر کے اُسے تسلی دے کر اس سے رخصت لے لوں۔ مگر اسے ہوش نہ آیا اور ادھر وہ مجھے لینے آ پہنچے۔

گرمیاں ابھی پوری طرح شروع نہیں ہوئی تھیں، لیکن درختوں کے سائے پیارے لگنے لگے تھے۔ میٹھی مست ہوا چل رہی تھی۔ ہسپتال سے باہر آ کر اپنے چاروں طرف میں نے نظر ڈالی۔ سب کچھ نیا نیا سا لگ رہا تھا اور میں محسوس کرتی تھی جیسے کسی دوسری دنیا سے لوٹ آئی ہوں۔

لاہور چھوڑنے سے پہلے ہم ان کے دوست کے ہاں بھی گئے ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ لئے ان کی بیوی نے میرا سواگت کیا۔ اصرار کرنے لگیں کہ دو چار دن لاہور ٹھہر کر جاؤ۔ اتنی چیزیں یہاں دیکھنے کی ہیں۔ انہوں نے بھی کہا ——— جب اتفاق سے آئی ہو تو دو ایک دن ٹھہر کر کچھ دیکھ دکھا لو، پھر کب کب آنا ہوتا ہے! لیکن میں نہ مانی۔ کوئی دوسرا موقعہ ہوتا تو میں دو چار دن کیا ایک دو ہفتے انہیں لاہور ٹھہرنے کے لئے مجبور کر دیتی۔ لیکن میں تو اُڑ کر گھر پہنچ جانا چاہتی تھی۔ اُن کے دوست اور ان کی شریمتی جی کے بہت کہنے پر ہم نے کھانا وہیں کھایا جو بڑے پریم سے انہوں نے تیار کیا تھا۔ لیکن مجھے کچھ زیادہ لطف نہ آیا جلد جلد فارغ ہو کر چلنے کو تیار ہو گئی۔ گھر کی مالکن سے گلے ملی اور پھر آنے کا، اور انہیں کافی دن تک تنگ کرنے کا وعدہ کر کے چل پڑی۔

انار کلی کے سرے پر بساطیوں کی دُکانیں دیکھ کر مجھے ننھے کے لئے کھلونے لینے کا خیال آیا۔

انہوں نے کہا ——— گاڑی سے رہ جاؤ گی، وہاں کھلونے کیا کم ملتے ہیں! لیکن جتنی دیر میں وہ تانگہ کرتے میں نے کھلونے خرید لئے۔

میرے پاس آ کر وہ ہنسے ساری دُکان ہی جھولی میں ڈال لو گی کیا؟ چلو تانگہ آ گیا ہے! ——— اور پیسے دُکاندار کو دے کر میں اسی طرح جھولی میں کھلونے لئے تانگے میں جا بیٹھی۔ سٹیشن پر پہنچے تو گاڑی تیار ہی تھی۔ ٹکٹ لے کر بھاگے۔ بیٹھے ہی تھے کہ گاڑی چل دی۔

کئی دفعہ جذبات کی شدت کے باعث باتیں کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ گاڑی چلی جا رہی تھی اور ہم دونوں چپ بیٹھے تھے۔ ان کے متعلق میں کچھ نہیں کہہ سکتی لیکن میں بہت کچھ سوچ رہی تھی۔ بچے کی قدر ہسپتال ہی میں جا کر مجھے معلوم ہوئی تھی اور اس کی دیکھ بھال، تعلیم و تربیت کے سلسلہ میں دل ہی دل میں میں بیسیوں سکیمیں بنا رہی تھی۔ سوچتے سوچتے گاڑی کے ہچکولوں سے مجھ پر کچھ غنودگی سی طاری ہونے لگی۔ کھانا بھی کھایا ہوا تھا اور پھر شروع گرمیوں کی دوپہر کچھ دیر میں وہیں کونے سے سر لگائے سو گئی۔ جب انہوں نے جگایا تو ہم اپنے شہر کے قریب پہنچ چکے تھے۔ گاڑی بل کھا رہی تھی۔ آنکھیں مل کر اور انگڑائی لے کر میں نے دیکھا ——— سٹیشن دکھائی دے رہا تھا۔ اب ایک دیوار ہماری گاڑی کے ساتھ ساتھ چلنی شروع ہو گئی۔ اَن گنت لائنیں شنٹ کرتے ہوئے انجن اور ڈبے۔ آخر گاڑی پلیٹ فارم پر رُک گئی۔

خوش خوش میں اُتری۔ گھر پہنچی تو ساس نے نیچے آ کر سواگت کیا۔ مجھے گلے سے لگایا اور ایک لمبی سانس لی۔ میں نے دیکھا اُن کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

میں نے پوچھا — ننّھا سو رہا ہے کیا؟

شاید انہوں نے میری بات نہیں سُنی۔ ان کے ہاتھ سے سامان لے کر وہ اُوپر جانے لگیں۔ جاتے جاتے گھوم کر انہوں نے اُن سے کہا۔ بہو کو نیچے بیٹھک میں بٹھاؤ اوپر ذرا لوکر جھاڑو دے رہا ہے۔

بیٹھک میں جا کر میں کوچ پر بیٹھ گئی۔ وہ کمرے میں ٹہلنے لگے لیکن مجھ سے زیادہ دیر بیٹھا نہ گیا۔ میں نے اٹھتے ہوئے کہا — میں ذرا ننّھے کو دیکھ آؤں۔

وہ رُکے۔ میں نے دیکھا۔ ان کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا ہے۔ ایک نامعلوم سے شبہ سے میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ بھاگ کر انہیں دونوں کندھوں سے پکڑ کر میں نے پوچھا — ننّھا کہاں ہے۔؟

انہوں نے انگیٹھی کی طرف اشارہ کیا۔ دیوار کے سہارے ایک بڑے چوکھٹے میں جڑی ہوئی ننّھے کی تصویر رکھی تھی — اسی کا بڑا سائز جو مجھے ہسپتال میں دے آئے تھے۔

— ننّھے کا اب یہی کچھ رہ گیا ہے شیل ....

اس سے آگے وہ کچھ نہ کہہ سکے۔ رومال سے چہرے کو ڈھانپ کر وہ جلد جلد دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

اوپندر ناتھ اشک

مشاغلِ نو

ڈھلتے ہیں غم یہ عالمِ امکاں نئے نئے
وحشت بنا رہی ہے بیاباں نئے نئے

اذنِ بہارِ تازہ ہے وحشت کا ارتعاش
موسم یہ ہیں نثارِ گریباں نئے نئے

کل شب کے واقعات ہوئے رُوداد دوش
امشب ہیں کاروبارِ درخشاں نئے نئے

شیشے نئے نئے ہیں شرابیں نئی نئی
شمعیں نئی نئی ہیں شبستاں نئے نئے

حشر آفریں ہے گرمیٔ رازونیازِ نو
شوق آزما ہیں وعدہ و پیماں نئے نئے

نوواردانِ بزم کی تعظیم کے لئے
گلپوش ہیں دریچہ و ایواں نئے نئے

نادیدہ رنگ میں ہیں ملے ناچشیدہ کیف
لرزاں ہیں کیف و رنگ کے طوفاں نئے نئے

ہیں صبح و شامِ محفلِ ہستی کے ہم رکاب
روئے حسین و گیسوئے پیچاں نئے نئے

کرتا ہے آشکار بہ پیرایۂ جدید
فکرِ عدمؔ مطالبِ رخشاں نئے نئے

عدمؔ

رخصت

مجھے خبر ہے ترا حُسن سوگوار ہے آج
اسی سے جذبِ محبت دلوں میں زندہ ہے

مجھے خبر ہے ترا قلب شعلہ زار ہے آج
اسی سے شعلۂ حسرت دلوں میں زندہ ہے

مجھے خبر ہے تری روح بے قرار ہے آج
اسی سے آتشِ الفت دلوں میں زندہ ہے

مجھے خبر ہے کہ سینہ ہے چاک چاک ترا
اسی سے قافلۂ شوق و جستجو ہے رواں

شہیدِ ہجر ہے یہ حسنِ تابناک ترا
اسی سے سینۂ عاشق میں آرزو ہے جواں

ترے لبوں پہ تبسّم کا آہ! رقص نہیں
خدا کے واسطے اس رنجِ بے پناہ کو تھام

لطیف و نرم تکلّم کا آہ! رقص نہیں
خدا کے واسطے حسرت بھری نگاہ کو تھام

سرور و کیفِ ترنّم کا آہ! رقص نہیں
خدا کے واسطے طوفانِ اشک و آہ کو تھام

ترے جمال میں تابانیاں نہیں باقی
مرے وداع کے منظر کو سوگوار نہ کر

تری نگاہ میں طغیانیاں نہیں باقی
مرے قرارِ شکستہ کو تار تار نہ کر

مگر یہ ہجر، یہ دلدوز، روح فرسا ہجر
وہ روزِ وصل و مسرّت بھی ہاں نہیں کچھ دور

یہ اشک ریز، یہ بیتاب و ناشکیبا ہجر
کہ جب میں بندۂ بے دامِ فطرتِ مجبور

یہ بے قرار، یہ راحت سے ناشناسا ہجر
نیازِ عشق کو لے کر بہ سینۂ مہجور

نہ ہو تو عشق میں پھر لذتِ وصال کہاں
حریمِ ناز میں بہرِ سجود آؤں گا،

نہ ہو تو عشق میں پھر عشرتِ خیال کہاں
تری جبین کو بوسوں سے آبساؤں گا

شہید ابنِ علی (مرحوم)

فریب

زندگی کا دریا تیزی کے ساتھ بہہ رہا تھا۔

شاندار اور برق رفتار موٹریں اپنے آغوش میں گوری رنگت، عریاں بانہوں، بلوری گردنوں اور دراز زلفوں والی مخلوق کو لئے ہوا کے جھونکوں کی طرح گزر رہی تھیں۔ انیسویں صدی کی یاد دلانے والی بگیاں تھیں جن میں نسبتاً پرانی معاشرت کے لوگ سکون و اطمینان کے ساتھ بیٹھے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ تانگوں کی بے اندازہ کثرت تھی اور ان میں یکوں کی بھی کمی نہ تھی جن میں مریل گھوڑے جتے ہوتے ہیں اور جن پر سوار ہونے والا اپنے آپ کو فضا میں جھولتا ہوا محسوس کرتا ہے۔ کبھی کبھی بیل گاڑی بھی نظر آ جاتی تھی، وہ بیل گاڑی جو ہندوستان کی میراث ہے اور دو ڈھائی ہزار سال قبل کی زندگی کو آج بھی تازہ کئے ہوئے ہے۔ سائکلیں بھیڑ کو چیرتی ہوئی تیزی کے ساتھ نکل جاتی تھیں۔ ان مختلف سواریوں کے علاوہ اناج کے چھکڑے اور لکڑی لوہے کے وزنی سامان سے لدے ہوئے ٹھیلے تھے، جن میں جانوروں کی بجائے انسان جتے ہوئے تھے ـــــ حشرات الارض کی طرح، لاتعداد لوگ یہاں ہر قسم کے لوگ شامل تھے۔ گورے بھی اور کالے بھی۔ خوبصورت اور بدصورت بھی۔ جسیم و شحیم بھی اور دبلے پتلے بھی۔ بڑی بڑی توندوں والے ساہوکار بھی اور پچکے ہوئے گالوں والے زرد رُو مفلس بھی۔ وہ بھی جو داڑھی مونچھ منڈا کر مغربی لباس پہنتے ہیں اور وہ بھی جو خضاب آلود داڑھی کے ساتھ پھنسی ہوئی چست وار آستینوں والا انگرکھا زیب تن فرماتے ہیں۔ غرضکہ ہر وضع اور ہر قماش کا انسان یہاں موجود تھا۔ ہر شخص اپنی دھن میں مست، اپنے خیالات کی ایک الگ دنیا بسائے ہوئے چلا جا رہا تھا۔ کسی کو کسی سے سروکار نہ تھا۔

میں بجلی کے کھمبے کا سہارا لئے کھڑا تھا اور اس منظر کو اس طرح دیکھ رہا تھا جس طرح ایک شخص ساحل پر کھڑے ہو کر بہتے ہوئے دریا کی تیز خرام موجوں کو دیکھتا ہے۔

لیکن زندگی کے اس بہتے ہوئے دریا کی تہ میں کنکر اور روڑے بھی تھے جو اس کے بہاؤ میں رکاوٹ پیدا کرتے تھے۔ بہت سے مزدور خالی ٹوکریاں سروں پر اوندھائے ہوئے مزدوری کی تلاش میں ادھر سے اُدھر پھر رہے تھے۔ انہیں کہیں جانا نہ تھا۔ ان کے سامنے کوئی منزلِ مقصود نہ تھی۔ اس لئے وہ چل پھر کے بھی ایک محدود دائرے میں رہتے اور جب تھک جاتے یا بے مقصد آوارگی سے اکتا جاتے تو سڑک کے کنارے پٹڑی پر بیٹھ جاتے۔ ان کی آنکھوں میں اُمید کا جلوہ نہ تھا ان کے چہروں پر زندگی کی رونق نہ تھی۔ کچھ بھکاری تھے جو راہگیروں کے آگے ہاتھ پھیلاتے اور ان کی رفتار کی روانی میں مخل ہوتے مگر راہگیر ان کو اس طرح دیکھتے ہوئے گزر جاتے جس طرح گائے بیلوں کو دیکھتے ہوئے گزر جاتے ہیں۔ ایک کوڑھی سڑک کے کنارے بیٹھا تھا، اپنی کثیف چادر کا کچھ حصہ سامنے زمین پر بچھائے ہوئے اور باقی اپنے چہرے پر ڈالے ہوئے اُس کا چہرہ ایک سڑا ہوا متعفن زخم تھا جس پر بے شمار مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ چند قدم آگے ایک بوڑھا فقیر میلی سی زرد ٹوپی سر پر رکھے اپنے بازوؤں کی مدد سے زمین پر گھسٹ رہا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ مفلوج تھی اور دوسری سرے سے غائب۔ سڑک کے اُس پار ایک نوجوان بھکارن چیخ چیخ کر اور ہاتھ بڑھا بڑھا کر لوگوں سے پیسے مانگ رہی تھی۔ تین ننگے دھڑنگے بچے اس کے ارد گرد جمع تھے اور چوتھا اس کی سوکھی ہوئی چھاتیوں سے چمٹا ہوا تھا۔ قریب ہی ایک کتیا جس کا پیٹ غالباً نصف درجن بچوں سے بھاری ہو رہا تھا ایک کوڑے کے ڈھیر کو پنجوں سے کرید کر سونگھ رہی تھی۔

سامنے چوراہے پر سینما ہاؤس زمانے بھر کی رنگینیوں اور دلچسپیوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ بڑے بڑے سائز کی اشتہاری تصاویر جن سے آئندہ دکھائے جانے والے تماشوں کا اعلان مقصود تھا عمارت کے بلند حصوں پر آویزاں تھیں۔ بیچوں بیچ میں جو تصویر تھی وہ سب سے بڑی تھی۔ اُس میں ایک نوجوان مرد اور نوجوان عورت شانے سے شانہ اور گال سے گال ملائے بیٹھے تھے۔ اندر ریکارڈ بج رہے تھے۔ ہندوستان کے بہترین پیشہ ور گانے والوں کی موسیقی سے شام کی فضا گونج رہی تھی۔ بازار کے شور و شغب کا اپنا منظر

کتنا دلفریب تھا!

سینما ہاؤس کے ٹکٹ گھر پر تماشائیوں کا غیر معمولی ہجوم تھا۔ خلقت ٹوٹی پڑتی تھی ایک کو ایک دھکیل رہا تھا۔ ایک پر ایک سوار ہوا جاتا تھا۔ ہر شخص اپنی چوّنی مٹھی میں دبائے ہجوم کو چیر کر آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس قربان گاہ پر ہر پجاری کی یہ تمنا تھی کہ اُس کا نذرانہ سب سے پہلے قبول ہو۔ انسانوں کے اس انبوہِ کثیر میں بڑی تعداد شہر کے مزدور پیشہ لوگوں کی تھی۔

میں ٹکٹ گھر کا دلچسپ منظر دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ آخر اس تماشے میں ایسی کون سی لذّت ہے جو ایک شخص کو اپنی دن بھر کی کمائی کا نصف حصّہ اس بے دردی کے ساتھ لُٹا دینے پر مجبور کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ لوگ محض گانا سننے کی غرض سے وہاں نہیں جاتے، کیونکہ گانا تو سڑک پر کھڑے ہو کر بھی سن سکتے ہیں۔ ان کا مقصد یہ بھی نہیں کہ حسن نسوانی کا نظارہ کریں اور اُس سے لطف اندوز ہوں، اس لئے کہ یہ مقصد بھی سڑکوں پر اور بازاروں میں نہایت آسانی کے ساتھ پورا کیا جاسکتا ہے اور پھر بے جان تصویروں کا حسن تو ایک بے معنی چیز ہے۔ اُس سے حسن پرستی کے جذبات کیوں کر تسکین پا سکتے ہیں! یقیناً یہ لوگ نسوانی حسن کی جستجو میں سینما نہیں جاتے۔ اگر نسوانی حسن کی جستجو ان کا مطمح نظر ہوتا تو یہ طوائفوں اور کسبیوں کے کوٹھوں پر جاتے اور ادھر کا رُخ بھی نہ کرتے تو آخر یہ لوگ سینما کیوں جاتے ہیں؟ کیا مقصد ہے ان کا وہاں جانے سے!

کچھ دیر سوچنے کے بعد میری سمجھ میں آیا کہ سینما جانے اور تماشا دیکھنے کا وہی مقصد ہوتا ہے جو ناول پڑھنے کا یا شعر و شاعری کے مطالعے کا۔ ایک شخص فلمی تماشا اس لئے دیکھتا ہے کہ وہ زندگی سے واقفیت حاصل کرے۔ زندگی کے مختلف مناظر کے ساتھ ایک قلبی تعلق قائم کرے، اور اس طرح اپنے تجربے کو وسیع کرے۔ فلمی تماشا اصل میں ہے کیا؟ زندگی ہے جو پردۂ سیمیں پر مرکوز کر دی گئی ہے۔ اس کا دیکھنے والا کوئی پست اور عامیانہ مقصد پورا نہیں کرتا بلکہ اپنے اُن جذبات کے لئے آسودگی ڈھونڈتا ہے جو مہذب انسان کا طرۂ امتیاز ہیں۔ یہ لوگ ـــــ یہ چھ آنے اور آٹھ آنے روز کی مزدوری کرنے والے انسان ـــــ بے شک غریب ہیں۔ اور ان کا سینما کے لئے چار آنے خرچ کر دینا یقیناً ایک مسرفانہ فعل ہے۔ تاہم یہ انسان ہیں اور دوسرے انسانوں کی طرح جذبات رکھتے ہیں، وہ جذبات جن کی تسکین زندگی کو خوشگوار بنانے کے لئے لازمی ہے۔ میں ذرا دیر پہلے ان لوگوں کو حقارت کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ مگر اب میرا انداز نظر زیادہ روادارانہ تھا۔ اور میں ایک خفیف مبہم سا شوق اپنے دل میں لئے سامنے کی اشتہاری تصویروں کو دیکھنے لگا۔

کسی نے پیچھے سے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ "کہو دوست! کیا کر رہے ہو؟" یہ میرا اپنا ساتھی رام سنگھ تھا جو پنجاب کے ایک سکھ گھرانے کا فرزند تھا۔ چند ماہ پیشتر دو سو ستّر روپے گھر سے لے کر بھاگا۔ کچھ دنوں دہلی میں رہا۔ پھر لکھنؤ آیا، اور اب کان پور میں ہمارے ساتھ مزدوری کر رہا تھا۔

میں نے کہا "بڑی حسرت سے اُن کی طرف دیکھ رہے ہو؟" وہ سامنے کی سب سے بڑی اشتہاری تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا اور پھر میں جواب میں مسکرا دیا۔ اُس نے میرا ہاتھ پکڑا اور آگے بڑھ گیا۔

ٹکٹ گھر پر اب بھیڑ نہ تھی۔ رام سنگھ نے دو ٹکٹ خریدے اور ہم دونوں تماشا گاہ میں داخل ہوئے۔ وہاں کی آرائش اور نفاست کا کیا کہنا! شیشے کی طرح چمکتا ہوا فرش، خوب صورت چھت، رنگین بام و در، قد آدم آئینے، حسین ایکٹرسوں کے فوٹو۔ ایسا معلوم ہوا میں کوئی دلآویز خواب دیکھ رہا ہوں۔ یہاں کی سیر سے فارغ ہو کر ہم ایک دوسرے دروازے سے ہال میں داخل ہوئے۔ ہال نہائت وسیع تھا اور تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ لوگ اطمینان کے ساتھ تمباکو کا دھواں اڑا رہے تھے یا پان چبا رہے تھے۔ یہاں کی فضا باہر کی فضا سے کتنی مختلف تھی! ہر طرف فرصت، فراغت، اور فارغ البالی کا دور دورہ تھا۔

یکایک روشنیاں گُل ہو گئیں اور کھیل شروع ہوا۔

یہ ایک نوجوان ـــــ سروج کمار سین ـــــ کی داستانِ الم تھی۔ سروج ایک آتش نوا مغنّی اور سحر نگار مصوّر تھا۔ وہ دنیا اور دنیا والوں سے متنفّر تھا اور اپنا سارا وقت اپنے تصویر خانے میں گزارتا تھا۔ یہاں وہ تصویریں بنایا کرتا، اپنے خیالات کو رنگین نقوش کی صورت میں صفحۂ قرطاس پر جلوہ گر کرتا اور جب اس شغل سے طبیعت اکتاتی تو ستار اٹھا لیتا اور نغمہ سرائی سے اپنا جی بہلاتا۔ اُسے اپنی بیوی آشا سے دیوانہ وار محبت تھی۔ وہ نو عمر تھی تعلیم یافتہ تھی اور غیر معمولی حسن کی مالک تھی۔ مگر آشا کو فن سے کوئی لگاؤ نہ تھا، اور اسی لئے سروج کی دلچسپیاں اس کی دلچسپیاں نہ تھیں۔ وہ اپنا بیشتر وقت گھر سے باہر اُن نوجوانوں کے ساتھ گزارتی جو سروج کی طرح عزلت پسند نہ تھے۔ بلکہ دنیا اور زندگی کا لطف اُٹھانا جانتے تھے

یہی سروج کی زندگی کی سب سے بڑی ٹریجڈی تھی۔ اسی سے اس کی موسیقی میں سوز تھا اور اسی سے نقاشی کے نادر نمونے وجود میں آتے تھے۔

کہانی آگے بڑھ رہی تھی۔ مناظر یکے بعد دیگرے سرعت کے ساتھ آنکھوں کے سامنے آرہے تھے۔ سروج کا تصویر خانہ تو اکثر پیش نظر رہتا۔ کیا بات تھی اس کی آرائش کی! وہ مصوری کے شاہکار، فن بت گری کے حیرت انگیز کارنامے، وہ مختلف آلاتِ موسیقی، وہ نرالی وضع کا حسین و جمیل فرنیچر ——— کیوں نہ ہو ایک حسن پرست آرٹسٹ کا کمرہ تھا۔ آشا کی خواب گاہ بھی کچھ کم آراستہ نہ تھی۔ اُس کا حسن سروج کے تصویر خانے کے حسن سے کچھ زیادہ ہی تھا اور آشا کے ملبوسات! ارے توبہ! کون کہہ سکتا تھا کہ اُس کی ساڑیاں دنیا کی بہترین صنعت کے بہترین نمونے نہیں ہیں اور پھر وہ موٹر جس میں بیٹھ کر آشا اپنے دوستوں سے ملنے جایا کرتی تھی! ارے رے رے! ایسی شاندار موٹر تو میں نے زندگی بھر میں نہیں دیکھی۔ آشا کے زندہ دل دوست بھی آشا اور اُس کے شوہر سے حیثیت میں کم نہ تھے۔ کیسی کیسی کوٹھیوں میں رہتے تھے وہ! ہمیں تو خواب میں بھی ایسی کوٹھیاں دیکھنے کو نہیں ملتیں۔

میں ان مناظر کے مطالعے سے بقدر استعداد مستفید ہوتا رہا۔

لیکن ایک مسئلہ مجھے برابر پریشان کئے ہوئے تھا۔ میری سمجھ میں یہ نہ آیا کہ یہ لوگ ——— سروج، آشا اور آشا کے مختلف دوست ——— اسی دنیا کے باشندے ہیں یا کسی دوسری دنیا سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا سارا وقت تو گیت گانے، تصویریں بنانے اور عشق و عاشقی کرنے میں صرف ہوتا ہے، پھر یہ اپنا روزگار کس وقت کرتے ہیں؟ آخر ان کا ذریعۂ معاش کیا ہے؟ یہ بے اندازہ دولت جو ان کی بے اندازہ ضروریات کو پورا کرتی ہے آ رآتی کہاں سے ہے؟ کہانی میرے ان سوالوں کا جواب دینے سے قطعی قاصر تھی۔

اتنے میں ایک نیا منظر پردۂ سیمیں پر ظاہر ہوا۔ آشا اپنے شوہر کو چھوڑ کر ایک دوست کے گھر چلی گئی ہے۔ صبح کا وقت ہے۔ آشا بیدار ہوتی ہے۔ وہ اپنے نرم و گداز بستر میں لیٹی ہوئی ایسی معلوم ہوتی ہے جیسے ایک ناشگفتہ کلی نازک اور شاداب پتیوں کے آغوش میں! وہ ہتھیلیوں سے اپنی آنکھیں ملتی ہے اور لیٹے لیٹے کمرے کے ساز و سامان پر ایک نظر ڈالتی ہے۔ اُس کے ارد گرد کی فضا انتہائی تکلف آمیز اور عیاشانہ ہے۔ پھر وہ انگڑائی لے کر اُٹھ بیٹھتی ہے اور اپنے سرہانے کی طرف ہاتھ بڑھا کر کوئی پیچ سا گھماتی ہے جس سے کھڑکی کے پردے سمٹ جاتے ہیں اور طلوع ہوتے ہوئے سورج کی کرنیں کھڑکی کے شیشوں میں سے گذر کر اندر داخل ہوتی ہیں۔ اُس کی مسہری کے پاس ایک ریڈیو رکھا ہے۔ زمین سے تقریباً ڈیڑھ گز بلند! وہ اُس کی کوئی کل دباتی ہے۔ کمرہ لطیف اور شیریں موسیقی سے لبریز ہو جاتا ہے۔ اُس کا دوست مسکراتا ہوا کمرے میں آتا ہے، اور اُس کے پاس شانے سے شانہ ملا کر بیٹھ جاتا ہے۔ تھوڑی دیر میں ریڈیو کی موسیقی بند ہو جاتی ہے اور دو محبت کرنے والوں کا گیت شروع ہو جاتا ہے۔

میں یہ سب کچھ دیکھ کر جھلا گیا۔ آخر کیا مذاق ہے یہ! کیا اسی کا نام زندگی ہے؟ کیا یہی وہ زندگی ہے جو پردۂ سیمیں پر مرکوز ہو گئی ہے اور جس کے مطالعے سے لوگ اپنے تجربے کو وسعت دیتے ہیں! نہیں یہ ہرگز زندگی نہیں ہے۔ یہ ایک صریحی فریب ہے، کھلا ہوا دھوکا ہے، مکارانہ جھوٹ ہے!

اس وقت میرے جی میں آئی کہ جس جگہ بیٹھا ہوں اُسی جگہ کھڑا ہو جاؤں، اور ان تماشائیوں سے پکار پکار کر کہوں، "تم بے وقوف ہو، نامعقول ہو۔ تمہاری عقل پر پتھر پڑ گئے ہیں۔ تم جسے زندگی سمجھ رہے ہو وہ زندگی کی پرچھائیں بھی نہیں ہے۔ وہ ایک فریب ہے جس میں تمہارا مبتلا ہونا تمہاری موت ہے۔ اگر تم زندگی کو دیکھنا چاہتے ہو تو باہر جاؤ ——— اس تماشاگاہ کی اونچی اونچی دیواروں سے باہر ——— وہاں تم زندگی کو دیکھو گے اور زندگی کے ڈرامے کو بھی! نامعقول کہیں کے! بے وقوف! ———

آخری لفظ میری زبان سے ذرا بلند آواز میں نکل گیا۔

"ٹھیک تو کہتا ہے، اس میں بے وقوفی کی کیا بات ہے!" رام سنگھ بولا۔ وہ پردے پر آشا اور اس کے دوست کی گفتگو نہایت غور سے سن رہا تھا۔

"میں جاتا ہوں رام سنگھ!" میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

"کہاں؟" اُس نے پردۂ تصویر سے اپنی نظریں ہٹائے بغیر پوچھا۔

"باہر"

وہ ہائیں ہائیں کرتا رہ گیا اور میں کودتا پھاندتا ہال سے باہر نکل گیا۔

دروازے پر سیڑھیوں کے پاس ایک نوجوان بھکارن تین چار برہنہ بچوں کو لئے کھڑی تھی اور ذرا آگے، سامنے سڑک پر زندگی کا دریا تیزی کے ساتھ بہ رہا تھا!!

اختر انصاری

اظہارِ تمنّا

تری یاد ہی میں مجھ کو ہے قرارِ زندگانی — تری مہربانیوں میں ہے بہارِ جاودانی

تری پیاری پیاری باتیں مری زندگی کی رونق — تری بھولی بھولی صورت مجھے عیشِ نوجوانی

تری دید ہی سے مجھ کو ہے سکونِ دل میسر — تری دل نوازیاں ہیں مری وجہِ کامرانی

مرے سازِ دل کا نغمہ ترے حُسن کا فسانہ — تری بے نیازیاں ہیں مرے عشق کی کہانی

تری دوریوں سے پیاری مجھے چین ہو تو کیسے — نہ کہیں تباہ کردے مجھے تیری سرگرانی

مرے عزم کی بلندی تجھے ڈھونڈتی ہے لیکن — تری بزمِ ناز شاید ہے فضائے لامکانی

مرا جذبۂ اسیری مجھے ڈال دے قفس میں — تجھے دیکھنے سے پاؤں میں بہارِ زندگانی

یہ میں کس طرح بتاؤں تجھے چاہتا ہوں دل سے — ترے دل میں آ نہ جائے کہیں نازِ حُسنِ فانی

ترا لطفِ بے محابا مرے دل پہ ہے قیامت — کہیں جاں بلب نہ کردے مجھے تیری مہربانی

تری کیف بار آنکھیں مجھے مست ہی نہ کردیں — مجھے دے ذرا سنبھل کر یہ شرابِ ارغوانی

مرے پاس آ مگر یُوں کہ نہ عقل و ہوش کھو دوں — مجھے دیکھ پر نہ ایسے کہ ہو وجہ بدگمانی

مرے درد کا فسانہ ہے زبان زدِ زمانہ — کبھی کاش آ کے سُن لے اِسے تو مری زبانی

مجھے دل سے گر بھلا دے تو یہ ہے تری عنایت
جو مجھے قبول کرلے تو ہے تیری مہربانی

نذیر احمد خاں مرغوب

اُردو میں بچّوں کی شاعری

بچے کیا ہیں؟ اور ان کی تربیت کہاں تک ضروری ہے۔ ادبیات کو تربیت میں کہاں تک دخل ہے اور بچوں کے لئے ادب اور شاعری کی ضرورت ہے یا نہیں! یہ ایسے سوال ہیں جن کے جواب بالکل صاف اور عیاں ہیں اور غالباً ہر شخص کو اس سے اتفاق ہوگا کہ انگریزی کے مشہور شاعر ورڈسورتھ کا قول "بچہ آدمی کا باپ ہے"۔ اس معنی میں بالکل صحیح ہے کہ یہی بچے آیندہ چل کر ہماری قوم کے افراد بنیں گے اور آیندہ نسلوں کے باپ ہوں گے۔ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ اس مشہور عالم شاعر نے اپنے خیال کی تکمیل ملٹن کے اس نظریے سے کی ہے کہ "جس طرح صبح سے دن کا پتہ چلتا ہے اسی طرح بچپن سے آدمی کا پتہ چلتا ہے"۔ مگر اتنی بات ضرور ہے کہ یہ خیال بھی ہمارے اس خیال کی تائید کرتا ہے۔ کہ کسی قوم کی آیندہ حالت کا دار و مدار اس کے بچوں ہی پر ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ بچوں کی اہمیت پر اب ہمیں خاص براہین اور دلائل پیش کرنے کی ضرورت نہیں اور ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ اور تجربہ ہی اس کا کافی ثبوت ہے۔

جب ہمیں یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی کہ ہماری قوم کی ترقی اور تنزل۔ ہماری راحت اور تکلیف، نیک نامی اور بدنامی انہیں بچوں کی نیکی اور بدی پر منحصر ہے تو پھر ہم کیوں نہ ان کو اچھے سے اچھا بنانے کی کوشش کریں۔ اس بیان سے بچوں کی تربیت کی ضرورت عیاں ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ تربیت کا اثر بچوں پر ہوتا ہے یا نہیں! اگرچہ مذہبی نقطۂ خیال سے اس میں اختلاف ہے، مگر ہم ان خیالات کو پیش کریں گے جن سے یہ بات بخوبی واضح ہو جائے گی کہ گھریلو تربیت کا اثر انسانی اخلاق پر بہت کچھ ہوتا ہے۔

پیغمبر اسلام فرماتے ہیں کہ ہر بچہ اپنی فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ پس اس کے والدین اس کو یہودی بنا دیتے ہیں یا نصرانی یا مجوسی بنا دیتے ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ بچوں پر تربیت اور سوسائٹی کا گہرا اثر پڑتا ہے۔ سعدیؔ کا شعر ہے ؎

چوب تر را چناں کہ خواہی پیچ — نہ شود خشک جز بآتش راست

انہوں نے بچوں کی تربیت کے بارے میں اپنی کتاب گلستان میں اسی بات پر خاص زور دیا ہے کہ بچے کچی لکڑی کے مثل ہیں ان کو ابھی جس طرف چاہو جھکا دو ورنہ خشک ہونے پر یعنی بڑے ہو جانے پر ان کا کسی طرف مڑنا سخت دشوار ہے۔

ماہر اخلاقیات ولیم۔ ٹی۔ ہیریس اپنی کتاب انٹرنیشنل ایجوکیشن سیریز میں لکھتے ہیں:۔

"بچوں کے دل بہت نازک ہوتے ہیں ان کو آسانی سے جس طرف چاہیں موڑ سکتے ہیں اور ان پر ایسے نقوش ثبت کئے جا سکتے ہیں جو مدۃ العمر قائم رہتے ہیں"۔

ان بیانات سے صاف عیاں ہے کہ بچوں پر تربیت کا گہرا اثر پڑتا ہے اور یہ بھی طے شدہ امر ہے کہ بچوں کی تربیت بہت جلد شروع ہو جاتی ہے اور ان کے احساسات کا تدریجی ارتقا بہت جلد ہونے لگتا ہے۔ اگرچہ اس کے متعلق ماہرین اخلاقیات میں اختلاف ہے کہ بچوں میں قوت ممیزہ کب سے پیدا ہوتی ہے اور وہ کب سے اشیا کا ادراک کرنے لگتے ہیں۔ ہمارے یہاں عام طور پر یہ بات مشہور ہے کہ چھٹی کا بچہ ماں کو اور چلّے کا بچہ باپ کو پہچانتا ہے یعنی چھ دن کے بعد بچے میں قوت ممیزہ پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ دوسری عورتوں میں سے اپنی ماں کو پہچان لیتا ہے اور ایک چلّے کے بعد دوسرے مردوں سے اپنے باپ کو پہچان لیتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس قول میں کچھ مبالغہ ہو پھر بھی ہمیں یہ کہنے میں پس و پیش نہیں کہ بچے کی تربیت گاہ اس کا گہوارہ ہے۔ علامہ نذیر احمد نے محصنات میں بچوں کی تربیت پر زور دیتے ہوئے لکھا ہے:۔

جس وقت سے بچہ پیدا ہوتا ہے وہ اخذ کرنا جانتا ہے ان لوگوں کی خوبو، جو اس کو پالتے، اٹھاتے بٹھاتے، اس کو سلاتے اس کو کھلاتے پلاتے ہیں۔ ظاہر میں معلوم ہوتا ہے کہ بچے ایک مضغۂ گوشت کی طرح پڑے ہیں۔ نادان اور لایعقل بنے ہیں نہیں۔ وہ اپنے سارے حواس سے، ظاہری ہوں یا باطنی، بڑی کوشش کے ساتھ کام لے رہے ہیں۔ چیزوں کو ٹٹولتے، آوازوں کو سنتے اور جو دیکھتے سنتے ہیں۔ اس کو حافظہ میں رکھتے جاتے ہیں . . . .“

ہیریسن صاحب کا خیال ہے کہ بچے کی اخلاقی تعلیم اس کے پالنے سے شروع کی جاسکتی ہے۔ اس کے بعد آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:۔

”ایک بہت چھوٹے بچے کو جو ڈیڑھ سال سے بھی چھوٹا ہو والدین کی مرضی کے تابع رہنا سکھایا جاسکتا ہے۔“

صاف ظاہر ہے کہ اس عمر میں بچے بولنا نہیں جانتے وہ صرف اپنے دوسرے حواس سے کام لیتے ہیں۔ ان کی قوت سامعہ کام کرتی ہے۔ ذہن بھی کام کرتا ہے۔ وہ اپنے والدین سے اور خاص کر ماں سے، اپنی دائی سے، دودھ پلائی سے، کھلائی سے جو کچھ سنتے ہیں اس کو اپنے ذہن میں رکھتے جاتے ہیں اور یہی ہماری قومی عمارت کا سنگ بنیاد ہے۔ تھوڑا غور کرنے سے معلوم ہو جائے گا کہ یہ چیزیں جو ہمارے بچوں کے ذہن نشین ہو رہی ہیں لوریاں ہیں۔

لوریوں کی اہمیت اور ان کی ضرورت کے متعلق ہم کچھ کہنا نہیں چاہتے۔ اوپر کے بیانات کے علاوہ یہ ایسی چیز ہے جس کی ضرورت اور اہمیت کو ہر بچے والا محسوس کرتا ہے۔ لوریوں کا رواج بہت قدیم اور بہت عام معلوم ہوتا ہے۔ ہر ملک میں لوریوں کا رواج ہے۔ ایران، عرب، ترکستان، انگلستان، جاپان، چین، جرمنی، یونان وغیرہ وغیرہ غرضکہ ہر ملک کی مائیں لوریوں کی دلدادہ ہیں اور تھوڑے بہت تفاوت سے لوریوں کا رواج ہر جگہ اور بہت قدیم سے ہے۔ لوریوں میں زیادہ تر بچے کے لئے نیند آنے کی تمنا، ماں کی بچے سے وابستہ امیدوں، بچے کی دلفریب اداؤں وغیرہ کا بیان ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر اس لوری کو لیجئے:۔

آجا ری نندیا تو آ کیوں نہ جائے   مرے بچے کی آنکھوں میں آ کیوں نہ جائے

سو جا سو جا آنکھوں کے تارے   سو جا سو جا میرے دلارے

آجا ری . . . .

باپ کی اپنے تو ہے نشانی   آ میں سلاؤں کہہ کے کہانی

باغ کا میرے تو گل خنداں   تو مری خواہش، تو مرا ارمان،

تو مری راحت تو ہے مری جان

پیاری پیاری تیری ادائیں   دل کو نہ ماں کے کیسے بھائیں

ہمارے یہاں لوریوں کے لکھنے والے بہت کم ہیں اور جو کچھ مواد اس کے تحت میں ملتا ہے وہ کسی خاص منشا سے نہیں لکھا گیا بازار میں کئی لوری نامے ملتے ہیں مگر ان میں نہ تو لوری بنانے والوں کے نام ہیں اور نہ ان میں کوئی خاص بات نظر آتی ہے۔ افسر کی نندیا پور اور باسط بسوانی کی کئی لوریاں نہائت عمدہ ہیں۔ کبھی کبھی عصمت اور تہذیب نسواں میں کوئی لوری شائع ہو جاتی ہے۔ لوریوں کی طرف سے ہمارے شعرا کی بے توجہی اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ ان کی نظر میں لوریوں کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ حالانکہ بچوں کی تربیت کا پہلا نقش یہی لوریاں ہیں۔ ایران میں لوریوں کو خاص اہمیت دی جا رہی ہے اور انہوں نے اپنی لوریوں کی نوعیت کو انقلاب زمانہ کے لحاظ سے بدل دیا ہے ہمیں بھی اپنے بچوں کے لئے خاص نوعیت کی لوریاں لکھنے کی ضرورت ہے۔ لوریوں میں نیند کی تمنا بچوں کی دلفریب اداؤں، ماں کی محبت اور اس سے وابستہ امیدوں، بچے کی اقبال مندی، جاہ و ثروت کی دعاؤں کا ذکر ضروری ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ ان بری باتوں کو بھی بیان کر دینا چاہیئے جو آیندہ چل کر بچوں میں پیدا ہو جاتی ہیں مثلاً ضد، گندگی، منہ نہ دھونا، کپڑے نہ بدلنا، اور خصوصیت سے ان باتوں کا جن سے بچوں میں ہمت، شجاعت، صبر اور استقلال وغیرہ جیسی خوبیاں پیدا ہوں ذکر کرنا چاہئے۔

لوریوں کی زبان نہایت آسان اور سادہ ہو سے

ڈال گلے میں پیارے باہیں   مکھڑے کی تیرے لے لوں بلائیں

فارسی اضافت کا استعمال جہاں تک ہو نہ کرنا چاہیئے اور ایسے الفاظ اور ترکیبیں استعمال کی جائیں جن کا تلفظ نہایت آسانی سے ہو سکے۔ سے

اللہ اللہ لوریاں   دودھ بھری کٹوریاں

دودھ میں نکلی مکھی   اللہ نے جان رکھی

پیالی گئی پھوٹ   چندا ماموں گئے روٹھ

پیالی آئی اور   چندا ماموں آئے دوڑ

لوریوں کی زبان بالکل بچوں کی زبان ہو تو اور بھی اچھا ہے ؎

کیچی کیچی کوا کھائے   دودھ بھات بھیا کھائے

لوریوں کی بحریں ایسی ہونا چاہئیں جن میں ترنم زیادہ ہو اور موسیقیت کی حامل ہوں ساتھ ہی ساتھ چھوٹی ہوں۔ بہرحال ہماری استدعا ہے کہ بچوں کے شاعر اور بالخصوص شاعرات اس طرف اپنی توجہ مبذول فرمائیں اور اپنے بچوں کے لئے ایسی لوریاں لکھیں جو ان کے ذہنی نشو ونما میں معاون ہوں۔

اس کے بعد بچہ غوں غاں کرنے لگتا ہے اور آبا، انا، بپا، مم وغیرہ ٹوٹے پھوٹے الفاظ نکالنے لگتا ہے۔ یہ حالت کوئی ڈھائی سال تک رہتی ہے اور بچہ بیٹھنے اٹھنے لگتا ہے اس عمر میں بچے کھلونوں سے کھیلنے لگتے ہیں اور رفتہ رفتہ پانچ سال کی عمر تک ان کا یہ شوق بہت زیادہ بڑھ جاتا ہے اور وہ ہر وقت کھلونوں کے دیوانے رہتے ہیں۔ دوڑ دھوپ بھی پسند کرتے ہیں۔ وہ رات کو کہانیاں سننے کے شائق ہو جاتے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کے احساسات میں ترقی ہو جاتی ہے۔ ان میں "ہم اور تم"، "ہمارا اور تمہارا" کا احساس اور امتیاز پیدا ہو جاتا ہے اور اپنے والدین وغیرہ سے جو کچھ سیکھتے ہیں اس کو عملی طور پر عادتوں میں ظاہر کرتے ہیں۔ اس لئے اس عمر میں بچوں کی شاعری میں کھلونوں (ہوائی بندوق، سائیکل، موٹر، ہوائی جہاز، گھوڑا، ہاتھی، گھرگھرندا، گڑیا، گڈا، وغیرہ) کا ذکر ہونا چاہئے۔ اس باب میں حامد علی مرحوم کی ہوائی بندوق "میرے دادا نے جو بھیجی ہے ہوائی بندوق"، گڑیا، لٹو، اچھی نظمیں ہیں جن کو بچوں کے کھلانے والے نہایت آسانی سے یاد کر سکتے ہیں اور ان کو گا گا کر سنا سکتے ہیں۔ اس وقت لوریوں کی ضرورت بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ کہانیاں بھی ضروری ہیں۔ مگر ہمارے یہاں کہانیوں میں چڑیا اور چڑے کی کہانی بہت عام اور مقبول ہے۔ اس باب میں ہمیں نیو کنفیشنز کے مقالہ نگار کی کوشش نہایت کامیاب نظر آتی ہے کہ انہوں نے چار پانچ سال کی عمر کے بچوں کے لئے دو کہانیاں نظم کیں جو بے حد مقبول ہوئیں۔ طوطا کی کہانی "انا تھا آشرم" میں۔

ایک تھی طوطی ایک تھا طوطا   نیک تھی طوطی نیک تھا طوطا
طوطا ہر دن باہر جاتا   شام کو گھر کو واپس آتا
ہاتھی لاتا گھوڑا لاتا   اور اک باجا بھی وہ لاتا
باجا پاکر خوش ہو جاتا   ننھا راجا ننھا راجا

آجا آجا مرے ننھے راجا آجا . . . . .

اور دوسری پریسیڈنٹ میں اس طرح شروع ہوتی ہے۔

ایک راجے کا بیٹا لے کر اڑنے والا گھوڑا   دیس دیس کی سیر کی خاطر اپنے گھر سے نکلا
اڑتے اڑتے چلتے چلتے تھکے جو اس کے پاؤں
ایک جگہ پر بیٹھ گیا وہ دیکھ کے ٹھنڈی چھاؤں

جوہر کی بلی اور مرغ، شفیع الدین نیر کی نظم چندا ماموں، ادیب مالیگانوی کی بادام کون کھائے۔ حامد علی مرحوم کی نیم، بائسکل، حسینہ احمدی صاحبہ کی میں نے بلی پالی نہایت اچھی نظمیں ہیں۔

اس کے بعد بچے کچھ پڑھنا شروع کر دیتے ہیں اور آٹھ نو سال کی عمر تک پڑھنے لکھنے لگتے ہیں اور اسکول جانے لگتے ہیں اور اسی وقت سے والدین اور مربیوں کے خیال سے بچوں کی تربیت شروع ہوتی ہے اور ان کو اُن کے اخلاق کی درستی اور فرائض کی ادائیگی کا خیال ہوتا ہے۔ عام انسانی فرائض کی طرح بچوں کے فرائض بھی تین قسم کے ہوتے ہیں۔ (۱) وہ فرائض جن کا تعلق خود انسان سے ہے (۲) وہ فرائض جن کا تعلق عام لوگوں سے ہے (۳) وہ فرائض جو خاص تعلقات کی بنا پر وقتاً فوقتاً پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ پہلی قسم میں بچوں کے لئے اپنے جسم کی صفائی، ہاتھوں اور دانتوں کی صفائی، کپڑوں کی صفائی، ضد سے پرہیز، رونے سے اجتناب۔ پڑھنا لکھنا سیکھنا، سچ بولنا، جھوٹ نہ بولنا، چوری نہ کرنا، وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔ اس قسم کی نظمیں بکثرت موجود ہیں مگر شفیع الدین نیر کی نظم "بچوں کا فرض" سادگی اور سلاست کے خیال سے نہایت موزوں ہے ؎

آؤ بھائی آؤ بھائی   بات مری سن جاؤ بھائی
ہاتھ اور منہ ہو صاف ہمارا   بھائے دل سے ہم کو صفائی
بے پوچھے ہم ہاتھ نہ ڈالیں   ہم کو ملے گر چیز پرائی
چاقو کاپی پنسل کاغذ   پیسہ دھیلا آنہ پائی
لڈو پیڑا برفی کھجی   بالوشاہی نان خطائی
مل جل کر سب رہنا سیکھیں   ہو نہ کبھی آپس میں لڑائی
آپس میں کچھ ٹھیک نہیں ہے   ہاتھا پائی مار کٹائی
مان گئے ہم نیر تم کو
خوب ہمیں یہ بات بتائی

اسی طرح سچ بولنے کے بارے میں مولانا محمد اسمٰعیل مرحوم میرٹھی کی نظم ؎

۱؎ کپڑے

سچ کہو سچ کہو ہمیشہ سچ ہے بھلے مانسوں کا پیشہ سچ
سچ کہو گے تو تم رہو گے عزیز سچ تو یہ ہے کہ سچ ہے اچھی چیز
جھوٹ کی بھول کر نہ ڈالو خو جھوٹ ذلت کی بات ہے اخ تھو

شفق قادری ابولوی کی نظم سچا لڑکا جس کے آخری دو شعر یہ ہیں:۔

کرنا تو جھوٹ بولنا بچے بولتے سچ ہیں جو کہ ہیں اچھے
سچ کا دنیا میں بول بالا ہے یہ شفق نے بھی آزمایا ہے

جوہر چانڈوری کی منظوم حکایت چوری کا نتیجہ نہایت عمدہ نظم ہے۔ اس قسم کی نظموں کے اچھے شاعر یہ ہیں۔ آزاد، حالی، احسن، اسماعیل میرٹھی، سعید بریلوی، اقبال، افسر، جوہر، شفق، نیر، اندرجیت شرما، ادیب مالیگانوی وغیرہ۔

وہ فرائض جن کا تعلق عام لوگوں سے ہے۔ اس شق میں نوکروں سے تعلقات، فقیروں اور بھک منگوں سے سلوک، پاگلوں اور دیوانوں سے برتاؤ۔ وغیرہ وغیرہ شامل ہیں۔ اس باب میں اردو میں بے شمار نظمیں ہیں جو طوالت کے خیال سے درج نہیں کی جاتیں۔

وہ فرائض جو خاص تعلقات کی بنا پر عاید ہوتے ہیں ان میں والدین کی اطاعت، چھوٹے بھائی بہنوں سے محبت، بڑوں کا ادب اپنے ہم جماعتوں کے ساتھ نیک برتاؤ، استاد کی تعظیم، وغیرہ شامل ہیں۔ اس باب میں والدین کی اطاعت کرنے کی عادت ہو جاتی ہے اور والدین سے بڑھ کر ایسی کوئی دوسری ہستی نہیں ہوسکتی اور اس طرح وہ بری باتیں کرنے سے رُک جاتے ہیں۔ بہرین صاحب نے اس بات پر خاص زور دیا ہے وہ لکھتے ہیں:۔

"بچہ برائی کرنے سے زیادہ تر اس لئے بچتا ہے کہ وہ اپنے ماں باپ کی خوشنودی حاصل کرسکے اور وجوہات بھی یکسر معدوم نہیں ہوتیں لیکن بدی سے بچنے کا سب سے بڑا باعث ماں باپ کے احترام کا جذبہ ہوتا ہے"

اس کے بعد خاص ضروری چیز بھائی بہنوں سے نیک سلوک ہے۔ بچے کھلونے بہت پسند کرتے ہیں اور آپس میں لڑتے جھگڑتے ہیں اس لئے نظموں میں جو حکایتوں کی صورت میں ہوں۔ ایسی باتوں پر زور دینا چاہئے اور ناصحانہ عنصر اس انداز سے موجود ہونا چاہئے کہ بچوں کو اس کی موجودگی کا بالکل پتہ نہ لگے کہ کوئی بڑا سمجھا رہا ہے۔ نصیحت اور فرائض ان کی عمر کے لحاظ سے عائد کرنے چاہئیں

اس قسم کی نظمیں اردو میں بکثرت موجود ہیں مگر خصوصیت سے آزاد، حالی، اسماعیل وغیرہ کی نظمیں قابل ذکر ہیں۔

یہ تو ہوئی ایک دھندلی تصویر اُن نظموں کی جو اخلاقی شاعری کے تحت میں آتی ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ بچے فطری طور پر کیا چاہتے ہیں اور ہمارے پاس ان کے لئے کیا ذخیرہ موجود ہے۔ اس کے جواب میں اجمالی طور پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ بچوں کو حسب ذیل قسموں کی نظمیں پسند ہوتی ہیں۔

(۱) کہانیاں اور قصے (۲) کھیل کود کی منظوم باتیں (۳) مزاحیہ نظمیں (۴) وطنی اور قومی نظمیں۔ کہانیوں میں گیارہ بارہ سال تک کی عمر تک بچوں کو دیو پری کے قصے بہت پسند آتے ہیں اور اس قسم کی کہانیاں انگریزی میں فیری ٹیلز کہلاتی ہیں۔

اس قسم کی کہانیوں کے تعلیمی فائدے میں اختلاف ہے۔ بعض ماہرین تعلیم کا خیال ہے کہ اس قسم کی کہانیاں کسی طرح مفید نہیں ہیں خصوصاً اس موجودہ سائنس کے زمانے میں۔ اور بعض کا خیال ہے کہ اس قسم کی کہانیاں کسی حد تک ضرور مفید ہیں۔ فائدہ اور نقصان سے قطع نظر یہ کہانیاں ہمیشہ بچوں کا محبوب مشغلہ رہی ہیں اور بچوں نے ان کو جان سے زیادہ عزیز رکھا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ یہ کہانیاں ہمیں اس وقت کی یاد دلاتی ہیں جب دنیا بالکل بچہ تھی اور سچ پوچھئے تو یہ بنی نوع انسان کے بچپن کی یادگار ہیں۔ شاید یہ اسی وجہ سے بچوں کو زیادہ مرغوب ہیں۔ مزید براں ان میں صحرائی زندگی کے مناظرہ خوف وہراس کے کرشمے، جانوروں، درختوں، ستاروں، چاند، بادل، آسمان، دیوی دیوتاؤں کے واقعات بیان کئے جاتے ہیں۔ اور اس طرح انسانوں اور جانوروں کے میل جول کی تاریخ ہماری نظروں کے سامنے بکھر جاتی ہے۔ ان کہانیوں سے بچوں کی دلچسپی اس سے اور بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ کہ بچوں کو بہروپ زیادہ پسند ہے اور وہ چیزوں کو ان کی اصلی شکل کے علاوہ دوسرے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں اور یہ بات ان کو ان کہانیوں میں مل جاتی ہے۔ اس قسم کی کہانیوں سے چاہے اور کچھ فائدہ ہو یا نہ ہو لیکن بچوں کی قوت متخیلہ ضرور تیز ہو جاتی ہے اور دماغی اور ذہنی نشوونما کے ارتقا میں تخئیل کو جو دخل حاصل ہے وہ ظاہر ہے۔

ہمارے یہاں اردو میں بچوں کے لئے فیری ٹیل صحیح معنوں میں

بالکل مفقود ہے۔ ہم اردو مثنویات میں سے بعض مثنویوں کو اس قسم کی بہترین نظمیں کہتے اگر ان میں عشقیہ عنصر ضرورت سے زیادہ نہ ہوتا۔ مثنوی گلزارِ نسیم میں تاج الملوک کا بار بار اپنے بھائیوں کے ساتھ نیک سلوک کرنا۔ برادرانہ محبت کی بہت عمدہ مثال ہے۔ اسی طرح مرغ اسیر کا صیاد کی نافہمی پر ہنسنا وغیرہ ایسی باتیں ہیں جو اس تحت میں آسکتی ہیں۔ انشا کی ایک مثنوی جس میں ہاتھی اور ہتھنی کی شادی کا دلچسپ افسانہ نظم کیا ہے۔ اس قسم کی اچھی نظم ہے۔

دراصل ہمیں فیری ٹیل میں ایسی نظموں کی ضرورت ہے جو نوکروں سے حق سلوک، بھائی بہن کی محبت، والدین کی اطاعت وغیرہ سکھائیں۔ جس طرح انگریزی میں وفادار جان[1] کی کہانی ہے، جو دیوں کی بولی سمجھتا تھا اور جس نے اپنے آقا کی جان بچائی، سنو وائٹ[2] کی کہانی، بارہ بھائیوں کی کہانی جن سے بھائی بہنوں کی محبت کا اظہار ہوتا ہے۔ ریڈ رائڈنگ ہوڈ کی کہانی جس میں بتلایا گیا ہے کہ بچوں کو اِدھر اُدھر گھومنا نہ چاہیئے وغیرہ وغیرہ۔

بچوں کو اس قسم کی کہانیوں کے علاوہ ایسی حکایتیں بھی بہت پسند ہوتی ہیں جن میں انسانوں کے کیریکٹر جانوروں میں ڈھالے جاتے ہیں۔ بچے ان حکایتوں کو پڑھ کر اس لئے اور بھی خوش ہوتے ہیں کہ وہ سمجھتے ہیں کہ جانور اور درخت ان کے دوست ہیں وہ ان کی باتیں سمجھتے ہیں وہ ان سے بات کرتے ہیں وہ ان کے دکھ درد میں شریک ہوتے ہیں۔ اس قسم کی حکایتیں اردو میں بہت کثرت سے ہیں اور نہایت عمدہ عمدہ۔ یہ حکایتیں جن کو انگریزی زبان میں فیبل (FABLE) کہتے ہیں دراصل ہندوستانی نژاد ہیں اور ان کا ماخذ بالکل بچوں ہی کی کہانیاں ہے۔ یہ کہانیاں مہاتما بدھ کی پیدائش کی کہانیوں سے لی گئی ہیں۔ ان کا اصلی نام جاتکا تھا جو بعد میں چل کر پنچ تنتر کے نام سے موسوم ہوئیں اور ایرانی سے عربی میں آئیں اور کلیلہ و دمنہ کے روپ میں اکھٹی ہوئیں۔ ان میں جانوروں کے ذریعہ باتیں کہلوائی جاتی ہیں اور اچھے باریک ہیں شاعر بچوں کے لئے پتے کی باتیں کہہ جاتے ہیں۔ براہِ راست نصیحت بچے تو بچے بوڑھوں کو بھی بری لگتی ہے۔ "والدین کا کہنا مانو" سننا بچوں کو زہر معلوم ہوگا، مگر وہ جب انور کی حسب ذیل نظم پڑھیں گے جس میں ایک چوہیا کا بچہ ماں کا حکم نہ ماننے سے چوہے دان میں پھنس گیا تو یہ بات اُن کے ذہن نشین ہو جائے گی کہ بڑوں کا حکم نہ ماننے سے نقصان ہوتا ہے

ایک دن چوہے کا بچہ بر ملا، اپنی اماں جان سے کہنے لگا
آج اک ایسا مکاں آیا نظر جس میں ہیں عمدہ غذائیں بیشتر
سن کے اس بچے کی ماں کہنے لگی تو نہ جانا بھول کر اس میں کبھی

. . . .

ماں نے دی ہر چند اس کو رائے نیک طفلِ ناداں نے نہ مانی بات ایک

. . . .

الغرض دروازہ حاصل ہو گیا بے دھڑک وہ اس میں داخل ہو گیا
ہر نوالے میں مزا آنے لگا اور کھانا شوق سے کھانے لگا

. . . .

جستجو میں در کی وہ پھرنے لگا در نہ پایا پھرتے پھرتے تھک گیا

. . . .

آخر کار وہ پچھتایا اور کہنے لگا ؎

اپنی ضد کی میں نے یہ پائی سزا اب تو بیشک آگئی میری قضا

اسی طرح چیل اور کبوتر کی کہانی، بلی اور مرغ کی کہانی، گدھا جس نے شیر کی کھال پہنی، کوا جس نے مور کے پر لگائے، شیر اور چوہے کی کہانی، لالچی کتا، ٹڈی اور چیونٹی، شہد کی مکھی اور مچھر، سورج اور بچہ، انگور کھٹے ہیں، نادان کی دوستی، جس میں ایک نادان بندر کا قصہ بنایا گیا ہے کہ کس طرح اس نے اپنے آقا کی ناک کو زخمی کیا، ہاتھی اور درزی کی کہانی، کتاب اور لڑکا۔ دال چپاتی، لڑکی اور دال، بچہ اور جگنو، مور اور کلنگ، ملمع کی انگوٹھی، کچھوا اور خرگوش، پودا اور گھاس جاڑا اور گرمی، بلبل اور جگنو، گھڑی، تین مچھلیاں وغیرہ وغیرہ بہت مشہور اور عمدہ منظوم حکائتیں ہیں۔

اس قسم کی منظوم حکائتوں کے مشہور شاعر آزاد، حالی، اسمٰعیل، اقبال، شفق قادری۔ نظیر اکبر آبادی، شفیع الدین نیّر، جوہر چاند وڑی، رنگین دہلوی، ظفر عاصی، عبدالرحمٰن، ارشد تھانوی، شرما بچھرای، سیفی سیوہاروی، تمنا اکبر آبادی، رسا گیاوی، فہز جونپوری وغیرہ ہیں۔

ہاں یہ بات یاد رکھنا چاہیئے کہ یہ حکائتیں محض بے کار نہیں ہوتیں بلکہ ان سے پند و نصیحت حاصل کی جا سکتی ہے اور در اصل ان کا منشا بھی یہی ہے چنانچہ ان حکائتوں کی نوعیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں زور آوروں کا کیریکٹر پیش کیا جاتا ہے کہ وہ کس طرح کمزوروں کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں اور کمزوروں کو اپنے تحفظ کا طریقہ بتایا

[1] FAITHFUL JOHN [2] SNOW-WHITE

جاتا ہے۔

کھیل کود اور کھلونوں وغیرہ کے منظوم حالات یوں تو محض بچوں کے دل بہلاؤ کے لئے ہوتے ہیں مگر بعض بعض اچھے شاعر ہنسی کھیل میں ان کی شیرینی کو بتلا دیتے ہیں۔ حامد علی مرحوم کی ہوائی بندوق اور بائیسکل اس کی اچھی مثالیں ہیں۔ اسماعیل کی ریل گاڑی، جس میں وہ سب کچھ بتانے کے بعد بچوں سے پوچھتے ہیں بتاؤ اس کا نام کیا ہے۔

حیوان ہے نہ انساں، جن ہے نہ وہ پری ہے
سینے میں اُس کے ہر دم اک آگ سی بھری ہے
کھا پی کے آگ پانی چنگھاڑ مارتی ہے
سر سے دھوئیں اڑا کر غصہ اتارتی ہے

. . . .

ہم کہہ چکے مفصّل جو کچھ ہے کام اس کا
جب جانیں تم بتا دو بن سوچے نام اس کا

پھر خود ہی جواب دیتے ہیں ؎

جی ہاں سمجھ گیا میں پہلے ہی میں نے تاڑی
وہ دیکھو آگرے سے آتی ہے ریل گاڑی

کھیل کود میں تیر کی مرغوں کی لڑائی نہایت عمدہ نظم ہے ؎

دِلّی سے ہم جو لکھنؤ آئے | گرم پرخاش مرغ یاں پائے
جمعے منگل کو پالی کی ہے دھوم | گلیوں میں روزِ حشر کا ہے ہجوم
مرغ بازوں کو ہے قیامت جوش | جس کو دیکھو تو مرغ در آغوش
انی پر جھاڑے یہ بھڑکنے لگے | انی کی نوک پر کڑکنے لگے
وہ جو سیدھا ہوا تو یہ ہیں کج | ساتھ اس کے بدلتے ہیں سج دھج
ایک بولے کہ کاری آئی چوٹ | ایک کہتا ہے بس گیا اب لوٹ
جھکتے ہیں آپ کو چراتے ہیں | لانیں گویا کہ یہ ہی کھاتے ہیں

غرض اس طرح لڑائی ختم ہوئی اور لوگ چل دیتے ہیں ؎

کھا پچے سر پر بغل میں مارے مُرغ | لے گئے جیتنے ہارے سارے مُرغ

میری بلی، بلی کیٹی، میری گڑیا، بکرے، لٹو، ہماری کتاب، ننھی گڑیا وغیرہ نہایت دل کش نظمیں ہیں۔ مرغی اور اس کے بچے، بلی اور چوہا، شیر کا شکار، پپیتے حالی کی نہایت اچھی نظمیں ہیں۔

مزاحیہ نظمیں بھی بچوں کو پسند ہیں اور وہ جس طرح خود دوسروں کو ہنساتے ہیں اسی طرح خود ہنسنا بھی چاہتے ہیں۔ یوں تو اردو میں مرزا سودا کی ہجویہ نظمیں ایسی ہیں کہ لوگ سنیں اور ہنستے ہنستے لوٹ جائیں، مگر ان میں بچوں کے لئے بہت کم دلچسپی کا سامان ہے۔ میر جن کی شاعری سوز و گداز میں اپنی نظیر نہیں رکھتی اور تمام عمر اپنا دکھڑا رو یا کئے۔ تعجب ہے کہ ان کی اس گریہ و زاری میں جو کچھ نکلا ہے ان میں سے بہت کچھ بچوں کی دل بستگی کا سامان ہو گیا ہے۔ چنانچہ ان کی نظم میرا گھر بچوں میں بے حد مقبول ہے اور بچے اس کو نہایت شوق سے پڑھتے اور ہنستے ہیں۔

اسماعیل میرٹھی کی دال چپاتی کی جھڑپ بھی اس میں آ سکتی ہے

دال کا دانہ بھی نہ چکھے کوئی | بلکہ رکابی میں نہ رکھے کوئی
دال تو اک ہارے کا ہتھیار ہے | کھائے وہی اس کو جو بیمار ہے

دونوں میں القصہ بہت بڑھ گئی | ایک پر ایک آن کے چھڑ چڑھ گئی

لقمہ بنا دونوں کو میں کھا گیا
قصہ ہوا فیصلہ، جھگڑا گیا

نظیر اکبر آبادی اور اکبر الہ آبادی[1] اس میدان کے خاص مرد ہیں بالخصوص جناب اکبر مرحوم بچے، جوان، بوڑھے سب ان کے کلام کے دلدادہ ہیں، لیکن طنزِ ملیح، ہنسی کی ہنسی اور نصیحت حاصل کرنا ہو تو اکبر مرحوم کے کلیات کا انتخاب بچوں کے لئے پیش کیا جائے۔ ؎

آج بنگلے میں مرے آئی تھی آوازِ اذاں | جی رہے ہیں ابھی کچھ اگلے زمانے والے

ہر چند کہ کوٹ بھی ہے پتلون بھی ہے | بنگلہ بھی ہے، پاٹ بھی ہے صابون بھی ہے
لیکن میں پوچھتا ہوں تجھ سے ہندی | یورپ کا تری رگوں میں کچھ خون بھی ہے

داغ پڑ جائے نہ چہرے پر کوئی | شغل ہے آٹھوں پہر صابون کا

اب تو اکبر بار ہے ہم پر نمازِ عید بھی | تم اگر رکھ سکتے ہو روزہ تو دارد زی کر

زوال قوم کی تو ابتدا وہی تھی کہ جب | تجارت آپ نے کی ترک، نوکری کر لی

گزر ان کا ہوا کب عالمِ اللہ اکبر میں | پلے کالج کے چکر میں مرے صاحب کے دفتر میں

---

[1] یہاں ہمیں صاحب مضمون سے اختلاف ہے۔ اکبر الہ آبادی بچوں کے شاعر نہیں ہو سکتے ہیں البتہ نظیر اکبر آبادی کا منتخب کلام (ریچھ کا بچہ، برسات کی بہاریں وغیرہ) بچوں کی بہترین شاعری میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ (ادارہ)

پہنچے ہوٹل میں تو کچھ عید کی پروا نہ رہی — کیک کو چکھ کے سویوں کا مزا بھول گئے

فٹ نفیس ہیٹ کے خوشنما، ڈنر سرِ شب — یہ لطف چھوڑ کے حج کا سفر یہ خوب کہی

وطنی اور قومی شاعری۔ ہمارا خیال ہے کہ وطن کی محبت ایک فطری بات ہے۔ خواہ بچہ ہو یا بوڑھا، ہر شخص کو وطن سے محبت ہوتی ہے اس لئے ضروری ہے کہ بچے بھی اپنے وطن سے محبت کریں اور اگر بالفرض ان میں یہ جذبہ نہیں ہے تو انہیں وطن سے محبت کرنا سکھایا جائے اردو میں اس قسم کی شاعری کی بہتات ہے اور ہم اس کو مختلف دوروں پر تقسیم کرسکتے ہیں قدیم شعرانے بھی وطن کی تعریف اور اس کی محبت کو اپنایا ہے۔ سودا کا مخمس شہر آشوب پڑھ کر کون ایسا شخص ہے جس کا دل نہیں ہل جاتا۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ زبان ذرا مشکل اور مغلق ہے۔ میر تقی میر کے اس شعر سے کس درجہ وطن کی محبت ٹپکتی ہے۔

کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو!
ہم کو غریب جان کے ہنس ہنس پکار کے

سلطان عالم حضرت واجد علی شاہ آخری تاجدار اودھ کے اس شعر سے وطن کی جس محبت کا اظہار ہو رہا ہے وہ بیان سے باہر ہے

در و دیوار پہ حسرت سے نظر کرتے ہیں — رخصت اے اہلِ وطن ہم تو سفر کرتے ہیں

مقصد یہ ہے کہ اردو شاعری میں حب الوطنی کی کمی نہیں اور قدما و متوسطین کے کلام سے بچوں کے لئے اچھا خاصا انتخاب کیا جاسکتا ہے لیکن صحیح معنوں میں یورپی طرز کی وطنی شاعری شعرائے متاخرین کی خاص چیز ہے اور ان میں آزاد اور حالی کی کوششیں پہلی کہی جاسکتی ہیں۔ حالی کی حب وطن کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ان میں کس درجہ درد ہے

اے وطن اے مرے بہشت بریں — کیا ہوئے تیرے آسمان و زمیں
تیری اک مشت خاک کے بدلے — لوں نہ سارا اگر بہشت ملے
جان جب تک نہ ہو بدن سے جدا — کوئی دشمن نہ ہو وطن سے جدا

اس کے بعد ڈاکٹر سر اقبال نے دیس پریم کی ایسی مدھ بھری بنسری بجائی کہ سارا ہندوستان گونج اٹھا ہے

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا — ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا
مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا — ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

اور نئے شوالے میں ہے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے — خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

جب سے وطن چھٹا ہے یہ حال ہوگیا ہے
دل غم کو کھا رہا ہے غم دل کو کھا رہا ہے
آزاد مجھ کو کردے او قید کرنے والے — میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے

ارمان ہے یہ جی میں اڑ کر چمن کو جاؤں — ٹہنی پہ گل کی بیٹھوں آزاد ہو کے گاؤں

پرندے کی فریاد

حامد اللہ افسر دوسرے مشہور وطنی شاعر ہیں جنہوں نے "بھارت پیارا دیش ہمارا سب دیسوں سے نیارا" کا راگ سب بھارت باسیوں کے کانوں تک پہنچایا۔ اور "بھارت ماتا کی سیوا میں ہم تن من دھن کو لگا دیں گے۔ ہم کیسے ویر ہیں بھارت کے یہ دنیا کو دکھلا دیں گے" کہہ کر بچوں میں جوش عمل پیدا کیا۔

سرور جہاں آبادی، اکبر الہ آبادی، چکبست، حفیظ جالندھری اندرجیت شرما، ہنر دہلوی، رسا گیاوی، رعنا اکبرآبادی، ساغر نظامی، وغیرہ بچوں کے مشہور وطنی شاعر ہیں۔ جناب جوش ملیح آبادی، شاعر انقلاب ہیں اور جوشِ حریت پیدا کرنے کے بادشاہ، مگر ان کے کلام سے بہت کم نظمیں بچوں کے کام کی ہیں۔ ہم جناب موصوف سے باادب استدعا کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ وہ ایران کے مشہور شاعر پورداؤد کی طرح بچوں، جوانوں، بوڑھوں، سب کے لئے جوش حریت پیدا کرنے والے اشعار نظم فرمائیں۔ پورداؤد کی ایک وطنیہ نظم رستخیز اس کا بہترین نمونہ ہے

از بہر وطن بجاں بکوشیم — در رزم بسان پیل جوشیم
چو شیر دژم بہم بجوشیم — گر دشمن اژدر و پلنگ است
برخیز ز خواب وقت تنگ است
بشتاب کہ روزِ رزم و جنگ است

روش صدیقی کی ہے

اے وطن، اے وطن، اے وطن، اے وطن
جانِ من، جانِ من، جانِ من، جانِ من

اگرچہ یونیورسٹی اور کالج کے طلبہ میں بے حد مقبول ہوئی اور اب تک وردِ زبان ہے، مگر موصوف کو چھوٹے بچوں کو نہ بھولنا چاہیئے اور ان کو

ہندو مسلم سکھ عیسائی — بھائی! سب ہیں بھائی بھائی

بھارت ماتا سب کی مائی
پھر کیسی یہ مار پٹائی

کہہ کر ملوا دینا چاہیے۔

اس کے علاوہ ہمیں اپنے بچوں کے لئے اس قسم کی وطنی شاعری کی ضرورت ہے۔

اے باغ ہر شگوفہ گل و یاسمن چہ شد
آں نزہت و طراوت سرو چمن چہ شد
بر عاشقان کشتہ مزار و کفن چہ شد
گریاں بحال زار تو مرغ ہوا وطن
بیکس وطن، غریب وطن، بے نوا وطن

اظہر علی فاروقی
ایم اے

اعجازِ تغزل

پہلو میں آکے وہ سرِ محفل نکل گیا
اور کہہ کے یہ کہ حوصلۂ دل نکل گیا؟

مرہونِ تیغِ ناز ہوئی مرگِ پُر نشاط
مرنا کہ ایک کام تھا مشکل نکل گیا

روکا بہت تھا جی کو مگر پھر بھی کیا کروں
اک حرفِ شوق کا سرِ محفل نکل گیا

آنکھیں ملا کے آنکھوں سے تو نے ہٹائیں جب
محسوس یہ ہوا کہ مرا دل نکل گیا

کل شب حدودِ ہوش سے اعجاز تھا پرے
مستی میں لے کے شیشۂ محفل نکل گیا

سعید احمد اعجاز

راوی پر ایک شام

ساحلِ راوی ہے، سناٹا ہے اور وقتِ غروب
ہوگیا افسانۂ تنویر کا عنوان شام

نبض مدھم ہے شفق کی، رک چلی دریا کی سانس
درہم و برہم ہوا جاتا ہے منظر کا نظام

سبزۂ نوخیز پر ہے صندلی کرنوں کا رقص
دن کے سیمیں ساغروں میں ہے مئے زرّینِ شام

دوش پر مغرب نے اوڑھی جھٹپٹے کی اوڑھنی
کرلئے پر ہول تاریکی نے خنجر بے نیام

بامِ مغرب پر دریچے کھُل گئے الماس کے
جھومتی ہے زلف بکھرائے ہوئے لیلائے شام

چوٹیاں پیڑوں کی کچھ روشن ہیں ڈھلتی دھوپ سے
ان پہ بھی ہو جائے گا لیکن اندھیرے کا قیام

سبز پتوں پہ یکایک سانولا پن آگیا،
اور سُبک رفتار جھونکے ہوگئے محوِ خرام

پرچمِ ظلمت ہے قصرِ نور پر سایہ فگن،
چل دیا ہے کارواں کرنوں کا اب ناشاد کام

شام کی دیوی اٹھی انگڑائیاں لیتی ہوئی
ہیں کنیزانِ فلک پہلو میں محوِ اہتمام

دامنِ ساحل میں آکر رک گئی ہیں کشتیاں
ہو رہے ہیں نا خدا اپنے خدا سے ہم کلام

فرشِ آبی پہ ہوا سے سلوٹیں پڑنے لگیں
جھک کے شاخوں نے کیا ہے تیرگی کا احترام

یک بیک راوی نے ہاتھوں میں اٹھایا جلترنگ
بانسری جیسے بجائے رادھکا کے ساتھ شیام

اٹھ کے دریا سے فضا میں زمزمے اڑنے لگے
گویا دریا بھی ہو کوئی مطربِ شیریں کلام

دھم سے جب گرتی ہے پانی میں کنارے کی زمیں
دل یہ کہتا ہے کہ یونہی زیست کا ہے اختتام

خواب طاری ہوگیا ہے آم کے اشجار پر
نیند میں ڈوبی ہوئی ہیں کشت ہائے سبز فام

تان کر ظلمت کی چادر سو چلی سب کائنات
خواب کی پریوں کا ہے بزمِ جہاں میں انصرام

چاندنی سے ماہِ کامل کی بجھی قندیل ہوش
ہر ستارے نے سمیٹا سیم گوں کرنوں کا دام

مطرب جلووں کے ہیں آغوشِ فطرت میں ہجوم
بانوئے کوکب کا ہے ایوانِ گردوں میں قیام

رقص کرتے ہیں فرشتے، گنگناتا ہے فلک
اور کھنکتی ہے صراحی، جام پر اُڑتے ہیں جام

بے خودی سے ہے عرصۂ افلاک پر چھائی ہوئی
ساحلِ دریا پہ میرے منہ سے نکلا کس کا نام

پرشوتم لال ضیا

کوہِ نور

تھوڑے دن ہوئے ایک انگریزی کتاب[1] میری نظر سے گزری جس میں "کوہ نور" کے متعلق دلچسپ معلومات تھیں کہ کس طرح یہ ہیرا مہاراجہ رنجیت سنگھ "شیرِ پنجاب" کے توشہ خانے سے نکل کر "ٹاور آف لنڈن" میں پہنچا۔ جہاں انگلستان کے شاہی جواہرات محفوظ رہتے ہیں۔ سر جان لوگن ایک مشہور انگریز ڈاکٹر تھے۔ ان کی میم صاحبہ "لیڈی لوگن" کی یادداشتیں ان کی بیٹی نے ایک کتاب کی صورت میں شائع کیں اور اس کتاب سے لیڈی لوگن کی معلومات کا یہ خلاصہ اردو خواں اصحاب کے لئے اخذ کیا گیا ہے

ڈاکٹر لوگن انیسویں صدی کے وسط کے قریب ہندوستان میں فوجی ڈاکٹر تھے۔ پہلے لکھنؤ کی ریزیڈنسی میں تعینات تھے اور ۱۸۴۸ء میں وہاں سے تبدیل ہو کر لاہور آئے اور سکھوں کی دوسری لڑائی میں شریک ہوئے۔ جب انگریزی فوج فتح یاب ہو گئی اور نوعمر مہاراجہ دلیپ سنگھ خلف مہاراجہ رنجیت سنگھ سرگ باشی جو اپنے بھائی مہاراجہ شیر سنگھ کے بعد تختِ پنجاب کے مالک تھے تخت سے اتارے گئے تو ڈاکٹر لوگن کو مہاراجہ دلیپ سنگھ کا جن کی عمر اس وقت بارہ سال کے قریب تھی نگراں اور سربراہ مقرر کیا گیا اور انہی کی معیت میں بعد ازاں مہاراجہ دلیپ سنگھ انگلستان پہنچے۔ ڈاکٹر لوگن کی میم صاحبہ اُن سے پہلے انگلستان آ گئی تھیں۔ وہ بھی مہاراجہ کی خبر گیری میں شریک ہوئیں اور دونوں کو مہاراجہ سے بہت دل بستگی ہو گئی۔

لیڈی لوگن اپنے شوہر کے انتقال کے بعد دیر تک زندہ رہیں اور مہاراجہ دلیپ سنگھ کی زندگی میں جو انقلابات اُن کے وطن سے جانے کے بعد آئے۔ وہ سب انہوں نے دیکھے اور ان میں سے بعض کا ذکر اس کتاب میں اور لیڈی صاحبہ موصوفہ کی اپنی لکھی ہوئی ایک کتاب میں ہے۔ مگر اس مضمون میں صرف وہ باتیں درج ہیں جو اس مشہور ہیرے سے تعلق رکھتی ہیں۔

جب ڈاکٹر لوگن کو نوعمر مہاراجہ کا ولی بنایا گیا۔ تو قلعۂ لاہور کا شاہی خزانہ اور جواہرات سب اُن کی تحویل میں دیئے گئے۔ توشہ خانہ جس میں "کوہ نور" کے علاوہ اور بھی قیمتی جواہرات اور نادر اشیاء جمع تھیں۔ اُن کے سپرد ہوا۔ انہوں نے مصر مکھراج کی مدد سے توشہ خانے کی فہرست تیار کرنی شروع کی۔ مصر مکھراج کا خاندان دو تین پشت سے توشہ خانہ کا سپردار چلا آتا تھا۔ ڈاکٹر لوگن کا اندازہ ہے کہ کوہِ نور کو الگ رکھ کر توشہ خانہ کے جواہرات کی قیمت دس لاکھ پونڈ یعنی ایک کروڑ تیس لاکھ روپے سے کم نہ ہو گی۔ "کوہِ نور" ایک مضبوط پیٹی میں محفوظ رہتا تھا اور اس پر زبردست پہرہ ہر وقت رکھا جاتا تھا۔ لارڈ ڈلہوزی کے خطوط میں جو کتاب کی صورت میں چھپ چکے ہیں۔ لکھا ہے کہ ڈاکٹر لوگن جب کبھی کسی کو یہ ہیرا دکھلاتے تھے۔ تو اس طرح کہ ہیرے کے گرد ایک سیاہ مخمل کا کپڑا ہوتا تھا اور اس کپڑے میں ایک سوراخ ہوتا تھا۔ دیکھنے والا کچھ فاصلے سے ہیرے کی چمک اس سوراخ میں سے دیکھتا تھا اور اس کی بڑائی کا بھی اندازہ کر سکتا تھا۔ اس سے پہلے جب کبھی کسی کو یہ ہیرا دکھایا جاتا تھا تو سپردار اسے اپنے ہاتھ میں رکھتا تھا اور اس کے دونوں طرف کی ڈوریاں اس کے بازو سے بندھی ہوتی تھیں۔

یہ تو اکثر لوگوں کو معلوم ہے کہ کوہ نور گولکنڈہ کی کان سے نکلا تھا اور مدتوں راجگانِ مالوہ کے قبضے میں رہا۔ جب سلطان علاء الدین نے راجگانِ مالوہ پر فتح پائی تو یہ اس کے قبضہ میں آیا۔ پھر ۱۵۲۶ء میں مغلوں کے پاس پہنچا اور ۱۷۳۹ء تک خاندانِ مغلیہ کے پادشاہوں کے پاس رہا۔ مگر جب نادر شاہ ایران سے حملہ آور ہو کر محمد شاہ پر فتح یاب ہوا۔ تو اس نے برادرانہ طور آپس میں پگڑی بدلنے کے بہانے سے یہ ہیرا جو محمد شاہ کی دستار پر سجا ہوا تھا۔ لے لیا۔ بعد میں نادر شاہ کے [illegible] سے افغانستان کے احمد شاہ ابدالی نے اسے چھین لیا۔ اس کے بعد جب امیر دوست محمد خاں نے شاہ شجاع کو افغانستان سے نکال دیا تو یہ ہیرا

[1] اس کتاب کا نام "لیڈی لوگن کی یادداشتیں" (LADY LOGIN'S RECOLLECTIONS) ہے اور یہ لندن میں ۱۹۱۶ء میں طبع ہوئی۔

اس کے ہمراہ پنجاب میں پہنچا۔ مہاراجہ رنجیت سنگھ کو جب یہ خبر لگی کہ کوہ نور شاہ شجاع کے پاس ہے تو انہوں نے شاہ شجاع کو اپنے ملک میں پناہ دینے اور بحال رکھنے کی شرطیں پیش کی کہ وہ یہ بیش بہا ہیرا مہاراجہ صاحب کو دیدیں۔ شاہ شجاع نے بہتیرے حیلے بہانے کئے۔ مگر ایک نہ چلی۔ مہاراجہ نے شاہ شجاع سے یہ ہیرا کس طرح حاصل کیا۔ یہ کہانی ڈاکٹر لوگن نے مصر مکھراج سے سن کر اپنی بیوی کو سنائی تھی اور وہ یوں ہے کہ شاہ شجاع مع اپنے قبائل کے اس وقت دیوان لکھپت رائے کے گھر میں زیر حراست تھے۔ مہاراجہ نے اپنے وزیروں اور مصاحبوں کو شاہ شجاع کے پاس ہیرا لینے کو بھیجا۔ شاہ شجاع نے ایک بڑا پکھراج جو زردی مائل اور چمکدار تھا۔ بھیج دیا اور کہلا بھیجا کہ یہی "کوہ نور" ہے۔ مگر مہاراجہ نے جوہری اپنے پاس بٹھا رکھے تھے۔ انہوں نے بتلا دیا کہ جو پتھر آیا ہے اپنی جگہ قیمتی ہے۔ مگر کوہ نور نہیں ہے۔ مہاراج نے وہ پکھراج تو اپنے پاس رکھ لیا۔ مگر یہ حکم دیا کہ شاہ شجاع کو کھانے پینے کو کچھ نہ دیا جائے اور تنگ رکھا جائے تاوقتیکہ وہ کوہ نور مہاراج کے حوالے نہ کر دے۔ کوئی آٹھ گھنٹے کی تنگی برداشت کرنے کے بعد شاہ شجاع نے ہیرا مہاراج کے وکلا کو دے دیا اور وہ فوراً اسے لے کر سمن برج میں پہنچے۔ جوہری اب بھی وہیں موجود تھے۔ انہوں نے کہا کہ یہ ٹھیک وہی ہیرا ہے جو مطلوب تھا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ شام کے دربار کے لئے ملبوس ہو کر کرسی پر بیٹھے تھے جس بکس میں یہ ہیرا رکھا ہوا تھا اس میں سرخ اطلس لگی ہوئی تھی اور ہیرے کے دونوں طرف ریشمی ڈوریاں تھیں جن سے اسے بازو بند کے طور پر باندھ سکتے تھے۔ وہ بکس مہاراج کے سامنے جب کھولا گیا تو وہ ہیرے کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ اپنے بازو پر اسے رکھ کر دیکھا۔ اور پھر بکس میں بند کر کے بیلی رام کے حوالے کیا اور حکم دیا کہ پکھراج اور کوہ نور دونوں مصر بستی رام محافظ توشہ خانہ کے سپرد کر دیئے جائیں۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ اس ہیرے کو اس قدر عزیز رکھتے تھے کہ جب دورہ پر جاتے تو یہ ہیرا ہمیشہ ساتھ جاتا۔ تقریباً ایک سو اونٹ ان کے ہمراہ ہوتے تھے۔ ان میں سب سے اگلے اونٹ پر ایک صندوق میں یہ ہیرا رہتا تھا اور فوجی سپاہی اونٹوں کی قطار کی حفاظت کے لئے ساتھ ہوتے تھے۔ یہ راز کہ ہیرا ہمراہ ہے یا کس اونٹ پر ہے صرف توشہ خانہ کے اہلکاروں کو معلوم تھا۔ رات کے وقت اس کی حفاظت کی ذمہ داری مصر بیلی رام کے سپرد ہوتی تھی جو اس کے صندوق کو دو اور صندوقوں کے درمیان رکھ کر خود پاس سوتا تھا اور اس کے اپنے رشتہ داروں اور معتبر ملازموں کے سوا کوئی اور اس کے خیمے کے قریب نہیں آ سکتا تھا۔

چار یا پانچ سال تک مہاراجہ صاحب کوہ نور کو اپنے بازو پر باندھتے رہے۔ اس کے بعد اسے پگڑی کے سرپیچ میں سجایا گیا۔ سال بھر میں تین چار موقعوں پر سرپیچ استعمال کیا گیا۔ پھر اس کا بازو بند بن گیا۔ اور ایک ایک چھوٹا ہیرا اس کے دونوں طرف لگایا گیا۔ جب یہ ہیرا پنجاب سے نکلا ہے تو کوئی بیس برس تک بازو بند کا کام دے چکا تھا۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کے انتقال سے ذرا سی دیر پہلے راجہ دھیان سنگھ نے جو مہاراج کے وزیر تھے۔ مصر بیلی رام کو بلا بھیجا اور کہا کہ مہاراج کی زبان تو بند ہے مگر انہوں نے اشارے سے حکم دیا ہے کہ کوہ نور کو دان پن کے طور پر خیرات میں دے دیا جائے۔ مگر بیلی رام نے کہا کہ ایسی نایاب چیز مہاراج کی اولاد کے پاس رہنی چاہئے۔ دان پن جو دیا جا چکا ہے وہ کیا کم ہے۔ اس کے اندازے سے اکیس لاکھ روپے کے قریب کا سونا چاندی اور جواہرات برہمنوں کو دیئے جا چکے تھے۔ مصر بیلی رام کو وزیر کا کہا نہ ماننے کی یہ سزا ملی کہ جب مہاراجہ کے گزر جانے کے بعد راجہ دھیان سنگھ کو پورا اقتدار حاصل ہوا تو اس نے مصر بیلی رام سے توشہ خانہ کی چابی چھین کر تیج چند کو دے دی اور مصر کو قید کر دیا۔ جب مہاراجہ شیر سنگھ خلف مہاراجہ رنجیت سنگھ تخت پر بیٹھے تو انہوں نے مصر بیلی رام کو قید سے رہا کیا اور ان کا عہدہ پھر بحال کر دیا۔ مگر جب شیر سنگھ کا انتقال ہوا تو اس کے دوسرے روز بیلی رام کو ہیرا سنگھ کے ماتحتوں نے پھر گرفتار کر لیا اور اسے اور اس کے بھائی اور دیگر رشتہ داروں کو نواب شیخ امام الدین کے مکان کے تہہ خانے میں قید کر دیا۔

مصر مکھراج جس سے یہ سب باتیں ڈاکٹر لوگن کو معلوم ہوئیں مصر بیلی رام کے خاندان سے تھا۔ اس نے یہ حال لکھ کر ڈاکٹر صاحب کو دیا اور ڈاکٹر صاحب نے اس تحریر پر اپنے دستخط کر کے اسے انگلستان بھیج دیا۔ اس تحریر کے آخری الفاظ یہ ہیں:۔

"ہیرا سنگھ کے مرنے کے بعد مصر مکھراج اور اس کے رشتہ دار قید سے رہا ہوتے اور لال سنگھ کا اقتدار ختم ہونے پر توشہ خانہ مع کوہ نور پھر مصر بیلی رام کے خاندان کے سپرد ہوا۔ اور اس وقت تک جب اس نے ڈاکٹر لوگن کو بتاریخ ۳۰ ماہ مئی ۱۸۴۹ء میں خزانہ

سپرد کیا۔ برابر ان کی تحویل میں رہا"

اس ہیرے کی اس قدر اہمیت تھی کہ لارڈ ڈلہوزی نے دو مرتبہ لاہور کے توشہ خانے کا معائنہ کیا۔ اور آخر جب اسے انگلستان روانہ کرنے کی تجویز ہوئی تو ڈاکٹر لوگن کو لارڈ ڈلہوزی نے اپنے ہاتھ سے رسید دی۔ جس کے الفاظ درج ذیل ہیں:۔

"آج میں نے کوہ نور ہیرا۔ انگلستان روانہ کرنے کے لئے ڈاکٹر لوگن سے اپنے قبضہ خاص میں لے لیا ہے۔ مجلس منتظمہ پنجاب کے اراکین اور سر ہنری ایسٹ سیکرٹری حکومت ہند موجود تھے۔"

اس رسید پر ہنری لارنس اور مینسل اور جان لارنس اور ایسٹ کے دستخط ہیں۔

اب ڈاکٹر لوگن نے تو اس بڑی ذمہ داری سے نجات پائی اور اس کے دل پر سے ایک بھاری بوجھ اُترا۔ مگر لارڈ ڈلہوزی کو اس کے باعث بہت سی تکلیف گوارا کرنی پڑی۔

لارڈ ڈلہوزی کو جو اہتمام کرنا پڑا۔ اس کا تذکرہ ڈاکٹر لوگن کے ایک خط میں درج ہے جو انہوں نے فتح گڑھ سے ۱۶ جولائی ۱۸۵۰ء کو اپنی بیوی کو لکھا تھا۔

اس کے اپنے الفاظ میں بذریعہ ترجمہ یہ تذکرہ سن لیجئے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"اخبارات سے معلوم ہوا کہ کوہ نور انگلستان پہنچ گیا ہے۔ صرف چند اشخاص کو اس کی ہندوستان سے روانگی کا راز معلوم تھا۔ ان میں سے ایک میں ہوں۔ میرے علم کے بغیر تو یہ ہیرا باہر جا نہیں سکتا تھا۔ کیونکہ جس دن سے میرے سپرد ہوا تھا۔ برابر میرے قبضے میں رہا۔ اب چونکہ وہ بحفاظت وہاں پہنچ گیا ہے۔ میں تمہیں یہ بتا سکتا ہوں کہ لارڈ ڈلہوزی اس کے لئے میرے مکان پر آئے اور اپنے ساتھ ایک خریطہ لائے جو لیڈی ڈلہوزی نے اپنے ہاتھ سے سیا تھا۔ تاکہ اس کے اندر ہیرا رکھا جائے۔ جب میں نے ہیرا انہیں دیا تو لارڈ موصوف نے میرے کمرے ہی میں جا کر اس خریطے کو اپنے کپڑوں کے نیچے میرے سامنے اپنی کمر سے باندھا۔"

بمبئی تک لارڈ ڈلہوزی خود اس ہیرے کو لے کر گئے۔ اس کے وہاں پہنچنے اور وہاں سے روانہ ہونے کا حال لارڈ ڈلہوزی کے مطبوعہ خطوط میں اس طرح درج ہے۔

"کوہ نور ۶ اپریل ۱۸۵۰ء کو میدیا نامی جہاز پر بمبئی سے روانہ ہوا۔ میں تمہیں اُس وقت کچھ نہیں لکھ سکا۔ کیونکہ اس کی روانگی ایک راز سربستہ تھی۔ میں لاہور سے بمبئی اسے خود لایا۔ میں نے گھبراہٹ میں اس کی تحویل اپنے ذمے لے تو لی۔ مگر پچھتایا۔ آخر جب بمبئی پہنچ کر اسے حفاظت کے ساتھ وہاں کے خزانے میں جہاز کی روانگی تک رکھ دیا تو مجھے حد سے زیادہ خوشی ہوئی۔ میری کمر سے ایک پیٹی بندھی تھی جس کے ساتھ اس کا خریطہ دو تہوں میں دوہری سلائی سے سیا گیا تھا اور پیٹی کا ایک سرا ایک زنجیر سے بندھا ہوا تھا۔ جو میری گردن کے گرد لپٹی ہوئی تھی۔ دن رات کسی وقت میں نے اسے اپنے بدن سے الگ نہیں کیا۔ سوائے اُن دنوں کے جب مجھے ڈیرہ غازی خاں جانا پڑا۔ تب میں اسے کپتان رمزے کے سپرد کر کے گیا اور اسے یہ حکم دیا کہ خزانہ کی پیٹی میں بند کر کے اس پیٹی پر وہ خود بیٹھا رہے۔ تاوقتیکہ میں واپس نہ آؤں۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ جب یہ بوجھ میرے گلے سے اترا تو مجھے کس قدر چین آیا۔"

یہاں تک تو ہیرے کے مختلف سفروں کے حالات تھے۔ اب اس کے منزل پر پہنچنے کی کہانی سنئے۔ یہ واقعہ لیڈی لوگن نے اپنی آنکھ سے دیکھا وہ بیان کرتی ہیں:۔

"ملکہ معظمہ وکٹوریہ آنجہانی کو نوعمر مہاراجہ کے حالات سے بہت دلچسپی تھی۔ اور وہ مہاراجہ کو محلات شاہی میں اکثر بلاتی تھیں اور شاہزادے اور شاہزادیاں اُن سے بے تکلف کھیلتے اور رلتے ملتے تھے۔ ایک مرتبہ ملکہ معظمہ نے چاہا کہ نوجوان مہاراجہ کی ایک پورے قد کی تصویر ایک مشہور مصور سے کھنچوائی جائے۔ اس لئے یہ انتظام کیا گیا۔ کہ قصر بکنگھم میں تصویر بنوانے کے لئے نشستیں ہوا کریں۔ مہاراجہ کی عمر اس وقت سولہ یا سترہ برس کی تھی اور اس وقت بہت خوبصورت اور چھریرے بدن کا نوجوان تھا۔ جب مصور تصویر بنا رہا تھا تو ملکہ معظمہ مع اپنے شوہر کے کئی دفعہ دیکھنے آئی تھیں کہ تصویر کیسی بن رہی ہے اور سر جان لوگن اور میں مہاراجہ کے ہمراہ وہیں موجود ہوتے تھے۔ ایک دن جب مصور اُن قیمتی جواہرات کی جو مہاراجہ کے زیب گلو تھے۔ تصویر لینے میں مصروف تھا تو ملکہ معظمہ نے الگ بات کی کہ کوہ نور ہیرا جو تراشوانے کے لئے امسٹرڈیم میں بھیجا گیا تھا۔ واپس آ گیا ہے۔ مگر ابھی کسی موقعہ پر ملکہ نے اسے لوگوں کے روبرو نہیں پہنا ہے کیونکہ انہیں حجاب سا معلوم ہوتا ہے کہ مہاراجہ کے سامنے اس کے خاندان کا سب سے قیمتی ہیرا پہنے۔ ملکہ معظمہ نے مجھے حکم دیا کہ ہیرے

سے متعلق مہاراجہ کے خیالات معلوم کر کے انہیں اطلاع دوں۔ ان کے الفاظ یہ تھے۔

"مہاراجہ کبھی کوہ نور کا ذکر کرتا ہے یا نہیں؟ کیا یہ معلوم ہوتا ہے
کہ اسے اس کے جانے کا افسوس ہے یا اسے پھر دیکھنا چاہتا
ہے۔ اب تمہیں جب تصویر کے لئے وہ آئے اس سے پہلے جو کچھ
پتہ لگا سکو لگا کر اور جو کچھ وہ کہے اس کی من وعن مجھے اطلاع دو۔"

"ملکہ معظمہ کو کیا خبر تھی۔ کہ اس حکم سے مجھے کتنی گھبراہٹ ہوئی۔ مگر میں نے شکر کیا کہ پہلے سوال کے بعد انہوں نے دوسرا سوال بھی جھٹ کر دیا۔ ورنہ پہلے سوال کا جواب صفائی سے دینا بہت مشکل ہو جاتا۔ کیونکہ کوہ نور مہاراجہ کے خیال میں ہر وقت رہتا تھا، اور اس کی زبان پر بھی اس کا ذکر آتا تھا اور اس کے مصاحبوں اور رفقا کا بھی یہی حال تھا۔ ایک مشرقی شخص کی نگاہ میں وہ ہیرا ہندوستان کی شاہی کا نشان تھا اور اسے اپنی سلطنت کے جانے سے زیادہ اس نقصان کا احساس تھا۔ اس لئے میں بہت ڈرتی تھی کہ اگر یہ مضمون چھیڑوں تو خدا جانے وہ کن خیالات کا اظہار کرے۔ دن گزرتے گئے مگر کوئی موزوں موقع اس گفتگو کا نہ آیا۔ مگر جس دن پھر تصویر کے لئے جانا تھا۔ اس سے ایک دن پہلے میں نے کوشش کی کہ کچھ بات چلے۔ ہم گھوڑوں پر رچمنڈ پارک میں سیر کے لئے گئے تھے۔ کہ میں نے یوں بات شروع کی۔ سنا ہے کہ "کوہ نور" کی صورت تراش کے بعد بہت بدل گئی ہے۔ کیا آپ پسند کریں گے کہ اس کی موجودہ صورت دیکھیں۔ مہاراجہ نے جواب دیا۔ بیشک میں اسے دیکھنا چاہتا ہوں اور پھر ابھی چاہتا ہے کہ اسے اپنے ہاتھ میں ایک دفعہ پھر لوں" جواب کے اس آخری حصے سے میں بہت خائف ہوئی۔ کیونکہ میں جانتی تھی کہ اسے اس ہیرے کا کس قدر خیال ہے اور میں نے ڈرتے ہوئے پوچھا کہ آپ کو اسے اپنے ہاتھ میں لینے کا اتنا زیادہ شوق کیوں ہے؟" انہوں نے کہا۔ "اس لئے کہ جب صلح نامے کے رو سے مجبوراً میں نے اسے دیا تھا تو میں بچہ تھا مگر اب میں جوان ہوں۔ میں پسند کروں گا کہ میں اپنے اختیار سے اسے ملکہ کے ہاتھ دوں۔" مجھے اس جواب سے بہت تسلی ہوئی اور میں نے اس خیال سے کہ مہاراجہ کہیں کوئی اور مشکل شرط اس ارادے کے ساتھ وابستہ نہ کر دے۔ فوراً گفتگو کا مضمون بدل دیا۔ اور دوسرے دن کا خوشی سے انتظار کرنے لگی۔ تا کہ ملکہ معظمہ کو یہ خوشخبری دے دوں۔

"جب دوسرے دن میں شاہی محل میں مہاراجہ کے ہمراہ گئی اور مہاراجہ مصور کے پاس جا بیٹھا تو ملکہ معظمہ نے مجھ سے دریافت کیا اور میں نے بخوشی جو جواب حاصل کیا تھا اس سے انہیں مطلع کیا۔ ملکہ کو بھی اس جواب سے مسرت حاصل ہوئی اور انہوں نے اپنے شوہر کو جو مصور کے قریب کھڑے تھے۔ اشارہ سے بلایا اور ان کے کان میں کچھ کہا انہوں نے ایک مصاحب کو بلا کر کچھ پیغام دیا۔ کوئی آدھ گھنٹہ تک وہ دونوں ہم سے باتیں کرتے رہے کہ اتنے میں شاہی چوبداروں کا ایک گروہ "ٹاور آف لنڈن" سے آیا۔ اور ایک چھوٹا سا بکس اپنے ساتھ لایا انہوں نے وہ بکس ملکہ معظمہ کے سامنے پیش کیا اور ملکہ نے اسے جلد جلد کھولا اور مہاراجہ کو پکار کر کہا۔ "آؤ میں تمہیں ایک چیز دکھاؤں"۔ وہ اٹھ کر ملکہ کی طرف آیا اور ملکہ نے کوہ نور اس کے ہاتھ میں دے کر کہا" آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ ہیرا پہلے سے زیادہ آبدار ہو گیا ہے یا نہیں اور اگر آپ کو نہ بتایا جاتا کہ یہ کوہ نور ہے تو آپ اسے پہچان لیتے یا نہیں"۔

حقیقت تو یہ ہے کہ جس نے کوہ نور کو اس کی اصلی حالت میں دیکھا تھا۔ وہ آسانی سے اسے نہ پہچان سکتا۔ وزن اور قد تو پہلے سے آدھا رہ گیا ہے اور مشرقی نگاہ میں تو اس کی قدر و قیمت بھی آدھی ہو گئی ہو گی۔ میرا خیال ہے کہ مہاراجہ کے دل میں یہی بات گزری ہو گی۔ مگر وہ کچھ کہے بغیر کھڑکی کے قریب گیا۔ جیسے ہیرے کو زیادہ غور سے دیکھنا چاہتا ہے کبھی اس کا ایک پہلو دیکھتا تھا کبھی دوسرا۔ تاکہ روشنی اس کے ہر حصے پر پڑے۔ اس کی خصوصیتوں پر نظر ڈالتا تھا اور جو فرق اس میں آیا تھا اس کا ملاحظہ کرتا تھا۔ مگر دلچسپی کی اس ظاہری ادا کے ساتھ اس کے چہرے پر ان جذبات کے آثار تھے جنہیں وہ بزور دبا رہا تھا۔ میں جو اسے اچھی طرح جانتی تھی مجھے تو وہ جذبات صاف نظر آتے تھے۔ مگر میرے خیال میں ملکہ معظمہ سے بھی چھپے نہیں رہے۔ کیونکہ وہ ہمدردانہ نگاہ سے جس میں کچھ اندیشہ بھی ملا ہوا تھا۔ اس کے منہ کو تک رہی تھیں۔ وہ دس پندرہ منٹ جو اس حالت میں گذرے میرے لئے بہت گراں تھے۔ کیونکہ مہاراجہ ہیرے کو ہاتھ میں لئے ہوئے کبھی ادھر سے کبھی ادھر سے دیکھتا تھا۔ جس سے معلوم ہوتا تھا کہ ایک دفعہ پھر اسے پانے کے بعد اس کو اپنے ہاتھ سے جدا کرنا دشوار معلوم ہو رہا ہے۔ میرے خیالات کی پریشانی تو اس درجے تک تھی کہ میں ڈرتی تھی کہ کہیں وہ جوش

ہیں آکر طلسماتی ہیرے کو کھڑکی سے باہر نہ پھینک دے کہ اتنے ہیں مہاراجہ نے ایک آہ سرد بھر کر ہیرے سے نگاہ ہٹائی اور ملکہ کی طرف مؤدبانہ بڑھ کر ہیرا ملکہ معظمہ کی ہتھیلی پر رکھ دیا اور یوں گویا ہُوا:۔

"ملکہ معظمہ مجھے بہت خوشی ہے کہ مجھے یہ موقع ملا کہ بحیثیت
آپ کی وفادار رعایا ہونے کے میں خود اپنے فرماں روا
کی خدمت میں کوہ نور پیش کروں"

یہ کہہ کر مہاراجہ اس چبوترے پر واپس چلا گیا۔ جہاں مصور اس کی تصویر کھینچ رہا تھا اور تصویر اتروانے میں مصروف ہوگیا۔"

عبدالقادر

غزل

کچھ ایسا جی کہ اجل آئے اور ٹل جائے وہ آفتاب نہیں زندگی جو ڈھل جائے

محال ہے کہ بدل جائے آرزو میری غمِ حیات کی فطرت بھی گر بدل جائے

نہ پوچھ مجھ سے مرے دل کا حالِ زار نہ پوچھ ابد نہ آئے تو کیونکر غمِ ازل جائے

نہ رُک ہمالہ بھی گر تیرا سنگِ راہ بنے وہ عزم لا کہ ہمالہ بھی جس سے ٹل جائے

فسانۂ دل بیگانہ سازؔ سُن ظالم مری دعا ہے کہ تیرا بھی دل بدل جائے

اُمید و بیم کے جھگڑے مٹا محبّت میں کسی دعا پہ تری آرزو نہ ٹل جائے

حذر حذر غمِ فردا و دی سے اے ناداں وہ بات سوچ کہ تیری آج کل جائے

مذاقِ عشق سلامت میں ڈھونڈھ لاؤں گا وہ حُسن جس پہ ترا حُسن بھی مچل جائے

عمل کہاں تری فردِ عمل میں اے تائبؔ

جو جا سکے تو کوئی دل نشیں غزل جائے

(ملک) مراتب علی تائبؔ

نیلا بنگلہ

چچا جان کا حال ہی میں انتقال ہوا ہے اور یہ وہی کہانی ہے جو وہ مجھے اکثر سنایا کرتے تھے:۔

تم جانتے ہو (چچا کہا کرتے) کہ مجھے اپنے کاروبار کے ضمن میں فرانس کے طول و عرض میں لمبے لمبے سفر کرنے پڑتے تھے۔ ایسے ہی ایک سفر کے دوران میں، دیہات کے نواح میں میں نے ملیبی کے چھوٹے سے اسٹیشن کے قریب ایک عجیب ڈھنگ کا بنگلہ دیکھا اور اس کا رنگ اور بھی عجیب تھا۔

یہ رنگ نیلا تھا —— زردی مائل نیلا —— جو مینہ اور برف باری کے اثر سے اور بھی زرد ہو گیا۔ اور پھر آہستہ آہستہ بھورا سا ہو کر چھت اور کھڑکیوں کے رنگ سے مل جل گیا تھا۔

جب پہلے پہل میں نے اسے دیکھا —— غالباً آج سے چالیس سال پہلے کا ذکر ہے —— تو میں ایکسپریس میں سفر کر رہا تھا جو ذرا سی دیر کے لئے ملیبی کے اسٹیشن پر ٹھہرتی ہے مکان کے سامنے والے چھوٹے سے باغیچے میں قریباً نو سال کی ایک ننھی سی لڑکی پھولدار فراک پہنے اور بالوں میں نیلے رنگ کا فیتہ لگائے اپنی گڑیا کے ساتھ کھیل رہی تھی۔ اس کے گال گلاب کی طرح کھل رہے تھے اور وہ بے انتہا خوبصورت دکھائی دے رہی تھی۔ میری طبیعت کچھ اداس سی تھی کیونکہ ان دنوں کاروبار کا حال ذرا پتلا ہو رہا تھا اور اس روز پیرس کو واپس آتے ہوئے تمام راستہ میرے خیالات مضمحل اور پراگندہ رہے۔ باغیچے کے اس پرکیف نظارے نے میرے دل کو کچھ تسکین دی۔ معلوم نہیں یہ کھلی ہوئی فضا کا اثر تھا یا اس ننھی حسینہ کا سحر یا اس دیہاتی علاقے کی رنگینی جو میری آنکھوں میں کھبی جا رہی تھی!

میں نے اپنے دل میں سوچا "یہ بہشت ارضی کس قدر پرسکون اور مسرت افزا ہے۔ جہاں نہ کوئی غم ہے نہ فکر!" مجھے اس تیتری کے مسرور اور بے پروا بچپن پر بڑا رشک آیا۔

گاڑی ابھی چلی ہی تھی کہ یکایک بنگلے کی ایک کھڑکی کھلی اور کسی نے آواز دی "لارا!"

لڑکی اندر چلی گئی۔ لارا۔ کتنا پیارا نام تھا عجیب بات ہے کہ قریباً گھنٹہ بھر بعد اُس کسل کے دوران میں جو اکثر لمبے سفروں میں انسان پر طاری ہو جایا کرتی ہے۔ وہ سارا نظارہ ایک دفعہ پھر میری آنکھوں میں پھر گیا۔ وہ لڑکی، گڑیا، باغیچہ اور وہ نیلے رنگ کا بنگلہ۔ اور پھر یہ سب چیزیں میرے دماغ سے محو ہو گئیں۔ مجھے بالکل بھول گئیں۔ اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ مدتوں تک مجھے اس طرف کوئی کام ہی نہ پڑا۔ میں زیادہ تر شمالی اور مشرقی فرانس ہی میں پھرتا رہا —— کبھی للّے کبھی نینسی، اور اس کے علاوہ تم جانتے ہو میری توجہ کے لئے اور تھوڑی باتیں تھیں؟ قریباً دس سال یونہی گذر گئے اور پھر ایک بہار میں صبح کو میں مارسیلز گیا اور واپسی پر چونکہ پرانی یادیں پھر تازہ ہو گئی تھیں۔ میں ارادۃً رات کی گاڑی میں سوار ہو گیا تاکہ صبح اسی اسٹیشن پر ٹھہر سکوں۔ نیلا بنگلہ ابھی موجود تھا لیکن اس کی نیلاہٹ اب اڑتی جا رہی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ بنگلے کی غور و پرداخت پر کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی۔

باغ میں ایک بلند قامت خوبصورت لڑکی بیٹھی تھی۔ اس کے بالوں میں پیازی رنگ کا فیتہ بندھا تھا۔ یہ لارا تھی۔ میں نے پہلی ہی نظر میں اسے پہچان لیا۔ اس کے قریب ہی ایک نوجوان کھڑا تھا جس کی تمام تر توجہ اسے خوش کرنے پر مرکوز تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ اس کا منگیتر تھا۔ ان کے گرد و پیش ویسی ہی پرسکون اور طمانیت بخش فضا موجود تھی۔ جس کا احساس میں نے آج سے دس سال پیشتر کیا تھا۔

انہیں دیکھ کر مجھے بے انتہا مسرت ہوئی، میرا دل خوشی سے اچھلنے لگا۔ اتنے میں گاڑی چھوٹ گئی۔ میں نے کھڑکی سے سر باہر نکال کر انہیں اشارہ کیا اور چلّا کر کہا "مس لارا! الوداع!"

لڑکی نے حیرت بھری نظروں سے میری طرف دیکھا، پھر لڑکے کی نظر مجھ پر پڑی۔ دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑے اور میں انہیں گاڑی کی کھڑکی سے تعظیماً جھکتے ہوئے اور رومال ہلاتے ہوئے دیکھتا رہا۔ میری مسرت کی کوئی انتہا نہ تھی۔

کچھ سال اور گذر گئے۔ لیکن اس عرصے میں اگرچہ میں مارسیلز کی

لائن پر ہی رہا لیکن اتنا مصروف تھا کہ ایک دو گھنٹوں کو بچانے کے خیال سے پہلی گاڑی پر سوار ہو جاتا رہا جو اس اسٹیشن پر ٹھیرے بغیر رات کی تاریکی ہی میں گذر جاتی ہے۔ ایک دن جب مجھے کچھ فرصت تھی میں پھر رات والی اکسپریس پر سوار ہوا جو صبح کے وقت وہاں ٹھیرتی ہے۔ اُس واقعے کو آج کتنی مدت ہو گئی تھی۔ جب میں نے پچھلی دفعہ لارا کو اپنے منگیتر کے پاس بیٹھے دیکھا تھا ــــ بارہ سال یا شاید پندرہ سال۔ مجھے ٹھیک طرح یاد نہیں رہا تھا۔

اب کی مرتبہ جو گاڑی اس اسٹیشن پر ٹھیری تو سوائے ایک چھوٹے سے لڑکے کے باغیچے میں اور کوئی نہ تھا۔ لڑکا پیٹ کے بل گھاس پر لیٹا ہوا تھا اور ایک بڑے سے کُتے کے ساتھ کھیل رہا تھا لیکن لارا کہاں تھی؟ میرا دل اداس ہو گیا۔ یکایک لڑکے نے آواز دی "اماں! اماں! گاڑی آگئی"۔

اس آواز پر ایک خاتون گھر سے باہر آئیں ظاہر ہے کہ یہی لارا تھی۔ کچھ موٹی ہو گئی تھی اور حسن میں بھی اب وہ دلکشی باقی نہ تھی تاہم میں نے اسے فوراً پہچان لیا۔ میرے دل پر عجیب رقت سی طاری ہو گئی۔ میں نے تعظیماً ٹوپی اٹھا کر اسے سلام کیا۔ اس نے کسی قدر حیرت زدہ نظروں کے ساتھ میری طرف دیکھتے ہوئے سلام کا جواب دیا۔ اس کی طبیعت اب بھی اپنی سادہ زندگی کی طرح تکلف سے خالی تھی۔ جب گاڑی چلنے لگی تو میں نے اس سفر کی یادگار کے طور پر بچے کی طرف ایک سنگترہ پھینکا جو گھاس پر لڑھکتا ہوا چلا گیا اور کتا اسے پکڑنے کے لئے اس کے پیچھے بھاگا۔

اب میری زندگی کا ایک ایسا دور شروع ہوا جو عجیب و غریب اور اہم واقعات سے پُر ہے۔ مندرجہ بالا واقعے کے فوراً ہی بعد مجھے کاروبار کے ضمن میں ترکی کا سفر اختیار کرنا پڑا جو حادثات سے اتنا پُر تھا کہ باوجود اتنا طویل زمانہ گذر جانے کے آج بھی جب میں اس کا خیال کرتا ہوں تو ایک ڈراونا خواب معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ تھوڑا بہت اثاثہ جو اس وقت میرے پاس ہے۔ اس کے جمع کرنے کے لئے مجھے زمانے کی بہت سی اونچ نیچ دیکھنی پڑی۔ یہ تو تمہیں معلوم ہی ہے کہ اسی سفر کے دوران میں بحیرۂ اسود میں ہمارا جہاز تباہ ہو گیا تھا۔ تم اس بات کا اچھی طرح اندازہ کر سکتے ہو کہ اُن مصروفیات میں مجھے بھول کر بھی نیلے بنگلے کا خیال نہ آ سکتا تھا۔ لیکن قدرت کی نیرنگی دیکھئے کہ اس تباہ شدہ جہاز پر عین اس لمحے میں جب میرے اور موت کے درمیان صرف ایک لکڑی کا تختہ حائل تھا۔ مجھے اسی کا خیال آیا اور تمام واقعات میری آنکھوں کے سامنے یوں پھر گئے جیسے آج ہی کی بات ہے۔ میں نے اپنے دل میں کہا۔ "جان! دنیا میں یوں گھومتے پھرنے کا آج تجھے مزا مل جائے گا۔ حالانکہ اگر تو چاہتا تو لارا کی طرح پرگندی کی تابناک فضا میں کسی ایسے ہی نیلے بنگلے میں آرام و سکون سے اپنی زندگی کے دن گذار سکتا تھا اور آج یہ روز بد دیکھنا تجھے نصیب نہ ہوتا"۔

خیر اُس روز میں خوش قسمتی سے بچ نکلا اور جیسا کہ میں نے تمہیں اکثر بتایا ہے۔ قریباً دو گھنٹے کے بعد جب تکان سے میری جان لبوں تک پہنچ گئی تھی ایک ڈوچ جہاز نے مجھے بچا لیا۔ یہ بالکل ایک معجزہ تھا۔ قریباً پندرہ یا بیس سال کے بعد ــــ صحیح تاریخ بھول جانا اب میری عمر کا تقاضا ہے ــــ میں فرانس میں واپس آیا اور کچھ دنوں کے بعد مارسیلز سے گذرا اور شاید آخری بار پیرس آنے والی گاڑی پر سوار ہوا۔ میری طبیعت بڑی قانع واقع ہوئی ہے۔ اس لئے جو کچھ میں اس وقت تک کما سکا تھا میں نے اسے اپنے آخری دن گذارنے کے لئے کافی سمجھا۔ چنانچہ یہ میرا آخری سفر تھا، میری جدوجہد کی زندگی کا خاتمہ۔

دن کے گیارہ بجے ہماری گاڑی بلیسی کے اسٹیشن پر پہنچی۔ شاید تمہیں یقین نہ آئے۔ میرا دل جوش مسرت سے بلیوں اچھل رہا تھا اور میں تم سے سچ کہتا ہوں اس کے چند ہی گھنٹے بعد اپنے بال بچوں سے مل کر مجھ پر اتنا اثر نہ ہوا۔

اسٹیشن کے سامنے نیلا بنگلہ اسی طرح روز روشن میں کھڑا دکھائی دیا۔ معلوم نہیں کس عجیب طریقے سے خیالات کی کڑیاں ایک دوسری سے ملحق ہوتی ہیں کہ عین اسی وقت بحیرۂ اسود میں جہاز کی تباہی کا نظارہ میری آنکھوں کے سامنے پھر گیا۔ اُس روز بھی یہ بنگلہ اسی طرح خاموش اور بے پرواانداز میں کھڑا ہوگا۔ جبکہ میں اپنی زندگی کے آخری لمحوں میں اس کے متعلق سوچ رہا تھا۔ ہماری گاڑی عین مکان کے سامنے آکر رُکی اور میں نے دیکھا کہ باغ میں ایک درخت کے سائے تلے ایک ادھیڑ عمر کی عورت اپنی لمبی ٹوپی کے نیچے سفید کپڑے کا پردہ ڈالے اپنے بیٹوں، بیٹیوں اور پوتوں، پوتیوں میں گھری بیٹھی ہے۔

یہ تھی لارا! میں نے اسے ایک ہی نظر میں پہچان لیا۔ مجھ سے غلطی کیسے ہو سکتی تھی۔ پھر میرے دماغ میں ایک بجلی سی کوند گئی جس کی روشنی میں میں نے ایک ننھی سی بچی کو اپنی گڑیا کے ساتھ کھیلتے ہوئے دیکھا، پھر ایک نوجوان لڑکی کو، پھر ایک ماں کو اور اب ایک بڑی اماں میرے سامنے

تھی۔ ہر مرتبہ ایک نئی صورت میں لیکن ہمیشہ اپنے خاص انداز میں۔

اس وقت میرا دل جدائی کے خیال سے بے حد مغموم ہو گیا۔

مجھے اس بات کا احساس ستا رہا تھا کہ شاید اب میں کبھی اس طرف سے نہیں گذر سکوں گا اور میرا دل چاہتا تھا کہ کاش تھوڑی دیر کے لئے میں اور یہاں ٹھہر سکوں، اس چالیس سال کی پرانی اجنبی شناسا سے کم از کم دو باتیں تو کر لوں۔ اسے خوش قسمتی کہئے یا اتفاق کہ گاڑی کے انجن میں کوئی معمولی سا نقص پیدا ہو گیا اور ہمیں بتایا گیا کہ کم از کم ایک گھنٹے تک ہمیں یہیں رُکنا پڑے گا۔ میں نے اس سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔

باغیچے کے پھاٹک کی طرف بڑھتے ہوئے میرا سارا بدن کانپ رہا تھا۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میں کبھی بات سے اتنا متاثر نہیں ہوا۔ میں کوئی کمزور طبیعت کا آدمی نہیں تھا اور میرا لڑکی کا خطرناک سفر اس بات پر شاہد تھا۔ بہر حال میں نے جرأت کر کے گھنٹی بجا دی۔ باغبان نے آ کر دروازہ کھول دیا اور میں نے اسے بتایا کہ میں گھر کی مالکہ سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ مجھے احاطے میں داخل کر کے مالکہ کو اطلاع دینے چلا گیا اور وہ آ گئی۔

لمحہ بھر میں لارا میرے سامنے تھی لیکن اب میں اس سے کیا کہوں؟ یہ مجھے معلوم نہ تھا۔ آخر اس نے خاموشی کو توڑا اور بولی:۔

کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ مجھے کس سے شرف نیاز حاصل ہے؟"

میں نے شرماتے ہوئے پوچھا "آپ مجھے پہچانتی نہیں؟"

"نہیں، بالکل نہیں"۔

"لیکن میں تو آپ کو بہت اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ میں آپ کو بڑی مدت سے جانتا ہوں میں نے آپ کو اس وقت دیکھا تھا۔ جب آپ ننھی سی بچی تھیں اور اسی باغ میں ایک گڑیا کے ساتھ کھیل رہی تھیں اور میں ہی وہ شخص ہوں جس نے آپ کو گاڑی کی کھڑکی سے سلام کیا تھا۔ جب آپ اپنے منگیتر کے ساتھ باغیچے میں کھڑی تھیں اور پھر اس کے کچھ عرصہ بعد میں نے ہی سنگترہ ننھے کی طرف . . . .

نیک دل عورت پہلے تو میری طرف پھٹی پھٹی اور خوف زدہ آنکھوں سے گھورتی رہی اور چند قدم پیچھے بھی ہٹ گئی، یقیناً وہ مجھے پاگل سمجھ رہی تھی۔ لیکن پھر میرے چہرے پر دیوانگی کے آثار نہ پا کر اسے کچھ تسلی ہوئی اور وہ نہایت نرمی سے بولی:

صاحب! آپ سے یقیناً کوئی غلطی ہوئی ہے۔ مجھے اور میرے کنبے کو یہاں آئے مشکل سے ایک سال بھی نہیں ہوا"۔

میرا سر چکرا گیا۔

"تو ۔۔۔ آپ کا ۔۔۔ نام ۔۔۔ لارا نہیں ہے"؟

"لارا؟ معلوم نہیں آپ کا مطلب کیا ہے۔ ہمارے تو خاندان بھر میں اس نام کی کوئی عورت نہیں"۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔

جب وہ جانے لگی تو میں نے کہا "محترم خاتون، معاف کرنا، لیکن ایک سوال اور پوچھنا چاہتا ہوں۔ آپ سے پہلے اس بنگلے میں کون رہتا تھا؟"

"ہم سے پہلے؟ ایک معمر سے صاحب تھے۔ لیکن ان کے تو کوئی بیوی بچہ نہ تھا۔ وہ قریباً دس سال سے یہاں مقیم تھے"۔

عورت نے تکلفاً سر جھکایا اور مجھے باہر تک چھوڑ کر دروازہ بند کر لیا۔

حیران و پریشان سا ہو کر میں بلیسی کی گلیوں میں یوں گھومنے لگا۔ جیسے مجھ پر کوئی بہت بڑا حادثہ گذر گیا ہے۔ بہر حال میں نے تہیہ کر لیا کہ اس کے متعلق مزید تحقیقات کر کے حقیقت ضرور معلوم کروں گا۔ اتنی بات تو یقینی تھی کہ اس معاملے میں کوئی زبردست غلط فہمی اور کوئی عجیب تر حادثہ کارفرما تھا۔

میں نے سٹیشن ماسٹر سے پوچھا۔ اسے بھی کچھ معلوم نہ تھا کیونکہ وہ نیا نیا تبدیل ہو کر اس سٹیشن پر آیا تھا۔ لیکن اس نے مجھے ایک نیک دل بڈھے کا پتہ دیا جو نیلے بنگلے کے سامنے ہی رہتا تھا اور گاؤں بھر میں سب سے بوڑھا آدمی تھا۔

بڈھا کچھ دیر اپنے حواس بجا کرنے کی کوشش کرتا رہا "لارا .... ٹھہریئے .... لارا .... مجھے تو یاد نہیں ...."

میں نے کہا "لیکن وہ عورت کون تھی۔ ذرا بھاری سے جسم کی، ہلکے سنہری بالوں والی اور ایک ننھا سا لڑکا اور ایک بڑا سا کتا جنہیں میں نے اسی باغ میں آج سے پندرہ سال پہلے دیکھا تھا"

"بڑا سا کتا .... ٹھہرو ٹھہرو .... بڑا سا کتا .... ہاں اب مجھے یاد آ گیا۔ وہ تو میڈم مارگریٹ تھی، ہمارے سپرنٹنڈنٹ کی بیوی۔ لیکن اس کا نام تو لارا نہیں تھا۔ مجھے وہ اچھی طرح

یاد ہے، میں اکثر ان کے گھر بھی جاتا رہا ہوں۔ اس کا نام توفر نیکائز تھا۔"
مجھ پر گویا بجلی ہی گر پڑی۔

"لیکن بڑے میاں، ٹھہریے، کیا آپ کو اس سے پہلے کے حالات بھی یاد ہیں اس سے قریباً بارہ سال پہلے، ایک نوجوان لڑکی، خوبصورت اور بلندقامت، بالوں میں ایک پیازی رنگ کا فیتہ باندھے ہوئے اور پھر ایک جوان لڑکا جو غالباً اس کا منگیتر تھا۔"

بوڑھا بڑی کوشش سے سوچنے لگا۔ آخر اس نے اپنی بیوی کو بلایا۔ ایک چھوٹے سے قد کی عورت جس کی چمکدار آنکھیں اور پھرتیلی حرکات اس کی ہوشمندی کی گواہی دے رہی تھیں۔

"وہ لڑکی؟ وہ تو مس سٹیفن تھی، ٹھیکیدار کی بیٹی..... بلند قامت اور پیازی فیتے..... ہاں وہی تو تھی۔ اس نے ڈیجان کے ایک دکاندار سے شادی کی تھی۔ اب تو اسے طلاق ہو گئی ہے۔ وہ سامنے والے گاؤں میں اپنے والدین کے پاس رہتی ہے۔ بے چاری غریب بڑی دکھیا ہے۔"

میرا سر چکرانے لگا۔ گھنٹہ ختم ہو رہا تھا اور گاڑی جلد ہی چھوٹنے والی تھی۔

میں نے کہا "لیکن لارا کے متعلق مجھے ابھی تک معلوم نہ ہوا، لارا کون تھی۔ میں نے اسے اپنی ان آنکھوں سے دیکھا تھا جب وہ ابھی بچہ ہی تھی وہ اپنی گڑیا کے ساتھ اس باغ میں کھیل رہی تھی۔"

"او ہو صاحب! آپ نے مجھ سے پہلے ہی کیوں نہ پوچھا۔ کبھی آپ ایک بڑھیا کے متعلق پوچھتے ہیں۔ کبھی ایک نوجوان عورت کے متعلق اور پھر ایک ننھی لڑکی کے متعلق۔ لیکن خیر کچھ مضائقہ نہیں۔ ہاں ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے، میرے حواس ابھی تک بالکل بجا ہیں (فخریہ انداز میں اس نے کہا) لارا! ٹھیک! مجھے یاد ہے۔ لیکن اس بات کو کتنا عرصہ ہوا ہے۔ کیا آپ قریباً چالیس سال کی بات تو نہیں کر رہے ننھی سی خوبصورت لڑکی، گاؤں کے دوا فروش کی بیٹی تھی۔ وہ ہمارے رشتہ دار تھے۔ آہ! وہ دس سال کی عمر میں مر گئی تھی۔ ——مئی کے مہینے میں۔"

دس سال کی عمر، اس سال مئی کے مہینے میں یعنی عین وہی سال اور وہی مہینہ جس میں پہلی مرتبہ میں نے نیلا بنگلہ دیکھا تھا میرے گذرنے کے چند ہی دنوں کے بعد۔ ۔ اور میں چالیس سال سے زیادہ عرصے تک اس کی زندگی کا مطالعہ کرتا رہا تھا!

اس موقع پر پہنچ کر چچا جان ہمیشہ اداس سے ہو جاتے تھے۔ پھر اپنا ہاتھ اپنی پیشانی پر دو تین دفعہ پھیرتے اور نہایت دھیمی آواز میں کہتے:-

تم نے دیکھا، میرے بیٹے! میری کہانی گو کچھ ایسی اہم تو معلوم نہیں ہوتی۔ لیکن اس میں زندگی کا ایک بڑا مفید سبق پنہاں ہے اور وہ یہ کہ ہمیں اپنی زندگی کے خوابوں سے پورا لطف اٹھانے کے لئے ان کو کریدنا نہیں چاہئے۔ اور نہ خواب کی تفصیلات معلوم کرنے کے لئے ہمیں اپنی آنکھیں اتنی زیادہ کھولنی چاہئیں کہ نیند ہی اُچاٹ ہو جائے۔

عمانوئیل آریرین

مظفر احمد

گداگر

یہ شام کا عالم یہ سیہ فام گھٹائیں
یہ ابر یہ طوفان یہ سنسان فضائیں
مچلی ہوئی ناگن کی طرح سرد ہوائیں
بپھرے ہوئے طوفان کی پُر ہول صدائیں
مضبوط درختوں کو گراتی ہوئی آندھی
اک شور بیاباں میں مچاتی ہوئی آندھی
بادل کا گرجنا کبھی بجلی کا کڑکنا
سہمے ہوئے آفاق کی چھاتی کا دھڑکنا
دو روز سے طوفاں نہ تھما ہے نہ رُکا ہے
آفت کی طرح عرصۂ دنیا پہ جھکا ہے

یہ عالمِ تاریک ہے اور ایک گداگر
بیٹھا ہے شکستہ سا فسردہ سا زمیں پر
کٹیا میں نہ بتی ہے نہ بجلی کی چمک ہے
پھیلی ہوئی کچھ آگ کی ہلکی سی دمک ہے
کھانے کے لئے پاس نہ آٹا ہے نہ دانہ
ہر سانس ہے غربت کا الم خیز فسانہ
طوفان میں بستی کی طرف جا نہیں سکتا
کچھ مانگ کے کھانے کے لئے لا نہیں سکتا
خاموش ہے اس طرح کہ تصویر ہے گویا
ہر سانس جگر کے لئے اک تیر ہے گویا
جی بھر کے نہ کھانا کبھی جی بھر کے نہ پینا
دنیا میں غریبوں کا ہے جینا کوئی جینا

یہ مفلسی، یہ وادیٔ غربت، یہ بیاباں، یہ رات، یہ برسات، یہ تنہائی، یہ طوفاں،
مر جائے تو دنیا کا زیاں کچھ بھی نہیں ہے
اور زیست میں راحت کا گماں کچھ بھی نہیں ہے

باقی صدیقی

خیالاتِ پریشاں

بتوں میں وہ کافر ادا ایک ہے — اُسی طرح جیسے خدا ایک ہے

ترے کوچے[۱] سے جب کوئی پلٹ کر شاد آتا ہے — وہ دھوکا میں جو تجھ سے کھا چکا ہوں یاد آتا ہے

ترے صدقے، ترے جلووں کا یہ احسان کیا کم ہے — ترے جلووں نے خود میرے لئے تکلیف فرمائی

ترے بے خبر کو یہ کیا کم خبر ہے — کہ تو مبتدا اور عالم خبر ہے

تمہارا کرم اور ہمیں یاد رکھے — تمہارے کرم کو خدا شاد رکھے!

افسوس، بے شمار سخن ہائے گفتنی — خوفِ فسادِ خلق سے ناگفتہ رہ گئے

آ، مگر اِس قدر قریب نہ آ — کہ تماشا محال ہو جائے

حکیم آزاد انصاری

[۱] یہ شعر فارسی کے اُس مشہور شعر کا ترجمہ ہے۔ چو می بینم کسے از کوئے تو دلشاد می آید، فریبے کز تو اول خوردہ بودم یاد می آید (آزاد انصاری)

دنیائے ادب

شرر کی شاعری

مرحوم مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی کو بحیثیت ایک ناول نگار، نثر نویس اور مورخ کے تو ایک دنیا جانتی ہے اور شاید ہی ادب اُردو کا کوئی دلدادہ ایسا نکلے جو مولانا کے کارناموں سے واقف نہ ہو۔ چنانچہ باوجود نصف صدی گذر جانے کے آج بھی اُن کی تصانیف خصوصاً اُن کے ناول بڑی دلچسپی سے پڑھے جاتے ہیں لیکن اس امر کو بہت کم لوگ جانتے ہوں گے کہ مرحوم شاعر بھی تھے۔ اس میدان میں انہیں شہرت نصیب نہ ہونے کا ذکر دلچسپی سے خالی نہیں۔ ایک تو مولانا نے شاعری پر اپنی پوری توجہات کبھی مرکوز نہیں کیں اور زیادہ تر نثر نویسی ہی سے خدمتِ زبان کا کام لیا (وہ پُر گو نہیں تھے۔ ساری عُمر میں انہوں نے صرف چند نظمیں کہیں۔ دوسرے وہ مروّجہ اصنافِ شعر سے قطعاً دل برداشتہ تھے۔ غزل اردو شاعری کی مقبول ترین صنف ہے، لیکن مولانا اسے ادبی و شعری ترقی کی راہ میں سنگِ گراں سمجھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے کبھی اس میں طبع آزمائی نہیں کی اور محض شاعر کہلانے کے لئے "تُک بند" بننا پسند نہیں کیا۔ یہی نہیں بلکہ اُردو شاعری کو ردیف وقافیہ کی مضر قیود سے آزاد کرانے کے لئے وہ اپنی تمام کوششیں بروئے کار لائے۔ ان کی دلی آرزو تھی کہ ان ظاہری اور لفظی پابندیوں نے اردو شاعری کی معنوی ترقی کی راہیں جو مسدود کر دی ہیں وہ کسی طرح وا ہو جائیں اور ہمارے شعراء ان بیرونی قیود سے آزاد ہو کر اپنے فکر و تخیل کو کھلی پرواز دے سکیں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں انہوں نے انگریزی شاعری کی چند اصناف مثلاً نظم معرّیٰ (BLANKVERSE) نظمِ آزاد (FREEVERSE) سٹینزا (STANZA) وغیرہ کو رائج کرنے کی کوشش کی۔ خود بھی ان میں طبع آزمائی کی اور دوسروں کو بھی اس طرف متوجہ کیا۔ اردو شاعری میں ردیف وقافیہ کے خلاف بغاوت کے اوّلین علمبردار شرر اور نظم طباطبائی ہی تھے۔ اس مقبولِ عام چیز کے خلاف جہاد کرنے کا انجام وہی ہوا جو عام طور پر ہوا کرتا ہے یعنی ہر طرف سے اُن پر اعتراضات کی بوچھاڑ ہونے لگی۔ بجائے اس کے کہ اس ادبی مہم میں اُن کی ہمنوائی کی جاتی، الٹا اُن کی حوصلہ شکنی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا گیا۔ چنانچہ جب ایک طویل جدوجہد کے بعد بھی انہوں نے اپنی کوششوں کو بار آور ہوتے نہ دیکھا۔ اور اپنی آواز کو محض صدا بصحرا پایا تو آخر بادلِ ناخواستہ انہیں اصلاح کا ارادہ ترک کرنا پڑا۔ ازبسکہ انہوں نے شعر کی ایک ایسی صنف میں طبع آزمائی کی تھی جو اُردو داں طبقہ کے لئے بالکل نئی اور غیر معروف تھی اور جسے ان کا مذاق قبول نہیں کرتا تھا۔ اس لئے شرر کا جو تھوڑا بہت کلام تھا بھی وہ شہرت نہ حاصل کرسکا نتیجہ یہ ہے کہ آج بہت کم لوگ ایسے ہیں جنہیں ان کے شاعر ہونے کا علم تک بھی ہے۔

مولانا کی شاعری کی کل کائنات چند مقفّٰی نظموں، دو ایک مختصر ناٹکوں اور (نظمِ معرّیٰ میں) ایک طویل مگر نامکمل ڈرامے پر مشتمل ہے۔ غزل اور دیگر اصنافِ شعر جن سے اردو داں طبقہ بالعموم واقف ہے۔ ان کے یہاں سرے سے غائب ہیں۔ اس کی وجہ (جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے) ردیف قافیہ سے ان کی طبعی نامناسبت ہے جو چند مقفّٰی نظمیں انہوں نے لکھی بھی ہیں، وہ نہایت عامیانہ درجہ کی ہیں۔ ان میں کوئی خاص خوبی، کوئی جدّت، کوئی امتیازی شان نہیں۔ وہی فرسودہ مضامین ہیں (مثلاً شبِ وصل، شبِ غم وغیرہ) اور وہی پامال طرز۔ البتہ بیان میں سادگی اور سلاست ہے اور لفظی تعقید اور مشکل الفاظ سے گریز۔ نمونہ ملاحظہ ہو:-

رات کا منظر۔

آئی رات بدلی اندھیاری — چرخ پہ تاروں نے کی گلکاری
کیسی رات مبارک ماشا — اچھی اچھی پیاری پیاری

اب پازیب بڑھاتے ہوں گے
تھوڑی دیر میں آتے ہوں گے (شب وصل)

صبح کی آمد:-

میکشو! وقتِ صبوحی آیا — مہوشو! جاؤ نہانے گنگا
برہمنو! لو دیر کا رستا — طائرو! بستر چھوڑو بسیرا
واعظ! رات فنا ہوتی ہے
دیکھو نماز قضا ہوتی ہے (شب غم)

طوفان:-

بسیروں پہ چڑیاں سمیٹے ہیں بازو — گھنی جھاڑیوں میں دبکتے ہیں آہو
درختوں میں جا جا کے چھپتے ہیں جگنو — ابھتے ہی جاتے ہیں ظلمت کے آنسو
درختوں کے پتے ہیں کیا کھڑکھڑاتے
زمیں پر ہیں کیا ٹہنے پھٹ پھٹ کے آتے (زمانہ اور اسلام)

مولانا کی صحیح شاعرانہ عظمت اور ان کے اجتہادی رتبہ کا پتہ اُن کی مقفّی نظموں سے نہیں بلکہ اُن کے نظم معرّیٰ میں لکھے ہوئے ناٹکوں سے چلتا ہے۔ انہوں نے اُردو میں غیر مقفّی نظم کو رواج دینے کی کوشش کی اور اگرچہ فطرتاً غیر شاعر ہونے نیز معاصرین کی مخالفت، گوناگوں مشکلات اور صحافتی مصروفیات کے باعث ان کی سعی مشکور نہ ہو سکی، تاہم انہوں نے اردو شاعری میں ایک نئے باب کا افتتاح کیا۔ "اردو شاعری میں شرر کو اگر کوئی جگہ مل سکتی ہے تو وہ اُن کی غیر مقفّی نظموں کی بدولت ہے" انہوں نے شکسپیر کے ناٹکوں کی طرز پر ایک طویل ڈراما نظم معرّیٰ میں اپنے رسالہ "دلگداز" کے ذریعہ سے اردو داں پبلک کے سامنے پیش کرنا شروع کیا تھا۔ اردو کی یہ اوّلیں طویل غیر مقفّی نظم تھی اور اب تک آخری بھی۔ شرر نے اس کو اتنی محنت سے لکھنا شروع کیا تھا کہ اُن کے اس نومولود ڈرامے کو انگریزی کی معرّیٰ نظموں کے سامنے فخر سے پیش کیا جا سکتا ہے۔ لیکن افسوس کہ بوجہ صحافتی مصروفیات کے وہ اس کے چند سے زیادہ سین نہ پیش کر سکے۔ تاہم جس قدر حصہ اس کا موجود ہے۔ اسے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شرر کسی غیر زبان کا اتباع نہیں کر رہے۔ بلکہ اس صنف شعر پر کامل قدرت حاصل کر کے خود اپنی زبان میں ایک نئی صنفِ شعر کی طرح ڈال رہے ہیں۔"

مثلاً ملاحظہ ہوں چند اقتباسات:-

عشق نبرد اندوہ و نبرد آلام عشق

ظلم سے تیرے بچا ہے کوئی بھی؟ کہسار سے
بہ رہی ہیں آنسوؤں کی ندیاں اور آندھیاں۔
خاک اڑاتی پھرتی ہیں۔ اور تو اے آسماں
ماتمی پوشاک پہنے ہے خود اپنے سوگ میں۔
اور تارے گویا انگارے ہیں جن پر لوٹتی
ہے نظر میری مری امیدوں کو لے کر عجب
بے قراری اور بے تابی کے ساتھ

سین ۵

صبح اب ہونے کو ہے۔
دیکھئے جھونکے نسیمِ صبح کے وہ آپ کی
زلف برہم کر رہے ہیں اور تاروں کے چراغ
جھلملاتے ہیں فلک پر۔ اور سیہ چادر یہ شب
کی سمٹتی جاتی ہے۔ ایسا نہ ہو چڑیاں اٹھیں
اور جگا دیں راز داں کو۔

سین ۲-

آہ دنیا تجھ میں کیا کیا لطف ہیں! کس شان سے
دیکھ سورج ڈوبتا ہے۔ اور کرنیں کس طرح
پانی پر افشاں چھڑکتی ہیں۔ ادھر اس کوہسار
کو کیا طلائی کپڑے سورج نے پہنائے ہیں جہاں
گھاس کی وہ ننھی ننھی پتیاں اس دھوپ میں
جگنوؤں کے مثل تاباں ہیں۔ وہاں اس بیل نے
کیا طلائی جھالریں منقش کی لٹکائی ہیں۔
پھول بھی ہر رنگ کے اس جا کھلے ہیں۔ اور وہ
دیکھ کلیاں مسکراتی ہیں عجب انداز سے۔
دیکھ کر یہ لطف چڑیاں خوش ہیں۔ اور کس
جوش سے سب چہچہا اٹھتی ہیں۔ کیسی شاد ہیں!
جس کو دیکھو خوش ہے۔ لیکن آہ! اک میں ہوں کہ دل
کو قرار آتا نہیں ——— الجھن ہے۔ بے تابی ہے، اور
ہر گھڑی اک درد ہے۔

سین ۴

مولانا نے دو ایک مختصر ناٹک بھی لکھے تھے۔ ان میں سے ایک

سے ذیل کا اقتباس مولانا کی شاعری کے بہترین نمونوں اور شہ پاروں میں سے ایک ہے:۔

نورِ ایماں مرے دل کے ملکوتی مہماں
ساکنِ سینہ پر داغ وانیس دحرماں
مرحمت کر تو ہمیں اپنی دوائے تسکیں
دے وہ پر جن سے اڑے قلب بسوئے افلاک
خاک کی تیرہ کثافت سے ہوں یہ آنکھیں صاف
اور آزاد غم و درد سے ہو جائیں یہ!

شرر کے کلام کی سب سے نمایاں خصوصیت سادگیٔ بیان ہے وہ مفہوم کو الفاظ کے ہیر پھیر میں نہیں چھپاتے۔ نہ مشکل اور گراں بار الفاظ سے ناظر کو مرعوب کرنے کی کوشش ہی کرتے ہیں۔ دو طرح کے الفاظ پر قدرت رکھنے کے باوجود انہیں سادہ اور آسان الفاظ مرغوب ہیں۔ ان کے پسندیدہ موضوع مناظرِ قدرت، فطری جذبات اور تاریخ ہیں۔ اگرچہ کردار نگاری میں وہ کامیاب نہیں رہے لیکن منظر کشی اور فضا پیدا کرنے میں ان کی اُستادی مسلّمہ ہے۔ ان کے ہاں (نثر میں بالخصوص) انگریزی الفاظ کا حد سے بڑھا ہوا استعمال اگرچہ کہیں کہیں کھٹکتا ہے لیکن غیر زبانوں کے کئی خوبصورت مناسب الفاظ اردو لغت میں داخل کرنے کے لئے اردو زبان ان کی ممنون احسان ہے۔ یہ امر قابلِ افسوس ہے کہ مولانا کو شاعری میں اپنے جوہر دکھانے کا آزادانہ موقع نہیں دیا گیا جس کے باعث وہ اس میدان میں اپنے لئے کوئی ممتاز جگہ نہیں پیدا کر سکے۔ تاہم نظم معریٰ کے اوّلین رواج دہندہ کی حیثیت سے اردو ادب میں ان کا نام زندۂ جاوید رہے گا۔

عبدالعزیز قریشی

"ہمایوں"

نقد و نظر

نذرِ ولی و یادگارِ ولی

پڑھتے ہیں ترے شعر وہ فی عرش پہ قدسی
باہر ہے تری فکرِ رسا حدِ بشر سے

نذرِ ولی (از طالبات جامعۂ عثمانیہ (لطیف النسا بیگم بی اے نجیب النسا بیگم بی اے نعیم النسا بیگم بی اے۔ جہاں بانو بیگم بی اے) کاغذ سفید عمدہ ضخامت اٹھانی سو صفحات سائز ۲/۱ ۶ × ۹ جلد نہایت خوبصورت اور مطلا۔ لکھائی چھپائی بہت اچھی قیمت غالباً دو روپے آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ مکتبۂ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن)

یادگارِ ولی (مرتبہ سید محمد ایم اے۔ کاغذ سفید معمولی ضخامت پونے تین سو صفحات سائز ۲/۱ ۷ × ۱۰ غیر مجلد لکھائی چھپائی خاصی ۴۲ عکسی تصاویر۔ قیمت دو روپے آٹھ آنے۔ ملنے کا پتہ مکتبۂ ابراہیمیہ حیدر آباد دکن)

یہ دونوں دلپذیر مجموعے بابائے ریختہ ولی دکنی کے دو صد سالہ جشن یادگار کی تقریب پر شائع کئے گئے تھے۔ پہلا مجموعہ جامعۂ عثمانیہ کی چار ہونہار طالبات کے قابل قدر مضامین پر مشتمل ہے اور دوسرے مجموعے میں جشن یادگار اور اس کے سلسلے میں منعقد ہونے والی نمائشِ مخطوطات کی تحریری اور عکسی روئیداد کے علاوہ ملک کے سربرآوردہ حضرات کے پیغامات اور متعدد اُدبا کے مقالات شامل ہیں اور مضامین کے علاوہ چند نہایت دل آویز نظمیں بھی ہیں۔ ان نظموں میں ہمارے مکرم معاون سید سکندر علی وجد کی نظم شاید سب سے اچھی ہے۔ چار پانچ اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

ولی اورنگ آبادی سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں:۔

"ترے دم سے ولی باغ سخن میں پھر بہار آئی
خزاں منظر چمن میں گل کھلے بانگ ہزار آئی
تری آواز پر ہر اہلِ محفل سر کو دھنتا تھا
دکن کا ذکر کیا ہندوستاں خاموش سنتا تھا
ترے شعروں میں گو نکہت بسی تھی موجۂ گل کی
کسک ہے ان میں پوشیدہ دلِ صد چاکِ بلبل کی
سنایا اپنی لے میں جب وفا کا تو نے افسانہ
بھگوئی شمع نے اشکوں سے شب بھر خاکِ پروانہ
ترے نغمے نے پھر سے بزمِ اہلِ شوق گرما دی
تری میٹھی زباں نے عشق کی تقدیر چمکا دی
گرایا جس نے نظروں سے جمالِ "ترکِ شیرازی"[1]
دکن کی سانولی[2] سے سب نے دل کی ہار دی بازی"

ولی دکنی نے آج سے دو سو برس پہلے ریختہ کی بنیاد رکھی۔ اُن سے بیشتر جن چند ہندوستانی شعرا نے (جن میں قطب شاہی شاہانِ دکن خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں) فارسی کو چھوڑ کر ملکی زبان میں اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ ان کی زبان موجودہ اردو سے بے حد مختلف تھی۔ اُن کے اسالیبِ بیان غیر ترقی یافتہ تھے اور انہوں نے اپنے عہد کے ادب پر کوئی دیرپا اثرات نہیں چھوڑے۔ ولی اردو کا پہلا "باقاعدہ" شاعر تھا جس نے فارسی کی شگفتگی اور ہندی کی مٹھاس کو اپنے کلام میں ایسی خوبی سے ملایا کہ آج دو سو برس کے گذرنے کے بعد اس کے چمنِ سخن کے پھول تازہ ہیں اور اپنی دلآویز خوشبو سے ہندوستان کی فضا کو معطر کر رہے ہیں۔

[1] فارسی [2] اردو ۱۲

نذرِ ولی میں محترمہ لطیف النسا بیگم نے اپنے قیمتی مضمون "ولی کا تخیل" میں ولی کے اصنافِ سخن پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اور حق یہ ہے کہ بحث کا حق ادا کر دیا ہے۔ ولی کے تعشق و تغزل۔ سوز و گداز۔ وارداتِ قلب۔ نزاکتِ خیال۔ مضمون آفرینی۔ معتقدات و معلومات اور اُن کی شاعرانہ زبان کی بہت سی مثالیں دی ہیں۔ جنہیں پڑھ کر تعجب ہوتا ہے کہ یہ بابائے اردو اپنے تخیل اور طرزِ بیان میں کس قدر "ماڈرن" ہے بعض اشعار تو ایسے ہیں کہ اگر اُن میں سے اُس عہد کے مخصوص الفاظ نکال دیئے جائیں تو وہ آج بھی جبکہ اردو نظم ارتقا کی بہت سی منازل طے کر چکی ہے۔ سننے والے کو چونکا دیتے ہیں۔ دیکھئے:۔

مرا دل کر کے مجھ سے بے وفائی
بہ بند خاطر خوباں ہوا ہے۔

شراب شوق سوں (سیتے) سرشار ہیں ہم
کبھی بے خود کبھی ہوشیار ہیں ہم

عیاں ہے ہر طرف عالم میں حسن بے حجاب اُس کا
بغیر از دیدۂ حیراں نہیں جگ میں نقاب اُس کا

(محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا) (غالب)

بات کہنے کا کبھی جب وقت پاتا ہے غریب
بھول جاتا ہے وہ سب کچھ دیکھ صورت یار کی
(کہتے تھے کہ یوں کہتے یوں کہتے جو یار آتا
سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا) (میر تقی)

فدا کیا ہوں یہ قامت پہ میں دل و جاں کو
کہ جس نے فتنۂ محشر سے بے نیاز کیا
(جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم
میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا) (غالب)

آج تیری نگہ نے مسجد میں
ہوش کھویا ہے ہر نمازی کا
(رہ گئے لاکھوں کلیجہ تھام کر
آنکھ جس جانب تمہاری اُٹھ گئی) (داغ)

لطیف النسا بیگم نے بالکل سچ لکھا کہ
"کسی کے نقشِ قدم پر چل سکنا یا پہلے خطوط کو گہرا کر دینا مشکل کام نہیں۔ کام تو مشکل اُس کا ہے جو پہلے پہل دشوار گذار گھاٹیوں میں راہ نکالے اور آنے والوں کے لئے نقشِ قدم چھوڑ جائے۔

ہماری زبان پر شعرا کا احسان ہے جنہوں نے نئی نئی ترکیبوں۔ خوبصورت تشبیہوں اور الفاظ سازی سے ہمارے لفظی خزانوں کو مالا مال کر دیا۔ اپنی ندرتِ خیال اور مضمون آفرینی سے ادب کو ترقی دی۔ لیکن اس ساری ترقی کا سہرا اس کے سر ہے جو اس کشتی کا پہلا سوار تھا اور جس کی شمع نے ہزاروں کے چراغ روشن کر دیئے" نذرِ ولی ص۴۴

ولی کی ایک دل آویز خصوصیت اس کی وہ تشبیہیں ہیں جو اُس نے خالص ہندوستانی ماحول سے مستعار لی ہیں اور انہیں نہایت سادگی اور پُرکاری سے اپنے اشعار میں ٹانکا ہے۔ دیکھئے۔

یہ سیہ زلف تجھ زنخداں پر
ناگنی جوں کنوئیں پہ پیاسی ہے

زلف تیری ہے موج دریا کی
پاس تل اس کے جوں سناسی کے

اے صنم تجھ جبیں اوپر یو خال
ہندوئے ہر دوار باسی ہے

"زلف کو پیاسی ناگن تصور کرنا ایسی لطیف تشبیہ ہے کہ لکھنؤ جہاں سراپا لکھنے میں ایڑی چوٹی کے زور لگائے گئے وہاں بھی اس قسم کی تشبیہات نہیں ملیں گی۔ دہلی والوں نے جب دکنی زبان کی ادبی حیثیت دیکھی تو رشک کرنے لگے اور

فارسی گوئی کو خیرباد کہہ کر اپنی بول چال کی زبان اور شاعری کو فروغ
دیا لیکن اپنی خودداری کو قائم رکھنے کے لئے دکنی زبان میں
بہت سی کاٹ چھانٹ کی اور اس زبان کو خس و خاشاک
سے صاف کر دیا انہوں نے فارسی الفاظ سے رنگینی پیدا کی
اس لئے اردو زبان ہندی کی نازک اور نادر تشبیہات سے محروم
رہ گئی"
(زین العابدین۔ دیباچہ کلیاتِ ولی ص ۱۶۳-۱۶۴)

ولی کے کلام کا سب سے حیرت ناک پہلو یہ ہے کہ انہوں نے جس زبان میں اپنے بیشتر اشعار لکھے ہیں، اُسے انہوں نے اپنے عہد ہی میں اس قدر جلا دے دی تھی کہ آج اڑھائی سو سال کے بعد بھی اُن کا اسلوب ہمیں ناآشنا اور اُن کی زبان اجنبی معلوم نہیں ہوتی۔ ہم تو اسے زبانِ اردو کا اعجاز کہیں گے کہ اس کا رنگ اڑھائی صدیوں میں بھی جوں کا توں قائم رہا۔ اور جب اس قدر سیاسی اور معاشرتی تبدیلیوں اور مخالفتوں کے باوجود اس کی ساخت اور انداز میں فرق نہیں پڑا تو امید ہے کہ آیندہ بھی اس کا سکہ یوں ہی رواں رہے گا۔ ولی نے جس زبان کی بنیاد رکھی وہی زبان آگے چل کر شعر و ادب کی زبان بنی اور خفیف تبدیلیوں کے ساتھ آج بھی اُسی طرح قایم ہے۔

ولی نے چند چیزیں ایسی بھی لکھی ہیں جن میں ہندی کا عنصر زیادہ ہے۔ خطاب کہیں ساجن سے ہے اور کہیں سجنی سے مرد کو محبوب ٹھہرانا تو ہندی زبان کی خصوصیت تھی لیکن موخر الذکر طرزِ خطاب آج انگریزی اثر کے ماتحت اردو میں رائج ہو رہا ہے۔ ولی کی کرامت دیکھئے کہ جہاں اُس نے زبان کو ایسی شاہراہ پر ڈالا جس پر متاخرین آج تک گامزن ہیں اور دیر تک گامزن رہیں گے۔ وہاں ایسے جدید اندازِ بیان بھی وضع کئے جو امتدادِ زمانہ کے ساتھ مقبول ہوئے اور ہو رہے ہیں۔

"اب پہلے آپ ولی کے اُس کلام کا نمونہ ملاحظہ فرمائیے جس میں ہندی عنصر زیادہ ہے۔ پروفیسر عبدالواحد صاحب یادگارِ ولی میں ایک جگہ لکھتے ہیں:

ولی کے مشربِ حسن پرستی نے کہیں زیادہ اہم اُس کا خالص ہندی تخیل ہے، جس نے اُس کے ملہماتِ شعری میں ایک خاص دلکشی پیدا کر دی۔ آیئے اس نقطۂ نظر سے ہندی نسائیت کے چند دلکش مرقعوں کی سیر کیجئے۔

گو ایسے کسی یاد ہ صورت کی مورت زبان زد خاص و عام ہے۔ اس کی گہرائیوں میں ولی کے تڑپ وطن کا راز پوشیدہ ہے۔

بھلا ولی جیسے آزاد مشرب اور حسن پرست انسان کے لئے اورنگ آباد اور بالخصوص عالمگیری عہد کے اورنگ آباد میں دلچسپی کا کیا سامان ہو سکتا ہے۔ اس کا دل تو حسن کی ہنگامہ زا فضا کے لئے بےتاب رہتا ہے۔ وہ تو عبادت کے ساتھ کچھ نظارہ بازی بھی چاہتا ہے۔ اُس کی آنکھیں تو شعر پرست حسن کی متلاشی رہتی ہیں۔ چنانچہ عالمگیری عہد کا یہ کنھیا شعر پرست کی تلاش میں گجرات کے مندروں، پنگھٹوں اور زرتشتی معبدوں کی بھی سیر کرتا نظر آتا ہے۔ دیکھئے نسوانی اور برہمنی حسن کی صداقت شعارانہ مُوکشی ولی سے پہلے یا بعد اس تفصیل کے ساتھ اور بھی کہیں ملتی ہے جیسا کہ اس گجراتی پجارن کے سراپا میں پیش کی گئی ہے۔

مت غصّے کے شعلے سوں جلتے کو جلاتی جا — ٹک مہر کے پانی سوں یو آگ بجھاتی جا
تجھ چال کی قیمت سوں نہیں دل ہے مرا واقف — اے ناز بھری چنچل ٹک بھاؤ بتاتی جا
اس رین اندھیری میں مت بھول پڑوں تس سوں — ٹک پاؤں کے بچھوؤں کی آواز سناتی جا
مجھ دل کے کبوتر کوں پکڑا ہے تری لٹ نے — یہ کام دھرم کا ہے ٹک اس کوں چھڑاتی جا
تجھ مکھ کی پرستش میں گئی عمر مری ساری — اے بت کی بجن ہاری اس بت کوں بچاتی جا
تجھ عشق میں دل جل کر جوگی کی لیا صورت — یک بار اری موہن چھاتی سوں لگاتی جا
تجھ گھر کی طرف سندر آتا ہے ولی دایم
مشتاق ہے درشن کا ٹک درس دکھاتی جا

یہ دیکھنے بھٹنے والی گجراتی ساڑی، وہ گھیردار گھونگھٹ اور وہ دلکش شورتی ادائیں۔ اس کے ساتھ والہانہ اندازِ بیان اور روانیٔ کلام کی روانی بھی ملاحظہ ہو"
(صفحہ ۶۵-۶۶)

اب ولی کے عام انداز کے چند منتخب اشعار ملاحظہ کیجئے۔ اور سوچئے کہ حسنِ بیان کے ساتھ تخیل کی ندرت اور رہبندی کس قدر اُستادانہ ہے۔

اُس سروِ خوش ادا کوں ہمارا سلام ہے
اُس یارِ بےوفا کوں ہمارا سلام ہے
لیتا نہیں سلام ہمارا حجاب سوں
اُس صاحبِ حیا کوں ہمارا سلام ہے
ناز و ادا سوں دل کو مرے مبتلا کیا
اُس نازنیں ہیا کوں ہمارا سلام ہے

آرامِ جان و دل ہے وؔلی جس کا دیکھنا
اُس جانِ دلربا کوں ہمارا سلام ہے

معشوق کو منظر نہیں عاشق کی آہ سے — بجھتا نہیں ہے بادِ صبا سوں چراغِ گل

آسماں میری نظر میں کلبۂ تاریک ہے — گر نہ دیکھوں تجھ کوں اے چشم و چراغِ زندگی

جسے عشق کا تیر کاری لگے — اسے زندگی کیوں نہ بھاری لگے
نہ ہووے اسے جگ میں ہرگز قرار — جسے عشق کی بے قراری لگے
ہر اک وقت مجھ عاشقِ زار کو — پیارے تری بات پیاری لگے

تری یہ زلف ہے شامِ غریباں
جبیں تیری مجھے صبحِ وطن ہے

وؔلی اس گوہرِ کانِ حیا کی کیا کہوں خوبی
مرے گھر اس طرح آتا ہے جوں سینے میں راز آوے

پھر میری خبر لینے وہ صیاد نہ آیا
شاید کہ مرا حال اُسے یاد نہ آیا
جاری کیا ہوں جوئے رواں اشک رُواں سوں
افسوس کہ وہ غیرتِ شمشاد نہ آیا
پہنچی ہے ہر اک گوش میں فریادِ وؔلی کی
لیکن وہ صنم سننے کو فریاد نہ آیا

فدائے دلبرِ رنگیں ادا ہوں
شہیدِ شاہدِ گلگوں قبا ہوں
ہر اک مہ رُو کے ملنے کا نہیں شوق
سخن کے آشنا کا آشنا ہوں

خوب رُو خوب کام کرتے ہیں
یک نگہ میں غلام کرتے ہیں
کم نگاہی سوں دیکھتے ہیں وے
کام اپنا تمام کرتے ہیں
کھولتے ہیں جب اپنی زلفاں کو
صبحِ عاشق کوں شام کرتے ہیں

پاکبازاں میں وؔلی ہے مشہور
اُس سوں چہرے کوں چھپایا نہ کرو

صنم میرا سخن سوں آشنا ہے
مجھے فکرِ سخن کرنا روا ہے
غنیمت بوجھ ملنے کو وؔلی کے
نگاہِ پاکبازاں کیمیا ہے

مجموعۂ ثانی یعنی یادگارِ وؔلی کے مندرجہ ذیل مضامین قابلِ ذکر ہیں۔ وؔلی کی شاعری از عبدالواحد صاحب ایم اے۔ وؔلی اور اس کی شاعری از موسیو گارساں دتاسی مترجمہ ڈاکٹر یوسف حسین۔ اردو شاعری میں وؔلی کا رتبہ از محمد عبدالحکیم صاحب بی اے۔ وؔلی کا اسلوبِ شعر و جدید شاعری از مولوی عبدالقیوم صاحب باقیؔ۔ وؔلی کا وطن از ڈاکٹر سید محی الدین قادری۔ مجموعۂ اول یعنی نذرِ وؔلی کے مضامین کا آغاز میں تذکرہ ہو چکا ہے۔

مضامین بحیثیت مجموعی محنت اور توجہ سے لکھے گئے ہیں۔ کہیں کہیں مبالغہ سے بھی کام لیا گیا ہے اور ایک آدھ مضمون میں فقروں کے طویل ہونے کے باعث زبان کی غلطیاں بھی ہو گئی ہیں۔ لیکن عام طور پر مضامین کا معیار کافی بلند ہے۔ ہم اپنے ناظرین سے دونوں کتابوں کے مطالعہ کی پرزور سفارش کرتے ہیں۔

ص

فہرست مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ اپریل سنہ ۱۹۳۹ء

جلد ۱۷ — نمبر ۴

تصاویر: ۱۔ ڈکٹیٹر ۲۔ سیاہ و سفید کا مالک ۳ و ۴ ایک احساس کے دو اظہار

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ

گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام صلاح الدین احمد ایڈیٹر و پرنٹر و پبلشر چھپ کر دفتر رسالہ ادبی دنیا مال روڈ لاہور سے شائع ہوا

دنیائے کاروبار

دی دھاریوال وُولن ملز دھاریوال

یہ ملز آج سے چھپّن برس پہلے ۱۸۸۰ء میں پنجاب کے معمولی سے گاؤں میں قائم کی گئی تھی۔ جب اس کا اثاثہ چند کاریگروں اور ایک چھوٹے سے کارخانے پر مشتمل تھا۔ وقت اور صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ آج یہ ملز ہندوستان بھر کی کپڑے کی صنعت میں نمایاں جگہ حاصل کر چکی ہے اور وہ جگہ جو کبھی چند مزدوروں کا چھوٹا سا گاؤں کہلاتی تھی آج چھ ہزار انسانوں کی بستی ہے جہاں تک کپڑے کی ساخت کے نئے طریق کا تعلق ہے۔ اس وقت اس ملز میں کپڑا بالکل نئے سائنٹیفک اصولوں سے مشینری کے ذریعے بنایا جاتا ہے۔ اُون کے دھوئے جانے سے لے کر اس کے خشک ہونے۔ دھاگا بنائے جانے۔ رنگنے۔ بُننے اور کپڑا بنائے جانے تک سب کچھ اعلیٰ درجے کی قیمتی مشینوں کے ذریعے کیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان بھر میں دوسری ملوں کے بنے ہوئے کپڑے کے مقابل دھاریوال کے بنے ہوئے کپڑے کو امتیازی خصوصیات کی بنا پر خاص درجہ حاصل ہے۔

اس ملز کے مالکوں کے پیشِ نظر صرف اپنا ہی ذاتی منافع نہیں بلکہ کاریگروں اور مزدوروں کی فلاح و بہبودی کے لئے اب اس چھ ہزار کی بستی میں لڑکے اور لڑکیوں کے لئے ہائی سکول۔ بجلی گھر۔ کواپریٹو سوسائٹی اور ہسپتال اور دیگر تمام سہولتیں موجود ہیں۔

غرضیکہ اس ملز کا تیار کردہ کپڑا اپنی بہت سی امتیازی خصوصیات کی بنا پر اس قابل ہے کہ ہر ہندوستانی اس کا استعمال کرے اور اس کارخانے کے لئے باعثِ اعانت ہو۔

سن لائف آف کینڈا ۱۹۳۸ء میں

سن لائف آف کینڈا ساٹھ سال کی پرانی کمپنی ہے۔ اور اس کا شمار ان پہلی دس کمپنیوں میں ہے جو براعظم امریکہ میں لائف انشورنس کا کام کر رہی ہے۔ اور چونکہ اس کی پہلی پالیسی ۱۸۷۱ء میں جاری ہوئی تھی۔ یہ اپنے پالیسی ہولڈروں اور ان کے نمائندوں کو ۳ ارب ۳۲ کروڑ ۸۴ لاکھ ۴۴ ہزار ۸۷۲ روپیہ ادا کر چکی ہے۔

سال زیرِ بحث کی سرگرمیوں کا خالص نتیجہ یہ تھا کہ ۶۲ ہزار ۰۰ نئی پالیسیاں ہماری فہرست میں شامل ہوئیں جن کے مطابق ۵۲ کروڑ ۹۱ لاکھ ۳۶ ہزار ۳۹ روپیہ کے لائف انشورنس کی ذمہ داری لینی پڑی ہے۔ یہ نتیجہ ایک عالمگیر کساد بازاری کے سال میں بے حد شاندار ہے۔ اس وقت کل ۷ ارب ۹۵ کروڑ ۹۹ لاکھ ۵۴ ہزار ۹۸۹ روپیہ کا کام جاری ہے۔

کمپنی کی طرف سے جو پالیسی مہیا کی جا رہی ہے۔ وہ نہایت جاذب توجہ ہے۔ پالیسی پر جو پریمیم چارج کئے جاتے ہیں۔ ان میں گزشتہ سالوں میں لازمی طور پر اضافہ کر دیا ہے۔ تا کہ گرتی ہوئی شرح سود کا استحکام ہو جائے۔ اس کے باوجود پالیسی کا مطالبہ کم نہیں ہوا۔ پچھلے سال پالیسیاں فروخت کرنے سے ۳ کروڑ ۵ لاکھ ۴ ہزار ۹۲۰ روپیہ وصول ہوا تھا۔ بے شمار آدمی مقررہ سالانہ محفوظ آمدنی سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔

سرمایہ میں قریباً ۱۲ کروڑ ۲۲ لاکھ ۴ ہزار روپیہ کا اضافہ ہو گیا ہے۔ جس کا مجموعہ ۲ ارب ۳۹ کروڑ ۷ ۹ لاکھ ۱۰ ہزار ۳۳۵ روپیہ تھا۔ سال زیرِ بحث میں زائد آمدنی ۲ کروڑ ۳۰ لاکھ ڈالر تھی۔ سن لائف کی ترقی کا اندازہ کرنے کے لئے ذیل میں دو سالوں کے اعداد و شمار دیئے جاتے ہیں۔

۱۹۰۸ء میں ۱۱ کروڑ ۵ ۹ لاکھ ۷ ۱ ہزار ۴۰ ۷ ڈالر انشورنس جاری تھی۔ اس کے مقابلہ میں ۱۹۳۸ء میں یہ رقم ۲ ارب ۹۰ کروڑ ۵۳ لاکھ ۸۰ ہزار ۲۸۶ ڈالر تھی۔ ۱۹۰۸ء میں پالیسی ہولڈروں کو ۲۹ کروڑ ۲۶ لاکھ ۲۰ ہزار ۷۶۵ ڈالر ادا کیا گیا اور ۱۹۳۸ء میں ۸ ارب ۴۳ کروڑ ۲۸۴ ڈالر ادا کیا گیا۔ ۱۹۰۸ء میں سرمایہ ۲ ارب ۹۲ کروڑ ۳۸ لاکھ ۵۲ ہزار ڈالر تھا اور ۱۹۳۸ء میں یہ رقم ۷ ارب ۵۸ کروڑ ۴ ۹ لاکھ ۷ ۲ ہزار ۲۲۲ ڈالر تھی۔

بزمِ ادب

سالنامہ ادبی دنیا کا دوسرا ایڈیشن چھپ کر تیار ہو چکا ہے ہم نے بارہا اپنے اُن ناظرین سے جنہوں نے رجسٹری کے لئے ٹکٹ نہیں بھیجے گذارش کی ہے کہ وہ ٹکٹ بھیج کر سالنامہ منگوالیں لیکن بعض اصحاب خصوصاً ہیڈ ماسٹر صاحبان نے توجہ نہیں فرمائی۔ رجسٹری کے بغیر سالنامہ بھیجنا اسے جان بوجھ کر گم کرنا ہے۔ ہم کسی حالت میں بھی یہ گوارا نہیں کرسکتے کہ سالنامہ دفتر سے جائے اور خریدار کو نہ ملے اس سے یہ بہتر ہے کہ دفتر ہی میں پڑا رہے۔ اس لئے آج پھر ہم اپنے فراموشکار خریداروں کی خدمت میں گذارش کرتے ہیں کہ وہ جلد از جلد سالنامہ منگوالیں ورنہ دوسرا ایڈیشن بھی ختم ہو جائے گا۔

فروری کے پرچہ میں بشیر ہندی صاحب کی کتاب "پاگل" پہ ریویو کیا گیا تو ضمناً یہ بھی ذکر آگیا کہ خلیل جبران سے اردو دان پبلک کا تعارف قاضی عبدالغفار صاحب نے اپنی کتاب "اُس نے کہا" کے ذریعے کرایا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خلیل کے افکار کتابی صورت میں پہلے پہل اردو میں قاضی صاحب نے ہی پیش کئے لیکن ہمارا یہ کہنا صحیح نہ تھا کہ خلیل سے اردو دان طبقہ کا تعارف عبدالغفار صاحب نے کرایا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے دوست ملک عطاء اللہ صاحب کلیم ایم اے ایک عرصہ تک خلیل جبران کی نظموں کے ترجمے "نوائے خلیل" اور "نغماتِ زندگی" کے عنوانات سے ادبی دنیا میں پیش کرتے رہے اس کے علاوہ انھوں نے "ساقی" اور "ہمایوں" میں بھی "آزادی" اور "بچے" خلیل کی دو نظمیں شائع کرائی تھیں۔ قاضی عبدالغفار صاحب نے اختر حسین صاحب رائے پوری کی وساطت سے منصور احمد مرحوم ایڈیٹر ادبی دنیا سے استفسار کیا کہ خلیل کی کتابوں کے انگریزی ترجمے کہاں سے دستیاب ہوسکتے ہیں۔ چنانچہ کتابوں اور پبلشر کے نام بتائے گئے اور اس طرح "اُس نے کہا" کے مصنف مترجم خلیل جبران سے آشنا ہوئے۔ ہمیں اس فروگذاشت پر کلیم صاحب سے ندامت ہے۔ اور ہم حیران ہیں کہ مذکورہ تنقید لکھتے وقت ہمیں کلیم صاحب کے بے مثال تراجم کیوں نہ یاد آئے۔ امید ہے کہ کلیم صاحب ہماری معذرت قبول فرمائیں گے۔

ہمیں افسوس ہے کہ مارچ کی اشاعت میں ہمارے دوست مسعود شاہد صاحب ایم اے کی نظم "انجام" کے نیچے "انگریزی سے" لکھا گیا۔ یہ نظم درحقیقت ترجمہ نہیں طبعزاد ہے۔ ناظرین تصحیح فرمالیں۔ اور مسعود صاحب ہماری غلطی سے درگذر فرمائیں۔ اس کے علاوہ ایک اور فروگذاشت کی بھی معذرت طلب ہے کہ پچھلے ماہ کی فہرست مضامین میں حضرت آزاد انصاری کے "خیالات پریشان" کا اندراج سہواً رہ گیا۔

ماہِ رواں کے مضامین میں سب سے زیادہ قابلِ ذکر مضمون "فرانس کا ایک آوارہ شاعر" ہے جسے رفیق میراجی نے نہایت کاوش اور خوبی سے لکھا ہے۔ ہمارے خیال میں ان کا یہ مضمون اُن کے سلسلۂ شعرائے عالم کے تمام دیگر مقالات سے بڑھ گیا ہے۔ امید ہے کہ اسے نہایت دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

ہمارے مکرم بزرگ جناب شبیر علی سرخوش بیشتر تحقیقاتی مقالے لکھتے ہیں اور ہر مقالے میں ایک آدھ نرالی بات پیدا کر جاتے ہیں۔ اب تک ادبی دنیا میں انہوں نے جس قدر مضامین لکھے ہیں۔ وہ ان کی اس روش کے آئینہ دار ہیں۔ زیرِ نظر مقالہ نہایت قابلِ توجہ اور خیال افروز ہے۔ اس بار کے مضمون کا انعام (دس روپے) جناب سرخوش کو دیا جارہا ہے۔
خواجہ احمد فاروقی نے ٹیلی وژن پر ایک مختصر مگر پرمعنی مضمون لکھا ہے۔ اور ان کا طرزِ بیان ایسا صاف اور سلجھا ہوا ہے کہ ہمارے نوجوان طلبا اس سے پورا فایدہ اٹھائیں گے۔

افسانے اب کے پانچ ہیں اور سبھی اچھے افسانے ہیں۔ ان میں سے "بھوت" از جناب شفیق تقی اور شبیر محمد صاحب اختر کا "یادِ رفتگاں" مساوی طور پر انعام کے مستحق قرار دیئے گئے ہیں۔

صلاحُ الدّین احمد

آئینہ عالم

دنیا کا آٹھواں عجوبہ

انگریز!

انگلستان کے جریدہ "سنڈے ریفری" میں مسٹر جان بورز رقمطراز ہیں:-

اگرچہ دنیا میں بعض عجیب و غریب قسم کے لوگ آباد ہیں لیکن ان میں سے عجیب ترین وہ لوگ ہیں جو اُس چھوٹے سے جزیرے میں بستے ہیں جہاں ہر وقت دھند چھائی رہتی ہے اور اس میں سے بارش کے قطرے آنسوؤں کی طرح ٹپکتے رہتے ہیں۔

اس عجیب قوم کے لوگ قد کے لانبے اور جسم کے پتلے ہیں۔ ان کی چوڑی چکلی ہڈیاں پتلی جلد میں سے یوں اُبھری ہوتی ہیں جیسے اسے پھاڑ کر نکل جائیں گی۔ ان کے بال سپید ہیں اور دانت اتنے بڑے ہیں جیسے پیانو کے پردے اور اس قدر اُبھرے ہوئے کہ اُن کے ہونٹ انہیں چھپانے میں کسی طرح کامیاب نہیں ہو سکتے۔

مرد ایک قسم کا لہنگا پہنتے ہیں یا پھر بے عیب چست لباس۔ بعض اوقات بُر دار کپڑے زیب بدن کرتے ہیں اور مشہور افسانوی کردار شرلاک ہومز کی طرح اونچی دیوار کی ٹوپیاں پہنتے ہیں۔

یہ لوگ لمبے لمبے پائپ سلگائے پھرتے رہتے ہیں اور وسکی پیتے ہیں۔ ناممکن ہے کہ کوئی شخص خاص وسکی کا قدح خالی کئے بغیر دن گذار سکے۔

ان کی مقررہ غذا سور کا گوشت اور انڈے ہیں لیکن وہ گائے کے نیم پخت گوشت کے بھی بہت شائق ہیں۔ گو مچھلی بھی بڑی رغبت سے کھاتے ہیں۔ لیکن یہ اُبلی ہوئی اور ایک جوہڑ بھر نیم گرم پانی میں تیرتی ہوئی ہونی چاہئے تب ہی انہیں پسند آسکتی ہے۔

یہ لوگ اپنی اولاد سے بیزار رہتے ہیں اور انہیں بچپن ہی میں تعلیمی اداروں میں بھیج دیتے ہیں جہاں کوڑے مار مار کر ان کے ننھے دماغوں میں لاطینی اور یونانی ٹھونسی جاتی ہے۔

ان کی زندگی کا نصب العین بہت ہی بلند ہے۔ یہ لوگ اپنے ملک کے بڑے اچھے کھلاڑی کو فوراً کوئی مذہبی یا حکومتی عہدہ عطا کر دیتے ہیں۔

ان کو حیوانوں سے بے انتہا محبت ہے۔ چنانچہ لومڑیوں اور بارہ سنگوں کا پیچھا اس جوش و خروش سے کرتے ہیں کہ اُن بے چاروں کی جان سے کر ہی چھوڑتے ہیں!

شاعروں، مصوروں اور مغنیوں سے انہیں نفرت ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ فٹ بال یا پولو کے کھلاڑی فنون لطیفہ کے ماہروں سے بدرجہا افضل ہوتے ہیں!

لیکن ان سب باتوں پر مستزاد یہ کہ یہ لوگ بڑے چالاک اور مکار ہیں۔ ہر وقت اپنی ایمانداری کا ڈھنڈورہ پیٹتے رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے الفاظ پتھر کی لکیر ہیں۔ لیکن ان کی زندگی ان قوموں کو دغا دینے میں ہی گذرتی ہے جو ان پر بھروسہ کر لیتی ہیں۔ کوئی شخص آج تک ان سے سودا کر کے فائدے میں نہیں رہا!

اُن کی عورتیں مردوں سے بھی زیادہ عجیب ہیں۔ وہ کھانا پکانا نہیں جانتیں۔ ان میں سے اکثر بن بیاہی بوڑھیاں ہیں جو سال کا زیادہ حصہ تاش

کپسٹر کے تھیلوں میں ملبوس ممالک غیر کے عجائب خانوں اور نگار خانوں میں گھومتی رہتی ہیں!

لباس کے معاملے میں تمام کی تمام عورتیں بدمذاق واقع ہوئی ہیں اور غازوں کا استعمال تو ایک بھی نہیں جانتی۔ ٹھنڈے پانی اور صابن سے چہروں کو اتنا رگڑ رگڑ کر دھوتی ہیں کہ وہ خوفناک حد تک صاف ہو جاتے ہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی ناکیں طوطے کی چونچ کی طرح سرخ ہوتی ہیں۔!

کوئی عورت گھر سے باہر نہیں نکلتی۔ جب تک اس کے ہاتھ میں چھڑی، پاؤں میں نیچی ایڑی کا جوتا اور ایک ننھا سا کتا رسی سے بندھا ہوا گھسٹتا نہ چلا آرہا ہو!

انہیں گھوڑوں سے بھی تقریباً اتنی ہی الفت ہے جتنی کہ کتوں سے ہے۔ وہ انہیں خاوندوں سے اچھا سمجھتی ہیں اور چونکہ سب کی سب ناکتخدا ہوتی ہیں اس لئے محبت کے متعلق کچھ نہیں جانتیں اور نہ انہیں جاننے کی ضرورت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی بیاہتا زندگی ایسی ہی غیر دلچسپ ہوتی ہے جیسا کہ موٹھ کا ٹھنڈا دلیہ۔

مرد اور عورتیں سب کے سب دولت مند ہیں لیکن روپے کے معاملے میں سخت کنجوس! کوڑی کوڑی کا حساب رکھتے ہیں لیکن اپنے ذاتی راحت و آرام کے لئے دل کھول کر خرچ کرتے ہیں۔

کیا آپ ان لوگوں کو پہچانتے ہیں؟ آپ کو پہچان جانا چاہئے تھا کیونکہ یہ خود آپ ہی ہیں۔ آپ، آپ کی بیوی اور آپ کے عزیز و اقارب!

یورپ کے باشندوں کے لئے انگلستان ایک دورافتادہ جزیرہ ہے۔ وہ نہ تو ہمیں جانتے ہیں اور نہ ہمیں سمجھتے ہیں۔ وہ ہمارے متعلق صرف ایک تصور قائم کر لیتے ہیں اور پھر ہمارے حالات کے متعلق قیاس آرائیاں کرتے ہوئے الزامات کی فہرستوں کے طومار لگا دیتے ہیں اور کارٹون بنا بنا کر ہمارا ناک میں دم کر دیتے ہیں!

ان ملکوں کے نزدیک جہاں آج کل ڈکٹیٹروں کی حکومت ہے ہم مورکھ راکشسوں کی مثل ہیں۔ ان کے تصور میں ہمارے سپاہی بے گناہ باشندوں پر ظلم برسا کر خوش ہوتے ہیں۔ اور انہیں دردناک عذاب دے کر لطف اٹھاتے ہیں۔

یہ تو خیر ہمارے خلاف جھوٹا پروپیگنڈا ہے۔ لیکن ہمارے ایک جرمن مراسلہ نگار جرمنی کے ایک اخبار میں لکھتے ہیں کہ "انگریز نہایت نرمی اور دوستانہ طریق پر گفتگو کرتے ہوئے پلک جھپکنے میں ہی ایسا آنکھیں بدلتا ہے کہ آپ اس کی تندی اور درشتی کا تصور بھی نہیں کر سکتے"!

یہ نا انصافی صریحاً ظلم ہے کیونکہ حقیقت یہ ہے کہ انگریز جذبات سخاوت سے بہت ہی کم متاثر ہوتا ہے۔ ایک جرمن کہتا ہے کہ "وہی انگریز اپنی چک بک ہر وقت اٹھائے پھرتا ہے"!

لیکن اس کے باوجود ہمارے معترضین کہتے ہیں کہ ہم روز بہ روز نرم ہوتے چلے جارہے ہیں۔ اہل روم کہتے ہیں کہ اگر آپ شیر برطانیہ کی دم مروڑیں تو وہ بمشکل ایک انگڑائی لیتا ہے اور اپنے چھوٹے دانت دکھا کر پھر چپ ہو جاتا ہے۔ جب ہم نے اپنے سپاہیوں کی آسائش کے لئے اپنی بارکوں کو جدید طریقوں پر آراستہ کیا تو جرمنی کے قہقہوں سے آسمان گونج اٹھا۔ "نامیوں کے لئے انائیں" کی سرخی جلی حروف میں ہر جرمن اخبار کی پیشانی پر نظر آرہی تھی۔

ایک وقت وہ تھا کہ ہمارے مردوں کی پوشاک تمام براعظم میں پسندیدگی کی نگاہوں سے دیکھی جاتی تھی آج ایک فرانسیسی عورت کہتی ہے کہ "انگریز کی تھیلہ نما برجس، بدنما پلس فور، رنگ برنگی پتلون اور بے ہنگم جاکٹ اس کے لئے آرام دہ تو ضرور ہیں لیکن ان کو پہن کر وہ عجیب جغد معلوم ہوتا ہے"!

ایک امریکن سیاح نے ہماری عورتوں کے لباس پہننے کے طریقے پر اس سے بھی عجیب تر خیال آرائیاں کی ہیں۔ وہ کہتی ہے:-

"میرا خیال ہے کہ انگریز عورتیں اپنی ٹوپیاں چھت کے ساتھ لوہے کی تاروں سے لٹکائے رکھتی ہیں۔ جب کبھی انہیں گھر سے باہر نکلنا ہوتا ہے وہ ایک بٹن دباتی ہیں اور "ٹشپ" سے ایک ٹوپی ان کے سر پر ٹپک پڑتی ہے جسے ہاتھ سے چھوئے بغیر ہی وہ باہر نکل آتی ہیں"!

یہی خاتون ہماری عورتوں کے کھلے لباسوں اور دبلے پتلے جسموں کے پیش نظر یہ سمجھتی ہے کہ انگلستان میں جب دھوبی میلے کپڑے اکٹھے کرنے آتا ہوگا تو بے خیالی میں کئی عورتوں کو بھی اپنی گٹھڑی میں لپیٹ کر لے جاتا ہوگا اور ایسی عورتوں کی تعداد سال بھر میں کئی ہزار تک جا پہنچتی ہوگی"!

اکثر یورپینوں کو ہماری عورتوں پر بڑا رحم آتا ہے۔ ایک جرمن

کہتا ہے کہ "انگریز عورتوں کے چہروں پر نظر ڈالتے ہی آپ پر واضح ہو جائے گا کہ ان میں سے اکثر کی امنگوں کا خون ہو چکا ہے اور وہ اپنی مایوسی کو ایک پُر تکلف چہرے کے نیچے چھپائے پھرتی ہیں۔"

ایک فرانسیسی خاتون کہتی ہیں کہ قریباً ساری کی ساری انگریز عورتیں تعلقاتِ جنسی کے معاملے میں مجھے قطعی طور پر بھوکی نظر آتی ہیں۔

ہنگری کے ایک صاحب فرماتے ہیں کہ انگلستان میں محبت کے معاملات بھی کسی قدر دفتری طریقے پر ہی سرانجام پاتے ہیں۔ اکثر حالات میں جانبین کو ایک دوسرے سے کہے جانے والے فقروں کا پہلے ہی سے حرف بہ حرف علم ہوتا ہے اور پھر جس طرح سے وہ اوقاتِ ملاقات مقرر کرتے ہیں یا ایک دوسرے کے ٹیلیفون کے نمبر معلوم کرتے ہیں وہ دو دلالوں کے کاروباری معاملات سے کسی طور بھی مختلف نہیں ہوتا۔"

یورپ والے اس بات پر سب سے زیادہ حیران ہیں کہ جو کھانا ہم کھاتے ہیں اس پر ہم زندہ کیسے رہتے ہیں۔ بولوں سے لے کر یورال تک ہر مرد، عورت اور بچہ ہماری خوراک کو کراہت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ ان کا ایمان ہے کہ ہم وسکی اور چائے کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں پیتے۔ گائے اور سؤر کے علاوہ اور کچھ نہیں کھاتے اور صرف اُسی چٹنی کو استعمال کرتے ہیں جو ہمیں بوتل میں سے نکال کر دی جائے۔

کھانا کھاتے وقت ہم بے اطمینانی کی فضا خود پیدا کر لیتے ہیں۔ پشت کی طرف کی کھڑکیاں کھول دیتے ہیں جن میں سے دُھند کے دَل بادل اور بارش کے چھینٹے آ آ کر ہمارا ناک میں دم کر دیتے ہیں انگریز کو تازہ ہوا کی ضرورت تو ہوتی ہی ہے ــــ لیکن وہ اسے نمدار صورت میں زیادہ پسند کرتا ہے۔ وہ ایسے مکانوں کو پسند کرتا ہے جن میں برسات کا پانی آسکے، ٹھنڈے پانی سے کپڑے دھو کر خوش ہوتا ہے۔ اور مکان کو گرم رکھنے والے سامان سے بہت گھبراتا ہے۔

چنانچہ یہ چھیڑ ہمیشہ سے یوں ہی چلی جاتی ہے۔ ہر غیر ملکی مصنف کی زندگی کے دوران میں ایک نہ ایک وقت ایسا ضرور آتا ہے کہ وہ انگریز کے متعلق کچھ نہ کچھ لکھنے کے لئے بے قرار ہو جاتا ہے اور ہمیشہ اس کے دل میں ایک ہی سوال پیدا ہوتا ہے اور وہ یہ کہ کیا انگریز بھی ہمارے ہی جیسا انسان ہے؟

اُن کے خیال کے مطابق ہم اُجڈ، خبیث، پُرخور، گھٹیا زدہ، جفاکار، ظالم، دُھند میں گھرے ہوئے وحشی ہیں جن کے دل میں کبھی کوئی شریفانہ احساس پیدا ہی نہیں ہوتا۔

لیکن ہم میں بعض باتیں ایسی بھی تو ہیں جن کی توجیہہ وہ خود کبھی نہیں کر سکے۔

مثلاً ہمارے معترضوں کو اس بات کا جواب کبھی نہیں سوجھا کہ باوجود اس ذہنی پستی کے جو اُن کے خیال کے مطابق ہم میں پائی جاتی ہے شکسپیر جیسا شاعر ہم میں کیسے پیدا ہو گیا؟

وہ شخص بھی ہم میں سے تھا جو اپنی محبوب بیوی کی تلاش میں اُڑ کر روس تک جا پہنچا تھا۔ کیا انہیں انگریزوں کو آپ جذباتِ محبت سے عاری سمجھتے ہیں؟

انگریز تختۂ ارض کے ایک سرے سے چل کر دوسرے سرے پر جا پہنچتا ہے، صرف اس لئے کہ وہ اس سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ انگریز نے اپنی اولوالعزمی اور جواں مردی کے معجز نما جوہر دکھائے ہیں، اور وہ بھی صرف اس لئے کہ وہ اسی میں لطفِ زندگی پاتا ہے۔

انگریز ہمیشہ کسی خاص نصب العین کی خاطر جان پر کھیل جانے کے لئے تیار رہتا ہے اور شاید یہی وہ بات ہے جو آج تک یورپ والوں کی سمجھ میں نہیں آئی۔

اور باوجود اپنی جہالت، اپنے جمودِ طبع اور بُری غذا کے ہم دنیا کے چوتھائی حصے پر نہایت تمکنت و وقار اور انصاف پروری کے ساتھ حکومت کر رہے ہیں۔

کم از کم ایک فرانسیسی ایسا ضرور ہے جس نے ہماری ایک جھلک حقیقی رنگ میں دیکھ پائی ہے۔ یہ شخص آندرے مارؔوا ہے۔ جس نے اپنے ایک فرانسیسی دوست کو جو سیاسی اغراض کے ماتحت آبنائے برطانیہ عبور کر رہا تھا خط میں لکھا: "اگر تمہیں انگریز کی کسی بات یا رائے سے حیرت یا صدمہ پہنچے تو اس کے صاف صاف کہنے میں ذرا بھی تامل نہ کرنا۔ دنیا کی کوئی قوم اعتراضات نہیں بلکہ سخت ترین اعتراضات کو اس تحمل اور بردباری سے برداشت نہیں کر سکتی جیسا کہ انگریز!

"انہیں اپنی حساس طبیعت پر فخر ہے۔ ممکن ہے اکثر انگریز کہیں کہ انہیں ہر قسم کی تعریف یا خوشامد سے نفرت ہے لیکن اُن کی اس بات پر یقین نہ کرنا کیونکہ وہ بھی آخر انسان ہیں!

"لیکن اگر تمہیں کسی انگریز کے ساتھ اختلاف رائے ہو تو اس بات کو کبھی نہ بھولو کہ انگریز کی روح انگلستان کے آسمان کی طرح ہے:۔ موسمی حالات ہمیشہ خراب ہی رہتے ہیں لیکن اس کے باوجود آب و ہوا صحت افزا رہتی ہے۔ اور اس کے علاوہ اس بات پر یقین رکھو کہ عالی نسب انگریز اپنی وضعداری کو کسی حال میں بھی نہیں چھوڑتا اور قوانین شرافت کی پابندی سختی کے ساتھ کرتا ہے۔ مدت ہوئی، تمہارے پیشرووں میں سے ایک نے کہا تھا کہ انگلستان آزادی اور علوم ترقی کا ایک حصار ہے۔ یہ مقولہ آج بھی اتنا ہی سچا ہے جتنا کہ اس وقت تھا"

یہودیوں کی ایک زرعی بستی

مندرجہ ذیل مضمون فلسطین کے نوآباد یہودیوں کی ایک زرعی بستی کے متعلق ہے۔ جو حال ہی میں یورپ کے یہودی پناہ گزینوں نے قائم کی ہے مضمون کی عام دلچسپی کے علاوہ یہ بات زیادہ دلچسپ معلوم ہو رہی ہے کہ تہذیب نو کے ستائے ہوئے خواہ وہ کسی قوم یا مذہب وملت سے تعلق رکھتے ہوں اپنی آخری پناہ کے لئے کمیونزم کی آغوش میں آرہے ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ وہ لوگ اسے کمیونزم نہ کہیں یا اس خیال سے ان قوانین وضوابط کو اختیار نہ کریں کہ وہ قوانین و ضوابط کمیونزم سے تعلق رکھتے ہیں لیکن یہ ثبوت ہے اس بات کا کہ کمیونزم کے اصول وقوانین نہ صرف ایک عالمگیر حیثیت ہی رکھتے ہیں۔ بلکہ فطرت انسانی کا تقاضا ہیں اور شاید آگے چل کر بنی نوع انسان کی مشکلات کا واحد حل ثابت ہوں۔

"ہوائی جہاز سے اترتے ہی ہم موٹر میں سوار ہو گئے اور تھوڑی ہی دیر میں طل عفیف جا پہنچے۔ اس کے بعد ایک دفعہ پھر دیہاتی علاقہ شروع ہو گیا۔ یہاں تک کہ چند ہی گھنٹوں میں ہم وادیٔ حجر میں پہنچ گئے۔

لیکن آج کل یہ "پتھروں کی وادی" خوشحالی اور بہبود کی وادی بن رہی ہے۔ یہاں یہودی نوآباد بستے ہیں۔ دو سو ایکڑ کے وسیع کھیتوں اور باغوں کے قلب میں سفید عمارتوں کا ایک جھنڈ کھڑا ہے جس کی مورچہ بندی کو دیکھ کر مغربی امریکہ کی اولین نوآبادیوں کا تصور دل میں جاگ اٹھتا ہے۔

مورچوں کے سوراخوں میں سے بندوقوں کی نالیاں جھانک رہی ہیں اور مورچے کے گرداگرد خاردار تار کے جنگلے کھڑے ہیں۔ عمارتوں میں سب سے اونچا ایک مینار ہے جس پر ایک چبوترہ قائم کر کے توپ گاڑی گئی ہے اور ساتھ ہی سرچ لائٹ کا آلہ لگا ہے

نوآبادی کی اپنی سڑک پر سے گذر کر جس کے دورویہ سایہ دار درخت اگے ہوئے ہیں، ہم مورچے کے پھاٹک پر پہنچ جاتے ہیں۔ یہاں ہمیں اپنی پہچان کرانی ہے اور بستی میں داخل ہونے سے پہلے جراثیم کش دواہیں جوتوں کے تلے ڈبونے ہیں۔ مبادا ہم بستی میں بیماری کے کوئی جراثیم لے جائیں۔ اس کے بعد دروازہ کھلتا ہے۔ اور ہم اندر داخل ہو جاتے ہیں۔

ایک خوش مزاج سا نوجوان کھلے گلے کی قمیص اور نیلی نیکر پہنے ہوئے ہمارے ساتھ ہو لیتا ہے۔ اس کی جلد گہرے گندمی رنگ کی ہے۔ آپ اس بات کا قیاس بھی نہیں کر سکتے کہ یہی دُبلا پتلا نوجوان کبھی گورا بھی تھا اور لندن کے ایک درزی کی دکان میں مشین چلایا کرتا تھا۔

اس کا نام داؤد ہے۔ وہ ہمیں کھانے کے کمرے میں لے جاتا ہے جو اس وقت خالی پڑا ہے۔ دوپہر کے کھانے کا وقت گذر چکا ہے اور یہاں کے لوگ کھانا کھا چکے ہیں۔ ہماری تواضع لبن (دودھ) اور سلاد سے کی جاتی ہے۔

میں نے کمرے کی وسعت کو دیکھ کر اظہار تعجب کیا۔ داؤد نے کہا "ہاں، ہم ڈیڑھ سو آدمی ہیں اور سب کے سب اسی کمرے میں کھانا کھاتے ہیں۔ اگر سب لوگ اپنے اپنے گھروں میں کھانا پکاتے تو دن کا بہت سا حصہ بےکار ضائع ہو جاتا"

"لیکن کیا یہ ممکن نہ تھا کہ تم لوگ کام کرتے رہتے اور تمہاری عورتیں کھانا تیار کر دیتیں؟"

نہیں نہیں، ہماری عورتیں کھیتوں میں ہمارے ساتھ کام

کرتی ہیں"۔

"تو پھر بچوں کی دیکھ بھال کون کرتا ہے؟"

"بچوں کے لئے ایک الگ مکان ہے جہاں اُن کی نگہداشت مجموعی طور پر کی جاتی ہے"۔

یہ بات مجھے کچھ عجیب سی معلوم ہوئی کیونکہ جس طریقے پر ہم آج تک زندگی گذارتے چلے آئے ہیں اس سے بالکل مختلف تھی۔

"شاید آپ اسے آسانی کے ساتھ نہ سمجھ سکیں"۔ داؤد نے کہا "ہمیں بھی پہلے پہل یہ طریقہ کچھ غیر مانوس سا معلوم ہوتا تھا کیونکہ ہم ایسے ملکوں سے یہاں آئے تھے جہاں آج تک ہمارا ہر گھرانا انفرادی زندگی بسر کر رہا تھا۔

یہاں ہم ایک ہی بڑے خاندان کی حیثیت سے رہتے ہیں ۔۔۔ اس لئے کہ ہم یہ طریقہ اختیار کرنے پر مجبور ہیں۔ ایک سو پچاس افراد کا گھرانا عربوں کا مقابلہ بہتر طور پر کر سکتا ہے بہ نسبت اس کے کہ دو دو تین تین افراد ایک دوسرے سے الگ دُور دُور فاصلوں پر رہائش اختیار کرتے جنہیں عرب نہایت آسانی سے ایک ہی رات میں تہ تیغ کر دیتے۔

حفاظت اور مقابلے کے علاوہ اس کا ایک اور مقصد بھی ہے اور وہ کفایت شعاری ہے۔ ہمیں اس بات کا شدید احساس ہوا کہ ہم الگ الگ رہ کر زراعت میں بھی عربوں کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ موجودہ صورت میں ہم زرعی مشینوں کا استعمال کر سکتے ہیں، تقسیم کار کر سکتے ہیں اور ایسے سائینٹفک طریقے استعمال کر سکتے ہیں جن کا امکان زمین کے چھوٹے چھوٹے تقسیم شدہ خطوں میں نہیں ہو سکتا۔

عام کاشتکاروں کی عورتیں کام کی زیادتی کی وجہ سے ہماری عورتوں سے زیادہ محنت کرتی ہیں۔ مرد صبح سے لے کر شام تک کام کرتا ہے لیکن عورت کو اُس سے زیادہ دیر تک کام کرنا پڑتا ہے۔ ہماری عورتیں اتنی ہی دیر تک کام کرتی ہیں جتنی دیر تک مرد کام کرتے ہیں انہیں کھانا پکانے اور بچے پالنے کی مصیبت سے چھٹکارا مل گیا ہے۔ وہ کھیتوں میں کام کر کے پیداوار کو دُگنا کر دیتی ہیں اور اس کے ساتھ ہی محنت کے اوقات گھٹا دیتی ہیں۔

"دوپہر کے وقت سب مردوں اور عورتوں کو تین گھنٹے کے لئے چھٹی ہو جاتی ہے۔ شام کے چھ بجے سب کام بند کر دیئے جاتے ہیں اور اُس وقت سے لے کر اگلی صبح تک لوگ جس طرح چاہیں کھیل تماشوں سے جی بہلا سکتے ہیں۔

"ہم باوجود اپنی محنت و مشقت کے بیسویں صدی کی تہذیب کے تمام لوازم سے لطف اندوز ہوتے ہیں حالانکہ ہمارے رقیب یعنی یہاں کے دیسی باشندے ابھی تک پرانے زمانے کی لکیر کے فقیر بنے ہوئے ہیں۔ یہ ہے فائدہ ایک سنگت بنانے کا"۔

میں نے نوآبادی کے معائنے کی خواہش ظاہر کی چنانچہ پست قد امریکی یہودن کے لئے جو ہمیں کھانا کھلا رہی تھی ایک سکہ میز پر چھوڑ کر ہم باہر آ گئے۔ وہ بھاگتی ہوئی میرے پیچھے آئی اور سکہ واپس کر دیا۔

"میں آپ کی بے حد ممنون ہوں لیکن بات یہ ہے کہ ہم کسی سے پیسہ نہیں لیتے۔ یہاں اس کا کوئی مصرف بھی نہیں ہے"۔

"پیسے کا کوئی مصرف نہیں ہے؟" میں نے دنیا کے کسی خطے میں آج تک ایسی کوئی بات نہیں سنی تھی۔

"یہ صحیح ہے کہ ہماری بستی بازار سے مال خریدتی بھی ہے اور فروخت بھی کرتی ہے"۔ داؤد نے مجھے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "لیکن یہ تمام کاروبار ہمارا خزانچی سر انجام دیتا ہے۔ اگر ہمارا کوئی آدمی طل عفیف یا یروشلم جانا چاہے تو اس کی ضروریات کے لئے اسے کافی روپیہ دے دیا جاتا ہے۔ لیکن ہم میں سے اکثر ایسے ہیں جن کے لئے روپے کا کوئی وجود ہی نہیں ہے"۔

میں نے کہا "کیا روپے کے بغیر تم اپنے آپ کو کچھ کھویا کھویا سا محسوس نہیں کرتے؟"

"نہیں، بلکہ اس کے خلاف ہم سبکدوشی سی محسوس کرتے ہیں۔ روپے کی موجودگی بہت سے تفکرات کو اپنے ساتھ لاتی ہے، مثلاً اس بات کی فکر کہ آپ کے پاس روپیہ کافی ہے یا نہیں، اس بات کی فکر کہ بروقت آپ کو اور روپیہ مل جائے گا یا نہیں۔ اپنے اندوختے کے بڑھانے اور گھٹنے کی فکر۔ اس بات کی خواہش کہ آپ کا آقا تنخواہ میں کچھ اضافہ کرے اور پھر ہر وقت ملازمت سے برخاست ہو جانے کا خوف۔ خوشحال ہمسائے سے حسد جو آپ سے زیادہ تنخواہ پاتا ہو اور پھر ہر وقت بے بیکاری کے دیو کا ڈر۔

یہاں ہم ہر معاملے میں بے فکر ہیں۔ جتنی محنت ہمارے امکان میں ہوتی ہے ہم کر گذرتے ہیں اور اس کے معاوضے میں ہمیں ہر چیز

مل جاتی ہے ۔۔۔ کھانا، کپڑا، مکان، تفریح کے سامان اور تعلیم کے اخراجات۔

"ہمارے یہاں معاوضے کا معیار قابلیت پر نہیں ہے۔ کیونکہ قابل ترین شخص اور جاہل ترین مزدور کا معاوضہ یکساں ہے۔

قابل شخص اپنی قابلیت کے استعمال کرنے سے جو لطف حاصل کرتا ہے وہی اس کے لئے کافی سمجھا جاتا ہے۔ ہمارے یہاں سنگتروں کی کاشت کا ایک ماہر بھی ہے لیکن کیا وہ اپنے باعزت کام کو چھوڑ کر خاکروب بننا پسند کرے گا۔"

"تو کیا تمہارے خاکروب ویسے ہی مکانوں میں رہتے ہیں جیسے تمہارے ماہرین کو ملتے ہیں؟" میں نے حیران ہو کر دریافت کیا۔ داؤد نے مجھے دونوں کمرے دکھائے۔ خاکروب کا بھی اور یونیورسٹی کے تعلیم یافتہ ماہر اشجار کا بھی، دونوں کمرے اور اُن کا ساز و سامان بالکل ایک جیسا تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ سامان کی ترتیب میں ماہر اشجار کی خوش مذاقی کا پتہ ملتا تھا اور خاکروب کے کمرے میں یہ بات نہ تھی۔

داؤد نے کہا "دونوں کے کام میں کسی طرح کی یکسانیت نہیں ہے۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ دونوں اپنے اپنے کام میں امکان بھر محنت کر گذرتے ہیں۔"

"امر واقع یہ ہے کہ دونوں کے معاوضے میں بھی اس وقت پوری پوری مساوات برتی نہیں جا رہی کیونکہ خاکروب ماہر اشجار کے مقابلے میں بہت زیادہ وصول کر رہا ہے۔ اس کا بیٹا بیمار ہو گیا تھا چنانچہ اس کے آپریشن پر ایک بھاری رقم صرف کرنی پڑی۔ اس کی بیوی بھی تپدق میں مبتلا ہے اور اسے سینے ٹوریم میں رکھنے کے اخراجات بھی مشترکہ خزانے سے ادا کئے جا رہے ہیں۔ ہمارا اصول یہ ہے کہ ہر شخص اپنی استعداد کے مطابق کام کرتا ہے جس کے معاوضے میں اس کی تمام ضروریات پوری کر دی جاتی ہیں۔

"یہ اصول فلسطین میں تو اس وقت نہایت کامیابی کے ساتھ برتا جا رہا ہے لیکن بہت ممکن ہے کہ انگلستان، امریکہ یا کسی اور جگہ اتنا کامیاب نہ رہے۔ کیونکہ بہت سے لوگ ایسے بھی ہوں گے جو دوسروں کی محنت و مشقت کا ناجائز فائدہ اٹھائیں گے اور خود تن آسانی سے بسر کریں گے۔ اس بات کا امکان فلسطین کے یہودیوں میں نہیں ہے۔ کیونکہ تمام کے تمام عربوں کی سختیوں سے خوف زدہ ہیں، جرمنی اور اسی قماش کے دوسرے یورپی ملکوں کے ستائے ہوئے ہیں اور اس کے علاوہ ان کے دلوں میں اس وقت فلسطین کو اپنا قومی گھر بنانے کا سودا پوری شدت سے کارفرما ہے۔ اس خواہش نے ان کے دلوں کو اتنا گرما دیا ہے کہ اب اس نے ایک مذہبی جوش کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔"

اس کے بعد ہم نے ان کی بیکری، ڈیری اور مرغی خانے کا معائنہ کیا جہاں ہر تیسرے روز آٹھ سو چوزے پیدا کئے جاتے ہیں۔ اُن کی گائیں قریباً ایک سو تیرہ من دودھ سالانہ دیتی ہیں۔ حالانکہ عربوں کی گائیں اس سے بہت کم دودھ دیتی ہیں۔

مورچے کے ایک پھاٹک سے باہر نکل کر ہم کھیتوں میں جا پہنچے یہاں تمام مرد اور عورتیں کام میں مشغول تھے۔ سوائے چند کے جو ہاتھوں میں بندوقیں تھامے پہرہ دے رہے تھے۔ میں نے پوچھا "اس زمین کا مالک کون ہے؟"

"فلسطین کے تمام یہودی اس کے مالک ہیں جنہوں نے مل کر ایک یہودی بیت المال قایم کر رکھا ہے۔ اس بیت المال کے ارکان زمینیں خریدتے ہیں اور نوآبادکاروں کی بستیوں کو اجارے پر دے دیتے ہیں۔ اگر انہیں خود بستیوں کے لئے زمینیں خریدنی پڑتیں تو بہت ہی کم بستیاں ایسی ہوتیں جو اس کی استطاعت رکھتیں۔"

"تو کیا سوائے بدن کے کپڑوں کے ان کی اپنی کوئی چیز نہیں؟"

"بدن کے کپڑے بھی ان کے اپنے نہیں ہیں۔ یہ قمیص جو میں اس وقت پہنے ہوئے ہوں، معلوم نہیں پچھلے ہفتے کس کا بدن ڈھانپ رہی تھی۔ یہ میرے جسم پر پوری اس لئے آ رہی ہے کہ ہر کپڑے پر اس کا سائز لکھا ہوتا ہے۔ جب کپڑے دھوبی کے ہاں سے دھل کر آتے ہیں تو ہم اپنے اپنے سائز کے کپڑے لے لیتے ہیں۔ لیکن یہ ہمارے نہیں ہوتے۔"

میں نے کہا فرض کیجئے کہ ایک شخص آپ کی برادری میں شامل ہوتے وقت اعلیٰ درجے کے کپڑے اپنے ساتھ لاتا ہے تو کیا وہ کپڑے وہ خود استعمال نہ کرے گا؟"

"نہیں! ابھی پچھلے دنوں کا واقعہ ہے کہ ایک لڑکی اپنے ساتھ ایک نہایت قیمتی پوستین لائی تھی۔ کچھ دنوں بعد ہماری ایک اور رکن کو اپنے والدین کی خبر گیری کے لئے پولینڈ جانا پڑا۔ چنانچہ وہ پوستین اُسے دے

دی گئی۔

"تو کیا پوستین کی اصلی مالکہ نے برا نہ مانا؟"

"ہماری برادری میں شامل ہونے کے بعد وہ اس کی مالکہ ہی کیسے رہ سکتی تھی۔ یہاں آنے کے بعد ہماری ہر چیز مشترکہ ذخیرے میں چلی جاتی ہے اور اس پر ایک شخص کا اتنا ہی حق ہوتا ہے جتنا کہ کسی دوسرے کا"

اس بستی میں دو باتیں خاص طور پر قابل توجہ تھیں۔ کاشت کے جدید ترین سائنٹفک اصولوں کی پابندی اور پیداوار کی کثرت انواع۔ میرے خیال میں مشترکہ کاشت کاری کا بہترین فائدہ یہ ہے کہ سارے سال کے دوران میں کام یکساں نکلتا رہتا ہے اور کسی خاص وقت میں باہر سے مدد لینے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

یہودی بستیوں کے خلاف ایک عام شکایت یہ ہے کہ وہ عرب مزدوروں کو کام پر نہیں لگاتیں۔ لیکن اس کی وجہ یہ ہے کہ عرب بھی یہودیوں کو کام نہیں دیتے۔ یہ لوگ اپنی فصلوں کو مختلف اوقات پر تقسیم کر دیتے ہیں جس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ہر کام بستی کے اپنے ارکان ہی سرانجام دے سکتے ہیں۔

ان کی زراعتی تجربہ گاہ میں جہاں مٹی کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ بکٹیریا کی پوری زندگی کا مطالعہ کرنے کے لئے ایک ایسا مائکروسکوپ موجود ہے جس کی ساخت کے صرف تین مائیکروسکوپ دنیا بھر میں ہیں۔

اس لبارٹری کے تمام انصرام عمل کا سہرا ڈاکٹر وبزمان کے سر ہے جو سرزمین فلسطین کو یہودیوں کا قومی وطن بنانے کی تحریک کے حقیقی رہبر ہیں۔"

مظفر احمد

"اپنے عمل الفاظ یا خیال کے ذریعے سے ہر روز کوئی نہ کوئی مفید کام کیجئے۔ خواہ وہ اپنوں کے لئے ہو یا غیروں کے لئے"۔

(ترجمہ از ساقی)

بُلاوا!

آ گئی فصل بہار!
موسم سرما کی میٹھی نیند سے،
جاگ اُٹھی موجِ نسیم!

بھر گیا پھولوں میں رنگ
آ گیا تاروں میں رس!
اور مہینہ چیت کا
نشے میں چُور سا!
تم بھی اب آ جاؤ دوست،
آ گئی فصل بہار!

یاروں کی منڈلی تمہارا کر رہی ہے انتظار!
تم بھی اب آ جاؤ دوست،
آ گئی فصل بہار!

سعید احمد اعجاز

اردو ادب و زبان پر بادشاہوں کا سایہ

کہا جاتا ہے کہ اردو زبان مسلمانوں اور ہندوؤں کی آمیزش یا آویزش سے اس ملک میں پیدا ہوئی۔ جو قریباً ایک ہزار سال کا پرانا واقعہ ہے۔ اس دوران میں مسلمانوں کے صدہا خاندان یہاں حکومت کرتے رہے جن کی سرکاری یا درباری زبان تو عموماً فارسی تھی لیکن عوام سے بات چیت کرنے میں وہ ہمیشہ اردو یا ہندی سے کام لیا کرتے تھے۔ اب انگریزوں کا زمانہ ہے۔ یہ بھی اردو کو عوام ہند کی زبان قرار دیتے ہیں۔ مگر ان کی سرکاری زبان صرف انگریزی ہے۔ حالانکہ وہ دفاتر جو ابتدا ہی سے محض دیسیوں کی شمولیت کے ساتھ چلائے جاتے ہیں۔ مثلاً پولیس۔ عدالت اور تحصیل و ضلع داری وغیرہ ان محکموں میں کہیں اردو رائج ہے اور کہیں کسی مقامی ہندی سے کام لیا جاتا ہے۔ تاہم ہندوستان جہاں دس دس کوس پر بول چال بدل جاتی ہے۔ اس ملک کی تمام زبانوں میں اردو ہی کو ترجیح و تفوق حاصل ہے۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ اب تک اسی زبان پر ہر حکومت کا سایہ رہا ہے۔ پس یہی اردو لوازی ہمارے اس مضمون کا اصلی موضوع ہے۔

"پنجاب میں اردو" کے عنوان سے جو بے مثل تذکرہ پروفیسر حافظ محمود خاں صاحب شیرانی مدظلہٗ نے تالیف کیا ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے اگر خود سلطان محمود غزنوی اس ملک کی کسی ہندی زبان سے واقف ہو۔ کیونکہ ۴۱۳ھ ہجری کی مہم میں جب وہ کالنجر پہنچتا ہے تو اس علاقے کا راجہ اس کی مدح و تعریف میں کچھ ہندی شعر لکھ کر بھیجتا ہے۔ سلطان فضلائے دربار کو جو ہند و عرب میں وہ اشعار دکھاتا ہے۔ جن کو سب کے سب پسند کرتے ہیں۔ اور سلطان تو ان اشعار کو سن کر اتنا خوش ہوتا ہے کہ صلے میں راجہ نندا کو پندرہ قلعوں کی حکومت کا پٹہ لکھ دیتا ہے۔

اس واقعے سے صاف واضح ہے کہ ہندوستان کا اولین اسلامی بادشاہ ہندی سے جس پر اردو کی بنیا رکھی گئی، شروع ہی میں اس قدر مانوس ہو گیا تھا۔ سلطان موصوف کے بعد آل غزنہ کا دور تقریباً ایک سو ستر سال رہا جس میں یہ زبان ایک معمولی بول چال کی حیثیت سے ترقی پا کر خاصہ ادب بن گئی۔ چنانچہ اس میں غزنوی عہد کے ایک شہرۂ آفاق شاعر مسعود سعد سلمان نے اپنا ایک دیوان مرتب کیا۔ پھر جب خلجیوں اور تغلق بادشاہوں نے دلّی میں اپنی مرکزی حکومت قائم کی تو امیر خسرو جو سات ایسے بادشاہوں کے ندیم رہے۔ انہوں نے اردو کو اس قدر عام کر دیا کہ پہیلیوں اور کہہ مکرنیوں کی صورت میں یہ بولی طوطی چھوٹے چھوٹے بچوں کی زبان تک پہنچ گئی اور اس نے خود مسعود سعد سلمان کی تقلید میں ایک ہندی یا اردو دیوان بھی تصنیف کیا جس کو اس نے اپنے ایک فارسی دیوان غرۃ الکمال کے دیباچے میں بہت فخر کے ساتھ ملک کے روبرو پیش کیا ہے اس کے بعد دلّی سے یہ زبان تغلقوں ہی کے عہد میں براہِ راست دکن پہنچ گئی۔ اور وہاں تو قطب شاہیہ حکومتوں نے اردو کو گویا اپنا شب و روز کا وظیفہ بنا لیا اور اس سے جنوبی ہند میں اس کی خوب اشاعت ہوئی۔ بلکہ دکن ہی کو یہ خاص شرف حاصل ہے کہ وہاں کے تاجدار اس زبان میں ہمیشہ ایک دیوان اپنی یادگار چھوڑ جاتے رہے ہیں اور اب تو وہاں اردو یونیورسٹی کے اجرا سے صاف ثابت ہو چکا ہے کہ فرمانروایان دکن اپنی سابقہ روایات پر بیشتر سے بھی زیادہ فیاضی کے ساتھ کاربند ہیں۔

زبان اردو پر بادشاہوں کی نظر شفقت اسی ایک شعر سے بھی صاف نمایاں ہے جسے سلطنت مغلیہ کے بانی مبانی بابر بادشاہ نے اپنے توزک میں لکھا ہے ؎

مجہ کا نہ ہوا کچھ ہوس مانگ د موتی

مجھ کو کچھ ہونگا

خفر العیفہ بس بلفوسید ردپانی و روتی

ترکی عبارت پانی و روٹی

اسی طرح بابر کے جانشین ہمایوں بادشاہ کو بھی اردو بولی ضرور آتی ہوگی جبھی تو اکثر تذکرہ نویسوں نے اُس کی یہ روایت قلمبند کی ہے کہ قلعہ چیپانیر کی مہم میں مخالف فوج کا سردار رُومی خاں گرفتار ہوکر آیا تو ایک طوطے نے رومی خاں کو پھٹ پاپی نمک حرام کہا۔ بادشاہ یہ سن کر محظوظ ہوا اور کہا کہ۔ رومی خاں یہ جانور ہے نادان اگر کوئی انسان ہوتا تو میں اس کی گردن اڑا دیتا۔

شہنشاہ اکبر نے ہمایوں کا تخت و تاج ملنے پر جو ہندی نوازی اور ہندو نوازی کی اس کی باتیں اب تک زبان زد عام چلی آتی ہیں جس پر حاشیہ آرائی کی بظاہر کچھ ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔ مگر عالمگیر اورنگ زیب کو بہت متعصب بادشاہ خیال کیا جاتا ہے اور اس کی تردید میں مسلمانوں کو جس قدر ضد ہے۔ اسی قدر ہندوؤں کو بھی کد ہے لیکن اس خاص مسئلے سے یہاں ہم کو کچھ سروکار نہیں۔ ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اردو بول چال شہنشاہ موصوف کے بھی اُسی طرح منہ لگی ہوئی تھی۔ جس طرح کہ اس کے بعد ہندوستان کے تمام وائسرائے یعنی لارڈ ہسٹینگز سے لارڈ لنلتھگو تک اس کو سب بخوبی سمجھتے آئے اور اس کا سمجھنا۔ نہ صرف ہندوستانی رعایا کے واسطے بلکہ اپنے لئے بھی لابدا ضروری خیال کرتے ہیں۔ ہم سطور ذیل میں عالمگیر اورنگ زیب کی اردو بول چال کا ایک نمونہ درج کرتے ہیں۔

اورنگ زیب کی اُردو

رسالہ انڈین انٹی کویری (Indian Antiquerry) کے پرانے فائل کے مطالعے سے مجھے معلوم ہوتا ہے کہ شہنشاہ اورنگزیب جب اورنگ آباد (دکن) میں مقیم تھا تو جس قدر یورپین سیاح۔ تاجر یا سوداگر اس وقت ہندوستان میں آتے جاتے تھے۔ وہ سب اردو زبان بولا کرتے تھے اور خود بادشاہ یا حکام وقت بھی صرف اسی زبان میں ان سے بات چیت کیا کرتے تھے جیسا کہ۔ رچرڈ بیل (Bell) ایک فوجی انگریز اورنگ زیب کے دربار میں آیا اور ایک توپچی کی حیثیت سے وہ بادشاہ کے لشکر میں بھرتی ہوگیا تو ایک روز شاہی دربار میں کچھ مذہبی گفتگو کے دوران میں قاضی صاحب انگریز موصوف سے کہنے لگے۔

"جناب رچرڈ بیل صاحب ہمار حضرت عیسیٰ کو تو ہم بھی روح اللہ مانتے ہیں۔ پھر آپ حضرت محمد صاحب کی تقدیس کے کس لئے قائل نہیں ہوتے؟ اس کا جواب رچرڈ بیل نے اپنی ٹوٹی پھوٹی اردو میں اس طرح دیا۔ جناب قاضی صاحب۔ جب سے کہ کھدا میرا آنکھ کھلا دکھو لا (یعنی پیدا کیا) ام کو سید ھا راہ بتایا (مراد یہ کہ صاحب بہادر کے نزدیک (خدا) ایک عیسائی روز اول ہی سے راہ ہدایت پر ہے۔ اس کو آنحضرت کی کچھ ضرورت نہیں) یہ بحث سن کر شہنشاہ عالمگیر نے فوراً یہ الفاظ کہے "عیسائی سچا یا جھوٹا یہ سب خدا کے ہاتھ ہے" مطلب یہ کہ ان مسائل سے درگذر کرنا اولیٰ ہے۔

اسی طرح پھر ایک مرتبہ وہی رچرڈ بیل اورنگ زیب کے دربار میں گیا اور چونکہ وہ صاحب توپ چلانے اور ڈھلنے کا کام بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ بادشاہ نے اس سے دریافت کیا۔ کیا تم ہمارے لشکریوں کو ایسے کام سکھا دوگے۔ اس کا جواب اس نے یوں دیا کہ "بادشاہ سلامت ام تمہارا چاکر" البتہ "ہمارے ولائتی بادشاہ کا حکم ام توپ کا بنانا کسی کو نہ سکھاتا" یعنی ان کو ولایت میں تاکید کردی گئی تھی کہ کسی ایشیائی کو توپ کا ڈھالنا نہ سکھانا۔ یہ سن کر بادشاہ نے فوراً کہا۔ "خدا نہ کرے" ــــــ یعنی اس قسم کی کسی بات پر عمل کرنے کی خدا تم کو توفیق نہ دے۔ اسی طرح اورنگ زیب سے اُسی صاحب کی اور کئی موقعوں پر بھی گفتگو ہوئی۔ اس نے ان کا حال بہ تفصیل لکھا ہے اور اورنگ زیب کی زبان سے جو کلمات وقتاً فوقتاً صادر ہوئے۔ ہم ان کو متعلقہ بیانات سے اخذ کرکے یہاں سپرد قلم کرتے ہیں۔ ایک موقع پر بادشاہ نے خود فرمایا۔ "ہم کہتا ہمارا بات سنو" ــــــ دوسرے موقع پر بادشاہ نے پوچھا۔ "یہاں سے کتنا دور"۔ میں نے (یعنی انگریز نے) کہا۔ آدھا کوس بھر"۔ ایک دن مسلمان توپچی جو دربار میں ملازم تھا۔ اُس انگریز توپچی سے توپ چلاتے وقت مارا گیا تو اورنگ زیب کے منہ سے نکلا۔ "دیکھو ہمارا عزت مرگیا"۔ مطلب یہ کہ شاہی توپچی نکما ثابت ہوا۔ تو بہت برا ہوا۔

ایک مقام پر رچرڈ بیل صاحب توپ ہی کے متعلق کچھ کہہ

سن رہے تھے کہ بادشاہ نے کہا۔"اب تم کیا کہتا۔ تم اول نہیں کہتا۔ یہ توپ درست نہیں چلنے گا"۔ اس جملے سے متکلم کی مراد یہ تھی کہ توپچی کو پہلے ہی سے کیوں نہ بتا دیا گیا کہ فلاں توپ درست نہیں اسی لئے وہ ٹھیک طور پر نہیں چلے گی۔ یہ اعتراض سن کر رچرڈ صاحب بولا۔"دار وگولا ام کو د و اب ام چلاتا"۔۔۔۔۔ لہٰذا اب صاحب نے توپ چلائی تو کمال کر دیا۔ یہ دیکھ کر (صاحب موصوف کا قول ہے) کہ بادشاہ نے یہ فقرہ اپنی زبان سے ارشاد فرمایا۔۔۔" اتنے آدمی یہ جانتا۔ ہمارے ملک کا آدمی اتنے نہیں جانتا"۔۔۔۔ یعنی جتنا یہ فرنگی توپ کا ہنر سمجھ سکتا ہے۔ ہندوستانی اس قدر نہیں جانتا۔ وغیرہ وغیرہ

مشرقی ملکوں کا یہ دستور ہے کہ بادشاہ جس بات کو سرِ دربار قبول کرے وہی اکثر سارے ملک میں پھیل جایا کرتی ہے اور ایسا کیوں نہ ہو۔ "الناس علیٰ دین ملوکہم" لہٰذا شہنشاہ اورنگ زیب کی سلطنت ہی کے زمانے سے اردو چار دانگ ہندوستان میں اشاعت پذیر ہو گئی تھی اور پھر مغل شاہزادے امراؤ وزرا۔ بلکہ دلی کے اکثر تاجدار مثلاً محمد شاہ بادشاہ اور بہادر شاہ ظفر وغیرہ تو صاحب دیوان کہلائے اور اسی دلی سے باغی ہو کر جب اودھ کے نواب برسرِ اقتدار ہوئے تو دلی کے تمام نامور شاعر جیسے میر تقی میر، سودا، جرأت، مصحفی اور انشا وغیرہ لکھنؤ چلے گئے اور تازیست وہاں عیش کرتے رہے۔ کیونکہ نواب سعادت علی خاں مرحوم سے لے کر شاہزادہ سلیمان شکوہ اور رسیا پیارے نواب واجد علی شاہ تک سب اردو غزل کے رسیا اور شیدا تھے۔ جنھوں نے اس زبان کو بہت نوازا اور خوب ترقی دے کر پروان چڑھایا۔ ادھر رامپور، الور اسی طرح کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں مثلاً بھوپال وغیرہ کا تو ذکر ہی کیا ہے۔ جہاں اردو شعرا کی محض اسی لئے قدر کی جاتی تھی کہ یہ شاہانِ دہلی کا خاص شعار تھا۔ پھر جب ایسٹ انڈیا کمپنی کا یہاں راج ہوا تو اسی دستور کی یوں نقل کی گئی کہ یورپین حکام کو اس ملک کی اور تمام زبانوں کے بالمقابل زیادہ تر اردو ہی سکھائی جانے لگی۔ چنانچہ خاص اس مطلب کے لئے کرنیل گلکرسٹ صاحب ولایت سے بلائے گئے اور لاکھوں روپے کے صرف سے فورٹ ولیم کلکتہ میں صاحب بہادروں کو اردو پڑھانے کی خاطر ایک مقامی یونیورسٹی کا بندوبست کیا گیا جس کی مفصل کیفیت یہاں نظر انداز کی جاتی ہے۔ پھر جب دلی کے غدر کا ہنگامہ برپا ہوا۔ تو انگریزی راج کچھ دنوں معطل رہ کر ملکہ وکٹوریہ نے تاج و تخت سنبھالا اور یہ بات سبھی جانتے ہیں کہ ملکۂ موصوف نے ایک ہندوستانی مولوی غالباً مسمی عبدالکریم کو لندن بلوایا تھا اور وہ اردو زبان بڑے شوق سے پڑھتی رہیں۔ حال میں نئی دلی تعمیر ہوئی تو وہ خاص تقریر جو وائسرائے ہند نے حکومت کی طرف سے کی تھی، تمام تر اردو میں تھی۔ غرض۔ اردو ادب و زبان پر اس ملک میں ہمیشہ بادشاہوں کا سایہ رہا ہے۔ بلکہ ان بادشاہوں سے بھی زیادہ عوام ہند کے نزدیک وہ لوگ معتقد رہیں۔ جو فقرا یا صوفیائے کرام کہلاتے ہیں اور جن کے حق میں آتش کا یہ قول ہے ؎

اے ہما پیشِ فقیری سلطنت کیا مال ہے
بادشاہ آتے ہیں پابوسِ گدا کے واسطے

یہ فقرا اور صوفیا کا گروہ بھی شروع ہی سے اردو پر بہت مہربان رہا ہے۔ چنانچہ اس کی داستان بھی انجمن ترقی اردو کی طرف سے ایک مختصر رسالے میں طبع و شائع ہو چکی ہے۔

مربیانِ سخن

کتاب شعر الہند کے دوسرے حصے میں مولوی عبدالسلام صاحب ندوی نے ایک باب مربیانِ سخن کے عنوان سے لکھ کر کتاب مذکور کا خاتمہ کیا۔ وہاں ذرا تفصیل سے معلوم ہو سکتا ہے۔ کہ ہندوستان میں اردو زبان پر کس کس طرح ہر زمانے میں یہاں کی حکومتیں احسان کرتی رہی ہیں۔ نظر بریں۔ اب یہ بحث ہے کہ آیا ہماری یہ زبان (اردو) حکومت ہی کے سہارے پر آیندہ بھی یہاں قائم وسلامت رہے گی۔ یا بعض سیاسی انقلابات ہمیں مجبور کر دیں گے کہ ہم اس خاص زبان کو صرف ہندو مسلم قوموں کی ایک مشترکہ ملکیت سمجھ کر۔ آیندہ بھی اس کو برقرار رکھنے کی کوشش کریں۔ تاکہ ضائع نہ ہو جائے۔

جہاں تک میرا عقیدہ ہے اردو اس ملک میں آل غزنہ کے پہلے تاجدار سے لے کر مغلوں کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر تک صرف ان مسلمان بادشاہوں ہی کے بل بوتے پر قائم وسلامت رہی ہے جن کی تقلید انگریزی عہد میں بھی کی گئی لیکن اب جبکہ

اس ملک کو آزادی یعنی خود مختاری کا درجہ دیا جا رہا ہے تو یہ خیال کہ صرف ہندو مسلم اتحاد اس زبان کو اب برقرار رکھے گا۔ مجھے ذرا کھٹکتا ہے کیونکہ میرے نزدیک اردو کی ضرورت ہم سے بھی زیادہ خود ان حکومتوں کو رہی ہے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے جب وہی بے بس ہو گئیں تو پھر اس کو ہندو مسلمانوں کے رحم پر چھوڑ دینا۔ گویا آئندہ اس کی مزید ترقی سے ناامید ہو جانے کے برابر ہے۔ اس لئے کہ یہ زبان اُن حکومتوں ہی کے چلائے سے اب تک چلتی رہی ہے نہ کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے ملاپ سے جو اب تک تو ہوا نہیں اور نہ کبھی ہو سکے گا۔ لہذا اردو کو یہیں یا تو سیاسیات سے دور رکھنا پڑے گا۔ یا اس کو ہندوستانی کی صورت میں بدل کر اس قدر کھچڑی کرنا پڑے گا کہ ہر ایک صوبے کی اردو ایک خاص جداگانہ رنگ اختیار کر لے گی اور اس پر کسی ہمہ گیر بادشاہ کا سایہ ہونے کے بجائے صرف ایک صوبے ہی کی وزارت کا سایہ پڑتا رہے گا۔ تو اس کی وسعت بالکل محدود ہو جائے گی۔
تاہم اس سے قطع نظر کہ اردو کا سابقہ بادشاہوں سے کیا تعلق تھا۔ اور اس سے کیا کیا نتائج مرتب ہوئے ....

اب یہ دیکھنا ہے کہ کیا کسی زبان کی ترقی اشاعت اور استقلال و استحکام کے اور بھی اسباب ہو سکتے ہیں اور ان سے ہماری اردو کس کس طرح مستفید ہوئی۔

اردو کی ابتدا ایک تو اس طرح سے ہوئی تھی کہ حکام وقت اور حکومت کو ہمیشہ اس کی ضرورت درپیش رہتی۔ دوسرے اس کی ابتدا میں بعض خاص خاص اسباب اس قسم کے اس کو حاصل ہوئے۔ کہ جن سے اس کی جڑ ہمیشہ کے لئے مضبوط ہو گئی۔ اور یہ آیندہ زبانوں میں مسلسل ترقی کرتی چلی گئی۔ چنانچہ وہ اسباب مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ پنجاب کی پیداوار۔ آب و ہوا یا اس کی عام فضا فطرتاً کچھ اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ اس میں ہر نئی تحریک فی الفور سرسبز ہو جاتی ہے اور تا بہ تکمیل ترقی پا کے رہتی ہے۔ مثلاً آریہ لوگ وسط ایشیا میں نامعلوم زمانوں سے آباد تھے لیکن وہ پنجاب میں آن بسے تو ان کو چار چاند لگ گئے۔ یہیں ان کی آئندہ زبان سنسکرت اور ویدوں وغیرہ کی بنیاد قائم ہوئی۔ اور پھر اسی کو لے کر وہ آگے بڑھے۔ اسی طرح آل غزنہ نے جب اُردو کو اپنی حمایت میں لیا تو یہ اہل پنجاب ہی کی اخلاقی جرأت۔ ہر نئی چیز سے محبت اور اس زبان کی خاص دلکشی تھی جو اُس وقت کام آئی اور پھر یہ زبان غوریوں اور تغلقوں وغیرہ کے ذریعہ دلی پہنچی۔ اور دلّی سے پھر دکن اور لکھنؤ تک جا کر ہندوستان کی عام زبان بن گئی۔ دیکھو۔ آریہ سماج پنجاب کی چیز نہ تھی۔ نہ سرسید کی جدید تعلیمی تحریک اور نہ ہندوؤں کی بھگتی فلاسفی جس کی اصل جنوبی ہندوستان سے ہے۔ لیکن آریہ سماج اور سرسید کی تحریک کی طرح بھگتی فلسفہ کا رفتہ رفتہ ایک پنجابی گورونانک کی وساطت سے خالص مذہب بن جانا۔ یہ ایسی باتیں ہیں جو ذرا تفصیل طلب ہیں۔ آریہ سماج کے بانی دیانند سرسوتی آگرہ اور بنارس جیسے ہندو آبادی کے شہروں میں جب ناکام رہے تو اسی شہر لاہور میں وہ ایک مسلمان ڈاکٹر رحیم خاں کی پناہ لے کر کامیاب ہوئے اور سرسید کو تو اہل پنجاب نے قلمے، قدمے، درمے۔ اتنی مدد دی کہ وہ اُن کو زندہ دلان پنجاب کا لقب دے گئے۔ جبکہ ساری دنیا میں مذہبوں کی تخلیق بالکل بند ہو چکی ہے۔ گورونانک کے پیغام کو ان کے ہندو مسلمان مریدوں نے ایک خاص پنتھ بنا کر اس کو پنجاب میں سکھ مذہب کے نام سے مستقل طور پر قائم کر دیا اور یہی مذہبوں کی دنیا یعنی سرزمین ایشیا کا آخری دھرم یا دین کہلایا۔ غرض اردو کو پہلے بول چال کے طور پر اپنانا۔ یہ پنجابیوں ہی کا کام تھا۔ ورنہ ہر قوم ہر نئی تحریک کو لبیک کہنے کے لئے تیار نہیں ہوا کرتی

۲۔ ایک نئی زبان کو استحکام و ترقی دینے اور اس کو بطور ادب آئندہ سلسلہ دار جاری رکھنے کے لئے خاص خاص ادبا اور شعراء کی بھی حاجت پڑتی ہے۔ اس اشد ضرورت کو جہاں تک مجھے معلوم ہے ابتدائے اردو میں ایک خالص پنجابی شاعر مسعود ابن سعد ابن سلمان نے پورا کیا۔ میں اس کو خالص پنجاب کا باشندہ کس وجہ سے قرار دیتا ہوں۔ وہ اس کی مختصر سوانح عمری سے واضح ہو گا۔ جو درج ذیل کی جاتی ہے۔

خواجہ مسعود کے والد کا نام سعد تھا جس کا باپ سلمان، ہمدان کے ایک معزز اور تعلیم یافتہ ایرانی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ خواجہ سعد غزنوی دربار میں ملازم ہو کر ہندوستان کی طرف آیا اور یہیں پنجاب میں مستقل طور پر رہ گیا۔ اسی کا بیٹا مسعود اسی شہر لاہور میں ۴۴۰ھ ہجری میں پیدا ہوا اور مثل اور پنجابی لڑکوں کے یہیں تعلیم و تربیت پائی اور پروان چڑھا۔ جوان ہوا تو وہ بھی اپنے باپ کی طرح آل غزنہ

کی خدمتگزاری پر مامور کیا گیا۔ ۴۶۹ھ میں جبکہ سلطان ابراہیم کے فرزند محمود ملقب بہ سیف الدولہ کو غزنویوں کی طرف سے پنجاب کی حکومت سپرد ہوئی تھی۔ خواجہ مسعود سعد سلمان کو اول اول سر دفتر بنایا گیا تھا۔ کیونکہ وہ اپنی خاندانی وجاہت و قابلیت کے لحاظ سے اسی کام کے لائق تھا۔ مگر آل غزنہ کے لئے پنجاب اس وقت جنگ و جدل کا میدان بنا ہوا تھا۔ کلائیو کی طرح خواجہ مسعود موصوف کو بھی ان غزنوی جنگوں میں پے درپے شریک ہونا پڑا اور اس سے ثابت ہوا کہ وہ نہ صرف قلم پر قادر تھا بلکہ تلوار کا بھی دھنی تھا۔ ان خدمات کے معاوضے میں اُسے ضلع لاہور میں حاکم یا نائب السلطنت کے عہدے پر بھی سرفراز کیا گیا۔ اور جس طرح کلائیو لارڈ بنکر انگریزوں کی مستقل حکومت ہند کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ خواجہ موصوف کو بھی اس پنجابی پراکرت کے مستحکم کرنے کا خیال پیدا ہوا تھا جس سے مابعد اردو نے جنم لیا۔ یہی وجہ ہے کہ مسعود سعد سلمان کے ایک ہندی دیوان کا حال بھی محمد عوفی نے اپنی کتاب الالباب میں لکھا ہے۔

ورنہ وہ ایرانی ہوتا تو اس کی کسی ایسی قابلیت کا اس وقت کوئی ذکر تک بھی نہ کرتا۔ کیونکہ محکوم قوم کی زبان کیا اور اس میں کوئی کمال حاصل کرے۔ تو اس کی قدر و قعت ہی کہاں ہوتی ہے۔ لیکن ہمارے اس مسعود سعد سلمان کو لاہور سے خاص محبت تھی وہ اس کے رہنے والوں کا دل سے دوست تھا جبھی تو وہ ایک مرتبہ قید ہوا۔ اور اس وقت جب وہ اپنی ذاتی جائیداد کے ایک مقدمے کی اپیل کے لئے غزنی گیا ہوا تھا تو شہر لاہور کی جدائی سے متاثر ہو کر لکھتا ہے۔

اے لوہور[1] ویحک بے من چگونہ — بے آفتاب تاباں روشن چگونہ
فرزند دل نواز تو از تو جدا شدہ است — با درد او بنوحہ و شیون چگونہ
تو مرغزار بودی و من شیر مرغزار — با من چگونہ بودی و بے من چگونہ

یہی مسعود جو پہلے تین سال حکومت کے عتاب میں آ کر مقید ہوا تھا۔ پھر جب مزید سات سال کے لئے محبوس کیا گیا اور رہائی کی امید بالکل منقطع ہو گئی تو اپنے وطن مالوف کے فراق میں کہتا ہے۔

کار اطلاق من چوں بستہ بماند — کہ ہمیں ایزدش نہ بکشاید
مرمرا حاجتے ہمے باشد — و ز دلم خار شے ہمے زاید
مخلصے باید از خداوندم — کہ از و بوئے لوہور[1] آید
کہ ہمی زار روئے لوہار شود — جان و دل در تنم ہمی ناید

مشرقی درباروں میں اعلیٰ حکام کی ملازمت بادشاہ کے رحم پر ہوتی ہے۔ جب مسعود کی اس قدر بے قدری کی گئی تو وہ آخر اپنی املاک یعنی کچھ ناقابل انتقال جائیداد کے آسرے پر جو اس لاہور کے ضلع میں تھی خانہ نشین ہو گیا اور اپنی تصنیفات میں مصروف رہ کر ۷۵ سال کی عمر میں ۵۱۵ ہجری میں انتقال کر گیا۔

اگر امیر خسرو کو بعض تذکرہ نویسوں نے اردو کا بانی تسلیم کیا ہے تو میرے نزدیک اس زبان کا اصلی واضع یا موجد خسرو نہیں بلکہ مسعود بن سعد بن سلمان لاہوری ہے۔ اور جس طرح دتی۔ دکن یا لکھنؤ کی سرزمین اردو کے آیندہ کمالات کے لئے راس آئی۔ اسی طرح لاہور بھی ابتدائے اردو سے اس کا ممد ہے۔ لیکن اگر مسعود جیسا ادیب شاعر اور سیف و قلم کا دھنی یہاں جنم نہ لیتا اور وہ اس کا خاص محسن نہ بنتا تو اردو زبان کبھی وجود ہی میں نہیں آ سکتی تھی۔ لہذا۔ اردو ادب و زبان پر مختلف اوقات میں بادشاہوں نے جو عنایت کی۔ اس کا دستور اسی جلیل القدر شاعر کے ہاتھوں قایم ہوا تھا۔ لیکن بہت افسوس ہے کہ اس کا ہندی کلام اب تک دستیاب نہیں ہوا۔ اور اگر کہیں سے ہوا بھی تو اُس کا قریب قریب وہی رنگ ہوگا جو امیر خسرو کی ہندی یا اردو تصنیفات کا ہے۔ جس کا غالب حصہ وقتاً فوقتاً ترمیم کیا گیا جس طرح خالق باری ترمیم ہوتے ہوتے ایسی بن گئی کہ اس کو خسرو کی تصنیف ہی قرار دینے میں بعض محققین ادب کو اب تامل ہوتا ہے اور کیوں نہ ہو۔ خالق باری کی سب سے آخری ترمیم مولانا حافظ نذیر احمد خاں مرحوم نے کی تھی اور اس کا نام نصاب خسرو رکھ دیا تھا۔ اسی طرح غالباً مسعود سعد سلمان کا اردو کلام بھی ترمیم ہو کر اور شعرا کے کلام میں جزواً جزواً لاحق ہو گیا اور پھر بالکل مفقود ہو کے رہ گیا ہے۔ ورنہ اس سے ہمارے اس مضمون کو اور بھی زیادہ مدد مل سکتی تھی تاہم ایران کے جدید تذکروں میں مسعود کے فارسی دیوان کا پتہ چلتا ہے کہ وہ وہاں تا حال موجود ہے۔

شیر علی خاں سرخوش

[1] لوہور سے لاہور

غزل

مرے لب پر یہ کیوں بے ساختہ آج اُن کا نام آیا
رہِ اُلفت میں پھر شاید کوئی نازک مقام آیا

بہکتا، لڑکھڑاتا، کون یہ مست خرام آیا
صُراحی خود بخود جُھکنے لگی، گردش میں جام آیا

نگاہِ شوق سجدے کر، وہ مائل ہیں نوازش پر
نظر اُٹھی، وہ شرمائے، سلام آیا، پیام آیا

نہ یاروں کا احساں ہے، نہ غیروں کی شکایت ہے
وہی لے دے کے اک دل تھا جو ہر موقع پہ کام آیا

طلب کی راہ میں کتنی جگہہ، ٹھوکر لگی دل کو
کہیں بیت الصنم آیا، کہیں بیت الحرام آیا

میں خود اپنے کو اے ماہرؔ مبارکباد دیتا ہوں
مقامِ شکر ہے خود اُن کی جانب سے پیام آیا

ماہر القادری

اے بادِ غرب

لائی ہے مغربی گھٹا! فصلِ خزاں کا قافلہ — رنج بھی، غم بھی، خار بھی، بادۂ بے خمار بھی!

تیرے شرار سوز سے پھول چمن میں جل اُٹھے — تیرے ہی نیشِ خار سے سینۂ گل فگار بھی!

تیری حیات میں نہاں، مانا کہ ہے خزاں کی جاں — تیری ہی گود میں جواں پل کے ہوئی بہار بھی!

پیدا ہوئے تھے برگ و گل ایک ہی رات کے لئے
تو نے دبا کے رکھ لیے "تازہ حیات" کے لئے

تیرے خرامِ ناز سے پیدا اک اضطراب ہے — بحر میں، بر میں، باغ میں، دشت میں کوہسار میں!

دامنِ تار میں نہاں تیرے ہیں لاکھ آندھیاں — جیسے نہاں ہوں بجلیاں گیسوئے تابدار میں!

گردشِ ماہ و سال کو منزلِ کارواں ہے تو
تیرہ و تار رات کی آخری داستاں ہے تو!

نالہ جوش تھا خموش، کس نے کیا ہے پرخروش! — بحر کی خفتہ موج کو کس نے جگایا خواب سے؟

زلفِ عروسِ باغ کی، تو نے صبا! بکھیر دی، — سینۂ آب کو نئے داغ دیئے حباب سے!

تیری نوائے پُرالم، تیری صدائے رنج و غم
تیری ندائے زیر و بم پھیلی ہوئی ہے، بم بہ بم!

میرا چمن اُجڑ گیا، بادِ خزاں! تو کیا ہوا! — تو اور میں تو ایک ہیں درد بھری صفات میں!

گیت ہیں ہار جیت کے بھولی ہوئی پریت کے — دونوں کی راگنی ہے غم کارگہ حیات میں!

میری صدائے ہاؤ ہو لے جا صبا! مثالِ بُو — جا کے سُنا دے کو بہ کو عرصۂ کائنات میں!

رنگِ خزاں نے لے لئے باغ میں برگ و بار کے
بلبلِ نیم جاں! نہ رو آتے ہیں دن بہار کے!

(شیلی)

قدرت اللہ شہاب

دو سپاہی

"چی" . . . . گاؤں حاصل کرنے کے لئے جاپانیوں نے کئی دفعہ کوشش کی۔ مگر چینیوں نے انہیں ان کے ارادوں میں کامیاب نہ ہونے دیا اب جاپانیوں نے ایک سخت حملہ کا تہیہ کر لیا تھا۔ مدافعت کے لئے چینی بھی تیار ہو رہے تھے۔

"چی" . . . . کے بیچ میں سے ایک سڑک گذرتی تھی جس کے دو رویہ درخت کھڑے تھے۔ جنگ سے پہلے گاؤں سے گذرنے والے مسافر ان کی ٹھنڈی چھاؤں میں گھڑی دو گھڑی بیٹھ کر سستا لیا کرتے تھے۔ گاؤں والے اپنے کھیتوں سے دوپہر کے وقت واپس آ کر ان کے نیچے جمع ہوتے اور ادھر اُدھر کی باتیں کر کے پھر اپنے کھیتوں کو واپس ہو جاتے اور بچوں کا تو یہ شغل ہی تھا کہ اُن درختوں پر چڑھیں۔ اتریں۔ اور اسی طرح دن پورا کر دیں۔ مگر اب تو یہ درخت ایک بھیانک منظر پیش کر رہے تھے۔ ان کی شاخیں ٹوٹ چکی تھیں۔ پتے غائب ہو چکے تھے۔ گولیوں نے ان کے تنوں کو چھید ڈالا تھا۔

گاؤں سے ذرا باہر ایک عمارت تھی . . . . . دو منزلہ . . . . . بموں نے اس کی اوپر کی چھت غائب کر دی تھی گولوں نے اس کی دیواروں میں بڑے بڑے سوراخ پیدا کر دیئے تھے۔ اس کے مٹیالے رنگ پر خون کے چھوٹے بڑے سیاہ دھبوں کے نقش و نگار . . . . . ایک ہولناک سماں پیش کر رہے تھے۔ اس عمارت کے دروازے پر "شنگ" نامی سپاہی پہرہ دے رہا تھا اور اس کے اندر چینی فوج کا ایک دستہ ٹھیرا ہوا تھا۔ "شنگ" کی بندوق اس کے کندھوں پر تھی۔ اس نے اپنا آدھا چہرہ آہنی خود سے چھپا رکھا تھا۔ وہ نہ معلوم کن خیالات میں کھویا ہوا تھا۔

شام کا وقت تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ اندھیرا پھیلتا جا رہا تھا۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ ہوا تیز ہو چلی تھی۔ مگر شنگ کو کچھ خبر نہ تھی۔ وہ دو گھنٹوں سے اسی طرح خاموش کھڑا پہرہ دے رہا تھا۔ اس کے پہرے کا وقت ختم ہونے میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ بجلی کی کڑک نے شنگ کو چونکا دیا اور وہ گشت کرنے لگا۔ تھوڑی دیر کے بعد اُسے بھوک محسوس ہوئی۔ اس نے اپنے تھیلے میں سے سوکھی روٹی نکال کر چبانا شروع کی . . . . . اس طرح جیسے کتا ہڈی چباتا ہے . . . . . شنگ نے روٹی چبانے کی بہت کوشش کی۔ مگر کامیاب نہ ہو سکا۔ وہ پھر سوچنے لگا۔ . . . . اس کی آنکھوں کے سامنے اپنے اُس دور زندگی کی تصویر کھینچ گئی۔ جب اسے اس قسم کی روٹی کھانے کا وہم بھی نہ آیا تھا۔ اور جب وہ اچھی سے اچھی غذا میں بھی کوئی نہ کوئی نقص نکال دینا اپنی خوش خوری اور نفاست پسندی کا معیار سمجھتا تھا . . . . . مگر اب وہی شنگ تھا جسے تازہ روٹی تک میسر نہ تھی۔ پہلے اسے اپنے آپ پر غصہ آیا اور پھر روٹی کے اس سوکھے ٹکڑے پر جو اب تک اس کے ہاتھ میں تھا، اس پر ایک وحشت سی طاری ہو گئی اور اُس نے دانت پیستے ہوئے اس ٹکڑے کو پھینک دیا اور روٹی کا وہ ٹکڑا کیچڑ میں جا گرا۔ اب شنگ مسرت محسوس کر رہا تھا . . . . . کچھ عرصہ تک وہ فاتحانہ انداز میں اس ٹکڑے کو دیکھتا رہا۔ پھر گشت کرنے لگا۔

ایک اور سپاہی کا اس طرف سے گذر ہوا۔ اس کی نظر کیچڑ میں پڑے ہوئے روٹی کے ٹکڑے پر پڑی۔ وہ تھما۔ رکا۔ ٹھیرا اور پھر اس ٹکڑے پر جھپٹا۔ بالکل اس طرح جیسے مردار گوشت پر گدھ اور چچوڑی ہوئی ہڈی پر کتا . . . . . اس نے کیچڑ میں سے روٹی کا ٹکڑا نکالا۔ اپنے پھٹے ہوئے کوٹ سے صاف کیا اور نہایت مزے سے اُسے کھانا شروع کیا . . . . . شنگ بت بنا اُسے دیکھ رہا تھا اور اپنے فعل پر ندامت محسوس کر رہا تھا۔ نو وارد سپاہی۔ ایک پتلا دبلا۔ طویل قامت بوڑھا آدمی تھا۔ اس کے سب بال سفید تھے۔ چہرے پر پتلی اور لمبی داڑھی تھی۔ میل جمے لمبے لمبے ناخن تھے۔ بالکل خونخوار درندوں کے سے۔ آنکھیں بخار کے مریض کی سی تھیں۔ بدن سے کراہت انگیز بدبو آ رہی تھی۔ سب کپڑے پھٹے ہوئے تھے . . . . شنگ نے اس کے قریب جا کر پوچھا . . . . "تم بہت بھوکے ہو؟"

اس نے روٹی چباتے ہوئے جواب دیا "ہاں ..... شاید تم دیکھ نہیں رہے۔"

"معاف کرنا اگر معلوم ہوتا تو میں کبھی بھی روٹی نہ پھینکتا۔"

"کوئی بات نہیں۔ میں تم جیسے نوجوان سپاہیوں کی طرح تنک مزاج نہیں۔"

"..... لیکن ..... پھر بھی مجھے روٹی نہ پھینکنی چاہیئے تھی۔ میں اپنے فعل پر سخت نادم ہوں ..... ہاں میرے پاس تھوڑی سی بیر ہے۔ پیو گے؟"

"پلا دو۔"

شنگ نے بڈھے سپاہی کو بیر کا گلاس دیتے ہوئے کہا "میرا نام شنگ ہے۔"

"مجھے ..... مجھے 'باشو' کہتے ہیں۔ میں لڑائی میں مجروح ہو گیا تھا۔ پرسوں ہسپتال سے نکلا۔ معلوم ہوا کہ جس دستہ میں میں تھا۔ وہ ختم ہو چکا ہے۔"

"اب کیا کرو گے باشو؟"

"کسی اور دستہ میں نام لکھا لوں گا۔"

"ہم کیوں نہ اکٹھے رہیں ....."

"بات تو ٹھیک ہے۔"

"باشو! اب جب ہم دوست ہو چکے ہیں۔ کیوں نہ ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف ہو جائیں۔"

"واقف تو ہو چکے۔"

"یہ تو صرف ناموں سے ہوئے ہیں، حالات سے نہیں۔"

"میں سمجھا! اچھا تو میں ایک سپاہی ہوں۔"

"اور"

"فاقہ مست ——"

"تم مذاق کر رہے ہو باشو۔ صاف بات کرو۔"

"—— چینی ——"

"یہ سب کچھ تو میں بھی ہوں۔"

"تو پھر 'بڈھا باشو' کا اضافہ کر دو۔"

"یعنی؟"

"بیکس حالات شنگ!"

"کیا؟"

"فاقہ مست بڈھا چینی سپاہی باشو۔"

"باشو! میں اپنی باری آنے پر اس طرح کہوں گا کہ میں ایک زمیندار کا بیٹا ہوں ..... میرا باپ مالدار تھا ..... میری زندگی عیش و عشرت میں بسر ہوتی تھی ..... آج سے چودہ پندرہ سال قبل میں نے اس دنیا سے دور ..... بہت دور ..... ایک اور دنیا بسانے کا ارادہ کیا تھا ..... مگر قسمت نے ساتھ نہ دیا ....."

"شنگ تم تو شاعر بھی ہو۔ میں تو نرا سپاہی۔ میری دنیا یہی ہے۔ اسی میں پیدا ہوا۔ اسی میں مر جاؤں گا۔ میں نے اس دنیا سے پرے کوئی دنیا نہیں بسائی اور نہ بسانے کا ارادہ کیا۔ ہاں اسی دنیا میں میری ایک دنیا تھی ..... وہ اجڑ گئی۔"

"میرا یہ مقصد نہ تھا باشو! کہ میں تمہیں یہ بتاؤں کہ میں شاعر ہوں یا زمیندار کا بیٹا۔ میں نے تو وقت گذارنے کا شغل نکالا تھا کہ اس بہانے ہم ایک دوسرے کے حالات سے واقف ہو جائیں گے ....."

"مجھے اپنے متعلق کچھ زیادہ تو معلوم نہیں کیونکہ کہتے ہیں کہ میں اپنی شیر خوارگی میں رستہ پر پڑا پایا گیا تھا ....."

"کیا! رستہ پر پڑا پایا گیا تھا۔؟"

"ہاں کسی رستہ پر۔ میں چار سال کی عمر تک ہسپتال میں رکھا گیا۔ پھر ایک عیسائی مشن کے سپرد کر دیا گیا۔ وہاں مجھ جیسے اور بہت سے بچے تھے۔ ہم سب کے دل بہلانے کے لئے ایک چھوٹا سا باغ تھا ..... بڑا خوبصورت باغ ..... شاید ایسا ہی جیسا کہ تم اس دنیا سے دور ..... بہت دور لگانا چاہتے تھے۔ اس باغ میں طرح طرح کے پھول تھے۔ ان کی خوشبو سے ننھی ننھی تتلیاں مست ہو کر ان کا طواف شروع کر دیتیں۔ بلبلیں اپنے حسین نغموں سے باغ کو بجا دیتیں۔ پپیہا 'پی کہاں' کی آواز سے ہم ننھے لڑکوں کے دلوں پر بھی ایک نامعلوم سی چوٹ لگا دیتا۔ ہم اس باغ میں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے۔ دوڑتے اور اسی طرح ہنس کھیل کر اپنا وقت گذار دیتے۔ ہماری نگران ایک راہبہ تھی۔ بڑی حسین اور من موہنی وہ اگرچہ سب بچوں سے پیار کرتی تھی مگر مجھے سب سے زیادہ وہ چاہتی تھی میں بھی اسے بہت چاہتا تھا ..... جب میری عمر دس سال کی ہوئی تو میری وہ دنیا مجھ سے چھن گئی۔ مشن کے منتظم نے مجھے کام سیکھنے کے لئے ایک کرسی ساز کے سپرد کر دیا۔ اس کے پاس مجھے پہلی مرتبہ فاقہ کا تجربہ ہوا۔ اس شخص کی

بیوی بڑی کنجوس تھی اور شاید اسی کی وجہ سے وہ بھی ایسا ہو گیا۔ مجھے کھانا دیتے وقت اس عورت کا گویا دم نکل جاتا۔ وہ کچھ ایسا منہ بناتی اور ایسے لال پیلے دیدے نکالتی کہ میری روح فنا ہو جاتی ...... میں دو سال تک وہاں رہا۔ مگر کسی دن بھی اتنا کھانا نہ ملا کہ پیٹ بھرتا۔ کام سیکھنے کے لئے وہاں دو سال تک رہنا پڑتا تھا۔ کیونکہ مشن کی طرف سے یہ قید لگی ہوئی تھی۔ ورنہ میں نے تو چھ ماہ میں ہی سب کچھ سیکھ لیا تھا۔ کام سیکھنے کے بعد میں آزاد تھا۔ اب میں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ گذارہ ہونے لگا۔ مگر بدقسمتی سے بیماری نے آن دبایا۔ سخت بیمار پڑا۔ اور ہسپتال میں گیا۔ وہاں چھ ماہ تک رہا۔ جب کچھ حالت سدھری وہاں سے بھی چھٹی مل گئی۔ اب حیران تھا کہ کیا کروں۔ کام کرنے کی سکت نہ تھی۔ کیونکہ بیماری گھن کی طرح کھا گئی تھی فاقہ برداشت نہ ہو سکتا تھا۔ خدا نے پیٹ بھرنے کا ایک اور وسیلہ کر دیا۔ صبح کے وقت سکول جاتے ہوئے بچے کچھ نہ کچھ کھاتے جاتے۔ آپس میں ایک دوسرے سے چھینا جھپٹی میں ان سے کچھ نہ کچھ گر جاتا۔ میں اسے اٹھاتا اور کھا لیتا...... میری یہ حالت زیادہ دنوں تک نہ رہی اور میں پھر بیمار پڑ گیا ——— اور پھر ہسپتال میں داخل ہو گیا۔ ہمارے ہسپتالوں کی مالی حالت کمزور ہے۔ اس لئے وہاں مریضوں کو زیادہ عرصہ تک نہیں رکھا جاتا۔ ذرا حالت سنبھلی اور چھٹی دے دی۔ اس لئے مجھے فاقہ کے ساتھ ہی چھٹی مل گئی۔ اب پھر وہی سوال تھا کہ کہاں سے کھاؤں۔ کامل دو دن تک فاقہ کیا۔ پھر پتہ نہیں۔ ہوش میں آیا تو میں ایک زمیندار کے ہاں تھا"

"زمیندار کے ہاں! کس زمیندار کے ہاں؟"

"ایک نیک دل زمیندار کے ہاں۔ اس نے میرے علاج کے لئے ایک ڈاکٹر اور میری خدمت کے لئے ایک ملازم مقرر کر دیا ———

اس قدر آرام اور راحتیں ملنے پر میں اپنی بیماری کو بالکل بھول گیا اور بچپن کے خوشگوار دنوں کی تصویر آنکھوں میں پھر گئی۔ جب میں بالکل اچھا ہو گیا۔ تو اس زمیندار نے اپنے بعض کام میرے سپرد کر دیئے۔ مثلاً کھیتوں کو جا کر دیکھ آنا۔ باغ میں نئے پودے لگوانا۔ کاشتکاروں سے مالیہ وصول کرنا ......"

"باشو کیا یہ تمہاری ہی داستان ہے؟"

"ہاں یہ میری ہی داستان ہے۔ اور کس کی ہوتی ——— تو ———

اس زمیندار نے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی مر چکی تھی۔ اس سے ایک لڑکی تھی۔ دوسری بیوی سے کوئی اولاد نہ ہوئی تھی۔ یہ بیوی بڑی خوبصورت تھی۔ زمیندار کو اس سے بہت محبت تھی اس سے ایک دم کے لئے بھی جدا ہونا اسے شاق گذرتا تھا۔ وہ بھی اسے بہت چاہتی تھی۔ مجھے وہاں گئے ہوئے ڈیڑھ سال ہی ہوا ہو گا کہ زمیندار نے اپنی لڑکی کی شادی مجھ سے کر دی۔ پہلے ہی زمیندار کے حسن سلوک نے کسی قسم کی اجنبیت باقی نہ رکھی تھی۔ اب اس شادی نے قانونی طور پر مجھے اس گھر کا ایک فرد بنا دیا۔"

"باشو۔ تمہاری داستان بہت عجیب ہے!"

"بہت عجیب شنگ! ...... ہاں ...... تو ...... مجھے جو بیوی ملی۔ وہ اس زمیندار کی اکلوتی لڑکی تھی۔ وہ بہت حسین تھی، اور بہت فرمانبردار مگر میں اسے نہ چاہتا تھا۔ وہ مجھے پیار کرتی میں اس سے کھنچتا وہ مجھے چاہتی۔ میں اس سے نفرت کرتا آخر میری نفرت ظلم و ستم میں تبدیل ہو گئی اور میں اسے بات بات پر جسمانی سزا دینے لگا۔ ایک دن میں نے ایک معمولی سی خطا پر اسے اس قدر پیٹا کہ وہ بیمار پڑ گئی اور دو مہینے تک اس بیماری میں ایڑیاں رگڑ رگڑ کر اس نے اپنی جان دے دی ———"

"بس! باشو باقی کل"

"سنو ——— شنگ اب تو تھوڑی سی باقی ہے۔ تو ——— مجھے اپنی بیوی کی موت سے ایک مسرت سی محسوس ہوئی۔ شادی کے بعد میں علیحدہ مکان میں رہنے لگا تھا۔ بیوی کی موت کے بعد میں پھر اس زمیندار یعنی اپنے خسر کے ہاں چلا گیا۔ دراصل! شنگ! میں وہ مکان نہ چھوڑنا چاہتا تھا۔ مجھے اپنی بیوی سے بھی اس لئے محبت نہ تھی کہ میں اس کی وجہ سے اس مکان سے علیحدہ ہو گیا تھا ...... شنگ! مجھے اپنے خسر کی دوسری بیوی بہت بھلی معلوم ہوتی تھی ...... میں اسے چاہتا تھا مگر وہ تو میرے محسن کی بیوی تھی ——— اور"

"شاباں ———"

"شنگ یہ تم کیا کہہ رہے ہو میری کہانی تو ختم ہو جانے دو ......

ہاں تو ...... میں نے محسوس کیا کہ میں کیا چاہتا ہوں ...... یعنی اپنے محسن اور اپنے خسر ......"

"خدارا بس ...... میں تھک گیا۔ شاباں!"

"تم شاید نشے میں ہو۔ شنگ۔ میرا نام تو باشو ہے ...... تو سنو اور ......"

"بس ...... خدا کے لئے بس!"

"...... تو ...... اسے حاصل کرنے کی ایک ہی تدبیر تھی۔

"...یعنی ....."

"میرا دل پھٹنے لگا۔ میں آگے کچھ نہ سنوں گا۔"

"سنو...... تو...... اسے حاصل کرنے کی ایک ہی تدبیر تھی... یعنی اس زمیندار کا ......"

"میں پاگل ہو جاؤں گا.... بس خدا کے لئے بس...."

"سنو.... یعنی اس زمیندار کا قتل۔ میں نے ایک تدبیر سوچی۔ اور ایک اندھیری رات جبکہ ....."

"میں آگے کچھ نہیں سن سکتا....."

"سنو.... شنگ.... اب تو میری داستان ختم ہوگئی۔ جب میرا مالک اور اس کی بیوی اپنے کمرے میں سو رہے تھے۔ میں ایک آبدار خنجر لئے کمرے میں گھس گیا۔ اور میں نے اپنی دانست میں اپنے خسر کے سینے میں خنجر بھونک دیا...."

"شاپان"

"..... خنجر سینے میں گھونپ دیا..... اس کے بعد ایک نسوانی چیخ..... آہ..... میرا وار غلط تھا..... میں بھاگا..... لاپتہ ہوگیا..... پھر فوج میں بھرتی ہوگیا۔ اس واقعہ کو چودہ پندرہ برس ہوگئے۔ شنگ..... اس کے بعد سے میں ایک سپاہی ہوں..... اچھا شنگ اب تم اپنے حالات سناؤ"

"میں کچھ نہیں سنا سکتا۔ میرا سر چکرا رہا ہے۔ مجھے کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ میں سوؤں گا۔"

....

آدھی رات کے قریب گاؤں کے مشرقی حصہ پر دشمن نے حملہ کر دیا۔ اس مکان کا چینی دستہ فوراً محاذ جنگ پر چلا گیا۔ مگر شنگ کو کچھ خبر نہ تھی وہ بے خبر سو رہا تھا۔ اس کے پاس اس کا دوست باشو بیٹھا تھا۔ ایک سپاہی شنگ کو لینے کے لئے آیا..... باشو نے شنگ کے عوض اپنے آپ کو پیش کر دیا۔

....

چینی دستہ کو فتح ہوئی اور سپاہی خوشی کے نعرے لگاتے ہوئے اس مکان میں داخل ہوئے۔ شنگ کی آنکھ کھل گئی۔ تین چار سپاہی اس کے پاس دوڑتے ہوئے آئے..... اور سب نے یک آواز ہو کر کہا "شنگ! ہم جیت گئے۔ ہم نہایت بہادری سے لڑے۔ ہم نے دشمن کے بہت سے آدمی کاٹ کے رکھ دیئے اور ہمارا صرف ایک آدمی مرا....... وہ بھی بڈھا...... جو تمہارے عوض جنگ میں گیا تھا......

....

شنگ کے بستر پر ایک خط پڑا تھا۔

شنگ! یعنی شاپخی!

چودہ پندرہ سال کے بعد ملاقات ہوئی۔ مگر کن حالات میں.... میں نے تمہیں وہی حالات سنائے جو تم سے سن چکا تھا۔ تم نے مجھے بہت دیر میں پہچانا۔ حالانکہ میں تمہاری حرکات و سکنات سے پہلی ہی نظر میں پہچان گیا تھا۔ میں تمہیں دیکھ کر مرنے کا آرزومند تھا..... تم مل گئے۔ ایک آرزو پوری ہوگئی۔ دوسری بھی ہو جائے گی۔ تم نے اپنے آپ کو پریشانیوں میں مبتلا کیا اور مجھے بھی کہیں کا نہ رکھا۔ تم میری بیوی کو چاہتے تھے۔ مگر وہ تمہیں اسی نظر سے دیکھتی تھی جس نظر سے میں..... بیٹی کی موت.... بیوی کے قتل کے بعد میرے لئے دنیا میں کیا رکھا تھا۔ میں بھی فوج میں بھرتی ہوگیا..... مدت کے بعد جنگ چھڑ گئی اور اور ہم ایک دوسرے سے مل لئے.... میں تمہیں سب کچھ معاف کرتا ہوں۔ اس لئے کہ اُس وقت تم نادان تھے۔

ہاں دیکھو..... دشمن نے گاؤں پر حملہ کر دیا... سب سپاہی جا رہے ہیں۔ ایک تمہیں بھی لینے آ رہا ہے۔ مگر تم سو رہے ہو..... میں تمہارے عوض اپنے آپ کو پیش کر دوں گا..... لو وہ آدمی آ گیا..... اچھا..... میں جاتا ہوں..... رخصت....."

تمہارا

باشو یعنی شاپان

شنگ کے ہاتھ سے خط گر پڑا۔ اور وہ آہستہ آہستہ زمین پر بیٹھ گیا!

....

(ترجمہ)

آفتاب شروانی

غزل

طبیعت اِن دنوں پھر خوگرِ غم ہوتی جاتی ہے
تمنا بڑھ رہی ہے زندگی کم ہوتی جاتی ہے

بکھرتا جا رہا ہے اس طرف تو دل کا شیرازہ
اُدھر وہ زلفِ برہم اور برہم ہوتی جاتی ہے

اُترتا جا رہا ہے اس طرح کچھ رنگ ہستی کا
سحر کے وقت جیسی شمع مدھم ہوتی جاتی ہے

میں پڑھ لیتا ہوں کتبے آسمانوں کے زمینوں سے
کہ میری چشمِ تراب ساغرِ جم ہوتی جاتی ہے

وہی پروانوں کی یورش وہی رونق ہے محفل کی
مگر اک شمع ہی کی روشنی کم ہوتی جاتی ہے

میں اپنے دل کی امیدوں کو یا رب کیسے سمجھاؤں
یہ محفل جس قدر جمتی ہے برہم ہوتی جاتی ہے

تمہاری بے نیازی کا اثر یہ ہے معاذ اللہ!
"طبیعت بے نیازِ ہر دو عالم ہوتی جاتی ہے"

دلِ مضطر میں رہ رہ کر گنہ کا جوش اُٹھتا ہے
جوانی مائلِ تقلیدِ آدم ہوتی جاتی ہے

زہے قسمت بہار آئی زہے قسمت بہے آنسو
خدا کا شکر ہے پھر آستیں نم ہوتی جاتی ہے

مری آنکھوں میں اُن کے زندگی افروز جلوے ہیں
الٰہی کس لئے پھر زندگی کم ہوتی جاتی ہے

خدا کی کردگاری کو نہ جانے کیا ہوا اختر
مری گردن بتوں کے سامنے خم ہوتی جاتی ہے

اختر ہوشیارپوری

فرانس کا ایک اور آوارہ شاعر

چارلس باڈلیئر

آج کل اردو ادب کے رجحانات روز بروز حقیقت پرستی کی طرف مائل ہوتے جا رہے ہیں۔ حقیقت پرستی کا مدعا یہ ہے کہ زندگی کو اس کے اصلی رنگوں میں پیش کیا جائے لیکن جس طرح سماجی اصلاح کے آغاز سے بہت عرصے تک محض بچوں کی شادی اور بیوہ کی مصیبتوں کا ہی رونا رویا جاتا رہا، اسی طرح حقیقت پرستی کا مطلب بھی ادب و شعر میں محدود ہو کر رہ گیا۔ مزدور کی زندگی اور گناہ گاری کے سستے پہلو کے علاوہ اردو کے ترقی پسند شاعروں اور ادیبوں کی نظریں اور بہت ہی کم رستوں کی طرف اٹھتی ہیں۔ اس لئے یہ بات کچھ بے جا نہیں معلوم ہوتی کہ مغرب کے ادب کی اُن شخصیتوں سے اردو کے دامن کو وسیع کیا جائے جو اچھوتی راہوں پر چلیں، اور جنہوں نے نئے خیالات کے لئے اپنی زندگی کو وقف کر دیا۔

آج سے پچیس صدی پہلے یورپ کے ادب اور آرٹ کا ماخذ یونان کی زرخیز ذہانت تھی۔ پندرھویں اور سولھویں صدی میں یہی درجہ اطالیہ کو میسّر ہو گیا۔ لیکن دورِ جدید میں فرانس نے ادب اور آرٹ میں سارے یورپ اور خصوصاً انگلستان کی رہنمائی کی۔ جمالیاتی تحریکات سے متاثر ہونے میں فرانسیسی شعور نے جدید زمانے میں سب سے بڑھ کر حصّہ لیا۔ اور چونکہ فرانسیسی شعور بہت باریک نظر اور حسّاس تھا۔ اس لئے آئے دن تبدیل ہوتے رہنے والے ماحول کے مختلف اور متنوّع انداز کو فرانس نہایت سچائی اور اخلاص کے ساتھ نشر کرتا رہا۔

چارلس باڈلیئر نے اپنے واحد مجموعۂ نظم "گلہائے بدی" کو فرانس کے مشہور ناول نگار تھیو فائل گاٹیئے کے نام پر معنون کیا۔ یہ کتاب ۱۸۵۷ء میں شائع ہوئی۔ اس کی اشاعت پر شاعر کے خلاف مقدمہ چلایا گیا کہ اس نے ایک ایسی کتاب شائع کی ہے جو اخلاقِ عامہ کے لئے مضر ہے۔

باڈلیئر کی شاعری سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس کا تخیّل زرخیز ہے اور فرانسیسی نقّادوں کی رائے میں اس کے اشعار میں ایک پختہ پاکیزہ اور باضابطہ موسیقی ہے۔ لیکن اُس کے تمام کلام سے اس دل بستگی کا اظہار ہوتا ہے جو اُسے عجیب، غلاظت اور گھناؤنے موضوعات سے تھی۔ اُس کی شاعری کے موضوعات سے اس کی داخلی اور خارجی زندگی کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے اور پڑھنے والا ایک دم جان لیتا ہے کہ وہ ایک ایسا شخص تھا جس کا ذہن پریشان ہو جس کی طبیعت غور و فکر کی عادی ہو جس کے تخیّل پر ہر وقت ملال انگیز تصورات مرگھٹ کے دھوئیں کی طرح چھائے رہتے ہوں اور ان وحشت ناک تصوّرات کا سلسلہ کبھی ٹوٹنے میں ہی نہ آتا ہو، جسے سیدھی سادی فطری باتوں سے نفرت ہو، اور غیر معمولی خیالات اور انوکھے احساسات کے زیرِ اثر زندگی گذارنا جس کے لئے ایک لازمۂ حیات ٹھہر چکا ہو۔ ایک ایسے شخص کے کلام کا ماحول اگر ناگوار اور ناساز گار خصوصیّات کا حامل ہو تو ہمیں کوئی اچنبھا نہیں ہونا چاہئے۔

مغرب کے جدید شعراء میں سے باڈلیئر تقریباً پہلا شاعر ہے جس کے مخاطب صرف منتخب لوگ تھے۔ بلکہ بعض دفعہ مخاطبوں کی یہ حد بندی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ کئی نظمیں اس نے اپنی ہی ذات کے لئے لکھی ہیں گویا اُن کے اظہار سے اس کا مقصد ترجمانی نہیں ہے۔ لیکن اس محدود دائرۂ تفہیم کے باوجود اثرات کے لحاظ سے باڈلیئر

اپنے زمانے کی فرانسیسی شاعری میں سب کے لئے نئی باتیں لایا۔ نئے موضوعاتِ سخن، نئے احساسات، نیا لہجہ، نیا اندازِ بیان اور نئی زبان، اگرچہ اُس نے صرف ایک کتاب "گلہائے بدی" لکھی لیکن اُس کی مثال روس کے مشہور ناول نگار دستووسکی سے (جس نے بہت سے ناول لکھے) دی جاسکتی ہے۔ دونوں کے کام کی بنیاد نفسِ غیرشعوری کے اُس تاریک خطے میں ہے جہاں ہر طرح کی مختلف النوع باتیں موجود ہیں، جو اپنی کیفیات کے لحاظ سے ایک اجتماعِ ضدین ہے۔ جہاں نیکی اور بدی بہت بے ڈھب طریق پر ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہو رہے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ہستی ایک دوسرے کے لئے لازم اور ملزوم کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس طرح دستووسکی کے ناول، نقادوں کی نظروں میں، ناگفتہ بہ جذبات و احساسات سے بھرپور ہیں۔ اُسی طرح احساسِ غیرشعوری کی تیرہ و تار سرزمین ہی سے باڈیلیئر کے "گلہائے بدی" کھل کر نمودار ہوئے۔

باڈیلیئر کا کام مشاہدۂ نفسی تھا۔ احساسات ـــــ نئے احساسات اس کا خام مواد۔ وہ اپنے اعصاب اور اپنے ذہنی امراض سے تخلیق فن کا کام لیتا تھا۔ اردو میں ہم اس کا تطابق پیش نہیں کرسکتے۔ لیکن اشارتاً یہ کہہ سکتے ہیں کہ میر تقی میر کی شخصی (عشقیہ) شاعری اور جان صاحب اور رنگین کا تخریبی کلام کچھ اسی قسم سے ہے۔ لیکن جان صاحب کی ریختی اور رنگین کی ہزل پرانی روایاتِ سخن کی یکسانی اور زوال کے ردِ عمل کا نتیجہ تھیں۔ کم از کم اُن کی نجی زندگی کے حالات واضح طور پر حاصل نہ ہوسکنے کی وجہ سے اُن کی ذہنی تخریب کے متعلق کچھ نہیں کہا جاسکتا نیز تشخیصِ نفسی ابھی ہمارے لئے ایک بالکل نئی چیز ہے اور نئے موضوعات کی کھپت بھی ابھی اردو شاعری میں بہت کم ہے۔ اس لئے ہم یہ بھی پورے طور پر نہیں جتا سکتے کہ باڈیلیئر نے بدی ہی کو کیوں اپنا موضوعِ سخن ٹھہرایا۔ تاریکی ہی میں اُجالے کی تلاش کیوں کی۔ اگرچہ جواباً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اُجالے کا احساس صرف تاریکی ہی میں ہوسکتا ہے۔ موجودہ اردو شعرا میں سے کم از کم ایک دو شاعر ایسے ہیں جو اپنی شاعری کے حقیقت پرستانہ مواد کے لئے اپنی ذاتی زندگی کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ لیکن باڈیلیئر سے تطابق کے لئے ان کی مثال سے ابھی احتراز ہی بہتر معلوم ہوتا ہے!

جس طرح انسان کی مرئی دنیا میں اندھیرے اور اجالے کا ساتھ ہے اُسی طرح غیر مرئی دنیا میں بھی اندھیرے اور اُجالے کا ساتھ ہے۔ اندھیرا اور اُجالا لازم و ملزوم خصوصیتیں ہیں، دو کیفیتیں ہم خواہ ان کے کوئی نام رکھ لیں۔ نیکی اور بدی، تخلیقی اور تنظیمی قوتیں، قدیم اور جدید رجحانات، قدامت پرستی اور انقلاب۔

یہ دونوں باتیں سطحی نظر میں ایک دوسرے کی ضد معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن ان کا ساتھ لازمی ہے۔ ایک کے بغیر دوسری کی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔ ان دونوں کے باہمی تبادلے اور ردِ عمل ہی سے زندگی کی ہم آہنگی قائم رہتی ہے اور دریائے حیات ایک ہموار چال سے چلتا رہتا ہے۔ بدنظمی اور انقلاب کے بعد باقاعدگی اور تنظیم کا زمانہ آتا ہے اور جب منظم دور کی یکسانی طبع انسانی کے بہاؤ کے لئے ایک بوجھل رکاوٹ ثابت ہونے لگتی ہے تو مروّجہ قوانین میں ایک بغاوت پیدا ہو کر نئی باتیں رائج ہو جاتی ہیں اور یوں زندگی یا زندگی کی پُراسرار قوت بنت نئی کارفرمائیوں سے کائنات اور نظامِ حیات میں ایک توازن کو برقرار رکھتی ہے۔

شعر و ادب زندگی کے ترجمان ہیں اس لئے ان کا بھی یہی حال ہے جب کبھی علم ادب کی باقاعدگی اور یکسانی بے مزہ اور بے رنگ ہو جاتی ہے۔ تو اچانک کوئی بغاوت پسند شاعر نمودار ہوتا ہے اور اپنی ذہانت اور طبّاعی سے پہلے مروّجہ طور طریقوں کی کایا پلٹ دیتا ہے۔ جب اردو شاعری میں لکھنوی تصنع، روزمرہ کا جنون، رعایتِ لفظی اور اسی قبیل کی اور باتیں روح شعر و ادب کو بے جان کر دیتی ہیں تو افق پر غالب کا تخیّل نمودار ہوتا ہے۔ اور نئی باتوں کی طرف اشارے کرتا ہے۔ اپنے زمانے میں اُس کی نئی باتوں کا رواج نہیں ہوتا۔ لیکن وہ ایک پتے کی بات کہتے ہوئے چلا جاتا ہے۔ "بقدرِ ذوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل" ـــــ اور پھر حالی اور آزاد کی آمد سے "بیان کے لئے نظم کی وسعت" کا رواج ہو جاتا ہے۔ نیچرل شاعری اور نظم نگاری رائج تو ہو جاتی ہے۔ لیکن اُس کا ابتدائی زمانہ گذرنے پر خدشہ پیدا ہوتا ہے کہ کہیں یہ نئی "وسعت" بھی جلد ہی محدود ہو کر نہ رہ جائے۔ اس خدشے کو دور کرنے کے لئے اقبال ایسی شخصیت اس دنیا میں آتی ہے اور اپنی بانگِ درا سے یہ بھید بتا جاتی ہے کہ قافلے کے مسافروں کو چاہئے کہ ستانے والی منزلوں میں سے ہی کسی ایک کو آخری منزلِ مقصود نہ سمجھ لیں۔

آرتھر سائمنز بیسویں صدی کی ابتدا میں ایک جگہ لکھتا ہے کہ انگلستان میں چارلس باڈیلیئر کو بہت کم لوگ جانتے ہیں اور اس کی شخصیت کے

متعلق بہت سی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں صرف ایک انگریز مصنف ایسا ہے۔ جس نے باڈیلیئر کے ساتھ اُس کے اپنے زمانے میں انصاف کیا۔ ۱۸۶۲ء میں انگریزی کے مشہور شاعر سوئن برن نے باڈیلیئر کو انگریزی خواں طبقے سے روشناس کیا اور پھر ۱۸۶۷ء میں باڈیلیئر کی موت پر اس کا زبردست نوحہ لکھا۔

باڈیلیئر کی آرزو صرف ایک تھی۔ کسب کمال۔ لیکن ایک انگریز اس بات کو سمجھ ہی نہیں سکتا کہ کسب کمال بھی انسان کی زندگی کا واحد مقصد بن سکتا ہے۔ باڈیلیئر نے اُس بات کو پورے طور پر سرانجام دیا جس کی اُسے آرزو تھی اور جس کی اُس میں اہلیت تھی۔ اس کی تمام عمر غربت میں بسر ہوئی لیکن اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ کام نہ کرتا تھا نکما تھا بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ اُس نے اپنے لئے ایک خاص انداز کا کام چن لیا تھا اور اس کام کو وہ صرف اپنی تسلی اور تسکین قلب کے لئے کرتا تھا۔

ادبی تخلیق کے لحاظ سے وہ ایک بہت محتاط انسان تھا۔ اردو زبان میں اس کی ایسی احتیاط کی مثال مرزا غالب کی زندگی سے دی جا سکتی ہے۔ مرزا نے اپنی ساری عمر میں اردو کا صرف ایک مختصر دیوان شائع کیا (اور روایت کے مطابق اس میں بھی قطع و برید کو بہت دخل تھا) مرزا کے خطوط کو اردو ادب میں جو درجہ حاصل ہوا، وہ محض اتفاقی تھا۔ باڈیلیئر نے بھی اپنی ساری عمر میں صرف ایک کتاب شعروں کی لکھی اور اُسی ایک ہی کے اثرات کی پیداوار آج کل کی جدید فرانسیسی شاعری ہے۔ اپنے اس اثر کے لحاظ سے بھی باڈیلیئر کا دیوان مرزا غالب کے دیوان سے بہت ملتا جلتا ہے۔ جس طرح اگر مرزا غالب کا دیوان نہ لکھا جاتا تو آج اردو شاعری کا رنگ اس کے موجودہ رنگ سے کہیں مختلف ہوتا۔ اُسی طرح اگر باڈیلیئر اپنے اشعار نہ کہتا تو جدید فرانسیسی شاعری اپنی موجودہ خصوصیات سے بہت مختلف خصوصیات کی حامل ہوتی۔

باڈیلیئر ایک بڑا شاعر نہیں ہے لیکن اپنی دلکشی اور اثرات کے لحاظ سے وہ ایک ایسی وسعت کا مالک ہے جو بہت کم شعراء کو نصیب ہوتی ہے۔ نثر اور نظم دونوں کا لکھنا اُس کے لئے مشکل تھا۔ تحریر میں صرف ایک بات ایسی تھی جس کا وہ خاص لحاظ رکھتا تھا یعنی اندرونی تحریک کے بغیر اُسے ایک لفظ لکھنا بھی گوارا نہ تھا۔ یہ مانا کہ اُس کا کلام بہت کم ہے لیکن اس کے ساتھ ہی یہ خوبی بھی اُس کے کلام میں ہے کہ وہ حشو سے پاک ہے۔ اُس کا کلام اُس کی تمام ذہانت اور اُس کے تمام اعصاب کا مجموعہ ہے۔ ہر نظم ایک خیال ہے۔ اور ہر موضوع ایک احساس۔ وہ گناہگار ہے لیکن اُس کی حیثیت ایک قاضی کی ہے۔ وہ ایک معلّمِ اخلاق ہے۔ لیکن اُسے بدی کی خوش کن کیفیات کا ایک گہرا، تیز اور شدید احساس ہے اور اپنے ذہنی جنون کو اس سکون کے ساتھ تخلیقی ادب کی صورت میں پیش کرنے ہی سے اُس نے لوگوں کو حیران کر دیا۔ نہ صرف فرانس کے باہر بلکہ فرانس میں بھی جہاں ایک فن کار کو عملی اور نظری دونوں طرح مکمل تجرباتی آزادی حاصل ہوتی ہے۔ (فنی طور پر اور معاشرتی طور پر بھی) پہلے پہل لوگ اس کی بے باکی پر مبہوت ہو کر یہ سوچنے لگے کہ کیا یہ شخص صرف ایک بے باک فن کار ہے یا کوئی گستاخ فحش نگار۔

جس طرح باڈیلیئر کی زندگی سماج کے لئے ایک علیحدہ اور خلوت کی چھپی چھپی سی بات تھی۔ اسی طرح اُس کی موت ہوئی۔ اُس نے لوگوں کی نگاہوں سے دور زندگی بسر کی اور لوگوں کی نگاہوں سے دور ہی وہ مر بھی گیا۔ وہ اپنے گناہوں کا اعتراف علی الاعلان کرتا رہا۔ لیکن پھر بھی یہ شک کیا جا سکتا ہے کہ وہ ایک ایسا گناہگار تھا جس نے اپنے گناہوں کی حقیقت کو کبھی تمام تر بے نقاب نہیں کیا۔ وہ ایک جذبات پرست تھا، ایک نفس پرور قحبہ خانوں کا ایک راہب!

جب تک ہم کسی مصنف یا شاعر کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کے متعلق معلومات نہ حاصل کر لیں، ہم اُس کی ادبی تخلیقات یا کلام کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتے کیوں کہ ہر مصنف یا شاعر کی تخلیقات خواہ اُس کا فنی اصول داخلی ہو یا خارجی، اُس کی اپنی شخصیت کا آئینہ ہوتی ہیں۔ جب ہم کسی بچے کو دیکھتے ہیں تو ہمیں قدرتاً اس کے باپ کا خیال آتا ہے اور جب ہم باپ کے کردار کی خصوصیات کو جان لیں گے تو بچے کے بارے میں بھی ضرور کچھ نہ کچھ رائے قائم کر سکیں گے اور وہ رائے پختہ بنیاد پر تعمیر ہوگی

باڈیلیئر حسن کی تخریب کا متوالا تھا لیکن اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ حسن کے احساس سے بے بہرہ تھا۔ بلکہ حسن پرستی ہی کی وجہ سے حسن کی تخریب کا خیال اُس پر اس بری طرح چھا چکا تھا کہ وہ اس سے کبھی بھی رہا نہ ہو سکا۔

باڈیلیئر کے مجموعۂ نظم کی اشاعت پر بہت کم لوگوں نے اس کی فنی

خوبیوں کی قدر کی۔ اگرچہ اس مختصر کتاب نے ایک ہنگامہ ضرور پیدا کر دیا لیکن اس ہنگامے کی وجہ شاعر کے کلام کا اچھوتا پن تھا۔ موضوعات کا تخریب آلود انتخاب ہی عوام کے لئے ایک دلکشی اور دلچسپی کا باعث تھا۔ حکومت نے اخلاق عامہ کے منافی کتاب شائع کرنے کی بنا پر شاعر اور ناشر کے خلاف قانونی کارروائی کی اور کتاب کے قابلِ اعتراض حصّوں کو خارج کرنے کے بعد چند سال گذرنے پر اس کا ایک نیا ایڈیشن شائع کیا گیا۔

باڈلیئر نے بچپن ہی میں انگریزی زبان سیکھ لی تھی اور انگریزی افسانہ نگاروں کے شیطانی رومانوں سے اُس کی مخرّب ذہنیت کو بہت تحریک ملی تھی۔ خصوصاً مختصر افسانہ نگاری کے ابتدائی فن کار الگزانڈر ایلن پو کی تخلیقات اُسے اپنی ہی ذہانت کا عکس نظر آئیں اور اُس نے فرانسیسی زبان میں اُن کے نہایت نفیس ترجمے بھی کئے۔

چارلس پیئری باڈلیئر ۹ مارچ ۱۸۲۱ء کے روز پیرس میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ شہر کے کسی انتظامی محکمے میں ایک اچھے عہدے پر ملازم تھا اور شوقیہ مصوری میں بھی دخل رکھتا تھا۔ ۱۸۲۷ء میں باڈلیئر کا باپ مرگیا اور اس کی ماں نے فوج کے ایک افسر لیفٹننٹ کرنل ایم اَوپیک سے نکاح ثانی کر لیا۔ اسی ایم اَوپیک کو بعد ازاں یورپ کے مختلف درباروں میں سفیر کی حیثیت سے بھیجا گیا تھا۔

باڈلیئر نے لیاں کے مقام پر تعلیم پائی اور پھر پیرس کے ایک کالج میں طالب علمی کا زمانہ بسر کیا۔ ۱۸۳۹ء میں اُس نے تعلیم سے فارغ ہوتے پر فیصلہ کیا کہ وہ علم ادب کو پیشے کے طور پر اختیار کرے گا۔ اس کے بعد اُس نے دو سال تک پیرس میں بہت بے قاعدگی کے ساتھ زندگی بسر کی۔

اپنی طبعی خصوصیات کے لحاظ سے بھی وہ پیرس ہی کا پروردہ تھا۔ پیرس کے تعیش پسند شہر کی خاص پیداوار۔ اُس کی ماں اور باپ کی عمر میں چونتیس سال کا فرق تھا۔ اور باڈلیئر کو اسی فرق کا نتیجہ اپنے اعصابی امراض اور اپنی نفسی اور جسمانی کیفیات کی صورت میں بھگتنا پڑا۔ ابھی باڈلیئر چھ سال کا تھا کہ اس کا باپ مرگیا اور جلد ہی اس کی ماں نے کرنل اَوپیک سے شادی کر لی۔ باڈلیئر پر ماں کے اس فعل کا بہت غیر متوقع اثر ہوا۔ اس شادی سے اُس کے دل میں حسد کے جذبات پیدا ہو گئے۔ اصل بات یہ تھی کہ اُس کی طبیعت کو اپنی ماں سے بہت لگاؤ تھا۔ ماں کی محبت کا جذبہ اس کے دل میں کسی جنسی احساس کی شدت لئے ہوئے تھا۔ ماں کی نفاستِ طبع، نسائی دلکشی اور حسن نے اُس کے دل میں ایک والہانہ تعلق خاطر پیدا کر دیا تھا۔ ۱۸۶۱ء میں باڈلیئر نے ماں کو ایک خط لکھا۔ اس کے چند فقرے اس بات کی دلیل مہیّا کرتے ہیں:

"جوانی کے دنوں میں ایک وقت تھا کہ میرے دل میں آپ کے لئے ایک شدید احساسِ محبت تھا۔ میری اس بات کو آپ کسی قسم کے تردّد یا خدشے کے بغیر سنئے گا . . . . یہ وہ زمانہ تھا کہ میری تمام ہستی آپ سے وابستہ تھی اور آپ بھی صرف میری ہی تھیں۔ آپ میرے لئے ایک دوست بھی تھیں اور ایک ایسی مورت بھی جس کی پوجا کی جا رہی ہو۔ اتنا زمانہ گذرنے پر بھی میں اُس وقت کا ذکر ایک شدید جذبے کے ساتھ کر رہا ہوں۔ شاید آپ کو اس پر حیرانی ہو۔ میں بھی یہ دیکھ کر حیران ہوں!"

سترہ سال کی عمر سے باڈلیئر نے گھریلو زندگی اور اپنے جذبات کی کشمکش سے تنگ آکر آوارہ گردی شروع کر دی۔ یہ زمانہ اُس کی آزاد اور اندھا دھند زندگی کا زمانہ تھا۔ ایک تخریب آلود زندگی کا زمانہ۔ اُس نے جی بھر کر عیش کئے۔ وہ ناپاکی کی گہرائیوں میں ڈوب گیا۔ پیرس کے تھیٹروں، قہوہ خانوں اور قحبہ خانوں میں اس کے دن گذرنے لگے۔ وہ اس پریشان حالی سے اپنے دل کو بہلاتا رہا۔ اپنی متواتر لغزشوں سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ ان دنوں نت نئے احساسات کے لئے اس کا تجسّس ختم ہونے میں ہی نہ آتا تھا۔ اُس کے اعصاب گویا ایک ایسے ساز کے تار تھے جو ایک پیہم لرزش میں رہتے ہوں۔ وہ اپنی نفسیات اور اپنی طباعی کی اندرونی آگ میں جھلسا جا رہا تھا۔ مختلف عورتوں سے ہنگامی تعلقات میں بے اخلاقی ہی اس کا مطمحِ نظر تھی۔

باڈلیئر کو اپنے سوتیلے باپ سے نفرت تھی۔ شاید اسی نفرت کا نتیجہ ادبی روایات سے اُس کی بغاوت کی شکل میں ظاہر ہوا۔ باعزت شہری زندگی، باقاعدگی، معاشری اُمنگیں ـــــ اِن سب سے اُسے ایک قدرتی نفرت ہو گئی، کیونکہ یہی خصوصیات اس کے سوتیلے باپ کا طرۂ امتیاز تھیں بہرحال باقاعدہ سماجی زندگی سے بغاوت کی خواہ کوئی وجہ ہو، باڈلیئر نے نوجوانی ہی میں آزادانہ آوارگی کی زندگی شروع کر دی۔ اُس کی اس آوارگی سے مجبور ہو کر ۱۸۴۱ء میں اُس کے ورثا نے اُسے ہندوستان کے سفر پر روانہ کر دیا اور وہ کلکتہ پہنچا۔ یہاں اُس کا قیام ایک سال سے کچھ کم عرصے کے لئے ہی رہا۔ ایک تو ویسے ہی کچی عمر میں ایسے دور دراز کے

سفر سے عین ممکن تھا کہ اُس کی طبیعت میں ایک تبدیلی رونما ہوتی۔ دوسرے اس کے کلام سے، نیز اُس کی عملی زندگی سے صاف ظاہر ہے کہ اس کے خام اور نابالغ ذہن پر سانولے سلونے سحر بنگالہ نے ایک خاص اثر کیا۔ کالی کے مندر کو بھی اُس نے دیکھا ہوگا۔ اور دیومالا کے اس فسانے میں اذیت پرستی کا جو فلسفہ نہاں ہے اُس کی پُر اسرار اور مسحور کن ہیبت نے اُس کے دل میں صدیوں کی دبی ہوئی، وحشی انسان کی طبعی تحریکوں کو از سرِ نو ایک اچھوتے انداز میں بیدار کر دیا ہوگا۔

اس کے ساتھ ہی ہمیں اس بات کو بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ وہ ایک سرد ملک کا رہنے والا تھا۔ اور ابھی اُس کی جسمانی مدافعت اس قدر پختہ نہ ہوئی تھی کہ ہر قسم کی آب وہوا کا پوری طرح مقابلہ کر سکتی کہ اُسے ایک ایسے ملک میں آکر رہنا پڑا جو نہ صرف سرد نہ تھا بلکہ جہاں کی گرم مرطوب آب وہوا ایک یورپی نسل کے انسان کے لئے طبیعت کو بے حد بیزار کر دینے والی ہوتی ہے۔ یورپ کے لوگوں کو ہندوستان یا افریقہ ایسے علاقوں کی شدید گرمی نہ صرف جسمانی طور پر ہی بیزار کرتی اور تکلیف دیتی ہے۔ بلکہ اس ماحول میں انہیں ایک روحانی اذیت کا احساس ہوتا ہے۔ اور یہ احساس بسا اوقات حساس طبیعتوں کو دُنیا وما فیہا سے برگشتہ خاطر کر کے بقائے حیات وعشرت کے لئے نئی باتوں اور ولولہ انگیز کیفیتوں کی جستجو اور حصول پر اکساتا ہے۔

باڈیلیئر کے لئے جنسی تعیش کوئی نئی چیز نہ تھی۔ لیکن نئے ماحول میں نسائی دلکشی اُسے ایک اچھوتے رنگ میں دکھائی دی۔ کالی دیوی اور اس کے افسانوں کے متعلقات میں اُسے کونسی دلچسپی دکھائی دی۔ سانولے سلونے حسن میں اُسے کیوں دلکشی محسوس ہوئی اس کا واضح جواب تو نہیں دیا جا سکتا۔ البتہ اندازے اور اشارے ہی کئے جا سکتے ہیں۔ ہندوستانیوں کے لئے تو قومی، ملکی اور مذہبی لحاظ ہی سے ملاحت جذبات انگیز اور مسحور کن ہے۔ ظاہر ہے کہ جب اپنا رنگ ہی کالا ہو تو وہ لوگ جو اپنے ہوں اُن کی رنگت بھی کالی ہی پیاری لگتی ہے۔ کیونکہ محبوب بھی عاشق ہی کا ایک ذہنی عکس ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ کرشن کنھیا کے حسن ملیح کا مذہبی استعارہ بھی ہندوستانی تہذیب وتمدن کا ایک ہمہ گیر پہلو ہے۔ حسن ملیح کی دلکشی کا احساس کرنے کے لئے اس جگہ میں چاہتا ہوں کہ مولوی عظمت اللہ کی ایک نہایت دلکش اور نفیس نظم درج کروں جس میں مغربی گھاٹ کے اندھرا دیس کے تاثرات کو ایک نہایت نفیس فن کارانہ انداز میں بیان کیا گیا ہے:۔

اندھرا دیس کی سُندر رُپتری کالی کوئل سے کالی
بال بھی کالے گھنگھور گھٹا !
ہونٹ وہ گدرے جامن کے سے اور اُداہٹ میں لالی
دانت اُجلے موتی کے سے
بڑی بڑی سی آنکھ غلافی، پُتلی بھنورا سی کالی
خمار اک مستانہ چھایا !
وہ من موہنی، متفناطیسی، ان میں چمک ناگن والی
آنکھ لڑی اور دل کو بھایا !
اور سراپا گدرا گدرا۔ سانچے میں ڈھلا چکیلا
جوش جوانی پھٹتا جوبن !
بھرا بھرا سا، ڈھلا ڈھلا سا، وہ اک اک عضو سجیلا
وہ ہر چیز کا بے ساختہ پن !
اک موج مچلتی مچلاتی، چڑھتی، اُترتی، تھرّاتی،
اور گردن کا نفیس ڈھلاؤ !
سینے کا جو الا مکھ، کمر لچکتی، بل کھاتی،
ہوش رُبا اُتار چڑھاؤ !
سندر صورت سندر ہی ہے، رنگت گوری یا کالی،
فطرت نے ہو جس رنگ میں ڈھالی !
فطرت کے لئے حسن یہی ہے، بیج دھج گرمانے والی،
جان کی کھیتی جوتنے والی !

لیکن اس نظم میں یہی ہے کہ جو کچھ دیکھا اُسے سیدھے سادے طریقے سے بیان کر دیا۔ ہمیں صرف یہی معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کی طبیعت ایسی ہے کہ وہ حسن کو جہاں بھی دیکھتا ہے اُس پر متوالا ہو جاتا ہے۔ اُس کے ذہن میں کسی قسم کا نفسیاتی پیچ نہیں ہے، اُس نے ایک سیہ فام عورت کو دیکھا ہے اور وہ اُس کی جوانی، اُس کی صحت اور اُس کی دلکشی سے متاثر ہوا ہے، لیکن باڈیلیئر کی ذیل کی منثور نظم اِن سے مختلف خیالات ہمارے ذہن میں لاتی ہے۔

سانولا گیت

اُس کی ہر بات کالے رنگ کی ہے۔ وہ نور درج شبانہ دکھائی

دیتی ہے، رُوح تیرگی۔ اُس کی آنکھیں گپھائیں ہیں جن کی گہرائی میں اسرار درخشاں ہیں۔ لیکن اُن آنکھوں کی نگاہیں بجلی کی طرح ہیں، ایک چمکارا جو رات کے پردے کو چیر دے۔

وہ ایک مُہرِ آبنوسی ہے، ایک مجسمِ سیاہ! اور اِس کے باوجود نور و مسرت کی کرنیں اس میں سے پھوٹ رہی ہیں، بلکہ وہ ایک ایسے چاند کی طرح ہے جس نے اُسے اپنا لیا ہے۔ وہ چاند، گیتوں کا دھندلا، پژمردہ سیارہ نہیں جو کسی کٹھور دُلھن کی طرح ہو، بلکہ وحشی، سرگرداں اور مدہوش چاند، جو کسی طوفانی رات کے آسمان میں آویزاں ہو۔ وہ سیمیں سیارہ نہیں جو لوگوں کے مطمئن خوابوں میں مسکراتا ہو، بلکہ ایک سانولی غضبناک دیوی جسے جادو کے اثر سے آسمانوں سے نکال دیا گیا ہو۔ جسے ساحروں نے ڈری ہوئی دھرتی پر پُرانے زمانوں سے آج تک ناچنے پر مجبور کر رکھا ہو۔

اُس کے ننھے سے سر میں ایک آہنیں قوتِ ارادی پنہاں ہے، اور ایک تشنگی شکار کی۔ پھر بھی اُس کے وحشی چہرے میں، جہاں گھاؤں جیسے نتھنے طلسمی سانسیں لے رہے ہیں، سرخ و سفید اور پیارا، شیریں دہن رنگ سے دمک رہا ہے، یوں ـــــ جیسے جوالا مکھی کے کنارے پر کسی پھول کی شوبھا!

....

اِس نظم کو دیکھ کر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اس میں محض حسن کا تأثر ہے۔ بلکہ اسے پڑھ کر ہمارے دل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اس شاعر کے ذہن میں کسی قسم کی تخریب کا وجود تو نہیں ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس "سانولے گیت" کی عورت "جان کی کھیتی جوتنے والی" ہستی نہیں ہے۔ وہ ایک "وحشی چہرے" والی غضبناک دیوی" ہے جس کی صورت سے "شکار کی تشنگی" کا اظہار ہوتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ باڈلیئر کی زندگی میں سیاہ فام حسن کی فریفتگی خواہ کلکتے سے شروع ہوئی ہو، اس "سانولے گیت" کی محرک، عین ممکن ہے کہ اُس کی حبشی نژاد محبوبہ ہو۔

ہندوستان سے لوٹنے پر باڈلیئر میں حسنِ سیہ فام کی پرستش کے لحاظ سے انقلاب پیدا ہو چکا ہو لیکن تعیش پسندی جوں کی توں برقرار تھی چنانچہ پیرس پہنچنے پر پھر وہی دن تھے اور وہی راتیں ۱۸۴۸ء میں وہ انقلاب پسندوں کے ساتھ شامل ہو کر عملی طور پر بھی بغاوت میں حصہ لینے لگا۔ لیکن اُس کے اس فعل کے محرک کسی طرح کے سیاسی خیالات نہ تھے کیونکہ وہ انقلاب پسندوں کو اس بات پر آمادہ کرنے پر مُصر تھا کہ نہیں جا کر جنرل آوپیک کو گولی سے اُڑا دینا چاہئے" ـــــ دجنرل اوپیک سے اس کی نفرت اس وجہ بڑھ چکی تھی کہ سیاسی کارگذاری بھی اُس کے لئے اپنی ذاتی نفرت کے جذبے کی تکمیل کا ذریعہ ہی تھی۔

بہت تھوڑے عرصے میں اُس نے اُس روپے پیسے میں سے جو اُسے اپنے مرحوم باپ سے ورثے میں ملا تھا، آدھے سے زیادہ اپنی رندانہ عیاشیوں میں اڑا ڈالا۔ جنرل اوپیک نے اُس کی اصلاح کے لئے اُس کے باقی ورثے پر حکومت کی طرف سے مختار مقرر کرا دیئے۔ اس طرح باڈلیئر کی آمدنی بہت کم رہ گئی اور اُس کی روز افزوں عیاشانہ ضروریات کو پورا نہ کر سکی۔ چنانچہ وہ قرضخواہوں کے جال میں پھنسنے لگا اور اس جال سے اُسے موت تک رہائی حاصل کرنا مشکل ہو گیا اب سے وہ اپنی ماں کو جو بھی خط لکھتا رہا اُس کا مقصد روپے کی طلب ہوتا تھا۔ اسی زمانے میں اُس کی نفسی زندگی میں ایک ایسی بات ہوئی جس نے اُس کی عمر کے آیندہ زمانے کو بہت پیچیدہ بنا دیا۔ جین ڈُوول پیرس کی ایک آوارہ عورت تھی۔ نسلاً اس میں یورپی اور حبشی خون کی آمیزش تھی۔ یہ عورت قعرِ مذلّت میں گھری ہوئی اپنے دن کاٹ رہی تھی۔ باڈلیئر کی اس سے ملاقات ہوئی۔ اسے نوجوانی ہی سے غیر معمولی اور انوکھی چیزوں سے رغبت تھی۔ جین ڈُوول کے لئے بھی اس کے دل میں ایک والہانہ فریفتگی پیدا ہو گئی۔ جب یہ تعلق بڑھ کر گہرا ہو گیا تو اس عورت کے گذر اوقات کا بار بھی باڈلیئر ہی کے سر پڑا۔ روپے کی ضرورت اس قدر بڑھ گئی کہ بسا اوقات فاقہ کشی تک نوبت پہنچنے لگی ۱۸۴۷ء میں اپنی ماں کو لکھے ہوئے ایک خط سے اس وقت کی کیفیت معلوم ہوتی ہے۔ باڈلیئر لکھتا ہے:۔

"کبھی کبھی مجھے تین تین دن تک بستر ہی میں لیٹے رہنا پڑتا ہے کیونکہ میرے پاس دُھلے ہوئے کپڑے پہننے کو نہیں ہوتے یا کھانے کو کچھ نہیں ملتا...... سچ پوچھو تو شراب اور افیون کا ست دُکھ کا بدترین دارو ہے۔ اِن سے وقت ٹل جاتا ہے لیکن زندگی نہیں سُدھرتی، افسوس! عقل و ہوش سے بیگانہ ہونے کے لئے بھی روپے ہی کی ضرورت ہوتی ہے! پچھلی دفعہ جب آپ نے مجھے مہربانی سے پندرہ فرانک بھیجے تھے تو میں نے دو روز سے کچھ بھی نہ کھایا تھا۔ دو روز ـــــ یعنی اڑتالیس گھنٹے!"

اس قسم کی زندگی سے اُس کے اعصاب پر کوئی بھی خوشگوار اثر نہ

پڑ سکتا تھا۔ اور پیرس کی شہری عیاشیاں، بدکاری اور ترغیبیں (جن سے باڈلیئر ایسا نوجوان جس میں قوت ارادی کی رمق بھی نہ تھی، کبھی عہدہ برآنہ ہوسکتا تھا) بلکہ یہ سب باتیں جلتی پر تیل کا کام کرتی تھیں۔ لغزش اور زوال ایک یقینی بات تھے اور ہوکر ہی ٹلے۔ باڈلیئر نے نفس کی ترغیبوں کے سامنے پوری رضا و رغبت کے ساتھ سرِ تسلیم خم کر دیا۔ اور اس راہ پر گامزن ہوتے ہوئے کسی قسم کی جھجک کو پاس تک نہ پھٹکنے دیا۔ لیکن عجیب بات یہ ہے کہ باڈلیئر کی یہ نفس پرستی شروع ہی سے ایک روحانی انداز لئے ہوئے تھی اور یہ رنگ اس قدر نمایاں تھا کہ اس کی احساساتی تجربیات کو سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی روحانی تجربیات کو بھی نظروں میں رکھا جائے کیونکہ یورپ کے جدید شعراء میں باڈلیئر طبعًا ایک بہت ہی روحانی اور مذہبی قسم کا انسان تھا۔

موت کے بعد اس کی یادداشت اور روزنامچہ شائع ہوا جس کا عنوان ہے "میرے دل کی باتیں"۔ اس کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بچپن ہی سے تصوف اور عرفان کی طرف زبردست طریقے پر مائل تھا۔ اس روزنامچے میں وہ خدا کے ساتھ بات چیت کا ذکر بھی کرتا ہے۔ مرتے دم تک اُس کے دل میں اُن بھیدوں کا ایک شدید احساس باقی رہا، جو مرئی دنیا کے عقدے کی تہہ میں ہمیں محسوس ہوتے ہیں۔ لیکن باڈلیئر میں اس احساس نے ایک منفی پہلو اختیار کرلیا۔ اس کی دو وجہیں تھیں۔ ایک اُس کا بلند جمالیاتی ذوق اور دوسرے اُس کی طبیعت میں قوتِ ارادی کا مطلق فقدان۔

اُس نے یہ محسوس کیا کہ اس دنیا کی عام بدنمائی اور بدصورتی ایک اخلاقی عیب ہے اور چونکہ اُس کی نگاہیں بدنمائی، ناپاکی، نجاست اور غلاظت کے سوا اور کسی چیز کو دیکھنے کے ناقابل تھیں اس لئے اُس کے ذہن میں بدی اور زندگی ایک ہی چیز کے دو نام بن گئے۔ اس بات کا احساس و شعور اُس کا جزوِ حیات بن گیا کہ خلقت کی تعمیر بدی کی بنیاد پر ہے۔ اُس نے اِس خیال کا ذکر اپنے کلام میں رہ رہ کر کیا ہے۔ اپنے اس غور و تفکر میں وہ بعض دفعہ ماورائے مادیات بھی چلا جاتا ہے۔ "میرے دل کی باتوں" میں وہ ایک جگہ اسی قسم کی بات لکھتا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ "آخر زوالِ آدمِ خاکی" کیا ہے؟ ـــــ اگر دوئی وہی چیز ہے جو پہلے یکتائی تھی تو اس سے یہی معنی نکلتے ہیں کہ "زوالِ آدمِ خاکی" خود خدا کا بھی زوال ہے۔ اور اس صورت میں یہ تمام تخلیقِ کائنات خدا کے زوال پر شاہد ہے۔

اُسے اس دنیا کی مصیبتوں میں، دکھ درد اور رنج میں ایک زبردستی، ایک ظلم نظر آتا تھا۔ ایک ایسا ظلم جو خالق نے حیاتِ کل پر طاری کر رکھا ہے اور اس کے دل میں اندرونی طور پر اس کے خلاف ایک احتجاج پیدا ہوتا تھا، خدا کے خلاف ایک بغاوت۔ وہ اکثر الحاد اور نیچ افعال کو محض اس لئے اپنا شعار بنا لیتا تھا کہ اس طرح اُسے خدا کے خلاف مدافعت اور بغاوت کی بے باکی کا ایک دھندلا سا احساس ہوتا تھا۔ اُسے ہابیل کی مظلومیت سے کوئی رغبت نہ تھی وہ قابیل کے مردود اور ملعون چیلوں چانٹوں کے ساتھ رہنا ہی پسند کرتا تھا۔ بلکہ اُسے مردود اور ملعون ہونے کے احساس میں بھی ایک لطف آتا تھا۔ وہ اس کیفیت کو ایک خصوصیت، ایک امتیاز، ایک رعائت سمجھتا تھا، اور اس کے حصول میں اپنی پوری کوششیں صرف کر دیتا تھا۔ ممکن ہے کہ اس کی یہ بغاوت منافیٔ اخلاق ہو۔ لیکن اُس کی بداخلاقی کی بنیادی وجہ ایک اخلاقی تحریکِ طبعی تھی۔ وہ دیکھتا تھا کہ نظامِ حیات و کائنات میں ہر جگہ ناانصافی اور بدنمائی ایک صاحبِ نظر اور ذوقِ سلیم کے مالک انسان کے لئے کسی گھناؤنے زخم کی شکل میں ہویدا ہے۔ اور اِس احساس سے اُسے رنج پہنچتا تھا اور اس رنج میں ایک ایسی شدت ہوتی تھی کہ وہ جھلا اٹھتا تھا۔ اُسے اپنے گناہوں میں کسی طرح کا جسمانی لطف نہ حاصل ہوتا تھا بلکہ گناہوں کا لطف اُس کے لئے ایک تخریب آلود روحانی نوعیت رکھتا تھا۔ یہ لطف کا احساس ایک ایسے شیطنت صفت باغی کا تند و تیز جذبہ تھا جو لعنت اور اذیت کو صرف اس وجہ سے ارادتاً اپنے لئے منتخب کرلے کہ یہی لعنت اور اذیت اُس کی عظمت اور اس کے احتجاج کی علتِ غائی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ باڈلیئر کہتا ہے کہ وہ مینا کے بغیر سندرتا کا تصور ہی نہیں کرسکتا۔ وہ کہتا ہے کہ مردانہ حسن کا مکمل ترین نمونہ شیطان ہے"۔

جین ڈوول اور باڈلیئر کے جنسی تعلقات مفکروں کے لئے اب تک غور کا مقام رہے ہیں۔ اعادۂ شباب کا مشہور ڈاکٹر واروناف باڈلیئر کے عشق و محبت کے بارے میں لکھتے ہوئے کہتا ہے کہ محبت کے نفسی دور کی کارفرمائیوں کے لحاظ سے باڈلیئر کی حیاتِ معاشقہ ایک نمایاں مثال ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ محبت کا نفسی دور تحریکاتِ ذہنی کو کہاں تک بیدار کرسکتا ہے۔ اگر جسمانی لحاظ سے تسکینِ عشق

ناامیدی اور ناکامی کا سامنا ہو تو اس بات کا خطرہ ہوتا ہے کہ کہیں ذہنی تحریکات ضائع ہو کر یکسر معدوم ہی نہ ہو جائیں۔ اس یاس کی صورت میں یہ نفسی دوری ہی ذہن کو زندہ رکھتا ہے۔

انیس سال کی عمر ہی سے باڈلیئر میکدوں اور قحبہ خانوں کی عیاشی سے روشناس ہو گیا۔ ابھی بائیس سال کا تھا کہ حبشی نژاد آوارہ جین ڈووَل سے اُسے ایک گہرا تعلق پیدا ہوا۔ یہ وہ عورت تھی جو اُسے اپنے عیبوں ہی کی دلکشی سے مسحور کئے ہوئے تھی۔ تیس سال کی عمر میں اُس کی ملاقات ایک ایسی عورت سے ہوئی جو حُسن، مہر و شفقت اور مسرت کا ایک زندہ مجسمہ تھی۔ اس کا نام اپولین سباتیئے تھا اور یہ ایک شخص کی داشتہ تھی اس کے شخصی وقار سے مرعوب ہو کر نیز اپنی ذلت اور پستی پر نظر رکھتے ہوئے باڈلیئر نے یہ خیال کیا کہ اُس کے لئے اس عورت کو حاصل کرنا ناممکن ہے۔ اس عورت کے حسن نے باڈلیئر ایسے تجربہ کار اور گرگِ باراں دیدہ انسان میں ایک ایسی جھجک اور شرم پیدا کر دی جو نوآموز اور نوجوان عشاق کے اولین عشق کی خصوصیت ہوتی ہے۔ لیکن باڈلیئر اس محبت کو دل ہی دل میں نہ چھپا سکا۔ پانچ سال تک وہ اپنا اندازِ تحریر بدل کر اس رومانوی محبوبہ کو گمنام محبت نامے لکھتا رہا۔ محبت کے اس نفسی دور میں ہی باڈلیئر نے چند شاہکار نظمیں لکھیں۔ ذیل کی نظم میں کسی ایسی زخمی روح کی پکار ہے جو اپنے بازو محبوب کی سمت پھیلائے ہوئے محبت کی آگ میں جل جل کر ترس رہی ہو۔

پُکار

اے مسرت کے فرشتے!
تجھ کو کچھ اس کی خبر ہے،
درد آور شرم ہیں کیا شے،
اور پشیمانی اور آہیں،
دل کی الجھن کے جھمیلے،
اور مبہم سے وہ خطرے،
جن سے بھرپور ہیں راتیں،
جو مرے دل کو مسل دیں۔
درد آور شرم ہیں کیا شے۔
تجھ کو کچھ اس کی خبر ہے،
اے مسرت کے فرشتے!

مہر و الفت کے فرشتے!
تجھ کو کچھ اس کی خبر ہے
تجھ کو احساس ہے اس کا۔
دل میں نفرت کا اندھیرا
جبکہ سب بند ہوں لا ہیں
کیسے غم لے کے ہے آتا؟
آہ! نفرت کی نگاہیں
آنکھوں میں لاتی ہیں آنسو،
انتقام اپنے بلاوے،
دل کو دیتا ہے کہ سُن لے
اور تاریکی سے اُٹھے،
جا کے اُس نور سے لپٹے!
دل پہ اُس وقت ذرا بھی،
اپنا رہتا نہیں قابو!
تجھ کو احساس ہے اس کا،
تجھ کو کچھ اس کی خبر ہے،
مہر و الفت کے فرشتے؟

. . . .

ایک اور نظم میں وہ لکھتا ہے:۔

"ایک بار صرف ایک بار، اے نرم دل عورت! تیرا بازو میرے بازو سے چھوا۔ میری روح کی تاریک گہرائیوں میں وہ یاد اب تک تازہ ہے۔ رات بھیگ چکی تھی اور چودھویں کا چاند نمودار ہو رہا تھا اور سوئی ہوئی بستی پر رات کی متانت کا حسن کسی دریا کے وقار کی طرح چھایا ہوا تھا۔"

ایک اور نظم میں کہتا ہے:۔

سلام اُس کے نسائی حسن کو جس نے مرے دل میں
مسرت لانے والا جال پھیلایا اُجالے کا!
فرشتے کو، اُسی مورت کو جو یکسر ہے لافانی
سلام اس عاشق ناشاد کے ناکام جذبے کا!

وہ میری زندگی میں اس طرح گھل مل گئی جیسے،
نمک مل کر ہوا میں ایک ہو جائے سمندر کا!

پیاسی روح کو یہ سری یہی احساس ہے گویا،
دوام اُس حُسن کا مجھ کو بھی لافانی بنا دے گا!

آخر جب محبت کے اس نفسی دور کو پانچ سال ہو گئے تو باڈیلیئر نے اظہارِ عشق کی جرأت کر ہی لی۔ اس وقت باڈیلیئر شہرت کی بلندی کو حاصل کر چکا تھا۔ اس کا مجموعۂ کلام شائع ہو چکا تھا اور اس پر حکومت کی طرف سے مقدمہ چلایا جا چکا تھا۔ اُس کی محبوبہ کے لئے یہ بات مسرّت افزا تھی کہ ایک اتنا مشہور شاعر اتنے عرصے تک اُسے اس اخلاص اور شدّت کے ساتھ چاہتا رہا۔ اُس کی شہرت اور اُس کے اخلاص سے متاثر ہو کر اس نے ایک رات ہار مان لی۔ اور یوں وہ نفسی دور ختم ہو گیا جو شاعر کی ذہانت کو تحریک دیتا رہا تھا۔ محبت کی یہ ذہنی تحریک باڈیلیئر ہی سے مخصوص نہیں ہے۔ ہر ذہین شخص کی زندگی میں محبت ایسی ہی تحریک لاتی ہے۔ اور پھر انسان روحانی کیف سے ہٹ کر جسمانی لذّت کی طرف رجوع ہوتا ہے۔ لیکن وہ جسمانی لذّت جو اس روحانی دورِ محبت کی تکمیل کرتی ہے۔ باڈیلیئر کے لئے تباہی کا موجب ہوئی۔ باڈیلیئر اور اُس کی محبوبہ دونوں کو ایک ناقابلِ علاج ناامیدی ہوئی اور اس کے لئے شاعر ہی قابلِ الزام ہے۔ اُسے ایک خفت، ایک ذلّت اور ہیچ نفسی کا احساس ہوا۔ اور یہ افسانۂ عشق ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔ جسمانی طور پر تسکین حاصل نہ ہو سکنے سے وہ بات مٹ گئی جسے روح اور ذہن نے تخلیق کیا تھا۔

باڈیلیئر کے اس معاشقے سے ظاہر ہوتا ہے کہ محبت کا نفسی دور ایک ذہین اور طبّاع انسان پر کس قسم کا اثر کرتا ہے۔ اس دور سے اس فرد کو فائدہ ہوتا ہے اُس کی اندرونی قوتیں بیدار ہو کر سطح پر آ جاتی ہیں اور اس نفسی دور کے ساتھ ضروری نہیں ہے کہ جسمانی لذّت کا دور بھی ہو۔ اس کے بغیر بھی یہ اپنی اثر اندازی کے قابل ہے۔

اس میں شک نہیں کہ عشق کے نفسی دور کی مدد سے بے نیاز ہو کر بھی بعض اشخاص اپنی قابلیتوں کا اظہار کر سکتے ہیں۔ اور اپنی طباعی کا جلوہ دکھاتے ہیں۔ اُن کے لئے محبت کی تحریک کی ضرورت نہیں ہوتی۔ بعض دفعہ نظمیں لکھی جاتی ہیں، گیت گائے جاتے ہیں اور تصویریں بنائی جاتی ہیں اور اس کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ فن کار اپنے فن کو ظاہر کئے بغیر رہ ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ ہر حقیقی طبّاع اپنی طبّاعی کا غلام ہوتا ہے۔ اُس کا اظہار اس کے لئے لازمی ہوتا ہے۔ اظہار سے باز رہنے کے لئے جس ضبط کی ضرورت ہے۔ اُس میں اُس کا نقصان ہوتا ہے۔ اس لئے وہ دولت یا شہرت کے لئے اپنے فن کا اظہار نہیں کرتا۔ شہرت سے اُسے مسرّت ہوتی ہے، دولت سے اُسے راحت ملتی ہے۔ لیکن تخلیقِ فنّی کی حقیقی اور بنیادی وجہ یہ نہیں ہوتی۔ بلکہ اگر وہ اُس بات کا اظہار نہ کرے جو اُس کے ذہن پر چھائی رہتی ہے، اگر وہ اُس پکار کا جواب نہ دے جو اُس کی روح کی گہرائیوں سے بلند ہوتی ہے، تو اُسے تکلیف اور اذّیت کا سامنا ہوگا۔ وہ اپنی نفسی اور ذہنی مسرّت اور تسکین کے لئے فنّی تخلیق کی طرف رجوع ہوتا ہے۔ ایک طبّاع انسان غیر شعوری طور پر اپنی ہستی میں چھپا ہوا ایک خزانہ لئے پھرتا ہے اور اُس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اس خزانے کی جھلکیں دنیا کو بھی دکھائے۔

ہیئت کے لحاظ سے باڈیلیئر کا کلام اپنے ہم عصروں سے تعلق رکھتا ہے۔ احتیاط، توازن، صفائی۔ یہ سب باتیں اپنے ہم عصر شعرا ہی کی طرح اُس کے کلام میں موجود ہیں۔ لیکن مواد کے لحاظ سے وہ اُن سے یکسر مختلف ہے۔ اُسے قدیم تصوّرات اور خارجی بیانات سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اُس کی طبیعت کا تقریباً تمامتر میلان پیرس کی جدید زندگی کی طرف تھا اور ایک ایسی روح کے حقیقی احساسات و تجربات اُس کے لئے غایت درجہ دلکشی رکھتے تھے جو اس دنیا کی ہر بات سے ناامید ہو کر پژمردہ ہو چکی ہو۔ اُس کے ہم عصر شعرا جس شدّت کے ساتھ خارجی اثرات کو بیان کرتے تھے۔ اُسی شدّت کے ساتھ وہ داخلی تاثرات کو بیان کرتا تھا۔ اپنے کردار کا تمام رنج والم، اپنے فلسفۂ حیات کی تمام تلخی اور اپنے یاس انگیز اور المناک حالات کی تمام اذیت اس کے کلام کا لازمہ تھی۔

بعض شاعر اس دنیا میں ایسے گذرے ہیں کہ ذاتی حالات کے المناک ہونے کے باوجود انہوں نے مسرت افزا کلام کہا ہے، حسنِ محض کی تخلیق کی ہے۔ اُن کی بنیادی ہستی پھولوں اور قوسِ قزح کے رنگوں ہی میں پوری طرح اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ لیکن بعض مصنفوں کی زندگی اور تخیّل تیرہ و تار ماحول کا ترجمان ہوتا ہے۔ ایسے لکھنے والے عموماً نثر ہی لکھتے رہے ہیں۔ باڈیلیئر کو اس لحاظ سے ایک خصوصیت اور امتیاز حاصل ہے کہ وہ گہری قنوطیت کے ہولناک تصوّرات میں جذبات، تخیّلات اور حُسن کی ایک ایسی آمیزش پیدا کر دیتا ہے کہ جسے دیکھ کر ہمیں حیرت ہوتی ہے۔ اُس کے تصوّر میں ہر وقت ایک تیرگی اور ہیبت چھائی رہتی ہے اور اُس کے کلام کا بیشتر حصّہ نوجوان اور نادان لوگوں کے پڑھنے

کے ناقابل ہے۔ لیکن ایک ایسا شخص جس کی ذہانت پختہ ہو اور جو گہرے
اور صحیح غور و تفکر کا بھی عادی ہو، اس پریشان شاعری میں بھی بہت زور
دار پہلو دیکھ سکتا ہے اور سب سے بڑھ کر اُسے اس کلام میں ایک
جذبات انگیز تخیل نظر آتا ہے۔ جس سے خیال کو ایک ایسی شان
رعنائی حاصل ہو جاتی ہے کہ اس غمدیدہ شاعر کے الفاظ ایک لافانی
بلندی کو پا لیتے ہیں۔

یہاں میں اُس نوحے کے ایک بند کا نثری ترجمہ پیش کرتا ہوں
جو انگلستان کے شاعر سون برن نے باڈلیئر کی موت سے متاثر ہو کر
لکھا تھا۔

"اے بھائی!
اپنے گیتوں کے پرانے موسم میں
تو نے اُن بھیدوں اور دکھ درد کو دیکھ لیا
جنہیں ہم نے کبھی بھی نہ دیکھا تھا۔
تند و تیز، جوشیلی محبت،
رات کے وقت کسی ایسی جگہ
جہاں کبھی کسی نے سانس تک نہ لیا ہو۔
پیاری پیاری، زہریلی کلیوں کی کھلتی ہوئی پتیاں،
تیری باریک نظر کے لئے ایک کھلی ہوئی بات تھیں۔
لیکن اور کوئی بھی انہیں نہ دیکھ سکتا تھا۔
زرخیز وقت کے پوشیدہ خزانے،
بے ہیئت گناہ،
بے مسرت باتیں،
اور وہ جگہ جہاں دُکھیا روحوں کی بند آنکھوں سے،
جھکولوں والی نیندوں میں الجھے سپنوں کے ذریعے سے
آنسو بہتے ہیں،
اور ہر چہرے پر تو نے ایک سایہ دیکھا،
اور تو نے دیکھا کہ لوگ جو بوتے ہیں
وہی کاٹتے ہیں!"

۹ر اپریل ۱۸۶۶ء سے ۳۱ر اگست ۱۸۶۷ء تک باڈلیئر
روح و جسم کی اُن اذیتوں کو ایک جانگداز آہستگی کے ساتھ سہتا رہا جو اُس
کے لئے فالج اور دوسرے امراض کی وجہ سے مرتے دم تک کے
لئے لازمی ہو گئی تھیں۔ زندگی کے یہ پونے دو سال زندگی نہ تھے،
موت تھے، ایک مرگِ مسلسل۔

۳۱ر اگست ۱۸۶۷ء کے روز صبح کے گیارہ بجے وہ مر گیا۔

اگر اُس کے کلام کے ساتھ اس کے اپنے زمانے میں انصاف
نہیں کیا گیا تو ہم صرف یہی کہہ سکتے ہیں کہ زمان و مکان وہی رہتے ہیں
لیکن طباع ذہنیتیں زمان و مکان کی قیود سے بالا ہوتی ہیں۔

بہجت کی بلندی

وادیٔ خطرات پر اور پُرسکوں جھیلوں پہ بھی،
جنگلوں پر، بادلوں، پیڑوں پہ اور ٹیلوں پہ بھی،
دُور مہر و ماہ کے سوداز دہ اسرار سے،
دُور یکسر مضطرب انجم کے شعلہ زار سے۔
سیر کر اَے روح! جا کر اشتیاقِ تازہ سے
اور کر احساسِ بہجت نور کے شیرازہ سے!
ایک ایسے شخص کی مانند جو مدہوش ہو
ایک احساسِ ندائے غیب سے خاموش ہو،
تو بھی اس کی طرح جا اب وسعتِ افلاک میں،
نفسِ مردانہ کی تندی لا دلِ بے باک میں!
تیرہ و تاریک دنیا کی پریشانی کو چھوڑ،
دہر کی بے رنگ اور آباد ویرانی کو چھوڑ!
چل نکل، دامانِ قیدِ عارضی کو چاک کر
اپنی ہستی کو ہواؤں میں پہنچ کر پاک کر!
اور وہاں آتش کی وسعت اور شدّت نوش کر
بادۂ گلرنگ کا اِک جامِ صحت نوش کر!
دہر سے دور اور ساری کائناتِ غم سے دور
دھند کے بارِ گراں سے، تلخیٔ پیہم سے دُور!
اُس کو حاصل ہے مسرت، جو پرندوں کی طرح
جا کے راحت سے ملے آزاد رندوں کی طرح!
اُس جگہ پر رہ سکے جس میں گنہ کوئی نہیں۔
جس جگہ جا کر کوئی دل رہ نہیں سکتا حزیں!
اُن مقاموں کی خموشی میں بھی اِک اظہار ہے؛ واں پھولوں کی زبان بھی مائلِ گفتار ہو

اجنبی عشرتیں

مطمئن دل کو لئے چلتا گیا ، چلتا گیا
کر لیا طے راستہ سب اس طرح ڈھلوان کا!
جس طرح منظر دکھائی دے کسی مینار سے
شہر کا جلوہ مجھے ایسے نظر آنے لگا !
اس جگہ سے اُن مقاموں تک گیا میرا خیال،
ہیں جو دوزخ کے نمونے: جیل، چکلے، ہسپتال !

ان مقاموں پر بدی کھلتی ہے پھولوں کی طرح
تجھ کو سب معلوم ہے شیطاں! مری وجہِ عذاب!
اس کا تجھ کو علم ہے، میں اُس جگہ پہنچا نہ تھا،
رائیگاں اشکوں سے آنکھوں کو کروں رشکِ گلاب!

میں تو بوڑھا اور فسردہ قلب اک عیّاش تھا
واں پہنچنا تھا وفاداری کا میری امتحاں !
دُور اُس آوارہ سے کرنا تھی دل کی تشنگی،
جس کا حسن دوزخی کر دیتا ہے مجھ کو جواں!

میرے دل کو ہے تعلق تجھ سے اے بدنام شہر!
خواہ تو خفتہ ہو، اک بوجھل نمی چھائی رہے
تیری وسعت پر۔ نمایاں دن کے اجیالے کی لہر
یا ہوں تیرے جسم پر ملبوس رنگیں شام کے!
صید اور صیاد میں ہیں لطف اپنے رنگ کے،
پستیوں کی عشرتیں عامی نہ اب تک پا سکے!

پردیسی خوشبو

جب اپنی آنکھوں کو بند کرتے ہی ، جیسے افیون کے نشے میں
کوئی تخیل کے خواب دیکھے ،
میں نوش کرتا ہوں تیرے سینے سے ایسی نکہت کے مست جھونکے
کہ دل کے جذبات جن سے مچلیں،

تو میری آنکھیں یہ دیکھتی ہیں
کہ اک جہنم کی تیز ندّی ہے اور اگنی رُخِ شفق کی ،
جو ایک پل بھی نہیں ہے رُکتی!

اور ایک جزیرہ کہ جس کے اندر ہے غیر فطری نظامِ قدرت؛
اُور اُس پہ اک بوجھ بن گئے ہیں وہ پھل جو کومل ہیں اور میٹھے؛
وہاں پہ مردوں کے جسم مہمان بنتے ہیں اُن کی عورتوں کے ،
اور اصل میں اس سے مختلف ہے دکھائی جو دیتی ہے ہر عورت!

رسیلے گھونگٹ سی گرم جوشی کی سمت کرتے ہیں رہنمائی،
وہ تیری نکہت کے مست جھونکے!
اور ایک ساحل کی کاٹ کے اوٹ میں چھپے، دیتے ہیں دکھائی،
مجھے کئی بادبان ابھرے!
تھکے ہوئے ہیں وہاں پہ تنگ آ کے سارے ساگر کی آندھیوں سے!
ہے میرے دل کی بھی ایسی حالت شبانہ عشرت کی اُلجھنوں سے!

یہ تیرے سینے کی مست نکہت مجھے خبر کیا کہ کس طرح سے ،
میرے دل و روح میں جگاتی ہے بہجت انگیز رس کے سپنے،
کہ جیسے ملّاح گیت گائے!

اس نظم سے باڈیلیئر کی شخصیت کا پورا پورا اظہار ہوتا ہے۔ وہ ایک تعیش پسند، نفس پرست، افیون کا عادی، شاعر تھا۔ تجزیاتی لحاظ سے اس نظم کو دیکھتے ہوئے اس سے اُس کے شاعر ہونے کی دلیل دینا غیر ضروری ہے، یہ بات واضح ہے۔ افیون کے نشے کا ذکر وہ پہلے ہی مصرعے میں تشبیہ کے طور پر کر دیتا ہے۔ کیونکہ اس نظم کے احساسات اور تصورات شاعر کے خیال میں ان احساسات اور تصورات سے ملتے جلتے ہیں جو افیون کی ترنگ میں کسی عادی کو محسوس ہوتے اور نظر آتے ہیں۔

شروع سے آخر تک خیال کا ایک مرکز نہیں رہتا۔ شبانہ ہمدم کے سینے کی نکہت سے بات چلتی ہے اور جذبات کا بھڑکنا جہنم کی تیز ندی، شفق کے خونیں رنگوں کی آگ، اور کہیں ——

ایک جزیرہ، مرد، عورتیں، ۔۔۔ ان چیزوں سے ہوتے ہوئے شاعر پھر لوٹتا ہوا گھونگٹ اور سینے کی نکہت تک آتا ہے۔ گویا نشے کی ترنگ اپنی بلندی پاکر پھر رفتہ رفتہ کم ہوتی جارہی ہے۔ لیکن اب وہ پہلی حالت نہیں کہ ہر بات محض جذبات انگیز اور عشرت خیز ہی دکھائی دے اب شاعر کا اندازِ نظر کسی قدر بدل چکا ہے۔ وہ اپنی ہمدم کی ہم آغوشی کی لذت سے کیف حاصل کرتے ہوئے، تفکر آمیز ذہنیت کا مالک بن جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں وہ خیالی جزیرہ اور اُس کی متعلقہ باتوں کے دھندلے اثرات باقی رہ جاتے ہیں اور پھر اُسے اپنی موجودہ حالت کا خیال بھی آتا ہے ۔۔۔ اُسے ساحل کی اوٹ میں چھپی ہوئی کشتیوں سے اپنی حالت کا تطابق سوجھتا ہے اور وہ اپنے کو اپنے عشرت کدے میں الجھنوں سے دُبک کر، اپنی ہمدم شبانہ کے آغوش میں پناہ گزین پاتا ہے لیکن عشرت کی لذت کا احساس تفکر پر غالب آجاتا ہے۔ اور اس کی بجائے کہ کسی قسم کا اخلاقی نظریہ قایم کرکے اپنے فن کی توہین کرے، (جو باڈیلیر سے بہت ہی دور از قیاس ہے!) وہ ساحل اور بحر دل سے بچے کھچے تاثرات کو جمع کرکے ملاح کے گیت کی آسودگی بخش بہجت کا ذکر کرتے ہوئے خاموش ہو جاتا ہے۔

ہاں ایک بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس نظم کی ہمدم شبانہ شاعر کی حبشی نژاد محبوبہ یا اور کوئی ہنگامی عورت ہے۔ وہ نظم کے شروع سے آخر تک ایک لفظ بھی ایسا نہیں کہتا جس سے ہم کہہ سکیں کہ اُسے اپنی ہمدم شبانہ سے کسی طرح کا رومانی تعلق خاطر ہے۔ وہ اُس کے لئے محض ایک لازمے کی حیثیت رکھتی ہے۔ وقت کٹی کا ایک ذریعہ۔ کسی قسم کی جذباتی مرکزِ خیال نہیں ہے۔

آہنگِ شام

اب ہے وہ گھڑی کہ ہواؤں کے جھولے پر جھولتا جاتا ہے،
جو پھول اگر بتی کی طرح اپنی خوشبو پھیلاتا ہے،
بوجھل ہے ہوا خوشبوؤں سے اور میٹھے میٹھے گیتوں سے،
کیا ناچ کی نرمی جھلکتی ہے تیورا کے بہکتے قدموں سے!

ہر پھول اگر بتی کی طرح اپنی خوشبو پھیلاتا ہے،
اور جاگ اٹھی ہیں سازوں میں فریادیں دکھیا روحوں کی!
کیا ناچ کی نرمی جھلکتی ہے تیورا کے بہکتے قدموں سے،
اک موت اور حسن کے مندر سی آکاس کی صورت اب ہے بنی!

لو جاگ اٹھی ہیں سازوں میں فریادیں دکھیا روحوں کی،
وہ روحیں جنہیں اس موت کی کالی کالی رات سے نفرت ہو!
اک موت اور حسن کے مندر سی آکاس کی صورت اب ہے بنی،
اور خون میں ڈوب کے سورج نے بھی چھوڑ دیا ہے رنگوں کو!

یہ روح جسے اس موت کی کالی کالی رات سے نفرت ہے،
اب یاد کئے جاتی ہے پیہم پہلے، بیتے زمانے کو!
اور خون میں ڈوب کے چھوڑ دیا ہے رنگوں کو اب سورج نے،
اور تیرا تصور جاگ اٹھا ہے میرے دل کے ڈرانے کو!

اس نظم کو پڑھتے ہی ہمیں خیال آتا ہے کہ وہ عورت جس کا تصور شاعر کے ذہن میں "دل کے ڈرانے کو جاگ اٹھا ہے" کوئی ایسی عورت ہے جو یا تو شاعر کو ملی ہی نہیں سکی اور اگر ملی ہے تو صرف ایک ہی بار ملی ہے، دوبارہ نہیں مل سکی۔ اور اُس کی یاد تحت الشعوری میں آسودہ ہو کر رہ گئی ہے اور اب جبکہ شاعر گیتوں، خوشبوؤں اور ناچ کے ہنگامے میں اپنی زندگی کے اس المناک واقعے کو قریباً بلکہ یکسر بھول چکا تھا "پہلے، بیتے زمانے" کی اس عورت کا تصور، نہ جانے کیوں، جاگ اٹھا ہے اور شاعر ڈرتا ہے کہ اس یاد سے جو اُس کے دل میں اچانک بیدار ہو گئی ہے، وہ عارضی فراموشی جو اُس کے ذہن پر دھند کی طرح چھا چکی تھی۔ بالکل ہی نہ مٹ جائے۔

شروع سے آخر تک اس نظم میں ہمیں پاکیزگی اور کسی اجڑے ہوئے رومان کی شہادت ملتی جاتی ہے ۔۔۔ جھولا، پھول، اگر بتی کی خوشبو، میٹھے میٹھے گیت، موت، حُسن، مندر، آکاس، فریادیں، دُکھیا روحیں، کالی کالی رات (فرقت کی!) ۔۔۔ ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جس سے ہمارا ذہن شاعر کے پُرا خلاص جذبے کی پاکیزگی، بے چارگی اور بے بسی کی طرف نہ رجوع ہو جائے اس نظم کی عورت شاعر کے دل میں کسی قسم کی ہنگامی تعیش پرستانہ راحت اور لذت کو تحریک نہیں دیتی۔ شاعر ہمیں آخر میں اس عورت کے تصور سے بھی گریز کرتا ہوا نظر آتا ہے شاید وہ نہیں چاہتا کہ وہ پاکیزہ یاد بھی اب اُس کے گناہ گار دل و دماغ میں آکر اپنے کو آلودہ کرے ؎

اب یہ ترے خیال کے قابل نہیں رہا،
اس دل میں رہ چکی ہے تمنا گناہ کی!

میراجی

غزل

کیوں بے قرار اے دلِ ناداں ہے آج کل
عہدِ وفائے وعدہ و پیماں ہے آج کل

ہر ذرہ برقِ طور بداماں ہے آج کل
از فرش تا بہ عرش چراغاں ہے آج کل

پہلو میں اپنے حُسن کا ارماں ہے آج کل
رنگینیٔ بہار کا ساماں ہے آج کل

اک سروِ نوشباب خراماں ہے آج کل
ذوقِ جنون و سوزِ غم ارزاں ہے آج کل

اب ہو چلا ہے عشق کو احساسِ بے کسی
خود حسنِ کائنات پشیماں ہے آج کل

روشن سپہرِ دہر پہ ہے اخترِ اُمید
قابو میں اپنے گردشِ دوراں ہے آج کل

رندی و میکشی میں ہے مضمر نجاتِ روح
ساقی کا فیض، حاصلِ ایماں ہے آج کل

وہ پھول جس پہ گلشنِ فردوس بھی نثار
افسانۂ بہار کا عنواں ہے آج کل

پردے جہالتوں کے اُٹھا چاہتے ہیں اب
محفل میں نورِ شمعِ فروزاں ہے آج کل

یہ عہد یادگار ہے تاریخِ دہر میں
بادہ فروش ساقیٔ دوراں ہے آج کل

آبِ حیات پیرِ مغاں نے لُٹا دیا
ہر دردِ لاعلاج کا درماں ہے آج کل

ساحل سے بے نیاز ہے اب فکرِ ناخدا
کشتی سپردِ موجۂ طوفاں ہے آج کل

تیری غزل میں مستیٔ جاوید ہے ضیا
ہر ذی حیات مست و غزل خواں ہے آج کل

ضیا فتح آبادی ایم اے

اُجالا

آشا آئی، سارے من کے دُکھ اک پل میں مجھ کو بھولے،
من مندر میں سُکھ سنگت نے ایسی اُمنگیں آن جگائیں
جیسے کوئی ساون رُت میں پُھلواری میں جھُولا جھولے،
کومل لہریں میرے من میں ایک انوکھی شوبھا لائیں،
جیسے اُونچے، نیلے ساگر میں دو کُونجیں اُڑتی جائیں،
جیسے بسنتی سماں سہانا من کو چنچل ناچ نچائے!
حیرانی ہے، میرے من میں ایسی باتیں کہاں سے آئیں؟
من سویا تھا، سوئے ہوئے کو کَون پکارے؟ کون جگائے؟
جیسے کوئی نَوجیون کا ہرکارہ، سندیسہ لائے!
جس کے من میں آشا آئے، بس وہی سمجھے، وہی بتائے!

میراجی

بھُوت

جمیا ایک لاوارث بہشتی کی لڑکی تھی ہے کر پالی گئی، جوان ہوئی تو دادی اماں نے اس شرط پر دولھا کی تلاش کرائی کہ اول تو خوبصورت اور قابل ہو (بی اے نہیں) دوئم کاغذ لکھے کہ جمیا کو نہ تو کبھی ماروں گا اور نہ کبھی لے جاؤں گا اور خود ڈیوڑھی پر پانچ روپیہ ماہوار کی زبردست تنخواہ پر عمر گذار دوں گا۔ درجنوں امیدوار آچکے تھے، ایک سے ایک بڑھ کر۔ کچھ تو شرط سن کر ایسے گئے کہ رسید بھی نہ دی باقی سب کو دادی اماں نے نامنظور کر دیا۔ ایک تو کوئی پچاس سے اوپر ڈاڑھی کتر کترا کر جو آئے تو حسبِ سابق عین دروازہ کے سامنے بٹھائے گئے اور دادی اماں نے جو چشمہ لگا کر چق میں سے دیکھا تو آگ بگولا ہو کر اُچھل پڑیں۔ "نوج! نکلواس بہروپئے کو آیا ہے وہاں سے مونڈی کاٹا"!

اور ادھر جمیا کا یہ حال کہ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے دوہے پا لک اور نوکرنی تھی۔ تو کیا ہے۔ آخر میں اس کی ہجولی اور رازدان بھی تو تھی) انہیں ہر امیدوار پسند تھا۔ ایک دیہات کا امیدوار آنے والا تھا جس کے انتخابی بورڈ کے صدر چچا خلیل بنائے گئے تھے اس امیدوار کی بڑی تعریفیں سنی گئی تھیں اور بالخصوص صورت شکل کی۔ دادی اماں کہتیں "لو بوا آخر میری جمیا کیا بدصورت ہے" اور واقعہ یہ ہے کہ اچھا سانولا بوٹا سا ہُوا رنگ بے حد نمکین (ذرا نمک زیادہ سمجھ لیجئے!) ہونٹ البتہ موٹے اور دہانہ ذرا چوڑا۔ ناک بقول دادی اماں "موٹی سے کیا ہوتا ہے"۔ اچھی خاصی تھی! جب دادی اماں سے اس بات پر لڑو کہ جمیا خوبصورت نہیں تو بحث یہاں ختم ہوتی کہ "خیر آدمی کی بچی ہے کوئی پری تو میں نے کہا نہیں!"

قصہ مختصر چچا خلیل کا انتظار ہو رہا تھا۔ آج ہمیں زیادہ انتظار نہ کرنا پڑا "کہو بھئی آئیں" کی مخصوص آواز کے ساتھ چچا خلیل صحن میں نظر آئے دادی اماں نے خیر و عافیت کے عنوان پر گفتگو شروع کرتے ہی جمیا کے امیدوار کا ذکر چھیڑ دیا اور ہیں امیدواروں کی آمد و رفت تعریفوں اور برائیوں سے تنگ آ چکی تھی اس لئے بول اٹھی "چچا آپ کی بندوق کیا ہوئی؟ آپ نے بہت دن سے شکار نہیں کھلایا۔ کیا شکار کو جانا چھوڑ دیا؟" چچا نے ایک دم سے چونک کر کہا "ارے بھئی کیا بتاؤں چھوڑ تو نہیں دیا مگر بلیّات سے سابقہ ہو گیا۔ اس سبب سے کچھ عرصہ سے چھوٹا ہوا ہے جو خاص سمت شکار کی ہے اور جدھر شکار زیادہ ملتا ہے وہی چھوٹ گئی ہے۔ بھئی کیا بتاؤں... "میں نے قہقہہ لگایا اور بھوتوں سے منکر ہوئی تو چچا لگے بگڑنے۔ دادی اماں نے بھی کہا "بے بیٹی خدا سے ڈر بلیّات کا ذکر تو بڑی بڑی کتابوں تک میں ہے۔ دولہاؤں کے ذکرِ خیر کے بدلے بھوتوں کا ذکر ہونے لگا" چونکہ مجھے ایسے قصوں سے زیادہ دلچسپی ہے اس لئے چچا کو پان بنا کر دیا اور ذرا خوشامدانہ لہجہ میں کہا "ہاں چچا تو کیسے سابقہ ہو گیا؟" چچا نے پان کھا کر مونڈھے سے ٹیک لگائی اور کہنے لگے "وہ ایسا ہوا کہ ایک دن ہمارے دوست خان نے کانگڑا گاؤں کے چودھری کے یہاں شکار کو چلنے کے لئے کہا۔ یہاں تو اُدھار کھائے بیٹھے تھے مختصر سی تیاری کے بعد روانہ ہو گئے اور چراغ جلے چودھری کے مکان پر پہنچے۔ کچھ دیر شکار کے متعلق گفتگو ہوئی۔ دوسرے دن سورج نکلنے سے پیشتر بیل گاڑی میں روانہ ہونا قرار پایا۔ پھر کھانا دانا کھا کر جو اطمینان ہوا تو چودھری نے سواری کا، خان نے بندوق کی صفائی کا۔ اور میں نے بستر پر دراز ہونے کا انتظام کیا۔

"سورج طلوع ہو چکا تھا سب ہی چرند و پرند دانہ گھاس کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ اور ہم شکار کی۔ اتفاقاً کسی کا نشانہ صحیح نہ بیٹھا۔ یہاں تک کہ دوپہر ہو گئی اور شکار کی امید نہ رہی صبح سے شام تک بے گنتی کارتوسوں کی آوازیں خرگوشوں ہرنوں تیتروں کبوتروں سے لے کر چیلوں کوّوں تک کو سنائیں اور ڈر کے بھاگے بھی سب ہی مگر اتنا کوئی نہ ڈرا کہ مر جاتا! آخر ناکام خاک چھانتے بیر بیٹتے جھاڑیوں سے الجھتے پسینے میں شرابور شام ہوتے ہوتے ایک ٹیلہ پر چڑھے تو ایک جھیل دکھائی

دی، وہاں مرغابیوں کے جھنڈ کے جھنڈ دیکھ کر سب کی باچھیں کھل گئیں۔

جھٹپٹے کا وقت تھا ہوا سنّاٹے سے چل رہی تھی جھیل میں ایک کنارے نرکل کھڑا تھا جس میں ہوا کی وجہ سے سیٹیاں سی بج رہی تھیں جھیل کے چاروں طرف سرکنڈا اُگا ہوا تھا۔ قریب ہی ایک پیپل کا درخت تھا جس کے پتے ہوا سے کھڑکھڑا رہے تھے اور خوفناک آوازیں نکل رہی تھیں۔ چاروں طرف سوائے ان آوازوں یا بطوں کی خوشگوار پھڑپھڑاہٹ اور بولنے کے سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ہم دبے پاؤں ٹیلہ پار کرکے جھیل کے قریب آئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ پیپل کی جڑ سے پیٹھ لگائے ایک شخص رسّی بٹ رہا ہے اور ایک آدمی ناریل کا حقہ ہاتھ میں لئے اونگی بونگی ہانک رہا ہے۔ ہم نے اس جگہ آکر یہ اندازہ لگایا کہ کس طرح ایک ہی فائر میں کئی مرغابیاں زخمی ہوں پیپل کا سہارا لے کر فائر کرنا آسان تھا مگر مرغابیوں کا زخمی ہوکر نرکل میں چھپ جانا یقینی تھا ان کے نکال لینے کے لئے آدمی درکار تھا ہم نے پہلے اس رسی والے سے کہا۔ "یہ بھی سنتا ہے۔ یہ نکال لائے گا۔ نہیں تو کیا کہتا ہے؟" رسّی والے نے چونک کر نصیحت کا دفتر کھول دیا اور رسّی بٹنا بھول گیا۔ اس کی نصیحت کا مطلب یہ تھا کہ یہ جھیل بھوتوں کا مسکن ہے اور اس میں شکار نکالنے کوئی نہیں گھستا اور جو گھستا ہے وہ واپس نہیں آتا اور اس نے قصہ سنایا کہ کس طرح ایک صاحب نے اپنے آدمی [illegible] بھوت نے اس کا گلا دبا کر غرق کر دیا وہ بھی غرق ہوکر بھوت بن گیا اور شکاریوں کو جنگل میں حیران کرتا ہے۔ اُس نے سنجیدگی سے ہمیں آگاہ کیا کہ اگر کوئی اس میں گھسا تو غرق ہوکر پھر وہ ہمیں بھوت بن کر حیران کرے گا۔ اس کی تائید میں حقے والے بے فکرے نے بھی سر ہلایا۔

چودھری نے واپس چلنے کے لئے اصرار کیا اور خان نے فائر کرنے کے لئے میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ خان نے فائر کر دیا اور ہوا وہی یعنی مرغابیاں زخمی ہوکر نرکل اور سرکنڈوں میں چھپ گئیں باقی ہوا ہوگئیں۔

"اب انہیں نکالے کون؟" چودھری نے خان کو گھور کر کہا۔ خان نے پھر حقے والے کی خوشامد بھی کی گھرکیاں بھی دیں لالچ بھی دیا سبھی جتن آنا فانا کر ڈالے مگر وہ تو ٹس سے مس بھی نہ ہوا اور ہم میں سے کسی نے اتنی ہمت نہ کی جو اس کیچڑ پانی اور اندھیرے میں مرغابیاں لاتا۔

چند منٹ میں ایک گنوار مٹکا بغل میں دبائے جھیل پر آیا ہم نے اس سے بھی کہا مگر وہ بھی بھوت کا قائل نکلا۔ ہم اسی ادھیڑبن میں تھے کہ اتنے میں ایک کھیت سے "آئی رات ہوئی اندھیاری" کی تان لگاتا ایک جوان دہقان لڑکا گندمی رنگ سر پر گھاس کی گٹھڑی ایک ہاتھ میں درانتی اور دوسرے ہاتھ میں ڈنڈا لئے میلی دھوتی پھٹا سلوکا سُرخ پگڑی باندھے نکلا اور خراماں خراماں ایک طرف جانے لگا۔ خان نے اس کے پاس جلدی سے جاکر اُسے ایک روپیہ دیا اور جھیل میں سے مرغابیاں نکالنے کو کہا۔ وہ دہقانی شاید بھوتوں کا قائل نہ تھا۔ کچھ پس و پیش کے بعد روپیہ لے کر بڑے انتظام سے اَنٹی میں اُڑسا سلوکہ پگڑی گٹھڑی ڈنڈا وغیرہ الگ ٹکا اور اُترنے ہی کو تھا کہ رسّی بٹنے والا دوڑ کر بولا "کیوں مرنے کو پھرتا ہے اس میں بھوت ہے"۔ یہ سن کر اس ہٹے کٹے جوان نے قہقہہ لگایا اور کہا "ارے میں خود زندہ بھوت ہوں" اور دھڑام سے پانی میں کود پڑا قہقہہ لگاتا اور گاتا ہوا "ہائے موری نیا پڑی منجدھار۔۔۔ سکھی۔۔۔"

بڈھا ہکا بکا ہوکر جھیل کی طرف غور سے دیکھنے لگا۔ نوجوان تو یہ جا اور وہ جا پانی کو چیرتا مرغابیوں تک پہنچا دو تو پکڑ لیں اور تیسری کے پیچھے نرکل میں گھسا اب اندھیرا بڑھ رہا تھا اور اس کا سایہ سا دکھائی دے رہا تھا کہ وہ نظروں سے غائب ہوگیا اور ہمیں نے آواز دی کہ مرغابی ملی تو اس نے بڑے زور زور سے نرکلوں سے آواز دی "بھوت۔ بھوت! بھوت ہے۔ بھوت ملا ہے"۔

بڈھا خوف زدہ ہوگیا اور ہم سب اُدھر دیکھنے لگے۔ کیا دیکھتے ہیں کہ کوئی شے بھینس یا گائے کی طرح نرکلوں کی تاریکی میں پانی منتھ رہی ہے کہ ایک دم سے عجیب آوازیں آئیں، پانی میں کشمکش ہوئی۔ کچھ دکھائی نہ دیا کہ یکایک نرکلوں میں فاصلہ سے کسی کے چلّانے کی آواز آئی اور پھر ہم نے دیکھا کہ وہی شے پانی میں غوطے سے کھا کر غائب ہوگئی ہم نے آواز پر آواز دی مگر سوائے بڑھتی ہوئی تاریکی میں دور سے سارسوں کے بولنے کے کچھ نہ سنائی دیا۔ بڈھے نے اپنی رسّی ٹوکری سنبھالی اور "بھاگو بھیّا، نہیں تو بھوت آ جائے گا" کہتے ہوئے چلتا بنا، ہم نے بہت روکا مگر بے کار۔ طبیعت پر عجیب اثر تھا۔ خان کا خیال تھا کہ لڑکا ڈوب گیا، یہی میرا خیال تھا مگر بہتی بجھ سے کیا کہوں وہ تو واقعی بھوت تھا۔

"بھوت تھا!" میں نے قہقہہ لگایا اور اتنے میں جیا حقہ بھر کر لائی

اور چچا کے سامنے رکھا۔ چچا نے حقہ کی نے پکڑتے ہوئے کہا "ہاں بیٹی کیا بتاؤں . . . "

"تو پھر کیا ہوا؟"

"بتاتا ہوں"

حقے کو سنبھال کر چچا نے اپنا قصہ جاری کیا "تو بھئی ہم وہاں سے سراسیمہ سے ہو کر آ رہے تھے اندھیرا ویسے اور پھر آدمی کو اپنی آنکھوں سے غرق ہوتے دیکھا کہ کسی بلا نے اسے دبا لیا۔"

ہم ایک کھیت سے نکل کر جھیل کو بائیں طرف چھوڑتے ہوئے جو نکلے ہیں تو بیٹی تو سچ مانیو وہی گنوار جو ہماری آنکھوں کے سامنے ڈوبا تھا ایک دم سے سامنے آ کر کیچڑ میں لت پت ایک بھیانک آواز سے مرغابیاں لٹکا کر کہتا ہے کہ "صاحب یہ لو . . . "

اور خان کے منہ سے "نکلا بھوت" پھر ہم جو بھاگے ہیں گرتے پڑتے اور وہ ہمارے پیچھے چیختا رہا بھوت نہیں ہوں . . . . . بھوت نہیں ہوں"۔ مگر ہم تو بھاگے ہی گئے۔ ایک نہ سنی۔

میں نے کہا "چچا آپ کیوں بھاگے۔ وہ ڈوبا ہی نہ ہوگا اور دوسری طرف سے نکل کر آ گیا ہوگا؟"

چچا نے زور دے کر کہا "مگر وہ تو ہمارے سامنے ڈوبا تھا اور اب مصیبت یہ ہے کہ اسی طرف ہم شکار کو جاتے تھے دو دفعہ جنگل میں وہ ہمیں مل چکا ہے اور ہم جان بچا کر اس سے بھاگ چکے ہیں"۔

میں نے کہا "واہ چچا پتے تو وہ کدھر سے آیا تھا؟"

چچا بولے "بیٹی وہ تو زمین سے پیدا ہو گیا۔ صاف میدان ہے، پھر کے جو دیکھتے ہیں تو چلا آ رہا ہے اور وہی "سنو تو . . . . سنو تو" کی رٹ لگاتا ہوا۔

اب ہار کر ہم نے اُدھر کا جانا ہی چھوڑ دیا۔ دوسری طرف شکار نہیں ملتا"۔

میں نے اس قصے کو سن کر بہت کچھ چچا سے بحث کی لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایک آدمی جو ان کے سامنے ڈوب چکا ہو اس کو کس طرح وہ زندہ مان لیتے۔ میں یہ بحث کر رہی تھی کہ وہ امیدوار آ گیا اور تجویز یہ ہوئی کہ عورتیں پردے میں چلی جائیں اور اس کو اندر بلایا جائے۔ میں نے جمیا کو اشارہ کیا کہ ہم دونوں سب سے الگ رہ کر دیکھیں چنانچہ وہ چپکے سے باورچی خانہ سے نکل آئی اور پاس ہی چق کے پیچھے ایک تاریک سے برآمدے سے ہم دونوں نے جھانکنے کی تجویز کی۔ ہم برآمدے میں پہنچے ہی تھے کہ پردہ ہو گیا اور فوراً ہی گویا قیامت آ گئی میں نے آنکھ سے تو کچھ نہیں دیکھا مگر ہاں ہیبت ناک آواز میں "بھوت" کانوں سے ضرور سنا۔ مڑ کر جو دیکھا تو چچا اپنے مونڈھے سے پھاند کر حقہ گراتے ہوئے "بھوت" کا نعرہ مار کر ایک دم سے چق توڑتے ہوئے ایسے گھبرا کے مجھ سے اور جمیا سے ٹکراتے ہوئے چارپائی پر جا گرے کہ ایک بھونچال آ گیا۔ دادی اماں الگ چیخیں اور اماں جان الگ۔ ذرا ہوش ٹھکانے ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک تگڑا سا گنوار بکھری ہوئی آگ اور گرے ہوئے حقے کو سنبھال کر آنگن میں حیران پریشان کھڑا یقین دلا رہا ہے کہ

"میں بھوت نہیں ہوں!"

شفیق نقی

تلاشِ سکوں

ہمنشیں! کیا پوچھتا ہے مجھ سے کیوں بیتاب ہوں
موجِ مضطر کی طرح ناآشنائے خواب ہوں
تو سمجھ سکتا نہیں شاعر کے دن اور رات کو
تُو سمجھ سکتا نہیں شاعر کے احساسات کو

ہر نفس میرے جنوں کا اک بھیانک راگ ہے
تجھ کو کیا معلوم میرے دل میں کتنی آگ ہے
تو سمجھ سکتا نہیں شاعر کے دل کے راز کو
تو سمجھ سکتا نہیں شاعر کے سوز و ساز کو

دن کو سورج کی شعاعیں تولتا رہتا ہوں میں
رات کو شبنم کے موتی رولتا رہتا ہوں میں
زہرہ و ناہید کے بربط بجاتا ہوں کبھی
چاندنی کے سیل میں غوطے لگاتا ہوں کبھی

سیر کرتا ہوں شفق کے لالہ زاروں میں کبھی
اور گاتا ہوں سما کر آبشاروں میں کبھی
چلچلاتی دھوپ کے صدمے کبھی سہتا ہوں میں
بحر کی موجوں میں حل ہو کر کبھی بہتا ہوں میں

جھولتا ہوں تھام کر کرنوں کے زینوں کو کبھی
اور کھینا ہوں ستاروں کے سفینوں کو کبھی

پھر بھی اے ہمدم مرے دل کی کلی کھلتی نہیں
ڈھونڈتا پھرتا ہوں جس تسکیں کو وہ ملتی نہیں

باقی صدیقی

یادِ رفتگاں

افراد:- مرزا بیدار بخت ——— شاہی مغل خاندان کا ایک فرد ستر سالہ بوڑھا
جمیلہ خاتون ——— مرزا بیدار بخت کی بیوی
بلند اقبال ——— ایک مغل شہزادہ
خسرو مرزا ——— مرزا بیدار بخت کا چھوٹا بھائی
نیلام کرنے والا ——— ایک انگریز
مسٹر ایکس ——— ایک مستشرق

زمانہ:- ہنگامۂ ۱۸۵۷ء کے چند سال بعد

بیدار بخت۔ میں نے آپ لوگوں کو کسی معمولی بات کے لئے یہاں آنے کی تکلیف نہیں دی۔ بلکہ معاملہ نہایت نازک اور اہم ہے

آوازیں۔ واقعی! واقعی!

بیدار بخت۔ آپ نے شاید اندازہ بھی کر لیا ہوگا کہ وہ معاملہ کیا ہے۔

[وقفہ] شہزادہ بلند اقبال ....

خاتون۔ میرا ماتھا ٹھنکا تھا کہ یہی ہوگا۔

بیدار بخت۔ اور یہی ہے۔

خاتون۔ اب کے تو خیر ہے،

بیدار بخت۔ خود فیصلہ کر لوگی، ذرا سن تو لو، اگر معاملہ معمولی ہوتا۔ تو بلند اقبال کا سرپرست ہونے کی حیثیت سے میں خود ہی اس کا تصفیہ کر لیتا۔ مگر بلند اقبال! کیا یہ معمولی معاملہ ہے؟

بلند اقبال۔ چچا جان! ہاں، نہیں تو۔

بیدار بخت میں نے چاہا کہ یہ بات سارے خاندان کے سامنے رکھوں تاکہ اس گتھی کو سب مل کر سلجھا سکیں۔

خاتون۔ مگر اس نے کیا کیا ہے؟

بیدار بخت۔ کیا کیا ہے؟ میں آپ کے سامنے سارا واقعہ رکھے دیتا ہوں۔ خاندان کا سب سے بوڑھا فرد ہونے کے باعث مجھے اپنے فرائض اور ذمہ داری کا پورا احساس ہے۔ ہماری شانِ رفتہ کی یادگار اور آیندہ امیدوں کا مرکز بلند اقبال ہی ہیں میں ان کا بدخواہ ہو سکتا ہوں؟ توبہ! توبہ [وقفہ] میں نے اقبال کو شعر لکھتے دیکھا تو ———

خاتون۔ شعر کہنا کوئی بری بات تو نہیں ہے۔ جہاں پناہ بھی تو ———

بیدار بخت۔ اسی لئے سلطنت گنوا بیٹھے۔ شعر و شاعری کے چرچے ہی دربار میں رہتے تھے جس نے یہ حالت کر دی،

خاتون۔ کبھی کبھی شعر کہہ لینا بری بات نہیں ہے۔

بیدار بخت۔ مگر اس سے بڑھ کر ———

[کھانسنے کی آوازیں جن سے خاندان کے دوسرے افراد کی موجودگی کا پتہ چلتا ہے]

خاتون۔ کیا؟

بیدار بخت۔ اور ایک بات!

ایک آواز۔ بڑھ کر اور بات؟

بیدار بخت۔ جی ہاں! شعر کہنا ابتدا تھی اور فضول خرچی اس کا نتیجہ۔

خاتون۔ اے خدا!!

بیدار بخت۔ میں یہ نہیں کہتا کہ کوئی زیادہ رقم ضائع کی گئی ہے۔ آخر اُن کی رگوں میں شاہی خون ہے۔ محلوں میں پلے ہیں۔ اور دولت میں کھیلے ہیں۔ اگر یہ لاکھوں روپے بھی خرچ کر دیں

تو مجھے ذرا بھر دکھ نہ ہو [ایک سرد آہ بھر کر] آخر بلند اقبال نے دیکھا ہی کیا ہے ـــــ [وقفہ] مگر جس بے دردی سے انہوں نے دس روپے کا نوٹ خراب کیا ہے مجھے اس کا بڑا دکھ ہوا۔

خاتون۔ آخر ابھی لڑکا ہی تو ہے!

بیدار بخت۔ یہ جانتے ہوئے بھی مجھے کہنا پڑتا ہے کہ وہ اب بیس برس کا ہو چکا ہے۔ کیا اس عمر کے دوسرے نوجوان بھی اسی طرح دولت کو برباد کرتے ہیں۔

خاتون۔ اقبال نے آخر کیا کیا؟

ایک آواز۔ حضرت! آخر ہوا کیا؟

بیدار بخت۔ [وقفہ کے بعد] نوٹ کو کاغذ کی جگہ استعمال کیا۔

خاتون۔ استعمال کیا ـــــ!

بیدار بخت۔ پرزہ کاغذ کی طرح!

ایک آواز۔ پرزہ کاغذ!

بیدار بخت۔ انہوں نے نوٹ پر لکھا ہیں ان منحوس نوٹوں ووٹوں کے متعلق کچھ زیادہ نہیں جانتا۔ فرنگی کا سکّہ بھی عجیب ہے ـــ کوئی بھلا اس طرح دولت کو برباد کر سکتا ہے۔ نوٹ اب ایک پائی کا بھی نہیں رہا۔

پہلی آواز۔ اُونہہ!

دوسری آواز۔ اوہو!

تیسری آواز۔ کیسے!

خسرو مرزا۔ نوٹ خراب ہو گیا ہے۔

بیدار بخت۔ خراب ہو گیا ہے نا!

خسرو مرزا۔ جی ہاں! بھائی جان!

بیدار بخت۔ یہی میری رائے تھی۔

بلند اقبال۔ چچا! کہتے ہیں اگر نمبر باقی ہوں تو سرکار سے قیمت مل جاتی ہے۔ اس کے نمبر تو موجود ہیں۔

بیدار بخت۔ بیٹا تم نے بھائی کی بات نہیں سنی۔ وہ کہتے ہیں۔ نوٹ بالکل خراب ہو گیا ہے۔

بلند اقبال۔ اوہ!

خاتون۔ بیٹا! مگر تم نے ایسا کیوں کیا؟

بلند اقبال۔ چچی جان کل صبح دریچے میں بیٹھا لال قلعہ کا نظارہ کر رہا تھا کہ جہاں پناہ کی وہ غزل یاد آ گئی ؎

نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا قرار ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکے میں وہ ایک مشتِ غبار ہوں

یادِ رفتگاں سے دل ایسا بے قرار ہوا کہ اسی زمین میں کہنے کو جی چاہا۔ اتفاقاً پاس کوئی کاغذ نہ تھا۔ بازار سے کون لا کر دیتا۔ خیالات کے ہجوم سے مجبور تھا۔ اتفاقاً یاد آیا کہ جیب میں ایک نوٹ ہے میں نے اس کی پشت پر لکھنا شروع کر دیا۔ اس میں حرج ہی کیا تھا

خاتون۔ ہاں بیٹا!

بیدار بخت۔ تم نے نوٹ کی پشت پر لکھنا شروع کر دیا!

بلند اقبال۔ جی ہاں! خیال تھا۔ باریک خط میں پوری غزل لکھ سکوں گا۔

بیدار بخت۔ مگر تم نے تو ـــــ

بلند اقبال۔ جی ہاں! بقول غالب ؎ ہم بھرے بیٹھے تھے کیوں آپ نے چھیڑا ہم کو۔ اشعار کی آمد کو میں روک نہ سکا۔ مجبوراً مجھے دوسری طرف لکھنا پڑا۔

بیدار بخت۔ (حاضرین کو مخاطب کر کے) سنا آپ نے! انہیں دوسری طرف لکھنا پڑا! جہاں پناہ نے شعر و شاعری میں سلطنت گنوا دی اور یہ حضرت دولت یوں برباد کر رہے ہیں۔ ہمیں خاندان کی بقا کے لئے اس کا سدِّباب کرنا ہوگا۔ یہ شاہی خاندان کی عزت کا سوال ہے۔ بلند اقبال صرف ایک نوجوان ہی نہیں بلکہ وہ شہنشاہ بابر کی آخری یادگار ہے۔ یادگار! میں نے ـــ

بلند اقبال۔ مجھے خود اس کا از حد افسوس ہے چچا جان!

بیدار بخت۔ میں نے ـــــ

خاتون۔ شاعری عادت نہیں ہے۔ یہ خدا کی دین ہے۔

بیدار بخت۔ عادت نہیں ہے۔ یہ مانتا ہوں اور میں شہزادے کو کسی چیز کا عادی ہونے بھی نہیں دوں گا۔ میں نے ایک حلفی اقرار نامہ تیار کیا ہے جس پر بلند اقبال کو دستخط کرنے ہوں گے اور آپ لوگ گواہ ہوں گے۔ میں پڑھے دیتا ہوں (جیب سے مسوّدہ نکال کر پڑھتا ہے) میں [یہاں بلند اقبال اپنا نام خود تحریر کریں گے] حلفاً اقرار کرتا ہوں کہ آئندہ کبھی کسی نوٹ یا اسی قسم کی سرکاری تحریر یا بنک کے کاغذات کی پشت پر یا سیدھی طرف کوئی تحریر نہ لکھوں گا۔" میرا

خیال ہے کہ یہ تحریر منتظر گر جامع ہے اور مجھے امید ہے کہ بلند اقبال کبھی اس کی خلاف ورزی نہ کریں گے اور پھر کبھی دولت کی یوں بے عزتی نہ کریں گے۔

بلند اقبال۔ میرا مقصد ہرگز دولت کی بے عزتی کرنے کا نہ تھا۔

بیدار بخت۔ (بازدارانہ لہجے میں) ہم سب پہلے ہی بے شمار مصائب کا شکار ہیں۔ اب اگر کوئی سرکار میں اطلاع کر دے کہ بلند اقبال نے ملکہ معظمہ کی تصویر پر لکھ کر اس کی بے عزتی کی تو کیا ہو!

آوازیں۔ اوہ!

خاتون۔ پنشن میں آپ ایک نوٹ لائے تھے جس کی پشت پر ہندسے سے لکھے تھے۔

بیدار بخت۔ وہ اور بات ہے۔

خاتون۔ مگر لکھنے والے نے نوٹ کو خراب کیا۔

بیدار بخت۔ اِس کا کیا۔ یہ تو ہیں شاہزادے جنہیں ——

بلند اقبال۔ مجھے افسوس ہے کہ میری وجہ سے آپ لوگوں کو بلاوجہ تکلیف ہوئی۔ میں کبھی ایسا نہ کرتا۔ مگر خدا جانے میری کیا حالت تھی میں طبیعت کی روانی کو روک نہ سکا۔ "یادِ رفتگاں" کے تصور نے مجھے وہ اشعار کہنے پر مجبور کر دیا۔

خسرو مرزا۔ بھائی جان! اقبال آخر نوجوان ہیں۔ اُن سے غلطی ہو گئی۔ ان پر زیادہ سختی نہ کیجئے،

بیدار بخت۔ واہ بھائی خوب! میں سختی کر رہا ہوں۔ اگر میری جگہ کوئی اور ہوتا تو آیندہ شعر کہنے کی قسم لیتا۔ مگر میں نے تو نوٹ پر لکھنے کی قسم لی ہے۔ جانتے ہو۔ اس کے نتائج۔ میں امین ہوں۔ خاندانی امانت کا محافظ ——

خاتون۔ اقبال ابھی نو عمر ہے۔

خسرو مرزا۔ ہاں! بھابھی جان ٹھیک کہتی ہیں۔

بیدار بخت۔ اس لئے میرا فیصلہ نرم ہے۔ اقبال! تم اپنے آپ کو اس شعر و شاعری سے باز رکھنے کی کوشش کرو۔ اس نے سلطنت برباد کر دی۔

بلند اقبال۔ چچا جان آپ کا ارشاد سر آنکھوں پر۔

خاتون۔ خدا میرے بیٹے کو سلامت رکھے

بیدار بخت۔ بیٹا مرحبا! زندہ باد۔

بلند اقبال۔ مگر بعض اوقات تو شعر کہنے پر مجبور ہو جاتا ہوں۔ جب یادِ رفتگاں ——

سین دوم

چند سال بعد۔ لندن کا ایک نیلام گھر

نیلام کرنے والا۔ "یادِ رفتگاں" کا اصلی مسودہ۔ دس روپے کے نوٹ پر دہلی کے آخری تاجدار کا وارث اپنے قلم سے لکھتا ہے۔ لیڈیز اینڈ جنٹلمین! یہ ایک نادرِ روزگار چیز ہے —— کاغذ پر تو سبھی لکھتے ہیں۔ مگر مغل خاندان کا آخری چشم و چراغ نوٹ پر لکھتا ہے، پہلی اور آخری بار —— آخری بار! آپ حیران ہوں گے۔ ذرا برٹش میوزیم میں چکر لگائیے۔ وہاں آپ کو ایک قلمی حلف نامہ ملے گا۔ اسی شہزادے کا —— حلف نامہ معمولی چیز نہیں۔ حضرات! سلطنت دہلی کے وارث خاندان کے ٹمٹماتے چراغ سب موجود تھے۔ جب یہ حلف نامہ لکھا گیا —— یہ کرنسی نوٹ —— ہندوستانی بنکنگ کی تاریخ کا نیا باب، جب ہندوستان میں پہلی بار نوٹ رائج ہوئے —— ہر لحاظ سے نادر —— لکھا گیا! —— "یادِ رفتگاں" "مرثیہ" اپنی گذشتہ عظمت کا مرثیہ بہادر شاہ ظفر کے اشعار کی زمین میں —— ہندوستانی شاعری کا مکمل نمونہ —— بولئے بولئے —— لیڈیز اینڈ جنٹلمین!

مسٹر ایکس۔ ایک پونڈ۔

نیلام کرنے والا۔ خوب! خوب! ادیب لوگ بڑے خشک مشہور ہیں۔ مگر آپ تو خوب بذلہ سنج ہیں اور پکے بیوپاری۔ ایک پونڈ میں نادرِ روزگار یادگار۔ یادِ رفتگاں کا مسودہ۔ شاہی خاندان کی آخری نشانی۔ خوب رہا آپ کا مذاق۔

مسٹر ایکس۔ دس گنی۔

نیلام کرنے والا۔ شکریہ! شکریہ! آپ نے تو حد کر دی، میرے سرپرستوں میں آپ جیسا بامذاق شاید ہی کوئی ہو۔ بولئے بولئے صاحب۔

ایک آواز۔ بیس گنی۔

نیلام کرنے والا۔ بیس گنی! صاحبان بیس گنی۔

مسٹر ایکس۔ پچیس گنی۔

نیلام کرنے والا۔ شکریہ! خوب ابھی تک آپ مذاق ہی کر رہے ہیں۔

دوسری آواز۔ تیس گنی۔

نیلام کرنے والا۔ شکریہ جناب! تیس سے بڑھئے۔ "یادِ رفتگان" ایک
سلطنت کے اقبال اور زوال کی داستان!
تیسری آواز۔ پینتیس گنی۔
نیلام کرنے والا۔ شکریہ! شکریہ جناب! بڑھئے بڑھئے۔ مجھے بھی روٹی
کمانی ہے۔ ایسی نایاب دستاویز پینتیس گنی میں فروخت کر کے
میں نے کیا کمایا۔
تیسری آواز۔ چالیس گنی۔
نیلام کرنے والا۔ چالیس گنی۔ شکریہ! وقت کی قدر کیجئے۔ یہ کیا
ہے ــــ اس کا اندازہ آپ ایسے مستشرقین نہ لگائیں گے
تو کون لگائے گا۔ دنیا میں اپنی شان کا ایک ہی مسودہ
اس کے اصلی ہونے کا ثبوت برٹش میوزیم میں موجود ہے۔
لیڈیز اینڈ جنٹلمین! سنئے (ایک ٹائپ شدہ کاغذ سے پڑھتا
ہے) یہ ترجمہ ہے۔ اس مسودے کا ــــ میں چیلنج کرتا ہوں،
اس کو نقلی ثابت کیجئے۔ ایک ہزار پونڈ انعام! بولئے حضرات!
بولئے ــــ لعل و گوہر کی قیمت معمولی کانچ کو مدنظر رکھ کر
نہ لگائیے ــــ وقت ضائع کیجئے ــــ وقت دولت ہے۔
چوتھی آواز۔ پچاس۔
نیلام کرنے والا۔ شکریہ! لعل و گوہر کی قیمت شیشہ کے معیار پر۔
معاف کیجئے ادب نوازی کا جنازہ نکل رہا ہے۔
پہلی آواز۔ پچپن گنی۔
نیلام کرنے والا۔ پچپن گنی! بڑھئے بڑھئے!
دوسری آواز۔ ساٹھ!
نیلام کرنے والا۔ ساٹھ گنی! خوب ساٹھ گنی!
تیسری آواز۔ پینسٹھ۔
نیلام کرنے والا۔ پینسٹھ جناب!
چوتھی آواز۔ ستر۔
نیلام کرنے والا۔ ستر سے بڑھئے۔
چوتھی آواز۔ پچہتر۔
نیلام کرنے والا۔ شکریہ! پچہتر گنی۔ نایاب مسودہ ــــ ایک سو
میں بھی مہنگا نہیں ــــ آپ کی لائبریری دنیا میں ایک نمایاں
شان کی مالک ہوگی۔ آپ کو ناز ہوگا۔ صرف ایک سو گنی۔

چوتھی آواز۔ اچھا سو گنی۔
نیلام کرنے والا۔ شکریہ! بولئے لیڈیز اینڈ جنٹلمین! ختم کردوں؟
پہلی آواز۔ ایک سو پانچ۔
نیلام کرنے والا۔ دولت کمائی جا سکتی ہے مگر یہ مسودہ ــــ
پہلا اور آخری ــــ تاریخی یادگار ــــ چند گنیوں میں۔
انقلاب! بڑھئے!
دوسری آواز۔ خوب!
نیلام کرنے والا۔ ایک سو دس آپ کے؟
دوسری آواز۔ بہتر!
نیلام کرنے والا۔ ایک سو دس ایک ــــ ایک سو دس دو۔
تیسری آواز۔ پندرہ۔
نیلام کرنے والا۔ پندرہ ــــ طاق ہندسہ۔ جانے دیجئے حضرت
جفت بنائیے جفت۔
چوتھی آواز۔ بیس۔
نیلام کرنے والا۔ خوب! خوب! ایک سو بیس۔ جناب آپ خوش
قسمت ہیں۔ ایک سو بیس گنی کی قلیل رقم اور یہ نادر روزگار تحفہ۔
ایک سلطنت کی بربادی کا مرثیہ۔ شاہی خاندان کی یادگار ــــ
شہزادے کے تاثرات ــــ جگر پارے ــــ انقلاب
زمانہ کی تصویر۔ بولئے بولئے۔ ختم کردوں ــــ لیڈیز اینڈ
جنٹلمین! ــــ جاتا ہے، تیر کمان سے نکل کر واپس نہیں
آسکتا ــــ بولئے ــــ
مسٹر ایکس۔ پچاس۔
نیلام کرنے والا۔ ایک سو پچاس ــــ مسٹر ایکس شکریہ ــــ
میں نے کہا تھا کہ آپ مذاق کر رہے تھے ــــ مگر آخر آپ
نے سنجیدگی سے اسے سوچا ــــ شکریہ ــــ بڑھئے۔
ایک سو پچاس ایک ــــ ایک سو پچاس ایک ــــ ایک
سو پچاس۔

(پردہ گرتا ہے)

(مختار)

شیر محمد اختر

غزل

سکندری کسے کہتے ہیں قیصری کیا ہے — ترے گدا کے لئے شرطِ سروری کیا ہے

بہ یک اشارۂ رنگیں جہاں ہو غرقِ شراب — میں جانتا ہوں ترا عزم کافری کیا ہے

اُبھر کے ڈوبنے والے تو لاکھ دیکھے ہیں — جو ڈوب کر نہ اُبھارے شناوری کیا ہے

تصوّرات میں ہر وقت بُت بناتا ہوں — مرے خیال کو یہ ذوقِ آذری کیا ہے

رسوخ شرط ہے وہ کفر ہو کہ ایماں ہو — جو اپنا دین نہ ہو خود وہ کافری کیا ہے

خلیل جس کا نتیجہ نہیں تو اے بُت گر — وہ بت گری ہے فقط کارِ آذری کیا ہے

قلندری ہے امارت کی آخری منزل — جو احمقوں پہ جچے وہ قلندری کیا ہے

جسے بھی دیکھ لیا آنکھ بھر کے شاد ہُوا — تری نظر کا اشارہ ہے قیصری کیا ہے

بجا ہے ماتمِ جذبات بھی مگر ساغر
شراب جس سے نہ برسے وہ شاعری کیا ہے

ساغر نظامی

مشاہدۂ غائب

موجودہ دور کی سب سے بڑی خصوصیت عقل و ہوش کی ارزانی ہے جس نے انسان کی قوت ایجاد و اختراع کے فروغ میں بڑی مدد دی ہے۔ آج سائنس کی حیرت انگیز ترقی کا راز بھی اسی میں مضمر ہے سائنس نے ہماری زندگی کے گوشہ گوشہ میں انقلاب پیدا کر دیا ہے۔ اس نے ہماری فطری ودیعتوں کو بے نقاب کرنے کی کوشش کی ہے ہمارے لئے نئی شاہراہیں کھولی ہیں اور وسائل زندگی میں یک گونہ اضافہ کر دیا ہے۔

یوں تو گذشتہ سالوں کی تمام سائنٹفک ایجادیں ہماری زندگیوں پر اثر انداز ہوئی ہیں۔ (مثلاً ہوائی جہاز، لاسلکی، ٹیلیفون وغیرہ) مگر پچھلے دنوں کی ایک ایجاد جو ٹیلی وژن یا مشاہدۂ غائب کے نام سے مشہور ہے، شاید ان سب سے زیادہ انقلاب آفریں ثابت ہو۔ غائب بینی کا سب سے پہلا مظاہرہ ۱۹۲۵ء میں اسکاٹلینڈ کے ایک نوجوان انجنیر بیرڈ (BAIRD) نے لندن کے ایک دارالتجربہ میں کیا۔ جس کو دیکھنے کے لئے "رائل انسٹی ٹیوشن" کے چالیس ممبروں کو دعوت دی گئی۔ جگہہ کی تنگی کی وجہ سے یہ چھ چھ آدمی جا کر دیکھتے تھے۔ ان لوگوں کو بھدی اور جھلملاتی ہوئی چند انسانی تصویریں دکھائی دیں جو لاسلکی کے ذریعے ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک بھیجی گئی تھیں۔ بیرڈ کا یہ طریقہ اگرچہ ابھی اتنا عام نہیں ہوا کہ وہ لاسلکی کی سی عمومیت حاصل کرلے لیکن پھر بھی اس سلسلہ میں کافی کام ہو چکا ہے اور بہت سے ممالک بیرڈ کے اصولوں پر اس چیز کو ترقی دے رہے ہیں۔ بہرکیف ابھی تجربہ کا دور جاری ہے اور اس کی ترقی کے بے شمار امکانات موجود ہیں۔

جب گراہم بل (Graham Bell) نے (جس کو پچاس سال سے بھی زیادہ زمانہ گذرا) ٹیلیفون ایجاد کیا تھا تو کسی مسخرے نے یہ بات کہی تھی کہ "اب ہم دور بیٹھے سن لیتے ہیں، کل کو ہم دور بیٹھے دیکھ بھی لیا کریں گے"۔ کسے معلوم تھا کہ یہ ہنسی کی بات اتنی سچی ثابت ہوگی۔ آج ہم لاسلکی کے ذریعہ دیکھ سکتے ہیں اور اس حقیقت سے انکار کی جرأت کسی کو نہیں ہو سکتی۔

غائب بینی "لاسلکی کے ذریعے دیکھنے" کو کہتے ہیں۔ لیکن یہ بات زیادہ صحیح نہیں۔ اصل میں یہ تلغرافی کے ذریعے دیکھنے کا نام ہے، اب چاہے وہ تار برقی کے ذریعہ ہو یا لاسلکی کے ذریعہ۔ مشاہدۂ غائب درحقیقت اس رویٔت برقی کو کہتے ہیں جو فی الفور کسی فاصلے پر دیکھی جا سکتی ہے اس کو نظاروں کی پیدائشِ نو سے بھی تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ اس کے ذریعہ ہم متحرک اشیا اور لوگوں کی ہوبہو نقل، رنگ و نور کے تمام لطیف فروق کے ساتھ دیکھ سکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تصویریں پردے پر بالکل ایسی ہی آتی ہیں جیسی کہ ہم انہیں اصلی طور پر دیکھتے ہیں البتہ اُن کا قدرتی رنگ نہیں آتا۔

مشاہدۂ غائب، برقی تصویر رسانی سے علیحدہ چیز ہے۔ موخرالذکر تار برقی یا لاسلکی کے ذریعے خاموش اور غیر متحرک تصویروں کے ارسال کرنے کا نام ہے۔ انہیں کی نقلیں ہیں جو عام طور پر اخباروں میں شائع ہوتی ہیں مشاہدۂ غائب اور فوٹو گرافی میں ایک خاص فرق ہے اور وہ یہ کہ اول الذکر کا تعلق جاندار اور متحرک اشیا سے ہے اور فوٹو گرافی مردہ اور غیر متحرک چیزوں سے وابستگی رکھتی ہے۔ اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

کہا جاتا ہے کہ یہ جدید آلہ ہماری "خلوت" میں مخل نہیں ہوتا یعنی اس آلہ کے ذریعے صرف وہی چیزیں سامنے آتی ہیں جو آلۂ ترسیل کے ماسکہ (Focus) کے مقابل ہوتی ہیں۔ یہی براڈکاسٹنگ میں بھی ہوتا ہے اس میں آپ صرف وہی سن سکتے ہیں جو بالکل "خردشنو" کے سامنے بولا جائے۔

انسان سالہا سال سے اپنی چشم عریاں کی بصیرت پر قناعت کئے ہوئے تھا، اس کے بعد اس نے خوردبین ایجاد کی جس سے اس کی نظر کی وسعت بڑھ گئی۔ لیکن اس سے حدود کی رکاوٹیں دور نہیں ہوئیں۔

اب اس نے "ٹیلی وژن" ایجاد کر کے اس دشواری کو بھی حل کر لیا ہے۔ اب اس سے ہم اتنے ہی فاصلہ کی چیز دیکھ سکیں گے جتنے فاصلہ کی سُن سکتے ہیں۔

براڈکاسٹنگ ہمارے صرف ذوقِ سامعہ کی آسودگی کر سکتا ہے۔ اس کے ذریعہ ہم تقریریں اور گانے سنتے ہیں لیکن تقریر کرنے والے کو نہیں دیکھ سکتے۔ اسی طرح ایک زمانہ میں "خاموش فلم" محض لطف مشاہدہ کے لئے تھا۔ اس میں ہم اداکاروں اور اُن سے متعلق تمام چیزوں کو دیکھ سکتے تھے۔ لیکن اُن کی زبان سے نکلا ہوا ایک بول بھی ہمارے کانوں تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔ آلہ غائب بین میں یہ خوبی ہے کہ اس کے ذریعہ ہم دیکھ بھی سکتے ہیں اور سن بھی سکتے ہیں۔ اسٹوڈیو یعنی نشر گاہ سے اداکاروں کی ہر اُس حرکت کا ہمیں احساس ہو سکتا ہے جسے ہم قوتِ باصرہ اور سامعہ کے ذریعے سے محسوس کرنے کے قابل ہوں اس طرح ٹیلی وژن صوت شعاعی کی ایجاد سے زیادہ دلآویز امکانات اپنے اندر پوشیدہ رکھتا ہے۔ وہ وقت بہت قریب آ رہا ہے جب ہم آرام کرسی پر لیٹے ہوئے سینما کے سے تمام مناظر، لوگوں کی تمام گفتگو اور اُن کی جملہ حرکتیں دیکھ اور سن سکیں گے۔ کوئی چار سال قبل مارکونی نے ایک تقریر میں کہا تھا کہ "مجھے یقین کامل ہے کہ مشاہدۂ غائب ایک حقیقت ہو کر رہے گا۔ اور اس کے آلہ کے ذریعہ ہم بہت دور دور تک مختلف مناظر ارسال کر سکیں گے۔" آج مارکونی کا یہ خیال بڑی حد تک عملی جامہ پہن چکا ہے۔ لاسلکی کے ذریعہ ہزاروں میل تقریر کا ارسال کرنا اب کوئی حیرت کی بات نہیں رہی۔ یہ روزانہ ہوتا ہے اور اب ہم اس کے عادی ہو گئے ہیں لیکن ابھی اس مقرر کا دیکھنا ضرور حیرت انگیز ہے جو ہم سے ہزاروں میل کے فاصلہ پر بول رہا ہے۔ لیکن اس میں بھی جزوی طور پر کامیابی ہو چکی ہے۔ ابھی ۱۷ دسمبر ۳۸ء کو برٹش براڈکاسٹنگ کمپنی نے الگزنڈرا پیلس سے جو پروگرام نشر کیا تھا وہ ایک سو اسی میل کے فاصلے پر سمندر کو عبور کر کے صاف دیکھا گیا۔ اسی طرح اس کا ۳ جنوری کا نشر کیا ہوا پروگرام لوگوں نے نیویارک میں مشاہدہ کیا۔ اس واقعہ نے اور بھی حسرت و مسرت کا ہیجان برپا کر دیا ہے۔

ٹیلیفون پر جب ہم گفتگو کرتے ہیں تو ہماری آواز بجلی کی لہریں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس کو تار برقی یا لاسلکی، برقی انعکاسات کی صورت میں بھیجتی ہے اور وہ آواز گیر میں جا کر پھر آواز کی صورت میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ مشاہدۂ غائب میں بھی اسی طرح کا عمل ہوتا ہے۔ جب ہم ٹیلی وژن کے آلہ ترسیل کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں تو چہرے سے روشنی منعکس ہو کر ایک ایسے خانہ پر اثر انداز ہوتی ہے جو روشنی کا اثر بہت جلد قبول کر لیتا ہے۔ یہ خانہ cell بہت سریع الاثر ہوتا ہے اس لئے یہ فوراً ایک برقی رَو نکالتا ہے۔ یہ رَو تار برقی یا لاسلکی کے ذریعہ آواز گیر یا مسمع تک بھیجی جاتی ہے۔ وہاں یہ رَو پھر روشنی میں تبدیل ہو جاتی ہے اسی روشنی سے اس ارسال کی ہوئی چیز کی تصویر پردے پر نمودار ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے۔

مشاہدۂ غائب میں سب سے زیادہ ضرورت اس کی ہے کہ یہ تصویریں بے حد تیز رفتاری اور تسلسل کے ساتھ آتی رہیں تاکہ وہ بالکل ایسے ہی دکھلائی جاسکیں جیسے کہ سینما کے پردے پر۔ یہ ان تصویروں کا قدرتی پن اور بے ساختگی ہے جو دلفریبی کا سامان پیدا کرتی ہے۔ لیکن اس چیز کا انحصار محض رویت کے استقلال پر ہے۔

یہ اندازہ کیا گیا ہے کہ جو کچھ ہم جانتے ہیں۔ اس میں سے تراسی فی صدی ہم مشاہدے کے ذریعہ اور سترہ فی صدی سامعہ کے ذریعہ حاصل کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم کے جدید طریقوں میں مشاہدہ اور بصری امدادوں کے ذریعے سکھلانے پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ سینما اس سلسلے میں بڑی مفید خدمت انجام دے سکتا ہے۔ خاص کر جغرافیہ اور تاریخ کے استادوں کے لئے وہ بڑی نعمت ہے۔

ذرا اس وقت کا تصور کیجئے جب آلہ غائب بین ہر حیثیت سے مکمل ہو جائے گا اور وہ لاسلکی کی طرح دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچ سکے گا۔ اس وقت وہ ہماری زندگی کے ہر ہر پہلو پر اثر انداز ہوگا، مکان و زمان کی قیود مٹ جائیں گی اور تعلیمی ترقی میں معتد بہ اضافہ ہو جائے گا۔ اس کے ذریعے تعلیمی فلم بہت آسانی سے نشر کئے جاسکیں گے اور فلموں کے تبادلے میں بھی بڑی سہولت ہو جائے گی۔ اس کے علاوہ تمام دنیا کی خبریں بھی اسی ذریعہ سے آن کی آن میں دیکھی اور سنی جاسکیں گی۔ اسکولوں کے استعمال کے لئے ایک "ٹیلی سینما" وضع ہو سکے گا۔ جس کے ذریعے تمام ایسے تعلیمی فلم دکھلائے جاسکیں گے جن کی اتنی کاپیاں تیار ہونا دشوار ہے کہ وہ ہر ہر اسکول میں تقسیم ہو سکیں۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اس کے بعد سینما کو کوئی پوچھے ہی گا نہیں۔ اس کی اعلیٰ تعلیم میں بدستور ضرورت باقی رہے گی اس لئے کہ اس کی ریل زیادہ مکمل ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ٹیلی وژن میں حادثے کا ہمیشہ امکان ہے

جس کا سینما میں اتنا اندیشہ نہیں ہے۔ آج کل لندن میں اس بات کی کوشش کی جارہی ہے کہ ہر سینما میں ٹیلی وژن کے پروگرام کا اضافہ کردیا جائے۔ اس طریقے سے ان دونوں کا رشتہ اور مضبوط ہو جائے گا۔

مشاہدۂ غائب کی ترقی یقیناً ہمارا روزمرہ کی زندگیوں پر بہت زیادہ اثر انداز ہوگی لیکن ابھی ہم اس کے تمام کمالات اور اثرات کا اندازہ شرح و بسط کے ساتھ نہیں لگا سکتے۔ اس لئے کہ اسے ابھی بہت سے ترقی کے زینوں سے گذرنا ہے۔ اس وقت تو ہمارے لئے صرف وہ تصور خوش آیند ہے جب ہم آرام کرسی پر بیٹھے بیٹھے آج کی تمام خبریں دیکھتے اور سنتے رہیں گے۔ افتتاح پارلیمان، ہٹلر کی تقریر، ہسپانیہ کی جنگ، گھوڑ دوڑ، بوٹ ریس، الغرض تمام چیزیں ہمارے سامنے ہوں گی۔ اب

گل دیدے وروئے تزا یاد کردمے

کے کہنے کی ضرورت نہ ہوگی بلکہ ہر چیز جو ہمیں محبوب اور پسند ہوگی وہ اپنی تمام رنگینیوں اور جلوہ سامانیوں کے ساتھ جنتِ نظر بھی ہوگی اور فردوسِ گوش بھی۔ پھر نگاہوں کے قریب اور دستِ شوق سے متصل۔ انسانی عقل و فراست کا اس سے زیادہ کیا عروج ہوسکتا ہے!

خواجہ احمد فاروقی

"ذہانت و عظمت اپنے آپ سے لاعلم رہتی ہیں۔

جونہی کسی انسان کو اپنی عظمت کا احساس شروع ہوتا ہے

اس کی عظمت کم ہونا شروع ہوجاتی ہے۔"
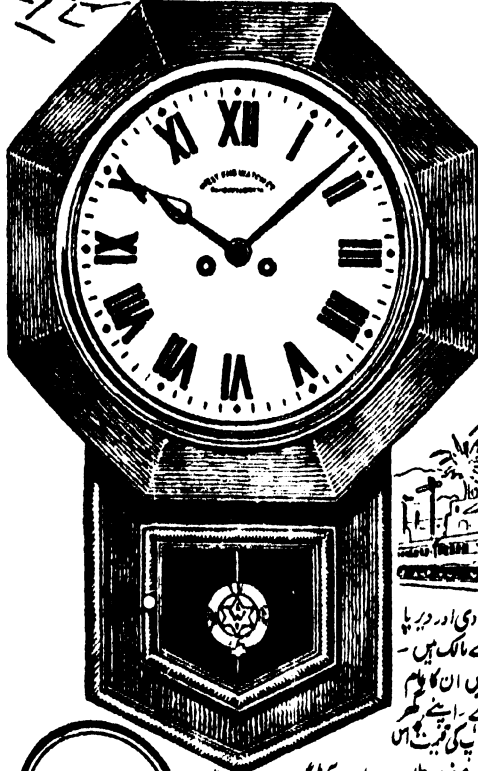
(ترجمہ)

ساقی

منزلِ مقصود

عزم و ہمت کا ہے اک سیلِ فراواں قلب میں!
حشر برپا کر رہے ہیں شوق و ارماں قلب میں
بجلیاں بے تاب ہیں طوفاں بہ طوفاں قلب میں
مضطرب جوشِ تمنا سے ہوا جاتا ہوں میں
منزلِ مقصود کی جانب بڑھا جاتا ہوں میں

ہر قدم پر شعلہ افگن آتشِ نمرود ہے!
محشرِ آفات ہر دم سامنے موجود ہے
اور مرے پیشِ نظر اک منزلِ مقصود ہے
دہر کے آلام ٹھکراتا چلا جاتا ہوں میں

یہ زمین و آسماں مجھ کو مٹا سکتے نہیں
جادۂ منزل سے ہرگز ورغلا سکتے نہیں
حادثوں کے دل شکن طوفاں ڈرا سکتے نہیں
آ، ایسے طوفانوں پہ طوفاں بن کے چھا جاتا ہوں میں

میری ہیبت سے جبال و کوہ سب رائی ہوئے
میرے نغمے وسعتِ افلاک تک گونجا کئے
میرے نغموں سے جوانوں میں ہیں پیدا ولولے
آگ بن کر روحِ فطرت میں سما جاتا ہوں میں!

خونِ دل سے سینچنا ہے گلشنِ برباد کو!
تازہ پھر کرنا ہے رودادِ کہن کی یاد کو
کوئی پہنچا دے مرا پیغام یہ، صیاد کو!
پھر فغاں پر آج سے مائل ہوا جاتا ہوں میں

ساغر جیلی

اندھا

وہ پیدائشی اندھا تھا ——— قوتِ بصارت سے محروم۔ اس نے غیر متوقع طور پر بینائی حاصل کر لی۔ ان دو بے نور آنکھوں میں یکایک روشنی پیدا ہو گئی مگر وہ اس کو بھی ایک مرض تصور کرتا تھا کیونکہ اسے پہلے کبھی اپنی آنکھوں سے گرد و پیش کی اشیا کو دیکھنے کا تجربہ نہ ہوا تھا۔

وہ چلتے چلتے رک گیا۔

"تمہیں کیا تکلیف ہے؟" لوگوں نے پوچھا اور بہت سے راہ چلتے جمع ہو گئے۔

"میں ابھی چند لمحات قبل اندھا تھا۔ مجھ کو کچھ نظر نہ آتا۔ اب نہ معلوم میری آنکھوں کو کیا ہو گیا۔ اندھیرے کے بجائے مجھے طرح طرح کے سائے نظر آتے ہیں جن سے مجھ کو ڈر لگتا ہے"! وہ کہنے لگا۔

"مگر تمہیں کیا دکھائی دیتا ہے"؟

"دکھائی"! اس نے بے صبری سے جواب دیا "مگر میں تو اندھا ہوں ——— پیدائشی اندھا"!

"مگر تم کو کیسے سائے نظر آتے ہیں"؟ سب نے پوچھا۔

اندھا ایک لمحہ کے لئے خاموش رہا اور اس کی نگاہیں اُس شخص پر جمی ہوئی تھیں جو مقابل میں تھا۔

"مجھ کو ایک متحرک سایہ جس میں سے آوازیں آتی ہیں دکھائی دیتا ہے۔ کیا یہ ہی انسان ہے! ..... اُف! مجھے کیا ہو گیا"!

"ہاں۔ میں انسان ہوں" مخاطب آدمی نے کہا "اور میرے آس پاس یہ اور انسان ہیں ——— کوئی مرد کوئی عورت۔ یہ اونچے اونچے سائے تمہارے دائیں بائیں عمارتیں ہیں جن میں ہم لوگ رہتے ہیں"۔

"مجھ کو چلتے ہوئے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ کہیں یہ مکانات میرے اوپر نہ آ پڑیں"!

"تم محفوظ ہو" لوگوں نے ہنس کر کہا "چند قدم ہمارے ساتھ چلو اور تم کو معلوم ہو جائے گا کہ تمہاری دلیل کس قدر غلط ہے۔ ہم انہیں میں پیدا ہوئے۔ انہیں میں پرورش پائی اور بہت سے ان میں ایسے بھی ہیں جن کو ہم نے ہی بنایا"!

"مگر میں ان سے بالکل ناآشنا ہوں ——— میں نے ان کو پہلے کبھی نہیں دیکھا"!

"نہیں دیکھا"! "مگر تم نے ان کو محسوس ضرور کیا ہو گا۔ ان میں سے کسی ایک میں تم بھی پیدا ہوئے تھے اور پرورش پائی۔ لیکن اب تم چلنے کی کوشش کرو"۔ انہوں نے اصرار کیا۔

"ہاں مجھے چلنے کی کوشش کرنی چاہئے"! اور اس نے اپنی عادت کے مطابق پیروں کو گھسیٹ کر چلنا شروع کیا۔

"نہیں۔ نہیں"۔ وہ سب چلائے "ایسے نہیں۔ تم کو اب ہماری طرح دکھائی دیتا ہے۔ تمہیں ہماری ہی طرح پاؤں اُٹھا کر چلنا چاہئے" گھسیٹنا نہیں"!

"میں گر پڑوں گا"!

"تو ہم سنبھال لیں گے"!

وہ متحیر نظروں سے ہر چہار جانب دیکھنے لگا۔

"وہ کیا ہے"! اس نے چند تیزی سے گذرنے والے گھوڑوں اور گاڑیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"یہ ٹریفک ہے۔ تم کو اس سے بچ کر چلنا چاہئے۔ اچھی خاصی آنکھوں والے آدمی بھی اس کی تیزی سے گھبراتے ہیں"۔

"اس سے تو میں اندھا ہی اچھا تھا" وہ کہنے لگا "میں اس حالت میں بھی خوش تھا"!

"یہ بزدلی ہے۔ تمہاری بصارت بھی تمہارے لئے باعث مسرت ہو گی"

"میں دیکھنا نہیں چاہتا! اس عمر میں یہ نئی نئی باتیں کس طرح سیکھ سکوں گا"!

اب یہ تمہارے بس کی بات نہیں۔ تم کو بخوبی دکھائی دیتا ہے۔

اور نہیں دیکھے رہنا چاہیئے۔
"مگر دیکھنے سے مجھے ڈر جو لگتا ہے"!
وہ اس کو ایک خاموش سنسان جگہ لے گئے "تاکہ دیکھنے کا عادی ہو جائے۔
"اب دیکھو۔ اپنی گرد و پیش کی چیزوں پر نظر ڈالو"۔
"یہ کیا ہے! ۔۔۔ میرے پیروں کے نیچے" اندھے نے پوچھا۔
"یہ گھاس ہے ۔۔۔ ہری گھاس" انہوں نے جواب دیا۔
"ہری کیا ہوتی ہے؟"
"ایک رنگ ہے"۔
"اور وہ؟" اس نے صنوبر کے درخت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دریافت کیا۔ انہوں نے اس کو بتایا۔
"اس کا کیا رنگ ہے؟"
"یہ بھی ہرا ہے"۔
"مگر یہ دونوں ایک جیسے نہیں"۔ اس نے گھاس کی چند پتیاں اٹھاتے ہوئے کہا۔ "آپ لوگ میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ میں اندھا ہوں۔ مجھ کو آج تک کبھی دکھائی نہیں دیا۔ آپ کیوں مجھے بناتے ہیں؟"
"گھاس اور صنوبر یک رنگ ہیں ۔۔۔ ایک ہی رنگ کی دو مختلف اقسام، ایک گہرا اور دوسرا ہلکا اور اس سے گہرا بھی ہو سکتا ہے اور ہلکا بھی۔ نئی کونپلیں بھی ہری ہوتی ہیں اور موسم خزاں کی گری ہوئی پتیاں بھی ہری"۔ غرضکہ انہوں نے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "ہرے رنگ کی ہزاروں قسمیں ہوتی ہیں"۔
"کیا دنیا کی تمام چیزوں میں یہی اختلاف ہے؟"
"ہاں" انہوں نے جواب دیا۔
"پھر تو یقیناً میرے لئے اندھا ہی رہنا بہتر ہوتا۔ میں دنیا کو دیکھ کر ان سب باتوں کو کیسے سمجھ سکوں گا۔ جب میں ہرے رنگوں کی اقسام سے واقفیت حاصل کر لوں گا تو پھر نیلے اور سرخ رنگ کے متعلق معلومات بہم پہنچانی پڑیں گی۔ جب میں صنوبر سے آشنا ہو جاؤں گا تو شاہ بلوط۔ بید اور دیگر اشجار کی بابت تعلیم حاصل کرنی ہوگی اور اب میں یہ سب باتیں جاننے کے لئے بہت معمر ہو چکا ہوں۔ میں بینائی نہیں چاہتا۔ میں اندھا ہی خوش تھا۔ بے خوف و خطر چل پھر سکتا تھا۔ میری لاٹھی مجھے راہ دکھانے میں مدد دیتی تھی"۔

وہ اس کو تنہا چھوڑ کر چلے گئے اور کہہ گئے کہ اس کو چلنے کی مشق خود کرنی چاہیئے۔ تاکہ وہ ان کو روزمرہ کے کام میں مدد دے سکے۔ اُس نے التجا کی کہ وہ اس کو چھوڑ کر نہ جائیں مگر وہ مصروفیت کا بہانا کر کے چلتے بنے۔
"میں کبھی ان کو مدد دینے کے قابل نہیں ہو سکتا۔ میرا ڈر کبھی دور نہیں ہوگا"۔ اس نے سوچا۔
سب کے جانے کے بعد اس کو چاروں طرف ناامیدی ہی ناامیدی نظر آتی تھی آسمان کی سطح پر متضاد رنگوں کے تیرتے ہوئے بادل ایسے معلوم ہوتا تھا کہ گر کر اس کو کچل دیں گے۔ وہ بہت دیر تک بیٹھا رہا۔ "مجھے چلنے کی کوشش کرنی چاہیئے"۔ وہ اٹھا اور ڈرتے ڈرتے قدم رکھے۔ لڑکھڑایا۔ سنبھلا اور پھر چلا "میں چل سکتا ہوں"۔ وہ پھر تیزی سے چلا اور گر پڑا۔ "مجھے معلوم تھا" اس نے حسرتناک آواز میں کہا ۔ "مجھے اب دوڑنا چاہیئے"۔ وہ دوڑا لیکن اس قدر تیزی سے کہ خود کو نہ روک سکا اور ایک جھاڑی سے الجھ گیا اور کانٹوں سے زخمی ہو گیا۔ "میں چلوں گا" اس نے کہا "مگر دوڑوں گا نہیں"۔!
عرصہ گذر گیا۔ اس نے چلنا۔ دوڑنا۔ کودنا اور اچھلنا سیکھ لیا اس کے بعد وہ شہر کی اس سڑک پر آیا۔ جہاں اس کی بینائی واپس آئی تھی اب اس کو کوئی خطرہ نہ تھا اور آسانی سے چل پھر سکتا تھا۔
"بینائی اور اندھے پن میں فرق ہی کیا ہے؟" وہ آخرکار کہنے لگا۔

(رسینٹ جان جی اَرِون)

منیب الرحمٰن

شعر

سازِ بسیج آمادہ ہے سب قافلے کی تیاری ہے
مجنوں ہم سے آگے گیا ہے اب کے ہماری باری ہے

میر تقی

غزل

جب سے وہ جانِ التفات نہیں
اپنی راتوں میں چاند رات نہیں

یہ مصائب یہ حادثات نہیں
اضطراب۔ اس کو بھی ثبات نہیں

آج تک دل پہ ہات رکھا ہے
وہ نظرہ بھولنے کی بات نہیں

ہائے یہ بے بسی کہ کہتا ہوں
کیا حیاتِ الم حیات نہیں

آنسوؤں میں جھلک رہی ہے اُمید
ضبطِ غم، سوچنے کی بات نہیں

اک حسیں نیند اک سُہانا خواب
اب وہ نوعیّتِ حیات نہیں

مانتا ہوں سکوں محال۔ مگر
اُس کے نزدیک کوئی بات نہیں

میری دُنیا کا حال کیا جانیں
جن کی دُنیا میں دن ہے رات نہیں

اے سَحَر اس قدر ہراس نہ ہو
مستقل نظمِ کائنات نہیں

سحر رام پوری

سامنے کی دیوار

وہ ایک بے رونق سی گلی کے آخری مکان میں رہتی تھیں ۔ ایک بوڑھی دادی ایک نوجوان لڑکی اور اس کی ماں۔ دوشیزہ نے ابھی الھڑپنے کی بہاریں ہی دیکھی تھیں کہ انہیں حادثات زمانہ یا بدنصیبی نے اس دیران سے مکان میں لا پھینکا۔ کبھی ان کی زندگی بھی خوشیوں سے بھری ہوئی تھی ـــــ عزت و ثروت ان کے گھر کی لونڈیاں ہوا کرتی تھیں مگر اب گردش ایام نے انہیں ایک کھنڈر سی کیفیت والے مکان میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا تھا۔ مکان کا وہ حصہ جو گلی کے سامنے اور بہتر حالت میں تھا کرائے پر دے دیا گیا۔ نئے کرایہ داروں نے پرانے اور مانوس ماحول کو بدل ڈالا اور چند نہ بھولنے والی یادوں کو مٹا دیا۔

سرکاری نیلام نے اگلے زمانے کے شاندار سامان آرائش سے انہیں بچھڑنے پر آمادہ کر دیا او۔ ان بے چاری گوشہ گزینوں نے اٹاری میں پھینکے ہوئے بوسیدہ سامان سے گرد کو جھاڑ کر اس کنج عزلت کی زینت بنا لیا۔ کچھ عرصہ کے بعد انہیں اس ویران مکان اور اس کی پرانی اور بوسیدہ اشیا سے محبت ہو گئی۔ وہ اپنی حسرتوں کو بہلانا سیکھ چکی تھیں۔ انتہائے یاس سے قانع ہو کر اب وہ اطمینان سے زندگی بسر کرتی تھیں۔ جاڑے کے موسم میں اسی ایک چولھے کی آگ اور طاق پر رکھے ہوئے لیمپ کے شعلوں میں اپنے خیالات کو بھڑکتے ہوئے دیکھنا ان کی عادت بن چکی تھی۔ وہاں اس گھر میں ایک ملال آمیز اطمینان چھایا رہتا تھا اور وہ یوں محسوس کرتی تھیں گویا وہ اسی سکون پرور تنہائی میں ہمیشہ سے رہتی ہیں۔

کمرے کی کھڑکیوں میں معمولی ململ کے پردے لگے ہوئے تھے۔ وہ کھڑکیاں سامنے کے روشن صحن میں کھلتی تھیں جس کی دیواروں پر یاسمین کی بیلیں گلاب کے پھولوں سے الجھی رہتی تھیں۔

وہ اپنے گذرے ہوئے زمانے کی شان و شوکت۔ عزت و ثروت اور مسرت کو بھولنا ہی چاہتی تھیں بلکہ بھول چکی تھیں کہ معاً ایک دن ایسی منحوس خبر ان کے کانوں تک پہنچی کہ وہ مدت تک غمزدہ اور بے قرار رہیں۔ اُن کے ایک پڑوسی نے اپنے مکان کو تین منزلوں تک بلند کرنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ اب ان کی کھڑکیوں کے سامنے جہاں سے وہ افق کے رنگوں میں گذرے ہوئے زمانے کی یادوں کو محو کر کے اک تسکین حاصل کیا کرتی تھیں اور جن سے سورج کی شفاف اور سیمیں کرنیں اندر بہہ کر ان کے ظلمت کدے کو بقعۂ نور بنایا کرتی تھیں اور جہاں سے کہیں دور سے آنے والی معطر ہوائیں ان کے پژمردہ دلوں کو طراوت بخشتی تھیں اب ان کے سامنے ایک دیوار حائل ہونے والی تھی ـــــ اُن کے پاس کوئی ایسا ذریعہ نہ تھا جس سے وہ اس مصیبت کو ٹال سکیں۔ یہ ایک ایسا روحانی صدمہ تھا جو گذشتہ تمام مصائب سے زیادہ مہیب اور شدید تھا۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کی نگاہوں کو یاسمین کی بیل اور افق کے رنگوں سے محروم کر دیا جائے۔ ان کو آفتاب کی روشنی اور ہوا کے لئے ترسانا فطرت کی زبردست ستم ظریفی تھی جس کو وہ برداشت نہ کر سکتی تھیں۔ اپنے پڑوسی کے مکان کو خریدنا کبھی آسان تھا لیکن اب ناممکن۔ آخر معذوری نے صبر و شکر کی صورت اختیار کر لی۔

اب منزلوں کی تعمیر شروع ہو گئی مگر بلندی کی طرف جانے والی ہر اینٹ سے اُن کے دل میں ایک چبھن سی پیدا ہوتی اور وہ ایک دھچکا سا محسوس کرتی تھیں۔ وہ نہایت ہی مایوسی اور اضطراب سے بڑھتی ہوئی دیوار کی طرف دیکھتی تھیں اور ان پر ہر وقت خاموش سی افسردگی چھائی رہتی اور اس بات کا خیال کہ یہ ٹھوس دیوار تھوڑے ہی دنوں میں انہیں یاسمین کی بیل اور افق کے رنگوں اور بادلوں سے ہمیشہ کے لئے جدا کر دے گی اُن کے دل و دماغ کے سکون کو برہم کرتا رہا۔

وہ دیوار مکمل ہوگئی۔ ایک ٹھوس۔ نہ ہٹنے والی۔ بے حس وحرکت اور ہیبت ناک دیوار۔ اس کے تاریک اور سرد سائے میں پلنے سے پھولوں پر وہ پہلے سا رنگ روپ نہ آتا تھا۔ بیلیں بھی زرد سی رہتیں۔ کھڑکیوں سے اب بھی سیمیں کرنیں اندر آتیں۔ مگر اُن کے پژمردہ دلوں میں حرارت نہ پیدا کرسکتیں۔ صبح کو سورج نکلنے کے بہت دیر بعد کہیں سے سہمی ہوئی آ جاتیں اور شام کو رات سے قبل ہی ڈر کر روپوش ہو جاتیں اور یوں اُن کی دنیا۔ عام دنیا سے ایک گھنٹہ پہلے ہی تاریک ہو جاتی وہاں ایک بھیانک اور روح فرسا افسردگی چھا جاتی۔

وقت گذرتا گیا۔ لمحے اور مہینے گذرے۔ سال گذر گئے ——

صبح کو دیر سے آنے والی روشنی اور شب کو جلد آنے والی تاریکی میں وہ سلائی یا کشیدے کے کام سے سر اٹھاتیں تو ایک سرد آہ بھر کر خاموش ہو جاتیں اور جب شام کا دیا جلانے کی فکر دامنگیر ہوتی تو وہ دوشیزہ اٹھتی اور انگڑائی لیتی اور پھر حسرت سے اس دیوار کی طرف تکتی جو شفق کی گلگونی اور اس کی نگاہوں کے درمیان حائل تھی۔ شفق کی رنگینیاں اکثر اُس کی حسرتوں کو امیدوں میں تبدیل کردیا کرتی تھیں۔ مگر اب یاس کے سوا کچھ بھی باقی نہ تھا۔ وہ اپنے آپ کو ایک قیدی تصور کرتی اور جھروکوں میں سے در و دیوار پر اُلجھے ہوئے زرد زرد پھولوں کو دیکھتی اور اُن میں اپنے شباب کی افسردگی کو ڈھونڈتی اور کبھی اُس دیوار کو ایک آسمان تصور کرتی جو اُس کی نگاہوں کے بہت قریب آگیا تھا۔ پھر اُس پر خواب آلود مستی بھرے بادلوں کی دنیا آباد کرتی اور اپنے سنہری خیالات کی مخمور کیفیتوں میں کھو جاتی۔

وہ اکثر جب آگ کے پاس بیٹھتیں یا لیمپ کی روشنی کے نیچے اکٹھی ہوتیں تو ایک ورثہ کا ذکر کیا کرتیں۔ جیسے خواب یا پریوں کی کہانی سنائی جاتی ہے۔ وہ سوچا کرتیں کہ جب ہمیں ورثے کا روپیہ مل جائے گا تو ہم پڑوسی کا مکان خرید کر دیوار کو منہدم کر کے وہی پرانی تسکین پرور اشیا کی صورت اور ماحول واپس لے آئیں گی۔ پھر وہی یاسمین کی بیل ہوگی اور افق کے مختلف رنگ پھر وہی پرانے وقتوں کی تھرتھراتی ہوئی کرنیں خون میں حرارت پیدا کریں گی۔ اب اُس دیوار کو جو مرگ مسلسل کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ گرا دینا ہی ان کی زندگی کا واحد مقصد تھا۔ بڑھیا دادی کی تو یہ آخری خواہش تھی کہ خدا اُسے وہ خوشیوں بھرا دن دکھانے کے لئے زندہ رکھے جبکہ اُس کی نگاہیں صحن کی وسعت میں گم ہوں گی لیکن اس کے آنے میں غیر معمولی دیر ہوئی —— اُس ورثہ کے جو اُن کی آخری اُمید تھا۔ کئی بار بادل چھائے اور برس کر چلے گئے۔ سورج کئی بار اُس دیوار کے پیچھے افق کے نیلگوں سائے میں سوگیا۔ دیوار پر پانی اور روغن کی غلیظ سیاہی پھڑپھڑاتے ہوئے پرندوں کے پروں کی طرح پھیل گئی اور وہ جوانی کے آخری لمحے کاٹنے والی بدنصیب لڑکی۔ یہ سب کچھ دیکھتی رہی اور دیکھتی رہی ہر روز —— ہر روز ایک بہار کے پُرشباب موسم میں جبکہ گلاب کے پھول دیوار کے طویل سائے کے باوجود اپنی خوبصورتی پر اترا رہے تھے۔ صبح کے وقت ایک نوجوان دیوار کے پاس نمودار ہوا۔ کچھ دن وہ ان تنہا عورتوں کے پاس آتا رہا۔ لوگوں نے اُس کے خوبصورت اور شادی کا خواہشمند ہونے کے بارے میں باتیں کیں۔ مگر وہ اس آنے والی میراث کا انتظار کچھ زیادہ دیر تک نہ کرسکا۔ لڑکی کی مفلسی نے اُسے بیزار کردیا اور اُس نے محسوس کیا کہ لڑکی کی جوانی ڈھل چکی ہے اور اس کی ازدواجی زندگی کو ایک مفلس اور ادھیڑ عورت خوشگوار نہیں بنا سکتی۔ وہ چلا گیا اور پھر کبھی نہ آیا۔ وہ کچھ دن اُسی مکان میں مجسمۂ زندگی۔ شباب اور نور بن کر رہا تھا۔ لڑکی نے چند دن اچھوتے خوابوں کے دیکھے تھے اور اُسے اپنا ہونے والا خاوند تصور کیا تھا۔ اس کے چلے جانے کے بعد اک خاموش۔ پراسرار۔ موت سی پژمردگی چھا گئی۔

وقت اداسی میں گذرتا گیا۔ خاموشی سے بہتے ہوئے دریاؤں کی طرح —— پانچ سال گذر گئے —— دس بھی گذرے۔ پندرہ اور پھر بیس بھی ختم ہوگئے۔ اس مفلس لڑکی کی جوانی ڈھلتے ڈھلتے بالکل ہی ڈھل گئی —— ماں کے بالوں کی سیاہی میں سفیدی آگئی اور دادی کا سفید سر باتیں کرتے وقت ہلنے لگا۔ وہ ہمیشہ ایک ہی جگہہ پر پڑی بیٹھی رہتی۔

اُس سنگ دل بے مہر دیوار کو دیکھتے دیکھتے وہ عمر رسیدہ ہوگئی۔

یاسمین کی بیلیں اور گلاب کی جھاڑیاں بھی معمر نظر آنے لگیں۔ "میری بچیو۔ میری مفلس اور نادار بچیو!" دادی اکثر بڑبڑاتی "کاش! میں بھی زندہ رہتی اور دیکھتی!" مگر اب اُس میں فقرہ مکمل کرنے کی بھی سکت باقی نہ تھی۔ تاہم وہ ہڈیوں کے ایک پنجے سے دیوار کی طرف اشارہ کرتی۔ اُسے مرے ہوئے بارہ مہینے گذر چکے تھے اُس کے چلے جانے سے اُس گھر کی فضا میں اک خلا پیدا ہوگئی تھی۔ اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ کوئی چیز ہونے کے باوجود نہیں ہے۔ آخر ایک دن جبکہ وہ اُس ورثہ کے

متعلق سوچنا بھی بھول بیٹھی تھیں ـــــ وہ ورثہ مل گیا۔ وہ لڑکی جو اب چالیس برس کی بوڑھی عورت بن چکی تھی اپنے آپ کو پھر سے جوان محسوس کرنے لگی ـــــ انہوں نے کرایہ داروں کو نکال دیا ـــــ پھر وہی پرانا سامان اور اشیا مہیا کرلیں۔ ہر چیز کو اس کی پہلی وضع میں تبدیل کر دیا ـــــ مگر خود کنج تنہائی کو چھوڑنا پسند نہ کیا۔ اب وہ اس کھنڈر سی کیفیت والے مکان سے مانوس ہو چکی تھیں۔ دیوار کے گرا دینے کے احساس سے ہی اُن کے دلوں اور مکان میں زیادہ روشنی نظر آنے لگی تھی۔ اب تو اُس کا گرا دینا بہت ہی آسان تھا۔ اُس بوسیدہ دیوار کا جو صرف ایک ٹھوکر لگنے کی منتظر تھی۔ آخر ایک دن وہ گرا دی گئی۔ وہ وہ دیوار جو بیس سال تک ایک مرگ مسلسل بنی رہی تھی۔ یہ کام پرانی اینٹوں کے گرد و غبار اور مزدوروں کے شور و غل میں جلد ہی مکمل ہو گیا اگلی صبح جب کام ختم ہو چکا تھا۔ اور مزدور جا چکے تھے۔ خاموشی واپس آ گئی۔ انہیں پھر وہی عہد رفتہ کی جانفزا روشنی نصیب ہوئی۔ وہ حیران تھیں۔ ماں اور لڑکی دونوں۔ کہ اب شام کا کھانا تیار کرنے کے لئے دیے کی روشنی کی بھی ضرورت نہ تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ پرانے دن پھر لوٹ آئے ہیں۔ انہوں نے یاسمین کی بیل اور گلاب کے پھول کو افق کے رنگوں کی مدھم روشنی میں سوتے ہوئے دیکھا مگر ان تمام چیزوں کے میسر آنے کے باوجود بھی خوشی کی بجائے وہ مضطرب سی رہنے لگیں۔ تاریک کمروں میں صبح ہوتے ہی یک لخت اتنی زیادہ روشنی کا آ جانا انہیں کچھ غیر مانوس اور اجنبی سا نظر آنے لگا۔

وہ یوں محسوس کرتی تھیں کہ اب وہ مکان میں نہیں بلکہ صحن میں رہتی ہیں۔ ان کے لئے یہ انقلاب کچھ خوشگوار نہ تھا۔ اپنے خواب کی تعبیر کے بعد اب وہ اضطراب کے باعث کو سمجھنے سے قاصر تھیں ان کی افسردگی بڑھتی گئی۔ اب وہ اکثر چپ سی رہتی تھیں۔ کھانے سے بھی انہوں نے بے نیازی اختیار کرلی اور آہستہ آہستہ ایک نامعلوم سے غم ـــــ پشیمانی اور ناامیدی نے اُن دو دلوں پر تسلط جما لیا۔ جب ماں نے محسوس کیا کہ لڑکی کی آنکھیں اکثر روتے رہنے سے سوجی رہتی ہیں اور دونوں کے دلوں میں اس تعبیر کا یکساں احساس ہے تو وہ بولی "کہتے ہیں کہ وہ پھر ویسی دیوار بنا سکتے ہیں"۔ "ہاں میرا بھی یہی خیال تھا۔ مگر اب ویسی بوسیدہ اجڑی ہوئی دیوار جس پر پانی اور روغن کی غلیظ سیاہی پھڑپھڑاتے ہوئے پرندوں کے پروں کی طرح پھیلی ہوئی ہو کیونکر بنائی جا سکتی ہے۔ اب وہ کبھی بھی پہلے کی طرح نہیں بنائی جا سکتی"

وہ کئی بار سوچتی کہ کیا میں نے ہی ایک رنگین اور دلآویز خواب کے پس منظر کو تباہ کیا ہے۔ جہاں بہار کے ایک موسم میں کوئی آیا تھا۔ وہی ایک جو میرے لئے اب چند دھندلے دھندلے نقوش دل کی چند پرکیف دھڑکنوں اور ہاتھوں۔ شانوں اور کمر پر ایک لطیف دباؤ اور دل اور سینے کی چند مبہم سی لرزشوں کے سوا کچھ نہیں رہا ـــــ جس قدر یہ نقوش منتشر اور مبہم ہوتے جاتے ہیں۔ شاید میرے دل میں اُس کے متعلق احساس اسی قدر گہرا اور مضبوط ہوتا چلا جاتا ہے"۔ اس کا دل غم کے بوجھ سے شکستہ ہو گیا۔ وہ دیوار کے ناقابل ترمیم انہدام پر پھوٹ پھوٹ کر روئی اِش بدیہ اُس کی زندگی کے سب سے زیادہ اندوہ فزا اور تڑپانے والے آنسو تھے۔

(ہیری لوتی)

مجید لشاری

فلسفۂ محبّت

محبت خود پرستی ہے محبت ہے خود آرائی
محبّت خود تمنّا ہے محبّت خود تمنّائی

محبت دردمندوں کے لبوں پر آہ بھرتی ہے
محبت حُسن کی بے دردیوں میں رقص کرتی ہے

محبت سانس لیتی ہے سُریلے آبشاروں میں
محبت زندگی کے گیت گاتی ہے بہاروں میں

کہیں رقصاں نگاہوں میں ستاروں سے چمک لے کر
کہیں جولاں دماغوں میں گلستاں سے مہک لے کر

محبت بے نیازی ہے کہیں کافر حسینوں کی
کہیں سجدوں کے ہنگاموں میں بیتابی جبینوں کی

کہیں فریاد کی زحمت کہیں ایذائے خودداری
کہیں پندارِ دل سوزی کہیں نازِ دل آزاری

محبت دوڑتی ہے دل میں خونِ آرزو بن کر
تلاشِ حُسن میں رنگِ فریبِ جُستجو بن کر

محبت ایک لمحہ بھی ہے، عمرِ جاودانی بھی
محبت ایک نغمہ بھی ہے، نغمہ کی جوانی بھی

کہیں اک زندگی ایسی اجل انجام ہے جس کا
کہیں اک موت ایسی زندگانی نام ہے جس کا

محبت آپ اپنی شان کی تصدیق کرتی ہے
محبت حُسن ہے اور حُسن کی تخلیق کرتی ہے

محبت کی بدولت ہے دو عالم کا یہ ہنگامہ
کبھی درماں کا پیکر ہے کبھی ہے درد کا جامہ

رعنا اکبرآبادی

غزل

مآلِ عشق سے واقف مری حیات نہ تھی
یہ آنکھ محرمِ اسرارِ حادثات نہ تھی

بہت حسین ہیں ایامِ عنفوانِ شباب
طفولیت میں تو ایسی یہ کائنات نہ تھی

مجھے شباب نے ذوقِ گنہ دیا ورنہ
میں پاکباز تھا دل میں ہوس کی بات نہ تھی

ملی تھی موت کے ساغر میں زندگی کی شراب
جسے حیات میں سمجھا تھا وہ حیات نہ تھی

خدائے عشق سے کچھ اور مانگتا تھا میں
مری نظر میں یہ دنیائے بے ثبات نہ تھی

جسے جہان میں دیکھا الم زدہ دیکھا
کسی بشر کو غمِ دہر سے نجات نہ تھی

تو میرے پاس تھا لیکن میں تجھ سے دور رہا
یہ ایک رازِ نہاں تھا خرد کی بات نہ تھی

طفیلؔ

دنیائے ادب

مثنوی زہرِ عشق

مثنوی زہرِ عشق اردو ادب کی یقیناً سب سے زیادہ مشہور مثنوی ہے۔ حکومتوں سے ادبی خدمت کا قصور بہت کم ہوا کرتا ہے مگر اس مثنوی کی شہرت کو ایک حد تک حکومت کا احسان ماننا چاہیے جس نے ایک زمانے میں اس کتاب کے چھپنے کو روک کر حضرتِ آدم کے سپوتوں کو باغِ ادب کے ایک ثمرِ ممنوعہ کی طرف خاص طور سے متوجہ کر دیا۔ ایک بار متوجہ ہو جانے کے بعد خود مثنوی کی خوبیاں ہی ہیں کہ ان کے نقش دلوں سے آسانی سے نہ مٹ سکے۔

یہ چھوٹی سی مثنوی تقریباً پانسو اشعار پر ختم ہو جاتی ہے۔ پلاٹ میں کوئی انوکھی بات نہیں۔ ایک طبیعت دار حسین نوجوان لڑکی جس کا نام مہ جبیں سمجھ لیجئے اپنے کوٹھے پر برسات کے موسم میں آسمان کی بہار کا لطف اٹھانے آتی ہے اور اس کی آنکھ محلہ کے ایک خوش باش نوجوان کی طرف اُٹھ جاتی ہے۔ مہ جبیں پہلی ہی نگاہ پر اپنا دل صدقے کر دیتی ہے کچھ دن تک دور دور کی نظارہ بازی محبت میں مضبوطی اور جذبات میں جوش پیدا کرنے کا کام دیتی ہے۔ یہاں تک کہ اپنے دماغ اور اپنی خودداری کو عشق کے سپرد کر کے مہ جبیں ماما کے ذریعے سے پیغام و سلام کا سلسلہ شروع کر دیتی ہے۔ صاحبزادے جو خود بھی نوجوان تھے۔ اور مہ جبیں کے حسن کا داغ دل پر کھا چکے تھے۔ منہ مانگی مراد پاتے ہیں۔ اور چھوٹتے ہی پہلے خط کے جواب میں بے باکی کے ساتھ جو دل میں آتا ہے کہہ ڈالتے ہیں۔ اس خط کو دیکھ کر عورت کی فطرت اور دل کی بے تابی میں ایک آخری کشمکش پیدا ہوتی ہے جو دو چار خطوں کے حیلے حوالے کے بعد ہمیشہ کے لئے ختم ہو جاتی ہے۔ عشق جیسا کہ ہمیشہ ہوتا آیا ہے فتح پا جاتا ہے۔ چوری چھپے کی ملاقات شروع ہوتی ہے۔ جس کا چند ہی دن میں بھانڈا پھوٹتا ہے۔ بدنامی کی بھنک مہ جبیں کے والدین کے کانوں میں پڑتی ہے جو مہ جبیں کو لعنت ملامت کرتے ہیں اور طے کرتے ہیں کہ اسے کسی دوسرے شہر بھیج دیا جائے۔ کچھ دنوں نظارہ بازی تک کا سلسلہ بند رہتا ہے۔ جس کی وجہ سے مہ جبیں کی بے تابی اپنی حد کو پہنچ جاتی ہے۔ جب جدائی کی تاریخ سر پر آ جاتی ہے اور محبوب کا شہر چھوڑ دینے کا وقت قریب آ جاتا ہے تو مہ جبیں موقع نکال کر اپنے محبوب سے آخری بار مل کر رخصت ہوتی ہے اور صبح اپنے مکان پر جا کر جان دے دیتی ہے۔

میں عرض کر چکا ہوں کہ پلاٹ میں کوئی انوکھی بات نہیں۔ قصہ بھی کوئی نیا نہیں۔ اسی قدر پرانا ہے جس قدر کہ خود نسلِ انسانی کی تاریخ پرانی ہے۔

یہی قصہ اکثر کے ہاتھوں میں پہنچ کر ایک بے اثر سا افسانہ ہو کر رہ جاتا یا جس زمانے میں یہ مثنوی لکھی گئی ہے اور جس فضا میں لکھی گئی ہے اس زمانہ اور اس فضا کے پرورش پائے ہوئے دوسرے لوگوں کے ہاتھ میں پڑ جاتا تو غالباً عریانی کی ایک بھونڈی تصویر ہو جاتا۔

نواب مرزا شوق، واجد علی شاہ کے دربار کے طبیب تھے۔ شاہی مزاج میں ان کا خاص دخل تھا جو اس بات کا پتہ دیتا ہے کہ ان میں بھی وہ تمام باتیں موجود ہوں گی جن کی ایسے دربار کے مصاحب کو ضرورت ہوا کرتی ہے پھر وہ فن کی کیا خوبیاں ہیں جن کی بدولت شوق کے ہاتھوں میں یہی قصہ ایک خاصہ ادبی کارنامہ بن گیا۔

پہلی بات تو یہ ہے کہ قدرت نے شوق کی فطرت خالص شاعروں کی سی بنائی تھی۔ ان میں ایک شاعر کی طرح یہ صلاحیت موجود تھی کہ وہ واقعات اور معاملات سے ایسا کچھ حاصل کر سکیں جو عام طور سے دوسروں کو نصیب نہ ہو سکے اور جو کچھ حاصل کر لیں ایسے انداز سے دوسروں تک

پہنچا سکیں کہ بات سننے والوں کے دل کی گہرائی میں اتر کر پتھر کی لکیر بن جائے۔

شوق کے ایک ذمہ دار عزیز کا بیان چھپ چکا ہے کہ یہ قصہ ایک اصل کی نقل ہے آپ دیکھیں کہ اس نقل میں شوق نے اصل سے کس قیامت کا اثر لیا ہے اور کس قدر کامیابی کے ساتھ اس اثر کو سننے والوں کی رگ رگ میں دوڑا دیا ہے۔

مثنوی میں پڑھ کر خودکشی کر لینے کے سب واقعات ٹھیک نہ سہی مگر قرین قیاس ضرور ہیں۔ آخری ملاقات اور وصیت کے موقعہ کے شعر سب کے سب نقل نہیں کئے جا سکتے اور یہ میرا جی نہیں چاہتا کہ میں اس موتی کی لڑی کو توڑ کر اس کے دانے بکھرا دوں اور کہیں کہیں سے دو ایک شعر پیش کروں۔ یہ اشعار پڑھنے والوں کے دل میں بلا کا طوفان پیدا کر دیتے ہیں۔ آپ خودکشی نہ کر بیٹھیں۔ مگر دنیا اور اس کی دو روزہ زندگی آپ کی نگاہ میں بے وقعت ضرور ٹھہر جاتی ہے اور مہ جبیں کی کسوٹی پر محبت کی قدر اس قدر بڑھ جاتی ہے کہ بلا سوچے سمجھے حاصل عمر اور خود عمر کو راہ یار میں نثار کر دینے کے لئے آپ اپنے کو مستعد پاتے ہیں۔

دوسری بات شوق کا Dramatic-Art یا ملکۂ تمثیل نگاری ہے۔ یعنی قوت خیال کا سب سے اونچا مرتبہ یہ ہے کہ شاعر اپنے کو مختلف شخصیتوں کی جگہ پر رکھ سکے اور اس وقت اس کا ہر کام اور اس کے منہ سے نکلا ہوا ہر لفظ بالکل وہی ہو جو ان شخصیتوں کا ہونا چاہیئے۔

مہ جبین ایک طبیعت دار نوجوان لڑکی ہے۔ جوانی خود ہی دیوانہ پن کا ایک خوبصورت نام ہے۔ اس پر طبیعت داری سونے پر سہاگے کا کام دیتی ہے۔ شعر و شاعری کا شوق اور برسات کی کیفیات سے لطف اٹھانے کا مزہ طبیعت داری کا ثبوت ہیں۔ یہ طبیعت داری جوانی کی دیوانگی کو ابھارنے میں مدد دیتی ہے۔ ایک خوشرو نوجوان سے آنکھ ملتی ہے۔ برسات کی مست کیفیتیں مناسب فضا پیدا کئے ہوئے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بجلی کی طرح ٹوٹ کر دل آجاتا ہے جوانی کی بلا جانے کہ یہ نوجوان اس محبت کے لائق ہے یا نہیں۔

قیامت پر قیامت یہ ہوئی کہ وہ دَور ایک رنگین اور عیش پرست دَور تھا۔ عصمت و عفت کمتر ہستیوں میں نفسی خودداری یا مذہب کے پیدا کئے ہوئے خوف کا نام ہوتا ہے۔ زیادہ تر کے دلوں میں عصمت اور عفت تمدن اور معاشرت کی پیدا کی ہوئی صرف ایک جھجک ہوتی ہے۔ یہ جھجک اس رنگین دور میں اجتماعی حیثیت سے کمزور پڑ چکی تھی۔ میں مہ جبیں کی طرف سے معذرت پیش نہیں کر رہا ہوں۔ میں واقعات کو ان کی صحیح روشنی میں لا کر شوق کے آرٹ کو پرکھنا چاہتا ہوں۔ جوانی، طبیعت داری معاشرتی جھجک کی کمزوری مہ جبین کو لے ڈوبتی ہے۔ عاشق ہے۔ خط میں خود ہی پہل کرتی ہے۔ اس پہلے ہی خط کا بے باک جواب سن کر ایک بار عورت کی فطرت یوں بھڑک اٹھتی ہے جیسے کہ وہ چراغ جو بجھ جانے کے قریب ہو مگر عشق دماغ پر فوراً ہی قبضہ جما لیتا ہے مہ جبیں آبرو باختہ نہ تھی دل باختہ تھی۔ خدا نہ کرے کہ عورت اپنے کو محبت کے ہاتھوں بیچ ڈالے۔ اس کی فطرت ہے کہ جب وہ محبت کا سودا کرنے پر تل جاتی ہے تو بے دریغ بلا سوچے سمجھے انجام سے بے خبر ہو کر اپنے کو محبت کے حوالے کر دیتی ہے۔

مہ جبیں کے خواب میں بھی یہ خیال نہیں آتا کہ وہ کوئی غلطی کر رہی ہے۔ عشق کا سودا ہو رہا ہے۔ اپنے کو اور اپنی آبرو کو اس سودے میں بیچ ہی ڈالنا پڑتا ہے۔ خودکشی کی اصل وجہ جدائی ہے نہ کہ کسی غلطی کا احساس اگر کبھی غلطی کا احساس ہوا بھی تو عشق دل کے سمندر میں لہریں مارنے لگا۔

گو کہ عقبیٰ میں روسیاہ چلی
مگر اپنی سی میں نباہ چلی

گناہ یا غلطی کا احساس ہوا مگر عشق کی ترازو میں پورے اترنے کے اطمینان اور خوشی نے فوراً ہی اس احساس کو دبا دیا۔ جدائی چونکہ یقینی ہے۔ لہٰذا خودکشی بھی یقینی ہو گی۔

آپ نے دیکھا اس عشق کی بندی کا کردار کیرکٹر تمثیل نگاری کی کسوٹی پر کتنا سچا اترتا ہے۔

اب دوسرا خاص کیرکٹر لیجئے۔

مہ جبیں کے محبوب نوجوان ہیں مگر تجربہ ماشاء اللہ سن سے زیادہ ہے۔ پہلے ہی خط کی بے باکی اور ملاقات کی خواہش دہراتے ہوئے استاد معلوم ہوتے ہیں۔ ایک حسین کنواری لڑکی خود ہی جال میں پھنس رہی ہے۔ اس سے فائدہ اٹھانا اور اپنے دوسرے تجربوں میں ایک اور تجربہ کا بڑھا لینا ضروری ہے۔ ایک انگریز ادیب کا قول ہے کہ عورت ایک

سادہ ورق کی طرح ہم لوگوں کو ہمیشہ للچاتی رہتی ہے کہ ہم اپنے سوانح
حیات اس پر ثبت کر دیں۔ یہی نظریہ ان صاحبزادے کا بھی ہے
ان کو مہ جبین سے عشق نہیں۔ ہاں اس کے لئے بے چین ضرور ہیں۔
شاعر جب مہ جبین کی زبان سے عشق کا اظہار کراتا ہے تو خود عشق
کی دلفریبی میں چار چاند لگ جاتے ہیں جب مہ جبین بے تابیٔ دل کا
اظہار کرتی ہے تو سننے والوں کا کلیجہ پھٹنے لگتا ہے۔ مگر یہ حضرت آموختہ
پڑھنے بیٹھتے ہیں تو بات دل میں نہیں اترتی۔ پہلے ہی خط کا مطلب قابلِ
غور ہے۔ عشق کا بھوت سر پر سوار نہیں ہے۔ مگر مہ جبین کے برابر ہی
مذہب اور سماج کی قید سے آزاد ہو کر زندگی بسر کرنے پر آمادہ ہیں اور
مہ جبیں کو بھی یہی دعوت دیتے ہیں۔ خفیہ ملاقاتوں کی اور ٹریجڈی کی
ذمہ داری صرف ان کی ذات پر ہے۔ مہ جبین کو عشق نے اندھا کر دیا تھا
مگر ان کی تو دونوں آنکھیں کھلی تھیں یا اگر ان پر پردہ تھا تو ایک نئے
تجربے کے شوق کا جلد ہٹ جانے والا پردہ کبھی اس آنکھوں والے
نے اس اندھی کو غار میں گرنے سے روکا۔ اس ہوش وحواس والے
نے کبھی بھی اس عشق کی دیوانی کو سنبھالا۔ شروع میں نہ سہی۔ مگر جب مہ جبیں
کی بدنامی ہو جاتی ہے تو اس وقت یہ کسی شریفانہ تلافی کے لئے کبھی بھی آمادہ
ہوتے ہیں۔ شادی یا کسی طرح سے بھی ساتھ ساتھ زندگی گذار دینے کے
متعلق کوئی بھی لفظ اس بندۂ خدا کے منہ سے کبھی بھی نکلا۔ جو لڑکی بدنام
ہو چکی ہو اس کے والدین اس تلافی پر آسانی سے رضامند کئے جا سکتے
تھے۔ ایسے موقع پر ذات، برادری اور دولت کی کمی اور زیادتی کا خیال
والدین کو نہیں ہوا کرتا۔

تمثیل نگار وصیت کے مقام پر پہنچ کر اس کیریکٹر کو خوب صاف
کر دیتا ہے۔ ایک رندِ فیشن نوجوان ایک عشق کے ہاتھوں بکی ہوئی دوشیزہ
کی زندگی تباہ کر دیتا ہے۔ اب ناگواری اور ذمہ داری کا موقعہ آتا ہے۔
تو نصیحت شروع ہوتی ہے کہ والدین کے کہنے کا برا نہ مانو۔

پہنچا ماں باپ سے اگر ہے الم
اس کا کرنا نہ چاہئے تمہیں غم
کچھ تمہیں پر نہیں ہے یہ افتاد
سب کے ماں باپ ہوتے ہیں جلاد
شکوہ ماں باپ کا تو ناحق ہے
ان کا اولاد پر بڑا حق ہے
تم تو نام خدا سے ہو دانا
اس پہ رتبہ ان کا پہچانا

اب پیچھا چھڑانے کی باتیں ہو رہی ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ مہ جبیں جا کر
خودکشی کر لیتی ہے اور چونکہ جناب خود اپنا قصہ بیان فرما رہے ہیں۔ مہ جبین
کی وصیت کے ادب کا اور مہ جبیں کے معجزے سے باوجود زہر کھانے
کے زندہ بچ جانے کا لچر اور ناقابلِ قبول عذر پیش کر کے پھر اسی قسم کے
مشغلوں کے لئے زندہ رہ جاتے ہیں۔

آپ نے ملاحظہ کیا کہ فنی اعتبار سے یہ کیریکٹر بھی کس قدر درست
ہے۔ دونوں کیریکٹروں کا تقابل تصویر کو روشن کر دینے میں اور ٹریجڈی
کو تکمیل تک پہنچانے میں کس طرح اپنا کام انجام دے رہا ہے۔

حسن تمثیل نگاری کا ثبوت ان دونوں کیریکٹروں میں شوق نے
دیا ہے وہ آپ ان مقامات پر بھی پائیں گے جہاں مہ جبین کی والدہ اپنی
بیٹی کی لاش پر بین کرتی نظر آتی ہے اور جہاں ان صاحبزادے کی والدہ کو
ان کے عشق کے ڈھونگ کی خبر ہوتی ہے اور وہ چراغ پا ہو جاتی ہیں۔

تیسری بات جو فن کے اعتبار سے اس مثنوی کو ابھارتی ہے۔ وہ
شوق کے آرٹ کی واقفیت ہے۔

اس انیسویں صدی کے شاعر کے فن میں وہ واقفیت ہے جس
کی جھلک اب بیسویں صدی میں ہمارے ادب کو مغربی ادیبوں کے واسطے
سے پہنچ رہی ہے۔ یہی وہ خصوصیت ہے جس کی اہمیت زمانۂ گذشتہ
کے مغربی ادیبوں میں بھی ہومر اور شیکسپیئر کی سی چند ہستیوں کے سوا کسی
کو نہ تھی۔ اس کے ثبوت مثنوی میں جابجا ملتے ہیں اور پوری قوت کے
ساتھ خاتمہ پر نظر آتے ہیں۔

اگر مہ جبین کا معشوق بھی خودکشی کر لیتا تو ہم لوگوں کی نگاہوں میں
افسانہ کا توازن سا قائم ہو جاتا مگر شوق کا آرٹ اس رسمی خاتمہ کے بند کو
اپنے کمال کا داغ سمجھتا ہے۔ خاتمہ وہی ہے جس پر تمثیل نگاری اور
واقفیت نے شاعر کو مجبور کر دیا ہے۔ بندۂ عشق مہ جبیں کو وہی کرنا
چاہئے تھا جو اس نے کیا یعنی جان سے گذر گئی۔ رندِ فیشن نوجوان سے
وہی امید تھی جو اس نے کیا یعنی معرکۂ عشق سے جان سلامت لے کر
نکل آیا۔ آپ ان صاحبزادہ پر بگڑ اٹھیں مگر اس سے زیادہ ان سے امید
بھی کیا تھی۔ پھر دنیا میں کتنے ایسے محبوب گذرے ہیں جنہوں نے محبت
کرنے والے کے ساتھ اپنی بھی جان ضائع کر دی یا کتنے ایسے شریف

ہوتے ہیں جنھوں نے ایک عورت کی زندگی کو تباہ کرکے اپنے لہو سے اس دھبہ کو دھو دیا ہے ۔ عام طور سے مرنے والا مر جاتا ہے ۔ اور باقی بچ جانے والے دوسرے دھندوں میں لگ جاتے ہیں۔

مثنوی کی کامیابی کا چوتھا راز یہ ہے کہ اس زمانے کے دوسرے قصّوں کی طرح یہ جن پری اور جادو کا قصہ نہیں ہے ۔ جو وقت گذار دیں مگر دل میں نہیں چُبھ سکتے ۔ انگریزی قول ہے کہ محبت کرنے والے سے دنیا محبت کرتی ہے مہ جبین محبت کے نام پر اپنی زندگی ختم کر دیتی ہے ۔ اور ہم لوگوں کے دلوں میں زندہ ہو کر براجتی ہے ۔ انسانوں کو انسانوں کے قصے بھاتے ہیں اور عشق و محبت کے افسانے تو دلوں میں اپنی جگہہ کر لیتے ہیں ۔ یہ قصہ ایک انسان کا ہے اور عشق کا قصہ دنیا لاکھ رنگ بدلے گر عشق کا نقش ایسا ہے کہ وہ دنیا کے صفحہ پر اٹل طریقہ سے لکھا ہے اور لکھا رہے گا۔

اس مثنوی کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ ہم کو شوق کی زبان کے لوچ کا اور اکثر مقامات پر ان کے سلیقۂ نظم کا بھی قائل ہونا پڑے گا۔ یہ زبان کا لوچ جو لکھنؤ کے شاعروں کا حصہ ہے اور جسے نقل کرنے والے نقل کرنے سے عاجز آ کر زنانہ پن کے لقب سے یاد کر کے ٹھکرا دینے کی کوشش کرتے ہیں ۔ بسا اوقات بے محل بھی ہو جاتا ہے گر اس افسانے میں نہایت مناسب اور موزوں ثابت ہوتا ہے ۔ یہ اسی نرمی اور گھلاوٹ کی برکت ہے کہ اس مثنوی کے بہت سے شعر ہماری زبان کا جزو بن کر رہ گئے ہیں۔

میں ذیل میں چند اشعار معہ ان مقامات کے جہاں وہ صرف کئے گئے ہیں پیش کرتا ہوں اور آپ دیکھیں کہ ان میں ادبیات کے جوہر کس حد تک موجود ہیں۔

مہ جبین کے حسن کی تعریف:۔

چشمِ بد دور وہ حسین آنکھیں
رشکِ چشمِ غزال تھیں آنکھیں
تھا جو ماں باپ کو نظر کا ڈر
آنکھ بھر کر نہ دیکھتے تھے ادھر

کوٹھے پر لونڈی مہ جبین کو بلانے آتی ہے:۔

گیسوئے رُخ پہ ہوا سے ہلتے ہیں۔
چلئے اب دونوں وقت ملتے ہیں

(عشق نے مہ جبیں کا کیا حال کر دیا ہے)

دردِ غم دل کو آ گیا جو پسند
سونا راتوں کو ہو گیا سوگند ۔
داغ جوں جوں جگر کے جلتے تھے
اشک گرم آنکھ سے نکلتے تھے
گرم نالے تھے لب پہ آہ سرد
دل میں ہوتا تھا میٹھا میٹھا درد

مہ جبیں کا خط خط لکھنے کو لکھتی ہے مگر شرم دامنگیر ہے ۔ بیتابیٔ دل کا عذر پیش کیا جا رہا ہے ۔

اس محبت پہ ہو خدا کی مار
جس نے یوں کر دیا مجھے لاچار
اب کوئی اس میں کیا دلیل کرے
جس کو چاہے خدا ذلیل کرے

پہلے ہی خط کے جواب میں اپنے محبوب کی بے باکی دیکھ کر عورت کی فطرت ابھرتی ہے۔

تجھ پہ میں مرتی کیا قیامت تھی
کیا مرے دشمنوں کی شامت تھی
کالا دانہ ذرا اتروا لو ۔
رائی لون اس سمجھ پہ کر ڈالو

آخری ملاقات کے موقع پر اظہار بے تابی دل ۔

وہ چھٹے ہم سے جس کو پیار کریں
جبر کیونکر یہ اختیار کریں
ہم بھی گر جان دے دیں کھا کر سم
تم نہ رونا ہمارے سر کی قسم
دل کو سمجھو لیوں میں بہلانا
یا میری قبر پہ چلے آنا

"کلیم"

رفیع احمد

بھولی بسری باتیں

مرزا غالب کی شوخیٔ تحریر کا کونسا ایسا فرد ادبی ہوگا جو ان کے چہیتے شاگرد میرن صاحب کے نام سے واقف نہ ہو۔ یہ وہی میرن صاحب ہیں جن کے نام رقعاتِ غالب میں کئی مکتوب موجود ہیں۔ غدر میں جب دلی اجڑی تو اس اُجڑے دیار کے بچے کھچے باکمال ملک کے مختلف گوشوں میں بکھر گئے۔ مگر مرزا غالب کی طرح میرن صاحب بھی فاقوں پر گزارہ کرتے اور اپنی وضعداری نباہتے دلّی ہی میں مقیم رہے۔ غالب کے انتقال کے بعد جب دلّی میں ان کی دل بستگی کا کوئی ساز و سامان باقی نہ رہا تو انہوں نے بہ دل شکستہ خاطر ہو کر حیدرآباد کا رُخ کیا۔ اس مینو سواد میں لوگوں نے انہیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ وہاں ان کی بڑی آؤ بھگت ہوئی اور کچھ ماہانہ وظیفہ بھی مقرر ہو گیا۔

میرن صاحب کو غالب کے متعلق ہر چیز اس قدر تفصیل کے ساتھ یاد تھی کہ شاید کسی کو بھی اتنی تفصیل سے یاد نہ ہو۔ غالب سے ان کی عقیدت کا یہ عالم تھا کہ جس کی مثال بمشکل ڈھونڈے سے کہیں مل سکتی ہے۔ مولانا عبدالحق صاحب سیکرٹری انجمن ترقی اردو سے سنا ہے کہ ایک مرتبہ حیدرآباد کے ایک نواب صاحب نے غالب کا کوئی شعر غلط پڑھ دیا۔ اتفاق سے وہاں میرن صاحب بھی موجود تھے۔ وہ غلط شعر سنتے ہی بھڑک اُٹھے اور کڑک کر فرمایا کیا اسے قرآن حدیث سمجھ رکھا ہے کہ جیسا جی آیا پڑھ دیا۔ حضرت یہ غالب کا کلام ہے اسے غلط نہیں پڑھتے اور اس کے بعد پھر خود صحیح شعر پڑھ کر سنا دیا۔

پنجاب کے مشہور فارسی گو شاعر شیخ غلام قادر گرامی مرحوم عرصۂ دراز تک حیدرآباد میں مقیم رہے۔ دیکھنے اور بات چیت کرنے میں ٹھیٹھ دیہاتی معلوم ہوتے تھے۔ انہیں دیکھ کر یا ان سے مل کر کسی کی سمجھ میں یہ بات نہ آ سکتی تھی کہ وہ فارسی کے اتنے اچھے شاعر ہوں گے۔ مولانا گرامی مولانا عبدالحق کے قدیم اور مخلص ملنے والوں میں تھے۔ حیدرآباد میں مولانا کا مکان ہمیشہ سے اہلِ علم کا مسکن رہا ہے۔ جب کبھی مولانا گرامی کچھ لکھتے تو اسے ایک پرزے پر لکھ کر مولانا کے پاس لاتے اور سنانے کے بعد وہ پرزہ وہیں چھوڑ کر چلے جاتے تھے۔ گرامی مرحوم کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ایسے بہت سے پرزے مولانا کے کتب خانے میں موجود ہیں۔ پنجاب سے گرامی کے کلام کا جو ایک نامکمل مجموعہ شائع ہوا ہے اور ان کی رباعیوں کا جو علٰحدہ مجموعہ چھپا ہے اگر ان دونوں کو سامنے رکھ کر ان پرزوں سے مقابلہ کیا جائے تو بہت ممکن ہے کہ ان میں گرامی کا ایسا کلام بھی نکل آئے جو اب تک کہیں نہ چھپا ہو۔

نواب نصیر حسین خاں خیال مرزا ابو محمد طالب عظیم آبادی اور دوسرے معمر شرفائے عظیم آباد سے سنا ہے کہ میر کے نام سے جو غزل مشہور ہے کہ ؎

اک ہوک سی دل میں اٹھتی ہے اک درد جگر میں ہوتا ہے

میں چپکے چپکے روتا ہوں جب سارا عالم سوتا ہے

اصل میں یہ میر کی نہیں بلکہ ضیاؔ کی ہے میر کے نام سے اس غزل کے غلط طور پر مشہور ہو جانے کی وجہ اس کی دردانگیزی اور اثر انگیزی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ ضیا عظیم آبادی نے بیس پچیس سال پہلے عین نوجوانی میں انتقال کیا۔ ضیا کا کلام مجموعہ کی صورت میں کبھی شائع نہ ہوا۔ عظیم آباد کے اربابِ ذوق سے مرحوم کا جو کلام سننے میں آیا اور ضمنی طور پر کسی تذکرے میں جو شعر نظر سے گزرتے ہیں ان سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اگر عمر وفا کرتی تو ضیا اردو کا بہت بڑا شاعر ہوتا۔

جن لوگوں نے ضیاء کو دیکھا ہے ان کا بیان ہے کہ وہ نہایت آشفتہ مزاج اور آزاد رو نوجوان تھا۔ اس زمانے میں فیروزہ جان نامی ایک طوائف کا عظیم آباد میں بڑا شہرہ تھا اس کے مکان پر شہر کے رئیس زادوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ کہتے ہیں کہ ضیاء کو اس طوائف سے عشق تھا۔ ضیا اس کے عشق میں شعر کہتے ہوئے دیوانہ وار عظیم آباد کی گلیوں کی خاک چھانتا پھرتا تھا۔ فیروزہ جان کو بھی اس کی خبر تھی مگر اس پتھر دل عالم پر ضیا کی آہ و زاری کا کوئی اثر نہ تھا۔

اسی زمانہ میں عظیم آباد کے ایک رئیس سے فیروزہ جان کی آشنائی ہو گئی اور رئیس نے اُسے نوکر رکھ لیا۔ اب فیروزہ کا دروازہ اس رئیس کے سوا دوسرے تمام تماشائیوں کے لئے بند ہو گیا۔ ضیاء کے عشق کی خبر شدہ شدہ رئیس کے کانوں تک جا پہنچی ادھر شہر کے بعض لوگوں نے رئیس مذکور کو رفتہ رفتہ اس امر پر رضامند کر لیا کہ ایک رات ضیا کو فیروزہ جان کے ساتھ رہنے دیا جائے۔ خدا جانے اس کے جی میں کیا آئی کہ وہ اس پر رضامند ہو گیا اور فیروزہ کو حکم دیا کہ تمہارے پاس جو بہترین لباس اور زیور

ہوں انہیں پہن لو اور کمرے کو سجا کر آراستہ کر لو تاکہ ضیا ایک شب تمہارے کمرے میں بسر کر سکے۔ فیروزہ بمصداق حکم حاکم مرگ مفاجات طوعاً و کرہاً اس پر رضامند ہو گئی۔

ایک طرف تو یہ ہو رہا تھا اور دوسری طرف رئیس کے مصاحب کسی نہ کسی طرح ضیا کو گھیر کر سرِ شام فیروزہ جان کے کوٹھے پر لے آئے۔ یہاں تو پہلے ہی سے ہر بات طے ہو چکی تھی سب ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے اور صرف ضیا اور فیروزہ جان باقی رہ گئے فیروزہ جان نے ضیا کا ہاتھ پکڑا اور دوسرے کمرے کی طرف لے کر چلی کمرے میں داخل ہو کر اس نے ضیا کو پلنگ پر بٹھایا اور اس کے گلے میں باہیں ڈال دیں۔

وہ محبوبہ جاں نواز جس کے عشق میں ضیا سب کچھ بھول چکا تھا اب سامنے موجود تھی۔ مگر ضیا کی زبان بند تھی فیروزہ نے لاکھ چاہا کہ ضیا کچھ منہ سے بولے مگر اس کے حلق سے آواز نہ نکلتی تھی البتہ آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری تھے وہ مومی شمع جو فانوس کی اوٹ سے ہر شب انسان کی بہیمیت پر آنسو بہایا کرتی تھی۔ آج عشق کی اس انوکھی ریت اور محبت کے اس نئے انداز کو حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

الغرض وصل کی یہ پہلی اور آخری رات اسی طرح گذر گئی۔

اس واقعہ کے دوسرے دن سے ضیا بیمار پڑ گیا اور ایسا بیمار پڑا کہ مر کر اٹھا۔ عالم نزع میں ایک صاحب پہنچے اور آواز دی کہو ضیا کیا حال ہے آنکھیں کھول دیں اور سرمد شہید کا یہ شعر پڑھا ؎

شورے شد و از خواب عدم چشم کشودیم　　دیدیم کہ باقیست شب فتنہ غنودیم

اس کے بعد ایک ہچکی آئی اور عظیم آباد کا یہ درخشندہ ستارہ جو آسمان ادب پر جگمگانے کے لئے پیدا ہوا تھا ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔

سید مظفر حسین شمیم

(مصور)

شعر

ہر دل میں نئے درد سے ہے یاد کسی کی
ملتی نہیں فریاد سے فریاد کسی کی

نامعلوم

نقد و نظر

نئے رسالے

جب ہندوستانی مردوں کو مہذب اور تعلیم یافتہ بنانے کا کام جاری ہو کر چل پڑا۔ تو مصلحان ملک وقوم کی نظریں طبقۂ نسواں کی طرف مائل ہوئیں ہندوستان کو ترقی دینے کے سلسلے میں تعلیم نسواں (یا عورت سدھار) کی تحریک دوسری تحریک تھی۔ اب چونکہ یہ کام شروع ہو چکا ہے اس لئے اُن لوگوں نے جو فلاح و بہبود کے کام سے کبھی غافل نہیں رہنا چاہتے دیہات سُدھار کی تحریک چلا دی۔ تعلیم نسواں کی طرح دیہات یا گاؤں سُدھار کی تحریک نے بھی ملک کے طول وعرض میں ایک نئی زندگی پیدا کردی ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ یہ تحریک اپنے اثرات کے لحاظ سے ہندوستان کے لئے مفید ثابت ہوگی۔ کیونکہ اس تحریک کو حکومت کی باقاعدہ مدد بھی حاصل ہے۔ اسی تحریک کے مدِنظر الہ آباد کے انڈین پریس نے گاؤں سدھار کے لئے ایک شاندار ماہنامہ "ہل" کا اجرا کیا ہے۔ یہ رسالہ دسمبر ۳۸ء سے جاری ہوا ہے۔ اور اب تک اس کے چار نمبر شائع ہو چکے ہیں۔ ان چار نمبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ اس رسالے کے کارکن حضرات ہمارے ہندوستانی دیہاتی بھائیوں کے لئے ہر طرح کے دلچسپ اور مفید مضامین نظم ونثر یکجا کرنے میں اچھی مہارت رکھتے ہیں۔ رسالے کی لکھائی چھپائی صاف ستھری اور خوبصورت ہے۔ اور اس میں مضامین کے ساتھ جا بجا تصاویر نے ایک خاص دلکشی پیدا کردی ہے۔ اس کی زبان بھی رائج الوقت خالص اُردو ہے۔ چورانوے ۹۴ صفحات قیمت سالانہ چار روپے آٹھ آنے۔ فی پرچہ چھ آنے۔

ہمیں اُمید ہے کہ صاحبِ توفیق شہری حضرات نہ صرف اس رسالے کو خود پڑھیں گے بلکہ اپنے دیہاتی بھائیوں تک بھی اسے پہنچانے کی کوشش کریں گے۔ انڈین پریس کا یہ اقدام یقیناً لائقِ صد تحسین ہے۔

دوسری تحریک یعنی بہبودِ نسواں اب روز بروز پھیل کر قوموں اور سماج کی گہرائیوں میں قبضہ جمانا چاہتی ہے۔ اُردو میں عورتوں کے لئے اگرچہ چند اچھے رسالے اور اخبار پہلے ہی سے جاری ہیں لیکن دہلی سے ایک تازہ ماہنامہ "انیسِ نسواں" بھی شائع ہوا ہے۔ اس ماہنامے کے مدیر محترم شیخ محمد اکرم بیرسٹرایٹ لا ہیں اور اُن کی بیگم صاحبہ ہیں۔ اُردو خواں طبقہ شیخ صاحب کے نام سے ناواقف نہیں ہے۔ شیخ صاحب موصوف محترم شیخ (سر) عبدالقادر کے "مخزن" اور اس کے علاوہ عصمت اور تمدن کی ادارت کے فرائض مختلف وقتوں میں احسن طریقہ پر انجام دے چکے ہیں۔ اور اب بھی اُن سے ٹھوس اور مفید کام کی اُمید ہے۔

وسعتِ نظر کے لحاظ سے "انیسِ نسواں" کا زاویہ محدود ہے۔ یہ رسالہ خصوصاً مسلمان خواتین کے لئے ہے۔ رسالے کے مقاصد کے متعلق "انیسِ نسواں" ہی کے الفاظ دئیے جا سکتے ہیں ——" اکثر تعلیم یافتہ نوجوان مذہبِ اسلام سے لاپروا ہو کر دہریت کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔ اور تہذیبِ مغرب کا شکار ہو گئے ہیں۔ اُن کا یہ اثر ہماری مسلم خواتین بھی قبول کرتی جا رہی ہیں۔ اور وہ بھی اپنے مذہب اور تمدن کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگی ہیں اور تہذیبِ مغرب کی زد میں آتی جا رہی ہیں۔ . . . . انیسِ نسواں . . . . مسلم خواتین کو اپنے مذہب کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کریگا۔ اور قرآن مجید کے مطالب کی تبلیغ کر کے شوقِ عمل کا جذبہ اُن کے دل میں پیدا کریگا۔" ہماری دعا ہے کہ شیخ صاحب قبلہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوں۔

انیسِ نسواں کا سالانہ چندہ پانچ روپے اور فی پرچہ آٹھ آنے قیمت ہے۔ سستے ایڈیشن کا سالانہ چندہ تین روپے ہے۔ لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ سرورق باقاعدہ اور جاذبِ نظر۔ حجم ہر ماہ چونسٹھ صفحات پتہ۔ انیسِ نسواں دہلی۔

ہندوستان سوراج کا طالب ہے۔ ظاہر ہے کہ سوراج کا طالب وہی ملک ہو سکتا ہے جو ہر طرح سے مہذب اور ترقی یافتہ ہو۔ عورتیں اور دیہاتی بنی نوعِ انسان کے دو ایسے گروہ ہیں۔ جن کی ترقی ہی سے کسی ملک میں تہذیب کا جال پھیل سکتا ہے۔ لیکن اس سے یہ مطلب نہ لیا

جائے کہ باقی مرد (جن میں اکثریت اوسط شہریوں کی ہوتی ہے) پورے طور پر مہذب اور ترقی یافتہ ہوتے ہیں۔ مغرب ہمیں ترقی کے میدان میں بہت ہی پیش پیش نظر آتا ہے۔ لیکن وہاں بھی زندگی کے چند پہلوؤں میں بیسویں صدی کے آغاز ہی سے ترقی کا قدم اُٹھایا گیا ہے۔ مثال کے طور پر جنسی علم ہی کو لیجئے۔ جنسی تعلیم و تربیت کی تحریک انگلستان اور یورپ میں ابھی کوئی بہت پُرانی نہیں ہوئی۔ اور ہندوستان میں تو ابھی اس کی کیفیت "تازہ بتازہ نو بنو" ہی کی ہے۔ افسوس اس بات کا ہے کہ ہندوستان میں اب تک جن لوگوں نے جنسی علم کی تبلیغ و اشاعت کا کام اپنے ذمے لیا اُن کا مقصد محض تجارت تھا۔ اور ضرورت اس بات کی تھی کہ کوئی جاننے والا اس علم کے متعلق بھی (خصوصاً اُردو میں) ایک پاکیزہ رسالہ جاری کرے۔ اس ضرورت کی تکمیل کلکتے سے ڈاکٹر حکیم محمد علی قریشی نے ماہنامہ "پیام صحت" کی صورت میں کی ہے۔ لیکن "پیام صحت" محض جنسی علم ہی کا مبلغ نہیں بلکہ اس کے متعلقہ علوم نفسیات (اور خصوصاً نفسیات جدید) حفظِ صحت اور طب پر بھی مفید مضامین شائع کرتا ہے۔ پیام صحت کے اب تک ۱۲ نمبر شائع ہو چکے ہیں۔ حجم چوالیس صفحے۔ چندہ سالانہ اعلیٰ ایڈیشن دو روپیہ عام ایڈیشن ایک روپیہ آٹھ آنہ۔ فی پرچہ دو آنے۔ پتہ دفتر پیام صحت نمبر ۲ کنائی سیل سٹریٹ کلکتہ۔

ہمیں اُمید ہے کہ اُردو خواں طبقہ اس مفید ماہنامے کی عملی امداد سے فائدہ اُٹھا کر حکیم صاحب موصوف کی سماجی خدمت کو خراجِ تحسین پیش کرے گا۔

پنجاب اور خصوصاً لاہور اُردو اخبارات و رسائل کی نت نئی اشاعتوں سے سارے ہندوستان میں مشہور ہو چکا ہے۔ لیکن اکثر ایسے اقدام تشنۂ تکمیل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ بہرحال ہم توقع کرتے ہیں کہ ماہنامہ "تعمیر" کی عمارت موسمی حادثات کے باوجود روز بروز پہلے سے زیادہ استوار ہوتی جائے گی۔ "تعمیر" نوجوانوں کی کوشش ہے اور اگرچہ نوجوان ہی مستقبل کے مالک ہوتے ہیں۔ لیکن جوانی دیوانی بھی مشہور ہے۔

"تعمیر" کے سرورق پر مشعلِ راہ کے طور پر میکسم گورکی کا ایک فقرہ لکھا ہوا ہے۔ "ماضی کے بُت کو پوجنے والے شاعرو! حال کی بُرائیوں کو چھپانے والے ادیبو! مستقبل پر تاریکی کا پردہ ڈالنے والے افسانہ نگارو! مٹ جاؤ، ورنہ تاریخ تمہیں خود مٹا دے گی۔" اس فقرے کو سرورق کا غیر معمولی امتیاز دینے سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ "تعمیر" ایسے ادبا اور شعرا کا معاون اور حامی ثابت ہوگا۔ جو ماضی کے بُت کو نہ پوجیں، حال کی بُرائیوں کو نہ چھپائیں اور مستقبل پر تاریکی کا پردہ نہ ڈالیں۔ لیکن ہم اُمید کرتے ہیں کہ ترقی کے اس جوش و خروش میں "تعمیر" کے اولوالعزم ارکان اس حقیقت کو نہ بھولیں گے کہ حال اور مستقبل کی بنیاد ہمیشہ سے ماضی ہی رہا ہے۔ اور جب تک یہ تینوں زمانے رہینگے ماضی ہی بنیاد رہے گا بھی۔ نیز حال کی برائیوں کو ظاہر کرنے کے ساتھ ہی ساتھ تعمیری ادب کا مقصد حال کی خوبیوں کو روشن کرنا بھی ہے۔ اس کے علاوہ مستقبل پرستی کی رو میں اس قدر بہہ جانا بھی فائدہ مند ثابت نہیں ہو سکتا کہ حال سے تعلق یکسر منقطع ہی ہو جائے۔ بہرحال جس طرح نوجوانوں سے ملک و قوم کی اور بہت سی توقعات وابستہ ہیں۔ اُسی طرح اُمید ہے کہ "تعمیر" کا حلقہ اُردو ادب کی تشکیل میں بھی قابلِ تعریف کام کریگا۔

حجم چونسٹھ صفحے۔ فی پرچہ پانچ آنے۔ سالانہ چندہ چار روپے۔ دفتر رسالہ "تعمیر" ۴۲ فلیمنگ روڈ۔ لاہور

سطور بالا میں ذیل کے رسائل پر ریویو کئے گئے ہیں:۔

ماہنامہ "ہل" انڈین پریس الہ آباد
ماہنامہ "انیس نسواں" دہلی۔
ماہنامہ "پیام صحت" کنائی سیل سٹریٹ کلکتہ۔
ماہنامہ "تعمیر" فلیمنگ روڈ لاہور

"سب رس"۔ دکن نمبر

اُردو کی خدمت اور ترقی کے سلسلے میں پنجاب اور دکن کا نام ہندوستان کے باقی علاقوں سے پیش پیش ہے۔ پنجاب میں اُردو کی ترقی اس زبان کے شائقین کی ممنون ہے۔ لیکن دکن میں اُردو کے بہی خواہوں میں حکومت بھی شامل ہے۔ اس بات کے لئے اُردو اور اُردو کے چاہنے والے دکن کی حکومت کے ممنون ہیں۔ لیکن اس حکومتی سہارے نے دکن کے تخلیقی ادب کے ایک پہلو میں غیر مستحسن اثراندازی کی ہے۔ اور اُردو کے عام دکنی کارکنوں میں سے اکثر کی آزادیٔ نظر کو بہت حد تک اپنی زد میں لا رکھا ہے۔ اس وقت ہماری نظر دکن کے "سب رس" کے سالگرہ نمبر بابت جنوری ۱۹۳۹ء پر ہے۔ جس کا عنوان دکن نمبر رکھا گیا ہے۔ اس کی ضخامت دو سو چھ صفحے ہے۔ تصاویر کی تعداد ۸، ہے۔

ان میں سے سلاطین و مشاہیر بیجا پور، مشاہیر احمد نگر، سلاطین گولکنڈہ، مشاہیر گولکنڈہ، سلاطین آصفی، وزرائے آصفی اور اُمرائے آصفی کی ستر تصاویر ہیں۔ چھ تصویریں قلعوں مقبروں وغیرہ کی ہیں اور دو تصویریں مجلس ادارت میں سے دو صاحبوں کی ہیں

مضامین نظم و نثر کی تعداد اسی ہے۔ اور بہت سی دلچسپ نظموں نے (جن میں بیشتر صاحبزادہ میر محمد علی خاں میکش کا کلام ہیں) اس نمبر کی دلکشی میں اضافہ کر دیا ہے۔ مضامین نثر کی نوعیت بیشتر تاریخی، سماجی اور ادبی ہے۔ تین افسانے بھی ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی یہ نمبر دکن کے قریباً ہر پہلو پر مفید معلومات کا حامل ہے اور اس قابل ہے کہ حوالے کے طور پر اسے اپنے پاس رکھا جائے۔ اس کی قیمت دو روپے ہے۔

"اُردو" - اقبال نمبر

ملک کے اکثر رسائل و جرائد نے حضرت علامہ مرحوم کی شخصیت اور شاعری کے متعلق خاص نمبر شائع کئے تھے۔ لیکن توقع کی جاتی تھی کہ "اُردو" بھی اس سلسلے میں کوئی کام کرے گا۔ "اُردو" کا اقبال نمبر اسی توقع کی تکمیل ہے۔ یہ نمبر اُردو کے عام سائز کے قریباً چار سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے شروع میں علامہ مرحوم کی ایک سادہ اور پاکیزہ عکسی تصویر ہے۔ اس کے بعد سر تیج بہادر سپرو کا ایک خط ہے۔ پھر پنڈت چاند نرائن۔ سید ہاشمی فرید آبادی، حکیم ظہور الدین احمد قریشی اور حامد حسن قادری (صاحبان) کی تعریفی نظمیں۔ اس کے بعد انگریزی زبان میں ایک صفحہ سر محمد اقبال کے عنوان سے سرای ڈینی سن راس کی تحریر کا ہے۔ اور ان سب کے بعد مقالات کا آغاز ہوتا ہے۔ ان کے عنوانات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ اقبال کا تصور خودی۔ ۲۔ رومی، نطشے اور اقبال۔ ۳۔ اقبال اور آرٹ۔ ۴۔ اقبال کی شخصیت اور اُس کا پیغام۔ ۵۔ اقبال کا ذہنی ارتقا۔ ۶۔ اقبال کا تصور زماں۔ ۷۔ اقبال اور اُس کے نکتہ چیں۔

یہ سب مقالات ٹھوس علمی تنقید سے لبریز ہیں۔ اور ان میں ہر مقالہ نگار نے اپنے اپنے موضوع کو واضح کیا ہے۔ یہ نمبر ۱۹۳۸ء میں اُردو کی آخری سہ ماہی کا شمارہ ہے۔ اس نمبر کی قیمت درج نہیں۔ غالباً اُردو کے عام نمبروں سے کچھ خاص زیادہ نہ ہوگی۔ ملنے کا پتہ۔ انجمن ترقی اُردو (ہند) نئی دہلی۔

"م"

فہرست مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ مئی ۱۹۳۹ء

جلد ۱۷ — نمبر ۵

تصاویر:- ۱- چار مینار ۲- ساحل کی موج ۳- حیا ۴- نقش بہ دیوار

سالانہ چندہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ

(گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام صلاح الدین احمد پرنٹر و پبلشر چھپ کر دفتر ادبی دنیا مال روڈ لاہور سے شائع ہوا)

دُنیائے کاروبار

فلپس کی کتاب

اولاد ہی پر کسی خاندان کے بقا کا انحصار ہوتا ہے۔ لیکن ہندوستان میں اولاد کی صحیح تربیت نہیں کی جاتی۔ فلپس کی کتاب اس کمی کو پورا کرنے اور ماؤں کو صحیح معلومات بہم پہنچانے کی غرض سے شائع کی گئی ہے۔

اس کتاب میں وہ تمام احتیاط صاف اور سلیس زبان میں بیان کی گئی ہے۔ جو حمل کے دوران میں مختلف تکلیفوں کے لئے اگر کی جائیں۔ تو نہ صرف ماں مختلف امراض سے بچ سکتی ہیں۔ بلکہ پیدا ہونے والے بچے کی آئندہ صحت بھی قبیحہ جسمانی امراض سے محفوظ رہ سکتی ہے۔ از بسکہ بچہ حمل کے دوران میں اپنے دانتوں ہڈیوں اور شریانوں کی بناوٹ کے لئے تمام خوراک ماں ہی کے جسمانی نظام سے حاصل کرتا ہے۔ اس لئے ماں کی خوراک اور اس کی جسمانی صحت کا خاص خیال رکھا جانا چاہیئے۔ جی متلانا بھی اس حالت میں تکلیف دہ ثابت ہوتا ہے۔ اس قسم کی بہت سی مختلف تکلیفات کی وجہ تیزابیت ہوتی ہے۔ جس کی طرف بہت کم توجہ کی جاتی ہے اور جو مہلک اثرات پیدا کرتی ہے۔ غرضکہ دورانِ حمل میں حفظانِ صحت کے وہ تمام اصول پیشِ نظر رکھنے چاہئیں۔ جن کا تعلق نیند۔ پانی۔ صفائی۔ دانتوں کی حفاظت۔ اسقاطِ حمل۔ دفعیہ قبض۔ بچے کے پیدا ہونے۔ پرورش اولاد خوراک میں سبزیوں کا استعمال بھینس کے دودھ کا استعمال۔ بچوں کی خوراک کے متعلق معلومات اور احتیاط۔ بچے کی جسمانی ترقی کی علامات۔ انتڑیوں کو درست رکھنے کے طریقے بچے کے دانت وغیرہ وغیرہ سے ہے۔ ان تمام نقائص کو فلپس ملک آف میگنیشیا کس طرح دور کرتا ہے۔ اس کی تفصیل فلپس کی کتاب میں ملاحظہ فرمائیں۔ اور اپنی اولاد کی بنیاد اس بہترین اور عمدہ صحت پر رکھیں جس پر انسان کی اپنی اور اس قوم کی زندگی کا دارومدار ہے۔ اس کتاب میں ان لوگوں کے خطوط بھی ہیں۔ جو ملک آف مگنیشیا استعمال کر چکے ہیں۔ یہ چھوٹی سی خوبصورت کتاب آپ ایک خط لکھ کر میسرز مارٹن اینڈ ہیرس لمیٹڈ مرکنٹائل بلڈنگس۔ لال بازار کلکتہ سے بالکل مفت منگائیں۔

کیسے اُڑا؟ ایسے اُڑا!

بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ جہانگیر اور نور جہاں کی شہرۂ آفاق داستان حسن و عشق کی بنیاد ان چار الفاظ پر ہے۔

اس افسانۂ زنگیں کی تفصیل کے لئے منروا فلم کمپنی کی تازہ ترین فلم "پکار" ضرور دیکھیے جس میں شہنشاہ جہانگیر کی زندگی کے اس تاریخی افسانے کو پردہ سیمیں پر پیش کیا گیا ہے۔ اس فلم میں منروا کے دوسرے باکمال اداکاروں چندرموہن شیلا۔ سردار اختر۔ صادق علی وغیرہ وغیرہ کے ساتھ ساتھ نسیم کے رُخ پر ورگانے بھی شامل ہیں۔ ڈائرکشن کے باکمال ہونے کی گارنٹی کے لئے سہراب مودی کا نام ہی کافی ہے۔

نیپچون انشورنس کمپنی لمیٹڈ۔ بمبئی

ہندوستان کی ان بیمہ کمپنیوں میں سے ہے جنہیں اپنے کام کی پائیداری اور اعزاز کی بنا پر خاص مرتبہ حاصل ہے۔ اس کمپنی نے ایسی شاندار ترقی کی ہے کہ حال ہی میں کمپنی نے اپنی بلڈنگ بنائی ہے۔ اور اس کا افتتاح کیا ہے۔ اس موقع پر بڑے بڑے ماہرین تجارت کے علاوہ صوبجاتی وزرا بھی موجود تھے۔ اور چند وزرا کی طرف سے تہنیت کے پیغامات وصول ہوئے۔ یہ بلڈنگ فنِ تعمیر کا ایک قابل تعریف نمونہ ہے۔ سر چمن لال سیتلواڈ کے۔ ٹی نے اپنے ہاتھوں سے اس بلڈنگ کو کھولا۔ اور ایک مختصر سی تقریر میں اس کمپنی کے قابلِ تعریف کام کی ستائش کی۔ سیٹھ وٹھل داس ڈی گوندجی جو اس کمپنی کے چیئرمین ہیں انہوں نے ڈائرکٹروں کا اور مہمانوں کی تشریف آوری کا شکریہ ادا کیا۔

اورینٹل گورنمنٹ سیکورٹی لائف انشورنس کمپنی لمیٹڈ

تمام ہندوستانی بیمہ کمپنیوں میں امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ امر باعث مسرت ہے کہ سال گذشتہ ۱۹۳۸ء میں اس کمپنی نے کل ۵۳۲۸۸ پالیسیاں حاصل کیں جن میں کل رقم بیمہ ۹،۶۸۵۳۸۵ روپے ہے۔
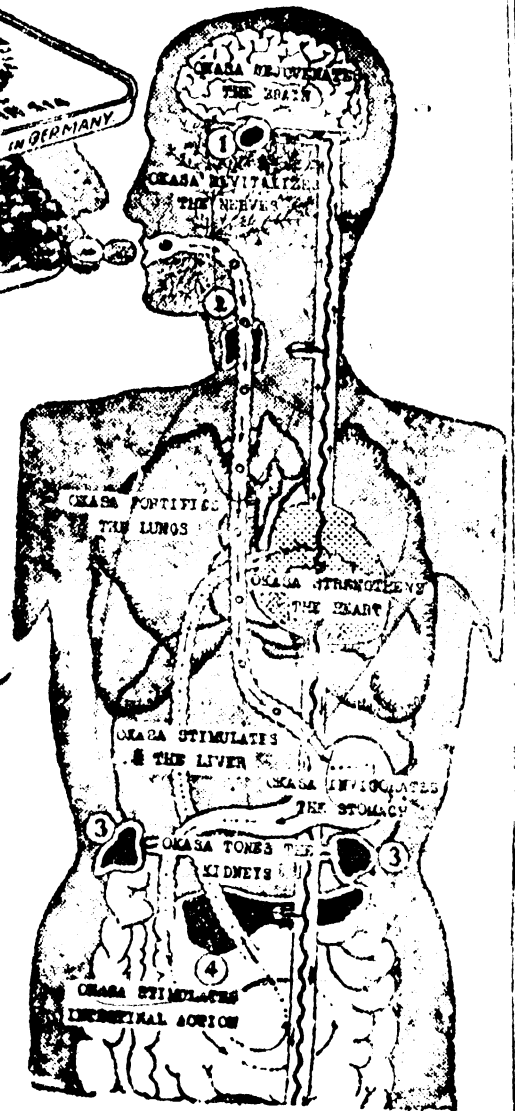
صرف تین ہی ہفتہ میں
آپ پر ثابت ہو جائے گا کہ
اوکاسا
آپ کو ایک نیا طاقتور آدمی بنا سکتا ہے
OKASA
HORMO-PHARMA
BERLIN
MADE IN GERMANY
OKASA REJUVENATES THE BRAIN
OKASA REVITALIZES THE NERVES
OKASA FORTIFIES THE LUNGS
OKASA STRENGTHENS THE HEART
OKASA STIMULATES THE LIVER
OKASA INVIGORATES THE STOMACH
OKASA TONES THE KIDNEYS
OKASA STIMULATES INTESTINAL ACTION
اوکاسا جرمنی کے ڈاکٹروں کی ایسی حیرت انگیز ایجاد کردہ دوا ہے کہ جس کے مقابلہ کی یا اس کے برابر اثر رکھنے والی دوسری دوا اب تک تیار نہیں ہو سکی۔ دنیا کے ہر ملک میں لاکھوں مرد و عورت اوکاسا کے استعمال سے اپنی تندرستی۔ زندگی۔ طاقت اور پوری جوانی دوبارہ حاصل کر چکے ہیں۔ ہر سال لاکھوں کی تعداد میں لوگ اوکاسا کا استعمال کر رہے ہیں اوکاسا کے اثرات کا راز اس میں ہے کہ اس کے استعمال سے جسم کے ہر حصہ کو غذا پہنچتی ہے۔ خصوصاً ان غدود یعنی گلینڈز جن پر تمام زندگی اور صحت کا دارومدار ہے یہ بات تصویر میں اچھی طرح ظاہر کی گئی ہے صرف تین ہفتہ کے استعمال سے معلوم ہو جائے گا کہ اوکاسا در اصل آپ کو ایک نیا طاقتور آدمی بنا دے گا۔ آپ کی طاقت۔ آپ کی صحت اور جوانی از سر نو واپس آ جائے گی۔ آپ کے چہرے پر رونق اور تازگی پیدا ہوگی۔ اور آپ کے جسم کی رگیں اور پٹھے اور تمام اعضا خصوصی طاقتور بن جائیں گے۔
اوکاسا اشتعال انگیز اور گرمی پیدا کرنیوالی دوا نہیں ہے
برخلاف اور تمام طاقت کی دواؤں کے جن میں کشتہ جات۔ کچلہ۔ دھاتیں پڑی ہوئی ہوتی ہیں اوکاسا بالکل بے ضرر اور قطعی اشتعال انگیز یا گرمی کرنیوالی دوا نہیں ہے۔ کیونکہ اوکاسا میں کسی قسم کا کشتہ یا دھات یا کچلہ وغیرہ شامل نہیں ہے اوکاسا ان اجزا سے بنی ہوئی ہے۔ جن کو انگریزی میں گلینڈز کہتے ہیں۔ گلینڈز یا غدود۔ جیسا کہ تصویر میں دکھایا گیا ہے۔ آدمی کے جسم کا اہم ترین جزو ہیں اس لئے اوکاسا آپ کے گلینڈز کو طاقتور بناتا ہے۔ گرمی پیدا کرنے والی اور اشتعال انگیز نہیں ہے ہر حالت اور ہر موسم میں اوکاسا استعمال کر سکتے ہیں۔ اوکاسا کے متعلق مفصل کتاب آپ مفت طلب کیجئے
پتہ:۔ اوکاسا کمپنی برلن (انڈیا) لمیٹڈ پوسٹ بکس نمبر ۲۹۶ بمبئی
اوکاسا آج ہی استعمال کرنا شروع کر دیجئے

بزمِ ادب

مئی کا ادبی دنیا معمول سے بہت پہلے شائع ہو رہا ہے۔ دسمبر کے آخر میں سالنامے کی اشاعت کے بعد ماہوار پرچے ایک ایک ماہ کے وقفے سے شائع ہوتے رہے لیکن ہم نے ہر مہینے میں چند دن بچانے کی کوشش کی تاکہ عام نمبر مہینے کے آخر کی بجائے آغاز میں شائع ہو جائیں۔ خدا کا شکر ہے کہ ہماری کوششیں بار ور ہوئیں اور ماہِ رواں کا پرچہ اس وقت کہ مہینے کا آغاز ہے۔ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

زیرِ نظر نمبر کے دونوں علمی و ادبی مضامین ادارہ کی طرف سے پیش کئے جا رہے ہیں۔ "طلاق کی نفسیاتی اہمیت" ہندوستان کی مشہور سیاسی اور سوشل کارکن اور مفکر کملا دیوی چٹوپادھیائے کا ایک معرکتہ الا... انگریزی مضمون ہے جسے ایڈیٹر نے اردو کا لباس پہنایا ہے۔ اس تحریر کی خیال انگیزی شاید بعض ناظرین کے لئے ذہنی بے چینی کا سامان مہیا کرے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض ایسے سماجی مسلمات جو ہم پر پیرِ تسمہ پا کی طرح مسلط ہو رہے ہیں۔ ان کا جادو کچھ اسی قسم کی جرأت آموز اور فکر انگیز یورشوں سے ٹوٹے تو ٹوٹے۔ امید ہے کہ یہ مضمون غور اور دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

رفیق میراجی نے دورِ نغمہ کے سلسلے میں اس بار یونانِ قدیم کی شاعرہ سیفو کو ناظرین سے روشناس کرایا ہے۔ سیفو کا کلام کمیاب بلکہ نایاب ہے۔ منصور احمد مرحوم نے اس کے چند منتشر اشعار کا پاکیزہ ترجمہ ۱۹۳۶ء کے سالنامے میں شائع کیا تھا جو بے حد مقبول ہوا تھا۔ مرحوم سیفو کے متعلق ایک بسیط مضمون لکھنا چاہتے تھے لیکن دستِ اجل نے انہیں مہلت نہ دی۔ آج جبکہ انہیں دنیا سے سدھارے پورے دو سال ہوتے ہیں۔ میراجی نے اُن کی یاد میں یہ مضمون لکھ کر ہمارے چھلکتے ہوئے آنسوؤں کو تھام لیا ہے۔

چونکہ دونوں مضامین ادارہ کی جانب سے ہیں اس لئے اس دفعہ کے بہترین مضمون کا انعام افسانوں کی طرف منتقل کر دیا گیا ہے اور دو بہترین افسانوں کے لئے دس دس روپے کے دو انعامات دئیے جا رہے ہیں۔ اپندر ناتھ اشک کا افسانہ "یہ مرد" اور انور اعجاز صاحب کی کہانی "منزل" دونوں اپنی اپنی جگہ بہت کامیاب ہیں اور اس نمبر کے بہترین افسانے قرار دئے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں ہمیں یہ کہتے ہوئے افسوس ہوتا ہے کہ ہمارے اہلِ قلم حضرات سنجیدہ اور اعلیٰ پایہ کے علمی و ادبی مضامین کی طرف بہت کم متوجہ ہوتے ہیں۔ حالانکہ زبان و ادب کی سب سے بڑی خدمت یہی ہے کہ اہلِ علم اور اہلِ ذوق اپنے مطالعہ اور تحقیقات کے نتائج کو آسان اور عام فہم زبان میں ناظرین تک پہنچائیں۔ امید ہے کہ ہمارے قلمی معاونین نظموں اور افسانوں کی بہ نسبت ادب کی اس صنف کی طرف پہلے سے زیادہ توجہ فرمائیں گے۔

موجودہ اشاعت سے "شام کی باتیں" کے عنوان سے ایک نئے اور دلچسپ سلسلے کا آغاز ہوتا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ اس عنوان کے ماتحت فن کار جو باتیں کہہ سکتا ہے اور کہہ جاتا ہے وہ نہ افسانے میں کھپ سکتی ہیں اور نہ مقالے میں۔ اس سلسلے کی پہلی کڑی عشق اور ایک کار "ہمارے نوجوان فن کار کرشن چندر کی صناعی کا ایک لطیف نمونہ ہے۔ اگلی کڑی ہمارے مکرم دوست شیخ عباد اللہ ڈھال رہے ہیں۔

حصۂ نظم میں اب کے دو خاص رُت کی چیزیں ہیں یعنی موسمِ بہار پر دو شگفتہ نظمیں جو حضرات شاد عارفی اور سحر رام پوری نے لکھی ہیں۔ یہ دونوں چیزیں آمنے سامنے چھپی ہیں۔ حسنِ تقابل سے لطف اٹھانا اب آپ کا کام ہے۔

صلاح الدین احمد

آئینۂ عالم

جاپان کی تعلیمی ترقّی

ڈاکٹر نٹوبے کا قول ہے:-

"جاپان سکولوں کی سرزمین ہے بلکہ وہ خود ایک بہت بڑا سکول ہے۔ دورِ حاضر کا یونان۔ جاپانی جو قدیم یونانیوں کی طرح فطرتاً تیز اور چاق و چوبند ہیں، اور جن کی خاموش اور رسا کن طبیعت ہر نئی اور عجیب بات کو سیکھنے کے لئے ہر وقت تیار رہتی ہے، دریائے علم میں اس طرح کود پڑتے ہیں جس طرح بطخیں پانی میں"۔

دنیا کے کسی اور ملک میں پرانے تمدن کی جگہ نئی تہذیب کی آمد کا نظارہ اس قدر گوناگوں اور رنگین کیفیتوں سے معمور نہیں جس قدر کہ جاپان میں اور یہ انقلاب خواہ آپ اسے محض ظاہری کہیں بڑی تیزی اور شدت سے کارفرما ہے۔ نئی طرز کی فلک نما عمارتیں جو بڑے بڑے شہروں میں نہایت سرعت سے بنتی چلی جا رہی ہیں نئے نمونوں کی بے شمار موٹر گاڑیاں، نیم زلفوں والی شوخ و طرار لڑکیاں، ناچ گھر، سرود خانے اور اس قسم کی اور خصوصیات جاپانی شہروں کو نہایت تیزی سے تبدیل کر رہی ہیں اور ثابت کر رہی ہیں کہ جاپانی اپنے آپ کو کیسی آسانی سے نئے سانچوں میں ڈھال لیتے ہیں۔

کئی صدیاں گذریں کہ چینی تہذیب و تمدن نے اسی طرح جاپان پر حملہ کیا تھا۔ یہاں آکر اگرچہ اس میں بہت سی تبدیلیاں ہو گئیں لیکن اس کے باقیات آج بھی جاپان میں موجود ہیں۔ عہد میجی (۱۸۶۸ء سے ۱۹۱۲ء تک) سے قبل کے نظامِ تعلیم میں چینی عنصر کافی حد تک پایا جاتا تھا لیکن اس کے بعد مغرب سے تعلیم کے جدید طریقے اخذ کئے جانے لگے اور آج تک یہ سلسلہ نہایت استقلال سے جاری ہے۔

"نکلتے ہوئے سورج کی سرزمین" میں مغربی تہذیب و تمدن کا داخلہ اس کی تاریخ کا ایک اہم ترین باب ہے۔ یہ عمل ایسے حالات میں اور ایسے عظیم الشان پیمانہ پر ہوا کہ یہ باب درحقیقت ایک نئے عہد کا آغاز بن گیا۔ لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ جاپان ایک قدیم ملک ہے اور جب مغربی تہذیب نے پہلے پہل اس میں قدم رکھا تو یہ اسے پورے طور پر خوش آمدید کہنے اور اپنانے کے لئے تیار تھا۔

چینی رسم الخط اور کنفیوشسی کتابیں جاپان میں پہلے پہل تیسری صدی میں وارد ہوئیں۔ کتابوں کے ساتھ معلّم بھی آئے خصوصاً کوریا کا رہنے والا ایک عالم "وانی" اور ایک چینی علامہ "اچیکی"۔ شہزادوں کے اتالیق بنا دئیے گئے اور ان کے بعد مدتوں تک ان کی اولاد درباری واقعہ نگاری کی خدمات انجام دیتی رہی۔ بدھ مذہب اس کے تین صدیوں بعد جاپان پہنچا اور بہت جلد تمام ملک میں پھیل گیا اور اس نے اہلِ ملک کے روحانی زاویۂ نگاہ پر نہایت گہرا اثر ڈالا۔

اس زمانے میں پڑھنا پڑھانا شہزادوں اور نوابزادوں تک محدود تھا۔ یہ حالت آٹھویں صدی تک جاری رہی جب کہ عام تعلیم کا ایک نظام قایم کیا گیا۔ اور ضابطۂ "تیہو" کے ذریعہ اس کا وسیع پیمانے پر اجراء عمل میں لایا گیا۔ اس ضابطے میں ایک مرکزی کالج "دیگاکو" اور بہت سے صوبجاتی مدارس "کوکوگاکو" کے قیام کی دفعات شامل تھیں۔ جن کی بنا پر یہ تعلیم گاہیں چینی نظام تعلیم کے نمونوں کے مطابق جاری کی گئیں۔ بعد میں متعدد نوابی خاندانوں اور بدھ مبلغوں نے مختلف اضلاع میں پرائیویٹ کالج اور درسگاہیں بھی قائم کیں لیکن ان میں صرف اعلیٰ

خاندانوں کے نونہال داخل کئے جاتے تھے اور یہ طالب علم صرف چینی کلاسیکی علوم کی تحصیل کرتے تھے۔

اس کے بعد "آشی کاگا" کا دورِ تعصّب آیا۔ جب کہ دو اداروں —— کاناگاوا لائبریری اور آشی کاگا سکول —— کے سوا باقی تمام تعلیمی اداروں کی حالت خراب ہوگئی۔

اب کنفیوشس ازم[1] جو اب تک عالم رہبرانِ دین سے مختص تھی میدان میں آئی۔ اس نے ایک نئی بنیاد پر اپنے قدم جمائے۔ اور چینی علوم اور تمدن کی نشر و اشاعت کے لئے اعلیٰ پایہ کے متعدد معلّم اور ماہر پیدا ہوگئے۔

یہ عہدِ توکاگاوا کا واقعہ ہے۔ اس عہد کے اختتام تک ٹوکیو میں جو اس وقت ایڈو کہلاتا تھا تحصیلِ علوم کا ایک معقول نظام قائم ہوگیا اور اس کے فوراً بعد مختلف قبائل نے اپنے بچوں کی تعلیم کے لئے مختلف قبائلی مدارس جاری کر دیئے۔ یہ مدارس جن میں فوجی اور مدنی دونوں قسم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ دو سو ستر ۲۷۰ کی تعداد تک جا پہنچے۔ تب سے عوام کی تعلیم کو "تیراکویا" مدارس کے ذریعے سے فروغ ہونے لگا۔ ان مدارس میں گرد و نواح کے بچوں کو روزمرّہ کی عام باتوں اور ابتدائی اخلاقیات کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اور یہی مدارس ۱۸۶۷ء تک ابتدائی تعلیم پھیلانے کا واحد ذریعہ تھے۔

۱۴ مارچ ۱۸۶۹ء کو شہنشاہ میجی نے حرم کے سامنے "پانچ اصولوں کے شاہی فرمان" کی قسم کھائی۔ پانچویں اصول کا مفاد یہ ہے کہ "علم و حکمت کو دنیا کے ہر گوشے میں تلاش کرو[2]۔ تاکہ سلطنت کی بنیادیں مضبوطی سے قایم ہو جائیں" یہ عقیدہ نئی سلطنت کی قومی بنیاد بن گیا۔

عہدِ تجدید کے آغاز ہی سے نئی حکومت نے تعلیمِ عامہ کے فروغ کے لئے ایک سرگرم مہم جاری کر دی۔ سینکڑوں تعمیر شدہ مدرسوں میں درس و تدریس کو نئی زندگی ملی اور دار السلطنت ٹوکیو میں ایک امپیریل یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۸۷۱ء تک اداراتِ حکومت میں محکمہ تعلیم کا اضافہ ہو چکا تھا اور ۱۸۷۲ء میں اس محکمہ نے ایک مکمل تعلیمی نظام کا نفاذ کیا جو آج تک تعلیماتِ جدیدہ کی اساس کا درجہ رکھتا ہے۔

۱۸۹۰ء میں شہنشاہ نے اپنا وہ مشہور و معروف فرمان جاری کیا جس کی رو سے قطعی طور پر ملک کی اخلاقی تعلیم و تربیت کی بنیاد رکھی گئی اور جو آج ہر جاپانی بچے کے سینے میں محفوظ ہے کیونکہ وہ اسے ہر اہم موقعہ اور تقریب پر سنتا ہے اس فرمان کا ترجمہ حسب ذیل ہے! "اے ہماری رعایا۔ تمہیں جاننا چاہئے کہ ہمارے شاہی اسلاف نے ہماری سلطنت کو ایک نہایت وسیع اور ہمیشہ باقی رہنے والی بنیاد پر قائم کیا اور نیکی اور اچھے اخلاق سے اس کی تعمیر کی۔ اور ہماری وفادار رعایا کے لوگ نسلاً بعد نسلٍ آپس کی محبت کے ذریعے سے متحد ہو کر ان زرّیں اصولوں کی خوبی کا ثبوت دیتے رہے۔ ہماری سلطنت کی بنیادی خصوصیات کی عظمت کا راز اسی محبت میں پنہاں ہے اور ہماری تعلیم کا سرچشمہ بھی یہی محبت ہے۔ پس اے ہماری وفادار رعایا تم لوگ اپنے والدین اور اپنے بہن بھائیوں سے پُرخلوص محبت رکھو اور شوہر اپنی بیویوں سے اور بیویاں اپنے شوہروں سے نہایت رواداری اور سازگاری کا برتاؤ کریں۔ اور دوست دوستوں کے وفادار رہیں۔ اے لوگو اعتدال اور حیا کا دامن ہاتھ سے کبھی نہ چھوڑو اور اپنی مہربانیوں کا دائرہ اتنا وسیع کر دو کہ سب لوگ اس میں آ جائیں۔ علم و فن کی تحصیل میں جی لگاؤ اور ان سے اپنی ذہنی اور اخلاقی قوتوں کو ترقی دے کر اوجِ کمال پر پہنچاؤ عوام کی بہتری اور سب کے مشترکہ فایدے کے لئے کوشش کرو۔ ملک کے آئین و قوانین کا احترام کرو اور جب کبھی ضرورت پڑے اپنے آپ کو حکومت کی خدمت کے لئے پیش کر دو اور اس طرح ہمارے اورنگِ شاہی کی جو زمین اور آسمان کے ساتھ پیدا کیا گیا تھا، عظمت و شوکت کے قیام اور فروغ میں حصہ لو۔ ایسے چلن سے تم نہ صرف ہماری رعایا کے نیک اور وفادار افراد بن سکو گے بلکہ اپنے آبا و اجداد کی شاندار روایات کو بھی قایم رکھ سکو گے۔

یہ طریقے جو یہاں بتلائے گئے ہیں۔ ہمارے عظمت مآب اسلاف نے نافذ فرمائے تھے تاکہ ان پر اُن کے جانشین اور اُن کی آنے والی رعایا یکساں کاربند ہو۔ یہ شرع ہر زمانے اور ہر مقام کے لئے درست اور ہر خطا سے بالاتر ہے۔ ہماری آرزو ہے کہ ہم خود اور ہماری رعایا نہایت احترام سے اسے اپنے دلوں میں جگہ دے۔ تاکہ ہم سب خیر و خوبی کے اعلیٰ مدارج حاصل کر سکیں"۔

جاپانی نظامِ تعلیم کی بنیاد یکسر اس منشورِ شاہی پر رکھی گئی ہے اس لئے بچوں کی تعلیم میں خالص درسی چیزوں کی بہ نسبت اخلاقی امور پر بہت زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔

۱۸۹۰ء کے بعد جاپان میں ترقی تعلیم کی رفتار بہت تیز ہوگئی

---

[1] کنفیوشس کی تعلیم مذہبی تھی۔ [2] "اطلبوا العلم ولو کان فی الصین"۔ حدیث قدسی۔ ایڈیٹر

اب وہاں ایک ایسا مکمل نظام تعلیم قائم ہے جو کسی اعلیٰ درجہ کے مہذب مغربی ملک کے نظام سے کسی صورت میں کم نہیں۔ موجودہ نظام کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ اس میں مشرقی اور مغربی دونوں تمدن اپنی خوبیوں کے ساتھ جلوہ گر ہیں اور اس کی بنیاد جاپان کے قومی اداروں کی خوبصورتی پر قائم ہے۔ اس میں ایک طرف تو فرانس اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے نظامہائے تعلیم کی خصوصیات پائی جاتی ہیں اور دوسری جانب کنفیوسش کی تعلیمات کے نمایاں پہلو بھی برقرار رکھے گئے ہیں۔ یہ مخلوط نظام نئے دور حکومت کے آغاز سے چار سال بعد اسی سال میں نافذ کیا گیا جس سال جبری فوجی خدمت کا نفاذ ہوا۔ اس سے ایک ہی سال پہلے نظام جاگیرداری کا خاتمہ کیا گیا تھا۔ آج کل تعلیم کا سارا نظم و نسق حکومت کے ماتحت ہے جس نے بعض شعبے مقامی اداروں یعنی میونسپلٹیوں وغیرہ کے سپرد کر رکھے ہیں جس سے مقصود یہ ہے کہ مقامی ضروریات کا ہر جگہ لحاظ رکھا جا سکے۔ چند شرائط کے ماتحت غیر سرکاری اداروں اور افراد کو بھی مدرسے اور تعلیم گاہیں جاری کرنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ ملک بھر میں مختلف مدارج کے پینتالیس ہزار سکول ہیں جن میں ایک کروڑ پچیس لاکھ سے زاید طالب علم تعلیم پاتے ہیں۔

ابتدائی تعلیم اس ملک میں اس قدر ترقی کر چکی ہے کہ اس لحاظ سے امریکہ اور یورپ کے بہت کم ممالک جاپان کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ ابتدائی تعلیم کے مقاصد کے متعلق جاپان کا نقطۂ نظر مندرجۂ ذیل الفاظ میں بہت اچھی طرح ظاہر کیا گیا ہے "پرائمری تعلیم کا منشا یہ ہے کہ بچے کی معمولی نشوونما اور قومی اخلاق و ضروریات کا پورا لحاظ رکھ کر بچے کو ایسی علمی اور فنی تربیت دی جائے جو اُسے زندگی میں اپنی جگہ لینے کے قابل بنا دے"۔ جاپان میں پرائمری مدارس کی تعداد چھبیس ہزار اور طالب علموں کی تعداد ایک کروڑ بارہ لاکھ کے قریب ہے۔ ۱۸۷۲ء کے قانون کے مطابق ہر جاپانی بچے کے لئے چاہے وہ لڑکا ہو یا لڑکی، امیر ہو یا غریب چار سال تک کسی مدرسے میں تعلیم حاصل کرنا ضروری قرار پایا تھا۔ بعد میں یہ مدت چھ سال تک بڑھا دی گئی۔ اس قانون کے ماتحت ہر چھ سال کا بچہ مدرسے جانے پر مجبور ہے۔

تقریباً تمام ابتدائی مدارس میں ہر مضمون ملکی زبان میں پڑھایا جاتا ہے اور ابتدائی تعلیم کے عام ہونے سے لوگوں کے ذہنی اور اخلاقی نشوونما پر حیرت انگیز اثر ہوا ہے۔ ان پڑھ لوگوں کی تعداد اب صفر کے قریب پہنچ چکی ہے۔ اور جاپان ابتدائی تعلیم کے اس نظام پر جتنا فخر کرے کم ہے۔

اُن بیس لاکھ لڑکے لڑکیوں میں سے جو ہر سال پرائمری مدارس کا آخری امتحان پاس کر لیتے ہیں قریباً دس فی صدی لڑکے اور چھ فی صدی لڑکیاں ثانوی مدارس میں داخل ہوتی ہیں۔ یہ امر یاد رکھنا چاہئے کہ ثانوی مدارس اور کالجوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے علیحدہ علیحدہ انتظام ہے ثانوی مدارس کی تعداد سترہ ہزار چھ سو کے قریب ہے جن میں اکثریت مڈل سکولوں کی ہے اور نئے سکولوں کا کورس پانچ سال کا ہے اور ان میں جو مضامین رائج ہیں وہ یہ ہیں: تاریخ۔ اخلاقیات۔ جاپانی زبان اور ادب۔ قدیم چینی ادب۔ ریاضی۔ طبیعیات۔ علم الاشیا۔ کیمیا۔ قانون۔ معاشیات۔ صنعتی علوم۔ ڈرائنگ۔ موسیقی اور جمناسٹک۔

لڑکیوں کے ثانوی مدارس میں جو لڑکوں کے مڈل سکولوں کے مقابل ہیں۔ چار اور پانچ سال کے کورس رائج ہیں۔ ان مدارس کی طالبات کی تعداد لڑکوں سے بھی زیادہ ہے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ لڑکوں کی ثانوی تعلیم پر کم توجہ دی جاتی ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ لڑکے معمولی مدارس کے علاوہ خاص پیشہ ورانہ درسگاہوں میں بھی تعلیم پاتے ہیں۔ لڑکیوں کے ان مدارس کی ایک دل آویز خصوصیت معاشرتی آداب و اطوار کا کورس ہے جس کے ضمن میں چائے تیار کرنے اور پلانے اور گھروں میں پھول سجانے کے مضامین بھی شامل ہیں۔ اس مقصد کے لئے ہر گرلز سکول میں جاپانی طرز کے چند خاص کمرے ہوتے ہیں جنہیں آداب و اطوار کی لیبارٹری یا تجربہ گاہ کہنا چاہئے۔

ثانوی مدرسہ میں تیرہ سال گذرنے کے بعد طالب علم یونیورسٹی میں داخل ہوتا ہے جہاں سے وہ تین یا چار سال کے بعد فارغ التحصیل ہو جاتا ہے اور اگر امتحانات پاس کرنے کے علاوہ کوئی طالب علم کسی خاص مضمون میں طویل اور دقیق مطالعہ کے ذریعے سے کوئی قابلِ قدر تحقیقات کرتا ہے تو اسے ڈاکٹری کی سند سے سرفراز کیا جاتا ہے۔ اور ایسے طالب علموں کو فارغ التحصیل طلبہ کی یونیورسٹی میں مزید مطالعہ کا موقعہ بھی دیا جاتا ہے بیشتر یونیورسٹیوں کے تحقیقاتی شعبے نہایت درجہ اہم ہیں اور جاپان کی حکمی اور علمی ترقیاں زیادہ تر انہی تحقیقاتی شعبوں کے مفید کام پر مبنی ہیں۔

جاپان میں چھ شاہی یونیورسٹیاں ہیں۔ توکیو۔ کیوتو۔ اوساکا۔ فوکوکا۔ سنڈائی اور سپورو۔ جن میں سے ہر ایک میں کئی علمی اور فنی شعبے ہیں۔ ان کے علاوہ اس چھوٹے سے ملک میں ۱۳ سرکاری۔ ۲ پبلک۔ اور ۲۴ پرائیویٹ یونیورسٹیاں ہیں۔ اور یہ سب مل کر جاپان کے تعلیمی نظام کی آخری تکمیل میں حصہ لیتی ہیں۔

سائنس کی تعلیم پر جاپان میں خاص توجہ کی جاتی ہے۔ اور ابتدائی مدارس میں تعلیم کی اساس کتاب یا اُستاد کے بتائے ہوئے تجربوں کی بجائے طالب علموں کے کئے ہوئے تجربوں پر رکھی جاتی ہے۔ اور مدرّسوں اور طالبعلموں کو عام اس سے کہ وہ شہری مدارس سے تعلق رکھتے ہوں۔ یا دیہاتی مدارس سے علمی تحقیقات پر آمادہ کرنے کے لئے اُن کی مختلف طریقوں سے حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔ اس کا اثر یہ ہے کہ جاپان میں سائنس بہت تیز تیز قدم اٹھا رہی ہے اور بہت اچھے نتائج برآمد ہو رہے ہیں۔

بہت سے ممالک میں ریڈیو نے علم اور تہذیب کی روشنی پھیلانے میں بہت مدد دی ہے۔ اور جمہور کی تعلیم کے سلسلہ میں یہ ایک نہایت موثر اور کارگر ذریعہ ثابت ہوا ہے۔ جاپان میں براڈکاسٹنگ مشرقی اور مغربی تہذیبوں کے ایک نہایت خوشنما اتصال کی مثال ہے۔

حال ہی میں جاپانی وزیر تعلیم نے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ جاپان کی براڈکاسٹنگ کارپوریشن ریڈیو کے تعلیمی پہلو پر بہت زیادہ توجہ دیتی ہے اور اس کے پروگرام عوام کی تعلیمی ترقی میں بے حد مفید ثابت ہو رہے ہیں۔ پہلے پہل ریڈیو کو صرف تفریح کا ایک ذریعہ سمجھا جاتا تھا لیکن اب وہ ہمارے قومی اخلاق کے فروغ اور جمہوری تعلیم کے نشوونما کے لئے ایک ناگزیر عنصر ہوگیا ہے اور پبلک عملی طور پر اس حقیقت کو تسلیم کر رہی ہے۔

(مترجمہ صلاح الدین احمد)

مسعود صوفی

شعر

دھوم ہے پھر بہار آنے کی
کچھ کرو فکر مجھ دِوانے کی

میر تقی

رباعیات

(۱)

سنتا ہوں [illegible] کی چھبی ہے تیری
سنتا ہوں [illegible] کی چھبی ہے تیری
[illegible] بھی [illegible]
افسانہ [illegible] کی چھبی ہے تیری

(۲)

[illegible] کی چھبی ہے تیری
[illegible] کی چھبی ہے تیری
[illegible] سمجھ بھی نہیں
[illegible] کی چھبی ہے تیری

فراق گورکھپوری

تضمین

میرے لئے للہ بلا کیجئے اُس سے
جو کچھ وہ کہے مجھ کو سنا کیجئے اُس سے
اچھا کہ بُرا ذکر مِرا کیجئے اُس سے
یا رد مرا شکوہ ہی بھلا کیجئے اُس سے
مذکور کسی طرح سے جا کیجئے اُس سے

خاموشی سے جان اور بھی گھبراتی ہے جی میں
تسکین کسی طرح نہیں پاتی ہے جی میں
چُپ اُس کی تو اور آگ لگا جاتی ہے جی میں
جوں جوں وہ رکے ہے تو یہی آتی ہے جی میں
پھر چھیڑیئے اور باتیں سنا کیجئے اُس سے

رُوٹھے ہوئے ہر چند ہم اُس بزم سے آئے
پھر دیکھ رہے ہیں کہ کوئی آکے بُلا لے
کیا کیجئے افسوس کہ مجبور ہیں جی سے
سو مرتبہ یوں ٹھیر چکی اب سے نہ ملئے
یوں بھی تو نہیں بنتی ہے کیا کیجئے اس سے

تم چارہ گر عاشق بیمار ہو صاحب!
تم مرہم زخم دلِ افگار ہو صاحب!
صورت سے مری کس لئے بیزار ہو صاحب!
بیزار اگر مجھ سے ہو مختار ہو صاحب۔
دل جس سے ملے اپنا ملا کیجئے اس سے

اے حضرت امجدؔ نہ چلیں آپ کی گھاتیں
اس بازیٔ الفت میں ہوئیں سینکڑوں ماتیں
اب آپ ہیں اور آپ کی تنہائی کی راتیں
ہم کہتے نہ تھے دردؔ میاں چھوڑیہ باتیں
پائی نہ سزا؟ اور وفا کیجئے اس سے!

امجد حیدرآبادی

طلاق کی نفسیاتی اہمیت

مرکزی مجلس آئین ساز کے سامنے ہندو سوسائٹی میں طلاق کے جواز کے متعلق جو مسودۂ قانون آج کل پیش ہے۔ اُس کے باعث اہل ملک کی توجہ اس مسئلہ پر مرکوز ہو گئی ہے۔ اگرچہ ہندوؤں کے لئے طلاق ایک بالکل نئی چیز نہیں ہے (کیونکہ ان کے بعض فرقوں میں اس کا رواج پایا جاتا ہے) تاہم ان کی روزمرہ کی زندگی میں اسے ابھی تک کوئی حیثیت حاصل نہیں ہے۔ اور کتابی آئین کے لحاظ سے تو اس کا کوئی وجود ہی نہیں۔ ہندوستانی عام طور پر طلاق سے ایک شدید قسم کی بیگانگی اور جھجک محسوس کرتے ہیں اور سوسائٹی میں اس بدعت کے رواج کے خلاف اپنی آواز بلند کر رہے ہیں۔ درمیانے طبقے کے ہندو بھی طلاق سے قطعی طور پر نا آشنا نہیں ہیں کیونکہ ان میں سے جو لوگ سول میرج ایکٹ کے مطابق شادی کرتے ہیں وہ چند شرائط کے ماتحت شادی فسخ کرانے کا حق بھی رکھتے ہیں لیکن ایسی مثالیں بہت کم یاب اور شاذ ہیں۔

بہت کم ایسے مسائل ہیں جن پر دنیا کے مختلف حصّوں میں قانون اور رواج کا اس قدر اختلاف پایا جاتا ہو جس قدر طلاق کے بارے میں موجود ہے۔ ممالک متحدہ امریکہ ہی کو لیجئے۔ اس ملک کی مختلف ریاستوں میں طلاق کا قانون ایک میں کچھ ہے تو دوسری میں اس سے بالکل مختلف مثلاً جنوبی کیرولینا میں طلاق کا وجود ہی سرے سے غائب ہے اور اس کے مقابل نیوادا میں طلاق فریقین کی باہمی رضامندی سے فوراً حاصل ہو جاتی ہے۔ اسی طرح یورپ کے مختلف ممالک میں بھی طلاق کا قانون بے حد مختلف ہے۔ اگر ایک طرف کیتھولک عقیدے کے پیرو ممالک میں طلاق کو بہت برا سمجھا جاتا ہے۔ تو دوسری جانب سیکنڈ نیویا میں باہمی رضامندی اس مسئلہ کو فوراً حل کر کے رکھ دیتی ہے۔ انگلستان میں طلاق اگر ایک مشین کے سے عمل کا نام ہے تو سویٹ روس میں اس مسئلہ کے حل کرنے میں فہم و خرد سے کام لیا گیا ہے۔

اس سے ظاہر ہے کہ ابھی ہم نے اپنی مجلسی زندگی کو سائنٹفک طریق سے بسر کرنا نہیں سیکھا اور نہ ہمیں اب اپنے قدیم آباؤ اجداد کے قدرتی طور طریقے ہی یاد ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ شادی بیاہ کا معاملہ دھندلے جذبات۔ مبہم مذہبیت اور غیر حقیقی روحانیت کا ایک گورکھ دھندا سا ہو کر رہ گیا ہے جس سے چھٹکارا پا کر شادی کے ایک صحیح اور معقول تصور تک پہنچنے کے لئے بہت سے ناقابلِ فہم تعصبات اور بیکار اُلجھنوں کے خارزار سے گذرنا پڑے گا۔

بنیادی مشکل یہ ہے کہ ہم نے ابھی تک شادی کا کوئی سائنٹفک اور معقول تصور قائم نہیں کیا۔ شادی کا پرانا تصور بھی اسے مذہبی طور پر مقدس تسلیم کرنے کے عقیدے عورت کی جسمانی اور اقتصادی کمتری اور بچوں کو خاندان کی واحد ذمہ داری سمجھنے پر قائم ہے۔ یہ خصوصیات کم و بیش قبیلے داری کی زندگی سے متعلق ہیں۔ لیکن ان تصورات کی جگہ نئے تصورات نے لے لی ہے اور پرانی معاشرتی صورتیں تیزی سے بدل رہی ہیں۔ جدید اقتصادی اور تعلیمی تصورات نے ہماری سوشل زندگی پر اپنا مخصوص اثر ڈالنا شروع کر دیا ہے اور ضرورت پیدا ہو گئی ہے کہ ہم اپنی زندگی کو جدید تر اور حقیقت سے قریب تر راہوں پر چلائیں۔

شادی کا اوّلین مقصد خاندانی زندگی کی تہذیب و تنظیم ہے۔ جو آگے چل کر بچوں کی تولید اور اُن کی تربیت کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ شادی کی یہی خصوصیت ہے جس کے باعث وہ انسان کی نظر وں میں ایسی عدیم النظیر معاشرتی قدر و قیمت رکھتی ہے اس کی اہمیت اس کے جنسی پہلو سے پیدا نہیں ہوتی، ایسا ہو تو اس کے یہ معنی ہیں کہ ایک فریق کو دوسرے فریق پر مامد جنسی تفوق حاصل ہو جائے۔ شادی کا آئین اپنے پائے سے گر جائے اور حفاظت اور شخصی حقوق جنسی کے

نفاذ کا ایک گھٹیا سا نظام بن کر رہ جائے جو یقیناً شادی کا مقصد نہیں۔
محض زناکاری کو طلاق کی وجہِ جواز قرار دینے کا رواج جو انگلستان
جیسے ممالک میں پایا جاتا ہے۔ اسی قسم کے تصور کا نتیجہ ہے اور اسی تصور
سے شادی کا اصل مقصد فوت ہو جاتا ہے اور اس کی بنا پر ان ممالک میں
اور ملکوں کی بہ نسبت طلاق کے بہت زیادہ جعلی مقدمات تیار کر لئے
جاتے ہیں بعض اوقات دونوں فریق مل کر ایک ایسا حقیقت نما افسانہ
گھڑ لیتے ہیں جس سے فریقین میں سے ایک پر زناکاری کا الزام ثابت
ہو جائے اور طلاق حاصل ہو سکے۔ اگر یہ قانون نابود کر دیا جائے تو
ایسے بہت کم جوڑے نکلیں گے جو جنسی بے وفائی کے عذر پر طلاق
حاصل کرنا چاہیں گے۔ اور جہاں کہیں طلاق کے لئے یہی وجہ پیش
کی جاتی ہے۔ وہاں اکثر اوقات اس عذر لنگ کے پس پشت اور
وجوہ ہوتی ہیں جو فریقین کے لئے متاہل زندگی کو ناقابل بسر بنا چکی ہوتی
ہیں۔

وحدتِ ازدواج محض اس لئے مقبول نہیں کہ بیشتر اقوام کے
نزدیک اسے قانونی درجہ حاصل ہے بلکہ دراصل عام انسانوں کے
لئے یہ ایک قدرتی آسان اور سازگار طریق زندگی ہے۔ ایسے مطمئن
اور مسرور گھرانوں میں بھی بعض اوقات خصوصاً لمبی جدائیوں کے دوران میں،
ایک یا دوسرے فریق سے اتفاقیہ طور پر جنسی بے راہ روی خارج از
امکان نہیں۔ مگر اس سے شادی کی زنجیر کا یکسر توڑ دینا کیونکر لازم آتا ہے؟
انسانی جذبات بے حد عجیب ہیں اور اُن کے ہنگامی تاثرات بے حد
مختلف لیکن ان کی وجہ سے کسی فردِ واحد کو اس حد تک قابل تعزیر ٹھہرانا
کہ ایک جیتے جاگتے خاندان کو تباہ کر دیا جائے۔ ایک غلط اور غیر قدرتی
اقدام ہے۔ اس طرح شادی فقط ایک جنسی تعلق ہو کر رہ جاتی ہے۔ اور
قبضہ و اقتدار کے ایک خام اور عامیانہ خیال کو قانونی تقدیس مل جاتی
ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وسیع تر معاشرتی فرائض اور ذمہ داریاں ایک
اندھے جذبے پر قربان کر دی جاتی ہیں۔ ہمارے سوشل نظام میں
یہ ایک ایسا عنصر ہے جس کی حوصلہ افزائی سوسائٹی کو ہرگز نہیں کرنی
چاہیئے۔

بیشتر حالات میں جہاں بچوں کا معاملہ درمیان ہو وہاں شادی
کو ایک وسیع تر معاشرتی اہمیت حاصل ہو جاتی ہے۔ بچوں کا مفاد
اور ان کی آئندہ ترقی لازمی طور پر ساری سوسائٹی کے لئے ایک اہم اور
قابل توجہ امر ہے۔ یہ کسی اکیلے خاندان کا خانگی معاملہ نہیں اس لئے حکومت
کے لئے جو سوسائٹی کے عملی اور تنظیمی بازو کی حیثیت رکھتی ہے یہ لازم
ہے کہ وہ دخل انداز ہو کر بچوں کی حفاظت کا سامان کرے۔ کیونکہ
بچوں ہی کے باعث فسخ مناکحت ایک سماجی اور سیاسی مسئلہ بن
جاتا ہے۔ ورنہ نہیں۔

سوسائٹی عام حالات میں جن جسمانی اور طبعی امور کی بنا پر طلاق
کو جائز قرار دیتی ہے وہ چند ناقابل علاج امراض مثلاً جذام اور دیوانہ پن
اور عادی طور پر شراب خواری یا ارتکاب جرائم جیسی حرکات ہیں۔ کوئی
صاحب فہم شخص جسے عام معاشرتی بہبود کا خیال ہوگا۔ مذکورہ بالا امور
کی بنا پر طلاق کو بُرا نہیں سمجھے گا۔ ان میں دو اور ایسے امور کا اضافہ
کیا جا سکتا ہے جن کی بہت سی عورتیں شکار ہو جاتی ہیں یعنی خاوند کا
بیوی سے علیحدگی اختیار کر لینا اور اس کی کفالت سے ہاتھ کھینچ لینا۔
لیکن آج ہماری سماجی بیداری ہمارے روبرو ایسے اور عناصر بھی
پیش کرتی ہے جو مذکورہ بالا وجوہات سے کسی طرح کم اہم نہیں ہیں بلکہ
جو بیشتر حالات میں زندگی سے زیادہ گہرا تعلق رکھتے ہیں۔ انسان محض
گوشت پوست کا ایک چلتا پھرتا مجسمہ نہیں ہے بلکہ وہ سوچنے اور
محسوس کرنے والے دل و دماغ بھی رکھتا ہے۔ دورِ حاضر کی زندگی
پہلے سے بہت زیادہ گوناگوں اور پیچیدہ ہو گئی ہے۔ انسانی طبیعت کے
بھی نئے نئے پہلو نکل آئے ہیں۔ اور ہمارے جذبات و احساسات
روز بروز نازک تر اور ذکی تر صورتیں اختیار کر رہے ہیں۔

نہ صرف انسانی نظامِ جسمانی و ذہنی بلکہ نظامِ حکومت بھی ترقی
پا کر پیچیدہ تر ہوتا چلا جا رہا ہے۔ پرانے ضابطے اور آئین اور پرانی
روایات موجودہ ضروریات کی کفیل نہیں ہو سکتیں کئی بار ایسا ہوتا ہے
کہ دو افراد اپنے آپ کو ایک ایسے بندھن میں گرفتار پاتے ہیں جو اُن
کے لئے روز بروز ناقابل برداشت ذلتوں کا موجب بنتا جاتا ہے۔
اب نہ جانے وہ کسی کے بہکائے سے اس میں گرفتار ہوئے تھے یا
کوئی غلط جذبہ۔ کوئی نظر فریب نقش۔ کوئی فلک پرواز تخیل یا پھر نافہم
والدین یا بے درد رشتہ داروں کی سنہری روپہلی مصلحتیں ان
کے ربطِ بے آہنگ کا باعث بنی تھیں۔ بہر حال سبب کچھ ہو نتیجہ
بے حد افسوسناک ہوتا ہے۔

پھر ایک ایسا مرحلہ آتا ہے کہ وہ تقدس جو کبھی مناکحت کا ضروری

جز دھوتا ہے، خاک میں مل جاتا ہے۔ قدیم روایات سے شدید وابستگی کسی کے کام نہیں آتی۔ جس طرح بچوں کی خاطر عام طور پر طلاق سے احتراز مناسب ہے۔ اسی طرح بعض اوقات انہیں کی خاطر طلاق ازبس ضروری بھی ہو جاتی ہے۔ بدقسمتی سے ہمارے رہبران اخلاق طلاق کو گناہ کی پاداش سمجھنے میں اس درجہ منہمک ہیں کہ وہ اسے بچوں کے مفاد کے لئے ایک ضروری چیز سمجھنے سے قاصر ہیں۔

اس بات سے کون انکار کر سکتا ہے کہ جہاں بچے موجود ہوں وہاں طلاق ایک مصیبت عظمیٰ کا درجہ رکھتی ہے۔ جدید علم النفس بچے کے لئے ماں اور باپ دونوں کے اثرات کا وجود بے حد ضروری قرار دیتا ہے۔ پس طلاق بچے کو زندگی کے ایک بنیادی اور حیات افروز عنصر سے محروم کر دیتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس کے یہ معنی ہیں کہ بچے کی فطرت میں شروع ہی سے خم پیدا ہو جائے۔ شاید اسی لئے بعض میاں بیوی ایک دوسرے سے ناخوش ہونے کے باوجود کنبے کو صحیح سلامت رکھنے کے لئے بہادرانہ کوشش سے کام لیتے ہیں اور اپنے آپ کو بچوں پر قربان کر دیتے ہیں۔ ہزار آفرین ہے اُن پر۔ مگر ایسا ہونا اُسی وقت ممکن ہے جب فریقین میں اپنی ذمہ داری کا ایک نہایت گہرا اور مشترکہ احساس ہو لیکن یہ احساس کئی جگہ مفقود ہوتا ہے اور زندگی باہمی الزام دہی اور چھوٹی چھوٹی لڑائیوں کے ایک ختم نہ ہونے والے سلسلے کا حکم رکھتی ہے۔ اور جب فریقین میں سے ایک فریق دوسرے پر اقتدار رکھتا ہے۔ تو ان خصوصیات کے علاوہ انتہائی ظلم و ستم اور زندگی کے ہر خوبصورت بلند اور خوش آیند پہلو کی تباہی یقینی ہے۔ کسی بچے کو ایسے ماحول میں زندگی بسر کرنے پر مجبور کرنا بھی انتہائی ظلم ہے۔ اور اسے اس سے بچانا ایک بڑے معاشرتی فرض کی بجاآوری ہے۔

ہاں جہاں بچے موجود نہ ہوں وہاں طلاق مذکورہ مشکلات کا ایک بالکل صاف اور آسان حل ہے۔ لیکن جہاں بچے موجود ہوں وہاں حکومت کا فرض ہے کہ ان کے مستقبل کی پوری نگہداشت کرے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ طلاق کو جیسا کہ آج کل دستور ہے، ایک مقدمے کی صورت میں منظر عام پر لایا جائے۔ یہ طریق انسانی جذبات اور ذہنی کیفیتوں کی سراسر توہین ہے۔ اُن افراد کے لئے جنہوں نے بہت سے شیریں لمحے نہایت خوشگوار کیفیات میں بسر کئے ہوں۔ یہ کس قدر ہیبت ناک ہے کہ وہ عدالت کے کٹہرے میں کھڑے ہو کر ایک دوسرے پر محض اس لئے بیہودہ الزامات لگائیں کہ وہ آپس میں جدائی چاہتے ہیں۔ ایک ناگوار صورت حالات سے نجات حاصل کرنے کے لئے اتنی بڑی قیمت ادا کرنا یقیناً سراسر ظلم اور منشائے قدرت کے خلاف ہے۔ طلاق کی کئی مثالیں ایسی بھی ملتی ہیں جہاں لڑائی جھگڑے اور باہمی تلخی مطلق موجود نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس فریقین میں ایک صورت حالات کی ایک خاموش اور پر وقار مفاہمت پائی جاتی ہے۔ بلکہ بعض جوڑے تو اُس زنجیر سے رہائی پا کر جو اتحاد کا رشتہ نہیں رہتی۔ ایک دوسرے کے بہتر دوست بن جاتے ہیں۔ مگر ہمارے قانون ساز ان تمام باتوں کو فراموش کئے بیٹھے ہیں۔ اُن کا انداز تفکر اور رویہ اس بارے میں نہایت غیر قدرتی اور مشین کے عمل سے مشابہت رکھتا ہے۔ وہ انسانی فطرت کو بھی ایک مشین سمجھتے ہیں جو ایک مقررہ فارمولے کے مطابق کام کرتی ہے۔

ہر فسخ نکاح کی تہ میں ایک جذباتی تلاطم ضرور برپا ہوتا ہے۔ یہ احساس بعض اوقات جدائی کے ایک زبردست جھٹکے اور بعض دفعہ ایک شدید ذہنی انتشار کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ ایسے حالات میں ضروری ہے کہ نہایت احتیاط اور ملائمت سے کام لیا جائے۔ اور جہاں کہیں باہمی رضامندی سے طلاق طے پائے وہاں اسے مشتہر کرنے اور ہر قسم کی تکلیف دہ کارروائیوں سے گذارنے کی بجائے نہایت سکون اور خاموشی سے انجام پانے دینا چاہئے۔ باہمی رضامندی کی طلاق کو سوسائٹی کی رضامندی حاصل ہونی چاہئے مخالفت نہیں۔ شاید بعض لوگ یہ خیال کریں کہ ایسی روش سے فسخ نکاح کی حوصلہ افزائی ہو گی۔ لیکن ہماری عام فہم و فراست اور اعداد و شمار اس مفروضہ کے خلاف ہیں۔ اس لئے کہ شادی محض جسمانی اختلاط اور عارضی جنسی کیف سے بہت بلند مرتبہ رکھتی ہے۔ وہ دو مختلف مزاجوں اور فطرتوں کا ملاپ ہے۔ ایک جال ہے جو قریب ترین صحبتوں اور ناقابل فراموش یادوں کے تار و پود سے بنا جاتا ہے اسی لئے اس کا تصور دائمی رفاقت اور ہمدمی کے ایک خوشگوار مستقبل سے وابستہ ہے، اسی لئے یہ رشتہ بہت سے غیر معمولی صدمات کا کامیابی سے مقابلہ کر لیتا ہے اور اسی لئے آج ہماری سوسائٹی میں طلاق ایک قاعدہ نہیں بلکہ ایک استثنےٰ ہے۔

ہمارے سماجی نظام میں طلاق کی غیر موجودگی ایک ظالمانہ جنسی تصور اور حقیقت ناشناسی کا اظہار کرتی ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ سوسائٹی اب تک غیر معقول بندشوں سے بلند نہیں ہو سکی۔ اور یہ امر قدرتاً جنسیات کے متعلق سوسائٹی کے عام اندازِ نظر کو خراب کرتا ہے۔ اسی لئے جنسی طرزِ عمل کو سازگار ترین ماحول میں ایک مقصد کے حصول کا ذریعہ سمجھنے کی بجائے سماج مختلف جنسی کیفیتوں کی یک طرفہ اور من مانی قدریں مقرر کر دیتی ہے اور یہاں سے اخلاقیات کے دو رُخہ معیار کی ابتداء ہوتی ہے اور مرد چونکہ وہ یکطرفہ فیصلہ دینے کا مجاز ہے قرار دیتا ہے کہ اس کی جنسی زندگی کا کوئی اخلاقی پہلو نہیں ہے لیکن عورت کی جنسی زندگی اخلاقیات سے سراسر وابستہ ہے ہندوستانی سماج اس اندازِ خیال کی ایک روشن مثال ہے کہ اس میں عورت اسی نقطۂ نظر کے ماتحت ہر قسم کی روایتی اور قانونی مضرات کی شکار ہے پس ہماری صحیح سماجی ترقی کے لئے اس ملک میں طلاق کے ایک معقول قانون کے نفاذ کی اشد ضرورت ہے۔

(صلاح الدین احمد)

کملا دیوی چتوپادھیائے

[illegible]

سعید احمد اعجاز

غزل

رہروِ راہِ محبت کے لئے منزل نہیں
زندگی کا عشق حاصل، عشق کا حاصل نہیں

چشمِ ساحل آشنا، تجھ سا کوئی غافل نہیں
دیکھ! طوفانِ اجل کی موج ہے ساحل نہیں

ابتدا میں ہر مصیبت پر لرز جاتا تھا دل
اب کوئی غم امتحانِ عشق کے قابل نہیں

قلزمِ ہستی ہے اصلی امتحاں گاہِ کمال
بحر کے طوفان کی ہر موج دریا دل نہیں

شعر کے پردے میں رازِ زندگانی فاش ہو
صرف لفظی شاعری کا وجدؔ میں قائل نہیں

روتے روتے آنکھ میں آنسو کی بوند
گوہرِ نایاب بن کر رہ گئی

اس نظر سے تم نے کیوں دیکھا مجھے
ہر تمنا خواب بن کر رہ گئی

سکندر علی وجد

ابوالہول

بچھا ہے صحرا اور اس میں ایک ایستادہ صورت بتا رہی ہے
پرانی عظمت کی یادگار آج بھی ہے باقی!

نہ اب وہ محفل، نہ اب وہ ساقی
مگر انہی محفلوں کا اک پاسباں کھڑا ہے!

فضائے ماضی میں کھو چکی داستانِ فردا،
مگر یہ افسانہ خواں کھڑا ہے!

زمانہ ایوان ہے
یہ اس میں سُنا رہا ہے
پرانے نغمے!
میں ایک ناچیز و ہیچ ہستی،
فضائے صحرا کے گرم و ساکن، خموش لمحے،

مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے۔
ابھی وہ آجائیں گے سپاہی،
وہ تند فوجیں
دلوں میں احکام بادشاہوں کے لے کے آجائیں گی افق سے

ہوائے صحرا نے چند ذرّے کیے پریشاں
ہے یا وہ فوجوں کی آمد آمد؟

خیال ہے، یہ فقط مرا اک خیال ہے، میں
خیال سے دل میں ڈر گیا ہوں،
مگر یہ ماضی کا پاسباں پُرسکون دل سے،
زمیں پہ اک بے نیاز انداز میں ہے قائم!

میراجی

شام کی باتیں

عشق — اور ایک کار

کل رات تعلیم یافتہ بے کاروں کے کلب میں اُپندر نے محبت کے موضوع پر ایک جذباتی تقریر کر ڈالی، محبت ایک جذبۂ الٰہی ہے۔ خدا اور سورج کی طرح محبت بھی نسل، قوم، ملک اور رنگت کی تمیز سے بالا تر ہے اور امیر اور غریب کو یکساں مسرت بہم پہنچاتی ہے، آہ، اُپندر نے آنکھیں اوپر چڑھا کر ایک تیز حسیاتی لہجے میں کہا "محبت تو فرشتوں کا جذبہ ہے۔ کُل کائنات پر محبت کی حکمرانی ہے۔ محبت خدا کا بہترین عطیہ ہے۔ جو اپنی مخلوق کو بخشا گیا ہے۔ کل کائنات کا نظام محبت پر قائم ہے آہ! محبت!" یہ کہہ کر اپندر نے آنکھیں بند کرلیں اور چُپ ہو گیا، اُس نے سمجھ لیا کہ اُس کی تقریر کے بعد کلب کے کسی دوسرے ممبر کو تنقید و تبصرہ کرنے کی جرأت نہ ہوگی، کم از کم اس کی جرأت آمیز خاموشی یہی کہے دیتی تھی۔

یہ خاموشی چند ثانیوں تک طاری رہی، پھر راجندر نے دھیمے لہجے میں کہا "تمہیں کیا ہو گیا ہے اُپندر! کیا کرنا نے کوئی نیا تحفہ بھیجا ہے! کل تمہارے ہاں لکھنے کے ٹیبل پر میں نے ایک خوب صورت منقش میز پوش دیکھا تھا۔ کیوں؟" اس پر اُپندر کا چہرہ کانوں تک سُرخ ہوگیا۔ سب لوگ ہنس پڑے۔ "اُف۔" اوپندر نے حقارت آمیز لہجہ میں جواب دیا، "تم لوگ بشریت کے بہترین جذبات کو پاؤں تلے کی مٹی میں ملا رہے ہو، اور اُن جنتی چیزوں کو جن کی اساس روح پر قایم ہے۔ مادی چیزوں سے ملوث کر رہے ہو۔ آج ۔ ۔ ۔"

لیکن بشیر سے نہ رہا گیا۔ وہ اُپندر کا چیلنج منظور کرتے ہوئے بولا، "تو اور کیا۔ محبت تو کیا دنیا کی ہر چیز مادیت سے منسلک ہے۔ تم اس حقیقت کو محض ایک جذباتی تقریر سے نہیں جھٹلا سکتے، جذبات و حسیات کی دنیا مادے سے الگ نہیں بلکہ اسی کی مخلوق ہے، جو چیز گندے گوبر میں مچھر پیدا کرتی ہے وہی چیز مناسب ماحول پاکر تمہارے دماغ کی سلوٹوں میں محبت بن جاتی ہے۔ انگلز کی کتاب "اینٹی ڈوہرنگ" میں لینن نے بھی یہی لکھا ہے۔"

بشیر جیسا کہ بہت کم لوگ جانتے ہیں بحیرۂ ہند سے اِس پار تیسرا صحیح الدماغ اشتراکی ہے۔ اور اس وقت ہندوستان میں پانچویں انٹرنیشنل (مزدوروں کی بین الاقوامی جماعت) کی بنیاد رکھنے میں مصروف ہے، اس لئے جب کبھی وہ کلب میں کسی موضوع پر اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے۔ تو سوائے چند ایک سرپھرے ممبروں کے، باقی سب اس کے ہم خیال بن جاتے ہیں اور اُپندر ان سرپھرے اراکین میں سے ایک ہے۔

"کیا واہیات بات ہے" اُپندر نے کہا "محبت یقیناً کوئی ارضی چیز نہیں، بلکہ ایک آسمانی جذبہ ہے، ہاں، محبت ایک جذبہ ہے اور بس، اس کا مادے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ بشیر نے اپنے حکمی نقطۂ نگاہ سے جو نتائج برآمد کئے ہیں، وہ بالکل غلط ہیں، مثال کے طور پر اُپندر اور کرنا کے تعلقات کو ہی لے لو، یقیناً اُپندر اس بات کا برا نہ مانے گا اگر میں تشریح کے لئے اس کی مثال لے لوں۔ تو اب دیکھئے نا کہ کرنا اُپندر سے محبت کرتی ہے، والہانہ محبت! مجھے اس کا اچھی طرح پتہ ہے۔ لیکن یہ محبت ایک روحانی چیز ہے، ایک روحانی کشش ہے جو ان دو دلوں کو ایک دوسرے کے قریب کھینچ لائی ہے۔ کرنا کی محبت میں مادیت کی گنجائش نہیں، وہ ایک امیر لڑکی ہے، میرا مطلب ہے۔ کم از کم اُس کا باپ تو دولتمند ہے، اور اب دیکھئے کہ اس جماعتی تفریق کے باوجود وہ اس سے محبت کرتی ہے۔ اُسے اُپندر سے عشق ہے۔ اُسے اُپندر کے مضامین سے عشق ہے، یہ عشق یقیناً ایک لافانی کشش ہے۔"

"ج۔ س" نے اپنے حافظے پر زور ڈالتے ہوئے کہا۔ "لکھنے والوں

افسانوں کے مضامین کا ذکر کرتے ہو! میں اس بات میں ہری سے متفق ہوں، محبت ایک روحانی شے ہے، عورتیں مردوں سے اس لئے محبت نہیں کرتیں کہ وہ حسین یا امیر و کبیر ہوتے ہیں"۔

"کیا ہندوستان میں عورتیں واقعی محبت کرتی ہیں؟" کلب کے ایک زرو رُو ممبر نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ لیکن چونکہ سوال غیر متعلق تھا۔ اس لئے کسی نے اُس کی بات کی طرف توجہ ہی نہ کی۔

"میں کہہ رہا تھا" ج۔ س نے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے کہا۔ "ر ح۔ س آج کل اپنا زیادہ تر وقت نفسیاتی کتابوں کے مطالعے میں صرف کرتا ہے"۔ "ہاں، میں کہہ رہا تھا، میں کیا کہہ رہا تھا، ہاں ٹھیک، ٹھیک، میں کہہ رہا تھا کہ عورتیں مردوں سے اس لئے محبت نہیں کرتیں کہ وہ حسین یا دولتمند ہوتے ہیں۔ ان کی سعی تمام تر یقیناً ایک روحانی جذبے کی تکمیل کے لئے ہوتی ہے، ذرا خیال فرمایئے کہ صالح عورتوں نے محبت کے مسئلہ میں ڈاکٹروں انجنیروں، ڈپٹی کمشنروں اور سرمایہ داروں اور دوسرے امیر طبقوں کے افراد کے مقابلے میں غریب ادیبوں، فوج کے سپاہیوں، مطبخ کے نوکروں اور نٹ بال اور کرکٹ کے کھلاڑیوں کو ترجیح دی ہے، عورتیں عشق کے معاملے میں اُس مرد کا انتخاب کرتی ہیں جس میں کوئی غیر معمولی خصوصیات ہوں اور درحقیقت عورت کی محبت کو حاصل کرنے کا صحیح طریقہ بھی یہی ہے۔ کہ آدمی اپنی محبوب کی نظروں میں جگہ پانے کے لئے کوئی غیر معمولی بات کرے ادیب ہو تو ایک کروڑ الفاظ کا ایک بسیط مقالہ لکھے، کھلاڑی ہو تو ہاتھ پاؤں بندھوا کر ایک تالاب میں زیادہ سے زیادہ عرصہ تک تیرنے کی کوشش کرے، سپاہی ہو تو ——"

مجیب نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔ "تو گھٹنوں کے بل بازار میں چلنے کی کوشش کرے"۔

ج۔ س نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "میرا مطلب ہے کہ مرد کوئی ایسی بات ضرور کرے جس سے وہ اپنے محبوب کی نظروں میں غیر معمولی اور فوق الفطرت معلوم ہو، جیسے اُس کے سر کے ارد گرد کوئی روحانی ہالہ سا چمک رہا ہو، اب ڈیوک آف ونڈسر کی مثال لیجئے۔ ڈیوک . . ."

"لیکن ہم ایک ڈیوک آف ونڈسر یا کرنا کی بات نہیں کر رہے"۔

شیام نے بات کاٹتے ہوئے کہا، "ایک ڈیوک آف ونڈسر والا اور ایک کرنا یہاں کوئی خاص فرق نہیں پیدا کرتے۔ اگرچہ میرا اعتقاد ہے کہ اگر ہم محبت کا سکی تجزیہ کریں، تو اس تجزیے کے نتائج ان دو غیر معمولی مثالوں پر بھی اسی طرح منطبق ہوں گے جیسے دوسرے لوگوں کی محبت پر، بات یہ ہے کہ محبت کو آخر کیوں غور و فکر کی نگاہ سے نہ پرکھا جائے۔ اور یہ محبت کا ایک روحانی جذبہ ہونا تو محض ایک طفل تسلی ہے۔ عشق کو مادے کے ماحول میں رکھ کر اسی آسانی سے پرکھا جا سکتا ہے جیسے نیوٹن کے قانون حرکت کو یا انسانی جلد پر پسینہ پیدا ہونے کے عملیے کو اور سچی بات تو یہ ہے کہ مرد ہمیشہ عورتوں میں ایک حسین چہرہ اور دلکش آداب کے جویا رہتے ہیں۔ اور اگر وہ ہندوستانی ہوں، تو ایک گراں قدر جہیز بھی چاہتے ہیں، اور عورتیں! عورتوں کو بھی عشق و محبت کے سلسلے میں جن خصوصیات کی تلاش ہوتی ہے ان کو روحانیت سے کم لگاؤ ہوتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ آپ ایک آرام دہ گھر، معقول آمدنی اور ہر جی حضور شوہر کو روحانی چیزیں کہہ دیں۔ پس عشق کے صحیح نظریئے میں روحانیت کے لئے کوئی جگہ نہیں، عشق کی اساس بھی انسانی زندگی کے دیگر محرکات کی طرح مادے پر قایم ہے۔ اور اسی طرح سمجھی بھی جا سکتی ہے، انسان کے مادی ماحول میں تغیر و تبدل ہونے پر محبت کے نظریئے میں بھی مناسب تبدیلی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ نہ صرف محبت میں بلکہ انسانی زندگی کے تمام سماجی تعلقات اسی ناگزیر تغیر کی وجہ سے تبدیل ہوتے، بنتے، بگڑتے اور سنورتے رہتے ہیں، قرون وسطیٰ کے مادی ماحول میں مجنوں کو عشق جتانے کے لئے صرف ایک اونٹ کی ضرورت تھی، وہ اپنے محبوب کو محمل میں بٹھا کر اونٹ کی نکیل اپنے ہاتھ میں لئے بادیہ پیمائی پر تُل جاتا تھا اور اپنے محبوب سے پوچھتا تھا۔

محمل سجا ہوا ہے بعزم سفر ہے آج!
اے جانِ قیس تیرا ارادہ کدھر ہے آج؟

لیکن آج کل کے مجنوں کے لئے اونٹ کی ضرورت نہیں، اُسے تو ایک کار چاہئے۔ اونٹ سے لے کر کار تک محبت کے نظریئے میں جو جو تبدیلیاں پیدا ہوئی ہیں، وہ نہ صرف انسانی تاریخ کی مختلف منزلوں اور اس کی سماجی اور اقتصادی کیفیتوں کی آئینہ دار ہیں، بلکہ یہ بھی اچھی طرح ظاہر کرتی ہیں کہ محبت کا عملی نظریہ قرون وسطیٰ کے مادی ماحول سے تبدیل ہوتا ہوا اب خالصتاً سرمایہ دارانہ بن کر رہ گیا ہے، اور محبت کے موجودہ اصول اُسی اندرونی تضاد، اور جماعتی تفریق کے زیر اثر ہیں جو موجودہ سرمایہ دارانہ نظام میں برسرپیکار ہے۔ آج عشق سرمایہ دارانہ اور بورژوا ہے، میں یہ نہیں کہتا کہ عشق ایک جذبہ نہیں، میں صرف یہ کہتا ہوں کہ محبت آج کل کے مادی ماحول کے زیر اثر ایک محض بورژوا جذبہ ہے، جذبہ ترحم کی طرح!

شیام نے اپنی تقریر ختم کرتے ہوئے دائیں ہاتھ سے ایک چٹکی بجائی جیسے اُس نے ایک چٹکی سے اپنے مخالفین کے تمام دلائل کو باطل ثابت کر دیا ہو۔

اب ہر ایک کی نظر سکھو پر گڑی تھی، سکھو جو افسانہ نویس تھا، وہ کیا کہنا چاہتا تھا محبت کے بارے میں اُس کے کیا خیالات تھے۔ کلب کے سارے ممبر یہ جاننے کے لئے بے تاب ہو اُٹھے۔ سکھو آج اس تمام بحث کے دوران میں منہ پھلائے ہوئے ایک طرف بیٹھا رہا تھا۔ اب سب کی آنکھیں اپنے چہرے پر لگی دیکھ کر وہ اپنی کرسی پر ایک عجیب بے چینی کے انداز میں ہلا۔ کسمسایا، اور پھر کہنے لگا میں تمہیں ایک کہانی سنانا چاہتا ہوں —— یہ کہانی —— آپ بیتی ہے۔"

"ایک دفعہ کا ذکر ہے" سکھو نے کہنا شروع کیا "مجھے ایک لڑکی سے پہلی نگاہ ہی میں محبت ہو گئی۔ میں نے اُس سے خوبتر نسوانی حسن کا نمونہ آج تک نہیں دیکھا۔ بس وہ بالکل ریفیئل کی اس تصویر کی طرح تھی جسے ہم لوگوں نے پچھلے سال رائل آرٹ کی نمائش میں دیکھا تھا تو مجھے اُس سے والہانہ محبت ہو گئی، پہلی نگاہ میں، اور جوں جوں میں اس کی طرف دیکھتا جاتا تھا میری محبت بڑھتی جاتی تھی، اور اگرچہ اس میں کوئی شک نہیں کہ میں پلازا تھیئٹر کے تیسرے درجے میں بیٹھا تھا اور وہ فرسٹ کلاس میں تھی، لیکن پھر بھی میری محبت کا یہ عالم تھا کہ جب کبھی سینما کے دروازوں میں روشنی بڑھ جاتی تو میں مڑ کر اُس کی طرف دیکھنے سے باز نہ رہ سکتا تھا۔ اور کھیل کے ختم ہونے تک تو مجھے یہ یقین ہو گیا کہ ربِ عظیم نے مجھے ایک جاودانی جذبے سے نوازا ہے، چنانچہ اسی جذبۂ سرمدی سے سرشار ہو کر میں نے کھیل ختم ہونے کے بعد لڑکی کی کار کی طرف محو نگاہوں سے دیکھا اور پھر احتیاط سے اُس کا نمبر اپنی ڈائری میں محفوظ کر لیا۔ . . .

"یہ ہماری محبت کی ابتدا تھی۔ میں یہ بیان کرنا نہیں چاہتا کہ اس کے بعد ہم کہاں ملے اور کیسے، اور میری محبت کو کن نازک ترین مراحل سے گذرنا پڑا۔ میں یہ سب باتیں ج۔س ماہرِ نفسیات کے تخیلی تجربات کے لئے الگ رکھے دیتا ہوں۔ ہاں صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ ہم دونوں بہت جلد دوست بن گئے۔ مخلص دوست۔ اُس نے کبھی بھی میرے ماں باپ، گھر بار یا میری سماجی حالت کے متعلق استفسارات نہیں کئے۔ وہ مجھے یقیناً پسند کرتی تھی۔ اور پھر ایک دن میں نے لال باغ میں اُسے چند غنڈوں کی چھیڑ چھاڑ سے بچا لیا، اگرچہ اس میں شک نہیں کہ وہ غنڈے میں نے ہی کرائے پر مہیا کئے تھے اور میں ہی انہیں لال باغ لے گیا تھا۔ غرضکہ میں نے افضل بک ڈپو کے ناولوں کا ہیرو بننے کی پوری پوری سعی کی اور وہ اُس دن سے مجھے اور بھی پسندیدہ نظروں سے دیکھنے لگی اور میں تو اُس کے قدموں کی مٹی کو پوجتا تھا، ہم بہت جلد ایک دوسرے سے گھل مل گئے۔ وہ مجھے اپنے سفر کی حکایتیں سنایا کرتی۔ جب وہ اپنے ماں باپ کے ہمراہ بلادِ مغرب میں گئی تھی اور میں علم الریاضی میں اپنی اُن جدید تحقیقی و تدقیقی کاوشوں کا ذکر کیا کرتا، جن سے آئن سٹائن کے نظریۂ اضافت کی تکذیب ہوتی تھی۔"

"بہت خوب" ج۔س نے مزاحاً کہا۔

سکھو چند ثانیوں کے لئے خاموش ہو گیا۔ وہ حزن و ملال کی زندہ تصویر بنا ہوا تھا۔ آخر کچھ وقفے کے بعد آہستہ سے بولا "کہانی سننا چاہتے ہو یا نہیں۔؟"

ج۔س نے معذرت پیش کرتے ہوئے کہا "سوری اولڈ مین"۔

سکھو بولا "ہاں تو اب کہانی میں کیا رکھا ہے، میں یقیناً خوش تھا۔ اور یقیناً ایک لمبے عرصے کے لئے خوش رہتا۔ اگر اُپندر نے اپنے محبت کے جنتی نظریے سے میری عقل کو مسلوب نہ کر دیا ہوتا، پوچھ لو اُپندر نے مجھ سے کہا تھا کہ اپنی محبوبہ سے شادی کی درخواست کرو! کمبخت یہیں سامنے تو بیٹھا ہے!"

"پھر کیا ہوا؟" ہم سب نے ایک دم چلا کر کہا۔

"کچھ نہیں" سکھو نے سکون آمیز لہجہ میں جواب دیا، "اور سچ بات تو یہ ہے کہ جب میں اُس کے مطالعے کے کمرے میں نمودار ہوا، تو وہ مجھ سے نہایت ملاطفت سے پیش آئی۔ وہ اُس وقت ایک آرام کرسی پر بیٹھی بلند آواز میں ٹینی سن کا کلام پڑھ رہی تھی، اور اپنی شیریں، نازک اور دلفریب آواز سے خود ہی محظوظ ہو رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگی۔

"ہلو، ہلو۔ فاؤ ڈائی (وہ مجھے اسی طرح پکارا کرتی ہے)

"کر ——کی" میں نے کہا۔ اور میں اُسے اسی طرح بلایا کرتا ہوں۔

"ہیل —— لو" اُس نے پھر حیرانی سے کہا "یہ کیا؛ تم آج ایک نئی ٹائی لگائے ہوئے ہو، خیر تو ہے؟"

میں نے اپنے چہرے پر ایک حزنیہ مسکراہٹ پیدا کر لی اور پھر کرسی گھسیٹ کر اُس کے قریب بیٹھ گیا اور آہستہ سے کہنے لگا۔ "پڑھے جاؤ کر —— کی، پڑھے جاؤ۔ میں تمہاری شیریں آواز سننا چاہتا ہوں یہاں تک کہ یہ نغمہ کیٹس کی بلبل کے نغمے کی طرح مجھے اپنے آپ میں تحلیل

کرلے، آہ۔ تمہاری آواز کس قدر شیریں ہے"۔ اُس نے بلند آواز میں پڑھنا شروع کر دیا، لیکن اب وہ چیخ رہی تھی، اور تلخ لہجہ میں میری نقلیں اتار رہی تھی۔

"کل میں نے وائی۔ ایم۔ سی۔ اے میں پنگ پانگ چیمپین شپ جیت لیا" میں نے اپنے سر کے گرد ایک روحانی ہالہ بناتے ہوئے کہا۔

"بہت خوب" کرکی نے جواب دیا "کیا تم ایک دیوار کے مقابلے میں کھیل رہے تھے بدھوا ڈودانی"۔ "مذاق کی حد ہو چکی" میں نے جذبات سے گلوگیر لہجے میں کہا "میں تم سے پیار کرتا ہوں، مذاق کی حد ہو چکی، کرکی میری بات سنو۔ مجھے تم سے محبت ہے۔ بے اندازہ محبت، کرکی کیا تم مجھ سے شادی کرو گی؟"

وہ چند ثانیے خاموش رہی، پھر اُس نے سنجیدہ رُو ہو کر پوچھا "تمہارا باپ کیا کام کرتا ہے؟"

"سچی محبت" میں نے جواب دیا "مذہب، نسل اور باپ کی تمیز سے بالاتر ہے۔ یہ ایک روحانی، سرمدی ۔ ۔ ۔ ۔"

کرکی نے قطع کلام کرتے ہوئے پوچھا "تم ایک مہینے میں کتنا کما لیتے ہو؟"

میں نے احتجاجاً کہا "میں ــــ اشتراکی ہوں"

"کیا تمہارے پاس ایک کار ہے؟"

"کار تو نہیں، لیکن ایک بائیسکل ضرور ہے جو مجھے رنجیت سینما کی ایک دیوار کے ساتھ لگا ہوا مل گیا تھا" میں نے تشریحاً کہہ دیا۔

کرکی نے جھٹ گھنٹی بجائی، اور رئیس کا ملازم داؤد کمرے کے دروازے میں نمودار ہوا۔

"داؤد!" کرکی نے بلند آواز میں کہا، اُس کی آواز میں غصہ کے ساتھ عصمت و عفت کے نسائی جذبات کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے تھے۔ "داؤد ــــ اس بدمعاش کو کمرے سے باہر نکال دو"

سکھو نے داستان ختم کر دی اور اپنے خیالوں کی دنیا میں گم ہو گیا، کلب میں ایک سناٹا سا چھایا ہوا تھا، ج۔ س اور اُپندر اپنی کرسیوں پر اس طرح سہمے ہوئے بیٹھے تھے جیسے کسی اُستاد کی گھرکی سے بچے دبک کے بیٹھ جائیں، آتشدان میں جلتی ہوئی لکڑیوں پر تیز تیز شعلے چمک جاتے تھے، یکایک کلب کے سب سے پرانے ممبر نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور سکھو کے حزیں چہرے کی طرف دیکھ کر کہا "بیٹا سکھو، غم کھانے سے کیا ہوتا ہے! انقلاب کے لئے کام کرو، اور خدا کا شکر کرو کہ اپنی روحانی محبت کے باوجود تم زندہ ہو، ورنہ اگر تم کسی بورژوا ناول کے ہیرو ہوتے تو اس واقعے کے بعد یقیناً خودکشی کر لیتے ــــ"

کرشن چندر

غزل

اس فکر میں کہ دل کو کسی طرح کل پڑے
کیا کیا نہ اضطراب کے پہلو نکل پڑے

ہم پر کسی کی وہ نگہِ لطف کیا پڑی
سینے میں سوز و درد کے چشمے اُبل پڑے

احساس اپنی بے پر و بالی کا جب ہُوا
بے اختیار آنکھ سے آنسو نکل پڑے

پھر ہے قدم قدم پہ مرے دل کا امتحاں
ایسا نہ ہو کہ پھر کوئی افسانہ چل پڑے

مایوسیوں میں یوں نظر آئی ہمیں اُمید
تاریکیوں میں جیسے کوئی شمع جل پڑے

ہے بات جب کہ سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو
لیکن نہ اُس کی یاد میں کوئی خلل پڑے

حیرت عبث ہے شکوۂ جورِ عدو کہ ہم
آغازِ کار ہی سے غلط راہ چل پڑے

عبد المجید حیرت

دیارِ حبیب سے رخصت ہوتے ہوئے

آرزو و شوق لایا۔ یاس و حرماں لے چلا
کیا بتاؤں آہ! کیا کیا دل میں ارماں لے چلا

کل جن آنکھوں میں مہکتے تھے تری خلوت کے خواب
آج اُن آنکھوں میں اشکِ خوں کے طوفاں لے چلا

کل جو دل فرطِ مسرّت سے نشاط آباد تھا
آج اُس دل کو وفورِ غم سے ویراں لے چلا

کل جو دامن تھا امیدِ لطف سے رشکِ بہشت
آج اُس دامن میں برقِ شعلہ ساماں لے چلا

کل شمیمِ زلف سے جو ذہن تھا مہکا ہوا
آج اُس میں سینکڑوں خوابِ پریشاں لے چلا

کل بہار آرا تھا جس دل میں بہشتوں کا سماں
آج اُس میں حسرتوں کے خار و پیکاں لے چلا

کر رہا تھا کل تبسّم آہ! جن ہونٹوں پہ رقص
آج اُن ہونٹوں کو صرفِ آہِ سوزاں لے چلا

تم نے اتنا بھی نہ پوچھا کس لئے آئے ہو تم؟
جذبۂ بے تاب پر دل کو پشیماں لے چلا

ہجر کی راتوں میں جو لکھے تھے اشعارِ حسیں
بے سنائے اُن کو اپنے دل میں پنہاں لے چلا

"پھر نہ آؤں گا۔ نہ آؤں گا دیارِ پاکِ یار!"
بس یہی لب پر شہیدِ سوختہ جاں لے چلا۔

شہید ابن علیؔ (مرحوم)

مغرب کی سب سے بڑی شاعرہ

سیفو

"لوگ کہتے ہیں کہ سروشِ غیبی تعداد میں نو ہیں لیکن وہ بھولتے ہیں۔ کیونکہ دیکھو! لیسبوس کی سیفو بھی تو ہے جو دسواں سروش ہے"
"افلاطون"

۱۹۳۶ء کے سالنامے میں منصور احمد (مرحوم) نے یونانی شاعرہ سیفو کے کلام سے چند منظوم ٹکڑے شائع کئے تھے۔ اُن کا ارادہ تھا کہ سیفو کے متعلق کبھی کوئی مفصل مضمون بھی لکھیں گے لیکن اس ماہ انہیں یہاں سے گئے دو سال ہوتے ہیں اور اُن کی یاد کو تازہ کرنے کے لئے میں یہ مضمون پیش کرتے ہوئے ایک تسکین اور مسرت محسوس کرتا ہوں۔ میراجی

علامہ اقبال فرماتے ہیں:۔

مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن
اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ افلاطوں

یہ شعر عورت کے متعلق علامہ کی بلند خیالی کا ثبوت ہے۔ اس جگہ اس غلط خیال سے بحث مطلوب نہیں کہ عورت اور مرد میں کون برتر ہے بلکہ محض اس عورت کے تصور کو تازہ کرنا ہے جس نے ذہنی طور پر اپنی برتری کا ثبوت دیا۔ سیفو ایک ایسی عورت تھی جس کی بلند خیالی کے وہ مرد بھی قائل ہیں جن کی ذہانت انسانی تخئیل کی بنیاد ہے۔ سقراط اُسے "حسین سیفو" کہہ کر پکارتا ہے۔ ارسطو لکھتا ہے کہ "اگرچہ وہ عورت تھی لیکن مٹی لین کے رہنے والوں نے اُس کی قدر افزائی کی"۔

کیٹولس اور رہوریس نے اس کے کلام سے استفادہ کیا اور قدماء جس طرح ہومر کا ذکر کرتے ہوئے اُسے صرف "شاعر" کے لفظ سے پکارنا کافی سمجھتے تھے اُسی طرح وہ سیفو کو صرف شاعرہ کے لفظ سے ہی یاد کرنا کافی سمجھتے تھے۔ یونان کی قدیم سماج میں عورتوں کا درجہ مردوں کے برابر نہ سمجھا جاتا تھا اگرچہ انہیں بہت حد تک آزادی حاصل تھی پھر بھی ذہنی طور پر سیفو ہی سی عورتیں تھیں جو اُس زمانے کے مردوں سے اپنی برتری کا لوہا منواتی تھیں۔ چونکہ یونان کی سیاسی اور سماجی زندگی میں مرد کو برتری حاصل تھی بلکہ عورتوں کو کوئی درجہ حاصل ہی نہ تھا۔ اس لئے دنیائے ادب میں بھی گنتی کی چند شاعرات ہیں جن کا کلام ہم تک پہنچ سکا ہے۔ لیکن عورتوں کی یہ کمتری یونان کے دارالسلطنت ایتھنز تک ہی محدود تھی۔ دوسرے حصوں کا حال مختلف تھا۔ مثلاً اسپارٹا میں عورتوں کو مردوں ہی کی طرح تعلیم و تربیت دی جاتی تھی۔ اور مردوں ہی کی طرح وہ ہر قسم کے کام کاج کو اختیار کر سکتی تھیں اور اگرچہ سپارٹا نے علم ادب میں کبھی کچھ نہ کیا لیکن زندگی کے دوسرے پہلوؤں میں سپارٹا کے خیالات کا اثر یونان پر نمایاں حد تک ہوا۔ چنانچہ جب ہم یونانی دیومالا کو دیکھتے ہیں تو صاف طور پر ظاہر ہو جاتا ہے کہ یونانی دیواستھان میں (جو یونان کی انسانی ذہانت کی پیداوار تھا) صرف دیوتاؤں کو ہی امتیاز حاصل نہیں ہے بلکہ ان آسمانی کارروائیوں میں دیویاں بھی برابر کی شریک ہیں۔ اگر علم ادب کا دیوتا اپالو صیغۂ تذکیر سے نسبت رکھتا ہے تو ہندوستانی سرسوتی دیوی کے مطابق میں نیموسین کی نو بیٹیاں بھی سروشِ غیبی کا درجہ رکھتی ہیں اور اُن کی حیثیت اپالو دیوتا سے کسی طرح کم نہیں ہے اور اگر یونانی شاعری کی تاریخ کو بہ حیثیت مجموعی دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یونانی ادب کے چار مشہور زمانوں میں سے

دو بلکہ تین دور ایسے ہیں جن میں عورتوں کا حصہ کسی طرح بھی ناقابلِ ذکر نہیں ہے۔ اور ان عورتوں میں سے بھی اگر کسی نے شعر و ادب میں حصہ نہ لیا ہوتا تو سیفو ہی ایک ایسی شاعرہ تھی جس کا کلام شعر و ادب میں عورت کی برتری کو ہمیشہ کے لئے ثابت کرسکتا ہے۔ سیفو نہ صرف اپنے زمانے میں یونان کی سب سے بڑی شاعرہ گذری ہے بلکہ خالص تغزل کے لحاظ سے وہ آج تک دنیا کی سب سے بڑی شاعرہ تصوّر کی جاتی ہے اور اس کی شاعری میں دو باتوں نے ایک خاص دلچسپی پیدا کر دی ہے۔ پہلی بات یہ کہ اس کا کلام کم یاب بلکہ نادر ہے۔ اب تک صرف ساٹھ کے قریب ٹکڑے اس کی شاعری کے مل سکے ہیں اور ان میں بھی صرف ایک نظم مکمل ہے اور دو تین اور بڑے ٹکڑے ہیں۔ باقی سب دو دو تین تین سطروں کے جواہر پارے ہیں بلکہ بعض ٹکڑے تو صرف چند الفاظ پر مشتمل ہیں لیکن یہ اُدھورے ٹکڑے بھی چمکتے ہوئے ہیرے ہیں اور بھڑکتے ہوئے شعلے۔

دوسری بات اُس کے رنگین سوانح حیات ہیں۔

شاید سیفو کو اپنے گیتوں کے لافانی ہونے کا احساس تھا۔ ایک جگہ اس نے لکھا ہے ؎

پیشین گوئی

ہماری زندگی کے بعد شاید

کوئی فصل بہار آئے گی ایسی،

اُٹھے گی اک صدائے بازگشت اور

ہمارے گیت اِک دنیا سُنے گی

اور اگر اس ٹکڑے کو سیفو کی فن کارانہ خود اعتمادی پر محمول کیا جائے تو اس کے لئے دوسرے عظمائے یونان روما کی آرا بھی دلیل کے طور پر مل سکتی ہیں۔ دنیائے قدیم کا دیوِ دانش افلاطون کہتا ہے:۔

"لوگ کہتے ہیں کہ سروش غیبی تعداد میں نو ہیں، لیکن وہ بھولتے ہیں، کیونکہ دیکھو! لیسبوس کی سیفو بھی تو ہے، جو دسواں سروش ہے!"

سیفو کے متعلق یہ اُس انسان کی رائے ہے جس کی مجوزہ دنیا میں روایت کے مطابق شعرا کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔

یونانی شعرا کے موضوعات شعری کی بنیاد اُن احساسات و جذبات پر ہے جو طبع انسانی میں ازلی اور ابدی طور پر موجود ہیں علم ادب اور دوسرے علوم میں ہر ملک اور قوم متقدمین سے استفادہ کرتی آئی ہے لیکن اہل یونان کو اس لحاظ سے ایک امتیاز حاصل ہے۔ اُن کے شعرا نے اپنے سے کسی پہلے ادب سے استفادہ نہیں کیا۔ انہیں غیر ملکی زبانوں میں کوئی دلچسپی نہ تھی اور غیر ملکی تہذیب و تمدن بھی ان کے لئے بہت کم اپیل رکھتا تھا۔ وہ اپنے علوم و فنون میں صرف اپنے ہی دیس کی روایات سے زور پیدا کرتے تھے۔ اور اپنے قوانین اور معیاروں سے وفاداری ان کا شعار رہی۔ شاعری کے متعلق یہ بات اور بھی زیادہ حقیقت کا رنگ لئے ہوئے ہے۔ یونانی شاعری کی ابتدا ایک ایسے ماضی میں دھندلاتی ہوئی کھوگئی ہے، جسے نمایاں نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اس سلسلے میں تاریخ آٹھویں صدی (قبل مسیح) سے ہماری رہنمائی کرتی ہے۔ اور اس وقت سے لے کر یونانی شاعری عیسائی تمدن کے غلبے تک ترقی کرتی رہی۔

اُس زمانے میں جب یونان کی شاعری بامِ عروج پر پہنچی ہوئی تھی، یونانی شعرا کا کلام پڑھنے کے لئے نہیں بلکہ سننے کے لئے کہا جاتا تھا۔ اور جب تک کتابیں ایجاد نہ ہوئیں یونانی شعرا گائے جانے یا پڑھ کر سنائے جانے کے لئے ہی شعر کہتے رہے جب کوئی یونانی شاعر فکرِ سخن کرتا تو اُس کے ذہن میں کسی مطالعہ کرنے والے تنہا انسان کا تصور نہ ہوتا تھا۔ بلکہ اُس کے مدِ نظر کسی میلے یا مجمعِ عام میں گانے والے افراد ہوتے تھے۔ یا اُس کے اپنے دوستوں کا وہ حلقہ ہوتا تھا جس میں اسے خود کلام موزوں پڑھ کر اپنے اور دوسروں کے ذوقِ سلیم کی تشنگی مٹانا ہوتا اس طریقے کا یونانی شاعری پر ایک خاص اثر ہوا۔ کیونکہ سامع اور قاری دونوں کا براہِ راست گہرا تعلق ہونے کی وجہ سے شعر محض اقلیت ہی کے لئے دلچسپی کا باعث نہ رہا۔ شاعر کو ہر وقت اپنی پشت پر دوستوں کے حلقے اور عوام کے مجمع کا احساس رہتا اور اُن کی داد و تحسین اُسے ہر طرح سے مطمئن رکھتی، اور اُن کی داد و تحسین حاصل کرنے کے لئے ہی ایسی باتیں اس کا موضوع سخن بن سکیں جن میں عوام کو دلچسپی تھی اور جو انسان کے بنیادی رجحانات سے متعلق تھیں۔ اس طرح قدیم یونان میں شاعری ایک مخصوص اقلیت میں محدود ہونے سے بچ گئی اور اسی لئے صحیح معنوں میں اپنے وقت اور ماحول کی ترجمان بھی رہی۔

شروع سے یونانی شعرا کے زیر مشق دو اصناف سخن رہیں،

ؔ ترجمہ از منصور احمد۔ م

ایک رزمیہ نظم اور دوسرے اوڈ (ایک طرح کا قصیدہ جس میں تغزل بھی ہو)۔ رزمیہ نظم بیانیہ شاعری کی ذیل میں آتی ہے اور اس لئے اس میں کسی طرح کا شخصی یا ذاتی عنصر نہیں ہوتا تھا۔ یونان کے رزمیہ شاعر ہومر کا کلام اس صنف کا واضح ترین نمونہ ہے۔ دوسری صنف یعنی اوڈ (یا قصیدہ) اپنی فنی خصوصیات کی بنا پر آگے چل کر مختلف قسم کی نظموں کی تخلیق کا باعث بنی۔ اوڈ (قصیدہ) سماجی اور مذہبی موقعوں پر رقص اور ساز کے ساتھ گائے جانے کے لئے لکھی جاتی تھی۔ اس لئے ان قصیدوں میں یونانی شعراء اُن جذبات کا اظہار کرتے تھے جو وہ ایک دوسرے کے متعلق رکھتے تھے۔ یا اُن خیالات کو نظم میں لاتے تھے جو دیوتاؤں کے متعلق اُن کے ذہنوں میں پیدا ہوتے تھے۔

رزمیہ نظم اور قصیدے کی بنیادی اصناف سخن کے ساتھ ہی ایک اور صنف بھی تھی۔ یہ ایک قسم کے گیت تھے۔ اور آج کل کی نظموں سے ان کی مشابہت اس خصوصیت میں تھی کہ یہ گیت شاعر صرف اپنی ذات اور اپنے لطف کے لئے لکھتا تھا۔ ان کے گائے یا سنائے جانے کے لئے کسی طرح کے مجمعے کی ضرورت نہ تھی۔ چونکہ یہ گیت ایک شخصی اور ذاتی نوعیت رکھتے تھے اس لئے ان میں موضوع اور بحروں کا اچھا خاصا تنوع رفتہ رفتہ پیدا ہو گیا اور یہ صنف قلبی احساسات کے اظہار کا مقبول ترین ذریعہ بن گئی۔ لیکن اس کی ترجمانی کا حلقہ دوست احباب کا محدود حلقہ ہی رہا۔

یونانی شاعری کے ابتدائی ایام میں یونان کے مختلف حصوں میں شعروشاعری کا چرچا رہا۔ لیکن پانچویں صدی میں یونانی تہذیب و تمدن اور شعروادب کا مرکز ایتھنز بن گیا۔ سنہ ۴۰۴ قبل مسیح میں ایتھنز پر سپارٹا کا قبضہ ہو گیا اور یوں ایتھنز کی قدیم سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔ لیکن یہ انقلاب صرف سیاسی انقلاب ہی نہ تھا۔ زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر بھی اس سیاسی تبدیلی کا اثر ہوا۔ چوتھی صدی قبل مسیح میں پانچویں صدی کا اعتماد اور دلجمعی مفقود تھی۔ یہ غربت، بے اطمینانی اور اندیشوں کا زمانہ تھا۔ اس لئے اس زمانے کی شاعری بھی اپنے میں کسی طرح کا زور نہیں رکھتی۔ اس کے بعد شاعری کا عروج دور سکندریہ کے نئے حالات میں ہوا۔ اس زمانے میں فن کاروں نے اپنی تخلیقات میں احساس شخصیت سے قوت اور زور پیدا کیا۔ قدیم روایات کی کمی اور پہلی لبریز حیات شہری حکومت سے دوری نے فن کاروں کو مجبور کر دیا کہ وہ اجتماعی زندگی کی بجائے اپنی انفرادی زندگی سے ہی تخلیقی مواد حاصل کریں۔

آج کل ہر ترقی یافتہ ملک کی شاعری کے بے شمار رنگ ہیں ان میں سے کئی رنگ ایسے ہیں جن کا خیال بھی یونانی شعراء کو نہ آسکتا تھا۔ مثال کے طور پر تصوف کی شاعری کا اُن میں فقدان تھا۔ اس کے علاوہ خالص نیچرل شاعری بھی اُن میں نہ تھی۔

یونانیوں کے خیال کے مطابق ایک شاعر کا کام اظہار حقیقت تھا۔ اگر کوئی شاعر کسی بات کو اخلاص اور عمدگی کے ساتھ کہہ سکتا ہو تو وہ کہے خواہ وہ بات اس سے پہلے بھی کئی لوگوں نے کہی ہو۔ یونان ایک بہت چھوٹا سا ملک ہے۔ اس لئے یونانیوں کی دنیا ایک محدود دنیا تھی یونان کے اکثر شعراء کی زندگی محدود اضلاع میں بسر ہوتی تھی اور اُن کے آس پاس کے شہروں کو سمندر یا پہاڑ اُن سے علیحدہ کر دیتے تھے۔ اُن کے پاس بہت کم کتابیں تھیں اور اُن کا تمدن ایک معین دائرے میں محدود تھا۔ لیکن انہی وجوہات کی بنا پر وہ جس چیز کو دیکھتے۔ نہایت واضح طور پر دیکھتے تھے۔ علوم و فنون کا بے پناہ انبار اُن کی نظر کو دھندلا نہ سکتا تھا۔ اگر ان کے ہاں تنوع نہ تھا تو اس سے انہیں یہ فائدہ تھا کہ اُن کے احساسات ذہنی ایک مرکز پر منجمد اور مرکوز رہتے تھے۔ مختلف تہذیبوں اور رومانی کے بار گراں سے انہیں آزادی حاصل تھی۔ اس لئے اُن کے شعراء جو دیکھتے وہ دکھاتے اور جو سنتے وہی سناتے تھے۔ چنانچہ سیفو کی شاعری کا بھی یہی حال ہے لیکن اس کی شاعری کے متعلق کوئی بات کرنے سے پہلے اس کے حالات جاننا اس لئے ضروری ہے کہ اس کی ادبی تخلیق اُس کی ذات کا ہی ایک حصہ تھی۔

سیفو کی زندگی کا افسانہ ساتویں صدی قبل مسیح کے آخر میں شروع ہوتا ہے۔ یہ زمانہ قدیم تاریخ میں ایک اہمیت رکھتا ہے۔ اس زمانے میں پرانی تہذیبوں کو زوال آرہا تھا اور نئی طاقتیں قیام حاصل کر رہی تھیں اور مغرب کے گوری رنگت والے انسان مشرق کے سانولے لوگوں سے قوت آزمائی کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ اور نوع انسانی کی تمدنی کارفرمائیوں کا مرکز یونان سے مغرب کی طرف سرک رہا تھا۔

سیفو کی شاعری کی نزاکت، لطافت اور نفاست اور اس کی سماجی آزادروی اُسے ہمارے اپنے زمانے سے قریب تر لاتی ہوئی محسوس ہوتی ہے لیکن اس کے ہمعصروں کے نام لیتے ہی ہمارے ذہنوں میں اس کی دوری کا احساس واضح ہو جاتا ہے۔

جب ہندوستان میں مہاتما بدھ کی "اہنسا پرمو دھرمہ" کا راج ہونے کو تھا اور جب بنی اسرائیل میں پیغمبر جرمیہ اور عزقائیل اپنی آتشیں گفتار کا جادو پھیلا رہے تھے اُس وقت یونان کے جزیرہ لیسبوس میں سیفو اپنی عشقیہ نظمیں لکھ رہی تھی۔ سیفو ۶۱۲ قبل مسیح میں پیدا ہوئی۔ یہ وہ عورت تھی جو دنیا کی سب سے بڑی شاعرہ مانی گئی ہے، جسے افلاطون "سرزمین غیبی" کہتا ہے اور جسے سقراط "حسن مجسم" پکارتا ہے۔ اور جس کے کلام کو عیسائیت کے ابتدائی ننگ... اور تنگ خیال حامیوں نے مخرب اخلاق سمجھ کر ضائع کر دیا۔

اندازے سے فیصلہ کیا گیا ہے کہ سیفو ۵۵۰ قبل مسیح تک زندہ تھی۔ محققین نے اُس کی عمر کے مختلف زمانوں کے سن مقرر کئے ہیں۔ اس اندازے کے لحاظ سے سیفو ۶۱۲ ق۔م میں پیدا ہوئی۔ سترہ سال کی عمر میں سنجیدگی کے ساتھ اُس نے ۵۹۵ ق م میں فکر سخن شروع کر دی۔ اکتیس سال کی تھی جبکہ ۵۸۱ ق م کہ اُسے جلاوطن کر دیا گیا اور پچپن سال کی تھی کہ ۵۵۷ ق۔م میں اُس نے خودکشی کر لی۔

ایریسوس کا مقام سیفو کی جنم بھومی تھا۔ اُس کی ماں کا نام کلیس تھا لیکن باپ کے متعلق شک کیا جاتا ہے کہ وہ جوانی ہی میں مر گیا تھا۔ محققین نے اُس کے آٹھ مختلف نام معلوم کئے ہیں۔ اب یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ ان آٹھوں میں سے اس کا اصلی نام کون سا تھا۔ سیفو کے ماں باپ کے حالات بھی تاریکی میں ہیں۔ صرف اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ لیسبوس کے اُونچے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ بھی اندازہ ہی ہے کہ اس کی پیدائش والدین کی جوانی ہی میں ہوئی۔ اُس کے بعد تین لڑکے اور پیدا ہوئے۔ لیکن ابھی سب سے چھوٹا لڑکا ماں کی گود ہی میں تھا اور سیفو چھ ہی سال کی تھی کہ ۶۰۶ ق۔م میں لیسبوس کی پُرامن زندگی میں ایک ایسا ہنگامہ برپا ہوا جو دس سال تک لیسبوس کے پانچ شہروں کے لئے ایک مستقل پریشانی کا باعث بنا رہا۔ ممکن ہے کہ اس متواتر جنگ کی ابتدا ہی میں کسی مقام پر سیفو کا باپ کام آیا ہو۔ باپ کے مرنے کے بعد سیفو کی ماں نے اپنی اور بچوں کی حفاظت کے لئے یہی بہتر سمجھا کہ وہ جزیرے کے دوسرے کنارے پر مٹی لین کے مقام پر جا کر رہنا سہنا شروع کر دے۔ باپ کی موت اور اس نقل مکانی کے زمانے میں سیفو ابھی اپنے لڑکپن ہی میں تھی۔

ایریسوس سے مٹی لین تک بتیس میل کا سفر ہے۔ اور راستے میں صنوبر کے جنگل پڑتے ہیں زمانہ جنگ میں ان جنگلوں سے ہوتے ہوئے سیفو کی ماں اپنے بچوں کو لئے مٹی لین پہنچی۔ یہ بہت ممکن ہے کہ شروع شروع میں مٹی لین میں یہ لوگ اپنے کسی رشتہ دار کے ہاں ٹھہرے ہوں۔ بہرحال بچپن کا زمانہ جنگ کے جھمیلوں میں گذرا اور جب احساس و شعور پختہ ہوئے تو سیفو نے اپنے کو مٹی لین کے خوش منظر مقام پر پایا۔

ہمیں یہ بات معلوم نہیں ہے کہ اس زمانے میں لڑکیاں کس عمر میں شادی کے قابل سمجھی جاتی تھیں لیکن اندازہ یہی کہتا ہے کہ بیس سال کی عمر تک وہ کنواری رہنے کی آزاد زندگی بسر کرتی تھیں لیکن اس سلسلے میں سیفو کو کوئی ایسی جلدی نہ تھی اور حالات بھی کچھ ایسے ہی تھے کہ ملک کے نوجوان جنگ میں مصروف تھے اور جنگ کے بعد بھی کافی عرصے تک ملک کی حفاظت ہی ان کا اولین مقصد تھا۔ اس لئے شادی بیاہ اور گھر والے کی بہم رسانی کچھ آسان نہ تھی۔ نیز سیفو صورت شکل کی بھی کچھ ایسی نہ تھی کہ عام دیکھنے والا کوئی نوجوان اُسے دیکھتے ہی جلد سے جلد بیوی بنانے پر راغب ہو جائے۔ بلکہ ایک روایت تو یہ کہتی ہے کہ وہ نہ صرف خوبصورت نہ تھی بلکہ بد صورت تھی۔ اُس وقت کے یونانی معیار حُسن کے لحاظ سے اس کی آنکھیں اور اس کے بال زیادہ سیاہ تھے جسمانی لحاظ سے بھی وہ ایک دبلی پتلی منحنی سی لڑکی اور بال بچوں کے بکھیڑے سے عہدہ برآ ہونے کے ناقابل تھی۔ بلکہ اس کی سانولی رنگت کے باعث ایک مصنف لکھتا ہے کہ وہ ایک ایسی بلبل کی طرح تھی جس کے ننھے سے جسم کو بدنما پرو بال ڈھانپے ہوئے ہوں لیکن اُس کی ذہانت ان نسائی خامیوں کی پردہ پوش تھی۔ وہ ایک ایسی شاعرہ تھی جسے مولوی عظمت اللہ کے الفاظ میں کہا جاسکتا ہے کہ

"کامنی کوئل تھی تو
گیت سریلا تیرا!"

اور اس ذہانت کے علاوہ بھی اس میں اپنی انفرادی خوبیاں تھیں۔ اس کی بدنمائی بھی ایک ایسی بدنمائی تھی جس میں دیکھنے والے کے لئے ایک خاص قسم کا حسن موجود ہوتا ہے۔ اور یہ بات ہے بھی درست کہ جب قدرت کسی شخص میں جسمانی طور پر کسی طرح کی کوئی خوبی نہیں

رہنے دیتی تو وہ اپنی اس چیرہ دستی کی تلافی کسی نہ کسی صورت میں کر دیتی ہے۔ اور نعم البدل اپنے انفرادی اچھوتے پن کی وجہ سے حسن سے کہیں بڑھ کر دلکش ثابت ہوتا ہے۔ سیفو کے متعلق مشہور ہے کہ اس کی میٹھی مسکراہٹ میں ایک ایسی من موہن ادا تھی جو دیکھنے والے کے دل کو جھٹ اپنا لیتی تھی۔ اس کے علاوہ اس کے بالوں کی سیاہی میں ایک ہلکی سی نیلاہٹ تھی اور ان سب سے بڑھ کر اس کا رکھ رکھاؤ، اس کی نفاست طبعی اور اس کی وضعداری تھی۔ اور ان باتوں کے ساتھ جب ایک ایسی فطرت کا امتزاج ہو جائے جو گہرے، سلگتے ہوئے جذبوں کی مالک ہو، اور ان جذبوں کا اظہار اس کی آنکھوں کی چمک سے ہو رہا ہو، اور ان شعروں سے ہو رہا ہو۔ جن کے متعلق پلوطارک کہتا ہے کہ "اس کا کلام شعلوں میں لپٹا ہوا تھا"—— تو حسن کی روایتی خصوصیات کی ضرورت ہی کیا ہے خصوصاً جبکہ مٹی لین میں اونچے گھرانے کا ایک نوجوان ایسا تھا۔ جسے حسن اتفاق سے یہ حقیقت سجھائی دی کہ سیفو کی رنگ لاتی ہوئی جوانی ایک مرد کے دل کو لبھا سکتی ہے۔ یہ نوجوان الکے اس تھا جو بعد میں جا کر ایک شاعر کی حیثیت سے مشہور ہوا۔

سسرو کے مطابق الکیاس ایک خوش طبع عشق باز نوجوان تھا۔ یہاں تک کہ ایک بار جب وہ ایک جنگ میں گیا تو وہاں بھی کسی رزمیہ نظم کی بجائے محبت کے گیت ہی پڑھتا ہوا گیا۔ اس کے علاوہ وہ شراب کا بھی بے طرح عادی تھا اور نتیجے کے طور پر اس کی شاعری میں بھی شراب کا موضوع جا بجا نظر آتا ہے اس کی شاعری کے صرف "تین موضوع تھے۔ سیاسیات اور حب الوطنی، اور شراب اور محبت۔ چونکہ اس کی اپنی طبیعت لوگوں سے مختلف تھی۔ اس لئے سیفو کی غیر معمولی شخصیت میں بھی اسے ایک زبردست دلکشی محسوس ہوئی اور تیز طرار طبیعت والے شاعر نے ایک روز سیفو کو ذیل کا منظوم خط لکھ ڈالا۔

"میٹھی مسکراہٹ اور بنفشے کے پھولوں ایسے بالوں والی معصوم سیفو! میرا دل تم سے کچھ کہنے کو چاہتا ہے لیکن شرم مجھے روکتی ہے"!

سیفو شاید اس کی متلون مزاجی کی بہت سی داستانیں سن چکی تھی۔ اس نے ذیل کا منظوم جواب اسے لکھا:۔

"جو کچھ تم کہنا چاہتے ہو اگر وہ کوئی اچھی بات ہوتی، اور تمہاری زبان کسی برائی کا زہر اگلنا نہ چاہتی تو شرم تمہیں نہ روکتی اور تم جو کہنا چاہتے تھے، کہہ دیتے"!

لیکن الکیاس اس سے بے ہمت نہ ہوا۔ بلکہ سیفو کے سامنے منظوم اظہار محبت کرتا ہی رہا اور ہر مجمعے میں سیفو کی تعریفی نظمیں اور محبت کے گیت لوگوں کو سناتا رہا۔ اس وقت الکیاس کی شہرت بڑھ رہی تھی اور ان نظموں سے اس کے سامعین کی توجہ سیفو کی طرف ہو رہی تھی۔ اس لئے سیفو ایک ہونہار شاعر کی محبوبہ ہونے کے لحاظ سے ہی شہر کی ایک خاص شخصیت بن گئی۔ سترہ سال کی عمر میں ہی جب اس نے خود بھی شاعری شروع کر دی تھی، وہ شہر کے باذوق حلقوں میں ایک نمایاں دلچسپی کا باعث بن گئی اور چونکہ اس زمانے میں لیسبوس کی عورتوں کو ویسی ہی آزادی حاصل تھی جیسی کہ موجودہ مغربی سماج میں ہے۔ اس لئے سیفو اور اس کی معترف سہیلیاں سوسائٹی کے ہر مسئلے میں حصہ لے کر نام پیدا کر سکتی تھیں۔

لیکن الکیاس کی فریفتگی کے باوجود سیفو کو ابھی تک مردوں میں کسی طرح کی دلچسپی محسوس نہ ہوتی تھی۔ ممکن ہے کہ جنگ کے حالات کی وجہ سے وہ اپنی سہیلیوں کی سنگت کی اس قدر عادی ہو چکی ہو کہ اسے نوجوانوں کی صحبت میں کوئی لطف محسوس نہ ہوتا ہو۔ نیز اس کی نفاست پسند طبیعت اس وقت کے جنگ جو نوجوانوں کے سپاہیانہ طور طریقوں سے مانوس نہ ہو سکتی تھی گر وہ مردوں کو ناپسند نہ کرتی تھی کیونکہ انجام کار اس نے ایک مرد ہی کی محبت میں جان دی تھی۔ جس زمانے میں سیفو جسمانی اور نفسیاتی لحاظ سے بالغ ہو رہی تھی۔ اگر اس وقت لیسبوس میں جنگ نہ چھڑی ہوئی ہوتی، تو ممکن ہے کہ اسے یہ نشو و نما کا عرصہ صرف اپنی ہم جنس ساتھنوں میں نہ بسر کرنا پڑتا اور یوں اس کی احساساتی زندگی میں وہ رجحانات نہ ہوتے جن کی بنا پر اس کی نظموں کو بعد ازاں جلا دینے کے قابل سمجھا گیا۔

لامحالہ ابتداً سیفو کی شاعری پر الکیاس کی نظموں کا بہت حد تک اثر ہوا ہوگا۔ اور چونکہ الکیاس کی شاعری تغزل کی صنف سے تھی۔ اس لئے سیفو کے آئندہ تغزل پر اس کا اثر لازمی معلوم ہوتا ہے۔

لیکن یہی ایک ایسا شاعر نہ تھا جس کی ادبی تخلیقات نے سیفو کے کلام پر براہ راست یا بالواسطہ اثر اندازی کی۔ بلکہ چند اور متقدمین بھی تھے جن کا مطالعہ، قیاس غالب ہے کہ سیفو نے کیا ہوگا۔ ایک ایریون

تھا۔ اسی کے تمثال والے گیتوں سے یونانی ڈرامے کی نشو ونما ہوئی ۔ لیکن اس کی شاعری صرف شراب کی شاعری تھی اور اُس میں بھی سنجیدگی کا جزو غالب تھا۔ الکیاس اظہار نفسی کا زیادہ پابند تھا۔ اور اظہار نفسی ابھی شاعری میں ایک یکسر اچھوتی بات تھی اور چونکہ سیفو کو بھی آگے چل کر اپنے ہی دل کی باتوں کو شعر کے پردے میں بیان کرنا تھا۔ اس لئے ایسا شاعر ہی اُس کے لئے زیادہ دلکش ہوسکتا تھا۔

ایک اور شاعر لیسبوس کا بھاٹ ترپاندر تھا۔ یہ سپارٹا میں شاعری اور موسیقی کا استاد تھا۔ اور پہلا یونانی شاعر تھا جس نے سنجیدگی کے ساتھ مے نوشی کے نغمے لکھے۔

الکمن بھی ایک غزلیہ شاعر تھا جس کا کلام سیفو کے مطالعے میں ضرور آیا ہوگا۔ یہ بھی ایک جذباتی شاعر تھا اور نغمات محبت کو فن کا درجہ اہمیت دینے کی پہل کا سہرا اسی کے سر ہے۔ لیکن اس کی شاعرانہ بے باکی کی وجہ ہی سے اس کے کلام کو بھی انجام کار عیسائیوں نے جلا ڈالا۔ یہ شاعر بھی اپنی ہی زندگی اور احساسات کو اپنے کلام کی بنیاد بناتا تھا۔ اور اس کا اثر بھی سیفو پر لازمی ہے ۔

سمرنا کا شاعر ممنرموس ایک عجیب شخصیت کا مالک تھا۔ ناکام محبت اس کے کلام میں اثر کا باعث بنی۔ یہ پہلا شاعر تھا جس نے نوحہ کو اظہار محبت کا وسیلہ بنایا۔ یعنی نوحے اور مرثیے کی مقررہ بحروں میں محبت کے گیت لکھے۔ سیفو کا ابھی بچپن ہی تھا جب یہ شاعر اپنی شہرت کی بلندی حاصل کرچکا تھا۔

سسلی میں ہمیرا کا شاعر سٹیسی کورس پہلا شخص تھا جس نے لمبی رومانی بیانیہ نظمیں لکھیں اور یوں وہ ناول نگاروں کے لئے رہنمائی کا موجب ہوا۔

یہ سب شعراء سیفو کے زمانے کے شاعر تھے یا اس سے تھوڑا عرصہ پہلے ہوچکے تھے اور ان کے کلام نے سیفو کی شاعرانہ نشو ونما پر ضرور اثر اندازی کی ہوگی۔ لیکن یونانی شاعری اگرچہ سیفو کے زمانے میں کوئی پرانی چیز نہیں تھی۔ پھر بھی چند قدیم شاعر ایسے ہیں، جن کے مجموعہ ہائے کلام سیفو کے زیر مطالعہ آئے ہوں گے۔ مثلاً ہومر اور ہسیاڈ۔ لیکن ان کا کلام رزمیہ صنفِ سخن کی ذیل میں آتا ہے۔ اس لئے وہ سیفو کی بجائے مردوں کے لئے زیادہ دلکشی کا موجب ہوسکتا ہے۔ لیکن کورنتھ کے یومیلوس اور فریجیا کے اولمپوس کا کلام غزلیہ ہونے کی وجہ سے سیفو کے لئے پسندیدہ ہوسکتا تھا۔ کیونکہ تغزل (لِرک) ہی ایک ایسی صنف تھی جس میں یونانی شعرا شخصی اور ذاتی انداز نظر قایم کرسکتے تھے۔ اور شخصی اور ذاتی باتیں ہی یونان کی اس شاعرہ کی خصوصیت بھی تھیں۔ اس کے علاوہ اندازہ ہے کہ اُس نے چند اور قدیم شعرا کا کلام بھی ضرور دیکھا ہوگا اور ان میں آرچیلوکوس ایک خصوصیت رکھتا ہے۔ یہ سیفو سے ایک صدی پیشتر کا شاعر ہے۔ اس شاعر نے پہلے ایک لڑکی کی چاہت میں اور پھر اُسی سے متنفر ہوکر اُسی کے خلاف بے حد تلخی آمیز نظمیں لکھیں اور ان نظموں میں وہ اپنے دل کی گہرائی کو عریاں کرنے میں اتنا بڑھ جاتا ہے کہ اُن یونانی شعرا میں اُس کا پہلا درجہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ جن کی شخصیت کا آئینہ دار اُن کا اپنا کلام ہو۔ اسی شاعر کی تلخ نظموں نے چلتے چلتے طنزیہ نظموں (یا ہجو) کی مستقل حیثیت اختیار کرلی۔

ایک شاعر اور بھی ہے۔ سائمونائیڈز آرچیلوکوس سے چند ہی سال بعد ہوا ہے۔ یہ بھی ذاتی اور ہجویہ نظمیں لکھتا تھا اور اس کی بہترین نظم وہ ہے جس میں اُس نے عورت کی ہجو کی ہے اور اس میں کینہ ور عورت کو بلی، باتونی عورت کو بھونکتے ہوئے کتے، مکار عورت کو لومڑ اور گندی عورت کو سؤر سے تشبیہہ دی ہے۔

ان شعراء کے علاوہ چند اور ایسے شعراء کے نام بھی ملتے ہیں ۔ جن کا کلام قیاساً سیفو کے مطالعہ میں آیا ہوگا۔ لیکن یہاں اس بات کو نہیں بھولنا چاہئے کہ خود سیفو بھی یونان کے شعرائے متقدمین ہی میں سے ہے اور اس کی حیرت ناک ذہانت کو شعروادب میں اپنے سے پہلے بہت کم رہنما مل سکے۔ وہ مشہور شعراء اور ڈرامہ نگار جن سے یونان کے ادب کو دنیا میں اہمیت حاصل ہوئی سیفو کے بعد معرض وجود میں آئے۔ ایسچیلوس (المیہ کا حقیقی موجد) پنڈار (غزل گو) سوفوکلز اور یوری پائیڈز (مشہور ڈرامہ نگار) ارسطفنیز (ARISTOPHANES) ان سب کا زمانہ بعد کا ہے۔ سیفو غزل گو شعراء کی صف میں سب سے پہلے ہی دکھائی دے جاتی ہے۔ اس کی ناقابل تقلید شعری تخلیقات کا سرچشمہ اُس کا اپنا جذبات سے لبریز دل تھا۔ اس کے اپنے نفیس احساسات تھے، اور اُس کی اپنی طبع سلیم تھی۔ اور ماضی کے خزانوں سے اُس نے بہت ہی غیر اہم استفادہ کیا تھا۔

اُس کے اشعار میں تکلف یا بہانہ سازی نام کو بھی نہیں ہے۔ اور اس کی وجہ اُس کی ہر طرح کے سماجی معیاروں سے بے پروائی

ہے۔ اس کے اشعار میں ایک سادگی ہے۔ ایک بے ساختگی ہے، اچھوتی چیزوں ایسا ایک جادو ہے، جیسے صبح کا پہلا دھندلکا ہو یا جیسے نوجوانی کے بیتے دن، ایسی ہی اس کی شاعری ہے۔ اس کے شعروں میں ایک ایسی پہلو بچاتی ہوئی دلکشی ہے، جس کی وجہ معلوم کرنے سے ہمارا ذہن قاصر ہے، اور جس کی مثال ہمیں ماضی اور حال میں کہیں اور مہیا نہیں ہو سکتی۔

جے۔ ڈبلیو میکائیل ایک جگہ لکھتے ہیں "ہم چند ایسے سیدھے سادے لفظوں کو پڑھتے ہیں جنہیں بہت سیدھے سادے طریقے پر یک جا کر دیا گیا ہے۔ انہیں پڑھ کر ہم اُن کی ستائش کرتے ہیں اور پھر ہمارا ذہن چلتا ہوا آگے بڑھ جاتا ہے، لیکن اچانک ہم محسوس کرتے ہیں کہ جو شعر ہم نے پڑھا اس میں کوئی ایسا جادو تھا جو ہمیں لوٹنے پر مجبور کر رہا ہے۔ ہم لوٹتے ہیں، پھر چل دیتے ہیں۔ لیکن وہ جادو ہمیں ایک بار پھر وہیں لے آتا ہے تاکہ ہم معلوم کر سکیں کہ اس بے پناہ سحر کی نوعیت کیا ہے۔"

قدیم یونانی نقادان ادب سیفو کو انسانی شعرا میں شمار نہیں کرتے تھے وہ اُسے افرودائٹ دیوی اور ایروس (کام دیو) کی بیٹی کہتے تھے، دسواں سروش غیبی سمجھتے تھے۔ دیویوں کی پروردہ جانتے تھے اور اپالو دیوتا کی ہم جلیس خیال کرتے تھے لیکن ہم آج بھی ان چند ادھورے ٹکڑوں ہی سے اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان قدیم نقادوں کی رائے کچھ بے جا نہ تھی۔

جب ایتھنز والوں سے لیسبوس کی جنگ ختم ہوئی تو سپہ سالار پٹاکوس کو لیسبوس میں ایک قسم کے ڈکٹیٹر کی حیثیت سے اقتدار حاصل ہوا لیکن وہ کسی اونچے گھرانے سے تعلق نہ رکھتا تھا جس طرح آج کل یورپ میں ڈکٹیٹروں کا راج ہے۔ اسی طرح سیفو کے زمانے میں یونانی علاقوں کی حالت تھی۔ اور اگرچہ یہ ڈکٹیٹر حکومت کے کام کاج اکثر احسن طریق پر انجام دے سکتے تھے پھر بھی اُن سے امرا کا طبقہ مطمئن نہ تھا۔ کیونکہ یہ عموماً اپنی قوت بازو ہی سے حاکم کے درجے تک پہنچتے تھے ان کی اپنی لیاقت ہی انہیں اس اونچے درجے تک لے جاتی تھی۔

پٹاکوس الکیاس شاعر کے بڑے بھائیوں کی مدد سے تخت پر بیٹھا لیکن اس سلسلے میں شاعر نے اس کی کوئی مدد نہ کی کیونکہ وہ پٹاکوس سے پہلے ڈکٹیٹر کو بھی قابل عزت اور حکومت کے لائق سمجھتا تھا نتیجے کے طور پر پٹاکوس الکیاس کو اپنا دشمن خیال کرنے لگا لیکن ابھی الکیاس کی توجہ سیاسیات کی بہ نسبت شعر و شاعری اور سیفو کی محبت کی طرف زیادہ تھی۔

اسی عرصے میں ایک باغی سردار نے ڈکٹیٹر کا رتبہ اختیار کر لیا۔ پٹاکوس نے اس کی مدد بھی کی۔ لیکن خود بظاہر علیحدہ بھی رہا۔ بہرحال یوں رفتہ رفتہ سنہ ۵۹۶ ق۔م کے قریب حکومت کے خلاف ایک سازش کا قیام عمل میں آیا۔ اس سازش کے روح و رواں الکیاس شاعر اور اس کے بھائی تھے۔ لیکن انہوں نے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو بھی اس کام میں شامل کر لیا۔ یہ سازشی گروہ دونوں جنسوں پر مشتمل تھا۔ اور کسی نہ کسی طرح سیفو بھی اس سیاسی معاملے میں آ پھنسی لیکن اس سازش کا راز آشکارا ہو گیا اور الکیاس، اُس کے بھائی، سیفو اور باقی تمام کرتا دھرتا پِرّا کے مقام پر جلاوطن کر دیئے گئے۔ یہ جلاوطنی ایک سال تک رہی۔ کیونکہ جب باغی ڈکٹیٹر کی حکومت ناقابل برداشت ہو گئی تو پٹاکوس ہی کے ایما سے اس کو قتل کر دیا گیا۔ پٹاکوس ایک بہت چالاک انسان تھا۔ اُس نے ڈکٹیٹر بنتے ہی ان تمام جلاوطنوں کو واپس بلوا لیا۔

گویا سنہ ۵۹۵ ق۔م۔ میں سیفو وطن کو لوٹی۔ اس وقت اس کی عمر بیس سال کی تھی۔ اور ابھی اُس کا بیاہ نہ ہوا تھا۔ لیکن ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اب بھی وہ پہلے ہی کی طرح ایک معصوم لڑکی تھی۔ کیونکہ ان سیاسی سازش کرنے والوں کے جوشیلے، جوان اور جنوں پرور گروہ میں رہ کر یہ لازمی تھا کہ وہ ان تمام باتوں سے شناسا ہو جائے جن کو اُسے اپنی آئندہ زندگی میں اپنا موضوع سخن بنانا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی تصویر کا دوسرا رُخ بھی نگاہوں سے دور نہ ہونے دینا چاہیئے کہ سیفو کی کیفیت چھوئی موئی کے پودے کی سی تھی اور ممکن ہے کہ اُس نے اس سازشی ہنگامے میں بھی اپنی نفاست پسندی اور عالی دماغی سے کام لے کر اپنے کو شہوانہ عشرتوں سے علیحدہ ہی رکھا ہو۔

اس کی غیر معمولی شخصیت اس بات کا تقاضا کر رہی ہے کہ ہم یہ سمجھیں کہ جلاوطنی اور اس کے بعد کے زمانے میں وہ اپنے مخصوص سیاسی حلقے کی جان ہو گی اور الکیاس اور وہ دونوں ہی اس گروہ کے روح و رواں ہوں گے۔ یہ مانا کہ سیفو کی شاعری میں ایک نقطہ بھی کسی طرح کے سیاسی رجحانات کی چغلی نہیں کھاتا۔ لیکن اسی بات سے اس کی سیاسی کارکردگی کا اظہار ہوتا ہے کہ اپنے چند دوسرے ساتھیوں کے ساتھ

اُسے بھی پٹاکوس نے جلاوطنی کے لئے منتخب کر لیا تھا۔ اگر وہ سیاسی لحاظ سے خطرناک نہ سمجھی جاتی تو اُس کی جلاوطنی کی نوبت نہ آتی۔

جلاوطنی کے بعد بھی الکیاس پٹاکوس کے خلاف نظمیں لکھ لکھ کر لوگوں کو بھڑکانے سے باز نہ آیا اور اس لئے آخر اس کی گرفتاری کے وارنٹ جاری کر دیئے گئے لیکن وہ بھاگ نکلا اور ساتھ کے علاقے سے اپنے دوستوں کی مدد سے روپیہ جمع کر کے بغاوت پیدا کرنے کو لوٹا لیکن اس کی تجویزیں کامیاب نہ ہوئیں اور اُسے گرفتار کر لیا گیا۔ اس پر بھی پٹاکوس نے اپنی چالاکی یا نیک نیتی کا ثبوت دیتے ہوئے اُس کو معاف کر دیا۔ لیکن سازشیوں کی سرگرمیاں بس نہ ہوئیں اور پٹاکوس کو تنگ آکر ان تمام کو ایک بار پھر لیسبوس سے جلاوطن کرنا پڑا۔

سیفو کے لئے یہ دوسری جلاوطنی لازماً ایک زبردست صدمہ ثابت ہوئی ہوگی۔ کیونکہ ابھی وہ صرف بیس سال ہی کی تھی اور اُس نے اُس سے پہلے لیسبوس کے ساحلوں کو خیرباد نہ کہی تھی۔ نیز اُسے اپنے وطن سے بے حد دلبستگی تھی۔ اُس کے بہت سے دوستوں نے اس مصیبت کے وقت میں اُس کا ساتھ نہ دیا۔ اسی بے وفائی کا ذکر اُس نے اپنے ذیل کے مصرعے میں کیا ہے:

"جن سے میں نے بھلائی کی، وہی مجھے دُکھ دے رہے ہیں۔"

شاید انہی بے وفاؤں سے مخاطب ہو کر اُس نے یہ بھی لکھا ہو:-

"لیکن اس کے باوجود مجھے کلام کے فرشتوں سے سچی خوشی حاصل ہوئی ہے اور جب میں مر گئی تو لوگ مجھے بھول نہ سکیں گے۔"

دوسری بار جلاوطن ہو کر سیفو خواہ اپنی مرضی سے خواہ پٹاکوس کے حکم سے سسلی کے جزیرے میں گئی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہاں یونانی نوآبادیات قایم تھیں۔ جہاں تک موجودہ محققین کی معلومات کا تعلق ہے سیفو نے اپنی اس سزا کے متعلق کسی طرح کا احتجاج نہیں کیا اور چپ چاپ سسلی کو روانہ ہو گئی۔

بظاہر اس بات کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ دوبارہ جلاوطنی کا زمانہ بسر کرنے کے لئے سیفو نے سسلی کے دور دراز جزیرے کو کس بنا پر منتخب کیا۔ کیونکہ یہ بات اُسے ضرور معلوم ہوگی کہ وہاں جا کر اُسے وہ آزادی نصیب نہ ہو سکے گی جو لیسبوس میں عورتوں کا سماجی حق تھی۔ ہاں، ایک بات سمجھ میں آتی ہے کہ سسلی کے رہنے والے اپنی عشرت پرستانہ طرزِ زندگی کے لئے بھی مشہور تھے۔ اُن کے شبانہ جلسے، اُن کا شوقِ خور و نوش اور اُن کے بے باک گیت اور اُن کی مے نوشی ضرب المثل کی حیثیت رکھتی تھی بلکہ افلاطون کی زبان میں کہا جا سکتا ہے کہ ضبطِ نفس اور پاکیزگی کا وہاں کسی کو کبھی خیال تک بھی نہ آتا تھا اور اس طرح کا طرزِ حیات ایک فنکار، اور خصوصاً ایک شاعرہ کے لئے ایک سراپا دلکشی رکھتا ہے اور اس لئے ممکن ہے کہ سیفو وہاں اسی دلکشی کی وجہ سے گئی ہو، اگرچہ پیشہ ور عورتوں کے علاوہ دوسری عورتوں کو پابند زندگی گذارنی ہوتی تھی خصوصاً سیفو ہی کے زمانے میں کورنتھ کے شہر میں پیریانڈر اور ایتھنز میں سولون عورتوں کی آزادی کو محدود کرنے میں بہت سرگرمی سے کام لے رہے تھے۔

ان حالات کے مدِنظر سسلی کو جاتے ہوئے اگر سیفو کا مقصود وہاں کی عشرت انگیز زندگی بھی ہو تو اس سلسلے میں بھی اس کی توقعات ایک حد کے اندر ہی ہوں گی اور عین ممکن ہے کہ اسی زمانے میں سیفو کو خیال آیا ہو کر محافظت کے لحاظ سے اگر وہ اپنے کو مناکحت کی زنجیروں میں لے آئے تو کچھ بے جا نہ ہوگا۔ ایک محقق کے مطابق اُس نے ایک بہت امیر تاجر "کیرکلاس" سے شادی کر لی۔ اور اس تاجر سے اس کی ملاقات قیاساً سسلی کے سفر کے دوران میں ہی ہوئی ہوگی۔ لیکن اس کی شادی کی تاریخ مقرر کرنے میں ماہرین ناکام رہے ہیں۔ اس لئے یہ بات محض اندازوں پر ہی اپنا دارومدار رکھتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُسے مناکحت کی زندگی کسی حد تک مسرت آمیز معلوم ہوئی کیونکہ وہ بیوگی کے زمانے میں ایک جگہ یہ کہتی ہے کہ اگر وہ اب بھی اس قابل ہوتی تو دوبارہ شادی کر لینے میں کسی طرح کی جھجک محسوس نہ کرتی بلکہ ایک اور مقام پر وہ سہاگ رات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتی ہے کہ وہ ایک ایسی مسرت کی رات تھی جو بہت جلد بیت گئی۔ ان حوالوں کے باوجود ایک دو جگہ اُس کے کلام میں اس انداز سے کے مخالف اشارے بھی پائے جاتے ہیں۔ مثلاً ــــ

"کیا یہ ممکن ہے کہ میں اب بھی دوشیزگی کی تمنا ہی دل میں لئے بیٹھی ہوں؟"

اور ایک جگہ اور ــــ

"میں ہمیشہ کنواری ہی رہوں گی"

ان اشاروں سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ شادی کی زندگی گذار لینے کے بعد بھی اُس کے انفرادی احساس تنہائی میں کسی قسم کا فرق نہ پیدا ہوا تھا اور یہ ایک ایسی ذہنی اور نفسی کیفیت ہے جس کا اظہار کسی دلہن کے آنسوؤں کی صورت میں ہوتا ہے اور اکثر دولہاؤں کو ایک اچنبے میں ڈال دیتا ہے۔

بہر حال مناکحت سے اُسے ایک فائدہ ضرور ہوا کہ جس طرح بے روک زندگی بسر کرنا چاہتی تھی، اس میں اُسے پہلے سے کہیں زیادہ آزادی حاصل ہو گئی۔ نیز اس کی تازہ دولت بھی خوش منظر سسلی سے لطف اندوز ہونے میں اُس کی معاون ثابت ہوئی اور سسلی ہی میں وہ ایک لڑکی کی ماں بھی بنی۔ اس کا نام اس نے اپنی ماں کی یاد میں کلیس رکھا۔ سیفو کے کلام میں دو جگہ ایسے فقرے آتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُسے اپنی اس اکلوتی بچی سے بہت محبت تھی۔

سسلی کے زمانۂ قیام میں اُس کے احباب کا حلقہ کن افراد پر مشتمل تھا، یہ ہم نہیں جانتے۔ البتہ یہ پتہ چلتا ہے کہ اسی زمانے میں اس کی ماں کا انتقال ہوا۔ نیز اس کا خاوند کیرکلاس بھی مر گیا۔

روایتی نقطۂ نظر سے سیفو کسی طرح کے اخلاقی اصولوں کی پابند نہ تھی۔ لیکن اس بات سے ہم انکار نہیں کر سکتے کہ دل کی صفائی اور پاکیزگی اُس کا مطمح نظر تھا۔ کسی مرد کے ہاتھوں اپنے روح و جسم کو یکسر سونپ دینا اس کے لئے کوئی خوشگوار عمل نہ تھا۔ مثلاً وہ ایک جگہ اپنے کو "ابدی دوشیزہ" لکھتی ہے۔ اس کے کلام کے جو ٹکڑے زمانے کی دست برد سے بچ رہے ہیں ان میں کئی مقاموں پر وہ اُن لڑکیوں کے لئے تعریفی کلمے کہتی ہے۔ جو ابھی دوشیزہ تھیں اور اُن سے صاف ظاہر ہے کہ اچھوتی روحیں اور اچھوتے جسم اس کے لئے کس قدر دلکش اور دل پسند تھے۔

"نرم آواز والی دوشیزائیں" "میٹھی آواز والی دوشیزائیں" "نازک ٹخنوں والی دوشیزائیں" "مٹی لین کی دوشیزائیں" "گلاب کی کلیوں ایسی دوشیزائیں" "محبت کے گیت گاتی ہوئی دوشیزائیں" "بے مثال دوشیزائیں" اور "ایسی دوشیزائیں جن کی تمنا کی جائے"۔ یہ سب کلمے اس کے دل کی اس دلبستگی کو ظاہر کرتے ہیں جو اُسے دوشیزگی سے تھی۔ ایک جگہ وہ دلہن کی زبان سے یہ سوال نکلواتی ہے:۔

"دوشیزگی! اے دوشیزگی! تو مجھے چھوڑ کر کہاں چلی گئی!—
کہاں چلی گئی اے مقتول!؟"

اور دوشیزگی جواب دیتی ہے:۔

"جہاں سے میں کبھی نہ لوٹوں گی، یا تیرے پاس کبھی نہ آؤں گی"

اس سوال اور اس کے جواب سے یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ گویا خود سیفو کو کوئی ایسا نقصان ہوا ہے جسے بیان میں نہیں لایا جا سکتا۔

سیفو کے سسلی میں قیام کی مدت بھی غیر یقینی سی ہے لیکن ایک بات واضح ہے کہ جتنا عرصہ بھی وہ وہاں رہی اُسے وہاں کے علمی ادبی اور سماجی حلقوں میں ایک نمایاں امتیاز حاصل رہا۔ یہی زمانہ تھا جب اُس کے اشعار کو پہلی بار شاہکار تسلیم کیا گیا۔ لیکن جلاوطنی کے آخری زمانے تک اُس کی دلکش شخصیت کو بھی بے مثال مان لیا گیا اور اس زمانے میں اس کی دولت، ذہانت اور نفاست طبعی کی شہرت دُور دُور تک جا پہنچی۔ لیکن جب وہ سسلی سے لیسبوس کو لوٹی تو عمر کے لحاظ سے جوان ہی تھی یعنی اُس کی عمر چھبیس سال کی تھی کہ پٹاکوس نے اُس کی جلاوطنی کو منسوخ کرنے کے احکام جاری کر دیئے۔

سیفو اور دوسرے جلاوطن امرا کی واپسی کی وجہ یہ تھی کہ پٹاکوس کا اقتدار ایک ڈکٹیٹر کی حیثیت سے پختہ ہو چکا تھا اور اس نے اپنی بہتر حکومت سے لوگوں کی ہمدردی پوری طرح سے حاصل کر لی تھی۔ اس لئے اُسے جلاوطن اُمرا کی واپسی سے کسی طرح کی تازہ بغاوت کا خطرہ نہ ہو سکتا تھا۔

اُس نے سیفو کے سب سے چھوٹے بھائی لیری کوس کو ایک معزز عہدے پر فائز کر دیا تھا۔ سیفو نے بھی اس وقت سے بہت پہلے ہی اپنی شخصیت اور شاعری کی بنا پر اپنے لئے ایک امتیاز پیدا کر لیا تھا اور اُس کے بھائی کی ترقی بھی ایک طرح سے اُسی کی تحسین کا اظہار تھی۔ نیز وہ خود اپنے خاوند سے حاصل شدہ دولت کی بنا پر ایک امیر عورت تھی اور اُسے بسر اوقات کے لئے کسی طرح کی فکر اور اندیشے کی ضرورت نہ تھی۔ چنانچہ اُس نے ان خوشگوار حالات میں کسی قسم کے ارادے یا باقاعدہ تجویز کے بغیر اپنے اردگرد چند ہم رتبہ نوجوان عورتوں کو اکٹھا کر لیا۔ اور اُنہیں نہایت توجہ سے وہ فنون سکھانے شروع کئے جن کی وہ خود ماہر تھی۔ مثلاً شعر و شاعری، موسیقی اور رقص۔ اُس کی یہ تمام ہم مذاق ساتھنیں نوجوان تھیں۔ اور وہ بذات خود بھی ابھی نوجوان ہی تھی۔ البتہ جلاوطنی سے لوٹنے پر اُس کی امارت، ذہانت اور نفاست طبعی کی کچھ ایسی دھوم مچ چکی تھی کہ مٹی لین کی خواتین کے فیشن ایبل حلقے میں اُسے ایک

نمایاں امتیاز کا مالک جان لیا گیا۔

سیفو اپنی ان نوجوان عورتوں کے حلقے کو "ہیٹیرے" کے لفظ سے بیان کرتی ہے۔ یہ بات کچھ کھٹکتی ہے کیونکہ اسی لفظ سے بعد میں جا کر اُن تربیت یافتہ طوائفوں کو پکارا جانے لگا جو یونانی امرا کا دل بہلاتی تھیں۔ لیکن سیفو کے زمانے میں اس لفظ کے ساتھ کوئی ایسا ناگوار تلازمِ خیال نہ تھا۔ نہ اس لفظ کے ترجمے کے لئے زنانخی یا دوگانا کی اصطلاحات سے مدد لینا چاہیئے۔ کیونکہ اُس وقت اس کا مفہوم بعینہٖ وہی تھا جو آج ہماری سماج میں "سہیلی" یا دوپٹہ بدل بہن کے کلمے سے لیا جاتا ہے "ہیٹیرے" ایک بے تکلف سنگت تھی۔ ہمدم و ہمراز نوجوان عورتوں کا ایک جھرمٹ تھا اور زیادہ امکان اسی بات کا ہے کہ ان سے سیفو کا تعلق یکسر انفرادی تھا۔ کسی قسم کی سماجی یا تعلیمی روایات کو اس سنگت کی بنیاد سمجھنا ایک غلطی ہے۔ سیفو کو اس بات میں ایک لطف آتا تھا کہ اُس کے آس پاس ایسی نوجوان لڑکیوں کا ایک جمگھٹا رہے جو اس کے گھر میں آزادانہ رہیں سہیں، گھر کے باغوں میں پھریں، اُس کے لئے ذرا ذرا سی باتیں کرنے کو ہر وقت تیار رہیں، اور ایک مثالی عورت کی طرح اس کی پرستش کریں، اور ساتھ ہی ساتھ اُس سے ایک ایسے دوست کی حیثیت میں جو اُن سے کہیں بڑھ کر تجربہ کار ہو، لیسبوس کے تہذیب و تمدن کی اُن خصوصیات کو حاصل کریں جن میں اب سیفو سسلی کی نفاست پرستی کو بھی ملا سکتی تھی۔

یہ نوجوان لڑکیاں جو سیفو کے اس مہذّب علمی اور ادبی جھرمٹ میں شامل ہوئیں خود بھی دلچسپ اور دل کش انفرادیت کی مالک تھیں ان میں سے ایک اناکٹوریہ تھی اور سیفو ہی کے زمانے کی ایک شاعرہ ایرینہ بھی تھی۔ جو شاعرہ ہونے کے علاوہ ایک حسین اور نازک اندام لڑکی تھی۔ اس نے ایک لمبی رزمیہ نظم لکھی تھی جس کی اب صرف چند سطریں ہی دستیاب ہو سکتی ہیں، اسی شاعرہ کے متعلق سیفو ایک جگہ لکھتی ہے کہ "میں خیال نہیں کرتی کہ اس فن میں دنیا کی کوئی دوشیزہ تمہارا مقابلہ کر سکتی ہو" اس سے سیفو کو بہت دلبستگی ہو گئی۔ یہاں تک کہ یہ دلبستگی رفتہ رفتہ ایک رومانی جذبے میں تبدیل ہو گئی۔ لیکن افسوس کہ بہت جلد یہ نوجوان شاعرہ انتقال کر گئی۔ اس کے علاوہ ایک اور شاعرہ دمیوفیلہ تھی۔ یہ محبت کے گیت لکھتی تھی۔ اس کا اپنا میلانِ طبعی بھی سیفو ہی کی طرح ہم جنس افراد کی طرف تھا۔ اس نے بعد ازاں اپنا ایک علیحدہ جھرمٹ بنا لیا۔ اس کے علاوہ چار اور لڑکیوں کے ناموں کا بھی پتہ چلتا ہے۔ جن میں سے ایک کے متعلق سیفو کا ایک ادھورا ٹکڑا موجود ہے:-

"بہتے ہوئے قدموں والی ننھی دوشیزہ"

یہ تمام لڑکیاں ایسی تھیں جو سیفو کی شہرت سے متاثر ہو کر بیرونی علاقوں سے مٹی لین پہنچی تھیں۔ باقی لیسبوس ہی کی رہنے والی تھیں۔ ایک ایتھیس تھی۔ اس کے حالات کے متعلق محققین کو بہت حد تک واقفیت ہے۔ اسی کے متعلق سیفو لکھتی ہے۔

ایک زمانہ

میں نے بھی ایک زمانے میں تم سے الفت کی ہے
ایک زمانے میں جس کو اب مدّت ہی گذر رہی ہے۔

چار اور لڑکیاں لیسبوس کی تھیں۔ ایتھیس کے ساتھ ہی ان سب کے لئے سیفو کے دل میں عموماً جذباتی احساسات تھے لیکن سب سے بڑھ کر اس کی والہانہ رومانی شیفتگی ایتھیس کے لئے تھی۔

ایتھیس اور سیفو کی المناک محبت کا واقعہ ایک ایسا سانحہ ہے۔ جس میں دوچار بہت سخت مقام آتے ہیں۔ کیونکہ اس واقعے سے جہاں برساتی ندی کی سی طوفانی اور اندھی محبت کا غم اندوز شیریں اظہار ہوتا ہے وہیں یہ اندیشہ بھی لاحق ہو جاتا ہے کہ تنگ خیالی کہیں اپنے شکوک سے اس پھول کے ساتھ کانٹوں کی موجودگی نہ ثابت کر دے۔ ایک عام انسان کی نگاہوں میں ہمدردی پیدا کرنے کے لئے ہمارے پاس اس محبت کے حق میں کوئی دلیل نہیں ہے۔ البتہ اپنے دائرہ نظر کو ذرا وسعت دے کر ہم اس واقعے کو ہمدردانہ نگاہوں سے دیکھ سکتے ہیں۔

جب یہ معاملہ شروع ہوا تو ایتھیس ایک نوجوان لڑکی تھی اور سیفو کی عمر پچیس سے تجاوز کر چکی تھی۔ ان دونوں میں ایک ایسا جذبات پرور بندھن پیدا ہو گیا جس کو دیکھتے ہوئے لوگوں نے انگلیاں اٹھائیں اور عین ممکن ہے کہ اس بہتان یا رسوائی کی بنا پر ہی بعد میں سیفو کا کلام نذرِ آتش کر دیا گیا ہو۔ کیونکہ اُس کی بیشتر نظموں کی مخاطب ایتھیس ہی تھی۔ لیکن اب جبکہ ان نظموں کے ادھورے ٹکڑے ہمیں دستیاب ہو چکے ہیں اور ہم انہیں غیر جانبدارانہ نگاہوں سے جانچ سکتے ہیں تو کون کہہ سکتا ہے کہ ان جواہر ریزوں کو ضائع کر دینے سے دنیا کو فائدہ ہوا بلکہ ہم تو یہی کہیں گے کہ تنگ خیال حضرات نے چند نہایت نادر اور

حسین تخلیقات شعری سے آنے والی نسلوں کو محروم رکھا۔ کیونکہ حسن کی تخلیق کے لئے کسی قسم کے ہنگامی کلئیے قاعدے کی حاجت نہیں ہوتی۔ اس کا باعث ہمیشہ استثنا ہوتی ہے۔ اخلاقی قوانین اور معیار تو ہر روز بدلتے رہتے ہیں۔ آئے دن پیدا ہوتے رہتے ہیں لیکن تخلیق حسن روزمرّہ کی بات نہیں ہے۔ سیفو اور اتیھیس کی ملاقات کے وقت اتیھیس ایک ناتجربہ کار نوجوان لڑکی تھی اس کا ثبوت سیفو کے ان شعروں سے ملتا ہے۔ جو اُس نے اتیھیس کے نام کے عنوان سے لکھے:

اتیھیس کے نام[1]

میں نے بھی ایک زمانے میں تم سے الفت کی ہے،
ایک زمانے میں جس کو اب مدت ہی گذری ہے،
جبکہ مرا بالاپن بھی تھا پیارے پھولوں ایسا،
اور تمہیں دنیا کہتی تھی ناداں ہے، ننھی ہے!

لیکن جوں جوں وقت گذرتا گیا اتیھیس ایک جوان اور حسین عورت بنتی گئی۔ اور اس شعر و ادب کے دلدادہ جھرمٹ میں سب سے ہونہار معلوم ہونے لگی۔ لیکن اس کی جوانی کے ساتھ ہی سیفو کا جذبہ بھی پختگی اختیار کرتا گیا۔ اتیھیس کا انداز نظر سیفو کے متعلق کیا تھا، اس کا اظہار ایک خط سے ہوتا ہے۔ سیفو اپنی بیٹی کلیس اور اتیھیس اور چند اور لڑکیوں کے ساتھ ایک بار گرمیوں کا موسم گذارنے کے لئے پہاڑی علاقے میں گئی۔ لیکن موسم ختم ہونے پر بھی سیفو وہاں سے ہلنے کا نام نہ لیتی تھی۔ اگرچہ اُس کی نوجوان ساتھنیں وہاں سے مٹی لین کو لوٹنا چاہتی تھیں کیونکہ اس جگہ سے اُن کا جی بھر چکا تھا۔ آخر سیفو نے ایک روز اُن سے وعدہ کر لیا کہ کل لوٹ چلیں گے۔ لیکن دوسرے روز صبح دیر تک وہ بستر ہی میں محو استراحت رہی۔ اتیھیس نے سیفو کو ایک رقعہ لکھا اور نوکرانی کے ہاتھ بھجوا دیا تاکہ وہ جلد جانے کے لئے تیار ہو۔ اس میں لکھا ہے:

"سیفو! میں قسم کھاتی ہوں کہ اب تمہیں نہ چاہوں گی۔ ہمارے لئے ہی اُٹھو اور اپنے ہٹیلے بوجھ کو بستر سے دُور کر دو اور ایک بے داغ کنول کے پھول کی طرح جھیل کے کنارے اپنا شب خوابی کا لباس اُتار پھینکو اور جھیل کے پانی میں نہا لو اور کلیس صندوقوں سے نکال کر تمہارے لئے ایک زعفرانی زیر جامہ، ایک گلابی پیرہن اور ایک عبا لے آئے گی اور پھر ہم تمہارے سر پر پھولوں کا تاج پہنا دیں گے۔ اور پھر تم پر ایک ایسا روپ نکھر آئے گا جو مجھے دیوانہ بنا دیتا ہے اور پھر پرکیتی نو وا اور میں مل کر سب کے لئے صبح کا کھانا تیار کر لیں گے۔ کیونکہ آج ہم پر دیوتا مہربان ہیں۔ آج سیفو جو عورتوں میں سب سے پیاری ہے، ہم سب کو اپنے بچوں کی طرح ساتھ لے کر مٹی لین کے شہر کو لوٹ چلے گی، وہ شہر جو سب شہروں سے پیارا ہے"

شہر پہنچنے پر بہت سے نوجوانوں کو اتیھیس کی طرف رغبت ہوئی اور اس سے سیفو کے دل میں حسد کے شعلے بھڑک اٹھے۔ کیونکہ اب اُس کے دل کا جذبہ ایک طوفان کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ اسی زمانے میں اُس نے اپنا مشہور گیت لکھا۔ جیسے ذیل میں درج کیا جاتا ہے:۔

دیوتاؤں کی طرح مجھ کو نظر آتا ہے،
سامنے بیٹھ کے جو دیکھتا ہی جاتا ہے
تری صورت کو۔ تری میٹھی صدا سنتا ہے!
قہقہے کی ترے مستانہ ادا سنتا ہے!
میرے سینے میں مرا دل بھی لرز اُٹھتا ہے،
آہ اک جذبۂ بسمل بھی لرز اُٹھتا ہے!
گھُٹ کے رہ جاتی ہے سینے ہی میں آواز مری،
دیکھ لیتی ہوں جو اک لمحہ بھی صورت تیری!
گویا منہ ہی میں نہ تھی ایسے زباں ہوتی ہے،
آگ سی جسم میں اک میرے تپاں ہوتی ہے،
میری آنکھوں کو نظر آتی نہیں کوئی شئے،
اور کانوں میں بھی اک شور چلا آتا ہے!
لیکن افسوس کہ قسمت میں "نہیں" لکھا ہے،
دکھ ہی سہتی رہوں میں بیٹھی یہیں، لکھا ہے۔
زندگی دُکھ سے رہائی نہیں دیتی مجھ کو،
موت بھی دُور دکھائی نہیں دیتی مجھ کو!

ایک نقاد لکھتا ہے کہ اس نظم میں سیفو نے احساسات کا ایک حیرت ناک اجتماع پیدا کر دیا ہے جسم و روح، سماعت، گفتار بصارت، نفسی احساس، ان سب مختلف باتوں کو ایک کوزے میں

[1] پہلے شعر کا ترجمہ منصور احمد (مرحوم) کا ہے۔ م۔

بند کر دیا ہے۔ اس کے ہوش تو قایم ہیں لیکن وہ مجنون بھی ہے، اس کے دل میں آگ لگ رہی ہے، لیکن ایک موت کی برفانی خنکی کا بھی اسے احساس ہے۔

اسی زمانے میں جب اتھیس سیفو کے جھرمٹ کی رونق بنی ہوئی تھی، متی لین میں موسیقی اور شاعری کا ایک سکول بھی قایم تھا اور وہاں کی معلمہ کا نام اینڈرومیڈا تھا۔ اس معلمہ نے اتھیس کو ترغیب دی کہ وہ سیفو کے جھرمٹ کو ترک کر کے اُس کے سکول میں شامل ہو جائے۔ سیفو کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو اس نے اتھیس کے نام چند اشعار لکھے جن میں سے یہ ٹکڑا ملتا ہے۔

"یہ گنواروں کا لباس پہننے والی یہ کون گنوار عورت ہے جس نے تم پر جادو کر دیا ہے؟ اسے تو اپنی ٹانگوں کے گرد لباس کو لپیٹنے کا سلیقہ بھی نہیں ہے۔"

لیکن اتھیس ترغیب کے جال میں آ چکی تھی اور سیفو کو چھوڑ کر جانے کو تھی کہ سیفو نے لکھا۔

"پیاری اتھیس! تو کیا تم وہ سب باتیں بھلا دو گی جو بیتے دنوں میں ہم تم میں ہوئیں؟"

اور ایک اور جگہ:-

"جب میں تمہیں دیکھتی ہوں تو مجھے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ہرمیون زمین کی بیٹی کبھی بھی تم ایسی نہ تھی۔ اور کسی فانی عورت کی بجائے تمہیں ہیلن سے تشبیہ دینا ہی صحیح ہے اور میں تم سے کہتی ہوں کہ میں تمہارے حسن کو اپنے تمام خیالات کی بھینٹ کرتی ہوں، تمہیں اپنے تمام احساسات سے پوجتی ہوں۔"

سیفو کے ان واسطوں سے کچھ عرصے کے لئے اتھیس پھر اس کے پاس آ گئی۔

"تم آ گئی ہو اور اب کسی بات کا کھٹکا نہیں ہے، اور اب تم نے میرے دل میں محبت کے شعلوں کو بھڑکا دیا ہے۔"

ایک اور جگہ ایک شعر ہے:-

"ابھی اتم سے میں جدا کر دی گئی تھی تمہیں سے میں پھر مل گئی"

گویا [1] ہر کسے کو دور ماند از اصل خویش

باز جوید روزگار وصل خویش

[1] پہلے دو شعر منصور احمد کا ترجمہ ہیں۔ م۔ [2] شعر و شاعری کا ترجمہ از منصور احمد۔ م۔

لیکن اتھیس کو اب سیفو سے محبت نہ رہی تھی اور ممکن ہے کہ اُس کے والدین اور والی وارث اب اُسے سیفو سے علیحدہ کر لینا چاہتے ہوں۔ سیفو اپنے غم کا اظہار ذیل کے اشعار میں کرتی ہے:-

بندِ عشق

اب مجھ کو گرفتار محبت نے کیا ہے،
سر تا بہ قدم خوف سے میں کانپ گئی ہوں
تلخی ہے تو شیریں ہے، ستم ہے تو مروت،
اس راحتِ جانسوز کو میں بھانپ گئی ہوں،
لیکن مری اتھیس مجھے چھوڑ چکی ہے،
اک غیر سے وہ رشتۂ دل جوڑ چکی ہے!

اینڈرومیڈا کے خلاف سیفو کے دل میں ایک زبردست غصے کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ جس کا اظہار ایک ٹکڑے سے ہوتا ہے۔

"جب تو مر جائے گی تو تجھے کوئی یاد تک نہ کرے گا، کیونکہ تو نے گلاب کے[1] پھول کھلانے میں کبھی کوئی حصہ نہ لیا۔ تو موت کے مکان میں بھولے ہوئے مردوں کی طرح بے نام و نشان گھومتی پھرے گی۔"

لیکن اس آہ وزاری کا کیا فائدہ! انجام کار اتھیس اپنی یا دوسروں کی مرضی سے سیفو کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ کر چلی گئی۔ شاعرہ کی فریاد ایک فقرے میں محفوظ ہے،

"اب میں اتھیس کو پھر کبھی نہ دیکھ سکوں گی، میں تو اب مر ہی جاؤں تو اچھا ہو!"

لیکن آسمانی فرشتوں نے شعراء کو ایک ایسا تحفہ دے رکھا ہے جس سے وہ اپنے غموں کو ہلکا کر سکتے ہیں۔ شاعری ان کے ذاتی احساسات کو عوام کی نظروں میں لا کر اُن کی پوشیدہ اذیت کو کم کر دیتی ہے۔ سیفو کو اپنی اس ناکام اور قابلِ رحم محبت سے معلوم ہو گیا کہ یہ جذبہ ایک "راحتِ جاں سوز" کا باعث ہوتا ہے بلکہ وہ محبت اور ایک طوفان میں مماثلت پاتی ہے۔

طوفان[2]

جب عشق کے آثار نظر آتے ہیں
اس طرح یہ جسم و روح گھبراتے ہیں
طوفان میں جس طرح ہوا کے اندر
اشجار کہستان کے تھرّاتے ہیں

اب سیفو تیس سال کی عمر کو پہنچ چکی تھی۔ پٹاکوس بہت عمدگی کے ساتھ اپنے فرائض بجا لاکر حکومت سے دست بردار ہو چکا تھا۔ اور الکیاس نے بھی اب اپنے باغیانہ احساسات کو دھیما کر کے شراب و شعر سے دل بہلانا شروع کر دیا تھا۔ سیفو کے جو مشاغل تھے اُن میں اس کی عمر گذرتی رہی۔

آخر ۵۵۳ ق م میں جب سیفو کی عمر پچپن سال کی تھی ہم اس کا تصور ایک ایسی نحیف نسوانی عورت کی شکل میں کر سکتے ہیں جس کے چہرے پر عمر کے آثار ایک باریک بین ہی کو نظر آ سکتے ہوں۔ کیونکہ ایک عام انسان کی نظر کو غازے اور بناؤ سنگار کا پردہ دھوکے میں ڈال سکتا تھا۔ لیکن اس کی مسکراہٹ میں اب بھی وہی دلکشی تھی اور اُس کی آنکھوں میں اس کے دل کی آگ کی وہی کبھی نہ مٹنے والی چمک تھی۔ بعض عورتیں ایسی ہوتی ہیں کہ بڑی عمر میں جا کر ان کی شکل و صورت ایک ایسا حسن اختیار کر لیتی ہے جو کئی جوان عورتوں کو بھی میسر نہیں ہوتا۔ پچپن سال کی عمر کو پہنچنے پر سیفو کی شکل و صورت میں بھی ایک ایسا ہی حسن نمایاں تھا۔

جوانی کے زمانے میں سیفو کے خیالات سماجی حفظ مراتب کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ لیکن اب عمر کی پختگی کے ساتھ ساتھ اس کی نظر میں ایک وسعت پیدا ہو گئی تھی۔ ایک زمانہ تھا کہ وہ پٹاکوس کے معمولی خاندان سے متعلق ہونے کو ناپسند یدہ نگاہوں سے دیکھتی تھی۔ اینڈرومیڈا کو گنوار عورت کہہ کر اس کا مضحکہ اڑاتی تھی۔ لیکن اب نظر کی وسعت کے ساتھ اس کی زندگی میں ایسا وقت آیا کہ وہ ایک معمولی ماہی گیر کی محبت کے جال میں گرفتار ہو گئی۔ اس ماہی گیر کا نام ہیلاگون تھا۔ لیکن اس نوجوان ماہی گیر کو قبل از وقت جوانی ہی میں موت سے دوچار ہونا پڑا۔

اس زمانے میں مٹی لین میں ایک نوجوان ملاح فاؤن رہتا تھا۔ اس کے حسن کا شہرہ تمام شہر میں پھیلا ہوا تھا۔ اور بہت سی عورتیں اس سے محبت کرتی تھیں۔ سیفو کو اسے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اور وہ بھی اس کی رعنائی کی تاب نہ لا سکی۔ معلوم ہوتا ہے کہ فاؤن واقعی غضب کا جوان رعنا تھا۔ کیونکہ بعد میں جا کر اس کے متعلق کئی طرح کی مافوق العادت روایتیں مشہور ہو گئی تھیں۔ ہمیں تاریخ سے یہ بات معلوم نہیں ہوتی کہ اول اول سیفو کی فاؤن سے کیونکر ملاقات ہوئی۔ ممکن ہے کہ سیفو نے فاؤن کا بجرا سیر کے لئے کرائے پر لیا ہو اور جب چاندنی سے چمکتی ہوئی سطح آب پر بجرا ستاروں کے سائبان کے تلے بہہ رہا ہو گا تو پتوار کے پاس کھڑے ہوئے فاؤن کے حسن و رعنائی کے مجسمے کے قریب یہ جذباتی شاعرہ پہنچی ہو گی۔ اور اپنے اظہار محبت سے اس افسانۂ جنونِ عشق کا آغاز کر دیا ہو گا۔ فاؤن کے متعلق بھی سیفو نے کئی گیت لکھے۔ لیکن اس کے بچے کھچے کلام میں کوئی ایسا ٹکڑا موجود نہیں ہے جسے ہم اس نوجوان ملاح سے نسبت دے سکیں۔ البتہ ہم اندازاً کہہ سکتے ہیں کہ ذیل کا ٹکڑا فاؤن ہی کے متعلق محسوس کئے ہوئے جذبات کی جھلک دکھا رہا ہے۔

دوست!

اے دوست! اُٹھو! اٹھاؤ،

آنکھوں میں آنکھیں ڈالو

اس راہ سے دل میں اُترو،

تن من کو حسیں بنا دو![1]

معلوم ہوتا ہے کہ شروع شروع میں سیفو کے عشق کی شدت نے نوجوان ملاح کو شاعرہ کی طرف مائل کر لیا۔ شاید اس کی خود پرستی کو اپنے زمانے کی مشہور ترین عورت کی محبت ایک تسکین دیتی ہوئی محسوس ہوئی ہو۔

مٹی لین کی پچھلی طرف کے ایک پہاڑی غار میں راتوں کے اندھیرے میں لپٹی ہوئی سیفو چھپ چھپ کر اپنے نوجوان ملاح سے ملنے کو جایا کرتی تھی۔ شاعرہ کو ملاح دل پسند تھا۔ اور ملاح کو شاعرہ کے نغمے۔ اور سیفو کی زبان سے اس والہانہ محبت میں جو بھی لفظ نکلتا ایک نغمہ ہی تو تھا۔ کیونکہ ایک بار پھر وہی محبت جو ایک "راحتِ جانسوز" ہوتی ہے اس کے روح و جسم پر غلبہ پا چکی تھی۔ لیکن یہ خواب گوں کیفیت بہت کم عرصے تک قائم رہی۔ فاؤن کا جی بھر گیا یا شاید اس نے یہ خیال کیا ہو کہ وہ اس آتشیں نفس شاعرہ کے بوسوں کی تاب نہیں لا سکتا۔ چنانچہ فاؤن چپ چاپ سسلی کی طرف جانے والے ایک جہاز پر سوار ہو کر مٹی لین سے نکل بھاگا۔ کہا جاتا ہے کہ جب سیفو کو اس کی خبر ہوئی تو وہ جہاں تھی وہیں کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔ رنگ زرد ہو گیا اور زبان گنگ ہو گئی۔ اُسے یقین نہ آتا تھا کہ اس کا خواب یوں پریشان ہو گیا ہے۔ لیکن جب اُس کے ہوش ذرا قائم ہوئے تو اُسے حقیقت کی تلخی کا پورا احساس ہوا اور وہ ضبط سے بے اختیار ہو کر زار و قطار رونے لگی

[1] ترجمہ منصور احمد۔ م۔

اُس نے اپنے بال نوچ لئے اور سینہ پیٹ لیا۔ جب اُس کے بھائیوں اور دوسرے رشتہ داروں کو یہ بات معلوم ہوئی تو انہوں نے اُسے لعنت ملامت کی اور یوں اس کی مصیبت میں اور اضافہ ہوا۔

فاؤن کے چلے جانے کے بعد اُسے سوتے جاگتے اسی کا خیال ستانے لگا۔ آخر جب اُس کی اذیت برداشت کی حد سے باہر ہوگئی تو اُس نے فاؤن کا پیچھا کرنے کی ٹھان لی۔ اور مٹی لین میں اب اس کے لئے کوئی دلچسپی بھی کب تھی۔ اُس کی ہمدم لڑکیوں کا جھرمٹ ٹوٹ چکا تھا۔ اپنے بھائی سے اُسے نفرت تھی۔ اُس کی بیٹی کو اس سے کوئی ہمدردی نہ تھی، اور اُس کے دوست اُسے ناپسند کرنے لگے تھے۔ اور یوں اُسے آئندہ زندگی میں تنہائی اور بڑھاپے کے سوا اور کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ مٹی لین سے وہ کورنتھ کی طرف روانہ ہوئی۔ یہاں سے ہوکر اُس کا ارادہ تھا کہ وہ جنوبی اطالیہ سے ہوتی ہوئی سسلی جا پہنچے گی اُس کے اس سفر کے متعلق کوئی تفصیل معلوم نہیں لیکن ہم اس کے تفکر و تردد اور اندیشوں کا اندازہ بخوبی کرسکتے ہیں۔

اپنے اس لمبے سفر کے دوران میں ممکن ہے کہ اُسے محسوس ہوا ہو کہ فاؤن کا تعاقب بے سود ہے۔ سسلی کے قریب پہنچ کر اُس نے سوچا ہوگا کہ اب اُس کے اس تعلق کے از سرِ نو پیدا ہونے کا کوئی موقعہ ہے یا نہیں۔ کیا فاؤن اُس سے ملنا پسند کرے گا۔ وہ عمر میں اس نوجوان ملاح سے کہیں زیادہ تھی، اور فاؤن کی بے وفائی کے صدمے نے اس کی شکل و صورت میں تباہ کن تبدیلی پیدا کر دی ہوگی۔ اور اب جبکہ اسے اپنے اچانک صدمے سے کسی حد تک فراغت حاصل ہوگئی ہوگی۔ تو اُس کا ذہن صاف طور پر سوچنے کے قابل ہو گیا ہوگا۔ اور وہ جان گئی ہوگی کہ اب اُس کے لئے مسرت کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ اس نا امیدی اور یاس کی تاریکی میں اس نے یک دم مرنے کی ٹھان لی۔ ایک چٹان پر سیر کرتے ہوئے اس نے دوڑ کر چھلانگ لگادی اور نیچے گہرائی میں موج زن سمندر کی موجوں نے اس کے جسم کو اپنے آغوش میں لے لیا۔ الکیاس شاعر کی ایک نامتمام نظم سے سیفو کی موت کے متعلق چند اشارے ملتے ہیں۔

" ..... بدنصیبی ..... میں ایک بدنصیب عورت ..... جس کے لئے دُکھ ہی دُکھ ہیں ..... گھر بار ..... دُکھوں سے بھری ہوئی تقدیر ..... رسوائی ..... زندگی کا ناقابل علاج زوال آنے کو ہے ..... ڈرے ہوئے سینے میں ایک خوف جاگ اُٹھا ..... جنون ..... تباہی ..... سمندر کی سرد مہر لہریں "

انجام کار سیفو کا شکستہ جسم سمندر سے برآمد کر لیا گیا۔ اور جلانے کے بعد اُس کی راکھ کو مٹی لین میں دفن کرنے کے لئے روانہ کر دیا گیا۔ کچھ اس بات کے حوالے ملتے ہیں کہ اُس کی قبر لیسبوس میں تھی۔

سیفو کے جوہر خداداد سے نہ پرانے نقادوں کو انکار تھا نہ جدید نقادوں کو ہے۔ اور اس جوہر خداداد کا اندازہ ہم ترجموں کے آواگون کے باوجود لگا سکتے ہیں۔ اس کے بعض فقروں میں تو جادو ہے۔ مثلاً

"میں تمہارے حسن کو اپنے خیالوں کی بھینٹ چڑھاتی ہوں اور تمہیں اپنے تمام احساسات کے ساتھ پوجتی ہوں"

یا وہ ایک جگہ کسی دوشیزہ کو ایک ایسے میٹھے سیب سے تشبیہ دیتی ہے۔

" جو جھاڑی کی ایک ایسی شاخ پر لگا ہوا ہو جو پھل توڑنے والوں کی نظروں سے اوجھل رہی ہو۔ نہیں اوجھل نہ رہی ہو بلکہ وہاں تک ان کی دسترس ہی نہ ہوسکی ہو"

سیفو خود کہتی ہے کہ محبت ایک گنوار کو بھی شاعر بنادیتی ہے اور سیفو تو ایک بہت ہی مہذب اور تعلیم یافتہ عورت تھی، وہ تو یقیناً محبت میں شعریت کو انتہا پر پہنچا سکتی تھی۔ فاؤن کی محبت اور ان کی ملاقاتوں کا رومانی ماحول اس سے ذیل کا نغمہ کہلواتا ہے [1]

جب سطحِ آبی پر کشتی فاؤن کی بہتی آتی ہے،
مغرب کی سمت سے بہتی ہوئی مستانہ ہوائیں لاتی ہے،
میں تھامے ہوئے بربط اپنا نغمات محبت گاتی ہوں،
اور عشق کے گیتوں سے اُس دم معمور فضا ہو جاتی ہے
اُس شوخ ستمگر پر لیکن کچھ اس کا اثر ہوتا ہی نہیں،
اے دردِ محبت رہنے دے، ناشاد نہ کر برباد نہ کر
جب اُس پہ اثر ہوتا ہی نہیں، تو آہ نہ بھر، فریاد نہ کر
اک رنج و الم کی دنیا میں میں کھوئی ہوئی سی رہتی ہوں،
اور روتے روتے ہواؤں سے ہی پریم کہانی کہتی ہوں
اس شوخ ستمگر پر لیکن کچھ اس کا اثر ہوتا ہی نہیں۔

[1] ترجمہ از اعجاز اسلام آبادی۔ م۔

اختر شیرانی کہتا ہے ؎

یہ کس کو دیکھ کر دیکھا ہے میں نے بزمِ ہستی کو
کہ جو شئے ہے نگاہوں میں بھلی معلوم ہوتی ہے

یہ محبت ہے جو ہر شئے کو حسین بنا دیتی ہے۔ سیفو محبت ہی کی متوالی نہیں، حسن فطرت کی بھی شیفتہ ہے۔ اُسے گلاب کے پھولوں سے ایک عشق ہے۔ وہ کسی دوشیزہ کے حسن کو گلاب کے پھول سے تشبیہہ دیتی ہے۔ اُن کے بازوؤں میں اُسے گلاب کی پھولوں کی پتیوں کی میٹھی خوشبو اور ملائمت اور نفاست کا احساس ہوتا ہے۔ میواڑ کی میرا بائی حسن فطرت سے مگن ہو کر پکار اُٹھتی ہے"

دھرتی روپ نَو نَو دھر گئی کانت ملن کے کاج؟

اور سیفو لکھتی ہے،

دھرتی رنگ رنگ کی مالاؤں سے سجی بیٹھی ہے"!

اور بلبل کو "بہار کا اشتیاق آمیز آواز والا ہرکارہ" سمجھتی ہے۔

آشیانے کے قریب پہنچتی ہوئی فاختاؤں کے بارے میں "اُن کا مقصد پورا ہونے کو ہے، اور وہ اپنے پروں کو ڈھیلا چھوڑ دیتی ہیں"

ایک جگہ شام کے منظر کو ایک سحر آمیز اختصار کے ساتھ بیان کرتی ہے

شام[1]

بچے ماؤں کی گود میں ہیں بھیڑیں اپنے گلوں میں
بکری بکری والے کے پاس لال شفق میں پرند اداس
حور سحر نے بکھیری ہے زرّیں ہاتھوں سے جو جو شئے
تو اس پر چھائی ہے اے شام
جادو ہے تیرا کتنا عام

اور ایک جگہ رات کا منظر۔

جب چاند کی اُجلی کرنوں سے سب دنیا جگمگ کر اُٹھی،
تب چاند کے ساتھی تاروں کی سب جوت ہوئی پھیکی پھیکی!

ایک اور نظم۔

جل پریوں کا باغ

سیبوں کی جھاڑیوں سے پانی بہتا جاتا گاتے گاتے
نرمی سے ناچتے جاتے ہیں دھرتی پر پھیلے ہوئے پتے

یہ نرم ہوائیں پھیلائے ہیں اک نیند کے مستانہ جھونکے،
اور اپنے بس میں کئے جاتے جادو سے دل کو میرے!

لیکن سیفو کی فطرت پرستی بھی جذبات کی شدت کو اپنے جلو میں لئے ہوئے ہے مثال کے طور پر

رات

چاند بھی اب چل دیا،
اور ستارے بھی گئے،
رات آدھی چل بسی!
رفتہ رفتہ چلتا ہے
وقت، لیکن مجھ کو کیا؟
میں تو ہوں لیٹی ہوئی،
چُپ، تن تنہا، اُداس!

وہ غیر مرئی اشیا کو بھی مرئی لباس میں دیکھتی ہے۔

نیند[1]

کالی کالی آنکھوں والی
نیند رات کی بیٹی

اور ایک جگہ دیہاتی رنگ بھی جھلک رہا ہے۔ یہ ٹکڑا غالباً سیفو کے اُن نغموں سے ہے جو اُسے آئے دن لوگوں کے شادی بیاہ کے موقعوں کے لئے لکھنا ہوتے تھے۔

مری اماں! میں کیسے آہ! اب چرخہ چلاؤں گی؟
نہیں اٹھتے ہیں میرے ہاتھ، انہیں کیسے اٹھاؤں گی؟
مدن کے تیر نے گھائل کیا دل کو، میں ہوں مجنوں،
میں اپنے نوجواں محبوب کی چاہت میں کھوئی ہوں!

سیفو کو قدرت نے جہاں بہترین نغمہ خواں قرار دیا ہے وہاں دانائی میں بھی اس کا رتبہ کچھ کم نہ تھا۔ اس کے دانائی سے لبریز اقوال کو لافانی سمجھا جاتا تھا۔ سقراط اس کا شمار داناؤں میں کرتا ہے۔ لیکن اُن تنگ خیال مذہب پرستوں نے اس کی دانشمندی کی کوئی پرواہ نہ کی۔ جن کی چند صبائی ہوئی آنکھوں کو اس کے گیتوں کے نقوش دکھائی نہ دیتے تھے۔ اس مضمون کے آخر میں "خوبی" کے متعلق جو دو شعر درج ہیں۔ وہی اس کی دانائی کے اظہار کو کافی ہیں، لیکن ایک اور قول کا دہرانا بھی بے جا نہ ہوگا۔ بہترین ہری نے لکھا ہے[2]

[1] ترجمہ منصور احمد [2] ترجمہ از علامہ اقبال۔ م۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مردِ ناداں پر کلامِ نرم و نازک بے اثر

یہی بات سیفو قبل مسیح کے زمانے میں یوں کہہ گئی ہے۔ "گرم دماغ کو جھکایا نہیں جا سکتا" اس طرح کے کئی فقرے اس کی دانشمندی کی یادگار ہیں "بوڑھے پرندے جال میں نہیں پھنستے" "جب دل میں غصہ ہو تو زبان پر قابو رکھو" اور "اس دنیا میں تکمیل کہاں!"

لیکن یہ مقولے صرف اس کی دانشمندی ہی کا ثبوت ہیں۔ اس کے ذہن کی سچی بلندی اس کے عشقیہ گیتوں ہی سے ظاہر ہوتی ہے اور اس کے احساسات کی نزاکت ہی ہمیں اس کا متوالا بناتی ہے۔

میرابائی سوچتی ہے کہ پیا کی سیج گگن منڈل پہ ہے "کس بدھ ملنا ہوئے" اور سیفو کہتی ہے "میں اپنے ان دونوں بازوؤں سے آسمان کو کیسے چھولوں!"

ایک گیت سنیے:-

جب رات کی گھڑیاں بیت چکیں آنے کو اجالا صبح کا ہو
جب کچھ نیند ہو آنکھوں میں اک دیوتا سپنے لاتا ہو
یہ بات کٹھن ہے کیسے سہے میرا دل دکھ اور بپتا کو،
میں کیسے ادھورا رہنے دوں اس اپنے دل کی آشا کو؟
من میں بے امنگ مرے ایسی ہیں دکھ کو آنے نہ دوں دل میں،
آکاش سے سکھ جو آن ملے ایسے سکھ کو تو بھروں دل میں،
جس وقت میں ننھی ناداں تھی اماں نے کھلونے مجھ کو دیئے،
پھیلا کر ہاتھ لئے میں نے، ایسا نہ ہوا میں نے نہ لئے!
آکاش سے اب سکھ ملتا ہے، وہ جس کی من میں آشا تھی،
پروان چڑھی ہے ہمیشہ مرے ناچوں اور میٹھے گیتوں کی!

اس گیت سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی بے چین روح جو راتوں کو فرقت کے زمانے میں بستر پر کروٹیں بدلتی رہی ہے۔ ایک خواب آلود دھندلکے میں محسوس کر رہی ہے کہ اس کی مصیبت اب کٹنے کو ہے اور وہ اس نئی مسرت کے حاصل ہونے میں کسی بات کو رکاوٹ نہیں بننے دے سکتی۔

سیفو نے ایک جگہ خوبی کا ایک معیار قائم کیا ہے۔

خوبی

خوب ہے جو حسیں ہوا بُت ہوا، نازنیں ہوا،
جو نہ حسیں ہوا، مگر خوب ہوا، حسیں ہوا

اور اس کی اپنی ذات بھی اس معیار پر پوری اترتی ہے۔

میراجی

موسم بہار

پھول ۔ اُن سے بھی خلش پانے کا موسم آگیا
اک نئی دنیا میں کھو جانے کا موسم آگیا

یاد کرنے یاد آجانے کا موسم آگیا
زندگی میں زندگی پانے کا موسم آگیا

صبح دم گاتے ہوئے سے آبشاروں کی قسم
صُبح دم گھر سے نکل جانے کا موسم آگیا

ہلکی ہلکی بدلیوں میں نکھری نکھری چاندنی
داستانِ حُسن دُہرانے کا موسم آگیا

رس ۔ عجب انداز سے کھلتی ہوئی کلیوں کا رس
بے پیئے مدہوش ہو جانے کا موسم آگیا

گفتگو کا سلسلہ موہوم امیدوں کے ساتھ
پھر کسی شئے کی کمی پانے کا موسم آگیا

یادِ ان راتوں میں کچھ بیتی ہوئی راتوں کی یاد
کروٹوں میں رات کٹ جانے کا موسم آگیا

دور سے آتی ہوئی معصوم نغموں کی صدا
قلب کی چوٹیں اُبھر آنے کا موسم آگیا

ایک وہ بھی ہیں زمانے میں کہ جن کے واسطے
قہقہوں کے پھول برسانے کا موسم آگیا

لطفِ ہر احساس کیسا کیف ہر منظر کہاں
الغرض مجبور کہلانے کا موسم آگیا

احتیاط اے پے بہ پے ناکامیابی احتیاط!
احتیاطوں سے گذر جانے کا موسم آگیا

میں سمجھتا تھا سحرؔ رونے سے فرصت مل گئی
میں سمجھتا تھا سکوں پانے کا موسم آگیا

سحرؔ رامپوری

موسم بہار

گلستاں پر مستیاں چھانے کا موسم آگیا
ہائے اہلِ دل کے گھبرانے کا موسم آگیا

آم کی شاخوں میں "بور" آنے کا موسم آگیا
ولولوں کے زندگی پانے کا موسم آگیا

حسنِ فطرت کے ستم ڈھانے کا موسم آگیا
بجلیاں پودوں میں چمکانے کا موسم آگیا

بے تکلف۔ بے محابا۔ بے نیاز و بے خبر
سینکڑوں جلوے نظر آنے کا موسم آگیا

سامنے آتے ہوئے دلچسپ مصرعے "پے بہ پے"
چلتے چلتے شعر لکھ لانے کا موسم آگیا

سَرو پر بیٹھی ہوئی دو فاختائیں پاس پاس
"ربطِ باہم" یاد آجانے کا موسم آگیا

شامہ چھوتا ہوا لیموں کے پھولوں کی مہک
پاؤں رکنے دل کے لہرانے کا موسم آگیا

"ناسپاتی" کے درختوں پر بہار آئی ہوئی
باصرہ کو ہار پہنانے کا موسم آگیا

بے طلب کوزے دیئے جاتا ہے ہر شیریں دہن
ذائقہ کے ہونٹ سِل جانے کا موسم آگیا

انگلیاں ترتیبِ گلدستہ میں غرقِ آب و رنگ
لامسہ میں رنگ دوڑانے کا موسم آگیا

زمزمہ کانوں کے پردوں پر ترنم آفریں
سامعہ گیتوں سے بھر جانے کا موسم آگیا

کشمشی۔ آبی۔ سیہ برقعوں کی رُت پھر آگئی
بدلیوں سے نور برسانے کا موسم آگیا

الغرض تصریح پر مائل ہے ہر خلوت نشیں
الغرض بچھڑوں کے مل جانے کا موسم آگیا

شاد اُن سے بات ہو جانے کا موقع آئے گا
بات کرتے رات کٹ جانے کا موسم آگیا

شاد عارفی

جوار بھاٹا

بیوی۔ اجی اٹھئے نا۔ اتنا دن ہونے کو آیا اور آپ ہیں کہ ابھی تک سو رہے ہیں۔

میاں۔ (کروٹ بدلتے ہوئے) ہوں۔ اوں!

بیوی۔ نہ جانے ان لوگوں پہ اتنی نحوست کیوں چھائی رہتی ہے۔ نہ نماز۔ نہ ۔ ۔ ۔ ۔

میاں۔ اچھا تو چپ رہو۔ سونے دو۔

بیوی۔ بس نماز کے نام سے تو بیخ پا ہو جاتے ہیں۔ نہ دین کی فکر نہ دنیا کی۔ نیند ہے اور یہ ہیں۔ کیا ابھی تک نیند پوری نہیں ہوئی۔

میاں۔ نہیں ہوئی!

بیوی۔ معلوم ہے! آٹھ بج چکے ہیں!

میاں۔ گھڑیاں بند ہو گئی ہیں کیا؟

بیوی۔ نہیں —— مگر اس کا مطلب؟

میاں۔ نو بھی بج سکتے ہیں!

بیوی۔ جی ہاں! تو گویا نو بجے تک سونے کا ارادہ ہے! اور آج چائے نہیں پئیں گے کیا!

میاں۔ چائے نو بجے بھی پی جا سکتی ہے!

بیوی۔ گویا دن بھر میں چائے ہی بناتی رہوں اور بھلا کچھ کام ہے۔ چائے بنی رکھی ہے تو بلا سے۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے تو بلا سے بس ان کو تو یہی کام ہے کہ سوتے رہیں اور کوئی جگائے نہیں۔ دن بھر کام کرتے کرتے تھک جاتی ہوں۔ مگر مجھے تو اتنی نیند نصیب نہیں ہوتی۔

میاں۔ تو اس میں میرا کیا قصور ہے! تم بھی سو رہو، اگر جگا جاؤں تو کہنا۔

بیوی۔ جگا جاؤں تو کہنا۔ مگر سونے بھی کب دیتے ہیں، آدھی آدھی رات تک —— کھانا لئے بیٹھی رہتی ہوں۔ مگر آپ ہیں کہ کبھی تاش کھیلتے کھیلتے دیر ہو جاتی ہے۔ کبھی اُس مردود مرغوب کے ہاں ریڈیو سنتے رہتے ہیں بس روز یہی بہانے۔ یہی چکمے ہیں تو اس زندگی سے تنگ آ گئی ہوں۔ کبھی یہ بھی کہا کہ آج گھر چل کے بیٹھیں! آخر گھر میں بھی تو انسان بستے ہیں۔

میاں۔ شاید!

بیوی۔ تو کیا میں انسان نہیں ہوں۔

میاں۔ نہیں!

بیوی۔ وہ کیوں۔

میاں۔ چونکہ تم میری بیوی ہو! اور بیوی کا فرض ہے کہ شوہر کا حکم مانے اور انسانیت تقاضا کرتی ہے کہ کسی کے آرام میں مخل نہ ہو۔ اس لئے مجھے سونے دو۔

بیوی۔ بس جی بس۔ آپ حد سے بڑھ گئے۔ اب میں برداشت نہیں کر سکتی۔

میاں۔ مجھے معلوم ہے۔

بیوی۔ کیا معلوم ہے؟

میاں۔ کہ تم برداشت نہیں کر سکتی ہو۔ انسانیت تقاضا کرتی ہے کہ برداشت کرو۔ اور بیوی کو بہت کچھ برداشت کرنا ہوتا ہے۔

بیوی۔ میں نے بہت کچھ برداشت کیا۔ اب اس سے زیادہ میری طاقت سے باہر ہے۔

میاں۔ تو پھر!

بیوی۔ بس اب جی چاہتا ہے کہ اس گھر کو چھوڑ کے کہیں بھاگ جاؤں۔

میاں۔ کہاں جاؤ گی! مجھے بتا کے جانا!

بیوی۔ اپنے میکے جاؤں گی جہاں مجھے انسان سمجھا جاتا ہے۔ جہاں میری عزت کی جاتی ہے اور میری ہر خواہش پوری کی جاتی ہے۔

میاں۔ مگر وہ تو میں بھی کرنے کو تیار ہوں۔

بیوی۔ یہاں تو میری کتوں کی سی حالت ہوتی ہے۔

میاں۔ مگر میں تو کُتّوں سے بھی بہت محبت کرتا ہوں۔

بیوی۔ بس کُتّوں سے محبت کیجئے

میاں۔ مگر میں انسانوں سے بھی کرتا ہوں۔

بیوی۔ تو کیا میں انسان نہیں ہوں۔

میاں۔ نہیں۔ تم میری بیوی ہو۔

بیوی۔ کیا لوگ بیویوں سے محبت نہیں کرتے

میاں۔ نہیں۔

بیوی۔ پھر اور کس سے کرتے ہیں۔

میاں۔ عورتوں سے۔

بیوی۔ یعنی میں عورت بھی نہیں ہوں۔

میاں۔ غالبًا۔!

بیوی۔ وہ کیسے؟

میاں۔ عورتیں جنگ نہیں کرتیں۔

بیوی۔ تو پھر میں ہوں کیا؟

میاں۔ معلوم نہیں۔

بیوی۔ بس جی بس۔ زبان کو لگام دیجئے۔ آپ سے شرافت نہیں برتی جا سکتی۔

میاں۔ مجھے بھی یہی رونا ہے۔

بیوی۔ وہ کیسے؟

میاں۔ کہ مجھے شرافت سے سونے دو!

بیوی۔ سونے دو۔ سونے دو۔ کیا ابھی تک آپ سو نہیں چکے؟

میاں۔ کیا کہا؟

بیوی۔ کیا آپ ابھی جاگے نہیں؟

میاں۔ ہیں! میں تو بالکل جاگ رہا ہوں۔ معلوم ہوتا ہے کہ میں کوئی خواب دیکھ رہا تھا۔

بیوی۔ شکر ہے خدا کا، آپ جاگے تو!

میاں۔ ہیں۔ یہ شکر کاہے کا۔ لاحول پڑھو۔

بیوی۔ وہ کیوں

میاں۔ اس لئے کہ میں خواب میں تمہارے ساتھ تکرار کر رہا تھا۔ توبہ توبہ

بیوی۔ تو کیا اب آپ جاگ رہے ہیں؟

میاں۔ بالکل . . . . دیکھو چٹکی لو۔

بیوی۔ ذرا زور سے چٹکی لیتی ہے۔ ہوں۔

میاں۔ اُف میں تو جاگ رہا ہوں

بیوی۔ شکر ہے!

میاں۔ پھر وہی!!!

بیوی۔ شکر ہے کہ آپ جاگے تو سہی۔

میاں۔ تو کوئی نذر بانٹو۔ ہم بھی کھائیں گے۔

بیوی۔ پہلے چائے تو پی لو۔

میاں۔ کیا چائے تیار ہے؟

بیوی۔ آدھ گھنٹہ سے تو لئے بیٹھی ہوں۔

میاں۔ تو بتایا کیوں نہیں؟

بیوی۔ مگر آپ اُٹھتے بھی!

میاں۔ تو جگایا کیوں نہیں؟

بیوی۔ جاگتوں کو کون جگائے۔

میاں۔ میں نہیں سمجھا۔

بیوی۔ پھر سمجھ لینا۔ پہلے چائے پی لیجئے۔ ٹھنڈی ہو رہی ہے۔

میاں۔ کیا چینی ملا دی۔

بیوی۔ جی ہاں۔

میاں۔ کتنے چمچے؟

بیوی۔ یاد نہیں۔ بس یہی دو تین۔

میاں۔ پھر میں تو چائے پینے سے رہا!

بیوی۔ کیوں!

میاں۔ بس چپ رہو۔

بیوی۔ مگر اب غصہ سے کیوں کھولنے لگ گئے صبح صبح لوگ اللہ کا نام لیتے ہیں اور آپ اُٹھتے ہی جھگڑتے ہیں لیکن جھگڑے کی کوئی وجہ بھی تو ہو!

میاں۔ کیا یہ کم ہے کہ تمہیں سال بھر میں چائے بنانی بھی نہ آئی۔

بیوی۔ مگر چائے تو بنا رکھی ہے۔

میاں۔ بیت اللہ! کس مصیبت میں پھنس گیا!

بیوی۔ مصیبت کاہے کی؟

میاں۔ یہی کہ تمہیں سمجھ نہ آئے گی اور میری تمام عمر یوں ہی گذر جائے گی۔

بیوی۔ آخر میں سمجھی کیا نہیں!

میاں۔ یہی کہ چائے بنانی بھی نہیں آتی۔

بیوی۔ مگر چائے تو بنا رکھی ہے۔

میاں۔ پھر وہی۔ میرا مطلب ہے کہ چائے میں کتنی چینی ڈالنی چاہیئے۔ کتنا دودھ وغیرہ وغیرہ۔

بیوی۔ تو کتنی چینی ڈالنی چاہیئے۔؟

میاں۔ بالکل نہیں۔

بیوی۔ وہ کیوں۔ مگر آپ تو چینی ڈالتے ہیں۔

میاں۔ بس میں خود ملا لیا کروں گا۔ تمہیں تکلیف کی ضرورت نہیں۔

بیوی۔ شکر ہے۔ کچھ تو آپ کیا کریں گے۔

میاں بس وہ دن قریب ہے جب مجھے سب کچھ خود کرنا ہوگا۔

بیوی۔ وہ تو بہت خوشی کا دن ہوگا۔!

میاں۔ تم دیکھو گی!

بیوی۔ کیا دیکھوں گی! ہمارے ساتھ باتیں صاف صاف کیا کیجئے۔ یہ آپ کی پہیلیاں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں۔

میاں۔ خدا نے عقل بھی تو نہیں دے رکھی۔

بیوی۔ عقل کا اس بات سے کیا واسطہ۔ بس دنیا بھر کی عقل آپ ہی میں ہے۔

میاں۔ یقیناً۔

بیوی۔ کیا میں بے وقوف ہوں۔

میاں۔ مجھے شک ہے۔

بیوی۔ مجھے فوراً اس کا جواب دیجئے۔ اگر میں بے وقوف ہوں تو اس گھر میں ایک منٹ بھی نہ ٹھہروں گی۔ آپ چپ کیوں ہیں۔ بولتے کیوں نہیں۔ میرے سوال کا جواب دیجئے۔ میں نے تہیہ کر لیا ہے کہ آج اس بات کا فیصلہ کر کے رہوں گی۔ یہاں میری زندگی حرام ہو چکی ہے۔ ساری ساری رات انتظار میں جاگتے رہنا، دن ہوتے ہی کسی نہ کسی بات پہ جھگڑا۔ بس ہماری آپ سے بسر نہیں ہو سکتی۔

میاں۔ مگر ہماری تو بڑے مزے سے گذرتی ہے۔

بیوی۔ آپ کی مزے سے گذرتی ہوگی۔ ہمیں کیا! میری تو جان پہ بن آئی۔ دن بھر جھگڑا۔ ہر روز لڑائی۔

میاں۔ اچھی چہل پہل رہتی ہے۔

بیوی۔ میں تو آپ پر حیران ہوں۔ کیا لڑائی جھگڑے سے ہی چہل پہل ہوتی ہے!

میاں۔ آخر ہم لڑیں بھی تو کس سے، گھر میں اور ہے کون! نوکروں کو روز ڈانٹ ڈپٹ کرنا اچھا نہیں ہوتا

بیوی۔ تو کیا یہ ڈانٹ ڈپٹ میری ہی قسمت میں لکھی ہے۔ میں تو اسے پسند نہیں کرتی۔ میں ایسی زندگی بسر نہیں کر سکتی۔

میاں۔ پھر وہی۔ آخر تمہیں تکلیف کا ہے کی ہے؟ مجھے بتاؤ۔ میں فوراً اس کو رفع کرتا ہوں۔

بیوی۔ کبھی لڑائی جھگڑے کے علاوہ اور بھی کوئی بات کی۔ یہ بھی کہ تم بے وقوف ہو۔ کم عقل۔ انسان بھی نہیں۔ عورت بھی نہیں۔ آخر ہوں تو کیا ہوں۔ مجھے معلوم ہونا چاہیئے۔

میاں۔ تم میری بیوی ہو۔ بہت سگھڑ۔ بہت سلیقے والی۔ بہت عقلمند اور . . . . .

بیوی۔ اجی چھوڑو بھی ان باتوں کو۔ ہر وقت ایسی ہی سوجھتی ہے۔ کبھی تو چین لینے دو۔

میاں۔ کتنی بھلی معلوم دیتی ہو۔ تمہاری آنکھیں۔ تمہارے بال . . . .

بیوی۔ اجی دیکھو کوئی کیا کہے گا۔

میاں۔ کہنے دو! ——

عبدالرّب خاں

غزل

لا وہ شراب، حُسنِ فروزاں کہیں جسے
وہ جام دے کہ عارضِ جاناں کہیں جسے

اے حُسنِ دِل نواز مِرے دل کو بخش دے
وہ اضطراب زلف پریشاں کہیں جسے

پائے جنوں کو ایسی ہو آوارگی نصیب
حُسنِ خرام و سیرِ گلستاں کہیں جسے

ہونٹوں سے موج موج فضا میں بلند ہو
وہ نیم آہ، بادِ بہاراں کہیں جسے

پیدا ہو آنسوؤں کے تقاطر سے وہ سرود
موجِ نشاط و نغمۂ باراں کہیں جسے

قامت پہ بے نوائیاں موزوں کریں وہ شے
رعنائی ہائے پیکرِ عریاں کہیں جسے

اُس جذبۂ شدید میں خوابِ شباب ہو
گہوارۂ تلاطم و طوفاں کہیں جسے

مجھ کو گرائے لغزشِ مستانہ اُس جگہ
بے اختیار، چاہِ زنخداں کہیں جسے

سعید احمد اعجاز

یہ مرد ـــ !

کسی قسم کے احساس کے بغیر، چپ چاپ اگو بند نے لکشمی کی چارپائی کے ارد گرد پردے لگا دیئے، پردے ـــ جو لکڑی کے فریم میں سفید کپڑا لگا کر بنائے گئے تھے۔ اور حسب خواہش کھولے یا بند کئے جاسکتے تھے۔ تب مس سلطانہ اور مبی تیز تیز چلتی آئیں اور ان کے بعد ڈاکٹر ایک متین اور سنجیدہ صورت انسان، اپنے بھاری قدم آہستہ آہستہ اٹھاتا ہوا ، ان پردوں کے اندر چلا گیا۔

کچھ لمحہ تک کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ صرف چھت پر لگے ہوئے سفید پروں والے پنکھے اپنی پوری رفتار سے چلتے رہے اور جون کی تپتی دوپہر اپنی نیم وا آنکھوں سے غنودگی کی حالت میں چُپ چاپ پڑی رہی۔

یکایک پردے کے پیچھے سے کچھ اُکھڑی اُکھڑی سانسوں کی آواز آئی، پھر لکشمی کے اُکھڑے اُکھڑے الفاظ اور پھر سلطانہ کی لمبی سانس! ڈاکٹر نے کہا ـــ سٹریچر لے آؤ! اور یہ کہہ کر، پردے کے پیچھے سے نکل کر، وہ جیسے آئے تھے، ویسے ہی چلے گئے۔ ان کے پیچھے رومال سے آنکھیں پونچھتی ہوئی سلطانہ نکلی۔ دوسری بیمار عورتیں تجسس بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھیں، اس کے نکلتے ہی رشیدہ نے پوچھا ـــ کیوں؟

"ختم ہوگئی"۔ بھرے گلے سے سلطانہ نے جواب دیا۔

"آخری وقت کیا کہتی تھی؟" ـ سُرتی بولی۔

"صرف ایک بار کھنہ صاحب کو یاد کیا اور بس!" اور یہ کہہ کر آنسو پونچھتی ہوئی سلطانہ جلد جلد سٹریچر لانے کے لئے چلی گئی۔

....

لکشمی اپنے خاوند کو کھنہ صاحب، کہہ کر پکارتی تھی۔ وہ لاہور ہی میں ملازم تھے اور قاعدے کے مطابق ہر ساتویں دن لکشمی کو دیکھنے آتے تھے۔ کوئی ایسے خوش شکل تو نہ تھے، مگر ایسے بھی نہیں کہ بدصورت کہے جاسکیں آنکھوں میں تو کچھ ایسی بات تھی کہ آدمی بے ساختہ ان کی طرف کھنچ جاتا تھا اور پھر اتنی باتیں کرتے تھے، اتنے قہقہے لگاتے تھے کہ جب وہ آجاتے تو ہسپتال کی اس خاموش اور ساکن فضا میں زندگی سی آجاتی۔ فقط لکشمی ہی ان کے آنے کا انتظار نہیں کرتی تھی۔ اُس کھلے اور کشادہ کمرے میں لوہے کی سخت، بے درد چارپائیوں پر لیٹی ہوئی اور بخار، حرارت، دوا پرہیز کی باتیں سُن سُن کر عاجز آئی ہوئی دوسری بیمار عورتیں بھی اُن کے آنے کی راہ دیکھا کرتی تھیں اور لکشمی۔ وہ تو جانے یہ سات دن کیسے کاٹتی تھی! ہنستی تھی، دوسروں کو ہنساتی تھی، لیکن اس تمام ہنسی ٹھٹھے میں اپنے خاوند کا انتظار اُس کے دل کے کسی نامعلوم گوشے میں چھپا پڑا رہتا تھا اور کون جانتا ہے کہ یہ ہنسی قہقہے، ہسپتال میں بسر ہونے والے لمبے لمبے دنوں کو کاٹنے کا محض بہانہ ہی نہ تھے۔ یہ بات نہیں کہ اسے اپنے خاوند سے اتنی شدید محبت اس مہلک بیماری کے دنوں ہی میں ہوئی تھی۔ بلکہ اسی دن جب شادی کے بعد ایک مہینہ گذار کر وہ اپنے میکے واپس آئی تھی تو اس کی سہیلیوں نے جان لیا تھا کہ بستی کی آزاد فضا میں دن رات کھیلنے والی، گلی محلے کو اپنے قہقہوں سے گونجا دینے والی لکشمی اب محبت کی زنجیروں میں جکڑی گئی ہے۔

سہیلیاں...... جب اُسے چاروں طرف سے گھیر کر بیٹھ گئی تھیں تو اُس نے ایک ادائے ناز سے کہا تھا "ان کی بات پوچھتی ہو؟ وہ تو مجھے پل بھر کے لئے بھی اپنی آنکھوں سے اوجھل نہیں ہونے دیتے۔ کتنی، کتنی دیر میری طرف دیکھتے ہی رہتے ہیں اور کہتے ہیں . . . "

شرم سے اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ پھر سہیلیوں کے اصرار پر اپنے گلاب کے سے چہرے کو ہاتھوں سے چھپا کر بولی "کہتے ہیں تم تو سورگ کی دیوی ہو، میں تمہاری پوجا کرتا ہوں"!

شیلا کی رشک سے معمور آنکھوں نے تب دیکھا، کہ اس کی یہ بات فقط ایک ہندوستانی بیوی کے اپنے شوہر کے متعلق عام اندازِ خیال ہی کے مطابق نہیں تھی بلکہ حقیقت پر مبنی تھی جس کی تائید اس کا رُواں رُواں کر رہا تھا۔ تب اپنے خاوند کی بے التفاتی کا دھیان آنے پر ایک سرد آہ اس کے

دل کی گہرائیوں سے نکل گئی۔

ساوتری نے اپنے رشک کا اظہار ایک دوسرے ہی طریق پہ کیا۔ کھسیانی سی ہنسی ہنستے ہوئے وہ بولی — "ہاں بہن، انہیں محبت کیوں نہ ہوگی، ایک بار ہاتھ سے گنوا کر ہی آدمی کسی چیز کی قدر کرنا سیکھتا ہے۔"

اس فقرے میں جو طنز پنہاں تھی۔ اس کی طرف دھیان کئے بغیر سادہ لوح لکشمی نے اپنی مسرت کی رو میں سہیلیوں کو اپنی اس ایک مہینے کی ازدواجی زندگی کی بیسیوں کہانیاں سنا ڈالی تھیں۔ کس طرح اس کا شوہر اس پہ جان چھڑکتا ہے۔ اسے آنکھوں سے اوجھل کرنا پسند نہیں کرتا۔ دفتر میں نہ جانے کیسے وقت گذرتا ہے! "پہلی بیوی" — وہ کہتے ہیں۔ "وہ تو گنوار اور بے وقوف تھی۔ تمہیں پا کر تو میں نے جیتے جی سورگ کا مزہ چکھ لیا ہے۔"

تارا نے تب ہلتے ہوئے کہا — "ساس کو یہ سب کچھ کیسے بھاتا ہوگا!"

"اُن کے دل کی تو میں کیا جانوں بہن،" لکشمی نے مسرت بھرے لہجے میں جواب دیا۔ "لیکن میٹھی تو وہ ایسی ہیں جیسے مصری۔ بولتی ہیں تو رس گھول دیتی ہیں۔ میری تو عادت تم جانتی ہو۔ سوتے سوتے دن نکل آتا ہے۔ مگر انھوں نے اس کا کبھی برا نہیں مانا۔ وہ خود علی الصبح چار بجے اٹھ کر، نہا دھو، پوجا پاٹھ کر، گھر کا سب کام ختم کر دیتی ہیں۔ میں کچھ کرنے کی کوشش بھی کروں تو کہتی ہیں۔ تمہیں ہی تو کرنا ہے بہو، میں کب تک بیٹھی رہوں گی۔"

اور اس دن بستی میں لکشمی کی رحم دل اور فرض شناس ساس اور محبت کرنے والے ہنس مکھ خاوند کی کہانی گھر گھر پھیل گئی اور شادی شدہ لڑکیوں نے دعا کی کہ اُن کے خاوند اور ساسیں بھی ایسی ہی بن جائیں اور کنواری لڑکیوں نے دل ہی دل میں کہا — بھگوان ہمیں بھی ایسا ہی گھر در دینا۔

. . . .

ربڑ کے پہیوں والا سٹریچر کسی آواز کے بغیر مشرقی دروازے سے داخل ہوا۔ گوبندا اسے دھکیل رہا تھا اور مس سلطانہ چپ چاپ اس کے ساتھ چلی آرہی تھی۔ اس کا ہمیشہ ہنسنے والا چہرہ اترا ہوا تھا۔ جیسے اُسی کے کسی قریبی رشتہ دار کی موت ہوگئی ہو۔ موتیں ہسپتال میں ہمیشہ ہی ہوا کرتی ہیں اور ہسپتال کے ملازم ان سے خوگر ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے سب کام کسی قسم کی بے چینی کے بغیر کئے جاتے ہیں لیکن لکشمی سے سلطانہ کو محبت سی ہوگئی تھی۔ سلطانہ پر ہی کیا موقوف ہے سب کو اُس سے اُنس ہو گیا تھا۔ اُس نے اپنی ازدواجی زندگی کے کتنے ہی واقعات ایک عجیب سادگی سے بیان کئے تھے۔ اپنی ساس کے متعلق اس نے جو بلند خیالات اپنے دل میں جما رکھے تھے۔ انہیں ہوا ہوتے دیر نہیں لگی۔ وہی زبان جو پہلے رس کی دھاریں بہاتی تھی۔ آہستہ آہستہ زہر بھی اُگلنے لگی۔ کھنہ صاحب تب ملازم نہیں ہوئے تھے مگر گھر کی سیاسیات میں وہ ماہر تھے۔ اپنا کام چالاکی سے نکالنا جانتے تھے۔ ماں کے سامنے چپ رہتے لیکن تنہائی میں کہتے — "لکشمی ان سب قصوروں کے لئے میں تم سے معافی مانگتا ہوں"۔ اور تب اُسے ساس کی جھڑکیاں، طعنے، گالیاں بالکل بھول جاتیں اور خاوند سے اُس کی عقیدت اور محبت کئی گنا بڑھ جاتی — وہ ساتھ ہیں تو پھر سارا جہان خلاف ہو جائے۔ وہ سب کی مخالفت خوشی خوشی جھیل لے گی۔ اس کا جی نہیں چاہتا تھا لیکن ساس کو خوش کرنے کے لئے اس نے بھگوتی دُرگا کی پوجا بھی سیکھی اور اپنی سہل انگاری کو چھوڑ کر محنت سے کام کرنے کی عادت ڈالی۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود ساس کے تیور نہ بدلے۔ اس کی جھڑکیاں۔ طعنے۔ کوسنے بدستور جاری رہے مگر لکشمی نے سب کچھ ہنس ہنس کر سہنا سیکھ لیا تھا۔ ہاں ایک بار جب جلتا ہوا گھی گر جانے سے اس کے ہاتھ جل گئے تھے اور ابھی آرام بھی نہ آنے پایا تھا کہ اُس کی ساس نے کپڑوں کی بھری گٹھڑی اس کے سامنے رکھ دی تو اُس کی ہمیشہ مسکرانے والی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ کپڑے دھوتے دھوتے اس کے چھالے پھوٹ گئے تھے۔ کپڑے دھونے کے بعد اندر کمرے میں جا کر وہ خوب جی بھر کر روئی تھی اور جب کھنہ صاحب آئے تھے تو اس نے کہا تھا۔ "مجھے اس نرک سے چھٹکارا دلاؤ۔ ماں اگر دھن والی ہے تو کیا اسی لئے یہ نرک کی اذیتیں برداشت کی جائیں۔ تمہارے ساتھ تو مجھے سوکھی روٹی بھاتی ہے۔ مگر یہ ظلم تو اب نہیں سہا جاتا۔"

کھنہ صاحب نے اُسے تسلی دی تھی اور مستقبل کی خوشیوں کا ٹھنڈا پھاہا اس کے جلتے ہوئے دل پر رکھ دیا تھا۔ انہوں نے کیا کیا کچھ کہا تھا۔ جب وہ ملازم ہو جائیں گے تو اسے اپنے ساتھ لاہور لے جائیں گے۔ ہاں تو لزاں شہر ہی میں رہے گی اور وہاں لاہور میں — انارکلی، مال، لارنس باغ، سینما، تماشے، نمائشیں۔ اور انہی مسرت بخش تصوّرات میں گم

ہوکر وہ اپنے چھالوں کی ٹیس، اپنے دل کا درد سب کچھ بھول گئی تھی۔

لیکن اس کی بدقسمتی کہ جب وہ دن آیا اور کھنہ صاحب لاہور ہی میں سول سیکریٹریٹ میں ملازم ہو گئے تو وہ دق جیسی مہلک بیماری میں مبتلا ہو گئی۔

. . . .

آہستہ آہستہ چلتا ہوا اسٹریچر پردے کے پیچھے پہنچا اور کچھ لمحے بعد سفید چادر میں لپٹا ہوا ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ لے کر دونوں طرف بچھی ہوئی چارپائیوں میں سے ہوتا ہوا مغربی دروازے سے باہر چلا گیا۔ ڈاکٹر صاحب برآمدے ہی میں کھڑے تھے۔ وہیں سے انہوں نے کہا۔ مردہ خانے میں لے جا کر رکھو۔ تب تک کھنہ صاحب آ جائیں گے۔ لہنا سنگھ تو کب سے چلا گیا ہے۔

لمحہ بھر کے لئے بیمار عورتوں کے دل دھک دھک کرنے لگے۔

لکشمی کا نحیف و ناتواں دق سے مرجھایا ہوا۔ موت کی اس سفید چادر میں لپٹا ہوا جسم سب کی آنکھوں کے سامنے سے گذر گیا۔ تپ دق کی ان سب مریضاؤں کا بھی آخر یہی انجام ہونا ہے۔ اپنے ہی جیسی بیماری سے کسی کو مرتے دیکھنا اور خود گھُل گھُل کر مرنے کا تصور موت سے بڑھ کر اندوہناک ہے۔ بہتوں کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھا گیا اور بعض کے آنسو بہنے لگے۔

پردے کے پیچھے سے نکل کر مس بیٹی غسلخانے میں ہاتھ صاف کرنے چلی گئی اور رحمدل سلطانہ نے اس غمناک ماحول کو کچھ بدلنے کی کوشش کی۔ ہمیشہ ہی ایسا ہوتا تھا ہمیشہ۔ جب کوئی مریضہ اس بھیانک بیماری کے ہاتھوں سے نجات پاتی تھی اور کمرے میں موت کی اُداس خاموشی چھا جاتی تھی۔ مس سلطانہ اپنے میٹھے تسلی آمیز لہجہ میں۔ اپنی دلچسپ باتوں، اپنے حیرت انگیز قصوں سے اس موت کی خاموشی کو دور کرنے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ برس ڈیڑھ برس سے لکشمی بھی اس کام میں اس کا ہاتھ بٹاتی آئی تھی۔ لیکن آج وہ خود ہی اس گہری خاموشی میں سما گئی تھی

گھڑی نے ٹن ٹن دو بجائے۔ ٹمپریچر لینے کا وقت ہو گیا تھا۔ دل میں اُمڈتے ہوئے آنسوؤں کے طوفان کو زبردستی روک کر، دوا میں پڑے ہوئے تھرمامیٹر کو ہاتھ میں لئے اور مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے وہ رشیدہ کی چارپائی کے پاس پہنچی۔ لیکن آج سعی بسیار کے باوجود وہ لکشمی کی موت کی یاد کو ہنسی کے پردے میں نہ چھپا سکی۔

رشیدہ نے کہا۔ مس صاحب لکشمی بھی چلی گئی۔

تھرمامیٹر کو رشیدہ کی زبان کے نیچے رکھ کر سلطانہ نے ایک لمبی سانس لی۔ اور نبض کی رفتار دیکھنے کے لئے اس کی کلائی ہاتھ میں تھام لی۔

سُرتی نے تحسین آمیز لہجہ میں کہا۔ "آخری وقت تک اپنے خاوند کا نام اُس کی زبان پر رہا۔ کیوں مس صاحب کھنہ صاحب بھی اس سے اتنا ہی پیار کرتے ہوں گے؟"

"نہوں گے کیا۔ کرتے ہیں۔" سلطانہ نے رشیدہ کی کلائی کو چھوڑ کر کہا "لکشمی کو مرنا بھی اسی لئے سہل ہو گیا۔ میں تو سوچتی ہوں کہ محبت کرنے والا خاوند جس خوش قسمت کے پاس ہے۔ موت اسے کچھ بھی تکلیف نہیں پہنچا سکتی۔ بے ہوش ہونے سے کچھ دیر پہلے جب اسے معلوم ہو گیا کہ اس کا آخری وقت اب نزدیک ہے تو مجھ سے اس نے کہا تھا ——

مس صاحب جانے وہ کیوں نہیں آئے۔ اس بار تو انہیں آئے پندرہ دن ہو گئے۔ اس وقت جی چاہتا ہے کہ وہ میرے پاس ہوتے۔ پھر خود ہی ہنس کر بولی — مس صاحب میں بھی کتنی بے وقوف ہوں۔ دل میں تو میرے ہر وقت انہیں کی تصویر رہتی ہے۔ اور میں بھی ان سے کتنی دور ہوں! کئی بار تو انہوں نے کہا ہے۔ لکشمی تم تو ہر وقت میرے پاس رہتی ہو۔ کئی بار کام کرتے کرتے تمہارا خیال آ جانے سے لکھنے میں غلطی ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ مرتے وقت بھی جب کچھ لمحوں کے لئے اس کی بیہوشی ٹوٹی تو اپنے خاوند کا نام ہی اس کی زبان پر تھا۔"

یہ کہتے ہوئے بھیگی آنکھوں کو پونچھ، گھڑی دیکھ کر سلطانہ نے تھرمامیٹر رشیدہ کے منہ سے نکال لیا۔ اور حرارت دیکھ کر نوٹ کرنے کے لئے چارٹ اُٹھایا۔

سرتی نے پوچھا۔ "لیکن مس صاحب یہ گہنوں کی بات کیا تھی۔ جب بھی کھنہ صاحب آتے تھے۔ اِن کا ذکر ضرور چھیڑتا تھا۔ جب سے گہنے لے گئے۔ بس ایک بار ہی تو پھر آئے ہیں۔"

تھرمامیٹر کو دوا میں ڈال اور دوسرا اُٹھا کر سُرتی کو دیتے ہوئے اُس نے کہا —— "میں نے پوچھا نہیں۔ لیکن جب لکشمی آئی تھی تو سب گہنے ساتھ ہی لے آئی تھی۔ اُس کی ساس نہیں چاہتی تھی کہ وہ ایک بھی گہنا ساتھ لے جائے۔ آخر ہسپتال میں اتنے گہنوں کا کام بھی کیا ہے۔ بازوبند، چوڑیاں، مالا، لاکٹ، کوئی ایک گہنا ہو تو کہوں۔ جانے کیوں اسے گہنوں سے اتنی

محبت تھی۔ ساس تو مرتے دم تک نہ لے جانے دیتی لیکن کھنّہ صاحب اپنی ماں کو سمجھا بجھا کر لے آئے تھے۔ یہاں مریضوں کو گہنے پہننے کی اجازت نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے سمجھایا کہ انہیں ساتھ نہیں لانا چاہئے تھا۔ اب بھی بہتر ہے کہ انہیں کھنّہ صاحب کے حوالے کر دو لیکن وہ گہنے اپنے پاس ہی رکھنا چاہتی تھی۔ آخر ڈاکٹر صاحب نے گہنے ایک لوہے کے صندوقچے میں بند کر کے چابی اسے دے دی اور صندوقچے کو ہسپتال کے سیف میں رکھ دیا۔ اس چابی کو وہ لحظہ بھر کے لئے بھی جدا نہ کرتی تھی۔ لیکن جب بیماری بڑھ گئی اور تن بدن کا بھی ہوش اسے بھولنے لگا۔ اور جب ایک دن کھنّہ صاحب کے کہنے پر میں نے اسے سمجھایا کہ گہنے تمہارے ہی نام بنک میں جمع کرائے جا سکتے ہیں تو اس نے چابی دے دی۔ یہی ایک بات لکشمی کی محبت میں مجھے عجیب نظر آئی۔ لیکن شاید انہی کے ذریعے وہ اپنے آپ کو زندہ سمجھتی تھی۔ اسی رات اس نے مجھے پاس بلا کر کہا تھا ـــــ

مس صاحب اب میں بہت دیر تک زندہ نہیں رہوں گی۔"

سرتی کی زبان تھرمامیٹر کی وجہ سے دُکھنے لگی تھی۔ آخر اُس نے خود ہی اسے نکال کر مس سلطانہ کو دے دیا۔ چونکہ مس سلطانہ نے تھرمامیٹر لے لیا اور ٹمپریچر دیکھنے لگی۔

سرتی نے کہا "یہ تو ٹھیک ہے مس صاحب، لیکن گہنے لینے کے بعد کھنّہ صاحب نے ہر ہفتہ آنا کیوں چھوڑ دیا۔ دو ہفتے گذر گئے انہیں آئے ہوئے۔"

رشیدہ بولی "بیمار نہ ہو گئے ہوں، نہیں تو گرمی، سردی، بارش دھوپ انہوں نے کسی بات کا کبھی خیال نہیں کیا۔ باقاعدہ ہر ہفتے آتے رہے۔ اور میں تو سوچتی ہوں مس صاحب لکشمی کی موت کی خبر سُن کر اُن کے دل پر کیسی گذرے گی۔ اپنی بیوی سے کس کو ایسی محبت ہو گی۔"

تب شاید سٹریچر مُردہ خانے میں پہنچا کر گوبند واپس آیا اور اس کے پیچھے پیچھے ڈاکٹر صاحب بھی آئے۔ پردے کے پاس پہنچ کر گوبند نے پوچھا۔ "کپڑوں کو لپیٹ دُوں۔ ڈاکٹر صاحب"۔ ڈاکٹر صاحب اس کے پاس جا کر کھڑے ہو گئے۔ اور انہیں اُنہوں نے کہا۔ "ہسپتال کی چادروں کو ڈس انفکٹر میں ڈال دو اور باقی کا سب سامان پڑا رہنے دو۔ ابھی شاید کھنّہ صاحب یا اُن کا آدمی آ جائے۔ ہاں گدّے کو باہر دھوپ میں ڈال دو۔"

اُسی لمحے برآمدے کے پاس سیڑھیوں پر سائیکل پھینک کر ہانپتا ہوا اور پسینے سے تر لہنا سنگھ اندر آیا۔ ڈاکٹر صاحب نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

"کیوں! کھنّہ صاحب ملے۔ بیمار تو نہیں؟"

لہنا سنگھ نے سر ہلایا۔ اُس کی سانس پھول رہی تھی۔ جواب نہ بن پڑتا تھا۔

ذرا تلخی سے ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔ "ملے یا نہیں؟ کہا نہیں تم نے کہ لاش کو آج شام سے پہلے لے جائیں۔"

ایک گہرا سانس لے کر لہنا سنگھ نے کہا۔ "وہ تو شادی کرنے اپنے گھر چلے گئے ہیں۔"

اور پھر کھٹ سے ٹمپریچر چارٹ کا فریم مس سلطانہ کے ہاتھ سے فرش پر گر پڑا۔ اور رشیدہ نے جیسے گھبرا کر چیختے ہوئے کہا ـــــ

مس صاحب! مس صاحب!

اُپندر ناتھ اشک

غزل

دل خوگرِ غم اور لبِ فریاد ہے خاموش
اے وائے ستم اب ستم ایجاد ہے خاموش

کس منہ سے ہو محرومیٔ قسمت کی شکایت
اک آہ تھی وہ بھی دمِ فریاد ہے خاموش

پامالِ محبت ہوں نہ سمجھے گا زمانہ
جوں صورتِ شبنم مری اُفتاد ہے خاموش

کیا نالۂ غم میں ہے ترے مرغِ گرفتار
کیوں شکوۂ بیداد پہ صیّاد ہے خاموش

محرومِ تماشا ہیں کھلی ہیں اگر آنکھیں
محشرکدۂ حسرتِ دلِ برباد ہے خاموش

رہتی تھی نظر جس کی رخِ لالہ و گل پر
گوشے میں قفس کے وہ چمن زاد ہے خاموش

کرتا تھا نظرؔ سوزِ جگر سے جو چراغاں
عرصہ ہوا وہ بندۂ بے داد ہے خاموش

قیوم نظرؔ

وہ؟

میرے دوست۔ تمہارا کہنا ہے کہ تم اسے کسی امکانی طریقہ سے نہ سمجھ سکے۔ اور میں یقین کرتا ہوں۔ تمہارا خیال ہے کہ میری دماغی حالت بد سے بدتر ہوتی جا رہی ہے؛ شاید ایسا ہی ہو۔ مگر وجوہات وہ نہیں جن کو تم نے قرین قیاس سمجھ رکھا ہے۔

یہ تو تمہیں معلوم ہی ہوگا کہ عنقریب میری شادی ہونے والی ہے۔ مجھے ایسا کرنے پر کس بات نے مجبور کیا۔ یہ میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں

میں نے اپنے خیالات اور عقیدوں سے ابھی تک تجاوز نہیں کیا۔ میں عورت اور مرد کی زندگی کو جب وہ خاوند اور بیوی کی حیثیت سے رہنے لگتے ہیں۔ انتہائی قسم کی بے وقوفی سمجھتا ہوں۔ میں کیا کہہ رہا ہوں اور کیا کہنا چاہتا ہوں، اس کو تم سمجھ گئے ہوگے۔ میری تو یہ خواہش تھی کہ جیسا ہوں ایسا ہی رہوں مگر ـــــ

اور پھر بھی میری شادی ہونے والی ہے!

اپنی ہونے والی شریک حیات کے متعلق میں بہت کم جانتا ہوں۔ بجز اس کے کہ میں نے انہیں چار یا پانچ بار دیکھا ہے اور کوئی ناگوار بات نہیں پائی ـــــ وہ خوبصورت اور تندرست ہیں ـــــ مجھے اور کسی بات سے واقفیت نہیں۔

وہ کسی متمول خاندان کی رکن نہ سہی مگر کھاتے پیتے والدین کی لڑکی ہے۔ اس میں نہ وہ خامیاں ہیں جو کسی شخص کو متنفر کر دیں اور نہ کوئی زبردست خصوصیات۔ مختصر یہ کہ وہ ان لڑکیوں میں سے ہے جو ہونے کو تو بڑی اچھی بیویاں بن جاتی ہیں۔ مگر ایک وقت ایسا آتا ہے جب ہم تمام عورتوں کو اس سے بہتر تصور کرتے ہیں جس کو ہم نے اپنا شریک حیات منتخب کیا۔

"کیوں" تم مجھ سے پوچھو گے نہیں "کونسی بات شادی کرنے پر مجبور کرتی ہے؟"

میں یقینی طور پر اس عجیب اور غیر ممکن وجہ کو ظاہر نہیں کرنا چاہتا جس نے مجھے یہ بعید از عقل کام انجام دینے پر مجبور کیا۔ مگر واقعہ یہ ہے کہ میں تنہا زندگی بسر کرنے سے خوف زدہ سا رہنے لگا ہوں۔

میں نہیں جانتا کہ کن الفاظ میں تم سے کہوں اور کس طرح تمہارے ذہن نشین کروں کہ تم سمجھ لو۔ بہرحال میری حالت قابل رحم بن گئی ہے۔

میں راتوں کو اکیلا نہیں رہنا چاہتا۔ میری خواہش ہے کہ میرے نزدیک کوئی ایسا ہم جنس ہو جس کو میں محسوس کر سکوں جو مجھ سے باتیں کرے۔ اور کسی موضوع پر چاہے وہ کچھ ہی کیوں نہ ہو میں اس سے گفتگو کر سکوں۔

میری خواہش ہے کہ میں اپنے پاس سونے والے کو بیدار کر دوں اور اگر چاہوں تو ایسے ہی کوئی غیر متوقع طور پر سوال کر بیٹھوں تاکہ میں انسانی آواز سنوں اور محسوس کروں کہ کوئی بیدار روح اور دھڑکتا ہوا دل میرے قریب ہے ـــــ ایک ایسا ہمراز جس کی دماغی قوتیں یکجا ہیں۔ تاکہ جب میں لمپ جلاؤں تو کسی انسانی چہرے کو دیکھ سکوں ـــــ کیونکہ ـــــ میں اقرار کرنے سے شرماتا ہوں ـــــ کیونکہ میں تنہا رہنے سے خوفزدہ ہوں!

آہ! تم اب بھی مجھے نہ سمجھ سکے۔

میں کسی خطرے سے نہیں ڈرتا۔ اگر کوئی شخص میرے کمرے میں گھس آئے تو بغیر کسی قسم کے خوف کے میں اس کو مار ڈالوں۔ میں بھوتوں سے بھی نہیں ڈرتا اور نہ ان پر یقین رکھتا ہوں۔ میں مرے ہوئے انسانوں سے نہیں ڈرتا کیونکہ میں اس چیز کو ہمیشہ کے لئے فنا سمجھتا ہوں جو صفحۂ زندگی سے مٹ جائے۔

خیر ـــــ ہاں۔ خیر مجھے بتانا ہی پڑے گا۔ میں اپنے آپ سے متوحش ہوں ـــــ ایک نامحدود خوف سے لرزتا ہوں۔

تم اس پر قہقہہ بلند کرو یا میرا مذاق اڑاؤ مگر یہ بہت ہی دہشت انگیز ہے اور میں اس پر قابو نہیں پا سکتا۔ میں دیوار، فرنیچر اور تمام ان اشیاء سے جن سے مجھے اچھی طرح واقفیت ہے ڈرتا ہوں اور اس کے علاوہ میں اپنے دہشت انگیز خیالات اور دماغی سکون سے جو نہ معلوم کب وحشت کی شکل اختیار کر لے ـــــ ڈرتا ہوں اور یہ تمام باتیں مجھے اس شاہراہ پر لئے جا رہی ہیں جس کی منزل بجز تکلیف و تردد کی آماجگاہ ہونے کے اور کچھ نہیں۔

پہلے پہل ایک نامعلوم اضطراری کیفیت میرے دماغ میں پیدا ہوتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ میں کانپنے لگتا ہوں میں مڑکر دیکھتا ہوں۔ اور یقیناً کچھ نہیں پاتا۔ میں چاہتا ہوں کہ وہاں کوئی چیز ہوتی۔ چاہے کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اس حد تک کہ میں اسے دیکھ سکتا۔ میرے اوپر خوف و ہراس کا عالم طاری ہو جاتا ہے اور وہ صرف اس وجہ سے کہ میں اپنے خوف کی نوعیت کو نہیں سمجھتا۔

اگر میں بات چیت کرتا ہوں تو مجھے اپنی آواز سے ڈر معلوم ہوتا ہے اگر میں چلتا ہوں تو نہ معلوم کس بات سے مجھے دہشت ہوتی ہے۔ کیا کوئی چیز پردوں کی آڑ میں پوشیدہ ہے؟ یا دروازہ اور الماری کے پیچھے چھپی ہوئی ہے! لیکن اس کے ساتھ ساتھ مجھے اس کا بھی یقین ہے کہ وہاں کوئی نہیں اور اس خیال کے ہوتے ہوئے میں اچانک پیچھے مڑکر دیکھتا ہوں کیونکہ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا کوئی میرے عقب میں ہے درآنحالیکہ کوئی موجود نہیں اور یہ میں خوب جانتا ہوں۔

میں پریشان ہو جاتا ہوں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا خوف لمحہ بہ لمحہ زیادہ ہوتا جا رہا ہے۔ میں اپنے کو کمرے میں بند کر لیتا ہوں اور بستر پر دراز ہو کر چادر میں چہرہ چھپا کر اپنی آنکھیں انتہائی رنج و افسوس کی حالت میں بند کر لیتا ہوں اور یہ جانتے ہوئے کہ لیمپ سرہانے روشن ہے اور مجھے اس کو بجھا دینا چاہئے۔ ایک وقفہ کے لئے پڑا رہتا ہوں اور پھر بھی ——— میں اس کو نہیں بجھا سکتا۔

یہ حالت بہت ہی تکلیف دہ ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟

اس سے قبل مجھے ان باتوں کا ذرا بھی احساس نہ ہوتا تھا۔ میں کمروں میں آتا جاتا رہتا اور کوئی چیز بھی میرے سکون و انبساط میں دخل انداز نہ ہوتی۔ اگر کوئی مجھ سے کہتا کہ تم ایسے مرض کے شکار ہونے والے ہو۔ میں اس کو مرض کے علاوہ کہہ ہی کیا سکتا ہوں؟ ——— اور ایک نامعلوم خوف تمہیں ہر لمحہ لرزہ براندام رکھے گا تو میں اس کے ان طفلانہ خیالات کو سن کر ہنس دیتا۔ اور اس کی بے وقوفی کی خوب داد دیتا میں یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مجھے اندھیری راتوں میں دروازہ کھولتے ہوئے کبھی خوف نہیں معلوم ہوا۔ میں بہت خاموشی سے بغیر اس کو بند کئے اپنے بستر پر لیٹ جایا کرتا تھا اور پھر نصف شب گذرنے کے بعد یہ دیکھنے بھی نہ اٹھتا کہ ہر چیز اپنی اپنی جگہ پر حفاظت سے رکھی ہوئی ہے یا نہیں۔

یہ حالت موسم سرما کی ایک بھیگی ہوئی رات میں عجیب و غریب طریقے سے پیدا ہوئی۔ کھانا کھلانے کے بعد جب میرا ملازم چلا گیا تو میں سوچنے لگا کہ اب کیا کروں۔ کمرے میں تھوڑی دیر ٹہلا کیا۔ کوئی وجہ نہ ہوتے ہوئے بھی مجھے تھکن معلوم ہو رہی تھی اور مجھ میں اتنی قوت بھی نہ تھی کہ کسی کتاب کا مطالعہ کرنے بیٹھ جاتا۔ موٹی موٹی بوندیں فرش پر پڑ کر ایک شور پیدا کر رہی تھیں اور میں سوگوار تھا۔ ہماری زندگی میں ایسے موقعے آتے ہیں جب رونے یا کسی سے باتیں کرنے کو دل چاہا کرتا ہے تاکہ ہم اسی طریقہ سے اپنے غم آلودہ خیالات کو دل سے نکال دیں۔

میں نے تنہائی محسوس کی۔ آج میرا کمرہ اور دنوں سے زیادہ سنسان معلوم ہوتا تھا اور میں اپنی تنہائی کے خیال میں ڈوبا ہوا تھا۔ مجھے کیا کرنا چاہئے! میں بیٹھ گیا۔ مگر پھر مجھے کسی کیفیت نے گھبرا دیا اور میں ٹہلنے لگا مجھے حرارت سی معلوم ہو رہی تھی۔ میرے دونوں ہاتھ جل رہے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایسا محسوس ہوا جیسے سرد ہوا میرے بدن میں سرایت کر رہی ہے۔ میں نے سوچا کہ وہ باد سرد کا جھونکا ہو گا چنانچہ اس سال پہلی مرتبہ میں نے آتشدان میں آگ جلائی اور شعلوں کو بیٹھ کر دیکھنے لگا۔ مگر تھوڑی دیر کے بعد مجھے اس بات کا احساس ہونے لگا کہ میں خاموش نہیں بیٹھ سکتا میں اٹھا اور باہر چل دیا تاکہ اپنی کھوئی ہوئی قوتوں کو ایک بار پھر مجتمع کر لوں اور کسی ایسے دوست کو تلاش کروں جس سے تھوڑی دیر کے لئے گفتگو کا شغل رہے۔

باہر کسی کو نہ پا کر میں ہوٹل کی طرف اس امید پر چل دیا کہ وہاں ضرور کسی جان پہچان والے سے ملاقات ہو جائے گی۔

میں ہر جگہ پریشان تھا۔ ہوٹل کی بھیگی ہوئی سیڑھیاں گیس کی روشنی میں چمک رہی تھیں اور بارش کا کہرا راستوں اور گلیوں پر اس قدر محیط تھا کہ کونے پر لگے ہوئے لیمپ سے مدھم روشنی چھن چھن کر نکل رہی تھی۔

میں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے سوچ رہا تھا "میں باتیں کرنے کے لئے کسی کو بھی نہ پاؤں گا"

میں تمام ہوٹلوں سے باری باری گذرتا گیا اور دیکھا کہ ہر آدمی میری طرح غمگین اور اداس بیٹھا ہے۔

بہت دیر تک میں بغیر کسی خاص وجہ کے گھومتا رہا اور آدھی رات کے قریب اپنے مکان کی جانب روانہ ہو گیا۔ جب میں کہیں باہر جاتا تھا تو عموماً دروازہ مقفل کر دیتا۔ مگر آج میں نے اسے صرف بھڑا ہوا دیکھا اور یہ تعجب خیز امر تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ خطوط شام کے وقت لائے گئے ہوں گے اور

ملازم نے کھولنے کو اپنی چابی دے دی ہوگی۔

میں اندر داخل ہوا اور آگ جلتی ہوئی پائی جس کی وجہ سے کمرے میں ہلکی ہلکی روشنی تھی۔ میں نے دیکھا کہ کوئی شخص میری آرام کرسی پر بیٹھا ہے۔ اس کے دونوں پاؤں آگ کے نزدیک ہیں اور گردن میری طرف۔

میں قطعاً خوفزدہ نہ ہوا۔ میں نے سوچا کہ کوئی دوست مجھ سے ملاقات کی خاطر آیا ہوگا اور میرا انتظار کرتے کرتے سو گیا ہوگا۔ یقیناً ملازم نے جس کو جاتے وقت میں نے اطلاع کر دی تھی اپنی چابی اس کے حوالے کر دی ہوگی۔ مگر معاً مجھے یاد آیا کہ کس طرح سے گلی کا دروازہ کھلا رہ گیا تھا اور میرے دروازے کی بھی چٹخنی لگی ہوئی تھی وہ مقفل نہ تھا۔

میرا دوست بظاہر انتظار کرتے کرتے سو گیا تھا۔ چنانچہ میں اس کے پاس گیا تاکہ اُسے بیدار کروں۔ میں اس کو بہت نمایاں طور سے دیکھ سکتا تھا۔ اس کا داہنا ہاتھ نیچے کی طرف لٹکا تھا۔ اس کے پیر دراز تھے اور اس کا سر آرام کرسی کے بائیں جانب تھا اور یہ تمام باتیں اس کا پتہ دیتی تھیں کہ وہ سو رہا ہے۔ "وہ کون ہوسکتا ہے؟" میں نے خیال کیا۔ چونکہ کمرہ میں روشنی کم تھی۔ اس وجہ سے میں اس کو اچھی طرح نہ دیکھ سکتا تھا۔ میں نے اپنا ہاتھ اس کو چھونے کے لئے بڑھایا اور وہ آرام کرسی کی پشت سے جا لگا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ کرسی خالی پڑی ہوئی تھی۔

میں سناٹے میں آگیا۔ ایسا معلوم ہوا گویا اتفاقاً کوئی خطرہ میری راہ میں حائل ہوگیا ہے۔ میں پیچھے ہٹ گیا۔ مگر اس اشتیاق میں کہ حقیقت کو معلوم کروں۔ مڑا اور سیدھا کھڑا رہا۔ میرے دل کی حرکت تیز ہوگئی تھی۔ میں اپنے خیالات کو مجتمع نہ کر سکتا تھا۔ اور ایسا محسوس کر رہا تھا کہ تھوڑی دیر میں بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑوں گا۔

لیکن میں نے سوچا کہ اس کو ایک خیال اور وہم سے زیادہ کوئی اہمیت نہ دینی چاہیئے اور اس واقعہ پر غور کرنے لگا۔ میں حقیقتاً اس کو خیال سے تعبیر کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ ہو نہ ہو یہ میری آنکھوں نے مجھے دھوکا دیا ہے۔ ہم لوگوں کو اکثر مرتبہ ایسے حادثات پیش آتے ہیں کہ جس چیز کا خیال دماغ میں بنا دگزیں ہوتا ہے وہ آنکھوں کے سامنے آتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔ حالانکہ اس شے کا وہاں گمان بھی نہیں ہوتا اور یہ کہہ کر میں نے اپنے دل کو تسکین دے لی کہ چونکہ میری آنکھیں خمار آلودہ ہیں۔ اس بنا پر یہ حادثہ پیش آیا ورنہ ایسا ہرگز نہ ہوتا۔

میں نے لیمپ روشن کیا اور جب آتشدان میں آگ جلانے کے لئے جھکا تو دیکھا کہ میں بری طرح کانپ رہا ہوں۔ میں اُچھل پڑا کیونکہ مجھے ایسا معلوم ہوا گویا کسی نے میری پیٹھ چھوئی ہے۔

مگر مجھے اب بھی یقین نہ آتا تھا۔

میں تھوڑی دیر ٹہلا کیا۔ نیچے سروں میں گنگناتا رہا اور پھر دروازے کو اندر سے مقفل کر کے چٹخنی چڑھا دی۔ غرضیکہ ہر طرح سے مطمئن ہو کر بیٹھ گیا کہ اب کوئی نہیں آسکتا۔

میں دوبارہ بیٹھ کر اس حادثے پر غور کر رہا تھا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد روشنی بھی گل کر دی اور بستر پر لیٹ گیا۔

آتشدان میں آگ آخری سسکیاں لے رہی تھی۔ اور تھوڑے عرصہ کے بعد بجھا چاہتی تھی۔ چند انگارے اب بھی سربلندی کر رہے تھے۔ اور ان کی ہلکی ہلکی روشنی کرسی کے قریب فرش پر پڑ رہی تھی۔ جہاں میں نے پھر اس شخص کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔

میں نے دیا سلائی جلائی مگر آہ! مجھے دھوکا ہوا۔ وہاں تو کوئی بھی نہ تھا۔ اضطراباً میں اٹھا اور کرسی چارپائی کے نیچے چھپا دی اور سونے کی کوشش کرنے لگا کیونکہ کافی رات گذر چکی تھی۔ پانچ منٹ گذرے ہوں گے، میری آنکھ ہی لگی تھی کہ میں نے اس تمام منظر گذشتہ کو اس خوبی سے دیکھا گویا وہ سب حقیقت ہے۔ میں ایک چیخ کے ساتھ اُٹھ بیٹھا اور اس کے بعد یہ خیال بھی نہ آیا کہ مجھے سونا ہے۔

دو مرتبہ مجھ پر نیند نے غلبہ پایا اور میں سونے پر مجبور ہو گیا مگر دونوں مرتبہ ہوبہو وہ تمام منظر آنکھوں کے سامنے پھر گیا اور اب میں نے محسوس کیا کہ میں پاگل ہوا جا رہا ہوں۔ جب دن نمودار ہوا تو میں دوپہر تک ایک پرسکون نیند میں سویا اور مجھے اب ایسا پتہ چلتا تھا کہ میرا مرض جاتا رہا۔

سب کچھ ختم ہو چکا تھا۔ مجھے اس بھیانک خواب کی وجہ سے حرارت ہو گئی تھی اور میں نہ جانتا تھا کہ وہ خواب کیسا ہے! بیمار ہوتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ کس قدر زبردست قسم کی بے وقوفی مجھ سے سرزد ہوئی ہے۔

وہ شام بڑی اچھی طرح گذری۔ میں نے رسٹوران میں جا کر کھانا کھایا اور رات کو ٹھہر گیا اور پھر گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ مگر جیسے ہی مکان کے نزدیک پہنچا۔ میرے اندر ایک بے چینی سی پیدا ہو گئی۔ میں اُس کو دوبارہ دیکھنے سے ڈرتا تھا۔ میں اس سے خوفزدہ نہ تھا اور نہ اس کی موجودگی سے جس کا مجھے یقین بھی نہ تھا۔ مگر مجھے ڈر تھا کہ پھر دھوکا نہ کھا جاؤں اور پھر اسی وہم

کاشکار نہ ہو جاؤں جس سے مجھے وحشت ہوتی تھی۔

ایک گھنٹہ سے زیادہ میں سیڑھیوں پر چڑھتا رہا مگر میں نے سوچا کہ میں بھی کس قدر بے وقوف ہوں اور یہ سوچ کر گھر کے اندر چلا گیا۔ میرا سانس تیزی سے چل رہا تھا ـــــ اتنی تیزی سے کہ میں زینے پر نہ چڑھ سکتا تھا اور جب اوپر پہنچ گیا تو دس منٹ متواتر دروازے کے باہر کھڑا کھڑا سوچتا رہا کہ اندر جاؤں یا نہیں۔ میں نے ہمت کی اور کنجی تالے میں ڈال کر دروازہ کھولا اور ہاتھ میں موم بتی لئے اندر داخل ہوا۔ سونے کے کمرے کا دروازہ کھول کر میں نے آتشدان پر ایک دوڑتی ہوئی نظر ڈالی۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ آ ـــــ ہ!

کیسا اطمینان اور کیسی مسرت! کس قدر سکون! میں ادھر ادھر پھرتا رہا مگر اب بھی مجھے دھوکا ہوتا تھا اور بار بار میں مڑ کر دیکھتا کہ کوئی میرے پیچھے تو نہیں۔ کونوں اور دیواروں پر پڑتی ہوئی پرچھائیاں مجھے ڈرانے کے لئے کافی تھیں۔

مجھے بڑی بری نیند آئی اور میں بار بار کسی خیالی شور سے اٹھ بیٹھتا تھا۔ مگر میں نے اسے نہ دیکھا ـــــ سب کچھ ختم ہو چکا تھا!

اس زمانے سے میں راتوں کو اکیلا سوتے ہوئے ایک ڈر سا محسوس کرنے لگا ہوں۔ میں سوچتا ہوں کہ کوئی روح میرے پاس ہے ـــــ مجھ سے بہت نزدیک۔ مگر وہ دوبارہ ظاہر نہ ہوئی اور یہ مان بھی لیا جائے کہ وہ ہوتی تو مجھے کیا ڈر! مجھے تو اس پر اعتقاد ہی نہیں اور جانتا ہوں کہ اس کی حقیقت کچھ بھی نہیں ہے۔

لیکن اس کا خیال مجھے ہر وقت پریشان رکھتا ہے۔ میں ہمیشہ اس کے متعلق سوچتا رہتا ہوں۔ اس کا داہنا ہاتھ لٹکا ہوا ہے اور سر بائیں طرف کرسی پر رکھا ہے۔ جیسے کوئی شخص سو رہا ہو ـــــ خدا کے واسطے بس اتنا کافی ہے! میں اس کے بارے میں مزید سوچنا نہیں چاہتا!

آخر کیوں مجھ پر اس خیال کا اتنا گہرا اثر ہے؟ اس کے پیر تو آگ کے بالکل نزدیک تھے!

وہ مجھے متوحش رکھتا ہے۔ یہ خام خیالی سہی مگر واقعہ ہے۔ وہ کیا ہے اور کون ہے؟

میں جانتا ہوں کہ اس کا وجود میرے بزدلانہ خیالات میں اور میرے خوف اور تکلیف کے علاوہ اور کہیں نہیں ہے۔ ہاں وہ ـــــ بس اتنا ہی کافی ہے۔

ہاں یہ میرے لئے ممکن ہے کہ میں اپنے سے سوالات کروں اپنے بزدلانہ خیالات کو یکسر موقوف کر دوں۔ مگر میں گھر پر تنہا نہیں رہ سکتا کیونکہ مجھے اس سے واقفیت ہے کہ وہ وہاں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ اب اسے کبھی نہ دیکھوں گا۔ وہ اب اپنے کو ظاہر نہ کرے گا۔ وہ پرانی باتیں سب ختم ہو گئیں۔ لیکن وہ میرے خیالات میں تو ہمیشہ بسا رہتا ہے۔ وہ آنکھوں سے غائب رہتا ہے مگر یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ وہ وہاں موجود ہی نہیں ہے۔ وہ دروازوں کی آڑ میں ہے۔ الماری کے پیچھے وارڈروب کے نزدیک۔ چارپائی کے نیچے۔ غرضکہ ہر اندھیرے کونے میں وہ موجود ہے۔ اگر میں دروازہ یا الماری کھولتا ہوں۔ اگر میں موم بتی ہاتھ میں لئے اسے چارپائی کے نیچے تلاش کرتا ہوں یا اندھیرے کونوں میں روشنی ڈالتا ہوں تو وہ وہاں نہیں ملتا لیکن پھر بھی میں محسوس کرتا ہوں کہ وہ میرے پیچھے ہی ہے۔ میں مڑتا ہوں۔ اور اس یقین کے ساتھ ـــــ کہ میں اسے نہ دیکھ سکوں گا۔ اور کبھی نہ دیکھ سکوں گا ـــــ مگر کچھ بھی ہو وہ ہے ـــــ اور میرے نزدیک ہی۔

یہ احمق پن سہی۔ وحشت سہی۔ مگر آخر میں کر کیا سکتا ہوں؟ میرے پاس اس کا کوئی علاج بھی تو نہیں۔

لیکن اگر ہم دو ہوں تو مجھے اس کا اچھی طرح یقین ہے کہ وہ یہاں کبھی بھی نہ آئے گا۔ کیونکہ وہ اسی لئے یہاں موجود ہے کہ میں تنہا ہوں ـــــ یقیناً وہ اسی وجہ سے موجود ہے۔

(موپاساں)

منیب الرحمن

گرمیاں

گئے پُر کیف جاڑے، اور ظالم گرمیاں آئیں
رو پہلی دھوپ میں، پگھلی ہوئی پھر بجلیاں آئیں

مناظر نے خوشی سے توڑ کر اپنے حسیں گہنے
لباس حسرت افزا سردیوں کے سوگ میں پہنے

کہاں کا کیف، منظر سے نری آتش برستی ہے
نگاہِ شاعرِ رنگیں طبیعت بھی ترستی ہے

نگوں سر ہیں شباب و شعر کی سرمستیاں ساری
فضائے دہر میں خاموش ہیں موسیقیاں ساری

شعاعِ آتشیں پھر سوز کے شانے ہلاتی ہے
طلائی انگلیوں سے ساز کا جھولا جھلاتی ہے

رگِ احساس ہے مجروح، کیسی آفتیں آئیں
تخیل کا گلا کٹتا ہے قاتل ساعتیں آئیں

اُداسی موت کی پھیلی ہوئی ہے آسمانوں میں
حیاتِ شعر بھی مرجھا گئی کومل کی تانوں میں

بہ پیہم گردشیں سیّال آتش کی ہواؤں پر
پگھل کر پیکرِ خورشید بہتا ہے فضاؤں پر

نظر آتی ہیں مضطر بجلیاں مجھ کو بگولوں میں
مزا ملتا ہے شاید ان کو صحرا کے ببولوں میں

شعاعوں کی جنونِ وصل میں بے چین رفتاریں
فضا کے جلوۂ معصوم پر چلتی ہیں تلواریں

جہنم گھل رہا ہے ساغرِ خورشید انور میں
چھڑکتی ہیں شعاعیں آتشِ محلول منظر میں

غضب میں مہر کی اس وقت غیظ افروزیاں یکسر
اٹھا دو مخملیں بستر جلا دو ریشمیں چادر

پڑا رہنے دو کنجِ عافیت میں اب یونہی مجھ کو
اجازت باہر آنے کی تپش دیتی نہیں مجھ کو

ستائے کیوں مجھے تابِ نظر خود ہو کے آوارہ
یہ مہرِ نیم روز اور اس کا اِس موسم میں نظارہ

محمد عبدالعزیز غوثی

دنیائے ادب

اُردو شاعری میں گناہ کا تصوّر

اُردو کے ایک نوجوان مگر آتش نفس شاعر مجاز نے کیا خوب کہا ہے

زندگی کیا ہے گناہِ آدم
زندگی ہے تو گنہگار ہوں میں

اور یہ واقعہ ہے کہ انسان اور گناہ میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ بلکہ ایک قدیم روایت کے مطابق انسان کی تخلیق کا باعث ہی گناہ ہے۔ مذہبی روایات کی چھان بین کی جائے تو گناہ کی پہلی مثال حضرت آدم کی کہانی میں ملتی ہے۔ شیطان نے انہیں سجدہ کرنے سے انکار کیا۔ اور راندۂ درگاہِ الٰہی ہو کر جنت سے نکالا گیا۔ اُس نے آدم سے بدلہ لینا چاہا۔ ادھر آدم اور حوا باغِ ارم میں چین کی بنسی بجاتے تھے اور مزے سے زندگی بسر کر رہے تھے۔ خداوند تعالیٰ نے انہیں ہر قسم کی آسائشوں اور راحتوں سے لطف اندوز ہونے کی اجازت دے رکھی تھی۔ لیکن یہ حکمِ الٰہی تھا کہ گیہوں کے پودے کے پاس تک نہ پھٹکنا۔ کہتے ہیں کہ شیطان کسی ترکیب سے پھر جنت میں آن گھسا اور آدم کو ایسا ورغلایا کہ گیہوں کھانے پر آمادہ ہو گئے۔ رہی سہی کسر حوا کی اعانت و اصرار نے پوری کر دی۔ پودے کو ہاتھ لگانا تھا کہ جنت کی لاانتہا وسعتوں میں قہرِ الٰہی کی بجلیاں کوندنے لگیں۔ اور وہی آدم جن کے سامنے فرشتے سربسجود تھے اب گنہگار ٹھیرائے گئے۔ اور آنکھ جھپکتے میں بہشت کے پرفضا مرغزاروں سے انہیں اس دنیا میں پھینک دیا گیا۔ یہ ہے پہلے گناہ کی روایت۔

کہنے کو تو یہ بیہودہ کہانی ہے۔ لیکن اس حکایت کے پردے میں بہت سے نفسیاتی نکتے پوشیدہ ہیں۔ کہ جن سے گناہ کی ماہیت پر کچھ روشنی پڑتی ہے۔ سب سے پہلے تو یہی غور کیجئے۔ کہ آدم کے گناہ کی نوعیت کیا تھی۔ صرف گیہوں کو ہاتھ لگانا یا اُسے چکھنے کی کوشش کرنا۔ عہدِ الست میں تو گیہوں کے سایہ تک سے پرہیز کا حکم تھا۔ یا اب زمانہ کی روش دیکھئے۔ کہ گیہوں کے بغیر جینا مشکل ہو گیا ہے۔ یعنی جو چیز پہلے گناہ تھی۔ اب انسان کی ضروریاتِ زندگی میں اہم ترین شے بن گئی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے۔ کہ زمانے کی روش اور خیالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ گناہ اور ثواب کا معیار بھی بدلتا رہتا ہے۔ جو چیز ایک زمانہ میں گناہ تھی۔ تہذیب و تمدن کا انقلاب اُسے چند سال بعد ایک مستحسن فعل اور عمدہ کام بنا سکتا ہے۔

دوسرے لفظوں میں کسی کا یہ نظریہ کہ کوئی فعل بذاتِ خود اچھا یا برا نہیں ہوتا۔ بلکہ ہماری اپنی قوتِ تخیل اُسے اچھائی یا برائی کا جامہ پہنا دیتی ہے گناہ پر بھی بالکل صادق آتا ہے۔ یعنی گناہ کا معیار لوگوں کے احساس پر منحصر ہے۔ جسے جمہور کی رائے ایک خاص وقت میں گناہ تصور کر لے وہ گناہ ہے اور جس فعل کو جمہور مستحسن تصور کرے۔ وہ ثواب ہے۔ صرف گیہوں پر ہی کیا منحصر ہے۔ ہماری اپنی تاریخ میں اس قسم کی بیسیوں دلچسپ مثالیں مل سکتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ رومن حکومت میں کسی کو اپنے چراغ سے دوسرا چراغ روشن نہ کرنے دینا ایک بہت بڑا گناہ تھا جس کی سزا موت تجویز کی جاتی تھی۔ اب یہ صرف کج اخلاقی کی حد میں شامل ہے۔ پہلے زمانے میں دیوتاؤں کے سامنے انسانی قربانی پیش کرنا عظیم ترین ثواب سمجھا جاتا تھا۔ اب یہ مذہب اور قانون دونوں کی نگاہ میں گناہ ہے۔

حضرت عیسیٰ کے متعلق ایک روایت بیان کی جاتی ہے۔ کہ ایک دفعہ کسی عورت پر شدید ترین گناہ کا الزام لگا کر ایک گروہ حضرت عیسیٰ کے سامنے انصاف طلب ہوا۔ حضرت عیسیٰ نے فیصلہ کیا کہ بیشک یہ عورت بدترین گناہ کی مرتکب ہوئی ہے۔ اور اس کی سزا موت ہے۔ اسے یہودیوں کے قانون کے مطابق زمین میں آدھا گاڑ کر سنگسار کر دیا جائے۔ لیکن ایک شرط ہے۔ کہ اس عورت پر پہلا پتھر وہ مارے۔ کہ جس نے آج تک کوئی گناہ نہ کیا ہو۔ روایت کے مطابق اس غیظ و غضب سے بھرے ہوئے مجمع کا ہر فرد اس عورت کے جرم پر نفرت و حقارت کا اظہار بہت شد و مد سے کر رہا تھا لیکن ان میں سے کسی کو اتنی جرأت نہ ہوئی کہ حضرت عیسیٰ کے فیصلہ کے بعد اپنی بے گناہی کے ثبوت میں اس عورت پر پتھر اٹھاتا۔

اس عورت کا کیا حشر ہوا۔ اور اس مجمع نے اپنی خفت اور شرم کو کس طرح چھپایا۔ یہ ایسی باتیں ہیں کہ جن سے اس وقت ہمیں براہ راست کوئی تعلق نہیں ہے۔ لیکن حضرت عیسٰیؑ کی روایتوں کا یہ کمال ہے کہ انسان روزانہ کے اندر بہت کچھ سبق سیکھ سکتا ہے۔ چنانچہ اس حکایت سے گناہ کا ایک اور پہلو سمجھ میں آجاتا ہے۔ یعنی دنیا میں کوئی ایسا شخص نہ ہوگا۔ کہ جس نے کبھی گناہ نہ کیا ہو۔ خواہ وہ گناہ معمولی ہو یا بہت سنگین۔ لیکن جہاں تک گناہ کا تعلق ہے۔ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ جس میں سب افراد انسانی شامل ہیں۔ لیکن یہ انسانی فطرت ہے۔ کہ اپنے گریبان میں کوئی مُنہ ڈال کر نہیں دیکھتا بلکہ دوسرے کی آنکھ کا تنکا شہتیر نظر آتا ہے۔

بعض لوگ گناہ کرتے ہیں اور نہیں جانتے۔ بعض جانتے ہیں اور گناہ کرتے ہیں۔ بلکہ اُس کے اعادہ میں انکو ایک خاص قسم کا لطف اور لذت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن وہ فرقہ جو نہیں جانتا اور گناہ کرتا ہے۔ سماج کی نفرت وحقارت کا نہیں بلکہ ہمدردی کا مستحق ہے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے کہ گرنا کوئی بُری بات نہیں ہے کہ سب گرتے ہیں۔ لیکن گر کر پڑے رہنا بہت بُری بات ہے۔ کہ اس سے انسان کی پست ہمتی ظاہر ہوتی ہے۔ کسی دوسرے فلسفی کا قول ہے کہ ہمیں مجرم سے نفرت نہیں کرنی چاہیئے۔ بیشک جُرم سے نفرت کرنا بجا اور درست ہے۔ لیکن مجرم نفرت سے زیادہ ہماری ہمدردی اور اعانت کا مستحق ہے۔

اس موقع پر مجھے حضرت عیسٰیؑ کی زندگی کا ایک اور واقعہ یاد آگیا۔ کہتے ہیں کہ اُنہیں جب صلیب پر چڑھایا گیا۔ تو حضرت عیسٰیؑ نے اپنے دشمنوں کے ظلم اور تشدد پر کسی قسم کی نفرت یا غضب کا اظہار نہیں کیا۔ یا ان کے متعلق کسی قسم کے نفرت آمیز کلمے نہیں کہے۔ جو ایسے موقع پر انسانی فطرت کا تقاضا ہے بلکہ اپنی روحانیت کا ثبوت اس طرح دیا۔ کہ "اے خدا انہیں معاف کر دے۔ کیونکہ انہیں خود علم نہیں ہے کہ یہ کیا کر رہے ہیں"۔ گناہ اور جُرم کے متعلق اس سے زیادہ تسلی بخش الفاظ غالباً دنیا کی تاریخ میں آج تک کسی نے نہیں کہے اور یہی گناہ کا معصومیت بخش رُخ ہے۔ جو گنہگاروں کے لئے تسکین کا باعث ہو سکتا ہے۔ اگرچہ قانون کی لوہے جیسی سخت نظروں میں لاعلمی کوئی قابل سماعت عذر نہیں سمجھا جا سکتا۔ لیکن اس سنگین قانون میں غالباً انسانیت کا وہ روحانی عنصر شامل نہیں ہے جو اپنی دریادلی سے سخت سے سخت گناہ اور بدترین مجرم کو بھی معاف کر سکتا ہے اور جس کی تعلیم غالب نے ان سیدھے سادے لفظوں میں دی ہے

نہ سنو گر بُرا کہے کوئی — نہ کہو گر بُرا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی — بخش دو گر خطا کرے کوئی

نامۂ خسرواں میں ایک ایرانی شاہزادے کے متعلق حکایت لکھی ہے۔ کہ ایک شب اُس نے خواب میں دیکھا کہ میں نے بادشاہ کو قتل کر دیا ہے اور خود تخت پر بیٹھ گیا ہوں۔ صبح اُٹھ کر اُس نے اپنے آپکو صرف اس گناہ کی پاداش میں ہلاک کر دیا۔ کہ میرے نفس نے بادشاہ کے متعلق خواب میں بھی اس قسم کا گمان کیوں کیا۔ یہ انسانی خلوص اور نیک نیتی کی بلند ترین مثال ہے۔ اور ہماری اس گناہ کی بحث میں خاص اہم ہے۔ موجودہ دور کے ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ ہر فعل سے پہلے ہمارے دماغی اعصاب اس کا تصوّر کرتے رہتے ہیں۔ اور ہم اس فعل کے امکان کو اپنے تخیل کے آئینے میں اکثر بہت صاف طور پر دیکھ بھی لیتے ہیں۔ اس لئے گوتم بُدھ اور زرتشت نے افعال نیک کے ساتھ ساتھ نیک خیالات کی بھی تلقین کی ہے۔ کیونکہ جو کچھ ہم سوچتے ہیں۔ وہی ہمارے افعال کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ کوئی شخص اخلاقی اعتبار سے بدترین جرائم اور گناہوں کے خیالات دل میں رکھے۔ اور اُس کے افعال ہمیشہ نیک اور عمدہ ہوں۔ شیخ شیراز فرما گئے ہیں ؎

ہر آنکہ تخم بدی کشت و چشم نیکی داشت
دماغ بیہودہ پخت و خیال باطل بست

نفسیات کے اس نظریہ کو میں ایک اور مثال سے واضح کرنا چاہتا ہوں۔ جو غالباً آپ کی دلچسپی کا باعث ہوگی۔

ایک لڑکا ایک سوداگر کی دکان پر کام کرتا ہے۔ اس کا کیرکٹر اب تک ہر بدنما داغ اور دھبے سے پاک ہے۔ آج تک اُس نے کوئی بددیانتی نہیں کی۔ اچانک اُس پر جُرم لگایا جاتا ہے۔ کہ اُس نے اپنے آقا کے ہاں چوری کی۔ سب حیران ہو جاتے ہیں۔ کہ کیسے ممکن ہے ایسا نیک اور سیدھا بچہ ایسا خطرناک اور مذموم کام کر گذرا۔ اس معمہ کا نفسیاتی حل یہ ہے۔ کہ لڑکا اس تدبیر پر غور و فکر کر رہا تھا۔ کہ کس طرح چوری آسانی سے عمل میں لانی چاہیئے۔ بار بار اُس نے اپنے ذہن کی آنکھوں سے اس موقع کو دیکھا ہوگا۔ کہ اس طرح بکس میں ہاتھ ڈالوں گا۔ اور رقم نکالوں گا۔ ہر تصوّر اپنے بعد ایک نقش چھوڑ گیا۔ اور آنے والے خیال کے لئے راستہ ہموار اور آسان کر دیا گیا آخر کار یہ ذہنی ناہموار سڑک خیالات کی آمد و رفت سے اس قدر ہموار اور سہل بن گئی۔ اور چوری کے خیال نے ذہن پر اس قدر قبضہ کر لیا کہ یہ مکروہ فعل ہو کر ہی رہا۔ بکس میں ہاتھ ڈالا گیا۔ رقم چُرائی گئی اور ایک اچھا کیرکٹر خراب ہو گیا۔ جس طرح کہ ایک بدکردار پلک جھپکنے میں نیک اور متقی نہیں بن سکتا۔ اُسی طرح ایک نیک شخص آن کی آن میں بداطوار نہیں ہو سکتا۔ نفسیات کی اس مثال سے یہ امر واضح ہو گیا

کہ گناہ کا تعلق صرف اُس کے عمل پر ہی منحصر نہیں۔ بلکہ اس کا خیال تک اخلاقیات کی رُو سے گناہ ہے۔

علمائے اسلام نے ایک اور دلچسپ قول بیان کیا ہے۔ الاعمال بالنیات یعنی ہمارے عمل کی اچھائی یا بُرائی ہماری نیت پر منحصر ہے۔ قانون نے بھی اس کو تسلیم کیا ہے اور سزا دیتے وقت ہمیشہ مجرم کی نیت کو خوب اچھی طرح جانچا جاتا ہے۔ یہی حال گناہ کا ہے کہ اگر اس کے ارتکاب میں ہمارا ارادہ بھی شامل تھا تو یقیناً وہ گناہ ہے۔ ورنہ انسان سے بہت سے افعال ایسے سرزد ہو جاتے ہیں کہ جن کے ارتکاب کا اسے گمان تک نہیں ہوتا۔ اور یہ غیر شعوری طور پر اُن کا مرتکب ہو جاتا ہے۔ میرے نزدیک ایسے گناہوں کو گناہ کہنا خود بہت بڑا گناہ ہے۔

آپ نے عربی کا یہ مشہور مقولہ تو ضرور سنا ہوگا کہ کُلُّ جَدِیْدٍ لَذِیْذٌ یعنی ہر نئی چیز لذیذ معلوم ہوتی ہے اور اُسے بار بار دیکھنے سے اُس کی وہ لذت اور خوبصورتی باقی نہیں رہتی کہ جسے ہم نے پہلی بار محسوس کیا تھا بالکل یہی حال گناہ کا ہے۔ جب ہم پہلی مرتبہ کوئی گناہ کرتے ہیں۔ تو ہمارے ضمیر کو اس کا بہت زیادہ احساس ہوتا ہے۔ لیکن اس فعل یا گناہ کے بار بار اعادہ سے اس کا احساس گھٹتے گھٹتے بالکل معدوم ہو جاتا ہے۔ بغیر لیمپ کے سائیکل چلانے کا خوشگوار قانونی گناہ کس بھلے آدمی نے نہیں کیا ہوگا۔ لیکن مجھے خوب یاد ہے کہ پہلی مرتبہ جب میں رات کو بغیر روشنی کے سائیکل چلانے پر مجبور ہوا۔ تو یقین جانئے کہ سڑک کا ہر سایہ مجھے سپاہی کی شکل میں نظر آتا تھا۔ اور مجھے اپنے جرم کا اس قدر احساس تھا۔ کہ چند مرتبہ سائیکل پر چڑھنے اور اُترنے کے بعد آخر کار میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس سے کہیں بہتر ہے کہ میں پیدل ہی چلوں۔ لیکن اس گناہ کے بار بار اعادے کے بعد میں اس قدر عادی ہو گیا۔ کہ کبھی اس کا خیال بھی نہیں آیا۔ یہی مثال عادی مجرموں کی ہے۔ کہ انہیں اپنے بڑے سے بڑے گناہ کا احساس تک نہیں ہوتا۔

گناہ کے متعلق اس قدر تمہید کے بعد اگر میں اپنی بات چیت کے دوسرے پہلو کی طرف رجوع نہ کروں تو مجھے خطرہ ہے کہ میں یہ مضمون پڑھنے والوں اور سننے والوں دونوں کا گنہگار بننے والا ہوں۔ کیونکہ میرا موضوع صرف گناہ ہی نہیں ہے بلکہ اُردو شاعری میں گناہ کا تصور ہے۔ ہمارے شاعروں نے گناہ کے مضمون کو مختلف پہلوؤں سے خوب باندھا ہے۔ اور حق تو یہ ہے کہ اس پیش پا اُفتادہ اور بظاہر چھپے ہوئے نوالوں میں سے اکثر نے خوب لطیف مضمون نکالے ہیں۔ مثلاً یہ خیال کہ گناہوں کا بوجھ انسان کو دبائے رکھتا ہے۔ بہت پرانا خیال ہے اُستاد ذوق فرماتے ہیں ؎

اے آشنا نہ پوچھ گراں باری گناہ ۔ کشتی میں ہوں تو زور سے لنگر کو توڑ دوں

غالب نے اس نکتہ کو خوب پہچانا ہے کہ فعل کا انحصار اُس کی نیت پر ہے ؎

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد ۔ یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

غالب ہر کام میں افراط و تفریط کے قائل ہیں۔ چنانچہ گناہوں کے معاملے میں بھی اُن کی طبیعت معمولی گناہوں سے سیر نہیں ہوتی ؎

بقدر حسرت دل چاہیئے ذوق معاصی بھی
بھروں یک گوشۂ دامن گر آب ہفت دریا ہو

پھر اُن کا یہ بھی دعوے ہے کہ گناہ چاہے ختم ہو جائیں لیکن ان کا ذوقِ معاصی تشنہ ہی رہتا ہے ؎

دریائے معاصی تُنک آبی سے ہوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

سُنا ہے کہ قیامت کے دن خداوند تعالےٰ انسان کے اعمال کا حساب لے گا۔ غالب نے اس بازپرس سے بچنے کا عمدہ حیلہ تراشا ہے ؎

آتا ہے داغِ حسرتِ دل کا شمار یاد !
مجھ سے مرے گنہ کا حساب اے خدا نہ مانگ

غالب نے مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق "کافر" اور "گنہگار" میں جو فرق ہے اُسے ظاہر کیا ہے ؎

حد چاہیئے سزا میں عقوبت کے واسطے ۔ آخر گناہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

سودا کے نزدیک گناہ کرنا خود اُس کے عفو کی دلیل ہے ؎

جُرم کے عفو کی تدبیر بہت اچھی ہے
بے گنہ رہنے سے تقصیر بہت اچھی ہے

ذوق نے اس نفسیاتی نکتہ کو بیان کیا ہے۔ کہ گناہ کے ارتکاب سے روح پر ضرور اثر باقی رہتا ہے ؎

ہر داغِ معاصی مرا اس دامنِ تر سے ۔ جوں حرفِ سرِ کاغذِ نم اُٹھ نہیں سکتا

قدرتی طور پر ایسے ملزم سے سب کو ہمدردی ہوتی ہے کہ جو ناکردہ گناہ مصیبت میں پھنس جائے اور اُسے خود اپنے جرم کا علم نہ ہو۔ چکبست نے کہا ہے

گنہگاروں میں شامل ہیں، گناہوں سے نہیں واقف
سزا کو جانتے ہیں ہم خدا جانے گنہ کیا ہے ؟

عاشق کا سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ اُس نے عشق کیوں کیا۔ لیکن میر دہائی دے رہے ہیں کہ خدارا کوئی محبوب سے بھی پوچھے کہ وہ اتنا حسین کیوں ہوا۔

پیار کرنے کا جو خوباں ہم پہ رکھتے ہیں گناہ !
اُن سے بھی تو پوچھتے تم اتنے کیوں پیارے ہوئے

دنیا کا دستور ہے کہ ہزارہا سال کی محنت پر ایک قصور پانی پھیر دیتا ہے۔
ذوقؔ نے اسی کا اشارہ کیا ہے ؎

گیا شیطان مارا ایک سجدے کے نہ کرنے سے
اگر لاکھوں برس سجدے میں سر مارا تو کیا مارا

گناہ کا ارتکاب اکثر دوسروں کے ورغلانے سے ہوتا ہے۔ اکبر کہتے ہیں ؎

دل کے یاروں سے ہوا شوقِ گناہ آدمی کا آدمی شیطان ہے

اس مضمون کو ذرا اور وضاحت سے اکبر الہ آبادی نے باندھا ہے۔

جب سے گناہ چھوڑ دیئے سب کھسک گئے
اب میرا کوئی دوست نہیں ہم نشیں نہیں

اکبر نے محسوس کیا کہ اس دور میں لوگ گناہوں اور جہنم سے اس قدر نہیں ڈرتے جتنا پلیگ سے ڈرتے ہیں ؎

گناہوں سے نہ باز آئیگی اور سستی سے بھاگے گی
جہنم سے سوا طاعون سے یہ قوم ڈرتی ہے :

بعض اوقات انسان گناہ پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ لیکن زمانہ اس کا سازگار نہیں ہوتا۔ اکبر فرماتے ہیں ؎

آمادگی مجھے تو رہی ہر گناہ پر ! فضل خدا سے بُت ہی نہیں آئے راہ پر

شاعر کے نزدیک شباب اور گناہ دو مترادف الفاظ ہیں۔ اس مضمون کو اکبر حیدری نے خوب ادا کیا ہے ؎

اب ضمیر پاک طینت لطف فرمانے لگا
اب میں اپنی لغزشوں پر آپ پچھتانے لگا
ہو چکا اکبر یقیناً ہو چکا عہدِ شباب
اب گناہوں میں گنہگاری کا رنگ آنے لگا

یہ سب جانتے ہیں کہ عادتیں راسخ ہو کر طبیعت ثانیہ بن جاتی ہیں۔ اور اُن کو درست کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ یہی حال نیک اعمال کی طرف رغبت کا ہے بظاہر ہم پرہیز و اتقا کی نمائش کرتے ہیں۔ اور اپنے افعال سے اس کا اشتہار کرنا چاہتے ہیں۔ لیکن دلوں کا خدا ہی حافظ ہے۔ اقبالؔ نے اس مضمون کو نئے رنگ میں ادا کیا ہے ؎

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
دل اپنا پرانا پاپی تھا برسوں میں نمازی بن نہ سکا !

آغا محمد اشرف "ساقی"

نقد و نظر

نئی کتابیں

ہندوستان کی اکثریت اس وقت سوراج کی خواہاں ہے۔ لیکن اس اکثریت میں سے بیشتر لوگ سوراج کا خواب دیکھتے ہوئے اس بات کو نظر انداز کر جاتے ہیں کہ اس کی تعبیر دو طرح کی الجھنیں پیدا کر سکتی ہے۔ پہلی وہ الجھنیں جنہیں اندرونی کہا جا سکتا ہے۔ ان کو دور کرنا اپنے بس کی بات ہے اور ہمیں روشن پہلو کو دیکھتے ہوئے توقع کرنا چاہیئے کہ بہی خواہانِ وطن اِن اُلجھنوں کو یقیناً دور کر لیں گے۔ لیکن دوسری قسم کی الجھنیں دوسرے ممالک کے ساتھ اپنے ملک کے سیاسی تعلقات کے سلسلے میں پیدا ہوں گی۔ ان کے دور کرنے کے لئے بعض ایسی رکاوٹیں راہ میں آ سکتی ہیں جن کی مدافعت کے طور پر ہندوستان کے ہر بچے کو دوسرے ممالک کے جغرافیائی، معاشری اور سب سے بڑھ کر سیاسی حالات کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ مغربی دنیا اور خصوصاً یورپ میں اس وقت دو آدمیوں نے جیسے حالات پیدا کر رکھے ہیں وہ مشرق کے لئے ایک زبردست سبق ہیں۔ مسولینی اور ہٹلر کی قوتِ ارادی نے نہ صرف اُن کے ہم وطنوں کو اُن کے آہنیں پنجوں میں جکڑا ہوا ہے بلکہ تمام براعظم کو بے بس بنا رکھا ہے۔ ہٹلر کی قوت ارادی کا مطالعہ کرنے کے لئے اُس کی خود نوشتہ سوانح عمری "میری جدوجہد" ایک مفید کتاب ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کتاب کے دو ترجمے بیک وقت اردو میں شائع ہوئے ہیں۔ اس وقت ہمارے سامنے لاہور کے مشہور ناشر نرائن دت سہگل اینڈ سنز کا شائع کیا ہوا ترجمہ ہے۔ اس کتاب کو اخبار "بندے ماترم" کے سابق مدیر لالہ شانتی نرائن جی نے اردو کا جامہ پہنایا ہے۔ شانتی نرائن جی پنجاب کے ہندو اخبار نویسوں میں صحافت کا اچھا تجربہ رکھتے ہیں اور اس کا ثبوت "میری جدوجہد" کے صاف اور رواں ترجمے میں ملتا ہے۔ البتہ ترجمے میں کہیں کہیں زبان کی ایسی خامیاں موجود ہیں جن سے عہدہ برآئی ہو سکتی تھی۔ لیکن غالباً اس کی وجہ وہ تعجیل ہے جو کتاب کے شائع کرنے میں کی گئی ہے۔ اور اسی سبب سے لکھائی چھپائی میں بھی پوری احتیاط نہیں برتی گئی ہے۔ ہمیں امید ہے۔ کہ اس کتاب کے مطالعے سے بڑے بوڑھے اپنے میں ایک ان تھک ہمت پائیں گے اور نوجوان اپنے ملک کے لئے صحیح راستے پر چلنا سیکھیں گے۔

حجم ۴۶۳ صفحات۔ قیمت (مجلد) دو روپے آٹھ آنے۔

ملنے کا پتہ:۔ نرائن دت سہگل اینڈ سنز تاجران کتب لوہاری دروازہ لاہور

خواجہ باقر حسن قادری نے کہاوتوں کی ایک بڑی کتاب بحر الامثال کے نام سے لکھی تھی۔ طالب علموں اور بچوں کے لئے اسی کتاب کا اختصار "قصص الامثال" کے نام سے جامع مسجد دہلی کی رائل ایجوکیشنل بک ڈپو نے شائع کیا ہے۔ کہانیوں کے ذریعے سے بچے سوکھی اور بے مزہ باتیں بھی سن لیتے ہیں۔ زبان دانی، روزمرہ اور محاورہ کے جاننے میں کہاوتیں بہت حد تک مددگار ثابت ہو سکتی ہیں۔ اور چونکہ کہاوتوں کا ایک لازمی پہلو کہانیاں بھی ہوتی ہیں اس لئے طلبار اور بچوں کے لئے یہ طریقۂ تعلیم بہت مفید ثابت ہوتا ہے۔ خواجہ باقر حسن صاحب نے اس مجموعے میں نہ صرف ڈھائی سو کہاوتوں اور ان کی کہانیوں کو عام فہم زبان میں طلبار کی سہولت کے لئے یکجا کر دیا ہے بلکہ چند اور باتوں کا بھی لحاظ رکھا ہے جن کا اظہار انہوں نے دیباچے میں کیا ہے۔

۱۔ ہر ضرب المثل کا محل وموقع استعمال یا مفہوم و مطلب واضح کر دیا گیا ہے۔

۲۔ مترادف المعنی ضرب الامثال ایک جگہ لکھ دی گئی ہیں۔

۳۔ اگر کسی شعر یا دوہے میں استعمال کی ہوئی کہاوت مہیا

ہو گئی ہے۔ تو اُسے بھی ساتھ لکھ دیا گیا ہے۔

۴۔ اردو کے علاوہ اور زبانوں کی کہاوتیں بھی جن کی ہم معنی کہاوتیں اردو میں موجود ہیں، مقابلے کے طور پر درج کی گئی ہیں۔

۵۔ جو محاورات کثرت استعمال سے کہاوتوں کا درجہ حاصل کر چکے ہیں انہیں بھی شامل کر لیا گیا ہے۔

۶۔ غیر مانوس الفاظ کی وضاحت اور معنی درج کئے گئے ہیں۔

۷۔ ایک ہی کہاوت کی مختلف مستعمل صورتوں کو بھی درج کر دیا گیا ہے۔

یہ تمام کہاوتیں حروف تہجی کے مطابق درج کی گئی ہیں۔

ہمیں امید ہے کہ سکول کے طلبا اور معلم صاحبان اس مفید کتاب سے فائدہ اٹھائیں گے۔ طلبا کے علاوہ معلّموں کے لئے بھی یہ کتاب ایک آسان حوالے کی کتاب کا کام دے سکتی ہے۔

حجم تین سو صفحات کاغذ معمولی لیکن اچھا، لکھائی چھپائی صاف قیمت ایک روپیہ پانچ آنے۔ ملنے کا پتہ:۔ رائل ایجوکیشنل بک ڈپو اردو بازار جامع مسجد دہلی۔

ماتا ھری (خلیل احمد، ناشر:۔ اردو لٹریچر سوسائٹی ۹۲۔ ٹمپل روڈ۔ لاہور قیمت ایک روپیہ)

جب کسی کنبے، ادارے یا ملک میں کوئی زبردست انقلاب یا ہنگامہ رونما ہوتا ہے تو بعض بڑی شخصیتیں گمنام ہو کر رہ جاتی ہیں اور کئی معمولی انسانوں کو امتیاز حاصل ہو جاتا ہے۔ جنگ عظیم میں ماتا ہری کی شہرت اس کی ایک اچھی مثال ہے۔ ماتا ہری ہالینڈ کی باشندہ اور پیرس کی ایک پیشہ ور عورت تھی ایک مشہور رقاصہ ہونے کی بنا پر اُس کا تعلق بہت سے فوجی افسروں سے ہوا۔ اور وہ اُن کی داشتہ رہی۔ جنگ عظیم میں اُس کے بعض فوجی عُشّاق محکمہ جاسوسی کے اخراجات سے ماتا ہری کی خوشنودیٔ طبع حاصل کرتے رہے۔ اور اس وجہ سے اُسے کورٹ مارشل میں جاسوسہ ثابت کیا جا سکا۔ اگرچہ طبقۂ اناث کا جاسوسی سے تعلق بہت پرانا ہے کیونکہ دنیا کی سب سے پہلی جاسوسہ وہ فاختہ تھی۔ جسے حضرت نوح نے کشتی کے ارارات سے جا لگنے پر خشکی کی تلاش میں روانہ کیا تھا، لیکن ماتا ہری کا تعلق جاسوسی سے اتفاقی اور بہت معمولی تھا۔ انگریزی میں میجر ٹامس کولسن کی کتاب ماتا ہری اس مشہور رقاصہ کی مستند سوانح عمری ہے۔ خلیل صاحب نے ان حالات کو اُردو کا جامہ پہنایا ہے۔ کتاب کے شروع میں مولانا عبدالمجید صاحب سالک کے قلم سے بارہ صفحوں کا ایک مقدمہ ہے۔ جس میں وہ فرماتے ہیں "خلیل صاحب نے یہ کتاب لکھ کر اُردو پڑھنے والوں کو دورِ حاضر کی ایک نامور ہستی سے رُوشناس کرا دیا ہے۔ اگرچہ لوگ اس سے پہلے ماتا ہری کے کچھ حالات اخباروں میں پڑھ چکے ہیں۔ اور ایک فلم بھی دکھائی جا چکی ہے۔ لیکن یہ کتاب کسی جانبدارانہ پروپیگنڈا سے پاک ہے اور ماتا ہری کی شخصیت کو اصلی رنگ میں پیش کرتی ہے۔ خلیل صاحب کا اسلوبِ بیان بہت دلنشین اور مرغوب ہے" ہمیں سالک صاحب سے صرف ایک بات میں اختلاف ہے۔ اور وہ بات کتاب کے غیر جانبدارانہ ہونے کے بارے میں ہے۔ شروع سے آخر تک مؤلف کا لہجہ کچھ اس قسم کا ہے۔ جس سے یہ اثر لیا جا سکتا ہے۔ کہ وہ ماتا ہری کو کسی طرح کی قابلِ ستائش اور بلند ہستی سمجھتے ہیں۔ خصوصاً آخری فقروں میں لکھا ہے۔ "وہ فرانس جس نے جون آف آرک جیسی عورت کو ہلاک کر دیا تھا۔ ماتا ہری کا سینہ گولیوں سے چھلنی کر کے اُس سے کچھ دُور نہ تھا۔"

یہاں ہم سمجھتے ہیں کہ ماتا ہری کو جون آف آرک سے جا ملانا مضحکہ انگیز ہے جون آف آرک حُب الوطنی کا ایک مجسمہ تھی۔ ماتا ہری بھی ایک مجسمہ تو تھی لیکن "وطن" کے ساتھ اُس کو کوئی تعلق نہ تھا "حُب" کے ساتھ ضرور تھا۔

نئے رسالے

ہندوستان کو ایک بٹا دو سوراج مل گیا۔ یعنی صوبجاتی خود مختاری حاصل ہو گئی۔ پہلے لوگ سلطنتِ انگلشیہ کی برکتوں کے گُن گاتے تھے۔ اب اپنوں کی خوبیوں کے سراہنے کا وقت آ گیا ہے۔ نیلامی اور شراب ممنوع قرار دے دی گئیں، صوبجاتی خود مختاری زندہ باد! ضبط شدہ کتابوں سے پابندی اٹھالی گئی، —— لیکن اس پر ہم اس گرم جوشی سے صاد نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ ہر قسم کی مطبوعات سے پابندی اُٹھا لینا دانشمندی کا شیوہ نہیں ہے۔ بہر حال لکھنؤ سے ایک ماہنامہ "ہولی" عرف "باغی" یشپال صاحب کے زیرِ ادارت اشاعت پذیر ہوا ہے۔ ہر ماہ صاف ستھرے چھپے ہوئے بہتر صفحات کا مجموعہ چندہ سالانہ چار روپے آٹھ آنے۔ فی پرچہ چھ آنے۔ مجموعے کی نوعیت ذیل کے عنوانات سے ظاہر ہو سکتی ہے۔ ۱۔ ریاستوں کی لڑائی ہمارا پہلا محاذ ہے ۲۔ ہندوستان کا قدیم سوشلزم ۳۔ مزدور (افسانہ) ۴

اسپین پر ایک نظر ۵۔ کانگرسی حکومتیں اور مسلمان ۶۔ مزدور انقلاب کا رہنما۔ ۷۔ سوسائٹی میں عورت کی جگہ۔ یہ اپریل کے شمارے کے چیدہ چیدہ مضامین ہیں۔ مارچ میں:۔ ۱۔ کسانوں کے سامنے دو راستے ۲۔ سوشلزم میں خدا کو جگہ نہیں ۳۔ ہندوستان کی غلامی کے وجوہات ۴۔ روس میں بچوں کی پرورش اور تعلیم کا انتظام۔ ۵ کیا کانگرس ہندو جماعت ہے؟ ــــ وغیرہ وغیرہ

نثر کے مضامین کے علاوہ نظمیں بھی ہوتی ہیں۔ اور اُن کی نوعیت بھی سیاسی اور انقلابی ہوتی ہے۔

ماہنامہ "دیلو عرف باغی" اُن لوگوں کی تحریک اور رجحاناتِ ذہنی کا مظہر ہے جو ہر قسم کے بیرونی سیاسی اثرات کو اپنے وطن اور سماج پر بھی طاری کرنا چاہتے ہیں اور یہ لوگ ملکی خدمت کے لحاظ سے ابھی نوآموز ہیں۔ ان کے منفعت بخش یا ضرر رساں پہلوؤں کے متعلق ابھی اندازہ ہی لگایا جا سکتا ہے۔ ہاں ان کے مقابلے پر ایسے خادمانِ ملک و قوم بھی ہیں جو کئی سالوں سے اپنے جنونِ قومی کے زیرِ اثر ارتقائی دور میں چلے جا رہے ہیں اردو صحافت کی تاریخ میں بجنور کے سہ روزہ اخبار مدینہ کا نام ہمیشہ ایک نمایاں امتیاز کا مالک رہے گا۔ پچیس سال سے یہ اخبار ہندوستان کی عموماً اور اہلِ اسلام کی خصوصاً خدمت کر رہا ہے۔ حال ہی میں اس نے اپنی نقرئی جوبلی مناتے ہوئے ایک خاص نمبر شائع کیا ہے۔ یہ نمبر اچھے اور مفید مضامین کا ایک قابلِ قدر مجموعہ ہے۔ اور اس کی ایک خصوصیت اردو ہندی ہندوستانی کے تنازعے کے متعلق فیصلہ کن مضامین کی اشاعت ہے۔ اس مجموعے میں آپ کو ہر قسم کے مضامین نظر آئیں گے۔ ادبی، لسانی، سماجی، سیاسی، انقلابی اور اسلامی۔ اس کے علاوہ اس میں جگہ جگہ تصاویر بھی آپ کو دکھائی دیں گی۔ یہ تصاویر مصر، عرب اور ہندوستان کے ایسے مقامات سے متعلق ہیں جو اہلِ اسلام کے لئے دلچسپی کا باعث ہیں اردو زبان کی خدمت کے سلسلے میں مدینہ کے جوبلی نمبر نے جو مضامین ہندی ہندوستانی کے موضوع پر شائع کئے ہیں اُن کے لئے ہم انہیں داد دیتے ہوئے ان کی نقرئی جوبلی کے موقعے پر مبارکباد کہتے ہیں۔ یہ خاص اشاعت ۴۷۶ صفحات پر حاوی ہے۔

جب سے اہلِ وطن کو گھر کی رونق کے بڑھانے کے لئے قومی زبان کا ہنگامہ ہاتھ آیا ہے، ہم اس بات کی اشد ضرورت محسوس کر رہے تھے کہ اس پروپیگنڈا کے زمانے میں اردو کی تبلیغ و اشاعت اور اس چشمۂ آفتاب کی اہمیت شپرہ چشموں پر واضح کرنے کے لئے کسی خاص اخبار کی اشاعت جلد سے جلد ہونا چاہیے: تا حال پنجاب سے ہمایوں ادبی دنیا اور دکن سے "اردو" اس سلسلے میں تخصیص کے ساتھ کوشش کر رہے تھے۔ اب دہلی سے انجمن ترقیٔ اردو نے ایک پندرہ روزہ اخبار "ہماری زبان" شائع کرنا شروع کیا ہے۔ اس کا کم سے کم حجم سولہ صفحے ہوگا۔ سالانہ چندہ ایک روپیہ فی پرچہ تین پیسے "ہماری زبان" ہر مہینے کی پہلی اور سولھویں تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔ اس اخبار سے آپ کو اردو کی ہمہ گیر خوبیوں کا علم ہوتا رہے گا۔ نیز آپ وقت کے ساتھ ساتھ یہ بھی جانتے رہیں گے کہ اس وقت اردو کے خلاف اور اس کے حق میں کون کون سی کارروائیاں عمل میں لائی جا رہی ہیں۔

اس اخبار کا چندہ خصوصاً کم رکھا گیا ہے اور اگرچہ یہ اخبار بذاتِ خود بھی مفید مضامین کا حامل ہے، اس کے باوجود کسی قسم کے نعم البدل کی توقع کے بغیر اس کی خریداری کو حب الوطنی اور زبان کی خدمت کے لحاظ سے ایک فرض شمار کرنا چاہیئے۔

پتہ۔ "ہماری زبان" نئی دہلی۔

میٹریکولیشن کا نتیجہ

۱۹۳۹ء کے لئے وظیفہ حاصل کرنے والے

سن لائٹ آف انڈیا انشورنس کمپنی لمیٹڈ لاہور کی میٹرک کے بعد کی پڑھائی کے لئے وظیفے دینے کی سکیم کے ماتحت ایک سو روپیہ ماہوار کی مجموعی رقم کے سات وظائف مندرجہ ذیل امیدواروں کو اُن کے نمبروں کے لحاظ سے جو اُنھوں نے امتحان میں حاصل کئے عطا کئے گئے ہیں۔

پہلا وظیفہ

-/۲۵ روپے ماہوار کا مسٹر اعجاز حسین طالب علم خالصہ ہائی سکول پشاور کو دیا گیا ہے اس امیدوار نے ۶۵۵ نمبر حاصل کئے

دوسرا وظیفہ

-/۲۰ روپے ماہوار کا مسٹر اوم پرکاش نرولا طالب علم ڈی اے ایس ہائی سکول لائل پور کو دیا گیا ہے۔ حاصل کردہ نمبر ۶۲۵

تیسرا وظیفہ

-/۱۵ روپے ماہوار کا مسٹر نیتانند طالب علم ڈی اے ایس ہائی سکول لائل پور کو دیا گیا ہے نمبر ۶۰۶

ان کے بعد چار وظیفے دس۱ دس۱ روپے کے مندرجہ ذیل اُمیدواروں کو دیئے گئے۔

مسٹر راجندر لال طالب علم ڈی اے وی ہائی سکول نمبر ۶۰۳

مسٹر کرشن دیو طالب علم اے۔ ڈی۔ اے۔ ایس ہائی سکول ایبٹ آباد نمبر ۵۸۶

مس للتا کماری لامبا طالب علم مہلا مہا ودیالہ۔ لاہور نمبر ۵۳۸

مسٹر جتیندر لال طالب علم ایس ڈی ہائی سکول لاہور۔ نمبر ۴۶۹

یہ وظائف پورے چار سال تک جاری رہیں گے۔

وہ سکیم جن کے ماتحت یہ وظیفے دیئے جا رہے ہیں۔ درحقیقت بے نظیر اور لاثانی ہے۔ اس سے سن لائٹ آف انڈیا کے پالیسی ہولڈروں پر کسی قسم کا بوجھ نہیں پڑتا بلکہ اس سے ان کے بچوں کو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں امداد ملتی ہے۔ سن لائٹ آف انڈیا کی پالیسی کے ساتھ یہ مفت کا فائدہ ہے جو پالیسی کی قدر و قیمت میں نمایاں اضافہ کرتا ہے۔

ہم ان اصحاب سے جو بیمہ زندگی کی پالیسی لینے والے ہوں بزور سفارش کرتے ہیں کہ وہ کہیں اور بیمہ کرانے سے پہلے ہماری اس سکیم کا ضرور مطالعہ کریں۔

سن لائٹ آف انڈیا انشورنس کمپنی لمیٹڈ میٹرک کے بعد کی تعلیم کے لئے وظائف کی سکیم کے مفصل حالات ایک کارڈ آنے پر نہایت مسرت سے ارسال کر دے گی۔

فہرستِ مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہِ جون ۱۹۳۹ء

جلد ۱۷ تصاویر:- ۱- من کی جانچ ۲- چین کا مکتی داتا اور اس کی شریکِ زندگی نمبر ۶

سالانہ چندہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے ممالکِ غیر سے دس شلنگ

گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام صلاح الدین احمد پرنٹر پبلشر چھپ کر دفتر ادبی دنیا ... سے شائع ہوا

OPTREX
FOR THE EYES
آپٹریکس
آنکھوں کی ماندگی کے لئے
آپٹریکس سلیوشن سے آنکھوں کو دھوڈالیئے
زمانہ حال کے ضرر رساں حالات میں کام کرنے سے جن خطرناک نتائج کے پیدا ہونے کا خدشہ ہے ان کے لئے حفظ ما تقدم کا کام دے گا۔
ہر معزز دوا فروش سے مل سکتا ہے۔
سول ایجنٹ
نوبل اینڈ کمپنی نمبر ۱۰۹ پارسی بازار سٹریٹ بمبئی

دُنیائے کاروبار

اورینٹل لائف انشورنس کمپنی لمیٹڈ

تازہ ترین رپورٹ پر سرسری نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی یہ سب سے بڑی بیمہ کمپنی بدستور راہ ترقی پہ گام زن ہے۔ یہ رپورٹ کمپنی کے حصہ داروں کے چونتیسویں سالانہ اجلاس میں جو بمقام بمبئی ۲۶ اپریل ۱۹۳۹ء کو منعقد ہوا پیش کی گئی تھی اس میں سال مختتمہ ۳۱ دسمبر ۱۹۳۸ء کے اعداد و شمار درج ہیں۔ اور اس کی رُو سے جن دلچسپ حقائق کا اظہار ہوتا ہے۔ اُن میں سے چند مختصراً حسب ذیل ہیں:۔

رپورٹ کے سال میں بیمہ کی ۷۶۱۴۰ نئی تجاویز پیش ہوئیں جن میں سے ۵۳۳۳۸ تجاویز منظور کی گئیں اور ان کی رُو سے ۹۷۶۸۵۳۰۵ روپے کی مجموعی مالیت کا نیا بیمہ کیا گیا جس کی سالانہ اقساط کی آمدنی ۵۱۶۵۶۷۹ روپے ہے۔ ان نئی تجاویز میں سے سب سے بڑی تجویز کی رقم ایک لاکھ تیس ہزار روپے تھی۔

کمپنی کے جاری پالیسیوں کی مجموعی تعداد ۳۸۸۵۹۷ ہے جن کی رُو سے ۷۷۵۶۹۰۲۷۴ روپے کی رقم بیمہ شدہ ہے

سال زیر تبصرہ میں ۱۳۹۸۱۸۹۱ روپے کے مطالبات ادا کئے گئے جن میں ۶۵۱۱۸۱۸ روپے کے مطالبات موت کے باعث اور ۷۸۲۷۸۸۷ روپے کے مطالبات پالیسی کی مدت پوری ہو جانے کے باعث ادا ہوئے جن مطالبات کا باعث موت تھی اُن کا تجزیہ کرنے پر معلوم ہوا کہ سب سے زیادہ اموات امراض سینہ سے واقع ہوئیں۔ سینہ کی امراض کے بعد علی الترتیب گروہ کے امراض، تپ دق، مختلف بخار۔ دِل کے امراض۔ حادثات۔ دماغی اور اعصابی امراض، ذیابیطس اور ذیابطیسی پھوڑے۔ ہیضہ۔ تپ محرقہ اور بڑھاپے کی کمزوری کا نمبر ہے۔

رپورٹ کے سال کی مجموعی آمدنی ۴۴۷۸۲۸۵۸ روپے اور خرچ ۲۲۴۸۵۶۲۱۰ روپے اور بچت تقریباً دو کروڑ روپے ہے اور پریمیم کی آمدنی سے اخراجات کی نسبت ۲۲ فیصدی ہے۔ کمپنی کے اثاثہ کی مالیت ۲۳۲۲۴۸۶۱۹ روپے ہے۔ اس سال کا ایک دلچسپ واقعہ کمپنی کے چیف اکاؤنٹنٹ مسٹر ایم جے ایس خراس کی ملازمت سے سبکدوشی ہے جو مسلسل پچاس برس تک کام کرتے رہے اور اس طویل عرصے میں اُنھوں نے ایک دن بھی چھٹی نہیں لی۔ غالباً پابندی فرائض کی یہ مثال دنیا میں بےنظیر ہے۔

سن لائٹ انشورنس کمپنی اور تعلیمی وظائف

ہمارے سامنے اس وقت ایک نہایت خوبصورت پمفلٹ ہے جس میں تعلیمی وظائف کی اُس سکیم کی تفصیلات درج ہیں جسے سن لائٹ آف انڈیا انشورنس کمپنی لمیٹڈ لاہور اپنے پالیسی ہولڈروں کے فائدے کے لئے جاری کیا ہے۔

سن لائٹ اُن ہندوستانی بیمہ کمپنیوں میں سے ہے جنہوں نے آغاز کار ہی میں ترقی کی منازل نہایت تیزی سے طے کی ہیں۔ سن لائٹ کے منتظمین اپنے پالیسی ہولڈروں کے فائدے کے لئے نت نئی تجاویز کو عملی جامہ پہناتے رہتے ہیں۔ ان تجاویز میں سے ایک تعلیمی وظائف کی سکیم ہے۔ اس کی رُو سے اُن پالیسی ہولڈروں کو جن کی پالیسی کی عمر پانچ سال یا اس سے زائد ہوگئی ہو یہ اختیار دیا جاتا ہے کہ وہ ایک ایسے طالب علم کی نامزدگی کر دیں جس نے انٹرنس کا امتحان دیا ہو۔ ہر سال نامزد طلبا کی ایک فہرست تیار کی جاتی ہے۔ اور اُن میں سے سات بہترین طلباء اپنے نمبروں کے لحاظ سے منتخب کر لئے جاتے ہیں۔

ان طلبا کو کمپنی درجے کے لحاظ سے پچیس۔ بیس۔ پندرہ اور دس دس روپے کے تعلیمی وظائف دیتی ہے۔ جو متواتر چار سال تک جاری رہتے ہیں۔ اس طرح یہ کمپنی چار سو روپیہ ماہوار اپنے پالیسی ہولڈروں کے بچوں یا عزیزوں کے تعلیمی مفاد کے لئے خرچ کر رہی ہے اور لطف یہ ہے کہ اس زائد خرچ کا کوئی اثر کسی پالیسی ہولڈر پر نہیں پڑتا۔ یعنی وظیفہ حاصل کرنے والے طالب علم کے والد یا والی کو پریمیم کے سوا کسی زائد رقم ادا نہیں کرنی پڑتی۔

جس خوبصورت پمفلٹ کا ہم نے اُوپر ذکر کیا ہے۔ اُس میں تعلیمی وظائف کی اس سکیم کے مفصل حالات اور شرائط درج ہیں۔ آپ ادبی دنیا کا حوالہ دے کر کمپنی کو ذیل کے پتہ پر ایک کارڈ لکھ دیں۔ سکیم آپ کو فوراً ارسال کر دی جائے گی۔ پتہ:۔ منیجر سن لائٹ آف انڈیا انشورنس کمپنی لمیٹڈ ٹمپل روڈ لاہور

بزم ادب

ادبی حلقوں میں یہ خبر رنج و افسوس سے سنی جائے گی کہ گذشتہ ماہ مولانا حامد علی خاں صاحب مدیر "ہمایوں" کی والدۂ محترمہ انتقال فرما گئیں۔ مرحومہ نہایت پاک نفس اور نیک سیرت خاتون تھیں۔ انہیں جوانی ہی میں بیوگی کا صدمہ اٹھانا پڑا تھا اس عالم میں انہوں نے تربیت اولاد کے فرائض ایسی خوبی سے انجام دیئے کہ ان کے سب بچے خدا کے فضل سے کامیاب اور فائز المرام ہیں اور یہ اُن کے حُسن سیرت اور تدبیر منزل کا روشن ثبوت ہے۔

ہمیں اس صدمہ جانکاہ میں مولانا حامد علی خاں صاحب، پروفیسر محمود احمد خاں صاحب پروفیسر حمید احمد خاں صاحب اور مرحومہ کی صاحبزادیوں سے دلی ہمدردی ہے۔

ابھی مندرجہ بالا سطور کی سیاہی بھی خشک نہ ہونے پائی تھی کہ اطلاع ملی کہ منصور احمد مرحوم ایڈیٹر ادبی دنیا کے والد محترم منشی محمد حسین صاحب صادق بھی اس جہان فانی سے رحلت فرما گئے۔ مرحوم حامد علی خاں صاحب کی والدہ مرحومہ کے سگے بھائی تھے اور اُن کی وفات پر اُن کے گاؤں کرم آباد تشریف لے گئے تھے۔ بہن کی وفات کا انہیں اس قدر صدمہ ہوا کہ اُسی شام انہیں فالج کا دورہ پڑا اور ایک ہفتہ حیات و موت کی کشمکش میں مبتلا رہ کر ۲۱ مئی کی صبح کو انتقال فرما گئے۔ مرحوم ایک بے نظیر شخصیت کے مالک تھے۔ راقم الحروف نے اپنی زندگی میں ایسا مخلص اور صادق انسان کہیں نہیں دیکھا۔ میرے حال پر خاص شفقت فرمایا کرتے تھے اور مجھے اپنے بچوں کے برابر عزیز رکھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ انہیں فردوس بریں کے اعلیٰ ترین مقامات عطا فرمائے۔ اس سانحۂ عظیم میں منصور احمد مرحوم کے چھوٹے بھائیوں مولوی مظفر احمد و محمود احمد سے عالمگیر ہمدردی کا اظہار کیا جا رہا ہے۔

ماہ رواں کے پرچہ سے "دنیائے ادب" میں ایک نئی چیز کا اضافہ ہوتا ہے۔ اردو کی رفتار ترقی کا صحیح ترین اندازہ ادبیات حاضرہ کے اُن نمونوں سے لگایا جا سکتا ہے۔ جو اردو کے اچھے رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ہم نے یہ انتظام کیا ہے کہ اس صنف ادب کے بہترین منتخبات کا ذکر ہر ماہ ادبی دنیا کے بہرۂ "دنیائے ادب" میں کر دیا جائے تاکہ ناظرین بیک نظر ادبیات حاضرہ کے رجحانات سے آشنا ہو سکیں۔ اس اقدام سے کئی اور فائدے بھی مرتب ہوں گے جن کا مجمل سا ذکر "دنیائے ادب" کے آغاز میں کر دیا گیا ہے۔

اس اشاعت کے علمی و ادبی مضامین میں سے بہترین مضمون "جنگ عظیم کا آغاز" از چارلس پیٹراش قرار پایا ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ صاحب مضمون نے یہ مضمون ان شخصیتوں اور مقامات سے ذاتی طور پر آشنا ہونے کے بعد لکھا ہے جن کا اس میں ذکر ہے اور جو دنیا کی سب سے بڑی جنگ سے خوفناک حد تک متعلق تھے۔

افسانوں میں سے بہترین افسانہ "بڑیرے" ہے جو مرزا عظیم بیگ صاحب چغتائی نے لکھا ہے۔ افسانے کی فضا عہد رفتہ کی بہادری اور وضعداری کے حرارت آفرین تاثرات سے لبریز ہے اور شہری زندگی کے مروجہ افسانوں سے بہت مختلف۔ امید ہے کہ اسے نہایت شوق اور دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

حصۂ نظم میں دو چیزیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اول مرزا غالب کا ایک نادر قطعہ اور اس کا جواب کہ نوادر ادب میں سے ہے اور مرزائے مرحوم کے مطبوعہ اور مروجہ دیوان میں موجود نہیں۔ ہمارے مکرم دوست مسٹر مالک رام ایم اے غالبیات سے خاص شغف رکھتے ہیں اور یہ قطعہ ہمیں انہیں کے توسل سے ملا ہے۔

دوسری چیز جناب مسعود شاہد اور روشن دین تنویر کی ایک زمین میں دو غزلیں ہیں جو ایک دوسرے کے مقابل چھپی ہیں حسن تقابل نے ان غزلوں کے لطف کو دوبالا کر دیا ہے۔

ناظرین دیکھ رہے ہوں گے کہ سالنامے سے لے کر اب تک متعدد مضامین مصور شائع ہوئے ہیں اور اکثر اصحاب نے ہماری اس روش کو بہت پسند کیا ہے۔ اشاعت حاضرہ میں بھی بسنت سہائے صاحب کا چین کا مکتی داتا باتصویر ہے۔

تصاویر کے سلسلے میں بہت سے ناظرین نے خطوط کے ذریعے سے ہمیں حسن انتخاب کی داد دی ہے۔ ادارہ اس قدر افزائی کے لئے اُن کا ممنون ہے۔

صلاح الدین احمد

آئینۂ عالم

چین کا مُکتی داتا

چیانگ کائی شیک

وہ لوگ جو اپنی قوتِ بازو سے بامِ عروج پر جا پہنچتے ہیں، دنیا کی حکایت سازی کے لئے ایک اچھا موضوع ہوتے ہیں۔ یہ روایتیں واقعیت سے خواہ دور ہوں مگر اُن کی زندگی اور شخصیت کو دلچسپ اور دلکش ضرور بنا دیتی ہیں۔ چین کے مشہورِ عالم سپہ سالار مارشل چیانگ کائی شیک کی ہستی بھی اس نظریے سے مستثنےٰ نہیں ہے۔

گذشتہ چند ہی سالوں میں چیانگ کائی شیک کی شہرت چین کے علاوہ کرۂ ارض کے دوسرے حصوں میں پہنچی ہے۔ اس چینی سپہ سالار کی زندگی اور سیرت کئی لحاظ سے مطالعے کے قابل ہے۔ چیانگ کائی شیک کے ایک پرانے معلّم نے اس کے سوانحِ حیات مرتب کئے ہیں۔ اس میں وہ ایک جگہ لکھتا ہے۔ کہ زمانۂ تعلیم میں چیانگ ...... صبح بہت جلد بستر سے اُٹھ کھڑا ہوتا اور ضروریات سے فارغ ہونے کے بعد اس کی عادت تھی کہ وہ اپنے سونے والے کمرے کے برآمدے میں آدھ گھنٹے تک سیدھا کھڑا رہتا۔ اس استادہ حالت کے دوران میں اُس کے ہونٹ بھینچے ہوئے ہوتے، اس کے چہرے سے ایک راسخ ارادے کا اظہار ہو رہا ہوتا اور اُس نے اپنے دونوں بازوؤں کو سینے پر باندھ رکھا ہوتا۔ ہم یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتے کہ ایسے لمحوں میں اُس کے دل پر کیا کچھ گذر رہی ہوتی، یا اس کے ذہن میں کون سے خیالات جاگزین ہوتے۔ لیکن یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ اپنے مستقبل کے متعلق ان پُرسکون لمحوں میں ضرور خیال آرائی کرتا ہوگا۔ بلکہ اُس کے روزنامچے سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہی ایام میں وہ جاپان سے فوجی تعلیم حاصل کرنے کے متعلق تجاویز پر غور و خوض کر رہا تھا۔ دوسری نمایاں خصوصیت اس کا وہ اشتیاق تھا۔ جس سے وہ شنگھائی سے آنے والے اخبارات کے مطالعے میں اپنے آپ کو غرق کر دیتا تھا۔ طلبائے کے لئے مطالعے کا ایک چھوٹا سا کمرہ بنا ہُوا تھا۔ اس میں چیانگ اخبار بینی کرتا۔ اُن دنوں ہمارے علاقے تک بہت کم اخبارات کی پہنچ تھی اور اس لئے جو بھی بُرے بھلے تھوڑے سے اخبار ہم تک آتے اُن کی بہت قدر کی جاتی۔ لیکن جہاں تک میری یادداشت کام کرتی ہے بیرونی دنیا کے حالات جاننے کے لئے چیانگ سے بڑھ کر اور کوئی مشتاق نہ تھا۔ آج بھی مارشل چیانگ ایک زبردست اخبار بین ہے اور وہ چین اور دنیا کے دوسرے ممالک کی روزانہ ارتقائی کیفیت سے آگاہ رہنا اپنا فرضِ اول سمجھتا ہے۔"

چیانگ کائی شیک ایک دیہاتی سوداگر کا بیٹا ہے، چین کا سب سے بڑا جرنیل اور سیاسی رہنما ہے اور اس کے ساتھ ہی نفسیاتی لحاظ سے ایک معمہ بھی ہے۔ وہ فوجی قواعد و ضوابط کی پابندی کا بے حد قائل ہے لیکن اس کے باوجود اُس نے اپنے بہت سے دشمنوں کو معاف کیا ہے۔ اور بہتوں کو ملازمتیں دی ہیں۔ اُس نے چین کو جاپان کی مدد سے متحد کر دیا ہے اور ہمیں چین کی تاریخ میں اُس سے بڑھ کر چین کو متحد کرنے والا اور کوئی شخص نہیں مل سکتا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ دس سال تک اپنی ہی قوم کی خانہ جنگیوں میں عملی طور پر حصہ لیتا رہا ہے۔ جس طرح روس کا محبوب رہنما سٹالن ہے اور اطالیہ کا مسولینی، اُسی طرح چین کا مقبول ترین سپہ سالار چیانگ کائی شیک ہے۔

وہ ایک پکا چینی قوم پرست ہے لیکن اُس نے اپنی تعلیم کا زیادہ

ترحصہ جاپان میں بسر کیا تھا۔ وہ سرتاپا ایک چینی ہے لیکن اسے عیسائیت سے عقیدت اور وائی ایم سی اے میں دلچسپی ہے۔

جسمانی لحاظ سے وہ ایک ہلکا پھلکا، مضبوط اور نرم نقوش والا انسان ہے۔ لیکن اس کے سبھاؤ اور رکھ رکھاؤ میں ایک عجیب لچک اور دلکشی ہے۔ اس کا قد پانچ فٹ دس انچ ہے۔ لیکن اُس کی ٹانگیں اُوپر کے دھڑ کی بہ نسبت چھوٹی ہیں اور اسی لئے وہ عموماً بیٹھ کر تصویر کھچوانا پسند کرتا ہے یا پھر اس حالت میں کہ اُس نے اپنا محبوب لباس زیب تن کر رکھا ہو، جو ایک کشادہ اور سیاہ رنگ کا لبادہ ہے۔ اُس کا وزن ایک سو اکتالیس پاؤنڈ ہے۔ اس کی آنکھیں ایک امتیاز کی حامل ہیں۔ ان کا رنگ سیاہی مائل بھورا ہے اور ان گہری شفاف آنکھوں سے نہایت تیز نگاہیں ہر چیز پر پڑتی ہیں اور یہ نگاہیں کبھی ساکن نہیں رہ سکتیں۔ ان سے ایک اضطراب ہویدا ہے۔

چیانگ صبح سویرے منہ اندھیرے اُٹھتا ہے اور رات تک لگاتار کام کئے جاتا ہے۔ صبح کاذب اور صبح صادق کے درمیانی وقفے کو وہ دن رات کا بہترین حصہ سمجھتا ہے۔ لیٹے رہنا اُسے بھاتا ہے اور کام کا زیادہ حصہ وہ صوفے پر دراز ہو کر تکمیل کو پہنچاتا ہے۔ دوپہر کے کھانے کے بعد وہ تھوڑی دیر کے لئے قیلولہ کرتا ہے۔ دوپہر کو سونے سے پہلے وہ ایک پرانے گراموفون پر ریکارڈ چلا دیتا ہے۔ اُسے مغرب کے نغمہ ساز شوبرٹ کا ایک ریکارڈ سب سے زیادہ پسند ہے۔ ساتھ کے کمرے میں اگر اُس کے کوئی دوست وغیرہ موجود ہوں تو دوپہر کے ریکارڈ کے تھم جانے سے وہ سمجھ لیتے ہیں کہ مارشل اب سو رہا ہے۔ تیسرے پہر کو آدھ گھنٹہ وہ گیان دھیان میں صرف کرتا ہے کیونکہ وہ ایک پرہیزگار اور وضعدار انسان ہے۔ نہ کبھی شراب پیتا ہے نہ تمباکو۔ بلکہ اُس کو چائے اور کافی سے بھی احتراز ہے۔ اس کی پابندیِ وضع کا اظہار اُس کے روزنامچے سے بھی ہوتا ہے جو وہ کئی سال تک متواتر لکھتا رہا۔ اسی روزنامچے نے ایک بار چیانگ کی جان بھی بچائی۔ دسمبر ۱۹۳۶ء میں سیان کے ایک باغی گروہ نے مارشل موصوف کو اغوا کر لیا۔ لیکن اس کا روزنامچہ اور بیوی کے نام جو خطوط مارشل کے ہمراہ تھے اُن کی وجہ سے باغیوں کا رویہ بدل گیا۔

چیانگ کائی شیک کو دنیا میں تین چیزیں سب سے زیادہ مرغوب خاطر ہیں: شاعری، پینٹ اور اپنی بیوی۔ پہاڑی علاقہ ہو۔ دھوپ کھلی ہوئی ہو۔ اور مارشل اس کوہستانی زمین پر پیدل گھوم رہا ہو، یہ اس کے نزدیک خوش وقتی کا بہترین تصور ہے یا اگر یہ بات نہ ہو تو آبادی سے دور دیہی یا جنگلاتی ماحول میں کھانے پینے کی اشیاء لے کر پک نک منانا اُس کے لئے لطف و مسرت کا ذریعہ ہے۔ جب وہ چلتا ہے تو شعر پڑھتا جاتا ہے۔ اُس کی گھریلو زندگی مسرت سے پُر ہے۔ اور میڈم چیانگ اُس کی لازمی اور دل پسند اور محبوب رفیقہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود چیانگ بنیادی طور پر ایک عزلت پسند انسان ہے۔ آسٹریلیا کا ایک اخبار نویس اور امریکہ کا ایک مبلغ یہ دونوں اُس کے پردیسی لیکن بہت گہرے دوست ہیں۔

چیانگ ایک حساس بلکہ بعض اوقات کم آمیز انسان ہے۔ معاشرتی طور پر لوگوں سے اُس کا ملنا جلنا بہت ہی کم ہے۔ جب کبھی وہ صوبہ جات کا دورہ کرتا ہے تو سوائے ایک سرکاری دعوت طعام کے وہ وہاں کے افسروں وغیرہ سے ملنے جلنے کی کوئی کوشش نہیں کرتا جہاں وہ ٹھہرا ہوا ہو۔ ۱۹۳۸ء میں جب فتح پر اظہار مسرت کے لئے ہزاروں باشندے چینی اُس کے گھر کے سامنے جمع ہو گئے تو وہ اُن سے مخاطب ہوئے بغیر ہی انہیں لوٹا دینا چاہتا تھا لیکن اُس کے مشیروں نے اُسے ایسا کرنے سے باز رکھا۔ حقیقتاً اُسے مجموعی یا انفرادی کسی طور پر بھی عوام کی طرف رغبت نہیں ہے۔

لیکن جب مارشل اور میڈم چیانگ کسی غیر ملکی ملاقاتی سے ملتے ہیں تو بہت خلق سے پیش آتے ہیں۔ میڈم چیانگ ترجمان بنتی ہے۔ کیونکہ مارشل غیر زبانوں سے صرف جاپانی جانتا ہے۔ مارشل اور میڈم میں اس قدر ذہنی ہم آہنگی ہے کہ گفتگو کی ترجمانی میں کسی طرح کی رکاوٹ نہیں پیدا ہونے پاتی۔ مارشل وقت کی بہت قدر کرتا ہے۔ اور اخبار نویسوں سے شاذ ہی ملا کرتا ہے۔

خاص خاص موقعوں پر مارشل کی بہت حفاظت کی جاتی ہے۔ مثلاً اُس کی موٹر کی دیواریں گولیوں کو گذرنے نہیں دے سکتیں اور اس کی کھڑکیوں کے شیشوں کا دل ایک انچ ہے۔ لیکن بعض اوقات وہ عوام سے آزادانہ میل جول رکھتا ہے۔ مثلاً ایک بار وہ ہنکاؤ کے بند پر بظاہر تن تنہا چل پھر رہا تھا۔ ہجوم میں وہ اس قدر غیر نمایاں نظر آتا ہے کہ اُسے کسی نے دیکھا ہی نہیں۔ اُس کے ذاتی محافظ (باڈی گارڈ) اُس کے ساتھ ہی تھے لیکن اُس سے دو سو فٹ کے فاصلے پر

موجود تھے۔

مارشل چیانگ کا کوئی مشغلہ نہیں، کام کا بار ہلکا کرنے کے لئے وہ تفریح کے طور پر مطالعہ کے علاوہ اور کسی بات کی طرف رجوع نہیں ہوتا مطالعہ کے لئے اُسے قدیم چینی کتب بہت مرغوب ہیں کنفیوشس کی تصنیفات سے ذیل کا حصہ اُسے سب سے زیادہ پسند ہے:۔

"ملک پر حکومت کرنے کے لئے لازمی ہے کہ انسان اپنے کنبے پر حکومت کرے،

"کنبے پر حکومت کرنے کے لئے لازمی ہے کہ انسان اپنے جسم کو اخلاقی تربیت کے ذریعے سے باقاعدہ بنائے۔

"جسم کو باقاعدہ بنانے کے لئے لازمی ہے کہ انسان سب سے پہلے اپنے ذہن کو باقاعدہ بنائے۔

" ذہن کو باقاعدہ بنانے کے لئے لازمی ہے کہ انسان اپنے ارادوں میں مخلص ہو،

ارادوں میں اخلاص پیدا کرنے لئے لازمی ہے کہ انسان اپنے علم کو بڑھائے"!

چیانگ کائی شیک ۱۸۸۸ء میں چکیانگ صوبے کے ساحلی ضلعے فینگھوآ کے ایک گاؤں چکاؤ میں پیدا ہوا تھا۔ اُس کا خاندان کچھ امیر نہ تھا، لیکن کچھ ایسا غریب بھی نہ تھا۔ گھر والے جبر کر کے اُس کی تعلیم کو جاری رکھتے رہے۔ لیکن چیانگ نے وہاں کوئی نمایاں درجہ نہ حاصل کیا۔ بہر حال وہ ایک فرمانبردار لڑکا تھا۔ پہلے وہ پیکن کے قریب کی ایک فوجی اکیڈمی میں پڑھتا رہا۔ پھر جاپان کے ملٹری سٹاف کالج میں داخل ہو گیا۔ اس کے بعد وہ کئی سالوں تک جاپانی فوج میں ملازم بھی رہا۔

جاپان میں چیانگ کی ملاقات انقلاب چین کے بانی مبانی ڈاکٹر سن یٹ سین سے ہوئی۔ اور نوجوان چیانگ کے دل میں چین کے جذبۂ قومی کی آگ بھڑک اٹھی، دو سال تک وہ اور جاپان میں ٹھہرا، لیکن اسی اثناء میں وہ ایک ایسی خفیہ انجمن کا ممبر بن گیا جس کے ارکان چینی مفاد کے لئے کوشاں تھے۔

جب ۱۹۱۱ء میں مانچو حکومت کا تختہ اُلٹ دیا گیا اور چینی جمہوریت کی تخلیق ہوئی تو چیانگ ایک دم چینی انقلاب میں شامل ہونے کے لئے جاپان سے چلا آیا۔ اگرچہ جاپانی فوج کی ملازمت کو یوں چھوڑ کر چلے آنا آئین کے خلاف تھا لیکن چین پہنچ لینے پر چیانگ نے اپنی وردی اور تلوار باقاعدگی کے ساتھ بذریعۂ ڈاک جاپان روانہ کر دی۔

۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۶ء تک پانچ سال کا عرصہ چیانگ اُن خانہ جنگیوں میں حصہ لیتا رہا۔ جو انقلاب چین کی وجہ سے جاری ہو گئی تھیں۔ ڈاکٹر سن یٹ سین کے بہترین ماتحتوں میں سے ایک چیانگ بھی تھا۔ لیکن ۱۹۱۶ء میں اُس نے اچانک فوج سے علٰحدہ ہو کر تجارت کو اپنا پیشہ بنا لیا۔ کیونکہ اُس نے اس بات کو اچھی طرح جان لیا کہ اپنے سیاسی کاموں کو کامیاب بنانے کے لئے لازمی ہے کہ اُس کے پاس بہت سا روپیہ موجود ہو۔ چنانچہ اُس نے اس روپے کے حصول کے لئے جستجو شروع کر دی۔ پہلے پہل وہ کچھ عرصے تک ایک دلال کے پاس کلرک کا کام کرتا رہا۔ چیانگ کی قسمت بہت اچھی تھی کیونکہ دو بہت امیر اور رسوخ والے آدمیوں نے اُسے اپنا متبنّٰی بنا لیا، اور ان میں سے ہر ایک نے اس کی کامیابی کے لئے ہر طرح سے کوشش کی۔

۱۹۲۱ء میں چیانگ نے پھر سے فوجی اور سیاسی معاملات میں دخل دینا شروع کر دیا یعنی وہ عملی طور پر ایک انقلابی بن گیا۔ ۱۹۲۳ء میں ڈاکٹر سن یٹ سین نے اُسے ایک فوجی افسر کی حیثیت میں ماسکو بھیج دیا۔ یہاں وہ چھ ماہ تک مقیم رہا۔ ماسکو میں چیانگ کی ملاقات جہاں اور مشاہیر سے ہوئی وہاں اُسے ٹراٹسکی سے بھی ملنے کا موقعہ ملا۔ ۱۹۲۵ء تک چیانگ "کوامن ٹانگ" کی کمیٹی کا صدر بن گیا، اور جب ڈاکٹر سن یٹ سین کا انتقال ہوا تو اُس نے چین کی قومی فوج کے سپہ سالارِ اعظم کے عہدے کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لے لی۔

۱۹۲۶ء میں چیانگ کے سب سے زیادہ حیران کن کارنامے کی ابتدا ہوئی۔ اُس نے فوجی فتح کے ذریعے سے چین کو متحد کرنے کا زبردست کام شروع کر دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب ابھی ان چینی قوم پرستوں کو سرپھرے روسی خیالات والے لوگ ہی سمجھا جاتا تھا۔ اور صرف جنوبی حصوں میں ہی انہیں اقتدار حاصل تھا۔ اس وقت چین کے جو اندرونی حالات تھے۔ انہوں نے چیانگ کی بہت مدد کی۔ چین کے بہت سے بڑے بڑے سپہ سالار آپس میں خون خرابہ کر رہے تھے، اور ایک دوسرے کو نیچا دکھا رہے تھے۔ اس لئے چیانگ کو اپنے مدِمقابل ہی کم یا کمزور ملے۔ لیکن اس کے باوجود چیانگ

نے جو کچھ کام کیا وہ ایک امتیازی شان رکھتا ہے۔ اس نے کامیابی کے لئے ہتھیاروں سے بھی لڑائی کی اور روپے سے بھی۔ چین پہلے ایک برِ اعظم کی مانند تھا۔ لیکن چیانگ نے اسے ایسا ملایا کہ ایک ملک بنا دیا ۔۔۔ لیکن متواتر دس سال تک اِن خانہ جنگیوں کی وجوہات کیا تھیں؟ اِن وجوہ کو جاننے کے لئے ہمیں ذرا فضائے بعید میں جانا پڑے گا۔

۱۹۲۱ء میں ڈاکٹر سن یٹ سین نے اپنے ان تین اصولوں کا اعلان کیا جو اب تک کم از کم نظری طور پر چینی قوم پرستی کے بنیادی مقاصد ہیں۔ ۱۔ قوم پرستی ۲۔ جمہوریت اور ۳۔ عوام کی وجہِ معاش۔ ان اصولوں سے ڈاکٹر سن یٹ سین کا مطلب یہ تھا کہ چین اُن مراعات کو رد کرے جو غیر ممالک کو یہاں حاصل تھیں۔ اپنے میں ایک باقاعدہ اتحاد پیدا کرے۔ اور جمہوری آئین کے ذریعے سے ملک کو خود مختار حکومت کے قابل بنا دیا جائے اور قومی حکومت میں آزادانہ انتخاب ہُوا کرے۔ نیز سماجی اصلاح، اقتصادی بلندی اور دولت کی از سرِ نو تقسیم سے لاکھوں بھوکوں کی روزی مہیا کی جائے۔ چین میں ایک ایسا نظام قائم کرنے کے سلسلے میں جو مشکلات حائل تھیں ان کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ ڈاکٹر موصوف کے اعلان سے پہلے چینی زبان میں جمہوریت کے لئے کوئی لفظ ہی موجود نہ تھا۔

۱۹۲۱ء میں ڈاکٹر سن یٹ سین کو مدد کی بہت بری طرح ضرورت تھی۔ مغربی طاقتیں اس نو پیدا ہوتے ہوئے انقلاب میں اُس کی معاون نہیں بننا چاہتی تھیں کیونکہ انہیں اپنی مراعات کے چھن جانے کا خدشہ تھا۔ انہیں یہ منظور نہ تھا کہ چین انفرادی اور اجتماعی طاقت پکڑ لے۔ متحدہ چین اُن کے لئے نقصان کا باعث تھا۔ اس لئے مجبوراً ڈاکٹر موصوف کو اپنی مدد کے لئے سوویٹ روس کی طرف رجوع ہونا پڑا۔ اس نے چیانگ کو ماسکو بھیجا۔ چنانچہ روس کے سیاسی صلاح کار چین میں آئے اور کوا ومن تانگ (عوام کی قومی جماعت) میں روسی اثرات پھیل گئے۔ لیکن عوام کی یہ قومی جماعت کسی طرح کی اشتراکی جمعیت نہ تھی۔ جب چیانگ نے ۱۹۲۷ء میں ہنکاؤ کو فتح کر لیا تو وہاں روسی طرز کی ایک حکومت قائم ہو گئی۔ لیکن اس حکومت کو بھی سراسر اشتراکی حکومت نہیں کہا جا سکتا۔ عوام کی قومی جماعت کا بایاں بازو یعنی ترقی پسند ارکان کا گروہ ایک طرح کی چینی اشتراکیت کو رائج کرنا چاہتا تھا۔ ان کے پروگرام میں زیادہ تر زرعی اصلاحات شامل تھیں اور ان کی باتوں سے اُن تمام کسانوں میں ایک نئی زندگی کی لہر دوڑ گئی جن کے پاس نہ ہل چلانے کو زمین تھی نہ رہنے کو مکان۔ لیکن دائیں اور بائیں دو گروہوں کے بن جانے سے یہ لازمی تھا کہ یہ قومی جماعت ٹوٹ جاتی۔ دائیں بازو والے پہلے اصول یعنی قوم پرستی کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ رفتہ رفتہ یہ اختلاف بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ اس نظری اختلاف نے عملی طور پر خانہ جنگی کی صورت اختیار کر لی اور ۱۹۲۷ء میں ہنکاؤ کی جدید حکومت کا تختہ اُلٹ دیا گیا۔ اس تختے کو اُلٹنے والے کا نام چیانگ کائی شیک تھا!

چیانگ کے آیندہ رویّے سے اُس کے دوست حیرت زدہ ہو کر رہ گئے۔ بظاہر اُس کا عمل انقلابی پروگرام کے منافی تھا۔ وہ اپنے عہد سے پھرتا ہُوا نظر آ رہا تھا۔ اپنے دوستوں سے مُنہ موڑتا ہُوا۔ اور ڈاکٹر سن یٹ سین کی یاد سے بے وفائی کرتا ہُوا۔ وہ چیانگ جو انقلابی کہلاتا تھا۔ اب انقلابیوں ہی کا مخالف بنا بیٹھا تھا۔ اُس کے پہلے ساتھی اور ساتھ لڑنے والے جو بائیں بازو میں شامل ہو گئے تھے، اُس نے انہیں چُن چُن کر ڈھونڈ نکالا اور زیر کرنا شروع کر دیا۔ چین میں ایک ایسی زبردستی اور یک طرفہ کارروائی کا جال پھیل گیا جس کی مثال ماضی میں موجود نہ تھی۔

چیانگ انقلابی تو تھا لیکن وہ ایک انتہا پسند انقلابی کبھی بھی نہ تھا اور اُسے اس کا احساس تھا کہ اگر انقلاب چین کو دنیا کی نظروں میں پُر اثر بنانا ہے تو ضروری ہے کہ اُسے ایک نئی صورت دے دی جائے۔ محض تبدیلی ہی سے کام نہیں چلے گا۔ چین کے لئے تبادلے کی بھی ضرورت ہوگی۔ اور شنگھائی اور ینگ سی کی وادی میں جو غیر ملکی مفاد مرکوز ہیں ان کی مدد بھی حاصل کرنا ہو گی۔

وہ شنگھائی گیا اور وہاں پہنچ کر اُس نے اُن بینکروں اور بین الاقوامی مراعات کے نمائندوں سے یارانہ گانٹھا جن کو تباہ و برباد کر لینے کا اُس نے پیشتر عہد کیا تھا۔ اشتراکیت کی مخالفت سے اُسے چین کے اُن بہت سے صوبوں میں اپنی قومی فوج کے قیام کا بہانہ مل گیا۔ جہاں وہ اس کے بغیر اپنے آدمیوں کو جمع نہ کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ اشتراکیت کی صورت میں اُسے ایک ایسا مدِّ مقابل ملتا رہا جس کا مقابلہ وہ لگاتار کر سکتا تھا اور ایک قوم پرست ڈکٹیٹر کے لئے یہ بات

بہت مفید تھی۔ لیکن چیانگ اشتراکیت کو دور کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ دس سال کی متواتر محنت اُس کی معاون نہ ہو سکی۔ اشتراکیوں نے کبھی ہمت نہ ہاری اور نہ ہار مانی۔ یہاں تک کہ آخر سیان میں انہوں نے چیانگ کو اغوا کر لیا۔ وہ انسان جس نے اشتراکیوں کے سیکڑوں آدمیوں کو مروا ڈالا تھا اب ان کے اپنے رحم و کرم پر تھا لیکن اس بات نے تمام دنیا کو حیران کر دیا کہ اُسی شخص کو انہوں نے آزاد کر دیا۔ بلکہ چیانگ نے اپنے ان "دشمنوں" کو ساتھ ملا کر ایک متحدہ محاذ قایم کیا اور بہت سے التوا اور ردوبدل کے بعد چین کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوا۔

مارشل چیانگ کی امتیازی سیرت کی نمایاں خصوصیات سختی، پختگی اور استحکام ہیں۔ یہ نرم و نازک نقوش والا سپاہی ایک چٹان کی مانند ہے۔ وہ کسی قسم کی چالبازی سے آگاہ نہیں ہے۔ اُس کے طریقے سیدھے سادے ہیں۔ جب سیان میں اُسے اغوا کر لیا گیا تو وہ اپنے گرفتار کرنے والوں کو خدا کا واسطہ دیتا رہا کہ وہ اسے جان سے مار ڈالیں۔ نیز اس کے روزنامچے سے معلوم ہوتا ہے کہ اپنی اس گرفتاری کے زمانے میں وہ اپنے صحیح خیالات کو چھپانے کی بجائے پورے اعتماد کے ساتھ اپنے گرفتار کرنے والوں سے ہر قسم کی گفتگو کرتا رہا۔

اس کی سیرت میں بے رحمی بھی ہے، اور اس کا اظہار اشتراکیوں کی مخالفت میں بسا اوقات ہو چکا ہے۔ اُس نے ہزاروں انسانوں کو صرف اس بات کی بنا پر موت کے گھاٹ اُتروا ڈالا کہ وہ اس کے ہم خیال نہ تھے۔ وہ ایک چالاک، شکی، سوچ سمجھ کر چلنے والا انسان ہے۔ اور اکثر اسے غیر مستحسن ذرائع اختیار کرنے میں بھی عار نہیں ہوتی۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس کی اخلاقی اور جسمانی جرأت اور دلیری سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ ایک سے زیادہ بار وہ اپنے رویے سے ثابت کر چکا ہے کہ اس کے دل میں موت کا ڈر موجود نہیں ہے۔

اُسے اپنے آپ پر اس قدر اعتماد ہے کہ وہ ہمیشہ منتظر رہتا ہے کہ اُس کے مخالف اپنی غلطی کو جان لیں، اس کی بات کو صحیح مان لیں اور نادم ہو کر اس کی طرف رجوع کریں۔ اس طرح اُس نے خانہ جنگی کے زمانے کے بہت سے سرداروں کو اپنا مفید ساتھی بنا لیا۔

ایک اور خصوصیت اُس کا بے پایاں صبر ہے۔ پانچ سال متواتر وہ جاپانیوں کے آگے جھکتا ہی جا رہا تھا۔ چنانچہ اس نے منچوریا بھی ہاتھ سے دے دیا۔ جیہول بھی اور اندرونی منگولیا کی حالت بھی اُسے مخدوش ہی معلوم ہوتی تھی۔ لیکن کئی سال تک اُس نے ذرہ بھر مخالفت نہ کی۔ جاپانیوں کے خلاف کچھ بھی نہ کہا۔ بلکہ اُس نے اُن چینیوں کو سزا بھی دی جو بظاہر جاپانیوں کے مخالف ہوئے۔ اُس کے بہت سے اچھے اچھے فوجی افسر خانہ جنگی کے دوران میں اُس کی اس کمزور روش پر آتش زیر پا بھی ہوئے۔ لیکن چیانگ نے پھر بھی کوئی قدم نہ اٹھایا اور اور اس کے بعد ۱۹۳۷ء کی وہ جنگ شروع ہوئی جو اب بھی جاری ہے۔

۱۹۳۴ء میں بھی وہ خفیہ طور پر اسی بات کو اپنے ماتحت افسروں کے ذہن نشین کراتا رہا کہ آخر کار انہیں جاپان سے جنگ آزما ہونا ہی پڑے گا۔ اور وہ اس آنے والی یقینی جنگ کی تیاریوں کے لئے اُن کی منتیں کرتا رہا۔ ۱۹۳۳ء میں چیانگ کو اس بات کا احساس تھا۔ کہ چینی جاپانیوں کا کامیاب مقابلہ نہیں کر سکتے اس لئے تیار ہونے کے لئے جس طرح بھی ملے وقت حاصل کرنا چاہئے اور پھر شاید وہ جیت سکیں

چیانگ روپے سے بہت ہوشیاری کے ساتھ کام لیتا ہے۔ جنگ کے آغاز ہی میں اُس نے گھاؤ دان یعنی زخموں کے انعام کا ایک ایسا سسٹم ایجاد کیا جس کی مثال دنیا کی فوجی تاریخ میں آج تک نہیں ملتی۔ ہر سپاہی کو قومی حکومت کی طرف سے میدان جنگ میں لگے ہوئے ہر زخم پر ایک مقررہ رقم (دس چینی ڈالر) دی جانی قرار پائی۔ چینی ذہن حقیقت پرست ہے اور اس کے لئے تمغوں کی بہ نسبت زرِ نقد خدمت کا بہتر معاوضہ ہے۔ یہ معاوضہ عام سپاہی کو دس، افسروں کو بیس سے پچاس اور جرنیلوں کو سو چینی ڈالر ملتا ہے۔ یہ طریقہ بہت کامیاب ثابت ہوا۔

مارشل چیانگ کی تنخواہ ایک ہزار چینی ڈالر ماہوار ہے یعنی تقریباً ساڑھے چھ سو روپے۔ اس کی ذاتی جائیداد کچھ زیادہ نہیں ہے۔ اگرچہ کہا جاتا ہے کہ اُس نے شنگھائی کے اولین ایام میں کافی روپیہ کمایا تھا۔ سونگ خاندان میں اس نے شادی کی۔ لیکن اس خاندان کی دولت ایک علیحدہ چیز ہے۔ سونگ خاندان کے لوگ چین کے امیر ترین افراد میں سے ہیں اور خاندانی اجتماعی قوت کے لحاظ سے یہ خاندان دنیا کی ایک امتیازی مثال ہے۔ کیونکہ اس خاندان کا ہر فرد ملک میں ایک نمایاں حیثیت کا مالک ہے۔ اس خاندان کی تین لڑکیوں میں سے سب سے بڑی لڑکی چین کے وزیر اعظم ڈاکٹر ایچ ایچ کونگ کی بیوی ہے

دوسری لڑکی ڈاکٹر سن یٹ سین کی بیوہ ہے اور تیسری جس کا نام مے آئی لنگ ہے۔ مارشل چیانگ کائی شیک کی بیوی ہے۔ ان تینوں بہنوں کی تعلیم و تربیت اور ابتدائی نشو و نما مذہبی ماحول میں ہوئی۔ تینوں ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں تعلیم کی تکمیل سے پہلے مشنری سکولوں میں بھیجی گئیں اور سب سے اہم یہ کہ تینوں کا تعلق بچپن ہی سے انقلاب چین کے ساتھ رہا کیونکہ ان کا باپ ڈاکٹر سن یٹ سین کا سب سے معتبر دوست تھا۔

میڈم چیانگ سب سے چھوٹی بہن ہے۔ لیکن سب سے امتیازی شان رکھتی ہے۔ اہمیت اور طاقت کے لحاظ سے اُسے اندازاً چین میں ثانوی حیثیت حاصل ہے۔ یہ مانا کہ چیانگ کائی شیک ہر بات کا فیصلہ بذاتِ خود کرتا ہے۔ لیکن ان فیصلوں میں میڈم چیانگ کے مشوروں کو بہت حد تک دخل ہوتا ہے۔ وہ نہ صرف مارشل کی رفیقۂ حیات اور مشیر کار ہے بلکہ غیر ملکی باشندوں سے میل جول اور غیر ملکوں کی رائے زنی سے مارشل کو آگاہ رکھنے میں بھی چیانگ کی معاون ہے۔

پندرہ سال کی عمر میں چیانگ نے فینگھوا میں اپنے ایک ہمسائے کی بیٹی سے شادی کر لی۔ یہ شادی خاندانی طور پر ہوئی تھی لیکن ۱۹۲۱ء میں چیانگ نے طلاق کے ذریعے سے آزادی حاصل کر لی۔ چیانگ کی اس بیوی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اُس کا رہن سہن قدیم چینیوں کی طرح تھا۔ پرانے رواج کے مطابق ہی اُس کے پاؤں چھوٹے رکھے گئے تھے۔ مارشل اب اُس سے کبھی نہیں ملتا۔ لیکن دنیوی لحاظ سے اُس کی مدد کئے جاتا ہے اور اس کی گذراوقات کا بار اُس نے طلاق کے باوجود اپنے ذمے لے رکھا ہے۔ پہلی بیوی سے ایک بیٹا بھی پیدا ہوا جس کی عمر اب بیس سال کی ہے۔ لیکن بعد ازاں مارشل نے ایک اور متبنّےٰ بھی بنا لیا۔ طلاق کے بعد مارشل چیانگ کی ملاقات مے آئی لنگ سونگ سے کینٹن میں ہوئی۔

میڈم چیانگ غیر معمولی طور پر حسین، دلکش اور جاذبِ نظر ہے۔ میڈم چیانگ پر اپنی بہنوں کی بہ نسبت امریکہ کے ماحول کا زیادہ اثر ہوا۔ چستی، صاف ستھرا پن، خوش گفتاری اور مستعدی، قابلیت، اور لیاقت، یہ سب میڈم چیانگ کی خصوصیات ہیں۔ چین اور مارشل چیانگ سے اُسے جو والہانہ عقیدت ہے اُس سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا۔ وہ سماجی اور سیاسی زندگی میں پوری طرح حصہ لیتی ہے۔ جب کبھی جاپانی ہوائی حملہ کرتے ہیں تو میڈم چیانگ ایک دم موقعۂ واردات پر جا پہنچتی ہے اور زخمیوں کی دیکھ بھال میں مصروف ہو جاتی ہے۔ دیہاتی علاقوں کو از سرِ نو آباد کرنے، زبان کو آسان بنانے کی نشو و نما اور تحریکِ حیات نو (شخصی امداد اور بہتری کی تحریک) کی تخلیق و تنظیم میں میڈم نے بہت حصہ لیا ہے۔

جب مارشل کو سیان کے باغیوں نے گرفتار کر لیا تو میڈم نے اپنے بھائی کے ذریعے سے ایک پیغام مارشل کو بھیجا، جس سے اُس کی سیرت پر روشنی پڑتی ہے "اگر تین دن تک میرا بھائی نہ لوٹا تو میں خود آپ کے پاس جینے اور مرنے کے لئے سیانفو پہنچ جاؤں گی ——" جب چیانگ نے اس پیغام کو پڑھا تو اُس کی آنکھیں نمدار ہو گئیں لیکن میڈم چیانگ تین کا انتظار کئے بغیر دوسرے ہی دن سیانفو جا پہنچی اور اُس نے یہ ثابت کر دیا کہ اُس کے خاوند کی زندگی اُس کی اپنی زندگی ہے اور اُس کے خاوند کے مقاصدِ حیات بھی اُس کے اپنے ہی ہیں۔

۲۲ر اکتوبر ۱۹۳۰ء کو چیانگ کائی شیک کو بپتسمہ دیا گیا۔ اور اُس نے عیسائی مذہب اختیار کر لیا۔ مارشل کی بیوی کے خاندان کے تمام افراد پکے عیسائی تھے۔ اور جب مارشل نے میڈم چیانگ کی طرف شادی کے ارادے سے توجہ کی تو شروع شروع میں اُس کے اس رجحان کو اس بنا پر رد کر دیا گیا کہ وہ عیسائی نہیں ہے اور یہ ظاہر کیا گیا کہ اگر وہ عیسائی ہو جائے تو شادی ہو سکتی ہے لیکن مارشل ایک راسخ الارادہ انسان تھا۔ اُس نے کہا کہ یوں کرنے سے اُس کی اپنی نظروں میں اُس کی عزت کم ہو جائے گی کہ محض شادی کے لئے اُس نے دوسرا مذہب اختیار کیا۔ اس سے لڑکی اور لڑکی والوں پر اثر تو ہوا لیکن اور کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ چیانگ نے یہ بھی کہا کہ اگر شادی ہو جائے تو وہ وعدہ کرتا ہے کہ عیسائیت کا باقاعدہ مطالعہ کرے گا اور اگر اُس کا اعتقاد پیدا ہوا تو اس مذہب کو اختیار بھی کرے گا۔ اس پر بھی بات نہ بنی۔ لیکن چیانگ نے ہمت نہ ہاری اور وہ اصرار کرتا ہی رہا۔ اسی دوران میں اُس نے انقلابِ چین کی مخالفت کی اور ترقی کی تمام منزلیں طے کر لیں۔ آخر ۱۹۲۷ء میں میڈم چیانگ کی بڑی بہن نے اخبارات کے نمائندوں کو شادی کی خبر سے آگاہ کیا۔ اور یکم دسمبر کو شادی ہو گئی۔ شادی کی رسم کے عین بعد چیانگ نے کہا کہ اب انقلاب کا کام زیادہ ترقی کرے گا۔ کیونکہ اب میں اپنی زبردست ذمہ داریوں سے مطمئن دل کے ساتھ عہدہ برآ ہو سکوں گا۔

انجام کار چیانگ نے عیسائیت کو اختیار کر لیا اور اب وہ ایک راسخ العقیدہ عیسائی ہے۔ ۱۹۳۵ء میں ایک تقریر نشر کرتے ہوئے اُس نے اس موضوع پر خیال آرائی کی کہ ہم یسوع مسیح پر کیوں اعتقاد رکھتے ہیں۔ چیانگ کے دل میں اپنی بیوی کی جو محبت ہے وہ شادی کو دس سال کا عرصہ گذر جانے کے باوجود کسی طرح کم نہیں ہوئی۔ اگر چہ سیان کی گرفتاری کے وقت اُس نے اپنا جو آخری پیغام بیوی کے نام روانہ کیا تھا۔ وہ ذاتی نہیں ہے "چونکہ میں نے ارادہ کر لیا ہے کہ ضرورت پڑنے پر اپنے وطن کے لئے قربان ہو جاؤں، اس لئے میرے متعلق مہربانی سے کسی قسم کی فکر نہ کرنا میں کبھی کوئی ایسی بات نہیں کروں گا، جس سے میری بیوی اپنے دل میں شرمسار ہو اور میں ہمیشہ اپنے کو ڈاکٹر سن یٹ سین کا ایک سچا پیرو ثابت کرنے کی کوشش کروں گا۔ چونکہ میں انقلاب ہی کے لئے پیدا ہوا تھا۔ اس لئے نہایت خوشی سے انقلاب ہی کے لئے مروں گا"

خواہ مارشل چیانگ کا عملہ کسی بھی جگہ مقیم ہو، ہر سوموار کے روز ایک امتیازی اور اہم رسم عمل میں آتی ہے۔ چھ سو سپاہی چیانگ کی دارالاقامت کے قریب ایک ہال میں جمع ہوتے ہیں۔ فوجی بینڈ باجہ پر خرامی نغمہ بجایا جاتا ہے اور سب لوگ سیدھے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ پھر ہر شخص باری باری ڈاکٹر سن یٹ سین کی ایک بڑی تصویر سے پردہ ہٹا کر تین بار سرِ تسلیم خم کرتا ہے۔ یہ رسم باقاعدگی کے ساتھ انجام کو پہنچائی جاتی ہے۔ پھر مارشل چیانگ ڈاکٹر سین کا عہد نامہ بہ آواز بلند پڑھتا ہے اور ہر فقرے کے بعد وقفہ دیا جاتا ہے تاکہ حاضرین اُسے دہراتے جائیں۔ یہ تمام رسم پوجا پاٹ کی طرح ہوتی ہے۔

اس کے بعد تین منٹ تک مارشل اور دوسرے حاضرین خاموش رہتے ہیں۔ اور پھر چیانگ ایک آدھ گھنٹہ تک لکچر دیتا ہے اس لیکچر میں وہ فوجی معاملات پر خیال آرائی اور رائے زنی کرتا ہے۔ اُن کو پہلے سے زیادہ مستعدی کے لئے اکساتا ہے۔ نکموں کو زبانی سرزنش کرتا ہے۔ حکومت کے بُرے پہلوؤں کی طرف دھیان دلاتا ہے۔ اس لکچر کے دوران میں حکومت کا ہر چھوٹا بڑا اہم افسر وہاں موجود ہوتا ہے اور تمام لوگ کھڑے رہتے ہیں۔ لکچر ہو چکنے پر مارشل "شکریہ" یا "الوداع" کی قسم سے کچھ نہیں کہتا بلکہ صرف اتنا پکارتا ہے "ختم ہوا"

تیس سال کی انقلابی کیفیات اور خانہ جنگیوں کے بعد چیانگ کائی شیک اتحادِ چین کا ایک استعارہ بن گیا ہے۔ جاپان کے خلاف چین کی مدافعت کا ایک مجسمہ جاپانیوں کو اس بات کا پورا احساس ہے۔ بلکہ انہوں نے اعلان بھی کر رکھا ہے کہ گرفتاری پر وہ اس کا سر تن سے جدا کر دیں گے۔

تیسری صدی قبل مسیح سے اب تک چیانگ کی ایسی انفرادی قوت والا کوئی شخص چین میں پیدا نہیں ہوا اسی صدی میں دیوارِ چین بھی بنائی گئی تھی۔ اس کے دوستوں کا بیان ہے کہ آج کل چیانگ کو وہ جس قدر مطمئن اور اعتماد سے لبریز دیکھتے ہیں۔ اس سے پہلے انہوں نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اور اس اطمینان اور اعتماد کی وجہ معلوم کرنا کچھ مشکل نہیں۔ وہ ایک ایسی دیوارِ چین تیار کر رہا ہے جو جاپانیوں کو ہمیشہ کے لئے چین سے دُور رکھنے کا ذریعہ ثابت ہوگی۔ اس مدافعت کی دیوار سے چین کی قومی زندگی کی نشو و نما مکمل ہو جائے گی اور چین کی سرزمین صرف چینیوں ہی کے لئے وقف رہے گی۔ اب چیانگ ایک غیر ملکی حملہ آور سے لڑ رہا ہے کسی خانہ جنگی میں حصہ نہیں لے رہا۔ اسی لئے اسے اطمینان ہے۔ اسی لئے اُسے اپنے پہلے سے زیادہ اعتماد ہے!

بسنت سہائے

شعر

میرے رونے کا جس میں قصہ ہے ۔ عمر کا بہترین حصہ ہے

جوش

نوادرِ ادبی

ذیل کے چار قطعات ہمیں ایک قلمی نسخے سے ملے ہیں جو نواب ضیاء الدین احمد خاں کے چھوٹے صاحبزادے میرزا سعید الدین خاں عرف احمد سعید طالبؔ دہلوی کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے
ان قطعات کے لئے ہم جناب مالک رام صاحب ایم اے کے ممنون ہیں۔
قطعات کے متعلق کسی تمہید یا تعارف کی ضرورت نہیں کیونکہ وہ آپ اپنی شرح کر رہے ہیں۔

ادارہ

از جانب مرزا غالب بنام نواب علاؤ الدّین احمد خانصاحب رئیس لوہارو

خوشی تو ہے آنے کی برسات کے پئیں بادۂ ناب اور آم کھائیں
سرِ آغازِ موسم میں اندھے ہیں ہم کہ دلّی کو چھوڑیں لوہارو کو جائیں
سوا ناج کے جو ہے مقلوبِ جاں نہ واں آم پائیں نہ انگور پائیں
ہوا حکم باورچیوں کو کہ ہاں ابھی جا کے پوچھو کہ کل کیا پکائیں
وہ کھٹے کہاں پائیں املی کے پھول وہ کڑوے کریلے کہاں سے منگائیں
فقط گوشت سو بھیڑ کا ریشہ دار کہو اس کو کیا کھا کے ہم حظ اٹھائیں

خوانی بہ سوئے خویش و ندانی کہ مُردہ ام دانی کہ مردہ را رہ و رسمِ خرام نیست
نے شیخ سُدّوام نہ الٰہ بخش، مرگِ من از عالمِ جنابت و مرگِ حرام نیست

جوابِ نواب علاؤالدین احمد خاں صاحب بہ مرزا غالب

خوشی ہے ہمیں آنے کی آپ کے — کہ باہم پئیں پان اور آم کھائیں
سرِ آغاز موسم میں کیا خوب ہو — کہ دلّی سے حضرت لوہارو کو آئیں
عجب لطف ہے یاں کی برسات میں — کہ کیچڑ کہیں نام کو بھی نہ پائیں
سرولی کے وہ ڈاک پر سبز آم — وہ دلّی کے انگور ہر شام آئیں
کریں حکم باورچیوں کو کہ ہاں — ابھی جا کے ہر چیز جلدی پکائیں
وہ لیں باغ سے جا کے املی کے پھول — وہ جنگل سے کڑوے کریلے منگائیں
وہ بے ریشہ بکری کا لحمِ طری — کہ کیا کیا اسے کھا کے ہم حظ اٹھائیں
کہیں اُن کو بے مہرو کا ہل، اگر — لوہارو جو اس بات پر بھی نہ آئیں

خوانمت سوئے خویش و گرچند مُردہ — دانم کہ بہر چوں توئی منع خرام نیست
پندارمش چو حسنِ تجلّیٔ لال بیگ — مرگش چو شیخ سدّو زراہِ حرام نیست

جنگِ عظیم کا آغاز

ایک زندۂ جاوید داستان کے چند ناخواندہ ورق

۲۸ جون ۱۹۱۴ء کی صبح کو گیارہ بجے بوسینیا کے ایک چھوٹے سے گمنام قصبے سراجیوو کی خاموش فضا پستول کے تین فائروں کی آواز سے گونج اُٹھی۔ ایک سلاوی طالب علم گاوریلو پرنسپ نے فرانسس جوزف شہنشاہ آسٹریا کے ولیعہد اور آسٹریا ہنگری کی سطوتِ شاہانہ کے نمائندے آرچ ڈیوک فرانسس فرڈیننڈ اور اُس کی بیوی کو پستول کا نشانہ بنادیا تھا اور اس قتل سے اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ سلاوی جمہور کو دبانے والے ایک جابر حکمران کا خاتمہ کر دیا جائے۔

جب اس شاہی قاتل نے جو بظاہر اس دنیا میں تقدیر کا آلہ بن کر آیا تھا اپنے پستول کی لبلبی دبائی ہوگی تو وہ اپنی بے پروایانہ سادگی میں یہی سمجھتا ہوگا کہ وہ دو "عالی جاہ" ہستیوں کو فنا کر رہا ہے۔ اُسے کیا معلوم تھا کہ وہ درحقیقت ایک کروڑ انسانی جانوں کو موت کے گھاٹ اُتار رہا ہے۔

یہ کہنا بے فائدہ ہے کہ سراجیوو کے سانحۂ قتل کے بغیر بھی جنگ کا ہونا اور دنیا کا قتل و غارت کے اس طوفان میں غرق ہو جانا لازمی تھا جب تک زندگی باقی ہے تب تک امید بھی قائم ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ جنگِ عظیم اُس نوجوان انقلاب پسند کے پستول کی نالی سے وجود میں نہیں آئی۔

یوگوسلافیہ کے پسماندہ ملک سے مجھے ایک خاص اُنس ہے اور گذشتہ سال میں کئی ماہ تک اس کے مختلف حصوں میں سفر کرتا رہا تاکہ اس کے باشندوں اور مناظر سے زیادہ آشنائی پیدا کرسکوں۔ ایک روز جب کہ دن نہایت خاموش اور شام بے حد حسین تھی، میں جھٹپٹا ہوتے ایک چھوٹے سے گاؤں میں پہنچا۔ میں پہاڑیوں کا ایک لمبا سلسلہ جو میلوں تک پھیلا ہوا تھا، قطع کر کے اور گھنے کوہستانی جنگلوں میں سے نکل کر اُس ہموار میدان میں داخل ہوا تھا جو سراجیوو تک پھیلا ہوا ہے۔ سراجیوو، جو یورپ کا مکّہ ہے اور جہاں تمام یورپ کے مسلمان زیارت کے لئے جاتے ہیں۔

میں نے اس گاؤں کا نام معلوم کرنے کی کوئی کوشش نہ کی۔ نقشے میں یہ صرف ایک سبز نقطہ تھا جو ایک نیلی لکیر کے کنارے واقع تھا۔ نیلی لکیر وہ چھوٹی سی ندی تھی جس کے کنارے پر میں اب کھڑا تھا اور جو میرے دائیں طرف ایک آبشار بنا کر گرتی اور گاؤں کی پن چکی کو چلاتی ہوئی گنگناتی چلی جاتی تھی۔ ڈھوروں کے گلّے چراگاہوں سے واپس آرہے تھے اور کسانوں کے گھروں سے جہاں وہ شام کا کھانا پکانے اور کھانے میں مصروف تھے۔ نیلے نیلے دھوئیں کے ہلکے ہلکے مرغولے اُٹھ رہے تھے۔ میں اپنی موٹر کو درست کرنے میں مصروف تھا اور تھوڑی دیر سے ایک جوان آدمی مجھے اجنبی سمجھ کر میری طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ آخر وہ گلی کو عبور کر کے میرے پاس آکھڑا ہوا اور بولا "آپ آج رات یہیں کیوں نہیں ٹھہر جاتے۔ شام ہو گئی ہے اور چراغ جلے سے پہلے آپ سراجیوو نہیں پہنچ سکتے اور ..... (یہاں وہ مسکرا دیا) میرا گھر آپ ہی کا گھر ہے"۔

"آپ کی بے حد نوازش"۔

اور دوسری صبح جب میں ایک چھوٹے سے کمرے میں بیدار ہوا تو دیوار پر لگے ہوئے چوکھٹوں میں سے چند عمر رسیدہ لوگ میری طرف

مسکرا مسکرا کر دیکھ رہے تھے اور میرا میزبان دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا۔
تھوڑی سی گفتگو کے بعد میں نے سرسری طور پر اُس سے دریافت کیا کہ اس گاؤں کا کیا نام ہے۔

"تاجیش۔ اور میرا نام ہے میلان شکوتا۔ لیکن یہ نسبتاً کم اہمیت رکھتا ہے۔ اگرچہ شاید آپ یہ معلوم کرنا چاہیں کہ گذشتہ رات آپ نے کس کے کمرے میں بسر کی۔ کئی سال گذرے یہ کمرہ گاوریلو پرنسپ کے پاس تھا۔ آپ کو یہ نام یاد ہے؟ وہ اس گاؤں میں اپنے بھائیوں جو آور نکولس کے ساتھ رہتا تھا۔ اور پھر جب میں اس اچانک اور حیرت انگیز خبر سے مبہوت ہو کر بے حس و حرکت بیٹھا رہا تو اُس نے میرے جواب کا انتظار کئے بغیر آہستہ سے کہا" وہ میرا بہترین دوست تھا۔ ہاں! اس بات کو اب بہت عرصہ گذرا۔ ہم نے تب سے یہ کمرہ استعمال نہیں کیا۔"

میں اب اپنی حیرانی پر غالب آچکا تھا "تو آپ بھی دہشت پسندوں کے گروہ سے تعلق رکھتے تھے؟"

"نہیں۔ میں اُن میں سے تو نہیں تھا لیکن اُس واقعہ کی لپیٹ میں ضرور آ گیا تھا۔ کیونکہ گاوریلو ان دنوں اسی کمرے میں مقیم تھا۔"

میلان شکوتا نے سماوار سے ترکی قہوہ کی پیالیاں بھرنی شروع کیں اور قہوے کے دور میں اُس نے مجھے وہ کہانی سنائی جو اُس دن تک کسی کو نہیں سنائی گئی تھی اور جس نے لاکھوں انسانوں کی تقدیروں کو بنا اور بگاڑ دیا تھا۔

میلان شکوتا کی کہانی

میلان شکوتا ایک سادہ اور تنومند انسان ہے اور جس طرح وہ جسمانی طور پر ایک مستول کی طرح سیدھا اور مضبوط ہے۔ اسی طرح اخلاقی طور پر بھی اُس میں کوئی کجی اور کمزوری نہیں۔ اگر اُس نے اب تک اپنی زبان نہیں کھولی تھی تو اس لئے نہیں کہ وہ زبان بندی کے کسی سخت حکم کی پابندی کر رہا تھا بلکہ محض اس لئے کہ کسی نے اُس سے اب تک یہ بات پوچھی نہیں تھی۔ اُس نے قتل کی واردات میں خود کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا تھا۔ اُسے گرفتار نہیں کیا گیا حالانکہ ۱۹۱۴ء میں اس سلسلے میں ہزاروں سربی پکڑے گئے تھے۔ اس کے بعد جس طرح قانون کے علم بردار اُسے نظر انداز کر گئے۔ اسی طرح وہ اخبار نویسوں کی نظروں سے بھی بچ گیا۔ میلان نے اپنے راز کو اپنے دل ہی میں آرام سے پڑا رہنے دیا۔ مگر مجھے یہ محسوس ہوا کہ اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر کے اُسے یک گونہ مسرت ہوئی ہے۔ میں نے بعد میں اُس کی بتائی ہوئی تمام باتوں کو اچھی طرح پرکھا۔ کیونکہ حدیثِ راہ کی نسبت مسافر کو ذرا زیادہ احتیاط سے کام لینا پڑتا ہے۔ معلوم شدہ حقائق سے اس کی کہانی کی جزئیات کی پوری مطابقت کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ تاریخ کے محتاط سے محتاط طالب علم کو بھی شکوتا کے اقرار کو بلا تامل اپنی تحقیقاتی بیاض میں شامل کر لینا چاہئے۔ اُس نے بیان کیا: "میں گاوریلو کو بچپن سے جانتا تھا۔ ہم پرائمری سکول میں ہم جماعت تھے اور میں اپنے دل میں اس کے لئے ہمیشہ محبت اور عزت کے جذبات پاتا تھا۔ ابتدائی مدرسے سے نکل کر مجھے دنیا کے دھندوں میں پھنس جانا پڑا۔ لیکن وہ پڑھتا رہا۔
جب وہ سراجیوو کے ہائی سکول سے گاؤں واپس آتا تو راستے میں ریلوے کے کارخانے سے مجھے بھی اپنے ساتھ لے لیتا۔ جب کوئی شخص دن بھر کارخانے میں ہتھوڑا چلاتا اور زنبور سے زور آزمائی کرتا رہے تو شام کو وہ یقیناً ایک ایسے پڑھے لکھے اور شائستہ رفیق کی صحبت کو پسند کرے گا جو اُسے بھی محبت کی نگاہوں سے دیکھتا ہو۔

ایک شام اُس نے مجھ سے کہا" میلان! میں کل سے مدرسے نہیں جاؤں گا۔"

"کیوں؟"

"پرنسپل مجھے ایک ایسی بات کے لئے سزا دینا چاہتا تھا جو مجھ سے سرزد نہیں ہوئی تھی۔ میں نے غصے میں آکر اُس پر حملہ کر دیا جس کی پاداش میں مجھے سکول سے نکال دیا گیا ہے۔"

یہ سب کچھ ٹھیک تھا صاحب۔ گاوریلو بعض اوقات ایسی باتیں کیا کرتا جو ہمارے فہم سے بالاتر ہوتیں۔ لیکن وہ جھوٹ کبھی نہ بولتا۔ چند روز کے بعد وہ بلغراد چلا گیا اور پھر کچھ عرصہ کے لئے بالکل غائب ہو گیا۔ لیکن آخر ۱۹۱۳ء کی بہار میں وہ اپنے اسی گاؤں تاجیش کو لوٹ آیا۔ اُس روز انتخابات ہو رہے تھے اور حکومت کے کارکن ہمیں سرکار پرست امیدواروں کے حق میں ووٹ دینے کو کہہ رہے تھے۔ یکایک گاوریلو زور سے چیخا" یہ بے حد شرمناک ہے۔ دوستو! ان کی بات بالکل نہ سنو۔ اپنا ووٹ حقیقی سربیوں کو دو۔ شہنشاہ کے کمینے جاسوسوں کو مت دو۔" پولیس نے ہجوم پر ہلّہ بول دیا اور گاوریلو کو راہِ فرار اختیار کرنی پڑی۔ پولیس والوں نے اُس کا پیچھا کیا مگر خوش قسمتی سے وہ بچ نکلا اور دوسرے دن واپس سربیا چلا گیا۔

اُس کی شوریدہ سری تو عیاں تھی۔ اور اسی لئے وہ مجھے اس قدر اچھا بھی لگتا تھا اگرچہ مجھ میں کبھی اس جیسا حوصلہ پیدا نہ ہُوا۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ وہ کسی انقلاب پسند جماعت میں شامل ہو گیا ہے یقیناً مجھے اس کی خبر نہ تھی۔ ایسی باتوں سے میں ذرا دُور دُور ہی رہتا ہوں۔ میں کوئی ہیرو تو ہوں نہیں۔ اور اگر مجھے گاوریلو کی ان کارروائیوں کا پتہ چل جاتا تو شاید میں ایسی گرمجوشی سے اس وقت اس کا استقبال نہ کرتا جب وہ اپنا سوٹ کیس لئے میرے ہاں آیا اور پھر غالباً یہ سب کچھ پیش نہ آتا جو اُس کے بعد پیش آیا۔ کیونکہ جنگِ عظیم کا آغاز اُسی سوٹ کیس میں پوشیدہ تھا جو وہ ایک شام میرے ہاں امانتاً رکھ گیا تھا۔

۱۹۱۳ء میں ایک روز تین نوجوان بلغراد سے پیادہ پا روانہ ہوئے انہوں نے اپنے کندھوں پر ایک چھوٹا سا سیاہ بکس، جیسے کسی بچے کا تابوت ہو، اُٹھا رکھا تھا۔ مگر اس میں کسی بچے کی نعش نہیں تھی۔ ان تینوں کے نام ناوتش، گرابش اور گاوریلو تھے۔ اور برناوتخ کے قصبہ تک وہ دریائے ساوا کے کنارے کنارے چلتے رہے اور شباتا اور پلانسا کے قصبوں سے بچتے ہوئے انہوں نے دریائے درینا کو ایک کشتی کے ذریعے عبور کیا اور سرحد پار ہو گئے۔ جب وہ آسٹریا میں داخل ہوئے تو انہوں نے بکس کو ایک کسان کے چھکڑے پر لاد دیا اور اسے بھُوسے بالکل ڈھک دیا۔ یہ بات بہت کارآمد ثابت ہوئی۔ کیونکہ تھوڑی ہی مسافت طے کرنے کے بعد اُنہیں ایک پولیس والے نے ٹوکا اور اُن سے بہت سے سوالات کئے۔ مگر وہ بدمستی کا بہانہ کرکے جھومتے اور گاتے رہے اور اس طرح اُس سے خلاصی حاصل کی۔ آخر بکس تلزا کے قصبے میں پہنچ گیا جہاں وہ مشکو کی تحویل میں دے دیا گیا۔ مشکو اسے تلزا سے لے کر دوبوئی پہنچا اور دوبوئی سے وئیلو نے اسے سراجیوو پہنچایا۔

گاوریلو ۲۸ جون کو سراجیوو کے ریلوے اسٹیشن پر اترا۔ میں اس کے لئے پلیٹ فارم پر منتظر تھا اور میرا دل مسرت سے رقص کر رہا تھا۔ میں نے اُس سے کہا: "گاوریلو تمہاری بھابی کے ہاں ابھی ابھی لڑکا پیدا ہُوا ہے بھلا سوچو تو انہوں نے اس کا کیا نام رکھا ہو گا؟"

"مجھے کیا خبر؟"

"شلوبدا۔ (آزادی) کیسا نیک شگون ہے؟"

"شلوبدا! شلوبدا! شاید ہمیں سچ مچ کی آزادی بھی اب ملنے ہی والی ہے۔"

میں نے اس کے الفاظ کی طرف چنداں توجہ نہ دی۔ سوٹ کیس اب وئیلو کے ہاں نہیں رکھا جا سکتا تھا کیونکہ پولیس تمام مشکوک لوگوں کی خانہ تلاشی لے رہی تھی۔ جلد جلد مشورے کئے گئے۔ گاوریلو کو جیسے الہام ہُوا۔ تڑپ کر بولا۔ "اسے میرے حوالے کیجئے۔ میرا ایک عزیز ترین دوست ہے جس پر کوئی شک نہیں کر سکتا۔ میں یہ متاعِ عزیز اس کے ہاں لے جاؤں گا۔"

اور یہی وجہ تھی کہ جون کے پہلے ہفتے میں ایک شام میرا عزیز دوست میرا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا اور اس کے کاندھے سے ایک وزنی سیاہ بکس لٹک رہا تھا۔

"شام بخیر! حضرت! یہ بکس آپ کے ہاں رہے گا اور شاید یہ اتنا بڑا نہیں ہے کہ اس کے باعث آپ مکان میں نہ رہیں۔" "بہت اچھا بھائی جان! مگر اس میں ہے کیا؟" "فقط کتابیں" اور پھر باورچی خانے میں آکر اُس نے بکس کو ایک بنچ کے نیچے دھکیل دیا۔

دن گذرتے چلے گئے اور مجھے کسی قسم کا گمان تک نہ ہُوا۔ ۲۷ جون کو گاوریلو ہمارے ہاں آیا اور آتے ہی اُس نے میری بیوی سے باورچی خانے کی چابی طلب کی اور جب وہ اپنی پیٹھ پھیر چکی تو اُس نے بکس سے کچھ نکالا! اور کچھ کہے سنے بغیر واپس چلا گیا۔ جب شام کو میں گھر آیا تو میری بیوی بڑبڑا رہی تھی کہ میرا دوست باورچی خانے کی چابی بھی اپنے ساتھ لے گیا ہے "میں کمبخت کھانا تک نہیں تیار کر سکی۔ وہ تمہارے دوست صاحب باورچی خانہ قبضے میں کرکے چل دیئے ہیں۔"

میں نے ابھی معاملہ پر غور کرنا شروع ہی کیا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ "او ہو۔ گاوریلو تم ہو! بھائی یہ باورچی خانہ کیوں بند کر گئے تھے؟" وہ مسکرا دیا اور مجھے ہاتھ سے پکڑ کر ایک طرف لے گیا "خفا کیوں ہوتے ہو میلان۔ آؤ تمہیں کچھ دکھائیں۔" یہ کہہ کر اس نے بکس کا ڈھکنا اٹھایا اور میری حیرت زدہ آنکھوں نے دیکھا کہ اس میں پانچ سات خوفناک بم۔ زہر کی چند شیشیاں اور ایک چھوٹا سا پستول پڑا تھا۔ "میرے پاس ایسی اور چیزیں بھی تھیں۔ مگر اب سب رفیقوں میں بٹ گئیں۔" اس نے پستول اُٹھا لیا اور اُسے کارتوسوں سے بھر کر جیب میں ڈال لیا۔ "ارے اسے کیا کرو گے گاوریلو؟" اُس نے میرے کندھے پر آہستہ سے تھپکی دی اور اپنا مُنہ میرے کان کے پاس لا کر کہنے لگا "کل۔ اس پستول سے میں آرچ ڈیوک کی زندگی کا خاتمہ کر دوں گا۔ فرڈینینڈ ہم سلاویوں کا سب سے بڑا دشمن

ہے۔ اور جس وقت تک ہیپسبرگ کا خاندان ہم پر مسلّط ہے ہم کبھی آزاد نہیں ہو سکیں گے۔ پس میں اس ملعون خاندان کے ایک رکن، ایک بہت بڑے رکن کا خاتمہ کرنے والا ہوں اور یہ ایک اچھا آغاز ہو گا۔" اور اُس نے ایک بم اُٹھا کر میری طرف بڑھایا۔ "دیکھو۔ موت کتنی آسان ہے۔ اس پن کو کھینچا اور یوں پھینک دیا۔ بس۔" "لیکن۔ گاوریلو۔ ۔ ۔ ۔" اُس نے ہنستے ہوئے اپنا اٹھا ہوا ہاتھ نیچا کر لیا اور میری جان میں جان آگئی اور پھر وہ مسکراتا ہُوا شب بخیر کہہ کر وہاں سے چل دیا۔ اس شب اُس کی رفتار میں آہوئے صحرائی سی سبک خرامی تھی اور اس کا چہرہ کسی نامعلوم مسرت سے دمک رہا تھا۔

میں اس سلسلے میں اپنی بیوی سے کسی قسم کا ذکر کرتے ہوئے ڈرتا تھا کہ مبادا وہ اپنے ہوش و حواس کھو کر کوئی سخت بے وقوفی کر بیٹھے۔ میں کسی طرح اپنے دوستوں سے بے وفائی نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن میں سراجیوو میں رہ کر گرفتار ہونے۔ ایذائیں اٹھانے اور آخر میں پھانسی پانے کے جوکھوں میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ اس لئے جب دوسری صبح میں اپنا کھانا رومال میں باندھ کر گھر سے نکلا تو ریل کے کارخانے کی بجائے میں نے ریل کے اسٹیشن کا رُخ کر لیا؛ تاکہ پہلی ٹرین میں سوار ہو کر سربیا چلا جاؤں۔ راستے میں مجھے گاوریلو ملا۔ وہ سرتاپا ایک تبسم رقصاں تھا۔ "صبح بخیر۔ میلان! کام پر جا رہے ہو؟" "نہیں سربیا کو۔ بیوی سے تو ذکر نہیں کیا؟" "دیوانے ہوئے ہو!" اور اتنے میں اسٹیشن جانے والی بس آگئی اور میں لپک کر اس پر سوار ہو گیا۔ گاوریلو اب نگاہوں سے اوجھل لیکن دماغ پر مسلّط تھا۔ راستے میں دیکھا۔ بازار چوتھی کی دلہن کی طرح سجائے گئے تھے۔ ولیعہد سلطنت کی آمد آمد تھی اور میرے یا تین چار اُن اشخاص کے سوا جو اپنی جیبوں میں بم بھرے اِدھر اُدھر ٹہل رہے تھے۔ کسے خبر تھی کہ اُسے یہیں کسی بازار کے موڑ پر آج موت سے ملاقات کا وعدہ پورا کرنا ہے!

ساڑھے گیارہ بجے میری گاڑی بیجیج کے اسٹیشن پر رُکی۔ اسٹیشن کی چھت سے ایک بہت بڑا سیاہ جھنڈا لٹک رہا تھا اور چاروں طرف پولیس اور فوج کے سپاہی پھر رہے تھے۔ "کیا ہُوا کیا ہوا!" "آرچ ڈیوک اور ڈچیس کو قتل کر دیا گیا ہے۔" میں نے اپنے چہرے پر ایک نہایت غمگین کیفیت طاری کر لی۔ سرحد کے اسٹیشن ویشی گراڈ پر ہم سب کو روک کر ہمارے اسباب کی تلاشی لی گئی۔ مگر چونکہ میرے کاغذات بالکل ٹھیک تھے۔ اس لئے مجھ سے کچھ تعرّض نہیں کیا گیا۔

شاہی پولیس کو خفیہ خبر مل چکی تھی کہ سراجیوو میں آرچ ڈیوک کی جان لینے کی سازش کی جا رہی ہے۔ لیکن ان اطلاعات کو بے بنیاد سمجھ کر طاقِ نسیان پر رکھ دیا گیا تھا۔

انقلاب پسند ناوش ریلوے سٹیشن اور ٹاؤن ہال کے درمیان جلوس کا منتظر تھا۔ اس نے شاہی گاڑی میں بم پھینکا لیکن وہ پھٹا نہیں اور آرچ ڈیوک نے نہایت سکون سے جھک کر اُسے اٹھا لیا۔ اور بازار میں پھینک دیا۔ جیسے یہ بھی اُن پھولوں میں سے ایک پھول تھا۔ جو اُس پر پھینکے گئے تھے۔ بم سڑک پر گر کے پھٹا اور چند تماشائی زخمی ہوئے لیکن جلوس کسی قسم کی رکاوٹ کے بغیر جاری رہا۔ ٹاؤن ہال میں رئیس شہر نے شہزادہ ولیعہد اور شہزادی کی خدمت میں خیر مقدم کا ایڈریس پیش کیا۔ مگر فرانسس فرڈیننڈ نے اس کا جواب نہایت غضبناک لہجہ میں دیا۔ "میں آپ کا اُس نازک احساس کے لئے شکریہ ادا کرتا ہوں جس کا اظہار آپ نے میرے خیر مقدم بذریعہ بم سے کیا ہے۔"

گاوریلو فرینز جوزف سٹریٹ کے کونے پر دریائے ملی آشکے کے بند کے پیچھے چھپا کھڑا تھا۔ ولیعہد کے شوفر کو ہدایت کی گئی تھی کہ وہ ٹاؤن ہال سے سیدھا محل کو چلا جائے۔ اور دیگر سرکاری گاڑیوں کے ساتھ فرینز جوزف سٹریٹ کے راستے سے جلوس کی شکل میں واپس جا رہی تھیں ہرگز نہ جائے۔ اگر وہ ان ہدایات پر عمل کرتا تو آرچ ڈیوک کی جان بچ جاتی اور ایسی صورت میں جیسا کہ آپ کا خیال ہے ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم برپا نہ ہوتی۔ لیکن اُس نازک ساعت میں شوفر اپنی ہدایت کو بھول گیا اور اُس نے اپنی گاڑی جلوس کی پیشرو گاڑی کے پیچھے لگا لی اور پھر اُس خونی کونے پر سے اس طرح مڑا کہ گاڑی اُس پتھر سے جا ٹکرائی جس پر گاوریلو کھڑا تھا۔ اب ایک ہی جست میں گاوریلو موٹر کے پائیدان پر تھا۔ اس نے اپنے ریوالور سے آرچ ڈیوک کے سینے کا نشانہ باندھا۔ لیکن ڈچیس اپنے شوہر کی حفاظت کے لئے آگے کو جھک گئی ایک خوفناک دھماکہ ہوا اور ڈچیس اوندھے منہ گر پڑی۔ گاوریلو نے دوسرا فائر کیا۔ آرچ ڈیوک بھی گاڑی کے فرش پر گرا۔ اور کھیل ختم ہو گیا۔

اور اب وہ گاوریلو اور اس کے ساتھیوں اور تمام سربی انقلاب پسندوں کو گرفتار کر کے پھانسی پر چڑھاتے یا آگ پر بھونتے۔ تقدیر کا لکھا پورا ہو چکا تھا اور ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم کا برپا ہونا ایسا ہی ضروری تھا جیسا اُس دن کے سورج کا غروب ہونا۔ نوشتۂ تقدیر مٹ نہیں سکتا۔

میلان شکوتا ۷ جون کو اپنی منتظر اور مضطرب بیوی کے پاس واپس آ گیا۔ وہ کسی قسم کا شک پیدا کئے بغیر اپنے گھر پہنچ گیا تھا اور یہاں آ کر اُس نے پہلا کام یہ کیا کہ باورچی خانے میں جا کر وہ صندوق جس میں یورپ کا امن وفن ہو چکا تھا آگ کی نذر کر دیا۔

اور یہاں میلان شکوتا کی کہانی جو اُس نے اُسی سادہ انداز میں سنائی تھی جیسی سادہ اس کی طبیعت تھی ختم ہو گئی۔

میں نے ایک لمبا سانس لیا اور پوچھا "تو کیا گاوریلو پرنسپ کے کنبے کے لوگوں میں سے کوئی زندہ بھی ہے"۔ "ہاں اُس کے دونوں بھائی اور اُس کی ماں۔ وہ آج کل یہیں جاحیش میں اپنے بڑے بیٹے جُود کے ہاں مقیم ہے۔ جُود آج کل ہماری پارلیمنٹ کا رکن ہے"

اور پھر ہم اسی صبح جُود پرنسپ کے مکان پر گاوریلو پرنسپ کے عزیزوں سے ملنے کے لئے گئے۔

جب ہم گھر میں داخل ہوئے تو درمیانی کمرے میں پرنسپ بھائیوں کی ماں اپنے چھوٹے لڑکے ڈاکٹر نکولس پرنسپ کے ساتھ بیٹھی تھی۔ وہ بڑے بھائی جُود کا جو خاندان کا سربراہ تھا انتظار کر رہے تھے۔

ماں کا پرنسپ، کہ یہ گاوریلو کی ماں کا نام ہے، ایک بوڑھی عورت ہے جس کے پُروقار چہرے پر عمر اور صدمات نے بہت سے نشانات ثبت کر دیئے ہیں۔ لیکن اُس کی آنکھوں کی گہرائی اور روشنی حیرت انگیز ہے۔ کہتے ہیں کہ گاوریلو کی آنکھوں میں بھی ایک ایسی دلکشی تھی۔ جو اپنی شدّت سے مقابل کو مسحور کر دیتی تھی۔ بڑھیا کا چہرہ اس صحت مند کیفیت کا آئینہ دار ہے جو دیہات کی زندگی ہی پیدا کر سکتی ہے۔ وہ ایک سفید لبادے میں ملبوس تھی جب میں قہوے کی تین چار پیالیاں ختم کر چکا تو میں نے اُس سے التجا کی کہ وہ مجھے گاوریلو کی کچھ باتیں سنائے

"گاوریلو! میرا گاوریلو" اور یہ نام لیتے لیتے اس کے چہرے پر اس نوجوان ماں کے چہرے کی کیفیت طاری ہو گئی جو اپنے ننھے کی باتیں کر رہی ہو"۔ "ہاں وہ اس سانحے کے وقت صرف اُنیس برس کا تھا۔ وہ ایک بہت اچھا لڑکا تھا۔ بیک وقت بے حد نرم اور بے حد گرم" یہ کہہ کر اُس نے اپنی آنکھیں کمرے کے ایک تاریک گوشے کی طرف اُٹھائیں اور میں نے دیکھا کہ وہاں ایک بڑے فریم میں گاوریلو کی تصویر آویزاں تھی۔ وہ بیٹھا ہوا تھا اور اُس کے ہاتھ میں ایک کتاب تھی اُس کے نقوش میں کچّی عمر کی تخیّل پرستی صاف جھلک رہی تھی۔ اگرچہ اُن سے کسی خاص شخصیّت کے آثار ناپید تھے۔ مجھے اس کا چہرہ اُس ہیرو کے لئے بعید موزوں معلوم ہوا جو محض ایک عمل۔ ایک عظیم الشان خیال کی تکمیل کے لئے عوام کے گروہ سے نکلتا ہے اور اپنے پُراسرار فرض کی انجام دہی کے بعد فوراً تاریکی میں چلا جاتا ہے۔ لیکن کیا میں ٹھیک سمجھ رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں سے تو کسی طرح کی بے رحمی عیاں نہ تھی۔ بلکہ ان میں ایک عجیب ملائمت تھی اور ایک ایسا الم جھلک رہا تھا جو شاید اُس کی جواں مرگی کی غمّازی کر رہا تھا۔

ہم قاتلوں کی نسبت عجیب عجیب تاثّرات رکھتے ہیں لیکن شاید یہ ہم نے کبھی نہیں سوچا کہ کوئی قاتل نرم دل۔ نیک اور تخیّل پرست بھی ہو سکتا ہے۔ ہمیں یہ بات بھولنی نہیں چاہئے کہ ایک خاص قسم کے بے رحم دھیمے پن اور ملائمت سے ایک ایسا یقین پیدا ہو جاتا ہے جو روح کے گرد اسی طرح لپٹ جاتا ہے جیسے ایک نرم ہاتھ ایک سیب کے گرد، اور اس یقین سے دنیا کے شدید ترین عمل کی پیدائش ممکن ہے

"گاوریلو" ماں کا پرنسپ نے پھر کہا "تم مجھ سے اُس کی نسبت کیا سننا چاہتے ہو۔ ایک عرصے سے وہ میرا اور صرف میرا نہیں رہا تھا۔ اب تو بے شمار لوگ اُس کے دعوے دار ہیں اور بہت سے تو اُسے اس طرح اٹھائے پھرتے ہیں جیسے ایک قومی نشان کو۔ اس کی زندگی ہی میں کتابوں اور رفیقوں نے اُسے مجھ سے چھین لیا تھا۔ پھر قید خانے نے اور اب قوم نے اُسے لے لیا ہے۔ اے کاش اس کی روح کو آرام اور چین نصیب ہو"۔ اور اس نے اپنے ہاتھ ایک دیہاتی عورت کی طرح اپنے پیٹ پر رکھ لئے۔ وہ ہاتھ جن کی رگیں اب رسیوں کی طرح اُبھر رہی تھیں اور پھر یکایک مجھے خیال آیا کہ اگر یہ ہاتھ ننھے گاوریلو کو اس کے پالنے میں نہ تھپکتے اگر یہ عورت اپنے پیٹ میں وہ بچہ نہ لئے پھرتی جو بعد میں گاوریلو پرنسپ بنا اور اگر وہ اپنے پہلے دو لڑکے جن کر بانجھ ہو جاتی تو شاید جنگ عظیم کے قبرستانوں میں ایک کروڑ قبروں پر چوبی صلیبیں نہ گاڑی جاتیں۔

میں جانتا ہوں کہ یہ سب "اگر" بے معنی ہیں اور ماں کا پرنسپ بھی ان پر اس وقت سے پہلے بہت غور کر چکی ہو گی۔ جب اُس نے مجھ سے کہا "لیکن یہ میرا قصور نہیں تھا"۔ یہ فقرہ اس چھوٹی سی میز پر جو میرے اور اُس کے چھوٹے لڑکے ڈاکٹر پرنسپ اور شکوتا کے درمیان تھی ایک پتھر کی طرح پڑا۔ "اور ہاں ڈاکٹر پرنسپ" میں نے کہا "آپ اپنے بھائی کی

نسبت مجھے کچھ نہیں بتائیں گے"۔

"نہیں۔ میں کچھ نہیں بتا سکتا۔ مجھے بتانے کا کوئی حق نہیں میرا بھائی جو یہاں نہیں ہے اور یہ حق صرف اُسی کو پہنچتا ہے"۔

"میں اُن سے کب مل سکتا ہوں؟"

"میں بھی اُن کا انتظار کر رہا ہوں اور نہیں جانتا کہ وہ کب آئیں گے"۔

"کیا اُن سے کسی اور مقام پر ملاقات کی جا سکتی ہے"؟

"نہیں۔ وہ ہمیشہ سفر میں رہتے ہیں"۔

میں اُٹھ کھڑا ہوا اور اُن سے رخصت چاہی۔ مائکا پرنسپ ابھی تک اپنے ہاتھ گود میں رکھے کھوئی کھوئی سی نگاہوں سے اپنے سامنے کی طرف دیکھ رہی تھی۔

میں گاوریلو کے گھر والوں سے مل چکا تھا اور شکوتا سے بھی جو دنیا کے عظیم ترین المیہ کے پس منظر سے زندہ انسانوں میں سب سے بڑھ کر آشنا تھا، اچھی طرح باتیں کر چکا تھا۔ شکوتا گاوریلو کا گہرا دوست تھا اور اس نے سب کچھ جانتے ہوئے آج تک اپنی زبان نہیں کھولی تھی۔ میں نے اُن سات انقلاب پسندوں کی قبروں کی زیارت بھی کی جو قتل کی سازش میں گاوریلو کے شریک تھے اور میں نے عین اُس موقعہ پر زندگی کی بے پڑا آمد و رفت بھی دیکھی جہاں فرانسس فرڈی نینڈ گرا تھا اور اپنے ساتھ سارے یورپ کو لے گرا تھا۔

ان یادگاروں اور کہانیوں سے معمور تصوّرات کے ساتھ مجھے یوں محسوس ہوا کہ وقت کا پردہ پلٹ کر چوبیس سال پہلے کا منظر پیش کر رہا ہے۔ جون ۱۹۱۴ء کی اس تاریخی صبح کو قسمت کا پانسہ تین مرتبہ امن کے خلاف اور جنگ کے حق میں پڑا اور پولیس اور سازشیوں کی تین مسلسل غلط فہمیاں اور غلطیاں آرچ ڈیوک کو گاوریلو پرنسپ کے پستول کی زد میں لے آئیں۔ یہ پانسہ نہ صرف امن بلکہ عالمِ انسانیت کے خلاف پڑا تھا اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک غیبی اور اٹل طاقت جو دنیا کی تمام وزارتوں اور سلطنتوں سے بالاتر تھی، ایک عظیم الشان طاقت جسے ہم خدا کہتے ہوئے ہچکچاتے اور محض اتفاق کہنے سے انکار کرتے ہیں، فرڈی نینڈ کی موت کی خواہش مند اور جنگ کی طالب تھی۔

میں میلان شکوتا، مائکا پرنسپ اور حاجیش سے رخصت ہوتا ہوں۔ حاجیش، اس چھوٹے سے گاؤں سے جو ایک شاہراہ پر واقع ہے اور جس کی پتھریلی گلیوں میں کبھی گاوریلو گھٹنیوں چلتا تھا اور اس نازک سی آبشار سے جس کا سرود گاوریلو کے بچپن میں اُس کے اولین جذبات سے ہم آہنگ تھا اور جو ابد تک یوں ہی گنگنائے جائے گی۔

مترجمہ
صلاح الدین احمد

چارلس لطراش

اس مضمون کا عالمگیر کاپی رائٹ بحقِ مصنّف محفوظ ہے اور اس کی جزوی یا کُلّی نقل قطعی طور پر ممنوع ہے۔

رباعی

تیغِ افسردہ مسرت سے چمک اٹھی ہے
ہو کے بیتاب ترے مردہ کی نبض دھڑک اٹھی ہے
جب سے سامنے آیا ہے تو اے جانِ نظر
بن پیے تیرے تبسم سے مری روح مہک اٹھی ہے

باقی صدیقی

حوصلے

(خدا اور انسان)

تودۂ خاک تھی یکسر، تری دنیائے حیات!
خونِ دل سے، اِسے گلزار بنایا میں نے
اپنے افکارِ جمالی سے بسایا میں نے
روشِ خُلد کا محرم نہ تھا صحرائے حیات
ذوقِ تزئین سے بیگانہ تھی لیلائے حیات
نکہت و رنگ کا انداز بتایا میں نے
نغمۂ و حُسن کا اعجاز سکھایا میں نے
رشکِ صد طور و ارم بن گیا سینائے حیات!

تیری دنیا تھی محبّت سے سراسر محرُوم!
میں نے یہ دردِ حسیں، آکے سکھایا اس کو
کیفِ صہبائے غمِ روح بتایا اس کو
ورنہ یہ خاک تھی لذّت سے سراسر محروم!
آخری پردہ بھی اک روز اُٹھا ہی دوں گا!
تیری صورت بھی زمانے کو دِکھا ہی دوں گا!

اختر شیرانی

غزل

کون سمجھتا رازِ محبت صرف مقابل آنے سے
بات کھُلی شرما کر منہ پر آنچل کو سرکانے سے

کیفِ محبت حاصل ہو تو مے نوشی کی حاجت کیا
جن کو تو نے دیکھ لیا وہ دُور رہے میخانے سے

کیسے وہ بے تاب ہوئے تھے آج تلک حیرانی ہے
افسردہ رخساروں پر دو اشکوں کے بہہ جانے سے

میرے بے خود کرنے کو دو جام چھلکتے رہتے ہیں
آنکھیں ہیں یا ملا ہوا ہے پیمانہ پیمانے سے

بے تابانہ جوشِ جنوں میں شعلے پر سر دے مارا
شمع نے آخر خلوت میں کیا بات کہی پروانے سے

بیٹھا ہوں پھر راہ گذر پر ہائے بُرا ہو چاہت کا
قسمیں کھا کر توبہ کی تھی اُس کی گلی میں آنے سے

دونوں دل سرشارِ محبت وصل کی فکریں کون کرے
سب کچھ حاصل ہو جاتا ہے آنکھوں کے مل جانے سے

قصۂ مجنوں سُن کر دل پر چوٹ لگی، کیا یاد آیا
یہ افسانہ ملتا ہے کچھ سیفیؔ کے افسانے سے

سیفی نزگانوی

بڑیرے

(آباؤ اجداد)

سو برس سے زاید عرصہ گذرا جب کا ذکر ہے

حکومت پالی[1] کا پروانہ دربار میں گذرا کہ "دیوڑوں[2]" کا لشکر نتھو خاں کی سرکردگی میں گھس پڑا۔ لوٹ مار کی اور خاصہ کے ایک ہزار اونٹ مع ہزار بارہ سو دیگر مویشی کے سروہی[3] کی طرف ہانکے لئے جاتے ہیں۔ مقامی حکام روکنے سے قاصر ہیں۔ تدارک فرمائیں۔

دربار ہوا کھانے جاتے تھے سخت ہیں بہ جبیں ہوئے غضب ہے نہیں کہ "دیوڑوں" کی اور یہ ہمت کہ پالی تک دھاوا ماریں انتھو خاں اس سے پیشتر پانچ دفعہ مار کر نکل گیا۔ بہت ہی ناگوار خاطر گذرا۔ بائیں کو نظر اٹھی بہور سنگھ میبڑتیا[4] کھڑا تھا۔ کوئی تیس برس کی عمر۔ چھریرا فولادی بدن۔ طاقت اور ہمت میں شیر۔ پھرتی میں چھلاوہ۔ کانوں تک ڈاڑھی چڑھائے راٹھوری پینچ کی وہ بانکی پگڑی۔ ایسا جوان کہ دیکھا کیجئے۔ گندمی رنگ کھڑی ستواں ناک بڑی بڑی چمکیلی آنکھیں۔

دربار نے فرمایا "بہور یا"

"جو حکم" کہہ کر ہاتھ جوڑ کر آگے بڑھا۔ جھک کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ حکم کا منتظر۔

دربار نے کہا "سنا تو نے . . . . . یہ دیوڑے اونٹ لے گئے . . . . ."

بہور سنگھ نے کہا "ان داتا حکم ہو تو مار دوں"

دربار نے کہا "جا۔ جلدی جا اور دیکھ جس کا کھوج[5] میں پالا مارے وہی گاؤں تیرا۔"

"کھماں گھڑیاں[6]" جھک کر ڈنڈوت کرتے ہوئے بہور سنگھ نے کہا کہ کہنیا بھیرا مسکرا کر آگے بڑھا اور بولا کہ ان داتا اس بھڑوے کو مارنے میں بھی جاؤں گی . . . . بہور یا کو اکیلے ڈر لگا تو؟

دربار کو ہنسی آئی اور فرمایا "بہور یا۔ دیکھ اسے بھی لے جا اور جھگڑے[7] میں اسے ڈال دیجیو۔ کہ پڑیں چونڑوں پر دیوڑوں کی تلواریں گر مرنے نہ پائے۔"

"جو حکم باپ جی۔ چل کہنیا . . . . چل"۔

دربار تو چل دئیے اور بہور سنگھ نے سچ مچ کہنیا کو پکڑ لیا کہ لے جاؤں گا۔ وہ نکلا جو بھی تو نکالی بہور سنگھ نے تلوار اور سر کاٹنے کی دھمکی دی۔ قصہ مختصر اسی شام کو کہنیا سمیت سو آدمی لے کر تیز رو اونٹوں اور گھوڑوں پر روانہ ہو گیا۔

(۲)

تیسرے دن بہور سنگھ نے دیوڑوں کو جا لیا۔

دیوڑوں نے دوپہر کو ایک باغ میں کھانا کھایا اور ذرا آرام کیا۔ نتھو خاں نے دو تین میل پیچھے اپنے شتر سوار تعینات کر دئے تھے۔ ایک شتر سوار نے ہوا کی طرح پہنچ کر بہور سنگھ کے آنے کی بہت موقعہ سے خبر دی۔

چشم زدن میں سب کے سب تیار ہو کر بہور سنگھ کی آمد سے قبل ہی نکل گئے۔ گرفتہ اونٹوں کو پانی پلا کر پہلے ہی آگے بڑھا دیا تھا۔ بہور سنگھ اور اس کے آدمی باغ میں جو پہنچے تو میدان صاف تھا مگر جلدی میں دیوڑے اپنی جاجم چھوڑ گئے تھے۔ جاجم پر جانماز تھی اور اس پر ایک تسبیح۔ دشمن کی جاجم ہاتھ آنا بہترین شگون تھا۔ ایسے موقعہ پر اس سے بہتر شگون ناممکن اور پھر ویسے ہی بہترین مال غنیمت۔

دیوڑے دور نکل گئے تھے کہ پتہ چلا "جاجم" رہ گئی۔ ارے! اب

---

[1] ریاست جودھپور کا ایک ضلع [2] سروہی ریاست والے دیوڑے راجپوت ہیں جو راجپوتوں کی ایک اعلیٰ ذات ہے۔ [3] راٹھوروں کی ایک شاخ ہے یہی میڑتیے کسی زمانے میں مغلوں کی فوج کا خوفناک حربہ تھے۔ [4] میدان [5] وہ تعظیمی سلام جو صرف راجہ کو کیا جاتا ہے [6] جنگ

کیا ہو۔ ننھو خاں نے کہا کہ اونٹ رہیں چاہے جائیں۔ جاجم نہ جائے اس سے زیادہ منحوس بات کوئی نہیں کہ میری جاجم جاتی رہے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا۔ لہذا اونٹ تو چلتے کئے اور نصف جمعیت لے کر لوٹ پڑے۔ ادھر سے بہور سنگھ آگ بگولہ بنا آ رہا تھا۔

دونوں لشکر ایک دوسرے کے سامنے آئے ہیں کہ ننھو خاں نے دیکھ لیا کہ اب ٹکراتے ہیں۔ ننھو خاں کو اپنی قوت پر ایسا بھروسہ تھا کہ وہ چین کرانسر کو تنہا جنگ میں مار کر قصہ ختم کرتا تھا۔ لہذا ننھو خاں نے اپنے لشکر کو تو روکا اور خود صف سے نکل کر گھوڑا چمکا کر آگے بڑھا۔ اور ہاتھ اٹھا کر بہور سنگھ کے لشکر کو ٹکرانے سے روکا ہاتھ سے اس نے کہا۔ "ٹھہرو ٹھہرو"

بہور سنگھ نے دیکھا اور اپنے آدمیوں کو روکا اور خود دریافت حال کو آگے بڑھا۔ آہستہ آہستہ دونوں ایک دوسرے کے قریب آئے اور بہور سنگھ نے اب ننھو خاں کو دیکھا۔ کوئی چالیس بیالیس برس کی عمر مگر بہت طاقتور اور دوہرے بدن کا آدمی۔ کسا ہوا لوہے کا سا بدن۔ سینہ جیسے چکی کا پاٹ۔ ایک عجیب شان سے داڑھی چڑھائے اور مونچھیں جیسے بچھو کا ڈنک۔ گوند سے اس طرح کھڑی کہ معلوم دے برچھی۔ ایک گہرے زخم کا نشان پیشانی پر جس کو اچھی طرح ظاہر کرنے کے لئے پگڑی کا ایک پیچ قصداً دوسرے پر چڑھا ہوا تھا اور زخم کے ارد گرد اس کے حدود کو دور سے واضح کرنے کے لئے اس میں سُرمے کی تحریر۔ اسی طرح ایک زخم کا نشان ناک پر۔ اور ایک داہنی طرف رخسار پر تھا۔ جس کی پوری وسعت ظاہر کرنے کے لئے داڑھی کے بالوں کو گوند سے چپکا یا گیا تھا تاکہ نشان واضح رہے۔ دراصل مردوں کا زیور یہی زخم کے نشان تھے۔ ترچھی بانکی پگڑی۔ پھنسا ہوا تنزیب کا انگرکھا اور چوڑی دار پائجامہ گندمی رنگ اور کھڑا نقشہ ہاتھ میں برچھی لئے۔ چاروں طرف چیتے کی طرح دیکھتا ہوا۔ اس شان کے ننھو خاں تھے۔

ننھو خاں نے سو اونٹ کے بدلے جاجم واپس مانگی۔ بہور سنگھ نے مشکوک نظروں سے دیکھتے ہوئے تیور بدل کر کہا کہ اونٹ ہمارے سب واپس کر دو۔ اور جاجم لے لو اور چلے جاؤ۔ ورنہ ہم نے ویسے ہی تم کو آ لیا ہے۔

ننھو خاں نے بتایا کہ آدھی جمعیت ابھی اور ہے جو اونٹوں کے پاس ہے اور اونٹ ایسی جگہ گئے کہ دیکھنے کو بھی نہیں مل سکتے۔ اس کا جواب بہور سنگھ نے یہ دیا کہ ہماری تین ٹکڑیاں ابھی اور آ رہی ہیں بلکہ ایک ٹکڑی نے شاید آگے بڑھ کر راستہ کاٹ بھی لیا ہو اور اونٹ ڈھونڈھ لیں گے۔

ننھو خاں کے مخبر ہر چہار طرف لگے رہتے تھے۔ لہذا اس کو معلوم تھا کہ یہ خالی دھمکی ہے۔ لیکن جاجم وہ کسی طرح چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔

اونٹ کوئی چیز نہیں۔ جاجم جاتی رہی تو ہم حیثیتوں میں الگ ذلت ہوگی اور سرکار ہیں بدنامی علیحدہ۔ گر سب اونٹ دینا تیا مت۔ آدھے اونٹ کا سودا کیا کر اتنے میں کیا دیکھتے ہیں کہ کنبیا بیجڑا۔ جاجم اوڑھے ناچ رہا ہے۔ اور ایک دم سے جاجم بچھا کر اس پر بیٹھ گیا۔ دو چار جوتے اٹھا کر جاجم پر رکھ تالیاں بجاتا کھڑا ہو کر مٹک مٹک کر گانے لگا ؎

دارو بھریو ڑے سیسا رے۔
(شراب) (بھرے ہوئے) (شیشے)
جاجم ماتے دہریو۔۔ ڑے۔۔۔ رے۔۔۔
(پر) (دہرے ہوئے)

اور جوتوں کو شراب کا شیشہ قرار دے کر لگا سپاہیوں کو جھوٹ موٹ پلانے۔ یعنی دوڑ دوڑ کر مارنے۔

ننھو خاں نے یہ دیکھا تو اُن کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ غضب ہے نہیں کہ اُن کی جاجم پر اور ہیجڑا بیٹھے اور یہ حرکتیں کرے۔ مگر خیال مالِ غنیمت کا تھا ورنہ چشم زدن میں لڑائی شروع کر دیتے۔ نتیجہ یہ کہ ننھو خاں نے بھی سوچا کہ دشمن نے ویسے ہی آ لیا۔ جنگ میں ہار ہو نہ ہو اونٹ اور مویشی لے کر نکل جانا ناممکن۔ سودا برا نہیں ہے۔ ہزار اونٹ خاصہ کے دے کر جاجم لے لو اور باقی جو ہزار بارہ سو مویشی ہیں وہی مالِ غنیمت کافی ہے۔

اِدھر بہور سنگھ نے دیکھا کہ اونٹوں کا پتہ سرا نہیں۔ نہ معلوم کدھر اور کہاں ہیں۔ ویسے ملیں یا نہ ملیں لہذا مویشی نہیں تو نہ سہی سودا خوب ہے لہذا راضی ہو گیا۔

(۴)

ننھو خاں نے اونٹ منگوا کر حوالے کر دیئے اور وہ ادھر

روانہ ہوئے اور یہ ادھر۔

جانے کو تو دونوں چلے گئے لیکن ذرا دور جا کر سوچنے لگے نتھو خاں اور ان کے ساتھیوں کو مفت خدا ونت جانے کی کسک۔ ایک نے کہا کہ بہتر ہوتا اگر ہم لڑتے اور لڑ کر جاجم لے لیتے۔ دوسرے نے کہا بے کار ہوتا۔ تیسرا بولا جاجم تو ہاتھ آئی پر ہیجڑے کو سزا نہ دی۔ ایک نے کہا ہیجڑا قتل ہونا تھا۔ ایک اور بولا ہیجڑے کو قتل کون کرے ناک کاٹنا تھی۔ ایک اور صاحب کا خیال تھا کہ ناک تو غالباً اب بھی کاٹی جانا زیادہ دشوار نہ تھی۔ نتھو خاں بھی دانت پیس رہے تھے کہ واقعی ہیجڑا صاف نکل گیا اور اُس وقت خیال ہی نہ رہا۔

اب دوسری طرف کی سنیے۔

کنہیا ہیجڑے نے بہور سنگھ سے کہا "راناجی جب تو لڑنے سے ڈرتی تھی تو آئی کیوں تھی؟ چل تو سہی سوت نہ تیری ناک چوٹی کٹائی ہو تو میرا ذمہ۔"

بہور سنگھ نے ہنس کر کہا "بدمعاش ماروں گا تجھے۔ چپ رہ"

کنہیا چیخ کر بولا "یہ تو بتاؤ سکھی تم نے پٹھان کو جاجم کیوں دے دی۔ اے گوری تمہیں ڈر لگا تو مجھ سے کہا ہوتا گھوڑے کو مار جوتیاں چھین لیتی۔"

لوگوں نے ہیجڑے کی باتوں کو غور سے سنا۔ بہور سنگھ نے بھی غور کیا کہ ہیجڑا پھر بولا۔

"راناڈ سوچتی کیا ہے۔ چل تو سہی دربار میں کیسی جوتیاں پڑتی ہیں۔ تجھے یہ بنیوں کا سودا کرنے بھیجا تھا کہ لڑنے مارنے؟ ارے کوئی بنیا نہیں تھا جو تجھے بھیجا؟"

اب بہور سنگھ نے غور کیا۔ یہ واقعہ تھا کہ بنیوں کی طرح مول تول کر کے اونٹوں کا سودا کر لیا تھا۔ ہیجڑا بولا "یہ سودا تو میں بھی کر لیتی بلکہ پٹھان کی ڈاڑھی موچھ لاتی گھاتے میں کیوں تو نے راجپوت کے گھر کیوں جنم لیا؟"

اس کے بعد ہیجڑے نے کہا کہ جودھپور چل کر تجھے گود لوں گی۔ بہور سنگھ کا خون کھولنے لگا۔ بہور سنگھ اور اس کے ساتھی اب واقعہ کی اہمیت پر غور کر رہے تھے۔ یہ واقعہ تھا کہ کسی کی نکسیر بھی نہیں پھوٹی۔ چور دل کو بغیر مارے کیوں چھوڑا؟ اگر یہ سوال دربار میں کیا گیا تو کیا جواب دوں گا۔ مگر ہیجڑا تو سوچنے بھی نہیں دیتا تھا۔ اس نے دم کے دم میں بہور سنگھ کا نام سیٹھ بہورامل رکھ دیا۔ اور لگا کہنے کہ تلوار مانگنے کہ ہٹا دان چیزوں کو۔

بہور سنگھ نے جل کر سرسٹ کر کہا "کنکٹے تو اس وقت کہاں مر گیا تھا؟"

ہیجڑا بولا "بھابی تم پٹھان سے ڈر کیوں گئیں؟"

بہور سنگھ نے کہا "اب تجھے ماروں گا ...."

ہیجڑا بولا "کیا عورتیں سب مر گئیں ...."

بہور سنگھ مارے غصے کے سر دھن رہا تھا۔ وہ ہیجڑے کو قطعی مارتا اگر ہیجڑا حق بجانب نہ ہوتا۔ ہیجڑا بالکل سچ کہتا تھا۔ سوال یہ تھا کہ اب کیا کریں۔

ہیجڑا بولا کہ "ترکیب میں بتاؤں"

بہور سنگھ نے کہا "وہ کیا"

کہنے لگا "آؤ سب مل کے ناچیں"

بہور سنگھ بگڑا تو کہنے لگا کہ "آؤ ہم تم دونوں نتھو خاں سے بیاہ کر لیں۔"

اور بہور سنگھ نے غصہ میں حکم دیا کہ اس کی چوٹی پکڑ کر گھسیٹ لے جاؤ۔

بہور سنگھ کے لئے یہ ناممکن تھا کہ وعدہ خلافی کر کے دیوڑوں سے پھر جا لڑے۔ یہ ناممکن! دوسری صورت یہی تھی کہ لوٹ کر دیوڑوں کو جنگ پر راضی کریں اور جنگ کی کوئی جائز صورت نکالیں۔ اُس کو اُمید تھی کہ نتھو خاں کا بانکپن کام دے جائے گا۔ چنانچہ اونٹوں کو آگے بڑھنے کا حکم دے کر اپنی پوری جمعیت کے ساتھ لوٹ پڑا۔ اب کنہیا بہت گھبرایا۔ اس کو خیال بھی نہ تھا کہ واقعی ایسا ہوگا اور بہور سنگھ نے کہا کہ "تجھے تو چھوڑوں گا نہیں۔ جھگڑے میں تیرے چونڈا لال کرانا ہیں۔ کیسے چھوڑ دوں؟" اور ہیجڑا اسیر گیا، رونے لگا تو بہور سنگھ نے کہا کہ اس کی چوٹی پکڑ کر مارو جوتیاں اور زرہ کو بکتر کر کے اسے اونٹ پر ڈال کر لے چلے۔ چار ونا چار چلا کوستا پیٹتا۔

(۴)

پہلے تو نتھو خاں سمجھے کوئی اور دستہ آتا ہے لیکن جب بہور سنگھ معہ چند ساتھیوں کے صف سے نکل کر بڑھا تو اطمینان ہوا۔ نتھو خاں بھی چند ہمراہیوں کے ساتھ بڑھے۔ بہور سنگھ نتھو خاں کو دیکھ کر مسکرایا۔

"ٹھاکران ا...." نتھو خاں نے ہاتھ سے سوال کا اشارہ کیا۔

"کیا حکم ہے؟"

بہور سنگھ نے مسکراتے ہوئے گردن کھجاتے ہوئے کہا۔

"خان جی تم نے جاجم لے لی اور اس کے بدلے اونٹ دے دیئے۔ دے دیئے"

"یہ سودا تو کچھ بنیوں کا سا ہو گیا۔"

نتھو خاں فوراً تاڑ گیا کہ لڑائی مانگتا ہے اور اپنے قول صلح سے پھرنے کی ترکیب میں ہے۔ نتھو خاں کو گو خود جھگڑے کی ضرورت بھی مگر اس نے بے پروائی سے کہا۔

"ہو تو گیا۔"

بھور سنگھ نے بے پروائی سے کہا "ایک چیز لیتے نہ تم اچھے لگو نہ ہم۔ جاجم اور اونٹ دونوں چیزیں ہم دونوں میں سے کوئی ایک بھی لے جاتا تو اچھا تھا۔"

نتھو خاں نے کہا۔ "ہاں چاہیئے تو یہی تھا مگر خیر۔"

بھور سنگھ نے کہا۔ "خیر کیا لے جاؤ اونٹ بھی۔"

نتھو خاں نے مسکرا کر کہا۔ "ہماری طرف چارہ کی ویسے ہی کمی ہے ہم نے سوچا کہ چلو رہنے دو جلدی کیا ہے۔ ذرا مہینہ دو ایک چر لیں اچھا ہے ..... لے جائیں گے ہم آپ اطمینان رکھیں پھر کبھی جھپٹ لے جائیں گے۔"

بھور سنگھ نے کہا۔ "خان جی دیوڑے اور راٹھور ٹکرائیں اور یوں بنیوں کی طرح سودا کر کے چلے جائیں۔ کسی کی نکسیر بھی نہ پھوٹے!"

نتھو خاں نے سنجیدگی سے کہا۔ "دیکھو جی۔ ہم تو یہاں مُتصدی بن کر آتے ہیں۔ اہلکار ہیں ہم تو۔"

"کیسے اہلکار؟"

"اہلکار ایسے کہ ہم تو دیوڑوں کی لاگ باگ (بمعنی خراج یا ٹیکس) لینے آتے ہیں۔ بہادری دکھانے نہیں آتے۔ اپنے لیا اور چل دیئے۔"

لاگ باگ کا نام سنتے ہی بھور سنگھ کا راٹھوری خون کھول گیا اور اس نے چیخ کر کہا۔

"لاگ باگ.. کیسی لاگ!.. ہم سے! ارے ہم سے اور دیوڑے لاگ لیں۔"

نتھو خاں نے قہقہہ لگا کر کہا۔

"لاگ نہیں تو اور کیا ہے؟"

"چوری ہے چوری" چیخ کر بھور سنگھ نے کہا۔ "چوری ..... ہم تم سے جاجم بھی لیں گے ..... مویشی بھی ....."

نتھو خاں نے کہا۔ "اور اپنے صلح کے قول سے پھر جاؤ گے؟"

"ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں۔"

"پھر کیوں جھگڑتے ہو۔ جاؤ۔ ہم تم سے نہیں لڑتے۔ ہم ہارے اور پر مویشی لے کر جاتے ہیں۔ جیت ہماری ہے۔ ہم نہیں لڑتے۔"

"لڑنا تو پڑے گا" بھور سنگھ نے سر ہلا کر کہا۔

"ہم ہرگز نہیں لڑیں گے۔ تم اپنا قول توڑ دو نکالو کھانڈا .... شروع کرو لڑائی .... مگر یاد رکھنا ٹھاکران۔ میرے ساتھ اگنی کے بچے دیوڑے ہیں بھیل باغی نہیں ہیں۔ گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دوں گا۔"

"اور میرے ساتھ بھی میٹر بیٹے ہیں ...."

کنہیا ہیجڑا سنتا ہی تھا اور بڑا خوش ہوا کہ لڑائی نہیں ہو گی اور اس نے چاہا کہ مذاق میں بات اڑا دوں۔ لہٰذا جیسے ہی بھور سنگھ نے اکڑ کر کہا۔

"میرے ساتھ بھی میٹر بیٹے ہیں ....."

تو ہیجڑا بات کاٹ کر تالی بجا کر چیخ کر اپنے سینے پر ہاتھ ٹھونک کر مٹک کر بولا۔

"میٹر بیٹے ہیں ہم ..... خان جی دیکھ لو ہمیں۔ بھول میں نہ رہنا...."

نتھو خاں نے ایک قہقہہ لگایا اور بھور سنگھ خفیف ہو گیا اور اس نے جل بھن کر ہیجڑے کی طرف دیکھا۔ نتھو خاں نے بھی دیکھا کہ بھور سنگھ کو ہیجڑے نے کیسا خفیف کیا۔ ایسا کہ گفتگو کی گرمی معہ جنگ کے امکان کے غائب۔ بات رنگ پر آئی تھی کہ ہنسی میں اڑ گئی۔ ہیجڑے نے بھی بھور سنگھ کے تیور دیکھے اور اپنی غلطی محسوس کی۔ مگر غلطی کیا۔ اس کی تو کوشش تھی کہ جنگ نہ ہو۔ ادھر نتھو خاں نے واپسی کی ٹھانی اور اجازت چاہی تو بھور سنگھ بپھر گیا۔ کہنے لگا۔

"خان جی جاجم تو دیتے جاؤ۔"

نتھو خاں نے کہا۔ "ٹھاکران تم لڑائی مانگتے ہو!"

"ہاں"

"سنو کان کھول کر" نتھو خاں نے کہا۔ "پہلی بات تو یہ کہ آج جاجم کے سبب ہمارا شگون خراب اور تمہارا شگون اچھا ہے۔ دوسرے یہ جو میرے ساتھی ہیں ان کی جان سرکار نے میرے ہاتھ میں سونپی ہے یہ دیوڑے ہیں۔ اگنی کے بچے۔ ایک اشارے پر ابھی کٹ مریں ہیں

ل چمار

ان کو مفت میں کیسے مروا دوں۔ تیسرے یہ کہ ہمیں سرکار سے حکم ہے کہ کسی سے لڑو مت بلکہ مال لے کر نکل آؤ۔ کوئی روکے تو مار کر نکل آؤ ورنہ خود مت لڑو۔ ہم تو خالی میدان میں آئے اور اپنے مویشی لے کے چلے گئے۔"

"یہ بھی کوئی مردانگی ہے"

نتھو خاں نے کہا۔ "پھر وہی بات! سن لو کان کھول کر ہمارے پانچ سپاہی مریں اور ہم تمہارے مار ڈالیں پچاس سپاہی تو ہماری تعریف نہیں ہوگی بلکہ جواب طلب ہوگا کہ اپنے آدمی کیوں مرے۔ ہم مویشی لینے آتے ہیں۔ جو بل اور ہٹ[1] اور مردانگی دیکھنا ہو تو آجاؤ۔ کبھی سر وہی۔"

بہور سنگھ نے ایک آخری اپیل کی اور کہا "خان جی بل اور ہٹ تو ہمیں دیکھیں گے ورنہ ہمارے ساتھ ہیجڑا ہے۔ جاؤ تم ہم اس سے تالی پٹوائیں گے۔"

ہیجڑا تو قریب ہی تھا اپنا نام سنتے ہی مٹک کر تالی بجا کر نتھو خاں سے بولا۔

"گوری جاجم دے دو۔ اے ہے گوری .... گوری جاجم دے دو۔"

نتھو خاں کا یہ حال کہ گویا تو وہ بارود میں آگ دے دی۔ ویسے ہی کباب ہو رہے تھے کہ اس نے یہ حرکت کی۔ اس پر لگا قہقہہ۔

نتھو خاں نے بہور سنگھ سے ایک اور تجویز کی۔ وہ یہ کہ اب شام ہو رہی ہے۔ کل پر رکھو اور منگواؤ اونٹ۔ مگر شرط یہ ہے کہ ہم تم تنہا نپٹ لیں کیوں سپاہیوں کا خون ہو اور ہیجڑا اس کے عوض ہمیں دو۔"

بہور سنگھ نے کہا "تم کیا کرو گے۔ ہیجڑے کا؟"

"ہم اس کی ناک کاٹیں گے۔ یہ ہماری جاجم اوڑھ کرنا چا"

سر ہلا کر بہور سنگھ نے کہا "ناک نہیں مل سکتی۔ ہیجڑا سرکاری ہے۔ مگر ہاں چوتڑ کاٹ سکتے ہو۔"

"وہ کیسے؟"

"مرنے نہ پائے زخمی کر دو۔ مگر ہڈی بھی نہ کٹے۔ دربار نے کہہ دیا تھا"

"منظور ہے" نتھو خاں نے کہا "لاؤ اسے۔"

بہور سنگھ نے کہا۔ "امانت ...."

"امانت۔ امانت" نتھو خاں نے جواب دیا۔

[1] دیوڑوں کو اپنے بل اور ہٹ پر ناز ہے۔

بہور سنگھ نے مسکرا کر کہا۔ "چار آدمی جھپٹ کے لے لو۔ ہم لوگ جھوٹی تلوار چلائیں گے۔"

جب یہ طے ہو گیا تو ادھر بہور سنگھ نے اپنے آدمیوں کو سکھا دیا۔ ادھر سے چار چھ آدمی ایک دم سے ہیجڑے پر ٹوٹ پڑے۔ اور برچھیوں کی ڈنڈیوں سے مار پیٹ کر گھسیٹ لے گئے۔ خوب مصنوعی لڑائی ہوئی۔ "مارنا پکڑنا" کے سوا کچھ نہ ہوا اور ہیجڑے کو دیوڑے گھسیٹ لے گئے۔

طے یہ ہوا کہ سامنے گاؤں کے قریب پہاڑی کے دامن میں ایک باغ ہے وہاں رات گذاریں گے اور صبح مقابلہ ہوگا۔

(۵)

رات کو دیوڑوں نے ہیجڑے کو خوب نوچا پیٹا اور حقیقت بتائی کہ استاد تمہارے چوتڑ کاٹے جائیں گے۔ خود تمہارے دربار کا حکم ہے۔ ہیجڑے نے جو حقیقت سنی تو بے حد خوفزدہ ہوا۔ خوب رویا پیٹا مگر بیکار۔

صبح ہوئی۔ نتھو خاں کو فتح کی سولہ آنے امید تھی۔ بلکہ رنج تھا کہ ایسا بانکا جوان قتل کرنا پڑے گا اور واقعہ ہے کہ نتھو خاں کا اور بہور سنگھ کا مقابلہ بھی کیا۔ نتھو خاں کے مویشی اب محفوظ تھے۔ اور اتنے آگے پہنچ چکے تھے کہ کسی طرح ان کا تعاقب ممکن نہ تھا۔

فریقین نے "تلوار کے قبضے پر ہاتھ رکھ کر قول و قرار کیا۔ اونٹ ابھی آئے نہیں تھے مگر آ رہے تھے اور اسی کا انتظار تھا۔

نتھو خاں نے بہور سنگھ کو سمجھایا کہ دیکھو جوان مت مرو۔ میں نے تیرے ایسے کتنے جوان کاٹ کے ڈال دیئے۔"

بہور سنگھ نے کہا۔ "خان جی کاٹتے ہوں گے۔"

"کاٹتے ہوں گے" نتھو خاں نے کہا "تم اپنے آدمی گنو۔ دھولجی تمہارا۔ کیسا جوان تھا۔ فولادی خود پہنے تھا مگر میں نے کھانڈے سے ٹھوڑی تک چیر دیا اور وہ رنجی۔ سروہی چمکا تارہ گیا۔ مارا جو ہاتھ جنہو کا تو گھوڑے سے دو ہو کے آدھا ادھر آدھا ادھر گرا .... اور وہ تمہارا ہمنام چانپاوت[2] ..... وہ برچھی والا .... چندری اڑھا کر چوڑا پہنا کر چھوڑ دیا ...."

"مجھے بھی پہنا دو نا ...."

"آؤ .... ابھی لو۔"

[2] راٹھوروں کی ایک گوت ہے جو چانپاجی کی اولاد۔

"خان جی ابھی اونٹ نہیں آئے ہیں"۔

"اوّل تو برچھی سے تم مجھے مارے نہیں لیتے ہو اور اونٹ نہ بھی آئیں تو کیا ہے۔ آتے ہیں"۔

دونوں نے اپنے اپنے گھوڑے طلب کئے اور دونوں برچھیاں لے کر تیار ہو گئے۔

"خان جی چُنڈری کہاں ہے"؟

نتھو خاں نے کہا "تمہارے سر پہ آجائے گی۔ تمہیں کیا مطلب"؟

اور بہت کچھ بہور سنگھ نے دیکھا پر کہیں چُنڈری یا چوڑا نظر نہ پڑا اور نہ نتھو خاں نے بتایا کہ کیسے پہنا دے گا۔

دونوں نے اپنے اپنے گھوڑے فاصلے سے ایک دوسرے کی سیدھ میں سرپٹ چھوڑ دیئے اور برچھیاں اور ڈھالیں موقعہ سے تیار۔ مگر عین موقعہ پہ جبکہ سوار ٹکر لیتے نتھو خاں اپنا گھوڑا بجلی کی طرح چمکا کر بائیں کو بچا لے گیا اور کاوا دے کر دشمن کا تعاقب کیا۔ بہور سنگھ نے بھی گھوڑا موڑا اور دونوں پھر اسی طرح آئے مگر بجائے گھوڑے ملانے کے برچھیاں کھاتے فاصلے ہی سے نکلے چلے گئے کہ بہور سنگھ نے اپنا بالوترا نکالا اور چمکا کر باز کی طرح جھپٹ کر اس تُندی سے نتھو خاں پہ گرا کہ اس دفعہ بہور سنگھ کی برچھی سے بچنا نتھو خاں ہی کا کام تھا۔ نتھو خاں نے سچے دل سے تعریف کی "واہ ٹھاکران کیا کہنے ہیں۔ دوسرا جنم لیا ہے میں نے۔ واہ واہ کیا کہنا۔ تقدیر سے بچا ہوں"۔

اور سب ہی نے تعریف کی کیا دوست کیا دشمن کمال کے سب ہی قدر دان تھے۔ ہیجڑا اس فکر میں تھا کہ نتھو خاں کی خوشامد کرے لہٰذا وہ تالی پیٹ پیٹ کر بہور سنگھ پر چوٹیں کر رہا تھا۔

ایک دفعہ پوری رفتار سے دونوں گھوڑے جو سرپٹ آئے ہیں تو سواروں نے اپنے برچھے تولے اور جھک کر جو گھوڑے ملائے ہیں تو ایک دم سے سب نے دیکھا کہ نتھو خاں کا گھوڑا بائیں کو جھک کر عین موقعہ پہ اس خوبصورتی سے اُڑا ہے کہ بہور سنگھ اپنی تیزی میں خالی نکلا چلا گیا لیکن عین موقعہ پر نتھو خاں اور بہور سنگھ کے برچھوں کی سنائیں لڑ چکی تھیں اور لڑنے کا کھٹکا سب نے سنا اور اسی کھٹکے کے ساتھ ایک پھڑپھڑاہٹ کے ساتھ رنگ برنگی چُنڈری نیزے کی جھڑپ سے نکل کر گیند کی طرح بہور سنگھ کے منہ پر پہنچی ہے کہ ہوا سے پھیل کر سر پہ ڈھک گئی۔ ایسے کہ بہور سنگھ جو نیزہ بلند کئے نکلا ہے تو چُنڈری اوڑھے!

ایک غلغلہ دیوڑوں کے لشکر سے بلند ہوا۔ جوانوں کی حلق پھاڑ آواز اور ڈھال پر تلوار مار کر ایک نعرہ مارا سب نے۔

"آدھ پتیاں سر چوندری۔۔۔۔۔ چوندری!

آدھ پتیاں سر چوندری۔۔۔۔"

اور ہیجڑا بھی بہور سنگھ کے گھوڑے کی طرف تالی بجاتا مٹکتا تھرکتا دوڑا چلاتا ہوا۔

"گوری گھونگٹ کھولو۔۔۔۔ گوری گھونگٹ کھولو۔۔۔۔"

اور بہور سنگھ نے خفیف ہو کر جو منہ پر سے چُنڈری کو الگ پھینکا ہے تو ایک تو دیوڑوں کا "آدھ پتی" کا طعنہ اور دوسری طرف خود اپنے ہیجڑے کی تالی اور ستم پہ ستم کہ برچھی والے ہاتھ کی کلائی میں ایک چوڑا بھی اٹکا ہوا تھا جو اتنا ڈھیلا تھا کہ برچھی کی ڈانڈ پر سے ہو کر کلائی میں آ پھنسا جھنجلا کر اس نے چوڑا الگ پھینکا۔ نتھو خاں کے کمال کا قائل ہو گیا اور واقعی ایک شعبدہ سا تھا کہ چوڑے کو اپنی برچھی سے دشمن کی برچھی میں پہنا دیا اور ساتھ ہی چُنڈری کی گیند سی منہ پر اسی برچھی والے ہاتھ سے ایسے ماری کہ پھیل کر سر پر پڑ گئی۔

بہور سنگھ کا رہا سہا تھوڑی خون کھول گیا اور سب سے زیادہ غصہ اُسے ہیجڑے پر آیا۔ اس نے گھوڑا بڑھا کر ہیجڑے کو نیزے کی ڈانڈ سے مارا کہ وہ منہ کے بل چیخ کر گرا۔

نتھو خان بھی جلے ہی بیٹھے تھے۔ انہوں نے بھی اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ "کاٹ لو چونرٹ" یہ کہنا تھا کہ دو چار آدمی جھپٹ پڑے اور تلواریں سونت کر مارنا جو شروع کیا ہے تو بیچ میں ہیجڑے کو کاٹ کر ہی ڈال دیا۔ اس چپقلش میں ہیجڑے کی ایک انگل بھی کٹ گئی اور چونرٹ تو بالکل ہی قیمہ ہو گئے۔ بہور سنگھ کے آدمی اُدھر اٹھا کر چلے ہیں کہ ادھر بہور سنگھ نے تن کر رکابوں پہ کھڑے ہو کر کہا "مجھے آدھ پتی کون کہتا تھا۔ ذرا پھر تو کہنا"۔

نتھو خاں نے اپنا برچھا ملازم کو دے دیا تھا اور دوسرا منگایا تھا اس لئے کہ یہ نیزہ خاص چُنڈری کے شعبدہ کا تھا۔

نتھو خاں نے تیور پہ بل ڈال کر کہا "جھگڑا مجھ سے ہے لہٰذا میں نے کہا سمجھو۔۔۔۔"

ــــــــ

آدھ پتی۔ آدھا پتی یعنی نصف شوہر یعنی نامرد یا بزدل۔

"ذرا پھر تو کہو" بہور سنگھ نے کہا۔

نتھو خاں نے اشارہ کیا کہ ایک جوان نے ذرا آگے بڑھ کر پھڑک کر اپنی ڈھال پر زور سے تلوار مار کر کہا۔

"ادھ[1] پتیاں سر چوندری سے راٹھوراں۔"

سر چوندری ...... آمیڑ تیا سر چوندری"۔

اور "آمیڑ تیا" اُس نے بہور سنگھ کی طرف اشارہ کرکے کہا۔

بہور سنگھ کے لئے برداشت ناممکن تھی۔ آگ بگولہ ہو گیا اور انتہائی غیظ و غضب کے ساتھ اُس نے اپنے گھوڑے کو بجلی چھوا دی اور تڑپ کر چلا اُس گستاخ جوان پر ایک نعرہ کے ساتھ۔

"رنڑ بنکا[2] میڑ تیا!"

ادھر نتھو خاں بھی تیار ہی تھا۔

"بل ہٹ ...... بل ہٹ بنکا دیوڑا[3]!"

کا نعرہ مار کر تلوار ہاتھ میں اُس نے جھپٹ کر بہور سنگھ کا راستہ کاٹا۔ بہور سنگھ سپاہی کو چھوڑ کر سیدھا نتھو خاں پر جھک پڑا۔ نتھو خاں کے پاس برچھی نہیں تھی۔ لہٰذا بڑی صفائی سے گھوڑے کو ہٹا کر وار خالی دیا۔ بہور سنگھ غیظ و غضب میں آگ ہو رہا تھا اُس نے بھی اپنا برچھا پھینک دیا اور تلوار سونت کر وہ پھر نتھو خاں پر گرا۔ نتھو خاں نے اپنا گھوڑا پھرا کر بچایا اور زور سے چیخا "میرا گھوڑا کٹ جائے گا ....." یہ کہتا ہوا وہ گھوڑے سے کود پڑا۔ بہور سنگھ بھی گھوڑے سے کود پڑا اور دونوں پینترا بدل کر سامنے آئے۔

نتھو خاں نے کہا "میں اپنے اس گھوڑے پر تلوار سے نہیں لڑتا۔ یہ خاص نیزے کی لڑائی کا گھوڑا ہے"۔

بہور سنگھ نے کہا۔ "خان جی زندہ بچے تو نیزے سے جی بھر کے لڑ لینا"۔

اور یہ کہہ کر ایک ایسا وار کیا کہ دوست دشمن سب کے منہ سے تعریف نکلی۔ مگر خان نے بھی خوب بچایا۔ گو تلوار شانہ چاٹتی چلی گئی اور نتھو خاں کو معلوم ہو گیا کہ یہ چھریرے بدن کا راجپوت معمولی سپاہی نہیں ہے۔ بہور سنگھ بجلی تھا اور اس کی تلوار بھی بجلی کی طرح چمکتی تھی۔

تھوڑی دیر تک لڑائی ہوتی رہی۔ نتھو خاں نے کئی وار کئے مگر بہور سنگھ نے یا تو ڈھال پہ روک لئے یا خالی دیئے۔ کوئی جوابی وار نتھو خاں کی طرف سے نہیں ہوا تھا کہ نتھو خاں نے اپنی تلوار پھینک کر کھانڈا سنبھالا اور اپنے زبردست شانوں کو جنبش دے کر کہا۔

"بہور جی یہ وہی کھانڈا ہے جس سے میں نے دھولجی کو تھوڑی تک چیر دیا"۔

بہور سنگھ نے تمسخر آمیز قہقہہ لگایا اور کہا "خان جی پرانی باتیں چھوڑ دو لاؤ جو کچھ پاس ہے"۔

اور نتھو خاں نے اپنے طاقتور ہاتھوں سے اپنا زبردست کھانڈا تولا اور آگے سرکنا شروع کیا۔

"بل ہٹ ...... بل ہٹ ....." کا نعرہ زبان پر اور آہستہ آہستہ کھانڈے کا پینترا بدلتا نتھو خاں بڑھا اور بہور سنگھ اس تاک میں کہ کھانڈے کا وار خالی جائے تو سر ہی چمکا جاؤں۔

اسی طرح گھاتیں ہوتی رہیں نتھو خاں بھلا ایسا اوچھا وار ہی کیوں کرتا کہ کھانڈا زمین پر آئے۔ وہ جانتا تھا کہ اگر ایسا ہوا تو میڑتیا چوٹ کر جائے گا۔ لہٰذا وہ ایسا سچا وار کرنا چاہتا تھا کہ کم از کم ڈھال پر تو پڑے۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر ذرا بھی اوچھا وار کیا تو اس کا مقابل بجلی کی طرح کوند کر نکل جائے گا۔

نتھو خاں نے بل ہٹ ...... بل ہٹ ..... کا وظیفہ پڑھتے پڑھتے ایک دم سے وُرک کر "بل ہٹ بنکا دیوڑا" کے نعرے کے ساتھ مارا جو ہے دو ہتڑ کھانڈے کا تو بہور سنگھ نے ڈھال پر روکا۔ کس زور سے کھانڈا ڈھال پر گرا ہے کہ ڈھال کو ٹین کی طرح کاٹ کر کڑا توڑ کر خود کی کناری کاٹ کر پیشانی پر ضرب دے گیا۔ ایسا کہ ضرب کے دھکے سے بہور سنگھ کی آنکھوں تلے اندھیرا آ گیا اور ڈھال کھانڈے میں پھنسی ہوئی چلی گئی۔ "بل ہٹ بنکا دیوڑا" گرج کر نتھو خاں نے کہا اور دو ہتڑ تان کر آگے سرکنے لگا۔ ڈھال اُسی طرح کھانڈے میں پھنسی ہوئی۔ جوں کی توں! نتھو خاں نے دوسرے وار کی تیاری کی ہے کہ بہور سنگھ کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ مگر اس کے ساتھی نے دوسری ڈھال فوراً دے دی۔

[1] بزدلوں کے سر پر چُندری اور راٹھوروں کے سر پر چیڈری اور اس بیٹھنے کے سر پر چُندری۔ [2] راٹھوروں کے پرچم کی تحریر ہے۔ راٹھوروں کا جنگی نعرہ رنڑ بنکا راٹھوڑ یعنی راٹھور رن کا بانکا ہے۔ [3] دیوڑوں کے پرچم کی تحریر یعنی۔ طاقت اور مند میں دیوڑا بانکا ہے۔ نتھو خاں دیوڑوں کے نوکر تھے اس لئے دستور کے مطابق انہی کا نعرہ مارتے تھے۔

ننھو خاں نے کھانڈا تول کر کہا "ٹھاکران دو کٹے دیتا ہوں ۔ چھوڑ دے سروہی ۔ ۔ ۔ ۔ ڈال دے سروہی ۔ ۔ ۔ "

بھور سنگھ کے ایک تازیانہ لگا اور اس نے سنبھل کر جو چوٹ کے ہاتھ شروع کئے ہیں تو خان جی کو کھانڈے سے اٹکی ہوئی ڈھال چھڑانا دوبھر ہو گئی اور پسپا ہونا پڑا۔

اسی طرح تھوڑی دیر لڑائی رہی کہ ننھو خاں نے لڑائی سے ہاتھ روکتے ہوئے کہا "ٹھاکران اب بس کرو" "کیوں؟"

"گھنٹہ بھر سے کھڑا ہوں تم کچھ بھی نہ بگاڑ سکے ۔ ایسے ہی لڑتے جاؤ گے برسوں ۔ مجھے تو فرصت نہیں ہے"

"واہ لڑ کیسے چکے؟ مار دیا مر دو ۔ ہار دیا جیتو ۔ نہیں لڑتے تو جاجم دے جاؤ ۔ اور نہیں کیسے لڑو گے؟ قول ہار چکے ہو ۔ ہیجڑے کے جوہڑ کاٹ لیئے"

ننھو خاں نے کہا "ٹھاکران میں تو اپنی طرف سے لڑ چکا ۔ اب بھی کھڑا ہوں ۔ لو مارو ۔ کوئی سال بھر تو رہتا نہیں ہوں گا ۔ اب تم اونٹ لے کے جاؤ اپنے ۔ ورنہیں تو ہم جاتے ہیں روک لو ہمیں"

"روک تو لیں گے اور ماریں گے تم کو"

ننھو خاں نے کہا "مارو تو" اور یہ کہہ کر اپنا گھوڑا لیا ۔ ادھر بھور سنگھ اپنے گھوڑے پر آیا اور خان جی کا راستہ کاٹتے بڑھا اور اپنے آدمیوں سے کہا کہ "لینا" اور ادھر ننھو خاں کے آدمیوں نے تلواریں نیام سے کھینچیں اور قریب ہی تھا کہ دونوں لشکر مل جائیں کہ پھر ننھو خاں نے چیخ کر کہا کہ "ٹھہرو ٹھہرو ۔ ۔ ۔ آؤ میں لڑتا ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ارے میر تنئے تیری جوانی پر رحم آتا ہے ۔ میں برچھی کا مرد ہوں ۔ میری برچھی سے کوئی نہیں بچا ہے ۔ کیوں اپنی جان دیتا ہے"؟

بھور سنگھ نے کہا "خان جی وہی کے دھوکے میں کیا سنت کھا لینا برچھی ہی سے شاید تمہاری موت بھی لکھی ہے ۔ ذرا ہوش کی باتیں کرو ۔ لو آؤ ۔ ۔ ۔ ۔ "

ننھو خاں نے کہا "اب تیری موت آئی ہے ۔ لے آ ۔ دو دفعہ تو حملہ کر لے ۔ تیسرے میں تجھے برچھی میں چھید لوں گا" "پہلے تو چندری اوڑھ ۔ لے آ ۔ ۔ ۔ "

اور دونوں نے اپنے گھوڑے کا وادے کر نکالے ۔ ادھر بھور سنگھ نے آگاہ کر دیا کہ اب کے چندری اڑھائی تو خیریت نہیں ہے ۔ اس کو پورا یقین تھا کہ وہ ہرگز یہ شعبدہ نہیں کرنے دے گا ۔ ادھر ادھر دوڑ کر بہت جلد گھوڑے آن ملے ۔ بھور سنگھ نے نشانہ باندھ کر ننھو خاں کے سینے میں بھالا مارا تھا ۔ مگر پھر پہلے کی طرح گھوڑا عین موقعہ پر جگہ سے اڑ کر بائیں کو پہنچا ۔ نیزوں کی ڈانڈیں کھڑکھڑائیں کہ دیوڑوں کے نعرے سے زمین ہل گئی ۔

"اوڑھ بنیان سر چندری"!

اور یہ واقعہ تھا کہ بھور سنگھ پھر پیشتر کی طرح چوڑا پہنے اور سر پہ چندری لئے چلے جا رہے ہیں اڑتے ہوئے ۔

خفیف ہو کر بھور سنگھ لوٹا اور اب ننھو خاں نے کہا "ارے میر تنیا دیکھ اب بھی خیریت ہے ۔ کیوں مرتا ہے"

بھور سنگھ نے کہا "خان جی بس اب کی جو تم اور چندری اڑھا دو تو میں تمہارا چیلا ہو جاؤں گا ۔ ۔ ۔ "

"قول ہارتا ہے؟" ننھو خاں نے کہا "پکڑے جاؤں گا ۔ ڈاڑھی مونڈھ کے اپنے ساتھ ۔ ۔ ۔ "

"عمر بھر تمہاری چاکری کروں گا" بھور سنگھ نے وعدہ کیا ۔

"اچھا آجاؤ" ننھو خاں نے کہا ۔

اور دونوں بہادر پھر اپنے گھوڑوں کو گھما کر لائے ۔ بھور سنگھ کو تڑاناپ تول کر حملہ کرنا تھا اور تین چار دفعہ وہ گھوڑا بچا کر نکال لے گیا کہ ایک دفعہ موقعہ سے اس نے سیدھ باندھ کر اور نیزہ تول کر پوری رفتار سے حملہ کیا ۔

ننھو خاں تیار ہی تھا لیکن جیسے ہی گھوڑے چلے ہیں ننھو خاں کے گھوڑے کا پچھلا پیر ایک سوراخ میں ایسا پھنسا کہ گھوڑے نے سکندری کھائی اور وہیں کا وہیں رہ گیا ۔ بھور سنگھ کا برچھا ننھو خاں کے سینے کے بیچوں بیچ میں لگا اور پشت کو توڑ کر نیزے کی پوری بانہہ نکل گئی ۔ ننھو خاں گھوڑے سے زخمی ہو کر نیچے گرا ۔ سینے میں دشمن کی برچھی پیوست ۔ ایک تہلکہ مچ گیا ۔ قریب تھا کہ فریقین میں تلوار چل جائے کہ سمجھدار لوگوں نے روک دیا ۔ بھور سنگھ گھوڑے سے کود کر ننھو خاں کے پاس آیا ۔

ننھو خاں نے فوراً اپنے آدمیوں سے کہا کہ بھور سنگھ کو جاجم دے دی جائے ۔

"ہرگز نہیں ، ہرگز نہیں" بھور سنگھ نے کہا "خان جی تم نہیں ہارے"

نتھو خاں نے خون تھوکتے ہوئے کہا۔ "ٹھاکران تو جیت گیا جاجم تیری ہے"۔

"ہرگز نہیں۔ ہرگز نہیں" پھر بہور سنگھ نے کہا۔ "خان جی تمہارے گھوڑے کا پیر پھنس گیا بھلا اس میں میری کیا جیت"۔

نتھو خاں نے دیکھا کہ جلد مرتا ہوں تو کچھ وصیت کی اور پھر اپنی قبر کے بارے میں پریشانی ظاہر کی۔ بہور سنگھ نے چھاتی ٹھونک کر کہا کہ یہ گاؤں اب دربار سے مجھے ملے گا۔ اور یہیں تم کو رکھوں گا اور مرتے ہوئے پٹھان نے اپنے شاہ زور مگر بردست کمزور ہاتھ سے اپنی پگڑی اُتار کر کہا کہ ..... "بھائی ....."

اور بہور سنگھ نے سر جھکاتے ہوئے کہا ..... "بھائی ... بھائی" اور اپنی پگڑی اتار کر مرتے ہوئے خان کے سر پر رکھ دی اور خان کی پگڑی اپنے سر پر رکھ لی۔ بہادر مرہٹے کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ جب اُس نے مرتے پٹھان کے گلے میں باہیں ڈال کر سینے سے لگایا۔ علیحدہ جو کیا ہے تو پگڑی بدل[1] بھائی کی روح پرواز کر چکی تھی۔

(۶)

اور قریب ہی کے گاؤں میں آج بھی دیکھ لو۔

دیکھ لو کہ پہاڑی پہ چھوٹی سی گڑھی ہے اور نیچے مختصر بستی۔ اور بستی میں ایک پختہ مزار ہے۔ جس پر شام کو جاگیردار کے خرچ سے چراغ روشن ہوتا ہے۔ ارجن فقیر کے پردادا کو قرآن خوانی کے لئے جاگیر کی طرف سے پچاس بیگھے معافی ملی تھی جو اب بھی اس کے قبضے میں ہے مگر قرآن پڑھنا ارجن جانتے نہیں لہذا اب صرف خدمات چراغ بتی رہ گئی ہیں۔ اور حقوق میں ناریل جو کوئی سہاگن چڑھائے یا دستور کے چڑھاوے جو قلعہ سے آئیں۔

اور جاگیردار جب ادھر سے نکلتا ہے تو دونوں ہاتھ جوڑ کر جھک کر مزار کو تعظیم دے کر جاتا ہے اور کوئی پردیسی ادھر سے گذرتا ہے اور پوچھتا ہے کہ یہ قبر کس کی ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ یہ قبر ٹھاکر صاحب کے "بڑیروں" کی ہے۔ ارے مسلمان ہاں پہلے ایسا بھی ہوتا تھا۔

عظیم بیگ چغتائی

[1] راجپوتوں میں پگڑی بدل بھائی سگے بھائی کی طرح ہوتا تھا۔

غزل

سُونی سُونی محفل ہے گُلرخوں کے جانے سے
چار پھول لے آؤں اُن کے آستانے سے

اس لئے ستاروں کو دردِ دل سناتا ہوں
دو جہاں پہ چھا جاؤ تم کسی بہانے سے

اب بدل گئی دنیا اب نیا زمانہ ہے
حُسن اب سبق لے گا عشق کے فسانے سے

اب کہاں چھپو گے تم اب تو چند دیوانے
ڈھونڈنے چلے تم کو موت کے بہانے سے

میں تو ہر بُنِ مُو کو چیر کر دکھا دوں گا
آپ خود نہ تھک جائیں میرے آزمانے سے

"عشق" بن کے آئے تھے تیرے آستانے پہ
"حُسن" بن کے جاتے ہیں تیرے آستانے سے

زندگی کا رونا کیا زندگی تو دھوکا ہے
اے ندیم بچ نکلو اس قمار خانے سے

احمد ندیم قاسمی

قطعات

محبت

شورشِ محفل سے کیوں رہتا ہوں دور؟ لطف آتا ہے خود آرائی میں کیوں؟
کوئی بتلاؤ خدا کے واسطے، مسکراتا ہوں میں تنہائی میں کیوں؟

جادو نوائی

آپ اپنے سے چھنا جاتا ہوں میں کس قدر بے خود ہوا جاتا ہوں میں
ہائے اس جادو نوائی کے نثار! زمزموں کے ساتھ اُڑا جاتا ہوں میں

یادِ ایام

ایک یہ دن ہیں کہ ساری ساری رات جاگتا رہتا ہوں نیند آتی نہیں
اور اک وہ وقت تھا یا دش بخیر! جب مری بیداریاں بھی خواب تھیں

محبت اور آنسو

محبت اے کہ تو دیوی ہے غم کی زُوئے جا اگر سفینہ ہو نازک تو یونہی کھیتے ہیں
ان آنسوؤں ہی سے زینت ہے تیرے عارض کی یہ اشک خوں ترے رُخ پر بہار دیتے ہیں

برسات کی راتیں

دلِ حسرت زدہ میں ایک شعلہ سا بھڑکتا ہے محبت آہیں بھرتی ہے، تمنائیں ترستی ہیں
کوئی دیکھے بھری برسات کی راتوں میں میرا حال گھٹا چھائی ہوئی ہوتی ہے اور آنکھیں برستی ہیں

برسات

فضا اُڈی ہوئی ہے اک چھلکتے جام کی مانند ہوا مخمور ہے، بادل غریقِ رنگ و مستی ہیں
مرا سر شار دل مجھ سے یہ کہتا ہے کہ اے اختر یہ بوندیں پڑ رہی ہیں یا تمنائیں برستی ہیں

اختر انصاری دہلوی

بچوں کی شرارتیں

اب سے کچھ سال پہلے تک لوگ نفسیات کا مطالعہ محض ایک علم کی حیثیت سے کرتے تھے۔ اس کا کوئی عملی مقصد یا فائدہ نہ تھا جس طرح ادب، شعر، تاریخ و فلسفہ کا مطالعہ تفریح یا دماغی قوتوں کی ترقی کے خیال سے کیا جاتا تھا، اسی طرح نفسیات کا مطالعہ بھی ایک نظری علم کی حیثیت سے ہوتا تھا۔ لیکن اب عموماً لوگ اس کی قدر اس کی افادی حیثیت کے لحاظ سے کرتے ہیں۔ عام زندگی میں عموماً اور تعلیم میں خصوصاً نفسیات کے مختلف پہلوؤں سے جو مدد لی گئی ہے اس کا اندازہ اور تصور بے حد مشکل ہے۔ بچوں کی تعلیم کو اُن کے لئے کس طرح زیادہ سے زیادہ دلچسپ اور مفید بنایا جاسکتا ہے؟ کس طرح تعلیم سے اُن کی ذاتی اور انفرادی قوتوں اور صلاحیتوں کو ترقی دی جاسکتی ہے؟ کس طرح انہیں آنے والی زندگی کے لئے زیادہ سے زیادہ مستعد اور تیار کیا جاسکتا ہے؟ کس طرح انہیں زندگی کے اُن راستوں پر لگایا جاسکتا ہے، جو اُن کے لئے فطری طور پر سب سے زیادہ مناسب اور موزوں ہیں؟ اس قسم کے تمام مسائل کا حل نفسیات نے پیش کر دیا ہے۔ لیکن اس کے علاوہ عام زندگی کی بھی بعض چیزیں ایسی ہیں، جن میں نفسیات کے اصول ہماری بے حد قابلِ قدر رہنمائی کرتے ہیں۔

بچوں کے متعلق عام خیال ہے کہ ان کی شرارتیں یا اُن کی اکثر اخلاقی کمزوریاں، اُن کی فطرت کا جزو ہیں۔ اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ بچوں کو اُن کے اخلاقی معائب اپنے والدین سے ترکہ میں ملتے ہیں اور وہ اچھی یا بُری فطرت لے کر ہی اس دُنیا میں آتے ہیں۔ خارجی اثرات کا اس میں بہت کم ہاتھ ہوتا ہے۔ ایسے لوگوں کے خیال کی تردید میں ایک دوسرا گروہ کہتا ہے کہ بچے اچھے اخلاق لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ ماحول اُن پر بُرے اثرات ڈالتا ہے۔ حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو ان دونوں گروہوں کا خیال صحیح نہیں۔ حقیقت میں بچہ نہ اچھی فطرت لے کر پیدا ہوتا ہے۔ نہ بُری اُس کی فطرت تو ایک سادہ تختی ہے۔ جس پر ماحول اپنے نقوش بناتا رہتا ہے اور ایک خاص وقت تک یہ نقوش کافی نمایاں طور پر نظر آنے لگتے ہیں۔

ماہرین نفسیات نے ماحول کے خارجی اثرات کا اندازہ کرنے کی کوشش کی ہے اور ربرٹ نے بچوں کی شرارتوں اور اُن کی اخلاقی کمزوریوں کی ۱۷۰ وجہیں لکھی ہیں۔ اس جگہ اُن سب کا ذکر کرنا غیر ممکن سا ہے۔ اس لئے ان میں سے چند ایک کا ذکر کیا جائے گا لیکن اِن اصلی وجوہ کا ذکر کرنے سے پہلے مختصر طور پر ان وجوہات کا بیان کر دینا بھی ضروری ہے، جو عام طور پر لوگ پیش کرتے ہیں۔

اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ اخلاقی کمزوریاں اُن بچوں میں زیادہ ہوتی ہیں، جن کے دماغوں میں فطرتاً کوئی خرابی ہو۔ اس خیال کی تردید میں وہ ہزاروں تجربات پیش کئے جاسکتے ہیں، جن سے پتہ چلتا ہے کہ دماغ کی خرابی اور اخلاقی کمزوری میں کوئی تعلق نہیں۔ بلکہ اکثر مثالیں موجود ہیں۔ جن میں ایسے بچے جن کے دماغ کچھ خراب تھے، اخلاقی نقطۂ نظر سے عام بچوں سے کہیں اچھے تھے۔ اس طرح کے تجربات کی بہت سی مثالیں سیرل برٹ کے مشاہدات میں موجود ہیں۔

اخلاقی خرابیوں کی ایک اور خاص وجہ سینما کو بتایا جاتا ہے اور لوگوں کا خیال ہے کہ سینما دیکھنے ہی کے لئے بچے چوری کرتے ہیں۔ جھوٹ بولتے ہیں اور اس طرح کی بعض دوسری اخلاقی خرابیوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ حالانکہ اس سلسلے میں بھی جو تجربات ہوئے ہیں وہ اس خیال کی تردید کرتے ہیں۔ اس لئے کہ انگلستان وغیرہ میں جہاں اتوار کے دن سینما نہیں ہوتے، اتوار کو اس طرح کی اخلاقی خرابیوں کی مثالیں زیادہ نظر آتی ہیں۔ اس لئے یہ کہنا غلط ہے کہ ان اخلاقی خرابیوں کی وجہ سینما ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ سینما بچوں کو بعض دوسری اخلاقی خرابیوں سے

بچاتا ہے۔ بہرحال یہ اور اس طرح کے بہت سے اسباب بیان کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں جو باتیں اور خارجی اثرات بچوں کی اخلاقی خرابیوں کے ذمہ وار ہیں۔ ان میں سب سے پہلا درجہ مفلسی کا ہے۔

عام طور پر مختلف قسم کی اخلاقی خرابیاں غریبوں کے بچوں میں زیادہ ہوتی ہیں۔ غریبوں اور امیروں کے بچے اپنی فطرتوں کے لحاظ سے یکساں ہوتے ہیں لیکن غریبوں کو اُن کی مجبوریاں ایسی باتیں کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ جن سے امیروں کے بچے محفوظ رہتے ہیں۔ اس لئے کہ انہیں مختلف طریقوں سے اپنی قدرتی ضروریات کے پورا کرنے کی آسانیاں حاصل ہیں۔ غریبوں کو اُن کی فطرت کچھ کرنے پر مجبور کرتی ہے تو اُن کی مفلسی سدّ راہ بن جاتی ہے۔ اس لئے یہ بچے اپنی فطری ضرورت کو پورا کرنے کے لئے کسی اخلاقی جرم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ چوری کرتے ہیں اور اس کا لازمی نتیجہ جھوٹ بولنا ہے۔

۲ غریبی ہی سے تعلق رکھنے والی ایک دوسری وجہ یہ ہے کہ جس گھر میں آدمی زیادہ ہوتے ہیں اور رہنے سہنے کی جگہہ کم وہاں کے بچوں میں بھی بہت سی اخلاقی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

۳ ایک اور خاص وجہ، جو غالباً دوسری وجہوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ اہم ہے، یہ ہے کہ جن گھروں میں لوگوں کے باہمی تعلقات اچھے نہیں ہوتے۔ اُن میں بچوں کے اخلاق بہت خراب ہو جاتے ہیں اور اس میں امیر غریب کسی کی قید نہیں۔ اگر ماں باپ میں ہمیشہ لڑائی جھگڑا رہے تو بچوں پر اس کا اثر لازمی طور پر بُرا ہوگا۔ اکثر اوقات گھر میں سوتیلی ماں یا سوتیلے باپ کے ہونے کا بھی بچوں پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے۔ اس طرح کے اکثر بچے ملیں گے جو محض محبت اور شفقت سے محروم ہو جانے کی وجہ سے اخلاقی جرایم کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس طرح کی مثالیں ہر شخص کو آسانی سے مل جائیں گی۔ جہاں بچوں کی اخلاقی کمزوری کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہیں۔

اور دوسری چیز جو ہندوستانی گھروں میں بہت عام ہے یہ ہے کہ بچوں کو کافی تنبیہہ نہیں کی جاتی۔ اُنہیں انتہائی لاڈ پیار سے پالا جاتا ہے۔ بعض ایسے بھی ہوتے ہیں جن پر کسی مجبوری کی وجہ سے تنبیہہ نہیں ہو سکی۔ مثال میں اس لڑکے کو پیش کیا جاسکتا ہے جو چوری کرنے کا بہت عادی تھا۔ آخر اس نے ایک دن جب ایک سائیکل چرائی تو وہ نفسیاتی ملاحظہ کے لئے لایا گیا۔ اس کے گھر کے حالات کا پتہ لگایا گیا تو معلوم ہُوا کہ اس کا باپ اُس کے بچپن میں ہی مرگیا تھا اور اس کی ماں ایک کمزور بوڑھی عورت تھی۔ جو کسی طرح بچے پر قابو نہ پاسکی اور اس لئے اس کی انتہائی آزادی نے اُسے خراب کر دیا۔

جس طرح تنبیہہ کی کمی بچوں کے لئے خطرناک ہے، اسی طرح اس کی زیادتی بھی بے حد مہلک چیز ہے۔ اس طرح کے سیکڑوں بچوں کی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جن کی اخلاقی خرابیوں کی ذمہ داری صرف اس وجہ پر تھی کہ ہر موقع پر اُن کے خوف کے جذبے کو بیدار کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ ایک نو برس کے بچے کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ رات کو اس طرح کے ڈراونے خواب دیکھتا تھا، جن میں ہمیشہ زہریلے سانپ اسے اپنے بدن پر لپٹے ہوئے نظر آتے تھے۔ جانچ پڑتال کے بعد معلوم ہوا کہ اس کا سوتیلا باپ اس کے ساتھ بہت سختی سے پیش آتا تھا اور یہ سانپ اُسی کی زہریلی شکل کا عکس تھے۔

جن گھروں میں بچوں سے بہت سختی کا برتاؤ کیا جاتا ہے وہاں عموماً بچے گھر سے بھاگنے کے لئے چوری کرتے ہیں۔ اس طرح کی ایک مثال پیش کی جاسکتی ہے۔ ایک مرتبہ ایک پندرہ سال کے لڑکے کو نفسیاتی معائنے کے لئے پیش کیا گیا۔ اس کا یہ جرم تھا کہ اس نے ایک نوٹ چرایا تھا اور یہ شاید اس کا پہلا جرم تھا۔ واقعات کا پتہ چلانے سے معلوم ہُوا کہ وہ لڑکا جس گھر میں رہتا تھا اُس کا یہ طریقہ تھا خواہ وہ بچہ کوئی قصور کرے یا نہ کرے۔ سوتے وقت اُسے ہنٹر سے پٹیا جاتا تھا اور اس حرکت کو بجا ثابت کرنے کے لئے کہا جاتا تھا کہ اگر لڑکے نے کوئی شرارت نہیں کی ہے تو ممکن ہے کہ آیندہ اس کے دل میں کبھی شرارت کرنے کا خیال آجائے اس لئے اُسے احتیاطاً پہلے سے سزا دے دینی بہتر ہے۔ ان سختیوں سے عاجز آکر اس لڑکے نے نوٹ چرایا کہ گھر سے بھاگ کر کہیں اور پناہ لے۔

تنبیہہ کی حد سے زیادہ سختی کا ایک لازمی جزو یہ بھی ہے کہ بچے کو اتنی تفریح نہ ملے جس کی اُسے فطرتاً ضرورت ہے۔ مثال کے لئے ایک سولہ برس کے لڑکے کو پیش کیا جاسکتا ہے۔ اس بچے کے والدین بہت غریب، سادہ مزاج اور معمولی آدمی تھے۔ یہ لڑکا بھی محنت مزدوری کرتا تھا۔ اس کے والدین اس سے اس کی کمائی کی پائی پائی لے لیتے تھے۔ اس لڑکے کی عمر کا تقاضا یہ تھا کہ اس کی جیب میں ہر وقت کچھ پیسے کھنکنے

رہیں کبھی وہ سینما جا سکے کبھی سگریٹ خرید کر پی سکے۔ لیکن جب اس
کی یہ خواہشات پوری نہیں ہوئیں تو اس نے چوری شروع کی۔ اور
یونہی کام چلاتا رہا۔

ایک اور وجہ بیکاری بھی ہو سکتی ہے یا ایسی ملازمت جو طبیعت
کے منافی ہو۔ مثلاً ایک لڑکے کا ذکر ہے کہ اس کی ماں نے عاجز آکر اُسے
طعنہ دیا کہ وہ کچھ کام نہیں کرتا اور مفت کی روٹیاں توڑتا ہے۔ لڑکے
نے نوکری تلاش کی۔ جب نہیں ملی تو کہیں سے کچھ روپے چوری کر لایا۔
اور ماں کو لا کر دیئے کہ یہ میری پہلے ہفتے کی مزدوری ہے۔

اسی طرح ایک سترہ برس کی لڑکی کا واقعہ ہے کہ جب وہ مدرسے
سے نکلی تو اس نے کہا کہ کسی گھر میں ملازمہ کا کام کروں گی۔ گھر والوں نے
اس کام کو ذلیل سمجھ کر اُسے ایک کارخانے میں نوکر رکھوا دیا۔ کارخانے
کی نوکری اسے بالکل پسند نہیں تھی۔ اس لئے اس نے ایک دن اُسے
چھوڑ دیا۔ لیکن وہ یہ بات گھر میں نہیں بتانا چاہتی تھی اس لئے اس نے چوری
کرنی شروع کی تاکہ گھر والوں کو نوکری چھوڑنے کا حال نہ معلوم
ہونے پائے۔

بچوں کی اخلاقی کمزوریوں کی جو خارجی وجہیں بیان کی گئیں ان
کے علاوہ بھی بہت سی وجہیں ہو سکتی ہیں۔ لیکن یہ بہت خاص خاص ہیں
اور قریب قریب سب ایسی ہیں جنہیں آسانی سے دور کیا جا سکتا ہے۔
لیکن ان خارجی وجوہ کے علاوہ، کچھ داخلی اسباب بھی ہیں، جن کا اس
جگہہ ذکر کر دینا ضروری ہے۔ صرف داخلی وجوہ کسی کی اخلاقی کمزوریوں
کے ذمہ دار نہیں ہو سکتے۔ انسان کا ماحول، اور اس کے بُرے اثرات
اُسے اسی صورت میں زیادہ متاثر کریں گے۔ جب اس میں خود کمزوریاں
موجود ہوں۔ مضبوط انسان ماحول کے اثرات کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ حقیقت
میں انسان ماحول کو بدلتا ہے۔ نہ کہ انسان کو ماحول۔ ماحول انسان کا
پیدا کیا ہؤا ہے، اور اس لئے اسے اس پر قادر ہونا چاہئے۔ اگر کسی صورت
میں ماحول غالب آجاتا ہے تو یہ انسان کی کمزوری کی دلیل ہے۔ اس
سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ بیان کر دینا بے محل نہ ہوگا ——

ایک چھوٹی لڑکی نے اپنے بھائی کی ناک دانتوں سے کاٹ کھائی۔ اس
کی ماں اس پر بہت خفا ہوئی اور کہا کہ شاید تیرے پیٹ میں شیطان
گھسا ہوا تھا جس نے تجھ سے ایسی حرکت کرائی۔ لڑکی بولی "نہیں۔ ممکن
ہے کہ شیطان نے میرے غصے کو ابھارا ہو لیکن نامی کی ناک کاٹنے کا
خیال بالکل میرا ہی ہے"

اس لئے کسی بچے کی کسی شرارت یا اخلاقی کمزوری کی صحیح وجہ
جاننے کے لئے، اُس کی دماغی کیفیتوں کا مفصل مطالعہ بھی ضروری ہے
خصوصاً اس کی ذہانت کی صحیح مقدار کا معلوم ہونا بے حد ضروری ہے
اس لئے کہ اول تو اس قسم کی حرکتوں پر کُند ذہن ہونے کا بھی اثر پڑتا ہے۔
اور عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ اس طرح کے جتنے بچے نفسیاتی معائنے کے
لئے لائے گئے، وہ کند ذہن ضرور تھے۔

کُند ذہن ہونے سے زیادہ، جو چیز اس قسم کی حرکتوں پر اثر ڈال
سکتی ہے۔ وہ کسی خاص جبلت کی انتہائی قوت ہے۔ خاص طور پر جنسی
جذبہ کی قوت کی زیادتی بہت سی اخلاقی بدعنوانیوں کی ذمہ دار ہوتی ہے
ایسے موقعوں پر سختی سے کام لینا کوئی اچھا علاج نہیں۔ کوشش یہ کرنی
چاہئے کہ فطری جبلت کے لئے نئی اور اچھی راہیں پیدا کی جائیں۔ اس
کے اظہار کے راستے میں رکاوٹ پیدا کرنا اور بھی مضر ہے۔

کبھی صرف ایک جبلت کی قوت نہیں، بلکہ مجموعی حیثیت سے
سب جبلتوں کی قوت مل کر بہت زیادہ تیز ہوتی ہے۔ مثلاً ایک سولہ
برس کی لڑکی ہر قسم کی اخلاقی بدعنوانی، جس کا تصور ہو سکتا ہے اور جو تصور
میں بھی نہیں آسکتی۔ کر چکی تھی۔ چوری، لڑائی جھگڑا، فحاشی، غرض ہر قسم
کے عیب اس میں شدت کے ساتھ موجود تھے۔ اس قسم کی مثالیں کم
ہوتی ہیں، اور ان کی اصلاح بھی قریب قریب ناممکن ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں بچوں کی غلط بیانیوں اور جھوٹ بولنے کی
عادت کا ذکر کر دینا بھی بے محل نہ ہوگا۔ اس لئے کہ ممکن ہے کہ لوگ
جھوٹ کو ہمیشہ کسی نہ کسی نفسیاتی اصول کے تحت میں لانے کی کوشش
کریں۔ بچوں کے جھوٹ کو ہمیشہ زیادہ شبہ یا خطرہ کی نظر سے دیکھنے
کی ضرورت نہیں۔ اس لئے کہ بچوں کے اکثر جھوٹ صرف تخئیل کا نتیجہ
ہوتے ہیں۔ چونکہ بچے حقیقت کی دنیا کا مقابلہ کامیابی اور اعتماد کے ساتھ
نہیں کر سکتے۔ اس لئے وہ اس کمی کو اپنے جھوٹ سے پورا کرتے ہیں۔ ان
کے جھوٹ میں اور افسانوں میں کوئی فرق نہیں۔ دونوں چیزیں کسی
بُری نیت سے نہیں کی جاتیں۔

بچے عموماً ایسے موقعوں پر بھی جھوٹ بول دیتے ہیں، جب
ان سے سوال کرنے والا سختی کا لہجہ اختیار کرتا ہے۔ خوف کی وجہ سے
غیر ارادی طور پر بھی جھوٹ منہ سے نکل جاتا ہے۔ اس قسم کے جھوٹ بھی

قابلِ ستائش نہیں کہے جا سکتے۔ لیکن ان کی ذمہ داری اکثر استاد یا والدین پر ہوتی ہے۔ اس لئے کسی بچے پر اس وقت تک کوئی الزام نہیں لگانا چاہیئے۔ جب تک اس کا پورا ثبوت نہ موجود ہو اگر بچے سے کچھ پوچھا گیا اور اس نے اس کا غلط جواب دے دیا اور سننے والا اس کی مناسب تردید نہ کر سکا تو اس سے بچے پر بُرا اثر پڑے گا اور وہ آیندہ بھی جھوٹ کو اپنے بچاؤ کا ایک یقینی ذریعہ سمجھ لے گا۔

ایک دوسری قسم کا جھوٹ جس کے بچے بہت عادی ہوتے ہیں۔ وہ ہے جس کے ذریعے سے اپنے کسی ساتھی کا عیب چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس سے جھوٹ بولنے والے کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا لیکن استاد اور شاگرد کے رشتے میں فرق آجاتا ہے اس لئے ایسے جھوٹ کو بھی جہاں تک ممکن ہو کم کرنا چاہیئے اور اس کا طریقہ یہی ہے کہ استاد یا والدین بچے سے شفقانہ تعلق رکھیں۔

ان جھوٹوں کے علاوہ، بچے واقعی اس طرح کے جھوٹ بولنے کے بھی عادی ہوتے ہیں، جن کا مقصد دھوکا دینا یا کوئی خاص فائدہ اٹھانا ہوتا ہے۔ ایسے جھوٹ بے حد خطرناک ہیں اور بچے کو ان کا عادی نہیں ہونے دینا چاہیئے۔ لیکن اس موقع پر بھی سختی سے کام نہیں لیا جا سکتا۔ اس لئے ضرورت ہے کہ جو والدین یا استاد بچوں کو واقعی سچ بولنے کا عادی بنانا چاہتے ہیں وہ اول تو انہیں کبھی دھوکا نہ دیں اُنکے سامنے جھوٹ کبھی مذاق میں بھی نہ بولیں۔ اور دوسرے یہ کہ اُن کے دل میں اپنی محبت اور اعتماد پیدا کریں۔

بچوں کے دل میں محبت اور بھروسہ پیدا کرنے کی ایک بہت عمدہ مثال انگلستان کے مشہور ماہرِ نفسیات ہومرلین کے ایک واقعے سے پیش کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس کے بیان کر دینے سے پہلے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ لین نے لٹل کامن ولتھ (ننھی جمہوریت) کے نام سے ایک ادارہ قائم کر رکھا ہے جہاں اس طرح کے بچوں کی تربیت ہوتی ہے اور لین بچوں کو انتہائی آزادی دے کر انہیں فطرت کے مطابق زندگی بسر کرنے کا موقع دیتا ہے اور ان کے دلوں میں اپنی طرف سے محبت اور بھروسہ پیدا کرتا ہے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ ایک لڑکا اس کے مدرسے سے بھاگ گیا۔ لین نے اس کا پیچھا کیا اور اسے پکڑ لیا۔ لڑکا اس سے پہلے اس بات کا عادی تھا کہ ہر ایسے موقع پر اس کے ہاتھ باندھ دیئے جائیں۔ اس لئے اس نے فوراً اپنے ہاتھ پھیلا دیئے لین مسکرایا اور اس کے ہاتھ میں ایک سونے کا سکہ دے دیا۔ لڑکا کسی قدر سہم کر بولا کہ "یہ کس لئے؟" لین نے محبت بھرے لہجے میں کہا "پیدل جانے کی ضرورت نہیں ریل پر اپنے گھر جاؤ۔" وہ لڑکا اسی رات لین کے مدرسے میں واپس آگیا۔

اس لئے ہر جگہ ضرورت ہے کہ استاد اور والدین محبت کے جذبے کو کام میں لا کر بچوں کی کمزوریاں دور کرنے کی کوشش کریں اور اس لئے یہ بھی ضرورت ہے کہ ہومرلین کے کامن ولتھ جیسے ادارے ہر جگہ قائم کئے جائیں۔ اس سے ملک کا ایک اہم مسئلہ حل ہو سکتا ہے۔

سیّد وقار عظیم

غزل

کتنی پُر کیف رات تھی وہ بھی
مست تھا میں بھی، چاند بھی، وہ بھی

ہر ستارہ کہ ماہئ بے آب
ماہئ موجِ بے خودی، وہ بھی

ساز تھا چاند یا کہ چاند تھا ساز
راگنی تھی کہ چاندنی، وہ بھی

جاں لبوں پر تھی، دل تھا پلکوں پر
یاد ہے اپنی زندگی وہ بھی

خوں برستا تھا ہر سرِ مُو سے
خوں کہاں تھا تھی آگ ہی، وہ بھی

شام وہ شام اور سحر وہ سحر
موجِ بے تاب وہ بھی تھی، وہ بھی

کشتِ شادابِ آرزوؤں کی
برقِ آپ اپنی بن گئی وہ بھی

جھلملاتی ہے ایک شمعِ خیال
ایسے جیسے کہ اب بجھی وہ بھی

زمزمہ ہے کہ مرثیہ تنویرؔ
ایک ہچکی ہے آخری، وہ بھی

روشن دین تنویرؔ

غزل

رات پھر آئے گی کبھی وہ بھی — دل تھا پہلو میں اور تھی، وہ بھی

دل تو پہلے ہی کھو چکے تھے ہم — جان باقی تھی، لو، چلی وہ بھی

شمعِ امید اک سہارا تھی — کوئی دم جل کے بجھ گئی وہ بھی

بزمِ جمشید سے یہ جامِ سفال — ہاتھ آیا ہے اور تہی وہ بھی

میری پُر درد داستانِ الم — سُن کے رویا کئے سبھی، وہ بھی

تُو مری اور میں ترا ہوتا — اِک یہ خواہش تھی اور کبھی وہ بھی

اُف قیامت پہ کیا قیامت ہے — وہ نظر اور جُھکی جُھکی وہ بھی

رات محفل میں ہو گیا محشر — ساتھ ساتھ اُٹھے درد بھی، وہ بھی

موت تو آ گئی ہے اے شاہد
کاش آ جائے اِس گھڑی وہ بھی

مسعود شاہد
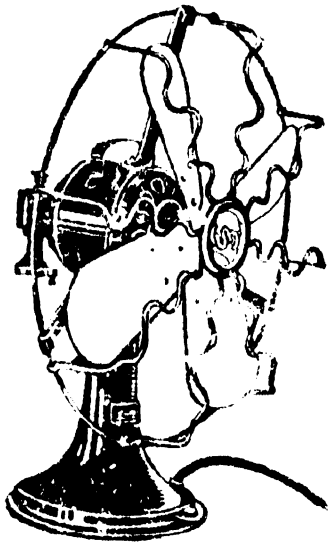
ملاقات

شاہراہِ زندگی پر یوں ہی ہم تم تھے ملے
جیسے دو پتّے لچکتی شاخ سے
ٹوٹ کر گر جائیں سطحِ آب پر،
ایک اس ساحل کے پاس،
ایک اُس ساحل کے پاس،
ڈولتے نازک سفینوں کی طرح
تیز رَو لہروں کے سینے پر رواں
تُند موجوں کے تھپیڑوں سے نڈھال،
جو کبھی ہوں پاس پاس۔
اور کبھی ہو جائیں دُور!

بہتے بہتے
کوہساروں لالہ زاروں سے گذرتے
زندگانی کی مسافت کاٹتے،
لیکن آخر جا گریں
بحر کے آغوش میں،
شاہراہِ زندگی پر یونہی ہم تم تھے ملے!

شاہراہِ زندگی پر یونہی ہم تم تھے ملے،
میں کہیں اور تم کہیں،
گرچہ واقف تک نہ تھے اک دوسرے کے نام سے،
اور اوجھل بھی رہے اک دوسرے کی آنکھ سے
محفلِ ہستی میں لیکن ہے یہ آئینِ حیات
اتفاقاتِ زمانہ سب کو لے آئیں قریب!
لب ملے، طوفاں اُٹھا،
کانپ اُٹھا کوہسارِ زندگی،
دل نے دل سے کچھ کہا
روح نے کچھ روح سے،

میری دنیائے تصور تھی تمہارا ہی خیال
آرزوئیں کھل گئیں شاداب کلیوں کی طرح
اور اُن پہ آئی وہ رنگیں بہار
جس میں رقصاں تھا تمہارا ہی جمال!
شاہراہِ زندگی پر یونہی ہم تم تھے ملے!

آہ! اے انسان! تیری آرزوؤں کا مآل،
جن کو کر دیتا ہے آئینِ جہاں
ٹکڑے ٹکڑے، ریزہ ریزہ، پاش پاش!
زندگی! یہ زندگی —— ہاں ہاں، یہ ظالم زندگی!
جن کی طوفاں خیزیوں سے ایک موجِ تند و تیز
لے گئی تم کو بہا کر میری آنکھوں سے بھی دُور
میرے قدموں کی رسائی سے بھی دُور،
اب تمہارے حُسن کی رعنائیاں
دور ہیں جیسے شفق کی احمریں کرنوں کا رنگ،
یادِ ان ایّام کی —— بن گیا ہے اک فسردہ سا خیال،
اور شکستہ آرزوؤں کا جہاں بھی ہو گیا بے رنگ و بو،
جیسے کمھلائے ہوئے پتّوں کی روحِ بے کسی!
سسکیاں لیتی ہیں یوں اب حسرتیں،
بجھ رہا ہو جیسے کوئی ٹمٹماتا سا چراغ!
لیکن اس بے کیف اور تاریک سی منزل میں بھی
دُور، اِس دنیا سے دُور،
چاند اور تاروں سے دُور،
ہے تمہارا ہی خیال!
جو لرزتا ہے کسی پُر نور شعلے کی طرح
اے مجھے بھولے ہوئے!
شاہراہِ زندگی پر یونہی ہم تم تھے ملے!

ساقی

اُردو بول چال میں تذکیر و تانیث کی غلطیاں

قوانینِ فطرت کے مطابق ذکور و اناث کا تعلق محض جاندار یا ذی رُوح اشیا ہی کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ کیونکہ وہ چیزیں جو بے جان ہیں۔ ان میں نر و مادہ کا وجود ہی نہیں ہوتا۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ ہم آخر الذکر اشیا کو بھی ذکور و اناث کی ذیل میں شمار کر کے کسی بیجان چیز کو مذکر اور کسی کو مؤنث تصور کریں۔ اور پھر اُس پر آمادۂ پیکار ہوں۔ کہ فلاں غیر ذی روح یا بے جان شے تو مؤنث ہے۔ اور آپ نے اس کو مذکر کیوں کہا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ بہت عرصہ ہوا۔ ایک رسالہ "ڈاکٹر اقبالؔ کی خامیاں" کے عنوان سے کسی صاحب نے شائع کرایا تھا۔ جس میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کی بعض بڑی بڑی غلطیوں میں کچھ وہ بھی تھیں۔ جو الفاظ کی تذکیر و تانیث کے متعلق ہیں۔ مثلاً بانگِ درا میں متاع کو مذکر استعمال کیا گیا تھا۔ معترض صاحب فرماتے ہیں کہ یہ بطورِ مؤنث صحیح ہے۔ لیکن قرآن السعدین کے نام سے راجہ جبیسور راؤ متخلص اصغر نے ایک کتاب تذکیر و تانیث کی بحث پر طبع کرائی ہے۔ اس میں متاع کو مختلف فیہ قرار دیا گیا ہے۔ اسی طرح اور بھی سر اقبالؔ مرحوم کی غلطیاں بحث میں لائی گئی ہیں۔ مگر اس مضمون پر ایک غائر نظر ڈالنے سے منتج ہوتا ہے۔ کہ اشیائے بیجان کے اسمائی تذکیر و تانیث کے وہ قواعد جو عام قواعدِ اُردو کی کتابوں میں درج ہیں۔ ایک قادر الکلام شاعر ہمیشہ ان پر پابند نہیں رہتا۔ اور جس طرح مناسب سمجھے اسم مذکر کو مؤنث اور مؤنث کو مذکر کے طور پر اپنے استعمال میں لا سکتا ہے۔ چنانچہ ان خاص قواعد میں جو جو باتیں اہلِ دہلی نے ملحوظِ خاطر رکھی تھیں پہلے اساتذۂ لکھنؤ نے اُن کو نظر انداز کیا اور دستور الشعرا یا مفید الشعراء وغیرہ رسائل طبع ہُوئے۔ اور اسی قبیل کی ایک کتاب حال میں معین الشعرا شائع کی گئی ہے۔ لیکن سخت تعجب ہے کہ تذکیر و تانیثِ الفاظ کے استعمال کی مشکلات کم کرنے کے بجائے اور زیادہ بڑھائی جا رہی ہیں۔ اور کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جلالؔ مرحوم کا وہ چھوٹا سا رسالہ مفید الشعرا جو غالباً دستور الشعرا کی تقلید میں لکھا گیا تھا۔ زمانہ حال کی ضروریات کے لئے بالکل غیر مکتفی ہے۔ یا جلالؔ نے جس قدر مثالیں تذکیر و تانیث کی اپنے زعم کے مطابق درج رسالہ کی تھیں۔ اُن میں سے اکثر کو مختلف فیہ ثابت کر کے اب جدید قواعد وضع کرنے کی ضرورت ہے یا جتنی مثالیں ایک قاعدے کے مطابق مذکر الفاظ کی وہاں درج کی گئی ہیں۔ قریباً اتنی ہی مثالیں اس کے بالمقابل مستثنےٰ الفاظ کی بھی پیش کی جا سکتی ہیں۔ تو پھر ایک قاعدہ اور استثنا میں جب کچھ فرق نہ رہا۔ تو تذکیر و تانیث کے یہ قاعدے کیا ہُوئے محض لفظوں کا ایک کھیل ہیں۔ اور یہ بات اس طرح پیدا ہوئی۔ کہ زبانِ اُردو جب تک اساتذۂ دہلی کے بنائے ہُوئے قاعدوں پر چل رہی تھی۔ عوام اُن اساتذہ کے کلام کو پڑھ کر کسی لفظ کو مذکر اور کسی کو مؤنث قرار دے لیتے تھے۔ مگر لکھنؤ میں یہ تخصیص قائم نہ رہی۔ کہ کسی بے جان اسم کی تذکیر و تانیث کو جس طرح کہ بعض اساتذہ یعنی چوٹی کے شاعروں نے مدنظر رکھا۔ اسی طرح ان سے دوسرے درجے کے شعرا بھی ان کی تقلید کریں۔ چنانچہ رشکؔ نے سب سے زیادہ ان قیود کو توڑا۔ اور پھر سب سے زیادہ اُردو الفاظ بھی اسی کے تین دیوانوں میں مستعمل ہوتے ہیں۔ غرض رشکؔ کی طرح بحرؔ۔ منیرؔ۔ فائزؔ۔ جانصاحبؔ۔ سحرؔ۔ امانتؔ۔ اسیرؔ اور جلیلؔ وغیرہ نے اس امر میں نہایت آزادی سے کام لے کر یہ ثابت کر دیا۔ کہ ان کے سامنے قوانینِ تذکیر و تانیث کی کچھ حقیقت ہی نہیں اور نہ صرف اساتذہ بلکہ عام شعرا بھی بے جان شے کے نام کو اگر وہ مؤنث مانا جاتا ہو تو اس کو مذکر اور اگر مذکر شہرت پا گیا ہو۔ تو خلافِ جمہور وہ اس کو مؤنث استعمال کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ لغویت اور بھی زیادہ ترقی پاتی ہے جبکہ اُردو زبان ان لوگوں کی بول چال میں دخل پاتی ہے کہ جو اہل زبان نہیں ہیں یا جن کی مادری زبان اُردو نہیں ہے مثلاً انگریز لوگ دو صدی سے ہماری زبان کا خاص طور پر مطالعہ کر رہے ہیں۔ اور یہ اُن کے سول سروس کے امتحان میں بھی داخل ہے۔ تاہم عام انگریز اپنی بول چال میں اسی طرح

کی اُردو ہمیشہ استعمال کرتے ہیں۔" ہمارا میم صاحب کا کتاب گرجے میں کھو گیا یا آج بابا لوگ کا دوائی کا نسامہ کہیں بھول گیا۔" وغیرہ وغیرہ علی ہذا اُردو زبان اہلِ پنجاب کی بھی مادری زبان نہیں ہے۔ اسی لئے۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال کو تو خیر مستثنےٰ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اس ملک کے وہ رسالے یا اخبارات جو عموماً یہاں طبع کئے جاتے ہیں۔ اہل زبان کو ان کی سطر سطر میں تذکیر و تانیث کی غلطیاں کھٹکتی ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہو۔ جبکہ ہم اوپر واضح کر چکے ہیں۔ کہ دہلی اور خصوصاً لکھنؤ کے درجہ دوئم کے اساتذۂ ادب ان سب قیود کو اب اپنے ہاں بالائے طاق رکھ چکے ہیں تو پھر وہی آسانیاں یا آزادیاں اہلِ پنجاب کے لئے بھی مخصوص ہونی لازم ہیں۔ غرض ذی روح یا جاندار مخلوق میں تو قدرت ہی نے ذکور و اناث کا وجود ودیعت کر رکھا ہے۔ ان کی تذکیر و تانیث میں تو اصولاً کچھ اختلاف نہیں ہونا چاہیئے تھا۔ مگر تعجب ہے کہ بلبل کو اب تک کوئی مؤنث مانتا ہے۔ اور کوئی مذکر اور آزاد مرحوم تذکرہ آبحیات میں تحریر فرماتے ہیں۔ کہ اُس خاص لفظ بُل بُل یعنی مبل کی تحلیل کر کے دیکھو تو ڈبل تانیث معلوم ہوتی ہے۔ دراصل ہمارے ہاں بیجان اشیا تو کیا وہ جاندار مخلوق جس سے ہمیں ہر روز واسطہ پڑتا ہے۔ اُس کی تذکیر و تانیث بھی ہمیشہ متنازعہ فیہ رہی ہے۔ تو غور کرنا چاہیئے۔ کہ اس قدر اختلافات کا اصلی سبب کیا ہے۔ اور ہمیں ایک ایک سطر کے لکھنے میں الفاظ کے مذکر و مؤنث قرار دینے کی حاجت کیوں پڑتی ہے۔ اگر ہم کو اسی طرح انگریزی زبان کے الفاظ کی تذکیر و تانیث سے ہر سطر میں واسطہ پڑتا۔ تو اُس وسیع زبان پر کوئی ہندوستانی تو شاید ہی قادر ہو سکتا ہے یا امریکہ اور یورپ اس کی انگریزی دانی کی داد دیتے۔ بلکہ سرکاری دفاتر میں بھی فہرستوں پر فہرستیں وقتاً فوقتاً بطور سرکلر شائع کی جاتیں کہ آئندہ فلاں انگریزی لغت مذکر مستعمل ہوگی۔ اور فلاں فلاں مؤنث جو بابو صاحب اس قاعدے کی خلاف ورزی کریں گے وہ غالباً ہمیشہ کے لئے نکال باہر کر دیئے جائیں گے ---- مگر انگریزی علم و ادب میں بیجان اشیاءً کی تذکیر و تانیث ہرگز قرار نہیں دی گئی۔ اور دور کیوں جاؤ ---- فارسی زبان میں تو انگریزی سے زیادہ یہ آسانی پیش نظر رکھی گئی ہے کہ کسی جاندار مخلوق کے نام کے ساتھ جو فعل لایا جاتا ہے۔ وہ مذکر و مؤنث دونوں کے لئے ہمیشہ ایک ہی ہوا کرتا ہے۔ مثلاً مرد آمد۔ زن آمد۔ اسی طرح اس زبان میں تذکیر و تانیث کے قاعدے اس قدر مختصر مقرر ہیں۔ کہ دنیا کی کوئی اور زبان اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ اُردو میں بڑی دقت یہ ہے کہ الفاظ کی تذکیر و تانیث کا اثر ہمیشہ فعل پر پڑتا ہے۔ اور اسم و فعل ہی تو دو چیزیں ہیں۔ جن سے ایک ایک سطر کے لکھنے میں ہمیں واسطہ پڑتا ہے لہٰذا خیال کرو کہ یہ زبان جب کسی غیر اہلِ زبان کے استعمال میں آتی ہے تو اُس کو کن کن دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے ۔ مختصر یہ کہ اُردو میں قواعد زبان زیادہ تر فارسی قواعد زبان سے ماخوذ کئے گئے تھے۔ اور ان قواعد فارسی کی بنیاد عربی قواعد پر رکھی گئی تھی۔ لیکن تذکیر و تانیث کے قاعدے مقرر کرتے وقت ہمارے قواعد نویسوں نے نہ تو فارسی کی کچھ پروا کی نہ عربی کی۔ ورنہ اس میں کیا قباحت تھی۔ کہ "آیا" کا فعل جو عورت اور مرد دونوں سے یکساں طور پر صادر ہوتا ہے۔ ہم اُس کو اس طرح برت لیتے۔ جیسے ہم کہتے "وہ عورت آیا وہ مرد آیا" مگر اس ضمن میں خاص مطالعہ کرنے سے یہ راز کھلا۔ کہ ہماری زبان میں قوانین تذکیر و تانیث ہندی گرامر سے مستعار لئے گئے ہیں۔ اور وہ اصول تذکیر و تانیث جو ہندی میں رائج ہیں۔ ان کو سنسکرت کے قواعد تذکیر و تانیث کی بنا پر وضع کیا گیا تھا۔ لیکن ہندی والوں نے اصول سنسکرت کی کچھ پروا نہ کی اور بیجان اشیاء کی تذکیر و تانیث کے تعین کرنے میں اپنی مرضی کو اس قدر دخل دیا کہ خود ہندی میں بھی یہ مسئلہ بہت پیچیدہ ہو کے رہ گیا۔ اور جب اس کی شمولیت زبان اُردو میں کی گئی۔ تو یہ اور بھی زیادہ دقت طلب مسئلہ بن گیا۔ اور ایک ہی شہر مثلاً دلی میں مسلمان تو دہی کو مؤنث بولنے لگے اور ہندو مذکر۔ حالانکہ سنسکرت کے قواعد والوں نے دہی کے لفظ کو دودھ یعنی دُہنے سے وضع کر کے اس سے ایک لفظ دوہی بنا لیا تھا۔ جس کا مفہوم جما ہوا دودھ ہے۔ اور فی الحقیقت دہی کیا چیز ہے؟ یہی جما ہوا دودھ۔ لہٰذا سنسکرت میں دوہی (جس سے بگڑ کر دہی کا لفظ اردو میں مستعمل ہونے لگا) بطور مذکر مستعمل ہے۔ تو ہندی اور اُردو کے گریمر نویسوں کو لازم تھا کہ وہ ان امور میں اپنی عقل سے بھی کچھ کام لیتے۔ اور دہی کو ہمیشہ مذکر ہی قرار دیتے۔ لیکن مسلمانوں کو زبان اُردو کے قواعد بناتے وقت یہ مشکل پیش آئی۔ کہ لفظ دہی کے آخر میں "ی" علامت تانیث موجود ہے۔ لہٰذا وہ اس کو مؤنث ماننے کے لئے مجبور ہو گئے۔ مگر ہندوؤں کو اپنے خاص ماخذ زبان کی پابندیاں کرنی تھیں۔ وہ عموماً اس لفظ کو مذکر ہی بولتے رہے۔ مگر اب کثرت استعمال کی وجہ سے "دہی" کو عام طور پر مؤنث ہی تسلیم کیا گیا ہے۔

خصوصاً پنجاب میں۔ لہٰذا طوالتِ مضمون کے خیال سے ہم اسی ایک لفظ دہی کی تذکیر و تانیث پر اپنی اس بحث کو ختم کرتے ہیں۔ اور اپنے ہم وطن اہلِ قلم سے ملتجی ہیں۔ کہ وہ اُردو الفاظ کی تذکیر و تانیث کے استعمال میں اگر پنجابی زبان ہی کا تتبع لازم سمجھتے ہیں۔ تو ان کو لازم ہے کہ دستور الشعرا یا مفید الشعرا وغیرہ کی قسم کا کوئی رسالہ لکھ کر اپنے نکتۂ خیال کو اصحابِ اُردو کے پیش نظر رکھ دیں۔ اور اپنے خصائصِ زبان کو اس زبان پر اپنا اس حق جتا کر بالعموم منظور و مقبول کر کے چھوڑیں۔ ورنہ ہم لوگ خواہ کتنا اُردو زبان کی تحصیل کریں اور اس کی مشق و مہارت میں شبانہ روز کوشش کریں۔ اکثر اہلِ پنجاب خصوصاً یہاں کے اُردو اخبار نویس جن کو ہر روز صفحوں کے صفحے اسی زبان میں بسرعت تمام لکھنے پڑتے ہیں۔ وہ الفاظ کی تذکیر و تانیث کے صحیح استعمال میں کبھی بھی عہدہ برآ نہیں ہو سکینگے۔ لہٰذا مکرر التجا ہے۔ کہ ہمارے اہلِ قلم اصحاب بہت جلد اس خاص ادبی معاملے کی طرف متوجہ ہوں۔ اور جس طرح دہلی و لکھنؤ کے اربابِ قلم نے باوجود کثیر اختلافات کے اپنے اپنے ہاں الفاظ کی تذکیر و تانیث کے مسائل کو متعدد رسالے لکھ کر سطے کر لیا ہے۔ ہمارا بھی فرض ہے۔ کہ اس بارے میں محض اپنی پنجابیت سے کام نہ لیا کریں بلکہ پنجابی اسماء کی تذکیر و تانیث اور اُردو الفاظ کی تذکیر کا باہم مقابلہ کر کے جو روش زیادہ پسندیدہ اور سہل تر معلوم ہو آئندہ اس پر عملدر آمد کرنے کی تحریک کریں۔ ورنہ جس طرح اہلِ زبان اقبالؔ مرحوم کی ایسی متعدد غلطیوں پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں۔ وہ ہمارے عام مصنفین کے کارناموں کو اس سے بھی زیادہ حقیر تصور کرینگے۔

سرخوشؔ

شعر

ولی اس گوہرِ کانِ حیا کی کیا کہوں خوبی

مرے گھر میں وہ یوں آتا ہے جوں سینے میں راز آوے

ولیؔ

راوی کی ایک رات

سنو ملّاح کا نغمہ—
یہ نغمہ شعلۂ لرزاں ہے اک شمعِ محبّت کا،
سنو ملّاح کا نغمہ—
یہ نغمہ لمحۂ شیریں ہے اک پُر کیف خلوت کا،
یہ اک دُزدیدہ رفتاری سے چھا جاتا ہے لہروں پر،
یہ اک مستی کا سیمیں جال پھیلاتا ہے لہروں پر!
اِسے سنتی ہیں لہریں اور کشتی کو بہاتی ہیں،
جلو میں جھومتی جاتی ہیں خود مستی کے جھونکوں سے!
یونہی کشتی کو یہ منظر اُفق کا جا دکھاتی ہیں،
اُترتی ہے وہاں سیّار کشتی نرم جھولوں سے!

مگر ملّاح کی ہمدم—
وہ آئی چھپتی چھپتی شب کی تاریکی میں تختے پر،
سنو ملّاح کا نغمہ
ہے سحرِ نغمہ سے آنکھوں میں اُس کی اور ہی منظر!
وہ اِس دم دیکھتا ہے خواب اک رنگیں فسانے کا۔
بیاں بچپن میں جو سنتا تھا پریوں کے زمانے کا
اُفق کے سائے میں آج اس کی تعبیریں نظر آئیں،
وہیں پہنچے گا، افسانہ حقیقت بن کے نکھرے گا!
تمنائیں دلِ بے تاب کی، لو! آج بر آئیں،
وہیں پہلو میں لے کر اپنی ہمدم کو وہ جائے گا!

میراجی

قسمیں

نظر اُٹھا کے تجھے دنیائے آرزو کی قسم
ادائے کوشش اخفائے رنگ و بُو کی قسم

جہانِ وہم و گماں بھی ہے گوش بر آواز
قسم قسم ترے اعجازِ گفتگو کی قسم

وہی ہے آنکھ جو ہر جنبش نگاہ سے دے
سرورِ بادۂ بے جام و بے سبُو کی قسم

تجھی سے ضبط کی سب منزلیں چمک اٹھیں
ٹپک سکا جو نہ آنکھوں سے اُس لہو کی قسم

سکون سے نہیں مانوس بے نیازیٔ عشق
صدائے دربدر و خاکِ کُو بکُو کی قسم

ہے ماورائے حیات و ممات ہستیٔ عشق
جہانِ یاس میں تجدیدِ آرزو کی قسم

مجال عرضِ تمنا کہاں ترے آگے
سکوتِ عشق کے الزامِ دُو بدُو کی قسم

شہیدِ تشنہ لبی ہوں فشارِ پنہاں ہوں
کمالِ خستگی ہائے کنارِ جُو کی قسم

ہیں شاد کام محبت میں نا اُمیدِ سکوں
شہود میں بھی مجھے تیری جستجو کی قسم

مجھے بھی آج کے رونے کے بعد مت کہنا
حیاتِ عشق تری جاتی آبرو کی قسم

لئے تھے تو نے جو قول و قرارِ صبر و سکوں
وہ یاد ہی نہیں، عشقِ بہانہ جو کی قسم!

نویدِ جوشِ جنوں ہے بہارِ لالہ و گل
فضائے مست میں کیفیتِ نمو کی قسم

تمام کہنے کی باتیں ہیں، ہوش و بے خبری،
سکوتِ شب کی قسم اس فضاءِ ہُو کی قسم

دمِ وداع وہ اصرارِ ضبطِ غم تیرا
وہ جھلملاتی ہوئی شمعِ آرزو کی قسم

فراق عینِ غشی میں بھی چونک اُٹھتا ہوں
فسونِ نرگسِ بیمار و فتنہ خُو کی قسم

فراق گورکھپوری

اُس کی پہلی اُڑان

ننھّی مرغابی اُونچی چٹان پر اکیلی تھی۔ اُس کے ماں باپ بھائی بہن دن نکلنے سے پہلے ہی جا چکے تھے۔ وہ ان کے ساتھ جانے سے ڈرتی تھی۔ ہر روز اُڑنے کے ارادے سے چٹان کے کنارے تک دوڑتی مگر ڈر کر رہ جاتی۔ اس چٹان کے نیچے ـــــــ بہت نیچے ایک بحرِ بیکراں موجیں مار رہا تھا۔ اس نے خیال کیا اُس کے نازک بازو اتنی گہرائی تک اس کا ساتھ نہ دے سکیں گے، وہ اپنی آرام گاہ میں چلی گئی۔ حالانکہ اس کے دو بھائی اور ایک بہن جن کے بازو اس سے کمزور تھے۔ چٹان کے کنارے تک دوڑے اور ہوا میں بازو مارتے ہوئے اڑ گئے۔ مگر اس کو جراٗت نہ ہوئی۔ یہ حرکت اس کے لئے ناممکن معلوم ہوتی تھی۔ اس کے ماں باپ اس کی کم ہمتی پر ملامت کرتے اس کے آس پاس گھومتے شور مچاتے اور اس کو فاقہ کرنے کے لئے چھوڑ دیتے۔ مگر اس کو اپنی جان پیاری تھی۔

چوبیس گھنٹے سے اُس نے کچھ نہ کھایا تھا۔ کل سے اس کو کھانے کے لئے کچھ نہ ملا تھا۔ شام ہونے کو تھی مگر اب تک اس کے پاس کوئی نہ پھٹکا۔ صبح سے شام تک وہ اپنے ماں باپ اور بھائی بہن کو اڑتے دیکھ رہی تھی۔ اس کے ماں باپ اس کے ساتھیوں کو فنِ پرواز میں ماہر بنا رہے تھے ان کو یہ بھی سکھایا جا رہا تھا کہ وہ سمندر کی خوفناک موجوں سے کس طرح بچ کر اڑیں اور کس طرح اپنے شکار کے لئے غوطہ لگائیں۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ اس کا ایک بھائی پہلی مرتبہ شکار کرنے میں کامیاب ہوا اور فاتحانہ انداز میں مقابل کی ایک چٹان پر بیٹھ کر بلا شرکتِ غیرے شکار کو ختم کر گیا اور اس دوران میں اس کے ماں باپ اس کے ارد گرد نعرہٗ مسرت لگاتے اس کی ہمت اور بہادری کی داد دیتے ہوئے چکر لگا رہے تھے۔ تمام دن اس خاندان کے افراد مقابل کی چٹان پر مزے کرتے ہوئے ننھّی مرغابی کی بزدلی پر اظہارِ نفرت کرتے رہے۔ دُور افق پر سورج غروب ہو رہا تھا۔

اور اپنی آخری کرنوں سے مرغابی کی آرام گاہ کو جو جنوبی رُخ پر واقع تھی گرما رہا تھا۔ ننھی مرغابی نے بھوک سے بے تاب ہو کر چٹان پر ایک نظر ڈالی۔ تو ایک کونے میں پس خوردہ پڑا دیکھا اس نے اسی پر اکتفا کی۔ وہ بار بار حسرت سے مقابل کی چٹان کو تکتی اور چاہتی تھی کہ بغیر اڑے کسی طرح ماں باپ کے پاس پہنچ جائے۔ لیکن جب اپنی چٹان کے کنارے پر آ کر جھانکتی تو سمندر منہ پھاڑ پھاڑ کر موت کا پیغام سناتا اُس کے اور اُس کے والدین کے درمیان ایک عمیق سمندر حائل تھا۔

ایک مرتبہ وہ چٹان کے کنارے تک پہنچ گئی اور ایک پیر پر کھڑی ہو گئی پھر آنکھیں بند کر کے غشی طاری ہو جانے کا بہانہ کیا۔ اس پر بھی اس کے ماں باپ نے کوئی توجہ نہیں کی پھر وہ مایوس ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس کے بھائی بہن دوسری چٹان پر اپنی گردنیں سکیڑے سستا رہے تھے۔ باپ پر کھولے دھوپ کھا رہا تھا۔ صرف ماں بچاری اس کی طرف بار بار دیکھ رہی تھی اور اپنے شکار کے ختم کرنے میں معروف تھی۔ ننھی مرغابی نے دیکھا کہ ماں چٹان پر چونچ رگڑ رگڑ کر مچھلی کھانے میں معروف ہے۔ یہ دیکھ کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا۔ وہ دیوانہ وار اپنی چونچ بھی رگڑنے لگی اور اُس کے دل میں خیال آیا کہ کاش ایک مچھلی مجھے بھی مل جاتی۔ اسی تصور میں بیساختہ اس کے حلق سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔ یہ حسرت و آرزو کی ایک دردناک پکار تھی۔ اس کی ماں نے اس کا جواب دیا۔ وہ چاہتی تھی کہ ماں اس تک لا کر شکار پہنچا دے مگر ماں یہ نہ چاہتی تھی۔ تھوڑی ہی دیر بعد ماں ایک ٹکڑا چونچ میں لے کر اُڑی۔ جب اس نے دیکھا کہ ماں اس کی طرف آ رہی ہے تو ننھی مرغابی کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ مگر ماں بجائے اس کے کہ اُس کے پاس آ کر بیٹھتی یا ٹکڑا پھینک دیتی اُسے منہ میں دبائے اس کے قریب قریب اُڑنے لگی۔ ننھی مرغابی اس بات کی کوشش کر رہی تھی کہ کسی طرح ماں سے قریب تر ہو جائے۔ یکایک اس کی ماں اس

سے صرف ایک فٹ کے فاصلے پر چٹان کے کنارے پر ٹک گئی ننھی مرغابی متعجب تھی کہ اس کی ماں اس کے قریب کیوں نہیں آتی۔ وہ بے تاب ہو کر لڑکھڑا ماں کی چونچ سے چھیننے کے لئے جھپٹی۔ ماں فوراً اوپر اڑ گئی۔

ایک بڑی چیخ کے ساتھ وہ چٹان سے آگے آ گئی اور نیچے گرنے لگی۔ جب وہ نیچے ہی نیچے جا رہی تھی تو اپنی ماں کے پروں کی آواز برابر سن رہی تھی۔ وہ جوں جوں سمندر کے قریب ہوتی جا رہی تھی اس کے دل میں ایک ہول پیدا ہو رہا تھا۔ یکایک اس نے محسوس کیا کہ اس کے دل کی حرکت بند ہو گئی ہے اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ یہ ساری پریشانی صرف ایک لمحے کے لئے تھی۔ دوسرے ہی لمحے میں اس نے محسوس کیا کہ اس کے بازو کھل چکے ہیں اور اس کے سینے اور بازو سے ہوا ٹکرا رہی ہے۔ اور اس کے پر ہوا کو کاٹ رہے ہیں اب وہ الٹے سر نیچے نہیں جا رہی تھی بلکہ اسے کبھی نیچے کبھی دائیں بائیں اور کبھی اوپر اڑنے کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کے دل کی دھڑکن کم ہو رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے اندھیرا دور ہو رہا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو پوری قوت کے ساتھ بازو مارتے اور اوپر اُٹھتے ہوئے دیکھا تو وفورِ مسرت سے وہ چیخ اُٹھی۔ اب اس کا پورا خاندان اس کے آس پاس محوِ پرواز تھا۔ ان سب کے قوی بازوؤں کی پھڑپھڑاہٹ اُسے صاف سنائی دے رہی تھی۔ اس نے بھی اُن کی تقلید کی کوشش کی۔ وہ اپنے بھائی بہنوں کو دائیں بائیں اوپر نیچے ہوتے دیکھ رہی تھی۔ اب وہ بھول چکی تھی کہ اس کے لئے اڑنا ناممکن ہے۔ اُس نے ہوا میں دائیں بائیں مڑنا اوپر اٹھنا اور غوطے لگانا شروع کیا۔ اس کی چیخ پکار سے سمندر کی ساری فضا گونج اٹھی۔

اب وہ پانی سے قریب ہو چکی تھی اور پانی پر برابر اڑ رہی تھی وہ اپنے نیچے ایک عمیق سمندر کو موجیں مارتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ اسی عرصے میں اُس نے اپنے بھائی اور بہنوں کو اس نیلی سطح پر بیٹھتے ہوئے دیکھ لیا اور اپنے پروں کی حرکت کو روک کر خود بھی اس پر پاؤں ٹیک دیئے، اس کے نیچے اس میں غرق ہونے لگے مارے خوف کے اس نے ایک چیخ کے ساتھ اوپر اٹھنے کی کوشش کی لیکن اس عجیب مشق اور بھوک نے اس کو کافی نڈھال کر دیا تھا۔ حتیٰ کہ اس کے پاؤں پورے غرق ہو گئے اس کا پیٹ بھی تری محسوس کرنے لگا۔ اس سے زیادہ وہ نہ ڈوب سکی۔

اب وہ پانی پر تیر رہی تھی اور اس کے اِردگرد اس کے خاندان کے سارے افراد تعریف کے ترانے گا رہے تھے اور اُن کی چونچیں تحفتہً مچھلی کے ٹکڑے پیش کر رہی تھیں۔

اس طرح اس نے اپنی پہلی پرواز کی تکمیل کی۔

ترجمہ **محمد عبد السّتار فاروقی**

غزل

کر رہا ہوں وہی تدبیر جو تقدیر میں ہے
مری تقدیر بھی شامل مری تدبیر میں ہے

آپ کی بندہ نوازی تو مسلّم لیکن
مجھے معلوم ہے جو کچھ مری تقدیر میں ہے

آپ تعزیر کی تکلیف گوارا نہ کریں
مری تعزیر بھی داخل مری تقصیر میں ہے

اس میں کچھ میری نظر کا بھی کرشمہ ہے ضرور
یہ جو اک حُسن نمایاں تری تصویر میں ہے

ہائے اُس حُسن فسوں ساز کی جادو نگہی
جس پہ مرنے کی حسرت دلِ دلگیر میں ہے

ہائے وہ دل کی تمنّا کہ نہ برآتی ہو
ہائے اقرارِ محبت کہ جو تاخیر میں ہے

آپ آئیں تو سہی آپ سنیں بھی تو سہی
نغمۂ حُسن مرے نالۂ شبگیر میں ہے

وہ خفا ہو بھی گیا سحرِ دُعا ہو بھی گیا
اور دلِ زار ابھی خواہشِ تاثیر میں ہے

کیا کہوں برہمیٔ حُسن کا عالم، یعنی
کچھ عجب لطف محبّت کی بھی تقصیر میں ہے

ان سے کیا آرزوئے خاطرِ دلگیر کہوں
اُنہیں معلوم ہے جو خاطرِ دلگیر میں ہے

کوئی پوچھو تو سہی آپ کی مرضی کیا ہے
انہیں معلوم ہے جو کچھ مری تقدیر میں ہے

شعرِ اکبر میں بھی اک بات ہے مانا لیکن
اِس میں تاثیر کہاں جو سخنِ میرؔ میں ہے

جلال الدین اکبر

رامی

کل اسی راستے سے رامی کی ارتھی شمشان کی طرف گئی تھی۔ گاؤں کے بہت سے لوگ بھی ساتھ تھے۔ رامی کی ماں تھوڑا سا روئی بھی تھی۔ اچھا ہوا کہ وہ تھوڑا سا رو لی۔ رامی کے جیتے جی تو اُسے کبھی رونا نہ آیا تھا اور نہ اس کی ضرورت ہی تھی۔ رامی تو جنم سے ہی اپاہج تھی۔ اس میں رونے کی بھلا کون سی بات تھی!

رامی مرنے سے پہلے بیمار نہیں ہوئی تھی۔ شاید ایشور اُسے اُتنا اپاہج نہ سمجھتا ہو جتنا کہ اس کے بھائی بہن اور ماں۔ بیمار پڑ جاتی تو گھر والوں کے پاس اس کے لئے بے اتفاقی کے سوا اور کوئی دوا نہ تھی۔ پانی تک کو ترس جاتی۔ اپاہج کو بھی بیمار ہونے کا کوئی حق ہے؟

وہ چکی پیس رہی تھی، جب اچانک اُس کا آخری وقت آ گیا۔ شاید وہ مرنا چاہتی تھی۔ شاید اس کا دل کمزور تھا۔ تعجب تو یہ ہے کہ اپاہج کا بھی دل ہوتا ہے۔ جب کبھی رامی کے احساسات کے بارے میں کوئی بات چلتی تو اس کے گھر والے ہنس دیا کرتے۔ اس دن جب حسب معمول رات کو سونے سے پہلے اُس کی ماں کچھ گیہوں لے کر رامی کی کوٹھڑی میں آئی تاکہ رامی صبح ہوتے ہوتے اُن سب کو پیس ڈالے، تو اُس نے اُسے چکی پر جھکے ہوئے پایا۔ وہ مر چکی تھی۔ رامی کی ماں کو دکھ ہوا کہ گیہوں بے پیسے ہی رہ گئے اور اب چکی کو بھی گنگا جل سے صاف کرنا پڑے گا۔ پھر خیال آیا کہ رامی تو میری اپنی بیٹی ہے۔ اُس کو حیرانی ہوئی کہ آج سے پہلے اُسے یہ خیال کبھی کیوں نہ آیا۔ اُس نے آہستہ سے رامی کا سر اٹھا کر اُسے زمین پر لٹا دیا اور اُس کی آنکھیں جو کچھ کچھ کھلی تھیں بند کر دیں۔ پھر وہیں بیٹھ کر کچھ دیر روئی اور اٹھ کر باہر خبر کرنے چلی گئی کہ رامی مر گئی ہے۔

مرنے سے کچھ دن پہلے اُس نے اپنی ماں سے پھر وہی بات پوچھی تھی جو وہ آگے بھی کئی بار پوچھ چکی تھی۔ "لاہور کیسا ہے، ماں، ریل گاڑی کیسے چلتی ہے۔" ماں نے کچھ سخت سست کہہ کر دھتکار دیا تھا کہ تجھ اپاہج کو ان باتوں سے کیا! اُس پر رامی نے یہی سوال اپنی بہن نمی اور بھائی مُنّے کے سامنے دہرایا تھا۔ وہ ہنس پڑے تھے اور انہوں نے کہا تھا تو جب گھر سے باہر نکل ہی نہیں سکتی تو یہ جان کر کیا کرے گی۔ بچے پھر کھیل میں لگ گئے تھے۔ وہ شاید رُک جاتے اگر وہ دیکھ لیتے کہ رامی کے گالوں پر دو آنسو لڑھک آئے ہیں جنہیں اُس نے اپنے دوپٹے سے پونچھ دیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ رامی کا دل بھی اور بچوں کے دل کی طرح ہی تھا۔ تبھی تو اُسے لاہور اور ریل گاڑی کے دیکھنے کا اتنا شوق تھا۔ اُن کا گاؤں سٹیشن سے ایک میل کی دوری پر تھا۔ لیکن کئی بار گاڑی کی سیٹی کی آواز رامی کے کانوں تک پہنچ جاتی تھی رامی کے لئے اس آواز میں ایسی مٹھاس تھی کہ عام لوگ اسے نہیں سمجھ سکتے۔ یہ آواز اُس کی ساری اُمنگوں کا مرکز تھی۔ وہ گھنٹوں چپ چاپ بیٹھی اس آواز کا انتظار کرتی۔ سیٹی کی آواز سُنتے ہی اُس کا دل دھک دھک کرنے لگتا۔ اس کے تمام جسم میں ایک عجیب سنسنی پیدا ہو جاتی۔ آنکھیں بند کر کے وہ اس سیٹی کی آواز کو سنتی۔ تصور اس ریل کی سیٹی کے ذریعے نہ جانے اسے کس دنیا میں پہنچا دیتا۔ اور ریل کے گذر جانے کے بعد بھی کتنی دیر تک وہ اپنی اس تصور کی دنیا میں کھوئی رہتی۔

لاہور کا خیال رامی کو اتنا نہ ستاتا۔ شاید اس لئے کہ وہ گاڑی کی آواز تو روز سُنتی تھی لیکن اُس کی ماں بہن اور بھائی سال میں صرف ایک بار ہی لاہور جاتے۔ اگر اس میں چلنے کی تھوڑی سی طاقت بھی ہوتی تو وہ اُن کو سٹیشن تک چھوڑنے تو ضرور جاتی لیکن چلنا تو دور رہا۔ وہ کھڑی بھی نہیں ہو سکتی تھی۔ ہاں گھسٹتے ہوئے تھوڑی دور تک چلی جاتی۔ لیکن یہ اُس کی لاہور دیکھنے کی پیاس کو مٹانے کے لئے کافی

نہیں تھا۔

پیاس پانی دکھانے سے اور تیز ہوتی ہے لاہور سے لوٹ کر ننھی اور منّا ایک ہفتہ تو لاہور والے چچا کی تعریفوں کے پل باندھنے میں مست رہتے۔ رامی چپ بیٹھی سنتی کبھی کبھی ایک آدھ سوال کر لیتی۔ منّا چاہتا کہ وہی ہر بات بتائے چچا کی بڑی بھاری کوٹھی ہے۔ فرش پر سفید پتھر ہے۔ وہاں گوبر سے لیپ نہیں ہوتا۔ اور دیواروں پر ہرے رنگ کی قلعی ہے۔ ہاں ہاں بڑی خوبصورت لگتی ہے۔ ٹھیک ہمارے کھیتوں کی ہریاول کی طرح' اور وہاں بجلی ہے' تو کیا جانے؟ تجھے بجلی کا کیا پتہ! ایک بٹن سا ہوتا ہے۔ دبایا اور روشنی ہی روشنی ہوگئی۔ اور لاہور میں گرمی نہیں ہوتی۔ اس کے لئے بھی بٹن دباؤ تو پنکھا گھومنے لگتا ہے۔ چچا کے پاس موٹر بھی تھی۔ کئی بار ہمیں سیر کرانے کو لے گئے اور وہاں انار کلی ہے، بڑا بازار، جہاں شیشوں والی بڑی بڑی دکانیں ہیں اور وہاں ٹھنڈی سڑک ہے ہیں اور کبھی وہاں میمیں دیکھنے جایا کرتے تھے وہ وہاں گھومنے نکلتی ہیں۔ کیسی ہوتی ہیں؟ تو تو کالی کلوٹی ہے۔ تجھے دیکھ لیں تو ڈر ہی جائیں۔ اُن کا رنگ بہت سفید ہوتا ہے۔ وہ گالوں پر کچھ لگاتی ہیں اور ہونٹوں پر بھی۔ بڑی عجیب سی لگتی ہیں وہ۔ جب وہ چلتی ہیں تو ننھی جیسے کتنے ہی بچے اُن کا مُنہ دیکھنے کے لئے ساتھ ساتھ بھاگے جاتے ہیں۔

کچھ دن تک تو رامی لاہور کے خیالات میں ڈوبی رہتی لیکن ایسے سپنوں کے لئے دماغ کی ان تھک اڑان چاہیئے۔ رامی کی نظر محدود تھی۔ لاہور کے خیالات کو وہ بہت دنوں تک اپنے دل میں نہ ٹھہرا سکتی۔ لاہور دور بھی تو بہت تھا لیکن گاڑی کی سیٹی ——— گاڑی کی سیٹی تو ایک میل سے زیادہ دُور نہ تھی کبھی وہ گھسٹ کر ہی وہاں تک جا سکتی!

شاید اُس کی ماں میں اتنی لیاقت نہ تھی کہ وہ اِن سکھ کے سپنوں کو سمجھ سکے۔ اُس کے لئے رامی گنوار، اَن پڑھ اور اپاہج تھی بس اور اسی لئے رامی کا روز کا کام یہی تھا کہ گھر کے سارے برتن مانجھے، چکّی پیسے، اور جب کبھی وقت ملے تو چرخہ کاتے۔ برتن مانجھتے مانجھتے رامی کبھی تھکی ہوئی بیٹھی رہ جاتی۔

.... پھر وہی سیٹی۔ خیال ہی میں رامی گاڑی پر پہنچتی۔ اُسے دنیا بھول جاتی۔ گھر والوں کے طعنے گاؤں والوں کی بے التفاتی بچوں کے مذاق کچھ بھی یاد نہ رہتا۔ گاڑی اور اس کی خیالی دنیا! اُس دنیا میں بے عزّتی کرنے والے نہ ہوتے۔ اپاہج۔ اپاہج کہہ کر جی جلانے والے نہ ہوتے۔ دھتکار کر رُلانے والے نہ ہوتے۔ تب اچانک رامی کی ماں کی کرخت آواز سنائی دیتی اور گالیوں کی بوچھاڑ تصوّر کے سب خواب بکھر کر رہ جاتے نکمّی۔ کاہل۔ کلمُہی۔ اِن لفظوں کا جواب رامی کے پاس اپنی بڑی بڑی پُرنم آنکھوں سے ماں کی طرف چپ چاپ دیکھتے رہنے کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا۔

گئی رات تک رامی چکّی پیستی۔ اُس نے چکّی کی گھر گھر میں اپنے دُکھوں کو بھولنا سیکھ لیا تھا۔ کوٹھڑی میں اپنے آپ کو بھلا دینے والی دنیا کو بھول کر رامی کو اپنے خیالات کی دنیا بنانے اور اُس میں کھو جانے کا موقعہ ملتا۔ جب رامی بھاگتے۔ کودتے۔ کھیلتے۔ ناچتے بچوں کو نہ دیکھتی تو اُسے اپنی قسمت کا خیال نہ آتا حقیقت خواب بن جاتی اور خواب حقیقت کا جامہ پہن لیتا۔ ایسی گھڑیوں میں رامی سکھ کا احساس کرتی اور اُسے ایشور کی ہستی کا کچھ کچھ یقین ہونے لگتا۔ کئی بار دل ہی دل میں وہ اپنی ماں کو دعائیں دیتی کہ اُس کی ماں نے اُسے کچھ کام دے کر اُسے گاؤں کے بچوں کے ہنسی مذاق سے بچا رکھا ہے۔ یہ اچھا ہی تھا کہ ماں کی طرف سے رامی کے ایسے خیالات تھے۔ کیونکہ اُس کی ماں تو اُسے انسان تک سمجھنے سے قاصر تھی۔ اُس کے لئے تو رامی ایک بے جان مشین تھی۔ رامی چل پھر نہیں سکتی بُرا بھلا کہنے پر بھی چپ رہتی ہے۔ اُسے کسی نے روتے نہیں دیکھا۔ تو پھر اُسے چکّی پیسنے میں ہی کیوں نہ لگایا جائے گھر کا پِسا ہوا آٹا اچھا بھی تو ہوتا ہے۔

اپنے بھائی اور بہن سے عام طور پر رامی کی اَن بَن رہتی۔ اُس نے انہیں کبھی بُرا بھلا نہیں کہا، حوصلہ بھی نہیں تھا اور نہ خواہش تھی۔ لیکن بچوں نے اپنا سلوک ماں سے سیکھا تھا۔ یوں ہی رامی کو کوسنا۔ بار بار اُسے اُس کی بدنصیبی کی یاد دلانا۔ ایسی باتوں میں انہیں مزا آتا تھا۔ جب کبھی رامی سے سیدھے مُنہ بات بھی کرتے تو اس ڈھب سے گویا اُس پر کوئی احسان کر رہے ہوں۔ ماں خود ہی رامی کو اُن سے جُدا رکھتی۔ رامی کی حفاظت کے لئے نہیں۔ ننھی اور منّا کی بھلائی کے لئے۔ رامی اپاہج تھی۔ یہی تو ثبوت تھا کہ ایشور بھی اُس سے ناراض ہے۔ اِس میں کوئی شک کی گنجائش نہیں تھی کہ وہ کلمُہی ہے۔ رامی کو ننھی اور

منتے سے زیادہ ملنے دیا جاتا تو انہیں نظر لگ جانے کا ڈر تھا۔ روز اُن کے سر سے مرچیں واری جاتیں۔ منگو کی لڑکی سے رامی نے ایک دن باتیں کی تھیں تبھی تو منگو کی لڑکی اس طرح کراہ کراہ کر مری۔ آنکھیں اُس کی باہر نکل پڑتی تھیں۔ ہاتھ پاؤں اُس کے اکڑ گئے تھے پر جان نکلنے میں نہیں آتی تھی۔ رامی کو دو دن کوٹھڑی میں بند رکھنا پڑا تھا۔ تب کہیں لڑکی کی جان سے جان نکلی تھی۔ اُن کے تو گھر میں ہی رہتی ہے۔ مرچیں بھی نہ واری جائیں تو ننھی اور مُنّا دیکھنے کو بھی نہ ملیں!

دن چڑھتا تو رامی اپنی اندھیری کوٹھڑی میں پناہ لیتی۔ باہر دھوپ کھلتی۔ پیپل کے نیچے بچوں کے جھنڈ اکٹھے ہونا شروع ہوتے رامی چھپ چھپ کر دیکھتی۔ جب بچوں کی کھیل کود اور ہنسی ناقابلِ برداشت ہو جاتی تو وہ آنکھیں بند کر کے چارپائی پر لیٹ جاتی۔ اپاہج اپنا دل ایسے ہی بہلایا کرتے ہیں!

شاید رامی کی ٹانگیں ٹھیک ہو جاتیں۔ موت کے وقت رامی چوبیس سال کی تھی۔ پندرہ سال پہلے رامی کے گاؤں میں ہی کرم دین نام کا ایک بوڑھا بڑھئی رہتا تھا۔ اُس نے کامل حکیم ہونے کا کبھی دعوے نہیں کیا۔ لیکن سبھی جانتے تھے کہ بوڑھے کرم دین کو دوا دارو کے کچھ ٹوٹکے آتے ہیں جو ٹھیک بیٹھتے ہیں۔ عمرو کی ماں کا جب سردی سے جسم مر گیا تھا تو کرم دین نے ہی اُس بے چاری کو دو ہفتے میں اچھا بھلا کر دیا تھا۔ چرن سنگھ کے لڑکے کی ٹانگ ٹوٹنے پر کرم دین ہی مسیحا بن کر آیا تھا۔ پھر رامی کی ماں نے کرم دین کو مدد کے لئے کیوں نہ بلایا۔ بلایا تو تھا لیکن بات نہ بن سکی تھی۔ کرم دین غریب تھا۔ اُس کے پاس دوسروں کے لئے دوا خریدنے کو پیسے نہ تھے۔ رامی کی ماں سے اُس نے بیس روپے مانگے تھے۔ مجھے بیس روپے دو، اُس نے کہا تھا، اس سے میں علاج کے لئے دوائیں خرید دوں گا۔ میں یہ تو نہیں کہتا کہ رامی بالکل ٹھیک ہو جائے گی لیکن مجھے پکی امید ہے اور اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا تو رامی ایک مہینے میں چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے گی۔

لیکن رامی کی ماں کو یہ بات نہ جچی تھی پرماتما کی باتوں کا کسی کو کیا پتہ اور اگر پتہ ہی نہیں تو بھروسا کیسا۔ رامی کی ماں نے انکار کر دیا تھا۔ اگر رامی اچھی نہ ہوئی تو مفت میں بیس روپے ضائع ہو جائیں گے اور رامی کی ماں اس جھمیلے میں پڑنے کو تیار نہ تھی۔

اگر رامی کی ماں بہت غریب ہوتی تو بات کچھ عجیب نہ تھی۔ لیکن اُن کی تو اچھی خاصی زمینداری تھی۔ دو کوئیں اپنے تھے۔ ایک باغ بھی تھا۔ کٹائی کے وقت تیس سے زیادہ مزدوروں کی ضرورت بھی آن پڑتی تھی۔ پر پھر بھی ان بیس روپوں کا خرچ رامی کی ماں کو گراں گذرتا تھا۔ رامی سب سے بڑی لڑکی تھی اور اپنے ماں باپ کی پہلی اولاد۔ اُس کے جنم سے پہلے اس کی ماں کو پوری امید تھی کہ لڑکا ہوگا۔ مگر جنم لیتے ہی رامی نے اُس کی آرزوؤں پر پانی پھیر دیا۔ ایک تو لڑکی، دوسرے اپاہج۔ رامی کی ماں کو کچھ دُکھ ہوا ضرور تھا لیکن پھر اُس نے اپنے دل کو تسلی دے لی تھی کہ اس اپاہج کا بیاہ تو اب ہونے سے رہا۔ چلو ایک مصیبت سر سے ٹل گئی۔ لیکن رامی کے باپ کو بہت صدمہ پہنچا تھا۔ وہ زندہ تو سات سال اور رہا تھا۔ لیکن وہ پُرانی رونق اُس کے مُنہ پر پھر کبھی دکھائی نہ دی۔

لاہور والے چچا کے سامنے بھی ایک بار رامی کا تذکرہ چلا تھا۔ بس ایک بار ہی۔ وہ دُکھی لوگوں کی کہانی سننے کے شوقین نہیں تھے اُن کو اپنے دفتر کا کام ہی بہت تھا۔ شام کو وہ سینما جانا پسند کرتے یا کلب میں برج یا ٹینس کھیلتے۔ لیکن اُس دفعہ انہوں نے اپنے ایک پڑوسی کو رامی کی بابت کچھ کہنے دیا تھا۔ شاید اس لئے کہ ان دنوں اُن کا اپنا چھوٹا بچہ بیمار تھا۔ اس پر انہوں نے رامی کی ماں سے پوچھا تھا کہ رامی کا کچھ علاج بھی کرایا ہے یا نہیں۔ پہلے تو ماں نے بات ٹال دی تھی کہ اُس قسمت کی ہیٹی کی زندگی تو ایسے ہی کٹ جائے گی۔ پھر اُس کے دل میں مامتا کی ہلکی سی لہر اُٹھی تھی اور اُس نے کرم دین اور بیس روپوں کا ذکر کر دیا تھا۔ اور چچا کہنے لگے تھے کہ اگر اس خرچ سے رامی اچھی ہو جائے تو بیس روپے دے دینے چاہئیں۔ پھر آپ ہی کہنے لگے کہ ان گنوار حکیموں پر زیادہ بھروسہ نہیں رکھنا چاہئے۔ ہو سکتا ہے کہ اُس کی دوا سے فائدے کی بجائے نقصان پہنچ جائے۔ جواب یہ تھوڑا بہت گھسٹ لیتی ہے اس سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے اور پھر رامی کو اپنی محرومی کچھ بہت چبھتی بھی تو نہیں۔ اُسے روتے کسی نے نہیں دیکھا۔ اس بے چاری کو اپنی حالت میں مست رہنے دو۔ ہزار روپیہ ماہوار تنخواہ لینے والے لوگ ایسی باتیں خوب اچھی طرح کر سکتے ہیں۔

لیکن چچا جی کو ایک اور بھی خدشہ تھا۔ وہ سوچتے تھے کہ اگر میں نے علاج کرانے پر بہت زور دیا تو کہیں بات بڑھ نہ جائے۔ ہو سکتا ہے کہ کرم دین کا ٹوٹکا ٹھیک نہ بیٹھے۔ ان گنوار حکیموں کا علاج اندھیرے میں گولی مارنے کی طرح ہوتا ہے۔ اگر رامی کی ماں نے کہہ دیا کہ اب رامی

کو لاہور میں لاکر بھی دکھایا جائے تو پھر؟ چچا جی کی آنکھوں کے سامنے رامی
کی گھسٹتی ہوئی اپاہج مورت پھر گئی۔ وہ کانپ سے گئے۔ گاؤں کی اور
بات ہے۔ گاؤں کے لوگ سیدھے سادے ہیں۔ وہ کسی نہ کسی طرح
رامی کی موجودگی کو برداشت کرسکتے ہیں۔ یہاں کوٹھی میں اس کا ٹھہرنا مشکل
ہوگا۔ کمرے کمرے میں گھسٹتی پھرے گی۔ فرش اور دریاں خراب ہوں گی
روز کتنے ہی ملنے والے آتے ہیں۔ وہ دیکھ پائیں تو کیا کہیں گے۔ رامی
گاؤں میں ہی اچھی ہے۔

رامی کو اپنی اس چھوٹی سی دنیا دیکھنے کے لئے بہت وقت نہیں
چاہیئے تھا۔ صبح جب اندھیرے میں ہی اٹھ کر باہر کھیتوں میں جاتی تو
بڑی بھلی سی ہوتی۔ سورج نکلنے سے پہلے ہی وہ لوٹ آتی۔ دوپہر
کی کھلتی ہوئی دھوپ۔ درختوں میں ہوا کا راگ۔ کھیتوں کے لہلہاتے
پودے اور دور گاڑی کی سیٹی۔ یہ رامی کی استعداد سے بہت دور کی
باتیں تھیں۔ اسی لئے اُسے اپنی زندگی کو طویل کرنے کا شوق نہیں تھا۔
اُس کا سارا دن اپنی کوٹھڑی ہی میں کٹتا۔ اس کی چار دیواری سے اب
وہ اچھی طرح واقف ہوگئی تھی اُس پر سے گوبر کا لیپ اُتر چکا تھا۔
پہلے تو سال میں ایک بار نیا لیپ ہوا کرتا تھا۔ لیکن کچھ سالوں سے گھر
کے سب لوگ سُست پڑ گئے تھے۔ دالان میں جو دروازہ کھلتا تھا۔ وہ
عام طور پر ہمیشہ بند رہتا۔ صبح منہ اندھیرے ہی کھیتوں کی طرف جانے کے
لئے رامی دروازہ کھولتی۔ پھر کھانا کھانے کے وقت کواڑ کھلتا۔ گھسٹ
کر رامی دالان میں آتی۔ اُس وقت سب روٹی کھا چکے ہوتے۔ ایک تھالی
میں جو سب کا بچا کھچا رہتا اُس کے آگے رکھ دیا جاتا۔ سامنے سارے
گھر کے برتن مانجھنے کو رکھے رہتے۔ رامی کبھی ایک کی طرف دیکھتی
کبھی دوسرے کی طرف پھر کھانا کھا کر برتن مانجھنے میں لگ جاتی۔ اس
دوران میں ہی ننھی یا منا کاتنے کے لئے روئی اندر کوٹھڑی میں رکھ
آتے۔ شام کو رامی کی ماں دروازہ کھول کر اندر آتی اور جب تک اندر رہتی
دروازہ کھلا چھوڑ دیتی۔ ایک طرف ٹوٹی ہوئی تپائی پر پڑے ہوئے دیئے
کو جلاتی۔ جس سے چکی کے پتھر اور اُن پر لگا ہوا لکڑی کا دستہ۔ چھت
پر لگا ہوا لکڑی کا جالا اور مٹی کی دیواریں جن پر اب گوبر کا لیپ نہیں رہا تھا۔
شام کے [illegible] سے دکھائی دیتی ہوئی چیزوں کی مانند معلوم دیتیں
رامی کی ماں چکی کے پاس ہی گیہوں کی ٹوکری پیسنے کے لئے رکھ دیتی
سونے سے پہلے وہ ایک بار گیہوں لے کر پھر آتی تاکہ رامی صبح سے پہلے
پہلے اُن کو پیس چھوڑے۔

کوٹھڑی کی تین دیواریں تو بالکل ٹھوس تھیں۔ چوتھی میں ایک
چھوٹی سی کھڑکی تھی جس میں لوہے کی سلاخیں لگی ہوئی تھیں۔ صبح صبح
رامی گھسٹ کر اپنے آپ کو کھڑکی کے پاس لے آتی اور نئے سورج
کی کرنوں سے دمکتے ہوئے دور کے درختوں اور کھیتوں کو دیکھتی
ٹھنڈی ہوا رامی کے چہرے کو لگتی تو رامی کا چہرہ کھل اٹھتا اور وہ
خوشی سے کچھ گنگنانے لگتی۔ جونہی گاؤں کے لوگ گھروں سے باہر
نکلنے شروع ہوتے۔ رامی گھسٹ کر کونے میں اپنی چکی یا چرخے کے
پاس جا بیٹھتی۔ وہ لوگوں کی طنز بھری نگاہوں سے بچنا چاہتی تھی۔ جب کام
کرتے کرتے تھک جاتی تو چھت پر مکڑیوں کو اپنے جال میں پھنسی ہوئی
مکھیوں کو کھاتے دیکھا کرتی۔ دوپہر کو جب باہر شور ہوتا تو چپکے چپکے
کھڑکی میں سے بچوں کو کھیلتے دیکھتی۔ شام کی خاموشی میں آسمان
کے جلتے بجھتے تاروں پر آنکھیں جمائے رکھتی۔ جب دل گھبرانے لگتا تو
کھاٹ پر لیٹ کر رو لیتی۔

یہ روز ہوا کرتا۔ رامی کی دنیا یہی کچھ تھی۔ چوبیس سال تک ایسی
زندگی بسر کرتے کرتے وہ تھک سی گئی تھی اور ایک دن جب چکی پیستے
پیستے گاڑی کی سیٹی سننے کے لئے وہ ذرا رُکی تھی تو سیٹی کی آواز کے ساتھ
ہی جیسے اُس کا تعاقب کرتے ہوئے اس کی روح اس کے جسم کو چھوڑ
کر چلی گئی۔

دھرم پرکاش آنند

اعلان

"کلیم" کے دفتر کو چونکہ ملیح آباد تبدیل کردیا گیا ہے۔ اور ڈکلریشن وغیرہ کے
سلسلے میں ابھی کارروائی مکمل نہیں ہوسکی ہے۔ اس لئے افسوس کے ساتھ اطلاع
دیجاتی ہے کہ آئندہ پرچہ مشترک مئی جون ۳۹ء کا شائع کیا جائے گا۔
قارئین کرام آئندہ سے مندرجۂ ذیل پتے پر مراسلت فرمائیں۔

مدیر کلیم، دفتر کلیم، ملیح آباد۔ لکھنؤ

جوانی کا خواب

صبا کی تُنک آندھیاں چل رہی تھیں
عجب رُت تھی وہ سہانی سہانی

سکوتِ مکمل میں گم ساری ہستی
خموشی کی تھی ہر طرف راجدھانی

تخیل بھی بیدار ہونے لگا تھا
ہر اک چیز میں آ گئی تھی روانی

ابھی رات انگڑائیاں لے رہی تھی
ابھی سو کے اٹھی تھی ظلمت کی رانی

یکایک وہ آئے خراماں خراماں
چلے جیسے سیّارۂ آسمانی

ہر اک گام پر نازکی کی نمائش
ہر اک سانس میں نغمۂ جاودانی

اداؤں میں مستی سموئی ہوئی سی
نظر سے اُبلتی ہوئی نوجوانی

جبینِ حسیں مائلِ دل رُبائی
لبِ نازک آمادۂ گُل فشانی

لُنڈھاتے ہوئے جنبشِ ہر نفس سے
مسرّت کے جام مئے ارغوانی

ہر اک ذرّہ انگڑائیاں لے کے اُٹھا
تمنا بدامن ہوئی عمرِ فانی

مگر ہوش آیا تو کچھ بھی نہ پایا
نہ اُلفت کا مندر نہ مندر کی رانی

کوئی خواب میں جیسے دُہرا رہا تھا
محبت کی بھولی ہوئی سی کہانی

علی احمد

دُنیائے ادب

تازہ ترین رسائل کے اہم مضامین

ہمارے ہاں مدّت سے دستور چلا آتا ہے کہ دنیائے ادب کے عنوان کے ماتحت ہم ہر ماہ ہمعصر رسائل کے مضامین میں سے کوئی نہایت اچھا مضمون چن کر شائع کرتے ہیں۔ اکثر اوقات اس عنوان کے نیچے ایک ہی مضمون چھپ سکتا ہے۔ چونکہ اردو کے اچھے رسالوں کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے اور ان میں ہر ماہ بہت سے اچھے مضامین نظم و نثر شائع ہوتے ہیں۔ اس لئے ہم نے مناسب خیال کیا ہے کہ دنیائے ادب میں ایسے تمام مضامین کا ذکر کر دیا کریں جو اردو کے اچھے رسالوں میں گذشتہ ماہ شائع ہوئے ہوں اور جو ہمارے نقطۂ نظر سے اہم اور قابلِ توجہ ہوں۔ اس سے کئی فائدے حاصل ہوں گے ان میں سے ایک یہ ہے کہ ادبی دنیا کے ناظرین ادبیاتِ حاضرہ کی رفتار و ترقی سے آشنا رہیں گے اور انہیں معلوم ہوتا رہے گا کہ ہمارے ادب میں کیا کیا نئی چیزیں آ رہی ہیں۔ دوسرا فائدہ یہ ہوگا کہ آج سے ایک عرصہ کے بعد اگر کوئی اہلِ قلم کسی قسم کی علمی جستجو کرنا چاہے گا تو ادبی دنیا کے اوراق سے اسے کاروانِ اردو کے چند نقوشِ قدم ضرور مل جائیں گے۔ تیسرا فائدہ یہ ہے کہ اس طرح ہمعصر رسائل کی کچھ تھوڑی سی خدمت کر کے ہم زبانِ اردو کے ادنیٰ خادموں میں شمار ہونے کے قابل ہو سکیں گے۔ امید ہے کہ ادبی دنیا کے اس چھوٹے سے اقدام کی قدر افزائی کی جائے گی۔ (رسائل کی فہرست حروفِ تہجی کے مطابق ہے)

اُردو (سہ ماہی بابت جنوری تا مارچ)

شیکسپیئر کے چند بند کا ترجمہ۔ "اردو" ہمارے اُن رسائل میں سے ہے جنہیں ہم آسانی سے قدامت پسند کا لقب دے سکتے ہیں۔ اس لئے زیرِ نظر شمارے میں ہمیں بلینک ورس کا ایک لمبا نمونہ دیکھ کر قدرے تعجب ہُوا۔ ہماری زبان میں نظم معرّیٰ کو رواج پائے زیادہ عرصہ نہیں گذرا اور جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس بارے میں اہلِ پنجاب ہی نے سبقت کی ہے۔ پنجاب کے رسائل میں بعض نہایت اچھی معرّیٰ اور آزاد نظمیں ایک عرصے سے شائع ہو رہی ہیں لیکن یہ جنس تو جمنا پار اور نربدا پار کے علاقوں میں کچھ ایسی مقبول نہیں ہوئی۔ بارے اب "اردو" کا دفتر جمنا کے اِس پار آ گیا ہے اور شاید اسی کا اثر ہے کہ اس میں ایسی نئی چیزیں شائع ہونے لگی ہیں۔ عابد نواز جنگ صاحب نے ہیملٹ کے چند مشہور بندوں کا ترجمہ بلینک ورس یعنی نظم عاری میں کیا ہے۔ انہیں چند بندوں کا ترجمہ ۵ سال ہوئے حمید عرفانی صاحب کے قلم سے ادبی دنیا میں شائع ہو چکا ہے عابد نواز صاحب کے ترجمہ کا نمونہ ملاحظہ ہو:۔

وے یہ موت ہے کیا شے۔ فقط اک نیند کا عالم
مگر یہ آرزو دل کی کہ ہم اس نیند سے سو کر
مٹا دیں گے وہ ساری کلفتیں جو ارثِ آدم ہیں
تمنّا ہی تمنّا ہے۔ زہے قسمت جو پوری ہو

بسمل فیض آبادی اور اودھ کی قدیم ترین مثنوی کے عنوان سے ایک سیر حاصل مقالہ اس نمبر کی زینت ہے۔ مولوی عبدالباری صاحب آسی کا ذوقِ تحقیق قابلِ داد ہے کہ انہوں نے انتہائی جستجو سے ایک ایسے باکمال اردو شاعر کا کلام معرضِ گمنامی سے نکالا ہے جس کے ذکر سے اردو کے مرّوجہ تذکرے خالی تھے۔ بسمل فیض آباد کے رہنے والے اور دربارِ آصفی سے متعلق تھے۔ اور ان پر دلی اسکول کا کوئی اثر نہ تھا۔ انہوں نے میر حسن کا زمانہ پایا لیکن ان کا رنگ بالکل جداگانہ تھا۔ دیکھئے ۔

الا اے ساقیٔ میخانۂ ناز ۔۔۔ نہ رکھ اے کو لبِ ساغر سے تو باز
غنیمت ہے ارے ظالم کوئی دم ۔۔۔ ہے عرصہ زندگانی کا بہت کم
کہ شمع بزم ہستی آہ فریاد ۔۔۔ سدا رہتی ہے زیرِ دامنِ باد
ذرا اٹھ اور سرانجام سفر کر ۔۔۔ صبوحی سے لبِ ساغر کو تر کر

یادِ وطن کے نام سے مرزا فرحت اللہ بیگ دہلوی نے ایک دل آویز نظم لکھی ہے جس میں وطن کے مختلف مناظر کا چشمِ تخیل سے نظارہ کیا ہے اور جب ان ذہنی نقوش کو کاغذ پر اتارا ہے تو ان میں جا بجا جذبات کے رنگ بھرے ہیں۔ دیکھئے دہلی کی صبح اور جمنا کا کنارا۔

ہر گھاٹ پہ دلی کے حسینوں کا وہ جمگھٹ ۔۔۔ وہ ساڑھیاں ہر رنگ کی دو ہاتھ کے گھونگھٹ
وہ حسنِ خداداد نہیں جس میں بناوٹ ۔۔۔ قدرت کے تماشائی کا دل جس سے ہو لوٹ
آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

اور ان کا وہ پھر گھاٹوں میں ڈبکی کو لگانا ۔۔۔ گھبرا کے گرپانی سے جلدی نکل آنا
بھیگی ہوئی ساڑھی میں بدن کا وہ چھپانا ۔۔۔ جھک جھک کے وہ چلّو سے سورج کو چڑھانا
آنکھوں میں وہی پھرتا ہے جمنا کا کنارا

ہمارا رسم الخط۔ عبدالقدوس صاحب ہاشمی نے رسم الخط کے مسئلے کا غائر نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ ادبی دنیا میں ان کے دو مضمون اردو کے لئے عربی رسم الخط اور لاطینی رسم الخط کی موزونیت اور ناموزونیت کی بحث کے سلسلے میں شائع ہو چکے ہیں۔ زیرِ نظر مضمون میں مذکورہ مضامین کے مواد کے علاوہ کچھ نیا مواد بھی ہے۔ جس سے مضمون نہایت جامع اور سیر حاصل ہو گیا ہے۔ ہندوستان میں رسم الخط کا مسئلہ لسانیات کی حد سے نکل کر سیاسیات کے خارزار میں پہنچ چکا ہے۔ اس لئے ہم میں سے ہر ایک کو اس سے کچھ نہ کچھ واقفیت حاصل کرنا ضروری ہے۔ ہاشمی صاحب کا اندازِ بیان بے حد سادہ اور زبان نہایت سلیس ہے اور وہ پڑھنے والے کی ذہنی کیفیت کو اس خوبی سے سمجھتے ہیں کہ اسے اپنے مضمون سے اُکتانے نہیں دیتے "ہمارا رسم الخط" زبان کے اس اہم مسئلے کی بہت سی اُلجھنوں کو صاف کر دیتا ہے۔

انیس النسواں دہلی (اپریل)

لڑکیوں کی تعلیم مشتاق احمد صاحب زاہدی نے نہایت سنجیدگی سے اس پیش پا افتادہ مسئلہ پر قلم اٹھایا ہے لیکن اس کے بہت سے نئے زاویے اور نئے رُخ پیش کئے ہیں۔ وہ دن لد گئے جب اس موضوع پر بحث ہوتی تھی کہ لڑکیوں کو تعلیم دلائی جائے یا نہ دلائی جائے اب زمانہ بہت آگے بڑھ گیا ہے۔ اور مسئلے میں جو نئی پیچیدگیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ وہ غور و فکر کے لئے بہت سی باتیں پیش کرتی ہیں۔ زاہدی صاحب نے ان کا بہت اچھی طرح جائزہ لیا ہے۔

اورینٹل کالج میگزین (سہ ماہی فروری تا اپریل)

شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد۔ آغا محمد باقر صاحب ایم اے نبیرہ مولانا محمد حسین آزاد مرحوم نے حضرت آزاد کے سوانح حیات پر ایک نہایت جامع مضمون لکھا ہے اور آزاد مرحوم کی سیرت کے معروف اور غیر معروف پہلوؤں پر دلکش انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ مضمون بے حد دلچسپ ہے۔ خصوصاً اس کا وہ حصہ جو آزاد کے آخری سالوں کی داستان ہے از بسکہ یہ مضمون خود آزاد کے خاندان کے ایک معتمد فرد کا لکھا ہوا ہے۔ اس لئے کسی کو واقعات کی صحت سے انکار کی گنجائش نہیں مل سکتی۔ آنے والے ادبی مورخوں کے لئے یہ مضمون نہایت قیمتی ثابت ہوگا۔

جامعہ (اپریل و مئی)

اقبال کا نوجوان از نورالحسن صاحب ہاشمی ایم اے ایک جامع اور لطیف مضمون ہے جو دو قسطوں میں شائع ہوا ہے۔ اقبال نے ملک و قوم کی جو سب سے بڑی خدمت کی ہے وہ اپنے سحرِ کلام سے ہمارے نوجوانوں کے جذبۂ عمل کو بیدار کرنے اور ان کے دلوں میں ہمت کی چنگاری روشن کرنے کی کوشش ہے۔ ہاشمی صاحب نے اپنے مضمون میں اقبال کی تعلیم کے اس رُخ پر نہایت عمدگی سے روشنی ڈالی ہے اگرچہ وہ کہیں کہیں نفسِ مضمون سے ذرا دور جا پڑتے ہیں لیکن بحیثیت مجموعی اُن کی کاوش داد کے قابل ہے۔ جا بجا علامہ مرحوم کے کلام سے موزوں مثالیں لے لے کر مضمون کی دل پسندی میں اضافہ کیا گیا ہے۔

زمانہ (اپریل و مئی)

ہندوستانی زبان کا مسئلہ۔ پچھلے دنوں دہلی سے ملک کے چار پانچ اکابر کی تقریریں ریڈیو پر نشر کی گئی تھیں جن کا موضوع تھا۔ "ہندوستانی زبان کیا ہے"۔ زیرِ نظر بحث میں جناب سہیل عظیم آبادی نے ان تقریروں پر تنقید کی ہے۔ اور سب کا خلاصہ بیان کر کے مختلف پیش کردہ نظریوں کا مقابلہ کیا ہے اور پھر نتیجہ پر ایک دلچسپ بحث کر کے

خود چند نتائج نکالے ہیں جن میں سے ایک یہ ہے "اب ہمارے لئے صرف ایک صورت باقی رہ جاتی ہے کہ ایمانداری کے ساتھ زبان کو زیادہ آسان بناتے چلے جائیں اور بس" اور دوسرا یہ " لیکن یہ سب کچھ جبھی ممکن ہے کہ تمدن، کلچر وغیرہ کے مفروضے ہمارے دماغوں سے نکل جائیں اور ہم اپنی سیاسی اور سماجی زندگی میں ایک ہی رجحان پیدا کرلیں۔ اسی لئے ہمیں زبان کو ایک کرنے سے پہلے اپنی سیاسی اور سماجی زندگی کو ایک بنانے کی کوشش کرنی چاہیئے" سہیل صاحب نے زبان کا مسئلہ سلجھانے کی ترکیبیں تو اچھی پیش کی ہیں مگر یہ ترکیبیں بجائے خود عظیم الشان مسائل کی حیثیت رکھتی ہیں۔

علی گڑھ میگزین (سہ ماہی مارچ سے مئی تک)

خاندانِ برمکی کی مختصر تاریخ از سلیم حامد صاحب رضوی ایک دلچسپ اور قابلِ قدر مضمون ہے۔ رضوی صاحب نے تاریخ خلافت عباسی کے ایک نہایت دل آویز اور رنگین باب کا خلاصہ چند صفحوں میں لکھ کر رکھ دیا ہے۔ اور ضروری مطالب اور جزئیات کی تفصیل سے کہیں گریز نہیں کیا۔ خاندان برامکہ کی علم دوستی شرافت بردباری اور جود و سخا کی نظیر مشرق کی تاریخ میں کہیں نہیں ملتی اور اس کے عروج و زوال کی داستان زمانے کی نیرنگیوں کی ایک ایسی مثال ہے جو یقیناً اپنا ثانی نہیں رکھتی جعفر برمکی کے قتل کا منظر ازبس دردناک ہے اور اس مقالے کا بہترین مقام کہلانے کا مستحق ہے۔

ساقی (مئی)

"عہدِ رفتہ کی یاد میں" ماہر القادری صاحب نے ایک دلپذیر نظم لکھی ہے۔

گاؤں کے وہ لہلہاتے سبزہ زار — خوشنما طائر قطار اندر قطار
نالیاں کھیتوں کی مثل آبشار — ہر طرف سرسوں کے پھولوں کی بہار
زندگانی کا فسانہ یاد ہے
مجھ کو اب بھی وہ زمانہ یاد ہے

اسی طرح کے گیارہ بارہ بند ہیں اور سبھی اچھے ہیں۔ لیکن افسوس ہر کہ ایک بند کے مصرعۂ اول میں وزن کا خیال نہیں کیا "گاؤں کی معصوم کنواری لڑکیاں" معصوم کی م تقطیع میں گر جاتی ہے۔ تعجب ہے کہ مدیر ساقی کی باریک بین نظر سے یہ غلطی کیونکر چھوٹ گئی۔

شاعر آگرہ (مارچ اپریل)

ہندوستان کے ٹھگ عبدالحفیظ صاحب ثمر کا لکھا ہوا ایک نہایت دلچسپ مضمون ہے جس کی تدوین میں کافی محنت کاوش اور تحقیق سے کام لیا گیا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے دور آخر خصوصاً لارڈ ولیم بنٹنگ کے عہد میں ٹھگی کے استیصال کی زبردست کوشش کی گئی اور کرنل سلیمن نے ٹھگوں کے حالات، رسوم، اور اعمال پر ایک نہایت دلچسپ کتاب بھی تصنیف کی۔ اردو میں جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس موضوع پر کوئی مستند کتاب نہیں لکھی گئی۔ اس کے پیش نظر حفیظ صاحب کا یہ مقالہ بہت دلچسپی سے پڑھے جانے کی چیز ہے۔

شاہکار (مئی)

جعلی شہزادے۔ منشی محمد دین صاحب فوق تاریخی مضامین بہت اچھے لکھتے ہیں۔ یہ مضمون انہی کے قلم سے نکلا ہے اور اپنے انداز کا نرالا مضمون ہے۔ دور مغلیہ میں اور اس طوائف الملوکی کے زمانے میں جب ہندوستان سے تیموریوں کی حکومت اُٹھ رہی تھی۔ کئی ایسے منچلے لوگ پیدا ہو گئے جنہوں نے اپنے زمانے کی مختلف مشہور و معروف ہستیوں سے اپنے کو موسوم و منسوب کر کے عوام اور عمائد حکومت کو فریب دینے کی کوششیں کیں۔ منشی صاحب موصوف نے کمال جستجو اور تحقیق سے ایسے بہت سے لوگوں کے حالات بہم پہنچائے ہیں۔ مضمون تاریخی لحاظ سے قابلِ قدر ہے۔

نقوشِ احساس کے عنوان سے سید عبدالحمید عدم کی ایک بہت اچھی غزل بھی اسی شمارہ کی زینت ہے۔ چند شعر ملاحظہ کیجئے۔

میں اپنے ذوقِ رنگ پرستی کو کیا کروں — اس گُل میں مانتا ہوں نہ بو ہے نہ باس ہے
اللہ رے بے نقابیٔ احوالِ عاشقی — ہر مضطرب نگاہ میں اک التماس ہے
میں بھی حرم نشیں ہوں مگر اتفاق سے — مجھ کو بلائے دیر بھی تھوڑی سی راس ہے
مے ہو کہ زہر کچھ تو میسر ہوائے عدم — حد سے فزوں جراحتِ ہوش و حواس ہے

افسوس کہ ایک مصرعے میں ایک کی بجائے اک چھپ گیا ہے۔
وہ مصرعہ یہ ہے۔ دل ایک تشنگی ہے نظر ایک پیاس ہے۔

نگار (اپریل)

ساٹھ سال کے بعد ہماری ادبیات

احمد حسین صاحب نے مذکورہ بالا موضوع پر ایک خیال انگیز مضمون لکھا ہے اور موجودہ تعلیمی اور سیاسی رجحانات کو مدنظر رکھ کر اردو ادب کی آئندہ رفتار کو جانچا ہے۔ ازبسکہ ادب زندگی کا آئینہ ہے اور زندگی اس

دور میں ایک مسلسل انقلاب کا نام ہے۔ اس لئے لازم ہے کہ ادبیات میں بھی اس قدر تبدیلی پیدا ہو جائے کہ آج سے ساٹھ سال بعد ہمارا ادب کہیں سے کہیں جا پہنچے۔ لیکن وہ کن راہوں پر چل کر مستقبل کی منازل طے کرے گا۔ اس کے متعلق صحیح اندازہ کرنا ایک نہایت دشوار امر ہے ہمیں مسرت ہے کہ صاحب مضمون نے نہایت مدلّل طریقے سے اُن شاہراہوں کی تفصیل بیان کی ہے جن پر اُن کے خیال میں ہماری ادبیات گامزن ہوں گی۔ ان کے خیال میں توسیع تعلیم کے بعد ایک ہی نسل کے اندر اندر مزدور اور کسان قارئین کی تعداد کروڑوں تک پہنچ جائے گی اور عامۃ الناس کی زندگی کے ہزاروں متنوّع مناظر اور مختلف پیشوں۔ ریت رسموں اور دلچسپیوں کی جیتی جاگتی تصویریں کچھ اس طرح پیش کی جائیں گی کہ ادب کی تاریخ میں پہلے کبھی نہ کی گئی تھیں۔

ہل (مئی)

زیر نظر نمبر میں ایڈیٹر صاحب (شری ناتھ سنگھ) کا لکھا ہوا ایک افسانہ "کیا وہ واقعی خونی تھا" چھپا ہے۔ موضوع دولت مند زمیندار اور غریب کسان کی باہمی آویزش ہے اور افسانے کے پلاٹ بلکہ نام تک سے کسان کی مظلومیت کا پروپیگنڈا کیا گیا ہے۔ ٹیکنیک کے لحاظ سے افسانہ بہت کامیاب ہے۔ اگرچہ ایک مخصوص مقصد کو پیش نظر رکھنے کے نقائص سے خالی نہیں ہے۔ زبان سادہ اور دلکش ہے لیکن بعض جگہ ادبی غلطیاں بھی نظر آتی ہیں جو ذرا سی احتیاط سے دور کی جا سکتی تھیں۔

ہمایوں (مئی)

گلاب کا پھول۔ سید عباس علی کے قلم نے گلزار ادب میں کھلایا ہے۔ یہ ایک بہت اچھا افسانہ ہے جس میں مرد کی نیرنگیٔ فطرت کا نقشہ ایک اچھوتے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ افسانے کی فضا بہت نکھری ہوئی ہے اور یہی اس کی سب سے بڑی خصوصیت ہے عطیہ کا کردار ایک دلچسپ انسانی مطالعہ ہے۔ اگرچہ اس کی مثالیں ہماری سوسائٹی میں بہت کم یاب ہیں۔

زلزلے۔ محمد باقر صاحب نسیم رضوانی نے لندن کی مخلوط مجلسی زندگی کا ایک دلکش مطالعہ اس عنوان کے ماتحت پیش کیا ہے ہندوستانیوں کو مغرب کی فضا میں جن معاشرتی اور تمدنی انقلابات میں سے گذرنا پڑتا ہے اُن کا ایک ہلکا سا نقش اس مضمون کی فضا پر چھا رہا ہے۔ "اور نئے ماحول سے کامل سازگاری اختیار کرنے میں جو دو چار بڑے سخت مقام آتے ہیں" اُن پر ایک لطیف پیرائے میں طنز کی گئی ہے۔

قطرہ و دریا۔ حامد علی خاں صاحب مدیر ہمایوں کی ایک تازہ نظم ہے اور ان کے پختہ طرز کلام کی پوری آئینہ دار۔ ملاحظہ کیجئے:-

اسی عالم میں کہ بیدار نہ تھا میں گویا — مجھ سے قطرے تھے مخاطب بزبانِ الہام
تو نے پایا نہیں سرچشمۂ ہستی کا سراغ — ہم کو دریا میں فنا ہو کے ملا عیشِ دوام
یہی انجام ہے قطرے کا یہی ہے آغاز — ہے ابھی بے خبر آغاز سے تیرا انجام

ہندوستانی (اپریل)

چکبست۔ یہ ڈاکٹر تاراچند صدر مدیر نے ایک دلچسپ، اگرچہ مختصر مضمون لکھا ہے اور اُن کے کلام پر تبصرہ بھی فرمایا ہے۔ چکبست کی قومی اور بیانیہ شاعری ہماری زبان میں ایک خاص امتیاز اور مرتبہ رکھتی ہے اور اُن کی ان خصوصیات کے پیش نظر یہ مقالہ بہت دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔ چکبست کا کلام اگرچہ مختصر تھا لیکن اپنی تازگی سلاست اور جذبات کی صحیح عکاسی کی بدولت اُس نے ہماری ادبیات میں ایک ممتاز مقام حاصل کر لیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ مقالہ لکھ کر بہت سے اہلِ ذوق کو "صبحِ وطن" کا گرویدہ بنا دیا ہے۔

صلاح الدین احمد

شعر

گاہ مری نگاہِ تیز چیر گئی دلِ وجود
گاہ اُلجھ کے رہ گئی اپنے توہمات میں

اقبال

ہندوستان میں چھاپہ خانوں کا پہلا دور

(۱۵۵۷ء لغایت ۱۷۰۰ء)

ہندوستان میں چھاپہ خانوں کے آغاز کے متعلق معلومات قریب قریب معدوم ہیں۔ دو چار کتابیں ہیں بھی تو اُن غیر ملکی زبانوں میں ہیں جن سے اہلِ ہند استفادہ نہیں کر سکتے۔ انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا سے بالعموم تمام حل طلب مسائل پر کچھ نہ کچھ روشنی پڑ جاتی ہے، لیکن اس باب میں وہ بالکل خاموش ہے۔ دوسری طرف بالفور کی "سائیکلوپیڈیا آف انڈیا" نے ہندوستان میں مطابع کی تاریخ پر جو بیان درج کیا ہے، اس میں سولھویں اور سترھویں صدی کے مطابع کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ اس کے بیان کے مطابق ہندوستان میں مطبع کا آغاز سنہ ۱۷۱۲ء میں اس زمانے میں ہوا جب ٹرانکوبار میں "پراٹسٹنٹ" مشنریوں نے اپنی خدمات کا سلسلہ شروع کیا تھا۔

زمانۂ حال میں سب سے پہلے "منگلور میگزین" (کرسمس سنہ ۱۹۱۰ء) نے ہندوستان میں چھاپہ خانوں کے آغاز کے باب میں تحریر کیا تھا کہ "ہندوستان میں سب سے پہلی کتاب ۱۵۷۷ء میں کوچین میں طبع ہوئی۔ اس اعلان نے ایک معنی میں سنسنی پیدا کر دی۔ متعدد اخبارات و رسائل نے اس بیان کی مخالفت و تائید میں مضامین شائع کئے۔ سب سے زیادہ "مدراس میل" نے اس بحث میں حصّہ لیا۔ اُس نے اپنی اشاعت مورخہ ۱۸ مارچ سنہ ۱۹۱۱ء میں لکھا تھا:-

> "سر ولیم ہنٹر نے امپیریل گزیٹیر آف انڈیا، جلد چہارم ص ۱۲۱ میں تحریر کیا ہے کہ ہندوستان میں سب سے پہلی کتاب ۱۵۷۷ء میں کوچین کی جیسوئٹ سوسائٹی نے طبع کی۔ اسی قسم کا ایک بیان لفٹنٹ ایچ۔ ایس براؤن نے اپنی کتاب "ہینڈ بک آف پورٹس آف انڈیا اینڈ سیلون" (ص ۱۲۹) میں درج کیا ہے۔ یہ دونوں بیانات غلط ہیں۔ جیسوئٹ پادری گوا میں سولھویں صدی کے اول نصف میں آئے۔ فونسیکا نے "ہسٹری آف گوا" (ص ۵۸) میں لکھا ہے کہ انہوں نے گوا میں آنے کے تھوڑے دنوں بعد یورپ سے دو پریس منگائے اور انہیں اپنے دو کالجوں: سینٹ پال اور رلیشول میں قائم کیا، یہ دونوں کالج ۱۵۴۱ء میں قائم ہوئے اور روز افزوں ترقی کر رہے تھے۔ ان کالجوں کے اسٹاف میں کئی نامی گرامی ہستیاں شامل تھیں۔ مثلاً سینٹ فرانسس زیویر۔۔۔۔
>
> گوا میں یہ پریس سنہ ۱۵۵۰ء میں آئے یعنی واسکوڈی گاما کے ہندوستان آنے کے ۵۲ برس بعد۔ جیسوئٹ پادری غیر معمولی طور پر سرگرم تھے۔ ترقی کے دلدادہ تھے، اور خاص طور پر کوشاں تھے کہ سائنس و لٹریچر کی کسی شاخ کو ہاتھ لگائے بغیر نہ چھوڑیں گے۔ ان حالات میں یہ کیونکر یقین کر لیا جائے کہ ان لوگوں نے دونوں پریسوں کو ۲۷ برس تک اپنے یہاں بیکار پڑا رہنے دیا۔ ۱۵۴۱ء میں گوا کے وائسرائے جان ڈی کیسٹرو کو شاہ پرتگال، جان سوم نے حکم دیا تھا کہ گوا کے اُن دیہات میں جہاں مسیحی خاندان پائے جاتے ہیں، ابتدائی مدارس قائم کئے جائیں۔ اس حکم کی تعمیل ہوئی اور مسیحی بچوں کو مذہبی تعلیم کے لئے سینٹ فرانسس زیویر نے "مسیحی تعلیم کا خلاصہ" بطور سوال و جواب تیار کیا جو ۱۵۵۷ء میں طبع ہوا۔"

(اوزیمبل کانکویسٹ جلد اول ص ۱۸، ہسٹری آف گوا ص ۵۸)

اس خط کی اشاعت کے بعد ہندوستان کے اخبارات کے علاوہ غیر ملکی اخبارات بھی اس بحث میں شریک ہو گئے۔ اس سلسلے میں بشپ میڈلی کاٹ کا وہ مضمون خصوصیّت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے جو آپ نے رسالہ "ٹبلٹ" میں شائع کیا تھا۔ آپ نے ہندوستان کے اول مطبع کا صحیح زمانہ تعیّن کر کے اس بحث کو گویا ختم کر دیا۔

(۱) گوا ۱۵۵۷ء جیسوئٹ پادریوں نے گوا میں آنے کے کچھ عرصہ بعد یورپ سے دو پریس منگائے اور اُن کو اپنے دو کالجوں میں قائم کیا۔ پریس سنہ ۱۵۵۰ء میں آئے تھے مگر معلوم ہوتا ہے کہ چند سال تک واقعی اُن سے کام نہیں لیا گیا۔ ۱۵۵۷ء میں سینٹ فرانسس زیویر نے "کاٹی کزم آف دی کرسچن ڈاکٹرن" (مسیحی تعلیمات، بطور سوال و جواب) مدوّن کی جو چھاپ کر شائع کی گئی۔ یہ سب سے پہلی کتاب تھی جو گوا[1] میں طبع ہوئی۔ جس کتاب سے

[1] پرتگیزی دور میں گوا ہندوستان سے الگ نہ تھا۔ بلکہ اس کا شمار بھی ہندوستانی مقبوضات میں تھا

یہ معلومات حاصل کی گئی ہیں، اُس کا بیان ہے کہ:۔

"بچوں کی صحیح تعلیم کی غرض سے زیویر نے ایک کاٹی کزم تیار کی جو
گوا میں ۱۵۵۷ء میں طبع ہوئی۔"

(اورینٹیل کانکویسٹ مطبوعہ لسبن ۱۷۱۰ء جلد اول)

اس کتاب میں مذکور ہے کہ کاٹی کزم کے علاوہ ایک پرائمر سے بھی کام لیا جاتا تھا جس کو فادر مارکس جارج نے تالیف اور فادر ٹامس اسٹیونس ایک انگریز نے مقامی زبان میں ترجمہ کیا۔ اس بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ ۱۵۵۷ء کی کاٹی کزم مقامی زبان میں نہ تھی، بلکہ پرتگالی زبان میں تھی۔ گوا کے مطبع کے متعلق جو اسنادیں موجود ہیں اُن سے نیز بعض قدیم دستاویزوں سے بھی، اس بات کا ثبوت ملتا ہے کہ ہندوستان میں سب سے پہلی کتاب مالابار میں طبع ہوئی تھی۔

۲۔ کوچین ۱۵۷۷ء | گوا کی کاٹی کزم کی طباعت کے ۲۰ برس بعد ۱۵۷۷ء میں یعنی کیکسٹن پریس کی سب سے پہلی کتاب کی طباعت کے کامل ایک صدی بعد جیسوئیٹ سوسائٹی کے ایک ہسپانوی ممبر جان گنسالوس نے سب سے پہلی بار ملائلم تامل زبان کے حروف کندہ کئے اور سینٹ فرانسس زیویر کی "مسیحی تعلیمات" کا ترجمہ "کھرشٹیہ وناکم" کے نام سے چھاپا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا ایک نسخہ پیرس کے قومی کتب خانے میں اب تک موجود ہے۔

یہاں تک تو قدیم و جدید شہادتیں متفق ہیں، لیکن جب جان گنسالوس کے پریس کے مقام وقوع کو دریافت کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو مالابار کے دو مقام اس اعزاز کے مستحق ثابت ہوتے ہیں کوچین کے باا ثر اخبار آرگس کی رائے پڑھ کر تعجب ہوتا ہے جو اُس نے اس بارے میں ظاہر کی ہے

"... یہ بات کچھ صحیح نہیں کہ سب سے پہلی کتاب کوچین میں طبع
ہوئی۔ جیسوئیٹ پادری ۱۵۴۹ء میں کوچین میں آئے اور ۱۵۵۵ء
میں یہاں کی عبادت گاہ باقاعدہ طور پر اُن کے حوالہ کی گئی۔ اُس
زمانے میں مشنری خدمات کا مرکز گوا تھا۔ کوچین میں اُن کا کوئی اہم
ادارہ نہ تھا۔ ..."   (آرگس مورخہ ۲۳ مارچ ۱۹۳۸ء)

یہ دعوے سراسر غلط ہے۔ کوچین کے قلعے میں پادریوں کی قیام گاہ اور گرجہ گھر کے علاوہ سوسائٹی کا ایک کالج بھی تھا جس میں تین سو سے زائد طلباء زیر تعلیم تھے۔ خود سینٹ فرانسس زیویر اپنے گوا اور روم کے احباب کو کوچین کالج کے بارے میں کچھ لکھتے رہتے تھے۔

ہم نے بیان کیا ہے کہ کوچین میں ملائلم تامل زبان میں کاٹی کزم طبع ہوئی تھی۔ ذرا اُن اسباب اور وجوہ پر بھی نظر ڈالنا چاہئے جو اس کے محرک ہوئے۔ جیسوئیٹ سوسائٹی کی تاریخ میں مذکور ہے کہ سوسائٹی کے جنرل نے فادر ویلیسگنانی کو وزیٹر کی حیثیت سے گوا و مالابار کے صوبوں کے معائنہ کو بھیجا تھا۔ آپ ۴۴ پادریوں کے ساتھ ۱۵۷۴ء میں گوا پہنچے۔ اس زمانے میں مغربی ساحل پر کچھ مذہبی بدمزگی پیدا ہو گئی تھی۔ فادر ویلیسگنانی اُن شکایات کو رفع کرنے کی غرض سے گوا سے مالابار تشریف لے گئے، اور کلیسائے سینٹ ٹامس کے آرچ بشپ سے متعدد ملاقاتیں کیں۔ بالآخر یہ بات طے ہوئی کہ جیسوئیٹ سوسائٹی کے کارکن وپی کوٹہ کی سکونت اختیار کریں اور عوام کی مذہبی تعلیم و تربیت میں آرچ بشپ اور اُن کے مددگاروں کا ہاتھ بٹائیں۔ ان حالات میں اس بات پر تعجب نہ ہونا چاہئے کہ انہیں سب سے پہلے کاٹی کزم کی طباعت کا خیال پیدا ہوا۔ گوا میں اس طریقے سے کام لیا جا چکا تھا۔ علاوہ بریں، کاٹی کزم کے ذریعے سے مذہبی تعلیم دینا سب سے پہلا کام ہے جو تمام مسیحی فرقوں میں اختیار کیا جاتا ہے۔

فادر فرانسس ڈی سوزا لکھتے ہیں:۔

"ہم نے مالاباری زبان میں کاٹی کزم کی طباعت کے کام کو ہاتھ
لگایا۔ برادر جان گنسالوس نے چھپائی کے لئے چوبی ٹھپے (بلاک)
تیار کئے۔ یہ سب سے پہلی کتاب تھی جو ہندوستان میں چھپی، اور
چونکہ یہ ایک بالکل نئی چیز تھی، علاقہ کے لوگوں نے بھی اس کی خاطر
خواہ قدر کی۔"

یہی رائے ویراپولی کے مذہبی حلقہ کے رومن کیتھولک پادریوں کی ہے، جنھوں نے ۱۸۷۰ء میں "کیرالا میں سچے مذہب کی تاریخ" شائع کی ہے۔ اس "تاریخ" کے مصنف بشپ ماسیلی نس نے قدیم یادداشتوں نیز سولہویں اور سترھویں صدی کے مصنفین سے بہت استفادہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:۔

"... سینٹ پال کالج کے منتظمین نے قلعہ کوچین میں ۱۵۷۷ء
میں ملائلم زبان میں ایک کاٹی کزم چھاپی جس کے لئے جان گنسالوس
نامی ایک جیسوئیٹ برادر نے ٹھپے بنائے تھے۔"

مسٹر جی پیکنزی اپنی کتاب "ٹراونکور میں مسیحیت" میں وپی کوٹہ کے پریس کے بارے میں لکھتے ہیں:۔

"ہندوستان میں یہ پہلا مطبع نہ تھا۔ ۱۵۷۷ء میں ایک ہسپانوی،
جان گنسالوس نے کوچین میں سب سے پہلی مرتبہ ملائلم تامل زبان

کے حروف تیار کر کے ایک کاٹی کزم چھاپی تھی"۔

"اور نٹیل کانکویسٹ" کے بیان کے علاوہ جو دیگر آراء ہم نے پیش کی ہیں اگرچہ نسبتاً زمانہ حال کی ہیں، لیکن بیشتر قدیم یادداشتوں پر مبنی ہیں۔ ذیل میں دو اور شہادتیں ملاحظہ ہوں[1]:-

(۱) سب سے پہلی کتاب جو ٹائپ سے طبع ہوئی، جان گنسالوس کی طبع کردہ "مسیحی تعلیمات" ہے۔ ہمارے علم میں جان گنسالوس پہلا شخص ہے جس نے اول بار تامل حروف کندہ کئے"۔

(۲) "۱۵۷۷ء میں کوچین میں جان گنسالوس نے پہلی مرتبہ مالاباری تامل حروف لکڑی پر کندہ کئے جن کے ذریعے سے "مسیحی مذہب کی ابتدائی تعلیم" ہندوستان میں اول کتاب کی حیثیت سے طبع ہوئی"۔

جان گنسالوس کا پریس کوچین کے پرتگالی قلعہ میں قائم تھا۔ ۱۵۷۸ء میں بھی ایک پریس قلعۂ کوچین میں تھا۔ مگر ۱۵۷۷ء والے پریس سے اس کو اس سے کچھ واسطہ نہیں۔ کوچین پر جب چھ ماہ کے محاصرے کے بعد ڈچ قبضہ ہوا۔ (۶ جنوری ۱۶۶۳ء) تو انہوں نے کوچین کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ جسیوئیٹ پادریوں کو بہت زیادہ نقصان اُٹھانا پڑا۔ ان کو خارج البلد کیا گیا۔ ان کے متعدد راہب خانوں، شاندار کالج، دو شفاخانوں، بشپ کی قیام گاہ اور تبرو گرجوں کا نام ونشان تک مٹا دیا گیا۔ اکتوبر ۱۷۹۵ء میں کوچین پر انگریزوں کا تسلط ہوا۔ رہی سہی کسر ۱۸۰۶ء میں انہوں نے پوری کر دی یعنی پرتگالی دور کے تمام آثار کو بارود سے اُڑا دیا۔ بہت سی پبلک عمارات اور ایک عظیم الشان کتھیڈرل جو ڈچ لوگوں کی دستبرد سے بچ رہے تھے، اس بار وہ بھی مٹ گئے۔

(۳) پنی کیل ۱۵۷۸ء | ۱۵۷۹ء میں ایک مطبع موضع پُنی کیل (ضلع تناولی) میں قائم ہوا۔ یہ موضع کیپ کامرن سے بیس میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ اور اُس زمانے میں موتیوں کی پیداوار وتجارت کا خاص مرکز تھا۔ یہ مطبع فادر جان ڈی فیبریا نے قائم کیا تھا۔ اس زمانے میں کورومنڈل کے ساحل کی زبان تامل تھی۔ پادری صاحب مذکور نے تامل زبان کے حروف خود کاٹے اور پھر اُن کو ڈھال کر مذہبی تعلیم کے لئے کئی چھوٹی چھوٹی کتابیں چھاپ کر شائع کیں۔ مزید برآں انہوں نے تامل زبان کا قاعدہ اور اسی قسم کی دو ایک کتابیں اور بھی چھاپیں تاکہ اس علاقے میں کام کرنے والے مشنری وہاں کی زبان لکھنا پڑھنا سیکھ سکیں۔ مطبوعہ کتابیں اُس زمانے میں ایک عجوبہ تھیں۔ مسیحیوں کے علاوہ غیر مسیحی بھی مانگ مانگ کر انہیں بڑے اشتیاق سے پڑھتے تھے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ پُنی کیل کے مطبع میں جو ٹائپ استعمال ہوتا تھا، اُس کا ایک ایک حرف جمایا جاتا تھا۔ کوچین کے مطبع کی طرح سالم صفحے کا ٹھپہ تیار نہیں کیا جاتا تھا۔

(۴) اپی کوٹہ ۱۶۰۲ء | سینٹ ٹامس کلیسا سے معاہدہ ہونے کے کچھ عرصہ بعد ۱۵۷۹ء میں جسیوئیٹ پادریوں نے اپی کوٹہ (چنامنگلم) کو اپنا مستقر بنایا۔ یہ مقام کرنگانور سے جانب جنوب ایک میل کے فاصلے پر تھا۔ ۱۵۸۱ء میں یہاں انہوں نے ایک عبادت گاہ بنائی اور ۱۵۸۴ء میں مدرسۃ الٰہیات قائم کیا، اور ۱۵۸۷ء میں ایک کالج قائم کیا۔ اسی زمانے میں انہوں نے پاپائے روم سے استدعا کی کہ باشندگان مالابار کی مذہبی تعلیم کے لئے مخصوص کتب ارسال کی جائیں۔ پاپائے روم (کلیمنٹ ہشتم) نے کتابیں تو ارسال نہ کیں بلکہ ایک پریس اور کلدانی زبان کا ٹائپ بھیج دیا۔ یہ پریس ۱۶۰۲ء میں آیا، اور فادر البرٹ لارشی نے اس کو اپی کوٹہ میں قائم کیا۔ مطبع قائم ہونے کے بعد پے درپے کئی کتابیں طبع ہوئیں۔ یہ سب کتابیں مذہب کی ابتدائی تعلیم کے متعلق تھیں، اور کلدانی زبان میں چھاپی گئی تھیں۔

(۵) امبلاکاڈ ۱۶۷۹ء | ایک اور مطبع ۱۶۷۹ء میں موضع امبلاکاڈ میں قائم ہوا۔ یہ موضع ترچور سے بیس میل جانب جنوب واقع تھا۔ امبلاکاڈ سترھویں صدی میں جسیوئیٹ پادریوں کی مصروفیات کا مرکزی مقام تھا۔ ۱۶۶۲ء میں اس جگہ ایک مدرسۃ الٰہیات بھی قائم ہوا تھا جو سینٹ پال سمینری کے نام سے مشہور تھا۔ اس گاؤں کا ایک حصہ وہاں کی زبان میں اب تک ایک ایسے نام (SAOPAULOUR.) سے مشہور ہے۔ جس کا ترجمہ ہے "سینٹ پال کا گاؤں"۔

ترچور کے مسیحیوں سے روایت ہے کہ امبلاکاڈ میں ایک مطبع ۱۵۵۷ء میں قائم ہوا تھا۔ لیکن کسی تحریری شہادت کی عدم موجودگی میں اس کو وثوق کے ساتھ پیش نہیں کیا جاسکتا۔ امبلاکاڈ کے مطبع سے سب سے پہلے تامل و پرتگیزی ڈکشنری (مولفہ فادر انتونی پروئینزا متعلقہ مدورا مشن) ۱۶۷۹ء میں طبع ہوئی۔ اس ڈکشنری کے لئے ایک مالاباری

[1] ہر دو شہادتوں کا ماخذ لاطینی زبان کی دو کتابیں ہیں جو ۱۷۹۶ء و ۱۷۹۴ء میں روم میں طبع ہوئیں۔

مسیحی نے تامل زبان کے الفاظ کے ٹھپّے تیار کئے تھے۔

ڈکشنری کی طباعت واشاعت کے بعد اسبلا کاڑ کے مطبع سے اور بہت سی کتابیں چھپ کر شائع ہوئیں۔ بلکہ کہنا چاہیئے کہ کوچین اور ویپی کوٹہ کے مطابع کے مقابلے میں یہاں کے مطبع نے نمایاں ترقی کی تھی۔ تامل حروف کے لئے چوبی ٹھپّے استعمال کئے جاتے تھے اور یورپین زبانوں کے الفاظ کے لئے سیسے کے حروف جو عام طور پر مروج ہیں۔ لیکن کچھ عرصہ بعد تامل حروف بھی ڈھال لئے گئے تھے۔ چنانچہ ۱۷۱۳ء کے بعد متعدد تامل کتابیں سیسے کے حروف سے چھاپی گئی ہیں۔

جن مطابع کا ہم نے ذکر کیا ہے، اُن کا کسی سائیکلوپیڈیا میں ذکر نہیں ہے۔ چنانچہ سائیکلوپیڈیا آف انڈیا نے ہندوستان میں چھاپہ خانوں کا آغاز اٹھارھویں صدی کے شروع میں بتایا ہے۔ ہم نے صرف سولھویں اور سترھویں صدی کے مطابع کا ذکر کیا ہے، اور ہمارے خیال میں وہی زمانہ "ہندوستان میں چھاپہ خانوں کا پہلا دور" تھا۔ اُس کے بعد اٹھارھویں صدی میں مطابع کا دوسرا دور شروع ہوتا ہے۔ پہلے دور میں چھاپہ خانوں کی پیدائش ہوئی اور دوسرے دور میں اُن کی نشوونما۔

اٹھارھویں صدی میں اس کام میں پروٹسٹنٹ مشنریوں نے نمایاں ترقی کی تھی۔ منجملہ ان کے ڈاکٹر ولیم کیری کا نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے، جنھوں نے ہندوستان کی دس بارہ زبانوں مثلاً بنگالی، ناگری، سنسکرت، تلیگو، پشتو، برمی، تامل، سنگالی، ملائی وغیرہ میں انجیل مقدس کا ترجمہ چھاپ کر شائع کیا تھا۔ حتیٰ کہ چینی زبان میں بھی انجیل مقدس شائع کی، جس کی طباعت کے لئے سیسے کے حروف تیار کئے گئے تھے، حالانکہ خود چین میں چوبی حروف یا ٹھپّے استعمال ہوتے تھے۔ ڈاکٹر کیری کے مطبع (واقع سیرامپور نزد کلکتہ) کی مصروفیات و ترقی کا اندازہ اسی سے ہوسکتا ہے کہ انہوں نے اپنی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے ٹائپ فاؤنڈری اور کاغذسازی کا کارخانہ قائم کیا تھا۔ وہاں کا کاغذ آج تک "سیرام پوری" کے نام سے مشہور ہے۔ ٹائپ کا کارخانہ ۱۸۶۰ء تک اور کاغذسازی کا ۱۸۶۵ء تک قائم و جاری رہا۔

ڈاکٹر ولیم کیری کی گراں بہا خدمات کا تذکرہ کسی آیندہ موقع پر ہدیۂ ناظرین کریں گے۔

"زمانہ" سے باجازت

پیارے لال شاکر (میرٹھی)

نقد و نظر

سخنورانِ دکن

مولفہ جناب تسکین عابدی۔ لکھائی چھپائی اچھی۔ کاغذ سفید ڈمی۔ ضخامت کتابی سائز کے چار سو صفحات۔ متعدد عکسی تصاویر۔ قیمت تین روپے۔ (۳ روپے)
ملنے کا پتہ: مکتبۂ ابراہیمیہ حیدرآباد دکن۔

تسکین عابدی صاحب کے نام سے ناظرین ادبی دنیا خوب آشنا ہیں کہ ان کے شگفتہ مضامین گاہے ماہے اس رسالے میں چھپتے رہتے ہیں۔ تسکین صاحب نے سخنورانِ دکن کے نام سے دکن کے اُن اردو شعرا کا ایک تذکرہ تصنیف کیا ہے جو عہدِ عثمانی میں یعنی ۱۹۱۱ء سے لے کر آج تک سرزمین دکن میں موجود رہے۔ یا موجود تھے۔ اور اس خصوصیت میں انہوں نے ملکی اور غیر ملکی کی تمیز روا نہیں رکھی۔ اس تذکرے میں تقریباً چھ سو شعراء کے مختصر حالات اور ان کے کلام کے نمونے دیئے گئے ہیں اور حق یہ ہے کہ مؤلف نے ان کی تدوین میں بہت کاوش اور جستجو سے کام لیا ہے۔

جناب نیاز فتح پوری نے اس تالیف کا پیش لفظ لکھا ہے۔ اور ہمارے کرم دوست سید تمکین کاظمی نے کہ جناب تسکین کے اُستاد بھی ہیں۔ ایک فاضلانہ مقدمہ تحریر فرمایا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خاص دکن کے شاعروں کا کوئی اچھا تذکرہ اس سے پہلے نہیں لکھا گیا۔ بقولِ صاحبِ موصوف "مولانا صوفی ملکاپوری نے شعراءِ دکن کا ایک تذکرہ دو حصوں میں شائع کیا تھا مگر اس میں خواجہ حافظ بھی دکنی شاعر بنا دیئے گئے تھے کیونکہ ان کا مقصد دکن تشریف لانے کا تھا۔ اس قسم کی بدحواسیاں اور لوگوں نے بھی کی ہیں ــــ مگر دکن کے شعراء کا اور پھر ایک خاص دور کی حد تک محدود تذکرہ کسی نے آج تک مرتب نہیں کیا تھا۔"

تذکرہ نویسی، جہاں تک کہ اس کا [illegible] زبان کی خدمت اور ادبیات کی بقا سے ہے ہماری ادبی زندگی کا ایک ضروری جزو ہے اور ہمیں ایسی ہر کوشش کی داد دینی چاہیئے جس کے ذریعے سے کوئی مصنف یا مؤلف ادب کے کسی بکھرے ہوئے شیرازے کو یکجا کرنا اور اس کی تدوین و اشاعت سے اس کی بقا کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ لیکن ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اگر ہمارے تذکرہ نویس تعداد کی بہ نسبت کیفیت کی طرف زیادہ توجہ کریں تو بحیثیت مجموعی وہ ادب کی بہتر خدمت انجام دیں گے۔ مثلاً زیرِ نظر تذکرے میں جہاں کئی ایک اچھے شعرا کا کلام درج کیا گیا ہے۔ وہاں بے شمار ایسے شاعروں کے نتائجِ طبع بھی موجود ہیں جن کی ذاتی یا ادبی حیثیت بالکل غیر اہم ہے۔ آج سے سو سال کے بعد جب کوئی محقق عہدِ عثمانی کے شعرائے دکن کی نسبت کچھ جاننے کے لئے کسی کتب خانے سے اس تذکرے کی ایک جلد حاصل کر کے پڑھے گا تو اُسے جہاں اس عہد کے بیسیوں غیر معروف شعراء کے دو دو چار چار بے مزہ اشعار ملیں گے وہاں اچھے شعراء کے بھی دو چار سے زائد اشعار دستیاب نہیں ہو سکیں گے۔ تسکین صاحب بہت اچھا کرتے اگر وہ اوجھڑ۔ ڈاکٹر۔ اور اس قسم کے دیگر بے شمار کم درجہ شعراء کے کلام کے زیادہ وسیع انتخاب سے اپنے تذکرہ کی زینت بڑھاتے بھلا آزاد انصاری کے آٹھ فانی کے دس صدق جائسی کے چار اور ماہر القادری کے تین اشعار سے ان بلند پایہ شعراء کے کمال کا کوئی کیونکر اندازہ لگا سکتا ہے اور پھر تذکرے تو زیادہ تر آنے والی نسلوں کے لئے ہوتے ہیں ہم اور آپ تو اپنے معاصرین اور اُن کے مدارج سے تھوڑے بہت آگاہ ہوتے ہی ہیں یہی بات حالات پر صادق آتی ہے کم درجہ کے شاعروں کی نسبت آپ بے شک یہی انداز اختیار کیجئے جو اس تالیف میں عموماً اختیار کیا گیا ہے مثلاً ــــ صاحب اورنگ آبادی

کے رہنے والے ہیں کبھی کبھی مقامی اخبارات میں آپ کا کلام نظر آتا ہے۔ یا فلاں فلاں صاحب وکالت بھی کرتے ہیں اور شعر بھی کہتے ہیں"۔ لیکن ایسے شعراء کی نسبت جن پر دورِ عثمانی کو ناز ہونا چاہیئے فقط اس قسم کی معلومات بہم پہنچا کر کہ "بارہ ایک سال سے حیدرآباد میں مقیم ہیں۔ غزل اور نظم خوب کہتے ہیں آپ کی نظمیں آج کل کے رسائل کی جان ہوتی ہیں۔ نہایت اچھا کہنے والے ہیں"۔ ان کے تذکرے کو ختم کر دینا پڑھنے والے کو گویا پیاسا مارنا ہے۔ کیا اچھا ہوتا اگر صاحبِ تذکرہ زیادہ نہیں تو چوٹی کے دس بارہ شعراء کی ادبی اور مجلسی زندگی کی گوناگوں کیفیتوں اور دلچسپیوں پر کچھ روشنی ڈالتے۔ چھ سو سے زائد قافیہ باز حضرات کے حالات اور کلام کی تلاش میں انہوں نے جس کاوش سے کام لیا ہے۔ اگر اس کا ایک حصہ بھی وہ اس لطیف جستجو میں صرف کرتے تو ان کے تذکرے کو چار چاند لگ جاتے۔

تذکرہ زیرِ نظر کی ترتیب مضامین یہ ہے کہ پہلے حضورِ نظام اور شہزادگان دکن کے کلام کا انتخاب درج کیا گیا ہے۔ ان کے بعد دکن کی کم و بیش پچاس شاعرات کو جگہ دی گئی ہے۔ ہم نے نہایت شوق سے اس باب کا مطالعہ کیا مگر افسوس کہ ایک آدھ کے سوا کسی شاعرہ کا کلام بلند پایہ نہیں ہے۔ رسارا بیگم سارا کے چند اشعار کچھ اچھے معلوم ہوئے۔ دیکھئے:۔

جوشِ گریہ نے کر دیا خاموش قصۂ غم انہیں سنا نہ سکے
کی دمِ نزع اس نے پرسشِ حال لب کو جنبش ہوئی بتا نہ سکے
یوں سما جاؤ میری نظروں میں پھر کوئی دوسرا سما نہ سکے

شاعرات کے بعد بہ ترتیب ہجا شعراء کا نمبر ہے۔ ان میں چند ایسے نام بھی ہیں جن کی شہرت دکن سے نکل کر ہندوستان کے کونے کونے میں پھیل چکی ہے۔ مثلاً استاد جلیل، ضامن کنتوری، اختر۔ عزیز۔ ثاقب۔ امجد۔ آزاد انصاری۔ فانی۔ ماہر القادری۔ علی منظور۔ وجد زیبا۔ میکش۔ صدق۔ علی احمد۔ ان میں سے آخری دس شعراء سے ناظرینِ ادبی دنیا اچھی طرح آشنا ہیں۔ کیونکہ ان کا کلام اکثر ان اوراق کی زینت رہا ہے۔ اور حضرات جلیل۔ ضامن۔ اختر۔ عزیز اور ثاقب کا کلام بھی محتاجِ تعارف نہیں اور اس تذکرہ میں ان شعراء کا جس قدر انتخاب درج کیا گیا ہے۔ اُس کا یہاں نقل کرنا اس لئے لاحاصل ہے کہ اس سے اُن کے کمال کا پورا اندازہ نہیں ہو سکتا۔ البتہ بعض ایسے شعرائے کے کلام کے نمونے دینا بے جا نہ ہوگا جن سے شمالی ہند کے لوگ اچھی طرح واقف نہیں۔

جامی۔ آپ خوش فکر نوجوان ہیں، نظم اچھی کہتے ہیں نظم دیکھئے:۔

گھنے درختوں کا سایہ سکوت پُر تو راز فسونِ شام میں افسانہائے سوز و گداز
خموش پل سی ندی کے کوئی گذرتا ہے کہیں چراغ کسی جھونپڑے میں جلتا ہے
کچھ عورتیں کہیں اپنے گھروں کو جاتی ہیں فسردہ شام کا غمگین گیت گاتی ہیں
شگفتہ پھول سیاہی میں منہ چھپاتے ہیں کہیں چراغ ستاروں کے جھلملاتے ہیں
طیور اپنے سنہری پروں کو پھیلائے ہوائے سرد کی سرشاریوں میں لہرائے
خموشیاں سر کہسار کیف کا عالم سنا رہے ہیں محبت کا نغمۂ پیہم
فلک پہ ابر کے اڑتے ہوئے سفینے ہیں شفق کی گود میں بکھرے ہوئے نگینے ہیں
نظر کے سامنے پھیلی ہوئی حسیں دنیا تصورات کے رنگین خواب ہیں گویا

توفیق۔ ان کے متعلق صاحبِ تذکرہ لکھتے ہیں:۔ "حضرتِ توفیق دکن کے بہترین غزل گو شاعر تھے۔ آج سے پندرہ بیس سال قبل حیدرآباد میں صرف دو ہی شاعر تھے۔ ایک توفیق دوسرے کیفی۔ اگر توفیق اپنے وقت کے میر تھے تو کیفی سودا۔

انتخاب ملاحظہ ہو۔

ہاں سچ ہے کہ بھیجا ہے کبھی تم نے کسی کو ہاں سچ ہے کہ میرا ہی کہیں گھر نہیں ملتا

ہزار ہا پردۂ حیا میں بھی جلوہ گر حُسنِ یار ہوگا چھپے گا جتنا یہ از بن کر اسی قدر آشکار ہوگا
لئے ہوئے چشمِ شوق میں ہم ہزار ہنگامۂ تماشا انہیں امید دل پہ جی رہے ہیں کبھی تو عالم دو چار ہوگا

کبھی پردہ در ہوں میں راز کا کبھی ہوں میں پردۂ راز میں
کہ حقیقت اک مری مشترک ہے حقیقت اور مجاز میں
میری شہرتیں مجھے کھینچ لائیں فریب دے کے گریز میں
وہ طلسمِ عالمِ راز ہوں کہ رہا ہوں مدتوں راز میں
وہ طلسم گم شدگی ہوں میں کہ فنا ہے اپنی بقا مجھے
مری خامشی ہے نواگری میں نہاں ہوں پردۂ ساز میں

یوں تو مری پرسش کو احباب تمام آئے پر کوئی نہیں آیا ایسا کہ جو کام آئے

عارف (میر لطف علی) نمونۂ کلام:۔

جو دل رکھ کے دلدار نے شرم رکھ لی بڑی بات کی یار نے شرم رکھ لی
مرے دل کی کچھ بھی نہ تھی قدر و قیمت مگر اک خریدار نے شرم رکھ لی

غرض اس قسم کے سینکڑوں شاعر ہیں اور ہزاروں اشعار

اور ان میں بہت اچھے، اچھے، خاصے، اور بُرے سبھی شامل ہیں تسکین صاحب نے اس تذکرہ پر بہت محنت کی ہے۔ بیان بہت سلیس اور صاف ہے اگرچہ کہیں کہیں دکنی انداز نمایاں ہے۔ ہم اپنے ناظرین سے اس کے مطالعہ کی پر زور سفارش کرتے ہیں۔

"ص"

انسان از لالہ کاشی رام چاولہ۔ حجم دوسو اٹھاسی صفحات۔ قیمت آٹھ آنے لکھائی چھپائی اور کاغذ عمدہ۔ ملنے کا پتہ: معرفت مصنف دفتر ڈپٹی کمشنر صاحب۔ ہوشیار پور۔

لالہ کاشی رام اس سے پیشتر پریم ترنگ یا ترانۂ اُلفت کے مصنف بھی ہیں۔ کرشن مہاراج، مہاتما بدھ، حضرت عیسیٰ، حضرت محمدؐ اور بابا نانک کی تعلیمات کا جو مقصد تھا اُسی کو پیش نظر رکھ کر چاولہ صاحب نے "انسان" تصنیف کی ہے۔ اس کتاب میں تصوف اور فلسفہ ملا ہوا ہے۔ لیکن اس سے کتاب کی دلچسپی میں کوئی فرق نہیں آیا جگہ جگہ ہندی دوہے، شلوک اور اردو فارسی اشعار نظر آتے ہیں اور فارسی اور ہندی سنسکرت کا اردو ترجمہ بھی وضاحت کے لئے درج کر دیا گیا ہے۔ کتاب میں کہیں کہیں جو دیے ہوئے مذاح کی مثالیں مل جاتی ہیں وہ مذاح سے بڑھ کر ایک حد تک مضحکہ انگیز ہو گئی ہیں۔ اُن میں سے ایک ذیل میں درج کی جاتی ہے۔ مولانا رومؒ کی مثنوی کا ایک مشہور حصہ یوں شروع ہوتا ہے،

گفت لیلیٰ را خلیفہ کاں توئی
کز تو مجنوں است حیران و غوی؟

اسی حصے کو بدلتے ہوئے لالہ کاشی رام فرماتے ہیں:۔

"موجودہ زمانے میں اگر پریم کی مثال دیکھنی ہو تو ایڈورڈ ہشتم کو دیکھئے کہ جس نے پریم کو نبھانے کے لئے اس عظیم الشان سلطنت پر ٹھوکر ماردی کہ جس کی حد میں سورج کبھی غروب نہیں ہوتا ہے

گفت سمپسن را وزیرے کاں توئی
کز تو ونڈسر شُد پریشان دغوئی
از دگر خوباں تو برتر نیستی،
گفت خامش شو تو ونڈسر نیستی

ترجمہ (بزبان مصنف) ایک وزیر نے مسز سمپسن (معشوقہ ایڈورڈ ہشتم) کو کہا کہ کیا تو ہی ہے کہ جس نے ونڈسر کو پریشان اور خراب کیا ہے تو تو کوئی انوکھی حسینہ نہیں ہے۔ مسز سمپسن نے ڈانٹ کر کہا کہ بس خاموش تو ونڈسر نہیں ہے"۔

کسی کسی جگہ مصنف نے اساتذہ کے کلام پر بھی اصلاح دے دی ہے مثلاً

صفحہ ۷ پر غالب کا ایک شعر یوں درج ہے ؎

عاشقی صبر طلب اور تمنا بے تاب
دل کا کیا حال ہوا خون جگر ہونے تک

اسی صفحے پر ایک اور شعر ہے:۔

ہر بوالہوس کا حسن پرستی شعار ہے
اب آبروئے شیوۂ اہل نظر گئی۔

صفحہ ۶۵ پر لکھا ہے ؎

وفاداری بشرط استواری عین ایماں ہے
مرے گر دیر میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو۔

معلوم نہیں مصنف نے شعروں کے اقتباس دیتے ہوئے دیوان غالب کا کون سا نسخہ سامنے رکھا تھا۔ امید ہے کہ آیندہ اشاعت میں یہ خامی دور کر لی جائے گی۔ اشعار کے علاوہ کتاب کی دلچسپی کو بڑھانے کے لئے اور مضمون کی وضاحت کے طور پر مصنف نے پرانی کتب سے حکایات اور روایات سے بھی مدد لی ہے۔ اور یوں کتاب کی یکسانی میں ایک تنوع پیدا ہو گیا ہے

"م"

اُردو کی دو زندہ جاوید کتابیں

۱۔ انار کلی

سید امتیاز علی صاحب تاج بی۔اے کا وہ معرکۃ الآرا المیہ تاریخی ڈراما جس کے محاسن کی بنا پر

۱۔ گورنمنٹ پنجاب نے مُصنّف کو ادبیات کا بیش بہا انعام دیا +

۲۔ اُردو کے طالب علم جاپانیوں نے جاپان میں اسٹیج کیا +

۳۔ اخبارات و رسائل اور ریڈیو پر اتنے بہت مضامین نکلے جو موجودہ عہد کی کسی دُوسری کتاب پر نہیں نکلے +

۴۔ نقادوں اور ایکٹروں اور ڈائرکٹروں نے مُصنّف کو ڈراما کے ایک عہد نو کا بانی قرار دیا +

۵۔ مرزا محمد سعید ایم۔اے۔ دہلوی تحریر فرماتے ہیں "انار کلی کی اشاعت ایک تاریخی اہمیت کوئی ہے"

۶۔ سید سجاد حیدر یلدرم بی۔اے۔ "ایک کتاب جس سے آنکھوں میں نور اور دل میں ہمدردی عاشق مہجور پیدا ہوتی ہے" +

۷۔ اے۔ ایس بُخاری۔ ایم۔اے (کینٹاب) ڈپٹی کنٹرولر براڈکاسٹنگ دہلی:۔ "انار کلی اُردو ڈراما کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہے گا" +

۸۔ منشی پریم چند مرحوم "مجھے جتنی کشش انار کلی میں ہوئی۔ اور کسی ڈرامے میں نہیں ہوئی +

۹۔ عنایت اللہ خاں صاحب مہتمم تالیف و ترجمہ عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن "یہ ان کتابوں میں سے ہے! اور ایسی کتابیں شاذ و نادر ہیں جن کو دیکھ کر۔ پڑھ کر اور اپنے پاس رکھکر ہمیشہ دل خوش ہوتا ہے، اور ان کو ایک مرتبہ نہیں بلکہ کئی مرتبہ پڑھنے کو دل چاہتا ہے" ہر عمر اور ہر مذاق کا شخص اسے پڑھتا اور بے اختیار سر دُھنتا ہے۔ کتابت۔ طباعت اور کاغذ نہایت اعلیٰ۔ آرٹ کی رنگین تصاویر اور تزئینی نقش تیسرا اڈیشن قریب الختم قیمت فی جلد عہ/ ۔ پرتکلف اڈیشن دستخط شدہ مُصنّف عے/

۲۔ چچا چھکن

سیّد امتیاز علی صاحب تاج کے ظرافت نگار قلم کا وہ کامیاب کردار:۔

۱ جس کے نام سے تعلیم یافتہ ہندوستان کا بچہ بچہ واقف ہے +

۲ جس کی کامیابی سے متاثر ہو کر اکثر ادیب اسی موضوع پر خامہ فرسائی کر رہے ہیں +

۳ جس کے متعلق ایک اصلی یا نقلی مضمون شائع کر دینا اکثر ادبی رسائل کے نزدیک ان کے خاص نمبروں کی کامیابی کا ضامن ہے +

شستہ ظرافت جسے پڑھ کر بچے بوڑھے۔ عورت مرد۔ لڑکے لڑکیاں سب قہقہے لگا سکتے ہیں۔ قیمت عہ

ملنے کا پتہ:۔ دارالاشاعت پنجاب لاہور
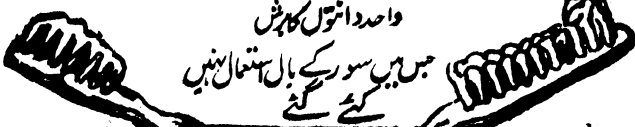
طاقت اور تندرستی کے لئے بچوں کو ڈونگرے کا

بال امرت

پلانا چاہئے

اس کے استعمال سے بچوں کی کھانسی بخار دفع ہوتے ہیں

فہرست مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ جولائی ۱۹۳۹ء

جلد ۱۷ — نمبر ۷

تصاویر:۔ ۱۔ تنہا مدبر۔ ۲۔ بت سنگین و بت رنگیں

سالانہ چندہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ

گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام صلاح الدین احمد پرنٹر و پبلشر چھپ کر دفتر ادبی دنیا مال لاہور سے شائع ہوا۔

تمام درزیوں کو منع کر دیجئے

بلکہ جس وقت آپ کوٹ شیروانی یا قمیص وغیرہ سلنے دیجئے تو تاکید کر دیجئے کہ ان میں کسی قسم کے بٹن نہ لگائے۔ کیا سمجھے آپ....؟

چاند تارا مارکہ حیدرآباد دکن بٹن فیکٹری

کے بنے ہوئے

بٹن

اس قدر خوبصورت ملتے ہیں کہ کپڑے میں چار چاند لگجاتے ہیں

ان بٹنوں میں خوبی کیا ہے وہ بھی سن لیجئے۔ مضبوط بہت خوبصورت اصلی رنگ قائم رہنے والا سب سے بڑی خوبی

ہندوستانی صنعت

بٹن خریدنے کے وقت (چاند مارکہ) ضرور دیکھ لیجئے

ہر جگہ ملتے ہیں　　ہر جگہ ملتے ہیں

REGD:
Nº 230 H.D

REGD:
Nº 192 BR:

TRADE MARK

دکن بٹن فیکٹری حیدرآباد دکن

پنجاب۔ یو۔پی اور سی۔پی میں سول ایجنٹوں کی ضرورت ہے

دی مغل لائن لمیٹڈ

یہ کمپنی جو ۱۸۷۸ء میں قائم ہوئی تھی دراصل اوّل ترین جہازراں کمپنی ہے جس نے زائرین بیت اللہ کو حج کے لئے لے جانے کا سلسلہ شروع کیا تھا

مغل لائن کے ذریعے حج کیجئے!

کمپنی کے جہاز جو عہد حاضرہ کے سامان آسائش و آرام سے مزیّن ہیں بمبئی۔ کراچی اور کلکتہ سے جدّہ کو جاتے ہیں۔

جہازوں کا بیڑا

ایس۔ ایس "اکبر"	۴۵۴۳ ٹن
ایس۔ ایس "علوی"	۳۵۶۶ ”
ایس۔ ایس۔ "اسلامی"	۵۸۷۹ ”
ایس۔ ایس "جہانگیر"	۳۵۶۶ ”
ایس۔ ایس "خسرو"	۴۵۴۲ ”
ایس۔ ایس۔ "رحمانی"	۵۴۶۳ ”
ایس۔ ایس "رضوانی"	۵۴۴۸ ”

مسافر اور مال لے جانے والی دوسری سروسیں

بمبئی اور کراچی سے شہر سکلا۔ عدن۔ بربیرہ جبیوتی بصوع۔ پورٹ سوڈان اور جدّہ ہر پندرہ دن کے بعد

بمبئی اور کراچی سے پورٹ لوئس۔ مارشیش ہر دو ماہ کے بعد۔

تمام جہازوں میں کیبن اور ڈک کلاس مسافروں کے لئے انتظام ہے۔

تمام جہازوں میں ہر قوم کے آدمیوں کیلئے بہترین قسم کا کھانا مہیا کرنے کا اعلےٰ ترین انتظام موجود ہے۔

تفصیل کیلئے ذیل کے پتہ پر لکھئے

ٹرنر ماریسن اینڈ کمپنی لمیٹڈ منیجنگ ایجنٹس

۱۶ بنک سٹریٹ بمبئی

تار کا پتہ "مغل" بمبئی

دنیائے کاروبار

رنگ و بُو کی ایک صدی

جب ہندوستان مغلوں کے زیرِنگیں آیا تو شاہانِ مغلیہ نے اگر کشورِ ہند کے علاوہ اقلیمِ نفاست کے بھی فرمانروا تھے جن نادر صنعتوں کے فروغ سے اس دیس کو جنت نشاں بنایا ان میں سے ایک اہم صنعت عطر سازی بھی تھی۔ خود ملکۂ نورجہاں نے عطر گلاب کی ایجاد سے اس نفیس صنعت کو چار چاند لگائے۔ اور آنے والی نسلوں کے لئے ایسی روح پرور یادگار چھوڑی جس کی مہک ابدالآباد تک کم نہ ہوگی۔ مغل سلطنت زوال پذیر ہوگئی اور اس کے ساتھ اس کی بہت سی خصوصیات بھی زائل ہوگئیں۔ مگر اس دورِ تہذیب و تمدن کے جو چند نقوش باقی رہ گئے اُن میں سے ایک خوشبو لگانے ذوق بھی تھا۔ خوشبو لگانے اور عطر بنانے کے شوق نے نوابانِ اودھ کے عہد میں بہت فروغ پایا اور لکھنؤ کہ اپنے باشندوں کی نفاست پسندی کے باعث ہندوستان بھر میں ممتاز ہے۔ تجارتِ عطر کا مرکز بن گیا۔

۱۸۳۹ء میں میر اصغر علی نے جنہیں اب صنعتِ عطر کا ابوالآباء کہنا چاہئے قنوج میں عطر سازی کا کارخانہ جاری کیا جسے وہ انیس برس بعد یعنی غدر سے ایک سال بعد لکھنؤ لے آئے۔ یہاں آکر کارخانے نے اپنے مالکوں اور کارکنوں کے حُسنِ نیت۔ معاملہ داری اور قابلیت کے باعث دن دونی اور رات چوگنی ترقی کرنی شروع کی۔ ۱۸۷۷ء محمد علی صاحب تولد ہوئے اور اُس وقت سے کارخانہ **اصغر علی محمد علی** کے نام سے موسوم ہوا۔ ہندوستان کی مختلف نمائشوں سے کارخانے کی مصنوعات پر سونے کے تمغے ملتے رہے لیکن سب سے اہم وہ طلائی تمغہ تھا جو ویمبلی انگلستان کی نمائش میں کارخانہ نے حاصل کیا۔ اگرچہ یورپ میں خوشبو کا ذوق ہندوستان سے مختلف ہے لیکن وہاں بھی کامیابی حاصل کرنا کارخانے کے صنعتی کمال کا ثبوت ہے۔

۱۹۳۰ء میں کارخانے کی مشہور عمارت **حنا بلڈنگ** کا جس کی تیاری پر لاکھوں روپے صرف ہوئے تھے۔ حضور نظام کے ہاتھوں سے افتتاح عمل میں آیا۔ کارخانے کی ناموری کا اندازہ آپ اس امر سے کر سکتے ہیں کہ ۱۹۳۹ء میں پانیر پریس کے لئے جو عظیم الشان عمارت مالکانِ فرم نے تیار کروائی اس کا سنگِ بنیاد خود حضور وائسرائے نے رکھا۔ غرضیکہ اپنی دیانت اور معاملے کی صفائی اور مال کی عمدگی کے باعث **محمد علی اصغر علی** کی فرم نے اپنی زندگی کے ان سو سالوں میں ایک معمولی کاروبار سے ترقی کر کے ایک عظیم الشان ادارے کی حیثیت حاصل کر لی جس کی بدولت نہ صرف ایک اچھی ملکی صنعت فروغ پا رہی ہے بلکہ سینکڑوں آدمیوں کا روزگار جاری ہے۔ ہم اس کامیابی اور صد سالہ جشنِ مسرت پر مالکانِ کارخانہ کی خدمت میں مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

بھوپندرا سیمنٹ ورکس کا افتتاح

۱۴ر جون کو سر ہومی مودی نے ہزہائی نس مہاراجہ پٹیالہ سے بھوپندرا سیمنٹ ورکس کے جو کالکا کے نزدیک واقع ہے، افتتاح کی درخواست کرتے ہوئے ایک دلچسپ تقریر کی جس میں انہوں نے بیان کیا کہ بھوپندرا سیمنٹ ورکس ایسوسی ایٹڈ سیمنٹ کمپنی اور ریاست پٹیالہ کی متحدہ کوششوں سے قائم کیا گیا ہے اور اس کی پیداوار جو تقریباً ایک لاکھ ٹن سالانہ ہوگی وسطی اور جنوبی پنجاب کی عام ضروریات اور بھکرا ڈام کی سکیم کے لئے خاص طور پر کام میں لائی جائے گی۔ اور اس سے ریاست کے دو ہزار آدمی اس عظیم الشان کارخانے میں کام کرتے ہیں جو ایک پہاڑی کو کاٹ کر بنایا گیا ہے۔ اور لوہے کی ہوائی لائن کے ذریعے سے پتھر کی کان سے ملا ہوا ہے۔ یہ لائن سات میل لمبی ہے اور اپنی قسم کی ہندوستان بھر میں سب سے لمبی لائن ہے۔

بھوپندرا سیمنٹ ورکس کے قریب کارکنوں کے لئے ایک نئی طرز کا شہر آباد ہو گیا ہے جس میں ان کی ضروریات اور تفریح کا ہر سامان موجود ہے۔ مثلاً بازار، ہسپتال۔ سکول۔ کلب۔ کھیل کے میدان ریڈنگ روم وغیرہ

امید کی جاتی ہے کہ اس کارخانے کے اجرا اور کامیابی سے ریاست پٹیالہ کو بھی بہت فائدہ پہنچے گا۔ یہ کارخانہ اس کے باشندوں کے لئے روزگار کا ایک اچھا ذریعہ ثابت ہوگا اور ریاست کو دیگر مالی فوائد بھی پہنچیں گے۔ ہم ایسوسی ایٹڈ سیمنٹ کمپنی کو اس جدید کارخانے کے افتتاح پر مبارکباد کا مستحق سمجھتے ہیں۔

بزمِ ادب

بعض اصحاب جو گاہے ماہے ہمیں اپنے مضامین نظم ونثر ارسال فرماتے ہیں، ان کی اشاعت میں ذراسی تاخیر بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ ہر ایسے مضمون کے موصول ہونے پر جس کی اشاعت کا امکان ہو۔ صاحبِ مضمون کی خدمت میں اس کی رسید فوراً بھیج دی جاتی ہے۔ ناقابلِ اشاعت مضامین فوراً واپس کر دیئے جاتے ہیں اور اگر کوئی مضمون بظاہر اچھا ہو تو اُسے زیرِ تجویز مضامین میں شامل کر لیا جاتا ہے۔ کچھ عرصے کے بعد جب اس کی اشاعت کا قطعی فیصلہ ہو جاتا ہے تو عام طور پر اس کی اطلاع بھی مصنف کو دے دی جاتی ہے۔ شاید بعض صاحبوں کو یہ معلوم نہ ہو کہ ایک جمے ہوئے ادبی ادارے میں مضامین کے انبار کے انبار ہر وقت موجود رہتے ہیں اور ان میں ہر روز اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان میں کام کی چیزیں بہت کم ہوتی ہیں۔ ادارے کا تمام وقت مضامین کے انتخاب اور مناسب ترمیم و تزئین میں صرف ہو جاتا ہے پھر یہ کیونکر ممکن ہے کہ کسی مضمون کے موصول ہوتے ہی اُسے شائع کر دیا جائے۔ پس اگر آپ کی چیز واپس نہیں کی گئی اور آپ کو اس کی رسید مل گئی ہے تو آپ اطمینان رکھیں کہ وہ اپنے وقت پر ضرور شائع ہو جائے گی۔

ہم پہلے بھی کئی بار عرض کر چکے ہیں کہ ہمارے لکھنے والوں کا میلانِ طبع زیادہ تر نظم یا افسانے کی طرف ہے۔ سنجیدہ اور فکر انگیز مضامین یا ایسے مضامین جو تحقیق اور کاوش چاہتے ہیں ان کی توجہ سے دُور رہتے ہیں۔ حالانکہ زبان وادب کی صحیح خدمت کے لحاظ سے اس قسم کے مضامین بے حد اہمیّت رکھتے ہیں۔ ہمارے ہاں نظمیں اور اچھی نظمیں اتنی زیادہ موصول ہوتی ہیں کہ ہر ماہ دس بارہ منظومات کی اشاعت کے باوجود بعض مخلص کرم فرماؤں کی شکایت کا بار ہمارے سر پر ہمیشہ موجود رہتا ہے۔

افسانوں کا معاملہ نظم سے کچھ بہتر ہے۔ لیکن اچھے مضامین کی کمی کو ہم بُری طرح محسوس کرتے ہیں۔ اور بعض اوقات یہ کمی خالصتاً ادارے کو پوری کرنی پڑتی ہے۔ ادبی دنیا ہر ماہ دس روپے کی حقیر رقم ایک اچھے مضمون کے لئے پیش کرتا ہے معاوضہ اگرچہ قلیل ہے۔ لیکن اپنے اندر ایک امتیاز ضرور رکھتا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ ابھی بہت کم اصحاب نے اس طرف توجہ فرمائی ہے۔

اس دفعہ کے مضامین میں سے بہترین مضمون "فرانس کا تخیل پرست شاعر" ہے جو حسبِ معمول میراجی کے قلم کا مرہون ہے۔ میراجی کا یہ مضمون ایک ایسی افادی حیثیت لئے ہوئے ہے جو اردو زبان کے بہت کم مضامین کے حصّے میں آئی ہے۔ میلارمے کی شاعری پر ایک سیر حاصل تبصرہ کرتے ہوئے انہوں نے خالص شاعری کے اوصاف پر جو روشنی ڈالی ہے وہ اردو میں یقیناً ایک نئی چیز ہے اور ادب کے طالبعلموں کے لئے افکار ونتائج کا ایک بیش بہا خزینہ۔ میلارمے کی طویل نظم "گوالے کا سپنا" اردو میں جس محنت اور استقلال سے منتقل کی گئی ہے۔ اُس کا کچھ اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے۔ کہ وہ اسے آہستہ آہستہ لکھتے رہے۔ یہاں تک کہ ایک سال کا عرصہ گذر گیا۔ اور اس عرصے میں جتنی ترقی اُن کی پختگیٔ فکر میں ہوئی اس کا عکس اس نظم میں موجود ہے۔

مضمون کا ہدیہ اس دفعہ ابو محمد امام الدین صاحب کی خدمت میں اُن کے "ہندی میں افسانوی لٹریچر" پر پیش کیا جا رہا ہے۔ افسانوں میں سے بہترین افسانہ کرشن چندر کے "دل کا چراغ" ہے جسے انہوں نے اپنے مخصوص "پرقافی" انداز میں پیش کیا ہے۔ خدا شاید انسان سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہے لیکن یہ انسان ....؟ جواب کے لئے افسانہ پڑھیے۔

اس دفعہ ایک نئے افسانہ نگار ہماری بزم میں شامل ہوئے ہیں، جناب علی عباس (جلال پوری) آثار بتا رہے ہیں کہ اگر مشق جاری رہی تو بہت جلد صفِ اوّل کے فن کاروں میں شامل ہو جائیں گے۔ سنگ دل ایک بہت اچھا مطالعہ ہے۔

صلاح الدّین احمد

★

آئینۂ عالم

مشرقی ایشیا میں جدید نظام

اس دفعہ آئینۂ عالم کے تحت میں ہم ایک خاص مضمون آپ کے پیشِ نظر کر رہے ہیں۔ ادبی دنیا کے دور افتادہ کرم فرما جناب نور الحسن برلاس (پروفیسر جامعہ السنۂ خارجہ توکیو) کی وساطت سے ہمیں ایک جاپانی طالب علم کا لکھا ہوا ذیل کا مضمون موصول ہوا ہے۔ اس سے جہاں ہمیں چین جاپان اور ایشیا کے بارے میں ایک نوجوان جاپانی کے اندازِ نظر کا مطالعہ میسر آتا ہے۔ وہیں یہ حقیقت بھی کچھ کم مسرت بخش اور باعث افتخار نہیں ہے کہ ہماری وہ اردو زبان جو بعض نادان اہلِ وطن کے ہاتھوں گھر کی مرغی بن کر دال کے برابر کی جا رہی ہے، ہندوستان سے نکل کر ایشیا کی وسعت میں بھی پھیل رہی ہے اردو کی ہمہ گیر حیثیت اور سلاست کی اس سے زیادہ اور کون سی مثال دی جا سکتی ہے کہ ایک جاپانی بھی جس کے ملک کی تہذیب و تمدن اور زبان ہم سے کہیں مختلف ہو۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس زبان کے ذریعے سے اظہار خیال کر سکے۔

ہم نے اس مضمون کو جوں کا توں رہنے دیا ہے اور زبان کی کمزوری یا غلطی کو دور کرنے کی کوشش نہیں کی تاکہ اصل کا تاثر برقرار رہے۔ اس مضمون کو پڑھ کر یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ خارجی ممالک اُس زبان کی "تخریب" کو ہندوستانی زبان نہیں سمجھتے جسے چند سیاسی لیڈر اور اُن کے اندھا دھند پیرو اپنے چند روزہ اقتدار کی بنا پر دیش باسیوں کے سر منڈھا چاہتے ہیں بلکہ ہندوستانی وہی اردو زبان ہے جس کی لسانی سلاست اور صفائی اور جس کے رسم الخط کے حسن اور اختصار کا مقابلہ ہندوستان میں نہ آج تک ہو سکا ہے اور ہم متوقع ہیں کہ نہ ہو سکے گا۔

ادارہ

نوٹ: یہ مضمون فوجیمورا صاحب کا لکھا ہوا ہے جو مدرسہ السنہ خارجہ توکیو کے طالب علم ہیں۔ اس کے متعلق یہ ظاہر کر دینا ضروری ہے کہ یہ اشاعت کی غرض سے نہیں لکھا گیا تھا بلکہ مقابلے کے ایک امتحان کے لئے لکھا تھا۔ چونکہ ہندوستانی زبان میں تھا اور ایسے موضوع پر تھا جو جاپان کے لئے بڑا اہم سیاسی مسئلہ بنا ہوا ہے میں نے اُن سے خواہش کی کہ اشاعت کی غرض سے مجھے دے دیں۔ نفس مضمون پر مجھے کچھ کہنا نہیں۔ ایک نہایت اہم مسئلے پر جاپانی طلبا کا نقطۂ نظر پیش کرنا منظور ہے۔ برلاس

آخرکار ۱۹۳۷ء میں ۷ جولائی کو جاپان اور چین میں ناگوار جنگ شروع ہو گئی اور ابھی جاری ہے۔ جاپان اور چین میں جنگ واقع ہونے کی کیا وجہ ہے؟

سبب بہت ہیں۔ مگر بظاہر ان میں سے ایک بڑی وجہ چین کی مخالفانہ پالیسی ہے۔ اس کے علاوہ سوویٹ روس نے اس کے پیچھے سے آکر مشرقی ایشیا کو لال رنگ میں بدلنے کے لئے چین کو کٹھ پتلی بنایا اور اس کو جاپان کے خلاف اُکسایا۔ آج بھی وہ ایک دوسرے کے ہمدرد ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ ہمارے قومی نظام اور کمنٹرن میں سخت اختلاف ہے اور یہ بھی قدرتی بات ہے کہ ہم کو اپنی مدافعت کے لئے اور مشرقی ایشیا کو کمنٹرن کے ہاتھ سے بچانے کے لئے ہتھیار اٹھانے ضروری ہیں۔ اگر ہم اس وقت اُس کو ایشیا سے نہ نکالیں تو وہ تھوڑی مدت میں کل ایشیا کو لال رنگ میں بدل دے گا۔ در حقیقت ہم جاپانی مشرقی ایشیا میں امن کے لئے لڑ رہے ہیں۔ اس وجہ سے اس جنگ کو مقدس کہتے ہیں۔

اس مقدس جنگ کے ذریعے سے ہم مشرقی ایشیا میں خود مشرقی ایشیا کی قوموں کے ہاتھوں سے مستقل اور حقیقی صلح قائم کر رہے ہیں یعنی جاپان کی قوت سے براعظم کے باشندوں کو بہت سے سال کے ظلم و ستم سے بچا کر جاپان اور منچوکو اور چین کے درمیان مستقل صلح اور خوش حالی قائم کرنے کے لئے ہم لڑ رہے ہیں۔ لہٰذا مشرقی ایشیا میں نئے نظام کا قیام ضروری ہوگیا۔ اب ہم اس منزل پر پہنچ گئے ہیں کہ جنگ سے برباد شدہ علاقے میں نئے نظام کی بنا ڈالیں خواہ چیانگ کائی شیک کی حکومت سوویٹ روس کی امداد سے جنگ جاری رکھے۔

یہ نیا نظام تین ملکوں یعنی جاپان اور منچوکو اور چین کے درمیان باہمی امداد اور ہمدردی قائم کرتا ہے۔ ہر شعبے میں یہی اصول کام کرے گا۔ مشرقی ایشیا میں نیا نظام بنانے کا مطلب یہ ہے کہ جاپان اور منچوکو اور چین آپس میں متحد ہو کر سیاسی، تمدنی اور اقتصادی اور دیگر مسائل کا انتظام کریں۔

انتظام ملک کے سلسلے میں مشرقی ایشیا کے امن اور تمدن کو کمیونزم کے منحوس ہاتھوں سے بچانا ہے۔ اقتصادی نقطۂ نظر سے ہمیں چین کے بازار کو ترقی دے کر اس قابل بنانا ہے کہ ہمارا بنایا ہوا مال کھپ سکے کیونکہ دنیا کے ہر ملک میں محصول کی دیوار کھڑی کر کے جاپانی مال کا بازار بند کر دیا گیا ہے۔ دو قوموں کی دوستی سے اپنے اپنے مخصوص تمدن کا باہمی تبادلہ ہونا بہت ضروری بات ہے۔ اسی طرح سے ہم مشرقی ایشیا کو خوشحال بنا سکتے ہیں۔

اس وقت ہم جاپانیوں کو مشرقی ایشیا میں نیا نظام بنانے کے لئے کیا کرنا چاہئے۔ جب سے جنگ شروع ہوئی ہے جاپان اپنے مقصد کو سامنے رکھے ہوئے سیدھا چلا جا رہا ہے۔ ایک طرف ہماری حکومت چیانگ کائی شیک کو بالکل شکست دیتی ہے اور دوسری طرف چین کی نئی حکومت کی حفاظت کرتی ہے اور جاپان اور منچوکو اور چین کے اتحاد کے لئے کوشش کرتی ہے۔ یہ کوشش مسلسل جاری رہنی چاہئے اب تک چین پر یورپ اور امریکہ کی حکومتوں نے ظلم کیا ہے۔ مگر نیا چین نیند سے ہوشیار ہو چکا ہے۔ اسے خود اپنے ہاتھ سے چینی قوم بنانی چاہئے۔ دیگر الفاظ میں یوں کہنا چاہئے کہ ایشیا کو ایشیائی اقوام کا ایشیا ہونا چاہئے۔ آج کل ایشیا کی حالت ہر ساعت بدل رہی ہے۔ تاہم پرانے زمانے میں جو پابندیاں عائد کی گئی تھیں وہ اب بھی عائد کی جا رہی ہیں یہ نامعقول بات ہے۔ نئے حالات کا اقتضا یہ ہے کہ نو حکومتوں کا پرانا عہدنامہ بے اثر قرار دیا جائے یا کم ازکم اس میں جدید حالات کے مطابق ترمیم کر دی جائے۔ آئندہ ہمارے ملک کو پرانی قیدوں سے آزاد ہو کر جدید اصول کی بنا پر نئے نظام کو بنانے کی کوشش کرنا ہے۔

تاہم ہم جاپانی غیر ممالک کے حقوق کو مسترد نہیں کرتے اگر وہ مشرقی ایشیا کی نئی حالت کو سمجھتے ہیں اور اسے تسلیم کرتے ہیں تو ہم خوشی سے ان غیر ملکوں کی امداد قبول کریں گے۔ مگر وہ نئی حالت کو ماننے سے انکار کریں اور پرانی حالت پر اڑے رہیں تو ہم کسی طرح ان کی امداد کو قبول نہیں کر سکتے۔ اگرچہ ہم مساوی موقع کے اصول کو مانتے ہیں مگر اس کی قدیم شکل تسلیم کرنے سے ہمیں انکار ہے۔ ہمیں اصرار ہے کہ ضرورت زمانہ کے بموجب اس میں ترمیم کی جائے۔ ان تدابیر کو کارگر بنانے کے لئے یہ بات بہت ضروری ہے کہ جاپانی اور چینی دونوں قومیں آپس میں ایک دوسرے کو سمجھیں۔ اگر اسے ظاہرداری کی دوستی کہا جائے تب بھی دونوں قوموں میں سمجھوتہ نہیں ہو سکتا۔ جب تک وہ ایک دوسرے کے خیالات سے واقف نہ ہوں۔ ہمیں اپنا اصلی مقصد ہمیشہ مدنظر رکھنا چاہئے اور اس بات کا لحاظ رکھ کر کہ ہم جاپانی ہیں کبھی صراط مستقیم سے نہ ہٹنا چاہئے۔

جنگ سے برباد کئے ہوئے ملک میں نئے نظام کا قیام بہت مشکل کام ہے۔ اس وجہ سے ہم ایک جدید لفظ "طویل نظام" استعمال کرتے ہیں۔ اس نظام کا قیام کیسا ہی مشکل ہو اور اس میں کتنے ہی سال لگیں ہم جاپانیوں کو دلیری سے آگے بڑھ کر کمیونزم کو دور کرنا چاہئے۔ اور مشرق میں امن کی حفاظت کرنی چاہئے۔ کیونکہ تینوں متحدہ حکومتوں میں بڑے ہم ہی ہیں۔ خصوصاً ہم نوجوانوں کو زیادہ مستعدی اور استقلال سے کام کرنا چاہئے۔ اس وقت ہم نوجوانوں کی متحدہ خدمت بہت مقدم ہے۔

یہ خیال ٹھیک نہیں ہے کہ نیا نظام جو ہم جاپان اور منچوکو اور چین کے درمیان قائم کر رہے ہیں اس کو صرف پرانا نظام بدلنے کے لئے بنا رہے ہیں۔ یقیناً اس نئے نظام کو ہمیشہ کے لئے جاری رکھنا ہے اور اسے امن مشرقی ایشیا نیز امن دنیا کی بنیاد ہونا چاہئے۔ اس واسطے ہماری خواہش جدید چین سے یہ ہے کہ اس نئے نظام کے

قیام میں ہمارا ساتھ دے اور ہمارے مقصد کو سمجھ کر ہماری مدد کرے چین کو یورپ اور امریکہ کی نوآبادی کی حیثیت سے نکال کر آزاد ملک کی حیثیت میں بدل دینا نہ صرف چینی قوم کے لئے بلکہ کل مشرقی ایشیا کے لئے مفید ہے۔ جدید نظام کے قیام کے معنی یہ ہیں کہ مشرقی ایشیا کو کمیونزم سے بچا کر تینوں ممالک کو یہاں کے امن کا ضامن بنا دیا جائے لہٰذا ہم جاپانیوں کو پورے یقین کے ساتھ اس مقصد کی تکمیل کے لئے آگے بڑھنا چاہیئے۔ اس عقیدے کا مطلب یہ ہے کہ جدید نظام کا قیام دنیا کے امن کے لئے ضروری ہے۔ اور قیامِ امن مشرقی ایشیا کے لئے سب سے اچھا کام ہے۔

م۔ فوجیمورا

اعلان

اُردو اکاڈمی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے ذیل کے ہر مضمون پر مبلغ دو سو روپے انعام دینا تجویز کیا ہے۔ جن صاحب کا مقالہ سب سے بہتر ہوگا۔ انہیں مذکورہ انعام دیا جائیگا۔ اکاڈمی کا فیصلہ ناطق ہوگا۔ اس کے علاوہ اکاڈمی منتخب مقالہ جات کے حقوق اشاعت اپنے ذمہ رکھیگی۔ مقالہ میں تقریباً پچاس ہزار الفاظ ہونے چاہئیں۔ اور تمام مقالے سیکرٹری اردو اکاڈمی کے پاس ۱۵ ستمبر تک پہنچ جانے چاہئیں۔ جو صاحب اس مقالہ نویسی میں شرکت پسند کریں۔ وہ پہلے اپنے مضمون کے انتخاب سے سیکرٹری کو مطلع کریں۔

فہرست مضامین

اشتراکیت	وطنیت	امریکہ اور سیاست عالم
فاسزم	سرمایہ داری	وسطی یورپ کی سیاست
نازی ازم	بحر روم کی سیاست	نوآبادیوں کی تقسیم
سامراج	بحرالکاہل کی سیاست	ممالک اسلامی کی سیاست

از طرف

سیکرٹری اُردو اکاڈمی جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

غزل

کمزور ہے، معتبر نہیں ہے
دنیا کی نظر، نظر نہیں ہے

تدبیر تو ہے، مگر کسی کی
تقدیر ہی زور پر نہیں ہے

معلوم کسے یہ تھا کہ کوئی
بے درد ہے، چارہ گر نہیں ہے

اب، اُن کی نگاہِ لطف میں بھی
تسکینِ دل و جگر نہیں ہے

کاٹے کوئی کس طرح شبِ غم
جب دیکھئے جب سحر نہیں ہے

اس دورِ الم کی ایک مشکل
یہ بھی ہے کہ مختصر نہیں ہے

پھر ہے کوئی غم ضرور، حیرت
یونہی تو یہ آنکھ تر نہیں ہے

عبدالمجید حیرت

غزل

جو بہاروں میں نہاں رنگِ خزاں دیکھتے ہیں
دیدۂ دل سے وہی سیرِ جہاں دیکھتے ہیں

ایک پردہ ہے غموں کا جسے کہتے ہیں خوشی
ہم تبسّم میں نہاں اشک رواں دیکھتے ہیں

دیکھتے دیکھتے کیا رنگ جہاں نے بدلے
دیدۂ اشک سے نیرنگِ جہاں دیکھتے ہیں

رات ہی رات کی مہماں تھی بہارِ رنگیں
پھر وہی صبح وہی جورِ خزاں دیکھتے ہیں

ہر مسرّت ہے غمِ تازہ کی تمہید اے دل!
نغمۂ شوق میں آثارِ فغاں دیکھتے ہیں

دل میں جینے کی تمنّا نہیں باقی اختر
کوئی دن اور تماشائے جہاں دیکھتے ہیں

اختر شیرانی

ہندی کا افسانوی لٹریچر

ہندی میں مختصر فسانہ نویسی کا آغاز موجودہ صدی کی ابتدا میں ہوا، بنگلہ میں اس سے پہلے مختصر فسانہ نگاری کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ غالباً بنگالی فسانوں ہی کو دیکھ کر ہندی اہلِ قلم میں فسانہ نویسی کا ذوق پیدا ہوا۔

ہندی اہلِ قلم میں سب سے پہلے سنہ ۱۹۰۰ء میں پنڈت مادھو پرساد مصر نے فسانہ نگاری شروع کی، ان کے فسانے اس زمانے کے مقبول و مشہور ناولوں سے ماخوذ ہوتے تھے۔ موجودہ مذاق کے اعتبار سے ان کے فسانے کتنے ہی پست قرار دیئے جائیں لیکن ان کے شرف اولیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔

پنڈت مادھو پرساد کے معاصرین میں کشوری لال گوسوامی، ان کے بیٹے چھبیلے لال اور گرجا کمار گھوش خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔ اس دور کے تمام فسانہ نویس ناولوں سے پلاٹ اخذ کر کے فسانے لکھا کرتے تھے، ان فسانہ نویسوں کے نزدیک فن اور معیار کو چنداں اہمیت حاصل نہ تھی، وہ پلاٹ میں واقعیت اور حقیقت کی بھی زیادہ پروا نہ کرتے تھے، وہ زیادہ تر اسباق و نتائج کو ملحوظ رکھتے تھے جس کا اندازہ کشوری لال گوسوامی کے فسانوں کے عنوانات، "دان کا پھل" (خیرات کا ثمرہ) "ست کا پرنام" (راست بازی کا نتیجہ) "دیا سے لابھ" وغیرہ سے کیا جا سکتا ہے۔

دورِ اول کے فسانہ نگاروں میں بہ اعتبار فن گرجا پرساد گھوش کے فسانے سب سے بہتر ہیں، ان کے معاصرین میں عام طور پر جو خامیاں پائی جاتی ہیں وہ ان کے ہاں بہت کم ہیں، بہرحال اس عہد کے فسانہ نویس اپنے عیوب و نقائص کے باوجود حق رکھتے ہیں کہ ہندی افسانہ نویسی کے تذکرے میں سب سے اول ان کا تذکرہ کیا جائے اور یہ ان کی قدر و منزلت کے لئے کافی ہے۔

ہندی فسانہ نویسی اور فسانہ خوانی کو مقبول اور متوجہ کن بنانے میں موقر ہندی ماہنامہ "سرسوتی" الہ آباد کو امتیاز خاص حاصل ہے، اس کی کاوش و کوشش سے موجودہ صدی کے دوسرے عشرے میں ہندی کے متعدد ادبا اور اہلِ قلم فسانہ نگاری کے میدان میں آئے جن کی ذات سے ہندی فسانہ نویسی کو کافی وسعت و ترقی حاصل ہوئی، ان ممتاز اہلِ قلم اور ادبا میں جے شنکر پرساد امتیاز خاص کے مالک ہیں۔ گذشتہ سال ان کا انتقال ہو گیا، وہ ہندی کے سب سے بلند پایہ ڈرامہ نویس سمجھے جاتے تھے۔ شاعری میں بھی ان کا ایک خاص درجہ تھا، ان کا سب سے پہلا فسانہ سنہ ۱۹۱۱ء میں شائع ہوا، ان کے بعد سنہ ۱۹۱۲ء میں وشمبھر ناتھ جیجا سنہ ۱۹۱۳ء میں راجہ رادھیکا رمن اور وشمبھر ناتھ کوشک سنہ ۱۹۱۴ء میں وید چتر سین شاستری اور پنڈت جوالا دت شرما اور سنہ ۱۹۱۵ء میں پنڈت چندر دھر شرما نے فسانہ نگاری شروع کی۔ ان ادبا کی ذات سے ہندی کی بزم فسانہ نگاری میں کافی رونق اور دلفریبی پیدا ہو گئی۔

جے شنکر پرساد کو ڈرامہ، ناول، مضمون، فسانہ، شاعری غرض تمام اصنافِ ادب میں مہارت اور دسترس حاصل تھی، اور وہ ایک طرزِ خاص کے مالک تھے، چنانچہ آپ کہیں بھی ان کی چند سطروں کو پڑھ کر سمجھ سکتے ہیں کہ یہ جے شنکر پرساد کی کاوشِ قلم کا نتیجہ ہیں، ان کو بودھ تاریخ اور بودھ لٹریچر سے خاص دلچسپی تھی، شاید یہی وجہ ہے کہ ان کی تمام تصانیف میں ایک مخفی درد سا محسوس ہوتا ہے،

پلاٹ کے اعتبار سے جے شنکر پرشاد کی تصانیف بہت وسیع ہیں۔ ان کی تصنیفات کے افراد و ارکان میں آپ عہد قدیم سے لے کر موجودہ سرحدی پٹھان دوشیزہ تک کا کردار ملاحظہ فرما سکتے ہیں، اس وسعت کے ساتھ آپ ان کے ہاں ایک خاص تحدید بھی پائیں گے، ان کے مختلف زمانوں کے مختلف قسم کے کرداروں میں ایک ہی روح کارفرما نظر آئے گی، چنانچہ انہوں نے جس طرح آج سے دو ہزار سال قبل کے وشیالی کے ایک بودھ بھکشو کی مریدنی کے کردار کی مصوری کی ہے۔

اسی طرح ۳۳ء کی ایک سرحدی پٹھان دوشیزہ کی بھی تصویر کھینچی ہے۔
یہی وجہ ہے کہ ایک ڈرامہ نویس اور شاعر کی حیثیت سے جے شنکر پرساد
جس بلندی پر نظر آتے ہیں فسانہ نویسی میں ہم ان کو اس مقام پر نہیں پاتے۔

جے شنکر پرساد کی تصانیف میں جو تحدید نظر آتی ہے اس کا سبب
غالباً یہ ہے کہ ان کو اپنے وطن بنارس سے باہر آمد ورفت کا بہت کم اتفاق
ہوا، اُن کی معلومات کا دار ومدار ان کے مطالعہ پر تھا۔ ان کی مجلس احباب
بھی بہت محدود تھی، ان حالات کا اثر اُن کی تصنیفات ہی پر نہیں۔ ان کی
زبان پر بھی پڑا، چنانچہ یو پی کے باہر کے ہندی خوانوں کو ان کی زبان کے
سمجھنے میں بہت دقت پیش آتی ہے۔ ان بعض خامیوں کے باوجود جے شنکر
پرشاد کی ادبی شان وعظمت سے انکار نہیں کیا جاسکتا، وہ ہندی کے
صف اول کے ادبا اور اہل قلم سے تھے۔ ان کی ادبی قدر ومنزلت کا آفتاب
آخر وقت تک پورے طور پر نمایاں ودرخشاں رہا۔

وشمبھر ناتھ جی نے اپنے متعدد فسانوں میں اپنی استعداد وصلاحیت
کا ثبوت دیا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حالات کی ناسازگاری نے انہیں
حصول کمال کا موقع نہیں دیا، راجہ رادھیکا رمن بھی چند اچھے افسانے
لکھ کر دنیائے ادب سے علحدہ ہو گئے، وشمبھر ناتھ کوشک ۱۳ء
سے لے کر اب تک برابر فسانے لکھ رہے ہیں اور ان کے فسانوں
کی تعداد تین سو سے زاید ہو چکی ہے، ان کے ابتدائی افسانوں کے
متعلق تو میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اس طرف کوئی پندرہ سولہ سال
سے ان کی فسانہ نویسی کا معیار یکساں قائم ہے۔

وشمبھر ناتھ کوشک کوئی نہ کوئی مقصد سامنے رکھ کر فسانہ لکھتے
ہیں، وہ "فن برائے فن" کے اصول کے قائل نہیں۔ ان کے فسانوں کی
ایک خصوصیت یہ ہے کہ وہ مکالمے سے شروع ہوتے ہیں اور مکالمے
ہی پر ختم ہو جاتے ہیں۔ کوشک کے فسانے علی العموم زندگی کے
معمولی واقعات پر مبنی ہوتے ہیں۔ ان میں یہ خاص کمال ہے کہ وہ معمولی
سے معمولی واقعات کی بنا پر فسانہ ترتیب دے سکتے ہیں۔ ان کے اکثر
فسانوں میں غیر ضروری طوالت کا عیب ہوتا ہے۔ تاہم بعض فسانے
فن کا بہترین نمونہ ہیں۔

وید چترسین شاستری ہندی کے ایک نامور اہل قلم ہیں۔ ہندی
میں ان کی نثر نگاری ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے، زبان میں ان کو
کمال حاصل ہے۔ وہ ایک بے حقیقت چیز کو بھی اپنے زور زبان
اور حسن بیان سے شاندار اور جاذب توجہ بنا دیتے ہیں، انہوں نے
کثرت سے فسانے لکھے ہیں۔ لیکن زبان اور اسلوب نگارش کے محاسن
کے سوا ان میں اور کوئی قابل ذکر خصوصیت نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ
ایک فسانہ نگار کی حیثیت سے انہیں کوئی خاص امتیاز حاصل نہیں
ہوا۔

پنڈت جوالا دت کے فسانے ہندی فسانہ نویسی کے دور اول
کے نمونے ہیں جن میں کردار نگاری کے مقابلے میں درس وتعلیم کو زیادہ
ملحوظ رکھا گیا ہے۔ چندر دھر گولیری نے شاید کل تین فسانے لکھے،
لیکن ان کا یہی مختصر افسانوی سرمایہ ان کے بقائے دوام کے لئے
کافی ہے۔ انہوں نے ایک افسانہ "اس نے کہا تھا" کے عنوان سے لکھا
ہے جو اس پائے کا ہے کہ آج بھی ہندی میں اس کے مقابلے کے
فسانے شاذ ونادر ہی پائے جاتے ہیں۔ اس فسانے میں فسانہ
نویسی کے تمام محاسن موجود ہیں۔ چندر دھر گولیری کی بے وقت موت
سے ہندی ادب کو بہت نقصان پہنچا۔

۱۹۱۶ء ہندی فسانہ نویسی کے لئے بہت مبارک ثابت ہوا،
معمولی حیثیت کا ایک نوجوان جس کا نام دھنپت رائے تھا اور جو نواب رائے
کے نام سے اردو میں فسانے لکھا کرتا تھا۔ پریم چند کے نام سے ہندی
فسانہ نویسی کے میدان میں داخل ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے
اس میدان میں اپنے نام کا ڈنکا بجا دیا۔

ہندی دنیا کی وسعت اور قدر شناسی نے پریم چند کو ہندی
کے میدان میں آنے کی ترغیب دی۔ لیکن انہوں نے اپنے مرکز عمل
کی تبدیلی کے باوجود اردو سے ترک تعلق نہیں کیا اور اردو خواں
پبلک بھی ان کو نہیں بھولی۔ اس لئے وہ اردو اور ہندی دونوں میں یکساں
مقبول ومحترم رہے اور دونوں زبانوں میں ان کے فسانے یکساں
قدر ومنزلت کی نظروں سے دیکھے جاتے تھے۔

یوں تو پریم چند نے سوسائٹی کے مختلف طبقوں پر فسانے لکھے
ہیں لیکن درحقیقت وہ ہندوستان کے پست اور بے زبان طبقے
کے ترجمان خصوصی تھے، ہندوستان کے لاکھوں اور کروڑوں مزدور
اور کسان جن کو تعلیم کی ہوا بھی نہیں لگی ہے۔ حوادث زمانہ سے کس طرح
متاثر ہوتے ہیں؟ ارد گرد کے واقعات کے متعلق کس عنوان سے غور و
فکر کرتے ہیں۔ اپنی مفلسی ومحتاجی اور بے کسی ومجبوری پر کس طرح اندر

ہی اندر گھٹتے اور خاموش رہتے ہیں! سائنس وفلسفہ کی موشگافیوں سے مطلق ناآشنا وناہلد ہر قسم کے آلام ومصائب کو تقدیر اور قدرت پر اعتماد کر کے کس طرح چپ چاپ برداشت کرتے رہتے ہیں؟ ان سب کی مصوری اور نقاشی پریم چند سے بہتر شاید ہی کسی ہندوستانی اہل قلم نے کی ہو۔

پریم چند مدت العمر مالی پریشانیوں میں مبتلا رہے، وہ بہت خوش مزاج تھے اور ہنستے تھے تو پوری شگفتگی کے ساتھ ہنستے تھے، لیکن ان ہنسی میں بھی ان کی پریشانیوں کی جھلک موجود ہوتی تھی۔ مالی اعتبار سے جہاں قدرت نے ان کو اپنی بخششوں سے بڑی حد تک محروم رکھا تھا وہاں ایک سچی رفیقۂ حیات عطا کر کے ان پر ایک احسان عظیم بھی کیا تھا۔ شیورانی دیوی کی رفاقت وہمدردی نے پریم چند کے قدم کو زندگی کے کسی لمحے میں بھی متزلزل نہیں ہونے دیا اور ہر حال میں ان کو خوش اور مطمئن رکھا۔

پریم چند کے فسانوں کی تعداد تین سو سے کم نہ ہوگی، اور ان کے ناول بھی ایک درجن سے زائد ہیں۔ ناول نویسی میں بھی پریم چند کے پایہ کا ہندی میں کوئی مصنف نہیں ہے، لیکن انہیں فسانہ نگاری میں جو کامیابی ہوئی وہ ناول نویسی میں نہیں ہوئی۔

پریم چند ہمیشہ لکھتے رہتے تھے، ان کو ایک روز کے لئے بھی آرام وسکون کا موقع نہیں ملتا تھا۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ ان کے بعض افسانے معمولی درجے کے ہیں، سوسائٹی کے پست اور بے زبان طبقے کی نمائندگی میں انہیں جو کامیابی ہوئی وہ دوسرے طبقوں کی مصوری میں نہیں ہوئی۔

ڈاکٹر ٹیگور، سرت چند چٹوپادھیائے اور پریم چند فسانہ نگاری میں نمایاں ترین شہرت وخصوصیت کے مالک ہیں۔ ان میں سے ٹیگور جذبات نگاری کا بادشاہ ہے۔ دل کے مخفی سے مخفی گوشے کے عمیق سے عمیق جذبات کی تصویر کشی میں شاعر اعظم کو جو کمال حاصل ہے وہ اس کے کسی حریف کو حاصل نہیں۔ سرت چندر اجتماعیت کے نمائندے ہیں۔ انسان جہاں اپنی انفرادیت کو محفوظ رکھتے ہوئے دوسرے انسان سے ملتا ہے خواہ وہ کسی حیثیت سے ملے وہیں سے سرت چندر کا میدان شروع ہوتا ہے۔ اور اس میدان میں سرت چندر کو امتیاز خاص حاصل ہے، اس کے بعد جب آدمی اپنی انفرادیت اجتماعیت میں جذب کر کے اجتماعیت کا عنصر بن جاتا ہے تو وہاں سے پریم چند کی حد شروع ہو جاتی ہے، اس میدان میں انسان کے انفرادی جذبات واحساسات کی چنداں اہمیت وخصوصیت باقی نہیں رہ جاتی۔ وجہ یہ ہے کہ اجتماعیت کے مقابلے میں خود انفرادیت چنداں اہمیت وخصوصیت نہیں رکھتی، اس میدان میں پریم چند کو اپنے معاصرین میں نمایاں امتیاز حاصل ہے۔

ٹیگور اور سرت چند بنگلا کے اہل قلم ہیں اس لئے اس گفتگو کو تو جملۂ معترضہ کے طور پر سمجھنا چاہئے۔ جہاں تک ہندی فسانہ نویسی کا تعلق ہے یہ کہنا خلاف واقعہ نہ ہوگا کہ ہندی میں صحیح فسانہ نگاری کا دور پریم چند کی فسانہ نویسی کے ساتھ شروع ہوا۔ ۱۹۱۷ء میں رائے کرشن داس نے فسانہ نویسی شروع کی۔ ۱۹۱۸ء میں چنڈی پرشاد "ہردیش" اور پنڈت گوند بلبھ پنت نے اس میدان میں قدم رکھا، کرشن داس وسیع مذاق کے اہل قلم ہیں۔ لیکن ان کے مذاق کی ممتاز خصوصیت ان کی فطرت پسندی ہے۔ چنڈی پرشاد "ہردیش" نے اپنی مختصر ادبی زندگی میں کافی فسانے لکھے مگر قبل اس کے کہ ان کا فن درجۂ کمال حاصل کرے، موت نے ان کی داستان زندگی کا آخری صفحہ الٹ دیا، پنڈت گوند بلبھ پنت نے بھی بہت سی کہانیاں لکھیں، مگر ہندی کے افسانوی لٹریچر میں انہیں کوئی امتیازی حیثیت حاصل نہیں ہوئی۔

۱۹۲۰ء میں سدرشن ہندی فسانہ نگاری کے میدان میں آئے پریم چند کی طرح یہ بھی اردو فسانہ نویس تھے۔ اور ان کو بھی اردو خواں دنیا میں کافی مقبولیت حاصل تھی۔ اچھے لکھنے والے تھے۔ ہندی کی ادبی سوسائٹی میں بھی جلد ہی مشہور ہو گئے، قبولیت عام کے اعتبار سے ہندی فسانہ نگاروں میں پریم چند کے بعد سدرشن ہی کا درجہ ہے، دونوں مصنفین کا مذاق بھی تقریباً یکساں ہے، سدرشن نے ایک مذہبی مبلغ کی حیثیت سے اپنی زندگی کا آغاز کیا تھا اس لئے ان کے فسانوں میں ابھی تک ان کی تبلیغی زندگی کا اثر موجود ہے، وہ اپنے ہر فسانے میں کوئی نہ کوئی درس وہدایت ضرور ملحوظ رکھتے ہیں، سدرشن کا اسلوب بیان نہایت شگفتہ اور دلکش ہے۔ وہ معمولی سے معمولی پلاٹ کو بھی اپنے طرز ادا کی خوبی سے ایک بلند پایہ فسانہ بنا دیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کے فسانوں میں خشکی اور بے روحی کا عیب بہت کم پایا جاتا ہے۔ سدرشن کے بیس پچیس سال مالی ابتلا میں گذرے۔

لیکن سیم وزر کے عوض قدرت نے ان کو صبر وضبط کی وافر دولت عطا فرمائی ہے۔ چنانچہ ان کی شکل وشباہت سے ان کی اقتصادی کشمکش اور پریشانی کا مطلق پتہ نہیں چلتا، بلکہ اس کے برعکس وہ بہت

خوش اور مطمئن نظر آتے ہیں، اس سے عجیب تر یہ کہ وہ جتنے بن کے ہیں دیکھنے میں اس سے کم عمر معلوم ہوتے ہیں۔ کشاکش حیات میں ان کی اس کامیابی کا موجب ان کی رفیقۂ حیات ہیں۔ مسز سدرشن کی سچی رفاقت ہی سدرشن کے دل میں زمانے کی کج روی سے بیل نہیں آنے دیتی فلمی لائن اختیار کر لینے کے باعث اب سدرشن ہندی فسانہ نویسی کے میدان میں بہت کم نظر آتے ہیں۔

بیسویں صدی کے دوسرے دسویں کے آخر میں پدم لال پنا لال بخشی، بابو شیو پوجن سہائے، مُنّن درویدی۔ گنگا پرشاد جی۔ پی۔ شری واستو، وغیرہ اہل قلم نے بھی فسانہ نویسی شروع کی۔ ان میں بخشی جی کے افسانے بہت اچھے ہیں، ان کے افسانے ہوتے تو ہیں چھوٹے چھوٹے لیکن معنوی اعتبار سے قابل قدر ہوتے ہیں، بابو شیو پوجن کے افسانے اوسط درجے کے ہیں، مُنّن درویدی افسانہ نگار کے برعکس مضمون نگار اچھے تھے، ان کا انتقال ہو گیا۔ جی۔ پی۔ شری واستو مزاحیہ نویس ہیں۔ ان کے فسانے بھی مزاحیہ ہوتے ہیں لیکن وہ مزاح میں جادۂ متانت و شائستگی سے تجاوز کر جاتے ہیں۔

اس طرح بیسویں صدی کے تیسرے دسویں کے قریب تک کوئی ایک درجن ہندی کے بہترین فسانہ نویس پیدا ہو چکے تھے اور افسانہ نویسی ہندی ادبیات کا ایک خاص جزو بن چکی تھی۔ لیکن ابھی تک افسانہ نویسی کے مقابلے میں شاعری کو زیادہ قدر و منزلت حاصل تھی۔

۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۷ء تک ہندی افسانہ نگاری کے میدان میں نئے اہل قلم کی آمد کی رفتار حسب ذیل ہے:۔

۱۹۲۱ء میں موہن لال نہرو اور رگھوپتی سہائے۔
۱۹۲۲ء بھگوتی پرشاد باجپئی، اور پانڈے بیچن شرما "اگر"۔
۱۹۲۵ء ونود شنکر ویاس۔
۱۹۲۶ء راجیشور پرشاد سنگھ۔
۱۹۲۷ء جنار دھن جا دوج، واچسپتی پاٹھک، درگا پرشاد بھاسکر جے نند کمار، رشمبرن جینی اور آلائی چند رجوشی،

موہن لال نہرو نے سماج کی اصلاح کے پیش نظر کچھ افسانے لکھے ہیں جو اچھے ہیں، بھگوتی پرشاد کے افسانوں کی تعداد کافی ہے، ان کو ادبی مشاغل سے بہت ذوق ہے چنانچہ ناسازگار حالت کے باوجود ان کی امکانی سعی یہی ہوتی ہے کہ ان کی کاوشیں ادبیات ہی سے وابستہ رہیں۔ اگر زمانہ ان کو سکون و اطمینان عطا کرتا تو وہ ایک ممتاز افسانہ نویس ہو سکتے تھے، لیکن بحالت موجودہ ان کو افسانہ نگاروں کی نمایاں صف میں جگہ نہیں دی جا سکتی۔

بے چن شرما "اگر" نے دورِ طفولیت ختم کرنے سے پہلے ہی فسانہ نگاری میں خاصی شہرت و قبولیت حاصل کر لی۔ "اگر" صاحب میں فسانہ نگاری کی زبردست استعداد و صلاحیت تھی۔ لیکن ان کے بعض عجلت پسند اور بے صبر مدحت طرازوں نے قبل از وقت ان کو بڑے بڑے خطابات سے گراں بار بنا دیا۔ غالباً اسی عاجلانہ تحسین و ستائش نے اگر صاحب کو اس سعی و کاوش اور فکر و مطالعہ سے مستغنی اور بے نیاز بنا دیا جو ایک بلند پایہ فسانہ نگار کے لئے ناگزیر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک دفعہ ہندی افسانہ نگاری کے آسمان پر چکے تو سہی، لیکن ٹوٹے ہوئے ستارے کی طرح جس کی روشنی دیکھتے ہی دیکھتے معدوم ہو جاتی ہے،

"گلہا تجلی" اور "چنگاری" کے نام سے "اگر" کے افسانوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں جو مصنف کی استعداد و صلاحیت کا پتہ دیتے ہیں۔

ونود شنکر ویاس افسانہ نویسی میں جے شنکر پرشاد آنجہانی کے پیرو ہیں۔ انہوں نے ابتدا میں بہت سے افسانے لکھے جن میں مزید ترقی کی کافی گنجائش تھی، لیکن انہوں نے فسانہ نویسی سے تقریباً دست کشی کر لی، ممکن ہے سکون و راحت کے ایام از دیاد صلاحیت کا باعث ہوں اور جب وہ دوبارہ فسانہ نویسی شروع کریں تو اپنے کو پہلے سے زیادہ کامیاب ثابت کر سکیں، فن فسانہ نگاری بالخصوص ہندی افسانہ نویسی کے متعلق ونود شنکر ویاس اچھی معلومات رکھتے ہیں۔

راجیشور پرشاد سنگھ کے فسانوں کے پلاٹ بہت اچھے ہوتے ہیں لیکن وہ غیر ضروری طوالت سے کام لیتے ہیں۔ اس لئے ان کے فسانے خشک اور بے کیف ہو جاتے ہیں۔ جنار دھن جی دیوج راجیشور پرشاد سنگھ کے طرز کے فسانہ نگار ہیں لیکن ان کے افسانوں میں قدرے ادبیت ہوتی ہے اور ان کے پلاٹ بھی دلچسپ ہوتے ہیں اس لئے ان کے افسانے پسندیدہ ہوتے ہیں۔ واچسپتی پاٹھک کو افسانہ لکھتے دس گیارہ برس ہو چکے ہیں، ان کے ابتدائی افسانے تو معمولی درجے کے ہیں۔ لیکن وہ بتدریج ترقی کرتے جا رہے ہیں اور اب وہ اچھے فسانے لکھ لیتے ہیں۔ اگرچہ ابھی تک ان کے فسانوں کا ماحول کامل

نہیں ہوتا۔ اور ان میں جذب و کشش کی بھی کمی ہوتی ہے۔ تاہم ان کے افسانوں کے مجموعے "پردیپ" کو دیکھ کر توقع کی جا سکتی ہے کہ موجودہ نقائص پر قابو پانے میں بھی کامیاب ہو جائیں گے۔

درگا پرشاد بھاسکر کے افسانے بھی اچھے ہوتے ہیں، امید ہے کہ وہ بھی ایک کامیاب افسانہ نویس ہوں گے۔ جے نند کمار کا پہلا افسانہ ۱۹۲۸ء میں شائع ہوا جس کا عنوان "ہتیا" تھا جو لوگ ان سے ناواقف تھے انہوں نے "ہتیا" کو دیکھ کر سمجھا کہ یہ کوئی کہنہ مشق بنگلہ افسانہ نویس ہیں اور اب انہوں نے ہندی میں لکھنا شروع کیا ہے۔ ان لوگوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ جے نند کمار ہندی ہی کے اہلِ قلم ہیں اور یہ ان کا پہلا افسانہ ہے تو ان کو بہت تعجب ہوا۔

جے نند کمار ہندی افسانہ نگاروں کی صف اول میں ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں اور طرز خاص کے بانی ہیں۔ ہندی فسانہ نویسوں میں جے نند کمار پہلا شخص ہے جس نے "فن برائے فن" کے اصول پر کامیابی کے ساتھ عمل کرنے کی ایک شاندار مثال قائم کی، اس کامیابی کے باوجود ابھی جے نند کمار اپنی موجودہ حالت پر قانع نہیں ہیں اور ترقیٔ فن کی سعی میں برابر کوشاں ہیں اس سے اس حوصلہ مند فسانہ نگار کے عزائم کی بلندی کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

دوسرے ادیبوں اور انشا پردازوں کی طرح جے نند کمار کو بھی مالی مجبوریاں گھیرے رہتی ہیں اس لئے ان کو اکثر زبردستی بھی لکھنا پڑتا ہے یہی اقتصادی مصلحتیں کبھی کبھی ان کو غیر ضروری طوالت نگاری پر بھی مجبور کر دیتی ہیں جس کا صریح اندازہ جے نند کمار کے ناول "سونیتا" سے کیا جا سکتا ہے۔

اس سے یہ سمجھنا صحیح نہ ہوگا کہ جے نند کمار اختصار نویسی پر قادر نہیں ہیں یا لکھتے نہیں ان کے متعدد افسانے مختصر نویسی کا بہترین نمونہ قرار دیئے جاتے ہیں۔ ان کا ایک افسانہ "دو چڑیاں" ہے جس میں ایک لفظ بھی زائد از ضرورت نہیں ہے۔

جے نند کمار میں انسانیت کے بہت سے محاسن بھی ہیں اور بہت سے معائب بھی، لیکن ان سب کے باوجود وہ خالص ادبی زندگی گذار رہے ہیں اور اپنا ایک خاص ادبی نصب العین رکھتے ہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نصب العین کی پابندی کا غلو انہیں جادۂ اعتدال سے الگ لئے جا رہا ہے جو عجب نہیں ان کو کسی گمراہی میں مبتلا کر دے۔

جے نند کمار اپنے فسانوں میں اپنے قلبی جذبات و حسیات کے بجائے دماغی فکر و کاوش سے زیادہ کام لیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے فسانوں میں درد و گداز کا عنصر بہت کم ہوتا ہے۔

جے نند کمار سے کسی قدر پہلے ہی دہلی کا ایک اور نوجوان بڑی آن بان سے ہندی فسانہ نویسی کے میدان میں آیا جس کا نام رشی بھرن جین تھا۔ اس میں بھی کافی استعداد و قابلیت موجود تھی جو ادب سے تجارت کی جانب منعطف ہو گئی، لیکن ان کے قلم سے نکلے ہوئے کافی افسانے موجود ہیں اور اب بھی وہ لکھتے رہتے ہیں، ان کے ابتدائی افسانوں میں اکثر مقامات پر جذب و اثر کی کمی پائی جاتی ہے۔

الائی چند ر جوشی کے متعدد افسانے فن کے اچھے نمونے ہیں۔ امید ہے کہ ان کا مستقبل اور بھی کامیاب ہوگا۔

۱۹۲۸ء سے ہندی ادبیات میں اس حیثیت سے ایک جدید دور کا آغاز ہوا کہ ہندی ادبیات کی سب سے ممتاز اور نمایاں جگہ فسانہ نگاری نے لے لی اور اس بنا پر اکثر شاعروں اور نثر نگاروں نے فسانہ نویسی شروع کر دی، ۱۹۲۸ء سے اب تک جتنے شعراء اور نثر نگار فسانہ نویسی کے میدان میں آچکے ہیں۔ ان کے نام یہ ہیں۔ سورج کانت ترپاٹھی "نرالا"، سیارام شرن گپت، سومترانندن پنت، موہن لال مہتو، بھگوتی چرن ورما، سوامی ست دیو، شری رام شرما، شری ناتھ سنگھ سدگرو شرن اوستھی، ست جیون ورما بھارتی۔ ان میں اول الذکر پانچ شاعر ہیں باقی نثر نگار،

ان شاعر فسانہ نویسوں میں سورج کانت نرالا کے فسانوں کے پلاٹ اکثر دلچسپ ہوتے ہیں اور ان کا رنگ بھی ادیبانہ ہوتا ہے۔ پھر بھی فسانہ نویسی میں انہیں کوئی قابل ذکر کامیابی نہیں ہوئی، وہ افراد افسانہ کے کردار کو بخوبی نمایاں کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ سیارام شرن کے افسانوں میں معنویت تو ہوتی ہے لیکن ان کی صوری حالت تشنۂ تکمیل رہ جاتی ہے۔ سومترانندن پنت کے افسانوں میں حقائق سے زیادہ جذبات کی نمائش ہوتی ہے وہ بھی سطحی جذبات کی۔ موہن لال مہتو کے فسانوں میں بھی شاعرانہ تخیلات کو نمایاں حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ بھگوتی چرن ورما دور جدید کے نمائندہ شاعر ہیں۔ امید ہے کہ وہ افسانہ نویس کی حیثیت سے بھی کامیاب ہوں گے،

نثر نگاروں میں سوامی ست دیو نے فسانہ نویسی شروع بھی کی

اور غالبًا چھوڑ بھی دی، اس فن میں انہیں کوئی خصوصیت حاصل نہیں ہوئی، شری رام شرما کے افسانے دیہاتی زندگی کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ ان کے فسانوں میں تخیلات کی بلند پروازی مفقود ہے لیکن حقیقت نگاری کے اعتبار سے افسانے کامیاب ہیں۔ شری رام شرما کے افسانے بہت زیادہ نہیں ہیں۔ شری ناتھ سنگھ نے بہت سے افسانے لکھے ہیں اور ان میں بعض بہت اچھے ہیں، "غریبوں کا سورگ" خصوصیت کے ساتھ تحسین و داد کے لائق ہے۔ سدگورو شرن اچھے شرنگار ہیں، ان کی یہ خصوصیت ان کے افسانوں میں بھی موجود ہے۔ "ست جیون" و "ماں بھارتی" کے افسانے بھی ایسے ہی ہوتے ہیں

کرشنانند گپت کو مغربی اسلوب افسانہ نویسی کے استعمال کا بہت اچھا سلیقہ تھا لیکن معلوم ہوتا ہے مالی حالت کی ناسازگاری نے ان کو ادبی مشغلہ سے کنارہ کش ہونے پر مجبور کر دیا، سات آٹھ برس سے دنیائے ادب میں ان کا پتہ نہیں چلتا، اسی زمانے میں موہن سنگھ دیوانہ نے بھی کچھ افسانے لکھے تھے۔

بیسویں صدی کے تیسرے دسویں میں جتنے ادیبا اور اہل قلم ہندی فسانہ نویسی کے میدان میں آئے ہیں۔ میں ان سب سے واقف نہیں۔ جن حضرات کو میں جانتا ہوں ان کے نام یہ ہیں۔ پرتاپ نرائن شری واستو منگلا پرشاد وشوکرما، اختر حسین رائے پوری، ویریشور، سادھو شرن۔ اننت پرساد شری واستو، سچدانند واتسیائن، دھرم بیر، اننت گوپال ماچھوے۔ راج کمار، رگھو بیر سنگھ، اپیندر ناتھ اشک، پہاڑی، سورج دیو نارائن شری واستو۔ اور جیش پال۔

ان میں پرتاپ نارائن مسلمانوں کی تہذیب و معاشرت کی مصوری میں امتیاز رکھتے ہیں، منگلا پرشاد کے فسانے جوالا دت شرما کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ ویریشور کے فسانے زیادہ نہیں ہیں لیکن جو ہیں ان سے نوجوان مصنف کی استعداد کا ثبوت ملتا ہے۔ دھرم بیر اور اشک لاہوری ہیں اور اردو کے اچھے فسانہ نگار سمجھے جاتے ہیں۔ ہندی میں بھی شہرت و قبولیت حاصل کر رہے ہیں، پہاڑی بھی اچھے فسانہ نگار ہیں، سورج دیو شری واستو کی تعریف پریم چند کر چکے ہیں، اختر حسین رائے پوری نے زیادہ فسانے نہیں لکھے۔ لیکن ان کے جتنے فسانے ہیں وہ ایک انقلاب پسند نوجوان کے خیال و مذاق کا اندازہ کرنے کے لئے کافی ہیں۔

ان جدید اور نوجوان افسانہ نگاروں میں سچدانند واتسیائن خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے۔ اس میں ایک اہلِ فن فسانہ نگار کے تمام آثار و علائم موجود ہیں۔ اس میں قدیم رسم و رواج ہوں یا جدید سب کے خلاف زبردست جذبہ موجود ہے، یہ نوجوان جیل کی زندگی بھی گذار چکا ہے۔

سچدانند واتسیائن کم و بیش پچاس فسانے لکھ چکے ہیں، ان افسانوں کی دنیا ایثار و اخلاص اور جانبازی و فداکاری کی سنگلاخ اور دشوار گذار سرزمین پر آباد کی گئی ہے۔ اس لئے یہ کہہ لیا جائے کہ ان میں دلچسپی اور رومانیت نہیں ہے لیکن ایک اہلِ نظر ان کی قدر و منزلت سے انکار نہیں کر سکتا۔

شاید سچدانند کی برسوں کی جیل کی زندگی نے ان میں انفرادیت پیدا کر دی ہے جس کا رنگ ان کے افسانوں میں بھی پایا جاتا ہے اور یہی وجہ ہے جو ان کے افسانوں کو قبول عام حاصل نہیں ہے۔ بہرحال وہ ہندی کے ایک ہونہار افسانہ نویس ہیں اور ان کا ایک خاص اسلوب ہے جشپال بھی انہی کے طرز پر اچھے فسانے لکھتے ہیں۔ ہندی کے افسانوی لٹریچر میں مزاحیہ فسانوں کی بہت کمی ہے۔ ہندی مزاحیہ نگاروں کے نام یہ ہیں۔ شیو ناتھ شرما، ہری شنکر شرما، کرشن دیو پرساد گوڑ، پنورنانند ورما اور جی۔ پی۔ شری واستو۔

ہری شنکر شرما اچھے لکھنے والے ہیں، لیکن انہوں نے مزاحیہ اسکیچ ہی لکھے، اپیندر ناتھ کو مزاحیہ نگاری میں کافی شہرت حاصل ہے۔ کرشن دیو پرساد گوڑ جو بے ڈھب بنارسی کے نام سے مزاحیہ لکھتے ہیں نسبتاً کامیاب ہیں۔ ان کے افسانوں میں "بنارسیت" کی خصوصیت سے مشہور رہے۔

ہندی مزاحیہ نگاری جتنی پست اور ذلیل ہے۔ اس کی نسبت اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ اگر باستثنائے چند ہندی کا کوئی مزاحیہ فسانہ یا مضمون ترجمہ کر دیا جائے تو اس کو اردو کے اچھے پرچوں میں شاید ہی جگہ مل سکے۔

سات آٹھ سال کے عرصے میں بہت سی ہندو خواتین بھی فسانے لکھنے لگی ہیں اور ان میں کامیاب افسانہ نویس بھی ہیں، خواتین میں سب سے پہلے غالبًا اوماہرو نے ہی فسانہ نگاری شروع کی، ان کے بعد منشی پریم چند کی اہلیہ شیو رانی دیوی نے فسانہ نویسی کے میدان میں قدم رکھا۔

ان کے فسانوں کا ایک مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔

شیورانی دیوی کے بعد ہندی کی مشہور شاعرہ سوبھدرا دیوی چوہان بزم افسانہ نگاری کی زینت ہیں۔ مردوں کی جانب سے عورتوں پر جو سماجی اور معاشرتی مظالم ہوتے ہیں۔ ان کے خلاف معلوم ہوتا ہے سوبھدرا دیوی کے دل میں انقلاب انگیز جذبات موجود ہیں جن کی شاعری کے ذریعہ تسکین نہ ہو سکی تو انہوں نے اس کے لئے فسانہ نویسی اختیار کی۔ سوبھدرا دیوی کا مقصد تو بہت شاندار ہے لیکن بہ لحاظ فن ان کے افسانے زیادہ بلند نہیں ہیں۔ ان کے فسانوں کے دو مجموعے معرض اشاعت میں آ چکے ہیں۔

تیج رانی پاٹھک اور اوشا دیوی متر بھی اہل قلم خواتین میں بہت مشہور ہیں۔ تیج رانی کا ایک افسانہ "چل چتر" (متحرک تصویر) ہے جو اتنا اچھا ہے کہ کوئی مرد شاید ہی اس پایہ کا افسانہ لکھ سکے، اوشا دیوی نے بھی افسانہ نویسی میں کافی مہارت حاصل کر لی ہے۔ ان کا بھی ایک خاص اسلوب ہے، پلاٹ میں بھی ندرت ہوتی ہے، ان کی زبان میں سلاست و سادگی کم ہوتی ہے اور تصنع و تکلف زیادہ ہوتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے اوشا دیوی کی فطرت دشوار پسند واقع ہوئی ہے۔ ہندی کے قدیم طرز ادا اور سنسکرت الفاظ کے استعمال کی بہت دلدادہ ہیں۔

۱۹۳۳ء میں کملا دیوی چودھرانی افسانہ نویس خواتین کے حلقے میں شامل ہوئیں۔ یہ ابتدا میں بہت کم ہندی جانتی تھیں۔ لیکن چند ہی سال کی کاوش و کوشش سے نہ صرف انہوں نے زبان پر قدرت حاصل کر لی۔ بلکہ فسانہ نویسی میں کمال پیدا کر لیا۔

ہندی افسانہ لکھنے والی خواتین میں چودھرانی صاحبہ اول درجے کی فسانہ نویس ہیں، احساسات و تصورات کی مصوری میں ان کو غیر معمولی دسترس حاصل ہے۔ "سادھن کا اُنماد" کملا دیوی کا بہترین افسانہ ہے۔ "اُنماد" کے نام ان کے فسانوں کا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ اور "پکنک" کے نام سے دوسرا مجموعہ بھی شائع ہوا ہے۔

تین چار برس سے سوشیلا کماری آغا بھی افسانہ لکھ رہی ہیں۔ ان میں بھی افسانہ نویسی کی کافی صلاحیت ہے۔ شاید ان کے افسانوں کا بھی ایک مجموعہ شائع ہو چکا ہے۔ حالات سازگار رہے تو امید ہے کہ آغا صاحبہ بھی ہندی فسانہ نویسی میں امتیازی حیثیت حاصل کر لیں گی۔

انہی دنوں کماری سرسوتی۔ نرتا راپانڈے، رتن کماری کا بیہ تیرتھ اور شریمتی ستیہ وتی ملک نے بھی فسانہ نگاری شروع کی۔ کماری سرسوتی کے افسانوں میں ایک خاص درد و اثر ہوتا ہے۔ اس لئے ان کے افسانوں کی قبولیت ترقی پذیر ہے، ستیہ وتی ملک بھی چھوٹے چھوٹے افسانے کامیابی سے لکھ لیتی ہیں۔ ان سے بھی توقع ہے کہ جذبات نگاری میں خاص مہارت حاصل کریں گی،

جن فسانہ نگار مردوں اور عورتوں کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ان کے علاوہ اور افسانہ نویس مرد اور عورتیں بھی ہیں جن کا ذکر تذکرہ مضمون کی مزید طوالت کا موجب ہوگا، ہندی کے افسانوی لٹریچر کا اندازہ کرنے کے لئے اتنا بھی کافی ہے۔

آخر میں یہ بتا دینا بے محل نہ ہوگا کہ آثار و قرائن ہندی فسانہ نویسی میں ایک انقلاب کا پتہ دے رہے ہیں۔ اب پبلک درسی فسانوں سے اکتا گئی ہے۔ وہ نہیں چاہتی کہ درس و نصیحت کے پیش نظر ایک پلاٹ کی تخلیق کی جائے اور اس کو درسیہ مقصد کے مطابق اچھے یا بُرے نتیجے پر ختم کیا جائے۔ وہ چاہتی ہے کہ جس طرح دنیا میں اچھا بُرا سب کچھ ہو رہا ہے فسانے بھی دنیا کا ہو بہو مرقع ہوں۔ اس جدید اصول کے مطابق افسانے لکھے بھی جانے لگے ہیں۔

ابو محمد امام الدین

شعر

مجھے کافی ہے نقش بوریا پہلو کی زینت کو،
ہیں ہر زینت کو اب سے وقفِ حرماں کر کے چھوڑوں گا

وحید الدین سلیم

تنہائی

شام آئی اور ہو گئی جوئے رواں اداس — جوئے رواں تو کیا، ہیں زمین و زماں اداس

جا دبکے گھونسلوں میں طیورِ نوا فروش — دھیمی ہوا کی چال ہے۔ لہریں ہیں بے خروش

مانجھی۔ ابھی تو آنکھ میں دن کی ہے روشنی

کیوں تو نے اپنی ناؤ کنارے پہ چھوڑ دی؟

آیا تھا بہرِ سیر و تماشا سحر کو میں — اس جلوہ گہ میں بھول ہی بیٹھا تھا گھر کو میں

میرے وہ ہم جلیس وہ یارانِ خوش ادا — دن بھر میں جن کے ساتھ یہاں کھیلتا رہا

جن دوستوں سے رہتی تھی ہر وقت دل لگی — جن سے کہ بندھ چکا تھا مرا عہدِ زندگی

وہ ایک ایک کر کے بالآخر چلے گئے — خالی ہر ایک شاخ ہے طائر چلے گئے

اُن سے عبث بڑھائی محبت خبر نہ تھی — آئے گی سر پہ ساعتِ فرقت خبر نہ تھی

اب ایک دردِ روحِ حزیں میں لئے ہوئے — سیل آنسوؤں کی آنکھوں سے جاری کئے ہوئے

اُس نیلگوں اُفق پہ لگائے ہوئے نظر،

ڈوبے ہوئے نصیب کو روتا ہوں گھاٹ پہ

تاجور سامری

فرانس کا تخیّل پرسْت شاعر

سٹیفانے میلارمے

باڈلیئر کہتا ہے کہ کوئی مکمل حسن ایسا نہیں جس میں کسی نہ کسی حد تک اجنبیّت اور اچھوتا پن نہ موجود ہو۔ میلارمے کی ادبی تخلیق کا حسن ایسا ہی حسن ہے۔ مگر یہ حسن بعض لوگوں کو اس لئے ایک اُلجھن میں ڈال دیتا ہے کہ اُس کا دارومدار اشاروں اور کنایوں پر ہے۔ غیر محسوس قسم کی باتوں کو اُس نے واضح طور پر بیان نہیں کیا۔ احساسات کو جوں کا توں تحریر کی صورت دے دی ہے۔

ہم سب اپنے وقت اور ماحول کے رسم و رواج اور عادات و اطوار کے قیدی ہیں۔ ادب اور آرٹ کی تخلیقات کو جانچتے ہوئے ہم کوشش کے باوجود جانبداری سے رہا نہیں ہو سکتے۔ قدماء شاعر کو تلمیذ الرحمٰن سمجھتے آئے۔ اور ہم بھی اب تک کم از کم غیر شعوری طور پر یہی سمجھتے ہیں۔ قدماء سمجھتے آئے کہ شاعر پیدا ہوتے ہیں، بنائے نہیں جاتے۔ شاعری ایک بے ساختہ اور الہامی چیز ہے اس میں خشک سوچ بچار کو کوئی جگہ نہیں۔ شاعر برہما کی مانند نئی اور اچھوتی چیزوں کی تخلیق کرتا ہے اور اُس کی تخلیق آسمان سے گرنے والی بارش کی طرح ایک ایسی چیز ہوتی ہے جس کا دنیوی اشیا سے کچھ تعلق نہیں۔ لیکن یہ اُس زمانے کے خیالات ہیں (اور اب بھی اکثر لوگ ان کے قائل ہیں) جب دنیا نہیں جانتی تھی کہ آسمان سے گرنے والی بارش بھی زمین پر پھیلے ہوئے سمندر ہی سے پیدا ہوتی ہے۔

مگر انسان شروع سے خواب دیکھنے کا عادی ہے۔ وہ عموماً اس دنیا کی حقیقت سے تنگ آکر اپنی ایک علیحدہ خیالی دنیا بساتا ہے اور جب وہاں اُسے حقیقت کی تلخی سے تسکین مل لیتی ہے تو وہ حقیقت کی طرف پلٹتا ہے۔ حقیقت اور خواب کے اس عمل ہی نے فرانس کے شاعر میلارمے کے ذہن کو اپنی طرف اس شدومد کے ساتھ متوجہ رکھا کہ وہ ایک نئے جمالیاتی نظریے کا بانی بن گیا۔ لیکن ایک اُلجھن یہ آپڑی کہ اُس کے کلام کی انفرادیت نے اس میں ایک ایسا ابہام اور اغلاق پیدا کر دیا جو شارحین اور نقادوں کی لے دے کا باعث بنا۔

وہ لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ غالب کی مشکل پسندی، اس کا اختصار اور ابہام شاعری کا ایک عیب ہے تنقید کے صحیح اصول سے ناواقف ہیں۔ بیدل یا غالب نے ایک بات کو محسوس کیا، ایک بات پر غور کیا اور اپنے اُس تاثر کو الفاظ کا قیدی بنا دیا۔ اب اگر ان الفاظ سے ہر قاری کے ذہن میں وہی احساس و تفکر نہیں پیدا ہوتا۔ تو اُن لفظوں کے لکھنے والے کا اس میں کوئی قصور نہیں ہے۔ ان لفظوں کو لکھنے والا ایک غیر معمولی اور بلند ذہانت کا مالک تھا، اس لئے اُس کے مفہوم کو پورے طور پر سمجھنے کے لئے بھی ہمدردانہ اور ارتقائی ذہنیت کی ضرورت ہے۔ لیکن ابہام میں ایک کمی ہے، یہ بسا اوقات بظاہر بے معنی ہو کر رہ جاتا ہے اور میلارمے بھی اس سے مستثنےٰ نہیں ہے۔ مگر اس اُلجھن کو دور کرنے کے لئے ارتقائے ذہنی کی اُن منزلوں سے گذرنا ضروری ہے جن سے گذر کر شاعر نے ایک احساس کو قلمبند کیا ہے۔

غالب کے اپنے زمانے میں اُس کے سمجھنے والے نہ تھے [یا کم تھے] کیونکہ ماحول کی موافقت کے لحاظ سے اُن کی ہستی کا امکان بھی کم ہی تھا۔ اُس وقت ملک و قوم پر ایک ذہنی اور روحانی تنزل چھایا ہوا تھا۔ لیکن بعد میں جب ایک ہمہ گیر بیداری پیدا ہوئی اور حیاتِ نو کے جلوے نظر آنے لگے تو لوگ خود بخود غالب کی اُن باتوں

کو سمجھنے لگے جنہیں کہتے ہوئے اُسے گو مُبہم مشکل وگرنہ گو مُبہم مشکل، کہنا پڑا تھا۔
لیکن اگر آج ہم غالب کو مشکل پسند کہہ کر رد کرنے کی کوشش کریں گے تو یہ ہماری ذہنی کم ہمتی کی دلیل ہوگی۔ اس لئے ہمیں میلارمے اور اُس جیسے دوسرے شعراء کے ابہام کو اپنے لئے واضح کرنے کی پوری کوشش کرنی چاہیئے۔

سٹیفانے میلارمے اٹھارہ مارچ ۱۸۴۲ء کے روز پیرس میں پیدا ہُوا۔ اُس کی تمام زندگی سیدھی سادی اور کسی قسم کے خاص واقعات سے خالی ہے۔ فرانس میں انگریزی زبان کے پروفیسر کی حیثیت سے جو آمدنی ہوتی وہ اُس کے اور اُس کی بیوی اور ایک بیٹی کے گذارے کے لئے کافی تھی۔ ہر منگل کی شام کو وہ اپنے احباب کو اپنے گھر پر مدعو کیا کرتا اور ان موقعوں پر باہم ادبی گفتگو اور تبادلۂ خیالات ہُوا کرتا جس طرح اُس کی چند کتابوں نے جو اُس کی زندگی کا جزو تھیں اپنے اثرات کے لحاظ سے ایک اہمیت حاصل کرلی اسی طرح ان شام کی باتوں نے بھی اپنے زمانے کے نوجوان اور ہونہار فرانسیسی ادبا پر بہت اثر کیا۔ ۱۸۸۷ء میں اس کی نظموں کا مجموعہ شایع ہوا۔ لیکن "گوالے کا سپنا" اور کئی دوسری نظموں کا ذکر اس اشاعت سے بہت پہلے ہی بہت سے لوگوں کی زبان پر تھا۔ ۱۸۷۵ء میں اس نے انگریزی زبان کے مصنف ایڈگر ایلن پو کی نظموں کا امتیازی ترجمہ فرانسیسی میں پیش کیا میلارمے بیس سال کا تھا کہ انگریزی زبان کی تحصیل کے لئے انگلستان پہنچا۔ اپنی اور پھر ایڈگر ایلن پو کی نظموں کی اشاعت کے بعد جبکہ اس کی عمر تیس اور چالیس کے درمیان تھی اُس نے ارادہ کرلیا کہ اب وہ سنجیدگی کے ساتھ نظم و شعر کی طرف توجہ کرے گا۔ اسی زمانے میں اس نے سٹیج کے لئے "گوالے کا سپنا" لکھا لیکن اسے سٹیج نہیں کیا گیا بلکہ اشاعت پر بھی لوگوں نے اس کا مذاق اُڑایا۔ مگر آج اسی نظم کو میلارمے کی بہترین اور سب سے واضح نظم سمجھا جاتا ہے۔ رفتہ رفتہ میلارمے کی شہرت قائم ہوگئی اور اُس نے "خالص شاعری" کے علمبردار کی حیثیت سے اپنے بہت سے پیرو پیدا کرلئے۔ آخر ۹ ستمبر ۱۸۹۸ء کے روز وہ اچانک فونتین بلو کے مقام پر پھیپھڑوں کے ایک مرض کی وجہ سے مر گیا۔

میلارمے کو اُس کی زندگی ہی میں اپنے زمانے کا واحد صاحبِ طرز تسلیم کرلیا گیا تھا اور فرانس کے شعراء میں اس کا درجہ اس وقت سے اب تک پہلے سے زیادہ مستقل حیثیت اختیار کرتا رہا ہے۔
میلارمے کی تحریک شعری پیچیدہ اور جزوی قسم کی ہوتی تھی۔ نتیجے کے طور پر اس نے بہت کم چیزیں لکھیں یا کم از کم اُن میں سے بہت کم چیزیں شائع کی گئیں، میلارمے کے جوہر خداداد کی بنیاد اُس چابکدستی پر ہے۔ جس سے وہ ایک ہنگامی تاثر کو اپنی ذہانت کی گرفت میں لا کر ایک مستقل حیثیت دے دیتا ہے۔ میلارمے کی شاعری میں ہم دیکھتے ہیں کہ موضوع کا فقدان ہے اور وہ جو کچھ کہہ رہا ہے اُس میں اُسے کوئی گہری دلچسپی نہیں۔ یہ موضوع کا فقدان ہی اُس کی شاعری کو "خالص شاعری" بناتا ہے اور اس لئے اُسے ہر بات تحریک نہیں دے سکتی اور جب کبھی اُسے کوئی بات تحریک دیتی بھی ہے تو وہ ایسی بات ہوتی ہے جو اُس کے سوا اور کسی کے لئے تحریک کی وجہ نہیں بن سکتی۔ میلارمے نے اپنی ابتدائی نظمیں باڈیلیئر کے اثرات کے ماتحت کہیں جس کی ایک مثال٭ "اُلجھن" ہے۔ لیکن ابتدا ہی سے اُس کی انفرادی خصوصیات شعری نشوونما پاچکی تھیں۔ اس کے کلام کی دو امتیازی خصوصیات ہیں۔ احسن قائم بالذات کے حصول کی جستجو اور رمز الفاظ کی قدر و قیمت کا ایک انفرادی تصوّر۔
میلارمے نے قدماء کے اصول و قوانین کی مخالفت ایک خاص انداز میں کی۔ اُس نے اُن کے قواعد کو ترک کر دیا لیکن اُن ہی ایسے سخت قواعد اپنے لئے از سرِ نو وضع کر لئے۔ اُس کے اپنے ان نئے قواعد وضوابط شعری کی سختی کا اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بہت عرصے تک اسی سختی نے اُس کی تخلیقی قوت کو کند کئے رکھا۔ ۱۸۷۰ء کے بعد سے اُس کی نظمیں پہلے سے زیادہ مبہم اور تخیّل پرستانہ ہوگئیں۔ لیکن اس کی واضح ترین نظموں میں بھی (مثلاً "گوالے کا سپنا"، "اُلجھن" وغیرہ) میلارمے کو سمجھنا بہت مشکل ہے۔ وہ عملی طور پر قبلہ کو قبلہ نما تو سمجھتا ہے۔ لیکن اُس کا سمجھ دسرمدا دراک سے پرے ہو کر نہیں رہ جاتا۔

اپنی تمام زندگی میں میلارمے نئے جمالیاتی نظریوں کی تلاش میں رہا اور اس میں اس نے عموماً جو دریافتیں کیں وہ ادب اور آرٹ میں ایک امتیازی درجہ رکھتی ہیں۔ میلارمے کی ذہانت میں انتقادی رجحانات اس قدر زیادہ تھے کہ وہ اُس کے تخلیقی رجحانات کی راہ میں حائل ہوتے رہے اور اُس کی حدبندیوں نے اُسے کبھی کثرت سے تخلیقی کام نہ کرنے دیا۔ جس مطمحِ نظر کو سامنے رکھ کر اُس نے اپنی جستجو جاری کی، اُسے وہ تکمیل تک تو نہ پہنچا سکا لیکن اُس کی چند نظموں میں ایک پتے بہ پتے گو بختی ہوئی خاصیت ہے ایک ہیروں سی چمکتی ہوئی شان، جو اگرچہ پراسرار معلوم ہوتی ہے لیکن پھر بھی معیّن اور باقاعدہ ہے۔
آخری عمر میں آکر اُس کا کلام پہلے سے کہیں زیادہ مبہم ہوگیا

٭ یہ نظم اسی صفحہ میں دیکھئے

ایسے معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے رفتہ رفتہ وہ تمام حدیں طے کرلیں جو الفاظ کے ذریعے سے حسن قائم بالذات کے اظہار میں رکاوٹ بنتی ہیں۔ اور حدوں سے اُس کی یہ بغاوت انجام کار اس قدر بڑھ گئی کہ اُس نے نظم میں رموز و اوقاف کا دینا بھی ترک کر دیا، اور نثر کے لئے ایک نئی بندش کے ساتھ ہی ساتھ اوقاف کا بھی ایک نیا طریقہ ایجاد کیا۔ ظاہر ہے کہ ایک ایسے مشکل شاعر کے مطالعے کے واسطے صبر آزمائی کی ضرورت ہے لیکن وہ صبر آزمائی لاحاصل نہ ہوگی۔

گذشتہ صدی کے آخری پچاس سالوں میں فرانس میں دو شاعر ایسے ہوئے ہیں جن کا کلام بار بار شائع کیا گیا اور جن کی تخلیقات شعری کے تجزیے سے نقادانِ ادب کبھی نہ اکتائے۔ یہ شاعر باڈلیئر اور میلارمے ہیں۔ میلارمے کی نظمیں دو قسم کے انسانوں کو اپنی طرف توجہ دلاتی ہیں۔ ذہین لوگ انہیں پڑھ کر ایک اشتیاق کے ساتھ ان کی گہرائی تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں اور سخن ناشناس انسان یوں ہی بے سوچے سمجھے اِن کی تعریف کرنے لگ جاتے ہیں۔ میلارمے کی نظموں کو سمجھنا اس لئے اور بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ اپنی زندگی میں اپنے کلام کے ابہام کی وضاحت سے ہمیشہ انکار کرتا رہا۔ ہم خواہ کسی زبان میں اس کے کلام کا مطالعہ کریں شاعر کی مشکل پسندی اور شعر کا ابہام ہمارے راستے میں ایک لازمی رکاوٹ بن کر نمودار ہو جائے گا۔ ہم اکثر جگہوں پر لفظوں کو مانوس جانتے ہوئے بھی اُس کے مفہوم کو گرفت میں نہیں لا سکیں گے۔

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا میلارمے کے کلام میں ابہام ارادی ہے؟۔ کیونکہ اگر یہ ابہام ارادی ہو تو پھر اس کی وضاحت کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہتی۔ اصل میں اس ابہام کا کچھ حصہ ارادی ہے اور کچھ غیر ارادی۔ میلارمے کے خیال میں کسی بات کو دھندلکے میں رکھنے سے شعر میں ایک حسن پیدا ہو جاتا ہے اور یہ بات درست ہے۔ صرف تصورات بھی بعض دفعہ ایک اچھے شعر کی تخلیق کا باعث ہو سکتے ہیں مثال کے طور پر اردو کا ایک شعر دیا جا سکتا ہے۔

ٹوٹی ہے کوئی کشتی، یا شور ہے ساحل کا،
یا کوئی بلاتا ہے مجھ کو لبِ دریا سے؟

(علی حسنین زیبا)

یہاں صرف تین تصور پیش کئے گئے ہیں اور اُن سے دل میں ایک دردمندانہ کیفیت پیدا کی گئی ہے۔ واضح طور پر شاعر نے کچھ نہیں کہا۔ ایک شک کی حالت شروع سے آخر تک قائم ہے۔ لیکن یہی شک اور یہی تفہیم کا دھندلکا شعر کی خوبی کو بڑھاتا ہے۔ ہاں ایک بات اور۔ اغلاق اور ابہام میں جو فرق ہے۔ ہمیں اسے نہیں بھولنا چاہئے۔ اغلاق کی مثال بھول بھلیاں اور چیستان کی ہے۔ مثلاً ؎

نقش فریادی ہے کس کی شوخیِ تحریر کا
کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا

اس میں معانی پر غور کیجئے تو شاید کچھ حاصل ہو، اور اُس کے لئے بھی ہندوستان سے ایران تک کا سفر کرنا پڑے گا۔ ورنہ اس بات کا اندیشہ ہے کہ شعر لفظوں کا ایک اُلجھاوا بن کر ہی رہ جائے گا۔ لیکن اگر آگہی دامِ شنیدن بچھانے کی کوشش کرے تو مطلب حاصل ہو سکتا ہے۔ اس کے مقابلے میں،

قمری کفِ خاکستر و بلبل قفسِ رنگ
اے نالہ نشانِ جگرِ سوختہ کیا ہے

اس شعر میں اغلاق کے ساتھ ابہام بھی ہے۔ نیز الفاظ کی آوازیں اور بحر کا وزن ذہن کو ایک ایسی لذت بخشتا ہے کہ اغلاق کی تلخی کم محسوس ہوتی ہے۔ یا اس کی بجائے ایک اور شعر لیجئے۔

نشہ ہا شادابِ رنگ و ساز ہا مستِ طرب
شیشۂ مے سروِ سبزِ جوئبارِ نغمہ ہے۔

اس شعر کی بحر ہی "قمری" والے شعر سے بڑھ کر رواں ہے اور پڑھتے ہوئے احساس میں ایک بہاؤ پیدا کر دیتی ہے۔ اس لئے اگر اغلاق ہو بھی تو وہ اُس بہاؤ میں آسانی سے روک نہیں بن سکتا۔ پہلے مصرعے میں ہمیں ایک دم بصارت اور سماعت کی مدارات کا انتظام نظر آ جاتا ہے اور ہم پورے طور پر آگاہ ہوئے بغیر دھندلکے میں ہی ایک کیفیت کا احساس کرتے ہیں جیسے دوسرے مصرعے میں شیشہ مے، سرو، اور جوئبار ایسی مادی اشیا حقیقت کے قریب لاتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ خواہ مفہوم کی وضاحت تاریکی ہی میں رہے۔ اور اس میں کوئی بری بات نہیں کیوں کہ جب ایک مصور کوئی تصویر بناتا ہے اور اس کے رنگوں کو ہلکے ہلکے دھندلکوں میں ملا دیتا ہے، شکل و صورت اور خد و خال کو نمایاں نہیں کرتا تو ہم اُس پر معترض نہیں ہوتے۔ ایک راگی کوئی نغمہ چھیڑتا ہے اور واضح سروں کے درمیانی وقفوں میں وہ چند ایسے پھیر دے لیتا ہے کہ اصلی راگ کے سُر آلودہ ہو جاتے ہیں۔ ہم اُس پر

بھی اعتراض نہیں کرتے۔ تصویر اور راگ کا دھندلکا ہمیں حسین محسوس ہوتا ہے لیکن اگر ایک شاعر اُسی رستے پر چلتا ہے تو ہم اس کے کلام کو مغلق کہہ کر اس سے پہلوتہی کرتے ہیں یہ ناانصافی ہے۔

تجزیۂ نفس نے ہمیں بتایا ہے کہ علامت و اشارت خیال کی سب سے بڑھ کر بے ساختہ اور آپ رُدپی صُورت ہے۔ دن اور رات کے (نیند اور بیداری کے) خوابوں میں علامت، اشارت اور استعارے کی زبان ایک ایسا بے ساختہ ذریعۂ اظہار ہے جو احساسات پر کسی قسم کے بندھن نہیں ڈالتا۔ اس لحاظ سے گویا اشارتی شاعری اظہار کا ایک ایسا فطری طریقہ ہے جو ہماری ہستی کی گہرائیوں سے اُمڈ کر نمودار ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس نظریے نے نفسیاتی اور طبّی علوم پر ایک انقلابی اثر کیا ہے وہ ادب اور آرٹ پر اثر کئے بغیر کیونکر نہ رہتا؟

ان اشارتی نظریّوں نے قلب و روح کی حیاتِ پوشیدہ کو ادب اور آرٹ کے ذریعے سے ظاہر اور نمایاں کرنے میں ہماری بہت مدد کی ہے۔ اشاروں ہی کے ذریعے ہم ایک گہری پُر اسرار موسیقی کو سطح پر لا سکتے ہیں اور زندگی کی اُس حرکت کو ظاہر کر سکتے ہیں جو لفس غیر شعوری میں آسودہ ہوتی ہے۔ لیکن اس سلسلے میں ایک بات کا دھیان رکھنا پڑتا ہے۔ وہ یہ کہ ایسے اشارتی فن میں چند خطرے بھی لاحق ہو سکتے ہیں۔ وہ اشارتی انداز جس کا منتہائے نظر ہماری اندرونی ہستی کا مکمل اظہار ہو، عین ممکن ہے کہ وہ اپنی اس کوشش میں کسی ایسی چیز کی تخلیق کر دے جو فہم و ادراک کے دائرے میں کلیتہً یا بالکل ہی نہ آسکے۔

میلارمے کے خیال میں تحریک شعری ذہن کی ایک لغزشِ مستانہ کی مانند ہے، ایک لرزتی ہوئی ذہنی کیفیت جس میں ایک انجانی دنیا، دلائل و براہین کی حد سے باہر ایک سرزمین، شاعر کی نگاہوں میں آجاتی ہے۔ میلارمے نے عام الفاظ کو ذریعۂ اظہار تو بنا لیا لیکن وہ قواعد زبان کے اصولوں سے یکسر بے نیاز تھا۔ بلکہ اکثر وہ الفاظ کی بندش اس طرح قائم کرتا کہ اُن کے معانی تک بدل جاتے اور اُن کا اثر سامع پر صرف کسی نغمے کے سروں کی طرح ہوتا اور اُن کی آوازیں اشارے اور کنائے کے ذریعے سے شاعر کے مفہوم کو واضح کرتیں۔ اس اشارتی شاعری کا اثر فرانس کے ادب پر بہت نمایاں ہوا۔ قدیم اصول و قوانین کی پابند شاعری سے جو بے جا قیود و بند اظہارِ احساس و جذبات پر عاید ہو گئی تھی اُسے دُور کرنے میں اس اشارتی شاعری کو بہت دخل ہے۔ میلارمے اور اُس کے حامیوں نے یہ بات عیاں کر دی کہ شاعری کا پہلا اور آخری کام اظہارِ احساس ہے، اور ضروری نہیں کہ اظہارِ احساس کے اصول عقل و خرد کی کٹھن پابندیوں کے تابع ہوں۔

میلارمے کا زمانۂ عمر ۱۸۴۲ء سے ۱۸۹۸ء ہے اور اُس کی اشارتی شاعری نے جس کا پہلا علمبردار پال ورلین تھا ۱۸۸۰ء کے بعد سے خصوصاً زور پکڑا اور ۱۸۹۰ء کے قریب اس انداز کلام کی تخلیق کثرت سے ہوئی۔ یہ اشارتی شاعری کسی ایک مخصوص گروہ کی تحریک نہ تھی۔ کیوں کہ وہ شاعر جو خود کو اشارتی شاعر کہتے رہے باہم بے حد مختلف خیالات اور نظریے رکھتے تھے لیکن اُن سب کا بنیادی خیال ایک ہی تھا۔ اس تحریک کے تین شاعر مرکزی درجہ رکھتے تھے۔ ورلین، رمباؔڈ اور میلارمے۔ اس تحریک کا مدعا وہی ہے جو ہم مختصراً بیان کر چکے یعنی شاعری عقل و دانش کا اظہار نہیں ہے۔ کیونکہ اس کا پہلا اور آخری کام احساس کی ترجمانی اور جذبات کا براہِ راست انکشاف ہے۔ آج تک شعرا سخت قوانین کے پابند ہو کر اپنی فطرت اور ذہانت کی بے ساختگی اور آمد پر دباؤ ڈالتے رہے۔ سچی شاعری وہی ہے جو اشارتی ہو اور اگر ان اشاروں اور کنایوں میں شاعر کسی جگہ مبہم بھی ہو جائے تو ہم اُس کے تجربات اور احساسات کو سمجھنے کے بغیر محسوس کر سکتے ہیں۔

اس اشارتی تحریک کے ماتحت فرانس میں بہت سے شاعر پیدا ہوئے لیکن اُن میں سے بیشتر کو آج کوئی بھی نہیں جانتا۔ کیونکہ اس تحریک نے شاعری کو ایک خاردار راستے کی صورت دے دی۔

ایک مشکل پسند شاعر کی حیثیت سے میلارمے کو جو شہرت حاصل ہوئی اس کی مثال ہمیں اُس کے کلام کے اکثر حصّے میں ملتی ہے۔ اُس کی بہت کم چیزیں پورے طور پر واضح ہیں۔ اُس کی اس مشکل پسندی، تخیّل پرستی اور اشارتی اندازِ اظہار کی وجہ خطابت اور لسانیات سے اُس کی نفرت ہے۔ وہ ان الفاظ میں اپنا نظریہ پیش کرتا ہے "کسی چیز کو واضح طور پر بیان کر دینے سے اُس لطف کا تین چوتھائی حصّہ زائل ہو جاتا ہے جو رفتہ رفتہ کسی بات کے معلوم کرنے میں ہمیں حاصل ہوتا ہے۔ اشاروں ہی سے سوئے ہوئے خواب جاگ اُٹھتے ہیں" —— اصل بات یہ تھی کہ مرئی اور غیر مرئی باتیں میلارمے کے ذہن کو اس قدر اُلجھائے رکھتی تھیں کہ وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکتا تھا حقیقت اور خواب کے

مسئلے نے اس کے ذہن کو اُلجھا رکھا تھا۔ اور وہ اپنے تخیّل کے تاثرِ شعری میں ماضی، حال، مستقبل اور زمان و مکان اور تصور اور حقیقت، سب کو یک جا کر کے ایک دوسرے سے اُلجھا دیتا تھا لیکن ایک بار وہ اپنی خالص تخیّل پرستی سے ہٹ کر گوشت اور پوست کے احساس کی طرف بھی آتا ہے۔

"میرے جذبو! تمہیں معلوم ہے! - کلیاں
گلابی رنگ لے کر، پختگی پا کر،
کھلا کرتی ہیں، اور سرگوشیاں بھنوروں سے کرتی ہیں:
ہمارا خون بھی بہتا ہے لافانی ہجوم آرزو کے واسطے،
اُس نازنیں کے واسطے جو اس کو اپنا لے!" رگوائے کا سپنا،

یہاں ہمیں وہ اپنے منتشر تاثرات کے باوجود ایک مرکز پر آتا ہوا محسوس ہوتا ہے ایک عورت کا خیال اُس کے ذہن میں آتا ہے لیکن عموماً وہ اپنے شعروں میں ایک اچھی بھلی نظر آتی ہوئی چیز کو اپنی خیال انگیزی سے ایک "تصور" میں تبدیل کر دیتا ہے اور اس تصور سے پھر کئی اور ایسے تصورات پیدا ہوتے جاتے ہیں جو اچھی بھلی نظر آتی ہوئی چیز سے پیدا نہ ہو سکتے تھے۔ یہ تخیّل پرستی اُس کی ذہانت کا لازمہ ہے۔ لیکن بہت عرصے تک اپنی تخیّل پرستی کی وجہ سے اُس کا درجہ فرانسیسی شاعری میں تسلیم نہ کیا جا سکا۔ کیونکہ اس کے کلام میں کوئی خصوصیت بھی ایسی نہ تھی جو اُسے عوام کی نظروں میں مقبول بنا سکتی۔ اور اسے خود بھی گمنامی، گوشہ نشینی اور خلوت نشینی پسند تھی۔ بیرونی دنیا سے اُسے گویا کوئی تعلق ہی نہ تھا اور بیرونی دنیا سے اس بے تعلقی نے اُس کے ذہن میں ایک نسائی نزاکت نرمی اور گداز پیدا کر دیا تھا۔ اُسے قبولِ عام کی کمی کا احساس تھا اور وہ خود سے ایک جگہہ یہ سوال بھی کرتا ہے کہ "جس طرح گوائے نے ـــــ کیا تھا منتشر بوسوں سے ہر زلفِ پریشاں کو

کیا اُسی طرح اُس نے اپنے کلام کے ذریعے سے زندگی اور اُس کی حقیقتوں کو شعر سے علیحدہ تو نہیں کر دیا؟" ـــــ لیکن اس نے حقیقت اور تخیّل کو ایک دوسرے سے علیحدہ کیا ہو یا نہ کیا ہو، میلارمے کے جوہرِ خداداد سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اُس کی صرف ایک نظم "رگوائے کا سپنا" ہی اس کا کافی سے زیادہ ثبوت ہے ہاں، اپنے پیروؤں سے ایک بات اُس میں ضرور مختلف ہے۔ اُس کا کلام پڑھ کر ہم جھجک جاتے ہیں، لیکن نا امید نہیں ہوتے۔ ہمیں ایک عنقریب حاصل ہونے والی لذّت کی توقع رہتی ہے اور ہمارا دل گواہی دیتا ہے کہ محض لفظوں کا ایک جال ہی نہیں پھیلا ہوا بلکہ لفظوں سے آگے نکل کر کچھ اور بھی موجود ہے۔ نہیں، موجود نہیں بلکہ لفظوں سے آگے پہنچ کر بھی ہمارے احساسات جاگ سکتے ہیں، البتہ اس "کچھ اور" کا احساس ہونا ہماری اپنی ذات پر منحصر ہے، وہ اجنبیت جو ہمیں میلارمے کی نظموں کو دیکھ کر پہلی نظر میں محسوس ہوتی ہے اُسے مٹانا ہمارا اپنا کام ہے۔

میلارمے کے کلام میں محض اس لئے ابہام نہیں ہے کہ وہ اوروں سے مختلف زبان بولتا ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اُس کے سوچنے کا طریقہ ہی اوروں سے مختلف ہے۔ یوں سمجھئے کہ اس کا ذہن غالب کے ذہن کی طرح جگہہ جگہہ خلاؤں سے پُر ہے اور وہ قارئین کی ذہانت پر بھروسہ کرتے ہوئے یہ جان کر اپنے ذہنی محذوفات کو نہایت شد و مد سے جُوں کا توں اپنے کلام میں ظاہر کرتا جاتا ہے کہ پڑھنے والے خود بخود اُن باتوں کو سمجھ لیں گے جو اُس کے ذہن میں اوروں کے ذہن سے مختلف حیثیت میں موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میلارمے اپنے کلام کے محذوفات کو سلسلہ ملانے والے ٹکڑوں سے پُر نہیں کرتا۔ میلارمے کا مقصد قبولِ عام نہ تھا اور اُس ایسے شاعر کے لئے قبولِ عام کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ اس لئے اُسے اور شعراء کی طرح وضاحت کی خاطر مشقت کی ضرورت نہیں۔ جو لوگ اُس کے کلام کو نہیں پڑھنا چاہتے یا نہیں پڑھ سکتے وہ اپنے کلام کو نہ تو اُن کی توجہ میں لاتا ہے اور نہ اُن کے لئے اپنے اندازِ تفکر میں کسی طرح کی رعایات برتتا ہے اُسے ایک بات کہنی ہے۔ وہ اپنی بات کہہ دیتا ہے اور یہ سننے کے لئے بھی نہیں ٹھہرتا کہ لوگوں نے اُسے سُنا یا سمجھا بھی ہے کہ نہیں۔ غالب کی طرح "گو نہ مشکل" کی اُلجھن میں نہیں پھنستا جو کہنا ہو کہہ گذرتا ہے۔

روح ادب و شعر کو الفاظ کے استعمال محض کی پژمردگی اور حبس بے جا سے بچانے میں میلارمے تمام عمر محو رنگ و دو رہا۔ اُس نے خود یہ جان لیا تھا کہ الفاظ احساسات ذہنی کے اظہار کا ایک بہت ہی معمولی سا ذریعہ ہیں۔ اور اس کے خیال میں اسی لئے یہ بات بہت ضروری تھی کہ کسی احساس کو ظاہر کرنے کے لئے الفاظ کا انتخاب اور اُن کی نشست نہایت ہی احتیاط سے ترتیب دینی چاہئے تاکہ قاری کے ذہن میں بجنسہٖ صحیح تار پر مضراب کا عمل ہو اور وہ شاعر کے احساس کو پورے طور پر اپنی تفہیم کی گرفت میں لا سکے۔ الفاظ محض

اشارے ہیں اس لئے وہ بنفسہٖ کسی طرح کی بیانی قوت نہیں رکھتے۔
پس محض الفاظ کے استعمال کے لئے ان کا استعمال صحیح نہیں۔

کہا جاتا ہے کہ میلارمے اپنے خیال میں پہلا خالص شاعر تھا۔
اگر ہم یہ کہیں کہ میلارمے پہلا شاعر تھا جس نے ارادہ وشعور کے ساتھ
شاعری میں "اچھوتے پن" کو اپنا مطمحِ نظر بنایا تو زیادہ صحیح ہوگا۔ ادب اور آرٹ
کی تمام تخلیقات تھوڑی بہت حد تک آلودہ ہوتی ہیں یعنی ان کی حیثیت
قائم بالذات کی نہیں ہوتی۔ اُن میں اُن احساسات وجذبات کی ایک گونج
ہوتی ہے جو ہماری حقیقی زندگی سے تحریک پاتے ہیں۔ مثلاً رحم، ڈر، آرزو،
تجسس ان سب باتوں کو مادی اشیا ہی تحریک دیتی ہیں۔ اس لئے
ان اشیا سے ہمارا تاثر چند احساساتی کیفیات پر مبنی ہوتا ہے جن کا تعلق
زندگی سے ہو اور ان میں ایک علٰحدہ قسم کے جمالیاتی ادراک کی آمیزش
بھی ہوتی ہے۔ لیکن ایک فن کار کو اپنے مقصد "تخلیق حسن" کا جس قدر
زیادہ احساس ہوتا جاتا ہے۔ وہ اس آلودگی سے دور ہو کر "اچھوتے پن"
کی طرف راغب ہوتا جاتا ہے۔ اور علٰحدہ قسم کے جمالیاتی ادراک پر ہی
اپنی تخلیق کی بنیاد رکھتا ہے اور ایسی تخلیق ہی کو خالص ادب، شعر
یا آرٹ کا رتبہ دیا جا سکتا ہے۔

خالص شعر کے جمالیاتی نظریے کا مطالعہ کرنے کے لئے میلارمے
کا کلام بہت مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اُس کے کلام میں ہم نسبتاً
آسانی سے اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ خالص شاعری کیا ہے۔ اس
مطالعے میں ہمیں بنیادی اور لازمی خصائص شعری کی تلاش ہونی چاہیئے
یعنی وہ خصائص جن کے بغیر ہم ایک نظم کو نظم نہیں کہہ سکتے۔

ہر لفظ ایک تصور یا خیال کا حامل ہے۔ اور اس تصور یا خیال
کے ساتھ ساتھ ہی اس کے لوازم بھی ایک ہالے کی مانند موجود ہوتے
ہیں۔ لوازم کا یہ ہالہ انفرادی اندازِ نظر کا پابند ہے۔ یعنی ایک ہی لفظ میں زید
کے لئے اور تلازمِ خیال ہے اور بکر کے لئے اور۔ لیکن ایک ہی زبان سے
بہت سے افراد کا مانوس ہونا مختلف افراد کے لئے الفاظ میں قریباً قریباً یکساں
تلازمِ خیال پیدا کر دیتا ہے۔ جب کوئی لفظ ہمارے فہم وادراک کے
دائرے میں آتا ہے تو یہ تلازمِ خیال کا ہالہ ذہن میں ایک خاص ہیئت
اختیار کرتا ہے اور جب اس پہلے لفظ کے ساتھ کوئی دوسرا لفظ ملایا
جائے تو وہ ہالہ اپنی ہیئت کو دوسرے لفظ کی مناسبت سے تبدیل
کر لیتا ہے۔ مثلاً پھول کا لفظ ایک معین تصور لاتا ہے۔ پھول کے
معنی کے آس پاس ایک ہالہ بن جاتا ہے۔ لیکن جب ہم دوبارہ کہتے
ہیں کہ گلاب کا پھول تو یہ ہالہ بدل جاتا ہے۔ اور ایک نیا ہالہ بن جاتا
ہے۔ اسی طرح جب ہم سرخ گلاب کا پھول کہتے ہیں تو دوسرا ہالہ بھی
بدل کر ایک نئی ہیئت اختیار کر لیتا ہے۔ کیونکہ ہر لفظ اپنے ساتھ
مختلف تلازمِ خیال کو لے کر آتا ہے اور معانی کے رنگوں میں نئی آمیزش
ہو جاتی ہے۔

شاعری کا منتہا یہ ہے کہ الفاظ کو اس طور پر استعمال کیا جائے
کہ اُن میں زیادہ سے زیادہ انگیخت کی اہلیت پیدا ہو جائے۔ شاعر ہر لفظ
کو اس طریقے پر ترتیب دیتا ہے کہ ہر لفظ مکمل، گہرا اور نمایاں تلازم خیال
پیدا کر سکے۔ اور ہر آنے والے لفظ کے تلازم کا ہالہ جو تبدیلی لائے اُس میں
ایک ایسی موزونیت اور روانی ہو کہ ہمارے ذہن کو چلتے ہوئے ساتھ
ہی ساتھ اُن تبدیلیوں کی اہمیت کا احساس ہوتا جائے۔

یہ بات عموماً دیکھی گئی ہے کہ ہمارے غور وتفکر کو رواں رکھنے
کے لئے تعجب کی ایک مقررہ خاصیت کی ضرورت ہے لیکن اس
تعجب کو مستقل طور پر پورے تلازمِ خیال کی الجھنوں کے ساتھ گھلا
ملا کر ہم آہنگ بناتے جانا چاہیئے۔ ایک لفظ سے مفہوم کی کسی اچانک
تبدیلی کا امکان ہے۔ لیکن وہ اچانک تبدیلی اس طریقے سے پیدا
کرنی چاہیئے۔ کہ اس کا تعلق ہمیشہ تبدیلیوں کے ساتھ قائم رہے۔
یعنی خیال کی زنجیر میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو جائے بلکہ کڑی سے کڑی
ملتی ہی چلی جائے۔ ہم مثال کے طور پر اختر شیرانی کا ایک مصرعہ
لیتے ہیں۔

یہی وادی ہے اے ہمدم جہاں ریحانہ رہتی تھی

ظاہر ہے کہ کل مصرعہ کسی کی زبان سے کہا ہوا کلمہ ہے۔ گویا
ایک شخص کہہ رہا ہے کہ "یہی وادی ہے"۔ ——— اتنا سن کر ہمیں ایک
تعجب یا تجسس کا احساس ہوتا ہے اور ہمارا ذہن سوچتا ہے کہ یہ وادی
تو ہے لیکن یہاں کیا ہوا۔ اس میں کونسی خصوصیت ہے۔ آگے "ہمدم" کا
لفظ آتا ہے اور ہمارے ذہن میں ایک تصویر مکمل ہو جاتی ہے۔ تصویر
یہ ہے:۔ دو انسان (مرد) ایک وادی میں کھڑے ہیں اور ایک کہتا
ہے کہ "یہی وادی ہے اے ہمدم"۔ اب ہمارا تجسس بڑھتا ہے
کہ یہ شخص اپنے ساتھی کو کونسی بات بتانے کو ہے۔ اسی وادی میں
پہنچ کر اُس کے ذہن میں کونسی یادیں تازہ ہو گئی ہیں۔ اگلا ٹکڑا "جہاں

کرتا ہے" جہاں ریحانہ رہتی تھی" اور بات پوری ہو جاتی ہے اور ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کی محبوبہ اسی وادی میں رہا کرتی تھی۔ وہ اب یہاں نہیں رہتی۔ شاعر آج کسی طرح اپنے رفیق کے ساتھ آن پہنچا ہے اور اُسے بتا رہا کہ اسی وادی میں ریحانہ رہا کرتی تھی۔ ظاہر ہے کہ اُس کا ساتھی جانتا ہے کہ ریحانہ کون تھی۔ ہم بھی جانتے ہیں کہ وہ کون تھی اور اس لئے مصرعے کے اختتام پر دو مردوں اور اس وادی کی جس میں کبھی ریحانہ رہتی تھی، جو ایک تصویر پیدا ہوئی تھی، اُس میں حزن وملال کی آمیزش ہو جاتی ہے۔

اگر اسی مصرعے کو ہم بدل کر یوں لکھیں،

"جہاں ریحانہ رہتی تھی یہی وادی ہے وہ ہمدم"

تو وادی کی اہمیت جاتی رہتی ہے اور حزن وملال کی کیفیت پیدا نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس صورت میں ہمیں وادی کی اہمیت بڑھانے والی ریحانہ کے متعلق باقاعدہ اطلاع مل جاتی ہے کہ یہاں وہ رہتی تھی اور دوسرا ٹکڑا ایک طرح سے فالتو اور پھیکا معلوم ہوتا ہے۔ لیکن پہلی صورت میں ہمارے تجسس کی رگ کو اکسانے کے بعد ہمیں بتایا جاتا ہے کہ اس وادی میں کیا خصوصیت ہے۔

اس مثال سے ظاہر ہوا کہ کس طرح الفاظ رفتہ رفتہ نئے سے نیا تصور لا سکتے ہیں اور اُن کی نشست کا مقام کس قدر معیّن ہونا چاہئے ساتھ ہی سمجھنا چاہئے کہ لفظی تصورات کی پوری اہمیت کو اُن کے اضافی رتبے کے ذریعے نمایاں کرنے کا یہ طریقہ ذہانت وتفکر اور بذلہ سنجی سے تعلق رکھتا ہے۔

بذلہ سنجی اور نغزگوئی کے فرق کو یوں سمجھنا چاہئے کہ شعر سے جب ذہن کے تاروں کو حرکت ہوتی ہے تو دیر تک ایک گونج سی قائم و جاری رہتی ہے۔ مگر بذلہ سنجی اور محض ذہانت و تفکر کا انجام یکبارگی ہوتا ہے۔ لیکن جب نظم کو شاعرانہ مقاصد کے لئے استعمال کیا جائے تو آواز کے حسن کی ہم آہنگی نہ صرف مناسب ہوتی ہے بلکہ ایک گہری، دھندلی، احساساتی کیفیت کے پیدا ہو جانے سے اثر کو زیادہ بھی کر دیتی ہے۔

یہیں سے ہم آئینِ شعر کا ایک اہم گُر معلوم کرتے ہیں۔ الفاظ کی آوازوں کا نغماتی حسن یہیں شعر کا لازمہ اور ایک بنیادی خصوصیت دکھائی دیتا ہے۔ اس طرح تین صورتیں ہمارے پیش نظر ہو جاتی ہیں:۔

۱۔ الفاظ کے تصورات شعر کی بنیادی خصوصیت ہیں۔ اور ترنم ایک ثانوی چیز ہے۔

۲۔ ترنم بنیادی خصوصیت ہے اور الفاظ کے تصور صرف اُس بہاؤ کے لئے ایک راستہ بناتے ہیں جو آواز سے پیدا ہوتا ہے۔

۳۔ دونوں باتیں مل کر شعر کی بنیادی خصوصیت ہیں۔

دوسری صورت ہمیں صاف طور پر ناقابل قبول نظر آتی ہے خالص نغمہ ایک ایسی یکسانی و یک رنگی رکھتا ہے جو ذرا سی دیر میں ہی ہمیں بیزار کر دیتی ہے۔ تیسری صورت کو ہم آسانی سے نہیں رد کر سکتے۔ لیکن دو مختلف خصوصیتوں کو ایک بھی نہیں تسلیم کیا جا سکتا۔ اس بات کو ہم مثال سے سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

"نینن نیند نہ چین جیا میں"

اس مصرعے کے تمام الفاظ جدا جدا اور مل کر نغماتی خصوصیت کے مالک ہیں۔ لیکن صرف ان کا ترنم ہی ہمارے لئے لطف انگیز نہیں ہے بلکہ ہمارے ذہن میں اُس شخص کا قابلِ رحم تصور آتا ہے جس کی آنکھوں میں نیند نہیں اور جس کے دل کو چین نہیں۔ ایک اور مثال

۵ پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

اس شعر میں نغمہ ہے۔ "پھر اس" کا اختصار اور تیزی "انداز" کی لمبان اور تسلسل، "بہار آئی" کے ٹوٹتے اور گرتے ہوئے لفظی ٹکڑے ——— اور ایسی ہی دوسری باتیں موسیقی بدامن ہیں لیکن صرف نغمہ اکیلا اثر انداز نہیں ہوتا۔ بلکہ بہار کی آمد کے تصور ہماری توجہ کو جذب کرتے ہیں۔ ایک اور مثال

"آسماں پر ہے گھٹاؤں کا ہجوم
بادلوں کا راج ہے ....."

اس میں بھی تصورات ہی رس اور کیف کا باعث ہیں اگر ہم یوں کہیں کہ

"فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلات
فاعلاتن، فاعلن ......"

تو وزن اور موسیقی وہی ہو گی۔ لیکن یکسانی سے جو بیزاری پیدا ہوتی ہے وہ ظاہر ہے۔

اگر یہ طرزِ استدلال صحیح ہے تو آواز کا حسن شاعری کا لازمہ نہ ہوا۔ بلکہ ایک خوشگوار لاحقہ ہوا۔ آواز کے حسن کو آپ جمالیاتی اور راگ کا معاون

کہہ سکتے ہیں۔ بنیادی خصوصیت نہیں شمار کرسکتے۔ لیکن یوں اگرچہ شعری
تاثر کے لئے الفاظ اور محاورات کے معانی لازمی معلوم ہوتے ہیں پھر
بھی اُن معانی کی نوعیت، حقیقت سے اُن کی مطابقت، زندگی کے لئے
اُن کی قدر و منزلت، اُن کی اہمیت اور اُن کی دلچسپی اور دلکشی
زیرِ غور نہیں ہوتی۔ شعری تاثر میں وہ مفہوم و معانی شامل نہیں ہیں جنہیں
وضاحت کے ساتھ نثر میں بھی اُسی قدر بلکہ اس سے زیادہ خوبی کے
ساتھ بیان کیا جاسکتا ہو۔

اگر ہم الفاظ کے تصوراتی تاثر کو شعر کی لازمی خصوصیت سمجھ لیں تو
میلارمے کا کلام اس لحاظ سے ایک اہمیت حاصل کرلیتا ہے۔ وہ
پہلا شاعر تھا جس نے اوروں سے کہیں بڑھ کر ارادی اور شعوری طور
پر الفاظ کے تصوّراتی تاثر کا لحاظ رکھا۔ ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ اس
طرح ارادی اور شعوری طور پر اس ایک بات کو اپنی تمام توجہات کا مرکز
بنا لینے سے فن کار کو نقصانات کا احتمال بھی ہوسکتا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ بھی
کہا جائے کہ فن کی بلند ترین صورتیں خالص ترین نہیں ہوتیں یا نہیں
ہیں اور ادب اور آرٹ کی گہری تخلیقات اُسی صورت میں ظاہر ہوئی
ہیں کہ اُن میں موضوعی مواد کی گہرائی بھی موجود تھی۔ لیکن یہ باتیں فن کارانہ
تخلیق کی نفسیات کی ذیل میں آتی ہیں۔ ہمیں یہاں صرف جمالیاتی تصوّر
ہی سے غرض ہے۔ نیز میلارمے کا کام لفظی تصورات اور تخیلات کے
باہمی شاعرانہ تعلقات پر غور کرنا ہے۔

دھندلا اجالا ادب اور آرٹ کا ایک جزو ہے۔ ان کے تمام
نفسیاتی کلماتِ اظہار ـــ پیش خیالی، کنایہ، صدائے بازگشت،
اشارہ، تھوڑی بہت اُلجھی ہوئی یادیں، ایسی لرزشیں جو بنیادی سُروں
سے تھوڑی بہت دور ہوجائیں ـــ شعر کے شفقی دھندلکے ہیں ان
سب کی جگہیں ہیں۔ اس دھندلکے میں واضح علم ایک ذیلی حیثیت ہی رکھتا
ہے۔ اگر ایک واقعے کو بیان کرنا مطلوب ہو تو اس کے لئے ضروری
ہے کہ اُسے نہایت واضح اور صاف طور پر بیان کیا جائے۔ عادات
و اطوار کے کسی قانون یا منطق کے کسی پیچ کو بھی وضاحت اور صفائی کے
ساتھ ہی بیان کیا جانا چاہئے۔ لیکن فرض کیجئے کہ فن کار ذہن کی کسی
کیفیت کا اظہار چاہتا ہے۔ ذہنی کیفیت کے چند اجزا ہمیشہ مبہم ہی
رہیں گے۔ اور اس لئے کسی ذہنی کیفیت کے اظہار میں یہ ابہام نہ صرف
ایک قدرتی بات ہے بلکہ حقیقت پرستی کا تقاضا ہے کہ اُسے جوں کا
توں بیان کیا جائے۔ جہاں آپ نے کسی ہلکے سے اشارے یا گونج
کو واضح کرنے کی کوشش کی وہ ہلکا اشارہ یا گونج نہ رہے گی۔ اور
جمالیاتی لحاظ سے بھی یہ ابہام ضروری ہے۔ ادب، موسیقی، مصوری
ان سب ذرائع میں یہ کنائتی انداز ایک لازمی خصوصیت ہے۔ فن کار
جس بات کو وضاحت کے ساتھ نہیں بلکہ اشارے کنائے سے
بیان کرتا ہے۔ وہی بات اس کی تخلیق میں ایک عُمق پیدا کرتی ہے۔
یہی وجہ ہے کہ میلارمے اپنے کلام میں ابہام سے کام لیتا ہے۔

میلارمے کی نظموں کے مطالعے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اُن کو
نظموں کی بجائے چیستان سمجھا جائے اور ہمارے لئے یہ بات کچھ عجب
نہ ہوگی، کیونکہ ہم نہ صرف غالب کے اشعار کو معمّوں کی حیثیت سے دیکھنے
کے عادی ہوچکے ہیں بلکہ بجنوری کی وجہ سے ان کی شرح کو بھی پہیلی کی
بھول بھلیاں سے کم درجہ نہیں دیتے۔ لیکن چونکہ میلارمے کا اندازِ
تفکّر ہی نرالا تھا۔ اس لئے اُس کے ابہام میں ایک اضافی گہرائی ہے۔
اور یہ عمق اس قدر مستقل ہے کہ جب تک ہم شاعر کے اندازِ تفکّر سے
مانوس نہ ہولیں ہم پر اُس کے اشعار کا حُسن منکشف نہ ہوسکے گا۔

ہر انسان اپنے انفرادی جنون اور خبط سے ممتاز ہے۔ ہماری
توجہ ہمارے تمام تجربات پر حاوی نہیں ہوتی بلکہ چند منتخب نقطوں
پر مرکوز ہوجاتی ہے اور یہ نقطے ہمارے لئے ایک دلچسپی کا باعث ہوتے
ہیں اور اس محدود دلچسپی کی وجہ سے ہم ان کے علاوہ دوسرے نقطوں
سے درگذر کر جاتے ہیں۔ لیکن نقطوں کا یہ انتخاب کس اصول کے
ماتحت ہوتا ہے۔ اس کے متعلق تو ماہرین نفسیات ہی کچھ جانتے
ہوں گے۔ ہمیں یہاں صرف اس حقیقت کا اظہار مقصود ہے اور
یہ کہنا ہے کہ اس مرکوز دلچسپی کی وجہ سے ہمیں جو کچھ نظر آتا ہے واضح
اور صاف طور پر نظر آتا ہے۔ لیکن یہی مرکوز دلچسپی ہمیں چُندھیا بھی
دیتی ہے۔ نگاہ کا یہ انجماد بصارت میں فرق لے آتا ہے اور ہمارے
اُن باتوں کے دیکھنے میں رُکاوٹ بن جاتا ہے جو ہمارے دائرۂ نظر
کے ہر طرف سایوں والے دھندلکے میں موجود ہوتی ہیں۔ زید بکر کی بات
صرف اس لئے نہیں سمجھ سکتا کہ اُن کی مرکوز دلچسپی ایک سی نہیں ہوتی۔

میلارمے کی ابتدائی نظموں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اُس کا ادبی
دائرۂ نظر بہت محدود ہے۔ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے لیکن خود اسے معلوم
نہیں کہ وہ کون سی بات ہے۔ اس وقت اُس کی مرکوز دلچسپی کاغذ کی

سفیدی میں ہے۔ جس پر وہ اظہار کی آرزو کے باوجود کچھ ظاہر نہیں کر پاتا۔ لیکن اس سفیدی کا باعث اُس کی اپنی حد بندی ہے۔ کیونکہ وہ صرف ایسی بات کہنا چاہتا ہے جس کی کچھ اہمیت ہو، اور ایسی بات اُس وقت عالمِ ہست میں نہیں۔ تیس سال کی عمر تک میلارمے اپنے گرد و پیش کی زندگی سے خاطر خواہ واقف ہو چکا تھا۔ وہ پیرس لندن اور فرانس کی دیہاتی زندگی کو جان چکا تھا۔ لیکن اس گہما گہمی میں اُسے اپنی ذہانت کو تحریک دینے والا کوئی موضوع حاصل نہ ہوا۔ وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے چاروں طرف حقیقت کو دیکھتا تھا، اور حقیقت ہی کو محسوس کرتا تھا۔ لیکن وہ اسے کاغذ کی سفیدی پر نہیں لانا چاہتا تھا۔ وہ حقیقت کے علاوہ "کسی" اور "شے" کا جویا تھا۔ میلارمے کے کلام کی شرح کی بنیاد انہی دو لفظوں پر ہے" اور "شے"۔

لیکن پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ یہ" اور "شے" "عالمِ ہست" میں نہ تھی۔ اس سے شاعر کو اذیت ہوتی ہے۔ وہ اس اُلجھن سے رہائی چاہتا ہے۔ وہ بے خواب نیند کی طرف رجوع ہونے کی کوشش کرتا ہے۔

"آج اُس نیند کا مشتاق و طلبگار رہوں میں
آہ! آلودہ نہیں ہے، جو ہے خوابوں سے بری!"——"اُلجھن"

وہ سفر کی طرف راغب ہوتا ہے۔

"مرے دل! آ سُنیں ملاح کے سفری ترانے کو"——
"سمندر کی ہوا"

اور جب شاعر کے ذہن میں یہ کشمکش جاری تھی تو اُسے "خالص شاعری" کی جستجو تھی۔ لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ "خالص شاعری" کیا چیز ہے۔

میلارمے کے ذہن میں یہ تمام اُلجھن اس وجہ سے تھی کہ وہ ایک ایسا فنکار تھا جو ایک جیتا جاگتا انسان ہونے کے ساتھ ہی ساتھ داخلی اور خارجی کیفیات میں ایک سمجھوتہ پیدا کر دینا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ خواب اور حقیقت اس قدر گھل مل جائیں کہ ان میں کوئی فرق نہ رہے اور یوں "خالص شاعری" کی تخلیق کرنا چاہتا تھا۔ لیکن سیدھے سادے لفظوں میں وہ نہیں جانتا تھا کہ "خالص شاعری" کسے کہا جا سکتا ہے۔ اس لئے اُسے اُلجھن تھی، اور ساتھ ہی ایک جستجو۔

خالصتہً ادب اور آرٹ کی کوئی تعریف نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ خالص ادب اور آرٹ، (یہاں شاعری سے مطلب ہے)

خالص شاعری بلکہ شاعری کوئی چیز نہیں۔ صرف ایسے انسان ہوتے ہیں جو شاعر ہوں اور اُن کی انفرادی حیثیت یا خصوصیات ہی کو ہم شاعری کہتے ہیں۔ میر تقی کے لئے محبت کا رونا دھونا شاعری تھا۔ غالب کے لئے ذہانت کی بھول بھلیاں، ذوق کے لئے لسانی ترقی اور داغ کے لئے معاملہ بندی۔ گویا اس طرح شاعری یا "خالص شاعری" انفرادی لہجے اور مرکزِ دلچسپی ہی کا دوسرا نام ہے اور جس قدر فنکار کی توجہ موضوع یا مواد کی بجائے شعریت پر مرکوز ہوتی جائے گی، اُس کا کلام "خالص شاعری" بنتا جائے گا۔ کیونکہ یوں خارجی اجزا تحلیل ہو کر محض داخلی تاثر باقی رہ جائے گا۔ ناول نویس دنیا کے ماحول کی اصل کو نقل کر دکھاتا ہے۔ شاعر جب مختلف موضوعات پر خامہ فرسائی کرتا ہے تو یہ تخلیقات خالص نہیں کہی جا سکتیں کیونکہ اُسے اپنے ماحول، اور موضوعات سے شعریت کی بہ نسبت زیادہ دلچسپی ہوتی ہے۔

اگرچہ حقیقت ہی سے "کسی" اور "شے" کی تخلیق ہوتی ہے۔ لیکن خالص شاعری پر حقیقت کا غلبہ کسی صورت بھی نہ ہونا چاہئے۔ اُسے حقیقت سے کوئی تعلق ہی نہ ہونا چاہئے۔ میلارمے کو حقیقت پر غور و تفکر سے اُلجھن ہوتی ہے اور یہی اُلجھن رفتہ رفتہ ایک "تخیل" کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ یہیں سے اُسے ایک طریقۂ کار معلوم ہو جاتا ہے کہ حقیقت کو اگر خواب کی صورت میں بدل دیا تو "خالص شاعری" حاصل ہو جائے گی۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حقیقت سے رہائی حاصل کرنے کے لئے ہی میلارمے گوالے کے خواب اور اُس کی بنسی کی طرف رجوع ہوتا ہے۔ بنسی کے متعلق وہ جانتا ہے کہ وہی اُس کی مکتی کا باعث ہو سکتی ہے۔

"...... چل آ اے کینہ ور بنسی!
ذریعہ ہے جو پروازوں کا، تو پھر سے شگفتہ ہو،
کنارِ آب پر جا کر......"

گوالا سپنا دیکھتا ہے اور بیداری پر حقیقت کو اپنے چاروں طرف پاتا ہے۔ اس کی تلخی سے دور ہو جانے کے لئے وہ پھر بنسی کی طرف لوٹتا ہے جسے وہ پرواز کا ذریعہ سمجھتا ہے۔ میلارمے کی کیفیت بھی اُسی گوالے کی سی ہے۔ حقیقت سے تنگ آ کر وہ خواب کی طرف جاتا ہے۔ لیکن اُس کے خوابوں کی ابتدا حقیقت ہی سے ہوتی ہے۔ وہ حقیقت سے رفتہ رفتہ یوں گریز کرتا ہے کہ سچائی ہی خواب بن کر "خالص شاعری" کی

تخلیق کا باعث ہو جاتی ہے لیکن اس کا اُلٹ بھی صحیح ہے۔ وہ ایک خواب یا خیال سے بھی اسی طرح گریز کرکے اُسے حقیقت کا جامہ پہنا دیتا ہے۔ اس قلب ماہیت کے عمل میں بہت سی باتیں، کنائے اور محاورے ہمیں اجنبی محسوس ہوتے ہیں۔ لیکن ان سب کا ماخذ ایک ہی خیال ہے اور اُسی کو وہ ظاہر کرتے ہیں۔ شاعر کے لئے وہ سب ایک سیدھی سادی اور قدرتی بات ہیں اور اگر ہم شاعر کی ذہنی کیفیت کو چند لمحوں کے لئے اپنے میں پیدا کرلیں تو ہمارے لئے بھی وہ ایک سیدھی سادی اور قدرتی بات ہی بن جائیں۔

اب میں میلارمے کی ایک نظم کا ترجمہ درج کرتا ہوں اور اس کے ساتھ ہی وہ شرح بھی لکھے دیتا ہوں جو چارلس موروں نے کی ہے۔ لیکن پہلے وہ لطیفہ سُن لیجئے جس کا اس نظم سے تعلق ہے:۔

ایک دفعہ میلارمے ایک جوان عورت کے ساتھ سیر کرتا ہوا غیر متوقع طور پر ایک دیہاتی میلے میں جا پہنچا۔ پیرس کے نواحی دیہات صنعتی اور مزدور پیشہ غریب غربا کا مسکن ہیں۔ میلے کی ہماہمی اور رونق میں ایک سٹال اُنہیں ایسا دکھائی دیا جو خالی پڑا تھا اور جہاں کسی طرح کی کاروائی نہ ہو رہی تھی۔ اس سٹال کا مالک ایک بوڑھا آدمی تھا اور اُس نے ایک پردہ لٹکا رکھا تھا کیونکہ لوگوں کی توجہ کے لئے وہاں کوئی بھی چیز موجود نہ تھی۔ اس خالی سٹال کو دیکھ کر شاعر کے ساتھ والی عورت کے ذہن میں ایک عجیب خیال پیدا ہوا۔ اُس نے ڈھول پیٹنے کو کہا اور شاعر کے بُلانے پر لوگ جمع ہونے شروع ہوئے اور ٹکٹ لے کر اندر داخل ہونے لگے لیکن اندر پہنچ کر جو تماشا حاضرین کے پیش نظر کیا گیا وہ صرف شاعر کی ساتھن تھی۔ جو فیشن ایبل لباس پہنے ہوئے، اپنے سر پر پھولوں سے سجا ہوا ہیٹ رکھے ایک میز پر کھڑی تھی۔ لوگ اس تماشے پر متعجب تھے اور خاموش اور شاعر نے محسوس کیا کہ کچھ نہ کچھ کہنا چاہئے، اس سے غرض نہیں کہ کیا کہا جائے، کچھ نہ کچھ کہا جائے، کوئی بات، چنانچہ اُس نے ہجوم کو مخاطب کرکے یہ نظم کہی:

(یہ ترجمہ نثر میں ہے تاکہ فرانسیسی اصل اور انگریزی ترجمے سے پوری مطابقت رہے)

وہ گیسوؤں کا انبار ایک شعلے کی لپک کی طرح
آرزوؤں کے پچھم کی آخری حد پر پہنچ کر، وہاں کھل کر
پھر بیٹھ جاتا ہے (اسے ایک سلطنت کا زوال کہئے)
اُس تاج کی ایسی اونچی بھوں کی طرف بیٹھ جاتا ہے۔
جو اس کا قدیم آتشدان تھی۔
لیکن افسوس! سنہرا پن چھن جانے پر بھی
اس زندہ بادل کو جو ایسی آگ کی مانند ہے جو ہمیشہ اندر رہتی ہے۔
اور اصل میں جو ایک اکیلی اگنی ہے،
آنکھ کے سنجیدہ یا طنز کرتے ہوئے ہیرے میں
جاری رہنا چاہئے تھا۔

ایک نازک ہیرو کی عریانی اس بات کو عیاں کرتی ہے۔
جسے نہ حرکت کرتا ہوا ستارہ، اور نہ انگلی پر کی آگ
اپنی صورت سے تکمیل تک پہنچا سکتی ہے۔
بلکہ جسے وہ عورت تکمیل تک پہنچاتی ہے۔
جس میں شان کی سادگی ہے،

سرخ پتھروں کے ساتھ
اس شک کی بنیاد کا کارِ عظیم بھڑکاتے ہوئے۔
جیسے اُس نے یوں چھوا تھا۔
جیسے کوئی شاداں اور رہنما مشعل"۔

اس نظم کو سن کر حیرت سے انگشت بدنداں ہجوم کسی طرح کا فساد کئے بغیر چل دیتا ہے۔ کوئی شخص اس نظم کے ابہام پر نہیں جھلاتا۔ لیکن ہم اُس گروہ میں نہ تھے۔ ہمیں اس کے مطالعے سے اُلجھن ہوتی ہے۔ آئیے اسے مٹانے کی کوشش کریں۔

میلارمے اس واقعے میں حسن اور ہجوم (عوام الناس) کا سنجوگ پاتا ہے۔ اس نظم میں حسن کو استعارے کے طور پر ایک دیوی کی بجائے ایک جیتی جاگتی عورت کے روپ میں پیش کیا گیا ہے۔ ایک ایسی عورت کے روپ میں جو شبانہ فرحت کی رونق ہوتی ہے لیکن شبانہ فرحت کی رونق افروز عورتوں کے بارے میں مردوں کا اندازِ نظر خالص جمالیاتی نہیں ہوتا! میلارمے کو اس کا علم ہے اور شاعر بھی آخر انسان ہے اس لئے بنیادی اور غیر شعوری طور پر اُس کے احساس بھی اس ہم جلیس کی طرف خالص جمالیاتی نہیں ہیں۔ عورت کے بارے میں بنیادی اندازِ نظر آرزو اور خواہش کا ہے۔ لیکن شاعر سوچتا ہے کہ اس خواہش کی کیفیت سے تفکر کی کیفیت تک کیونکر پہنچا جائے یعنی کس طرح نفسی آسودگی کو اُبھار کر حسن محض میں تبدیل کر دیا جائے۔ بالکل اُسی طرح جیسے گوالا گوپیوں کو نہاتے ہوئے دیکھ لیتا ہے تو اُس کی بنسی

"ہوا کرتی ہے محوِ خواب لمبی "تان کی لے میں
اور اک بے لطف، پُرآو از یکساں خط بناتی ہے"۔

لیکن گو الا ایک ایسی خیالی دنیا میں تھا جہاں تال کے کنارے عریانی دکھائی دیا کرتی تھی، اور وہ اُس عریاں منظر کو نغمے کی صورت دیتا تھا۔ شاعر ایک مہذب اور حقیقت پرست دنیا میں ہے اُسے کم درجہ عریانی پر ہی قانع ہونا پڑے گا۔ اِس ملبوس نسائیت سے لبریز دنیا میں میلارمے کی توجہ گیسوؤں کی عریانی پر مرکوز تھی۔ چنانچہ وہ اپنی اکثر نظموں میں گیسوؤں کا ذکر کرتا ہے۔ "اُلجھن" میں وہ کہتا ہے

"اور نہ آیا ہوں کہ پیدا کروں طوفانِ حزیں
اپنے بوسوں کی گرانباری و بیزاری سے
گیسوؤں میں کہ پریشان ہیں مستانہ وار!"

لیکن گو اے کے "سپنے" میں چونکہ عریانی مکمل طور پر حاصل ہو جاتی ہے اس لئے

"... اور اُن کے گیسوؤں کا غسل تاباں بھی،
نظر سے دور ہو جاتا ہے لرزش اور تابش میں!"

گویا مہذب دنیا میں عریانی کا نمائندہ (شاعر کے لئے) گیسو ہیں۔ اس نظم میں شاعر گیسوؤں کی عریانی اور حقیقت پر اپنے شعری خواب کی بنیاد رکھتا ہے۔ اپنی اور دو نظموں میں گیسوؤں کو "وہ زرّیں علم" اور "شفق کی آگ" سے تشبیہ دیتا ہے۔ اس نظم میں یہ دونوں تشبیہیں گھل مل کر ایک ہو جاتی ہیں اور "مشعل" کی صورت لے لیتی ہیں۔ اور تخیل اس مشعل کو ایک زندہ عورت کے روپ میں پیش کرتا ہے جو اپنے گیسوؤں کو ہوا میں آویزاں کئے ہوئے کھڑی ہے۔

اب ہم نظم کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔

"گیسوؤں کا انبار ایک شعلے کی لپک کی طرح"

یہ مشعل اور گیسو کی تشبیہ ہوئی۔

"آرزوؤں کے پچھم کی آخری حد پر پہنچ کر"۔

"پچھم کی آخری حد" شفق کے تعلق سے بنی۔ اس مصرعے میں عشقی تحریک کی قدرتی حرکت ہے۔ گیسوؤں کے پچھم کی طرف جانے سے نفسی تحریک طبعی کی تکمیل مراد ہے۔ پچھم جہاں آرزو غروب ہو کر تکمیل پائے اور جہاں گیسوؤں کا شعلہ آرزو کے شعلے سے گھل مل جائے۔ ادب اور آرٹ چونکہ تہذیب و تمدن کی پیداوار ہیں اس لئے یہ طبعی تحریک کی تکمیل کے رستے میں ایک رکاوٹ بنتے ہیں۔ اس لئے گیسوؤں کا شعلہ آخری حد پر پہنچ کر

"وہاں گھل کر پھر بیٹھ جاتا ہے"

یہ جمالیاتی ردِ عمل ہے۔ یعنی ادب اور آرٹ طبعی خواہش کو روکتے ہیں۔

"تاسے ایک سلطنت کا زوال کہہ لیجئے"

سلطنت کا زوال تاج کا زوال ہے، تاج گیسو ہیں۔ گیسوؤں کی طبعی حرکت میں رکاوٹ کا پیدا ہونا زوال سلطنت ہے۔

"اُس تاج کی ایسی اونچی بھوں کی طرف بیٹھ جاتا ہے"
جو اس کا قدیم آتشدان تھی"۔

بھوں کے اُوپر ہی گیسوؤں کا ماخذ یا اصلی مقام ہے۔ طبعی تحریک کی رکاوٹ سے ایک نا اُمیدی سی ہوتی ہے۔ آرزو حسرت بن جاتی ہے، نیز گیسو گھل کر بیٹھ جاتے ہیں تو شفق کی تشبیہ معدوم ہو جاتی ہے۔

"لیکن افسوس! سنہرا پن چھن جانے پر بھی"

سنہرا پن نہ رہا تو شعلہ بھی نہ رہا۔ اب اس کے نعم البدل کی تمنا ہے۔

"اُس زندہ بادل" (گیسو) کو جو ایسی آگ کی مانند ہے
جو ہمیشہ اندر رہتی ہے"۔

اگر یہ شعلے کے راستے میں رکاوٹ آجاتی ہے مگر وہ وہیں کا وہیں ہے۔

"اور اصل میں جو ایک اکیلی اگنی ہے"۔

کیونکہ ایک شعلہ، ایک اگنی، ایک شکتی تمام نظامِ قدرت میں کارفرما ہے۔

"آنکھ کے سنجیدہ یا طنز کرتے ہوئے ہیرے میں
جاری رہنا چاہیئے تھا"

آنکھیں عریاں رہتی ہیں۔ وہ غلط بیانی نہیں کرسکتیں۔ وہ صاف گوئی کے ساتھ ہنستے ہوئے ادب اور آرٹ کے نفسی ماخذ کو تسلیم کرتی ہیں۔ خواہ شعلہ رُک جائے۔

"ایک نازک ہیرو کی عریانی"
آنکھ کی عریانی ہے۔

"اُس بات کو عریاں کرتی ہے

جیسے نہ حرکت کرتا ہوا ستارہ"
کان کا آویزہ کہہ لیجئے۔
"اور نہ انگلی پر کی آگ"
انگشتری سمجھئے۔
"اپنی صورت سے تکمیل تک پہنچا سکتی ہے"
حسنِ محض کی طرف ہمیں زیورات راغب نہیں کرتے،
"بلکہ جیسے وہ عورت تکمیل تک پہنچاتی ہے۔
جس میں شان کی سادگی ہے"
عورت حسنِ قائم بالذات کی طرف لے جاتی ہے۔ لیکن کس طرح
"سرخ پتھروں کے ساتھ اُس شک کی بنیاد کا کارِ عظیم بھڑکاتے ہوئے جسے اُس نے یوں چھوا تھا جیسے کوئی شاداں اور رہنما مشعل"
یعنی عورت اپنے گیسوؤں کی شاداں اور رہنما مشعل سے اِس شک کو چھونی یعنی جگاتی ہے کہ اس منظورِ نظر اور دل پسند عورت کا کیا فائدہ ہے یعنی حسنِ محض کا کیا فائدہ ہے! ـــ لیکن اِس شک کی تخلیق کے باوجود اس عورت میں ایک ایسی شان پیدا ہو جاتی ہے جیسی کسی شاداں اور رہنما مشعل میں ہو۔

یہ طریقہ ہے میلارمے کی نظموں کے مطالعے کا۔ اب میں پہلے اس کی ایک نظم "اُلجھن" درج کرتا ہوں۔ یہ واضح ہے اور باڈیلیئر کے رنگ میں اور اس کے بعد اُس کی مشہورِ عالم نظم "گوالے کا سپنا" پیشِ نظر ہے۔ جس سے پہلے چارلس مورولی کا تشریحی بیان بھی ہندوستانی لباس میں حاضر ہے۔

اُلجھن

آج آیا نہیں مفتوح بنانے کے لئے
اور رکھے دیو ہزیمت سے ملانے کے لئے
تو کہ حیران ہے دنیا کے گناہوں سے لدی،
جیسے پھولوں سے ہو بوجھل کوئی نازک ٹہنی!
اور نہ آیا ہوں کہ پیدا کروں طوفانِ حزیں،
اپنے بوسوں کی گراں باری و بیزاری سے،
گیسوؤں میں کہ پریشاں ہیں جو ستانہ وار!
آج اُس نیند کا مشتاق و طلبگار ہوں میں،
آہ! آلودہ نہیں ہے، جو ہے خوابوں سے بری!
بند پردوں میں جو بستر کے حرارت سے ہے مکیں،
منتظر اِس کا ہوں بن جائے وہ ہمراز مری!

موت سے بڑھ کے فراموش جو کر دے وہ نیند،
ترے بستر کی حرارت میں ہے ہمدوش تری
وقت سے تیز گناہوں کی ہے نشتر کاری!
تو کہ بے سود ہزیمت پہ مری ہے نازاں،
ایک جیسی ہے تری اور مری رسوائی!

یہ ترا دل کہ جو محفوظ ہے سینے میں ترے،
جرم کے زخم سے ہوتا ہی نہیں ہے حیراں!
زر دروز و بادیہ پیمائی میں ہوں سرگرداں،
اور اس اندیشے سے ہر وقت ہے دل بھی لرزاں،
"موت آ لے نہ کہیں، سوؤں اگر میں تنہا"
اس لئے آج میں خلوت میں تری آیا ہوں!

گوالے کا سپنا

گوالا بن میں گھنی شاخوں کے تلے سویا ہوا ہے۔ گرمیوں کے دن، سہ پہر کا وقت ہے۔ آس پاس کی فضا سورج کی تیز روشنی سے تپی ہوئی ہے۔
گوالا جاگتا ہے
اُس نے ایک سپنا دیکھا ہے جنگل کی پریوں (دگوبیوں) سے اختلاط کا سپنا۔ آنکھیں بند کئے وہ کوشش کرتا ہے کہ اس عیش افزا نظارے کو جہاں تک ممکن ہو، زیادہ دیر تک قائم رکھا جائے۔ شاید گوالے کے جی میں آئی ہے کہ وہ اس نظارے کو یوں دیر تک قائم رکھ کر لازوال کر دے، لافانی بنا دے!...
"بقائے زندگی بخشوں گا ان جنگل کی پریوں کو....."
..... ساتھ ہی ساتھ وہ اپنی آنکھیں کھولتا ہے، اس خیال کے ساتھ ہی ساتھ۔ لیکن خواب کا فریبِ نظر (تصور) اس قدر شدت لئے ہوئے ہے کہ اُسے اب بھی سایوں کے درمیان دیویوں دگوبیوں'

پریوں) کی صاف ستھری شکلیں تھرکتی ہوئی دکھائی دیتی ہیں۔ یہ اس لئے کہ کچھ تو نیند کا اثر ہے اور کچھ یوں کہ اُسے ساکن برگ زار نظر آتا ہے اور ان ٹھہرے ہوئے، چُپ چاپ پتّوں ہی کو دیکھ کر شک وشبہ کی تخلیق ہوتی ہے، کہ .....

"(تو) کیا میں نے فقط اک خواب دیکھا تھا؟"

..... لیکن جوں جوں نیند کے آثار گھٹتے جاتے ہیں، ٹہنیوں کی ہستی نمایاں تر ہوکر اس کا یقین دلاتی جاتی ہے کہ یہ وہی بن ہے جس میں وہ گوالے کی زندگی گذار رہا ہے۔ اب شبہے باقی نہیں رہتے۔ گوالے کی سمجھ میں یہ بات آجاتی ہے کہ وہاں اور کوئی نہ تھا اور وہ تنہا تھا اور وہ جان لیتا ہے کہ (افسوس!) یہ ساری بات ایک سپنا تھی، نرا سپنا!

لیکن گوالے کی گداز روح ایک فرضی تصور بناتی ہے:-

خواب میں دو گوپیاں تھیں، کون جانے؟ ——— شاید وہ گوالے کے احساسات کی غلط کاری سے پیدا ہوگئی ہوں۔ اُن میں سے پاکیزہ (گوپی) (جل پری) کی نیلگوں اور سرد مہر آنکھیں تھیں۔ وہ ایسی تھی گویا کسی چشمے کے اُبلنے کی جھنکار (اُس کی آنکھیں نیلگوں کیوں تھیں؟ کیا اُن میں گوالے کی موہن مورت کی نیلاہٹ جھلک رہی تھی؟) اور ——— اور وہ دوسری! ——— سراپا آہیں۔ (کیوں؟) اُس کی نمود ہواؤں کی سرسراہٹ سے نہ ہوئی تھی کیا! ——— نہیں نہیں، اس بن میں تو اگر کوئی جھنکار ہے تو وہ گوالے کے پیروں میں پائل کی اور اگر کوئی گونج ہے تو وہ بنسری کی مدھر تانوں کی، جسے گوالا نیند سے پہلے بجا رہا تھا اور اگر کوئی ہوا ہے تو وہ سانسوں کی جو بنسری سے نکلتی ہیں۔ یا ہوا کا وہ جھونکا موجود ہے جو اُفق سے آیا تھا اور اب بھی اُفق کے پاس ہی پہنچ کر آسمانی کیفیتوں میں شامل ہوگیا ہے۔

لیکن اب کیا؟ اب تو کوئی بات باقی نہیں رہی۔ اب تو شک و شبہے کی گنجائش ہی نہیں۔ اب گوالے کے لئے صرف ایک راہ ہے:-
اپنی بنسی کے نغمے سے خواب کا گیت پیدا کرے۔

"میں بنسی بنانے کی فکر میں سرکنڈوں کے درمیان اِدھر اُدھر پھر رہا تھا کہ مجھے جھیل کی سطح پر، دُور ——— ایک جاندار سفیدی کی لرزش دکھائی دی۔ کیا یہ کوئی راج ہنس تھے؟ ——— نہیں نہیں کی قسم! یہ تو جنگل کی پریاں ہیں، یہ تو جل کی پریاں ہیں۔ (گوپیاں تو نہیں کہیں!) اور جوں ہی انہوں نے میری بنسی کے پہلے سُروں کو سُنا وہ دھندلی اور مبہم شکلیں گریزاں ہوکر منتشر ہوگئیں"۔

اس اندھا دھند فراری کی وجہ سے اب کچھ بھی نہ رہا۔ اس سہ پہر کی ساکن اور پژمردہ فضا میں کوئی بھی نشان ایسا نہیں جس سے دیویوں کے جھرمٹ کی ناگہاں فراری کا کچھ بھی پتہ چل سکے۔ جھرمٹ میں بہت سی پریاں تھیں۔ اور اتنے گروہ میں سے کسی کو قابو میں لانا ناممکن تھا۔ چنانچہ گوالے کی بنسی کے پہلے ہی سُروں کو سُن کر وہ سب کی سب گریزاں ہوگئیں۔

خیر۔ اب تو گوالا تنہا ہے۔ اکیلا ہے ——— اکیلا ہے تو کیا ہوا! وہ اب بنسی کی تانوں میں کھو جائے گا۔ وہ اب بنسی بجائے گا۔ اپنی سادگی، اپنے بھولپن ہی کی وجہ سے اُس نے بے سوچے سمجھے بنسی بجائی اور جنگل کی پریاں اُسے سُن کر گوالے کی نگاہوں سے پل بھر میں اوجھل ہوگئیں۔ اب وہ پھر بنسی ہی بجائے گا۔

گوالا اپنی جگہ سے اُٹھا۔ اُس کی نگاہ اپنے سینے پر گئی ——— نشان! ——— دانتوں کے نشان! یہ کس کے بوسے کے نشان ہیں؟ شاید یہ سب کچھ خواب نہ تھا۔ محض ایک بوسے کی یاد کی بہ نسبت ایک بوسے کا نشان زیادہ یقین دلانے والی شے ہے۔ یقینی ثبوت اس بات کا کہ یہ تاثر صحیح ہے کہ

"مرا سینہ کسی بوسے کا نقش جاوداں محسوس کرتا ہے"!

بوسہ تو ایک ایسی غیر مرئی، شیریں "معدومیت" ہے جو بہت جلد تحلیل ہوکر مٹ جاتی ہے ——— لیکن افسوس! ذرا غور سے دیکھا تو جانا کہ سینہ تو سراسر اچھوتا ہے۔ کوئی نشان نہیں ہے۔ چلو چھوڑو۔ جانے دو۔ اس کے متعلق کوئی بات ہی نہ کرو۔ بنسی ہی اس پہیلی کو بوجھ سکتی ہے۔ یہ بنسی جو خود بھی کسی نغمہ خواں دیوی کی مانند ہے اور جو اب ایک ہی سپنے کے دیکھنے میں محو ہے۔ اپنے آس پاس کی جوانی بھری سندرتا کی شکلیں نغمے کی صورت میں تبدیل کرتے رہنے میں مشغول ہے۔ پریم کی باتوں جیسی سرگوشی کے ساتھ، رانوں اور کمر کی لہروں کو، گونجتے ہوئے یکساں خط کی لرزش میں بدلنا، بنسی کا کام ہے اور گوالا آنکھیں بند کئے اپنی اندرونی قوتِ نظارہ سے ان جسمانی لہروں کا سراغ لگا رہا ہے۔

"چل تو پھر اے حیّز بنسی! تو ہی جانتی ہے کہ کس طرح جنگل کی پریاں ہم سے گریزاں ہوکر، موسیقی میں گھُل مل کر، معدوم ہوجاتی ہیں۔ تو ہی از سرِ نو اپنے نغمے سے جل پریوں کو نمودار کر!"

———— اور اس دوران میں گوالا یادوں اور خیالی خوشیوں سے
سے اپنا جی بہلائے گا۔

گوالا جل پریوں کو اپنے قابو میں لانے کے لئے اُن کا پیچھا کرتے ہوئے، دوڑتا چلا جا رہا تھا کہ اچانک وہ سامنے اپنے قدموں میں کوئی شئے دیکھ کر ٹھٹکا۔ دو پریاں (گوپیاں) تھیں۔ ایک بے نیازی سے ایک دوسرے کے گلے لپٹے ہوئے لیٹی تھیں، سوئی ہوئی تھیں۔ باہیں ایک دوسری کی گردن میں ڈالے ہوئے۔ گوالے نے انہیں ———— اُن دونوں کو ...... ان دونوں کو ———— قابو میں کیا اور تعشقِ سوناں کی امید میں اُن کو اٹھا کر پھولوں کے ایک ڈھیر کی طرف لے چلا۔ دونوں مدافعت کرتی رہیں لیکن گلزار میں پہنچ کر گوالے نے اُن کی روک تھام، جھجک اور بدن چرانے کے باوجود، اُن دونوں دیویوں کے جسموں کو بوسوں سے ڈھانپ دیا۔ سراپا آہوں ایسی کو قدموں سے لے کر چوما اور سرد مہر آنکھوں والی کو سینے تک چوم لیا۔ لیکن آسمانی دیوتا اس منظر کو دیکھ کر غضب ناک ہو گئے۔ گوالے نے اس تُندی کے ساتھ دو اچھوتی دیویوں (پریوں، گوپیوں) کے اختلاط آمیز خواب لطف میں خلل اندازی کی اُن بکھرے ہوئے بوسوں کے اُلجھاوے کو دیکھ کر آسمانی دیوتا غضبناک ہو گئے اور اس لئے ———— ہاں، اسی لئے جب گلچیں زیادہ ربط انگیز مسرتوں کے لئے اپنے کو وقف کرنے والا تھا، تو اچانک اُس پر ایک کمزوری سی طاری ہو گئی۔ ایک ضعف سا چھا گیا۔ اُس میں ایک مبہم سی کمی پیدا ہو گئی۔ اور اس سے اُس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ دونوں گوپیاں اس کے قابو سے نکل بھاگیں۔ دہکتی ہوئی، انگار دسی، اچھوتی گوپی بھی نکل بھاگی۔ اور وہ نوعمر شوخ گوپی بھی نکل بھاگی، جسے گوالے نے پریم سکھشا کے لئے اُس کی انگلی سے تھامے رکھا تھا۔

خاموشی! ———— اس سارے بیان کے بعد ایک لمبی خاموشی طاری و ساری ہو جاتی ہے۔ انجام آ پہنچتا ہے اور جب نظم دوبارہ شروع ہوتی ہے تو اس کا لب و لہجہ ڈھیلا ڈھالا اور تھکا ہوا سا ہوتا ہے۔ لیکن اُس لہجے میں اطمینان بھی ہوتا ہے اور نیند کا غلبہ بھی۔ گوالا اپنے جی کو مستقبل کی مسرتوں کے خیال سے تسکین دیتا ہے۔ وہ مسرتیں آئیں گی۔ یقیناً وہ مسرتیں اٹل ہیں! کیونکہ جس طرح انار کی کلیوں کی گداز اور گلابی کیفیت کو دیکھ کر بھنوروں کا جھرمٹ اکٹھا ہو جاتا ہے، اسی طرح گوالے کے ایسے رسیوں کا، گوالے کی ایسی رنگیلی ہستیوں کا لہو بھی دیویوں کی آرزوؤں کو تکمیل تک پہنچانے کے لئے ہی بہتا ہے ———— گوالے کے دل میں غرور کے احساسات پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ سوچتا ہے کہ گوپیوں کے ساتھ ایک ہنگامہ خیز ملاقات کی جائے گی۔ اتنے میں شام آ پہنچتی ہے اور رفتہ رفتہ رات کالے، چاند تاروں سے درخشاں لباس کو پہن کر بکھیر دیتی ہے۔ چاند میں گوالے کو دیوی کی مورت دکھائی دیتی ہے۔ "ہاں ہاں" ———— گوالا سوچتا ہے "ہاں ہاں، دیوی کے ساتھ اختلاط کی کیفیتوں سے لطف اندوز ہوا جائے گا! ———— لطف اندوز ہوا جا رہا ہے۔ دیوی تو اس کے پہلو میں ہے۔ گوالے کی گود میں موجود ہے۔ دیوی جو سب گوپیوں سے بڑھ کر سندر ہے۔ گوالا گوپیوں کا انتقام دیوی کے اختلاط سے لے گا۔

"رخ انور نگاہوں میں مری دیوی کا آتا ہے!
وہ اک جھرمٹ سزاؤں اور جزاؤں کا مرے دل میں جگاتا ہے!"

لیکن خواب کی اس قدر مبالغہ آمیزی ہی سے ظاہر ہے کہ گوالا اب پھر سے نیند میں ڈوبنے کو ہے۔ گرمی سے ہلکان ہو کر وہ مے آتشیں کے لئے اپنے لبوں کو ذرا کھولے ہوئے پتوں کی سیج پر لیٹ جاتا ہے۔

خاموشی! ———— خاموشی پھر طاری و ساری ہو جاتی ہے اور گوالا آخر کار بول اٹھتا ہے "الوداع" اے پریو! الوداع، اے گوپیو!"

گوالا اب اُس رات کی تلاش میں پھر نیند میں ڈوب جائے گا جس کی ہواؤں پر خواب بہتے ہیں، سپنے بہتے بہتے گھلتے جاتے ہیں اور جہاں وہ سائے ہیں جن میں وہ دونوں گوپیاں گم ہو گئی تھیں۔

نظم

بقائے زندگی بخشوں گا ان جنگل کی پریوں کو۔

ٹک مورت ہے ان کی اس قدر شفاف ———— بہتی ہے ہواؤں پر،
ہوائیں جو گھنیری نیند کے جھونکوں سے بوجھل ہیں!

تو کیا، میں نے فقط اک خواب دیکھا تھا؟

گماں میرا پرانی رات کا انبار ہے اور ختم ہوتا جا رہا ہے
اب یقین بن کر؛ (د)
بہت ہی نرم شاخیں چھوڑ کر جنگل کو، سپنے میں

دکھائی دے رہی تھیں مجھ کو،
وہ اس وقت اظہارِ حقیقت ہیں!

انہیں شاخوں سے،
اِس میرے گماں سے ہی یہ ثابت ہے (۱۰)
کہ مَیں خلوت کے لمحوں میں
گنہ کی کیف زا مستی میں اپنا آپ کھو بیٹھا!

مجھے کچھ غور کرنے دو،
کہ وہ دوشیزگانِ نازنیں جن کا بیاں کرتے ہو، تمہارے
فسانہ ساز احساسات کا نقشِ تمنا تو نہ تھیں دونوں؟ (۱۵)
فریبِ حسن اس پاکیزہ تر دوشیزۂ آبی کی نیلی سرد آنکھوں کا
گریزاں تھا،
کہ جیسے چشمۂ آبی کے آنسو بہتے بہتے چھوڑتے جاتے ہوں چشمے کو!
مگر وہ دوسری جس کو "سراپا آہ" کہتے ہو،
کہو تو، روزِ روشن میں بدن سے اپنے، کیا بادِ صبا کی طرح اس کے
لمس کا احساس تھا تم کو؟ (۲۰)

نہیں لیکن،
جہاں وہ صبح تازہ کشمکش کرتی تھی پژمردہ نقاہت سے،
جسے گرمی دباتی اور مسلتی ہے،
تو پانی کی وہاں سرگوشیاں معدوم تھیں یکسر!
فقط آوارہ نغمہ بنسری کا تھا (۲۵)
جو اس بَن کی فضا پر پھیل جاتا تھا!
مری بنسی سے نغمہ آمادۂ پرواز اک جھونکا
وہ جھونکا سانس تھا مصنوعی، بے حرکت، نمایاں سا،
وہ جھونکا سانس تھا اُس ایک اعجازِ تاثر کا
مری آواز کو بے آب چھینٹوں میں (۳۰)
پریشاں، منتشر کرنے سے پہلے جو افق کے صاف میداں میں
شفق کے پار پہنچا تھا!

تو اے چپ چاپ جھاڑ جھیل کے ساکن کنارے کی!
جو میری خود پسندی کو
کہیں بڑھ کر تپِ خورشید سے، برباد کرتی ہے، (۳۵)
جوانِ نا بالغ گُلوں کے سائے میں خاموش رہتی ہے!
بیاں کر دے، کہ
"جب میں اس نیستاں میں
تلاشِ نے کی خاطر محو تھا یکسر،
تو کیا اُس دور کے سبزے کے اک زریں دھندلکے میں (۴۰)
جہاں بیلوں نے اپنے جال پھیلائے ہیں چشمے کے کناروں پر
کسی زندہ سفیدی کی وہاں لہریں ہوئیں پیدا؟"
بیاں کر دے: کہ
"جب بنسی کے پہلے سُر نے اُن ہنسوں کو چھیڑا تھا،
"نہیں، اُن جل کی پریوں کو،" (۴۵)
تو کیا، زندہ سفیدی اڑ گئی یا تیر کر غائب نگاہوں سے ہوئی یکسر!"

ہر اک شے تند لمحوں میں جھلستی ہے بغیر احساس کے، ان کو
ذرا پروا نہیں اس کی
اچھوتا پن مگر کس جادو سے غائب ہو گیا پل میں،
مجھے تھی جستجو جس کی! (۵۰)
ہوا بیدار میں اُس وقت پہلی گرم جوشی سے،
تنِ تنہا ــــ پرانے نور کے طوفان کے نیچے،
کنول کے پھول بھی تھے ہم نشیں میرے،
اور احساسِ حقیقت ہو گیا اُن سے مرے دل کو!

علامت جیسی وہ اک بے نام شیرینی (۵۵)
سکوں لاتی ہے نزہت جس کی اس درجہ وفا نا آشنا عشاق
کے دل میں
ہو گویا ایک بوسہ اُن کے ہونٹوں سے کبھی پیدا،
یونہی سینہ مرا گرچہ مبرا ہے مگر اس پر
ہویدا نقشِ پر اسرار ہے کوئی!

مگر رہنے دو، رہنے دو! ــــــ (۶۰)
کہ ایسے پردہ دار اسرار نے اپنے لئے
منتخب کی ہے۔

وہ نَے جس کو میں چرخِ نیلگوں کے سائے میں ہر دم بجاتا ہوں،
وہ نَے جو کاوشِ رخسار کو ہنسی سے اپنی ملتفت کر کے،
ہوا کرتی ہے محوِ خواب لمبی تان کی لے میں،
کہ ہم بہلائیں اپنے دل کو اُس حسنِ فراواں سے (۶۵)
جو چاروں سمت پھیلا ہے!
سراپا اُنھیں جو لغزشِ سادہ میں اور حسنِ فراواں میں ہویدا ہوں،
ہم اُن سے دل کو بہلائیں!
ہوا کرتی ہے محوِ خواب لمبی تان کی لے میں،
اور اک بے لطف، پر آواز، یکساں خط بناتی ہے، (۷۰)
اور اس خط کو جدا کرتی ہے سادہ خواب سے میرے،
وہ سادہ خواب جو ہوتا ہے میری نیم وا آنکھوں کے پردوں میں،
وہ سادہ خواب جس کو جذبۂ دل وضع کرتا ہے!

چل آ، اے کیسۂ ورنیسی!
ذریعہ ہے جو پروازوں کا، تو پھر سے شگفتہ ہو، (۷۵)
کنارِ آب پر جا کر،
جہاں تو منتظر ہے میری ہستی کی!

فسانہ سازیوں پر اپنی میں نازاں ہوں، نازاں ہوں!
کئی لمحوں تلک باتیں کروں گا دیویوں کی میں!
میں اُن کے پیرہن پھر سے اُتاروں گا! (۸۰)
میں ان کو نور میں لے آؤں گا سایوں کی بستی سے!

یونہی، جیسے پشیمانی جو ہے باطل فریبوں پر
اُسے دل سے مٹانے کو،
میں انگوروں کے رس کو، نور کو جب چوس لیتا ہوں،
تو خالی شاخ اپنے ہاتھ سے سوئے فلک اُس دم اٹھاتا ہوں (۸۵)
اور اس کو شام تک میں دیکھتا رہتا ہوں دل میں بے خودی
کی آرزو لے کر!

ہم، اے جنگل کی پریو!
پھر سے اُن سو رنگ کی یادوں کو دل میں
تازہ کرتے ہیں

"نظر میری نیستاں سے نکل کر، چیر کر جاتی ہے ---- جاتی ہے،
"نظر جاتی ہے میری ہر گلوئے غیر فانی پر: (۹۰)
"گلوئے غیر فانی، سوز کو اپنے جو لہروں میں چھپاتے ہیں،
"غضب کی چیخ جن میں سے نکل کر آسماں کی سمت جاتی ہے،
"اور اُن کے گیسوؤں کا غسل تاباں بھی،
"نظر سے دور ہو جاتا ہے لرزش اور تابش میں!"

"میں جب دوڑا، نظر آئیں مجھے دو نازنینیں اپنے قدموں میں (۹۵)
"بہم بازو حمائل گردنوں میں تھے،
"وہ تھیں سوئی ہوئی دونوں!
"میں لپکا اُن پہ، سلجھائے بغیر اُن کو،
"پھر اس گلزار میں لایا،
"گلوں کا رس جہاں پر سوکھتا جاتا ہے گرمی سے، (۱۰۰)
"وہ گرمی جس سے نفرت ہے تلون کیش سایوں کو،
"جہاں ممکن تھا، مہرِ تُند دن کی طرح عشرت کو ہماری جذب کر لینا!"

مجھے دوشیزگی کا طیش بھاتا ہے،
پسند آتا ہے جوشِ پاک دامانی،
میں دوشیزاؤں کے جوشِ غضب کا اک پجاری ہوں؛ (۱۰۵)
مقدس اور عریاں جسم کی وحشی مسرت، جو پھسلتا ہے،
چمکتا ہے کہ جیسے ہو کوئی بجلی گھٹاؤں میں،
گریزاں میرے گرم اور چوستے ہونٹوں کی لرزش سے!
وہ پنہاں خوف جسموں کا.
تھے جو نمدار وحشی آنسوؤں سے، یا (۱۱۰)
ذرا کم درجہ غم انگیز قطروں سے!
بدن نمدار تھا قدموں سے لے کر ایک کا، ہاں وہ جو ظالم تھی،
مگر نمدار تھا جسم اُس کا سینے تک جو خائف تھی،
اچھوتا پن وہ کھونے کو تھیں وہ دونوں ایک لمحے میں!

مرا یہ جرم ہے، میں نے (۱۱۵)
فریب انگیز ڈر کو جیتنے پر شاداں ہو کر،
کیا تھا منتشر بوسوں سے ہر زلفِ پریشاں کو،

کہ جن کو دیوتاؤں نے سجا رکھا تھا خوبی سے۔
اور اُس دم جبکہ میں کھونے کو تھا اک نازنیں کے گیسوؤں کی
شادماں عزلت میں اپنا آتشیں خندہ

(اور اس دوران میں چھوٹی کو جو سادہ طبیعت تھی، (۱۲۰)
حیا کی سرخیاں رُخسار پر جس کے نہ آتی تھیں،
اُسے تھاما ہوا تھا اک طرف: تنہا، اکیلی، ایک انگلی سے،
سفیدی تاکہ اُس کے دل کی بھی رنگین ہو جائے،
اُسی ہم خواب کے دل کی چمکتی آرزوؤں سے)
تو میرے بازوؤں سے کر لیا آزاد خود کو صید نے اک دم، (۱۲۵)
تشکر کا اُسے احساس ہی گویا نہ تھا یکسر!
کسی مبہم سی کمزوری کی مجھ پر خستگی چھائی ہوئی تھی، اور
مَیں جس سسکی سے بے خود تھا، اُسے اُس پر نہ رحم آیا!
ہوا جو کچھ ہوا، ہیں اور بھی جو اپنی زلفوں کو
مری آنکھوں کے پردوں سے لگائیں گی۔ (۱۳۰)
مجھے لے جائیں گی عشرت کی جانب رہنما بن کر۔
مرے جذبو! تمہیں معلوم ہے، کلیاں
گلابی رنگ لے کر، پختگی پا کر،
کھلا کرتی ہیں اور سرگوشیاں بھنوروں سے کرتی ہیں؛
ہمارا خون بھی بہتا ہے لافانی ہجوم آرزو کے واسطے، (۱۳۵)
اُس نازنیں کے واسطے جو اس کو اپنا لے!
انہیں لمحوں میں جب جنگل
سنہرے اور مٹیالے مناظر لے کے آتا ہے،
چمک اُٹھتا ہے اک جشنِ مسرت برگ زاروں میں۔

کہ جو خاموش ہیں اور ماندگی میں کھوئے ہیں سارے! (۱۴۰)

اداسی اور سکوں جب گونج اُٹھتے ہیں،
تو شعلے، موت کے دامن میں یکسر ڈوب جاتے ہیں!
اُنہیں لمحوں میں ہیماوَت کی بیٹی برف سے ٹھنڈے
قدم رکھتی ہے آتش خیز سینے پر جو الا کے!

مرے پہلو میں ہے دیوی! ..... (۱۴۵)
یہی ہے انتقام اُن کا جو پہلو سے گریزاں ہو گئیں میرے!
نہیں لیکن
نہیں ہے طاقتِ گویائی میری روح میں یکسر،
بدن پر بھی مرے اک بوجھ چھایا ہے:
سرِ تسلیم خم کرتے ہیں روح و جسم اُس نازاں خموشی کو، (۱۵۰)
جو دن کے آتشیں لمحوں پہ طاری ہے!

بس اب سپنے نہ دیکھوں گا،
مجھے نیند آئے گی، بھولوں گا میں اِس ظلمِ ناحق کو،
میں پیاسی ریت پر سو جاؤں گا خوابوں کے جھونکوں میں!

بس اب رُخصت تمہیں، دونوں کو، ـــــ دونوں کو، ! (۱۵۵)
اب اُن سایوں کو دیکھوں گا کہ جن میں کھو گئی ہو تم!

میراجی

شعر

دور بہت رہتے ہو ہم سے سیکھے طریق غزالوں کا
وحشت کرنا شیوہ ہے کچھ اچھی آنکھوں والوں کا

میر تقی

نوائے سرمدی

(سنسکرت کے چند شلوک)

نہ خلوت ہوں نہ جلوت انجمن ہوں میں نہ تنہائی ۔۔۔ پریشاں ہوں نہ یکجا برہمی ہوں نے تسلسل ہوں

نہ مجھ میں ہوش و بے خبری نہ مذہب ہوں نہ ملت ہوں ۔۔۔ ثباتِ محض، ردِ ہر دلیلِ عقل و حکمت ہوں

نہ حُسن و عیب ہے مجھ میں برائی ہے نہ اچھائی ۔۔۔ معرّا ہوں نہ مضمر نظم و نسخِ ہر جُزو کل ہوں

مُصیبت ہوں نہ راحت ہوں نہ دوزخ ہوں نہ جنت ہوں ۔۔۔ جدا از نقش و صورت، ماورائے معنویت ہوں

بری ہوں ہر تعلق سے نہ اِس کا ہوں نہ اُس کا ہوں ۔۔۔ عدد مجھ میں نہ ہے مقدار تنگی ہے نہ وسعت ہے

نہ ظاہر ہوں نہ باطن پردہ پوشی ہوں نہ رسوائی ۔۔۔ نہ مجھ میں سمت ہے کوئی نہ مجھ میں وقت ہے کوئی

یگانہ ہوں نہ بیگانہ پرایا ہوں نہ اپنا ہوں ۔۔۔ بروں ہے نے دروں مجھ میں نہ پستی ہے نہ رفعت ہے

نہ وہم لفظ و معنی ہوں خموشی ہوں نہ گویائی ۔۔۔ فریبِ "نسبت" ہے مجھ میں نہ وہم ہست ہے کوئی

نہ مجھ میں گرمی و نرمی نہ سستی ہے نہ چستی ہے
نہ ہے قہر و غضب مجھ میں نہ ہے جود و کرم مجھ میں

مثال بے مثالی ہوں نہ اوروں سا نہ یکتا ہوں
نہ با حس ہوں نہ بے حس ہوں مسرت ہے نہ غم مجھ میں

سکوں مجھ میں نہ رم مجھ میں نہ تیزی ہے نہ سستی ہے
نوائے راز ہوں ملتے نہیں ہیں زیر و بم مجھ میں

عدم ہوں میں نہ ہستی ہوں نہ جانے کون ہوں کیا ہوں
نہ اثبات و نفی مجھ میں نہ وہم کیف و کم مجھ میں

نہ جابر ہوں نہ ہوں مجبور دیوانہ نہ فرزانہ
نہ نوری ہوں نہ ناری ہوں سبک ہوں میں نہ بھاری ہوں

نہ قیدی ہوں نہ ہوں آزاد غمگیں ہوں نہ شاداں ہوں
نہ مالک ہوں نہ بندہ ہوں نہ خالق ہوں نہ خلقت ہوں

نہ گل ہوں میں نہ بلبل۔ شمع سوزاں ہوں نہ پروانہ
نہ اعلیٰ ہوں نہ ادنیٰ ہوں نہ ٹھہرا ہوں نہ جاری ہوں

نہ صہبا ہوں نہ مستی ہوں نمایاں ہوں نہ پنہاں ہوں
حقیقت ہوں حقیقت۔ وہم وحدت ہوں نہ کثرت ہوں

فراق گورکھپوری

مجھ میں نئی طاقت پیدا ہو گئی
میں ایک نیا طاقتور آدمی بن گیا
اوکاسا
واقعی جسم کے ہر حصے کو طاقت
پہنچاتا ہے
از ڈیرہ دون
جناب من!
میں نے آپ کی دوا اوکاسا کا استعمال کیا
اور مجھے یہ کہنے میں مسرت ہے کہ اس نے مجھے
ایک نیا آدمی بنا دیا ہے
میں پہلے سے بہت بہتری محسوس کرتا
ہوں اور اپنے کام میں دلچسپی لیتا ہوں میں ہمیشہ
ہر دوست سے اوکاسا کے استعمال کی سفارش کروں گا
اوکاسا نے مجھے
نئی زندگی بخشی
اوکاسا کس طرح عمل کرتی ہے؟
اوکاسا کوئی محرک دوا نہیں ہے۔ یہ زندگی بخش غدود دماغ اور بدن بنانے والے مادوں کا ایک بے نظیر مرکب ہے جسے سائنٹفک طریق پر تیار کیا گیا ہے اوکاسا کی ٹکیوں میں غدودوں کا ایسا موثر جوہر ہوتا ہے جو معدے میں پہنچ کر اپنے زندگی بخش مادوں کو فوراً مصروف عمل کر دیتا ہے اور یہ مادے معدے کی دیواروں کے ذریعہ سے بہت جلد خون میں جذب ہو جاتے ہیں اور خون کے ساتھ اعضائے رئیسہ تک جا پہنچتے ہیں۔ اس قدرتی اور سائنٹفک طریق میں اوکاسا جسم کے ہر عضو کو طاقت بخشتی ہے۔ کامل صحت نیز شباب انگیز طاقت کا از سر نو پیدا ہو جانا اور بڑھاپے کی علامات کا غائب ہو جانا اوکاسا کے چند حیرت انگیز اثرات ہیں اوکاسا نسوں پٹھوں، دل، دماغ اور تمام اعضائے رئیسہ کو طاقت دیتی ہے تکان اور پژمردگی رفع کر کے گم شدہ طاقت کو بحال کرتی ہے۔ اس سے حافظہ اور دماغ کی قوتیں بیدار ہو جاتی ہیں اوکاسا صرف تین ہفتہ استعمال کر کے اپنی صحت، طاقت اور قوت میں حیرت انگیز تبدیلی کا مشاہدہ کریں۔
حفاظت مقدم ہے
کسی ٹانک یا مقوی دوا کا استعمال کرتے وقت سب سے مقدم خیال احتیاط اور حفاظت کا ہونا چاہیے اوکاسا کا استعمال کرنے میں آپ بالکل محفوظ ہیں کیونکہ یہ مشہور عالم مرکب گزشتہ تیرہ سال سے تمام دنیا میں کامیابی سے آزمایا جا رہا ہے اوکاسا ان بازاری ادویات میں سے نہیں ہے جو ہندوستان کے بازاروں میں ٹکے سیر بکتی پھرتی ہیں اوکاسا برلن اور لندن کی ہوسو فارما لیبارٹری میں تیار ہو کر دنیا کے ہر ملک میں تقریباً دو کروڑ اشخاص کے استعمال میں آتی ہے۔ اس لئے ہم آپ کو غیر معروف سستی اور ناقابل اعتبار ادویات کے متعلق خطرے سے آگاہ کئے دیتے ہیں اوکاسا تمام انگریزی دوا فروشوں سے مل سکتی ہے۔ چھوٹا سائز تین روپے بارہ آنے۔ بڑا سائز دس روپے مفصل حالات اور نمونہ جات مندرجہ ذیل پتہ سے طلب کریں
اوکاسا کمپنی برلن (انڈیا) لمیٹڈ
پوسٹ بکس 369 بمبئی
اوکاسا تین ہفتے استعمال کر کے نتیجہ دیکھئے!
OKASA
MADE IN GERMANY

غزل

عقل کا اور مدعا عشق کی اور آرزو
اُس کو شکیب کی تلاش اس کو تڑپ کی جستجو

جذب و کشش ہے زندگی پیکرِ کائنات کی
دعوتِ عشق شش جہت جلوۂ حُسن چارسو

عرضِ نیازِ عشق سے نطق بھی آشنا نہیں
ہم نے حضورِ یار میں کی ہے نظر سے گفتگو

ٹوٹ چکے ہیں سلسلے گرچہ تعلقات کے
تجھ سے جدا ہوئے نہ ہم ہم سے جدا ہُوا نہ تُو

کس کی بہارِ حُسن کا مُجھ کو خیال آ گیا
آج مری نظر میں ہے ایک جہانِ رنگ و بُو

میرا مذاقِ معصیت تیرے کرم کا مشغلہ
میری سرشت میں گناہ عفو گناہ تیری خُو

پیکرِ نازنیں ترا آئینہ دارِ نوبہار
سروِ خرام، لالہ رُخ، غنچہ دہن، بنفشہ مُو

عہدِ تعلقات کا دیکھئے کیا مآل ہو
فطرتِ عشق مضطرب حسن کی طبع جنگجو

واقفِ کفر و دیں نہیں بے خبرانِ مے کدہ
دیر و حرم سے پاک ہے مشربِ ساغر و سبو

میرے قصور دیکھ کر تو ہو قصوروار کیوں
اپنے کرم پہ رکھ نظر میری طرف نہ دیکھ تُو

نازشِ زُہد و معصیت کوئی بھی معتبر نہیں
تیرا عتاب بے سبب تیرا کرم بہانہ جو

گرچہ امید و آرزو روح و روانِ عشق ہیں
کاش رہے نہ عشق میں کوئی اُمید و آرزو

وہ قدحِ نشاط لا وہ مئے تند و تیز دے
جائے نہ جس کی عمر بھر مستی و تلخئ گلو

ظفر تاباں

حُسنِ یقین

غمِ ہر شکست محال ہے — نہ وہ گیت ہیں نہ وہ رات ہے
غمِ ہر مُحال خیال ہے — نہ وہ کیف ہے نہ وہ بات ہے
مری زندگی کا سوال ہے — نہ وہ امتیازِ حیات ہے
مجھے پھر بھی اس کا یقین نہیں کہ مجھے کسی نے بھلا دیا — مجھے پھر بھی اس کا یقین نہیں کہ مجھے کسی نے بھلا دیا

یہ عجیب رُت یہ عجیب سماں — نہ دعا قبول نہ التجا
یہ عجیب سماں یہ خموشیاں — نہ پیامِ قُرب نہ "آسرا"
نہ سکونِ دل نہ سکونِ جاں — نہ سلامِ شوق نہ "سامنا"
مجھے پھر بھی اس کا یقین نہیں کہ مجھے کسی نے بھلا دیا — مجھے پھر بھی اس کا یقین نہیں کہ مجھے کسی نے بھلا دیا

نہ وہ صبح بادہ بہ جام ہے — مری داستاں مرا ماجرا
نہ وہ جامِ عیش پیام ہے — مری آرزو مرا مُدّعا
نہ وہ عیش گام بہ گام ہے — "تمہیں جانتا نہیں جانتا"
مجھے پھر بھی اس کا یقین نہیں کہ مجھے کسی نے بھلا دیا — مجھے پھر بھی اس کا یقین نہیں کہ مجھے کسی نے بھلا دیا

نہ وہ شام رنگ بہ رنگ ہے
نہ وہ رنگ نغمہ و چنگ ہے
نہ وہ منظرِ لبِ گنگ ہے
مجھے پھر بھی اس کا یقین نہیں کہ مجھے کسی نے بھلا دیا

سحر رام پوری

سحر البیان اور گلزار نسیم

پھر چھیڑا حسن نے اپنا قصہ　　بس آج کی شب بھی سو چکے ہم

اردو زبان میں مثنوی کی ابتدا بہت جلد ہوئی اور اس کا آغاز بھی مذہبی تاثر کی بنا پر ہوا۔ ۱۰۸۱ھ میں قطب شاہ نے ایک نعتیہ مثنوی لکھی۔ اس کے بعد رستمی نے خاور نامہ خاور نامی مثنوی لکھی جس کو حضرت علیؓ کے کارناموں کی ایک دلچسپ داستان سمجھنا چاہیئے۔ اسی زمانے میں مولانا نصرتی نے "گلشن عشق" تصنیف کی اور ایک مثنوی علی عادل شاد کی فتوحات کی تعریف میں لکھی۔ صاحب شعر الہند نے محمد یحییٰ کی مثنوی کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ اگرچہ وجہی نے اپنا "سب رس" کا پلاٹ اس سے اخذ کیا ہے۔

دہلی میں محمد شاہی دور میں متعدد مثنویاں لکھی گئیں۔ شاہ مبارک آبرو اس عہد کا مشہور و معروف مثنوی گو شاعر ہے۔ سید محمد حید زبخش نے بھی کئی مثنویاں لکھیں اور بہت سی مثنویوں کا فارسی سے اردو زبان میں ترجمہ بھی کیا۔ اس کے بعد میر۔ سودا۔ راسخ نے مثنویاں لکھیں اور میر اثر نے ایک مثنوی "خواب و خیال" نامی تحریر کی۔

قدما کے تیسرے دور میں اس طرف بہت کم توجہ کی گئی۔ انشاء اور جرأت نے تو کوئی بھی مثنوی نہیں لکھی۔ ہاں مصحفی نے البتہ میر کی مشہور مثنوی "دریائے عشق" کو "بحر المحبت" کا جامہ پہنا دیا۔ لیکن میر حسن نے اس دور کا کفارہ بھی ادا کر دیا اور ایسی یادگار چھوڑی کہ دنیائے شعر میں ان کا پایہ بہت بلند ہو گیا۔

متوسطین کے دور میں لکھنؤ میں ناسخ اور آتش نے تو گویا اس صنف کو ہاتھ ہی نہ لگایا مگر پنڈت دیا شنکر نسیم نے گلزار نسیم لکھ کر بقائے دوام حاصل کی۔ دلی میں سوائے مومن کے کسی نے اس صنف کو چھوا تک نہیں۔

مگر آج دنیائے ادب میں میر حسن کی مثنوی بدر منیر عرف سحر البیان کی شہرت کو کوئی دوسری مثنوی نہیں پہنچی۔ مثنوی سحر البیان کا قصہ اتنا مشہور ہے کہ یہاں اس کا دہرانا چنداں ضروری نہیں۔ یہ مثنوی ۱۱۹۹ھ میں تمام ہوئی۔ اس کی بحر عام عشقیہ مثنویوں کی طرح رزمیہ ہے صاحب شعر الہند کی رائے ہے کہ میر حسن نے سینکڑوں چیزوں کا نقشہ کھینچا ہے لیکن کہیں فطری انداز سے تجاوز نہیں کیا۔" اس سے پیشتر کی مثنویاں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ جہاں کہیں سودا، میر اور راسخ نے کوئی سماں باندھا ہے۔ وہاں بجائے محاکات کے تخیل سے کام لیا ہے۔ مگر میر حسن نے بجائے تخیل کے محاکات سے کام لیا ہے اور یہی اس مثنوی کی سب سے بڑی خوبی ہے۔

اس کی زبان فطری سلاست رکھتی ہے۔ منظوم شدہ قصہ کے اجزا بہ لحاظ تناسب خوب ہیں۔ استعارات اور تشبیہات کا استعمال فطری طور پر کیا گیا ہے۔ مبالغہ بے تکا اور بالکل بعید از قیاس نہیں ہے۔ ملک کے رسم و رواج بڑی خوبی کے ساتھ حوالۂ قلم کئے گئے ہیں۔ امور ذہنیہ اور واردات قلبیہ بہت راستی سے بیان کئے گئے ہیں۔ قصہ کا ہر جزو کوئی نہ کوئی اخلاقی یا تمدنی نتیجہ پیش کرتا ہے۔ یہ مثنوی بہت مربوط، مسلسل اور ہموار ہے۔ حامد اللہ افسر صاحب نے لکھا ہے کہ اس مثنوی کا سب سے بڑا عیب اس کا طول ہے۔ مگر ہم ان سے اتفاق نہیں کرتے۔ یہ خیال صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ یوں کہ اس کا طول قاری پر بالکل گراں نہیں گذرتا۔ دوسرے قصے کا پلاٹ اور مختلف بیانات اس طول کے بغیر کس طرح ادا ہو سکتے تھے؟

مثنوی گلزار نسیم کی تمام تر بنیاد خیال ہندی، رعایت لفظی اور

تشبیہ اور استعارہ پر رکھی گئی ہے اس لئے وہ نیچرل طریقہ سے بالکل دور جا پڑی ہے۔ مثلاً ایک صحرا کا منظر یوں دکھاتے ہیں:-

اک جنگل میں جا پڑا جہاں گرد　　صحرائے عدم بھی تھا جہاں گرد
سایہ کو پتہ نہ تھا شجر کا　　عنقا تھا نام جانور کا
مرغان ہوا تھے بھولے راہی　　نقش کف پا تھے ریگ ماہی

ان تمام اشعار کو پڑھ کر یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ کسی اصلی سنسان بیابان جنگل کا سماں کھینچ رہے ہیں۔ ہاں ایک خیالی جنگل کا نقشہ البتہ آنکھوں میں گھوم جاتا ہے۔ اس طرح کی مثالیں گلزار نسیم میں بکثرت مل سکتی ہیں۔ مگر اس کے خلاف میرحسن نے جہاں بھی مناظر فطرت کی عکاسی کی ہے کمال کر دکھایا ہے۔ بالکل وہی نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ ایک سنسان جنگل کا سماں چاندنی رات میں یوں کھینچتے ہیں:-

وہ سنسان جنگل وہ نور قمر　　وہ براق سا ہر طرف دشت و در
وہ اجلا سا میدان چمکتی سی ریت　　اگا نور سے چاندناروں کا کھیت
درختوں کے پتے چمکتے ہوئے　　خس و خار سارے دمکتے ہوئے
درختوں سے چھن چھن کے مہ کا ظہور　　گرے جیسے چھلنی سے چھن چھن کے نور
نظر جو کہ پڑتی تھی بوٹی جڑی　　سو اک عالم شوق میں تھی کھڑی
درختوں میں لگ لگ کے باد صبا　　لگی بولنے وجد میں واہ وا

بھلا کون انکار کر سکتا ہے کہ یہ شعر ایک چاندنی رات میں ایک سنسان میدان کا سماں پیش نظر نہیں کرتے۔ میرحسن کے یہاں اس قسم کی فطری مناظر کی عکاسی و مصوری کی مثالیں اور بھی موجود ہیں۔

گلزار نسیم میں بکاؤلی کی بارہ دری کی تصویر یوں پیش کی گئی ہے

گول اس کے ستون ساعد حور　　چلمن مژگان چشم مخمور
دکھلاتا تھا وہ مکان جادو　　محراب سے در سے چشم و ابرو

لیکن میرحسن اسی طرح بدر منیر کے مکان کا نقشہ کس فطری اسلوب میں کھینچتے ہیں۔

عمارت کی خوبی دروں کی وہ شان　　لگے جس میں زربفت کے سائبان
چھتیں اور پردے بندھے زرنگار　　دروں پر کھڑی دست بستہ بہار
کوئی در سے در پہ اٹکا ہوا　　کوئی زہ پہ خوبی سے لٹکا ہوا

. . . .

دئیے ہر طرف آئینے جو لگا　　گیا چوگنا لطف اس میں سما

غرض ہر جگہ میرحسن کے یہاں اصلی جذبات نگاری ہے اور نسیم نے ہر جگہ لفظی صناعی اور خیال بندی سے کام لیا ہے۔ بکاؤلی کی حالت کا سماں جب کہ وہ تاج الملوک کے ہجر کی آگ میں جلتی ہے۔ یوں دکھایا ہے

کرتی تھی بھوک پیاس بس میں　　آنسو پیتی تھی کھا کے قسمیں۔
جامہ سے جو زندگی کے تھی تنگ　　کپڑوں کے عوض بدلتی تھی رنگ
صورت میں خیال رہ گئی وہ　　ہیئت میں مثال رہ گئی وہ

ظاہر ہے کہ ان اشعار میں شاعرانہ نازک خیالی البتہ ہے اور لفظی تصویر بنا کر دکھایا گیا ہے۔ لیکن اس کی بنیاد تشبیہی ہے۔ ہمیں مولانا حالی کا قول یاد آتا ہے کہ ان اشعار کا کوئی مطلب ہی نہیں ہے اصل جذبات کی مصوری کا یہ طریقہ نہیں بلکہ اس کا طریقہ وہ ہے جو میرحسن نے بدر منیر کی بے قراری کا سماں دکھانے میں اختیار کیا ہے۔ بدر منیر بھی اس وقت بے نظیر کے ہجر میں مبتلا ہے۔

خفا زندگانی سے ہونے لگی　　بہانے سے جا جا کے سونے لگی
ٹھہرنے لگا جان میں اضطراب　　لگی دیکھنے وحشت آلودہ خواب
نہ اگلا سا ہنسنا نہ وہ بولنا　　نہ کھانا نہ پینا نہ لب کھولنا
جہاں بیٹھنا پھر نہ اٹھنا اسے　　محبت میں دن رات گھلنا اسے
کسی نے جو کچھ بات کی بات کی　　یہ دن کی جو پوچھی کہی رات کی

غرض یہ کہ گلزار نسیم میں کہیں بھی فطری اسلوب اختیار نہیں کیا گیا ہے۔ البتہ طرز ادا نہایت صاف رواں اور شستہ ہے۔ بندش چست ہے۔ اور ہر موقع پر ہمواری پائی جاتی ہے۔ رعایت لفظی، خیال بندی اور استعارہ طرازی کے جلوے ہر جگہ نظر آتے ہیں اور ان تمام چیزوں میں لطافت پیدا کی گئی ہے۔ مثلاً

گو باغ کے پاسبان غضب تھے　　خوابیدہ برنگ سبزہ سب تھے

گل لے کے بڑھا ایاغ بر کف　　چوری سے چلا چراغ بر کف

مجنوں ہو اگر تو فصد لیجے　　سایہ ہو تو دور دھوپ کیجے

جعفر بلگرامی نے لکھا ہے کہ رعایت لفظی کو صرف دو شخصوں نے حسن کے ساتھ برتا ہے ایک نسیم اور دوسرے صبا نے۔ اس میں شک

نہیں کہ نسیم نے رعایت لفظی سے مثنوی میں جان ڈال دی ہے۔ گر میرا خیال یہ ہے کہ بعض جگہ اس رعایت لفظی کی وجہ سے مطلب خبط ہو کر رہ جاتا ہے۔ گلزارِ نسیم میں اس اختصار سے کام لیا گیا ہے کہ کسی چیز کی مکمل تصویر سامنے نہیں آتی۔

مثنوی شاعری کی ایک ایسی صنف ہے جس میں عشق و محبت کے جذبات بھی لائے جاتے ہیں۔ قدرتی مناظر کے نقشے بھی پیش نظر کئے جاتے ہیں۔ نوحہ و ماتم بھی ہوتا ہے۔ شادی بیاہ کے موقعے بھی پیش آجاتے ہیں۔ غرض یہ کہ اس میں ہر صنف سخن یعنی غزل، مرثیہ، قصیدہ، واقعہ نگاری اور فطری مناظر کی عکاسی، سوشل اور تاریخی حالات اور قومی و شخصی اعتقادات اور کردار کا بھی ذکر کیا جاتا ہے۔ لیکن وہ ایک مسلسل نظم ہوتی ہے۔ اس کا ایک شعر دوسرے شعر سے زنجیر کی کڑیوں کی طرح مربوط ہوتا ہے جس طرح زنجیر کی ایک کڑی کے نکل جانے سے سلسلہ بالکل منقطع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر ایک شعر بھی غیر مربوط ہو جائے تو مثنوی کے تسلسل اور ربط میں فرق آجاتا ہے۔ اور مثنوی کی ساری خوبیاں زائل ہو جاتی ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ ایک شعر کے بعد اس کی ضرورت نہ پڑے کہ کچھ الفاظ قاری اپنی طرف سے بڑھائے تب پورا مطلب واضح ہو یعنی بغیر کچھ اپنی طرف سے ملائے ہوئے مطلب خبط رہے۔ نسیم نے اس کا خیال نہیں رکھا اور غالباً اس کی وجہ وہ اختصار ہے۔ جو کہا جاتا ہے کہ انہوں نے آتش کی ہدایت کے بموجب روا رکھا اور جسے ان کی مثنوی کی خوبی بتایا جاتا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ اختصار بالکل ایسا ہی ہے کہ لیمپ کی روشنی کو کم کرنے کے لئے اس کی بتی کو نیچا کرتے کرتے اتنا نیچا کر دیا جائے کہ لیمپ بالکل گل ہو جائے اور روشنی بالکل ختم ہو جائے۔ مولانا حالی نے ایک جگہ یہی اعتراض کیا ہے۔

آنا تھا شکارگاہ سے شاہ نظارہ کیا پدر نے ناگاہ

ظاہر انہیں معلوم ہوتا کہ شاہ اور پدر ایک ہی شخص ہے۔ حالانکہ ہے ایک ہی شخص۔ مولانا موصوف کی رائے میں یہ مصرعہ یوں ہونا چاہئے تھا۔

ع بیٹے پہ پڑی نگاہ ناگاہ۔

گر اب بعض ایڈیشن ایسے بھی ملتے ہیں جن میں یہ مصرع بدل دیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ اعتراض زندہ نہیں رہا۔ لیکن بالکل ایسا ہی ایک اعتراض ہم کرتے ہیں۔ جب بکاؤلی کی ماں اس کو دیکھنے آتی ہے تو اُس کا بیان یوں کیا ہے۔

واں آئی پری کی ماں جمیلہ اس سمت سے پہنچی یہ عقیلہ

یوں کہنے لگی بکاؤلی سے شکوہ کرنے لگی پری سے

صاف نہیں معلوم ہوتا کہ جمیلہ بکاؤلی کی ماں تھی یا پری کی ماں تھی حالانکہ مطلب پری سے بکاؤلی ہی ہے۔ مگر کہنے کا طرز کچھ ایسا ہے کہ پری اور بکاؤلی دو مختلف سے اشخاص قصہ معلوم ہوتے ہیں یعنی بکاؤلی سے کچھ کہا گیا ہے اور پری سے شکوہ کیا گیا ہے۔ اسی طرح نسیم نے اس واقعے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کہ تاج الملوک کے دیکھنے سے زین الملوک کی قسمت میں اندھا ہونا لکھا تھا۔ اس کا بیان یوں کیا ہے۔

چشمک تھی نصیب اس پدر کو نور آنکھ کا کہتے ہیں پسر کو

اس طرح دلبر بیسوا کے جوئے کے سامان کا ذکر اس طرح کیا ہے۔

بلی کا سر چراغدان تھا چوہا پانسہ کا پاسباں تھا،

اگر پورا قصہ پہلے سے نامعلوم ہو تو ان دونوں اشعار کا مطلب بالکل سمجھ میں نہیں آسکتا۔ ہاں بعض جگہ اس اختصار نے چار چاند لگا دیئے ہیں۔ بڑے بڑے واقعات کو چند الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ مثلاً فرماتے ہیں:۔

اس پیڑ سے لے کے راہ پکڑی پتے، پھل پھول گوند لکڑی

ان تمام باتوں پر نظر کرتے ہوئے ہمیں نسیم کے بارے میں یہ کہنا زیادہ صحیح معلوم ہوتا ہے کہ "پستی اش بغایت پست و بلندش بغایت بلند" اور واقعی میر کے کلام کی بہ نسبت یہ مقولہ نسیم کی اس مثنوی پر اچھی طرح چسپاں ہوتا ہے۔

میر حسن کی مثنوی کو جو شرف حاصل ہے وہ اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے چھوٹے چھوٹے واقعات کو تفصیل کے ساتھ ایک ماہر فن کی حیثیت سے بیان کیا ہے۔ لیکن بعض بعض جگہ میر حسن اور نسیم دونوں نے انتہائی عریانی سے کام لیا ہے اور وہ مخرب اخلاق اور حیا سوز نظارے پیش کئے ہیں جن کو وہ اگر اشارۃً بیان کر دیتے تو مثنوی کے ربط میں کوئی فرق نہ پڑتا بلکہ کچھ حسن میں اضافہ ہی ہو جاتا۔ ہاں ایسی ہی مثالیں فسانۂ عجائب اور باغ و بہار میں بھی ملتی ہیں۔

گلزار نسیم کو پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مصنف نے خواہ مخواہ قصہ کو طول دینے کے لئے بڑھایا ہے۔ کیونکہ جگہ جگہ یہ خیال ہوتا ہے کہ مثنوی یہاں ختم ہو گئی۔ یہ بھی اس کے ربط کی خرابی ہے۔

مثنوی میں اس کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ جو کچھ بھی کہا جائے

کہیں، لیکن اس کی تردید نہ کردی جائے اور واقعات کو جہاں تک ہو سکے۔ اصلی رنگ میں دکھایا جائے۔ لیکن ہمیں ان دونوں مثنویوں میں ایسی مثالیں ملتی ہیں جو ان مثنویوں پر زبردست اعتراضات کی صورت میں نازل ہوتی رہی ہیں اور ہوتی رہیں گی کیونکہ کوئی شخص ان کا معقول جواب دے کر معترض کو مطمئن نہیں کرسکتا۔ مثلاً نسیم نے ایک جگہ لکھا ہے۔

خالق نے دیے تھے چار فرزند — دانا۔ عاقل۔ ذکی۔ خردمند۔

گویا زمانے بھر کی عقل اور اس کی ساری قسمیں تو ان چاروں بھائیوں کے حصے میں آئی ہیں مگر حرکتیں ان چاروں کی ایسی دکھائی ہیں جس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ عقل سے ان چاروں کو دور کا بھی واسطہ نہیں تھا اور چاروں کے چاروں پرلے درجے کے احمق تھے۔ ہر مثنوی میں چند اہم کیریکٹر بھی ہوتے ہیں۔ کردارنگاری میں خاص ہوشیاری کی ضرورت ہے۔ کردار کا نباہنا بڑا ٹیڑھا کام ہے نسیم جیسا ہوشیار شخص دھوکا کھا گیا ہے۔

میرحسن نے بھی دو ایک جگہ واقعات کے بیان کرنے میں دھوکا کھایا ہے۔ اگرچہ کردارنگاری میں وہ پورے اُترے ہیں۔ مگر واقعہ نگاری میں روانی و آمد کی رو میں بہہ گئے۔ ایک اعتراض تو بہت قدیم ہے اور مولانا حالی بھی کرچکے ہیں۔ میرحسن فرماتے ہیں۔

وہ گانے کا عالم وہ حسن بتاں — وہ گلشن کی خوبی وہ دن کا سماں
درختوں کی کچھ چھاؤں اور کچھ وہ دھوپ — وہ دھانوں کی سبزی وہ سرسوں کا روپ
لپٹے ہوئے پوستوں پر تمام — روپہلے سنہرے ورق صبح و شام

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سرسوں اور دھان ایک ہی موقع پر کھیتوں میں کیسے موجود تھے۔ کیونکہ اشعار کا صاف مطلب یہ ہے کہ ایک طرف تو سرسوں کھڑی پھول رہی تھی اور دوسری طرف سبز سبز دھان لہرارہے تھے۔ دھان جولائی اگست میں کھیتوں میں ہوتے ہیں۔ اور سرسوں دسمبر سے مارچ تک۔ کیونکہ دھان خریف میں بوئے جاتے ہیں اور سرسوں ربیع میں۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ اس زمانے میں خریف کی فصلیں ربیع کے ساتھ بوئی جاتی ہوں!

دوسرا موقع وہ ہے جبکہ وہ اس سماں کا نظارہ پیش کرتے ہیں۔ جب کہ عیش بائی طوائف بدرمنیر کے بلانے پر باغ میں آتی ہے۔ عیش بائی کی حالت اس وقت یہ تھی۔

وہ خلقت کی گرمی وہ ڈومنی پنا — نشے میں بھبھوکا سا چہرہ بنا
لٹیں منہ پہ چھوٹی ہوئی سربسر — کہ بدلی ہو جوں مہ کے ادھر اُدھر
وہ بن پوچھے ہونٹوں کی مسی غضب — کہ منہ پر تھی گویا قیامت کی شب
فقط کان میں ایک بالا پڑا — کہے تو کہ مقامہ کے ہالہ پڑا
وہ پشواز اگر کی وہ نرگس کے ہار — وہ کمخواب کے بند رومی ازار
بندھا سر پہ جوڑا پڑی زرد شال — کمر کی لچک اور مٹک کی وہ چال
چلی واں سے دامن اُٹھاتی ہوئی — کڑے سے کڑے کو بجاتی ہوئی

اب یہاں ایک ہی سلسلے میں یہ کیسے بیان کردیا کہ لٹیں بھی چھوٹی ہوئی تھیں اور جوڑا بھی بندھا تھا۔ بال بکھرے ہوئے بھی ہوں اور بندھے بھی یہ کیسے ممکن ہے [1]

مگر یہ اعتراضات ان دونوں مثنویوں کی خوبیوں کے مقابلے میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ کیونکہ اس مثنوی (سحرالبیان) کی خوبیاں اتنی ہیں کہ یہ اعتراضات بالکل ہیچ معلوم ہونے لگتے ہیں۔ نسیم کے یہاں ایک آدھ غلطی زبان کی بھی مل ہی جاتی ہے۔ مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں۔

تھا داغ پسر منفرد اس کو — جنتی تھی ہمیشہ دختر اس کو

یہ شعر شرر اور چکبست کے درمیان ایک عرصہ تک معرض بحث میں رہ چکا ہے۔ اس لئے ہم اس کا دوبارہ ذکر کرنا نہیں چاہتے۔ ڈاکٹر محی الدین زور نے ایک جگہ لکھا ہے کہ مثنوی گلزار نسیم کو معرکہ شرر و چکبست نے بہت مشہور کردیا۔ اگرچہ وہ خود اس قدر اہم نہیں تھی۔ مگر ہم کو اس سے بحث نہیں کہ زور کا کہنا صحیح ہے یا غلط لیکن اتنا ضرور کہیں گے کہ یہ سحرالبیان کے مقابلے کی نہیں۔ مگر خوبی زبان اور لفظی صناعی میں اس کا جواب نہیں اور ہم کو بے اختیار آتش کا شعر یاد آجاتا ہے۔

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

اب ہم ان مثنویوں کی اہمیت پر نظر ڈالتے ہیں ان کا درجہ نہ صرف اس لئے بلند ہے کہ ان کی زبان اعلیٰ ہے یا ان کی شاعری جاندار ہے بلکہ ان کی اہمیت اور شہرت کی خاص وجہ یہ ہے کہ یہ دونوں مثنویاں اپنے اپنے زمانے کی عکاسی کرنے میں بھی بے مثل ہیں۔ یہ مثنویاں اپنے اپنے عہد کی مذہبی، اخلاقی اور تمدنی حالت اس قدر تفصیل سے بیان کرتی ہیں کہ ان کے ذریعے سے اس عہد کی تاریخ مرتب کی جاسکتی ہے۔ لوگوں کی اخلاقی و تمدنی حالت کے علاوہ شادی بیاہ اور موت و فاتحہ وغیرہ کی رسوم کا ذکر بخوبی کیا گیا ہے اور ان تمام باتوں پر مکمل روشنی

[1] ہمارے خیال میں یہ اعتراض صحیح نہیں، لٹیں دائیں بائیں بندھے بالوں سے نکل کر یا ڈھیلی ہو کر بھی پیدا ہوسکتی ہیں اور اس کے باوجود پچھلے بالوں کا جوڑا بندھا رہ سکتا ہے۔ ادارہ

ڈالی گئی ہے کہ لوگ کیسی زندگی بسر کرنا پسند کرتے تھے اور ان کے اعتقادات کیا تھے۔ فوق الفطرت کردار بھی جن کا ذکر دونوں مثنویوں میں بدرجۂ اتم موجود ہے خاص اہمیت رکھتے ہیں کیونکہ یہ اس کے شاہد ہیں کہ اس زمانے کے لوگوں کا اعتقاد تھا کہ جادو ٹونے کے ذریعے سے انسان کے افعال واقوال پر قابو حاصل کیا جاسکتا ہے۔ جن وپری کو تو ہم لوگ اب بھی مانتے ہیں۔ مگر اس عہد میں عام خیال یہ تھا کہ دیو، جن اور پری انسان کی زندگی میں حصّہ لے سکتے ہیں اور ان کا طرز زندگی اور حرکات و اقوال کا بہ نظر غور مطالعہ کرتے ہیں اس نقطۂ نظر سے ان دونوں مثنویوں کی اہمیت بالکل وہی ہے جو انگلستان کے مایۂ ناز ڈرامہ نویس شیکسپیئر کے ڈرامے "ساون رین کا سپنا" کی ہے

پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی ایک خاص بات پر اور بھی روشنی ڈالتی ہے وہ یہ کہ ہندوؤں کا اعتقاد اس زمانے میں آواگون یعنی تناسخ کے بارے میں اور بھی پختہ تھا اور دوسرے یہ کہ جس طرح رامائن وغیرہ میں راجہ اندر کا ذکر آیا ہے بالکل اسی طرح اس مثنوی میں بھی کیا گیا ہے۔ بکاؤلی کا دہقان کے گھر میں پیدا ہونا صاف مسئلہ تناسخ پر روشنی ڈالتا ہے۔ اس سے ایک اور ادبی نکتہ بھی حل ہوسکتا ہے۔ وہ یہ کہ غالباً شرر نے یہ اعتراض کیا ہے کہ مثنوی گلزار نسیم آتش نے لکھی اور کسی خاص وجہ سے نسیم کو دے دی مگر ناظرین خود بھی خیال کرسکتے ہیں آتش نہ تو راجہ اندر ہی کا ذکر کرتے اور نہ تناسخ کا ہی مسئلہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے۔

ایک خاص بحث یہ بھی کی جاتی ہے کہ نسیم نے میر حسن کی مثنوی کا جواب لکھا ہے۔ اور پھر یہ بھی کہ کس کی مثنوی بڑھی ہوئی ہے ہم اپنے اس مضمون کو ختم کرنے سے پیشتر اس سوال کو بھی حل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ نسیم نے میر حسن کی مثنوی کو دیکھ کر مثنوی لکھنے اور شہرت پانے کا خیال کیا ہو لیکن چونکہ ان دونوں مثنویوں کی بحریں بھی جدا جدا ہیں اور پھر پلاٹ میں بھی کوئی خاص یگانگت نہیں ہے اس لئے یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ نسیم نے میر حسن کی مثنوی کا جواب لکھا ہے۔

ابو مسلم صدّیقی

احساسِ محبّت

اے دوست یہ ہو جاتی ہے اکثر مری حالت
ہر سمت پھرا کرتا ہوں گھبرایا ہُوا سا
رہتی نہیں افعال پہ اپنے مجھے قدرت
پاتا ہوں دلِ زار کو مرجھایا ہُوا سا
کھلانے لگے غنچہ کوئی جیسے چٹک کر
اور جانبِ گلزار خزاں آئے لپک کر

یہ حسرتِ بے تاب کہیں درد نہ بن جائے
اور درد جو ہے دل ہی نہ رہ جائے یہ ہو کر
خندہ کہیں گھٹ کر نفسِ سرد نہ بن جائے
حالت ہے وہی راحت و آرام کو کھو کر
جیسے کہ فنا ہو کسی زردار کی دولت
اور درد سے اندوہ میں ڈھل جائے مسرّت

ہر چند توجہ ہے مری اس کے سبب پر
معلوم نہیں ہوتا پریشانی کا باعث
ہاں سرد سا اک قطرۂ خاموش ٹپک کر
کچھ اور بھی ہو جاتا ہے حیرانی کا باعث

فطرس نقوی

تخلیق شعر

عالمِ حسرت پرستی دیکھ کر — حادثاتِ راہِ ہستی دیکھ کر
چوٹ لگتی ہے رگِ احساس پہ — یاس آجاتی ہے غالب آس پر
پیدا کر دیتی ہے اک موجِ ملال — دل کی تہ میں ہلکا ہلکا سا اُبال
جاگتا ہے ذہن میں اک ارتعاش — ہوتا ہے آئینۂ دل پاش پاش
جوش میں آتا ہے سیلابِ جنوں — اور اُبلنے لگتا ہے رگ رگ میں خوں
چاک ہو جاتا ہے دامن صبر کا — ٹوٹ جاتا ہے تسلسل جبر کا

زیرِ احساسِ غم و اُمید و بیم — تلملا کر نُطق کا سیلِ عظیم
موج زن ہوتا ہے بحرِ راز میں — ایک نکتہ آفریں انداز میں
ایسے عالم میں جو ہو جاتی ہے بات — ہوتی ہے آئینہ دارِ حادثات
نقش ہوتی ہے مرے دن رات کا — میرے احساسات اور جذبات کا

باعثِ تشہیر بن جاتی ہے وہ
اور جہاں میں شعر کہلاتی ہے وہ

باقیؔ صدیقی

مذاق

سردیوں کی ایک چمکیلی دوپہر تھی ——— اور ناڈیا کے ہونٹوں پر سیمیں کر جم رہی تھی۔ اُس نے میرا ہاتھ تھام رکھا تھا۔ ہم ایک بلند پہاڑی پر کھڑے تھے۔ ہمارے سامنے ایک شفاف برفانی ڈھلوان تھی جو آئینے کی طرح سورج کی شعاعوں کو منعکس کر رہی تھی اور ہمارے ساتھ ہی سرخ برفانی گاڑی پڑی ہوئی تھی۔ "آؤ نیچے پھسلیں ناڈیا!" میں نے اُسے یقین دلاتے ہوئے کہا۔ "چوٹ کا ذرا بھی ڈر نہیں"۔ لیکن ناڈیا ڈرتی تھی، خوشنما ڈھلوان اُسے ایک خطرناک، گہری ختم نہ ہونے والی خلا، معلوم ہوتی تھی جب وہ نیچے دیکھتی تو ایک لمبا سانس لے کر پیچھے ہٹ جاتی۔ ابھی میں نے اُسے گاڑی میں بیٹھنے کو کہا ہی تھا کہ مجھے خیال گذرا کیا تو وہ مخبوط الحواس ہو جائے گی اور یا مر جائے گی۔

"دیکھو نا" میں نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ "تمہیں ڈرنا نہیں چاہیئے۔ . . . یہ بڑی کمزوری ہے . . . یہ شرم کی بات ہے۔"

بالآخر وہ مان تو گئی۔ لیکن اُس کے چہرے پر مردنی چھا گئی۔

میں نے اُسے گاڑی میں بٹھایا ——— زرد اور کانپتی ہوئی وہ خوب مضبوطی سے میرے ہاتھ کو پکڑ کر بیٹھ گئی۔ گاڑی گولی کی طرح نیچے چلی۔ ہوا جال میں پھنسے ہوئے وحشی جانور کی طرح چیختی اور تڑپتی ہوئی ہمارے کانوں کے پاس سے گذرنے لگی اور ہمارے منہ پر طمانچے مارنے لگی۔ اُس نے غصہ میں اپنے جناتی ہاتھوں سے تالیاں بجانی شروع کر دیں جیسے وہ چاہتی تھی کہ ہمارے سروں کو ہمارے شانوں سے اُکھیڑ لے۔ اس کے دباؤ سے سانس لینا مشکل ہو گیا ——— ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خود شیطان ہمیں اپنے آہنی پنجوں میں پکڑے گرجتا برستا کسی جہنمی گہرائی میں لئے جا رہا ہے ——— ارد گرد کی تمام چیزیں زور سے بہتی ہوئی سیاہ طوفانی ندی کی طرح معلوم ہوتی تھیں ——— خیال ہوتا تھا کہ ہم ابھی تباہ ہو جائیں گے۔

"مجھے تم سے محبت ہے ناڈیا!" میں نے بمشکل دھیمی آواز میں کہا گاڑی کی رفتار کم سے کم تر ہوتی گئی، ہوا کا شور دھیما پڑ گیا۔ اور آخر کار ہم سطح زمین تک پہنچ گئے ——— اور ناڈیا کو دیکھو تو گویا مردہ تھی۔ اُس کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ بمشکل سانس لے رہی تھی۔ میں نے اُسے کھڑا ہونے میں مدد دی۔

"میں پھر کبھی پہاڑی پر سے نہ پھسلوں گی۔" اُس نے اپنی نمناک آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اُف! میں تو مر ہی گئی تھی"۔

تھوڑی دیر میں اُس نے اپنی حالت کو درست کر لیا اور استفسارانہ انداز میں میری طرف دیکھنے لگی۔ "کیا واقعی وہ الفاظ میں نے کہے تھے، یا طوفانی ہوا نے اُسے اِس خوش فہمی میں مبتلا کر دیا تھا، وہ تھوڑی دیر بے چینی سے ٹہلتی رہی۔ یہ معمہ اُسے چین نہیں لینے دیتا تھا۔ وہ الفاظ میں نے کہے تھے یا نہیں ——— ہاں ——— نہیں ——— ہاں ——— نہیں ——— ہاں ——— یہ غرور و ناز کا معاملہ تھا۔ یہ وقار کا معاملہ تھا۔ زندگی اور موت کا معاملہ تھا ——— غرض کہ بہت اہم، دنیا کا اہم ترین معاملہ تھا۔ ناڈیا بے صبری سے میرے مُنہ کی طرف دیکھتی رہی۔ گویا میں کچھ کہنے والا تھا۔ اُس کے چہرے پر ایک رنگ آتا ایک جاتا۔ وہ ایک کشمکش میں مبتلا تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن اُس کے پاس لفظ نہیں تھے۔

"آؤ . . ." اُس نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ "ایک دفعہ پھر پھسلیں"۔

ہم اُلٹے پاؤں پہاڑی پر چڑھے۔ میں نے کانپتی ہوئی زرد ناڈیا کو گاڑی میں بٹھایا جب ہوا کا شور بہت بڑھ گیا تو میں نے آہستہ سے کہا "مجھے تم سے محبت ہے ناڈیا"۔

گاڑی ٹھیری ——— ناڈیا نے ایک اُچٹتی ہوئی نگاہ اس پہاڑی پر ڈالی اور پھر غور سے میرے چہرے کو دیکھا ——— میری غیر محسوس آواز کو سننے کی کوشش کی ——— اس کے غمزدہ اور احساسات سے خالی چہرے پر ہر شخص یہ لکھا ہوا پڑھ سکتا تھا" اس کا مطلب کیا ہے؟ آخر کون وہ الفاظ کہتا ہے؟ کیا وہی جس پر مجھے شک ہے؟ یا یہ میری خوش فہمی ہے" اس غیر یقینی بات نے اُسے تھکا دیا۔ وہ تمام صبر کھو بیٹھی ——— آہ غریب لڑکی! ایک سیمیں چمکیلا آنسو اس کی دائیں آنکھ سے جھانک رہا تھا۔

"گھر نہ چلیں؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے . . . مجھے پھسلنا پسند ہے" وہ کہنے لگی۔ "ایک دفعہ

پھر ۔ ۔ ۔ ۔"

اُسے پھسلنا پسند تھا، لیکن پھر بھی جب وہ گاڑی میں بیٹھی تو پہلے کی طرح زرد، کانپتی ہوئی اور سانس لینے کے ناقابل تھی۔ ہم تیسری دفعہ چلے مجھے محسوس ہوا کہ وہ میرے ہونٹوں کو دیکھ رہی ہے۔ میں نے مُنہ پر رومال ڈال لیا۔ اور جب ہم پہاڑی کے درمیان پہنچے میں یہ الفاظ کہنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔ "مجھے تم سے محبت ہے ناڈیا۔"

اور راز پہلے کی طرح راز ہی رہا۔ ناڈیا خاموش خیالات کے بے پایاں سمندر میں ڈوب گئی —— میں نے اُسے گھر پہنچا دیا۔

دوسرے دن مجھے رقعہ ملا" اگر آج پہاڑی کی طرف جاؤ تو مجھے بھی لیتے جانا" ن"

اور اُس دن سے ہر روز ہم پہاڑی پر جاتے —— پھسلتے اور جب میں درمیان میں پہنچتا تو آہستہ سے کہتا" مجھے تم سے محبت ہے ناڈیا" ناڈیا کو یہ فقرہ سنتے ہی نشہ سا ہو جاتا —— بلکہ اُسی طرح جیسے لوگوں کو شراب پینے سے ہو جاتا ہے —— یہ سچ ہے کہ پھسلتے وقت اُسے پہلے کی طرح تکلیف ہوتی تھی۔ لیکن محبت بھرے الفاظ —— وہ الفاظ جو پہلے کی طرح ایک راز اور معمہ تھے —— اُسے بہت کچھ برداشت کر لینے پر مجبور کر لیتے تھے۔ ہم دونو —— ہوا اور میں پہلے کی طرح مشتبہ تھے —— کون اُس سے محبت کرتا تھا وہ یہ نہ جانتی تھی اور بظاہر نہ جاننا چاہتی تھی۔

ایک دن ایسا ہوا کہ میں پہلے چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد ناڈیا بھی آ گئی اور اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا لیکن مجھے نہ پایا۔ پھر چپکے سے گاڑی میں بیٹھ گئی۔ گاڑی نیچے چلی۔ میں نہیں جانتا کہ اس دفعہ اُس نے وہ الفاظ سُنے یا نہیں۔ میں نے اُسے تھکے ہوئے گاڑی سے نکلتے دیکھا۔ اُس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ خود بھی فیصلہ نہ کر سکی کہ اُس نے وہ فقرہ سنا تھا یا نہیں۔

لیکن اب مارچ کا مہینہ آ پہنچا تھا۔ دھوپ تیز اور گرم ہونے لگی تھی اور ہماری برف کی پہاڑی نے پہلے چمک کھوئی اور آخر کار گھِس کر گئی —— ہم نے پھسلنا چھوڑ دیا۔

غریب ناڈیا! اب وہ الفاظ کیسے سُنتی؟ کیونکہ کہنے والا کوئی نہ رہا تھا۔ ہوا —— بند ہو گئی تھی۔ اور میں کچھ عرصہ کے لئے یا شاید ہمیشہ کے لئے پیٹرز برگ جا رہا تھا۔

یہ میرے جانے سے دو دن پہلے کی بات ہے —— میں ایک چھوٹے سے باغیچے میں جو ناڈیا کے گھر سے ملحق تھا، بیٹھا ہوا تھا۔ ابھی خاصی خنکی موجود تھی کھاد کے ڈھیر پر تھوڑی سی برف پڑی ہوئی تھی۔ مردہ درخت بھوتوں کی طرح کھڑے پہرہ دے رہے تھے —— دھیمی دھیمی خوشبو ملکۂ بہار کی آمد آمد کی خبر دیتی تھی —— اور شاہ بلوط کے ایک بلند درخت پر بیٹھی شاما خوشی کا نغمہ الاپ رہی تھی۔ میں نے ناڈیا کے گھر کی باڑھ میں سے جھانکا۔ وہ ایک کوچ پر بیٹھی آسمان کو تک رہی تھی۔ بادِ بہاری اُس کے دامن کے ساتھ اٹھکیلیاں کر کے اُسے برفانی پہاڑی کی ہوا کی یاد دلا رہی تھی۔ اس کا چہرہ زرد سے زرد تر ہوتا گیا۔ حزن و ملال کے آثار اُس کے چہرے پر نمایاں ہو گئے۔ ایک موتی سا آنسو رخسار پر سے ڈھلک گیا۔ اُس نے اپنے بازو پھیلا دیئے۔ گویا ہوا سے التجا کر رہی ہو کہ ایک دفعہ پھر وہی فقرہ کہے۔

میں نے آہستہ سے دھیمی آواز میں کہا" مجھے تم سے محبت ہے ناڈیا"

اُس کے چہرے پر انقلاب آ گیا۔ خوشی کے مارے اُس کی چیخ نکل گئی۔ وہ مسکرانے لگی۔ اُس کے رخساروں پر خوشی کھیلنے لگی۔ اُس نے ہوا کو اپنے بازوؤں میں دبا لیا۔

میں بستر بند کرنے چلا گیا۔

اس بات کو عرصہ ہو چکا ہے۔ اب ناڈیا کی شادی بھی ہو گئی ہے اُس کی شادی ہوئی —— اُس کی مرضی سے یا اُس کی مرضی کے خلاف یہ دوسری بات ہے۔ اب وہ تین بچوں کی ماں ہے۔

کبھی کسی بیتے زمانے میں برفانی پہاڑی سے پھسلتے وقت ہوا ایک فقرہ کہا کرتی تھی" مجھے تم سے محبت ہے ناڈیا"۔ وہ یہ بھول نہیں گئی یہ اُس کی زندگی کی خوشنما اور دلچسپ ترین یادگار ہے۔

لیکن اب جبکہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ یہ نہیں سمجھ سکتا کہ میں کیوں وہ الفاظ کہا کرتا تھا۔ آخر اس مذاق کا مطلب کیا تھا؟

"چیخوف"

نواز کہستانی

غزل

کچھ عجب حال ہے مرے جی کا
دیکھ کر اُس کا صندلی ٹیکا

زندگی تجھ سے چھوٹ کر پیارے
ایک جنجال ہے مرے جی کا

بزم میں اس طرح وہ در آئے
شمع کا رنگ پڑ گیا پھیکا

اے پپیہے! تجھے خدا کی قسم
نام برسات میں نہ لے پی کا

مہرباں تم جو تھے تو گردشِ چرخ
بال میرا نہ کر سکی بیکا

کسی صورت نہ کام گار ہوا
بخت کو اپنے عمر بھر چھیکا

اہلِ عشرت ادھر نہ آئیں جلیل
عشق ہے سر بہ سر زیاں جی کا

جلیل قدوائی

نفرت

اب میں اُس بھینگے کو یاد کر کے نہ تو دانت پیستا ہُوں اور نہ مٹھیاں بھینچتا ہُوں۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ اُس کا طرزِ عمل بالکل فطری تھا اور حالات کے عین مطابق!

میں دہلی سے بمبئی جارہا تھا۔ بھوپال کے قریب ایک نسبتاً چھوٹے اسٹیشن پر کسی خاص ضرورت سے ریل رُکی۔ میں گاڑی سے اُتر کر پلیٹ فارم پر ٹہلتے ٹہلتے ذرا دور نکل گیا۔ اتنے میں گارڈ نے سیٹی دی اور ریل یکایک چل پڑی۔ جس سمت کو گاڑی جانے والی تھی خوش قسمتی سے میں اُسی طرف ٹہلتا ہُوا آگے نکل گیا تھا۔ اگر کہیں مخالف سمت میں نکل جاتا تو یقیناً گاڑی کا ہاتھ آنا ناممکن ہوجاتا۔ خیر جُونہی میں نے سیٹی کی آواز سُنی، بے تحاشا بھاگا۔ یہ کمبخت فرنٹیر میل تھی۔ ابھی گاڑی پلیٹ فارم ہی پر تھی کہ فرّاٹے بھرنے لگی۔ میں نے دل میں سوچا کہ ایسے میں اپنے ڈبّے کی تلاش بے سُود ہے جو ڈبّہ سامنے آجائے اُسی میں گھس جاؤ۔ لمحہ بھر گاڑی کے ساتھ بھاگ کر ایک کھڑکی کے دستے پر جھپٹا مارا اور غپ سے اندر داخل ہوگیا ـــــ یہ ملازموں کا ڈبّہ تھا۔

جب ذرا گھبراہٹ دُور ہوئی اور سانس پیٹ میں سمانے لگا۔ تو مُڑ کر ڈبّے کا جائزہ لیا۔ اس میں صرف ایک سیٹ تھی۔ ادھر سے اُدھر تک چپڑاسیوں اور اردلیوں کی وضع کے چار پانچ آدمی بیٹھے ہُوئے تھے جی چاہا میں بھی تھوڑی دیر بیٹھ رہوں۔ سیٹ کے پرے سرے پر بہت سی جگہ خالی تھی۔ میرے قریب جو شخص بیٹھا تھا وہ ایک نوعمر لڑکا تھا اور بھینگا تھا۔ میں نے تحکمانہ لہجے میں اُس سے کہا "تم اُدھر بیٹھ جاؤ"۔

اُس نے اپنی ترچھی نظر سے پہلے مجھے دیکھا، پھر اُس خالی جگہ کو۔ مگر بدستور اپنی جگہ پر بیٹھا رہا۔ وہ میرے تحکمانہ انداز سے قطعی مرعوب نہ ہُوا۔

میں نے پھر کہا۔ "ارے بھائی ذرا اُدھر بیٹھ جاؤ نا"۔

"تم کیوں نہیں بیٹھ جاتے وہاں جا کے"۔ اُس نے نہایت کھرے پن کے ساتھ جواب دیا۔ مجھے اُس کی بدتمیزی پر بے حد غصہ آیا۔ مگر کیا کرتا۔ مجبور تھا۔ دھینگا مشتی تو میرے بس کا کام تھا نہیں۔

"آخر حرج کیا ہے اگر تم ذرا دیر کے لئے وہاں بیٹھ جاؤ۔ میں تو صرف اگلے اسٹیشن تک یہاں بیٹھوں گا"۔ یہ کہہ کر میں نے باقی آدمیوں کی طرف دیکھا گویا میں اُن کی ہمدردی کا طالب ہوں۔ اور یہ اُمید رکھتا ہوں کہ وہ اپنے بیہودہ ساتھی کو اُس کی نامعقول ضد پر بُرا بھلا کہیں گے۔ مگر وہ چُپ چاپ بیٹھے رہے۔ بے تعلقی کے انداز سے! اُنہوں نے میرے ساتھ کوئی ہمدردی نہ کی۔

"تم شاید یہ سمجھ رہے ہو کہ میں بغیر ٹکٹ کے سفر کر رہا ہُوں۔ میرے پاس سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ ہے"۔ میں نے اُن سب سے مخاطب ہو کر کہا لیکن اُنہوں نے اس اطلاع کو غیر ضروری خیال کیا اور جواب دینے کی زحمت بھی گوارا نہ کی۔

میں انتہائی نفرت اور غصے کے عالم میں اُن کی طرف پشت کر کے کھڑا ہوگیا اور پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر گاڑی کے باہر سنٹرل انڈیا کے جنگلوں کو دیکھنے لگا۔

اس دو کوڑی کے آدمی نے میری جو توہین کی تھی۔ وہ یقیناً ناقابلِ برداشت تھی۔ لیکن اُس وقت میرے ذہن میں ریل کے یکایک چھوٹ جانے کا واقعہ اس قدر تازہ تھا کہ میں زیادہ دیر تک اس پر غور نہ کر سکا۔

"اگر میں اس ڈبّہ تک نہ پہنچ سکتا اور گاڑی نکل جاتی تو کیسی مصیبت کا سامنا ہوتا"۔ "اگر میرا پاؤں پھسل جاتا!" "اگر گاڑی پر چڑھتے وقت میں گر پڑتا"۔ یہ اور اسی قسم کے خیالات اُس وقت میرے دماغ میں بھرے ہُوئے تھے۔ مگر جب سفر ختم ہوگیا، اور میں بمبئی پہنچ گیا۔ تو مجھے بھینگے کی بدتمیزی کو یاد کر کے بہت غصہ آیا۔ اور پھر اُس کے بعد مدتوں اس تلخ یاد نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ اکثر اُس بھینگے کا خیال آجاتا اور اُس وقت غصے کے مارے میرا بُرا حال ہوتا۔ میں دانت پیستا، مٹھیاں بھینچتا، اور دل ہی دل میں خواہش

کرتا کہ کہیں، کسی طرح، وہ بھینگا مل جائے اور میں طمانچوں، گھونسوں اور لاتوں سے اُس کی ایسی تواضع کروں۔ کہ عمر بھر نہ بھولے۔ برسوں یہ حالت رہی لیکن اب ـــــ

اب یہ حالت ہے کہ روزانہ صبح کو جب اپنے خداوند نعمت عالی جناب خان بہادر صاحب کو دور سے موٹر میں آتا ہوا دیکھتا ہوں۔ تو منہ ہی منہ میں دس بیس گالیاں دیتا ہوں۔ اس خاموش خیر مقدم کے بعد کار کی کھڑکی کھولتا ہوں۔ اور چہرے پر اطاعت اور مسکینی کے آثار پیدا کر کے کہتا ہوں۔ "آداب عرض سرکار!" اور پھر جونہی اُن کی پیٹھ مڑتی ہے میرے چہرہ پر سے اطاعت اور مسکینی کے یہ آثار غائب ہو جاتے ہیں اور نفرت ہی نفرت رہ جاتی ہے۔ غرضکہ مجھے ان سے بے انتہا نفرت ہے وہ نفرت جو آقا اور خادم کے درمیان لازمی طور پر پائی جاتی ہے۔ جو کہیں خوابیدہ ہوتی ہے اور کہیں بیدار، مگر ہوتی ضرور ہے۔ اگر خان بہادر صاحب میری تنخواہ دوگنی بلکہ چوگنی کر دیں تب بھی میں اُن سے نفرت کروں گا۔ میرے پاس ان کے لئے نفرت کے سوا کچھ ہے ہی نہیں جب تک وہ آقا ہیں اور میں خادم، نفرت کی یہ خلیج پاٹی نہیں جا سکتی۔ پھر اُنہیں سے نہیں۔ مجھے ہر اُس شخص سے نفرت ہے جو اُنہیں کی طرح واقع ہوا ہے۔ جب میں ایک اجنبی کو دیکھتا ہوں کہ اس کی توند پھولی ہوئی ہے۔ کلّے چڑھے ہوئے ہیں۔ اور قیمتی لباس پہنے ہُوئے ہے تو میں اُس کے اندر اپنے خان بہادر صاحب کا عکس دیکھتا ہوں۔ اور اُس سے اتنی ہی نفرت کرتا ہوں جتنی خان بہادر صاحب سے کرتا چلا آیا ہُوں۔

پھر اگر دس سال پہلے اُس بھینگے نے میرے ساتھ گستاخی کی تو کیا گناہ کیا؟ اس نے بھی تو اُسی نفرت کا اظہار کیا جو میں زمانہ بھر کے آقاؤں کے خلاف اپنے دل میں لئے پھرتا ہوں۔ اس کا آقا یقیناً کوئی سخت گیر اور خود غرض انگریز یا انگریز نما ہندوستانی ہوگا۔ جس کا عکس اُس نے میرے اندر دیکھا۔ اور پھر کھلم کھلا میری عدول حکمی کر کے اپنے دل کا بخار نکالا۔ حقیقت میں وہ اس پر مجبور تھا اس کے سوا وہ کچھ کر ہی نہ سکتا تھا!!

چنانچہ اب میں اُس بھینگے کو یاد کر کے نہ تو دانت پیستا ہوں اور نہ مٹھیاں بھینچتا ہُوں اب میں سمجھتا ہوں کہ اُس کا طرز عمل بالکل فطری تھا اور حالات کے عین مطابق!!

اختر انصاری

غزل

غم نے چھوڑا دل کو، یا دل بے نیازِ غم ہوا
کیا خبر! پہلے کدھر سے ربط باہم کم ہوا

جب کسی کو سامنے دیکھا یہی عالم ہوا
جیسے ذرّہ نور میں اب ضم ہوا اب ضم ہوا

حسن کی نیرنگیوں کا یہ اثر کیا کم ہوا
جس طرف نظریں اٹھائیں طور کا عالم ہوا

کھینچ لی جیسے کسی نے روح بزمِ عشق سے
دفعتہً پہلو میں جب دل کا تڑپنا کم ہوا

پردے پردے میں نگاہِ ناز نے مارا مجھے
دل کا شیرازہ عجب انداز سے برہم ہوا

ظلم ہے اک دردمندِ عشق کا انجام بھی
وہ پشیماں ہو گئے، یہ ظلم بھی کیا کم ہوا

ہو گئے برباد لاکھوں دل محبت میں مگر
ہائے وہ دل جس کے مٹنے کا انہیں بھی غم ہوا

عالمِ دیوانگی کی کونسی منزل ہے یہ؟
بڑھتی جاتی ہے ہنسی، آنسو بہانا کم ہوا

اس طرح تکمیل کو پہنچا مذاقِ بندگی
سر، زمین و آسماں کا میرے آگے خم ہوا

بزمِ ہستی کو جو دیکھا اُن کی جانب دیکھ کر
ذرّے ذرّے سے نمایاں اک نیا عالم ہوا

اضطرابِ آرزو کو زندگی کہتا ہوں میں
زندگی کیا، اضطرابِ آرزو گر کم ہوا!

جانتے رازِ چمن، اہلِ چمن کیونکر ادیبؔ
مثلِ بو نکلا چمن سے، جو کوئی محرم ہوا

ادیب مالیگانوی

دُنیائے ادب

تازہ ترین رسائل کے اہم مضامین

یہ سلسلہ جو گذشتہ ماہ شروع کیا گیا تھا بہت سے ناظرین کو پسند آیا ہے۔ اگرچہ بعض مخلصین نے لکھا ہے کہ اس طرح تو آپ نفقط دوسرے رسائل کو مشتہر کرتے ہیں۔ ہماری ناقص رائے میں اگر ہم سے یہی ایک خدمت سرانجام پا جائے تو ہماری خوش قسمتی ہوگی لیکن دراصل اس کے علاوہ بھی چند فائدے مقصود ہیں جن کا ذکر پچھلی اشاعت میں آچکا ہے۔ یہاں ہم ایک بات صاف کر دینا ضروری سمجھتے ہیں وہ یہ کہ اس مضمون کو رسائل پر کسی قسم کی تنقید نہیں سمجھنا چاہئیے کیونکہ اس میں فقط چند خاص اور اچھے مضامین نظم و نثر کا ذکر ہوتا ہے۔ معمولی یا ادنےٰ مضامین کا مطلقاً تذکرہ نہیں کیا جاتا۔ کیونکہ ہمارا مقصد اپنے ناظرین کو اُن نئی نئی چیزوں سے آشنا رکھنا ہے جو ہمارے ادب میں ہر روز داخل ہو رہی ہیں اور بعض ایسے مضامین کی ایک یادداشت مرتب کرنا ہے جو آئندہ چل کر محققین کے کام آسکیں گے۔ کسی مہینے میں جو اچھی چیزیں خواہ وہ مضامین ہوں یا افسانے نظمیں ہوں یا ڈرامے، متفرق رسائل میں چھپتی ہیں وہ اپنے اپنے حلقے میں نظر بندسی رہتی ہیں۔ اس تذکرے سے اُن کی اور اُن کے لکھنے والوں کی جان پہچان کا دائرہ وسیع ہو جائیگا اور ہمارے ناظرین کی ادبی معلومات میں یقیناً ایک مسلسل اضافہ ہوتا رہے گا۔ (رسائل کا ذکر حروف تہجی کے لحاظ سے ہے)

اُردو (اپریل تا جون)

رُوسی ناول کا پہلا دَور۔ تالستائی۔ پروفیسر محمد مجیب صاحب نے تالستائی کی ناول نگاری پر ایک نہایت بلند پایہ مضمون لکھا ہے جس میں اُنہوں نے اس عظیم الشان انسان کی سیرت اور اس کے ادبی کارناموں میں جو گہرا تعلق تھا اس کی نہایت دلآویز اور دلچسپ شرح کی ہے۔ تالستائی کی شخصیت بجائے خود ایک زبردست مطالعہ ہے۔ اور پھر جب یہ مطالعہ ایسے انداز میں کیا جائے کہ خود اس کا پیدا کیا ہوا جہان اُس کا پس منظر بنے تو یہ واقعی ایک حیرت ناک انسانی تجربے کا مقام حاصل کر لیتا ہے۔ تالستائی محض ناول نگار نہیں تھا۔ وہ ایک گرم جوش مصلح۔ ایک حقیقت شناس فلاسفر اور ایک زبردست ادیب اور مفکر تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس کے اعمال اس کے عظیم الشان عقائد کا ساتھ نہ دے سکے لیکن اس میں کوئی کلام نہیں کہ جو کچھ اُس نے لکھا اپنی رُوح کی گہرائیوں میں ڈوب کر لکھا اور جو کچھ اُس نے کہا۔ احساس کی ایک بے پناہ شدت سے بے تاب ہو کر کہا۔ پروفیسر مجیب ایک جگہ کیا خوب لکھتے ہیں۔

"وہ اپنی کمزوریاں محسوس نہ کرتا تو دنیا اس بصیرت افروز ہنگامے سے محروم رہ جاتی جو اس کی تنقید نے پیدا کیا۔ ہمیں اس کی دینی اور معاشرتی تعلیم کے صحیح اور کامیاب ہونے سے بحث نہیں۔ صرف اس ادیب سے مطلب ہے جس نے ادب، فن اور اخلاق کے چشموں کو ملا کر اپنے دل — اور اس کے ساتھ ساری دنیا کی پیاس کو بجھانا چاہا۔ جس نے حجاب کی رسموں کو توڑ کر ادب کو دین اور اخلاق کی صورت دکھائی اور قلم کی انتہائی قوت میں بے چارگی پائی تو اُسے اُٹھا کر پھینک دیا اور دل کو ہاتھ میں لے کر دنیا کے سامنے کھڑا ہو گیا۔"

ایشیا (بابت ششماہی مختتمہ مارچ ۳۹ء)

مشرقی کتب خانہ بانکی پور۔ مختارالدین احمد صاحب نے ہندوستان کے اس مشہور کتب خانہ کے مفصل حالات بہت اچھے پیرایہ میں لکھے ہیں اور مخطوطات کے جمع کرنے کے سلسلے میں مولوی خدا بخش مرحوم اور اُن کے والد مولوی محمد بخش مرحوم کی زندگی کے بعض نہایت دلچسپ واقعات اور سوانح پر روشنی ڈالی ہے۔ اس مضمون کے مطالعہ سے یہ معلوم کر کے یک گونہ اطمینان ہوا کہ اس کتب خانہ میں مخطوطات کی تعداد انڈیا آفس۔ برٹش میوزیم اور

پیرس اور برلن کے کتب خانوں کے نوادر قلمی سے بہت زیادہ ہے مضمون بدرجۂ غایت دلچسپ ہے۔

بہاراں ان کا ساغر بہت خوب ہے۔ ایک شعر ہے ؎

یہ بجا کہ دورِ بہار ہے یہ بجا کہ فصلِ بہار ہے جو بکھر کے دوش پہ آپڑے تو یہ ابرِ گیسوئے یار ہے

مقطع دیکھئے ؎

مری شاعری مری زندگی مری زندگی مری شاعری، دل و جاں تو کیا ہے ترے لطف پر مری شاعری بھی نثار کر

حضرت جگر کی چند اچھی غزلیں بھی اسی مشترک نمبر کی زینت ہیں۔ "تصویرِ جگر" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

قیامت کیا یہ اے حسنِ دو عالم ہوتی جاتی ہے
کہ محفل تو وہی ہے دلکشی کم ہوتی جاتی ہے
وہی ہیں شاہد و ساقی مگر دل بجھتا جاتا ہے !
وہی ہے شمع لیکن روشنی کم ہوتی جاتی ہے
وہی میخانہ و ساقی وہی شیشہ وہی صہبا !
مگر آوازِ نوشانوش مدھم ہوتی جاتی ہے
وہی ہے زندگی لیکن کچھ ایسا حال ہے دل کا
کہ جیسے زندگی سے زندگی کم ہوتی جاتی ہے
جہاں تک دل کا شیرازہ فراہم کرتا جاتا ہوں !
یہ محفل اور برہم ، اور برہم ہوتی جاتی ہے

زمانہ (مئی)

اقبال اور تصوف از ولی کمال خاں صاحب ایک بہت اچھا اور پُرمغز مضمون ہے۔ اقبال کا تصوف "رواجی تصوف" نہیں ہے۔ بلکہ نفس انسانی اور نظامِ کائنات کے اسرار و رموز کو جس انداز سے انہوں نے اپنے ذاتی فکر اور پیغمبرانہ اجتہاد سے بے نقاب کیا اور تلاشِ حق کی دُھن میں جو بلند مقامات اُنہوں نے طے کئے اور شاہدِ حقیقت کے رخِ زیبا کی جھلک جس طرح اہلِ عالم کو دکھائی وہ کچھ انہیں کا حصہ تھی۔ اس میں شک نہیں کہ حکمائے اسلام میں سے مولانا رومی کا اُن پر بہت اثر تھا۔ اقبال کا تصوف تسکینِ روح کے لئے گوشۂ خانقاہ نہیں ڈھونڈتا۔ وہ شاہدِ مطلق کا جلوہ کارزارِ حیات میں دیکھتا ہے۔ صاحبِ مضمون کے الفاظ میں انہیں "صوفی کا دل، فلسفی کا دماغ، اور قلندر کا وجدان" عطا ہوا تھا اور اس میں کوئی کلام نہیں۔ کہ اقبال نے اسلامی تصوف پر ایک نہایت گہرا اثر ڈالا جس کا صحیح اندازہ آنے والی نسلیں ہی کر سکیں گی۔

کرنل جیمس اسکنر۔ ہنگامہ آزادی ۱۸۵۷ء سے پہلے بہت سے عالی خاندان یورپین لوگ ہندوستانی معاشرت اختیار کر کے ہندوستان جنت نشان کے باشندے بن چکے تھے۔ ان لوگوں نے شریف ہندوستانی گھرانوں میں شادیاں کیں۔ ہندوستانی زبان کو مادری زبان کا درجہ دیا۔ شرفائے ہندوستان کی سی بود و باش پسند کر لی۔ اور متعدد والیانِ ریاست کے دامن سے وابستہ ہو کر حقِ نمک ادا کیا۔

اس قسم کے سربرآوردہ اینگلو انڈین خاندانوں میں سے ایک سکنر خاندان تھا جس کے ایک ممتاز فرد کرنل جیمس سکنر کا نام پنڈاریوں کی سرکوبی کے سلسلے میں بہت معروف ہے۔ منشی پیارے لال صاحب شاکر سے جن کے متعدد مضامین گارڈنر خاندان کے شعرا کے متعلق ادبی دنیا میں چھپ چکے ہیں، ناظرین بخوبی آشنا ہیں۔ یہ لطیف مضمون انہی کے قلم سے نکلا ہے اور غایت درجہ دلچسپ ہے اُس زمانہ کی معاشرت کے بعض نہایت دل آویز پہلو اس مضمون کے مطالعہ سے معلوم ہوئے۔ مثلاً کرنل اسکنر کی یورپین بہو کی شادی کا منظر۔ "دلہن ہندوستانی لباس میں ملبوس تھی۔ اس کے دوپٹے میں اٹھارہ سو روپے کی قیمت کے موتی ٹنکے ہوئے تھے۔ اسی سے اس کے زیورات کی قدر و قیمت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اجنبیوں کی موجودگی کے باعث دلہن کسی قدر پریشان نظر آتی تھی۔ تاہم وہ شرم و حیا اور وہ بھولا پن اُس میں نمایاں تھا جو صرف ہندوستانی زنانخانوں ہی میں نظر آ سکتا ہے۔ وہ پردے میں رہی تھی، حتٰے کہ شادی سے قبل کسی یورپین کی نظر اُس پر نہ پڑی تھی۔"

سب رس (جون)

"شیراز" دکن میں ۔ یہ شیراز ایران کا وہ رومانی شہر نہیں جہاں سعدی اور حافظ محوِ خواب ہیں بلکہ ایک بلبل کا نام ہے جو دکن کے ایک نواب صاحب کی پالی ہوئی دوسرے بلبلوں کے سینے چاک کرتا تھا۔ یہ دل آویز کہانی انیسویں صدی کی حیدرآبادی معاشرت کی ایک رنگین تصویر ہے جسے نقی رضوی صاحب نے الفاظ میں کھینچ کر رکھ دیا ہے۔ "شیراز" اور "کلے پہاڑ" کی جنگ کا منظر اور اُس کی ڈرامائی تفاصیل بہت دلچسپ ہیں۔

ساقی (جون)

نیرا۔ ایک نہایت اچھا افسانہ ہے جسے محترمہ عصمت چغتائی نے لکھا ہے۔ نیرا کے کیرکٹر میں زندگی کی حقیقت کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی ہے ہمارے بیشتر افسانہ نگاروں میں ایک عام نقص پایا جاتا ہے۔ کہ وہ اپنے ہیرو یا ہیروئن کو حسن و خوبی کا پُتلا بنا دیتے ہیں۔ اور کوئی بات ایسی نہیں لکھتے جس سے اس

پتلے کا کوئی بھدّا یا بدنما یا کریہہ پہلو نظر کے سامنے آجائے۔ عصمت چغتائی
اس روش سے بالکل علیحدہ ہیں۔ نیرا جسے پڑھنے والے کی پوری ہمدردی آخر
تک حاصل رہتی ہے اگر ایک جگہ ایک تیزدار گرہستن کے بھیس میں "کام
کاج کر کے بن ٹھن کر سندر کا سر اپنے بازو پر رکھ کر تیل ڈالتی تو وہ پوری گھر
والی نظر آتی ہے"۔ تو اس سے پہلے جب وہ گاؤں کی ایک غریب لڑکی تھی۔ اس
کی تصویر یوں کھینچی گئی ہے:۔ "اور یہ جوئیں! ہر وقت نیرا کے سر میں گھوڑ دوڑ مچائے
رکھتیں۔ مرنے جوئیں کو رات میں نیند بھی تو نہیں آتی۔ کھرنڈ بنتے اور پھر اکھڑ جاتے
سرسوں کا تیل آٹھویں دن ہی کھٹی کھٹی بو دینے لگتا۔ کہاں تک کوئی سر دھوئے"
. . . . یہ ہے ان کی حقیقت نگاری کا بے رحم اور بے پردا
انداز۔ اور آگے چل کر وہی بھولی نیرا۔ جو اپنی بیوہ ماں سے زندگی بھر کے لئے
جدا ہو کر سندر کی "منہ بولی" بیوی بن کر اس کے ساتھ شہر چلی آئی تھی۔
جب سندر کے فریب سے آگاہ ہوتی ہے تو بجائے برنا استریوں کی طرح
نالہ و بکا نہیں کرتی یا خودکشی میں اپنے درد کا درماں نہیں ڈھونڈھتی بلکہ
سیدھی روپا کے طلسم خانے میں پہنچتی ہے۔ اور پھر "روپا کی سر ہوئی دکان چل
نکلی اور نیرا اُس کی ہو گئی۔ تندرست جسم اور چمکتے ہوئے گالوں سے اُس نے پورا فائدہ
اٹھایا اور یہی ایک عورت کی دولت ہے، چاہے وہ لونڈی ہو چاہے رانی۔ جب
تک بدن چست ہے اور گال چکنے ہیں سب کچھ ہے اور پھر؟ . . . . سب
ہی آتے تھے۔ پر سندر اُس کا سب سے پہلا سندر کبھی نہ آیا۔ نہ جانے وہ کہاں
تھا، شاید کسی نئی نیرا کے سنگ! مگر نیرا کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ ماضی
کے متعلق سوچ سکے۔ حال اور مستقبل ہی اس کے لئے بہت تھے۔ اور پھر
اس کی نئی ساڑی میں فیتہ بھی تو نہیں لگا تھا . . . "

زبان بہت آسان اور دل نشین ہے۔ سوائے اس کے کہ کہیں
کہیں اجنبی محاورے برتے گئے ہیں مثلاً "سندر باپ کو نیرا کا علم نہ دینا چاہتا تھا"
یہ شاید انگریزی مطالعے کا اثر ہے۔ عصمت صاحبہ اس انداز سے گریز
کریں تو بہت اچھا ہے۔

بیرو۔ کپلنگ کی جنگل بک ترجمہ ہو کر "زلفی" اور "جنگل میں منگل"
کے ذریعہ سے اُردو دان پبلک تک پہنچ چکی ہے لیکن کپلنگ کے علاوہ
انگریزی میں بے شمار مصنفین نے جانوروں کی کہانیاں لکھی ہیں۔ جن میں
لارنس سٹانگ بہت مشہور ہے اُردو میں ایسی چیزیں کم یاب بلکہ نایاب
ہیں۔ البتہ کچھ عرصہ گذرا مرزا عظیم بیگ چغتائی نے "کتوں کا عشق" لکھ کر
ادب کی اس پگڈنڈی پر ایک قابل قدر اقدام کیا تھا۔ "بیرو" اس اقدام کی
ایک کامیاب پیروی ہے۔ سید رفیق حسین نے ایک ایسی نیل گائے کے
سوانح اور جذبات کا چربہ اُتارا ہے جسے جنگل نے شہر سے واپس بلا لیا تھا۔
بہت دلچسپ اور کامیاب مطالعہ ہے۔ ہمارے ہاں ایسی چیزوں کی بہت
ضرورت ہے

شیرازہ (۸ جون)

پراچین کال کی کہانی۔ جس چیز کو ہم لوگ "ادب لطیف" کے نام
سے پکارتے ہیں اُردو میں اس کی بڑی مٹی پلید ہوئی ہے۔ اور اب اکثر اوقات
اس کے بھیس میں طرح طرح کی خرافات ذوقِ سلیم کو مجروح کرنے کا سامان بہم
پہنچاتی ہیں۔ درحقیقت "ادب لطیف" ادب کی ایک نہایت نازک اور آراستہ
صورت کا نام ہے جس کے خدوخال سنوارنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ یلدرم
نے ایک طرح سے اُردو ادب میں ادب لطیف کی بنیاد رکھی اور ایک مدت
تک وہ اس عرصہ کے واحد شہسوار رہے۔ اس کے بعد بہت سے اصحاب
نے یہاں اپنے سمند طبع کی جولانیاں دکھائیں۔ کچھ ان میں سے کامیاب ہوئے
اور کچھ بہت بری طرح ناکام رہے۔ کامیاب لکھنے والوں میں سے ایک
میراجی ہیں۔ اور یہ مضمون ان کی طبع رسا کے نتائج میں سے ہے۔ ازبسکہ ایک
لطیف شے کا تجزیہ کرنا خود اپنے ذوق کی کثافت کا ثبوت دینا ہے اس لئے
ہم اس سے اجتناب ہی مناسب سمجھتے ہیں۔ اور یہ مضمون بعینہٖ شیرازہ سے
"دنیائے ادب" میں منتقل کئے دیتے ہیں۔ اب اس سے لطف اندوز ہونا
آپ کا کام ہے۔

عالمگیر (سالانہ نمبر بابت جون)

اُردو کے مایہ ناز نثر نگار۔ جناب عطاء اللہ پالوی نے مولوی محمد حسین
آزاد، میر ناصر علی دہلوی۔ مہدی حسن افادی اور نواب نصیر حسین خیال کو
اُردو کے چار ممتاز نثر نگار قرار دیا ہے اور بالکل بجا قرار دیا ہے۔ صاحب
مضمون نے ان چاروں کے اسلوب نگارش پر علیحدہ علیحدہ تبصرہ کیا ہے
اور ان کی تحریروں کے جدا جدا نمونے بھی دیئے ہیں۔ تبصرہ اگرچہ ذرا ہلکا ہلکا
ہے۔ لیکن ازبسکہ وہ ان چاروں کو ایک پھول کی چار پنکھڑیاں قرار دیتے
ہیں۔ اور ان چاروں میں ایک نہج کی مماثلت ثابت کرنا چاہتے ہیں اس
لئے اس قدرے محدود انداز نظر کے لئے انہیں معذور ہی سمجھنا
چاہیے۔ بہرحال مضمون غایت درجہ دلچسپ ہے اور موزوں مثالوں نے
اس کی دلچسپی میں خوب اضافہ کیا ہے۔

نیا ادب (مئی)

جدید چینی ادب پر سوامی ادویتا نند نے ایک مختصر مضمون لکھا ہے اور اُس کش مکش اور اختلافِ نظر کو نہایت عمدگی سے بیان کیا ہے جو چینی ادب کے قدیم اور جدید رجحانات میں جاری ہے۔ "کریسنٹ مون سوسائٹی" وہاں کی ایک سربرآوردہ ادبی سوسائٹی ہے۔ جس کا مجلّہ قدیم طرزِ خیال اور طرز نگارش کا علمبردار ہے۔ وہ اُن انقلابی مصنفین کا سخت مخالف ہے جنہیں زندگی کی حقیقتیں دنیائے رنگ و بو سے نکال کر اپنی تلخیوں اور درشتیوں سے آشنا کرتی ہیں اور جو ان کا عکس ادب کے آئینے میں اتارتے ہیں وہ ان سے کہتا ہے "تم کھردرے ہو۔ تم آرٹسٹ نہیں۔ تم شریف بھی نہیں"۔ یہی حال انقلابی شاعروں اور ادیبوں کا ہے۔ جن میں سے بیشتر "فوجِ آزادی" کے سپاہی رہ چکے ہیں۔ وہ اپنے مخالفوں کے لئے اس قسم کے الفاظ استعمال کرتے ہیں جو پرانے شاعروں کو اُن کی قبروں میں بے چین کر دیتے ہیں۔ چین کے قومی مصائب نے اس کے ادب پر بہت گہرا اثر ڈالا ہے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر چین ان میں مبتلا نہ ہوتا تو اس قدامت پسند ملک میں بورژوا ادب اور شاعری ابھی بہت دیر تک قدم جمائے رکھتی۔ بہرحال یہ کشمکش مطالعے کے قابل ہے۔

گیندا۔ بعض افسانہ نگار ایک مقصد کو سامنے رکھ کر افسانہ لکھتے ہیں اور یہ مقصد اکثر اوقات کوئی نام نہاد اخلاقی مقصد ہوتا ہے۔ دنیائے ادب اس طرز سے تنگ آ چکی ہے۔ ہمیں افسانوں میں جو چیز سب سے زیادہ درکار ہے وہ انسانیت کی تصویر کشی ہے اور انسانیت جس چیز کا نام ہے اسے محسوس تو ضرور کیا جا سکتا ہے۔ بیان کرنا ذرا مشکل ہے۔ زیرِ نظر افسانہ انسانیت اور اس کی تمام کمزوریوں کی ایک بے عیب تصویر ہے اور اس کا سحر یہ ہے کہ پڑھنے والے کے جو جذباتِ حسنہ کسی اخلاقی قسم کے افسانے سے بمشکل نیم بیدار سے ہوتے وہ زندگی کی اس بے روغن تصویر کو دیکھ کر ایسی شدت سے جاگ اُٹھتے ہیں کہ پھر ماند نہیں پڑتے۔ زندگی خود سب سے بڑی مصلحِ اخلاق ہے۔ اور اس مصورِ زندگی سے بڑھ کر کون مصلح ہوگا جو ہمارے سامنے خود زندگی کو پیش کرتا ہے۔ محترمہ عصمت چغتائی نے اس افسانے میں یہی چیز پیش کی ہے اور بڑی بے باکی سے پیش کی ہے۔

ہمایوں (جون)

زندگی اور موت کے دوراہے پر۔ ہمارے ہاں مرثیہ ادب کی ایک مستقل صنف ہے لیکن تعجب ہے کہ جہاں اُردو نظم میں مراثی کا اس قدر وافر ذخیرہ پایا جاتا ہے۔ وہاں اُردو نثر کا دامن ایسے عالی پایہ مضامین سے بالکل تہی ہے۔ جو کسی غم انگیز سانحہ یا موت سے متاثر ہو کر لکھے گئے ہوں۔ پروفیسر حمید احمد خاں کا یہ مضمون اُردو میں ایک نئی چیز ہے۔ ہمارے اکثر مشاہیر کی موت پر ممتاز ادیبوں نے غم انگیز خیالات کا اظہار کیا ہے لیکن اس اظہار کا ذریعہ زیادہ تر نظم ہی کو بنایا ہے۔ پروفیسر حمید احمد خاں نے یہ مضمون لکھ کر ثابت کر دیا ہے کہ نازک سے نازک اور لطیف سے لطیف احساسات کا اظہار نثر میں کس خوبی سے کیا جا سکتا ہے۔ یہ مضمون اُنہوں نے اپنی والدہ محترمہ کی وفات سے متاثر ہو کر لکھا ہے اور اگرچہ یہ اس لحاظ سے ایک حد تک ایک ذاتی اور جذباتی رنگ لئے ہوئے ہے لیکن اس کی ادبی حیثیت ہماری توجہ کو بے اختیار اپنی طرف کھینچتی ہے۔ چند سطریں ملاحظہ کیجئے۔

"اے زندگی کی شمع کو جلانے اور بجھانے والے! ٹمٹماتے ہوئے دیئے تیرے قدموں کی دھمک سے لرز رہے ہیں۔ تو آتا ہے۔ کسی چراغ کو بجھاتا اور کسی کو جلاتا ہوا گذر جاتا ہے! یہ کیسا کھیل ہے اور اس میں تجھے کیا مزا ملتا ہے۔ پروانوں کے ننھے ننھے دل خوف سے دھڑک رہے ہیں تاریکی اُن کے لئے موت ہے۔ شمع کی روشنی کو یوں ایک دم جھپٹ کر نہ لے جا۔ جگر سوختہ پروانوں کو صرف ایک پل کے لئے اپنی آخری حسرت پوری کر لینے دے۔ بجھتی ہوئی شمع کو جلانا ضرور دشوار ہے لیکن تو اسے ناگہاں بجھا دینے پر بھی تو مجبور نہیں ہے۔ ابھی اس کے گرد پروانوں کا ہجوم باقی ہے۔ ان کے سینے غم سے پھٹ رہے ہیں۔ اگر تو مہلت دے تو وہ اس ناتواں شعلے کا آخری طواف کر لیں۔ صبح قریب ہے۔ چراغ کا تیل ختم ہو چکا۔ اس کی لَو ٹمٹما رہی ہے۔ اس کی آخری جھلملاہٹ کو خود بخود ختم ہو جانے دے۔ تو سمجھتا ہے کہ تیری بساط جگمگا رہی ہے اور جگمگاتی رہے گی۔ تیری محفل کا نور ایک شمع کے بجھنے سے ماند نہیں پڑے گا۔ پھر بھی ہر شمع کے گرد ایک الگ جہان آباد ہے۔ چھوٹا سہی، حقیر سہی، لیکن اس جہان کے دل میں بھی وہی سوز ہے جس سے تیرے لاکھوں کروڑوں ستاروں کی دنیائیں روشن

ہیں۔ ۔ ۔ اے کاش تجھے معلوم ہوتا! کاش تجھے کوئی سمجھا سکتا کہ زمان و مکان کی انتہائی وسعتوں تک زندگی ایک ہے غیر منقسم، ایک رنگ، ایک جان، جب تو اس کو میری حقیر سی، محدود سی دنیا میں ٹھیس لگاتا ہے۔ تو فضائے لامکاں کے جگر میں ٹیس اُٹھتی ہے۔ سنگین پہاڑوں کی زمین دوز رگوں سے خون ٹپکتا ہے اور بعید ترین ستارہ درد سے کراہنے لگتا ہے۔ اے کاش۔ اے کاش تجھے معلوم ہوتا!"

ہماری زبان (۱۶ر جون)

ہندوستان میں اُردو کی حیثیت۔ مولانا عبدالحق نے اس بلند پایہ مضمون میں اُردو ہندی کے باہمی فرق کو کم کرنے کی ایک نہایت اچھی تجویز پیش کی ہے۔ وہ یہ کہ ایک مستند لغت ایسا تیار کیا جائے جس میں ایک طرف تو عربی فارسی کے وہ تمام الفاظ آجائیں۔ جو ہندی والے استعمال کرتے ہیں اور دوسری جانب سنسکرت اور بھاشا کے وہ تمام شبد جمع کئے جائیں جنہیں اردو میں عام طور پر برتا جاتا ہے۔ اس طرح اُس زبان کی تشکیل میں کچھ مدد ضرور مل جائے گی جس کا نام ہندوستانی تجویز کیا گیا ہے اور جو ابھی تک شاید عام بول چال یا سودا سلف کی ضروریات سے آگے نہیں بڑھی۔

ایک اور نکتہ جو اس مضمون کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے یہ ہے کہ اُردو میں فارسی اور عربی الفاظ کی آمد کا بڑا باعث خود برادران وطن کی غفلت تھی۔ ورنہ جب تک دلی اُردو کا مرکز رہی۔ ہمارے نثر نگار ہندی الفاظ کو چن چن کر اُردو میں داخل کرتے رہے۔ اور اس سے فارسی اور عربی کی شوکت کے ساتھ اُردو میں ہندی کی مٹھاس اور لوچ کا اضافہ ہوتا رہا۔

اب بھی اگر نیتیں نیک ہوں تو زبان کا مسئلہ آسانی سے حل کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اُردو کی تشکیل و ترقی میں مسلمانوں کی بہ نسبت ہندوؤں کا زیادہ حصہ ہے۔

صلاح الدین احمد

پراچین کال کی کہانی

آ ۔۔۔ دراغم کو ساتھ لے کر میرے ہمراہ چل ۔۔۔ دیکھ، بڑھیا دنیا اپنے شکستہ بربط سے کون سا نغمہ پیدا کر رہی ہے۔

• • •

منظر:۔ "رین سندری نے چاندنی کی چادر کے بجائے 'سیاہ' باریک ساری پہن لی ہے، اور یہ ساری جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی ہے۔ رین سندری کا گداز جسم بہت جگہوں سے عریاں ہے۔ انگیا پہننا بھی شاید بھول گئی ہے سینے کا اُتار چڑھاؤ بتا رہا ہے۔ کہ ماہتاب کی چودھویں بہار میں ہی، کسی کے لئے سوگوار رہنا پڑا ہے!"

گیت:۔ "آؤ، پیاری، آخری بار گلے سے لگ جاؤ! ۔۔۔ نینوں کے سیپیوں سے موتی نکالنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ مجبوری اور صبر کی آگ نے، درد کا بارود خاک کر ڈالا! ۔۔۔ وقت کے آسمان میں یادداشت کے ستاروں سے لکھا جا چکا ہے۔ کہ ہم دونوں، پریم کا لاجواب جوڑا ہیں! اور اب ۔۔۔ تمہاری زندگی کے اُفق میں مشرق سے ایک "سیاہ آفتاب" نکلنے والا ہے۔ جب کہ میری عمر کا سورج، موت کے مغرب میں غروب ہو چکا ہوگا! ۔۔۔ آہ، پیاری، آخری بار گلے سے لگ جاؤ۔

"سہاگ کی رات سے آج تک، تم اور میں دُکھ سکھ کے ساتھی رہے اور اب، جب کہ میرا بیاہ موت کی دیوی سے ہونے والا ہے، گذرے ہوئے روح پرور منظر، اور تکلیف کی کٹھن گھڑیاں، ایک بھولا ہوا خواب معلوم ہوتی ہیں، میں اپنے کو سویا ہوا محسوس کر رہا ہوں، اور یہ خواب دیکھ رہا ہوں، ایسے ہی بھولے بسرے خواب عقل کو ضائع کر دیا کرتے ہیں! آؤ' وقت کے عقاب کی جھپٹ میں آنے سے پہلے، جاگ کر ہوشیار ہو جائیں گلے سے لگ جاؤ، پیاری! آخری بار، آؤ ۔۔۔

"ہم دونوں کے پریم کا کبوتر قید کر لیا گیا۔ ہمارے خوشی کے لمحوں میں آئے ہوئے آنسو، ماضی کی دلہن کے پیراہن سے پونچھ دیئے گئے۔ عہدِ وصال کی محبت بھری نظروں کے تیر فضا میں چھوٹ چکے۔ زندگی اور یہ سہانا شب کی سُنی ہوئی کہانی معلوم دیتا ہے! ۔۔۔ آؤ، پیاری، یہ کہانی ختم ہونے سے پہلے آخری بار گلے سے لگ جاؤ! آؤ ۔۔۔!"

کچھ سمجھا بھی؟ بات کیا ہوئی! ۔۔۔ سُن!!

>

پراچین کال کے مہاپرشوں سے یہ روایت سننے میں آئی ہے۔ کہ بہت عرصہ گذرا، پورب دیس میں، راجہ میلس راؤ راج کرتا تھا، جس کی راجدھانی میں کوئی فریادی نہ بستا تھا۔ حسد کی دیوی نے، کئی راتیں، دیلے لے کر، اُس راج کی بستیوں میں، کسی ایک فریادی کے مل جانے کی اُمید میں، ضائع کردی تھیں، پرنتو ہر بار، ناکامی کی دیوی نے اُسے اپنا چہرہ دکھا دکھا کر، آخرکار بے آس کر دیا! اور پھر وہ ملک، تمام، مسرت، شادمانی، فارغ البالی اور آرام و راحت کی دیویوں کی "خرام گاہ" بن گیا!

اُنہیں خوشگوار دنوں کے ایک موسم بہار کی، ایک سہانی رات کو، عشق کی دیوی کا، پایۂ تخت ٹھاکر نگر کی فضاؤں سے گزر ہؤا۔ اور وہ پریم کے پھول اور محبت کے عطر، برساتی اور چھڑکتی ہوئی، وہاں سے گذر گئی۔ اور دوسرے دن، ٹھاکر نگر میں، ایک گمنام، ساحر شاعر رہاس رائے وارد ہؤا لیکن ابھی جبکہ وہ بڑے دروازے میں قدم رکھ ہی رہا تھا۔ تو مہندی کی خوشبوئیں فضا میں بساتی ہوئی، کام دیو کی استری، اپنے عریاں جسم سے تجلیاں بکھیرتی، نظر پڑی۔ اور ـــــ رہاس رائے کے جذبات بیدار ہو گئے، اور اس اچانک جھلک کا اثر، ہمیشہ کے لئے اُس کے من پر ہو گیا!

وقت کی دیوی سانس کے ذریعے، لمحوں کو اپنی بین میں بھرتی رہی۔ اور مستقبل کے نغمے، ماضی کے گیت بنتے رہے۔

اب رہاس رائے، میلس راؤ کا درباری شاعر بن چکا تھا۔ اُس دیس میں، شاعرانہ تخیل کی زیادتی نے حسن کو عریاں رکھنے کی رسم ڈال رکھی تھی، اور خوبصورتی کے خزانوں پر نقاب کے ناگ نہ بیٹھے رہتے تھے۔ جلوۂ یار عام تھا اور حسن کے پجاری، رُوپ کو سدا سُکھی پاتے تھے۔

رہاس رائے کو شاہی محلوں اور شاہی باغ میں جانے کی بغیر روک ٹوک کے اجازت تھی۔ "محلوں کی پریاں" اور "پریوں کی باندیاں" شاعر کو کوئی لمحہ فرصت کا حاصل نہ ہونے دیتی تھیں اور ہر وقت شاعر کے گیت سُنتی رہا کرتی تھیں۔ کوئی باندی شاعر کو تنہائی میں دیکھتی اور فرمائش کرتی:۔

"اے بلبل ذرا چہک تو سہی!"

شاعر کہتا:۔

"پھول! ـــــ عوضانہ؟"

باندی جواب دیتی، "جو چاہو!"

شاعر یہ سُن کر گاتا:۔

"اے سندری! آؤ ذرا پھول بن کر ٹہنی سے تو لگ جاؤ،

تاکہ میں بھنورا بن کر رس چوس لوں!!

اور پھر شعر کے بدلے، شعر کو ہی عملی صورت میں لے آتا!

ایک دن "محلوں کی پریاں" ایک بڑے سے حوض میں نہا رہی تھیں اور شاعر کنارے پر بیٹھا، نغموں کو فضا میں آوارہ کر رہا تھا۔ سب سے آخر اُس نے یہ گیت گایا:۔

"میری مالک' پریاں' حوض میں نہا رہی ہیں، اور اُن کے پھولوں کے ایسے چہرے ایسے نظر آتے ہیں، جیسے کہ سطح آب پر کنول کے پھول کھل رہے ہوں۔

"لیکن مجھے ایسے عریاں مناظر سے کوئی دلچسپی نہیں۔ جبکہ اُن کے پیراہنوں میں ہوا بھر جاتی ہے اور پانی کی سطح پر بڑے بڑے بلبلے نظر آنے لگتے ہیں۔

"یا جب وہ پانی سے باہر آتی ہیں، تو اُن کے پیراہن نیم عریاں بدنوں سے چمٹ کر کامل عریانی کا دھوکہ دیتے ہیں۔

"یا جب وہ گیلے کپڑے اُتار کر سوکھی ساریاں زیب تن کرتی ہیں۔ تو اُن کی اُبھری اُبھری چھاتیاں اور سڈول جسم دکھائی دیتے ہیں۔

"مجھے ان تمام دلکش مناظر سے کوئی دلچسپی نہیں!

"میں تو اُس کلی کے خیال میں ہوں، جو قدرت کے چمن میں ہستی کے پودے سے لگ رہی ہے، اور جس کا رس، مجھ بھونرے کے لئے ہی ہے"

"یا وہ پھول مجھے یاد آ رہا ہے، جو صحرا میں اکیلے اُگے ہوئے پودے سے لگا ہے!

"اور یا میں اس تیتری کی تمنا کر رہا ہوں، جو شاہی باغ کے کسی کنج میں محو پرواز ہے!"

یہ گیت گا کر، وہ اُٹھ بھاگا، اور دوڑتا ہؤا، محل کے باغ میں جا پہنچا اور روشوں پر آہستہ آہستہ ٹہلنے لگا، اور اس نے دیکھا کہ سامنے ایک کنج میں، اِک تیتری محو پرواز ہے ـــــ اِک انسانی تیتری! جو پودوں سے رنگ برنگے پھول توڑ کر، جھولی میں بھرتی جاتی ہے۔

شاعر مبہوت سا ہو کر بڑھا، اور بڑھتا ہی چلا گیا، کنج میں جا پہنچا، اور بولا:۔

"مجھ بلبل کے پھول! گل چین بن کر پھولوں پر ظلم نہ کر!"

لڑکی چونک پڑی، پھر کر دیکھا، اور بولی۔

"مجھے دخل در معقولات سے سخت نفرت ہے۔"

اور یہ کہہ کر مُنہ تھوتھا سالیا اور پھر گل چینی میں مصروف ہوگئی۔

شاعر مسکرایا اور کہنے لگا۔

"لیکن جیسے دخل در معقولات سے نفرت ہے۔ مجھے اُس سے محبت ہے۔"

لڑکی نے پھول توڑتے ہوئے طنزاً کہا۔

"محبت! ـــــ لیکن مجھے مردوں پر اعتبار نہیں!"

شاعر پھر مسکرایا اور بولا "لیکن عورتوں کا مطلب وہ نہیں ہوتا، جو وہ کہتی ہیں"

لڑکی بولی "مجھے معلوم ہے، مرد باتیں بنانا بہت جانتے ہیں۔"

شاعر نے حاشیہ چڑھایا ـــــ "اور عورتیں ادائیں!"

پاس کے پیڑ پر ہی ایک بلبل چہک رہی تھی۔

"عورتیں طرح طرح سے اپنے عاشق کو آزمایا کرتی ہیں!"

لڑکی چپ رہی اور شاعر خاموش! ـــــ تھوڑی دیر تک، فضا میں، خاموشی اور سکوت کی بُو آتی رہی! اور پھر پرندے چہک رہے تھے اور ہوا فضا کے ساز کے تاروں سے نغمے بنا رہی تھی!

لڑکی پھول توڑ توڑ کر جھولی بھرتی رہی، اور شاعر کھڑا نظروں میں رس بھرتا رہا! ـــــ اور پھر بولا "تم بڑی پیاری ہو۔"

لڑکی کہنے لگی "کبھی دفعہ شہد، زہر کے نتائج لایا کرتا ہے!"

اور جب وہ یہ کہہ رہی تھی۔ تو ایک کانٹا، اس کی انگلی میں چُبھا۔ اور اس کے دوسرے ہاتھ سے گرتے کا پلّہ چھُوٹ گیا، پھول گر کر بکھر گئے اور لڑکی درد سے بیتاب ہوگئی، شاعر بڑھا، اُنگلی کو چُوس کر ـــــ پھر رومال باندھ دیا!

\+ \+ \+

وقت کا شکاری لمحوں کے تیر، کمان میں رکھ رکھ کر، فضا میں چھوڑتا رہا۔

کئی دن بعد، وہی باغ تھا، اور اُس کا وہی کنج، وہاں وہی لڑکی کھڑی تھی اور وہی شاعر، لیکن وہ حالت نہ تھی! ـــــ پھول بکھرے ہُوئے تھے، شاعر زمین پر پاؤں پھیلائے بیٹھا تھا۔ اور اُس کے زانوؤں پر سر رکھے وہ لڑکی آنکھیں بند کئے لیٹی ہوئی تھی ـــــ اتنے میں ایک سفید مور اُڑ کر وہاں آ پہنچا، اور جھنکارنے لگا۔

پریم کا جوڑا چونک پڑا، اور شاعر، گویا مور کو مخاطب کر کے بولا۔

"مجھے دخل در معقولات سے سخت نفرت ہے۔"

پر لڑکی بولی "لیکن میں اسے پسند کرتی ہوں، کیونکہ، کئی بار یہی دخل در معقولات بہت عمدہ نتائج لایا کرتی ہے۔"

اوقت ایک کافور تھا۔ کھُلی فضا میں اُڑتا رہا!

رات کی خاموشی میں بُڑھیا، دُنیا گا رہی تھی۔

"مالن کی دوشیزہ لڑکی بھُورے بھُورے بال لئے

رقص کرے گی صحنِ چمن میں فصلِ بہاری آنے دو۔[1]"

\+ \+ \+

بہار کا دیوتا دلکش پیراہن پہنے، اُچھلتا، کودتا، آ پہنچا، اور رقاصۂ بہار کو بھی ساتھ لیتا آیا! عیش و نشاط کی جوان لڑکیاں بھی ساتھ آئیں، اور کیف و انبساط کے گویّے بھی!

لوگ رقص گاہوں میں رقصِ بہار دیکھنے جا رہے تھے، لیکن شاعر اسی کُنج میں کسی کا منتظر کھڑا تھا۔

آخر تمنّا پوری ہوئی اور آرزو، اس کی محبوبہ بن کر، جلوہ گر ہوئی، ایک لطیف پیراہن زیب بدن تھا جس کی باریکیوں میں سے مالن کی دوشیزہ لڑکی کا جوان اور کنوارا جسم نظر آ رہا تھا!

ملاقات، آداب و رسوم، اور گلہ و شوق کی دیویاں، آئیں اور چلی گئیں، اور پھر شاعر بولا:

"گلبدن! وعدہ کب ایفا کرو گی؟ چلو، رقص شروع کرو۔"

گلبدن بولی "اور تم ساز بھی لائے ہو؟"

شاعر نے جواب دیا "سب کچھ درست ہے!"

اور پھر گلبدن اُس کے پہلو سے اُٹھی اور بولی۔

"میرے شاعر! آج میں تمہیں بہت سی قسموں کے ناچ بتاؤنگی دیکھو، سب سے اول "آتشیں رقص" شروع کرتی ہوں، تم ساز پر کوئی "اگنی راگ" بجاؤ، اور سنگت کرو!"

اور اسی طرح وہ رقص کرتی رہی، اور وہ گاتا اور ساز بجاتا رہا۔ آخر رقص بہار کا دن گذر گیا اور دوسرے دن شاہی دربار کی باری تھی!

\+ \+ \+

[1] ظریف لکھنوی

ہر مکان میں، شاہی اہتمام سے، تصویر اور آواز کی بے تار برقی لگی ہوئی تھی اور لوگ اپنے اپنے آشیانوں میں بیٹھے ہوئے، دربار کی موجودگی کا لطف اُٹھا رہے تھے۔

سب سے آخر شاعر اُٹھا، اور چبوترے پر آیا۔ اُس نے کئی گیت ساز پر اور ساز کے بغیر سنائے، اور سب سے آخر یہ گیت گایا۔

"میں محبت کے شبستان کا وہ پروانہ نہیں۔ جو وصال کے شاندار محلوں میں، عیش کے کمرے کے بیچ، حُسن کی شمع کے گرد، اُڑ اُڑ کر جان چھڑک رہا ہو!

"اور نہ میں اُن میں سے ہوں جو کیف و سرور حاصل کر کے راکھ ہو چکے ہیں۔

"بلکہ میں وہ حرماں نصیب پتنگا ہوں۔ جو عیش کے کمرے کی کھڑکی کے باہر شیشوں میں سے ہی، حُسن کی شمع کو تک رہا ہو۔ اور نثار ہونے کے لئے کوشاں لیکن واقعات اور رقابت کے شیشے، رکاوٹ بن رہے ہوں"

شاعر گیت گا چکا اور میلس رائے خوش ہو کر بولا:۔

"اے اس درباری چمن کے پھول! تیرے نغمے اور تیری باتیں اثر افروز اور نادر ہیں۔ آج میں چاہتا ہوں کہ تو اپنے من کے ناریل میں سے کامنا کی گری نکالے تاکہ تجھے تمنا کی دیوی سے ہم آغوش کر کے تیرے نغموں کا بدل، کسی حد تک ادا کر سکوں!"

شاعر، پھر کھڑا ہوا اور بولا:۔

"راجہ! تیرے عہد میں مجھے سب کچھ حاصل ہے اور اس حاصل سے زیادہ میرے گیت ہیں۔ لیکن تو چاہتا ہے کہ میں اپنی کامنا کی دیوی کی ساری، بھرے دربار میں اُتار پھینکوں، تاکہ تو اسے ——— "پوری مراد" کے پیراہن پہننے کو دے، اس لئے میں تجھے تیری تمنا سے ملاتا ہوں، اور اسی بدلے کا اُمیدوار بنتا ہوں!"

"میں چاہتا ہوں، کہ مجھے وہ چیز حاصل ہو جائے، جس کی وجہ سے مجھے یہ گیت حاصل ہیں، اور جن گیتوں کی وجہ سے میں، تجھے حاصل، ہوں! اس لئے اے راجہ! ——— مجھے اپنے شاہی باغ کی مالن کی بیٹی گلبدن کو دے ڈال، تاکہ میرے گیت، اور بھی مؤثر اور نادر ہوں"۔

شاعر، اپنی محبوبہ، گلبدن کے ساتھ زندگی بسر کرتا رہا، اور جب شاعر کے آخری لمحے آن پہنچے، تو بستر مرگ پر اُس نے ایک گیت میں، اپنے جذبات گلبدن سے بیان کئے!

یہ گیت، "یہ رین سندری" والا گیت، جو بیان کیا گیا ہے اُسی، پورب دیش کے پایۂ تخت ٹھاکر نگر کے راجہ، میلس راؤ کے درباری شاعر رہاس رائے کا بنا ہوا ہے، ——— بستر مرگ پر!

میراجی

(شیرازہ بہ اجازت)

نقد و نظر

افکارِ سلیم

مجموعۂ کلام مولوی وحید الدین سلیم مرحوم۔ مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی۔ لکھائی چھپائی عمدہ۔ کاغذ سفید دبیز۔ سائز ½۶ + ½۸۔ ضخامت ۲۱۸ صفحات۔ ٹائٹل خوشرنگ سادہ۔ قیمت درج نہیں۔ ناشران: حالی اکیڈیمی پانی پت۔

مولوی سید وحید الدین سلیم آج سے ۷۲ برس پہلے پیدا ہوئے۔ اور گیارہ برس ہوئے کہ فوت ہو گئے۔ اس لئے اُن کا زمانہ ایک لحاظ سے اردو نظم کے دورِ جدید سے پہلے کا زمانہ ہے۔ لیکن افکارِ سلیم کے مطالعہ سے جو پہلا اثر پڑھنے والے کے ذہن پر ہوتا ہے وہ نظم کے جدید رجحانات سے سلیم کی ہم قدمی بلکہ پیش قدمی کا احساس ہے۔

اگر نظیر اکبر آبادی کے کلام سے قطعِ نظر کر لیا جائے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ اردو میں نظم نگاری کی ابتدا، حالی اور آزاد سے ہوئی اور غزل اگرچہ اب بھی پہلے کی طرح ہمارے شعراء اور خصوصاً دوسرے درجے کے شعراء کا وظیفۂ حیات ہے لیکن "نظم" "آبِ حیات" کی تقسیمِ ادوار کے پیشِ نظر خالصتاً اردو کے دورِ ششم کی پیداوار ہے۔ پھر تعجب ہے کہ آزاد سے گذر کر موجودہ نظم نگار شعراء تک جو ایک خاصہ طویل عرصہ ہے اس عہد کے کاروانِ نظم میں سلیم کی نظموں کو کوئی نمایاں جگہہ نہ ملی۔ حالانکہ ان کا مرتبہ مضامین کی ندرت۔ بندشوں کی چستی اور الفاظ کے حسنِ انتخاب کے لحاظ سے بہت بلند ہے۔ اس کی وجہ غالبًا یہ ہے کہ سلیم ایک نہایت بے پروا اور بے نیاز طبیعت رکھتے تھے۔ ان کا بیشتر کلام ان کی اس بے نیازی کی نذر ہو کر ضائع ہو گیا اور ادب کا دامن ان گل ہائے نوبہار سے محروم رہا۔

آخر عمر میں انہوں نے اپنا کلام رسائل میں بھیجنا شروع کیا تھا۔ اور مجموعۂ زیرِ نظر زیادہ تر انہی متفرق نظموں سے مرتب کیا گیا ہے۔

سلیم کی جدت پسندی کا کچھ اندازہ آپ ان کی نظموں کے شگفتہ اور خیال افروز عنوانات سے کر سکتے ہیں۔ چند عنوان سنیئے:۔

"ہندوستان میں آریوں کی پہلی آمد"۔ "میں کیا کیا کرتا رہا"۔ "ہندوستان کی سرگذشت پہاڑوں کی زبان سے"۔ "حسن کی زبان سے"۔ "نوادرمیں"۔ "تنہا بادل"۔ "گوشۂ تنہائی"۔ "نیم کے پتے"۔ "رقاصہ"۔ "جولانیاں"۔ "برسات کا پہلا دن"۔ "بگلا"۔ "نونہالوں کی موت"۔ "مسرت بھرا دل"۔ "انسان کی تازہ کاریاں"۔ "دعوتِ انقلاب" وغیرہ

ان چند عنوانات سے آپ یہ بھی معلوم کر سکتے ہیں کہ سلیم کی شاعری میں تنوع اور دلکشی کا عنصر کس حد تک موجود ہے اور وہ نہ صرف ظاہری موضوعات پر قلم اٹھاتے ہیں بلکہ باطنی کیفیات کی تصویر کشی بھی کرتے ہیں۔ بالفاظِ دیگر اُن کی شاعری خارجی بھی ہے اور داخلی بھی اور پھر ایسے اچھوتے مضامین کو وہ جس خوبی سے نبھاتے ہیں وہ کچھ انہی کا حصہ ہے۔ وحید الدین سلیم ایک زبردست عالم تھے اور دنیائے ادب میں وہ اپنی فضیلتِ علمی اور زبان دانی ہی کے باعث ممتاز تھے۔ شاعری اُن کے اوصافِ شخصی میں دوسرا درجہ رکھتی ہے اس لئے ہمیں ان کی نظموں میں جہاں ان کی وسعتِ نظر اور غائر مطالعہ کے نہایت روشن ثبوت ملتے ہیں۔ وہاں اس جنسِ گراں کی کمی بھی نظر آتی ہے جسے سوز و گداز اور نزاکتِ احساس کے نام سے پکارا جاتا ہے مطالعہ کی وسعت نے انہیں اپنے ہم عصروں سے بہت آگے پہنچا دیا تھا اور انہوں نے اس کی بدولت نظمِ اردو کو بہت سے جدید خیالات اور محسوسات سے مالا مال کیا۔ بعض نظموں پر مغربی اثر بہت نمایاں ہے لیکن بعض ایسی خوبی سے لکھی گئی ہیں کہ بنیادِ خیال میں مغربی ہونے کے باوجود ماحول اور طرزِ نگارش کے لحاظ سے سراسر مشرقی بلکہ ہندوستانی معلوم ہوتی ہیں:۔

مثلاً "بگلا" میں دیکھئے:۔

جب سمندر نیلگوں ہو اور ہوا ہو خوشگوار — آسماں سر پر ہو ساکن اور مطلع بے غبار
پاؤں پھیلاتا ہے وہ اس طرح سطحِ آب پر — جیسے شہزادہ کوئی لیٹا ہو فرشِ خواب پر

. . . .

اس کو سردی کی نہ پروا ہے نہ ویرانوں کا ڈر — بے تکلف ایسے ملکوں کا وہ کرتا ہے سفر
برف میں ڈوبی ہوئی رہتی چٹانیں ہیں جہاں — ہے جہاں یخ بستہ پانی اور سورج ہے نہاں
واں بھی رہتا ہے اسی آسودگی سے صبح و شام — جس طرح اس کا سمندر کے کنارے تھا مقام

. . . .

(گریز ملاحظہ کیجئے)

ولولے جو دل میں ہیں بگلے کے اٹھتے صبح و شام — جب وہ انسانوں کے دل میں اپنا کرتے ہیں مقام
وہ بھی بے خوف خطر ملکوں میں جاتے ہیں نکل — ہمتوں میں اُن کی خاطر سے نہیں آتا خلل
ہر مصیبت میں وہ سینہ اپنے کرتے ہیں سپر — کوئی خطرہ ہو نہیں کرتے ذرا اس سے خطر

اب ذرا "گوشۂ تنہائی" کی سیر کیجئے:۔

اے خلوتِ خاموشی، اے گوشۂ تنہائی — قدرت کی بلندی ہے تو نے مجھے دکھلائی
جس ذہن میں جودت ہو جس دل میں ہو جولانی — جمھو دنیں پھنس کر وہ ہو جائے گا زندانی
کھائے گا ہوا کیونکر وہ عالمِ بالا کی — جن پاؤں میں زنجیریں جب صحبتِ دنیا کی

. . . .

خلوت میں ہے خاموشی جلوت میں ہیں آوازیں — جلوت میں ہے مایوسی خلوت میں ہیں پروازیں
خاموشی و تنہائی الہام کے چشمے ہیں
پنہاں اسی پردے میں قدرت کے کرشمے ہیں

اور "رقاصہ" کو دیکھئے کہ

وہ حسن کی تیلی جو تھرکتی نظر آئی — پھولوں کی چھڑی تھی کہ لچکتی نظر آئی
وہ حور کہ تھی فرشِ قلم کا رہ رقصاں — شبنم تھی کہ پھولوں پہ ڈھلکتی نظر آئی
چال اس کی قیامت نے جو دیکھی سرِ محفل — سوتے ہوئے فتنوں کو تھپکتی نظر آئی

آپ نے ملاحظہ کیا، الفاظ کی نشست مصرعوں کی روانی بحر کی موسیقی اور زبان کی دل آویزی کس درجے پر ہے۔ ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سلیم پر صحتِ زبان و محاورہ اور انتخابِ الفاظ کے بارے میں ذوق اور شاداب استعاروں اور رنگین تشبیہات کے لحاظ سے آزاد ایک بڑی حد تک اثر انداز ہوئے اور از بسکہ ان کی زندگی کا ایک حصہ صحیفہ نگاری اور مولوی ظفر علی خاں کی صحبت میں گذرا۔ اُن کی بعض نظموں میں ایک ہنگامی اور صحافتی جھلک پائی جاتی ہے اور قافیہ بندی میں بھی مولوی صاحب موصوف کا رنگ نمایاں ہے۔ اب یہ معلوم نہیں کہ مشکل سے مشکل قافیے اس طرح باندھتے چلے جانا کہ پڑھنے والا یہ سمجھ بیٹھے کہ شاید یہ نظم دل آویز محض قافیہ شماری کے لئے کہی گئی ہے، سلیم نے مولوی صاحب کی صحبت میں سیکھا یا مولوی صاحب کی طبع رواں سلیم کے انداز سے متاثر ہوئی۔ بہر حال یہ خصوصیت دونوں اصحاب میں مشترک ہے۔ اس امر کی مثال کے طور پر اس مجموعے میں سے کئی چیزیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً "وقت سحر" میں کروٹیں، سرسراہٹیں، جھلملاہٹیں، مسکراہٹیں، چلبلاہٹیں، لگاوٹیں۔ گنگناہٹیں جیسے قافیئے نہایت قادر الکلامی سے باندھے گئے ہیں۔ یا "فطریات" میں لپک۔ دبک جھپک۔ ٹھٹک۔ تھپک۔ تھک۔ مسک۔ جھٹک۔ لپک۔ دمک۔ ڈھک اور یہاں تک کہ سٹک۔ اور اس قسم کے بیس اور قافیئے۔ ناظم کے کمال کی داد دے رہے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ ان کے باعث کلام میں کہیں ابتذال پیدا نہیں ہوا۔ بلکہ بعض شعر تو بہت چست ہوئے ہیں۔ مثلاً

ہر باغ میں بلیورِ چمن کے وہ چہچہے — ہر دشت میں نسیم کی وہ سرسراہٹیں
وہ چرخِ سبز فام پہ کرنوں کا پھوٹنا — پانی میں نورِ صبح کی وہ جھلملاہٹیں
پانی کی چادروں کے وہ پُرجوش زمزمے — گلہائے رنگ رنگ کی وہ مسکراہٹیں
وہ بلبلوں کا شاہدِ گل سے خطابِ عشق — وہ قمریوں کی سروِ چمن سے لگاوٹیں

سلیم کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ وہ ہمیشہ زندگی کا روشن پہلو دیکھتے ہیں۔ آپ ان کے تمام کلام پر نظر ڈال جائیے۔ آپ کو کہیں قنوطیت اور یاس پرستی کا نشان نظر نہیں آئے گا۔ بلکہ قدم قدم پر زندگی اور زندہ دلی کی شادابیاں اور امیدوں اور امنگوں کی بلندیاں آپ کو مسکراتی دکھائی دیں گی۔ سلیم کی شاعری درحقیقت جوانوں کی شاعری ہے۔ وہ یاس و حرماں سے قطعاً نا آشنا ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ کہیں اُن کے آج سے بیس پچیس برس پہلے کے کلام میں زندگی کی حرارت کے وہی شعلے فروزاں نظر آتے ہیں جن سے بالِ جبریل جیسی کتاب العصر روشن ہوئی۔ افکارِ سلیم بعض مقامات پر اقبال کے پیغام کا عکس پیش معلوم ہوتا ہے۔ سلیم اگرچہ اقبال کی بلندیٔ تخیل اور پختگیٔ فکر کو نہ پہنچ سکا۔ لیکن اس میں ہرگز کلام نہیں کہ وہ زندگی اور زندگی کے وسیع امکانات کا ایک نہایت درخشاں منظر ہماری آنکھوں کے سامنے رکھ دیتا ہے اور ہمیں پکار پکار کر اس کی کامرانیوں اور کامیابیوں سے ہم آغوش

ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ سلیم کے درسِ عمل کی ایک ممتاز خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے مخاطب کو کسی سحرِ افرنگ یا طلسمِ سامری کا اسیر قرار نہیں دیتا اور نہ اُسے یہ ضرورت پیش آتی ہے کہ وہ تہذیبِ حاضر کے تاریک پہلو کو نمایاں کر کے ہمارے احساسِ خودی کو بیدار کرے وہ ہر قسم کے خارجی اثرات سے بے نیاز ہو کر اپنا پیغام سناتا ہے۔ اور ایسے دل افروز انداز میں سناتا ہے کہ دل کے تار اس کے سرودِ عمل سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں۔ سلیم کا خطاب عوام سے ہے اور اسی لئے اس کا اندازِ بیان اقبال کی طرح حکیمانہ نہیں بلکہ خطیبانہ ہے لیکن اس مقام پر اس کی شاعری صحیح معنوں میں شاعری نہیں رہتی۔ شاعر دب جاتا ہے، خطیب اُبھر آتا ہے مگر یہ سحر نگار اپنی خطابت میں بھی وہ بات پیدا کر جاتا ہے جو دوسروں کو نصیب نہیں۔ وہی الفاظ کا جادو۔ وہی مصرعوں کا ترنم۔ وہی فن کارانہ نشستیں۔ وہی اتار چڑھاؤ۔ غرضکہ نگارِ شعر کی روح اگرچہ قدرے تحلیل ہو جاتی ہے۔ مگر اس کے رخسار غازۂ سخنوری سے دمکتے ہی نظر آتے ہیں۔

مجموعۂ زیرِ تنقید میں سے سلیم کے اس رجائی اندازِ نظر کی مثال میں بہت سی نظمیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ چند کے عنوانات یہ ہیں:۔

آفتابِ دل۔ خود شناسی۔ دعوت انقلاب مسرت بھرا دل۔ زندہ دلی۔ کلیدِ ظفر۔ پیغامِ حیات۔ شکوۂ دل۔ شاہ راہِ عمل۔ سنبھل جا۔ زندگی۔ جادۂ ترقی۔ "نوجوانوں سے"۔ فلسفۂ مصائب۔ آ۔ نغمۂ حریت۔ میں کیا ہوں۔ جذبۂ ایمان۔ آئندہ کا خواب۔ نگاہِ حقیقت امید کی کرن۔ ذوقِ عمل وغیرہ وغیرہ۔

ان کے علاوہ اُن کی غزلیات بھی زندگی بخش اشعار سے سرتاسر معمور ہیں۔ اور ان میں بھی زندگی کے رُخِ روشن کا جلوہ نظر آتا ہے۔ بعض نظموں کے چند اشعار ملاحظہ کیجئے:۔

دل آئینہ ہے اس کو بگڑنے نہ دو کبھی — زد اس پہ فکر و رنج کی پڑنے نہ دو کبھی
خورشید کو بنا لیا جب سطحِ نظر — ذرات سے نگاہ کو لڑنے نہ دو کبھی
خالی نہ رکھو دل کو امنگوں سے غافلو! — اس شہرِ آرزو کو اجڑنے نہ دو کبھی
راہِ طلب میں آپ بنو اپنے دستگیر — ہاتھ اپنا خضر کو بھی پکڑنے نہ دو کبھی
کُشتی لڑو زمانے کی ناکامیوں سے تم — غیرت کے ولولوں کو پچھڑنے نہ دو کبھی
دُھن میں اٹھو سفر کی جو مطلوب ہے ظفر — دامن سے گردِ راہ کو جھڑنے نہ دو کبھی

"کلیدِ ظفر"

کیوں بحرِ زندگی میں در آتا نہیں کوئی — کیوں غوطہ اس کی موج میں کھاتا نہیں کوئی
جاتی ہے رائیگاں یہ تگ و دو نسیم کی — پھولوں میں پیرہن کو بساتا نہیں کوئی
کرنیں ہیں آفتابِ کرم کی اگرچہ تیز — لعل اپنے سنگِ دل کو بناتا نہیں کوئی
بازو میں زور، تیر مہیا، کماں درست — حیرت ہے کیوں نشانہ اڑاتا نہیں کوئی
ساقی کریم، بادہ کہن، مہرباں حریف — ساغر تک اپنا ہاتھ بڑھاتا نہیں کوئی
حسن اپنا جلوہ گرچہ دکھاتا ہے بے دریغ — فرصت مگر نظارے کی پاتا نہیں کوئی
جانیں لبوں پہ ہیں مگر اللہ رے بزدلی — آبِ بقا کے چشمے پہ جاتا نہیں کوئی
شکوہ ہے دردِ دل کا ہر اک کی زبان پہ — افسانہ چارہ گر کو سناتا نہیں کوئی
کہتے ہیں یہ کہ شیر سے پنجہ لڑائیں گے — آنکھیں غزال سے بھی لڑاتا نہیں کوئی

"شکوۂ دل"

کیا لے گا خاکِ مردہ و افتادہ بن کے تو
طوفان بن، کہ ہے تری فطرت میں انقلاب
کیوں ٹمٹمائے کرمکِ شب تاب کی طرح
بن سکتا ہے تو اوجِ فلک پر اگر شہاب
وہ خاک ہو، کہ جس میں ملیں ریزہ ہائے زر
وہ سنگ بن کہ جس سے نکلتے ہیں لعلِ ناب
چڑیوں کی طرح دانہ پہ گرتا ہے کس لئے
پرواز رکھ بلند، کہ تو بن سکے عقاب (دعوت انقلاب)

یہ تینوں نظمیں ایک ہی بحر میں ہیں اور یہی سلیم کی منظور نظر بحر ہے۔
اب ذرا فلسفیانہ رنگ کی بہار دیکھئے:۔

ذرے ذرے میں دواں موجِ رواں پاتا ہوں میں
زندگی کو ایک بحرِ بے کراں پاتا ہوں میں
برق کی جنبش ہو یا بادِ صبا کا ہو خرام
زندگی کا ہر تموج میں نشاں پاتا ہوں میں
چپہ چپہ اس مکاں کا ہے مکینوں سے بھرا
زندگی کو شش جہت میں حکمراں پاتا ہوں میں
ہو چکی ہے حکمراں جس نخل پر بادِ خزاں
اس کی رگ رگ میں بہارِ بے خزاں پاتا ہوں میں
چار سُو راہ سفر پر دوڑتی ہے جب نظر
زندگی کو کارواں در کارواں پاتا ہوں میں
جانے والوں کی تباہی کے نشانوں میں نہاں

آنے والی ہستیوں کی بستیاں پاتا ہوں میں
الغرض سمجھے ہو جن کو موت کی بربادیاں
زندگی کے انقلاب اُن میں نہاں پاتا ہوں میں

"زندگی"

مناظرِ فطرت کی مصوری میں سلیم اپنے عہد کے بہت سے شعرا سے بدرجۂ غایت بلند ہے۔ اس صنف کلام کی چند مثالیں آغاز میں گذر چکی ہیں۔ اب ایک مثال ایسی پیش کی جاتی ہے جس سے اُن ہلکے ہلکے داخلی تاثرات کا اظہار ہوتا ہے جو نظارۂ قدرت سے ہر تخیل پرست انسان کے دل میں رونما ہوتے ہیں۔ چشم ظاہر جب کسی حسین منظر کی سیر میں مصروف ہوتی ہے تو نگاہِ باطن اسی تاثر کے ماتحت کسی اور دنیا میں محوِ تماشا ہوتی ہے۔ دیکھئے منظرِ صبح کا بیان کس قدر دل آویز اور خیال انگیز ہے۔

روشن ہے تیرے عکس سے یہ جلوہ زارِ صبح   گل میں ترے چمن کی ہے گویا بہارِ صبح
ہیں تیرہ بخت تجھ سے جدا اس طرح رہا   جس طرح شام ہو نہ سکی ہم کنارِ صبح
چھپتے ترے نہاں ہے وہ حسن نظر گداز   ہٹ جا نظر کے سامنے سے اے غبارِ صبح
کس بادشاہِ حسن کا لاتا ہے تو پیام   آتا ہے کس طرف سے تو اے شہسوارِ صبح
یہ نند مے ہے کس نے بھری جام مہر میں   اس راز کو بتلائے گا کیا شیر خوارِ صبح
کیا نور کی پھوار سی پڑتی چمن میں ہے   گرتی کس آب و تاب سے ہے آبشارِ صبح
اے وہ کہ تیری نذر سے ہیں کافور ظلمتیں   تجھ پر نثار صبح ہے، میں ہوں نثارِ صبح
شبنم نہیں ہے جس کے جام کو دیکھ کر کیا ہی سرشار   ساقی پلا دو مجھ کو مے خوشگوارِ صبح

پرتو ترے جمال کا بھی اس میں ہے شریک
سورج کی روشنی پہ نہیں ہے مدارِ صبح

اب غزلوں کی طرف آئیے۔ اس مجموعے میں کم و بیش پچیس تیس ایسی بلند پایہ غزلیں ہیں جو سلیم کی اُن تمام خصوصیات کی آئینہ دار ہیں جن کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ نکھری ہوئی زبان، چست بندشیں، رنگین و شاداب استعارے، دلپذیر اشارے، مترنم مصرعے، غرضکہ اُس فن کاری کے لحاظ سے جسے جدید نقاد "ٹکنیک" کہتے ہیں سلیم کی غزل ایک نمونے کی چیز ہوتی ہے۔ البتہ یہاں وہ جوہرِ لطیف شاید نہ مل سکے جو میر کے ہاں سوز و گداز، غالب کے ہاں بلندیٔ فکر، اور داغ کے ہاں معاملۂ حسن و عشق کی صورت میں پایا جاتا ہے۔ ہیئت شعری سلیم کے ہاں بے عیب ہے۔ لیکن جو جنس خیال وہ پیش کرتے ہیں اگرچہ وہ تمثیلی حیثیت نہیں رکھتی لیکن سلیم کی تمام خصوصیات فکر سے ممتاز ہے۔ کیف و سرور، مستی و سرخوشی، نظارۂ جمال، لطف وصال، بہجت و نشاط، شوخی و رعنائی، غرضکہ ان کی عروس غزل سوز و گداز کے سوا ہر زیور سے آراستہ ہے۔ یاس و حرماں سے ان کی طبیعت کو فطرتاً کوئی لگاؤ نہ تھا اس لئے انہوں نے بہت اچھا کیا کہ اپنی غزلوں میں غم و اندوہ کے مضامین باندھنے کی بجائے اپنی عام روش کو قائم رکھا ہے

چند شعر ملاحظہ کیجئے:۔

غیروں نے کبھی تم کو مکرتے نہیں دیکھا   پر ہم نے کبھی وعدہ بھی کرتے نہیں دیکھا
کیا جانے تری مستیٔ انداز کو ساقی   مے جس نے تجھے جام میں بھرتے نہیں دیکھا
دانوں کو جو خرمن کے فراہم نہیں کرتے   بجلی سے کسی نے انہیں ڈرتے نہیں دیکھا
یوں ہم پہ بگڑتے جو ہیں یہ حضرتِ واعظ   شاید کسی مہوش کو سنورتے نہیں دیکھا

~~~

مہکا ہوا آمد سے تری ہے چمن ایسا   ہوگا نہ معطر کبھی دشتِ ختن ایسا
اک سینۂ فولاد ہے اک پارۂ بلور   ہوگا کسی دلبر کا دل ایسا نہ تن ایسا
حسن اُس کا تو رنگیں ہو مگر دل نہ ہو سنگیں   بت تو نے ہے دیکھا کوئی اے برہمن ایسا

~~~

اب رنگ کا بدلنا دیکھئے:۔

ہوں جب سے غرق تیرے کرم کے خیال میں   بحرِ جہاں کو تا بہ کمر دیکھتا ہوں میں
بخشی ہیں میرے ذرّے کو تو نے وہ رفعتیں   سجدہ میں آفتاب کا سر دیکھتا ہوں میں
سورج کی زد میں گرچہ فنا کا یقین ہے   شبنم کو پھر بھی سینہ سپر دیکھتا ہوں میں
دل سے کسی آفتاب کے اٹھنے کا وقت ہے   رگ رگ میں اپنی نورِ سحر دیکھتا ہوں میں
کس بام پر ہے مرغِ تخیل کا اب گذر   لرزاں جبرئیل کا پر دیکھتا ہوں میں

~~~

چار تنکوں کا ہوں میں مالک مگر جرأت تو دیکھ   انتظارِ جلوۂ برقِ تپاں کرتا رہا
جستجو تھی تیرے حسن عرش منزل کی مجھے   اپنی ہستی کو غبارِ کہکشاں کرتا رہا
دو قدم پر عشق کو لیلےٰ کا محمل مل گیا   فلسفہ برسوں تلاش کارواں کرتا رہا
تیرے اس اعجاز پر صد آفریں اے ضبطِ عشق   تو مرے ہر قطرے میں دریا نہاں کرتا رہا
مجھ سے پوچھے کوئی تیرے حسن کی نیرنگیاں   جو تری خاموشیوں کو نغمہ خواں کرتا رہا

~~~

نسیم صبح بہار بن کر، چمن میں اے جذبۂ محبت
سنایا شبنم کو کس ادا سے فسانۂ آفتاب تو نے

تھے تبسم کی شوخیوں کی یہ ایک تشنہ جھلک تھی ساقی
کہ قطرے قطرے کو خون دل کے پلا دیا اضطراب تُو نے
کرے گی کیا ہمسری قیامت ترے قدِ فتنہ آفریں کی
کہ ٹھوکروں میں مسل دیئے ہیں ہزارہا انقلاب تُو نے
کرن حقیقت کی تلملائی کہ جھونک دے پر وہ نظر کو
غبارِ حسنِ مجاز کا جب اُتار پھینکا نقاب تُو نے
عروس معنی نے مجھ کو دیکھا، ادا سے گردن اُٹھا اُٹھا کر
دیا ہے پیری میں اے تخیل مجھے وہ رنگیں شباب تو نے
ہر ایک سطرِ نفس میں غافل ہزاروں اسرار جلوہ گر ہیں
ورق ورق کھول کر نہ دیکھی، یہ زندگی کی کتاب تو نے

ساقیٔ حسن لائے جلوہ ذرا رک کے دے	کہ چھلکنے کو ہے ساغر مری بینائی کا
میری دنیائے تخیل میں اندھیرا ہے اگر	تم نقاب آ کے اُلٹ دو شبِ تنہائی کا

خبیر ادراک رہ جائے جہاں پرواز کر	اس فضا میں آج دکھلانی ہے جولانی مجھے
کر کے دانائی کا دعویٰ ایسا میں کھویا گیا	ڈھونڈتی پھرتی ہے ہر سو میری نادانی مجھے

میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ مجھ کو غنچہ و گل میں
تجلی ڈھونڈتی پھرتی ہے خورشیدِ درخشاں کی
حجاب قدس میں تاروں کی آنکھوں سے وہ پنہاں تھا
سحر نے کھینچ دی تصویر اُس کے حسنِ عریاں کی

ہے مرے جذبات کا ہنگامہ برپا ہر کہیں	ظالم و جاہل ہوں لیکن نورِ حق محفل ہوں میں
اہرمن بھی ساتھ یزداں کے مری فطرت میں ہے	روشنیٔ حق ہوں میں تاریکیٔ باطل ہوں میں
ڈال مجھ پر اک نظر اے نخل بندِ کائنات	تیری کشتِ آرزو کا آخری حاصل ہوں میں

نہ دیکھ دل کو حقارت سے گر غبار ہے یہ	جسے تو ذرہ سمجھتا ہے آفتاب ہے یہ
ہزاروں نغمۂ اسرار اس میں پنہاں ہیں	خدا کے ہاتھ سے بجتا ہے وہ رباب ہے یہ

نشہ ہے زندگیٔ لازوال کا اس میں
ملا نہ خضر کو وہ ساغرِ شراب ہے یہ

الٹ دیتا نقاب اُس گل کا اُلٹے ہاتھ سے میں بھی
سہارا گر ترا تھوڑا سا اے بادِ سحر ہوتا
یکایک پو اگر پھٹتی تری صبحِ تجلی کی
سحر کا رنگ دھندلا صورتِ شمعِ سحر ہوتا

ستارے کہکشاں سے ٹوٹ کر کچھ ہو گئے غائب
فرشتے ڈھونڈتے پھرتے ہیں اُن کو مہ جبینوں میں
رہو یوں خندہ پیشانی کہ سمجھے دیکھ کر دنیا
ہزاروں چاند اُتر آئے ہیں گویا ان جبینوں میں

تو نغمہ چاہتا ہے فغاں چاہتا ہوں میں	تو چاہتا ہے جو، وہ کہاں چاہتا ہوں میں
ٹھہرے یہ چاہتا ہے مسرت کی لہر تو	سینے میں ایک برق تپاں چاہتا ہوں میں
تو چاہتا ہے دل کو سکوں ہو ترے نصیب	بے تاب دمبدم رگِ جاں چاہتا ہوں میں
شیخ حرم سے گر تجھے زمزم کی ہے طلب	پیرِ مغاں سے رطلِ گراں چاہتا ہوں میں
تو زندگی کے ساحلِ خاموش پر مقیم	گردابِ زندگی کا سماں چاہتا ہوں میں
منبر پہ تجھ کو جلوۂ واعظ کا اشتیاق	سولی پہ رازِ حق کو عیاں چاہتا ہوں میں
تو چاہتا ہے دل ہو ترا لالہ زارِ عیش	اُٹھتا ہوا جگر سے دھواں چاہتا ہوں میں
دنیا مسرتوں کی ہے درکار گر تجھے	بیتابیوں کا ایک جہاں چاہتا ہوں میں

قادر الکلامی کی اس سے بلند مثالیں ہمارے ادب میں ڈھونڈے ہی سے ملیں گی۔ لیکن افسوس کہ ایسی حیرت انگیز روانی کے باوجود سلیم بعض دفعہ لفظی رعایتوں کی دلدل میں بری طرح پھنس جاتے ہیں۔ چند شعر ملاحظہ کیجئے۔

پرتو سے تیرے حسن کے قدر ان کی بڑھ گئی
کانٹوں میں تولتا ہوں ہر اک گل کے زر کو میں
جلوہ تمہارا کوئی گرفتار ہو نہ جائے
بچنا، کہ پھینکتا ہوں کمندِ نظر کو میں
روشن خیال جھڑتے ہیں میرے دماغ سے
چھلنی میں چھانتا ہوں فروغِ سحر کو میں

بھلا ایسے اشعار کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ الفاظ کے باہمی ارتباط و تقابل کو نمایاں کرنے کے سوا ان سے کچھ فائدہ حاصل نہیں ہوا۔ مگر ایسی بھونڈی چیزیں اُن کے ہاں بہت کم ہیں اور جو ہیں وہ چاند کے لئے گہن

کے لزوم کا حکم رکھتی ہیں۔

مجموعہ زیر نظر کی تالیف و ترتیب میں ہمیں کچھ نقص بھی نظر آئے جنہیں ظاہر کئے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔ اول یہ کہ فہرست مضامین سرے سے غائب ہے۔ اس لئے مطلوبہ نظموں کی تلاش میں بہت دقت ہوتی ہے دوئم یہ کہ نظموں اور غزلوں کے تقدم و تاخر میں کسی خاص ترتیب کا لحاظ نہیں رکھا گیا۔ ان کے علاوہ ایک بڑا سہو ناشرین سے یہ ہوا ہے کہ ۲۵ سے لے کر ۳۲ تک کے صفحات الٹ پلٹ چھپ گئے ہیں۔ جس سے مخمس سلیم جو ایک طویل نظم ہے تباہ ہو کر رہ گئی ہے۔ کیا اچھا ہوتا اگر یہ فرمہ دوبارہ چھاپ کر کتاب کو اس بڑے نقص سے بچا لیا جاتا۔

جناب مرتب کی کوششیں قابل داد ہیں کہ انہوں نے نہایت محنت سے سلیم کا کلام جمع کر کے اس کی بقا کا اہتمام کیا۔ بعض نظمیں اس مجموعے میں نظر نہیں آئیں۔ مثلاً "یاران شباب" کہ "زمانہ" میں چھپ چکی ہے اور "جوش نوجوانی" جو "مخزن" کے دور سوئم میں شائع ہوئی تھی۔ سی آر داس مرحوم کی نظم "ساگر سنگیت" کا ایک نامکمل ترجمہ ادبی دنیا میں شائع ہوا تھا وہ اس مجموعے میں موجود ہے لیکن یہی نظم زمانہ میں کئی اقساط میں طبع ہو کر پایہ تکمیل کو پہنچ چکی ہے۔

مولف صاحب نے اس کتاب کے مقدمہ میں ایک جگہ لکھا ہے

تسلیم جمالیات کا عاشق زار ہے لیکن اس کے لئے اس نے بالعموم مظاہر قدرت کا انتخاب کیا ہے۔ بقول اکبر الہ آبادی

حسن جس چیز میں ہو دیکھ کے خوش کر دل کو
بند کر لے مگر آنکھیں اگر انسان میں ہو"

ظاہر ہے کہ اکبر کا یہ شعر ہماری معاشرتی کمزوریوں پر ایک طنز ہے۔ وہ ہرگز یہ نہیں کہتا کہ انسان کے حسن سے آنکھیں سیراب نہ کی جائیں بلکہ وہ تو ہماری سوسائٹی کے مصنوعی آداب پر ہنستا ہے کہ ہم کوہ و دمن اور لالہ و گل کے حسن کی سیر تو پوری آزادی سے کر سکتے ہیں۔ لیکن جہاں حسن انسانی کی دید کا سوال آیا سوسائٹی ہمیں آنکھیں بند کر لینے کا حکم دیتی ہے۔ بس اکبر کے اس شعر سے سلیم کی مناظر قدرت سے دل بستگی اور حسن انسانی سے بے نیازی ثابت نہیں کی جاسکتی۔ ہماری رائے میں سلیم حسن انسانی کا بھی ویسا ہی شیدائی ہے جیسا مناظر فطرت کا۔ اسکا ثبوت اسکے کلام سے بخوبی مل سکتا ہے اور جو مثالیں اس مضمون میں جگہ جگہ دی گئی ہیں وہ بھی ہمارے اس خیال کی تصدیق کرتی ہیں۔

"ص"
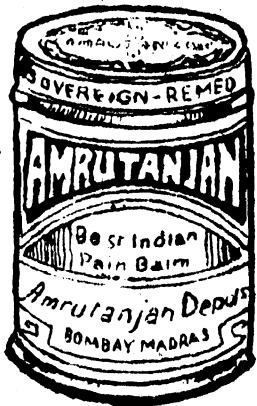
فہرست مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہ اگست ۱۹۳۹ء

جلد ۱۷ تصاویر: ۱۔ شام۔ ۲۔ افلاس **نمبر ۸**

سالانہ چندہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے ممالک غیر سے دس شلنگ

گیلانی پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام مسٹر صلاح الدین پرنٹر و پبلشر چھپ کر دفتر ادبی دنیا کمرشل بلڈنگ مال روڈ لاہور سے شائع ہوا —

پیشاب کی تمام
خطرناک بیماریوں کا
تیر بہدف
علاج
سوزول
پہلی ہی خوراک کے استعمال سے پیپ جلن
MAQBOOL'S
GONORRHOEA
MIXTURE.
SOZOL
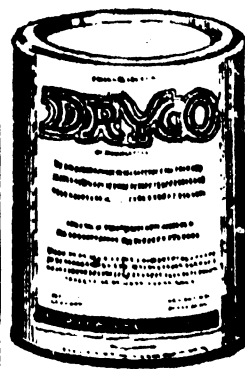
ڈرائیکو
شیرخوار بچوں کیلئے شدید بیماری کے مریضوں کے لئے اور بیماری سے اُٹھنے والے مریضوں کے لئے
بہترین طاقت بخش غذا ہے
DRYCO

بزمِ ادب

اس دفعہ سید شہنشاہ حسین صاحب رضوی کا مضمون عہدِ مغلیہ کی ٹکسالیں اور پروفیسر اظہر علی فاروقی کا مضمون ڈاکٹر نذیر احمد کا ایک ناول دونوں مساوی طور پر انعامی مضامین قرار پائے ہیں اور اسی طرح اُپیندر ناتھ صاحب اشک کا افسانہ "تہذیب" اور خلیل احمد صاحب کا افسانہ "سایہ" دونوں کو انعام کے قابل سمجھا گیا ہے۔ ہر ماہ کی انعامی رقم بیس روپے مقرر ہے لیکن اب کے اس میں آٹھ روپے کا اضافہ کر کے چاروں صاحبوں کو سات سات روپے پیش کئے جا رہے ہیں۔

موجودہ نمبر میں اہم رسائل کے بہترین مضامین کے تعارف کی تیسری قسط شائع ہو رہی ہے۔ ہمارے بہت سے قلمی معاونین اور ناظرین نے اس سلسلے کو بے حد پسند کیا ہے۔ لیکن تعجب ہے کہ ہمارے معاصرین میں سے کسی ایک نے بھی اس پر اپنی رائے کا اظہار نہیں کیا۔ حالانکہ یہ اُن کی خاص دلچسپی کی چیز تھی۔ ہم اردو کے تمام رسائل کو ایک ہی خاندان کے ارکین اور ایک ہی درخت کی مختلف شاخیں سمجھتے ہیں اور اس لئے ہمیں اپنے صفحات پر اُن کے ذکر سے ایک خاص مسرت محسوس ہوتی ہے۔ معلوم نہیں یہ احساس یک طرفہ ہے یا مشترک۔ مگر ابھی تک بیشتر معاصرین کی طرف سے اس کا کوئی حوصلہ افزا ثبوت نہیں ملا۔ بہر حال ہمارے ہاں یہ سلسلہ بند نہیں ہوگا اور ہمارے ناظرین ہر ماہ اردو کے بہترین مضامین نظم و نثر سے متعارف ہوتے رہیں گے۔

ہمارے شعراء نے آغاز ہی سے اپنے جذبات و افکار کے اظہار کا ذریعہ غزل کو بنا رکھا ہے۔ لیکن جب سے باقاعدہ نظم کا رواج ہوا ہے۔ یہ صنفِ سخن آہستہ آہستہ اردو شاعری پر چھا رہی ہے یہاں تک کہ ہمارے رسائل میں اکثر غزلوں کے عنوان نظموں کے ڈھب پہ رکھے جاتے ہیں۔ مثلاً محض غزل لکھ دینے کی بجائے "آئینۂ حیرت، محشرِ جذبات، اعجازِ بیان، نوا ہائے راز، تجلیات، حسنِ نظر" وغیرہ عنوان لکھے جاتے ہیں۔ ان میں بعض اوقات شاعر کے تخلص کی رعایت مدنظر رکھی جاتی ہے۔ اور بعض دفعہ ایک شاعر اپنے لئے ایک عنوان یوں ہی مخصوص کر لیتا ہے۔ یہ طریقہ "ادبی دنیا" میں بھی برسوں رائج رہا۔ لیکن دو ماہ سے ہم غزل کا عنوان غزل ہی دیتے ہیں۔ اگرچہ اس سے ہمارے بعض کرمفرماؤں کو اختلاف ہے۔ اور وہ مُصر ہیں کہ اُن کی غزلوں پر اُن کے پسندیدہ عنوان دئیے جائیں غزل کو ہمارے ادب میں جو اہمیت حاصل ہے اُس سے ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا اور عنوانات کے موجودہ رواج سے غزل ایک غیر نمایاں سی چیز ہو کر رہ جاتی ہے۔ اس لئے ہم غزل اور نظم کے امتیاز کو نمایاں کرنے کے لئے غزل کو غزل ہی کے نام سے پکارنا بہتر سمجھتے ہیں۔ امید ہے کہ ناظرین اس بارے میں ہم سے متفق ہوں گے۔

ناظرین کو یہ معلوم کر کے مسرت ہوگی کہ ہمارے معزز دوست جناب عبدالسمیع صاحب پال آثر صہبائی کی نظموں کا مجموعہ "ذکر و فکر" کے نام سے عنقریب شائع ہونے والا ہے۔ اس مجموعے میں صرف آثر کی نظمیں ہوں گی۔ غزلیں اور رباعیاں نہیں۔ جناب آثر نے جو بلند درجہ رباعیات لکھنے اور غزل کہنے میں حاصل کیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ اپنی نظموں میں وہ اس سے بھی اونچے مقام پر پہنچیں گے۔

اسی طرح ہمارے لئے یہ اعلان کرنا بھی باعثِ مسرت ہے کہ ادبی دنیا کے معاونِ خصوصی پروفیسر رگھوپتی صاحب فراق گورکھپوری کا مجموعۂ کلام بھی بہت جلد چھپنے والا ہے۔ اس میں جناب فراق کی پختگیِ فکر کے بہت سے شگفتہ نمونے دیکھنے میں آئیں گے۔ نام ہوگا، "سازِ ہستی"۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے ناظرین ان دونوں مجموعوں کے مطالعے سے فائدہ اٹھائیں گے۔

صلاح الدین احمد

آئینۂ عالم

گاندھی سے ایک امریکن کی ملاقات

برما کو نکال کر ہندوستان کی آبادی ۳۸ کروڑ نفوس کے قریب ہے۔ یا شاید اس سے بھی زیادہ۔ ان تمام ہندو، مسلمان، سکھ، پارسی اور یورپین افراد میں ایک ہستی ایسی بھی ہے جس کے لئے ان تمام لوگوں کے دلوں میں عزت و احترام کا جذبہ موجود ہے۔ یہ شخص گاندھی ہے جسے اس کی بزرگی کی وجہ سے "مہاتما" کہا جاتا ہے۔

بظاہر ہندوستان پر برطانی وائسرائے لارڈ لنلتھگو شہنشاہِ معظم کی طرف سے حکمران ہیں۔ ان کے محل کے پھاٹکوں پر سپاہیوں کا پہرہ ہر وقت موجود رہتا ہے۔ جب کبھی وہ کسی تقریب پر باہر نکلتے ہیں تو نیزہ بند سواران کی گاڑی کے ساتھ ساتھ چلتے ہیں اور سرکاری تقریبوں پر قصر بکنگھم کی طرح ان کے دربار میں بھی خاص درباری لباس پہننا ضروری ہے کیونکہ ان کے دربار میں بھی ویسے ہی اہم معاملات سرانجام پاتے ہیں اسی طرح ان کے ملاقاتیوں اور ان کے سفر کے حالات روزناموں میں سرکاری نشان کے ساتھ اشاعت کے لئے بھیجے جاتے ہیں۔

لیکن ہندوستان میں سب سے بڑی حقیقی طاقت (جسے وہ اگر استعمال کرنا چاہے تو ہر وقت کر سکتا ہے) ایک بوڑھے شخص کے قبضے میں ہے جو سفید سوتی دھوتی باندھے اور ایک اونی کمبل لپیٹے کھجور کے پتے کی چٹائی بچھائے کسی محل کے چبوترے پر یا کسی خس کے جھونپڑے میں جہاں کہیں بھی وہ ہو، اپنے پیرووں کے چھوٹے سے گروہ میں گھرا ہوا عام مسائل زندگی پر غور کرتا یا ہندوستان کی گتھیوں کو سادہ لیکن مدبرانہ سوچ بچار کے ساتھ سلجھاتا نظر آتا ہے۔

مہاتما گاندھی کی عمر اس وقت ۷۰ سال ہے۔ اس کی زندگی بھی اتنی ہی سادہ ہے جتنا کہ اس کا لباس۔ اس کی روزانہ خوراک خشک میووں، تھوڑے سے چاول اور بکری کے دودھ پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس کا دن عبادت سے شروع ہوتا ہے اور عبادت پر ہی ختم ہوتا ہے ہفتے میں ایک دن اس کی خاموشی کا دن ہوتا ہے۔ اس دن وہ کسی سے بات چیت نہیں کرتا خواہ اس کا بولنا کتنا ہی ضروری ہو۔

وہ اپنے پیرووں کو صرف ہدایت کرتا ہے حکم نہیں دیتا۔ اس کی تعلیم عدم تشدد ہے اور اس کا تنہا ہتھیار وہ عقوبتیں ہیں جنہیں وہ اپنے آپ پر عاید کرتا ہے عوام کی کسی تکلیف کا مسئلہ ہو یا اپنے پیرووں کو نافرمانی سے باز رکھنے کا معاملہ، وہ اس وقت تک کھانا پینا بند کر دیتا ہے جب تک کہ وہ مسئلہ سلجھ نہ جائے۔ اگر ضرورت ہو تو اس بات کا اعلان کر دیا جاتا ہے کہ یہ برت اس وقت تک جاری رہے گا۔ جب تک یہ مسئلہ حل نہ ہو جائے یا مہاتما کی موت نہ واقع ہو جائے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان موقعوں پر مہاتما کو مرنے نہیں دیا جاتا۔ وائسرائے جہاں کہیں بھی ہوں گھر کی طرف بھاگے آتے ہیں اور اس تکلیف کو رفع کر دیتے ہیں یا باغی ہتھیار ڈال دیتے ہیں۔ ہندوستان کی کوئی ہستی گاندھی کی موت کی تاب نہیں لا سکتی۔

گاندھی اس وسیع و عریض ملک کی سب سے بڑی ہستی ہے۔ اس کے معمولی سے اشارے پر ہندوستان کے کروڑوں نفوس بڑی سے بڑی قربانی کرنے کو تیار ہیں۔ اس کے ایک لفظ پر لاکھوں انسان اپنا مال و دولت، آزادی یہاں تک کہ اپنی جان بھی نذر کرنے پر آمادہ ہیں۔ یہ طاقت دوسرے کسی انسان کو حاصل نہیں ہے اور نہ کسی

کے الفاظ میں یہ اثر ہے۔

میں دہلی میں گاندھی کا انتظار کر رہا تھا کہ مجھے اس ملاقات کا موقع مل جائے جس کا اس نے مدت سے وعدہ کر رکھا تھا۔ اپنے متعدد سفروں کے دوران میں میں جہاں کہیں بھی پہنچا ہوں وہ کسی اور جگہ ہوتا تھا لیکن آخر کار میں نے اُس کی عارضی قیام گاہ کا پتہ لگا لیا۔

مغربی دنیا گاندھی کو صرف اُن تصاویر اور مضامین کے ذریعے سے جانتی ہے جو اخبارات میں آئے دن چھپتے رہتے ہیں، اس کے فاقوں کے متعلق، اس کی یاتراؤں کے متعلق اور اس کے آشرم کے متعلق۔ اسے ایک سیاست دان، غیر معمولی ہستی یا عطائی بنا دینا ہر پڑھنے والے کی ذہنی حالت پر منحصر ہے۔ حقیقت میں اس کی ہستی ایک قومی قوت ہے —— اور شاید سب سے بڑی قوت۔

اس کے چند ہی روز بعد مجھے مہاتما سے ملاقات کا موقع مل گیا۔ گفتگو کے دوران ہی میں مجھے اس کی قوتِ بیان کا احساس ہونے لگا۔ وہ ایک غیر معمولی ہستی ہے۔ اس کی ملاقات کے لئے یہ ضروری تھا کہ میں صبح ۵ بجے اٹھ کر بغیر کچھ کھائے پیئے اس کی قیام گاہ تک جاؤں۔ ایسے آدمی کے لئے جو چالیس سال سے نامہ نگاری کے فرائض ادا کرتے کرتے دوپہر چڑھے تک سونے کا عادی ہو گیا ہو۔ اتنا سویرے اُٹھنا بجائے خود ایک اذیت تھی اور مجھے اس کا شدید احساس بھی ہوا لیکن ہندوستان کے اس بزرگ سے دوچار ہوتے ہی میں اپنی ساری کلفت بھول گیا۔

اگر کسی شخص کو اپنے فوٹوگرافروں سے قانونی چارہ جوئی کرنے کی وجہ پیدا ہو سکتی ہے تو وہ گاندھی کی ذات ہے۔ اس لئے نہیں کہ فوٹوگرافروں کا یہ رویہ حاسدانہ ہے یا ان کے کیمرے بُری تصویر اتارتے ہیں بلکہ اس کی وجہ خود فوٹوگرافی کے فن کی خامی ہے۔ کیمرا صرف جسمانی اعضا کو ظاہر کرتا ہے۔ مہاتما کی تصویر میں گھٹا ہوا سر، بڑے بڑے کان، سوکھا گندمی چہرہ، اور پچکا ہوا بے دانت کا منہ بہت نمایاں ہوتا ہے اس میں اس کا نحیف و نزار جسم، بے ہنگم سفید دھوتی اور موٹا بھورا کمبل تو نظر آجاتا ہے۔ لیکن حقیقی گاندھی بالکل پوشیدہ رہتا ہے۔

اگر آپ مہاتما کی آنکھوں میں دیکھیں جن سے ایک گوشہ نشین سادھو کی طرح عزم اور حیا کا اظہار ہوتا ہے۔ تو آپ کہیں گے "یہ ایک نیک انسان ہے"۔ اگر آپ اس کی لطیف مسکراہٹ کو دیکھیں تو آپ کہیں گے "یہ ایک کریم النفس انسان ہے جس کے دل میں ہر شخص کے لئے خیر کا جذبہ ہے اور دشمنی کا عنصر مفقود ہے"۔ اس کی نرم آواز، اس کی سوچی اور سلجھی ہوئی گفتگو ان احساسات کو اور گہرا کر دیتی ہے۔ اور بولنے والے کے اخلاص اور سچائی کو ظاہر کرتی ہے۔ یہ چیزیں کیمرے کی تصویر ظاہر نہیں کر سکتی۔

گاندھی سے گفتگو شروع کرتے ہی اس کی عقیدت کا قیدی نہ ہو جانا ناممکن ہے۔ یہ بھی ناممکن ہے کہ کوئی صحیح دل و دماغ کا انسان اس سے گفتگو کرے اور اس کے خلوص اور بے نفسی سے متاثر نہ ہو۔ وہ سوچتا بھی ہے تو بلند آواز سے جس سے انسان اس کے دلی خیالات بھی پڑھتا جاتا ہے۔

وہ سوال جو میں نے گاندھی سے کرنے کے لئے سوچ رکھا تھا۔ اور جو موجودہ ہندوستانی سیاسی مسئلے کی جان تھا۔ اس کا جواب مجھے نہ دیا گیا۔ نہایت نرمی لیکن مضبوطی کے ساتھ اس نے اس سوال کا جواب دینے سے انکار کر دیا کہ اگر برطانیہ کو یورپ کی آئندہ جنگ میں حصہ لینا پڑا تو اس کے پیروؤں کا رویہ کیا ہوگا یا ہندوستان اپنی آزادی کو برطانوی اقتدار کے ماتحت تسلیم کرے گا یا مکمل آزادی حاصل کر کے رہے گا؟ گاندھی نے نہایت نرمی سے جواب دیا کہ ان دونوں سوالوں کا جواب دینا اس وقت بہت دشوار ہے اور دوسرے سوال کے متعلق تو ابھی میں نے فیصلہ ہی نہیں کیا۔

میں نے ان سوالوں کے جواب کے لئے اصرار نہ کیا بلکہ ان کی بجائے کچھ اور پوچھنا مناسب سمجھا۔ لیکن ان کا جواب دینا بھی اس نے سیاسی تدبر کے خلاف سمجھا اور نہائت صفائی سے طرح دے گیا۔ آخر مجھے ایک ایسی بات سوجھ گئی جس سے مہاتما متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ میں نے پوچھا کہ کیا آپ دنیا کے نام کوئی ایسا پیغام دینا مناسب سمجھیں گے جو ہندوستان سے پرے اُن ملکوں کو جو آمادۂ پیکار ہیں امن کی تلقین کرے۔ مہاتما اس سے متاثر ہوا۔ کچھ دیر تو وہ خاموش رہا۔ پھر اس نے بلند آواز کے ساتھ سوچنا شروع کیا۔

ایسا ایک خیال اس کے دماغ میں موجود تھا اور اسے پیغام کی صورت میں پیش کیا جا سکتا تھا۔ لیکن ایسا کرنا درست بھی ہے کہ نہیں؟ اس کی رائے میں یہ خیال سچائی اور دانائی کا نچوڑ تھا لیکن باہر کی سخت دل مادی دنیا اس رائے سے اتفاق نہ کرے گی۔ یہ دنیا اس

پیغام کی اور خود اُس کی ہنسی اڑائے گی۔ کیا ایک دفعہ پھر دنیا کی تضحیک کی آماج گاہ بننے سے کچھ فائدہ ہوگا؟ بہرحال ہنسی مذاق ایک پسندیدہ شئے ہے۔ کیوں نہ ایک دفعہ پھر قسمت آزمائی کی جائے۔

اس نتیجے پر پہنچ کر اس نے فوراً اپنا پیغام لکھانا شروع کر دیا۔ پیغام صرف یہ تھا کہ چیمبرلین کو چاہیئے کہ جب وہ اپنے حلیفوں کے ساتھ مجلس شوریٰ منعقد کرے تو تمام طاقتوں کو فوراً ہتھیار ڈال دینے کا مشورہ دے۔ مجھے اتنا ہی یقین ہے جتنا کہ اپنے یہاں بیٹھنے کا مجھے یقین ہے۔ کہ ہٹلر بھی اس سے متاثر ہو کر اسلحہ ڈال دے گا۔

یہ تھا گاندھی کا دوسرا رُخ اُس بزرگ ہستی کا جسے انسان کی امن پسندی اور اخوت پر ایمان ہے۔ وہ امتیازی صفت جو اُسے دوسرے سیاست دانوں سے الگ ظاہر کر رہی ہے۔ جنہوں نے دنیا میں ایسے خیالات کو کئی بار پاؤں تلے روندا جاتے دیکھا ہے۔ اپنا پیغام لکھانے سے پہلے وہ بلند آواز سے اس کے نتائج وعواقب پر غور کر رہا تھا۔ لوگوں کا خندہ و استہزا، تضحیک، کارٹون، ٹھٹھا، لیکن ہنسی بہرحال ایک لطیف شے ہے ہنسی کو پیدا کرنے والی بات کہنا اچھا فعل ہے۔ چنانچہ اس پیغام کی اشاعت کر دی جائے۔

میں نے پوچھا کیا یہ ایک معجزہ نہ ہوگا؟ لیکن اُسے تو صرف وہ فوائد نظر آرہے تھے جو اس کے نتیجے میں پیدا ہونے تھے۔ مذاق ایک پرلطف شے ہے اور خندہ و استہزا کا نشانہ بننا اُسے ناگوار نہیں ہے۔ چنانچہ

——"شاید معجزہ ہی ہو" مہاتما نے کہا" لیکن اس سے دنیا اس کشت وخون سے بچ جائے گی جس کا امکان ہر گھڑی نظر آرہا ہے۔

ممکن ہے ایسے معجزے رونما ہوتے ہوں اور یہ خاص معجزہ بھی ظاہر ہو جائے لیکن میرا ذہن یکایک جرمنی کی اُس لکھو کھا کی فوج کی طرف منتقل ہو گیا جو یلغار کرتی ہوئی بڑھتی چلی آرہی ہے اور جرمنی کی جدید ترین حربی ترقیاں میری آنکھوں کے سامنے پھر گئیں۔ پھر اس جد و جہد اور مشقت و محنت کا خیال آیا جو انہیں حاصل کرنے کے لئے انہوں نے برداشت کی ہے اور اس یقین کا تصور کہ اس طاقت کے بھروسے پر وہ دنیا کو زیر کر کے اپنے دل کی خواہشوں کو پورا کریں گے اور جب میرا تصور واپس اپنے ماحول پر دوبارہ منعطف ہوا تو وہی سادہ مزاج اور پرخلوص بڈھا میرے سامنے بیٹھا تھا جسے کبھی ایسے خونخوار دشمنوں سے پالا نہیں پڑا جس کا مقابلہ نسبتاً رحم دل اور نرم طبیعت والے لوگوں سے ہے جو سول نافرمانی اور فاقے جیسے کمزور اور بے ضرر ہتھیاروں سے بھی دب جاتے ہیں۔

اتنی سی ملاقات کے بعد اس کا نحیف و نزار جسم جو حال ہی کے فاقے سے اور بھی کمزور ہو چکا ہے تھک گیا اور اس کے ہر وقت مستعد رہنے والے دل کو یورپ کے سیاسی مسائل حل کرنے کے علاوہ کئی اور باتیں یاد آئیں جو اسے آج ہی سرانجام دینی تھیں۔

"کیا آج کی صبح کے لئے اتنا ہی کافی نہیں ہے" مہاتما نے کہا

امن وصلح کا جو حل گاندھی نے بتایا ہے۔ دنیوی کاروبار کی گہما گہمی میں شاید اس مضمون کے شائع ہونے سے پہلے ہی مجھے بھول گیا ہوگا۔ لیکن یہ تصویر ادھوری رہ جائے گی اگر میں اُس اثر کا اظہار نہ کروں جو اس کی اشاعت سے ہندوستان پر ہوا۔

اس پیغام کو ہندوستانی تار بابوؤں کے رحم پر چھوڑنے سے پہلے یہ ضروری تھا کہ میں اسے اُن کی آسانی کے لئے ٹائپ کرا لیتا۔ چنانچہ میں ایسوسی ایٹڈ پریس کے دفتر میں جو امریکن ایسوسی ایٹڈ پریس سے ملحق نہیں ہے اپنے ایک دوست کے پاس چلا گیا اور اس سے ٹائپ کی مشین اور ایک کلرک کی خدمات حاصل کیں۔

جب میں کام کرا کے رخصت ہونے لگا تو دفتر کا انگریز مینیجر میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو تو "ٹائمز" میں شائع ہو جانے کے بعد اس روئیداد کو ہم بھی استعمال کر لیں؟ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہ تھا چنانچہ میں نے مضمون کی ایک نقل اُسے دے دی جسے وہ ایک خاص مدت کے بعد استعمال کر سکتا تھا۔ دو دن کے بعد یہ تمام واقعہ میرے ذہن سے اُتر گیا۔

تیسرے روز کلکتے میں میرے ہوٹل کے دروازے کے سامنے ایک اخبار فروش کھڑا تھا جس کے ہاتھ میں اخبار کے اہم عنوانات کا اشتہار بھی تھا۔

"مہاتما گاندھی نے یورپ کی سیاسی گتھی سلجھا دی"

یہ عنوان پورے صفحے کی چوڑائی پر جلی حروف میں لکھا نظر آتا تھا اور اس کے نیچے مہاتما کی تصاویر کے پرانے ذخیرے میں سے جلدی میں انتخاب کی ہوئی ایک تصویر چھپی ہوئی تھی۔ ہندوستانی صحافت نگاری کی روایات کے مطابق گاندھی کے الفاظ "کشت وخون" کو "قضیئے" سے بدل دیا گیا تھا جس سے اس کا اصل مطلب ہی فوت ہو گیا تھا اور پھر بعض جگہ

میرے حواشی کو گاندھی کے الفاظ سے تعبیر کیا ہُوا تھا لیکن گاندھی کا پیغام بہرحال موجود تھا۔

لوگ جھپٹ جھپٹ کر اخبار خرید رہے تھے اور چائے پینے کے کمرے میں چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں تقسیم ہو کر نہایت مسرّت اور فخر کے ساتھ مہاتما کے متعلق بحث کر رہے تھے۔ نتیجہ اخذ کرنے میں سب متفق تھے"۔ کوئی جنگ نہ ہوگی۔ گاندھی نے کہہ دیا ہے۔ اُس نے اس مسئلے کو حل کر لیا ہے"! اگلی صبح کے تمام ہندوستانی اخبار اس نتیجے کے دہرانے میں یک زبان تھے۔

اس وسیع وعریض بر اعظم یعنی ہندوستان کے بسنے والے ایک ہی لکیر کے فقیر ہیں اور یورپ کے دور افتادہ ممالک کے متعلق یا وہاں کے ہولناک معاملات کے متعلق کچھ نہیں جانتے[1]۔ ہندوؤں میں سے اکثر کا اس بات پر ایمان ہے کہ وہ اکیلے اور نہتّے رہ کر صرف سول نافرمانی اور فاقوں کے ہتھیاروں کے بل پر اس حقیقی دنیا کے خونریز ارادوں اور ہولناک اسلحہ سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ آسٹریا، چیکوسلوویکیا اور میمل کی خونریز داستانیں ہندوستان کو ابھی سے بھول چکی ہیں اور روانتی چکنے گھڑے پر سے بوند کی طرح پھسل گئی ہیں۔

اور گاندھی، خوش آئند سپنے دیکھنے والا مہاتما اس ہندوستان کا پیر اور پیغمبر ہے۔ ممکن ہے کہ وہ حقیقت میں اس سے زیادہ چالاک ہو جتنا کہ وہ نظر آتا ہے کیونکہ وہ ہر قسم کے حالات کے مطابق اپنے آپ کو نئے سانچے میں ڈھال لیتا ہے لیکن آخر وہ ایک بڈھا آدمی ہے ۔۔۔۔۔!

(ایک مغربی نامہ نگار)

مظفر احمد

[1] جیسے مغرب والے ہندوستان کو صرف شیر چیتوں، ہاتھیوں سپیروں اور راجوں مہاراجوں کا مجموعہ ہی سمجھتے ہیں۔ ادارہ

(ترجمہ)

قطعات

(۱)

برس کے چھٹ گئے بادل، ہوائیں گانے لگیں
گرجتے نالوں میں چرواہیاں نہانے لگیں
وہ نیلی، دھوئی ہوئی گھاٹیوں سے دو گونجیں
کسی کو دُکھ بھری آواز میں بلانے لگیں

(۲)

وہ رات ختم ہوئی تارے ٹمٹمانے لگے
وہ لے رہی ہے سحر کی حسینہ انگڑائی
میں اب بھی وادیٔ ویراں میں منتظر ہوں ترا
صبُوحی کیوں تجھے وعدے کی شب نہ یاد آئی؟

(۳)

جو وقت بیت چکا پھر نہ آئے گا لیکن،
تصورات سے دل خوش ہیں نوعِ انساں کے
وہ کس کے ہاتھ کے ہیں منتظر خدا جانے!
لرزتے رہتے ہیں پردے حریمِ جاناں کے

احمد ندیم قاسمی

عذر گناہ

جوشِ جنوں میں زہر کے پیالے پئے بہت ظلم آپ اپنی جان پہ ہم نے کئے بہت

ہم کھیلتے رہے ہیں ہلاکت کی فوج سے، سوتے رہے لپٹ کے تباہی کی موج سے

ہم اپنا سر پہاڑ سے خود پھوڑتے رہے، خود اپنے دل کے آئینے کو توڑتے رہے

بدمستیوں سے شام و سحر جھومتے رہے جُھک جُھک کے دستِ اہرمنی چومتے رہے

رگ رگ میں زہرِ درد و الم جب اُتر گیا جب گوشہ گوشہ روح کا ظلمت سے بھر گیا

عذر گناہ ہم نے کیا بھی تو کیا کیا تقدیر اور خدا کا بہت ہی گلا کیا

اپنے سوا ہر اک کو بُرا بر ملا کہا

قسمت کا نام لے کے خدا کو بُرا کہا

آثر صہبائی

پرانے ہندوستان کا ایک شاعر

امارو

یوں تو جو بیت چکی وہ پرانی ہوئی، لیکن وقت اور فاصلہ دو ایسی چیزیں ہیں، جن کی آئندہ اور گذشتہ کے لحاظ سے کوئی حد ہی نہیں ہے پرانے ہندوستان کی قدامت کا تصوّر بھی وقت ہی کی طرح بے پایاں اور عمیق ہے۔ کیونکہ یہ کوئی چند صدیوں کی بات نہیں ہے اس قدامت کا کچھ اندازہ اس بات سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ بعض ماہرین کے نزدیک پہلا انسان اسی سرزمین پر نمودار ہوا تھا۔

ویدوں کے زمانے کو قدامت کے لحاظ سے جو رتبہ حاصل تھا، وہ "موہن جو دارو" اور ہڑپہ کی کھدائی سے جاتا رہا۔ ویدوں کا زمانہ نسبتاً جدید ہو گیا، اور علم انسانی کو ایک اور قدیم تر تمدن سے آگاہی ہوئی۔ ان دونوں زمانوں کے دوائر کی ہم آہنگی کے متعلق ابھی قطعی فیصلہ نہیں کیا جا سکا۔ آریاؤں اور سندھ کے تمدن میں کوئی باہمی تعلق تھا یا نہیں، یہ ابھی ایک پر اسرار مسئلہ ہے۔ البتہ ایک بات ظاہر ہے کہ وادیٔ سندھ کے مردوں اور عورتوں کی تخلیقات کے اثرات مشرق میں ملتان پنجاب اور راجپوتانہ اور مغرب میں ایران، ایشیائے کوچک بلکہ مصر تک ملتے ہیں ان اثرات کی وضاحت کے لئے ابھی ہمیں اور انتظار کرنا ہوگا، لیکن گمان غالب ہے کہ مستقبل کے ماہرین یہ ثابت کر دیں گے کہ ان قدیم سندھیوں اور آریاؤں میں باہم تمدنی تعلقات تھے۔ اگر یہ بات ثابت ہو گئی تو آریاؤں کی قدامت اور بڑھ جائے گی اور ہندوستان کی تہذیب آریہ، یونانی اور مغل اثرات کا مجموعہ ہونے کی بجائے ایک ایسی خود رو تہذیب ہو جائے گی جس پر ماضی میں آئے دن نئے اثرات ہوتے رہے۔

آریہ باہر سے آئے تھے۔ شمالی پہاڑوں کو پار کر کے اُن کے سامنے ایک ایسی نئی سرزمین پھیلی ہوئی تھی جس پر قابو پانا اور جس کے رہنے والوں کو مفتوح بنانا اُن کا پہلا مقصدِ حیات تھا۔ جسمانی حالت اور نسلی امتیاز کے لحاظ سے وہ قدیم باشندوں سے برتر تھے اور انہیں خود بھی اس بات کا پورا احساس تھا۔ چنانچہ اس احساس کا اظہار ویدوں کے اُس قدیم ترین ہندوستانی ادب میں ہے جنہیں انہوں نے ترتیب دیا۔ اتھرووید میں ایک جگہ لکھا ہے:۔

"میں بلوان ہوں میرا نام بڑا، اس دھرتی پر جیتنے والا، ہر چیز کو جیتنے والا، اس کے ہر حصّے کو پورے طور پر قابو میں لانے والا"

گویا زندگی کی ضروریات کے لحاظ سے پرانے ہندوستان کے ادب کی پہلی آواز فاتحانہ جذبات و احساسات کی حامل تھی۔ ہر شخص کے لئے کام تھا، ہر شخص ضروریاتِ زندگی کے لئے صرف اپنی ہی قوت بازو کا محتاج تھا، ہر شخص مطمئن تھا اور حال میں مست۔ اُسے آئندہ اور گذشتہ کی کوئی سوچ نہ تھی۔ اس کا ماضی خوشگوار نہ تھا اور بیتے ہوئے زمانے کی تلخی کو وہ اس نئی سرزمین کے زندگی بخش اثرات میں بھلا رہا تھا اور اس کا مستقبل ابھی ایک بہت دور کی بات تھا۔ ویدوں کی شاعری سے اُسی فلسفۂ حیات کا اظہار ہوتا ہے جو حال میں مگن اور مصروف رہنے والے لوگوں کے اندازِ نظر سے بنا ہو۔ اس حیات پرور زمین کو دیکھ کر اُن کے دل میں ستائش کے جذبات پیدا ہوتے تھے، اور وہ اپنی اور قدرت کی تعریف کرتے تھے، لیکن انہیں اپنے فطری اور خداداد زور اور بل کو قائم رکھنے اور بڑھانے کی بھی ضرورت تھی، انہیں ایک ایسی شکتی کی ضرورت تھی جو انہیں اندیشۂ فردا سے بے نیاز کر دے چنانچہ رگوید کا ادب ایک ایسی ہی شکتی کی جستجو کو ظاہر کرتا ہے۔ اس میں اگنی کی برتری کے گُن گائے گئے ہیں۔ تہذیب و تمدن کے ارتقا کے لئے آگ کی ضرورت تھی۔ آگ کی دریافت انسانی کشمکش حیات کا پہلا باب ہے۔ رگوید اسی زمانے اور اُس کشمکش کا اظہار کرتا ہے۔ یہ ابتدائی

اُلجھنیں رفتہ رفتہ مٹتی گئیں، یہاں تک کہ ہندوستان میں انسان کی تخلیقی کارفرمائیوں نے ایک مستقل حیثیت اختیار کر لی۔ جب انسان نے آگ پر قابو پالیا تو وہ اِس نئی اور اندھی شکتی سے جن باتوں کا متقاضی ہوا، اُن کا ذرا سا بیان سنئے:۔

"جلادے، اے اگنی! قریب ترین دشمنوں کو، جلادے دُور کے بدخواہوں کو، اُن دکھیوں کو جلادے! تیرے ہر دم نئے، اَن تھک شعلے پھیلتے ہی جائیں! جو تیرے لئے جان مارتے ہیں انہیں اندھا زور دے، انہیں خوش بختی دے اور خوشحالی، اے اگنی!" ——— رگ وید۔

لیکن سونے جاگنے اور کھانے پینے پر ہی انسانی ضروریات کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ چنانچہ ویدوں میں اُرواسی کے فسانے میں محبت کا رومان بھی موجود ہے جس سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت بھی عورت ایسی ہی خصوصیات رکھتی تھی جیسی آج رکھتی ہے، صرف زمانے کے اثرات کا فرق ہے۔

آریہ تنومند تھے، چوڑے چکلے جسموں والے، اچھے ہاضمہ معدوں والے، کڑے سخت، جنگ میں چابک دست اور بہادر اور اس لئے وہ بہت جلد شمالی ہندوستان پر قابض ہو گئے۔ تیر کمان اُن کا ہتھیار تھا اور وہ رتھوں میں نیزوں کے ساتھ دشمن پر حملہ کرتے تھے۔ آہستہ آہستہ اُنہوں نے دریائے سندھ اور گنگا کے ساتھ ساتھ مشرق اور جنوب کی طرف بڑھتے ہوئے دریائے نربدا تک قبضہ جما لیا۔

جُوں جُوں اُن کی فتوحات مکمل ہوتی گئیں اور جنگی ضروریات کم، وہ اطمینان کے ساتھ مختلف علاقوں میں قائم ہو کر زراعت پیشہ بنتے گئے، اور اُن کے قبیلے چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تبدیل ہونے لگے۔ ہر ریاست پر ایک مہاراجہ حکومت کرتا تھا اور اس خیال سے کہ کہیں وہ حکومت کے نشے میں اعتدال کی حد سے تجاوز نہ کر جائے، اس کے مشیر کار کی حیثیت سے فوجی سرداروں کی ایک کمیٹی ہوتی تھی۔ ہر قبیلے کا حاکم راجہ ہوتا تھا اور پھر اس کی بھی ایک چھوٹی کمیٹی اور ہر گاؤں میں مختلف گھرانوں کے بڑے بوڑھے ہر طرح کا انتظام اور فیصلہ کرتے تھے۔ ان فیصلوں کے لئے سب گاؤں چوپال میں اکٹھا ہوتا تھا جیسا کہ بدھ کے ایک مکالمے میں لکھا ہے: "جب تک وہ یوں اکٹھے ہوا کریں گے اور اپنی سماج کی جماعت بندی میں حصہ لیتے رہیں گے، انہیں زوال نہ آئے گا۔ اور وہ خوش حال ہوں گے اور ترقی پائیں گے"!

آریاؤں کو اس نئی سرزمین میں اطمینان و فراغت کے ساتھ مختلف علاقوں میں آباد ہو جانے پر ایک اور خطرہ بھی لاحق ہوا اور وہ یہ کہ یہاں کے پہلے باشندوں سے ان کے اپنے لوگ شادی بیاہ کے تعلقات قائم نہ کر لیں۔ کیونکہ اس طرح انہیں اپنے نسلی امتیاز کے کھوئے جانے کا اندیشہ تھا۔ اس لئے انہوں نے شادی پر پابندی رکھنے کے لئے سماجی اصول بنائے۔ ان اصولوں کا مقصد یہ تھا کہ لمبی ناکیں چپٹی ناکوں سے علیحدہ رہیں۔ یہ پابندی اگرچہ نسل کو دوغلا ہونے سے بچانے کے لئے تھی لیکن آگے چل کر اسی سے ذاتوں کی تقسیم عمل میں آئی۔

ویدوں کے زمانے میں شادی بیاہ پر تو پابندی تھی۔ لیکن ذات پات کے بندھن کوئی نہ تھے۔ ان بندھنوں کے لئے ہندوستان اُن برہمنوں کا ممنون ہے جنہوں نے منو سے لے کر آئندہ ہر زمانے میں اپنے فرقے کی طاقت کو بڑھانے کے لئے مساوات کے اصول کو بھُلا دیا۔ جب ویدوں کا زمانہ ختم ہوا اور مہابھارت اور رامائن کا دور آیا تو ذات پات کا جال سخت ہونے لگا۔ اور پیشے روز بروز راسخ حیثیت اختیار کرتے گئے۔ ابھی تک چونکہ برہمنوں ہی کو مطالعے کا حق اور فرصت حاصل تھی اس لئے وہی ادب کے بانی ہوئے اور شروع میں شاعری بھی مذہبی رنگ ہی لئے رہی۔ ذات پات کے بندھن تو سخت ہوئے لیکن رامائن اور مہابھارت کے زمانے میں بھی برہمنوں کو کوئی امتیازی درجہ حاصل نہ تھا۔ وہ صرف کل انسانوں کے ایک گروہ ہی کو ظاہر کرتے تھے۔ بلکہ رامائن میں تو یہ بھی لکھا ہے کہ ایک کشتری کا درجہ برہمن سے بڑھ کر ہے۔ جینیوں نے بھی خود بخود کشتریوں کو سب سے اعلیٰ سمجھنا اور کہنا شروع کر دیا اور بدھ لٹریچر میں تو برہمن کو "نیچ" بھی لکھا ہے۔

جنگ اور فتوحات کا دور مٹتا گیا اور آریہ امن کے ساتھ بسنے لگے اور مذہب جس کا تصور ذہن انسانی میں زراعتی معاملات کے لئے قدرت کے رحم و غضب کو قابو میں رکھنے کے واسطے پیدا ہوا تھا، پہلے سے پیچیدہ ہوتا گیا اور اس بات کی ضرورت پیدا ہوئی کہ انسان اور دیوتاؤں کے تعلق کو استوار بنانے اور احسن طریق پر نبھانے کے لئے مخصوص اور ماہر لوگ مقرر ہوں۔ چنانچہ اسی ضرورت کی بنا پر برہمن کثرت، دولت اور طاقت میں روز افزوں ترقی کرنے لگے۔

لیکن بدھ کے زمانے تک کشتریوں نے ذہنی برتری کا اجارہ کلیتہً برہمنوں کو نہیں دے دیا تھا۔ ویش لوگ بھی باقاعدہ صورت میں بدھ کے زمانے کے بعد ہی سے ظہور میں آئے اور پھر رفتہ رفتہ ہندوستان کے قدیم باشندے شُدر کہے جانے لگے۔

اِن آریاؤں کے رہن سہن کا طریقہ کیا تھا؟ ۔۔۔ پہلے جنگ پھر گلّہ بانی اور زراعت اور پھر دست کاری۔ ہندوستانی آریہ گایوں کو پالتے اور پرورش کرتے تھے لیکن ابھی اس جانور کو وہ مقدس رتبہ حاصل نہ ہُوا تھا جو بعد میں جا کر ہوا۔ آریاؤں کو ضرورت پڑنے پر اس کا گوشت استعمال کرنے میں بھی احتراز نہ تھا۔ ویدوں کے زمانے میں جو کی کاشت ہوتی تھی لیکن چاول کا نام نہ تھا۔

ان قدیم ہندوستانیوں کی ذہانت اور جوہر خداداد کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے۔ کہ فلکیات کو انہوں نے یونانیوں سے اخذ کیا (اگرچہ جوتش پہلے ہی یہاں موجود تھی) لیکن اس علم کو اُن سے کہیں بڑھ کر تکمیل کو پہنچایا۔ ریاضی میں ہندسے اور اعشاریہ کا طریق شمار ایجاد کیا۔ الجبرا بھی انہی کی ایجاد تھی۔ اگرچہ اس علم نے عرب سے مغرب کو جاتے ہوئے مستقل طور پر عربی نام ہی اختیار کر لیا۔ جیومیٹری میں البتہ قدیم ہندوستانی کچھ خاص کامیاب نہ ہوئے لیکن اس میں بھی بہت سی باتیں پہلے پہل انہی نے معلوم کیں۔ البتہ ٹرگنومیٹری میں وہ یونانیوں سے سبقت لے گئے۔ یہ سب کام عموماً صرف تین آدمیوں کے ممنونِ تکمیل ہیں۔ آریہ بھاٹ، برہم گپت اور بھاسکر۔ بعد میں یہ علوم عرب سے ہوتے ہوئے یونان میں پہنچے اور پھر یورپ میں پھیلے لیکن اِن خشک علوم میں بھی آریاؤں نے اپنی شاعرانہ ذہنیت کو ہاتھ سے نہ دیا۔ ذیل میں الجبرے کے دو سوال دیکھئے:۔

"مدھ مکھیوں کے ایک بڑے جھرمٹ میں سے کل کا پانچواں اُڑ کر کدم کے پھولوں پر جا بیٹھیں، کل کا تیسرا سلندھرا پھولوں پر اور اِن دونوں کے فرق کا تین گنا کٹجا کی کلیوں پر۔ ایک مدھ مکھی پیچھے رہ گئی اور وہ یوں ہی ہوا میں منڈلاتی رہی۔ اے سندر ناری! بتا تو سہی، سب کتنی مکھیاں تھیں؟"

"میری پیاری! تیرے کانوں میں جو یہ آٹھ لعل، دس زمرد اور سو موتی ہیں، انہیں میں نے تیرے لئے یکساں قیمت پر خریدا تھا اور وہ قیمت آدھے سو سے تین کم تھی۔ اے شبھ ناری! مجھے ہر ایک کی قیمت بتا دے۔"

یہی شاعرانہ ذہنیت آگے چل کر علم ادب میں ایسے جواہر ریزوں کی تخلیق کا باعث ہوئی جو آج تک ساری دنیا کے لئے کیف و انبساط کا سامان ہیں لیکن اِس شاعرانہ افتادِ طبع نے انہیں اُن علوم میں ترقی کرنے سے نہ روکا جو نوعِ انسانی کے لئے عملی طور پر افادی درجہ رکھتے ہیں۔ کیمیا، طب اور علم تشریح الابدان کی دریافت اور ترقی بھی ان کے لئے جاذبِ نظر رہی۔ وہ ذرا ذرا سی باتیں جو آج ہمیں مغرب کے علماء کی بتائی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ قدیم ہندوستانیوں کے ذہن سے ہی نکلی تھیں۔ یہ دنیا ذرّات کا مجموعہ ہے، یہ انہی کی معلوم کی ہوئی بات ہے، انسان ایک جرثومے سے نشو و نما پا کر دنیا میں آتا ہے، یہ بھی انہی کی معلوم کی ہوئی بات ہے۔ یہ تو ہوئے وہ علم جو عملی زندگی میں مفید ہیں۔ ذہنی زندگی میں سب سے بڑھ کر ترقی دینے والا علم فلسفہ ہے، اور فلسفے میں قدیم ہندوستانیوں نے جو کچھ کیا وہ تمام دنیا کے سامنے ہے اور عام بھی۔ اس لئے میں بھی اس کی طرف اشارہ ہی کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔ یہ سب کام برہمنوں کے تھے۔ لیکن برہمنوں کی روز افزوں طاقت کے لئے ایک زبردست صدمہ بھی ہند قدیم ہی میں پیدا ہوا، یہ مہاتما بدھ کی انسانیت پرست شخصیت تھی۔ بدھ کا ہر اصول برہمنوں کے مفاد کے منافی تھا۔ ایک ہی بات کو لیجئے۔ بدھ مساوات کا حامی بلکہ موحد تھا اور مساوات برہمنوں کی ذات کو مٹا دینے والا زبردست حربہ لیکن اُس زمانے میں تعلیمی شعور چند محدود انسانوں میں ہی تھا۔ چنانچہ بدھ مت تو پھیلا لیکن برہمنوں کی طاقت از سرِ نو قائم ہو کر بڑھتی رہی۔ ۵۰۰ء قبل از مسیح کے قریب ہندوستانی ادب میں برہمنوں کے بنائے ہوئے پُرانوں کی تخلیق ہوئی۔ ۳۲۹ء میں اسکندر نے ستلج تک تمام ملک کو تہ و بالا کیا اور اس کی فوج کے لَوٹ جانے پر ہندوستان کی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

یہاں تک تو اُس فضائے بعید پر ایک جھلکتی ہوئی نظر ڈالی گئی ہے جس کے اثرات میں امارو ایسا شاعر پیدا ہوا۔ لیکن امارو کی شاعری آسودۂ نفسی احساسات کو لذّت بخشتی ہے، اس لئے ضروری ہے کہ ایک مختصر خاکہ اُس زمانے کے جنسی اور اخلاقی معیار کا بھی مدِ نظر رکھ لیا جائے۔ ویدوں کے زمانے سے لے کر اشوک اور چندر گپت تک عام اخلاق بہت ہی بلند تھے۔ ہم اپنی موجودہ حالت کو دیکھتے ہوئے

اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ویدوں کے زمانے میں راجہ مہاراجہ لوگوں سے زبردستی کر لیتے تھے۔ لیکن سکندر کے مورخ کا بیان ہے "ہندو راست بازی میں ایک امتیاز رکھتے ہیں۔ اُن کا چلن اس قدر معقول ہے کہ انہیں شاذ ہی باہمی معاملات کے فیصلے کے لئے مقدمہ بازی کی طرف رجوع ہونا پڑتا ہے۔ اُن کی ایمانداری کا اندازہ اس حقیقت سے کیا جا سکتا ہے کہ وہ کبھی کوئی تحریری عہد نامہ نہیں کرتے۔ ہر بات زبانی ہی طے پاتی ہے۔ نیز وہ اپنے گھروں کو قفل بھی نہیں لگاتے۔ گویا وہ سچائی کے بہت ہی زبردست پرستار ہیں"۔ یہ تو ہوئی عام اخلاق کی حالت لیکن جب ہم جنسی تعلقات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ہمیں رگوید میں ہی حرام تعلقات، اغوا، قحبگی، اسقاط اور بدکاری کا ذکر مل جاتا ہے۔ بلکہ اختلاطِ ہم جنسی کا بھی خال خال بیان ہے۔ لیکن ویدوں سے بھی جو عام تصور ہم اُس زمانے کے جنسی اخلاق کا قائم کرتے ہیں وہ بہت بلند ہے۔ مہابھارت اور رامائن میں بھی یہ بلندی قائم ہے۔ ان تمام کتابوں سے ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ جنسی معاملات، زن و شوہر کے تعلقات اور گھریلو تفصیلوں میں اُن لوگوں کے معیار کی بلندی آج کل کے لوگوں کے لئے قابل رشک درجے تک پہنچی ہوئی تھی۔

شادی بیاہ کے مختلف طریقے تھے۔ زبردستی اٹھائے جانا، خرید کرکے آنا یا باہمی رضامندی سے فیصلہ کر لینا۔ لیکن باہمی رضامندی کو کچھ مستحسن نہ خیال کیا جاتا تھا۔ عورتیں اس بات کو اپنے لئے قابلِ فخر سمجھتی تھیں کہ انہیں خرید کر حاصل کیا جائے۔ یہ خرید و فروخت کا کام غالباً مشاطہ یا دلال کے ذریعے سے انجام پاتا تھا جس کی مثال ہمیں امارو کی ایک نظم میں بھی ملتی ہے۔ زبردستی اٹھائے جانا بھی ایک عورت کے لئے عزت کا باعث تھا۔ شاید یوں اس کی خودپرستی کو تسکین ملتی تھی کہ ایک شخص اُسے ہر قسم کے خطرات کے باوجود اٹھا کر لے گیا یعنی وہ اُسے بہت چاہتا ہے۔ اس نے اسی کو منتخب کیا ہے۔ کثرتِ ازدواج کا رواج بھی تھا، اور بڑے اور امیر لوگوں میں تو یہ ایک لازمی بات تھی اس کے مقابل میں کثرتِ ازدواج نسائی کی مثال بھی دروپدی کے افسانے سے ملتی ہے۔ یہ رسم لنکا میں ۱۸۵۹ء تک رائج تھی اور تبت کے چند علاقوں میں اب بھی ہے۔ لیکن عموماً کثرتِ ازدواج کی عشرت پرستی کا حق صرف مرد ہی کو حاصل تھا۔ اور اُس زمانے کے گھر پر مرد کی ایک راجے کی مانند کلی حکومت ہوتی تھی۔ اُس کی بیوی یا بیویاں اور بچے اُس کے دوسرے ساز و سامان کی طرح اس کی ملک تصور کئے جاتے تھے۔ لیکن ان باتوں کے باوجود اُس زمانے میں عورت کو بعد کے ہندوستان سے (خصوصاً رامائن کے بعد سے) کہیں زیادہ آزادی حاصل تھی۔ اگرچہ شادی بیاہ کی جو صورتیں اوپر بیان کی گئی ہیں۔ اُن سے یہ اندازہ نہیں ہو سکتا لیکن اُس دور کی عورت کو اپنے رفیق حیات کے انتخاب میں بہت کچھ کہنے سننے کا حق تھا۔ عورتیں دعوتوں، رقص و سرود کی محفلوں اور پوجا پاٹ کے موقعوں پر مردوں کے دوش بدوش ہر قسم کے مجلسی ہنگاموں میں حصہ لیتی تھیں۔ انہیں مطالعے کی بھی اجازت تھی وہ فلسفیانہ اور علمی گفتگو میں بھی دخل رکھتی تھیں۔ لیکن مہابھارت اور پھر رامائن کے زمانے میں عورت کا یہ آزاد رتبہ برقرار نہ رہا تھا۔ امارو ایسی کا ذکر بھی کرتا ہے۔ لیکن اُس کی نظموں سے عورتوں کے مرتبے کا جو تصور قائم ہوتا ہے وہ رامائن سے کہیں زیادہ آزادانہ محسوس ہوتا ہے۔ کیونکہ رامائن کے بعد سے عورتوں کے لئے ویدوں کا پڑھنا بھی غیر مستحسن بلکہ باعث فساد تصور کیا جاتا تھا۔ بیواؤں کی شادی ممنوع ہو گئی تھی۔ عورتوں اور مردوں کے سماجی میل جول پر پابندیاں عائد کر دی گئی تھیں اور ستی کی رسم بھی جاری ہو گئی تھی۔ مثالی عورت وہی سمجھی جاتی تھی جو سیتا کے نقشِ قدم پر چلے۔ لیکن امارو کی نظموں میں ہمیں عورت کی ذات پر یہ پابندیاں نظر نہیں آتیں۔

یہ زمانہ تھا، یہ لوگ تھے، یہ مرد، یہ عورتیں اور یہ سماج —— علوم و فنون کی ترقی اور علم ادب اور سنسکرت زبان کا معیار انتہا کو پہنچ چکا تھا۔ اسی دور میں امارو کی شاعری پیدا ہوئی۔

امارو کے متعلق ہم سوانحاتی مواد کی غیر موجودگی کے باوجود اس کی نظموں کی اندرونی شہادت سے بھی کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مثلاً ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ شہری تھا۔ عالم فاضل تھا، اور اس لئے گمان غالب ہے کہ برہمن ہو گا۔ اغلباً اُس کا تعلق کسی راجے کے دربار سے نہ تھا۔ کیونکہ اس صورت میں اس کا کچھ نہ کچھ حال ہمیں ضرور معلوم ہو جاتا۔ اس کی اپنی زندگی خواہ وہ برہمن تھا یا غیر برہمن، بہت رومانی رہی ہو گی۔ کیونکہ ان نظموں میں جن احساسات کا اظہار ہے ان کے متعلق اس عمدگی سے بغیر ذاتی تجربے کے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ عورتوں سے اُس کے تعلقات بہت وسیع تھے۔ جن میں سے بعض کے نام بھی اُس نے اپنی نظموں میں لئے ہیں لیکن امارو کا ہمیں صرف نام ہی معلوم ہے۔ اور سو سے اوپر کچھ

نظمیں۔ اُس کی زندگی کے متعلق ہمیں کوئی بات معلوم نہیں البتہ ایک روایت ہے کہ وہ روح جو امارو کے جسم میں تھی اپنے پہلے سو جنموں میں عورت کے جسم میں ظاہر ہوئی تھی اس ناقابل قبول روایت کی بھی ایک وجہ ہے امارو کی نظموں کے معتد بہ حصّے میں عورت کے جذباتِ محبت کو اس سلیقے نفاست اور عمدگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے کہ کسی مرد سے وہ ممکن ہی نہیں تاوقتیکہ اس میں کافی حد تک نسائیت کا عنصر موجود نہ ہو۔ ایک روایت کے مطابق امارو کی نظموں کو شنکراچاریہ کے نام لگایا جاتا ہے جبکہ اُس نے راجہ امارو کے مردہ جسم میں جان ڈالی کہ وہ منڈنا مصر کی بیوی سے نوعی موضوع پر مباحثہ کر سکے۔ روایت ہی کے طور پر امارو کو بکرماجیت کے نورتنوں میں سے بھی بیان کیا گیا ہے لیکن یہ ممکن نہیں کہ وہ کالیداس کا ہمعصر ہو مختلف کتب کی اندرونی شہادت کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ امارو آنند وردھن سے پہلے تھا۔ اس لئے اس کا زمانہ ۸۰۰ء کے بعد تو ہو ہی نہیں سکتا بکرماجیت کا دور ۳۰۰ء سے ۴۱۳ء تک ہے لیکن اگر بکرماجیت کے زمانے میں امارو کی شاعری تخلیق پاتی تو ہمیں بکرماجیت کے اور رتنوں کی طرح اس کے حالات بھی معلوم ہو سکتے۔ "امارو شتک" یعنی امارو کی سو نظموں میں ایک نظم ایسی بھی ہے جس کے شروع میں ایک وضاحتی کلمہ ہے: "یہ بدھ کی بیوی کی پرارتھنا ہے" — اس سے ہمیں ایک بات معلوم ہوتی ہے کہ امارو کا زمانہ بدھ کے بعد کا ہے۔ گویا پرکار کے نصف قطر کو گھٹاتے ہوئے ہم امارو کے زمانے کو ۴۸۳ قبل مسیح اور ۸۰۰ بعد مسیح کے درمیانی حصّے میں محدود کر سکتے ہیں۔

امارو شتک یا امارو کی سو نظموں کو ہندوستان بلکہ دنیا کی عشقیہ شاعری میں ایک خاص امتیاز حاصل ہے۔ امارو کی شاعری نے سنسکرت ادب میں پہلی بار اس حقیقت کو منوایا کہ صرف محبت ہی کو شاعری کا بنیادی موضوع بنا کر گوناگوں نغمے چھیڑے جا سکتے ہیں۔ نیز امارو کی شاعری ہی سے محبت کی غزلیہ نظموں نے باقاعدہ بند کی ہیئت اختیار کی۔ ایک بند کی محدود وسعت میں محبت کے کسی احساس کو مکمل طور پر بیان کرنا اس شاعری کا مقصد ہے لیکن احساسات کی ایسی نقاشی کوئی آسان کام نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں چند مختصر لفظوں اور چند نپے تلے فقروں میں ایک احساس کی شدّت اور ایک جذبے کے تاثر کی ترجمانی کرنا ہوتی ہے۔ لیکن آج کل کی شاعری میں جو تجزیاتی عنصر ہے وہ اس میں موجود نہیں ہوتا گویا یوں کہئے کہ اس نغمے میں سر ماترے کو علیحدہ نہیں کر دیا جاتا بلکہ ناپ تول کے باوجود اُن کی باہمی آمیزش اسطور پر رکھی جاتی ہے کہ ذہن کو وہی لذّت حاصل ہو جو کسی راگ سے لبریز دُھن کو سُننے سے ہوتی ہے۔ یعنی اس نغمے میں سرگم کی بے کیفی نہیں ہوتی۔

پراکرت کی عشقیہ شاعری میں جو رتبہ ہال کا ہے وہی رتبہ سنسکرت کی عشقیہ شاعری میں امارو کا ہے۔ امارو کی تمام نظمیں (امارو شتک) پانچ چھوٹے حصّوں میں منقسم ہیں۔ پہلا حصہ مرد کے جذبات پر مشتمل ہے۔ دوسرا عورت کے احساسات پر تیسرے حصّے میں مرد اور عورت کی بات چیت اور نوک جھونک ہے، چوتھے میں عورت کے عورت کے متعلق جذبات ہیں، اور پانچویں حصّے کا عنوان "مشاہدات" ہے۔ یہ پانچواں حصّہ ایک طرح سے شاعر کے شخصی احساسات و تخیّلات کا آئینہ کہا جا سکتا ہے قدیم نقاد آنند وردھن کی رائے میں امارو کی نظمیں شاعری کے امرت سے لبریز ہیں۔ امارو کا کلام فنّی لحاظ سے بھی بہت بلند اور قابلِ توجہ ہے چنانچہ سنسکرت کے تمام علماء اور قواعد دان فنّی اور لسانی وضاحتوں کے لئے امارو ہی کی مثالیں دیتے ہیں۔ سنسکرت کے تخیلی اور تخلیقی ادب میں امارو ایک نئی نشوونما کا پہلا علمبردار ہے۔ تصوّر کی نفاست، اظہار و تاثر کی گہرائی اور احساسات و خیالات کی نزاکت سنسکرت شاعری کی خصوصیات عمومی ہیں۔ لیکن انہیں جاری اور رائج کرنے میں امارو ہی کے کلام نے آنے والے شعراء کی اعانت کی ہے۔ امارو کی نظموں میں محبت کی سیدھی سادی سلجھی ہوئی باتیں بھی ہیں، اور اُلجھے ہوئے پیچیدہ معاملات بھی۔ بیسویں صدی کے ماہرینِ نفسیات نے محبت کے واحد جذبے میں جس کثرتِ احساس کی دلیلیں مہیّا کی ہیں۔ امارو آج سے انیس صدی پیشتر ان سب کو اپنی نظموں میں بیان کر گیا ہے۔ محبت کی بوقلموں کیفیات، عشق کے متلوّن خیالات، انوکھی اُلجھنیں، غیر متوقع تاثرات ہیجانی تحریکات طبعی، آرزو، اضطراب، ناامیدی، شکستہ دلی، میل ملاپ، جدائی، دُور دُور کی شیفتگی، شرم و حیا، اختلاط، بے باکی، وہ جذبہ جو کلیوں سا اچھوتا ہو اور وہ احساس جو پورب سے نکلنے والے سورج سے بھی پرانے ہو چکے ہوں —— یہ سب باتیں امارو کی سو نظموں میں موجود ہیں۔

امارو کی نظموں میں محبت ایک تنہا اور شدید جذبہ نہیں ہے، جیسے کہ محبت کی عام شاعری میں ہوتا ہے، بلکہ ان میں محبت کے دُکھ سُکھ کو بڑھا کر انہیں اور دلکش بنانے والی تمام باتیں ہیں۔

ایک تنہا خیال یا واقعے کو ایک محدود جگہ میں قید کرنے سے شعر میں ایک حسنِ بیان پیدا ہو جاتا ہے۔ اردو کی غزل اس کی روشن مثال ہے۔ اور جاپان کی ہیکو شاعری بھی۔ اگرچہ امارو کی ان مختصر نظموں میں عموماً ہلکی پھلکی شگفتہ محبت کا بیان ہے، اُس عشق کا بیان جسے لذّتِ وصال حاصل ہے یا بہت جلد حاصل ہو جانے کی توقع ہے۔

لیکن بعض دفعہ یاس اور نا امیدی پر نظم کی بنیاد رکھتے ہوئے ساز شعر سے گہرے اور گنبھیر سُر بھی نکل آتے ہیں۔ لیکن ہلکی پھلکی شگفتہ اور مطمئن محبت ہو یا گہری، شدید اور ناکام محبت، امارو کی فنی بلندی ہر نظم میں ایک ہیرے کی طرح چمکتی اور بعض اوقات چندھیاتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔

اور اب امارو کی پریم کتھا شروع ہوتی ہے۔ جیسے کہ پہلے کہا جا چکا ہے اس کے پانچ حصے ہیں جن کے عنوان ذیل میں درج کئے جاتے ہیں:-

۱۔مرد ۲۔عورت ۳۔ مرد عورت، ۴۔عورت سے عورت اور ۵۔مشاہدات۔

یہ ترجمہ ہم نثر میں دے رہے ہیں کہ اصل کا حسن اسی طرح برقرار رہ سکتا تھا۔

۱۔ مرد

(۱)

اگر مجھے والمیکی کی قابلیت حاصل ہو جاتی تو میں اپنی منیئم کے متعلق ایک نظم لکھتا۔

پہلے دس شعر اس کے ہاتھوں کی دس انگلیوں کے بارے میں ہوتے؛

کیونکہ انہی انگلیوں نے ایک ایسا نقاب گوندھا جس میں میں نے اپنے پہلے تمام افسانۂ محبت لپیٹ دئے ہیں۔

اور دوسرے دس شعر ان دس راتوں سے منسوب کرتا جو ہم نے ماگھ ہاٹ میں گذاریں!

(۲)

اے دریا میں نے تجھے منبع پر بھی دیکھا ہے،

ایک بچہ بھی تجھے پھلانگ سکتا ہے۔

پھولوں کی ٹہنی سے بھی تیرا راستہ بدلا جا سکتا ہے!

لیکن اب تو ایک پھیلا ہوا طوفان ہے۔

اور اچھی سے اچھی کشتی کو بھنور میں گھیر سکتا ہے!

افسوس اے دیا متی کی محبت!![1]

(۳)

وہ مجھے پوری طرح پرنام کرتی ہے،

اور پھر جھالر کے نیچے اپنے پاؤں کھینچ لیتی ہے،

وہ اپنی پنکھیا پر بنے ہوئے پھولوں کو غور سے دیکھتی ہے،

اگر میں اُس کی ہرنی کو پچکاروں، تو وہ اپنی مینا کے پروں کو سہلانے لگتی ہے؛

اگر میں اُس سے کچھ کہوں تو وہ اپنی سکھیوں سے بات کرنے لگتی ہے؛

اُس کی اِن شرمیلی اداؤں میں مجھے بے شمار مسرتیں حاصل ہوتی ہیں!

(۴)

اگر میں ندی سے اپنا دکھ کہوں تو ندی میرے لئے ٹھہر جائے۔

اگر میں کھجور کے پیڑ سے کہوں تو کھجور کا پیڑ میرے لئے جھک جائے۔

لیکن تم گاتی ہوئی چلی جاتی ہو،

اور میری طرف دیکھتی بھی نہیں؛

میں اپنا دکھ ندی سے کہوں گا،

اگر ندی میرے لئے نہ رکی تو کم سے کم میں اُس میں اپنی آنکھیں ہی دھو کر ٹھنڈی کر لوں گا؛

میں اپنا دکھ کھجور کے پیڑ سے کہوں گا۔

اگر وہ میرے لئے نہ جھکا تو کم سے کم اُس کا سایہ ہی مجھ پر رہے گا؛

آج پھر میں نے شرم اور جھجک کو بھلا کر تم سے اپنا حال کہا،

لیکن تم اپنے ہونٹوں کا امرت، اپنے سائے کی چھاؤں مجھے نہیں دیتیں!

(۵)

تمہارے بال کندھوں پر بکھرے ہوئے ہیں،

اور ریشم آدبت کا جنگل مصرا کیشی کے رنگین مندر کو اپنی گود کے گھیرے میں لئے ہوئے ہے!

(۶)

جب سے تم چلی گئی ہو کسی نے مجھ سے تمہاری بات نہیں کی،

لیکن ہوا جب گذر رہی تھی تو میں نے تمہارا نام کہا،

[1] کہ عشق آساں نمود اول، ولے افتاد مشکلہا۔ حافظ
ہنستے ہنستے جان دو بھر ہو گئی
بڑھتے بڑھتے بڑھ گئیں بیماریاں ۔ حفیظ جالندھری

اور ایک شخص مر رہا تھا تو اُس کے سامنے بھی میں نے تمہارا نام لیا،

میری پیاری اگر تم زندہ ہو تو کسی دن ہوا کا گذر تمہارے پاس سے ہوگا،

اور اگر تم مر چکی ہو تو اس شخص کی روح تمہیں بتا دے گی کہ مجھے تم اب بھی یاد ہو!

(۷)

گیاتری! تیری محبت تو بجروں والی جھیل میں کسی شاخ کی پرچھائیں سے بھی زیادہ ناپائیدار ہے۔

جب بجرے جا چکیں تو جھیل آئینے کی طرح ہموار ہو جاتی ہے

لیکن تیرے دل میں مجھے معاف کر دینے پر بھی میرے متعلق بدگمانیاں ہیں!

(۸)

میرے باغ کے پیڑوں پر بیٹھے ہوئے پرندو!

کیا تم اپنے موسیقانہ جال میں میری آرزوؤں کو گرفتار کر سکتے ہو؟

میری آرزوئیں میری پریتم کی طرف کھنچی چلی جا رہی ہیں،

جسے میں نے تیس دن سے نہیں دیکھا ہے!

میری آرزوئیں جلدی میں ہیں کہ اُس کے معطر سینے کو جا چھوئیں، اور اُس کی بھینی آوازیں گھل مل جائیں!

اچھے پرندو! انہیں نہ روکو!

(۹)

اُس نے پھولوں کو اپنی ڈاب میں رکھ لیا اور اُن کی پتیاں سمٹ کر بند ہوگئیں۔

وہ بولی: لو دیکھو، یہ کیا ہوا!

اور میں نے جواب دیا:

تم نے اپنی کالی آنکھوں کی سیاہی سے انہیں دیکھا اور وہ سمجھے کہ رات ہوگئی۔[1]

(۱۰)

تمہیں مجھ پر رحم کیوں نہیں آتا!

دیکھو ستارے سمندر سے نفرت نہیں کرتے،

وہ اُن میں اپنے عکس کو سراہتے ہیں!

(۱۱)

سامنے وہ سفری بادل چاند کے قدموں میں آکر ٹھہر گیا، اور ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھر گیا۔

اے تو! کہ جو کسی دن اِن شعروں کو پڑھے، ذرا سوچنا تو سہی کہ انہیں لکھتے ہوئے میں نے آہ کیوں بھری۔

(۱۲)

اگر گوندہ بن کے پیڑوں پر بہت سے پنچھی چہچہاتے ہیں،

اور اگر گوندہ بن کے پھول کبھی نہیں مرجھاتے،

اور اگر گوندہ بن کے آکاس پر کبھی گھٹائیں نہیں چھاتیں،

تو پیاری!

یقیناً کبھی نہ کبھی تمہارا وہاں سے گذر ہوا ہوگا![2]

(۱۳)

چپ رہو!

تمہاری پیار کی باتیں میری خوشی کو نہیں بڑھاتیں،

بولنا بند کر دو!

سورج کی اِس کرن کے اُجالے میں بیٹھی رہو!

(۱۴)

وہ مر چکی ہے، لیکن پھول اب بھی مرجھاتے ہیں،

اے موت!

اس لڑکی کو حاصل کرنے کے بعد تجھے مارنے کی فرصت کیسے ملتی ہے!

(۱۵)

اے صبح! جنگل نے تجھے قیدی بنا رکھا تھا،

اور پیڑوں کے تنے تیرے بندی خانے کی سلاخیں تھے

ندی کا گیت تیرے لئے خوشبوؤں سے بھرپور تھا،

اور جنگل کی گھاس تیرے لئے نرم تھی،

لیکن تو نے، روشنی سے، اپنا پنجرہ توڑ ڈالا،

اور اے صبح! تو چلی گئی!

مجھے مادھوی کا دھیان آتا ہے جو مجھ سے ایک رات صبح

[1] میرے خونِ دل کی سرخی سے تیرے پاؤں لال ہیں ٹیگور

[2] تمہارے دم سے ہر رونق بہار ہستی کی

تک پیار کرتی رہی۔

(۱۶)

طوفان کے باوجود وہ آہی گئی۔
کاش! تم نے بیڑوں کے پھولوں سے اُس کے بالوں پر پڑتی
ہوئی پھوار دیکھی ہوتی!
کاش! اُس کی موتیوں کی مالا ٹوٹ کر اس کی چھاتیوں پر چمکنے لگتی!

(۱۷)

"میں کوئی نادان نہیں،
تیرے سامنے جھوٹ کہنا بیکار ہے،
مجھے تمہارے سینے پر پیرن کے بوسوں کے نشان دکھائی دے
رہے ہیں"
لیکن میں بہت زور سے اُسے اپنے سینے سے بھینچتا ہوں،
تاکہ وہ نااندیشانہ نشان مٹ جائیں،
اور وہ انہیں بھول جائے!

(۱۸)

جب سے میں نے اُس کے ہونٹوں کو پہلی بار چوما ہے، میری
پیاس دُگنے زور سے بھڑک اٹھی ہے،
لیکن اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں،
اُن بوسوں میں ایک سلوناپن تھا!

(۱۹)

اُس کا لباس بدن سے چمٹ گیا، اور لباس کے ریشوں سے
آر پار دکھائی دینے لگا۔
اے برکھا! تیرا شکریہ!
سنانوری! تم تو یوں تھیں گویا عریاں ہو!
لیکن جب دھنک پھوٹی تو تمہاری ننھی، کانپتی ہوئی چھاتیاں
کس نے گرم کیں؟

(۲۰)

محبت کی خوشبو! محبت کی مسکراہٹو!
اے سورج کے جلال! اور اے تاروں بھری رات کی شوکت!
موت کے مقابلے میں تم مجھے ہیچ نظر آتے ہو!
لنکا کی لڑکیو! سلدتھ کے تاڑ کے درختو! بارگی کی ندیو! اکمل میں
شاہدانے کے درختوں میں ہوا کے گیتو! — میں تمہیں الوداع کہتا ہوں!

۲۔ عورت

(۱)

میں اپنی بھوؤں کے سنگار میں ہی بہت سا وقت صرف کر دیتی
ہوں۔ میں جانتی ہوں کہ چتون کو ترچھی چتون کیونکر بنایا جاتا ہے۔ تبسم
میں زیادہ سے زیادہ دلکشی پیدا کرنی مجھے خوب آتی ہے۔ جب میری
سکھیاں میری ہنسی اڑاتی ہیں تو میں بالکل چپ سادھ لیتی ہوں۔ اور جب
کبھی مجھے دل میں درد محسوس ہوتا ہے تو میں اپنے کمربند کو کس کے
باندھ لیتی ہوں۔ لیکن ان ساری باتوں میں کامیابی حاصل ہونا تو ایشور
کے ہاتھوں میں ہے!

(۲)

اس جنگل کے کنارے پر پھاندتے ہوئے اجنبی! تو کہاں دوڑا جا
رہا ہے! کیا محبت نے یہ قوتِ پرواز تجھے دے رکھی ہے، اور تو اپنی
محبوبہ کی رہنے کی جگہہ کی طرف روانہ ہے! جس طرح مضراب ساز
کے تاروں پر نہیں ٹھہرتا، تیرے قدم زمین پر نہیں ٹھہرتے۔ کیا تجھ پر روحانیت
نے غلبہ پا لیا ہے؟ اور تو اپنے کو اپنے جسم سے علیحدہ کر کے قابو میں کرنے کی
کوشش میں ہے؟

(۳)

میں ضرور جاؤں گی،
میں شفق پھیلنے تک باہر رہنے کے لئے کوئی نہ کوئی بہانہ بنا دوں گی۔
میں چاہتی ہوں کہ خوشبوؤں کو اپنے میں جذب کر لوں، اس لئے
میں دُور کے رستے سے فوآرے کے سامنے جا پہنچوں گی،
اور وہاں میں اپنی سکھیوں سے کہوں گی کہ
میں تو یہ دیکھنے آئی ہوں کہ طوفان سے میرے باپ کے کھیتوں کو
کوئی نقصان تو نہیں پہنچا!
محبت ہر بات کو جیت لے گی،
میں ضرور جاؤں گی،
اے وحشی دل!

(۴)

میں اب اپنے جسم کو پانی کے بوسوں کے حوالے کرتی ہوں۔
اور پھر لمحوں کے بوسوں کو سونپ دوں گی۔

اے لبوں کے بوسو! کیا تم بھی شفاف پانی کی طرح میری رُوح
پر ایک خوشبو کا اثر چھوڑ جاؤ گے؟

(۵)

اے دن! کبھی تو کیسا پیارا ہو جاتا ہے، اے رات! تو کیسی اداس
ہو جاتی ہے۔
اے رات! کبھی تو کیسی میٹھی بن جاتی ہے، اے دن! تو کیسا
دردوں سے بھر جاتا ہے۔
اگر اُس نے کبھی آنا ہی نہیں تو
تم دونوں معدوم ہی کیوں نہیں ہو جاتے؟

(۶)

"وہ تو سو گئے، اب تم بھی سو جاؤ"
یوں مری سکھیوں نے مجھ سے کہا، اور مجھے چھوڑ کر چل دیں۔
اور پھر محبت کا ایک مستانہ غلبہ مجھ پر آ گیا،
اور میں نے ہونٹوں سے اپنے جوان دولہا کے گال کو سہلایا
مجھے محسوس ہوا کہ وہ لرز اٹھا ہے،
میں جان گئی کہ سونے کا بہانہ ہی تھا،
اُس وقت مجھے شرم آ گئی،
لیکن جلد ہی میں نے مسرت کی آہیں بھریں۔[1]

(۷)

میرا باپ کسی کام کے لئے سفر پر ہے؛
میری بہن بیمار ہے اور میری ماں صبح سے اُسے دیکھنے گئی ہے؛
رات چھا رہی ہے،
اور میں بالی ہوں،
اور اکیلے ڈرتی ہوں،
اے پیارے اجنبی! آؤ ــــ یہاں آ جاؤ!

(۸)

جس طرح اُس پرندے کے بوجھ سے ٹہنی خم کھاتی ہے، اُسی
طرح میں تمہاری چاہت کے بوجھ سے لچکتی ہوں۔
پرندہ اڑ جائے تو ٹہنی پھر ویسی ہی ہو جاتی ہے،
لیکن تمہارے چلے جانے پر میں پھر ویسی نہیں بن سکتی۔
لیکن پھر کیا؟

پنچھی! ــــ گاتا جا،
میں بھول گئی تھی کہ تو جلد ہی گانا چھوڑ دے گا۔
میں بھول گئی تھی کہ ابھی تیرا گیت مجھے یاد نہیں ہوا ہے!

(۹)

اُس نے کئی بار سرگوشی میں کہا۔
"آؤ میں تمہیں اپنی مینا دکھاؤں"۔
میں اس کے پیچھے پیچھے گھر میں گئی،
لیکن گھر کی عورتیں ہمیں دیکھ رہی تھیں،
وہ بولی "مینا باغ میں ہوگی"۔
مینا باغ میں بھی نہ تھی۔ کیونکہ وہاں چنبیلی کے پھولوں کی خوشبو
بہت ہی زیادہ تھی۔
ندی کے کنارے بھی مینا نہ تھی، کیونکہ وہاں ایک چھوٹا سا لڑکا
لکڑیاں کاٹ رہا تھا۔
آخر ہمیں ایک ویران گنبد میں ایک رنگین چبوترے پر مینا ملی!

(۱۰)

اے رات! تو کئی بار میرے پاس دبے پاؤں آئی ہے اور تو نے
میرے روتے ہوئے چہرے کو چھپا لیا ہے۔ آج کی شام میرے پیالے
میں امرت دمک رہا ہے، اور میرے پریتم میرے سینے پر سر رکھے
سو رہے ہیں، اے رات! آج کی رات جب تک تیرا جی چاہے،
میرے ہی پاس رہ۔

(۱۱)

اگر تمہیں میرے پیار یاد ہیں تو جب تم اپنی پیاری کو زور سے
بھینچو تو ایک بار چپکے سے میرا نام بھی لے لینا۔

(۱۲)

ہم تین ہیں، لیکن اس کے باوجود ہم چار ہیں، کیونکہ محبت بھی تو
ہمارے پاس ہی رقص کناں موجود ہے۔ رات چھا چکی ہے لیکن
ہمیں تو نارانی کی چھاتیوں کا اُجالا حاصل ہے۔ پھولوں نے اپنی پتیاں
سمیٹ لی ہیں، لیکن پروا جب ہمارے قریب ہوتی ہے تو اُس کے
سانس کی خوشبو ہمیں تازہ دم بنا دیتی ہے۔ ارانا! آؤ، ہم اپنا پنہاں
ترین رقص کریں۔ آؤ کہ ہمارے پاؤں اس گھاس کو ایک شادمانی سے
مسل دیں۔ نارانی! بالوں کی لٹ نے تیرے گلے کو چھپا رکھا ہے،

[1] درد اور مسرت میں ایک گہرا نفسیاتی تعلق ہوتا ہے موجودہ ماہرین نفسیات نے اس پر مفصل بحثیں کی ہیں لیکن دیکھئے کہ امارو کو اس کا شعور اس وقت بھی تھا جب موجودہ نفسیاتی وضاحتوں کا کسی کو خیال بھی نہ
آتا تھا۔ م ح یہ ایک نغزوہ الہامہ ہے۔

اسے ہٹا دے۔ پریوا، ذرا اور پاس آ جاؤ۔ اے محبت! ہمارے جسموں کو
دیکھتی جا! ہمیں دیکھتی جا! ہمیں، ــــ نارانی کو، پریوا کو اور دوسری کو!
ہم سب پیار کرتے ہیں، اور جنگل میں چھائی ہوئی رات کے بلاوے
بھی ہمیں جدا نہیں کر سکتے! رات چاہتی ہے کہ ہماری فریادوں کو اپنی
بھاری گونج کی ہم آہنگ بنالے، لیکن ارا ہا! ہم اُس وقت تک ناچتے
ہی رہیں گے کہ سحر کے عنابی آثار نمایاں ہو جائیں۔ اُس وقت تک ہم پریوا کو
اپنے رہنے کی جگہہ پر نہیں لے جائیں گے، اور نہ اُس کے پسینے کی شراب
نوش کریں گے۔ ارا ہا! ارا ہا! تمہارا پیٹ تو یوں ہے گویا کسی جھیل کی سطح
پر طوفانی کوڑے پڑ چکے ہوں، اے نارانی! تمہارا پیٹ تو یوں ہے۔ تم
نے ابھی سے آخری ناچ کیوں شروع کر دیا؟ اور تم پریوا! اے ــــ پریوا!
اے رات! ہم آتے ہیں!

(۱۳)

یہ بدھ کی بیوی کی پرارتھنا ہے:۔

اے مردوں میں سب سے سندر، اے چندر مکھ! تیری آواز
ایسی میٹھی ہے، جیسی کلونکا پنچھی کی آواز۔ وہی کلونکا پنچھی جس کی آواز نے
ایشور کو بھی پاگل بنا دیا تھا۔ اے میرے اُجیالے پتی! تو نے اُن باغوں کی
جنت میں جنم لیا تھا جو مدھ مکھیوں کی گنگناہٹ سے گونج رہے تھے۔
اے گیان کے اونچے پیڑ! مکتی داتاؤں کی مٹھاس! اے میرے پتی!
تیرے ہونٹ آلوچوں کی طرح گلابی ہیں، تیرے دانت برف کے گالوں
کی طرح، تیری آنکھیں کنول ہیں، تیری کھال گلاب کا ایک پھول ہے!
اے پھولوں میں سب سے روشن! اے میرے سہانے موسم! اے
عورتوں کے بھون کی خوشبو! کہ جو چنبیلی سے اچھی ہے!...... اے
گھوڑوں میں سب سے اچھے گھوڑے، کنتھکا! وہ تجھ پر سوار ہو کر کدھر
چلا گیا؟

۲۔ مرد اور عورت

(۱)

آج موسم کیسا ہے!
ہم کیا جانیں!
کیا کہا؟ ــــ گاؤں سے نکل کر آئی ہو اور تم کیا جانو!
دھرتی دھوپ سے اُجیالی ہے، لیکن جب تک میں
یہ نہ جان لوں کہ تم شاداں ہو یا ملول، کیا پتہ کہ دن اچھا
ہو گا یا بُرا!

(۲)

میری پیاری، میری پیاری پرتیما! اس کالی رات میں تم کہاں
جا رہی ہو؟
میں تو اُڑ کر اُس جگہہ پہنچنے کو ہوں، جہاں وہ میری راہ دیکھ
رہا ہے جو دن سے کہیں سندر ہے۔
لیکن کیا تمہیں اکیلے جاتے ڈر نہیں لگتا، میری پیاری،
میری پیاری پرتیما!
مدن! اپنے کاری تیر لئے میرے ساتھ ہے۔

(۳)

سُکھ کی انجیر!
کہاں؟
سُکھ کی انجیر، تمہیں نہیں پتہ کہ کہاں ہے۔
تو پھر تم ہی بتا دو۔
دو شاخوں کے درمیان۔
ادھر؟
نہیں۔
اُدھر؟
نہیں۔
اُوپر؟ نیچے؟
نیچے۔ لیکن ہلو نہیں۔
تو پھر تم ہی اسے توڑ لو۔
میں اُوپر چڑھوں گا۔
ہے بھگوان! متیا! اری میا!
کیا ہوا ننھی؟
کچھ نہیں، میں گرنے لگی تھی۔
سنداتی! یہ انجیر بھی کیسی گرم چیز ہے!

(۴)

میں تو تمہیں دیکھ رہی تھی۔
میں تو کب سے یہیں ہوں۔
بھینا نکل بھاگی تھی، اس لئے مجھے دیر لگ گئی۔

جھوٹ بولنے کی کوئی ضرورت نہیں، میں نے تمہیں ملاّح کے ساتھ دیکھا تھا۔

میں تو اس سے پوچھ رہی تھی کہ اُس نے کہیں میری بچھیا کو تو نہیں دیکھا۔

اور پھر تم دونوں اُسے مل کر ڈھونڈتے رہے؟

ہاں!

بڑی دیر تک؟

ہاں کافی دیر تک۔

اوہ! اسی لئے اُسے چلنا دوبھر ہو رہا ہے۔

(۵)

مجھے کہیں گرمی نہ لگ جائے، اس کا ڈر ہے۔

میرا گھر دریا کے کنارے پہ ہے اور وہاں تازگی چھائی رہتی ہے۔

اگر میں تمہارے گھر تک گئی تو لوگ مجھے دیکھ لیں گے۔

میرا گھر تو جنگل میں ہے، صرف پھول ہی تمہیں آتے جاتے دیکھیں گے۔

پھول مدھ مکھی سے کہہ دیں گے، مدھ مکھی مینا سے کہہ دے گی اور مینا تو سبھی سے کہہ دیا کرتی ہے۔

جب تم وہاں سے گذرو گی تو پھول تو بڑی دیر تک گونگے بنے متوالے ہو کر جھومتے رہیں گے۔

جب میں لوٹوں گی تو میری ماں میرے بکھرے بال دیکھ لے گی۔

میرے گھر آئینے میں تم اپنے بال پھر سے سنوار لینا اور اس آئینے میں تمہاری مسکراہٹ کا عکس ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہ جائے گا۔

مجھے تو تم سے پیار ہے، مجھے تو یہ بھول ہی چکا ہے کہ مسکرانا کسے کہتے ہیں!

(۶)

آج تو تم جو چاہو مجھ سے مانگ لو، میرے پتی بہت دور گئے ہوئے ہیں۔

افسوس، افسوس، لیکن مجھے تو صرف اچھوتی چنبیلی ہی کی خوشبو بھاتی ہے۔

یہ محبت سے بھیگی ہوئی آنکھیں، جو کسی مست متوالی فاختہ کے بازوؤں کی طرح آدھی کھلتی اور پھر بند ہوئی جاتی ہیں، جو دل کی ہر بات کو پورے طور سے ظاہر کر رہی ہیں، وہ کون سا خوش قسمت ہے جس پر یہ آنکھیں مرکوز ہوں گی؟

یہ آنکھیں اُسی پر مرکوز ہوں گی جو مجھ سے میری پریتم کی باتیں کرے گا۔

۴۔ عورت اور عورت

(۱)

ابھی تھوڑی دیر ہوئی کہ وہ مجھے سدا کے لئے چھوڑ گیا، لیکن میں ہمت سے کام لوں گی اور کوئی بھی میری ناامیدی کو دیکھ نہ پائے گا۔

میں مسکراتی ہوں، میں تو مسکرا رہی ہوں۔

تمہاری مسکراہٹ میں ویسی ہی اُداسی ہے جیسی اُس صبح میں جو کسی آتشزدہ گاؤں پر نمودار ہوئی ہو۔

(۲)

یہ لڑکیاں کپڑے دھوتے ہوئے اپنی چنچل باتوں سے اتنا شور مچاتی ہیں کہ جو تم کہہ رہی تھیں وہ میں سن ہی نہ سکی۔

اُس نے میری گردن کو اپنے بازوؤں کی لپیٹ میں لے لیا، اپنی سانس میری سانس میں ملادی اور اپنے ہونٹ میرے ہونٹوں سے۔

(۳)

اُس کے پچاس ریوڑ ہیں، اُس کا انگور کے ایسا بیضوی چہرہ ہے اس کے بدن سے کوئی بدن لگا نہیں کھا سکتا۔ جب وہ کالی جھیل میں سے نہا کر نکلتا ہے تو گویا چاند رات میں نمودار ہوتا ہے۔ تمہیں بات چکانی ہی پڑے گی۔

تمہیں کچھ جلدی ہے کیا؟

بہت۔

تو پھر اُس سے کہہ دینا کہ وہ صرف میرے بالوں ہی سے کھیل سکے گا

پگلی ہوئی ہو کیا؟ میں اُسے یہ کیوں کہتی پھروں!

کیونکہ آج ہی سویرے وجنا نے اُتنی ہی رقم ایک ایسے دلال کے واسطے سے پیش کی ہے جو میرے دل بہلاوے کے لئے اچھا خاصا ہے۔

(۴)

کون ہے؟

میں ہوں میں کتنی ہی دیر سے کواڑ بجا رہی ہوں۔

تمہارا نام کیا ہے؟

مہادیوا، مجھے پتہ ہے تم میری آواز کو پہچان گئی تھیں۔

پہچان تو میں گئی ہی تھی، کیونکہ تمہارے ہی سپنے دیکھ رہی تھی۔

تو لو، میں بھی آ ہی پہنچی۔

لیکن اب تمہاری کوئی ضرورت نہیں، سپنے ہی میرے لئے کافی ہیں۔

(۵)

اری ریامتی! تو تو سب کچھ جانتی ہے یہ جوان مجھے کیوں تکتے ہیں۔ میں ہوا کے مخالف ہو کر چلتی ہوں، یہاں تک کہ میرا لہنگا بدن سے چمٹ جاتا ہے لیکن وہ راستہ کاٹتے ہوئے اپنی راہ چلے جاتے ہیں۔ میں کون سا جتن کروں کہ وہ یہ جان لیں کہ میں اب جوان ہوں؟

تمہیں انہیں یہ دھیان دینا چاہیئے کہ تم پریم کی باتیں جانتی ہو۔

کیسے؟

اپنے دل کے جوش اور لگن سے۔

میرا یہ مطلب نہ تھا۔ میں تو کہتی تھی کہ میں انہیں اپنی جوانی کیونکر سمجھاؤں؟

ایک دن وہ دیکھیں گے کہ تم ہوا کے مخالف ہو کر نہیں چلتی ہو اور تم نے اپنے لہنگے میں بے شمار چھپانے والی تہیں بنالی ہیں۔

(۶)

قسم کھا کر کہتی ہوں، کہ اُس نے تمہیں دھوکا دیا۔ وہ ناراینی کے ساتھ تھا کہ اوپر سے میں جا پہنچی۔ اور کل اُس نے میرے سینے کو چھو لیا اور آج صبح اُس نے مجھے زبردستی چوم لیا اور میرے ہونٹوں کو گھائل کر دیا۔

تم جھوٹ کہتی ہو۔

تو یہ زخم دیکھ لو۔

مجھے اپنی آنکھوں پر اعتبار نہیں۔ میں انہیں چوس کر دیکھوں گی، چوس کر، مجھے چوسنا ہی پڑے گا۔

(۷)

سمجھ میں نہیں آتا کہ تم کیسے اس رسیا پربھی کو دروازے سے باہر رکھتی ہو اور وہ گیت گاتا رہتا ہے۔ اس سے تو وہ اپنے پیارے گیت بالو پر ہی لکھ آئے تو اچھا۔ کیونکہ تم تو اُس کا مذاق اڑانے کے لئے اپنی مینا کو وہ گیت سکھا دیتی ہو۔ وہ نوجوان تو دھن دولت والا ہے اور تمہیں روپے پیسے کی ضرورت ہے۔

(۸)

پھر اُس نے کیا کیا؟

اُس نے تازہ گھاس کا ایک تکیہ بنا کر میرے سر کے نیچے رکھ دیا اور آپ دودھ لینے چلا گیا۔

اور تم یونہی سوتی رہیں؟

تم بھی کیا نادان ہو۔ میں اُٹھی اور میں نے "دادلی" کی ایک ٹہنی توڑی اور اپنے ہونٹوں کو چھال سے سُرخ کیا اور جنگلی داکھ سے اپنے پپوٹوں کو نیلا بنایا اور بڑے بڑے کنول کے پھولوں سے برادہ لے کر اپنی چھاتیوں پر چھڑک لیا۔

۵۔ مشاہدات

(۱)

وہ اُسے بتانے آیا کہ وہ اُسے چھوڑ دے گا، کیونکہ اُسے کسی اور سے پریم ہے، وہ روئی۔ اُس نے اپنے بالوں کو ایک نئے انداز میں بنا رکھا تھا اور وہ اس نئے انداز کے متعلق بغیر کچھ کہے چلا گیا۔

(۲)

اُس نے اُس کے چہرے کو، اس کی چھاتیوں کو اور اس کے بازوؤں کو بوسوں سے ڈھانپ دیا اور پھر وہ چلا گیا۔ چونکہ اُس نے اُس کے مُنہ کو چومنے کی ہمت نہ کی اس لئے اب وہ اپنے کانپتے ہوئے بازوؤں پر اپنے ہونٹ پھرا رہی ہے۔

(۳)

پوست کا وہ پھول جسے کھلنے میں دیر لگتی ہے ہوا کا ایک جھونکا اُس کی پتیوں کو کھول دیتا ہے، محبت ایک لڑکی کی روح کو اچانک ایک پھول کی طرح کھلا دیتی ہے۔

(۴)

دیکھنا، یہ بسنت کی ہوائیں جو صبح سویرے کنول کی خوشبو سے بوجھل

ہیں، اُس لڑکی کے ماتھے سے چمکتے ہوئے پسینے کو کس طرح صاف کر دیتی ہیں، اور کسی پریمی کی طرح اس کے گھونگٹ کو چھیڑتی ہیں اور اُس کی شکتی اُسے واپس دے دیتی ہیں۔

(۵)

میں اِس جوشیلی اور رس بھری آواز کو زیادہ اچھی طرح سننے کے لئے گھر سے باہر نکل آیا ہوں، یہ آواز جو کھیتوں کو چوم رہی ہے۔ یہ آواز تو گویا کسی عورت کی آواز ہے، حرارت سے لبریز اور سنجیدہ، محبت میں ڈوبی ہوئی، ـــــ لیکن یہ تو بند ہو گئی۔ بلبلیں آج رات چپ ہی رہی ہیں۔

[1](۶)

...... اور وہ عورتیں جنہوں نے اپنی بنسریاں توڑ دی ہیں۔
یا یاب پانی کے کنارے سپنے دیکھنے کو جاتی ہیں ......

(۷)

آرزو، احساس اور بے صبری سے لرزتے ہوئے وہ لمبے سفر کے بعد اپنی محبوبہ کے مکان میں داخل ہوا۔ اور اُس نے دیکھا کہ اُس کی سکھیاں اُسے گھیرے ہوئے ہیں۔ اس کی سکھیوں کو اپنی ملاقات بڑھانے میں ایک تیکھا مزہ آتا تھا۔ لیکن اُس کی محبوبہ اُس سے بھی زیادہ مشتاق تھی، اور یہ چلاتے ہوئے "اوئی! یہ کیا کاٹ گیا!" ـــــ اُس نے اپنا گھونگٹ اٹھایا اور اُس گھونگٹ سے اُس اکیلے دیے کی لو کو بجھا دیا جو وہاں جل رہا تھا اور اندھیرے کی وجہ سے اُس کی سکھیاں رخصت ہو کر چل دیں۔

(۸)

مردوں کی باتیں:۔

تم تو بے وقوف ہو، اگر وہ نہ مانی تو یہ رونا دھونا کیسا؟ آنسو پونچھو اور چنبیلی کے پھولوں سے اپنے سر کو سجاؤ۔ اُس کی داسی کے دیس کا کوئی گیت گاؤ، کیونکہ وہ داسی بھی تو سندر ہے۔ اپنی مالکن سے زیادہ سندر ہے وہ بہت جلد مان جائے گی، اور اپنی مالکن کی سختی کا کفارہ ادا کر دے گی۔

جاؤ جاؤ، مجھے چھوڑ دو، مجھے تو داسی سے ہی محبت ہے،

مجھے چھوڑ دو۔

وہ داسی بڑی سندر ہے۔

صرف سندرتا ہی کافی نہیں ہوتی۔

اُس کی چھاتیاں، اُس کی ٹانگیں۔

وہ کس دیس کی ہے؟

مہاپورہ کی۔

شاید وہ میرے بھائی کو جانتی ہو، میرا بھائی بھی تو وہیں کہیں پاس ہی رہتا ہے۔ چونکہ تم کہتے ہو اس لئے میں گیت گا کر اُسے گھر سے باہر بلاؤں گا۔

مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ تمہیں اپنے بھائی سے اتنا پریم ہے۔ اچھا، رام بھروسے!

(۹)

اُسے اُس شام کا دھندلکا یاد ہے جب اُس نے پھولوں سے لدے ہوئے پودے کے سائے میں اسی کے پریم کی قسم اٹھائی تھی۔ اُسے اُس کی بے وفائی بھی یاد ہے، اُس کا جھوٹ، اُس کا بے رحمی سے چلے جانا، اور وہ خوش ہے کہ وہ ایسے آدمی کے پھندے سے بچ گئی۔ لیکن چاندنی میں پیڑ پر کھلے ہوئے پھول اُسے ہمیشہ دھندلے ہی نظر آتے ہیں۔

(۱۰)

بجلی کا رتھ بادلوں پر کڑکڑا رہا ہے۔ اب قریباً اندھیرا چھا چکا ہے۔ اور لو، برسات بھی آن پہنچی۔ آؤ سندری! میرے اس پیڑ کے نیچے پناہ لے لو۔ میں تو تمہیں تمہارے اس نئے لہنگے کے خراب ہو جانے کے خیال سے یہاں پناہ لینے کو کہہ رہا ہوں اور میرے پیڑ کی ٹہنیوں میں جو پنچھی چھپا بیٹھا ہے۔ اُس کے خیال سے کہہ رہا ہوں، کیونکہ اس پنچھی نے کبھی ایسا موقعہ نہیں دیکھا کہ ایسے طوفان سے کسی مرد اور عورت نے فائدہ نہ اٹھایا ہو۔

"افسوس! افسوس! مجھے تمہاری بات ماننا ہی پڑے گی" ـــــ

لیکن اس کے باوجود پنچھی جلد ہی اڑ گیا۔

(۱۱)

گہرے نیلے کنول کی بجائے اُس کی ایک نظر، چنبیلی کے پھولوں کی بجائے اس کے مسکراتے ہوئے روشن منہ کے دانت، پیالے کی بجائے اُس کی ایک ابلتی ہوئی چھاتی؛ ـــــ اور یوں وہ اس موقعے پر کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی اُس کے لوٹ آنے کی دھوم دھام منا رہی ہے۔

(۱۲)

"تم گھونگٹ کے بغیر زیادہ سندر دکھائی دیتی ہو۔" اور اس کا بے صبر ہاتھ کمر کی طرف سرکتا ہے۔ نوجوان لڑکی کی آنکھوں میں ایک چمک جاگ اٹھتی ہے اور اُس کی سکھیاں اور داسیاں دانشمندی سے کام لیتے ہوئے وہاں

[1] مندراں وچ رون کھلیاں کچّی ٹٹ گئی جنہاں دی یاری ۔ م ۔

سے چل دیتی ہیں۔

(۱۳)

بھوانی، امبا لیکا اور رد ہنی نے اپنے مسکراتے ہوئے چہروں کا عکس پانی میں دیکھا اور بھوانی یہ پکارتے ہوئے کہ مجھے تو پیاس لگی ہے، اس سنہرے دائرے پر جھکی جو رد ہنی کا چہرہ تھا اور اس نے اُسے چوم لیا جب وہ دائرہ لرزتا ہوا سطح پر تیر رہا تھا اور امبا لیکا رونے لگی۔

(۱۴)

وہ پربت کے دھارے کو دیکھتی ہے جہاں اُس کا پریمی اپنے ریوڑ کو رکھتا ہے اور کہتی ہے "اے دھارے! اے ندی! کیا تو نے اُسے دیکھا ہے؟" اور دھارا اپنے جھاگ چھوڑتے ہوئے منہ سے کہتا ہے۔ "میں نے تو نیلے آسمان اور سفید چٹانوں کو دیکھا ہے"۔ "کیا تو نے بنسری کی تان سُنی ہے؟" "میں نے تو چٹانوں سے ٹکراتی ہوئی ہوا کا شور سُنا ہے"۔ "اے دھارے! اے ندی! کیا تو نے کسی منڈلاتے ہوئے عقاب کو دیکھا ہے؟" دھارا کہتا ہے "میں نے عقاب کو دیکھا ہے" اور وہ کہتی ہے "میں خوش ہوں کہ تو نے اُس عقاب کو دیکھ لیا جس نے اسے دیکھا ہے"۔

(۱۵)

اے اگنی کہ جس سے بڑھ کر شکتی والے صرف اندر مہاراج ہیں، اے قدرت کی حرارت! برفانی پہاڑوں سے چھلکتی ہوئی، ستاروں کے چمکتے ہوئے گھیرے سے بہتی ہوئی اگنی، اگنی، اگنی! تجھ میں ہزاروں کنول تلملاتے ہیں، تو لوہے کو سرکنڈوں کی طرح موڑ دیتی ہے، تو ناچنے والوں کے دلوں میں جوت جگائے ہوئے ہے، اُن غزالوں کے لہو میں بھڑک رہی ہے جو شکاریوں کے آگے آگے ہانپتے ہوئے قلانچیں بھرتے چلے جاتے ہیں، تو چمٹے ہوئے پریمی اور پریتم کے! بازوؤں میں ہے اگنی، اگنی، اگنی!

(۱۶)

مندر کی گھنٹی نے اپنی آواز کے تیر کو رات پر ڈھیلا چھوڑ دیا ہے اور تیز تیز سائے گذر رہے ہیں۔ وہ جو چاندی کے پازیبوں کی جھنکار سنائی دے رہی ہے، وہ پرتھا ہے اور وہ اُداس گیسوؤں والی منہ تپتا ہے۔ وہ اوما ہے اور وہ گوتمی ہے۔ جلد ہی وہ لوٹ آئیں گی اور ہر ایک کے پاس ہون کے بیتے میں سنکلپ کیا ہوا ایک ایک کوئلہ ہوگا اور ہمیشہ کی طرح پرتھا کے کوئلے میں گھاس پر کی اوس جذب ہو جائے گی کیونکہ وہ پیار دینے کے لئے کوئلے کو زمین پر رکھ دیا کرتی ہے۔

(۱۷)

بھوانی اور پرتھا سرگوشی کر رہی ہیں۔ وہ کیا کہہ رہی ہیں؟ لو، اب پرتھا دوڑ پڑی۔ وہ کہاں جا رہی ہے؟ اب اُس کے پازیبوں کے ننھے ننھے گھنگروؤں کی آواز نہیں آ رہی۔ بہت دور، وہاں دیکھنا، دو لڑکیاں ایک دوسری کا منہ نوچ رہی ہیں اور ایک نوجوان مرد کھڑا ایک پھول کی پتیاں توڑ رہا ہے۔

(۱۸)

بنسریاں چُپ ہو گئیں۔ الھڑ لڑکیاں دوڑ رہی ہیں۔ پھول مسلے گئے، طوفان آ گیا۔

(۱۹)

اے صبح سویرے کی صورت والی موت! اے پھولوں کے تاج والی موت! اے وہ کہ جو ازل سے آج تک ہر مرد اور عورت کے جسم کو اپنے آغوش میں لینے کی مستی میں چور ہے! اے وہ کہ جس کے ہونٹوں پر مہر لگی ہے! اے موت کہ جو گرے ہوئے شکستہ رقاصوں کی تسلیم و نیاز سے بھری ہے! اے صبح سویرے کی صورت والی موت!

. . . .

یہاں امارو کی پریم کتھا ختم ہوتی ہے۔

اس بات کے باوجود کہ ہمیں صرف امارو کا نام معلوم ہے اور اُس کی یہ نظمیں اور اندازاً اُس کا زمانہ۔ ہم ان نظموں ہی سے اس کی زندگی کے متعلق بہت کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں اور "مشاہدات" کے حصے میں تو درجے میرے خیال میں ذاتی نظمیں کہا جا سکتا ہے اگرچہ ان کا انداز خارجی ہے ہمیں زندگی کے متعلق امارو کے خیالات کی بھی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً پہلی نظم سے پتہ چلتا ہے کہ امارو کے خیال میں مرد کی ذات بے وفا ہے چھٹی نظم میں بھی ناقابلِ فہم طریق پر یہی خیال جھلک رہا ہے۔ آٹھویں نظم میں تو علی الاعلان مردوں کو معتوب کیا گیا ہے۔ نویں نظم سے عورت کی وفاداری ظاہر ہے، اور آخری نظم میں اچانک ہمیں اس کتھا کے انجام پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ رنگ رلیاں اور یہ عیش و عشرت تبھی تک ہیں کہ سانس چل رہی ہے۔

لیکن یہ تمام نظمیں مل کر زیرِ لب یہ کہتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں کہ ؂

ساقیا! یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ — جب تلک بس چل سکے ساغر چلے

میراجی

بغاوت

زندگی محبوب ہے، پھر بھی دعائیں موت کی،
مانگتا ہے دل مرا دِن رات کیوں؟
قسمتِ غم گیں کے ہونٹوں پر کبھی،
آ نہیں سکتی خوشی کی بات کیوں؟

کیوں نگاہوں پر مری چھائے ہیں آنسو کے نقاب،
اِس سوالِ مستقل کا کیوں نہیں ملتا جواب؟
کیا خودی کی اُلجھنیں میرے ارادے توڑ کر
کر رہی ہیں مجھ کو اس دنیا میں ناکامِ حیات؟
کیوں نہیں آتی وہ رات
جس کی ضَوتر سحر

آرزو ہے، مجھ سے ہو اب ہم کلام؟
راحتیں معدوم ہیں میرے تخیل سے تمام!
راستہ مجھ کو نظر آتا نہیں!
راستہ مجھ کو خوشی کا کیوں نظر آتا نہیں؟

چل مرے دل! آج اس محدود خلوت سے نکل!
ہاں سنبھل، قعرِ خموشی میں نہ گر، لے اب سنبھل!
بے خودی مسلک بنا لے بھول جا سب آج کل!
چھوڑ دے مرکز کی چاہت مضطرب ہو اور مچل!
سینۂ آتش فشاں کی طرح گرمی سے اُبل!

چل مرے دل! راستہ خوشیوں کا دیکھ!
اور شعلہ عیش کے لمحول کا دیکھ!
دل گرفتہ! آنسوؤں کو خشک کر!
دیکھ رستہ! آنسوؤں کو خشک کر!
چھوڑ دے مرکز کی چاہت، مضطرب ہو، اور مچل!
چل مرے دل! آج اس محدود خلوت سے نکل!

میراجی

نوادرِ ادبی

حالی کا ایک غیر مطبوعہ خط

بہت عرصے تک ہندوستان میں فن کار کی زندگی کو اس کے فن سے ایک علٰحدہ چیز سمجھا جاتا رہا۔ اسی وجہ سے کسی شاعر، مصور، یا راگی کی نجی زندگی کے واقعات کو آئندہ نسلوں کے فائدے کے لئے حیطۂ تحریر میں لانے کا رواج آغاز ہی سے بہت کم رہا اور یوں موجودہ زمانے میں جب ہمیں معلوم ہوا کہ زندگی اور فن کے گہرے تعلق کو خاطر خواہ طور پر سلجھانے کے لئے فن کار کی نجی زندگی کا علم بھی ایک ضروری جزو ہے تو عموماً اس سلسلے میں تحقیق و تفتیش کرتے ہوئے بہت سی مشکلات حائل ہوئیں۔ اردو شعراء کے حالات معلوم کرنے میں تین چیزیں زیادہ تر ہماری معاون ثابت ہوتی ہیں، لطائف خطوط اور واقعاتی نظمیں، کیونکہ باقاعدہ سوانح عمری کا رواج ابھی ایک نئی بات ہی ہے۔

جون کے شمارے میں جناب مالک رام ایم اے نے نوادرِ ادبی کے عنوان سے غالب کا ایک غیر معروف واقعاتی قطعہ ناظرین ادبی دنیا کی دلچسپی کے لئے پیش کیا تھا۔ موجودہ شمارے میں وہ مولانا الطاف حسین حالی پانی پتی کا ایک غیر مطبوعہ خط پیش کرتے ہیں جس سے بیک وقت غالب انیس، حالی، احسن لکھنوی اور بعض دوسرے اصحاب کے متعلق کچھ حالات معلوم ہوتے ہیں۔ ہم اس خط کے لئے صاحب موصوف کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔ (ادارہ)

(ہم آج مولانا حالی مرحوم کا ایک خط ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ جو ان کے مکتوبات کی دونوں جلدوں میں نہیں چھپا ہے اور نہ کسی اور جگہہ ہماری نظر سے گذرا ہے۔ چونکہ یہ خط ایک خاص واقعے کے سلسلے میں لکھا گیا ہے۔ اس لئے اس کی وضاحت کے لئے چند تمہیدی سطور درج ذیل ہیں۔

۱۹۰۵ء میں منشی مہدی حسن صاحب احسن لکھنوی نے میر انیس مرحوم کی سوانح عمری بنام "واقعات انیس" شائع فرمائی۔ احسن صاحب نے کتاب مذکور کے صفحہ ۱۹ پر لکھا۔

"چنانچہ مرزا غالب مرحوم سے لکھنؤ میں جب میر انیس کی ملاقات ہوئی اور مرزا صاحب نے غزل سننے کا شوق ظاہر کیا تو میر انیس مرحوم نے صنف غزل گوئی کا ابتذال ظاہر کر کے اکثر سلاموں کے مطلع اور شعر سنائے جو تغزل کے رنگ میں صنفِ غزل سے بدرجہا بلند و مضمون خیز تھے اور مرزا صاحب سے دل لگی دل لگی میں مرثیہ کہنے کی فرمائش بھی کر دی۔ میر انیس کا مقصود یہ تھا کہ غالب سا شاعر بھی مرثیئے کی فکر کر کے دیکھ لے کہ یہ رستہ کس قدر دشوار گذار ہے چنانچہ مرزا غالب مرحوم نے صرف تین بند مرثیئے کے بڑی کاہش و کاوش سے لکھے ہیں اور میر صاحب کے پاس اصلاح کو روانہ کئے ہیں اور اس کے ساتھ جو خط ہے اس کی عبارت یہ ہے:

امتثال امر سے مجبور تھا۔ صرف تین بند لکھ کر جو غور کیا تو مرثیہ کا ہے کو ہے واسوخت معلوم ہوتا ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ یہ آپ ہی کا کام ہے۔"

احسن صاحب کے اس بیان سے مندرجہ ذیل امور ظاہر ہوتے ہیں۔

(۱) میرزا غالب کلکتہ جاتے ہوئے لکھنو ٹھہرے تو ان کی میر انیس سے ملاقات ہوئی۔

(۲) میر انیس نے میرزا سے مرثیہ لکھنے کی فرمائش کی۔

(۳) میرزا نے بڑی کاہش و کاوش سے تین بند لکھے اور انہیں بغرض اصلاح میر انیس کے پاس بھیجا اور صنفِ مرثیہ میں اپنے عجز کا اعتراف کیا۔

میر انیس کی عظمت سے کوئی انکار نہیں مگر جس رنگ میں احسن صاحب نے یہ واقعہ لکھا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ اس سے انیس کی عظمت کے اظہار سے زیادہ غالب کی منقصت منظور تھی (وہی لکھنؤ اور دہلی کی روائتی چشمک اور بے جا جنبہ داری)، چنانچہ جب "واقعات انیس" نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر رخشاں کے صاحبزادے مرزا سعید الدین

احمد خاں طالب مرحوم کی نظر سے گذری تو انہوں نے احسن صاحب سے اس واقعے کے لئے سند طلب کی اور پوچھا کہ وہ خط کہاں ہے جس کا حوالہ آپ نے اپنی تحریر میں دیا ہے۔ احسن صاحب نے اس کے جواب میں ایک طویل خط لکھا۔ یوں یہ خط و کتابت کا سلسلہ کچھ مدت جاری رہا۔ احسن صاحب کو اس واقعے کی صحت پر اصرار تھا۔ اور طالب مرحوم اسی تحدی سے اسے غلط قرار دیتے تھے۔ اور کسی طرح فیصلہ ہونے میں نہیں آتا تھا۔

آخر طالب نے یہ تمام خط و کتابت چھپوا کر دہلی اور اطراف کے صاحبانِ علم کے پاس بھیجی اور درخواست کی کہ وہ اسے مطالعہ فرما کر محاکمہ کریں کہ کون سچا ہے اور کون جھوٹا۔ اس پر مولانا حالی مرحوم نے جو خط نواب صاحب کو لکھا ہے وہ ہدیۂ ناظرین ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس کے بعد احسن صاحب نے اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا کہ میر انیس اور مرزا غالب کی ملاقات کا واقعہ ہی سرے سے غلط ہے۔ مالک رام

منجانب شمس العلما مولوی خواجہ الطاف حسین

بنام نواب سعید الدین احمد خاں طالب مرحوم

جناب نواب صاحب مخدوم و مکرم تسلیم۔ کتاب "واقعات انیس" کے بعض مضامین کے متعلق آپ کے اور مصنف "واقعات" کے درمیان جو خط و کتابت ہوئی ہے وہ چھپی ہوئی میرے پاس پہنچی۔ میں اس باب میں زیادہ لکھنا نہیں چاہتا۔ صرف اس قدر لکھنا کافی سمجھتا ہوں کہ مرزا صاحب (غالب) کی ملاقات لکھنؤ میں نہ انیس مرحوم سے ہوئی نہ ہو سکتی تھی۔ مرزا صاحب لکھنؤ اس وقت گئے ہیں جب کہ وہ سپریم کورٹ (عدالتِ عالیہ) میں اپنی پنشن کی بابت استغاثہ کرنے کے لئے کلکتے جاتے تھے اور اثنائے راہ میں چند روز لکھنؤ ٹھہرے تھے۔ یہ زمانہ جیسا کہ مرزا صاحب کی تحریر سے معلوم ہوتا ہے۔ نصیر الدین حیدر کا تھا چنانچہ وہ ایک خط موسومہ منشی حبیب اللہ خاں ذکا میں جو اردوئے معلی مطبوعہ ۱۸۹۹ء کے صفحات ۲۷، ۲۹ میں درج ہے۔ اپنا کلکتے جانا ۱۸۳۰ء میں لکھتے ہیں[1]۔ نصیر الدین حیدر جیسا کہ تواریخ اودھ میں مذکور ہے ۱۸۲۷ء میں تخت نشین ہوئے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ۱۸۳۰ء میں عہد نصیر الدین حیدر کا آغاز تھا۔ اس وقت تک میر انیس نہ لکھنؤ میں فیض آباد سے آئے تھے اور نہ لکھنؤ میں ان کی کچھ شہرت تھی اور نصیر الدین حیدر دس برس تخت نشین رہے اور ان کے بعد پانچ برس کے قریب محمد علی شاہ تخت نشین رہے۔ ان دونوں کے عہد میں میر انیس صاحب جیسا کہ واقعات انیس سے ظاہر ہے فیض آباد ہی میں رہے اور امجد علی شاہ کے زمانے میں فیض آباد سے آکر لکھنؤ میں ان کے خاندان نے سکونت اختیار کی۔ چنانچہ واقعات انیس کے صفحہ ۶۶ میں لکھا ہے کہ نصیر الدین حیدر کے زمانۂ سلطنت تک میر انیس کی شہرت لکھنؤ میں نہیں پائی جاتی۔ کیونکہ مرزا رجب علی بیگ کے "فسانۂ عجائب" کی ابتدا زمانہ غازی الدین حیدر میں ہوئی اور عہد نصیر الدین حیدر میں وہ تمام ہوا۔ سرور نے اس کتاب میں لکھنؤ اور صاحب کمالانِ لکھنؤ کا ذکر کیا ہے۔ اس وقت کی انشا پردازی کے موافق تبلیغ علما و حکما سے لے کر ادنیٰ طبقے کے لوگوں تک کا ذکر کر گئے ہیں۔ اس فہرست میں میر انیس کا نام نہیں پایا جاتا۔ اس کے بعد اسی صفحے پر لکھا ہے کہ لکھنؤ کے اکثر کہن سال بزرگوں سے بھی یہی دریافت ہوا کہ زمانۂ امجد علی شاہ میں میر انیس کا مستقل قیام لکھنؤ میں ہوا ہے۔ جو فہرست مشاہیر لکھنؤ کی "فسانۂ عجائب" کے مصنف نے نقل کی ہے۔ اس میں مرزا دبیر کا نام تو پایا جاتا ہے لیکن میر انیس کا نام نہیں ہے۔ اس کے علاوہ صفحہ ۷۲ پر یہ لکھا ہے میر انیس مرحوم خود فرماتے تھے کہ جب ہم نے لکھنؤ میں مرثیہ پڑھنا شروع کیا تو اس وقت دو صاحب اس فن کے لکھنؤ میں نامی گرامی تھے۔ ایک تو میر مداری صاحب اور دوسرے مرزا سلامت علی دبیر۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ میر انیس کی شہرت لکھنؤ میں مرزا دبیر سے بہت پیچھے ہوئی ہے۔ مگر مرزا دبیر سے بھی مرزا غالب کا لکھنؤ میں ملنا کسی تحریر سے یا کسی زبانی روایت سے ثابت نہیں ہوتا۔ البتہ شیخ امام بخش ناسخ اور میر ضمیر سے ان کا ملنا بخوبی ثابت ہے اس سے کسی کو انکار نہیں ہے۔ اگر ان یقینی شہادتوں سے قطع نظر کی جائے تو مصنف "واقعات انیس" کی طرزِ تحریر ایسی واقع ہوئی ہے کہ جو مکالمہ میر صاحب اور میرزا صاحب کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ دونوں صاحبوں کی شان سے نہایت بعید معلوم ہوتا ہے۔ مرزا صاحب جو گویا اہلِ لکھنؤ کے مہمان تھے۔ ان سے میر انیس کا پہلی ملاقات میں یہ کہنا کہ غزل ایک مبتذل صنفِ کلام ہے اور ان سے مرثیہ لکھنے کی فرمائش کرنا اور گویا در پردہ یہ کہنا کہ اس میدان میں آؤ تو حقیقت معلوم ہو کس قدر خلافِ انسانیت۔ خلافِ تہذیب اور خلافِ اخلاق باتیں ہیں جن کو کوئی مرد آدمی باور نہیں کر سکتا۔ خاکسار کا یہ بیان آپ جس رسالے یا اخبار میں چاہیں شائع کرا دیں۔

راقم خاکسار الطاف حسین حالی از پانی پت۔ ۲ مارچ ۱۹۰۹ء

[1] مرزا غالب لکھنؤ جاتے ہوئے ۱۸۲۶ء، ۱۸۲۷ء میں لکھنؤ ٹھہرے۔ یہاں مرزا غالب اور حالی دونوں کو تاریخ کے تعین میں سہو ہوا ہے۔ دیکھو ذکرِ غالب صفحہ ۳۰-۳۱ (مالک رام)

غزل

یکساں روشِ شیخ و رہِ برہمنی ہے
دنیا جسے کہتے ہیں خدا کی صنمی ہے

ہر چند کہ ارزاں ہیں یہاں حُسن کے جلوے
لیکن ابھی دنیا میں محبت کی کمی ہے

اپنی ہوسِ دید کو بدنام کریں کیوں؟
خود حُسن کی فطرت میں تماشا طلبی ہے

کہتے ہیں تری جلوہ گہہ ناز ہے دنیا
اب ہوش میں آنا بھی یہاں بے ادبی ہے

جو حوصلۂ ارض و سما پھونک کے رکھ دے
وہ برقِ تجلی مرے خرمن پہ گری ہے

جس دم نظر آجائے ترا حُسنِ دل آرا
میرے لئے وہ لمحہ حیاتِ ابدی ہے

اس سوزشِ پیہم نے کہیں کا بھی نہ رکھا
یہ دل ہے کہ اک آگ سی سینے میں بھری ہے

جب تک نہ ہو دل واقفِ اسرارِ خدائی
اے شیخ وہ سجدہ نہیں بیہودہ سری ہے

پروانے سرِ شام ہی جس سے تڑپ اُٹھے
وہ آگ دلِ شمع میں تا صبح جلی ہے

لا بادۂ غم سوز کہ غم کا نہیں یارا
اللہ کو اندازۂ ضبطِ بشری ہے

ساغر کی ہوس کفر ہے میرے لئے تاباںؔ
خوش ہوں کہ اسی میں مرے ساقی کی خوشی ہے

ظفر تاباں

تعبیر

تیسری دفعہ نزہت آرا کی آنکھیں پھر کھل گئیں۔ وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھی اور آنکھیں مل مل کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔ اس خیال سے کہ شاید دیر ہو گئی ہو اس کا دل دھڑک رہا تھا ——— آج چھ ماہ کی جاں گسل جدائی کے بعد رشید گھر واپس آ رہا تھا اور ابھی تک اس کے استقبال کی تیاریاں مکمل نہ ہوئی تھیں ——— سارے گھر کی صفائی۔ فرنیچر کی ترتیب اور جھاڑ پونچھ ——— بچہ کو نہلا دھلا کر صاف ستھرے کپڑے پہنانا ——— ناشتے کی تیاری اور اسی قسم کے صدہا کام ابھی باقی تھے۔

رفتہ رفتہ جب نیند کا بوجھ آنکھوں سے دور ہوا تو اس نے آسمان کی طرف دیکھا ——— صاف اور شفاف آسمان کی نیلگوں سطح پر ستارے جھلکے ہوئے تھے۔ فضا میں اُن کا خوش آئند نور پھیلا ہوا تھا۔ رات بھیگ چلی تھی۔ ہوا کے پاکیزہ اور لطیف جھونکے سرد ہو گئے تھے ——— آسمان کے اس حسین اور پُرکیف منظر نے نظروں میں کھُب کر نزہت آرا کے دل میں چٹکیاں لیں ——— اس نے ایک ہلکی سی انگڑائی لی۔ اور بے محابہ ——— کسی تحت الشعوری جذبہ کے زیر اثر بچے کے لب و رخسار چومنے لگی۔ دل کی گہرائی سے ایک آہِ سرد اُٹھی اور ہونٹوں سے نکل گئی ——— ساتھ ہی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ ایسے آنسو جن کا بظاہر کوئی مطلب نہ تھا اور ہونٹ کانپنے لگے۔

رات زیادہ باقی تھی۔ نزہت آرا نے آنسو پاک کئے۔ پریشان زلفوں کو درست کر کے جوڑا باندھا اور دوپٹہ ٹھیک کر کے بچے کے پہلو میں لیٹ رہی۔ وہ چاہتی تھی کہ جلدی نیند آ جائے تاکہ صبح اٹھنے میں دیر نہ ہو۔ لیکن نیند کو نہ آنا تھا نہ آئی۔ وہ دیر تک آنکھیں بند کر کے کروٹیں بدلتی رہی۔ لیکن نہ خیالات کا سلسلہ ٹوٹا اور نہ آنکھ لگی۔ گذشتہ زندگی کے واقعات ایک ایک کر کے یاد آ رہے تھے اور اس کے دماغی سکون کو درہم و برہم کر رہے تھے ——— ابھی اس کی شادی کو کچھ اوپر دو سال ہوئے تھے لیکن اس قلیل مدت میں اس نے زندگی کے بہت سے نشیب و فراز دیکھ لئے تھے۔ انیس سال کی عمر میں وہ ایک الھڑ لڑکی سے ایک تجربہ کار عورت بن گئی تھی!

ازدواجی زندگی کا وہ ابتدائی دور اس کی نظروں میں پھر رہا تھا۔ جب رشید کی بے پایاں محبت نے اس کو ایسی دنیائے رنگ و بو میں پہنچا دیا تھا۔ جہاں ابدی مسرتیں شراب بن کر اچھلتی تھیں۔ جہاں حسن و عشق کی بے قراریاں سحاب بن کر گرجتی تھیں، امنڈتی تھیں اور برستی تھیں محبت سے لبریز دلوں کے نغمے دونوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے فضا کی رنگینیوں میں منڈلاتے پھرتے تھے۔ جب کبھی محبت کی بے قراریوں سے مجبور ہو کر رشید اس کی گردن میں اپنی باہیں حمائل کر دیتا تھا، اور وہ آنکھیں بند کر کے اس کی داستانِ الفت سنتی تھی تو ایسا محسوس ہوتا تھا گویا وہ اور رشید دونوں مادی جسم کی کثافت سے پاک ہو کر دو لطیف اور مسرور روحوں کی طرح اُڑتے چلے جا رہے ہیں، شفق کے سرخ بادلوں کی طرف! جذبات کی گرانباری سے رشید کی آواز لرز لرز کر ایک ہلکی سی آہ سرد میں تبدیل ہو جاتی تھی اور اس کی گرم گرم سانس رخساروں سے مس ہو کر کیسے شیریں فتنوں کو جگاتی تھی۔

یہ رنگین طلسم کیوں ٹوٹ گیا! یہ جنتِ نشاط کیوں اُجڑ گئی؟ ——— یہ ایک ایسا معمہ تھا جس کو نزہت آرا آج تک نہ حل کر سکی۔ پہلے کبھی اس کو خواب میں بھی یہ خیال نہ آتا تھا کہ رشید کی محبت سیلاب کی طرح بہت جلد ختم ہو جائے گی۔ لیکن ہوا ایسا ہی ——— پورا ایک سال بھی نہ گذرا تھا کہ رشید کے انداز و اطوار میں نمایاں فرق پیدا ہو گیا۔ پہلی سی دلداری باقی رہی نہ پہلی سی بے قراریاں۔

نزہت کو وہ رات یاد آ رہی تھی جب اسی چھت پر، جس پر اس وقت موجود تھی، وہ رشید کے پہلو میں بیٹھی ہوئی تھی۔ رشید اس کی سیاہ مشکبو زلفوں سے کھیل رہا تھا۔ نزہت نے اپنی نیم باز آنکھیں اس کے چہرے پر جما دیں اور یہ دیکھ کر نقشِ حیرت بن گئی کہ رشید کا محض جسم وہاں موجود تھا اور ذہن بہت دور کسی ایسی دنیا میں تھا جس سے وہ آشنا نہ تھی۔

رشید کی یہ بے توجہی اس کو ناگوار گذری، چنانچہ اس کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے اس نے حسن و شباب کی صبرشکن طاقتوں سے کام لیا اور ایک مستانہ انگڑائی لے کر مسکرائی اور اس کے شانے سے اپنا رخسار لگا دیا۔ رشید کا داہنا ہاتھ اٹھا اور آہستہ آہستہ سر اور گردن کو مس کرتا ہوا کمر سے لپٹ گیا۔ دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے رشید نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر بلند کی اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیر تک دیکھتا رہا ـــــ خاموشی اور سکون کے ساتھ۔

نزہت نے ڈر کر اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ اس لئے کہ اس وقت رشید کی آنکھوں میں محبت کے بجائے رحم اور افسوس کی کیفیت پیدا تھی۔ وہ اس کی طرف اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے کوئی عرب اپنے محبوب ترین ناقہ کو ذبح کرنے سے پیشتر دیکھتا ہے ـــــ رشید نے اس کے مرتعش ہونٹوں پر ہونٹ رکھ دیئے لیکن اس کے ہونٹ سرد تھے اور غیر متحرک! ـــــ اس کے بعد وہ نزہت کے پہلو سے اٹھ کر چھت پر ٹہلنے لگا ـــــ اور نزہت نے تکئے میں اپنا حسین چہرہ چھپا کر رونا شروع کر دیا۔ پہلے آنسو ڈھلکے پھر سسکیاں شروع ہو گئیں۔ رشید نے اس کی آواز سنی لیکن تسکین دینے کے لئے قریب نہ آیا۔

یہ نزہت کی ازدواجی زندگی کے دوسرے دور کا آغاز تھا۔ جس طرح ڈوبنے والا گھبرا کر اِدھر اُدھر ہاتھ پیر مارتا ہے اور تنکے کا سہارا ڈھونڈتا ہے، اسی طرح نزہت نے عقل و خرد سے بیگانہ ہو کر اپنی طرف سے بے تابی اور بے قراری کا اظہار شروع کیا۔ اور رشید کی شمع الفت کو از سرِ نو روشن کرنے کی کوشش کی لیکن توقع کے خلاف ان کوششوں کا اثر الٹا ہوا۔ رشید اُس کی محبت کی بے قراری دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھنے لگا ـــــ اور تلخ کلامی کے ذریعے اپنے ضمیر کی سرزنش کا انتقام بدنصیب نزہت آرا سے لینے لگا۔ آخر نزہت نے مایوس ہو کر خاموشی اختیار کر لی۔ لیکن اس صورت میں بھی اس کو رہائی نہیں ملی۔ اس کو ملول اور افسردہ دیکھ کر رشید کو تکلیف ہوتی تھی اور مردانہ فطرت کے مطابق یہ فرض کر کے کہ نزہت محض مجھے تکلیف دینے کے لئے رنج و غم کا اظہار کرتی ہے وہ اس سے بگڑتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بے چاری نزہت اس سے ڈرنے لگی ـــــ اور دور دور رہنے لگی۔

رشید نے اُس کی اس خاموشی سے فائدہ اٹھایا اور دن رات کا زیادہ حصہ گھر سے باہر گذارنے لگا۔ رفتہ رفتہ نزہت کے کانوں تک یہ خبر پہنچی کہ رشید مقامی زنانہ ہسپتال کی حسین اور جواں سال لیڈی ڈاکٹر سے راہ و رسم بڑھا رہا ہے۔ لیڈی ڈاکٹر بمبئی کی ایک شریف مسلم خاتون تھی ـــــ وہ نزہت کا علاج کر چکی تھی اور کبھی کبھی اس کو دیکھنے چلی آیا کرتی تھی۔ لیکن دو تین مہینے سے اس نے آمد و رفت بند کر دی تھی ـــــ یہ سوچ کر نزہت کا ماتھا ٹھنکا۔ اور آزمائش کے لئے ایک روز اس نے لیڈی ڈاکٹر کو بلا بھیجا لیکن اس نے کوئی عذر کر کے ٹال دیا ـــــ اس واقعے سے نزہت کا شک یقین سے بدل گیا۔

رشید اُن آوارہ مزاج نوجوانوں کی طرح نہ تھا جو جنسی فتوحات کو باعث فخر سمجھ کر ایک کے بعد دوسرا شکار تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ اس نے اپنی رفیقۂ حیات سے رشتۂ الفت قائم رکھنے کی انتہائی کوشش کی لیکن قائم نہ رکھ سکا۔ اس کی ہستی رفتہ رفتہ لیڈی ڈاکٹر کی دلفریب شخصیت میں جذب ہوتی گئی۔ وہ نزہت کی طرح محض حسن و جمال کی دولت سے مالامال نہ تھی بلکہ انتہائی دلفریب ذہن اور روح کی بھی مالک تھی۔ جس کی لطافتیں اور رعنائیاں مادی حسن کی لطافت اور رعنائی سے کہیں بڑھ چڑھ کر تھیں اور جو نشۂ شراب کی طرح رشید کے دل و دماغ پر چھا گئیں اور اُس کو بالکل بے قابو کر دیا۔

نزہت حسن و جمال کے اعتبار سے ہزاروں میں ایک تھی۔ لیکن ایک قدامت پرست ماں کے آغوش میں پلی تھی۔ اور اعلیٰ تعلیم کے زیور سے محروم تھی۔ رشید روشن خیال اور تعلیم یافتہ تھا۔ لہٰذا دونوں میں وہ ذہنی اور روحانی اتحاد پیدا نہ ہو سکا جس سے محبت کے رشتے دائمی ہو جاتے ہیں اور یہ کمزور رشتہ پہلے ہی جھٹکے میں ٹوٹ گیا۔

نزہت ان لڑکیوں میں تھی جو شوہر کے ہر فعل کو تقدیر کا فیصلہ سمجھتی ہیں۔ لہٰذا وہ رشید کی اس بے وفائی کو اپنی شومیٔ تقدیر کا نتیجہ سمجھ کر خاموش ہو گئی ـــــ اس نے کبھی رشید سے شکایت نہیں کی۔ اپنے کنبہ والوں سے بھی کبھی اس کا ذکر نہیں کیا۔ اگر کوئی رشید اور لیڈی ڈاکٹر کا ذکر چھیڑتا تو وہ ہنسی ہنسی میں ٹال دیتی اور چہرے کی اُس زردی کو چھپانے کی کوشش کرتی جو دل پر چوٹ لگنے سے ایسے موقعوں پر نمایاں ہو جایا کرتی ہے۔

آخر ایک روز رہی سہی امید دل کا بھی خون ہو گیا۔ جب رشید کے ایک دوست نے ڈیوڑھی پر آ کر کہلا بھیجا کہ وہ کسی ضروری کام سے آگرے چلا گیا ہے۔ اور کچھ روز وہاں قیام کرے گا۔ نزہت نے یہ خبر

خاموشی کے ساتھ سنی ـــــ اس کا دل بیٹھ گیا۔ ہمت پست ہو گئی۔ وہ جانتی تھی کہ لیڈی ڈاکٹر آگرے تبدیل ہو کر جا چکی ہے۔

آج چھ ماہ کے بعد رشید آگرے سے واپس آ رہا تھا! اس دوران میں خاندان والوں نے اس کو طرح طرح کے مشورے دیئے۔ کسی نے نان ونفقہ کا دعوےٰ کرنے کو کہا۔ کسی نے طلاق لینے کی صلاح دی۔ خود اس کی ماں بضد تھی کہ اس کو اپنے بھائی کو ساتھ لے کر فوراً آگرے پہنچ جانا چاہیئے۔ لیکن وہ سب کے جواب میں یہی کہہ دیا کرتی تھی کہ ایک نہ ایک روز وہ خود واپس آئیں گے۔ جب میرا ہاتھ پکڑا ہے تو نباہ بھی کریں گے۔ میری محبت نہ سہی۔ کیا اپنے بچے کو بھی بھول جائیں گے؟

اسی امید پر وہ اب تک زندہ تھی۔ والدین نے بہت اصرار کیا کہ جب تک رشید نہیں آتا اپنے میکے میں آ کر رہے لیکن وہ نہ گئی۔ ڈرتی تھی کہ اگر میری غیر حاضری میں واپس آ گئے تو گھر کو خالی پا کر ناراض ہوں گے۔

خیالات کا سلسلہ یہاں تک پہنچا تھا کہ نزہت آرا کو نیند آ گئی۔

(۲)

ارے اب کیا ہو گا، اتنی دھوپ چڑھ آئی! نزہت آرا نے گھبرا کر خادمہ سے پوچھا جو اس کو بیدار کرنے آئی تھی۔ "ابھی سارا کام باقی ہے"

"آپ اُٹھ کر ہاتھ منہ دھوئیے۔ سب کچھ ہو جائے گا" خادمہ نے بچے کو گود میں لے کر جواب دیا۔ "سرکار تو دوپہر کی گاڑی سے آئیں گے"۔

خادمہ بچے کو لے کر مکان کے زیریں حصے میں چلی گئی۔ نزہت نے اٹھ کر جلد جلد ہاتھ منہ دھویا۔ بال سنوار کر لباس تبدیل کیا اور سراسیگی میں نیچے آئی۔ اس کے خیالات کا شیرازہ بکھرا ہوا تھا ـــــ

"اری ہرمزی" اس نے بچے کو ٹب میں بٹھا کر کہا "ذرا میرے سنگار میز سے وہ خط تو نکال لانا۔ یاد نہیں آتا کس گاڑی سے آنے کو لکھا ہے۔ ارے لو ـــــ خدا کی مار ایسے دھیان پر بچے کو نہلانے بیٹھی ہوں اور صابن نہیں لائی ـــــ ذرا صابن بھی لیتی آنا۔ جلدی سے جاؤ۔ مجھے ابھی بڑا کام ہے"۔

چند منٹ بعد جب ہرمزی خط لے کر آئی تو نزہت آرا نے اپنی بھیگی ہوئی انگلیوں سے اس کو کھول کر پڑھا۔ تین دفعہ شروع سے آخر تک پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ وقت کا کوئی تعین نہیں ہے ـــــ کسی ٹرین سے آ جائیں گے۔ یہ معلوم ہونے پر اس کی سراسیگی میں اور اضافہ ہو گیا۔ اس لئے کہ ایک ٹرین آٹھ بجے صبح بھی آتی تھی۔

بچے کو نہلا دھلا کر نزہت نے اچھے ریشمی کپڑے پہنائے۔ بالوں میں تیل ڈال کر کنگھی کی، پاؤڈر لگایا، آنکھوں میں کاجل دیا اور چند منٹ تک عزور وناز کے ساتھ اس کو دیکھنے کے بعد ہرمزی کو آواز دی۔

"ہرمزی۔ دیکھ تو میرا آصیل کیسا اچھا ہے!" اس نے ہرمزی سے کہا۔

"خدا سلامت رکھے حضور" ہرمزی نے بلائیں لے کر جواب دیا۔ "چندے آفتاب چندے ماہتاب۔ خدا نظر بد سے بچائے"۔

لیکن ہرمزی بلائیں لے کر کھڑی ہوئی تو اُس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبائے ہوئے تھے ـــــ کشمکش جذبات سے ہونٹ کانپ رہے تھے نزہت نے اس کی طرف دیکھا اور دیکھتے ہی کلیجہ منہ کو آ گیا ـــــ وہ ہرمزی کے سینے سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"ہرمزی میں آج رونا نہیں چاہتی" اس نے سسک سسک کر کہا "آج تو میرے لئے خوشی کا دن ہے۔ لیکن نہ معلوم کیوں دل بھرا آ رہا ہے۔ ہرمزی سچ بتاؤ ـــــ وہ آئیں گے؟"

"جی ہاں۔ خدا سلامت رکھے۔ ضرور آئیں گے۔ میرا دل کہتا ہے" ہرمزی نے جواب دیا۔

"میرے دل میں خدا جانے کیسے کیسے وسوسے پیدا ہو رہے ہیں" نزہت نے کہا "لیکن اگر آنا نہ ہوتا تو لکھتے ہی کیوں؟"

"جی ہاں اور کیا" ہرمزی نے تائید کی۔

ہرمزی کے جانے کے بعد نزہت نے ماما کو بلایا اور کھانے کے متعلق ہدایات دیں۔ جتنی اچھی چیزیں یاد آئیں۔ سب کے پکانے کا حکم دیا۔ چائے اور ناشتہ کا انتظام ہرمزی کے سپرد کر چکی تھی۔ دو لڑکیاں جو متفرق کام کرتی تھیں ان میں سے ایک کو جمیل کی نگرانی کے لئے چھوڑا اور دوسری کو ساتھ لے کر مکان کی آرائش کا اہتمام کرنے لگی۔

لڑکی نہایت ہوشیار اور چابک دست تھی ـــــ اس نے انتہائی پھرتی کے ساتھ ایک ایک چیز کو جھاڑ پونچھ کر قرینے سے رکھنا شروع کیا ـــــ لیکن نزہت آرا سراسیگی میں کوئی قطعی فیصلہ کرنے سے عاجز تھی۔ وہ ہر ہر چیز کو بار بار مختلف جگہوں پر رکھواتی اور پھر شکوک باقی رہ جاتے۔ نشست کے کمرے کا فرنیچر تین دفعہ ترتیب دیا گیا۔ لیکن ہر دفعہ

کوئی نہ کوئی عیب ضرور پیدا ہوگیا۔

یہ کام شاید سارا دن اسی طرح جاری رہتا لیکن اتفاقاً دیوار کی گھڑی پر نظر پڑتے ہی نزہت کے ہاتھ پیر پھول گئے نفس کی آمد وشد تیز اور بے ترتیب ہوگئی ــــ آٹھ بج رہے تھے! ٹھیک آٹھ بجے ایک ٹرین آگرہ سے آتی تھی۔ اگر رشید اسی ٹرین سے آ گیا تو تھوڑی دیر میں ہی گھر پہنچ جائے گا! ۔ اس خیال نے بجائے خوشی پہنچانے کے نزہت کی جذباتی اور ذہنی کشمکش میں اضافہ کر دیا۔

نزہت نے اپنی پوری قوت ارادی صرف کر کے اوسان درست کئے۔ آئینے میں اپنا عکس دیکھ کر لباس تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا اور بالاخانہ پر پہنچی۔ لیکن اب تک ہر آہٹ پر اس کا دل اس طرح بیٹھ جاتا تھا۔ جس طرح اوپر سے گرا ہوا پتھر کوئیں کی تہ میں بیٹھ جاتا ہے ــــ نفس کی آمد ورفت بند ہو جاتی تھی ــــ ہر آواز پر رشید کی آواز کا دھوکا ہوتا تھا۔

اسی اضطراب اور بے چینی کی حالت میں اُس نے آخر کار ایک جوڑا پسند کر کے پہنا۔ اور آئینے میں اپنی شکل دیکھ کر گھبرا گئی۔ نرگسی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے پڑ گئے تھے۔ رخسار زرد تھے! چھ مہینے کے بعد وہ اس حالت میں رشید کا خیر مقدم کرنا نہیں چاہتی تھی ــــ وہ چاہتی تھی کہ اُسے خوش وخرم پائے۔ لیکن کوشش سے بھی وہ رخساروں میں تابانی اور ہونٹوں پر تبسم پیدا نہ کر سکی۔ ناچار اسی حالت میں نیچے اتر آئی۔

بچہ میز پر بیٹھا ہوا لڑکی کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ نزہت نے جا کر اس کو پیار کیا اور قریب ہی ایک کوچ پر بیٹھ گئی۔ لیکن ابھی اس کو بیٹھے ہوئے پانچ منٹ بھی نہ گذرے تھے کہ چونک کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔ پہیّوں کی گڑگڑاہٹ کی آواز آتے آتے رک گئی تھی!

اس نے چاہا کہ کسی کو پکارے لیکن آواز نہ نکلی۔

"سرکار آ گئے"! دفعتہً ہرمزی نے کمرے میں داخل ہو کر کہا۔

"کیا!" نزہت کے منہ سے آواز آئی ــــ اور ساتھ ہی اس کے دونوں ہاتھ اوپر اٹھے ــــ سر چکرانے لگا۔ آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا ــــ قریب تھا کہ وہ غش کھا کر گر پڑے کہ ہرمزی نے دوڑ کر سہارا دیا۔

"اب کیا ہوگا ہرمزی!" اس نے نحیف آواز میں پوچھا "وہ آ گئے میرا دل بیٹھا جاتا ہے۔ تم ہٹ کر قریب سے نہ جانا۔ میں اکیلی اُن کا سامنا نہیں کر سکتی۔"

چُرمُر چُرمُر! والان سے کسی کے جوتوں کی آہٹ آ رہی تھی!

"ہرمزی مجھے پکڑ لو" نزہت نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا "نہیں نہیں، تم جاؤ ــــ مجھے اکیلی چھوڑ دو۔ بچے کو بھی لیتی جاؤ۔"

ہرمزی اور لڑکی جیسے کمرے سے باہر گئیں، رشید آ گیا ــــ نزہت نے چاہا کہ اس کی طرف بڑھ کر جائے۔ لیکن قدموں نے جنبش نہ کی۔ مجبوراً وہیں کھڑی رہی۔ رشید اس کے قریب آ کر کھڑا ہوگیا۔

"آ گئے!" نزہت نے بمشکل کہا اور چپ ہوگئی۔

"ہاں ..... آ گیا" رشید نے گلوگیر آواز میں جواب دیا اور نزہت کو اپنے بازوؤں میں قید کر لیا۔ نزہت اس کے سینے پر سر رکھ کر رونے لگی۔ بچوں کی طرح۔ سسک سسک کر۔

چند منٹ کے بعد رشید نے آہستہ آہستہ اس کو لا کر ایک کوچ پر بٹھا دیا اور خود بھی اس کے پہلو میں بیٹھ گیا۔ نزہت نے اپنے آنسو پاک کئے اور مسکرا کر کہا۔

"مجھے یقین تھا کہ آپ ضرور آئیں گے۔ اسی لئے روز آپ کا انتظار کرتی تھی۔ آپ کے کپڑے بھی دھلا کر رکھے ہیں۔ اپنے جمیل کو دیکھئے کیسا موٹا تازہ ہے۔ میں نے آپ کے جانے کے بعد اس کی بڑی خدمت کی۔ ڈرتی تھی کہ کہیں دبلا نہ ہو جائے اور آپ ناراض ہوں۔"

"اور تم خود کتنی خوبصورت ہوگئی ہو۔ پہلے سے بھی زیادہ!" رشید نے کہا۔

نزہت اس تعریف سے خوش ہوئی۔ لیکن ساتھ ہی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔

"جمیل کو دیکھئے گا؟ بلاؤں؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں۔ ضرور!"

نزہت خود جا کر بچے کو لائی اور ایک جوہری کی شان سے جو دنیا کا بہترین ہیرا گاہک کو دکھاتا ہے اس کو رشید کے پہلو میں بٹھا دیا۔ اس کے چمپئی رخسار جوش مسرت اور تفاخر سے تمتما رہے تھے ــــ نرگسی آنکھیں چمک رہی تھیں اور ہونٹوں پر تبسم کی لہریں کھیل رہی تھیں ــــ اس کے اس جوش مسرت میں ایک دلکش شرمیلی ادا شامل تھی۔ رخسار رنگ حجاب میں ڈوبے جاتے تھے ــــ وہ اُن آنکھوں سے جن میں مسرت اور اطمینان نے بجلیاں بھر دی تھیں، رشید کے چہرے کا اُتار چڑھاؤ اور اس کے ہاتھ کا بچے کے جسم پر چلنا دیکھ رہی تھی۔

"خوبصورت ہے نا؟" نزہت نے ناز کے ساتھ مسکرا کر پوچھا۔
"آخر تمہارا بچہ ہے، خوبصورت کیسے نہ ہوتا؟" رشید نے جواب دیا
"لیکن ہے آپ پر!" نزہت نے شرما کر کہا۔
اس قسم کی باتوں میں چند منٹ گذرے تھے کہ نزہت آرا کو یک بیک ناشتے کا خیال آگیا۔ وہ چونک پڑی اور ندامت کے لہجے میں بولی۔
"بھاڑ میں جائے ایسا دھیان۔ میں میٹھی باتیں بنا رہی ہوں اور آپ کی آنتیں قل ھو اللہ پڑھ رہی ہوں گی ——— آپ بچے کو لئے رہئے گا۔ میں جا کر دم کی دم میں حمام تیار کرتی ہوں۔ نہا دھو کر ناشتہ کیجئے۔"
"ابھی بیٹھو۔ تمہیں دیکھ کر میری بھوک جاتی رہی" رشید نے عاشقانہ انداز میں جواب دیا۔
نزہت جاتے جاتے ٹھہر گئی اور چند منٹ تک خاموشی کے ساتھ رشید کا منہ تکنے کے بعد اس کے پیروں کے قریب فرش پر دو زانو ہو گئی۔ اس نے اپنے خوشنما ہاتھ رشید کے گھٹنوں پر رکھ دیئے اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔
"ایسی باتیں نہ کیجئے ——— میرے دل پر چوٹ لگتی ہے ——— آج کے دن مجھے خوش رہنے دیجئے۔"
ان سیدھے سادے جملوں میں شکایت کی ایک دنیا پنہاں تھی ——— جس کے احساس سے رشید تلملا اٹھا۔ اس نے اپنی نظریں نیچی کر لیں اور عذر خواہی کے لہجے میں کہا۔
"اٹھو نزہت۔ مجھ سے غلطی ہوئی۔ مجھے ایسی باتیں کرنے کا واقعی کوئی حق نہیں۔"
"حق آپ کو جو پہلے تھا۔ وہ اب بھی ہے اور ہمیشہ رہے گا۔" نزہت نے آنسو بہا کر جواب دیا "لیکن میں چاہتی ہوں کہ آج پرانی یاد تازہ نہ ہو۔ آج آپ میرے مہمان ہیں۔"
رشید کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے ——— اس نے نزہت کا سر کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا اور اس کی سیاہ زلفوں میں اپنا چہرہ چھپا لیا۔
"ہٹئے۔ مجھے جانے دیجئے" نزہت نے رشید کے سینے سے سر اٹھا کر ناز کے ساتھ کہا "خواہ مخواہ مجھے رلا دیا!"
نزہت کے جانے کے بعد رشید دیر تک دروازے کی طرف دیکھتا رہا ——— آخر ایک لمبی سانس کھینچ کر بولا "بے چاری معصوم نزہت! اگر اس کو میرے آنے کا اصل سبب معلوم ہو جائے تو نہ معلوم صدمے سے اس کا کیا حال ہو۔"

(۳)

جوش مسرت نے نزہت آرا کو دیوانہ بنا دیا تھا۔ اس کا رشید گھر واپس آگیا تھا۔ اور گو اس کے عادات اور برتاؤ میں فرق تھا ——— پہلی سی پیار اور اختلاط کی چھیڑ چھاڑ تھی نہ وہ راز و نیاز کی باتیں تاہم نزہت خوش تھی۔ اس لئے کہ گذشتہ چھ ماہ کی طرح اب اس کی زندگی بے مقصد نہ تھی۔ رشید کو راحت اور آرام پہنچانا بھی اس کی خوشی کے لئے کافی تھا۔ رشید کو اس سے محبت نہ سہی لیکن جمیل ایک ایسی سنہری زنجیر تھا جس نے دونوں کی زندگی کو وابستہ کر دیا تھا ——— اس نے ماضی کو بھلا کر اپنے تئیں حال میں کھو دیا تھا۔
کئی دن اسی حالت میں گذر گئے۔ رشید چاہتا تھا کہ نزہت کچھ لیڈی ڈاکٹر کا ذکر چھیڑے۔ کچھ آگرے کے قیام کے متعلق دریافت کرے تو وہ اپنے آنے کی اصل غایت بیان کر دے۔ لیکن نزہت نے ان باتوں کا ذکر نہ آنے دیا۔ اگر رشید کبھی گفتگو کا رخ اس طرف موڑتا بھی تھا تو وہ نہایت ہوشیاری کے ساتھ موضوع بدل جاتی تھی۔
وقت گذر رہا تھا اور رشید کی الجھنیں بڑھ رہی تھیں لیکن نزہت کی بے پایاں خوشی کو دیکھ کر اس کی ہمت پست ہو جاتی اور وہ حرف مطلب زبان تک لا کر خاموش ہو جاتا۔ وہ دیکھتا تھا کہ نزہت شاداں اور مطمئن ایک ایسی تتلی کی طرح جو خزاں سے بے خبر پھولوں سے لدی ہوئی کیاریوں میں اڑ رہی ہو، سارے مکان میں دوڑی دوڑی پھرتی تھی کبھی اس کمرے میں اس کے قہقہے گونج رہے ہیں۔ کبھی اس دالان میں اس کے تبسم کی بجلیاں کوند رہی ہیں۔ وہ کبھی جمیل کو کھلاتی تھی۔ کبھی رشید کی خاطر داریوں میں منہمک ہوتی تھی۔ غرضکہ صبح سے نصف شب تک وہ انہی دلچسپ مشاغل میں مصروف رہتی۔ بات بات میں ہنسنا مسکرانا۔ اٹھتے بیٹھتے کے ساتھ اٹھلا اٹھلا کر چلنا اس کا دستور ہو گیا تھا۔
ایک روز صبح سویرے اٹھ کر نزہت نے سارا گھر سر پر اٹھا لیا۔ ایک سانس میں اتنے احکام جاری کئے کہ نوکرانیاں بوکھلا گئیں۔ رشید جو بالا خانے سے نیچے اترا تو گھر میں عجیب چہل پہل نظر آئی۔ صفائی ہو رہی تھی۔ صندوقوں سے جہیز کے قیمتی برتن نکالے جا رہے تھے۔ فرش بدلے جا رہے تھے۔ ہر طرح کی تیاریوں کا ایک ہنگامہ برپا تھا،

چاندنیاں بچھائی جا رہی تھیں۔ اور نزہت ایک الھڑ لڑکی کی طرح خادماؤں کے ساتھ مل کر کام کر رہی تھی۔ رشید حیرت کے ساتھ ان انتظامات کو دیکھتا ہوا نشست کے کمرے میں آ کر بیٹھ گیا۔ نزہت نے اس کو آتے دیکھ لیا تھا۔ لہٰذا فوراً چائے کا سامان لے کر آئی۔

"خیریت تو ہے نزہت؟" رشید نے مسکرا کر پوچھا "یہ کاہے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ کون آنے والا ہے؟" "بہت سے مہمان آ رہے ہیں۔ آج دعوت ہے۔" نزہت نے قریب بیٹھ کر جواب دیا۔ "دعوت کس بات کی؟"

"آپ کے آنے کی خوشی میں سب نے میرا ناک میں دم کر دیا تھا کہ خدا نے تمہارے دن پھیرے ہیں۔ دعوت کر دے۔ ہائیں یہ آپ کی کیا حالت ہے۔ کیوں بد نصیب دشمناں کہیں درد ہے؟"

رشید کا چہرہ خاکستری ہو گیا تھا!

"کچھ نہیں گھبرانے کی کوئی بات نہیں" اس نے جواب دیا۔

"نہیں کوئی بات ضرور ہے۔" نزہت نے گھبرا کر اس کے قریب جاتے ہوئے کہا "آپ کو میری قسم سچ بتلائیے کیا تکلیف ہے! آخر آپ چھپاتے کیوں ہیں؟"

"نزہت آج میں تم سے ایک بات کہنے والا تھا" رشید نے فرش پر نظریں گاڑ کر کہا۔ "شاید گذشتہ دنوں کی طرح آج بھی ہمت نہ پڑتی۔ لیکن اس دعوت نے مجبور کر دیا۔ اب میرا خاموش رہنا تم پر انتہائی ظلم ہوگا۔

نزہت رشید کا مطلب نہ سمجھ سکی تھی لیکن دل آپ ہی اچھل اچھل کر حلق میں آنے لگا۔ ہاتھ پیر سرد ہو گئے۔

"کون سی بات؟" اُس نے ڈوبتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"میں صرف دو ایک روز کا اور مہمان ہوں۔ اس کے بعد آگرے چلا جاؤں گا۔"

"آگرے؟"

"ہاں۔ مجھے نہایت افسوس ہے کہ میں وہ بات کرنے پر مجبور ہو گیا ہوں جس سے تم کو بہت تکلیف ہوگی لیکن تم ابھی نادان ہو۔ زندگی کے اہم مسائل کو نہیں سمجھ سکتی ہو۔ ایک دن ایسا آئے گا۔ جب تم بھی کہو گی کہ جو کچھ ہوا ٹھیک ہوا۔ تجربے سے معلوم ہوا کہ مجھے تمہارے ساتھ صرف مادی محبت ہے میں صرف تمہاری اچھی صورت کو چاہتا ہوں۔ ہمارے درمیان وہ روحانی اور ذہنی اتحاد نہیں جو زن و شوہر میں ہونا چاہئے۔ تمہاری دنیا دوسری اور میری دوسری ہے۔ نہ تم میری دنیا تک پہنچ سکتی ہو۔ نہ میں تمہاری دنیا تک۔ ایسی صورت میں ہم شریکِ حیات ہوتے ہوئے بھی ایک دوسرے سے جدا زندگی بسر کرنے پر مجبور رہوں گے۔ قریب رہ کر بھی ہم تم ہمیشہ دور رہیں گے لہٰذا آگے چل کر ہماری زندگی ایک مسلسل عذاب بن جائے گی۔ ..... ہماری شادی ایک غلطی تھی اور ایک ایسی زبردست غلطی جس کا ازالہ بہت جلد ہو جانا چاہئے۔"

"لیکن میں تو آپ کے ساتھ بہت خوش ہوں" نزہت نے کہا۔ "میں جانتی ہوں کہ میں آپ کی محبت کے قابل نہیں اسی لئے اس کی آرزو بھی نہیں کرتی ــــ ہمیشہ اپنے قدموں میں پڑی رہنے دیجئے یہی میری خوشی ہے۔ میں اور کچھ نہیں چاہتی۔"

"نہیں نزہت تم نادان ہو" رشید نے جواب دیا "جب میں تم کو کبھی خوشی نہیں پہنچا سکتا تو میرا فرض ہے کہ میں کنارہ کش ہو جاؤں اور کسی دوسرے کو اس کا موقع دوں؟"

"کیا؟" نزہت نے گھبرا کر پوچھا۔

"تم مجھ سے طلاق لے لو ــــ اور کسی ایسے کے ساتھ شادی کر لو جو تم کو خوش کر سکتا ہو۔"

نزہت سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ زمین اس کے پیروں تلے سے نکلی جا رہی تھی۔ کمرے کی دیواریں چکر کھاتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔ دیر تک خاموش رہنے کے بعد اس نے سر اوپر اٹھایا اور رشید کے چہرے پر نظریں گاڑ کر پوچھا۔ "کیا آپ نے مجھے طلاق دینے کا پختہ ارادہ کر لیا ہے؟"

"ہاں نزہت۔ اس میں تمہاری بھلائی ہے!"

"تو پھر مجھے کچھ کہنا نہیں ہے۔ میں نے آج تک آپ کے ہر فیصلے پر سر جھکا دیا۔ اور اس فیصلے پر بھی سر جھکاتی ہوں۔ صرف اتنا بتا دیجئے کہ کیا آپ اُس ڈاکٹرنی سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟"

"ہاں"

"اور بغیر مجھے طلاق دیئے اس سے شادی نہیں ہو سکتی؟"

"نہیں۔ لیکن طلاق کی صرف یہی ایک وجہ نہیں ہے۔ میں تم کو بھی خوش دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"بہت اچھا۔ آج مجھے دعوت سے فارغ ہو لینے دیجئے۔

صرف آج ایک دن کے لئے میری ضد پوری ہونے دیجئے — آج اور میں خوش رہنا چاہتی ہوں۔ کل آپ کا منشا پورا ہو جائے گا۔"

سارے دن گھر میں بڑی چہل پہل رہی۔ اندر باہر سارا مکان مہمانوں سے کھچا کھچ بھرا رہا۔ تقریباً دس بجے شب تک جشن رہا۔ نزہت میزبانی اور خاطر تواضع میں مشہور رہتی۔ لیکن آج اس نے اپنے سابقہ اہتمام کی یاد بھلا دی۔ وہ ایسی خوش و خرم نظر آتی تھی کہ بعض سہیلیوں کے دل میں حسد نے چٹکیاں لینا شروع کیں۔ بڑی بوڑھیوں نے قریب بٹھا کر اس کی بلائیں لیں اور لاکھوں دعائیں دیں۔ نزہت کی خوش مزاجی، بذلہ سنجی اور حاضر جوابی نے سب کو خوش کر دیا تھا۔

لیکن جب وہ اپنی ماں کو رخصت کرنے لگی تو آنسو نہ تھمے۔ وہ ماں سے لپٹ کر رونے لگی! ماں سمجھی کہ پرانا غبار دھل رہا ہے۔ لہٰذا اس گریۂ بے محل پر کچھ زیادہ توجہ نہیں کی۔ نزہت کی بڑی بہن جن کو تقدیر نے اب تک نعمتِ اولاد سے محروم رکھا تھا جمیل کو سینے سے لگائے ہوئے کھلا رہی تھیں۔ نزہت نے قریب جا کر کہا۔

"باجی۔ دل چاہے تو جمیل کو لیتی جائیے۔ آپ کا بچہ ہے"۔

"لیکن تمہارا دل تو نہیں کڑھے گا؟"

"جی نہیں۔ میں تو چاہتی ہوں کہ آپ ہمیشہ کے لئے اس کو لے لیجئے"

"اے خدا نہ کرے کیسی بات منہ سے نکالتی ہو۔ خدا تم کو سلامت رکھے۔" اس کی باجی نے جواب دیا اور جمیل کو لے کر سوار ہو گئیں۔ ان کو حیرت تھی کہ بچے کو رخصت کرتے وقت نزہت کیوں بے چین نظر آتی تھی۔ کیوں جمیل کا منہ چومتے وقت اس کے آنسو نکل پڑے تھے۔

مہمانوں کو رخصت کرنے کے بعد نزہت نے لباس تبدیل کیا اور شادی کا قیمتی جوڑا پہن کر خواب گاہ میں داخل ہوئی۔

"میں چاہتی تھی کہ جس لباس میں آپ نے مجھے پہلے پہل دیکھا تھا" نزہت نے رشید کی گردن میں باہیں ڈال کر کہا "اس میں آخری دفعہ بھی دیکھ لیں"

"آخری دفعہ؟"

"جی ہاں — میں اب صرف چند منٹ کی مہمان ہوں۔ مرنے سے قبل چاہتی ہوں کہ ایک دفعہ آپ مجھ کو پیار کر لیں"۔

رشید نے پیار کیا — اور چونک پڑا۔ نزہت کے منہ سے افیون کی بو آ رہی تھی!

شبیر حسین رضوی

قطعات

اندوہِ ناکامی

تمام عمر [illegible] آنسو بہاؤں گا [illegible]
تمام عمر [illegible] گلا میرا [illegible] ساتھ
تمام عمر [illegible] گردِ ملال
کسی کی [illegible] ناکام آرزو کے ساتھ

افسانہ اور حقیقت

پڑھا ہے میں نے فسانوں میں جس طرح اختر
[illegible] شگوفۂ امید کیوں نہیں کھلتا
[illegible] ہم کتابوں میں
جو عشق [illegible] نہیں [illegible]
وہ واقعات کسی دنیا میں کیوں نہیں ملتا

اختر انصاری

ساون

خوشبو سے ہیں مہکی ہوئی ساون کی ہوائیں
ہر سمت مسلط ہیں سیہ رنگ گھٹائیں

کوئل کے ترانے ہیں کہ ناہید کی تانیں
سارنگ کے نغمے ہیں کہ بلبل کی نوائیں

دہکے ہوئے گلشن کی ہیں آغوش سے پیدا
رندانِ بلانوش کی مدہوش صدائیں

نکلے ہیں سرِ شام حسینانِ خوش اندام
گلفام ہوئیں جن کی بہاروں سے فضائیں

ہونٹوں پہ مچلتا ہوا شوخی کا تبسّم
آنکھوں میں لرزتی ہوئی مستی کی ادائیں

یہ جشنِ طرب ہو، یہ سمِ گل فصلِ بہاراں،
اُن کا یہ تغافل کہ نہ آئیں نہ بلائیں

ہو باعثِ تسکینِ جگرِ لالہ میں شبنم
ہم سوختہ دل داغ جدائی کے اٹھائیں

قیوم نظر

ڈاکٹر نذیر احمد کا ایک ناول

کسی ناول، قصے یا کہانی میں جو بات سب سے پہلے دیکھی جاتی ہے وہ اس کا موضوع ہے۔ ناول کے ذریعے سے کن موضوعات پر اظہار خیال کیا جا سکتا ہے اور کیا مولوی نذیر احمد اپنے فسانوں میں ناول کے مفروضہ موضوع پر خاطر خواہ رسائی کرتے ہیں یا نہیں۔ یہ سوالات ایسے ہیں جو ہر ناول پڑھنے والے کے دماغ میں پیدا ہو سکتے ہیں۔

ناول کے موضوع کے متعلق سمجھ لینا چاہئے کہ اس کے موضوع کی وسعت خود ذات انسانی سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ ناول نگار عورتوں اور مردوں کا گہری نظر سے مطالعہ کرتا ہے۔ اس کا تعلق ان کے افعال۔ ان کے خیالات۔ ان کی غلط کاریوں، ان کی عظمت اور ان کی فرومائگی سے ہے۔ بے شمار حسین صورتیں، ان کی تلون مزاجی، خوف۔ احساسات۔ جوش اور جذبات جو انسانی قلوب میں تموج برپا کر سکتے ہیں۔ یہ سب ناول کے موضوع ہیں۔ گویا اس کا موضوع خود انسان ہے۔

علامہ نذیر احمد کے تمام ناول اس معیار پر پورے اترتے ہیں۔ ان کے ناولوں کا موضوع خود انسان ہے اور انسان بھی کون؟ وہی جو ہماری اور آپ کی طرح ہندوستانی ہو۔ محصنات کے دیباچے میں علامہ نے اپنے ناولوں کے متعلق خود جو کچھ لکھا ہے وہ یہ ہے "۔ ۔ ۔ ۔ عورتوں کی تعلیم کا سلسلہ مرتب ہو گیا۔ خانہ داری میں مراۃ العروس معلومات ضروری میں بنات النعش خدا پرستی میں توبۃ النصوح ۔ ۔ ۔ "

اس سے صاف ظاہر ہے کہ علامہ نذیر احمد کے ناولوں کا موضوع انسان ہے اور ان کے موضوع کی نوعیت اصلاحی۔ مراۃ العروس کی ابتدا کو ملاحظہ فرمائیے۔

جو آدمی دنیا کے حالات پر کبھی غور نہیں کرتا۔ اس سے زیادہ کوئی بے وقوف نہیں ہے اور غور کرنے کے واسطے دنیا میں ہر طرح کی باتیں ہیں لیکن سب سے عمدہ اور ضروری آدمی کا حال ہے۔۔"

اسی طرح توبۃ النصوح میں اپنے مقصد کو اس طرح پیش کیا ہے

اس کتاب میں انسان کے اس فرض کا مذکور ہے جو تربیت اولاد کے نام سے مشہور ہے ۔ ۔ ۔ ۔

محصنات کا موضوع خود انسان ہے اور اس کے موضوع کی نوعیت بھی اصلاحی ہے چنانچہ وہ دیباچہ کتاب میں تحریر فرماتے ہیں:

"ان ہی[1] دنوں مجھے یہ خیال ہوا تھا کہ مسلمانوں کی معاشرت میں عورتوں کی جہالت اور نکاح کے بارے میں آزادی، دو بہت بڑے نقص ہیں۔ میں نے ایک نقص کے رفع کرنے میں کوشش کی ہے تو دوسرے نقص کے رفع میں بھی کچھ کرنا ضرور ہے"

محصنات کا مقصد اگرچہ نکاح کے بارے میں آزادی ہے۔ مگر صرف یہی نہیں بلکہ علامہ نے اس کے تحت میں ان تمام امور پر روشنی ڈالی ہے جن کے ناقص رہنے سے ازدواجی زندگی میں خرابیاں واقع ہو جاتی ہیں اور ضمناً ان تمام خرابیوں کو بھی دور کرنے کی سعی کی ہے۔ جو اس وقت ہندوستانیوں میں عام طور پر اور مسلمانوں میں خاص طور پر جاگزیں تھیں۔ چنانچہ تعلیم کے متعلق جو خیالات انہوں نے ظاہر کئے ہیں۔ ان میں اخلاق کی درستی پر خاص زور دیا ہے۔ انہوں نے ناول کے ہیرو مبتلا کا کیریکٹر بیان کرتے وقت اس خیال کو اس طرح ادا کیا ہے

"دنیا میں سارے لوگ پڑھے لکھے نہیں ہوتے اور نہ پڑھنے لکھنے پر زندگی یا معاش کا انحصار ہے۔ اصل چیز ہے عادات کی درستی۔ مزاج کی شائستگی۔ طبیعت کی اصلاح ۔ ۔ ۔ ۔"

ایک دوسری جگہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ اگر اخلاق درست نہیں ہیں تو پڑھنے سے کوئی فائدہ نہیں۔

[1] انہیں۔ ا۔ ع۔

"۔ ۔ ۔ ۔ فرض کیا وہ اچھی طرح پڑھتا ہی ہے تو بد وضع کو پڑھنے
سے فائدہ علم سے حاصل؟ اس سے جاہل بد اسلوب بہتر۔
ان پڑھ کہیں بھلا ۔ ۔ ۔ "

علامہ نے قدیم نظامِ تعلیم اور جدید طرزِ تعلیم کا مقابلہ نہایت خوبی سے کیا ہے۔ اور جدید نظام میں اُن کو جو خوبیاں نظر آئی ہیں انہیں نہایت خوبی سے سراہا ہے یعنی جماعت بندی، مختلف مضامین کا مختلف اوقات میں پڑھانا، کھیل کود، ورزش جسمانی، نصابِ تعلیم کا منظم صورت میں ہونا وغیرہ لیکن یہاں اساتذہ اور پروفیسروں پر ایک طنز بلیغ کی ہے کہ ان کو بھی طلبہ کے اخلاق کی درستی کا خیال نہیں۔

"چوری کرو، جھوٹ بولو، سر بازار جوتی پیزار لڑو، گالیاں دو اور
گالیاں کھاؤ۔ شرافت کو بٹہ لگاؤ۔ بدمعاشوں میں رہو اور بدمعاش
بنو، ۔ ۔ ۔ ۔ غرض جو تمہارا جی چاہے سو کرو، مگر جو چیزیں
پڑھائی جاتی ہیں۔ ان میں امتحان اچھا دو تو اسکالرشپ بھی
ہے۔ انعام بھی ہے سرخروئی بھی ہے۔ مدرس خوش۔ پرنسپل
بھی راضی۔ ۔ ۔ ۔ ۔ " صفحہ ۱۹

موجودہ نظامِ امتحان کے متعلق ان کی رائے ہے کہ

"شوق کے مشتعل کرنے کو امتحان کا قاعدہ نہایت عمدہ تھا۔۔۔"
مگر امتحان محض رٹائی کا دوسرا نام ہے اور وہ ذاتی قابلیت کی جانچ کا صحیح طریقہ نہیں ہے۔

"ایک بار تو امتحان ہوتا تھا۔ اکثر انگریزوں کے بڑے دن سے
پہلے۔ پس امتحان کے مہینے ڈیڑھ مہینے آگے سے وہ تیاری
کر لیتا ہوگا ۔ ۔ ۔ ۔ " صفحہ ۲۰

ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ امتحان محض دھوکا ہے اور طلبہ میں استعداد پیدا نہیں کر سکتا کیونکہ طلبہ امتحان کو ناجائز طریقوں سے بھی پاس کر لیتے ہیں۔

"۔ ۔ ۔ ۔ اگرچہ چوری چھپے ناجائز طور پر دوسروں سے مدد لے
کر ہی کیوں نہ ہو" صفحہ ۱۹

بچوں کی تعلیم سے وابستہ دوسری بات جس پر انہوں نے بہت زیادہ زور دیا ہے خانگی تعلیم اور مادری تربیت ہے اور یہ واقعہ ہے کہ جس وقت سے بچہ پیدا ہوتا ہے اسی وقت سے اس کی تعلیم شروع ہو جاتی ہے گویا آغوشِ مادری اس کا اسکول ہے اور گہوارہ اس کی تعلیم گاہ۔

مگر کتنے لوگ ہیں جو اس کا خیال رکھتے ہیں۔ علامہ نذیر احمد اس کے سختی سے پابند ہیں چنانچہ انہوں نے مبتلا کی تباہی کا ذمہ دار اس کی ناقص تربیت ہی کو قرار دیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ آغوشِ مادری ہی بچے کے لئے بہترین تربیت گاہ ہے۔

"ظاہر ہیں معلوم ہوتا ہے کہ بچے ایک مضغہ گوشت کی طرح پڑے
ہیں۔ نادان اور لایعقل نہیں ہیں۔ وہ اپنے سارے حواس سے
ظاہری ہوں یا باطنی، بڑی کوشش سے کام لے رہے ہیں
چیزوں کو دیکھتے ہیں۔ ٹٹولتے ہیں۔ آوازوں کو سنتے ہیں اور جو
دیکھتے ہیں یا سنتے ہیں اُن کو حافظہ میں رکھتے جاتے ہیں ۔ ۔ ۔ " صفحہ

جس فضا اور ماحول میں انسان پرورش پاتا ہے۔ اس کے اخلاق پر اس کا خاص اثر پڑتا ہے یہی وجہ ہے کہ ناول نگار اس ماحول اور فضا کا تعارف قارئین سے کرا دیتا ہے۔ چنانچہ محصنات میں بھی یہی بات پائی جاتی ہے۔ چونکہ مبتلا کا تعلق ایک زمیندار خاندان سے تھا اس لئے ضرور تھا کہ اس عہد کے زمینداروں کی حالت کا نقشہ مکمل طور سے کھینچا جائے۔ علامہ نذیر احمد نے زمینداروں کی حالت کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ پہلے سیّدوں کی خبر لی ہے کیونکہ مسلمانوں میں یہی قوم باثر اور صاحب ثروت تھی۔ اس کے بعد کسانوں اور زمینداروں کی حالت بیان کی ہے۔ سیّد جو اشرف الاشراف سمجھے جاتے تھے اور جن سے اُمید کی جاتی تھی کہ وہ تمام صفاتِ حمیدہ سے متصف ہوں۔ ان کی حالت اس درجہ بدتر ہو گئی کہ برعکس نہند نام زنگی کافور کا مصداق بن گئے۔ یہ خیال انہیں کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے۔

"اب سیّد کے معنی ہیں مفسد، لڑاکا، جھگڑالو، مردم آزار، جھوٹا،
جعلساز، مفتری، فتنہ پرداز ۔ ۔ ۔ ۔ " صفحہ ۱

ایک دوسری جگہ انہیں سیّدوں کے کارنامے اس طرح بیان کئے ہیں۔

"جھوٹ بولنا، جھوٹا حلف[1] اٹھانا، جھوٹے گواہ، جھوٹی روداد اور
جھوٹی دستاویزیں بنانا۔ حاکم کو دھوکا دینا۔ پرایا حق مار بیٹھنا۔
لوگوں کو ناحق ستانا۔ ان باتوں کو ہنر اور داخل ہوشیاری
سمجھتے تھے ۔ ۔ ۔ ۔ " صفحہ ۵

کمزوروں کو ستانا۔ ان کو پٹوانا۔ آپس میں لڑنا جھگڑنا۔ بات بات میں مقدمہ بازی۔ گالی گلوچ کرنا جلالی اور رعب دار زمینداروں کے امتیازی خصوصیات ہیں۔ علامہ نذیر احمد نے اپنے زمینداروں کا خاکہ میر متقدر کے

[1] لکھنؤ اور اس کے گرد و نواح میں حلف کی تانیث مشہور ہے

نئے کرو ۔ ۔ ۔ ا۔ ع

کیریکٹر میں اس طرح اڑایا ہے۔

"۔۔۔۔ بڑے غصیلے اور بڑے ظالم اور بڑے سخت گیر اور
بڑے جابر مشہور تھے کہتے ہیں کہ دو تین خون ان کے ہاتھ سے
ہوئے مگر دب دبا گئے انہوں نے غلطاً کئی بھلے آدمیوں کی ناموس
بگاڑی اور عزت ریزی کی ۔۔۔۔"

آپس میں گالی گلوچ سب وشتم اور لٹھ بازی کا چربہ کس خوبی سے
اتارا ہے۔

"جب معتقد ر نے داتا سنگھ کے کارندے کو برا بھلا کہا اور
اس کے مالک کو علیٰ رؤس الاشہاد لہ مغلظات سنائیں۔ وہ بے چارہ
اپنا سا منہ لے کر لوٹ گیا اور داتا سنگھ کے آگے جا کر
اپنی پگڑی زمین پر دے ماری اور کہا تم نے مجھ کو بے عزت کرایا
اور خود بھی بے عزت ہوئے ۔۔۔۔" صفحہ ۱۹

اب کیا تھا داتا سنگھ کو غصہ آگیا اور کہنے لگا۔

"اس مسلمان چھوکرے کا اتنا مقدور۔ خیر اب لڑائی ہے تو لڑائی
ہی سہی" صفحہ ۵۲

دونوں نے اپنے اپنے کاشتکاروں کو جمع کیا اور لٹھ چل گیا۔ "دو پہر
کامل لٹھ چلا" جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں کے دو سو آدمی زخمی ہوئے۔ چار
گھڑی رات جاتے سرکاری فوج توپ لے کر آ پہنچی۔ پکڑ دھکڑ شروع ہوئی
۔۔۔۔ میر معتقد ر کسی تدبیر سے بھاگ نکلے۔ گھر بار ضبط ہوا۔ اسباب نیلام
ہوا کسی نے پھانسی پائی ۔۔۔"

کسانوں کی سدھائی اور ایمانداری کا اعتراف علامہ کو بھی ہے
چنانچہ غریبا کے کیریکٹر سے کسانوں کی دیانت پر روشنی ڈالی ہے۔

"۔۔۔۔ کیوں صاحب آپ نے دیکھا ۔۔۔۔ یہ بے چارہ نہ تو
پڑھا نہ لکھا اور نہ شاید ساری عمر کسی پنڈت برہمن کی صحبت میں
بیٹھا۔ اندیشۂ پاسبان سے مطمئن اور اس پر چوری کو سمجھتا ہے کہ
برا کام ہے ۔۔۔۔" صفحہ ۵۶

۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اس کے علاوہ پردہ حسن اور تعدد ازدواج یہ تین ایسی خاص
باتیں ہیں جن کے متعلق علامہ نذیر احمد نے اپنے خیالات کا اظہار نہایت
آزادی سے عارف کے کیریکٹر میں مکالموں کے ذریعے کیا ہے اور ان
تمام خیالات کی بیخ کنی نہایت شد و مد سے کی ہے جو عوام تو عوام خواص
کے قلوب میں بھی جاگزیں ہیں۔ ان تینوں باتوں سے بحث کرتے وقت
آپ نے جس خاص بات پر زور دیا ہے۔ وہ یہ ہے کہ ہندوستانی
مسلمانوں نے مذہب اور رسم و رواج کو اس قدر خلط ملط کر دیا ہے کہ
ایک کو دوسرے سے جدا کرنا مشکل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض مذہبی امور
رسوم کی پابندیوں کے ساتھ اس درجہ الجھ گئے ہیں کہ بے چارے فقیہہ
بھی ان کو سلجھانے سے قاصر رہ جاتے ہیں۔ چنانچہ پردے کے متعلق
آپ کے خیالات ملاحظہ ہوں:۔

"ہندوستان کے مسلمانوں نے رسم اور مذہب دو چیزوں کو
ملا کر اپنے طرز معاشرت کو آدھا تیتر اور آدھا بٹیر بنا لیا ہے۔
مثلاً پردے سے چلو۔ بلاشبہ اسلام کا حکم ہے۔ کہ بیبیاں
پردہ کریں اور اس میں شک بھی نہیں کہ ایک پردے سے ہزارہا
فسادوں کا انسداد ہوتا ہے۔ مگر جس سختی کے ساتھ ہم لوگوں نے
پردے کو لازم کر لیا ہے افراط ہے۔ حد شرع سے متجاوز پردہ
نہیں ہے مگر قید اور قید جس قدر سخت اسی قدر زیادہ ۔۔۔۔"

فسانۂ مبتلا صفحہ ۱۳۶

ڈاکٹر نذیر احمد نے حسن کے متعلق جو معیار قائم کیا ہے وہ عوام
کے معیار کے مطابق نہیں ہے انہوں نے حسن کے متعلق اپنے خیالات
فسانۂ مبتلا کے علاوہ رویائے صادقہ، الحقوق والفرائض اور امہات الامۃ
میں بھی ظاہر کئے ہیں ان کے نزدیک حسن صورت فی نفسہٖ کوئی چیز نہیں ہے
ہاں اس بات کو ضرور مانتے ہیں کہ تعدد ازدواج کا محرک یہی حسن ہے
چنانچہ امہات الامۃ میں اس بات کو اس طرح لکھتے ہیں:۔

"فی اکثر الاحوال تکثیر ازدواج کی اصلی محرک حسن پرستی ہوتی ہے۔۔۔۔"

اس کتاب میں آگے چل کر حسن کا مفہوم بیان کیا ہے، لیکن ہم
یہاں فسانۂ مبتلا سے وہ اقتباس دیتے ہیں جو حسن کے مفہوم کو ادا کرتا
ہے اور اس بات پر روشنی ڈالتا ہے کہ حسن فی نفسہٖ کوئی شے نہیں ہے:۔

"اگر یہ خیالات طبعی ہوتے تو ضرور تھا کہ سب آدمیوں کے ایک
ہی طرح کے ہوتے، کیونکہ آدمی آدمی انسانیت میں سب یکساں
ہیں تو اس کے یہی معنی ہیں کہ طبیعت انسانی سب میں یکساں
ہے اور طبیعت یکساں ہوئی تو چاہئے کہ سب کے تقاضے
یکساں ہوں، مگر ہم دیکھتے ہیں کہ جو ایک کے نزدیک مطبوع

لہ سب کے سامنے، برسرِ اجلاس۔

ہے۔ دوسرے کے نزدیک مکروہ ..... مثلاً بڑی خوبصورتی
رنگ کی ہے کہتے بھی ہیں ایک رنگ ہزار ڈھنگ لیکن رنگ
کے بارے میں مذاق اس قدر مختلف ہیں کہ گورا، سرخ و سفید،
گندم گوں، ملیح، چمپئی وغیرہ کتنی قسم کے رنگ ہیں جن کے
پیچھے ہمارے ملک کے لوگ سر دھنتے ہیں لیکن فرض کرو کہ
ان رنگتوں میں سے کسی رنگ کا آدمی افریقہ میں جا نکلے تو وہاں اس کی
کیسی قدر ہوگی جیسی ہمارے یہاں حبشی اور بربروں کی
..... خاص خاص اعضا کی نسبت بھی مذاقوں کے
اختلاف کا یہی حال ہے۔ مختلف ملکوں کی تاریخیں اور
جغرافیے پڑھو تو معلوم ہو کہ حسن کی نسبت لوگوں کے خیالات کس
قدر مختلف ہیں۔ قومی اختلافات سے اتر کر شخصی اختلافات پر
آؤ تو ہر جگہ وہی معاملہ ہے کہ ع لیلیٰ را بچشم مجنوں باید دید۔
غرض جہاں تک غور کیا جاتا ہے حسن کا مفہوم متعین نہیں ٹھہرتا پس
مفہوم حسن کو انسان کا طبعی خیال سمجھنا غلط ہے۔"

تعدد ازدواج کے بارے میں عام طور پر قرآن شریف سے جو آیت
استدلال پیش کی جاتی ہے اس کا ترجمہ یہ ہے کہ اگر تم کو یہ ڈر ہو کہ ہم یتیموں کے
حق میں انصاف نہ کر سکیں گے تو عورتوں میں سے دو دو تین تین اور چار چار
جتنی تمہاری خوشی ہو نکاح کر لو، لیکن علامہ نذیر احمد چونکہ حافظ قرآن تھے اور ساتھ
ہی ساتھ منطقی اور فلسفی، اس استدلال کو اس طرح رد کرتے ہیں کہ اس آیت کے
آگے کا جملہ تلاوت کر دیا جس کا ترجمہ یہ ہے "اگر تم کو یہ خوف ہے کہ متعدد
بیبیوں میں برابری نہ کر سکو گے تو ایک ہی بی بی کر لو" اس کے ساتھ ہی
ایک اور آیت کا اضافہ کیا جس کا ترجمہ یہ ہے "تم بہتیرا چاہو مگر تم سے یہ
ہو ہی نہ سکے گا کہ عورتوں میں برابری کر سکو پس سارے کے سارے ایک
طرف کو مت جھک کر اس بے چاری کو ادھر میں لٹکتا ہوا چھوڑ دو ....."
اب منطقی اصولوں سے ان دونوں کو ملانے سے نتیجہ یہ نکلا کہ محض ایک بی بی
کرو۔ مولانا نذیر احمد تعدد ازدواج کے سخت مخالف ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

"... حرمت تعدد نکاح پر ایک کتاب لکھی ہے۔ اس کے
نزدیک ان دونوں آیتوں کے ملانے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ
بس ایک بی بی کرو۔" صفحہ ۱۳۲

اب رہا یہ سوال کہ آخر پیغمبر نے ایک سے زیادہ بیویاں کیوں
کیں؟ اس کے جواب میں آپ فرماتے ہیں کہ پیغمبر کے عمل سے استشہاد
غلط ہے۔ کیونکہ یہ دونوں آیتیں عام مسلمانوں کے واسطے ہیں پیغمبر صاحب
کے نکاح ان میں شامل نہیں۔ حضرت رسالت مآب کے لئے سورۂ
احزاب میں ایک پورا رکوع موجود ہے جس کا مطلب یہ ہے:۔

"اے نبی! ہم نے آپ کے لئے ان تمام عورتوں کو حلال کر دیا ہے
جن کے آپ مہر ادا کریں الخ"

مزید براں ان کے لئے عدل و مساوات کی بھی ضرورت نہ تھی،
اسی رکوع میں موجود ہے۔ "اپنی بیویوں میں سے جس کو چاہو اپنے سے جدا
رکھو اور جس کو چاہو اپنے پاس جگہ دو اور جس کو چاہو ہٹا کر پھر ملا لو تو
تم پر کچھ گناہ نہیں"۔ اسی طرح پیغمبر کے لئے بغیر مہر کے بھی نکاح کر لینا
جائز تھا۔ حالانکہ پیغمبر ازواج مطہرات میں اپنی طرف سے عدل فرماتے
تھے۔ مگر خدا نے ان پر اس بات کو بھی لازم نہیں کیا تھا۔ یہ باتیں خصائص
نبوی میں سے ہیں۔ مختصر یہ کہ مولانا تعدد ازدواج کے سخت مخالف تھے
جس کو عارف کے کیریکٹر میں اس سے صاف صاف کہلوا دیا ہے:۔

"از برائے خدا کہیں جلدی سے فرما بھی چکو کہ تعدد نکاح کے مؤید
ہو یا مخالف؟" "سخت مخالف" صفحہ ۱۳۵

. . . .

ناول میں پلاٹ اور موضوع کے بعد دوسری چیز کردار نگاری
ہے۔ کردار نگاری مختلف طریقوں سے کی جاتی ہے بیانات سے۔ ملبوسات
سے۔ مکالمات۔ حرکات و سکنات وغیرہ سے، ان تمام باتوں کی تشریح
طوالت کے خیال سے نہیں کی جاتی۔ مولانا نے کردار نگاری میں بیانیہ
تمہید کو خاص طور سے اپنایا ہے۔ محصنات میں مبتلا کا کیریکٹر بیانی تمہید
سے اس طور پر شروع کیا ہے۔

"نور کا پتلا ہے۔ بڑی بڑی غلافی آنکھیں۔ اونچی اور ستی ہوئی ناک
پتلے ہونٹ ....." صفحہ ۹

اسی طرح غیرت بیگم کے کیریکٹر کا بیان اس طرح شروع ہوتا ہے:۔

"ذات جماعت کچھ پوچھنی نہ تھی سگی پھوپھی کی بیٹی۔ رہی صورت،
کوئی خاص چیز تو چنداں بری نہ تھی بلکہ الگ الگ دیکھو تو رنگ بھی
گورا نہیں تو کھلتا ہوا چمپئی۔ آنکھ، ناک، دہانہ، ماتھا، مانگ کسی
میں کوئی عیب نہ تھا ....." صفحہ ۲۷

محصنات میں کردار نگاری ملبوسات کے ذریعے بہت کم کی گئی
ہے۔ حالانکہ اس کا فقدان نہیں ہے۔ میر متقی کا کیریکٹر ملبوسات کے ذریعے

بہت کچھ بیان کیا گیا ہے۔ توبۃ النصوح میں مرزا ظاہر دار بیگ کا کیریکٹر اس
کی بہترین مثال ہے۔

محصنات میں کردار نگاری زیادہ تر بیانیہ اور نفسیہ کے ذریعے کی
گئی ہے۔ مکالمات سے بہت کم مدد لی گئی ہے۔ البتہ عزیبا اور سید ناظر
کا کیریکٹر مکالموں ہی کے ذریعے کھینچا گیا ہے۔

بعض بعض کیریکٹر اس درجہ نفسیاتی اصول پر بیان کئے گئے ہیں کہ
بالکل فطری معلوم ہوتے ہیں۔ خصوصاً اس وقت میں جبکہ ناولوں میں کردار
نگاری کا فقدان تھا۔ ایسے کیریکٹروں میں عارف اور مبتلا کے کیریکٹر خصوصیت
سے قابلِ ذکر ہیں۔ مولانا کی کردار نگاری کے متعلق ہم دنیائے افسانہ سے وہ
اقتباس پیش کرتے ہیں جس سے ان کی کردار نگاری پر روشنی پڑتی ہے۔

"کردار نگاری میں بعض جگہ اس قدر نفسیاتی طریقے سے کام لیا گیا ہے
کہ انگریزی ناول نگار جارج ایلیٹ کے ناول یاد آجاتے ہیں۔
معلوم ہوتا ہے کہ جارج ایلیٹ کی طرح ان کی بڑی عمر نے ان کو
مختلف سوسائٹیوں کے مطالعے کا نہایت عمدہ موقع دیا تھا۔
دونوں اپنے افسانوں میں ایک خاص مذہبی اعتقاد کی طرف اشارہ
کرتے ہیں ....."

ناول کی کردار نگاری میں ایک خصوصیت یہ بھی ہونا چاہئے کہ پڑھنے
والے کو یہ بات معلوم ہو جائے کہ دراصل شخص قصہ کے اوپر کس طرح کے
جذبات کا اثر ہے اور ان کا کیا مطلب ہے؟ مثلاً رنج اور خوشی، غیظ و
غضب شرم وحیا وغیرہ جذبات جو افراد ناول پر طاری ہوں وہ پڑھنے
والے کو معلوم ہو جائیں اور یہ بات حرکات و سکنات کا بغور مطالعہ کرنے سے
حاصل ہوتی ہے۔ علامہ نذیر احمد کو اس قسم کی کردار نگاری میں ایک خصوصیت
حاصل تھی۔ اُن کے اشخاص قصہ پر جو جذبات طاری ہوتے ہیں وہ فوراً ان
کی کیفیت اور حالت سے ظاہر ہو جاتے ہیں۔

محصنات میں مبتلا کا ہریالی کے عشق میں دیوانہ ہونا کوئی ایسی بات
نہیں جو کسی سے پوشیدہ ہو اور اس کا ہریالی کو ماما بنا کر گھر میں داخل کرنا
اس کی انتہائی محبت اور الفت کی دلیل ہے۔

کردار نگاری میں کرداری ارتقا بھی بہت ضروری ہے۔ علامہ
نذیر احمد کے ناولوں میں اس قسم کے ارتقا کا اگرچہ فقدان تو نہیں ہے مگر
ہے بہت کم۔ توبۃ النصوح کے کلیم کی طرح مبتلا مرتے مرگیا۔ مگر اس کے
کیریکٹر میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ ہاں ایک خاص جو بات مولانا کے ناولوں
کے کرداروں میں پائی جاتی ہے۔ اور دوسرے ناول نگاروں کے ہاں
کم ہے۔ وہ ہے کرداروں کا صبر واستقلال۔ نصوح آخر وقت تک کلیم
کی اصلاح کے لئے سرگرداں ہے۔ محصنات میں حاظر اپنے بھائی ناظر
کی اصلاح کس صبر واستقلال سے کرتا ہے۔

تیسری ضروری بات اسلوب بیان ہے اور اس میں مکالموں
کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ علامہ نذیر احمد پہلے ناول
نگار ہیں جنہوں نے ناولوں میں مکالموں کو داخل کیا ہے اور ان کے مکالمے
نہایت کامیاب ہیں۔ وہ جہاں ایک گنوار کو گفتگو کرتے دکھائیں گے۔
تو اس کی زبان بالکل وہی پیش کریں گے جو ایک گنوار کی ہوتی ہے۔ اسی طرح
عورتوں، بچوں، مولویوں، نوکروں وغیرہ سب کی زبان وہی ہوگی جو در
اصل ان لوگوں کی ہوتی ہے۔ بنات النعش میں اصغری بیگم، حسن آرا، محمودہ
اور مغلانیوں وغیرہ کی بات چیت ملاحظہ فرمائیے تو صاف معلوم ہوگا کہ دہلی
کی عورتیں گھر میں بیٹھی بات چیت کر رہی ہیں۔ توبۃ النصوح میں علیم اور نصوح
کا مکالمہ، اسی طرح محصنات میں عزیبا اور میر متقی کا مکالمہ، بھانڈوں کی نقل
اس کی نہایت عمدہ اور بے نظیر مثالیں ہیں۔

مولانا نذیر احمد کی تحریر میں سب سے زیادہ نمایاں چیز عربیت
کا غلبہ ہے۔ چونکہ مولانا خود درسِ نظامیہ کے منتہی اور حافظ قرآن تھے اس لئے
بات بات میں قرآن مجید سے حوالے دیئے چلے جاتے ہیں چونکہ ان کے
ناولوں کا مقصد معاشرتی اصلاح ہے اور اصلاح بھی کس کی؟ مسلمان
خاندانوں کی۔ اس لئے لازمی طور پر ان کو دلائل میں قرآن مجید اور احادیث
سے حوالے دینے پڑے۔ سینکڑوں عربی الفاظ فقرے اور ضرب الامثال
استعمال کر گئے جو اپنی اپنی جگہہ پر نہایت موزوں اور چسپاں ہیں۔ اگرچہ
بادی النظر میں کھٹکتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ خصوصاً ان لوگوں کی نظروں
میں جو عربی سے بالکل نابلد ہیں۔ مثال کے طور پر نافلہ اشراق، معاذ اللہ، الخوف
امام، مقتدی، بدعتی، قدوری، صوفی، فقیہ، حب الشئی یعمی ویصم، عشر
.... فریق فی الجنۃ وفریق فی السعیر۔ مگر یہی عربی الفاظ اور فقرے
بعض بعض موقعوں پر اس بری طرح کھپائے گئے ہیں کہ تمام عبارت کو
خراب کر دیتے ہیں اور نہایت نامانوس معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً ہمارے
خاندان میں اباً عن جدٍ چلی آتی ہے (محصنات صفحہ ۲۵) .... الدنیا والدین
ضرتان (صفحہ ۲) اس مضمون کو سعدی نے کیا قلّ ودلّ کے طور پر ادا کیا
ہے (صفحہ ۱۸) اس کی حالت یوماً فیوماً ردی ہوتی گئی (صفحہ ۳۲۲) سید حاضر

NARRATION[1] ۔ [2] (تنہا گوئی) Soliloquy .

نے بہ تقاضائے دینداری علی رغم انف سید ناظر اپنی بہن کو اس کا حق دلایا۔ (صفحہ ۴۷) اس کے مالک کو علی روس الاشہاد مغلظات سنائیں (صفحہ ۵۹)۔" شاید اسی قسم کے جملوں کو پڑھ کر جناب رام بابو سکسینہ نے مولانا کی تحریر کے متعلق یہ رائے قائم کی ہے:۔

"..... البتہ کبھی کبھی بڑے بڑے عربی فارسی کے غیر مانوس الفاظ لے آتے ہیں جس سے کہیں کہیں رنگین عبارت میں بجائے چستی اور خوبصورتی کے بھونڈا پن اور خرابی پیدا ہو جاتی ہے ....."

مولانا کے ہاں شوکت الفاظ اور عبارت کی شان خاص طور پر دیکھنے کے لائق ہے۔ تنہا صاحب اس کے متعلق لکھتے ہیں:۔

"ان کی تحریر کا انداز خاص یعنی الفاظ کی شوکت۔ عبارت کی متانت طرز ادا کی بلاغت ان کے قلم کی خاص اور ما بہ الامتیاز صفت تھی"۔

کہیں کہیں سادگی اور سلاست اس درجہ بڑھ گئی ہے کہ معلوم ہوتا ہے لوگ آپس میں بیٹھے کر رہے ہیں۔

"مکتب کیا تھا برائے نام اس کا جی بہلنے کے لئے چار پانچ ریزہ کی لڑکے اور بٹھا لئے گئے تھے یعنی بحساب چودہ برس کی عمر تک مبتلا بھونرے کی طرح پلا۔

بعض بعض جگہ اس درجہ ڈرامائیت پائی جاتی ہے کہ شاید ڈراما نگار خود اس سے زیادہ نہ پیدا کر سکتے اگر ان کو وہی بات لکھنا ہوتی۔ محصنات میں ناظر اور مبتلا کی لڑائی، ہریالی اور غیرت بیگم کا مکالمہ میر متقی اور غیرت بیگم کی ملاقات کے مناظر کس درجہ ڈرامائیت کے حامل ہیں۔

مولانا کے ناولوں کے متعلق یہ کہنا کہ ان میں ناصحانہ عنصر پایا جاتا ہے معمولی بات ہوگی بلکہ ان کے ناول پند و نصیحت کے مجموعے ہیں۔ محصنات میں میر متقی کے وعظ۔ عارف اور مبتلا کے مباحثے پڑھیئے تو آپ کو ایسا معلوم ہوگا کہ آپ ناول نہیں پڑھ رہے ہیں بلکہ کسی مسجد میں بیٹھے ہیں اور پیش امام صاحب کا وعظ سن رہے ہیں اور اگر یہ بات صحیح ہے کہ ہر فن لطیف کو اعلیٰ رتبے پر پہنچنے کے لئے اس میں اخلاقی جزو کا پایا جانا بے حد ضروری ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ مولانا نذیر احمد کے ناول اس حیثیت سے ناول نگاری کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔

ان تمام چیزوں کے علاوہ ناول میں اس کا خاتمہ بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ مولانا نذیر احمد کے تمام ناولوں کے خاتمے بالکل فطری طور پر ہوئے ہیں۔

اظہر علی فاروقی

لطفِ معاملہ

فطرت کا مزاج آشنا ہوں ۔ وہ چاہیں مجھے میں اُن کو چاہوں

سرشارِ نشاطِ مدعا ہوں ۔ منشائے طرب سمجھ چکا ہوں

صورت کا ہے اعتبار کتنا! ہے حُسن فریب کار کتنا! ۔ شوخی کی ہے جان یہ متانت

انساں کو "پری" سمجھ رہا ہوں ۔ ہنستے نہیں وہ میں ہنس رہا ہوں

وارفتۂ حُسنِ خود نُما ہوں ۔ بروقت بدل رہا ہوں اسلوب اب بھی ملاؤں ہاں میں ہاں خوب!

اب بھی نہ ہو کیفِ دید طاری! ۔ کس سحر بیاں کا ہمنوا ہوں

بے پردہ یہ کس کو دیکھتا ہوں! ۔ کیا آج میں یونہی جھومتا ہوں

یہ شکل یہ خوشنما تبسّم! یہ وضع یہ دِل رُبا تکلّم! ۔ خود مجھ کو خجل وہ پا رہے ہیں

میں لطفِ حیات پا رہا ہوں ۔ یوں اُن کا حجاب اُٹھا رہا ہوں

دلدادۂ حُسنِ جانفزا ہوں ۔ باتیں بھی سنیں، سُنے گِلے بھی وہ روٹھ رہے ہیں میں ابھی سے

جو راز ہے خوش نگاہیوں کا ۔ اپنی ہی خطا سمجھ رہا ہوں

اُن سے نہیں دل سے پوچھتا ہوں ۔ اور اُن کو ابھارتا چلا ہوں

مقصودِ حیات اور کیا ہے ۔ دل میرا یہی تو چاہتا ہے

علی منظور

تہذیب

صبح کے آٹھ بج گئے تھے لیکن میری بیوی سلیکھا اور میں ابھی تک اپنے اپنے لحافوں میں سمٹے باتیں کر رہے تھے۔ جمعدارنی ابھی تک آئی نہ تھی اور میں انتظار کر رہا تھا کہ وہ صفائی کر جائے تو میں اُٹھوں۔

علی الصبح اُٹھنے کی تو ویسے بھی مجھے عادت نہیں۔ سردیوں کے دن ہوں اور سوکھا جاڑا پڑ رہا ہو تو ہمیشہ اپنے گرم لحاف میں لیٹا سوچا کرتا ہوں کہ وہ لوگ کیسے دل کے مالک ہیں جو اس تیر کی طرح جسم میں پیوست ہو جانے والی سردی میں بلاناغہ پانچ بجے اُٹھ کر سیر کو جاتے ہیں۔ وہ سیر کرتے ہیں یا سزا کاٹتے ہیں؟ اور اُس دن تو روز کی بہ نسبت اور بھی دیر ہو گئی تھی۔ صرف جمعدارنی کا وقت پر نہ آنا ہی اس کی وجہ ہو، یہ بات نہ تھی، اس دن مہینے کا آخری اتوار تھا۔ ڈسپنسری بند تھی اور دوسرے لاہور میں ہی ہمارے ایک دور کے رشتہ دار کے بھائی کی نہایت اندوہناک حالات میں موت واقع ہو گئی تھی۔ تیسری منزل کے جنگلے پر قدرے آگے کو جھکے ہوئے وہ داتن کر رہے تھے کہ جنگلہ ٹوٹ گیا اور وہ نیچے بجری کی سخت کالی سڑک پر آ گرے۔ ہڈی ہڈی اُن کی پس گئی۔ اس سے پیشتر کہ کوئی اُن کی امداد کو جاتا روح اور جسم کا ساتھ ختم ہو چکا تھا۔

اُن کی عمر ابھی تیس برس کی بھی نہیں تھی۔ اور دو بچے وہ اپنے پیچھے چھوڑ گئے تھے۔

ہمارے یہ دور کے رشتہ دار جن کے بھائی کی موت ان افسوسناک حالات میں واقع ہوئی تھی۔ لاہور ہی میں رہتے تھے۔ رشتہ دار بھی وہ ہمارے بہت ہی دور کے تھے۔ سلیکھا کے جو بڑے بھائی لاہور میں ملازم تھے اُن کے وہ ہم زلف تھے۔ ہمارے لئے تو اُن کے بھائی کی موت روزانہ اخبار کی ایک خبر سے زیادہ اہمیت نہ رکھتی اگر سلیکھا کے بھائی کو لے کر وہ خود ہی اس دُور کے رشتے کو ذرا اور نزدیک لانے کے لئے ایک دن اچانک خود ہی وارد نہ ہو جاتے۔ آدمی وہ اچھے ہنس مکھ ہیں۔ ایک بیمہ کمپنی میں انسپکٹر ہیں۔ تنخواہ کافی پاتے ہیں اور رنیوئل (Renewal) میں بھی کافی پیسے انہیں مل جاتے ہیں۔ کامیابی تو جیسے ان کے چہرے پر لکھی ہوئی ہے۔ پورے پورے کاروباری آدمی ہیں۔ اپنے انہی مرنے والے بھائی صاحب سے انہوں نے ایک دن کہا تھا کہ تھوڑے بہت انشورنس کے ذریعے مستقبل کا انتظام آپ کو کر دینا چاہئے اور اس مطلب کے لئے اپنی بیمہ کمپنی سے وہ خاص رعایت بھی کرا دینے کو تیار رہتے تھے۔ لیکن پرائمری سکول کی مدرسی سے جو پندرہ روپے انہیں ملتے تھے۔ اس سے حال کا نبھنا ہی مشکل تھا۔ مستقبل کی تو بات ہی کیا کی جائے اور ادھر تو کئی مہینے سے وہ بیکار ہی چلے آتے تھے۔ بیوی کی بیماری میں لگے رہنے سے انہیں ملازمت چھوڑنی پڑی تھی اور اس کی موت کے بعد جب وہ پھر سکول پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ ان سے کہیں زیادہ تعلیم یافتہ اور ڈگری یافتہ ایک نوجوان ان کی جگہ سنبھالے بیٹھا ہے۔ ناچار دو تین مہینے ادھر اُدھر ٹھوکریں کھانے کے بعد وہ اپنے انہی متمول بھائی کے پاس لاہور آئے تھے کہ کہیں پندرہ بیس کی [illegible] ہو جائے تو بے ماں کے بچوں کا پیٹ پالنے کی سبیل ہو۔ لیکن یہاں آنے پر بے ماں کے بچے اب باپ کے سائے سے بھی محروم ہو چکے تھے۔ ان بے کس غریب بچوں کی لمبی بیماری کے بعد مرنے والی ان کی ماں کا، دیکھتے دیکھتے موت کی گود میں سو جانے والے ان کے مرحوم باپ کا اور ان غریبوں کے تاریک مستقبل کا ذکر کر کے سلیکھا کئی بار آنکھوں میں آنسو لا چکی تھی۔ بھگوان کی یہ کیسی مایا ہے جہاں بچے ہیں وہاں پالنے والا کوئی نہیں اور جہاں پالنے والے ہیں وہاں بچوں کی کمی ہے۔ میں سے سمجھا سمجھا کر ہار گیا کہ نہ پال سکنے سے تو اچھا ہے کہ بچے ہی نہ ہوں۔ کون جانتا ہے کہ اگر کوئی بچہ ہوتا تو ہم اس کی غور پرداخت کرنے کے لئے زندہ بھی رہتے یا نہیں۔ لیکن ان دلیلوں سے جب میری ہی تسلی نہ ہوتی تھی تو وہ کیسے صبر کر لیتی۔

ہم اسی طرح کی باتیں کر رہے تھے کہ جمعدارنی آگئی۔ بات چیت کے موضوع کو پلٹنے کے خیال سے میں نے جلدی سے اُٹھ کر کنڈی کھولی اور اسے ڈانٹا کہ اتنی دیر سے کیوں آئی ہے اور اگر تجھے صبح صبح نہ آنا ہو تو صاف کہہ دے تاکہ ہم کوئی دوسرا انتظام کریں۔

جمعدارنی کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور اس کے ہونٹ سوکھ گئے تھے۔ ہکلاتے ہوئے اُس نے بتایا کہ اس کی جیٹھانی بڑی خطرناک حالت میں بستر پر پڑی ہے اور ساری رات وہ اس کے سرہانے بیٹھی جاگتی رہی ہے اور اس وقت بھی وہ صفائی نہیں بلکہ یہ درخواست کرنے آئی ہے کہ میں چل کر اسے دیکھ لوں۔ شاید اسی بہانے پرماتما اس کے بچوں کے لئے اس کی جان بخش دے۔

میں کہنے ہی والا تھا کہ آج چھٹی کے دن میں کہیں نہیں جاتا لیکن سلیکھا نے کچھ ایسی نظروں سے میری طرف دیکھا کہ الفاظ میرے لبوں پر ہی رہ گئے۔ کہنے لگی —— ہوگا تو وہی جو پرماتما کو منظور ہے لیکن ذرا دیکھ آئیے چھٹی تو آج آپ کو ہے، اور نہ سہی ان غریبوں کو کچھ حوصلہ ہی ہو جائے گا۔ میں کنڈی کھول چکنے کے بعد پھر لحاف میں بیٹھنے والا تھا۔ کہ اس کی بات سن کر چپ چاپ اوپر کو چل پڑا۔

برسوں سے طرح طرح کے دیوی دیوتاؤں کی منتیں ماننے کے بعد بھی ہمارا آنگن سونا ہی تھا۔ اور اسی لئے سلیکھا کی آنکھوں سے ہمیشہ کچھ اس طرح کی مایوسی جھلکتی رہتی تھی کہ مجھے اس کی کسی فرمائش کو ٹالنے کا حوصلہ نہ ہوتا تھا۔ خصوصاً جب اس کی یہ فرمائش کسی غریب بیکس سے متعلق ہوتی۔ ارادہ نہ ہونے پر بھی پندرہ منٹ میں تیار ہو کر میں جمعدارنی کے ساتھ چل پڑا۔

. . . .

میونسپلٹی کی صفائی کی گاڑیاں بدبو پھیلاتے ہوئے ابھی گلیوں میں ہی پھر رہی تھیں اور دنیا بھر کی صفائی کرنے والی مہترانیاں مَیل اور عفونت کی پتلیاں بنی ان بھرپور گاڑیوں کو اور بھی بھرتی جا رہی تھیں جمعدارنی کا گھر نزدیک ہی بھنگیوں کی گلی میں تھا۔ گھر کیا صرف ایک کمرہ تھا جس کی دیواروں کی خستہ اور بوسیدہ اینٹیں لال مٹی بن بن کر روز بروز اور بھی خستہ اور بوسیدہ ہوتی جا رہی تھیں۔ اسی ایک کمرے میں جمعدارنی اس کا خاوند اور ان کے پانچ بچے برسوں سے سردی گرمی کاٹتے آ رہے تھے۔ یہی اُن کی رسوئی تھی۔ یہی سونے اور سامان رکھنے کا کمرہ۔ گلی کے

باہر جمعدارنی کے فاقہ مست بچے اپنی ٹھٹھرتی ہوئی ننگی ٹانگوں اور نیم برہنہ جسموں کو سکوڑے شاید اس کو پاس سے گذرتے دیکھ کر اس کی ٹانگوں سے چمٹ گئے۔ چیخ کر اپنی لڑکی کو آواز دیتے ہوئے جمعدارنی نے اُن کو الگ کیا اور لڑکی سے کہا کہ انہیں چُپ کرائے اتنی دیر میں وہ آ جائے گی، نہیں تو کسی پڑوسی کے گھر سے ایک باسی روٹی لاکر انہیں کھلا دے۔ اور لڑکی روتے چیختے، گرتے پھسلتے، بچوں کو بڑی مشکل سے سنبھالتی سنبھالتی چلی گئی۔

میں نے پوچھا۔ "تمہارا یہاں نہیں کیا؟"

"نہیں جی وہ تو یونیورسٹی کے کوارٹروں میں ہے"

یونیورسٹی کے کوارٹروں میں —— اتنی دور! اور میں نے ابھی داتن بھی نہ کی تھی۔ لیکن اب تو کوئی چارہ ہی نہ تھا۔ کچھ دیر تک ہم چپ چاپ چلتے رہے۔ پھر میں نے پوچھا —— "تو تمہاری جیٹھانی بیمار ہے نا؟"

"جی"

"لیکن تم نے تو کہا تھا کہ تمہارے جیٹھ کی ہوئے عرصہ ہوا مر گئی"

"یہ میری دیورانی ہے"

"دیورانی ہے" —— چونک کر میں نے پوچھا۔

"جی پہلے وہ میرے دیور کے گھر تھی۔ لیکن اس کے مر جانے پر جیٹھ کے گھر بیٹھ گئی۔ اس طرح دیورانی کہو یا جیٹھانی، جو ہے یہی ہے"

اور یہ کہہ کر جمعدارنی نے اپنی اس ملی جلی دیورانی جیٹھانی کی بیماری کے سلسلے میں بتایا کہ کس طرح دیوالی کے دن ہی سے وہ بیمار پڑی ہے۔ پہلے اسے معمولی بخار ہوا تھا لیکن معمولی بخار کو لے کر اگر کوئی کھاٹ پکڑے تو کام کیسے چلے۔ سات اس کے بچے تھے اور گول باغ سے لے کر بڑے ڈاک خانے تک میونسپلٹی کی سڑکوں کو منہ اندھیرے پانچ بجے اُٹھ کر اسے صاف کرنا پڑتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بخار تیز ہو گیا اور جسم ٹوٹنے لگا۔ جب کام کرنے کی سکت بالکل نہ رہی تو میونسپلٹی کی سڑکوں کو کسی اور خوش قسمت کے لئے چھوڑ کر وہ کھاٹ پر جا پڑی۔ تب اس کے خسر کو جتنے ٹونے ٹوٹکے یاد تھے اُس نے آزما دیکھے، ان سے فائدہ نہ ہوا تو وید و حکیم کی شرن لی گئی جب اُس کے نسخے بھی بے سود ثابت ہوئے تو بھوت پریت کا سایہ سمجھ کر پیر علی بخش کو بلایا گیا اور جب یوں بھی کچھ نہ بن آئی تو جوکسی نے

کھلا کر دیا۔ اس ساری تیمار داری کے باوجود جب مریضہ کی حالت بد سے بدتر ہوتی گئی تو آخر اسے ہسپتال پہنچایا گیا تب معلوم ہوا کہ اسے نمونیہ ہو گیا ہے۔ بیس دن تک وہ ہسپتال میں رہی۔ اس اثنا میں چھوٹا بچہ گھر میں بیمار ہو کر دوا دارو کے بغیر مر گیا۔ ہسپتال میں جیٹھانی کی حالت سدھر رہی تھی لیکن بچے کی موت کی خبر سن کر پھر بگڑ گئی۔ کل نازک حالت میں اسے ہسپتال سے لایا گیا۔ گھر میں دوسری عورت تھی نہیں۔ اس لئے جب جمعدارنی کو پتہ چلا تو ساری رات وہ اس کے سرہانے جا کر بیٹھی رہی۔

. . . .

اُن بازاروں میں سے گذر کر جہاں صبح صبح جانے والوں کا خیر مقدم دُکاندار اپنی دُکانوں کی گرد سے کرتے ہیں اور ان سڑکوں کو پار کر کے جہاں تانگوں موٹروں اور بسوں کی "چَے پوں" صبح ہی سے کانوں کے پردے پھاڑنے لگتی ہے جب ہم یونیورسٹی کے نزدیک پہنچے تو میں سوچنے لگا کہ کیا کہہ کر میں انہیں تسلّی دوں گا لیکن مجھے اتنی تکلیف نہیں کرنی پڑی۔ بھنگیوں کے احاطے کے باہر ہی سے بَین کی آواز نے بتا دیا کہ مریضہ دواؤں اور ڈاکٹروں سے اتنا تنگ آ چکی تھی کہ اب ایک اور ڈاکٹر کا انتظار کرنا اس نے مناسب نہیں سمجھا۔

اندر پہنچتے ہی جمعدارنی تو یہ بھول گئی کہ وہ ایک شریف ڈاکٹر کو اس کے گرم بستر سے اٹھا کر لائی ہے اور مجھے وہیں کھڑا چھوڑ مریضہ کے سرہانے بیٹھی ہوئی عورتوں میں شامل ہو گئی اور پھر اس کے بَین بھی پڑوسنوں کے نالہ و بکا میں مِل گئے۔ میں مبہوت و ساکن وہیں کھڑا کا کھڑا رہ گیا۔ فہم و فراست کی طاقتیں جیسے جواب دیتی ہوئی معلوم ہوئیں۔ اب یہیں سے واپس چلا جاؤں، یا اتنی دور آیا ہوں تو تعزیت کے دو بول کہتا چلوں میں کچھ بھی فیصلہ نہ کر سکا۔ اتنے میں جمعدار کی نگاہ مجھ پر پڑی۔

"آپ بھی آ گئے ڈاکٹر صاحب!" اور غم کی تاریکی اس کے چہرے پر جیسے اور بھی گہری ہو گئی۔

میں نے کہا۔ "ابھی جمعدارنی نے مجھے بتایا لیکن تم لوگوں نے مجھے پہلے خبر کیوں نہ کی؟"

یہ سُن کر جمعدار کا دبا ہوا غصّہ جیسے ابھر پڑا۔ نسیں تن گئیں اور سیاہ چہرہ غم و غصّہ کی وجہ سے اور بھی سیاہ ہو گیا۔ وہ کوئی نہایت تلخ بات کہنا چاہتا تھا لیکن کہا اس نے صرف اتنا ہی ــ "وہ . . . . . وہ تو مجھے اپنا دشمن سمجھتا ہے"۔

اس کا اشارہ اپنے بھائی کی طرف تھا جو اپنے چھ روتے بلکتے بچوں کے ساتھ گم سم بیٹھا تھا۔ پھر کچھ شانت ہو کر اس نے اتنا اور کہا ــ ہم تو بے شرم ہو کر چلے آئے بابوجی۔ موقع ہی ایسا تھا۔ نہیں وہ تو اتنا ضدّی ہے کہ . . . . . فقرہ اس سے ختم نہیں ہو سکا۔ غصّہ اور رنج سے بھر آنے والی آنکھوں کو پونچھتے ہوئے اُس نے مُنہ دوسری طرف پھیر لیا۔

. . . .

میرا وہ چھٹی کا دن کچھ اُداس اُداس ہی بیتا۔ گھر آیا تو سلیکھا کو سب باتیں سنانی پڑیں اور بھرے پورے گھر کو یوں بے بسی سے چھوڑ کر چلی جانے والی کے دلی جذبات اور بے ماں کے اُن چھ بچوں کی زبوں حالی کا خیال کر کے وہ کئی بار آنکھوں میں آنسو بھر بھر لائی۔ تب میں نے اُسے اِدھر اُدھر کی باتوں سے بہلانے کی کوشش کی۔ سینما کے مٹینی شو میں بھی میں اسے لے گیا۔ لیکن اس دن وہ کھلی نہیں ملول ہی سی رہی اور شام کو جب میں سمجھ رہا تھا کہ صبح کے اندوہناک واقعات کو وہ بھلا چکی ہو گی تو اپنے بھائی کے ہم زلف کی بات لے بیٹھی اور مجھ سے اصرار کرنے لگی کہ اس غریب کے بھائی کے چوتھے میں میں ضرور شرکت کروں۔

چوتھے کے دن میں معمول سے بہت پہلے اُٹھا۔ مجھے الارم لگانا پڑا تھا اور یہ جان کر مجھے تسلی ہوئی کہ میں ٹھیک وقت پر ان کے یہاں پہنچ گیا۔ شمشان سے پھول چُن کر وہ واپس آ گئے تھے۔ اور لوگ ابھی تعزیت کی غرض سے بیٹھے ہی تھے۔ تب اُن سے مل کر میں نے محسوس کیا کہ بھائی کی موت کا دُکھ کتنا گہرا ہوتا ہے۔ ان کے ہنس مکھ چہرے پر مُردنی چھائی ہوئی تھی۔ داڑھی بڑھ گئی تھی اور بال پریشانی کے عالم میں بکھرے ہوئے تھے۔ جوان بھائی تو دایاں بازو ہوتا ہے۔ جس کا بھائی مر جائے اس کا تو گویا ایک بازو ہی کٹ جاتا ہے اور پھر ان کا تو صرف بھائی ہی نہ مرا تھا بلکہ دو بچے بھی اپنے پیچھے چھوڑ گیا تھا اور اثاثہ کے نام سے ایک پیسہ بھی نہیں۔ جب سب لوگ تعزیت کر کے چلے گئے تو میں نے اپنی اور سلیکھا کی طرف سے ان کے بھائی کی اس بے وقت موت پر اظہارِ افسوس کیا۔ پھر دوسری باتیں چل پڑیں۔ اس پر

اُنہوں نے کہا — "دیکھئے اسی دن کے لئے آدمی بیمہ کراتا ہے۔ میری آمدنی کا تو جو حال ہے کسی سے پوشیدہ نہیں۔ لیکن پھر بھی چار ہزار کا بیمہ میں نے کرا چھوڑا ہے۔ ان سے میں نے بارہا کہا کہ بھائی صاحب اور نہیں تو کم از کم ایک ہزار کا بیمہ تو کرا ہی چھوڑو۔ لیکن ان کے کان پر جوں تک نہیں رینگی اور اب دو بچوں کو چھوڑ کر مر گئے۔ زندگی کا کیا بھروسہ ہے۔ خیر اب تو میں ہوں، کسی نہ کسی طرح سنبھال ہی لوں گا۔ لیکن اب اگر میں بھی نہ رہوں تو کیا ہو؟"

اس کے بعد انہوں نے بتایا کہ کس طرح اُن کی بیوی ہمیشہ بیمار رہتی ہے۔ اور اس سے اپنے بچے ہی سنبھالے نہیں جاتے۔ کہنے لگے — "مجھے فکر ہے تو اسی بات کی، ورنہ ڈپوں کی میں کیا پروا کرتا ہوں"!

میں نے کہا — "آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ لیکن آپ انہیں ان کے ننہال کیوں نہیں بھیج دیتے؟"

وہ بولے — "اول تو وہاں کوئی ہے ہی نہیں۔ ہو بھی تو اپنے بھائی کے بچوں کو میں یوں در در کی ٹھوکریں کھانے کے لئے کیسے چھوڑ سکتا ہوں!"

میری آنکھیں بھر آئیں۔ انہیں تسلّی دیتے ہوئے میں نے کہا "آپ جیسا بھائی ملنا اس خود غرض دنیا میں ناممکن ہے۔ پرماتما مالک ہے۔ وہ آپ کو اس مصیبت کا مقابلہ کرنے کی طاقت دے"۔

اس کے بعد میں نے ان سے رخصت لی۔ اُس دن پہلی بار مجھے اس خیال سے تسلّی ہوئی کہ اچھا ہے کہ میری کوئی اولاد نہیں جو میرے اچانک مر جانے سے دوسروں پر بوجھ بننے کے لئے رہ جائے اور اس بات سے بھی مجھے اک گونہ مسرت ہوئی کہ اگر ایسا ہو بھی تو بیمہ کی ایک رقم سلیکھا کے نام کمپنی کے دفتر میں چپ چاپ بڑھ رہی ہے۔ چلتے چلتے میں نے ان سے کہہ بھی دیا کہ آج زندگی میں پہلی بار مجھے اپنے بیمہ کرانے پر دلی مسرّت ہوئی ہے۔

. . . .

اس کے بعد کئی دن گذر گئے اور وہ ہمارے دور کے رشتے دار پھر کبھی دکھائی نہیں دیئے۔ شائد رشتہ داری کے جس جوش سے متاثر ہو کر وہ سلیکھا کے بھائی کو لے کر آ دھمکے تھے وہ یہ جان کر عنقا ہو گیا کہ ایک مشہور بیمہ کمپنی میں میں نے کافی رقم کا بیمہ کرا رکھا ہے۔ سلیکھا سے بھی میں نے ہنس کر یہی بات کہی تو وہ بگڑ گئی۔ کہنے لگی۔ "کوئی اپنے رشتے دار کے یہاں کیا اسی لئے جاتا ہے کہ اس سے بیوپار کرے! مصروف آدمی ہیں کہیں پھنس گئے ہوں گے اور اب تو اپنے بھائی کی گرہستی کا بھی بار آ پڑا ہے۔ آپ کو چاہئے کہ کسی دن جا کر ان کی خیر خبر ہی پوچھ آئیں"۔

کچھ خفیف سا ہو کر میں نے کہا۔ "خیال تو آیا کہ کسی دن ہو آؤں لیکن وقت ہی نہیں ملتا"۔

اور اسی حیص بیص میں ایک مہینہ اور گذر گیا اور میں ان کے یہاں نہ جا سکا۔ ایک دن ڈسپنسری میں اپنا کام ختم کر کے میں اُٹھنے ہی والا تھا کہ مرکزی یتیم خانے کے انچارج لالہ سندر لال آ پہنچے اور اصرار کرنے لگے کہ میں ان کے ساتھ یتیم خانے میں آدھے گھنٹے کے لئے ہوتا چلوں۔ میں بہت تھکا ہوا تھا اور گھر جانے کی بھی مجھے جلدی تھی۔ لیکن سلیکھا کا یہ اصرار تھا کہ جہاں کہیں بے بس اور یتیم کا سوال آئے میں لیت و لعل نہ کروں۔ اس لئے میں ان کے ساتھ چل پڑا۔ وہاں دو بچوں کو میرے سامنے لایا گیا۔ ایک سات آٹھ برس کی متین لڑکی تھی اور دوسرا تین ایک برس کا مریض دُبلا پتلا لڑکا۔

"بھائی بہن ہیں"۔ سندر لال جی نے کہا۔

میں نے ان کا معائنہ کر کے ان کے لئے نسخہ لکھ دیا اور ان کی کمزوری کے پیش نظر یہ بھی صلاح دی کہ دو چار انجکشن دونوں کو دے دیئے جائیں اور اگر ہو سکے تو کوئی طاقت کی دوا بھی کھلائی جائے۔

جب بچے چلے گئے تو میں نے پوچھا۔ "یہ شائد نئے آئے ہیں۔ پہلے تو ان کو کبھی نہیں دیکھا۔ کہاں سے آئے ہیں یہ؟"

سندر لال جی نے بتایا کہ لاہور ہی کے ہیں اور ان کا باپ حال ہی میں ایک سہ منزلے مکان سے گر کر مر گیا ہے۔

چونک کر میں نے پوچھا۔ "تو ان کا اور کوئی نہیں؟"

انہوں نے بتایا کہ نہیں چچا ہیں لیکن ان بے چارے کی بیوی بیمار رہتی ہیں۔ اپنے ہی بچوں کو نہیں سنبھال سکتیں۔ اس لئے وہ انہیں یہاں چھوڑ گئے ہیں۔ کچھ رقم ماہ بماہ دینے کا انہوں نے وعدہ کیا ہے اور یہ بھی یقین دلایا ہے کہ لڑکی کی شادی پر بھی کچھ نہ کچھ ضرور دیں گے،

. . . .

اُسی شام کو جب میں گھر آیا تو سلیکھا نے کہا۔ "سنا جی آپ نے ہماری جمعدارنی جیٹھ کے سب بچوں کو اپنے گھر لے آئی ہے"۔ چونک کر میں نے کہا "لیکن اس کے تو اپنے ہی پانچ بچے ہیں اور کمرہ بھی اُن کے پاس ایک ہی ہے"۔

"یہ تو ٹھیک ہے"۔ سلیکھا بولی۔ "لیکن جمعدار کہتا ہے کہ اپنے بھائی کے بچوں کو میں یوں در در کی ٹھوکریں کھانے کے لئے نہیں چھوڑ سکتا"۔

اپندر ناتھ اشک

تنگ دلی

ہر شعورِ نَو میں ہے کیفیتِ موجِ شراب
پی چکا ہے کس قدر چھلکے ہوئے گلگوں ایاغ

خامشی سے اک سرودِ راز سُن لیتا ہوں میں
نغمۂ موجِ ہوا ہوتا ہے جب پیکرِ طلب

کتنی راتوں کی حلاوت کتنے کاموں کا فسوں
کتنی زلفوں کی مہک کتنی نگاہوں کا اثر

شعر کے ایوانِ لافانی میں تھرّائی ہوئی
اک شبِ مہتاب کی خاموش موسیقی کا سحر

اک طلوعِ روح پرور کی ادائے جاں رُبا
اک بہارِ خندہ زن کی انجمن آرائیاں

گلشنِ دنیا کے خدوخال ہیں بکھرے ہوئے
جنتیں کتنی ہیں آسودہ نظر کے گام میں

حسنِ بے پایاں کے بُت خانے بنا دیتا ہوں میں
تیرے قبضے میں بس اک جنت ہے وہ بھی بے سراغ

سو حجابوں میں چھپا رکھا ہے تُو نے خُلد کو

ہر تخیل ہے کسی تازہ سحر کا آفتاب
میرا میخانہ طرازِ رندوصہبا گرِ دماغ

دامنِ گردوں سے شب کو پھول چُن لیتا ہوں میں
بخشنا پڑتا ہے لفظوں کو ہوا کا نطق و لب

کتنی موجوں کی لچک کتنی بہاروں کا جنوں
صرف ہو جا کر تو بنتا ہے کہیں اک شعرِ تر

ہے صدا صدیوں کے ڈوبے حُسن کی آئی ہوئی
پُرجنوں، عشق آفریں، مدہوش موسیقی کا سحر

اک غروبِ حیرت آرا کا فسونِ سحر زا
اک خزاں کی نیند میں ڈوبی ہوئی تنہائیاں

پھول کے پتے ہیں میرے ذہن میں بکھرے ہوئے
نغمے خوابیدہ ہیں تارِ بربطِ الہام میں

دیکھتا ہوں جو زمانے کو دکھا دیتا ہوں میں
کتنے بے مصرف ہیں یارب تیرے صہبا اور ایاغ

اک فسانہ سا بنا رکھا ہے تو نے خلد کو

کیا کشادہ قلب ہوں گو بے نوا انسان ہوں
تُو خدا ہو کر ہے کتنا تنگ دل، حیران ہوں

عدمؔ

شمالی ہندوستان میں عہد مغلیہ کی چند ٹکسالیں

سلاطین مغلیہ کے سکّوں پر بہت سی ٹکسالوں کے نام پائے جاتے ہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ مغلوں کے عروج کے ساتھ ٹکسالوں کی تعداد بھی بہت زیادہ ہو گئی تھی۔ ظہیر الدین بابر کے عہد میں ہندوستان میں مغلوں کی صرف سات ٹکسالیں تھیں۔ ہمایوں کے زمانے میں دو ٹکسالوں کا اضافہ ہوا اور یہ تعداد نو تک پہنچی۔ جلال الدین محمد اکبر نے بہتّر ٹکسالیں قائم کیں جس کا سبب غالباً اس کی نئی نئی فتوحات تھیں لیکن یہ بھی کوئی ضروری بات نہ تھی کہ فتوحات کی تعداد کے ساتھ ٹکسالوں کی بھی تعداد بڑھے۔ کیونکہ اورنگزیب کی سلطنت بہ اعتبار وسعت کے اکبر سے کہیں زیادہ تھی لیکن اس کے عہد میں صرف اڑسٹھ ٹکسالیں رہ گئی تھیں۔

کسی مقام پر ٹکسال کا قیام چند امور پر منحصر تھا۔ اوّلاً اس مقام کی معدنی حالت، یا یوں کہئے اگر اس مقام کے قرب و جوار میں کسی دھات کی کان تھی۔ یا کسی دھات کی فراہمی میں آسانیاں تھیں تو اس دھات کے سکے بنانے میں بھی آسانیاں اور کفائتیں تھیں۔ دوئم اس مقام کی جغرافیائی حالت، آپ دیکھیں گے کہ اکثر اوقات دو قریب کے شہروں میں ٹکسالیں قائم تھیں لیکن ان شہروں کے جغرافیائی حالات ایک دوسرے سے مختلف تھے اس لئے اگر ایک مقام سے کسی دوسرے صوبے میں سکہ لے جانے میں آسانی ہوتی تھی تو اس کا لحاظ کیا جاتا تھا۔

شمالی ہندوستان میں اکبر کی مشہور ٹکسالیں آگرہ، الٰہ آباد، جونپور، فتح پور اور لکھنؤ میں تھیں۔

ہم سب سے پہلے آگرہ کی ٹکسال پر بحث کریں گے۔ اس ٹکسال نے مختلف قسم کے بہت سے خوبصورت سکے نکالے ہیں۔

آگرہ | سب سے پہلے بابر نے آگرے میں ٹکسال قائم کی۔ بابر اور ہمایوں کے عہدِ حکومت میں یہاں صرف چاندی اور تانبے کے سکے تیار ہوئے چاندی کے سکے کا نام "درہم" تھا یہ دوسرے مشرقی ممالک کے "درہم" کی طرح پتلا ہوتا تھا۔ تانبے کے سکے بہلولی وزن (۱۴۵ گرین) پر بنائے گئے تھے۔ ان پر بادشاہوں کے نام نہیں ہیں۔ بلکہ آگرے کی جگہ پر "دار الخلافت آگرہ" "دار العدالت آگرہ" اور "دار العمال آگرہ" لکھا ہوا ہے۔

اکبر کے زمانے میں اس ٹکسال سے سونے کے سکے بھی بننا شروع ہوئے اس کی مہر کا وزن ۱۶۸ گرین ہے اور روپیہ یا درہم کا ۱۷۸ گرین ۱۹۸۱ھ میں اکبر نے ایک خاص قسم کی مہر جو محرابی شکل کی ہے جاری کی۔ اسی کی ایک اور مہر آگرہ ٹکسال سے اکبر کے پچاسویں سن الٰہی میں جاری ہوئی اس کا ایک نمونہ ہمارے لکھنؤ کے عجائب خانے میں اب بھی موجود ہے لندن کے عجائب خانے میں ایک بہت ہی نایاب مہر ۵۰ سنہ الٰہی کی موجود ہے۔ اس پر ایک طرف بطخ بنی ہے اور دوسری طرف حسب ذیل عبارت ہے۔

اللہ اکبر
۵۰ خورداد الٰہی
ضرب آگرہ

ایک اور چاندی کا سکہ ہے جو بہت نایاب ہے لیکن خوش قسمتی سے لکھنؤ میوزیم کے لئے حاصل کر لیا گیا ہے۔ اس پر لفظ روپیہ لکھا ہوا ہے۔ واضح رہے کہ اس سے قبل ہندوستان میں کسی سکے پر روپے کا، لفظ نہیں دیکھا گیا۔ اکبر کے تانبے کے سکوں کے نام فلوس ٹنکا، نیم ٹنکا، چونٹانکی، دو ٹانکی اور ایک ٹانکی ہیں۔ جہانگیر کے عہد میں آگرے کی ٹکسال اور نکھری اور اس نے نہائت حسین اور خوشنما سکّے ڈھالے۔ سکّوں کی تول میں بھی کچھ اضافہ کیا گیا۔ چنانچہ ایک اشرفی جس کا وزن ۲۴۲۸ گرین تھا ۱۰۲۸ھ میں رائج ہوئی تھی۔ یہ اشرفی اس وقت بھی برطانیہ عظمیٰ کے عجائب خانے میں موجود ہے۔ اس پر حسب ذیل عبارت کندہ ہے۔

از شاہ جہانگیر بود دورِ زماں
در آگرہ ز نام اوست زر نور فشاں
تا ہست نشان زپنج نوبت بجہاں
ایں سکہ پنج مہر پس باد رواں

اسی ۱۰۲۸ھ میں جہانگیر نے راسی مہریں تیار کرائیں۔ یہ اس کی بالکل نئی ایجاد تھی۔ اس سے قبل کبھی بھی دنیا کی کسی قلمرو میں راسی سکہ رائج نہیں ہوا یہ جہانگیر ہی کو سوجھی۔ معلوم نہیں اس میں کیا مصلحت تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ہندو نجومیوں کا اثر بادشاہ اور دربار پر بہت تھا۔ بہر نوع راسی مہریں ایک بالکل نئی ایجاد تھیں، ان مہروں پر ایک طرف بادشاہ اور ٹکسال کا نام ہے اور دوسری طرف اس خاص راسی کی شکل ہے جس راس کے مہینے میں وہ سکہ جاری کیا گیا تھا۔ مثال کے لئے ماہ فروردین کے سکوں پر میش کی بہت خوبصورت شکل ہے۔

جہانگیر کے سکوں پر جو آگرے کی ٹکسال کے بنے ہوئے ہیں۔ حسب ذیل کتبے ہیں۔

(۱) سکہ زد در شہر آگرہ خسرو گیتی پناہ
شاہ نورالدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ
(۲) زد بہ آگرہ سکہ شاہی بزر در مہر و ماہ
شاہ نورالدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ
(۳) در مہ آبان بآگرہ سکہ زد ظل اللہ
شاہ نورالدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ
(۴) در مہ بہمن بہ آگرہ سکہ زد ظلِ الہ
شاہ نورالدین جہانگیر ابن اکبر بادشاہ
(۵) در اسفندار ایں سکہ را در آگرہ زد بر زر
شہنشاہ زماں شاہ جہانگیر ابن شاہ اکبر
(۶) بفروردین زر آگرہ فروزاں گشت چوں اختر
زنور سکہ شاہ جہانگیر ابن شاہ اکبر
(۷) یافت در آگرہ روئے زر زیور
از جہانگیر شاہ شاہ اکبر
(۸) سکہ آگرہ داد زینتِ زر
از جہانگیر شاہ شاہ اکبر

ان کے علاوہ ایک سکہ جس پر نور جہاں بیگم کا بھی نام موجود ہے آگرے کی ٹکسال سے جاری ہوا تھا اس پر یہ ثبت تھی۔

بحکم شاہ جہانگیر یافت صد زیور
زنام نور جہاں بادشاہ بیگم زر

۱۰۳۸ھ مطابق ۱۶۲۸ء میں شاہ جہاں نے آگرے کا نام بدل کر اکبرآبادؔ رکھ دیا اور اس شہر کو دارالخلافت اکبرآباد کے نام سے ناموری حاصل ہونا شروع ہوئی۔

اورنگ زیب کے عہد حکومت میں بھی اکبرآباد کی ٹکسال سے سکے نکلتے رہے۔ اور جلوس کے انیسویں سال اکبرآباد کو "مستقر الخلافۃ" کا بھی خطاب عطا ہوا۔ اورنگ زیب کے سکوں پر حسب ذیل بیت ملتی ہے۔

سکہ زد در جہاں چو مہر منیر
شاہ اورنگ زیب عالمگیر

یہ تو سونے کے سکوں پر ہے اور چاندی کے سکوں پر "مہر" کے بجائے "بدر" کا لفظ ہے۔ سلاطین عظمیٰ کے بعد شاہ عالم بہادر شاہ کا زمانہ آیا جس نے اکبرآباد کا نام پھر بدلا اور آگرہ آگرہ کہلانے لگا۔ جہاندار شاہ اور فرخ سیر نے کوئی تبدیلی نہیں کی جس کی وجہ یہ تھی کہ ان کا دورِ حکومت اس قدر مختصر تھا کہ اس میں تبدیلی کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔ سلطنت ایک وبال جان تھی اور آخر کار جان سے کر رہی۔ کہتے ہیں کہ فرخ سیر نے جلوس کے پانچویں سال آگرے کو مستقر الخلافۃ کہنا پھر شروع کیا اور پھر شاہ عالم دوئم تک اس نام میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔ لیکن اس کی کوئی تحقیق ہنوز نہیں ہوئی ہے نہ کوئی شاہی فرمان ایسا دستیاب ہوا ہے جس سے نام کی تبدیلی ثابت ہو سکے۔ بہرکیف یہ ثابت ہے کہ آگرہ کبھی اکبرآباد کبھی مستقر الخلافت کے خطاب یا نام سے موسوم ہوتا رہا۔

الہ آباد آگرے کے بعد شمالی ہندوستان میں الہ آباد مغلوں کی قدیم ٹکسال ہے ۹۸۲ھ مطابق ۱۵۷۴ء میں شہنشاہ اکبر نے دریائے گنگا اور جمنا کے سنگم پر ایک قلعے کی بنیاد رکھی۔ اس قلعے کے گردوپیش ایک شہر آباد ہونا شروع ہو گیا۔ معاصر مورخ بدایونی تیئس ماہ صفر سنگ بنیاد نصب کئے جانے کی تاریخ لکھتا ہے۔ اس زمانے میں شہنشاہ کا قیام الہ آباد میں تھا۔ اس وقت میں یہ بستی الہ آباد کہلانے لگی۔ لیکن پرانا نام

ؔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ اکبر نے آگرے کا نام اکبرآباد رکھا تھا یہ غلط ہے۔

"اِلٰہ آباس" ۱۵۹۷ء تک قائم رہا۔ اس کا ثبوت لاہور کے عجائب خانے میں ایک چھوٹا تانبے کا سکہ نمبر ۶۲ ہے جس پر سنہ ۴۲ الٰہی مطابق ۱۰۰۶ھ مطابق ۱۵۹۷ء) تحریر ہے اور پرانا نام "الٰہ آباس" بھی کندہ ہے قلعے کی تعمیر کے بعد ٹکسال بھی قائم ہوئی اور اس سے چاندی اور تانبے کے سکے نکلنے لگے۔ الٰہ آباد کے سکوں پر حسب ذیل بیت کندہ تھی۔

همیشه هم چو زر مهر و ماه رائج باد
بغرب و شرق جهان سکه اله آباد

تذکروں سے ثابت ہوتا ہے۔ کہ جب اکبر سیر و تفریح کی غرض سے الٰہ آباد آیا تھا تو اس کو اس مقدس مقام کو ہندوستان کا دارالحکومت بنانے کا خیال پیدا ہوا تھا۔ اس خیال نے عملی صورت اختیار نہیں کی لیکن اس میں شک نہیں کہ الٰہ آباد اس وقت سے عزت کی نظروں سے دیکھا جانے لگا۔

نامور باپ کی طرح جہانگیر کی بھی نظر التفات الٰہ آباد پر رہی۔ اور اس کے عہد میں بھی الٰہ آباد سے چاندی کے سکے نکلتے رہے چنانچہ ایک خوبصورت چاندی کا سکہ لکھنؤ میوزیم میں اس وقت بھی موجود ہے جس پر حسب ذیل بیت کندہ ہے ؎

همیشه نور زر سکهٔ اله آباد
ز نام شاهِ جهانگیر شاه اکبر آباد

جہانگیر کے "سلیمی" سکے جو شہنشاہ اکبر کی حیات میں چلے تھے وہ الٰہ آباد کی ٹکسال کے نکلے ہوئے تھے۔

لکھنؤ | لکھنؤ کی قدیم تاریخ بتلاتی ہے کہ سلاطین شرقیہ کے عہد میں وہ جونپور کے زیر نگیں تھا۔ ۱۴۷۸ء میں بہلول لودھی کا اس پر تسلط ہوا۔ پھر ۱۵۲۶ء میں جنگ پانی پت کے بعد یہ بابر کے قبضے میں آیا۔ اس وقت سے بابر نے چاندی کا درہم "لکھنؤ کی ٹکسال سے جاری کیا اس اعتبار سے لکھنؤ الٰہ آباد پر فوقیت رکھتا ہے لیکن لکھنؤ کی ٹکسال کو تاریخ ہندوستان میں وہ اہمیت کبھی بھی نصیب نہیں ہوئی جو الٰہ آباد کو حاصل تھی۔ بابر کے سکے نایاب ہیں۔ مشہور ہے کہ ماسکو میں ایک سادھو کے پاس لکھنؤ کا ایک بابری سکہ ہے جس پر حسب ذیل عبارت کندہ ہے۔

لا الٰہ الا اللہ
محمد
رسول اللہ

پھر ایک منقش مربع شکل میں۔

ابوبکر الصدیق
عمر الفاروق

دوسری طرف ایک خوبصورت محراب کے اندر

۹۳۶
ظہیر الدین محمد بابر
بادشاہ غازی

اور محراب کے اوپر

[السلطا] ن الاعظم خاقان [المکرم]
[خلد] اللہ تعا [لیٰ] ملکہٗ لکھنؤ
وسلطنتہٗ ضرب

اس کے بعد شیر شاہ نے تانبے کے سکوں کی ایک ٹکسال قائم کی ان سکوں پر یہ عبارت تحریر تھی۔

ایک طرف	دوسری طرف
فی عہد	ابوالمظفر
الامیر الحاکم	شاہ سلطان
فی الدنیا والدین	شیر
	ضرب خلد اللہ
	لکھنو ملکہٗ

یہ ٹکسال اکبر کے عہد حکومت کے سنتیسویں (۳۷) سال تک قائم رہی اور اس میں چاندی کے سکے بھی ڈھلتے رہے لکھنؤ میوزیم میں عہد اکبری کا ایک چاندی کا سکہ اس وقت بھی موجود ہے۔ اکبر کے تانبے کے سکے جو لکھنؤ کی ٹکسال سے ۹۶۳ھ میں بنے تھے ان پر "لکھنؤ خطہ" لکھا ہوا ہے اور ۹۶۷ھ کے سکوں پر "لکھنؤ سرکار" اور ۹۷۵ھ لغایت ۹۸۷ھ کے سکوں پر "دار الخلافت" کندہ ہے۔ جہانگیر کے عہد کا کوئی سکہ لکھنؤ کی ٹکسال کا دیکھنے میں نہیں آیا۔ لیکن ٹکسال کے وجود کا پتہ ضرور چلتا ہے شاہ جہاں کے عہد کی ایک مہر لاہور میوزیم میں محفوظ ہے۔ جو لکھنؤ کی ٹکسال کی ڈھلی ہوئی ہے۔ اس کے بعد سے اورنگ زیب۔ بہادر شاہ۔ جہاندار شاہ فرخ سیر۔ رفیع الدرجات محمد شاہ تک کے زمانے کے سکے لکھنؤ کی ٹکسال کے دستیاب ہوتے ہیں۔

فتحپور سیکری | فتحپور کی بنیاد قصبہ سیکری میں اکبر نے ڈالی تھی اور کچھ عرصے تک فتحپور دار السلطنت بھی رہا تھا۔ ۹۹۲ھ کا ایک تانبے کا سکہ ملتا

ہے جس پر فتحپور کو دارالسلطنت تحریر کیا گیا ہے۔ اکبر کا چوکور روپیہ جو "چار یاری" روپیہ بھی کہلاتا ہے۔ فتحپور ہی سے نکلا تھا۔ جہانگیر کے سونے اور چاندی کے راسی سکے بھی فتحپوری ٹکسال میں ڈھلے تھے۔ ان میں سے ایک کا ذکر رائل ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے جرنل ۱۸۸۲ء میں آیا ہے۔ اس سکے پر حسب ذیل بیت کندہ تھی۔

بفتحپور فروزندہ گشت سکہ زر
ز نور نام جہانگیر شہ شہ اکبر

فرخ آباد: یہ ٹکسال عہد فرخ سیر میں ۱۱۳۰ھ میں قائم ہوئی اور اسی سبب سے یہ قصبہ فرخ آباد کہلایا۔ محمد شاہ کے زمانے میں فرخ آباد صوبہ اودھ کے زیر نگیں ہوا لیکن کچھ زمانہ بعد احمد شاہ نے پھر اس پر تسلط کر لیا۔ اس وقت سے فرخ آباد کو احمد نگر بھی کہنے لگے لیکن یہ نام زیادہ مقبول نہیں ہوا۔ تاہم عالمگیر دوئم کے زمانے کے سکوں پر احمد نگر فرخ آباد ہی تحریر ہے۔

جب ۱۲۱۷ھ میں انگریزوں نے فرخ آباد پر قبضہ کیا تو اس وقت وہاں کی ٹکسال بند ہو چکی تھی۔

مقامات مندرجہ بالا کے علاوہ شمالی ہندوستان میں بہت سے مقامات ہیں جن میں عہد مغلیہ کے کسی نہ کسی دور میں ٹکسال قائم ہوئی تھی اس کی ایک مختصر فہرست جو تحقیقات کے بعد مرتب کی گئی ہے حسب ذیل ہے۔

(۱) اکبر پور ٹانڈہ (ضلع فیض آباد)
(۲) آنولہ ضلع بریلی
(۳) بریلی آصف آباد "
(۴) بسولی
(۵) اودھ (خطہ اختر نگر صوبہ)
(۶) اٹاوہ
(۷) اسلام آباد متھرا
(۸) بلونت نگر جھانسی
(۹) بنارس محمد آباد
(۱۰) بندرابن مومن آباد
(۱۱) بہرائچ
(۱۲) سری نگر گڑھوال
(۱۳) سہارن پور
(۱۴) ظفر آباد
(۱۵) قنوج (شاہ گڑھ و شیر گڑھ دار الخلافت شاہ گڑھ)
(۱۶) کالپی
(۱۷) کورا
(۱۸) کوینج
(۱۹) گورکھپور (معظم آباد)
(۲۰) مراد آباد
(۲۱) مصطفیٰ آباد رام پور
(۲۲) میرٹھ
(۲۳) ہاتھرس
(۲۴) ہردوار
(۲۵) بدایوں
(۲۶) علی نگر
(۲۷) نجیب آباد
(۲۸) سنبھل
(۲۹) دوگانواں
(۳۰) نجف گڑھ
(۳۱) نانک پور
(۳۲) چنار مرزاپور
(۳۳) عبداللہ نگر پہان

ایک بات سمجھ میں نہیں آتی وہ یہ ہے کہ اتنے قریب قریب ٹکسالوں کے قائم کرنے کی کیا وجہ تھی؟ ممکن ہے کہ روپیہ کو کثیر تعداد میں گردش میں رکھنے کی غرض سے قریب قریب ٹکسالیں بنائی گئی ہوں۔ ابھی تک عہد مغلیہ کی ٹکسالوں اور ان کے انتظام انصرام کے متعلق اطمینان بخش ریسرچ نہیں کی گئی ہے۔ لیکن اتنا پتہ ضرور چلتا ہے کہ ٹکسال کا ایک مخصوص محکمہ تھا اور اس کے عمال بھی بہت متدین لوگ ہوتے تھے۔ ٹکسالوں کے بھی درجے تھے اور ہر درجے کی ٹکسال کے اختیارات محدود تھے۔ مثلاً درجہ اول کی ٹکسال ہر ماہ میں ایک ہزار مہر اور دس ہزار روپیہ اور بیس ہزار ٹنکا ڈھال سکتی تھی۔ ان اختیارات

کے صحیح استعمال کی سختی سے نگرانی ہوتی اور ملک کی دولت کے برقرار اور رائج و متحرک رکھنے کے لئے ایک مضبوط نظام قائم تھا۔ جو میزان ر (Equilibrium) کے کسی پلے کو کسی طرف جھکنے نہیں دیتا تھا۔

میں نے اس مضمون میں صرف شمالی ہندوستان کی ٹکسال سے بحث کی ہے شمالی ہند کے علاوہ ہر خطے کے ممتاز مقامات پر ٹکسالیں موجود تھیں۔ جن سے سکے نکلتے رہتے تھے۔ موضوع ریسرچ کا تشنہ ہے[1] اور بغیر عمیق مطالعہ اور تحقیقات کے قلم اٹھانا آسان نہیں ہے ممکن ہے کہ آئندہ کسی اشاعت میں اجمال کی تفصیل کی کوشش کی جاسکے۔

[1] رائے بہادر بابو برج دیال کیوریٹر لکھنؤ میوزیم نے ایک طویل مضمون ہندی میں اس موضوع پر لکھا ہے۔ یہ مضمون بہت پُر معلومات و دلچسپ ہے علاوہ بریں بہار و اڑیسہ ریسرچ سوسائٹی جرنل ۱۹۱۹ء میں ڈاکٹر اسپونر۔ ڈاکٹر ہفن ارکر اور مسٹر ای اے اسٹیج ورش کے مضامین بھی قابل ذکر ہیں۔

شہنشاہ حسین رضوی

غزل

تنگ آ چکے ہیں گردشِ دورِ زماں سے ہم
امیدِ فیض کیسے رکھیں آسماں سے ہم

مر کر ملا ہے منزلِ مقصود کا پتہ
پہنچے وہیں پہ آکے چلے تھے جہاں سے ہم

شائد کہ رازِ جلوہ گہِ دوست پاسکیں
آگے بڑھیں گے سرحدِ فہم و گماں سے ہم

ساقی! جگا جنوں کو، پلا، تند و تیز دے
اٹھیں گے بے پئے نہ ترے آستاں سے ہم

دل سرد ہو گیا ہے تمنا ہے بے خروش
جائیں کہاں کو اٹھ کے ترے آستاں سے ہم

نذیر احمد مرغوب

کیفیّتیں

جا اے نسیمِ صبح پیامِ فغاں لئے — شعلوں کا اپنے دوش پہ اک کارواں لئے

ہر ذرّہ ہے شگفتہ گلستاں کا مثلِ گُل — ہر گُل کنار میں طربِ جاوداں لئے

میں ہوں رہینِ کشمکشِ اضطراب، اور — وہ چُپ پڑے ہیں دامنِ خوابِ گماں لئے

اُڑتا ہوں عرش پر میں زمیں کو لئے کبھی — گرتا زمیں پہ ہوں کبھی ہفت آسماں لئے

چلتا ہوں کاروانِ کواکب کے ساتھ ساتھ — بیٹھا ہوں دل میں گردشِ دورِ زماں لئے

بیٹھا ہے ایک پیکرِ حیرت بنا ہُوا — تصویر ان کی صانعِ کون و مکاں لئے

شاہد اب اُٹھ کہ دیر سے ہے منتظر ترا

ساغر شرابِ ناب کا پیرِ مغاں لئے

مسعود شاہد

لطیفہ

اگر آپ نے لطیفہ کی آنکھیں نہیں دیکھیں تو آپ یہ جان ہی نہیں سکتے کہ پیاری آنکھیں کیسی ہوتی ہیں۔ جب میں جوان تھا اور لطیفہ ایک معصوم دوشیزہ تھی، تو میں اکثر یہ کہا کرتا تھا۔

گو اُس بات کو مدّت گذر چکی ہے لیکن میں اب بھی اپنے کہے پر قائم ہوں۔

جنوری کا مہینہ تھا اور برسات کا موسم۔ میں چند عربوں کے ہمراہ باہر کھیتوں میں انگور کی بیلوں کی کاشت کے لئے زمین کو ہموار کروانے میں مصروف تھا۔ میرے دل کی رنگینیاں انگڑائیاں لے رہی تھیں۔ اور یوں نظر آتا تھا کہ فضا میں ہر سُو مخمور طلسمی کیفیتیں لرزاں ہیں۔

بہت ہی سہانا دن تھا۔ ہوا دل کو گدگداتی تھی، مشرق سے اُبھرتے ہوئے آفتاب کی سیمیں کرنیں ہر شے کو منوّر کر رہی تھیں۔ ایسے سمے میں سانس لینا بھی اک مسرت تھی پھیپھڑوں کو ان کی آخری وسعت تک تازہ ہوا سے بھر لینا ایک عشرت تھی۔ ہر چیز پر مستی چھائی ہوئی تھی۔ اور کائنات کا ذرّہ ذرّہ بہار سے متاثر نظر آتا تھا۔ وادی کے آوارہ پھول جھوم جھوم کر انجان اشارے کر رہے تھے۔ جو عرب عورتیں پتھر صاف کر رہی تھیں۔ اُن میں مجھے ایک شگفتہ چہرہ جنگل کے پھول سے بھی زیادہ شاداب، نظر آیا۔ یہ ساحرہ کوئی چودہ برس کی لڑکی تھی۔ سرو قد۔ انجان اور بے خبر سی۔ اُس نے نیلگوں لباس پہن رکھا تھا۔ سفید رومال کا ایک کونا اُس کے سر پر تھا اور دُوسرا اُس کے کندھے پر پڑا تھا۔

"کیا تم اپنا نام بتا سکتی ہو؟" میں نے کہا ———

ایک معصوم اور شرمیلا چہرہ میری طرف پھرا اور دو ستاروں کی مانند روشن آنکھیں شعلہ بار ہوئیں۔ اُس کی آنکھیں بہت ہی پیاری تھیں۔ بڑی بڑی سیاہ۔ اور روشن شمعیں جن پر لانبی لانبی گھنی پلکیں مسرت اور احساسِ جوانی سے جھک رہی تھیں۔

"دختر شیخ سلمان" ایک عرب نے طنزاً کہا اور کام میں مشغول ہو گیا اور پھر معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے مُسکرایا اور گنگنانے لگا۔ "بہار کی طرب انگیز راتوں میں دو ستاروں کی مانند ——"

اس واقعے کے بعد مجھے اپنے کام میں ایک نئی دلچسپی پیدا ہو گئی۔ جب کبھی میں تھکاوٹ محسوس کرتا یا اُداس ہوتا تو لطیفہ کو دیکھ لیتا۔ جس سے خون میں حرارت پیدا ہو جاتی اور روح میں شگفتگی آ جاتی۔ اور اُس کی سحر پرور نگاہیں مجھ میں زندگی بھر دیتیں۔ میں اکثر جبکہ وہ میری طرف دیکھتی اس کی نگاہوں کی حرارت کو محسوس کرتا اور اس کی آتشیں نگاہیں میری روح کو گرماتیں۔ لیکن کبھی کبھار یہ آنکھیں اُداس بھی ہو جاتیں۔

ایک دن میں گھوڑے پر سوار کھیت کی طرف جا رہا تھا کہ راستے میں کنوئیں کے پاس مجھے لطیفہ ملی۔ اُس کے سر پر ایک گھڑا تھا۔ وہ مزدوروں کے لئے پانی لا رہی تھی . . . . .

"کیا حال ہے لطیفہ؟"

"میرا باپ مجھے کام کی اجازت نہیں دیتا . . . . ."

یہ لفظ اُس کے منہ سے اس طرح نکلے جیسے کہ وہ انہیں کہہ کر اک ایسے بوجھ کو ہلکا کر رہی ہے جو مدّت سے اُس کے دل پر پڑا تھا۔ اُس کی آواز میں افسردگی تھی اور یوں محسوس ہوتا تھا کہ اُس کی سادہ اور معصوم روح کو کوئی شدید صدمہ پہنچا ہے۔

"تو کیا گھر پر رہنا کام سے بہتر نہ ہو گا؟" میرے ان الفاظ پر لطیفہ نے مجھ پر اک گہری نگاہ ڈالی۔ اُس کی آنکھیں کچھ مدھم ہو گئیں اور چند لمحے وہ بالکل خاموش رہی اور پھر کہا۔ "میرا باپ مجھے شیخ اصغر کے لڑکے سے بیاہ دینا چاہتا ہے۔"

"اور تم؟"

"میں اس پر موت کو ترجیح دیتی ہوں!"

وہ ایک دفعہ پھر چپ ہو گئی اور کچھ لمحوں کے بعد کہنے لگی۔

"خا جا! کیا یہ سچ ہے کہ تمہاری صرف ایک ہی بیوی ہوتی ہے"۔

"ہاں صرف ایک!...."

"اور تم لوگ عورتوں کو مارتے بھی نہیں"۔

"نہیں۔ جس عورت کو پیار کرتا ہو اُسے کوئی کب اذیت پہنچاتا ہے خصوصاً جبکہ وہ عورت بھی اُسے پیار کرتی ہو ——"

"تمہارے ہاں تو ہر دوشیزہ اپنے محبوب سے شادی کر سکتی ہے نا؟"

"یقینی طور پر ——!"

"ہمیں تو یہاں حیوانوں سے بھی بدتر تصور کیا جاتا ہے"

ایسی ساعتوں میں لطیفہ کی آنکھوں کی روشنی نظارہ سوز حد تک بڑھ جاتی تھی اور نگاہوں کی گہرائی اور سیاہی کی حدود کا جاننا محال ہو جاتا تھا۔

"میرا باپ کہتا ہے کہ مجھے وہ تمہیں دے دے گا بشرطیکہ تم مسلمان ہو جاؤ....!"

"مجھے؟"

میں بے اختیار ہنس پڑا۔ لطیفہ میرا منہ تکتی رہی۔ اس کی نگاہیں غم انگیز تھیں ——

"لطیفہ یہودی بن جاؤ میں تم سے شادی کر لوں گا"۔

"نہیں خا جا! یہ بات ناممکن ہے۔ میرا باپ میری جان لے لے گا اور تمہیں بھی مار ڈالے گا"۔

اگلے روز بوڑھا شیخ میرے کھیت پر آیا۔ وہ سفید گھوڑی پر سوار تھا اور اُس کے سر پر ایک شاندار دستار تھی۔ اس نے مزدوروں کے سلام کا تمکنت سے جواب دیا اور وہ سب اُس کے سامنے عاجزی سے جھک گئے اور خاموش ہو گئے۔ اُس نے میری طرف قہر آلود نگاہوں سے گھورا اور وہ مجھ سے نہایت سرد مہری سے پیش آیا میں نے ویسا ہی خشک جواب دیا۔ آبادی کے لوگ شیخ کو کچھ قدر کی نگاہ سے نہ دیکھتے تھے۔ کیونکہ اُسے یہودیوں سے بہت نفرت تھی۔ مگر اس کے باوجود اُس سے سب خائف تھے۔

جب شیخ نے اپنی دختر کو دیکھا تو وہ مشتعل ہو گیا۔

"کیا میں نے تمہیں یہودی کے پاس جانے سے منع نہ کیا تھا" اُس نے غُراتے ہوئے کہا اور پھر وہ جوش میں آکر کہنے لگا۔

"اُن مسلمانوں کو شرم آنی چاہئے جو اپنی زمین کفار کے ہاتھ فروخت کر دیتے ہیں" ان الفاظ کے ساتھ اُس کے ہاتھ کی چھڑی کئی بار لطیفہ پر بے رحمی سے برسی میں نے بڑھ کر لطیفہ کی مدد کرنا چاہی مگر لطیفہ کی نگاہوں نے مجھے بے حس و حرکت رہنے کی تلقین کی اور میں چُپ کھڑا اس اندوہ افزا منظر کو دیکھتا رہا۔ اس کے بعد....

شیخ اور اُس کی دختر چلے گئے۔ مزدوروں نے بھی اطمینان کا سانس لیا۔

"شیخ سلمان بے رحم ہے" کسی نے کہا" اس لئے مزدور پیشہ لوگ خوشی سے اُس کے پاس کام کرنے کے لئے نہیں جاتے۔ ایک تو تشدد سے کام لیتا ہے اور دوسرے اُجرت بھی کم دیتا ہے بھلا ایسے میں کون دن رات اُس کی غلامی کرے جبکہ مقابلتاً یہودی زیادہ اُجرت دیتے ہیں اور کام بھی تھوڑا لیتے ہیں"۔

"اُسے جس بات کا غصہ تھا میں خوب جانتا ہوں" ایک نے معنی خیز نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد لطیفہ کام پر واپس نہ آئی.....

کچھ دن بعد جب میں اپنے گھر سے باہر نکلا تو وہ راستے میں مجھے ملی۔ سڑک کے کنارے بیٹھی مرغیاں فروخت کر رہی تھی۔ مجھے آتا دیکھ کر وہ اُٹھ بیٹھی۔ اُس کی آنکھیں پہلے سے زیادہ حسین اور اُداس تھیں۔

کیسا حال ہے لطیفہ؟" میں نے پوچھا

"شکریہ" اُس نے جواب دیا۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔

لطیفہ اکثر مرغیاں فروخت کرنے کے لئے آیا کرتی اور ہمیشہ شام ہی کو آتی ——

ایک دن میرے ایک مزدور نے مجھے بتایا کہ لطیفہ کی شادی شیخ اصغر کے لڑکے سے ہو گئی ہے اور وہ شیخ اصغر کے گھر چلی گئی ہے۔ اس کا لڑکا پست قامت اور بے بضاعت ہے۔ اُس کے بعد میں نے سنا کہ شیخ اصغر کے لڑکے کا گھر جل کر راکھ ہو گیا ہے اور لطیفہ اپنے باپ کے پاس واپس آگئی ہے۔

پھر سُنا کہ اُسے زبردستی سسرال بھیج دیا گیا ہے.....

یوں ہی کئی برس گذر گئے۔ میں اپنے نئے مکان میں رہتا تھا۔ اور کسی کی خوبصورت آنکھوں نے مجھے لطیفہ کی حسین آنکھوں کو بھول

جانے پر مجبور کر دیا تھا۔

ایک صبح میں گھر سے باہر نکلا تو دو معمّر عرب عورتیں مرغیاں فروخت کر رہی تھیں۔ ایک عورت میری طرف بڑھی۔

"کیا بات ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کیا تم حاجا نہیں؟" اُس نے جواب میں کہا۔

"لطیفہ؟" میرے مُنہ سے بے ساختہ نکل گیا۔

آہ! یہ لطیفہ تھی۔ ایک بوڑھی اور عمر رسیدہ عورت، اُس کی جوانی اُس کے چہرے کی جھرّیاں بن کر رہ گئی تھی۔ مگر اُس کی آنکھوں میں اب بھی کسی گذرے ہوئے عہد کی یاد دلانے کے لئے روشنی باقی تھی۔

"تم نے اب داڑھی رکھ لی ہے۔ تم کس قدر تبدیل ہو چکے ہو"۔ اُس نے میرے چہرے کا جائزہ لیتے ہوئے کہا ——

"تم کیسی ہو۔ تم میں بھی تو زبردست انقلاب آگیا ہے"۔

"قدرت کو یہی منظور تھا اور ایسا ہی ہونا تھا!" وہ چُپ ہو گئی اور پھر کچھ سوچ کر کہنے لگی۔

"حاجا! اب تمہارے گھر بیوی بھی ہو گی؟"

"ہاں لطیفہ!"

"میں اُسے دیکھنا چاہتی ہوں . . . . !"

میں نے اپنی بیوی کو باہر بلایا۔

لطیفہ دیر تک اُس کی طرف دیکھتی رہی۔ اُس کی آنکھوں میں دو بڑے بڑے آنسو جھلک رہے تھے۔ تب سے میں نے لطیفہ کو کبھی نہیں دیکھا —— !

مجید لشاری "مُوسیٰ بسل آنسکی"

شعر

نہ دیکھا میرِ آوارہ کو، لیکن
غبار اک ناتواں سا کُو بکُو تھا

میر تقی

بٹوت

ہے ٹھنڈی ٹھنڈی بادِ بہاری بٹوت میں
اور میٹھے میٹھے چشمے ہیں جاری بٹوت میں

صورت میں لالہ و گلِ خورو کی دیکھئے
حُسنِ ازل کی نقش نگاری بٹوت میں

اشجارِ سبز پوش کے آئی لباس ہیں
خضرِ خجستہ پے کی سواری بٹوت میں

ابرِ بہار جھوم رہا ہے خمار میں
عالم وہ مستیوں کا ہے طاری بٹوت میں

واعظ کے وعظ میں بھی ہے مستی شراب کی
زاہد ہے وقفِ بادہ گساری بٹوت میں

مسکن ہے اپنا ابرِ بہاری کی سیر گاہ
میخانہ ہے بغل میں ہماری بٹوت میں

ہے ٹھنڈی باولی پہ حسینوں کا جمگھٹا
اور کچھ نظر گزر کے بھکاری بٹوت میں

اک شوخ چنچل اُتری پہاڑی سے ڈگر ڈگری
نینوں کی چل رہی ہے کٹاری بٹوت میں

دھونی رمائے بیٹھے ہیں چیلوں کی چھاؤں میں
پربت کی مورتوں کے پجاری بٹوت میں

حاضر حضورِ حق میں ہے غائب زمانے سے
اللہ ہو زباں پہ ہے جاری بٹوت میں [۱]

خوشی محمد ناظر

[۱] عام طور پر قبلہ ناظر صاحب کا رنگ سنجیدگی لئے ہوئے ہوتا ہے لیکن یہ ایک ہلکی پھلکی چیز ہوتی ہے جیسا کہ مقطع میں ناظر صاحب کا لباس پہنے ہوئے ہیں اور اس تبدیلی میں بھی ایک بات پیدا ہو گئی ہے۔

سایہ

لارنس باغ میں ایک تنہا اور غیر آباد کونے میں سجاد بیٹھا ہوا جمیلہ کا انتظار کر رہا تھا، وہ کونہ غیر آباد تو تھا لیکن اس قدر نہیں کہ وہاں پرندہ بھی نہ پھٹک سکتا ہو، کبھی کبھی کوئی موٹر سامنے والے موڑ سے گذرتی تو اس کی تیز تیز آنکھوں میں سے روشنی نکل کر بہت سی غیر مانوس اور پوشیدہ تاریکیوں پر پڑ جاتی اور اسی لپیٹ میں سجاد بھی آ جاتا، اس نے بہت سوچ سمجھ کر وہ جگہ چنی تھی۔ ایک بڑے اور جھکے ہوئے درخت کے نیچے تنے کے ساتھ لگا ہوا سیاہ رنگ کا بنچ —— لیکن موٹروں کی تیز تیز آنکھوں سے کوئی کہاں تک بچے! آنکھوں کو چندھیا دینے والی روشنی کو برا بھلا کہتے ہوئے سجاد نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا، اس کو اس بات سے بہت نفرت تھی کہ کوئی اسے تنہائی میں بیٹھا ہوا دیکھے،

جمیلہ کا ابھی تک کہیں نام و نشان نہ تھا!

سجاد نے اپنی دونوں ٹانگیں بنچ پر دراز کر لیں، اور پھر درخت کے پتوں میں —— بالکل تاریک پتوں میں نگاہیں جما دینا تو اس کے اختیار کی بات تھی، اچانک ایک پرندہ پھڑپھڑاتا ہوا درخت میں سے باہر نکلا غالباً وہ نہیں چاہتا تھا کہ رات کی تاریکی میں کوئی انسان اسے گھور گھور کر دیکھے، وہ اس وقت اڑ کر کہاں جا سکتا تھا، اڑا اور اڑ کر ساتھ ہی دوسرے درخت پر جا بیٹھا، سجاد کی نگاہیں اس کے پیچھے لگی رہیں، پھر وہ مسکرا دیا اس نے مڑ کر عقبی سڑک پر نظر دوڑائی۔ جہاں سے جمیلہ اسے سائے کی طرح بڑھتی ہوئی نظر آ سکتی تھی لیکن ابھی تک وہ سایہ مفقود تھا۔

اس کے دہنی طرف بھی ایک سڑک تھی جس پر سے موٹریں گذر رہی تھیں لیکن ان کی روشنی اس پر نہ پڑ سکتی تھی اس لئے وہ خوش تھا، کوئی موٹر گذرتی تو جب تک وہ پودوں کی اوٹ میں نہ ہو جاتی۔ وہ پیچھے دیکھتا رہتا اور خوب نگاہیں جما کر ہر ایک کا نمبر پڑھنے کی کوشش کرتا، پھر مسکرا دیتا —— وہ تو سمجھتے ہوں گے کہ اس درخت کے نیچے تاریکی ہی تاریکی ہے، یہاں پر کسی انسان کا کیا کام، بے وقوف لوگ! یہ سوچ کر وہ مسکرا دیا۔

اس نے پھر اپنی بڑی بڑی آنکھیں پھاڑ کر تاریکی میں دیکھا اور چند لمحوں تک دیکھتا رہا، یہاں تک کہ تاریکی میں نگاہیں گاڑے ہوئے بھی اس کی آنکھوں سے پانی بہہ نکلا،

جمیلہ کا سایہ کہیں بھی حرکت کرتا ہوا نظر نہ آیا،

ہوا کا ایک تند سا جھونکا اس کے درست بالوں کو پریشان کرتا ہوا گزر گیا، اس نے اپنی انگلیوں سے انہیں درست کیا، بہت پرے لیمپ کے پودوں کو جب ہوا نے جنبش دی تو ایک بتی جھلکنے لگی، وہ بنچ پر سرک کر تاریک کونے میں جا بیٹھا۔ جہاں بتی کی مدھم سی شعاعیں نہ پڑ سکتی تھیں،

چند لمحوں کے بعد جمیلہ وہاں ہو گی اور پھر اس کے جذبات میں کس قدر ہیجان برپا ہو گا، یہ خیال کس قدر دلچسپ اور مسرت انگیز تھا اور یہی تصور تو اسے اس تاریکی میں لئے بیٹھا تھا۔

وہ اسی لارنس باغ میں جمیلہ سے ملا، کس طرح ملا؟ اس کی تفصیل اس کے ذہن سے اتر نہیں چکی تھی لیکن غیر ضروری تفصیل کی ضرورت ہی کیا تھی؟ —— اب تو وہ ایک جذبات خیز دھارے میں بہتا ہوا جا رہا تھا —— ! اس کا جمیلہ سے ملنا ایک قدرتی واقعہ تھا، انسانی فطرت کا ایک تقاضا لیکن جمیلہ نے آخر اسے کیوں پسند کیا؟ اس میں خصوصیت ہی کیا تھی؟

دفتر کا ایک بے حقیقت سا کلرک، محدود آمدنی کا مالک، وہ شاعر نہیں تھا، افسانہ نگار نہیں تھا، قابل رشک عہدے پر بھی فائز نہیں تھا، آخر وہ کیا تھا —— جمیلہ نے اس کی طرف کبھی توجہ نہیں دی، ایک دو دفعہ سجاد نے اپنی اخلاقی جرأت کا ثبوت دینے کے لئے یہ

کہا بھی،

"جمیلہ! میں ایک بے حقیقت سا کلرک ہوں، میری کوئی خاص حیثیت نہیں ہے۔ ممکن ہے شادی کے بعد . . . "

لیکن جمیلہ نے ان باتوں کو غیر ضروری سمجھ کر سُنا اَن سُنا ایک کر دیا، وہ حیران تھا کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے! جمیلہ سے ملتے ہوئے اُسے کافی عرصہ ہو چکا تھا لیکن اُسے یہ معلوم نہیں تھا کہ وہ کون ہے، جب اس نے سجاد کی باتیں نہ سنیں تو وہ اس کے متعلق کچھ کیونکر پوچھ سکتا تھا لیکن وہ اسے بھول نہیں سکا۔ اس کی یاد سے اسے ایسا معلوم ہوتا تھا گویا اس کا معطر جسم اس کے جسم کے ساتھ چھو گیا ہو۔ اُس نے مڑ کر تاریک سڑک پر پھر نگاہ دوڑائی۔

جمیلہ کا تاریک سایہ اب تک اُس کی آنکھوں سے اوجھل تھا!

اس نے ایک لمبی سانس کھینچی گویا واقعی اسے جمیلہ سے عشق تھا لیکن پھر وہ اپنے حالات پر غور کرنے لگا، کیا اُسے واقعی جمیلہ سے محبت تھی؟ ایک مدت گزر گئی، وہ محبت کئے جا رہا تھا۔ خاموش محبت ---- لارنس باغ کے تاریک کونوں میں وہ کئی بار اس سے مل چکا تھا ---- اور چاندنی رات میں حسن و عشق کے تصادم کی بے نام چیخیں کئی بار بلند ہو چکی تھیں، آخر اس کاروبار کا مقصد کیا تھا؟ جمیلہ کیا چاہتی تھی۔ ---- ؟ وہ کیا چاہتا تھا ---- ؟ بے معنی محبت ---- لاحاصل جذبات کا دھارا ---- !!

ایک دو دفعہ اس نے اس بات کی کوشش بھی کی کہ وہ کسی نہ کسی حیلے سے جمیلہ تک رسائی حاصل کرلے اور دائمی بندھن کی کوئی صورت نکالے۔ لیکن جمیلہ نے اس مشورے کو نہایت معمولی اور بے معنی سمجھ کر ٹال دیا، آخر بغیر کسی مقصد کے ہوا میں اڑنے سے کیا حاصل؟

معاً تاریک سڑک کی جانب سے گانے کی آواز آئی۔

کوئی شخص سائیکل چلاتا ہوا گا رہا تھا، "دیوانہ بناتا ہے تو دیوانہ بنا دے"

وہ چند لمحوں کے لئے اس بے معنی مصرعے پر غور کرتا رہا لیکن اپنی محبت کے بے معنی ہونے کا رنج اسے زیادہ تھا۔ اس لئے پھر جمیلہ کی تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی۔

رات کے دس بج چکے ہوں گے، سیاہ اور پختہ سڑک پر جھاڑو کی آواز اس کے کانوں میں پڑی، درختوں کی خاموش فضا میں وہ آواز عجیب معلوم ہو رہی تھی، بھنگی اپنی مزدوری میں کس قدر مستعد تھا، دوسروں کے لئے کام کرنا اس کی فطرت میں داخل ہے، اس اندھیرے میں اس کا کوئی محافظ تو ہے نہیں جو اس کے کام کی پڑتال کرے۔ نیز اسے اس بات کا بھی یقین ہے کہ آسمان گدلا ہو رہا ہے۔ جھکڑ ضرور چلے گا سڑک کی صفائی کرنا نہ کرنا برابر ہے، کام نہ کرنے کے لئے اس کے پاس کافی بہانے ہیں لیکن پاگل کہیں کا پھر بھی کام کئے جا رہا ہے، سجاد نے سوچا! اس کے پاس تو ضعیف سے ضعیف بہانہ بھی ہو تو وہ دفتر کا کام چھوڑ دیا کرتا ہے، افسر ہر وقت سر پر بیٹھا رہتا ہے اسی لئے وہ کام میں مصروف نظر آتا ہے اور بسا اوقات وہ موٹی موٹی مسلیں یوں ہی سامنے کھول کر بیٹھا رہتا ہے۔ آخر دوسروں کے لئے اتنا کام کرنے کا فائدہ ہی کیا؟ بھنگی تو بے وقوف ہے، وہ لکھا پڑھا انسان ہے۔ وہ اس قدر احمق نہیں ہو سکتا، بہت بے معنی سی بات تھی جس پر وہ اس قدر دماغ سوزی کر رہا تھا لیکن جمیلہ کی محبت ---- ؟ وہ غالباً اس سے بھی زیادہ بے معنی تھی جس کے انتظار میں وہ دنیا سے بغاوت کر رہا تھا۔ اس نے مڑ کر ایک دفعہ پھر تاریک درختوں میں نظر دوڑائی۔

جمیلہ کا سایہ کہیں حرکت کرتا ہوا نظر نہ آیا۔!

جمیلہ نے ٹھیک نو بجے باغ میں پہنچنے کا وعدہ کیا تھا لیکن وہ ابھی تک نہیں آئی۔ اس قسم کے وعدے اتنے بے معنی تو نہیں ہوتے کہ انہیں توڑا جا سکے، ایک دفعہ پہلے بھی جمیلہ نے اسی طرح کیا تھا۔ جو وہ رات بھر انتظار کرتا رہا اور وہ رات بھر نہ آئی، صبح جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ اس بنچ پر سویا ہوا تھا، دوسرے دن جمیلہ قہقہے لگاتی ہوئی آئی اور جب سجاد نے اسے یہ بتایا کہ صبح تک وہ اسی بنچ پر سوتا رہا تھا تو اس نے ضرورت سے زیادہ قہقہے لگائے گویا وہ اس کی اس حرکت کا مذاق اڑا رہی تھی، معلوم نہیں اُس دن اُسے اس تضحیک کا احساس کیوں نہ ہوا، آج تو یہ بات بالکل صاف ستھری ہو کر اس کے ذہن میں آ چکی تھی، جب اس نے جمیلہ سے نہ آنے کی وجہ پوچھی تو وہ نہایت دلچسپی کے ساتھ اس بات کا ذکر کرنے لگی کہ کس طرح اُسے دیکھنے کے لئے ایک بہت بڑے خاندان کے چند افراد آئے ہوئے تھے۔ جس نوجوان کے لئے وہ رشتہ مانگنے کے لئے آئے تھے وہ خوبصورت بھی تھا اور پی سی ایس کے اعلیٰ عہدے پر فائز تھا ---- بہت بڑے خاندان کے چند افراد۔ گویا وہ تو ایک ادنیٰ درجے کا بابو تھا ---- یہ بات آج ہی اس کے ذہن میں آئی، اس دن تو وہ اس اہمیت کو نہ پا سکا ---- اس نے جمیلہ سے بہت دفعہ پوچھا

بھی کہ اس کے باپ نے اس رشتے کے متعلق ان لوگوں کو کیا جواب
دیا لیکن ہر دفعہ اس نے یوں ہی باتوں میں ٹال دیا ، اس کی بھی
کوئی خاص وجہ ہوگی ورنہ اسے بتا دینے میں کوئی اعتراض نہ ہو سکتا تھا
دیدہ دانستہ اس نے اس کے بہت بڑے سوال کو یوں ہی ٹال دیا
——— یہ کیوں ۔؟

اس نے مایوس لیکن باغیانہ نگاہوں سے تاریک سڑک پر جھپٹتی
ہوئی نگاہ ڈالی اور پھر ایک طنز آمیز مسکراہٹ سے گزرنے والی موٹر کو دیکھنے
لگا ۔

جمیلہ خلاف معمول ابھی تک نہ آئی تھی !

اس میں شک نہیں کہ وہ جمیلہ سے محبت کرتا ہے لیکن دیدہ
دانستہ وعدہ شکنی کرنے کا کیا مطلب ۔ ؟ ممکن ہے آج بھی اسے دیکھنے
کے لئے کسی اور بڑے خاندان کے افراد آئے ہوں ، کیا اس کی کوئی اہمیت
نہیں ! وہ بار بار اپنے بالوں کو درست کرتا اور سوچتا ——— اور اسی
ایک کی یاد میں پھر جمیلہ کا دلآویز حسن اُس کی آنکھوں کے سامنے پھر جاتا
اور پھر وہی احساس ——— گویا اس کا معطر جسم اس کے جسم کے ساتھ
چھو گیا ہو ، اُسے چھونا تو بڑا مشکل کام ہے ——— خواہ اسے انتظار میں آج
بھی صبح تک بنچ پر ہی سونا پڑے ۔" ——— لیکن جمیلہ کی بے وفائی پر ایک
طنز آمیز مسکراہٹ اس کے چہرے پر کھیل ہی گئی ، میں نے زندگی
میں پہلی دفعہ ایک عورت سے محبت کی تھی اور پہلی دفعہ ہی مجھے اس قسم
کی نوجوان عورت ملی جو صرف اپنے جسم سے کھیلنا جانتی ہے اور بس ،
کیا عورت اور مرد کی محبت کا یہی مآل ہے ؟ سجاد کی آنکھوں کے
سامنے پھر جمیلہ اپنی تمام عریانیوں کے ساتھ بے نقاب ہوئی ، سوچتے
سوچتے اس نے ایک اور رستہ ڈھونڈ نکالا ۔

سجاد کی آنکھیں تاریکی میں بھی چمکنے لگیں ۔ اگر عورت اور مرد کی محبت
کا یہی انجام ہے تو پھر غم کھانے کی کیا ضرورت تھی ۔ !!

منٹگمری ہال کی بچی کھچی موٹریں مدہوش سواروں کو لئے ہوئے
جا رہی تھیں اور رقص گاہ پر اداسی ہی اداسی چھا گئی ۔

اس نے پھر ایک دفعہ تاریک سڑک پر نظر دوڑائی لیکن جمیلہ
کہیں آتی ہوئی دکھائی نہ دی ۔

یکایک دور روشنی میں اس نے ایک عورت کو سڑک پر آتے دیکھا ،
کبھی کبھی اس عورت کی ساڑی روشنی میں چمک جاتی ، اس کی چال
نوجوان عورتوں کی سی تھی اور باغ کی تنہائی اور وقت کی غیر موزونی سے
وہ بے خوف معلوم ہوتی تھی ، سجاد نے غور سے دیکھا ، یہ جمیلہ تو نہ تھی ———
اس لئے اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا ، اس کا دل گواہی دے رہا
تھا کہ جمیلہ آج نہیں آئے گی ، نہ آئے تو کیا وہ انتظار بھی نہیں کر سکتا !
لیکن اسے یقین ہو چکا تھا کہ جمیلہ کی محبت دو تند و تیز لہروں کی ٹکر کے
مانند ہے ، مل گئیں تو مل گئیں ، نہ ملیں تو ایک دوسرے سے بہت دور
نکل گئیں ۔

وہ ٹہلتا ہوا ایک پھول کے پودے تک گیا جو اندھیرے میں
بھی اپنی خوشبو سے فضا کو معطر کر رہے تھے ، پودے کے قریب کھڑے
ہو کر ایک لمحے کے لئے اس نے سوچا ——— ہر پھول خوبصورت ہے ۔
ہر پھول کی خوشبو دل کو لبھا سکتی ہے !

وہ لڑکھڑاتا ہوا واپس آیا اور پھر بنچ پر آکر گر گیا ۔ چمکتی ہوئی ساڑی
پر پھر اس کی نگاہ پڑی ، وہ عورت اسی طرف بڑھتی ہوئی چلی آ رہی تھی ، اسی
تاریک کونے کی طرف ——— سجاد وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا ۔
لیکن ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا اپنے ساتھ غازے اور خوشبو کا ایک طوفان
لایا ——— سجاد کے سینے میں اس قسم کی خوشبو ایک ہیجان برپا کر سکتی
تھی ، اور اُس کے پریشان خیالات کو اور منتشر کر سکتی تھی ۔

چمکدار ساڑی والی عورت گھاس پر تیرتی ہوئی بڑھتی چلی آئی ، اسی
تاریک کونے کی جانب جہاں سجاد چھپا ہوا بیٹھا تھا ، وہ سمٹ کر بنچ کے
ایک کونے میں دبک گیا ،

اب سجاد میں بھاگنے کی طاقت نہ رہی تھی !

وہ عورت بے باکانہ انداز سے آئی اور بنچ کے نزدیک پہنچ کر بھی
ٹک نہیں ، غالباً اس کی تیز نگاہوں نے دور سے ہی دیکھ لیا تھا کہ کوئی
شخص بنچ پر بیٹھا ہے ، اس نے نہایت سریلی آواز میں کہا ۔

"آپ کون ہیں ؟ ..... یہاں کیا کر رہے ہیں ؟"

"میں ——— میں ——— یہاں ———"

"انتظار کر رہا ہوں ، صاف کہہ دیجئے نا !" یہ کہہ کر فضا میں ایک
نقرئی قہقہہ بلند ہوا اور وہ عورت بے تکلف بنچ پر بیٹھ گئی ۔

"اُف ! یہ انتظار کی گھڑیاں بھی کس قدر طویل ہوتی ہیں ، انسان اپنے
دوست کا انتظار کر رہا ہو اور وہ نہ آئے تو کتنا دکھ ہوتا ہے ۔"

"کتنا دکھ ہوتا ہے !" سجاد نے احمقوں کی طرح فقرے کا آخری

حصّہ دہرایا۔ چمکدار ساڑی والی عورت نے بنچ کی پشت کے ساتھ اپنی پشت لگاتے ہوئے کہا۔

"اور اگر خدانخواستہ جس شخص کے لئے انسان انتظار کر رہا ہو وہ جان بوجھ کر یہاں نہ آئے ۔۔۔ میرا مطلب ہے کہ وہ کسی اور دوست کے ساتھ مصروفِ عیش ہو تو پھر دُکھ کی انتہا نہ رہے گی"۔

"کسی اور دوست کے ساتھ"! سجّاد نے چلّا کر کہا اور اپنی جگہ سے اُٹھ کھڑا ہؤا اور تاریک سڑک پر نظریں گاڑ دیں، وہ دیر تک یونہی کھڑا دیکھتا رہا۔

چمکدار ساڑی والی عورت اپنی جگہ سے اُٹھی اور اُٹھ کر اس نے سجاد کے کاندھوں پر اپنا معطّر اور نازک سا ہاتھ رکھ دیا، اس کے کمزور پژمردہ اور منتظر سینے میں پھر ایک ہیجان پیدا ہؤا اور اُس نے بے اختیارانہ اس عورت کے ہاتھ کو دبایا۔

سجّاد اور وہ عورت پھر بنچ پر بیٹھ گئے، جذبات کی تند اور تیز لہریں اُٹھیں اور وہ ایک دوسرے سے چمٹ کر بہت دیر تک آپس میں بے معنی سی باتیں کرتے رہے۔ اب سجّاد کی نگاہیں اس تاریک سڑک کی طرف نہ اُٹھیں جہاں سے جمیلہ کے آنے کا امکان ہوسکتا تھا۔

پچھلی رات جھکّڑ چلنے لگا، سجّاد اور وہ عورت دونوں گھاس پر مدہوش لیٹے ہوئے تھے، اس عورت کے ریشمیں اور معطّر بال اُڑ اُڑ کر سجاد کے چہرے پر پڑ رہے تھے۔

وہ سڑک جسے بھنگی نہایت محنت سے صاف کر کے گیا تھا سوکھے ہوئے پتّوں سے بھر چکی تھی۔!

خلیل احمد

ماہِ طلعت

ماہِ طلعت کھڑی ہے کھڑکی میں
خوش نزاکت کھڑی ہے کھڑکی میں
رُخ سے سرکا ہؤا دوپٹّا ہے
ابر سرکا ہے، چاند نکلا ہے
اس کے عارض پہ زلف ہلتی ہے
شام نورِ سحر سے ملتی ہے
مست ہیں اُس کی سرمگیں نظریں
اُف ہیں تلوار یہ حسین نظریں
یوں چمکتے ہیں اس کے آویزے
جیسے ہوں ننھے ننھے مہ ریزے
اس کی کوئل سی ہے حسیں آواز
اپنی آواز پر ہے اس کو ناز
سامنے کے کواڑ میں چھپ کر
تاکتا رہتا ہے کوئی دن بھر

مہدی علی خاں

شعر

ابر چھایا ہے مینہہ برستا ہے
جلد آ جا کہ جی ترستا ہے

گنا بیگم

دنیائے ادب

تازہ ترین رسائل کے اہم مضامین

[اس مضمون کو رسائل پر کسی قسم کی تنقید نہیں سمجھنا چاہیئے کیونکہ اس میں فقط چند خاص اور اچھے مضامینِ نظم و نثر کا ذکر ہوتا ہے معمولی یا ادنےٰ مضامین کا مطلقاً تذکرہ نہیں کیا جاتا]

(رسائل کا ذکر حروفِ تہجی کے لحاظ سے ہے)

ادبِ لطیف (ڈراما نمبر، اشاعت اپریل و مئی)

دینو۔ دھرم پرکاش آنند اردو کے نئے لکھنے والوں میں سے ہیں۔ ان کا ایک افسانہ رامی ناظرینِ ادبی دنیا کی نظروں سے گذر چکا ہے۔ دھرم پرکاش ہمیں زندگی کی تاریک گہرائیوں میں لے کر اتر جاتے ہیں۔ اور وہاں ہمیں ایسے مناظر دکھاتے ہیں جن کی ہیبت ناک حقیقت سے ہماری مسرت طلب نگاہیں دوچار نہیں ہونا چاہتیں۔ یہ مختصر ڈراما اُن کے اسی اندازِ نظر کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ پنجاب کے پہاڑی علاقے کے لوگوں کا افلاس کسی تشریح کا محتاج نہیں اور ان کی سب سے بڑی دولت شاید وہ نسبی غرور ہے جو کبھی کبھی خود فراموشی کے عالم میں اُن کی سوکھی ہوئی شریانوں میں زندگی کا خون دوڑا دیتا ہے۔ اس ڈرامے میں ایک طرف افلاس کی جاں گداز مصیبت اور اس مصیبت سے پیدا ہونے والی گوناگون کیفیتوں کی آئینہ داری کی گئی ہے تو دوسری جانب اُس نام نہاد اور مصنوعی ہمدردی کا مضحکہ اڑایا گیا ہے جو ہمارا بورژوا تمدن افلاس کے ساتھ روا رکھتا ہے۔ آنند صاحب اگر اسی انداز میں لکھتے رہے تو وہ ترقی پسند ادب میں بیش بہا اضافہ کریں گے۔

ادبِ لطیف (جون)

بچپن۔ از کرشن چندر

الھڑ دیہاتی لڑکیوں اور بیکار شہری نوجوانوں کے کامیاب چربے اتارنے کے بعد اب کرشن چندر کے تخیل نے بچپن کی معصوم کیفیتوں کا جائزہ لینا شروع کیا ہے۔ زیرِ نظر افسانہ اس نئی روش کا ایک بہت اچھا نمونہ ہے۔ ننھے رفیع کے نازک احساسات اور اُلجھے ہوئے طرزِ عمل کا عکس اُتارنا ایک اچھے ماہرِ نفسیات کا کام تھا۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ کرشن چندر اس میں خوب کامیاب ہوئے ہیں اور پھر رفیع اور نیلا کا مکالمہ کس قدر دل آویز ہے۔ اور رفیع کے مردانہ غرور کا مدوجزر اور آخر کار نیلا کے آنسوؤں کی تاب نہ لا کر آدم کے ایک سچے بیٹے کی طرح اپنے سارے ہتھیار ڈال دینا اور اپنی تمام پونجی جو تیتریوں کے تین سو پروں پر مشتمل تھی۔ حوا کی بیٹی نیلا کی نذر کر دینا، اس سے بھی خوب تر ہے۔ اور آخر کار جب زمانہ اور شباب دونوں ایک باہمی سازش سے ان کے بچپن کے خوابوں کو پریشان کر دیتے ہیں اور وہ ایک دوسرے سے بچھڑ کر ایک مدت کے بعد شاہ راہِ زندگی پر پھر ملتے ہیں تو نیلا جوان ہو کر ماں بن چکی ہوتی ہے اور رفیع ——— تخیل پرست رفیع

"باغ میں ایک سیب کے درخت کے نیچے کتاب کھولے بیٹھا تھا کہ کوئی اس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا۔ ہاں یہ نیلا ہی تھی، سرو کی طرح بلند قامت۔ شباب کی رعنائیوں کا مرقعِ جمیل، اس کے لبوں پر ابھی معصوم سی مسکراہٹ تھی جو شاید سورج کی کرنوں سے مل کر بنی تھی اور اس کی گود میں ایک ہنستا ہوا بچہ تھا ..... یہ تمہارا لڑکا ہے نا کتنا خوبصورت ہے، اس کا کیا نام ہے؟ .... نیلا نے کانپتی ہوئی آواز میں آہستہ سے کہا، ہاں، اس کا نام ہے یہ بھی (رفیع) محمد رفیع، ..... کتنی ہی دیر رفیع خاموش کھڑا رہا نہ اس کے پاؤں تلے زمین تھی اور نہ سر پر آسمان وہ خلا میں گھوم رہا

تھا، نہایت تیزی سے گھوم رہا تھا، پھر یکایک ایک جھٹکے کے
ساتھ وہ بچپن کی زندگی میں لوٹ آیا۔ وہ چھوٹا سا ننھا، ننھا رفیع
نیلا کے ساتھ بھاگ بھاگ کر تیتریاں پکڑ رہا تھا۔ نیلا اور وہ سنبلو کی
شاخوں پر جھکے سنبلو کھا رہے تھے۔ ندی کے کنارے اونچے
تنگ پر جھولا جھول رہے تھے۔ گڈریے بانسریاں بجا رہے تھے
..... براتی بنے ہوئے تھے اور نیلا اس کی دلہن .....
نیلا کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے لیکن رفیع نے نہایت ہمت
سے کام لے کر اپنے آنسوؤں کو اپنی آنکھوں میں روک لیا۔
اور نگاہیں اٹھا کر گھاٹی سے آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔ جہاں
سفید سفید چمکتے ہوئے بادل ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے
ہوئے جا رہے تھے۔" دیکھئے یہاں مصور اور ادیب باہمد گر
اس طرح مل گئے ہیں کہ ایک کو دوسرے سے جدا کرنا کتنا دشوار ہے
زبان کے لحاظ سے اس افسانے میں چند خامیاں بھی ہیں۔ کرشن چندر
جیسے بلند پایہ افسانہ نگار کو اس بارے میں زیادہ احتیاط سے کام لینا
چاہیئے۔ وہ ہمارے بہت سے لکھنے والوں سے بہتر زبان لکھتے ہیں
اور ان کا طرزِ بیان بے حد شگفتہ ہوتا ہے لیکن کہیں کہیں وہ بلا تکلف
پنجابی الفاظ استعمال کر جاتے ہیں اور بعض اوقات فقروں کی ساخت
پر نظرِ ثانی نہیں کرتے۔ مثلاً ایک جگہ لکھا ہے "وہ چنبیلی کے پھولوں
کے پودوں سے پھول توڑ رہا تھا"۔ یہی فقرہ یوں لکھا جا سکتا تھا کہ "وہ
چنبیلی کے پھول توڑ رہا تھا" یا اس طرح کہ "وہ چنبیلی کے پودوں سے
پھول توڑ رہا تھا"۔ یہ کہنا کس قدر طویل اور غیر ضروری ہے کہ "وہ چنبیلی
کے پھولوں کے پودوں سے پھول توڑ رہا تھا"۔ اسی طرح ایک جگہ
جھولے کی بجائے پینگ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ پینگ پنجابی میں
ہی چیز ہے جسے اردو میں جھولا کہتے ہیں۔ البتہ اس جھکولے کو جو جھولنے
لا لیتا ہے اردو میں پینگ کہتے ہیں اور پینگیں بڑھانے کا محاورہ
ی سے بنا ہے مگر "پینگ" رسی کی ہو یا کسی اور چیز کی جھولے کے معنی
ر اسمِ جامد کے طور پر اردو میں جائز نہیں ہے۔ امید ہے کہ جناب
ن چندر اپنی آئندہ تحریروں کو ان چھوٹے چھوٹے نقائص سے محفوظ
ر گے۔

زمانہ (جون)

حضرتِ اکبر الہ آبادی۔ یہ قیمتی مضمون جو اکبر مرحوم
کی زندگی کے چند دلچسپ پہلوؤں پر روشنی ڈالتا ہے۔ مرحوم کے
فرزند سید عشرت حسین صاحب کلکٹر، یو۔ پی نے لکھا ہے اور خوب لکھا
ہے۔ اکبر مرحوم کی وضعداری تو ان کے کلام سے عیاں ہے۔ لیکن اس
مضمون کے مطالعے سے اس وضعداری کی بہت سی مثالیں سامنے آ
جاتی ہیں۔ زندگی درحقیقت چھوٹے چھوٹے واقعات ہی سے بنتی ہے۔
اور ان ہی کے آئینوں میں جھلکتی ہے۔ اس لئے ہمیں اکبر کی بولتی چالتی
تصویر ان منتشر واقعات میں ایسی صاف نظر آئی کہ اس سے پہلے نظر نہ
آئی تھی۔ اس مضمون میں ایک خط بھی شامل ہے جو عشرت صاحب کی
شادی کی تقریب پر لسان العصر نے اپنے ایک عزیز دوست کو لکھا تھا
ان صاحب نے شادی پر ناچ کا ہونا ضروری قرار دیا تھا۔ جواب میں
فرماتے ہیں "مجنت نامے کے مضامین نے دل کو باغ باغ کر دیا۔ میرے
ایک عزیز جو دبی زبان سے اسی بات کے لئے اشارے کر رہے تھے
آپ کے خط کو سن کر پھڑک گئے۔ فرمانے لگے کہ بس یہ شخص آپ کا
سچا محب اور زندہ دل دوست ہے ..... بیس سال سے
زیادہ ہوئے میں نے عقل اور مصلحت سے فتوے حاصل کر کے
ناچ مجرے دیکھنا چھوڑ دیا ..... آپ کہیں گے کہ حضور لکچر
دے رہے ہیں یا یارانِ بے تکلف کو خط کا جواب لکھ رہے ہیں
اچھا صاحب۔ لکچر موقوف۔ کان پکڑتا ہوں۔ ہزار بار توبہ۔ اب
کفر نہ بھانکوں گا۔ پوری اندر سبھا پر ایمان لایا ..... بھائی صاحب
چیت کا مہینہ۔ آغاز بلکہ عین موسم بہار ہوگا۔ کیسے کیسے وضعدار
نوجوان ہمارے دوست رونقِ محفل ہوں گے۔ عشرت سلمہٗ زرد
جوڑا پہنے ہوئے زینتِ مسند عروس ہوں گے۔ دل تو یہ چاہتا ہے
کہ ایک شوخ طرار پرکالۂ آتش یہ گاتی ہوئی سامنے آئے۔ ؎
ہے جلوۂ تن سے در و دیوار بسنتی ؛ پہنے ہے جو پوشاک سراپا بسنتی
آپ گھوڑے سے ہیں اجلاس سے مولوی برکت اللہ صاحب
منبر سے گر پڑتے لیکن ..... سٹرک خام ہے نیز ریاست ملتے
ہیں ..... پور اشاعرانہ اور گورنمنٹی زور لگا کر بھی تیس اکّے اور
چند پالکیوں اور دس بارہ ہاتھیوں سے زیادہ کا انتظام ناممکن ہے
بہ مجبوری خاص خاص اعزہ اور احباب کو ساتھ لوں گا ... اب
فرمایئے کیا مزا ہے کہ جنت کی قمریاں یک ڈنڈیوں پر پھدکتی پھریں
ہم لوگ خود سفر کئے ہوئے کچھ آرام کریں گے۔ پھر بارات جائے گی

پھر نکاح ہو گا۔ بیچاری گرمیوں کی ماری لیلائے شب کی پیاسا ہی
کیا۔ چار انگڑائیاں لیں اور بھور..... بتلائیے کیا وقت ملے
گا کہ اطمینان سے خنجر نگاہ کے زخمی ہوں اور قاتل کو داد دیں۔
آپ کا گذارا نسر میں ممکن ہے کہ اس کام کی فرصت نکال لیں۔
لیکن جب تک مرگِ انبوہ نہ ہو کیا مزا ہے..... لوگ کہتے
ہیں اور سچ کہتے ہیں کہ نوشہ میاں تو رسم رسوم اور خیالِ عروس
اور سہرے کے سلسلے میں بسر کریں گے۔ باراتی بے چارے کیا
کر کے رات گذاریں گے؟ میں یہ کہوں گا کہ نفلیں پڑھو، تہجد
ادا کرو اور اس میں بدشگونی سمجھو تو گپ اڑاؤ اور شعر خوانی کرو۔ آپ
کے ولولے حق بجانب۔ آپ کی محبت کا میں معترف لیکن
اس کو دوسرے وقت پر اٹھا رکھئے۔ بہت سے مواقع ہیں
ہم سے آپ سے اس باب میں گفتگو ہو جائے گی"

آپ نے دیکھا۔ یہ بزرگ کہاں پہنچے ہوئے تھے۔ ایسے زندہ دلوں کے ہوتے ہوئے ہم کیونکر کہہ سکتے ہیں کہ "گلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو"۔ اور زبان و بیان کی کرامت آپ نے ملاحظہ فرمائی۔ آج یہ بات کسے نصیب ہے۔

کیا قومی زبان بنائی جاسکتی ہے۔ ایک خیال انگیز مضمون ہے جسے ح۔ ی۔ ع صاحب ایم اے نے لکھا ہے۔ درحقیقت یہ زمانہ کے مستقل مضمون نگار "حق پرست" کے ایک مضمون کا جواب ہے۔ صاحبِ مضمون نے "حق پرست" کے اس نظریے کی تردید کی ہے کہ اردو صرف مسلمانوں کی زبان ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ ان کے بعض دلائل بہت وزن دار ہیں۔ ایک اور بات انہوں نے یہ کہی ہے کہ ہماری یہ کوششیں کہ زبان میں سے بعض قسم کے الفاظ نکال دیئے جائیں اور بعض شامل کر لئے جائیں کبھی کامیاب نہیں ہوں گی۔ کیونکہ زبان ایک قدرتی چیز ہے اور اس میں آورد اور تصنع سے کام نہیں چلتا۔ آخر میں انہوں نے ایک دو باتیں بہت صاف بیانی سے کی ہیں۔ اور زبان کی بحث میں اُن کا یہ قول ایک حد تک قابلِ توجہ ہے کہ

"اردو، ہندی، ہندوستانی کی بحث بالکل فضول ہے۔ پہلے
خدا کے واسطے دل ملائیے۔ پھر زبان ملائیے گا۔ جب تک دل نہیں
ملیں گے زبان نہیں ملے گی۔ زبان مختلف ہی رہے گی یہ کوشش
بالکل فضول ہے کہ پہلے زبان ایک کی جائے اُس کے بعد دل ملائے
جائیں۔ اس کوشش میں دل اور پھٹ جائیں گے اور نہ زبان ایک
ہوئی ہے اور نہ ہو گی"

ظاہر ہے کہ صاحبِ مضمون جوش میں بہت آگے چلے گئے ہیں۔ ہمارا ذاتی خیال یہ ہے کہ کم از کم وادیٔ سندھ اور وادیٔ گنگا و جمن کی زبان ایک ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ دونوں فریق یہ سمجھیں کہ جیت اسی بولی کی ہے۔ جو اپنے بازو پھیلا کر اپنی موہنی سے دوست دشمن سب کو رام کرے گی۔ اور جو بولی الگ تھلگ رہ کر اپنے نادان چاہنے والوں کے جھرمٹ سے نہیں نکلے گی۔ وہ آخر ایک دن اپنی حریف کے سامنے نیچا دیکھے گی۔

دلگداز (جولائی)

قصیدہ اور اردو ادب۔ ایک مختصر مگر جامع مضمون ہے جس میں گرجانندن صاحب نے اردو میں قصیدہ گوئی کی مختصر تاریخ بیان کی ہے۔ معروف قصیدہ گو شعراء کے کلام کے نمونے دیئے ہیں۔ اور آخر میں وہ اثرات گنوائے ہیں جو قصیدہ گوئی نے ہماری شاعری پر کئے۔ اس مضمون کا وہ حصہ خاص طور پر قابلِ مطالعہ ہے جس میں صاحبِ مضمون نے قصیدہ کا اثر مرثیہ پر دکھایا ہے۔ اس باب میں انہوں نے چند ایسے نکات بھی پیش کئے ہیں جن کی طرف عام طور پر ابھی تک توجہ نہیں کی گئی تھی۔ مضمون ہر لحاظ سے دلچسپ ہے۔ مگر اس قدر مختصر ہے کہ بحث کچھ تشنہ رہ گئی ہے۔

سب رس (جولائی)

محمد قلی قطب شاہ کی بارہ پیاریاں۔ یہ دلچسپ مضمون سید محی الدین قادری زورؔ کی علمی جستجو کا نتیجہ ہے۔ محمد قلی قطب شاہی سلاطین میں سب سے بڑھ کر عیش پسند اور خوش باش بادشاہ تھا اور شعر و سخن اور ادب کا نہایت اچھا ذوق رکھتا تھا۔ اس نے اپنے دیوان میں اپنی منظورِ نظر معشوقاؤں کا ذکر نہایت دل آویز پیرائے میں کیا ہے۔ یوں تو اس کے حرم میں بے شمار مہ جبینیں تھیں۔ لیکن ان میں سے بارہ انتخاب تھیں اور یہ بارہ کا عدد بارہ اماموں کی رعایت سے مقرر کیا گیا تھا۔ ان میں سے چند کے نام یہ ہیں۔ ننھی۔ سانولی۔ پیاری۔ موہن۔ محبوب۔ پدمنی۔ سندری۔ سجن۔ رنگیلی وغیرہ۔ صاحبِ مضمون آخر میں لکھتے ہیں۔

"شباب کی رنگا رنگیوں اور جذبات کی جولانیوں کے اظہار میں اس کا
قلم غیر معمولی قدرت رکھتا تھا اور یہ قدرت تخیلی یا فرضی عشق عاشقی

سے پیدا نہیں ہوسکتی۔ محمد قلی صحیح معنوں میں اس میدان کا مرد تھا اس کے رفیع الشان محل نہ تھے بلکہ اصل میں بین قومی حسن و نغمہ کی وسیع اور آراستہ و پیراستہ نمائش گاہیں تھیں۔ ان میں کئی ملکوں، کئی مذہبوں اور ہر وضع و قطع کی نازنینیں آزادی اور بے تکلفی کے ساتھ اپنے حسن و جمال کی آرائش و زیبائش میں مصروف و منہمک اور عشق و مستی کی عجیب و غریب کیفیتوں اور جوانی و رعنائی کے بے پناہ جذبات کے مظاہرے کرتی رہتی تھیں"۔

یہ مضمون اس دفعہ ہماری "دنیائے ادب" کی زینت ہے۔

کلیم (مئی و جون)

جدید رسم الخط از حکیم آزاد انصاری۔

جناب آزاد انصاری سے ناظرین ادبی دنیا اچھی طرح آشنا ہیں لیکن ہم سب انہیں ایک شاعرِ نغز گو کی حیثیت میں جانتے ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ وہ ایک اعلیٰ درجے کے محقق اور ماہر رسم الخط بھی ہیں زیرِ نظر مضمون ایک نہایت بلند پایہ اور سیر حاصل مقالہ ہے جس میں حکیم صاحب موصوف نے رسم الخط کی تاریخ پر ایک حکیمانہ نظر ڈالی ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ انسان نے اوّل اوّل اپنے مطلب کی ادائی کے لئے کس طرح نقوش سے کام لیا۔ پھر ان نقوش نے ترقی پا کر مصر قدیم میں ایک تصویری رسم الخط کی صورت اختیار کر لی۔ تصویری رسم الخط ارتقاء کی منزلیں طے کرتا ہوا فنیقی قوم کے ہاتھوں میں آیا اور اُن سے یونانیوں نے حاصل کیا اور اسے دائیں جانب سے لکھنے کی بجائے بائیں جانب سے لکھنا شروع کیا۔ اسی زمانے میں یہ رسم خط دو اقسام پر منقسم ہوا۔ (۱) مشرقی اور مغربی۔ مشرقی کی ترقی یافتہ صورت عربی رسم الخط اور مغربی کی رومن ہے لیکن ان کی اصل ایک ہے۔ حکیم موصوف نے بہت سی مثالیں دے کر اور ایک ایک حرف کو لے کر یہ ثابت کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے کہ در اصل دونوں قسم کے حروف ایک ہی ماخذ سے تعلق رکھتے ہیں اس کے بعد رومن اور عربی خطوں کے محاسن اور معائب پر ایک مفصل اور دیانتدارانہ بحث کی ہے۔ جو اس سارے مضمون کی جان ہے اور ہم نے اس سے پہلے ایک مضمون میں حروف کی نشست و ساخت اور رسم الخط کی آسانیوں اور دقتوں پر اس سے بہتر بحث کہیں نہیں دیکھی۔ اس کے بعد خط نسخ سے گذر کر نستعلیق کا ذکر کیا ہے۔ اور پھر نستعلیق کے حسن و خوبی کا تذکرہ کرتے ہوئے اُن مشکلات کو شمار کیا ہے جو اس کے ٹائپ اور ٹائپ رائٹر کے رواج میں پیش آ چکی ہیں اور آخر میں نستعلیق کے ان معائب کو رفع کرنے کی چند صورتیں پیش کی ہیں اور یہاں آ کر جناب آزاد نے ایک اجتہادی غلطی کی ہے۔ وہ یہ ہے کہ نستعلیق کا ٹائپ بناتے بناتے انہوں نے اس خط ہی کو یکسر بدل کے رکھ دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رومن کی طرح نستعلیق کے بھی دو رسم الخط ہونے چاہئیں۔ لکھنے کا الگ اور چھپنے کے لئے الگ۔ لکھنے کا تو جیسا اب ہے ایسا ہی ہو اور چھپائی کے لئے ہر حرف جدا جدا ہو اور چند حروف صحیح رومن سے لے لئے جائیں مثلاً K اور D وغیرہ اور چند حروف علت بھی مثلاً U۔ O۔ E۔ A اور موجودہ حروف میں بھی تبدیلیاں کی جائیں جن سے وہ دیدہ زیب اور خوشنما بھی ہو جائیں اور جگہ بھی کم گھیریں مثلاً ب پ ت کو یوں لکھا جائے T۔ T: Ṫ T̈۔ ان تجاویز کی بھی آپ نے مختلف چار صورتیں پیش کی ہیں اور چند فقرے اپنے تجویز کردہ رسم الخط میں لکھ کر بھی دکھائے ہیں۔

مثلاً "کہ عشق آساں نمود اول و لے افتاد مشکلہا" کو اس طرح پر لکھا ہے

(۱) کہ ۴ا ۳ق آ۳ا ۳ن ۱م ودا وال و!ل ۹ ۸فن ۳ن اد م۴ ۳ک !ل۱۴

(۲) کہ ع اشق آسانہ نزام ودا اق ال ہ وال ۹ ۸ فتہ ادم ۴ ش ک بل ۱۴

اب ناظرین خود اس بات کا فیصلہ کر لیں کہ وہ اس خط کو محض اس لئے قبول کرنے کو تیار ہیں کہ یہ آسانی سے ٹائپ اور ٹائپ رائٹر کے ذریعے سے چھاپا جا سکتا ہے۔ ہمارے نستعلیق کے مقابلے میں یہ مجوزہ خط اس قدر طویل اور غیر مربوط ہے کہ اس کے رواج کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہم جو نستعلیق کے مقابل نسخ تک کو گوارا نہیں کرتے ایسے خط کو کیوں کر قبول کر سکتے ہیں۔ نسخ اور نستعلیق میں کوئی اصولی فرق نہیں ہے۔ فرق صرف حروف کی کاٹ کا ہے۔ باقی تمام قاعدے اور اصول ایک ہیں اور نسخ میں ٹائپ بھی موجود ہے اور ٹائپ رائٹر بھی پس اگر ہم ٹائپ اور ٹائپ رائٹر کے بغیر اپنا گذارہ نہ کر سکیں گے تو نسخ ہمارے پاس موجود ہے۔ اس سے کام چلا لیں گے لیکن ہم جو نستعلیق کے حسن کے قتیل ہیں اور محض اس حسن کی وجہ سے نسخ کو قبول نہیں کرتے حکیم صاحب کے مجوزہ خط کو کیسے قبول کر لیں گے۔ مانا کہ ہمارا رسم الخط بے عیب نہیں۔ لیکن کونسا ایسا رسم الخط ہے جس میں ہمارے نستعلیق سے زیادہ عیب نہیں ہیں۔ مضمون کے مذکورہ حصے سے ہمیں سخت

اختلاف ہے لیکن علمی حیثیت سے یہ مضمون بے حد کارآمد اور دلچسپ ہے۔

معارف (جون ۱۹۳۹ء)

تہنید۔ از علامہ سید سلیمان ندوی۔

دوسری زبانوں کے الفاظ ہندوستانی زبان میں سے آنا تہنید کہلاتا ہے۔ اور یہ عمل ہماری زبان کی ترقی کے لئے بہت مفید ثابت ہوا ہے۔ فاضل مضمون نگار نے بہت سی مثالیں ایسے الفاظ کی دی ہیں جو غیر زبانوں سے اردو یا ہندی میں آئے۔ یہاں آکر انہوں نے اپنے معنے اور بسا اوقات اپنی صورتیں بھی بدل لیں اور پھر یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ ایک مثال سنیئے "عربی میں فلک

> آسمان کو کہتے ہیں چونکہ نجوم اور جوتش نے ہم کو یہ یقین دلایا ہے کہ ہماری ساری مصیبتیں آسمان کی گردش کا نتیجہ ہیں۔ اس لئے ہم نے فلک سے فلاکت بنایا اور اس سے فارسی کی ترکیب دے کر فلاکت زدہ (فلاکت کا مارا ہوا) کہا۔ اور پھر اس کو عربی لفظ سمجھ کر اس کا مفعول مفلوک بنا لیا اور عربی اضافت دے کے مفلوک الحال کہہ دیا۔ حالانکہ اس کے ان معنوں کو عرب جانتا بھی نہیں۔"

غرضکہ اس قسم کی بہت سی مثالیں دے کر علامۂ موصوف نے ہندوستانی زبان کی اُس سب سے بڑی خوبی کو ظاہر کیا ہے جسے ہم "اپنا لینا" کہتے ہیں۔ اور یہ سلوک صرف عربی فارسی سے نہیں ہوا بلکہ انگریزی پرتگالی اور سنسکرت سے بھی اسی طرح روا رکھا گیا ہے اور "یہ ہر خود مختار زبان کا حق ہے اور کسی کی قدرت نہیں کہ وہ اس سے اس کے اس حق کو چھین سکے"۔

ہمارے ان فاضل دوستوں کو جو اردو کے بعض مروّج الفاظ کو اُن کے عربی فارسی یا سنسکرت کے معانی یا ملفظ کا پابند کرنا چاہتے ہیں۔ ان مفید مضامین کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیئے۔

نگار (جولائی)

اشتراکیت اور اس کا مستقبل

ہمارے ہاں آج کل اشتراکی ہونا فیشن میں داخل ہو گیا ہے۔ اگر آپ اشتراکی نہیں ہیں یا کم از کم اپنے اشتراکی ہونے کا جا و بے جا اعلان نہیں کرتے رہتے تو آپ فرسودہ اور تنگ خیال سمجھے جاتے ہیں۔ گلاب چند صاحب نے اس مختصر مضمون میں اشتراکیت اور اس کے متعلقات پر ایک چھچلتی ہوئی نگاہ ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ اشتراکیت کی نسبت ہم بہت سی غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں اور اگرچہ دنیا آہستہ آہستہ انفرادیت سے اشتراکیت کی طرف جا رہی ہے۔ لیکن ہر اشتراکیت روسی قسم کی اشتراکیت نہیں ہے اور نہ یہ ممکن ہے کہ نوع انسان سے انفرادیت کا جذبہ بیکسر محو ہو جائے۔ انہوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ فرد کی حیثیت قائم رکھے بغیر سوسائٹی کبھی ترقی نہیں کر سکتی بدقسمتی سے ہم ہر چیز میں مبالغہ چاہتے ہیں۔ اس لئے ہمیں آج انفرادیت سراسر ظلم و ناکامی اور اشتمالیت نوع انسان کی نجات کا واحد ذریعہ نظر آتی ہے۔ لیکن حقیقت شاید اس سے کچھ مختلف ہے۔ دنیا کے لئے اشتمالیت اور انفرادیت دونوں چیزیں ضروری ہیں "انسان نہ تو ایک مشین ہے اور نہ ایک خود رو پودا"۔ بہر حال مضمون بہت خیال انگیز ہے۔

صلاح الدین احمد

محمد قلی قطب شاہ اور اس کی بارہ پیاریاں

سلاطین قطب شاہیہ میں محمد قلی قطب شاہ ہی ایک ایسا بادشاہ ہے جس کا زمانہ زیادہ سے زیادہ امن و امان اور راحت و آرام سے گذرا۔ اور جس نے اپنی تمام زندگی عیش و عشرت اور بہجت و کامرانی میں گذار دی۔ مغل مورخوں نے قطب شاہیوں کے آخری یادگار ابوالحسن تاناشاہ کو بدنام کرنے اور شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی فتوحات کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے تاناشاہ کو بڑا عیاش اور رند بدمست مشہور کر رکھا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ سلطان محمد قلی کو عیاشی کے جو موقعے حاصل ہوئے تاناشاہ کو ان کا عشر عشیر بھی نصیب نہ ہو سکتا تھا۔

محمد قلی نے بچپن سے محل کے ناز و نعم میں پرورش پائی اور اگر وہ بھاگ متی والا قصہ صحیح ہے (جس کی رو سے بھاگ متی کی خاطر اس نے زبردست طغیانی کے باوجود رود موسیٰ میں اپنا گھوڑا ڈال دیا اور بعد کو اس جرأت کی پاداش میں محل سرا میں نظربند کر دیا گیا اور وہاں ملک ملک کی حسین دوشیزاؤں کو اس کے ساتھ چھوڑ دیا گیا تاکہ اس کا دل بہلائیں اور رقاصۂ محبوبہ کا خیال اس کے دل سے دور کر دیں) تو ظاہر ہے کہ عنفوان شباب کے ساتھ ہی وہ مہ جبینوں کے ماحول میں رہنے لگا جن میں سے ہر ایک اس پر جان و دل فدا کرنے کو تیار تھی۔

اس حسین و رنگین ماحول کے ثبوت خود محمد قلی کے کلام سے بھی دستیاب ہوتے ہیں۔ ہر تقریب میں اس کے اطراف خوبرویوں کا جمگھٹا رہتا اور رمضان اور محرم کے مہینوں کے سوا اس کی زندگی کے بہت کم لمحے ایسے ہوں گے۔ جب شاہد و شراب و نغمہ اس سے دور رہتے ہوں اتنا ضرور ہے کہ رمضان اور محرم میں وہ شراب قطعاً ترک کر دیتا تھا اور عیش و عشرت چھوڑ کر ایسا زاہد مرتاض اور متقی و پرہیزگار بن جاتا تھا کہ اس کے رند شاہد باز ہونے پر شاید شبہ ہونے لگتا۔ یہ اس کی طبیعت کا استقلال اور تربیت کی خوبی تھی۔

بھاگ متی کے متعلق تفصیل سے آیندہ لکھا جائے گا۔ لیکن اس کے علاوہ سلطان محمد قلی کی بیسیوں اور معشوقائیں تھیں جن میں سے حسب ذیل کے نام یا عرف اس کی کلیات میں بار بار دستیاب ہوتے ہیں۔

۱۔ ننھی ۲۔ سانولی ۳۔ کونلی ۴۔ پیاری ۵۔ گوری ۶۔ چھبیلی ۷۔ لالہ ۸۔ لالن ۹۔ موہن ۱۰۔ محبوب ۱۱۔ بلقیس زمانی ۱۲۔ حاتم ۱۳۔ ہندی چھوری ۱۴۔ پدمنی ۱۵۔ سندر ۱۶۔ سجن ۱۷۔ رنگیلی ۱۸۔ مشتری ۱۹۔ حیدر محل۔

ان بیسیوں مہ جبینوں میں بارہ ایسی ہیں جو خاص طور پر اس کی منظور نظر تھیں۔ کیونکہ محمد قلی بارہ اماموں کی رعایت سے ہر چیز میں بارہ کے عدد کا لحاظ رکھتا تھا۔ چنانچہ جب اس نے حیدرآباد کے جانب جنوب کی خوش منظر پہاڑی پر (جہاں اب قصر فلک نما واقع ہے) ایک عالی شان قصر محل کوہ طور کی تعمیر کی تو اس میں انھی دوازدہ آئمہ معصومین کی رعایت سے بارہ برج بنائے تھے۔ چنانچہ اسی محل سے متعلق اس نے ایک نظم بھی لکھی ہے جس میں ان برجوں کا ذکر اس طرح کرتا ہے "چونکہ ان بارہ برجوں پہ بارہ اماموں کی نظر عنایت ہے۔ اسی لئے ان پر ایمان کی تجلی جھلکتی رہتی ہے"۔ اس کا شعر ہے ؎

بارہ بروج پہ ہے بارہ امام کی دِشٹی تو اس اپر جھلکتا ایمان کا اجالا

بارہ پیاریوں کی تخصیص کے متعلق بھی اس کے کلام سے مستند شہادت ملتی ہے۔

شہر حیدرآباد کی تعمیر کے وقت محمد قلی نے کئی عالی شان قصر تعمیر

گئے تھے اور خاص کر اپنے لئے ایک رفیع الشان سات منزلہ محل بنوایا تھا جس کا نام خداداد محل رکھا تھا۔ اس محل کی آرائش و زیبائش کے متعلق اس کی ایک نظم اس کی کلیات میں موجود ہے (دیکھو صفحہ ۲۱۱) اس نظم سے معلوم ہوتا ہے کہ جب وہ اس محل میں آ کر رہا تو اپنے ساتھ صرف ان بارہ پیاریوں کو لے آیا تھا جو اس وقت اس کی منظور نظر تھیں۔ اس نظم کا ایک شعر ہے ؎

نبی صدقے بارا اماماں کرم تھے کر دیش ہم بارہ پیاریوں سوں پیالے

اسی طرح عید میلاد النبی کی ایک نظم (دیکھو صفحہ ۳۹) میں بھی اس نے ان بارہ مہ جبینوں کا پھر بارہ اماموں ہی کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

مبارک منج اچھو یو عید مولود پیغمبر ملے ہیں قطب سوں بارہ اماماں ہور نگاراں خوش

ان بارہ پیاریوں میں سے چند کی خصوصیتیں ذیل میں درج کی جاتی ہیں۔ سب سے پہلے ننھی قابل ذکر ہے۔ اس کی تعریف میں محمد قلی نے کئی نظمیں لکھی ہیں اور اکثر نظموں اور غزلوں میں اس کا ذکر بھی کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ:۔

ننھی کی جیسی حسین تو آسمانوں میں بھی نہیں۔ سرو اس کے قد کے مقابل کبھی نہیں آسکتا۔ اس نے مدن پھول کے رنگ کی ساڑی باندھی ہے جس کے کنارے عجیب و غریب موتی ٹنکے ہوئے ہیں۔ اس کی یاد کی مستی قطب شاہ کو چڑھی ہوئی ہے اور وہ اس کو رجھانے کی خاطر دوتارے پر عجیب تان بجاتا ہے۔

ایک دوسری نظم میں کہتا ہے:۔

اے سکھیو! میں ننھی کے پریم میں موتی بکھیر رہا ہوں، تم سمیٹ کر ان کو خوشی سے گوندھو۔ ننھی میرے ساتھ عشق کا داؤ کھیلتی ہے۔ اور اپنے چاند سے چہرے کر پر نئی بہار دکھاتی ہے۔ اے ننھی میں تیرے جسم کی خوشبو کا ذکر کروں یا تیرے راز کی کہانی بیان کروں کیوں کہ تیری خوشبو کی مہکاٹ عاشق کی روح کو مہکا دیتی ہے۔ خوشبو تیرے جسم سے اسی طرح مہکتی ہے جیسے ساونت کی بارش سے مہکتی ہو۔ تیری آنکھوں کی چک میں کاجل بہت سہانا نظر آتا ہے اور یہ تو اس لئے لگاتی ہے کہ رقیبوں کے منتر تجھ پر کام نہ کریں۔

ایک نظم میں ننھی کے ہنستے کھیلتے اور ڈھلتے ہوئے پیالہ پلانے کا ذکر کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑی ہنس مکھ ظریف اور حاضر جواب تھی وہ شراب کی صراحی ہاتھ میں لینے یا قطب شاہ کو پیالہ بھر بھر کر دینے کو پسند نہیں کرتی تھی اور چاہتی تھی کہ قطب شاہ زیادہ شراب نہ پئے۔ اس لئے طرح طرح سے ٹالتی رہتی تھی۔ اس کا ذکر سالگرہ کی ایک نظم میں بھی کیا ہے (دیکھو صفحہ ۱۵۸) یہ تو بعد کے اوصاف تھے۔ ابتدا میں ننھی کی کیا حالت تھی اور بادشاہ نے اس کو ننھی کا لقب کیوں دیا تھا۔ اس کا علم ان دو نظموں سے ہوتا ہے جو صفحات ۲۲۸ تا ۲۳۱ میں درج ہیں جس میں وہ کہتا ہے کہ:۔

اے نازک ننھی تو ابھی محبت سے ناواقف ہے۔ تیری آنکھیں کاجل کی وجہ سے چمکتی ہیں لیکن تو نہیں جانتی کہ یہ کیا جادو جگا رہی ہیں۔ تیرا دل عشق و عاشقی کی طرف بھی مائل نہیں نہ تو شیشہ و پیالہ میں شراب بھرتی ہے اور نہ میری عرض مانتی ہے لیکن مجھے تجھ سے آس ہے اگرچہ تو دل لگانے کے طریقوں سے ناواقف ہے۔ لیکن میرا معشوق تو ہے۔ تجھے اپنے بچپن کے کھیلوں کا مول نہیں معلوم نہ یہ جانتی ہے کہ تیرے ہونٹوں میں آب حیات ہے۔ اس لئے تو منہ سے صاف صاف بات نہیں کرتی۔ سچ تو یہ ہے کہ تجھے ابھی اپنی قیمت معلوم نہیں۔ تجھے چاہیئے کہ قطب زماں کو جانے، محبت کی باتوں کو پہچانے اور عشق کی سیوا کرے تو کب تک اسی طرح اپنے کو کھینچتی رہے گی۔

ایک اور نظم میں محمد قلی نے ننھی کے متعلق لکھا ہے کہ:۔

جب چمن میں ننھی محو خرام ہوتی ہے تو شرم کے مارے آنچل ڈال لیتی ہے۔ معلوم نہیں کہ اس ننھی ڈالی پر ابھی سے شباب کے پھل کیوں لگ گئے۔ جب وہ غصہ یا ناز سے خط سرمہ کے اشارہ سے بات کرتی ہے۔ اور اس کے ہونٹ عرق آلود ہو جاتے ہیں تو دل چاہتا ہے کہ اس کو مگن دیکھوں۔ میری محبت کے نونہالوں میں سے ایک کو اچھے پھل رتن لگے ہیں۔ اے خداوند میرے باغ کا ایک سرو ہے اس کی حفاظت کر۔ اس کی بہشتی خوشبو سے جگ کے تمام پھول کھلتے ہیں۔ اس کی خوشبو خطا اور ختن بھی نہیں پا سکتے۔ اے ننھی تیرے چہرے سے سب خوبرویوں کو روشنی ملی۔ تیرے چہرے کو زیور و جواہر کی کیا ضرورت! جب تو چاندنی میں نکلتی ہے تو چاند چھپ جاتا ہے۔ اور تارے آسمان پر سے تجھ پر نثار ہونے کے لئے آتے ہیں۔ میں نہیں جانتا کہ تو کیسے نور سے پیدا ہوئی ہے۔ سب پرند تیری چکا چوند روشنی کے لئے اپنا اپنا وطن چھوڑ آئے ہیں۔

تو غصہ سے کیوں میری طرف بھوؤں کی کمان چڑھا کر دیکھتی ہے

تجھے تو چاہیے کہ ناز و غمزے کے ساتھ مجھے اپنے ہونٹوں کا بوسہ

دے۔"

(۲)

کلیات میں نہمی کے بعد سانولی کا ذکر زیادہ ملتا ہے۔ اس کے متعلق محمد قلی نے لکھا ہے کہ میری سانولی من کی پیاری نظر آتی ہے۔ کیونکہ وہ رنگ روپ میں بالکل کونلی عورت ہے سب سہیلیوں میں اس کا قد ایسا بالا ہے کہ معلوم ہوتا ہے سرو کو اس پر سے نثار کر دیا گیا ہے۔ جب وہ سکھیوں کے ساتھ عشق کا کھیل کھیلتی ہے تو اس کے چہرے کی روشنی میں چاند ذلیل و خوار نظر آتا ہے۔ کوئل اس کے بولوں کے مقابلے میں ہاری ہوئی نظر آتی ہے۔ اس کی اچھی چال سب کے دل کو بھاتی ہے اور وہ اپنے ساتھیوں میں ایک نادر پھول نظر آتی ہے۔ اگرچہ سکھیوں نے اپنے چہرے کو طرح طرح سے غازہ لگایا اور اپنے جسم کو رنگین بنایا لیکن اس کے قدرتی رنگ کی بات کسی عورت میں نہیں آتی۔

دوسری نظم میں لکھا ہے:۔

سانولی پیاری نے اپنے سبز رنگ میں نزاکت دکھا کر ہمارے دل کو موہ لیا۔ اس کے ہونٹوں پر پان کی رنگیلی دھڑی ایسی سہانی معلوم ہوتی ہے کہ دنیا کی تمام رنگینیاں اس پر ریجھ جاتی ہیں۔ جب وہ ہنستی ہے تو اس کے کنول جیسے منہ سے موتی جھڑتے ہیں اور ان موتیوں سے عالم جگمگنے لگتا ہے۔

تیسری نظم میں لکھتا ہے کہ:۔

جب سے اے سانولی تجھ پر نظر ہے ہوش و حواس گم ہیں اور بے خبر ہو گیا ہوں۔ جب تو اپنی شوخ آنکھوں سے ناز و غمزہ کرتی ہے تو میرا رواں رواں اس سے متاثر ہو جاتا ہے۔ جب تو ناز سے ہنستی ہے تو تیرے دانتوں کی چمک چاند کی طرح جھلکتی ہے۔ تیرا سرو جیسا قد جب محو خرام ہوتا ہے تو تیرے بالوں کا لمبا جوڑا چنور کا کام کرنے لگتا ہے۔ جب تو لباس پہن کر صحن میں نکل آتی ہے تو تیرے چمکدار کپڑوں سے آسمان روشن ہو جاتا ہے۔ جب تو موتی کے رنگ کی نیم تنی پہنتی ہے تو مجھے ایک بہشتی حور نظر آتی ہے۔ قطب شہ تیری نزاکت سے ناواقف نہیں۔"

(۳)

سانولی کے بعد محمد قلی کونلی کی تعریف میں رطب اللساں ہے۔ وہ لکھتا ہے کونلی اپنے ہاتھ میں پیالہ لے کر کھڑی ہے اور اتنی دُبلی پُتلی ہے کہ ہوا سے ہل رہی ہے۔ وہ بالوں میں پھول جاتی ہے اور چوٹی میں دونا و بالا باندھتی ہے۔ اپنے کونلائے ہوئے چہرے پر وہ اپنی بھوؤں کو اس طرح چڑھاتی ہے کہ نورانی معلوم ہونے لگتی ہے۔ اگرچہ بظاہر شرم و ناز سے کھنچتی کھچاتی کھڑی ہے لیکن آنچل کے اندر سے اپنی آنکھوں کی چنچل پتلیوں کو نچا رہی ہے۔ اس کے جسم کے رنگ سے نورتن کو روشنی ملی ہے اور اس کے گلے میں چاند سورج کے حمائل بنا کر ڈالے گئے ہیں۔

دوسری نظم میں لکھتا ہے:۔

اے کونلی تیرا قد دیکھ کر چمن کے سرو اشارے کرنے لگتے ہیں۔ تیرا قد باغ فردوس کے لئے بھی باعث زینت ہے۔ میں نے اپنی پلکوں کو تکیے بنا کر رکھا ہے تاکہ اے ہندی پتلی تو میری آنکھ میں آکر آرام کرے۔ تیرے دونوں ہونٹ ایسے رنگیلے ہیں کہ یاقوت نے اُن سے رنگ مانگا اور عقیقوں نے یمن میں اُن سے بھیک لی۔ تیری باریک کمر کے عشق میں میں بال کی طرح باریک ہو گیا ہوں۔ یہ اتنی باریک ہے کہ پیرہن کا کوئی تار اتنا باریک نہ ہوگا۔ دکھن کی اس کونلی سکی کو دیکھ کر میری جتنی کالی اور گوری سہیلیاں تھیں میں ان سب کو بھول گیا۔

تیسری نظم میں لکھتا ہے کہ:۔

اے اچھی پیاری جب تو نظربازی کرنے کے لئے آنکھ سے آنکھ ملا کر کھڑی ہوتی ہے تو میرے لئے نظر کا نا دشوار ہو جاتا ہے۔ تو کندنی رنگ کی ایک پتلی ہے۔ جس کا روپ کونلا ہے۔ تیری گلابی آنکھوں میں سمندر موجیں مارتا رہتا ہے اور تیرے سورج سے گالوں میں دانت نورتن کی طرح جڑے ہوئے ہیں۔ تو بالے بال زنگار رنگ اور چنچل ہے۔ خوبرویوں پر راج کرنا تجھے سجتا ہے اے گلابی آنکھ والی سہیلی تو میرے دل کی پیاری ہے۔

ایک اور نظم میں لکھتا ہے کہ:۔

یہ شگفتہ چنچل پھر میرے یہاں سبز آنچل اوڑھے اور پھولوں کی کلغی لگائی ہوئی آئی۔ اس کی الھڑ چال سے شراب کا خمار اور

آنکھوں میں رنگ کے ڈورے نظر آرہے ہیں۔ اس حسین کی محبت اور اس کے پاؤں کی جھنکار دل کے لئے امید، تن کے لئے عیش اور کان کے لئے ذوق کا باعث ہے۔ وہ گالی دیتی ہے اور دکھ سے کاری ہو کر گھات کرتی اور لاکھ خوشامد اور لوچ سے دروازے میں مسکراتے آتی ہے یہ سب میں ہوشیار عورت ہے کیونکہ بھید کو جانتی عشق کو پہچانتی، اور اپنے گھر میں تخت پر بیٹھتی ہے

(۴)

پیاری بھی محمد قلی کی نہایت چہیتی تھی لیکن وہ اپنے حسن و نزاکت پر اتنی مغرور تھی کہ ہمیشہ محمد قلی کو ترساتی اور ستاتی رہتی تھی اور وہ ہمیشہ اس کو منانے کی فکر میں رہتا چنانچہ کہتا ہے کہ:

اے سکھیو تم آج جا کر پیاری کو سمجھا منا کر لے آؤ کیونکہ تمام عشوہ طرازوں کا تاج اسی کے سر سجتا ہے۔ اس سے کہو کہ قطب شہ نے اپنے مکان کو بہت ہی زیبائش و آرائش سے سنوارا ہے۔ لیکن تیرے بغیر گذارنا مشکل ہے۔ اگر تجھے عشق ستاتا ہے تو آ اور دیوانہ بنا لے کیونکہ یہاں تیرا ہی راج ہے۔ تیرا لباس حسن ایسا عجیب ہے کہ اس کے ساتھ یہ عشوے تجھے زیب دیتے ہیں تو اپنے روپ کی وجہ سے شاہِ خوباں ہے۔ اس لئے سب تجھے خراج عشق ادا کرتے ہیں۔ جس وقت میں تیرے چہرے کا نور دیکھتا ہوں تو وہ ایک لمحہ میرے لئے سو برس کی عشرت کے برابر ہے

دوسری نظم میں کہتا ہے:

اے پیاری تو مجھ سے غرور نہ کر۔ جب یہ جوانی چلی جائے گی تو غمیدہ ہو جائے گی یقین جان کہ یہ بات دنیا میں مشہور ہے کہ ٹوٹے ہوئے موتی کا مول کم ہو جاتا ہے۔ جوانی اور جوبن اسی لئے ہے کہ اپنے سائیں کے لئے باعثِ عیش ہو۔ تو اپنے دل میں سائیں کی محبت قائم رکھ کیونکہ تیری ہی وجہ سے اس کا عیش ہے۔ جب تو عشوہ و ناز کے ساتھ سنگھار کر کے آتی ہے تو تیرے چہرے پر پسینے کی بوندیں اسی طرح بھلی معلوم ہوتی ہیں جس طرح پھول پر شبنم۔ تو اپنی شراب حسن سے سکھیوں کو فیضیاب کرتی ہے اور تمام خوبرویوں میں اپنا علم سرفرازی بلند رکھتی ہے۔

دوسری نظم میں یوں لکھا ہے:۔

اے پیاری تیرے بچھڑنے کی وجہ سے مجھے راتوں کو نیند نہیں آتی تجھے قدرت نے ایسا اچھا گھڑا ہے کہ تیرے بغیر مجھے ایک گھڑی بھی محبت نہیں بھاتی جو دل سے تیرا عاشق ہے اس کو رات اور دن کچھ بھی سجائی نہیں دیتا۔ تیری یاد کچھ اس طرح لگی ہوئی ہے کہ پھر کچھ بھی یاد نہیں آتا۔ تیرے بیمار محبت کا علاج لقمان بھی نہیں کر سکتا۔ جب تک تو اپنے ہونٹوں کا شربت نہ چکھائے گی تیرے عاشق کو کیونکر صحت ہو گی؟ یہ سچ ہے کہ تیرے ساتھ ایک رات رہنا میرے لئے سو راتوں کے برابر ہے۔ تو یہی کہہ کہ جب تو مجھے اپنے سیج پر نہ بلائے تو میں پھر کس کے سیج پر رہوں۔ تیری اس فرقت کی آگ میں میرا دل موم کی بتی کی طرح پگھل رہا ہے لیکن تو مصری کی طرح سخت اور گھٹ ہے اور خود کو ذرا بھی نہیں پگھلاتی تیری گفتار، تیز رفتار، تیرے تیور، طرح طرح کے ہیں تو جو کچھ برا بھلا کہنا چاہتی ہے کہہ لے لیکن مجھے ناامید نہ کر۔ تجھ کو خدا نے اتنی قدرت دے رکھی ہے۔ کہ قطب شاہ کو سمجھا سکتی ہے۔

ایک اور نظم میں لکھتا ہے:۔

اے پیاری تیرا بول مجھے مارے ڈالتا ہے: تیری ہر بات مجھے کٹاری نظر آتی ہے: تیری چوٹی ناگ کی طرح ہے جس کا زہر کڑوا ہوتا ہے تو کھیلتے وقت اپنی اس ناگ جیسی چوٹی کی وجہ سے سچ مچ سپیرا معلوم ہوتی ہے۔ میں بھنورے کی طرح تیرے اطراف پھر پھر کر تیری خوشبو لیتا ہوں کیونکہ اس خوشبو میں نرگس کی طرح خمار نہیں ہے۔ تیرے جسم سے صندل اور مشک کی خوشبو نکلتی رہتی ہے تو کانچ کی چوڑیاں پہنے ہوئی ہے اور ہاتھ میں اچھری باندھی ہے ٹھیکری اور کانچ میں وہ ہندوی گنوار کیا فرق کر سکتی ہے۔

پھر بگڑ کر لکھتا ہے۔

تیرے بول میں نمک نہیں اور تیرے ہونٹوں میں رس نہیں ہے۔
تیری چولی کسی ہوئی نہیں ہے اور تیری چوٹی اندھیرا ہے۔

(۵)

محمد قلی کی بارہ پیاریوں میں ایک گوری بھی ہے۔ اس کی نسبت ایک نظم میں لکھتا ہے:۔

گوری کا چہرہ حسن کی وجہ سے اس قدر سہانا معلوم ہوتا ہے کہ اس چاند سے چہرے سے شرما کر خود چاند نقاب پوش ہو جاتا ہے۔ وہ سرو جیسا قد نہیں بلکہ ایک کندنی درخت ہے جس سے سورج جیسی

روشنی نکلتی ہے۔ اے گوری تو رنگ اور رس کے باغ کی کلی ہے
اس لئے تیرے چہرے سے زندگانی کا پانی ٹپکتا ہے۔ تیرے رسیلے
ہونٹوں میں شراب بھری ہے۔ یہ عاشقوں کے دل کو جلاکر کباب بنا
دیتے ہیں۔
ان کو میں زلفیں کہوں یا تازہ سنبل جو تیرے پھول جیسے چہرے پر
اس طرح بکھرتی ہیں جیسے چاند پر ابر۔
تیری مستانہ چال سے ہاتھی شرماتے ہیں کیونکہ ان میں یہ ناز اور شوخی
نہیں۔ اے قطب نبی کے صدقے میں تجھے گوری ملی ہے تو اس
کے گلے میں باہیں ڈال اور اس کے ساتھ شراب پی۔
دوسری نظم میں کہتا ہے:۔
گوری عشق کی ایک رنگیلی تیلی ہے جو تمام خوبرویوں میں چھبیلی
نظر آتی ہے۔ تجھے پدمنیوں کے چہروں کی بزم آرائیاں زیب دیتی
ہیں۔ کیونکہ تو چاند جیسی صورت رکھنے والیوں میں سب سے زیادہ
رسیلی ہے۔ سولہ سنگار صرف تیرے جسم کی سج دھج کو دیکھ کر بنائے
گئے ہیں کیونکہ تمام مہ جبینوں میں تو ہی سب سے زیادہ حسین ہے
تیرے سر پر نور کا جلوہ برستا ہے تیری جیسی سندر سہیلی اور کوئی نظر
نہیں آئی۔ نبی کے صدقے میں قطب شاہ سے ایسی پیاری حسن کا
پیالہ پہن کر آملی۔
تیسری نظم میں کہتا ہے:۔
اے عشق کی تیلی تو میرے دل میں کھڑی ہوئی ہے اور عشق کی وجہ
سے تجھے تو پر لگ گئے ہیں۔ اس تیلی کو عشق و محبت پر ناز کرنا
زیب دیتا ہے۔ وہ عشق بازی کے لئے کمر باندھ کر تیار اور جوبن کے
پیالے اپنے ہاتھ میں لے کر کھڑی ہوئی ہے۔ اے پریم کی سہیلیو
بتاؤ کہ پریم کے باغ میں یہ پیاری سجتی ہے کہ نہیں۔ اے گوری
تیرے جسم پر سر تا قدم پھول ہی پھول ہیں۔ تو اپنی پرستش کرانے
کے لئے کھڑی ہے تو مجھے عشق کی محبتوں میں پیالہ پلا۔ مجھ پر
تیرے عشق کی بھٹی کی مستی چڑھی ہوئی ہے۔ نبی کے صدقے میں
مجھے ایسی گوری ملی ہے کہ سورج اور مشتری جس کے عکس ہیں
اسی طرح بارہ پیاریوں میں سے ہر ایک پر کئی کئی نظمیں لکھی ہیں جو
کلیات کے صفحات ۲۴۳ تا ۲۶۴ پر درج ہیں اور ان خاص پیاریوں کے
کے علاوہ اور دوسری پیاریوں پر بھی اس کی نظمیں موجود ہیں جو کلیات
کے صفحات ۲۶۵ تا ۲۸۱ پر شائع ہوئی ہیں۔
ان سب پیاریوں کی نظموں کے خاکے یا خلاصے پیش کرنا موجب
طوالت ہے اس لئے ہم یہاں اس کی صرف خاص خاص پیاریوں کے سراپا
اسی کی نظموں سے اخذ کر کے نہایت مجمل الفاظ میں پیش کر دیتے ہیں۔
۱۔ **ننھی**۔ بالا قد۔ چاند سا روشن چہرہ۔ چمکدار آنکھیں جسم میں ایک خاص
خوشبو۔ ابتدا میں نہایت شرمیلی اور سیدھی سادی لڑکی تھی جو بہت
جلد عنفوان شباب کو پہنچ گئی۔ ملنے اور بات کرنے سے جھجکتی
تھی۔ شراب سے نفرت کرتی تھی اور شراب کی صراحی اور پیالہ ہاتھ
میں لینے اور پینے پلانے سے ہمیشہ بچتی تھی۔ آنکھوں میں کاجل
لگاتی اور خط سرمہ کھینچتی تھی۔ مدن پھول کے رنگ کی ساری باندھتی
جس کے کنارے عجیب وغریب موتی ٹنکے ہوتے۔ وہ بعد کو بڑی
ہنس مکھ، ظریف، اور حاضر جواب ہو گئی تھی۔
۲۔ **سانولی**۔ بلند و بالا قد۔ دلفریب سانولا سلونا رنگ جس کی وجہ سے وہ
بہت نازک اور کومل معلوم ہوتی تھی۔ خوش آوازہ خوش خرام۔ موتی
کی طرح دانت۔ شوخ آنکھیں۔ زرق برق لباس پہننے والی۔
موتی کے رنگ کی نیم تنی زیب بر کرتی۔
۳۔ **کومل**۔ ایسی دبلی تپلی کہ ہوا سے ہلنے والی جسم کو شرم و ناز سے اتنا چرائے
رکھتی کہ کمر کے ہونے نہ ہونے کا شبہ ہوتا۔ دکنی مہ جبین۔ کندنی
رنگ۔ گلابی آنکھیں جو رنگین ڈوروں کی وجہ سے ہمیشہ خماری
نظر آتیں۔ چڑھی ہوئی بھوئیں یاقوت اور عقیق یمن کو شرمانے والے
ہونٹ۔ چمکدار رخسار۔ نورتن جیسے دانت۔ سرتاپا زنگار رنگ
اور چنچل۔ سبز آنچل اوڑھتی۔ بالوں کو پھولوں سے سجاتی بہت ہی
ہوشیار۔
۴۔ **پیاری**۔ ہمیشہ روٹھنے اور بگڑنے والی بہت ہی خوبصورت اور اپنے
حسن پر مغرور۔ روشن چہرہ۔ جب بن سنور کر نکلتی تو چہرے پر پسینے
کی بوندیں ایسی بھلی لگتیں جیسے پھول پر شبنم۔ تند مزاج اور تلخ گفتگو
کرنے والی۔ ناگ کی طرح سیاہ بل کھائی ہوئی لانبی چوٹی۔ خوشبودار
جسم۔ کانچ کی چوڑیاں پہنتی اور ماتھے میں اچھری باندھتی بے حد
عشوہ طراز۔
۵۔ **گوری**۔ چاند سا چمکتا چہرہ۔ روشن پیشانی۔ پراگندہ زلفیں۔ رسیلے ہونٹ
مستانہ چال۔ ابھرا ہوا سینہ۔ تپلی جیسا خوبصورت اور پھولوں

کی طرح نرم ونازک اور شگفتہ جسم۔

۶۔ **چمپیلی**۔ رخسار پر تل۔ ژولیدہ زلفیں۔ شکاری آنکھیں۔ خط سرمہ کھنچا ہوا۔

۷۔ **لالا**۔ ہونٹوں میں آب حیات۔ گلابی پھولوں کی طرح دانت۔ سر پستان سے جوانی ٹپکتی ہوئی۔ مست کرنے والی چال ہنسی سے رات کو دن بنانے والی عشق ومحبت کی پیاسی۔ غمزدۂ فراق۔

۸۔ **لالن**۔ نُقل جیسے ہونٹ ہنس جیسی چال۔ پھول کی کلی سے نازک کم عمر اور نادان۔

۹۔ **موہن**۔ جادو سے بھری ہوئی آنکھیں عشوہ طراز اور گن والی۔ چہرے پر عیش وصال کی کیفیت نمایاں۔ آنکھیں رات کی خماری سے متوالی۔ سہانی سبز ساری جس پر شفق کے رنگ کی کناری لگی ہوئی۔ محبت میں دیوانی۔

۱۰۔ **محبوب**۔ گلاب کے پھول ایسے گال۔ باریک کمر۔ زریں پٹکہ کسی ہوئی۔ یوسف سے زیادہ حسین۔

بارہ پیاریوں میں سے اور دو پیاریوں مشتری اور حیدر محل کا ذکر آئندہ تفصیل سے آئے گا۔

ان پیاریوں کے علاوہ محمد قلی نے متعدد نظمیں ایسی بھی لکھی ہیں جو اُس کی عیش وعشرت کی ترجمان ہیں۔ اور عشق عاشقی کی زندگی کی دلچسپ داستانوں کا کام دیتی ہیں۔ ان نظموں میں بعض بہت عریاں ہیں جن میں اُس نے وصال کے پُرکیف مرقعے پیش کئے ہیں اور بعض نظمیں اس کی جوانی کی راتوں اور مرادوں کے دنوں کے تفصیلی اور دلچسپ نظام العمل ہیں حسن وعشق کے راز و نیاز کا شاید ہی کوئی موضوع ہو جو چھوٹ گیا ہو شباب کی رنگا رنگیوں اور جذبات کی جولانیوں کے اظہار میں اس کا قلم غیر معمولی قدرت رکھتا تھا۔ اور یہ قدرت تخیلی یا فرضی عشق عاشقی سے نہیں پیدا ہوسکتی۔ محمد قلی صحیح معنوں میں اس میدان کا مرد تھا۔ اس کے رفیع الشان محل نہ تھے بلکہ اصل میں ہیں قومی حسن ونغمہ کی وسیع اور آراستہ وپیراستہ نمائش گاہیں تھیں۔ ان میں کئی ملکوں، کئی مذہبوں اور ہر وضع وقطع کی نازنینیں آزادی اور بے تکلفی کے ساتھ اپنے حسن وجمال کی آرائش وزیبائش میں مصروف ومنہمک اور عشق ومستی کی عجیب وغریب کیفیتوں اور جوانی ورعنائی بے پناہ جذبات کے مظاہرے کرتی رہتی تھیں۔

"سب رس" **سید محی الدین** قادری زور

رسالہ "ایشیا" میرٹھ (سہ ماہی)

پنڈت جواہرلال نہرو کی نظر میں!

ایڈیٹر۔ ساغر نظامی

(ماہنامہ "ایشیا" (سہ ماہی) کے لئے میری بہترین دعائیں قبول فرمایئے۔ مجھے یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی کہ ایسے میگزین اُردو شائع کئے جارہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ رسالہ "ایشیا" اس عظیم الشان براعظم کے اہم مسائل کے علم و وقوف کی اشاعت میں مدد دے گا۔ اور ان مسائل کے باہمی ربط و تعلق کو واضح کرے گا۔ کیونکہ انجام کار یہ مسائل ایک بہت وسیع مسئلہ کا جزو ہیں۔

خود ہمارے ملک میں اس مسئلہ کا اہم پہلو یہ ہے۔ کہ ملک کو آزادی حاصل ہو اور عوام سے جو ناجائز فائدہ اُٹھایا جا رہا ہے۔ اُس کو دور کیا جائے۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ رسالہ "ایشیا" اس مقصد کی تکمیل کا حامی ہے۔

جواہرلال نہرو

۲۰ ستمبر ۱۹۳۶ء الہ آباد

سالانہ چندہ ۵ روپے جلد۔ مجلدے رفی نمبر عہ علاوہ محصول محصول ۴/

پتہ:۔ دفتر رسالہ "ایشیا" (سہ ماہی) ادبی مرکز میرٹھ (یوپی)

فہرستِ مضامین ادبی دنیا لاہور

بابت ماہِ ستمبر ۱۹۳۹ء

جلد ۱۷ — نمبر ۹

تصاویر: ۱۔ دیبی اور ناری ۲۔ پورب کی ناچنے والی

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے۔ ممالک غیر سے دس شلنگ

گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام صلاح الدین احمد پرنٹر و پبلشر چھپ کر دفتر ادبی دنیا دہلی ہال لاہور سے شائع ہوا۔

روز مرّہ کا ایک ضروری
واقعہ
بال بچوّں کی تسلّی کے لئے
چائے
جس وقت آپ کا شوہر اپنے کام سے اور
آپ کے لڑکے اِسکول سے واپس آئیں۔ اُس لمحہ
آپ کو چائے بنانے میں معروف ہو جانا چاہیئے۔ کیونکہ اس طرح آپ اپنے گھر میں
روزانہ چائے کی مجلس قائم کرتے ہیں۔ جو کہ گھریلو خوشی کی انتہا ہے۔ آپ یقین کیجئے کہ
یہ خوش کن واقعہ جس طرح آپ کے گھر میں ہوتا ہے۔ اسی طرح دوسرے گھروں میں بھی ہوتا ہے۔
آؤ ہم ہندوستانی چائے پئیں
چائے کس طرح تیار کرنی چاہیئے:۔ تازہ پانی اُبال لیجئے۔ اور پھر ایک
صاف برتن کو ذرا گرم کرکے اس میں ہر شخص کے لئے ایک ایک چمچہ ہندوستانی چائے
کا ڈال دیجئے اور ایک چمچہ فالتو ڈال لیجئے۔ جونہیں پانی اُبلنے لگے اس کو چائے والے
برتن میں ڈال دیجئے۔ اور پانچ منٹ تک ڈھکا رہنے دیجئے۔ بعد ازاں دودھ
اور کھانڈ ملا کر پیالیوں میں ڈال کر استعمال کیجئے۔

دنیائے کاروبار

چائے اور انسانی تمدّن

تمدّن کے ارتقائی مراحل دماغی کاوشوں اور ذہنی خصوصیات کے علاوہ اچھی صحت۔ تندرستی اور جسمانی صحت کے بھی مرہون منت ہیں۔ بلکہ اگر نظرِ غور سے دیکھا جائے تو جسمانی محنت و جفاکشی ہی وہ راستے ہیں جن سے گزر کر انسانی عزائم عملی جامہ پہنتے اور پایۂ تکمیل کو پہنچتے ہیں انسانی جسم کی حرارت کو برقرار رکھنے کے لئے تمام اشیائے خورد و نوش میں چائے ممتاز درجہ رکھتی ہے۔ اس کی مقبولیت کی انتہا یہ ہے کہ انسانی معاشرت کے تمام تدریجی مراحل پر زندگی کے جزو لاینفک کی حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ یہاں تک کہ شاہ انگلستان جارج ششم جو انگریزی خصوصیات کے ترجمان و حامل ہیں اپنے سفر میں بہترین چائے اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ جاپان میں جسمانی چستی و چالاکی کو برقرار رکھنے کے لئے چائے کی کرشمہ سازیوں کو یہاں تک تسلیم کر لیا گیا ہے کہ جب کسی کا حقارت سے ذکر کرنا مقصود ہو تو کہا جاتا ہے کہ "فلاں شخص میں چائے نہیں ہے"۔

حال ہی میں چائے کے پروپیگنڈے کے سلسلہ میں" انڈین ٹی مارکیٹ ایکسپینشن بورڈ کے کمشنر نے اپنی ۱۹۳۸-۳۹ء کی رپورٹ میں بیان کیا ہے کہ گرمیوں میں اکثر چائے خانے بند ہو جاتے تھے لیکن اب گرمیوں میں بہت سے نئے چائے خانے کھل جاتے ہیں۔ حالانکہ چند سال پہلے یہ بالکل ناممکن تھا۔ ان اعداد سے یہ ثابت ہوتا کہ گرمیاں میں دن بھر کے سخت کام کے بعد یا کھیل یا سفر یا جسمانی یا دماغی محنت کے بعد گرم چائے کی ایک پیالی تر و تازگی دیتی ہے۔ اور جسم میں چستی و چالاکی پیدا کرتی ہے۔

چائے سردیوں میں جسم کو گرم اور گرمیوں میں سرد رکھتی ہے۔ چائے پینے سے پسینہ جلد آجاتا ہے جسم کے مسام کھل جاتے ہیں۔ اس قدرتی طریقے سے جسم کو ٹھنڈک پہنچتی ہے۔

پکار

ملکہ نورجہاں اگرچہ بیابان میں پیدا ہوئی تھی لیکن کاتب تقدیر نے اس کی قسمت میں شاہی حکومت لکھی تھی اور دنیا نے دیکھا کہ کس طرح نورجہاں نے ہندوستان کے تخت پر حکومت کی اور تخت کے ساتھ ساتھ شہنشاہ جہانگیر کے دل پر بھی۔

اس تاریخی ڈرامے کو جناب سہراب مودی نے اپنی قابلیت سے پردۂ سیمیں پر پکار کے نام سے پیش کیا ہے جس میں عدل جہانگیری کی روایات کو بھی مؤثر انداز میں دکھایا گیا ہے۔

پکار معنوی اعتبار سے جہانگیر کی ان فیاضیوں کی ترجمان ہے جن کے زیر اثر اس کے محل میں وہ زنجیر لٹکی تھی۔ جسے ہلانے سے اس کی رعایا کا ہر فرد بشر جہانگیر کے حضور میں اپنی فریاد پیش کر سکتا تھا۔ ہم امید کرتے ہیں کہ ہندوستانی فلمی صنعت میں "پکار" حقیقی معنوں میں ایک بیش بہا اضافے کا موجب ہوگی۔

بھگت سورداس

انسان اپنی فطرت میں نیکی کی طرف رجحان رکھنے کے باوجود بھی گناہ کی طرف شدت سے مائل رہا ہے۔ جب دنیا کی فضا گناہ سے بہت زیادہ آلودہ ہو جاتی ہے۔ قدرت انسانوں کو راہ راست پر لانے کے لئے کسی ایسے انسان کو بھیجتی ہے جس کی سیرت بلند روایات کی ترجمان ہو اور جس کی قوتِ تبلیغ انسانی طبیعت کو گناہ سے متنفر کر دینے کے لئے کافی ہو۔ بھگت سورداس ہندوستانی تاریخ کا ایک پرانا قصہ ہے جس میں گناہ اور نیکی کی جنگ دکھائی گئی ہے۔

اس تاریخی افسانے کو میسرز موتی محل تھیئٹرز نے پردۂ سیمیں پر پنجابی زبان میں بہت کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ یہ کمپنی اس فلم کے علاوہ اور بہت سی فلمیں پنجابی زبان میں تیار کر رہی ہے، ہم امید کرتے ہیں کہ یہ فلم ہندوستانی فلم انڈسٹری میں نمایاں ترقی کا باعث ہوگی۔

جاباکسم ہیر آئل

ہم اشاعت گزشتہ میں کلکتے کی مشہور فرم میسرز سی کے سین اینڈ کمپنی لمیٹڈ کے تیار کردہ شہرہ آفاق تیل جاباکسم ہیر آئل کے متعلق لکھ چکے ہیں کہ یہ تیل آپ کے لئے خوب صورت۔ دیدہ زیب اور سنہری پیکنگ میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کا پرانا پیکنگ بالکل بدل دیا گیا ہے اور نیا پیکنگ اس قدر خوب صورت بنایا گیا ہے کہ ولایتی تیلوں کے پیکنگ کو مات کرتا ہے۔ اس نئے کاسکیٹ کی تصویر سامنے دیکھئے۔

ہے۔ اس نئے پیکنگ پر زر کثیر خرچ ہونے کے باوجود بھی اس کی قیمت میں کوئی اضافہ نہیں کیا گیا۔

ان تمام اوصاف کی بنا پر ہم ناظرین ادبی دنیا سے اس کے استعمال کی پر زور سفارش کرتے ہیں۔

بزمِ ادب

مقامِ مسرت ہے کہ ہمارے نوجوان اہلِ قلم کا میلان اب سنجیدہ مضامین لکھنے کی طرف ہو رہا ہے۔ اور ہمیں امید ہے کہ یہ رجحان ترقی کرے گا اور اس کے نتائج ہماری زبان و ادب کے لئے باعثِ فخر ثابت ہوں گے۔

اس مہینے کے مضامین میں سے علی احمد صاحب کا مضمون "اردو کی ایک گمنام مثنوی، بتخانۂ خلیل" بہترین قرار پایا ہے۔ صاحبِ مضمون نے اس رنگین و لطیف مثنوی سے اہلِ ذوق کو آشنا کرا کے ادب کی ایک بیش بہا خدمت انجام دی ہے۔ اگرچہ اسے شائع ہوئے پچیس سال گذر گئے۔ مگر اردو پڑھنے والے طبقے کی ناقدر شناسی کے باعث یہ ابھی تک بہت کم لوگوں کی نظر سے گذری تھی۔ موجودہ انتخاب پر ایک نظر ڈالنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ خلیل کا یہ ادبی کارنامہ اگر سحر البیان کے ہم پایہ نہیں ہے تو اس سے بہت کم درجہ بھی نہیں رکھتا۔ بعض اشعار اس قدر صاف ہوئے ہیں کہ انہیں میر حسن کے بہترین اشعار کے مقابل میں رکھا جا سکتا ہے۔ دیکھئے ہجراں نصیب رانی ناگمت اپنے بے وفا شوہر کو خط میں لکھتی ہے ؎

مجھے تو نہ دنیا کی لذت ملی — کسی روز دل کو نہ راحت ملی
اکیلی بھری انجمن میں رہی — پریشاں ہمیشہ چمن میں رہی

بتا تو ہی یہ غم سہوں کس طرح — مکاں میں اکیلی رہوں کس طرح
نہیں سوجھتا کچھ کدھر جاؤں میں — یہ جی میں ہے کچھ کھا کے مرجاؤں میں

کٹے ہائے برسات تو کس طرح — کٹے چاندنی رات تو کس طرح
کٹیں کس طرح زندگانی کے دن — جوانی کی راتیں جوانی کے دن

زبان کی شگفتگی اور بے ساختگی اور جذبات کی تصویر کشی کی داد نہیں دی جا سکتی۔ علی احمد صاحب نے اپنے مضمون میں اس مثنوی کے مختلف پہلوؤں پر نہایت لطیف پیرائے میں تبصرہ کیا ہے اور اس کے حسن و خوبی کا مقابلہ اردو کی دوسری مشہور مثنویوں سحر البیان اور گلزارِ نسیم سے کر کے جا بجا ایسی مثالیں دی ہیں جن سے مضمون کی افادیت اور دلچسپی بہت بڑھ گئی ہے۔

اس نمبر کا دوسرا قابلِ قدر مضمون "اردو شاعری میں مرثیے کی نشو و نما" ہے، جسے عبد السلام صاحب خورشید نے لکھا ہے۔ صاحبِ مضمون نے اردو مرثیہ نگاری کی تاریخ پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی ہے اور نظم کی اس اہم صنف کا نہایت سلیقے سے جائزہ لیا ہے۔ وہ عہدِ جہانگیری کے شاعر نوری سے شروع کر کے اقبال تک چلے آتے ہیں اور مرثیے کی عہد بعہد ترقیوں اور رجحانات کو مثالوں سے واضح کرتے ہوئے یہ بتاتے ہیں کہ مرثیے کا میدان اب پہلے سے بہت وسیع ہو گیا ہے اور جہاں پہلے مرثیہ گوئی کا بڑا مقصد حصولِ ثواب اور رلانا رلانا تھا، اب اس سے دل کی بجھی ہوئی چنگاریاں روشن کرنے اور ایک خوابیدہ قوم کو جگانے کا کام بھی لیا جا سکتا ہے۔ ادارے نے مومن کی محبوبہ کا مشہور مرثیہ اس مضمون میں اس خیال سے تمام و کمال شامل کر دیا ہے کہ ایسی چیزوں کے ثبات کے جس قدر ذریعے مہیا ہو سکیں اسی قدر اچھا ہے۔

افسانوں میں بہترین افسانہ "مرض" قرار پایا ہے جسے نجیب الرحمن صاحب نے سینٹ جان اروِن سے مستعار لے کر گہرے ہندوستانی رنگ میں رنگ دیا ہے۔ یہ افسانہ ایک بے نظیر نفسیاتی مطالعہ ہے ایک "چراغ خانہ" جو بجھنے کے قریب ہو کیونکر "شمعِ محفل" بن جاتا ہے۔ اور افسردہ ترین زندگی بھی سازگار فضا پا کر اپنے لئے کیسی نئی نئی راہیں نکال لیتی ہے، یہ اس افسانے کے مطالعے سے آشکار ہو گا۔

"آج اور کل" ایک چھوٹا سا دل آویز معاشرتی خاکہ ہے جسے ہمارے دوست شیخ عباد اللہ صاحب نے نہایت چابک دستی سے کھینچا ہے۔ اور اس میں جا بجا لطافتِ زبان اور حسنِ بیان

کے رنگ بھرے ہیں۔ عباداللہ صاحب نہایت نکھری ہوئی زبان لکھتے ہیں اور انہیں انیسویں صدی کی معاشرت اور تہذیب سے ایک گہری دل بستگی ہے۔ وہ جب کبھی قلم اٹھاتے ہیں تو بلا ارادہ ہمارے اُس پیارے پیارے مٹتے ہوئے تمدّن کی تصویر کشی کرتے چلے جاتے ہیں جس کی جھلک اب کہیں کہیں دکھائی دیتی ہے۔

منظومات میں سے دو چیزیں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ۔

پروفیسر فیض کی "تنہائی" اور جناب ن۔م۔ راشد کی نظم "دریچے کے قریب"۔ "تنہائی" کا لطف آپ خود اٹھائیے۔ بیان سے زائل ہو جائے گا۔ "دریچے کے قریب" ایک خاص چیز ہے اور اُس سیاسی سماجی اور اقتصادی بے اطمینانی اور ذہنی خلفشار کا ایک نہایت روشن آئینہ ہے جو آج ملک کے نوجوان طبقے میں پایا جاتا ہے۔ نظم معرّیٰ کے میدان میں راشد کا پایہ بلند ہے۔ اور یہ نظم اُن کی نظموں میں ایک خاص امتیاز رکھتی ہے۔

علی احمد صاحب کی "برکھارت" اور احمد ندیم صاحب کا "ساون" موسم کی دو خاص چیزیں ہیں۔ اب کے پنجاب میں برسات کی بہاریں دیکھنے میں نہیں آئیں۔ شاید یہ نظمیں ہی کچھ تلافی کر سکیں۔

اور چلتے چلتے ایک شعر بھی سنتے جائیے۔ جناب محروم فرماتے ہیں ؎

جوانی اور بوئے گل میں یارب کیا تعلق تھا
کہ بوئے گل سے پیری میں جوانی یاد آتی ہے۔

صلاح الدین احمد

اس نمبر کے انعامات

اردو کی ایک گمنام مثنوی	ساڑھے سات روپے
اردو شاعری میں مرثیے کی نشوونما	ساڑھے سات روپے
مرض (افسانہ)	سات روپے
دریچے کے قریب (نظم)	پانچ روپے

دو نظمیں

دامِ خیال

موت کے بعد آئے گی
اور بھی اِک زندگی
جاودانی زندگی
غیر فانی زندگی
اِک بہارِ بے خزاں
اِک نشاطِ بے کراں
لذّتیں، کیفیتیں،
راحتیں ہی راحتیں
کتنا دلکش ہے یہ جھوٹ!

شعبدہ!

وہ شعبدہ گر خوب تھا،
اِک سحر جس نے پھونک کے،
نیلے پیالے کے تلے
سارے جہاں کو رکھ دیا!
اور جب اُٹھایا جائے گا
نیلا پیالہ، ناگہاں،
بدلا ہوا ہوگا جہاں
سارا جہاں بدلا ہوا!

سعید احمد اعجاز

آئینۂ عالم

مادام چینگ کائی شک سے ایک ملاقات

حال ہی میں فریدہ اٹیلی نے مادام چینگ کائی شک سے ایک ملاقات کی ہے جس کا حال اُس نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے وہ لکھتی ہے۔

صوبہ سوانگ کی عورتیں چین میں جرأت اور بہادری کے لئے بہت مشہور ہیں۔ محاذ جنگ سے واپسی پر جب دوبارہ مادام چینگ کائی شک سے ملنا ہوا تو مجھے اس حقیقت کا کافی ثبوت ملا۔ ابھی ہم نے گھنٹہ بھر ہی زخمیوں کے مسئلے پر گفتگو کی ہوگی کہ جاپانیوں نے ہوائی حملہ کر دیا۔ لیکن مادام اس غیر متوقع واقعے سے بالکل ہراساں نہ ہوئی بلکہ اس طرح باتوں میں مصروف رہی گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ اسی اثنا میں جنرل چینگ کائی شک بھی دو بار کمرے میں داخل ہوا۔ وہ اُس وقت ایک سادہ لباس پہنے ہوئے تھا جو عموماً چینی لفٹننٹ پہنا کرتے ہیں۔ جب بم ہمارے قریب آ آ کر گرنے لگے تو وہ مجھے آرام گاہ میں لے گئی۔ ادھر چین پر جاپانی حملہ ہو رہا تھا ادھر ہم نہایت بے تکلفی سے باتوں میں مصروف تھے۔ مادام نہایت دل کش اور سادگی پسند خاتون ہے۔ اس کی تعلیم امریکہ میں ہوئی ہے اس لئے اس کی طبیعت میں بہت سے امریکن اوصاف بھی ہیں۔

جب اُس پر کسی جذبے کا غلبہ ہو اس وقت اس کی بڑی بڑی اور سیاہ آنکھیں بہت ہی بھلی معلوم ہوتی ہیں اس صبح وہ اپنی زندگی کی ناکامیوں اور اپنی تکالیف کی داستان نہایت آزادی اور بے تکلفی سے بیان کر رہی تھی۔ اگرچہ میں جانتی ہوں کہ مجھے ایک بار پھر جب وہ چین کی ملکہ ہوگی، شاہی آداب کو ملحوظ رکھتے ہوئے اُس کی بارگاہ میں حاضر ہونے کا شرف حاصل ہوگا۔ لیکن میں اڑھائی گھنٹوں کی اس ملاقات کو ہرگز فراموش نہیں کر سکتی۔ جس کے دوران میں وہ ایک نہایت طباع اور ذہین مغربی تعلیم یافتہ خاتون بن کر ظاہر ہوئی اور یہ وہ زمانہ ہے جب کہ اُسے خطرات نے ہر طرف سے گھیر رکھا ہے۔ لیکن وہ پھر بھی ان مشکلات اور خطرات کو خاطر میں نہ لا کر نہایت صبر و استقلال سے ان کا مقابلہ کر رہی ہے۔

اُسے سیاست دانوں سے بہت نفرت ہے۔ کیونکہ اُس کا خیال ہے کہ یہ لوگ ہمیشہ اپنے حامیوں کی غلطیوں کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں خواہ اس سے ملک کو کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو۔ اسی دوران میں مادام نے بتایا کہ ایک اشتراکی نے جس کی حفاظت میں چند پناہ گزین بچے رکھے گئے تھے۔ ان کی دیکھ بھال میں نہ صرف کوتاہی کی بلکہ اُن کو بھوکا بھی رکھا۔ لیکن اس کے اشتراکی دوستوں نے اس کی جرم پوشی کرنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔

اس پر میں نے کہا "عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ اشتراکی اتنے بُرے نہیں ہوتے بلکہ وہ تو چین کا بہترین عنصر ہیں"۔

مادام نے فوراً جواب دیا "ہاں وہ اس لئے بُرے نہیں ہیں کہ انہیں ابھی کوئی طاقت حاصل نہیں ہے۔ آج اُن کے ہاتھ میں طاقت دے دو اور دیکھو کل تک وہ کیا کچھ نہیں کر گزرتے"۔

اُس کے ان الفاظ میں بہت حد تک صداقت موجود ہے وہ اپنی بہن "مادام سن یٹ سن" کے برعکس سیاسی حقائق شناس واقع ہوئی ہے۔ بہر حال اس سے گفتگو کرتے ہوئے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ اشتراکیوں سے سخت متنفر ہے۔ اور ان کی خوبیوں کو بھی ماننے کے لئے طیار نہیں ہے۔

اشتراکی نہ صرف جنرل چینگ کائی شیک سے برسرِ پیکار رہے بلکہ وہ مادام کے مذہبی عقائد سے بھی اختلاف رائے رکھتے ہیں۔ اس لئے اس کی نفرت اشتراکیوں کے معاملے میں اُن کے تمام محاسن پر غالب آجاتی ہے اور دوسری طرف ان لوگوں کی غلطیاں بھی اُسے غلطیاں نظر نہیں آتیں جو مذہبی طور پر اُس کے ہم خیال ہوں یا ایسا ہونے کی کوشش کریں۔

مجھے یہ محسوس کرکے بہت دُکھ ہوا کہ مادام موصوف ایک خاص قسم کی عیسائیت سے بہت متأثر ہے اور اس کا یہ مذہبی تعصب چین کی بدقسمتی کی دلیل ہے۔ مادام نے "نئی زندگی کی تحریک" کے نام سے چین کی اصلاح کے لئے ایک مہم بھی شروع کر رکھی ہے۔ یہ تحریک جزواً عیسائیت اور جزواً کنفیوشس کی تعلیمات سے متأثر ہو کر وجود میں آئی ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ چین کے اقتصادی، سیاسی اور معاشرتی مسائل کا حل روحانیات میں تلاش کیا جائے۔ اگر مادام اپنی ذہانت، اپنی مغربی تعلیم، اور جسمانی اور اخلاقی قوتوں کو اس تحریک میں ضائع نہ کرتی تو وہ چین کے لئے بہت زیادہ مفید ثابت ہو سکتی تھی۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ تحریک فوجی آمریت سے جس کا مقصد انہی مسائل کا حل سیاسیات میں تلاش کرنا ہے زیادہ کامیاب ثابت نہیں ہو سکتی۔ ہاں اس تحریک نے لوگوں کی عادات میں کسی قدر اصلاح کر دی ہے اور زیادہ تھوکنے، تفریح گاہوں میں حقہ پینے اور قیمتی لباس پہننے کی عادات اُن سے چھڑا دی ہیں۔ لیکن موجودہ جنگ کے دوران میں جب معاشرتی اصلاحات کی ضرورت بہت زیادہ ہے اور یہ امر بھی اشد ضروری ہے کہ تمام ترقومی توجہات کو اسی طرف مبذول کر دیا جائے اس تحریک کی کوششیں امریکہ کی مکتی فوج کی سرگرمیوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔

بلاشبہ مادام نے بذاتِ خود بھی اصلاحات کی طرف توجہ کی ہے اور اپنے ذاتی اثر و رسوخ، اور حیرت انگیز ہمت سے کام لے کر ملک کی بہت سی کمزوریوں کو اگر ہمیشہ کے لئے نہیں تو کم از کم تھوڑے عرصے کے لئے تو دور کر ہی دیا ہے۔

در جنگ کے سوت تیار کرنے والے سرمایہ دار ہانکو میں بہت دولت پیدا کر رہے تھے مگر جاپان کے ہوائی حملوں سے مالی، اور جانی نقصان بھی اٹھا رہے تھے۔ اس پر بھی وہ اپنے کارخانوں کو اندرونی چین میں منتقل کرنے کے لئے تیار نہ تھے، ان کا خیال تھا کہ اگر ہانکو جاپان کے قبضے میں بھی آ جائے تب بھی ان کی آمدنی میں کمی نہیں ہوگی۔ باقی رہا حملوں کی وجہ سے مزدوروں کی موت کا سوال تو اِسکی اُنہیں پرواہی نہیں تھی —— اور مزدور آقا کی نگاہ میں وقعت ہی کیا رکھتے ہیں ——!

مادام کو جب اس حقیقت کا احساس ہوا تو اُسے بہت دُکھ ہوا۔ اس کے لئے مالکوں کا ذاتی مفاد چین کے لئے اتنا مفید نہیں تھا جتنی کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی زندگی؛ اس نے دل میں عہد کر لیا کہ وہ اِس سلسلے میں ضرور کچھ کر کے رہے گی۔

اچانک اُس نے صبح کے پانچ بجے جا جا کر کارخانوں میں کام کرنے والے مزدور مردوزن کی حالت کا معائنہ کرنا شروع کر دیا۔ پھر ڈائرکٹروں سے ملاقاتیں کیں، اور اُن کے ساتھ بحثیں کر کے اُن کے سوئے ہوئے جذبۂ حب الوطنی کو بیدار کیا اور انہیں اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ اندرونی چین میں آجائیں۔ اسی طرح حکومت نے بھی فیکٹریوں کے مالکوں کو مجبور کیا کہ وہ بھی اپنی فیکٹریاں مغربی صوبوں میں منتقل کرلیں اور حکومت کا یہ جبر اخلاقی کوششوں سے زیادہ مفید ثابت ہوا۔ کہتے ہیں، چینگ کائی شک نے فیکٹریوں کے مالکوں سے صاف طور پر کہہ دیا تھا کہ یا تو وہ اندرونی چین میں چلے آئیں یا تباہ ہو جائیں۔ اگر حکومت یہ اقدام کچھ عرصہ پہلے کرتی تو ہانکو کے بہت سے صنعتی کارخانوں کو تباہی سے بچایا جا سکتا تھا۔ لیکن حکومت نے یہ جبر بھی سنبھل سنبھل اور ڈر ڈر کر کیا۔ کیونکہ ایک تو یہ ذاتی جائداد میں مداخلت تھی اور دوسرے مادام کے امریکی آزادی کے تخیل کے سراسر خلاف، اور اس کے علاوہ اسے اُس کے مسیحی عقاید سے بھی مناسبت نہ تھی جن کا تقاضا ہے کہ انسان کے سامنے مثال پیش کر کے اور اس کے جذبات صالح کو اپیل کر کے اُس کو فرض کی انجام دہی کی طرف متوجہ کیا جا سکتا ہے،

اگر مادام پر مسیحی اثر غالب نہ ہوتا تو وہ اُن چینیوں کا ساتھ دیتی جو چین میں بنیادی طور پر اقتصادی، سیاسی، اور معاشرتی اصلاحات کی لہر دوڑانا چاہتے ہیں لیکن پھر بھی وہ کبھی کبھی اپنے مذہبی عقائد کی پرواہی نہیں کرتی۔ مثلاً اس نے ایک مشہور عورت شہبہ لینگ کو "نئی زندگی کی تحریک" کے ایک اہم شعبے کا مہتمم بنا رکھا ہے۔ یہ عورت عیسائی نہیں اور جنگ سے قبل قید میں تھی۔ اسی طرح وہ اور بھی بہت سے

ایسے آدمیوں کی سرپرستی کرتی ہے۔ جو اشتراکیوں سے ہمدردی رکھتے ہیں۔

جب اس نے مجھ سے اور ڈاکٹر ٹالبیٹ سے چینی ریڈکراس کے ڈائرکٹر رابرٹ لم کے کام کی تعریف سنی تو بہت خوش ہوئی اور دوسرے ہی دن تار دے کر اُسے چینگ شا سے بلایا اور انعام دے کر بہت افزائی کی۔ اس سے پہلے اُس نے ایسا کبھی نہیں کیا تھا۔

ڈاکٹر لم کا ادارہ کلیتہً چینی ہے۔ لیکن وہ عیسائی نہیں اور انٹرنیشنل ریڈکراس کے حکام بھی جو ہانکو میں نئی زندگی کی تحریک سے متعلق ہیں اُسے پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔

میں صرف وہی خیالات بیان کر رہی ہوں جو اُن امریکی لوگوں کے ہیں جو ایک عرصے سے چین میں مقیم ہیں اور یہ نہیں چاہتے۔ کہ چین مغربی حکومتوں کے زیر اثر رہے۔

مادام چینگ کو اگر کوئی کمزوری معلوم ہو جائے تو وہ فوراً اُس کے دور کرنے کا علاج سوچ لیتی ہے اور اُسے دور کر دیتی ہے۔ اس ملاقات کے دوران میں میں نے زخمیوں کے متعلق جو بات بھی کی وہ فوراً اس کی تہ تک پہنچ گئی۔ یہ شاید اس لئے ہے کہ وہ نہایت ذہین ہے اور اس میں کام کرنے کی بہت قوت موجود ہے اور وہ اُسے ملک کی بہتری کے لئے استعمال کر سکتی ہے۔ سیاسی، اقتصادی اور معاشرتی مسائل کے متعلق اس کا زاویہ نگاہ چین کے لئے بہت مفید ثابت ہو رہا ہے۔

وہ بہت صاف گو ہے۔ اس طویل ملاقات کے اختتام پر جب میں نے چینی مجروحین کے متعلق پریس کو دئیے ہوئے اپنے ایک بیان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا کہ کیا اُسے اس پر کوئی اعتراض تو نہیں تھا۔ تو اُس نے نہایت سادگی سے کہا۔ "نہیں یہ تو ہمارے لئے بہت مفید ثابت ہوگا"۔

مادام نے اکثر نئی زندگی کی رضاکاروں کو لے کر وہیں کے شفاخانوں کا دورہ کیا ہے۔ جس کی کسی قدر تقلید چینی عورتوں نے بھی کی ہے۔ موصوفہ نے عورتوں کے عام طبقے میں بیداری بھی پیدا کر دی ہے اور انہیں اس کا احساس کرا دیا ہے کہ ایامِ جنگ میں ملک کی طرف سے اُن پر کیا کیا فرائض عائد ہوتے ہیں لیکن صدیوں کے فرسودہ خیالات اور عقائد کو تبدیل کرنے کے لئے ابھی بہت کچھ اور کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ ایک سپاہی۔ خواہ وہ زخمی ہو یا تندرست، خواہ وہ میدانِ جنگ میں ہو یا کسی شفا خانے میں امیر طبقہ کی ایک چینی خاتون کی نگاہوں میں ایک قلی سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ جب تک اعلیٰ اور درمیانے طبقے کی ماؤں کے بیٹے میدانِ جنگ میں نہیں آتے اُس وقت تک اُن کی ماؤں بہنوں کو اس بات کا احساس نہیں ہوگا۔ کہ زخمیوں کی مرہم پٹی کرنا، شفاخانوں میں جھاڑو دینا اور مزدوری کرنا، خواہ ان کے لئے توہین کا باعث ہی کیوں نہ ہو، ملک کے لئے مفید ہے۔ ابھی تک چین میں ایسی عورتیں بہت کم ملیں گی جو مریضوں کی تیمارداری کریں، اور سپاہیوں کے لئے گرم کپڑے سی کر مادام چینگ کی تقلید کرنا پسند کرتی ہوں۔ امیر طبقے کی عورتوں کی اکثریت تو ابھی تک کاہلی اور آرام طلبی کی زندگی کو ترجیح دیتی ہے۔

مادام پناہ گزین بچوں کی حفاظت کے لئے عورتوں کو اکٹھا کرنے میں بہت کامیاب رہتی ہے، اور نئی تحریک کے اسی شعبے میں عورتوں نے نمایاں کام کیا ہے۔

نئی تحریکوں کے لئے جن میں اشتراکی عنصر غالب ہو۔ نوجوان طبقہ بہت مفید رہ سکتا ہے، لیکن مادام کو اس پر اعتماد نہیں ہے۔

اوپر کے بیان سے میرا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ نئی تحریک کوئی مفید کام نہیں کر رہی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس کی اکثریت تساہل پسند اور آرام طلب واقع ہوئی ہے جو کسی قسم کی قربانی نہیں کر سکتی اور پھر چینی ریڈکراس کے ڈاکٹروں سے حسد بھی کرتی ہے۔

ہانکو سے روانگی سے قبل مجھے مادام سے ایک مرتبہ پھر ملنے کا موقعہ ملا اور میں پہلے کی طرح اس مرتبہ بھی اُس کی محبت اور صاف گوئی سے بہت متاثر ہوئی۔ اس نے کہا کہ میں باہر جا کر انٹرنیشنل ریڈکراس کے خلاف کچھ نہ کہوں۔

میں نے جواب دیا کہ "میں وعدہ نہیں کر سکتی" اگرچہ اس وقت میری یہ خواہش نہیں تھی کہ اس ادارے کی خدمات کو بھلا دیا جائے لیکن میں یہ ضرور محسوس کر رہی تھی کہ اگر امریکہ یا انگلستان کے لوگ چین کی مدد کرنا چاہتے ہیں اور اسے فتح مند دیکھنے کے آرزومند ہیں تو انہیں چاہئے کہ وہ چینی ریڈکراس کی امداد کریں۔ کیونکہ میرے نزدیک یہ بات بہت زیادہ وقیع ہے کہ چین کسی غیر ملکی انجمن مثلاً انٹرنیشنل ریڈکراس

سوسائٹی پر زیادہ بھروسہ کرنے کے بجائے چینیوں کی امداد حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اس موقعے پر مادام نے ڈاکٹر لم کے ادارے کی بہت تعریف کی اور کہا کہ اگر چینیوں میں سے کوئی اُس جیسا آدمی میسّر ہو جائے تو وہ اس سے زیادہ کامیاب ہو سکتا ہے۔ لیکن مادام نے اس کا بھی اعتراف کیا کہ چینی قوم میں ابھی بہت سی خامیاں موجود ہیں جن کی بنا پر رفاہ عام کے امدادی کاموں میں ابھی غیر ملکی امداد کی ضرورت ہے۔

علاوہ ازیں اس نے یہ بھی کہا کہ چین کا بہترین عنصر بھی بہ یک وقت ان یہ دو کام کرنے سے قاصر ہے کہ جنگ بھی لڑے اور زخمیوں کی دیکھ بھال کی طرف بھی متوجہ ہو۔ اس لئے ابھی غیر ملکی امداد کی ضرورت ہے۔ نیز مادام نے بتایا کہ وہ چین کے حالات کو پیش نظر رکھ کر اصلاحات کی جانب آہستہ آہستہ قدم اُٹھائیں گے۔ مجھے مادام اس وقت عجیب مخمصے میں نظر آ رہی تھی۔ کیونکہ اُسے فطرتاً اپنے غیر ملکی ہمدردوں کو بھی ناراض نہیں کرنا تھا۔ اور زیادہ اصلاحات نافذ کر کے اپنے ملک کے بااثر طبقے کی مخالفت سے بھی گریز کرنا لازم تھا۔

اس کے بعد ہماری گفتگو مذہب سے متعلق ہونے لگی اور میں نے اس ملاقات کے دوران میں محسوس کیا کہ مادام عیسائیت کے ساتھ نہایت اخلاص سے وابستہ ہے۔ عیسائیت اس کے لئے بہت کچھ ہے اور اس کی سیرت کا سرچشمہ ——— !

بہت سے لوگ جو چین کے حالات سے بے خبر ہیں اور محض دور ہی سے اُس کا نظارہ کرنے کے عادی ہیں، اُن کا خیال ہے کہ جنرلِ چیانگ کائی شک اور ان کی اہلیہ چین میں من مانی کرنے پر قادر ہیں۔ در اصل حقیقت اس کے خلاف ہے۔ وہ اپنی منزلِ مقصود کی طرف اتنی تیزی سے نہیں بڑھ سکتے۔ جتنا کہ وہ چاہتے ہیں۔ ملک کے حالات اور قوم کی حالت کو دیکھ کر انہیں اپنی رفتار میں کمی کرنی پڑتی ہے۔

دور بیٹھ کر رائے زنی کر لینا اور یہ کہہ دینا کہ چین کے لئے یہ کچھ کیا جا سکتا ہے۔ وہ کچھ کیا جا سکتا ہے۔ آسان کام ہے۔ لیکن اسے عملی جامہ پہنانا بہت مشکل ہے ——— اور مارشل اور مادام چیانگ کائی شک اسی کوشش میں ہیں۔

تابش صدیقی

غزل

جفائے چرخِ کج رفتار پر فریاد کیا کرتے
خود اپنی ہمتِ عالی کو ہم برباد کیا کرتے

وہ عالم جس کی ہست و بود پابندِ عناصر ہے
ہم اُس عالم میں شرحِ فطرتِ آزاد کیا کرتے

جنہیں میرے سکونِ خاطر برباد سے ضد تھی
سرانجام سکونِ خاطرِ برباد کیا کرتے

جنہیں سامانِ نازِ زندگی پاسِ قدامت تھا
کوئی نوعِ نظامِ زندگی ایجاد کیا کرتے

نہیں ممکن خود اپنی ہمنوائی جن اسیروں کو
کسی کو ہمنوائے شکوۂ صیاد کیا کرتے!

ابھی کچھ اور دن اُمیدوارِ کشف رہنا تھا
زبانِ عیب سے کیا جانے وہ ارشاد کیا کرتے

ملی تھی عمرِ شبنم اے نہالؔ اس دارِ فانی میں
بقدرِ ذوق سیرِ گلشنِ ایجاد کیا کرتے

نہالؔ سیوہاروی

بارش کے بعد

بھونرے مستانہ وار پھولوں پہ گرے — ہو ہو کے بے قرار، پھولوں پہ گرے
چھیڑا جو صبا نے تھپکیاں دے دے کے — اُٹھ اُٹھ کے، بار بار، پھولوں پہ گرے

گلشن کی فضا میں تتلیاں تھرّائیں — یا باغ میں اُڑتی ہوئی پریاں آئیں
یا دستِ بہار نے تماشے کے لئے — پھولوں کی ہوا میں پتّیاں بکھرائیں

بکھرے ہوئے پھول ہیں خیابانوں میں — یا بادۂ مشک بُو ہے پیمانوں میں
ہیرے برسا کے ابر بدمست گیا — اب پھول برس رہے ہیں بُستانوں میں

عباس بیگ محشر

اردو کی ایک گمنام مثنوی

بتخانۂ خلیل

مثنوی شاعری کی ایک متداول صنف ہے بقول مولانا شبلی انواع شاعری میں مثنوی کی صنف دیگر انواع کی بہ نسبت زیادہ مفید زیادہ وسیع اور زیادہ ہمہ گیر ہے۔ جذباتِ انسانی، مناظرِ قدرت، واقعہ نگاری، تخیل ان تمام چیزوں کے لئے مثنوی سے زیادہ کوئی میدان ہاتھ نہیں آسکتا ..... بہار و خزاں، گرمی اور سردی۔ صبح و شام یا جنگل اور بیابان کوہ و صحرا، سبزہ زار وغیرہ کی تصویر کھینچی جاسکتی ہے۔ اس صنفِ شاعری کا وجود ہر زبان میں پایا جاتا ہے۔ چنانچہ انگریزی میں Heroic Couplets مثنوی ہی کی قسم سے ہیں۔ فارسی زبان میں اس کی کوئی کمی نہیں اردو میں بھی یہ صنف شاعری قدیم زمانے سے چلی آرہی ہے میر، سودا، شوق، میر حسن اور دیا شنکر نسیم کی مثنویاں اسی زبان میں لکھی گئیں اور سب جانتے ہیں کہ آخر الذکر دو مثنویوں سحر البیان اور گلزار نسیم کو زمانے نے جس قدر عروج بخشا وہ پایہ کسی مثنوی کو حاصل نہ ہوسکا۔ ان مثنویوں کے بعد دوسرا درجہ شوق کی مثنویوں کا ہے۔ چنانچہ جناب پروفیسر سروری صاحب اپنے ایک مقالے میں لکھتے ہیں "شوق کے بعد شاید ہی کوئی منظوم قصہ ایسا لکھا گیا ہو جس کو ادبیات العالیہ میں جگہ مل سکے"۔ یہ "شاید" کا لفظ بجا طور پر استعمال کیا گیا تھا کیونکہ ادب کے وسیع میدان میں خدا جانے ایسے کتنے خزانے مدفون ہیں جو تلاش و جستجو کی نگاہوں سے روپوش ہیں۔ اس وقت مثنویوں کا ایک مجموعہ "پنجۂ نگارین" میرے پیش نظر ہے۔ اس کے مصنف شاعر دربار راج بلرام پور جناب حافظ خلیل حسن صاحب خلیل مرحوم ہیں جو استاذ السلطان نواب فصاحت جنگ بہادر حضرت جلیل کے برادر کلاں تھے۔ یہ مجموعہ پانچ نادر مثنویوں پر مشتمل ہے اور ۱۹۱۴ء میں مطبع مفید عام آگرے میں طبع ہوا۔

(۱) بتخانۂ خلیل (۲) بتکدۂ خلیل (۳) وشینت اور شکنتلا (۴) میگھ دوت (۵) فیروز اور سلمہ ان میں سے بتکدۂ خلیل اور فیروز اور سلمہ طبعزاد مثنویاں ہیں باقی سنسکرت زبان کے ترجمے ہیں۔

اختصار کے مدنظر میں خلیل کی صرف پہلی مثنوی "بتخانۂ خلیل" کا تفصیل کے ساتھ ذکر کروں گا۔ یہ ملک محمد جائسی کی مشہور تصنیف "پدماوت" کا ترجمہ ہے۔ معنف نے مثنوی کے آغاز میں اور کئی جگہ اس کا ذکر کیا ہے۔

فسانا جو بھاکے کا مشہور ہے ۔۔۔ یہ حال اُس میں اس طرح مذکور ہے

اب آگے ہے یہ داستاں اس طرح ۔۔۔ ملک نے کیا ہے بیاں اس طرح

ملک محمد جائسی نے "پدماوت" لکھ کر نہ صرف ہندی بلکہ ہندوستانی زبانوں خصوصاً برج بھاشا پر بڑا احسان کیا۔ ایک طرف تو خود ہندی میں "پدماوت" کے اثر سے بیشتر طبعزاد قصے لکھے گئے اور دوسری طرف ہندوستان کی دیگر زبانوں میں اس تصنیف کے کثیر تراجم ہوئے۔ اردو زبان میں سب سے پہلے پدماوت ۱۶۸۰ء میں منتقل کی گئی اور جیسا کہ پروفیسر ڈاکٹر زور نے "اردو شہ پارے" میں لکھا ہے گولکنڈہ کے مشہور شاعر ابوالحسن تاناشاہ کے معاصر غلام علی نے اس کو نظم کیا۔ اس کا دوسرا منظوم ترجمہ ولی ویلوری نے کیا اور اسے "رتن پدم" کے نام سے موسوم کیا۔ آخر الذکر دونوں تراجم اس وقت کے ہیں جب اردو زبان پروان چڑھ رہی تھی۔ ابھی اچھی طرح نکھری نہ تھی اور جس وقت خلیل نے اس مثنوی

کو لکھنے کے لئے قلم اٹھایا اُس وقت عروس اردو کے بکھرے ہوئے گیسو زمانے کی مشاطہ کے ہاتھوں سنوارے جا چکے تھے۔ زبان میں حُسن بیان، لطف محاورہ اور روزمرہ جھلکیاں لے رہا تھا۔ اس لحاظ سے خلیل کی مثنوی کا پایہ بہت بلند ہو گیا ہے اور اس کے ایک غائر تنقیدی مطالعے کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ سحر البیان، گلزار نسیم اور شوق کی مثنویوں زہرِ عشق اور بہارِ عشق سے اس کا پایہ کسی قدر کم نہیں۔

بحر اور طرزِ بیان کے لحاظ سے یہ مثنوی میر حسن کی سحر البیان سے بہت ملتی جلتی ہے گو بظاہر سحر البیان کا پلاٹ نصرتی کے "منوہر اور مدمالتی" سے ماخوذ معلوم ہوتا ہے۔ پھر بھی وہ ایک حد تک طبع زاد ہی ہے۔ خلیل کی اس مثنوی کو طبع زاد نہیں کہا جا سکتا لیکن بیان کے اسلوب میں ایسی بے ساختگی اور ایسی روانی ہے کہ پڑھنے والا ایک لمحے کے لئے بھی یہ تصور نہیں کر سکتا کہ وہ ایک ہندی تصنیف کا منظوم ترجمہ پڑھ رہا ہے۔ ان خصوصیات کے مدنظر اگر سحر البیان اور خلیل کی "پدماوت" کے ایک ہی قسم کے مناظر پہلو بہ پہلو پیش کئے جائیں تو یہ موازنہ اہلِ ذوق کے لئے خالی از دلچسپی نہ ہوگا اور حق تو یہ ہے کہ فی زمانہ بغیر تقابل کے کسی شے کی وقعت و قیمت کا ٹھیک ٹھیک اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

مثنوی کا آغاز حمد سے ہوتا ہے۔

جو چاہا لکھوں حمد اٹھا کر قلم　　گرا ہاتھ سے تھرتھرا کر قلم
ثنائی یہ دہشت جگر پھٹ گیا　　اٹھائی وہ خفت کہ کٹ کٹ گیا
ثنا اُس کی کوئی کرے کیا مجال　　کوئی حمد کا دم بھرے کیا مجال
یہاں پاؤں امکان کا لنگ ہے　　فرشتوں کا بھی حوصلہ تنگ ہے

. . . .

پھر نعت اور مناجات کے مرحلے طے کرتے ہوئے داستان کا آغاز ساقی نامے سے ہوتا ہے۔

مے ناب سے جام بھر ساقیا　　مجھے بھی مرید آج کر ساقیا
بہت تو نے وعدوں پہ ٹالا مجھے　　پلا آج اپنا پیالا مجھے
کروں جس میں دل سے اطاعت تری　　ملی ہے نصیبوں سے خدمت تری
بنا تو بھی پورا شرابی مجھے　　چھلکتی ہوئی دے گلابی مجھے

بقول مولانا شبلی مثنوی کا سب سے پہلا اور سب سے بڑا حسن اُس کی اچھی ترتیب ہے۔ اس ترتیب کے لحاظ سے مثنوی گلزار نسیم مکمل ہونے کے باوجود وہ روانی اور یکسانیت نہیں رکھتی جو سحر البیان کا خاص جوہر ہے۔ لیکن خلیل کی یہ مثنوی اتنی ہی جامع اور مکمل ہے جتنی سحر البیان۔ شاعر جب قصے کو طویل کرنے کے لئے ضمنی واقعات کی کڑیوں کا اضافہ کرتا ہے تو عموماً یہ تسلسل بے ربط ہو جاتا ہے۔ مثنوی نگار کے لئے یہ وقت بڑا نازک ہوتا ہے۔ میر حسن نے نجومیوں کی اس پیشینگوئی سے کہ بارہ برس کی عمر میں شہزادے پر کوئی آفت پڑے گی۔ قصے کے تسلسل میں ہم آہنگی اور ربط پیدا کر دیا۔ گلزار نسیم میں ایسے موقعوں پر بڑی کمزوری نظر آتی ہے۔ لیکن خلیل ایسے موقعوں پر بھی ایک مکمل آرٹسٹ نظر آتا ہے۔

پدماوت کے بولنے والے طوطے کو اس کی خادمہ . . . . . . کنوئیں میں ڈال دیتی ہے، کنوئیں سے نکلتے ہی وہ شکاری کے دام میں پھنس جاتا ہے۔ ایک برہمن جو سراندیپ کا سفر کرتا ہے اُسے خرید کر چتوڑ گڑھ کے نوجوان راجہ رتن سین کی نذر کرتا ہے۔ رتن سین اور اس کی بیوی ناگمت اُسے جان کی طرح عزیز رکھتے ہیں۔ حسن پر مغرور ناگمت ایک روز اپنا بناؤ سنگار کرتی ہے اور طوطے کے پاس آتی ہے۔

کہا اے زمانے کو جھیلے ہوئے　　اکھاڑے میں پریوں کے کھیلے ہوئے
قسم ہے تجھے اپنے ایمان کی　　رتن سین کے سر سہرے جان کی
نظر آتی ہے یہ ملاحت کہیں　　مری سی بھی دیکھی ہے صورت کہیں
سراندیپ کا حُسن مشہور ہے　　وہاں جو ہے وہ غیرت حور ہے
اُسی دیس کا رہنے والا ہے تو　　حسینوں کے ہاتھوں کا پالا ہے تو
بتا واں بھی ایسی حسین ہے کوئی　　مری طرح بھی نازنیں ہے کوئی
کہا اُس نے شک کیا ہے اچھی بھی ہو　　رسیلی بھی ہو، بانکی ترچھی بھی ہو

طوطے کی یہ معمولی تعریف اُسے پسند نہیں، بگڑ کر کہتی ہے۔

کہا تو نے تعریف طوطے نہ کی　　مرے حُسن کی داد تو نے نہ دی
سوا مجھ سے کوئی حسیں ہوگا کیا　　برابر مرے نازنیں ہوگا کیا

یہ کہنا طوطے کے دل پر گراں گذرا۔

کہا اُس نے یہ ناز اچھا نہیں　　تکبر حسینوں کو زیبا نہیں
حسینوں سے خالی یہ خلقت نہیں　　کسی بُت کو سب پہ فضیلت نہیں
سراندیپ میں ایک گلفام ہے　　پری زاد ہے، پدمنی نام ہے
بنایا ہے خالق نے ایسا اُسے　　کہ زاہد بھی کرتے ہیں سجدا اُسے

غرض بات بڑھتی ہے اور رتن سین طوطے کے منہ سے پدمنی کے حسن کی تعریف سن کر اُس پر عاشق ہو جاتا ہے۔ نفسیاتی نقطۂ نظر سے پدماوت کا سراپا کھینچنے کے لئے شاعر نے طوطے کے منہ میں ایسے اشعار کہے ہیں جو یقیناً کسی اُمنگ بھرے جوان دل کو ٹھیس لگائے بغیر نہیں رہ سکتے۔ سنئے۔

عجب حسن پایا ہے اُس ماہ نے بنایا ہے آپ اُس کو اللہ نے

نظر آنکھ میں، آرزو دل میں ہے چمن میں ہے گل، شمع محفل میں ہے

بڑی قد سے بھی اُس کی لمبان ہے وہ چھل بل ہے ناگن بھی قربان ہے

وہ مانگ اس کی ہے راہ ظلمات کی جبیں چاند ہے چودھویں رات کی

سوا ہونٹھ یاقوت سے لال ہیں وہ بے پان کھائے ہوئے لال ہیں

وہ نوخیز جوبن کا عالم غضب اُبھار اُن کا سینے پہ کم کم غضب

کمر ہی کے حصے میں آیا ہے لوچ رگ گل سے بھی بڑھ کے پایا ہی لوچ

نہ دُبلا، نہ ایسا اکہرا بدن نہایت ہی موزوں چھریرا بدن

سرورِ جگر راحتِ دل ہے وہ کلیجے میں رکھنے کے قابل ہے وہ

یہ جی چاہتا ہے کہ دیکھا کرے کرے تو اُسی بت کو سجدہ کرے

یہاں پہنچ کر قصہ یک بیک پلٹا کھاتا ہے لیکن پڑھنے والے کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ کوئی کڑی خارجی طور پر شامل ہو گئی ہے۔

مثنوی کی تیسری خصوصیت واقعہ نگاری خیال کی جاتی ہے یعنی ہر چیز کو اُس کے جزئیات سمیت پیش کرنا، اس طرح کہ جس چیز کا بیان ہو رہا ہو اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے کھنچ جائے۔ چونکہ شاعری درحقیقت ایک قسم کی مصوری ہے۔ اس لئے جب تک واقعہ نگاری میں اس قسم کی خصوصیات نہ دکھائی جائیں کسی واقعہ یا کسی شے کی اصلی تصویر اور صحیح شکل ذہن میں نہیں آسکتی۔ میر حسن اس فن کے استاد ہیں لیکن اکثر موقعوں پر وہ اتنی گہری اور بے ضرورت تفصیل میں پڑ گئے ہیں کہ دماغ بار محسوس کرنے لگتا ہے اور طبیعت کسل مند ہو جاتی ہے۔ واقعہ نگاری کی چند مثالیں سحر البیان سے ملاحظہ ہوں۔ شاہزادہ بے نظیر کے حمام کرنے کا منظر

ہوا جبکہ داخل وہ حمام میں عرق آگیا اس کے اندام میں

تنِ نازنیں نم ہوا اس کا، کُل کہ جس طرح ڈوبے ہے شبنم میں گل

لبوں پر جو پانی پڑا سر بسر نظر آئے جیسے وہ گلبرگ تر

ہوا قطرۂ آب یوں چشم بوس کہے تو پڑی جیسے نرگس پہ اوس

اب خلیل کی واقعہ نگاری دیکھئے پدماوت اپنی سہیلیوں کے ساتھ اپنے باغ کی نہر میں نہا رہی ہے۔

پہن کر گریں ساریاں نہر میں ہوئیں جا کے جلوہ کناں نہر میں

کوئی تو کنارے نہانے لگی کوئی بڑھ کے غوطے لگانے لگی

کنارے کوئی اس کے اندر کوئی سکھانے لگی بال دھو کر کوئی

جھٹک کر لٹیں دوش پر ڈال دیں اِدھر ڈال دیں کچھ اُدھر ڈال دیں

آخری شعر کی تو تعریف نہیں ہو سکتی۔ اسی سلسلے میں آگے چل کر کہتے ہیں (خارجی شاعری ملاحظہ ہو!)

منور وہ آب اُس کا سارا ہوا اُٹھا بلبلا جو ستارا ہوا

جو پانی پڑا اور بھیگا بدن چھپا ساریوں میں نہ اُن کا بدن

لپٹ کر وہ جلدِ بدن ہو گئیں برہنہ وہ سب سیمتن ہو گئیں

پری بن گئی پدمنی اور بھی جو بھیگی تو وہ اُڑ چلی اور بھی

عجب نور تھا جسمِ شفّاف پر پھسلتا تھا پانی تنِ صاف پر

کوئی بوند ساکن اگر ہو گئی تو عکسِ بدن سے گہر ہو گئی

ہوا بھیگنے سے بدن اس طرح کوئی پھول شبنم سے تر جس طرح

یا ناگمت کے بناؤ سنگار کرنے کا منظر

ہوئی ایک دن صبح جب آشکار چلی ناگمت اپنا کرنے سنگار

نہا کر گھنے بال پھیلا دیئے جفاکار نے جال پھیلا دیئے

بڑھی سانپ کی طرح لہرا کے زلف زمیں پر لگی لوٹنے آ کے زلف

لٹک کر جو چھل بل وہ دکھلا گئی تو پتلی کمر تین بل کھا گئی

بہت شوخ ہاتھوں میں مہندی ملی لبوں پر دھواں دھار مسّی ملی

ستم اُس پہ لاکھا جما کر کیا جفا پر جفا پان کھا کر کیا

لگایا جو کاجل ستم ڈھا دیا نظر پھیر کر سب کو تڑپا دیا

دوپٹے کو کچھ سر سے سرکا دیا اک آنچل کو کاندھے سے لٹکا دیا

کمر بال سی سینہ نکلا ہوا جوانی کے دن، حسن اُبلا ہوا

کمر نازکی سے لچکتی ہوئی پسِ پشت چوٹی لٹکتی ہوئی

جذبات نگاری بھی مثنوی کی ایک بڑی اہم خصوصیت ہے۔

میر حسن تو اس فن کے استاد ہی تھے۔ بے نظیر کی جدائی میں بدر منیر کی بے قراری دیکھئے۔ لکھتے ہیں۔

خفا زندگانی سے ہونے لگی   بہانے سے جا جا کے سونے لگی
تپِ غم کی شدت سے وہ کانپ کانپ   اکیلی لگی رونے منہ ڈھانپ ڈھانپ

کہا گر کسی نے کہ بی بی چلو   تو اُٹھنا اُسے کہہ کے ہاں جی چلو

جو پانی پلانا تو پینا اُسے   غرض غیر کے ہاتھ جینا اُسے

خلیل کی بھی جذبات نگاری ملاحظہ ہو۔ محبت کی پہلی چوٹ کھائی ہوئی پدماوت کی کیفیت

لگا جوشِ غم میں غش آنے اُسے   مگر کچھ سنبھالا حیا نے اُسے
نئی بات اُسے دل سوجھانے لگا   غم اُٹھ اُٹھ کے دل کو بٹھانے لگا
ہنسی نے لبوں سے کنارا کیا   تڑپ نے جگر پارہ پارہ کیا

گرانباریٔ جانِ بسمل بڑھی   گھٹا زور، بے تابیٔ دل بڑھی
تمنائے دل جوش کھانے لگی   طبیعت کو وحشت ستانے لگی

جذبات نگاری کی دوسری سچی تصویر ملاحظہ ہو۔ پدماوت رتن سین کے خط کا جواب لکھنے بیٹھی ہے۔ اس وقت جو حالات اس پر اثر انداز ہیں وہ یہ ہیں۔ رتن سین اس کا نادیدہ عاشق اور جوگی بن کر اس کے دیس آتا ہے۔ فطرتاً اس کا اثر پدماوت کے نازک دل پر ہوتا ہے وہ اُسے چھپانا چاہتی ہے لیکن نہیں چھپا سکتی۔ خط لکھنے کے لئے قلم اٹھاتی ہے تو حیا دامن پکڑتی ہے۔ کبھی ایسا کام نہیں کیا۔ لکھے تو کیسے لکھے اور کیا لکھے۔

پڑی سوچ میں لکھوں القاب کیا   میں اس کے لئے ڈھونڈوں آداب کیا
لکھوں اس کو راجہ کہ جوگی لکھوں   کہ الفت کا بیمار روگی لکھوں
جو لکھتی ہوں عاشق مناسب نہیں   جو مشتاق لکھتی ہوں واجب نہیں
دیا لکھ کے کاٹ اس کو اے مہرباں   کیا چاک خط لکھ کے اے قدرداں

لکھا آخر اے طالبِ بے قرار   مرے حسنِ نادیدہ کے خواستگار
مرے حسن کی چوٹ کھائے ہوئے   مری زلف میں دل پھنسائے ہوئے

جو خط تم نے لکھا وہ مجھ کو ملا   کروں اپنے طوطے کا کیا میں گلا

خبر اُس نے تم کو یہ دی ہے غلط   مری اُس نے تعریف کی ہے غلط
مری شکل و صورت تو اچھی نہیں   اجی جھوٹ ہے، سچ یہ کچھ بھی نہیں
مرے واسطے جوگ لینا نہ تھا   مرے دل پہ یہ داغ دینا نہ تھا
کچھ اچھا نہ یہ کام تم نے کیا   مجھے مفت بدنام تم نے کیا

وہ لکھ کر وہ پڑھنے لگی اپنا خط   کہ لکھ تو نہیں ہیں گئی کچھ غلط
پڑھا تو بہت آئی اس کو حیا   کہ ہیں، اس کو میں لکھ رہی ہوں یہ کیا
یہ میرے لئے تو کچھ اچھا نہیں   شریفوں کو یہ بات زیبا نہیں
انہیں ساری باتوں پہ کر کے نظر   دیا اُس نے پھینک اپنا خط پھاڑ کر

یا رتن سین کے غم میں اس کی بیوی ناگمت کا اضطرار

ہوئی دردِ فرقت سے دلگیر وہ   سراپا ہوئی غم کی تصویر وہ
ہوا جوشِ غم، چشم نم ہو چلی   وہ شوخی نگاہوں سے کم ہو چلی
سوا دن سے راتوں کو رونے لگی   سحر آنکھوں آنکھوں میں ہونے لگی
جو تھے پھول سے گال کوئے ہوئے   وہ جوبن جگر کے پھپھولے ہوئے

کبھی سر کو پکڑے جھکائے کبھی   کبھی دل کو تھامے دبائے کبھی

گراں پیرہن اس کو تن پر ہوا   وہ جینا جدائی کا دُوبھر ہوا
الگ چوڑیاں پھوڑ کر پھینک دیں   اِدھر پھینک دیں کچھ اُدھر پھینک دیں

نہ کھانے کا اس کو نہ پینے کا ہوش   نہ مرنے کی پروا نہ جینے کا ہوش

یا جب جدائی کی تاب نہ لا کر ناگمت اپنے بے وفا رتن سین کو خط لکھتی ہے۔ خط کا ہر شعر جذبات میں ڈوبا ہوا ہے اور مضطرب دل کی سچی تصویر ہے

لکھا بے وفائے زمانہ اُسے   لکھا عاشقِ غائبانہ اُسے
شہِ کشورِ بے وفائی لکھا   درِ بحرِ نا آشنائی لکھا
لکھا اُس کو اے راحتِ دل مرے   جفاکار۔ جلاد۔ قاتل مرے
کہاں چھا رہا، بے وفا جا کے تو؟   کدھر رم رہا مجھ کو تڑپا کے تو؟
تجھے فکر کچھ ناگمت کی بھی ہے   خبر اس کی کچھ خیریت کی بھی ہے
تری ناگمت تو جہاں سے چلی   ترے گھر سے، تیرے مکاں سے چلی
چلی روٹھ کر زندگانی سے وہ   چلی پھیر کر منہ جوانی سے وہ

کدھر وہ تری جھوٹی الفت گئی   کدھر وہ زبانی محبت گئی
مجھے تو نہ دنیا کی لذت ملی   کسی روز دل کو نہ راحت ملی

اکیلی بھری انجمن میں رہی   پریشاں ہمیشہ چمن میں رہی

اسی سلسلے کے چند اور شعر ملاحظہ ہوں جذبات نگاری کی یہ معراج ہے۔

بتا تو ہی یہ غم سہوں کس طرح   مکاں میں اکیلی رہوں کس طرح
نہیں سوجھتا کچھ کدھر جاؤں میں   یہ جی میں ہے کچھ کھا کے مر جاؤں میں

کٹے ہائے برسات تو کس طرح   کٹے چاندنی رات تو کس طرح
کٹیں کس طرح زندگانی کے دن   جوانی کی راتیں، جوانی کے دن

آخر کے دو شعروں کی تو تعریف نہیں ہو سکتی۔

مناظر کشی میں میر حسن ہمیشہ نسیم سے آگے رہے۔ چاندنی رات اور جنگل کا منظر ملاحظہ ہو۔

وہ سنسان جنگل وہ نورِ قمر   وہ براق سا ہر طرف دشت و در
وہ اجلا سا میداں چمکتی سی ریت   اگا نور سے چاند تاروں کا کھیت
درختوں کے پتے چمکتے ہوئے   خس و خار سارے جھمکتے ہوئے
درختوں کے سائے سے مہ کا ظہور   گرے جیسے چھلنی سے چھن چھن کے نور

اب خلیل کی منظر نگاری دیکھئے۔ گرمی کی دوپہر کا سماں کیا خوب کھینچا ہے۔

وہ دن جیٹھ بیساکھ کے اور وہ دھوپ   ہر اک شے تھی بدلے ہوئے اپنا روپ
جگر خشک ہوتے تھے لب کی طرح   سیہ فام دن بھی تھا شب کی طرح
بڑا دھوپ کا زور دنیا میں تھا   سمندر بھی پوشیدہ دریا میں تھا
جو غنچہ تھا شک اس پہ تھا نار کا   جو پتا تھا چہرہ تھا بیمار کا

ہوا آگ تھی ہر مکاں آگ تھا   زمیں آگ تھی، آسماں آگ تھا

میر حسن کا بیان شروع سے آخر تک سادہ اور نیچرل ہے لیکن اس سادگی کے باوجود تشبیہہ و استعارے سے انہوں نے گریز نہیں کیا۔ بعض نقادوں کا خیال ہے کہ مثنوی کا حسن مبالغہ سے پرہیز کرنا ہے اور جذبات کی عریاں تصویر کھینچنا صرف اسی وقت ممکن ہے جبکہ انداز بیان بالکل فطری اور نیچرل ہو۔ تشبیہیں، استعارے، صنائع بدائع جذبات کی سچی تصویر کو دھندلا کر دیتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ایک ایسی ناکمل تصویر ہوگی جس میں نہ تو رنگ ہوگا اور نہ چمک یعنی انہیں عناصر کی کمی ہوگی۔ جو تصویر کو جاذبِ نظر بنانے کے لئے ضروری ہیں۔ یہی نظریہ میر حسن اور خلیل کا تھا۔ پہلے سحر البیان کی چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔

وہ گورا بدن اور بال اُس کے تر   کہے تو کہ ساون کی شام و سحر

نہانے میں یوں تھی بدن کی دمک   برسنے میں بجلی کی جیسے چمک

وہ رو رو کے دو ابرِ غم یوں ملے   کہ جس طرح ساون سے بھادوں ملے

اب دوسری طرف خلیل کی پدماوت دیکھئے۔

ہوا بھیگنے سے بدن اس طرح   کوئی پھول شبنم سے تر جس طرح

کوئی بوند ساکن اگر ہو گئی   تو عکسِ بدن سے گہر ہو گئی

ہوا سے تھیں شاخیں جھکیں اس طرح   جھکائے دلہن ہو نظر جس طرح

کٹاری سے بڑھ کر نظر ہے مری   رگِ گل سے بڑھ کر کمر ہے مری

مکالمہ بھی مثنوی کی ایک خصوصیت ہے۔ یہ جس قدر سادہ اور بے تکلف ہوگا۔ اسی قدر دل پر اثر کرنے والا اور نیچرل ہوگا۔ نجم النساء اور بدر منیر کا مکالمہ میر حسن کی زبان سے سنئے۔ نجم النسا شاہزادی کو سمجھا رہی ہے۔

مجھے چوچلے تو خوش آتے نہیں   ترے ناز بے جا یہ بھاتے نہیں
مجھے بھی ذرا دیکھ تو لے ہائے   مثل ہے کہ من بھائے منڈیا ہلائے
ٹک اک حظ اٹھا زندگانی کا تو   مزا دیکھ اپنی جوانی کا تو

یہ سُن سُن کے وہ نازنیں مسکرا   لگی کہنے اچھا بھلا ری بھلا
میں سمجھی ترا دل گیا ہے کدھر   بہانے تو کرتی ہے کیوں مجھ پہ دھر
لگی کہنے ہنس ہنس کے وہ ماہ وش   ہوئی تھی اُسے دیکھ میں ہی تو غش
تمہیں نے تو چھیڑا کا تھا مجھ پر گلاب   بھلا میری خاطر بلا لو شتاب

اب خلیل کی طبع کے بھی جوہر دیکھئے مغرور ناگمت اپنی سوت پدماوت کو اپنے شاہی باغ میں تفریح کے لئے بلاتی ہے تاکہ اپنا خوشنما باغ اس کو دکھا کر رشک سے جلائے۔ پدماوت آتی ہے ناگمت اُس

اپنے باغ کا ایک ایک گوشہ اور ایک ایک روش دکھا کر کہتی ہے ۔

کہ اس باغ کا آج ہمسر نہیں کوئی باغ اس کے برابر نہیں

پدماوت کو یہ غرور پسند نہیں آتا کہتی ہے ۔

مجھے سخت حیرت ہے اس بات کی کہ مدحت سرا تم ہو کس بات کی
ستائش کے قابل تو گلشن نہیں کسی پھول پر اس کے جوبن نہیں

یہ کیوں پیڑ اتنے ملائے گئے گھنے اس قدر کیوں لگائے گئے
یہ بے میل ہر ایک تھالا ہے کیوں یہ سوسن کے تختے میں لالا ہے کیوں
چنبیلی یہاں اور بیلا وہاں ہزارا یہاں اور گیندا وہاں
یہ نسرین سے ہے نسترن کیوں الگ پڑی ہے وہاں یاسمن کیوں الگ

نہیں کوئی تختہ بری عیب سے جو کیاری ہے وہ ہے بھری عیب سے

یہ سن کر وہ جامے سے باہر ہوئی وہ اک بارگی خاک جل کر ہوئی
کہا رنج دینے کی گھاتیں ہیں یہ حسد کی، عداوت کی باتیں ہیں یہ
امارت، نفاست کی لیتی ہو تم یہی ہر گھڑی چھیڑ دیتی ہو تم

لڑائی بڑھتی ہے اور دلچسپ صورت اختیار کر لیتی ہے ۔
ناگمتی تیوری پر بل ڈال کر کہتی ہے ۔

مری تجھ سے کیا کچھ ہے صورت بری ملاحت بری ہے کہ رنگت بری
تری طرح گو، گوری چٹی نہیں مگر میں غضب کی ہوں مٹی نہیں
نمک جو مرے سانولے پن میں ہے جو جادو مری ترچھی چتون میں ہے
تجھے حشر تک وہ میسر نہیں حسیں کوئی میرے برابر نہیں
نہ شوخی ہو جس میں وہ عورت ہی کیا نمک ہو نہ جس میں وہ صورت ہی کیا
نہ بھونرے ہوئے مجھ پہ عاشق تو کیا نہ کیڑے ہوئے گر موافق تو کیا

پدماوت آپے سے باہر ہو جاتی ہے اور بگڑ کر جواب دیتی ہے ۔

وہ بولی کہ چل ہٹ ، سرک ، دور ہو بہت اب نہ بیہودہ بک ، دور ہو
بڑی ایک یہ حسن والی ہوئی جہاں میں یہ سب سے نرالی ہوئی
مرا جا کے راجہ سے تو حال پوچھ مرے حسن کا اس سے احوال پوچھ
لیا تھا یہ جوگ اس نے تیرے لئے کہ پہنچا سراندیپ بیسر کے لئے

ایسے نمونے خلیل کے پاس زیادہ نہیں اور نہ کردار نگاری کی

عمدہ مثالیں ہیں ۔ وجہ یہ ہے کہ افسانے کے پلاٹ نے انہیں اس طرف اپنے جوہر دکھانے کا کوئی موقع ہی نہیں دیا ۔

اب تک جتنی باتیں اوپر بیان کی جا چکی ہیں ۔ اُن سے صرف مثنوی کے مواد پر روشنی پڑتی ہے ۔ اب اندازِ بیان اور طرزِ ادا پر ایک نظر ڈالنا ہے ۔ ہر مصنف کا پیرایۂ بیان خاص ہوتا ہے ۔ مثلاً نسیم اور میر حسن کی زبان اور اندازِ بیان کا مقابلہ کسی طرح نہیں کیا جا سکتا ۔ میر حسن کا بیان جس قدر سادہ اور نیچرل ہے نسیم کا اُسی قدر پیچیدہ اور تشبیہ و استعارے سے مملو ۔ بیان کی سادگی کی حد تک خلیل میر حسن کے پہلو بہ پہلو ہیں لیکن ساتھ ہی ساتھ ادائے بیان کے لئے انہوں نے جو پیرایہ اور نہج اختیار کیا ہے وہ کافی موثر اور دلچسپ ہے ۔ مثلاً پدماوت کی (کمسنی) کو جن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے اُس سے مصنف کی قادر الکلامی کا پتہ چلتا ہے ۔

ابھی دخل ناز و ادا میں نہیں وہ مشتاق جور و جفا میں نہیں
نہیں جانتی وہ نکھرنا ابھی نہیں اس نے سیکھا سنورنا ابھی
ابھی اُتری منت کی ہنسلی نہیں ابھی پوری چودہ برس کی نہیں
ابھی اُس کے ہیں اُٹھتے جوبن کے دن ہنسی، کھیل کے، چلبلے پن کے دن
نہیں وہ بنی ہے دلہن اب تلک اچھوتی ہے وہ گلبدن اب تلک

یا جب پدمنی رتن سین سے ملنے جاتی ہے ۔

اتر کر خراماں خراماں چلی لئے سینکڑوں دل میں ارماں چلی
چلی بڑھ کے شیریں سوئے کوہکن چلی شوق میں نل سے ملنے دمن
زیارت کو وامق کی عذرا چلی گلے ملنے مجنوں کے لیلےٰ چلی
چلی ہنستی بادِ سحر کی طرح چلی اپنی تیغِ نظر کی طرح
وہ ناگن سی چوٹی لٹکتی ہوئی وہ آنکھوں سے مستی ٹپکتی ہوئی

کہیں تو کڑے سے کڑے لڑ گئے کہیں کھا کے ٹھوکر چھڑے لڑ گئے
کہیں بج کے گھنگرو نے بیداد کی کہیں لڑ کے چھاگل نے فریاد کی

نسیم کا کمال یہ ہے کہ وہ ایک زبردست آرٹسٹ کی طرح طویل مضامین کو چند اشعار میں ادا کر دیتا ہے اور وہ بھی نہایت حسن اور خوش اسلوبی کے ساتھ ۔ بکاولی کے سونے کی تصویر صرف دو شعروں میں کھینچی ہے ۔

بند اُس کی چشمِ نرگسی تھی چھاتی کچھ کچھ کھلی ہوئی تھی

سمٹی تھی جو محرم اُس قمر کی   برجوں پہ سے چاندنی تھی سَرکی

لیکن خلیل میر حسن کی طرح جزئیات کی تفصیل سے کام لیتے ہیں اور اسی کو آرٹ سمجھتے ہیں۔ پدماوت کے سونے کی تصویر جس دلفریب انداز میں کھینچی ہے اس کی تعریف نہیں ہوسکتی۔

ستم ڈھا رہی ہے جوانی کی نیند   وہ مستی بھری شادمانی کی نیند
گلے میں ہے ہار اک معطر پڑا   دوپٹا ہے مل کا مُنہ پر پڑا
مگر لی ہیں جو کروٹیں ناز سے   تو کچھ ہٹ گیا ہے وہ انداز سے
وہ جوبن جو تنگی سے گھبرائے ہیں   تو انگیا سے کچھ کچھ نکل آئے ہیں

بکھر کر پڑے کچھ ہیں چہرے پہ بال   ڈھکے اُن سے کچھ پھول سے ہیں گال
مگر بال لپٹے جو ہیں پیار سے   دبے ہیں جو تکیے پہ رخسار سے
تو ظاہر ہیں گالوں پہ سارے نشاں   نظر آتے ہیں پیارے پیارے نشاں

دوسری مثال ملاحظہ ہو۔ کسی بڑے غم اور صدمے کے وقت انسان کی جو مضطربانہ کیفیت ہوتی ہے اُس میں اُس کے ہوش و حواس بجا نہیں رہتے اور وہ ہر چیز کو اپنا رازداں سمجھنے لگتا ہے۔ مثلاً بکاؤلی کی حالت اُس وقت جب کہ اس کا پھول کھو جاتا ہے۔ نسیم کی زبان سے سنیئے۔ وہ حالتِ اضطراب میں ہر شے سے استفسار کرتی ہے۔

نرگس تو دکھا کدھر گیا گُل   سوسن تو بتا کدھر گیا گُل
سنبل مرا تازیانہ لانا   شمشاد اسے سولی پر چڑھانا

خلیل نے بھی بعض موقعوں پر اسی طرز کو اختیار کیا ہے۔ اور شاعری کے خوب جوہر دکھائے ہیں۔ رتن سین پدمنی کے عشق میں اپنی بیوی ناگمت کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ اُس کے چلے جانے کے بعد وہ غم کی ماری دیوانی سی ہو کر ہر چیز پر اس کو نہ روکنے کی تہمت لگاتی ہے۔

کرشموں نے بھی کچھ نہ ٹوکا اُسے   نہ غمزوں نے بھی ہائے روکا اُسے
کیا کچھ نگاہوں نے جادو نہ ہائے   چلے پیچ کچھ اُس پہ گیسو نہ ہائے
یہ پازیب تو پاؤں پڑتی ذرا   کمر کر دھنی تو پکڑتی ذرا
یہ مُنھ دیکھتی آرسی کیوں رہی   یہ مُنھ باندھے چنپا کلی کیوں رہی
نہ چوڑی نے بھی ہاتھ پکڑا ذرا   نہ زنجیر نے پاؤں جکڑا ذرا
چل اب یاں سے بجنی سرک دور ہو   نہ سینے پہ بیرے چمک دور ہو
گلا چھوڑ دے چھلڑی تو بھی اب   نہ رہ ناک میں نتھ پڑی تو بھی اب
مرے پاؤں سے تو بھی چھاگل نکل   گلے سے مرے تو بھی ہیکل نکل
کلائی مری چھوڑ کنگن ذرا   سرک بیر سے بازو سے جوشن ذرا

جہاں یہ سب کچھ ہے وہاں خلیل نے حقائق سے بھی گریز نہیں کیا اور قدم قدم پر اخلاقی درس دیئے ہیں۔

کڑی ہے محبت کی منزل بہت   وہاں تک پہنچنا ہے مشکل بہت
جگر میں یہ ہوتا ہے نالا کبھی   کلیجے کا بنتا ہے چھالا کبھی
گلے کا یہ خنجر کبھی بن گیا   رگِ جاں کا نشتر کبھی بن گیا
کبھی زخمِ دل کا نمکداں ہوا   جگر میں کبھی نوکِ پیکاں ہوا

نظر جس پہ کی جی سے کھویا اُسے   دیا جس کو پانی ڈبویا اُسے
قیامت کی اس بحر کی لہر ہے   جو قطرہ ہے وہ سانپ کا زہر ہے

تکبر ہے اللہ کو ناپسند   نہیں کبر اس کو کسی کا پسند

حسینوں سے خالی یہ خلقت نہیں   کسی بت کو سب پر فضیلت نہیں

یہ خلیل کی مثنوی کی ایک جھلک ہے جو دکھائی گئی۔ حق تو یہ ہے کہ جب تک ساری کتاب کا تفصیلی مطالعہ نہ کر لیا جائے اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے کہ فطرت نے کتنی شاعرانہ خوبیاں مصنف میں جمع کر دی ہیں۔ انشاء اللہ رفتہ رفتہ بقیہ مثنویوں کو بھی منظرِ عام پر لانے کی کوشش کروں گا۔

علی احمد

دریچے کے قریب

جاگ اے شمعِ شبستانِ وصال
محفلِ خواب کے اس فرشِ طربناک سے جاگ!
لذّتِ شب سے ترا جسم ابھی چُور سہی
آ مِری جان، مِرے پاس، دریچے کے قریب!
دیکھ کس پیار سے انوارِ سحر چُومتے ہیں
مسجدِ شہر کے میناروں کو!
جن کی رفعت سے مجھے
اپنی برسوں کی تمنّا کا خیال آتا ہے۔
سیمگوں ہاتھوں سے اے جان ذرا
کھول مے رنگ، جنوں خیز نگاہیں اپنی،
صبح کے نور سے شاداب سہی،

اِسی مینار کے سائے تلے کچھ یاد بھی ہے
اپنے بیکار خدا کے مانند
اُونگھتا ہے کسی تاریک نہاں خانے میں
ایک افلاس کا مارا ہوا مُلّائے حزیں
ایک عفریت، اُداس!
تین سو سال کی ذلّت کا نشاں
ایسی ذلّت کہ نہیں جس کا مداوا کوئی!

دیکھ بازار میں لوگوں کا ہجوم
بے پناہ سیل کے مانند رواں۔
جیسے جنّات بیابانوں میں۔

مشعلیں لے کے سرِ شام نکل آتے ہیں۔
اِن میں ہر شخص کے سینے کے کسی گوشے میں
ایک دُلہن سی بنی بیٹھی ہے
ٹمٹماتی ہوئی، ننّھی سی، خودی کی قندیل،
لیکن اتنی بھی توانائی نہیں
بڑھ کے اِن میں سے کوئی شعلۂ جوّالہ بنے!
اِن میں مفلس بھی ہیں، بیمار بھی ہیں۔
زیرِ افلاک مگر ظلم سہے جاتے ہیں!
ایک بوڑھا سا، تھکا ماندہ سا رہوار ہوں میں!
بھوک کا شاہسوار
سخت گیر اور تنومند بھی ہے!

اور اس شہر کے لوگوں کی طرح
ہر شبِ عیش گذر جانے پر،
بہرِ جمعِ خس و خاشاک نکل جاتا ہوں
چرخ گرداں ہے جہاں۔
شام کو پھر اسی کاشانے میں لوٹ آتا ہوں
بے بسی میری ذرا دیکھ سہی،
مسجدِ شہر کے میناروں کو
اس دریچے میں سے پھر جھانکتا ہوں
جب انہیں عالمِ رخصت میں شفق چومتی ہے۔

ن۔م۔ راشد

نوادرِ ادبی

غالب کا ایک غیر معروف خط

اس سے پیشتر ہم جناب مالک رام ایم اے کی اعانت سے نوادرِ ادبی کے تحت میں غالب اور حالی کی یاد تازہ کر چکے ہیں۔ آج کی فرصت میں غالب کا ایک غیر معروف خط پیش نظر ہے۔ اردو نثر کے ارتقا میں غالب کے خطوط کو ایک غیر فانی امتیاز حاصل ہے۔ لیکن غالب نے اپنے ابتدائی خطوط مذاقِ زمانہ کا لحاظ رکھتے ہوئے مقفّیٰ عبارت میں لکھے تھے اور بعد کے خطوط صاف اور رواں عبارت ہیں۔ اگرچہ وہی سیدھے سادے خطوط اردو نثر کے ارتقا میں سنگ میل کا درجہ رکھتے ہیں۔ پھر بھی موازنے کے لئے مقفّیٰ عبارت والے خطوط بھی زنجیر کی ایک ضروری کڑی ہیں۔ کیونکہ انہی سے ہم جان سکتے ہیں کہ غالب کا زمانہ اردو کے بدلتے ہوئے رجحانات کے آغاز کا زمانہ تھا۔ اس خط کے لئے ہم مالک رام صاحب کے ممنون ہیں۔ (ادارہ)

(مرزا کی مندرجہ ذیل تحریر ان کے کسی مجموعے میں شامل نہیں۔ یہ پہلی دفعہ دہلی سوسائٹی کے رسالہ مطبوعہ ۱۸۶۶ء میں شائع ہوئی تھی اور دوسری دفعہ اب "ادبی دنیا" کے ذریعے مداحینِ غالب تک پہنچائی جا رہی ہے) مالک رام

حکامِ معدلت فرجام اور صاحبانِ والا مقام کی جناب میں اور حاضرانِ انجمن اور دانندگانِ ہر علم و فن کی خدمت میں بلکہ جو شخص خدا پرست و حق شناس ہے۔ اُس سے یہ التماس ہے کہ یاد کرو ۱۸۵۷ء میں دلی کے رہنے والوں نے حاکموں پر شہر کا دروازہ بند کر دیا اور ایسے فرماں روایانِ دادگر سے لڑائی کا قصد کیا۔ میگزین کا دروازہ کھلوایا اور انہیں کی گولی بارود سے ان پر آگ کا مینہہ برسایا۔ چار مہینے چار دن ظلم کی آنچ کی تیزی رہی قلعہ اور شہر اور باہر خونریزی رہی۔ ناگاہ قہرِ الٰہی اس شدت سے نازل ہوا کہ ہر جاندار کو جینا مشکل ہوا۔ قومِ انگریز کو خدا نے فتح عنایت کی۔ انہوں نے سیاست کے بعد رعیت کی رعایت کی۔ ہر چند حکام کو عفوِ جرائم منظور رہا مگر قہرِ حاکمِ حقیقی بدستور رہا۔ نہ مکیں کا پتہ نہ مکاں کے آثار۔ نہ گلی کوچے نہ وہ بازار۔ مانا کہ شہر کی صورت اب اس سے بہتر ہے مگر وہ عمارت جس پر خدا کے قہر کی آندھی چلی تھی وہ کدھر ہے۔ ع

سپس ہر آئینہ شہرے جدید خواہد بود ؎ نہ آنکہ شاہجہاں ساختہ ز زمانِ قدیم

رفعِ فتنہ و فساد، ظہورِ امن و دادِ مسلم۔ لیکن قہرِ الٰہی سے کچھ پیش نہیں جاتی۔ خلافِ تقدیر تدبیر بن نہیں آتی۔ تین برس برابر کال رہا۔ ہر شخص خستہ و بدحال رہا۔ آب و ہوا کی ناسازگاری طرح طرح کی مصیبت رنگ رنگ کی بیماری، کلیجوں کا تپ کی حرارت سے سلگنا، گھروں میں جابجا آگ کا لگنا، ہوا شرارہ ریز، خاک شعلہ انگیز، دریا اور کوئیں کا پانی زہرا، مینہہ کے پانی کی بوند گوہرِ نایاب، اساڑھ اور ساون برسات کے دو مہینے تمام ہوئے، ساون کے آخر اور بھادوں کے اول دو چار مینہہ ہوئے جن میں پانی اس قدر برسا کہ زمینداروں نے حاصلِ فصلِ ربیع سے ہاتھ دھو لئے، پایان کار کا حال خدا جانے خلق اس کے اسرار کو کیا جانے، گرانی اور ارزانی ایک امرِ عام ہے، مجھے خاص اپنے غرض مدعا سے کام ہے، بوڑھا ہوں، ناتواں ہوں، سچ اگر پوچھئے تو نیم جاں ہوں۔ ع

ضعف نے غالب نکما کر دیا ؎ ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

میں کہاں اور بزم نشینی کہاں نظم و نثر میں وہ رنگینی کہاں، سرکار کی خدمت گزاری کا شائق ہوں، مگر اب صرف دو کام کے لائق ہوں اگر کسی امر میں بذریعہ خط مجھ سے کچھ پوچھا جائے تو وہ لکھ سکتا ہوں جو میری رائے میں آئے، یا اگر تحریرِ نظم و نثر فارسی و اردو کا حکم ہو تو لکھ کر بھیج سکتا ہوں، آئندہ حکام کے پسند ہو یا مقبول ہو جائے ۱۸۰۶ء سے جس کو آج ساٹھ برس ہوئے سرکارِ انگریزی کا نمکخوار ہوں اور ۱۸۵۵ء یعنی دس برس سے شہنشاہِ بحر و بر حضرت فلک رفعت ملکہ معظمہ کا مدحت نگار ہوں، دو قصیدے[1] میرے ولایت پہنچ گئے ان میں سے ایک کی رسید کی اطلاع مجھ کو آ گئی تیسرا قصیدہ میرے مسوّدات میں موجود اور مطلع اس کا یہ ہے ع

نامہ زو کشور یہ چو نامور آمد ؎ از افقِ نامہ آفتاب بر آمد۔

یہ قصیدہ اس کے سزاوار ہے کہ ایران بھیجا جائے اور وہاں کے شعرا سے داد مانگی جائے اب میں جناب صاحب کمشنر بہادر اور مجموع صاحبانِ عالی شان کو سلام کرتا ہوں اور نگارش کو تمام کرتا ہوں۔

راقم۔ اسد اللہ خاں شاعر۔ برادرزادہ نصر اللہ بیگ خاں رئیس سلونک وسلونسہ۔ مرقومہ ۱۱ ماہ اگست ۱۸۶۵ء

---

[1] پہلے قصیدے کا مطلع ہے ع نظم گسترت ز نزمہ خوش کُنُ ہر گرہوں طراز عیش فرق عاشقاں دہم

اور دوسرے قصیدے کا مطلع ہے ع در روزگار انتواں شمار یافت خود روزگار آنچہ دریں روزگار یافت

یہ تینوں قصیدے کلیات میں شامل ہیں۔ پہلا ۱۸۵۵ء میں لکھا گیا تھا اور دوسرا ۱۸۵۸ء میں یہ دستنبو کے ساتھ بھی شامل ہے۔ ان دونوں قصیدوں کے متعلق مرزا کی اردو فارسی تحریروں میں اکثر جگہ اشارے ہیں۔ م۔ ر۔

مرض

سرسوتی کافی معمر ہو چکی تھیں اور ان سے زیادہ ان کے شوہر دینا ناتھ۔ لوگ عموماً سوچا کرتے تھے کہ خدانخواستہ اگر سرسوتی سے پہلے ان کے شوہر مر گئے تو ان پر کیا گذرے گی۔ بسا اوقات وہ دکانوں پر سے متعدد اشیاء خرید کرلے جایا کرتے اور لوگ اس سے متاثر ہو کر کہتے "کیا اچھا آدمی ہے سب چیزیں اپنے آپ خرید تا ہے اور بیوی کو بے جا تکلیف دینا گوارا نہیں کرتا۔ ۔ ۔ ۔" وہ ان کی ہر طرح سے خدمت کرتے تھے کیونکہ سرسوتی ایک عرصے سے امراض دائمی میں مبتلا تھیں!

یہ بجز ایک عذر کے اور کچھ نہیں تھا۔ عوام کا خیال تھا کہ اگر سرسوتی امور خانہ داری اور دوسرے کاموں میں کوئی حصہ نہیں لیتیں تو اس کی صرف یہ وجہ ہے کہ وہ مدت سے بیمار ہیں اور یہ وجہ ان کی معذرت طلبی کے لئے کافی ہے۔ انہوں نے اُن کے متعلق یہ رائے بھی قائم کر لی تھی کہ وہ اپنے شوہر کی ہمدردی اور مروت سے بے جا فائدہ اٹھانے کی متمنی ہوتے ہوئے آرام کرنے کی عادی ہو گئی ہیں یہ سب کچھ تھا مگر دینا ناتھ کی زبان سے شکایت کا کوئی حرف نہ نکلتا۔ جب کوئی انہیں چائے پر مدعو کرتا اور پوچھتا کیا آپ بہن سرسوتی کو اپنے ہمراہ نہیں لائیں گے؟ تو وہ یہ کہہ کر ٹال دیتے "میری خواہش تھی کہ وہ آئیں لیکن جیسا کہ آپ لوگ جانتے ہیں، وہ ایک عرصے سے بیمار ہیں اور کبھی باہر جانا گوارا نہیں کرتیں"۔

وہ عدیم الفرصت رہتے تھے۔ ان کو آج کل کے بچوں سے نفرت تھی کیونکہ وہ بڑوں کا احترام کرنا جانتے ہی نہیں اور بے حد بے تمیز ہیں۔ ملازم پیشہ آدمیوں کے عیوب کو وہ نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ غرباء سے ان کو دشمنی تھی اور ان کے متعلق کچھ پڑھنے سے وہ صریحاً انکار کر دیتے تھے۔ منشی پریم چند کے ناول اور افسانے وہ پسند نہ کرتے کیونکہ وہ ان ہی اشخاص کے ماحول کا نقشہ پیش کرتے ہیں۔ وہ سوچا کرتے تھے کہ ان اسمبلی اور کونسل کے ممبروں نے غریبوں کو سر پر چڑھا دیا ہے۔ دنیا میں ان سے برا کوئی نہیں اور غریب اس لئے غریب ہے کہ اس کو غریب ہونا چاہئے۔

جب کوئی ان سے ملاقات کرنے آتا تو وہ صوفے پر دراز ہو جاتے اور کہتے۔ "آج میں تم سے دل کھول کر باتیں کرنا چاہتا ہوں" لیکن اس سے پہلے کہ وہ بے چارہ اپنے مطلب کا اظہار کرے دینا ناتھ اپنے گاؤں یا گورنمنٹ کے بارے میں شکوہ و شکایت کا ایک دفتر کھول دیتے تھے۔ اور جب وہ سب کچھ کہہ لیتے تو ان کا اندر جانے کا وقت ہو جاتا کیونکہ سرسوتی فکرمند ہونگی۔ "آپ سوچئے تو سہی"۔ وہ کہتے "کہ وہ ہمیشہ سے علیل ہیں کبھی باہر نہیں جاتیں۔ نہ کسی سے ملاقات کرتی ہیں اور تھوڑی سی دیر کے لئے بھی ان سے جدا ہو جاتا ہوں تو وہ پریشان ہو جاتی ہیں"۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سرسوتی سے بہت زیادہ باتیں کیا کرتے تھے۔ ان کو وہ تمام خبریں پڑھ کر سنا دیتے جو ہولناک ہوں۔ کیونکہ اخبارات ایسی عورت کے لئے پریشان کن ثابت ہوتے ہیں۔ نو بجے کے قریب وہ ان کو بتا دیتے کہ آج کا دن سرسوتی کے لئے مصروفیت کا گذرا۔ لہذا ان کو تکان محسوس ہونے لگی ہو گی اور آرام کی سخت ضرورت ہے۔ شام کو تاش کھیلنا ان کا معمول نہ تھا۔ دینا ناتھ تاش کو نفرت کی نظروں سے دیکھتے تھے سوائے اپنا قیمتی وقت ضائع کرنے کے اس سے کوئی فائدہ متصور نہیں۔ بے حد نامعقول چیز ہے! کسی شخص نے ان کو رائے دی کہ ریڈیو ان کی بیوی کی دلچسپی کا باعث ہو گا لیکن وہ اپنے سر کو جنبش دے کر کہنے لگے "میری بیوی بہت جلد پریشان ہو جاتی ہیں اور نہیں معلوم اس نئی ایجاد سے کیا بات وقوع پذیر ہو جو ان کی زندگی پر برا اثر ڈالے"۔

جب مسٹر عزیز نئی کار خرید کر لائے تو انہوں نے سوچا کہ یہ ہمسائگی کا فرض ہو گا کہ سرسوتی کو موٹر پر اپنے ہمراہ لے جائیں۔ مگر دینا ناتھ نے

پر جوش طریقے سے اس رائے کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ موٹر میں ذرا سا گھوم آنا ان کی موت کا سامان نہ بن جائے۔ اگر کسی دن مسٹر عزیز خود چلا رہے ہوں اور دینا ناتھ کو ساتھ چلنے پر مدعو کریں تو وہ جانے کے لئے فوراً تیار ہو جاتے تھے۔ مسٹر عزیز کا اس طرح ہمدردی ظاہر کرنا خوش دلی کی علامت تھی اور اگر اس کا سرسوتی پر بھی اظہار کیا جاتا تو بہتر ہوتا لیکن وہ کہیں نہ جاتیں کیونکہ بے حد کمزور تھیں۔

اور جب گاؤں کے لوگ دینا ناتھ کو دیکھتے تو اس سوچ میں پڑ جاتے کہ سرسوتی پر جب وہ اکیلی رہ جائیں گی تب کیا گذرے گی۔

لوگ کہتے تھے کہ یہ سوچتے ہوئے اطمینان محسوس ہوتا ہے کہ سرسوتی شاید اپنے خاوند سے پہلے انتقال کر جائیں۔ تمام گاؤں میں دینا ناتھ سا خوش دل اور نوجوان طبع انسان نہ تھا۔ ان کے کیا اچھے مشاغل تھے! کسطرح وہ مصروفیت میں مارے مارے پھرتے! اور دنیا میں اپنا راستہ پیدا کرنے میں وہ کس قدر کوشاں تھے۔ چھوٹے دکانداران کی نسبت کوئی اچھی رائے نہ رکھتے تھے اسی طرح قصائی کو بھی ان سے ہمدردی نہ تھی۔ "یہاں آتے ہیں" وہ عموماً کہا کرتا تھا" اور چھ پیسے کا گوشت لے کر چلے جاتے ہیں!" لوکل سوسائٹی کو وہ بہت کم چندہ دیا کرتے تھے۔ جب ہارٹیکلچرل سوسائٹی کے خزانچی نے ان سے چندہ طلب کیا تو انہوں نے ایک بہت طویل لکچر خود اعتمادی اور آزادی پر دے ڈالا۔ آخر کیا وجہ ہے کہ کاشتکار جب وہ خود زمین بو سکتے ہیں تو دوسروں سے روپے وصول کریں ... " یہ تھے ان کے خیالات۔ چند دیہاتیوں نے ان تاروں کو جو بیچ در بیچ گلیوں کے ہر دو جانب لگے ہوئے تھے۔ توڑ کر پھینک ڈالا۔ اس پر دینا ناتھ نے ان سے باز پرس کی۔ وہ لوگ ان سے بھی لڑنے کے لئے تیار ہو گئے مگر دینا ناتھ نے اُن سے کچھ نہ کہا اور ایک نئی سڑک اپنے داموں سے پہلی سے زیادہ آرام دہ بنوا دی۔

اگرچہ گاؤں والے ان سے اتفاق نہ کرتے مگر وہ یہ قبول کرنے کے لئے تیار تھے کہ دینا ناتھ کا برتاؤ اپنی بیوی کے ساتھ بہت اچھا ہے اور اس لئے وہ لوگ حیران سے تھے۔ کہ دینا ناتھ اگر اپنی بیوی سے پہلے انتقال کر گئے تو ان پر کیا گذرے گی۔

دینا ناتھ جو ہنوز تندرست و توانا نظر آتے تھے ناگہانی طور پر فوت ہو گئے۔ تمام گاؤں میں ہلچل مچ گئی۔ لوگوں کا خیال سرسوتی کی طرف منتقل ہوا۔ لوگ اسی سوچ بچار میں تھے کہ وہ جو اس قدر علیل ہیں کہ حرکت بھی نہیں کر سکتیں اور ہمیشہ صوفے پر پڑے رہنے کی عادی ہو گئی ہیں، اب کیا کریں گی۔ دینا ناتھ ہی ان کو مدد دے کر ڈرائنگ روم سے پائیں باغ میں لے جاتے تھے۔ اب تمام خوشیوں کے دروازے ان پر مسدود ہو گئے تھے۔ جو لوگ بوڑھی سرسوتی سے واقفیت رکھتے تھے انہوں نے بتایا کہ کس طرح دینا ناتھ اپنے ہاتھوں کا سہارا دے کر ان کو باغ کے اس حصے میں لاتے جس کو آفتاب کی مسکراتی ہوئی شعاعیں نور سے معمور کر دیتی تھیں۔ اگر سورج کی تپش زیادہ بری معلوم نہ ہوتی تو وہ ان پیڑوں کو بغور دیکھتی رہتیں جو دریا کے ساحل پر نظر آتے تھے۔ ایک گھنٹے کے بعد دینا ناتھ پھرتے اور اسی طرح ڈرائنگ روم میں واپس لے جاتے تھے۔ اب وہ محبت اور پرستش نایاب ہو کر کس قدر دلکش اور دلفریب ہو گئی تھی! وہ پہلی انسانیت اب کہاں! اور یہ بےچاری عورت جو کسی زمانے میں اپنے خاوند کے ساتھ مسرور رہتی تھی۔ آج بے یار و مددگار رہ گئی! اس کا مستقبل کتنا سیاہ اور ڈراؤنا تھا! مکان کی تمام اشیاء اس کو اپنے شوہر کی یاد دلائیں گی۔ آتشدان کے قریب والی آرام کرسی جس پر بیٹھ کر وہ سرسوتی کو خبریں سنایا کرتے تھے۔ وہ بوسیدہ کوٹ جس سے ان کو پرانی محبت تھی۔ سلیپر جن کو وہ شام کے وقت پہنا کرتے۔ حالت ظاہری ان کی بہت بری تھی۔ یہ سب چیزیں ان کو فراموش نہ ہونے دیں گی۔ دوپہر کو جب دھوپ زیادہ ہو جاتی۔ سرسوتی غور سے اِدھر اُدھر دیکھتی تھیں تاکہ ان کے شوہر نظر پڑ جائیں اور وہ ان کو سہارا دے کر کسی سایہ دار جگہ لے جا کر بٹھا دیں، وہ صرف اس خیال سے خوفزدہ تھیں کہ کہیں چلتے چلتے کمزوری اپنا غلبہ نہ پالے اور وہ زمین پر نہ گر پڑیں۔ اب ان کا کوئی بھی نہ تھا!

پڑوس کی ایک عورت ڈاکٹر کے پاس دوڑی گئی اور سارا ماجرا بیان کر کے کہنے لگی "کیا کوئی تدبیر نہیں کی جا سکتی؟ سرسوتی شاید اس جانکاہ حادثے کے رنج میں وقت سے پہلے مرجائیں۔ ان میں اتنی طاقت نہ تھی کہ وہ اپنے خاوند کے بغیر رہ سکیں۔"

سن رسیدہ عورت کا رنج بے پایاں تھا۔ اگرچہ ان کے دوستوں

نے بہت منع کیا گروہ ارتھی کے ساتھ گئیں وہ لوگوں کے اصرار
پر گاڑی میں سوار تھیں اور گو زیادہ سردی نہ تھی مگر انہوں نے اپنے جسم کو
ایک گرم لبادے سے محفوظ کر لیا تھا۔ ان کی آنکھوں کے گرد ہالے
پڑے ہوئے تھے ضعیفی اپنے نقوش چھوڑ گئی تھی۔ چہرے پر غم کی
علامات تھیں جو شاید شوہر کی وفات سے پیشتر ثبت ہو چکی تھیں۔

"اُس عورت کو بے حد رنج برداشت کرنے پڑے" گاؤں کے
تمام لوگوں نے کہا اور اتفاق سے یہی الفاظ اس قصائی کی زبان
سے نکل گئے جس نے ایک دفعہ دینا ناتھ کو برا بھلا کہا تھا۔ آج وہ
مرنے والے کے حق میں یہ الفاظ کہنے پر نادم تھا!

"زیادہ عرصہ نہیں گذرے گا کہ یہ بھی اپنے شوہر کے پاس چلی
جائیں گی۔" قصائی نے کہا اور جنہوں نے سُنا ان کو یقین کامل ہو گیا
کہ جو کچھ اس نے کہا حرف بحرف درست ہے۔

(۳)

اور یہی سرسوتی کو نظر آتا تھا۔ اس حادثے کے غم کا بارِ عظیم اُن
کے دل پر اب بھی محیط تھا۔ جب کبھی انہوں نے موت کے بارے میں
سوچا یہی سوچا کہ وہ دینا ناتھ سے پہلے ان پر یورش کرے گی۔ مگر
قسمت کی ستم ظریفی کو کون روک سکتا ہے! شام کی ہلکی سیاہی تمام
عالم پر چھا رہی تھی اور لیمپ جلایا نہ گیا تھا تب انہوں نے سوچا کہ وہ اب
تنہا رہا کریں گی اور دنیا میں ان کا کوئی نہیں۔ جب وہ پہلے پہل بیاہی آئی
تھیں تو یہی سوچا کرتی تھیں کہ دینا ناتھ سے پہلے وہ مر جائیں گی۔
جیسے ہی ان کو معلوم ہوا کہ وہ ایک بچے کی ماں بننے والی ہیں ۔۔۔ اور
یہی تنہا ایک بچہ تھا ۔۔۔ تو وہ اس وجہ سے خوفزدہ ہو گئیں کہ کس طرح
اس کی پرورش ہو سکے گی۔ مگر وہ بچہ ہی مر گیا اور اس کا ان کو خیال تک
نہ تھا۔ آہ قدرت کی ستم ظریفی! جن چیزوں کو ہم طے شدہ سمجھتے ہیں
وہ درہم برہم ہو کر رہ جاتی ہیں دینا ناتھ موت کی آغوش میں پڑے سو رہے
تھے اور وہ ابھی تک دنیا میں سانس لے رہی تھیں! .....

"مجھ کو کیا کرنا چاہیئے؟"

انہوں نے چہار جانب نظر دوڑائی۔ کیا ان میں اتنی طاقت
ہو گی کہ وہ ملازمہ کو بلا کر لیمپ روشن کرنے کو کہہ دیں۔ ملازمہ مکان
کے اندر کام میں مصروف ہو گی اور یہ نامعقول ہو گا کہ اس کو اپنے متعینہ
کام سے علیحدہ کیا جائے اگر دینا ناتھ..... مگر دینا ناتھ ان چھوٹے چھوٹے
کاموں کو انجام دینے کے لئے دوبارہ نہیں آئیں گے۔ وہ صوفے
پر لیٹ گئیں اور اپنی آنکھوں کو بند کر لیا۔ اب تمام دن اسی طرح گذریں
گے جب تک وہ بھی ابدی نیند نہ سو جائیں۔ شام کے وقت وہ اپنے
ڈرائنگ روم میں تنہا بیٹھا کریں گی۔ کوئی انہیں خبریں پڑھ کر نہ سنائے گا۔ کوئی
ان کو سہارا دے کر باغ میں نہ لے جائے گا جہاں سے وہ صنوبر کے
پیڑوں کی آڑ سے دریائی چڑیوں کو دیکھا کرتی تھیں اور یہ سب باتیں خادم
کی امداد سے ہو بھی جائیں گی مگر یقیناً وہ ہر مرتبہ جب ان کو کوئی کام
ہو گا اس کو بلانے نہیں اٹھیں گی۔ وہ بس اسی صوفے پر پڑی پڑی مر
جائیں گی۔

اگر دینا ناتھ اپنی خواہش سے گھر میں بجلی لگوا جاتے تو ان کو لیمپ
روشن کروانے کی فکر مطلق نہ ہوتی اور وہ اس تکلیف دہ کام سے نجات
پا جاتیں بجلی کے بارے میں دینا ناتھ کے کیسے دقیانوسی خیالات
تھے۔ ایک دفعہ سرسوتی نے اصرار کیا تھا کہ بجلی گھر میں لگوالی جائے تو انہوں
نے اُس کے تمام دلائل کو رد کر دیا۔ جب سرسوتی نے یہ کہا کہ لیمپ
کا روشن کرنا بہت گندا اور تکلیف دہ ہے تو وہ یہ کہنے لگے کہ یہ کام خادمہ
کے سپرد کر دیا گیا ہے اور فی الحقیقت اس کی انجام دہی کی تنخواہ اس کو
ملتی ہے۔ وہ کیوں اتنی چھوٹی سی بات کے لئے اپنے کو پریشان کرتی
ہیں۔ سرسوتی کی مروت و ہمدردی نے نوکروں کو بہت آزادی دے
دی تھی۔ یہ کام صرف نوکروں کو انجام دینا چاہیئے۔ وہ یہ ماننے کے
لئے تیار نہیں کہ مکان میں بجلی لگوائی جائے۔ ہمیشہ لیمپ ہی جلتے رہیں
گے! ..... وہ دینا ناتھ کی رائے سے متفق ہو گئیں۔ وہ جہاندیدہ آدمی
تھے اور جو کچھ کہتے تھے۔ سچ ہوتا تھا۔ شاید وہ اس بار کو جو ملازمین پر پڑا ہوا تھا
ہلکا کرنا چاہتی تھیں اور یقیناً یہ غلط تھا ایک پرانی ضرب المثل جس کو دینا ناتھ
بسا اوقات دہرایا کرتے تھے۔ یہ تھی کہ جتنا تم نوکروں کے بجائے کام کرو
گے اتنا ہی وہ تمہاری خدمت کرنا چھوڑ دیں گے۔ وہ سوچا کرتی تھیں کہ
دینا ناتھ نے یہ نتیجہ خوب اخذ کیا کہ جتنا ان کے ساتھ رحم کیا جائے وہ سر پر چڑھ
جاتے ہیں جب تک تم ان کے ساتھ سختی کا برتاؤ نہ کرو۔ وہ یہ سمجھنے لگتے
ہیں کہ ہمارا آقا کمزور ہے"۔

صوفے پر پڑی پڑی وہ یہ سوچ رہی تھیں کہ بجلی اگر مکان میں لگوائی
جائے تو بہت سی آسانیاں پیدا ہو جائیں گی اور ان میں سے ایک یہ بھی
تھی کہ بار بار ملازمہ کو آواز دینی نہ پڑے گی اور یہ بالکل جو ان کو پریشان کر

رہی تھی یکسر موقوف ہو جائے گی۔ صرف ان کو اتنا کرنا پڑے گا کہ اُٹھیں، بٹن
دبایا اور تمام کمرے میں روشنی ہو گئی۔

وہ بجلی لگوانے کا تخمینہ کر رہی تھیں۔ دینا ناتھ تجارت پیشہ آدمیوں
کو برا سمجھتے تھے۔ تمام باتیں زمانے کے ساتھ بدلتی جا رہی تھیں۔ اب پہلے
کی بہ نسبت پہننے کے اخراجات میں اضافہ ہو گیا تھا، ملازمین اسی پہ جمے ہوئے
ہیں کہ ان کو مزدوری زیادہ ملنی چاہئیے۔ درآنحالیکہ وہ سوائے سونے کے
اور کچھ نہ کرتے تھے اور بقول دینا ناتھ وہ ہمیشہ اونگھا کرتے۔ تاجر اپنے اسی
خیال میں محو تھے اور وہ شاید دوسروں کے فوائد کو نظر انداز بھی کر رہے تھے،
کہ جو حالت لوگوں کی جنگِ عظیم سے پہلے تھی وہ اب بھی ہے! ..... ہر چیز
قیمتی ہو گئی تھی۔ لیکن اب جب کہ وہ تنہا تھیں ان کا اس سے کم خرچ ہو گا جتنا
دینا ناتھ کے زمانے میں ہوا کرتا تھا۔ اگر وہ ساتھ کے گاؤں کے بجلی لگانے والے
سے اس کی بابت گفتگو کریں تو اس کے لگوانے میں بے حد آسانیاں پیدا
ہو جائیں گی۔

ابھی تک وہ ان ہی خیالات میں کھوئی ہوئی تھیں کہ ملازمہ لمپ
لئے ہوئے داخل ہوئی۔ اس نے لمپ میز پر رکھ دیا اور صوفے کے نزدیک
آئی تا کہ ان کا تکیہ سیدھا کر دے "آپ تھکی ہوئی سی معلوم ہوتی ہیں"۔
اس نے کہا۔

"میں بہت تھک گئی" انہوں نے جواب دیا۔

"کیا آپ سونے کے لئے نہیں جائیں گی؟"

"نہیں"

"کسی اور چیز کی تو ضرورت نہیں؟"

سرسوتی نے سوچا کہ ان کو کس چیز کی ضرورت تھی؟ کس چیز کی نہیں
تھی؟ وہ دینا ناتھ کو پھر دیکھنے کی متمنی تھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ دینا ناتھ کمرے
میں داخل ہوں اور آتے ہی وہ تمام واقعات جو گاؤں میں آج کے دن
پیش آئے ہیں دہرا جائیں۔ کیسے انہوں نے اپنے دلائل سے ایک شخص
کو شکست دے دی اور کس طرح نئے ڈاکٹر کو اپنی غلطی کا اندازہ ہو کر
ان کی رائے سے متفق ہونا پڑا اور وہ کہنے لگا۔ "دینا ناتھ تمہیں بذاتِ خود
ڈاکٹر ہونا چاہئیے تھا"۔ ان کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور انہوں نے
اپنا چہرہ پھیر لیا کہ ملازمہ دیکھ نہ سکے۔ وہ کچھ دیر کے لئے اسی کیفیت میں
ڈوبی رہیں اور ان کو احساس نہ تھا کہ خادمہ بھی کمرے میں موجود رہے۔
وہ خاموشی کے سلسلے کو توڑ کر کہنے لگی "کیا میں اخبار لے آؤں؟" انہوں
نے اس کی طرف دیکھا۔ اخبار لے آئے؟ سالوں سے انہوں نے اخبار
چھوا تک نہ تھا۔ دینا ناتھ صوفے پر پڑے پڑے منتخب خبریں پڑھ کر
سنایا کرتے تھے اور وہ لیٹی ہوئی اُن کی دلکش آواز پر کان دھر کر سنا کرتی
تھیں اور اب وہ کیوں نہ اخبار پڑھیں! دینا ناتھ اب انہیں سنانے
نہیں آئیں گے۔ اور ان کو اخبار پڑھے بغیر معلوم نہ ہو سکے گا کہ دنیا
میں کیا ہو رہا ہے۔ وہ اپنے سر کو ہلا کر کہنے لگیں۔

"لے آؤ"

بے فکری سے وہ اپنی انگلی اخبار کے صفحوں پر دوڑاتی رہیں اور
اس اثناء میں سوچتی رہیں کہ اڈیٹر کو ہر روز نئی نئی دلچسپ خبریں کہاں
سے دستیاب ہو جاتی ہیں وہ متحیر تھیں کہ جب اڈیٹر کو شام کے وقت
کوئی خبر نہ ملتی ہو گی تو وہ کیا کرتا ہو گا؟ کیا پرانے اخبارات اٹھا کر ان
میں سے چند دلچسپ واقعات منتخب کر کے ایک دفعہ پھر شائع کر دیتا
ہو گا یا یہ کہ کسی افسانے کا اس دن بہت بڑا حصہ چھاپ دیا کرتا۔ ناول
کا ایک باب اس دن بھی شائع ہوا تھا اور پڑھنے کے بعد ان کو پتہ چلا
کہ وہ واقعی دلچسپ ہے! ..... اتنا دلچسپ کہ انہوں نے تمام
پچھلے باب پڑھ ڈالے اور پھر اگلے اخبار کا بے صبری سے
انتظار کرنے لگیں۔ اخبار میں پڑھنے کے لئے بہت کچھ تھا۔ دینا ناتھ
ہمیشہ خبروں کا انتخاب کرتے کرتے عاجز آ جایا کرتے تھے اور کبھی کبھی
ان کی زبان سے نکل جاتا۔ "آج کے دن کوئی تازہ خبر نہیں ہے"۔ اور دو
ایک خبریں بہ آوازِ بلند پڑھ کر وہ خاموش ہو جاتے اور پورا اخبار اپنے آپ
آہستہ آہستہ پڑھ جاتے تھے۔ سرسوتی نے کئی دفعہ سوچا کہ جب اخبار
میں اتنا تھوڑا ان کے سنانے کے لئے ہوتا ہے تو اس قدر زبردست
ذخیرہ دینا ناتھ کے مطالعہ کے واسطے کہاں سے آ جاتا ہے۔ مگر انہوں
نے ان خیالات کو زیادہ اہمیت نہ دی۔ کیونکہ دینا ناتھ سے وفاداری
کا عزم بالکل درہم برہم ہوا جا رہا تھا۔ ان کی عادت تھی کہ جب دینا ناتھ
دنیا کی خبروں میں کھوئے ہوئے ہوتے تو وہ اپنی آنکھیں بند کر لیتی تھیں!
..... اب جب کہ وہ ان ایام کی یاد اپنے دماغ میں تازہ کرتی تھیں تو
واضح ہو جاتا تھا کہ انہوں نے ایک عرصہ اپنی آنکھیں بند کئے گذار دیا۔
یہ غفلت نہ تھی۔ سونا نہ تھا۔ بس ذرا سی آرام طلبی تھی۔ دینا ناتھ ہمیشہ
آرام کرنے پر زور دیا کرتے تھے۔ وہ کتنے ہمدرد اور رحم دل تھے! بے سبب
باتیں ہوتے ہوئے وہ اور زیادہ خبریں سننا چاہتی تھیں اور ملازمہ نے

اچھا کیا جو انہیں اخبار کے متعلق یاد دلا دیا۔ اس میں اتنی زیادہ کارآمد معلومات موجود تھیں اور وہ حیرت زدہ رہ گئیں۔ جب خادمہ نے ان کو اخبار پڑھنے کے بعد بتایا کہ مقررہ سونے کے وقت سے بہت دیر ہو گئی ہے۔ دس بجے تھے! لیکن ان کو تکان تک محسوس نہ ہو رہی تھی اگر خادمہ ایک گھنٹہ اور تاخیر کر کے آتی تو انہیں جتنی تھکن اس وقت محسوس ہو رہی تھی۔ اس سے زیادہ معلوم نہ ہوتی۔ وہ اس سے پوچھنے لگیں۔

کیا تمہارے خیال میں بجلی لگوانے میں کچھ زیادہ خرچ ہو گا؟

ملازمہ تھوڑی دیر چپ رہی۔ آخر اس نے کہا "نہیں تو۔"

"میں ابھی ابھی سوچ رہی تھی" وہ اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہنے لگیں "کہ کیا اس کو لگوانا مفید نہ ہو گا۔ وہ لیمپ سے کتنی زیادہ آرام دہ چیز ہے!"

"یقیناً ہے تو" ملازمہ نے بے صبری سے جواب دیا۔ "کشن دیال جو بجلی لگاتے ہیں۔ آپ کو تمام اخراجات سے مطلع کر دیں گے۔ کیا میں ان سے اس کے متعلق پوچھوں؟"

"نہیں" انہوں نے کہا "میں یہ نہیں چاہتی۔ اس کے بارے میں غور کروں گی۔ مجھے ذرا اپنا سہارا دینا۔"

ملازمہ ان کو سہارا دے کر بالاخانے میں ان کے کمرے تک لے گئی۔

"تم کشن دیال سے بات چیت کر لینا۔ اور وہ آ کر مجھے تمام اخراجات بتا دیں گے۔" انہوں نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے کہا "آخر اس سے مجھے کوئی نقصان بھی نہیں!"

"نہیں" اس نے جواب دیا "آپ بجلی لینے سے ہمیشہ انکار کر سکتی ہیں۔"

"ہاں۔ تو کل تم گاؤں چلی جانا اور کشن دیال سے کہنا کہ آ کر مجھ سے مل جائیں۔"

اور پھر اس طرح جیسے ان سے کوئی حرکت سرزد ہو گئی ہے وہ بستر پر دراز ہو کر سو گئیں۔

(۴)

کشن دیال آ گئے اور کام بھی شروع ہو گیا۔ سرسوتی کو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا انہوں نے ان کے تمام مکان پر قبضہ کر رکھا ہے۔ وہ ان کی باتیں سنتی تو لیکن انہیں زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے۔ مکان میں بجلی لگانے آئے تھے اور انہوں نے طے کر لیا تھا کہ گھر کو اس وقت تک نہیں چھوڑیں گے۔ جب تک بجلی نہ لگا لیں۔ کبھی کبھی وہ سوچ میں پڑ جاتیں۔ دینا ناتھ اپنے مکان میں بجلی لگوانا پسند نہ کرتے۔ کشن دیال جو دراز قامت اور سرخ و سفید آدمی تھے اور کوئی ہنسنے ہنسانے والی بات کرتے ہوئے ایک فرمائشی قہقہہ بلند کرتے تھے۔ ان کی بھی غلطیاں دینا ناتھ نکال کر رکھ دیتے۔ ان کے ہاتھ لمبے اور موٹے تھے۔ خاص طور پر ان کی انگلیاں اور معلوم ہوتا تھا جیسے ناخن ایک عرصہ دراز سے نہیں ترشوائے گئے۔ وہ ان سے بھی تھوڑا بہت مذاق کر لیا کرتی تھیں اور صرف یہ سوچ کر رک جاتی تھیں کہ وہ دینا ناتھ کے دوست تھے۔ نہیں دینا ناتھ یہ قطعاً پسند نہ کرتے لیکن سرسوتی کا خیال تھا کہ کبھی کبھی ایسے موقعے آ جاتے ہیں۔ جب کشن دیال انتہائی خوش مذاقی سے کام لیتے ہیں۔ بہت جلد انہوں نے مکان میں بجلی لگوا دی اور سرسوتی کو خیرباد کہتے وقت انہوں نے یقین دلایا کہ جب کشن دیال کو کام سپرد کرنا ہو تو تامل نہ کریں۔

لیکن ان تمام باتوں سے قطع نظر کر کے بجلی سے بذات خود بھی کافی فوائد مقصود تھے۔ ملازمہ خوشی سے پھولی نہ سماتی تھی وہ اپنی مسرت اور تعجب کو نہ چھپا سکتی تھی۔ اب لیمپ میں بدبودار تیل نہ ڈالنا پڑے گا۔ بتی نہ کاٹی جائے گی۔ چمنی کو صاف کرنے کی فکر نہ ہو گی اور سب سے بڑی بات یہ کہ اب وہ خوف یکسر موقوف ہو جائے گا۔ جو لیمپ لے جاتے وقت محسوس ہوا کرتا تھا کہ وہ گر کر تمام گھر کو شعلوں کی نذر نہ کر دے! بٹن دبایا اور کمرہ مطلع انوار بن گیا۔ سرسوتی نے یہ سوچا کہ دینا ناتھ بجلی کی بابت دقیانوسی خیالات سے کام لیتے تھے۔ مگر ان کا یہ قیاس بھی صحیح تھا کہ "اگر زندگی کو اتنا آرام دہ بنا لیا جائے تو نوکروں کے لئے کیا رہ جائے گا! یہ تدابیر جو کاموں میں آسانی پیدا کر دیتی ہیں۔ ملازمین کو فرصت دے دیں گی وہ آخر اس فرصت میں کریں گے کیا؟ جب دریا میں طغیانی آ جاتی اور ملاح اپنے کام پر نہ جاتے تو دینا ناتھ ان کی عادات پر تبصرہ کیا کرتے تھے۔ وہ کرتے کیا ہیں؟ بس گلیوں میں کھڑے کھڑے خوش گپّی کیا کرتے ہیں یا بھٹی پہ جا کر اچھی طرح شراب پی لیتے یا پڑے سوئے رہتے ہیں۔ بس یہ ہی ان کے شغل ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک نے بھی اپنے دماغ کو تسکین نہیں دی "کام" دینا ناتھ کہا کرتے تھے "عوام کو مصروف رکھنے کے لئے ہے اور دنیا مختلف ایجادات ہمارے سامنے پیش کر کے ہمیں ایک مسئلہ لاینحل سلجھانے کے لئے چھوڑ رہی ہے اور یہ نئی نئی ایجادات ان لوگوں کے کام

کو ہلکا کر رہی ہیں جو یہ نہیں جانتے کہ اپنی دماغی قوتوں کو کیسے بروئے
کار لائیں یا اگر جانتے ہیں تو کرنا نہیں چاہتے"۔

اس کے خلاف سرسوتی کے لئے یہ اطمینان دہ بات تھی۔
ان کو محسوس ہونے لگا تھا کہ اب وہ دوسروں کی محتاج نہیں رہتیں
جیسا کہ پہلے کشن دیال نے بٹن ان کے سرہانے ہی لگا دیا تھا تاکہ
جب وہ چاہیں بغیر اٹھے ہوئے روشنی کر سکیں۔ کس قدر آرام! اب
ان کو راتوں میں کوئی ڈر معلوم نہ ہوا کرے گا۔ یہ سب آسائشیں ایک بٹن
کی بدولت تھیں!

وہ خود اخبار پڑھنے کی عادی ہو گئیں تھیں اور منتظر نہ رہتیں
کہ کوئی آکر ان کو مخصوص خبریں پڑھ کر سنائے۔ کشن دیال نے کہا تھا
کہ وہ اپنے گھر میں ریڈیو لگوا لیں۔ ان کے پاس ایک تھا اور وہ اس کے
تمام فوائد سے واقف تھے۔ ہر شام کوئی شخص دلّی سے دن بھر
کی خبریں سناتا تھا اور ہزارہا دلچسپیوں کے سامان اس میں موجود تھے
تقریریں اور گانے وغیرہ۔ کشن دیال روزانہ اپنی گھڑی دلّی کے وقت سے
ملا لیا کرتے تھے "یہی میری گھڑی ہے" وہ کہا کرتے۔ سرسوتی کو یاد آیا کہ
وہ مدت سے دلّی نہیں گئیں اور اب انہوں نے چاندنی چوک کو بھی
بھلا دیا۔ خیر۔ لیکن ریڈیو نئی ایجاد تھی اور دیناناتھ اس کو اپنے گھر میں
لگوانے کے لئے راضی نہ ہوتے۔ مگر وہ تھی بہت کارآمد اور جب وہ
اخباروں میں پروگراموں پر نظر دوڑاتیں تو یہ سوچتیں کہ ایک شخص اس
کی جتنی قیمت ادا کرتا ہے اس سے زیادہ نفع حاصل کر لیتا ہے۔ ان
کو اس کے متعلق غور کرنا چاہئے!

ان کو تعجب ہوا کہ وہ کس قدر آسانی سے باغ میں جا سکتی ہیں
پہلے پہل وہ اپنے اندر کچھ کمزوری محسوس کرتی تھیں۔ چنانچہ کرسی پر
بیٹھا رہنا اور دیواروں کو تکنا ان کا معمول ہو گیا۔ وہ چلنے میں چھڑی استعمال
کرتی تھیں مگر جب کسی دن صبح کو انہیں چھڑی نہ ملی تو ان کو پتہ چلا کہ وہ اس
سے بغیر کسی تکلیف کے کنارہ کش ہو سکتی ہیں۔

باغ میں بیٹھ کر سورج کی روشنی کو جو پتوں پر طرح طرح کے نقش
و نگار بناتی تھی دیکھنا کتنا دل خوش کن مشغلہ تھا اور پتلی پتلی پگڈنڈیوں
پر ہوتے ہوئے باغ کی حدود تک پہنچ جانا اپنے اندر کس قدر جاذبیت
رکھتا تھا! وہ کھڑے ہو کر اور سر کا سہارا لیتے ہوئے ہلکے طور پر دریا کا
کنارہ دیکھ سکتی تھیں۔ جہاں لوگ مچھلیوں کے شکار میں معروف
رہتے۔ ان کو یاد نہ تھا کہ پچھلی مرتبہ وہاں کب گئی تھیں اور ان کا دل چاہتا
تھا کہ پھر آ جائیں مگر فی الحقیقت ایک ناممکن بات تھی۔ ان کو واپسی میں گھر
تک تمام راستہ طے کرنا پڑے گا اور اونچائی پر چڑھنا اور اترنا ایسی
عورت کے لئے خواب و خیال سے زیادہ نہ تھا جو عرصے سے بیمار
ہو! .....

بہرحال وہ خیال اپنے اندر زبردست کشش رکھتا تھا۔ اور ملّاح
بذات خود اچھے آدمی تھے گو ان میں سے بہت سے دیناناتھ سے بری طرح
پیش آئے۔ شاید وہ سامنے کے دروازے تک جا سکیں۔ سڑک
میں نشیب تھی اور وہاں پھسلنے کا بھی امکان تھا۔ دیناناتھ کہا کرتے تھے
کہ نئی سڑک بنوانے سے کوئی فائدہ نہیں کیونکہ وہ اتنی کم استعمال ہوتی
ہے۔ لیکن اگر وہ بہ احتیاط چلیں تو وہاں کسی حادثے کے پہنچ سکتی ہیں۔
وہ پیچھے مڑیں اور انہوں نے اپنے اس مکان کو دیکھا جس میں
اتنی مدت تک انہوں نے بسر اوقات کی تھی۔ جہاں سے وہ باہر
بہت کم نکلی تھیں۔ اور معاً ان کے دماغ میں خیال گذرا کہ وہ قیدی کی حیثیت
سے رہی ہیں۔ باغ کا حصہ ان کی نظروں سے بالکل پوشیدہ تھا۔ وہ
گول کمرے سے سونے کے کمرے میں چلی جاتیں۔ وہاں سے بڑے میں اور
پھر لوٹ کر وہیں آ جاتیں جہاں سے چلی تھیں، اور یہ سب کچھ تھا اتنی
چھوٹی سی دنیا ان کی نگاہوں کے سامنے تھی۔

ان کے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ چونکہ وہ کافی سے زیادہ عمر رسیدہ
ہو چکی ہیں اور مرنا یقینی ہے انہیں دریا کے کنارے تک جانے کی
کوشش کرنی چاہئے۔ ان کو کتنے دن اور زندہ رہنا تھا؟ وہ بوڑھی
عورت تھیں اور اگر زیادہ سے زیادہ زندگی کے دن رہے تو شاید ایک
سال اور گذار لیں گی۔ ان کے تمام دوست سوچتے تھے کہ اب سرسوتی
کے لمحات زندگی بہت کم رہ گئے ہیں۔ دیناناتھ کو وہ کبھی ہی بیٹھی تھیں۔
غرضیکہ اس تمام احتیاط اور حفاظت کی کیا ضرورت تھی۔ یہی نہ کہ
وہ دو سال کی بے لطف زندگی خوش و ناخوش اور بسر کر لیں؟ اس سے
کہیں اچھا تھا کہ وہ گاؤں کی حد پہ پہنچ کر دریا کے کنارے کو دیکھیں اور
جس قدر لطف اٹھایا جا سکے اٹھا لیں! ان کو اس حیرت انگیز خیال پر
ایک جھرجھری سی محسوس ہوئی۔ وہ سوچتی تھیں کہ اپنے رشتۂ حیات کو کاٹنے کا
سامان وہ خود پیدا کر رہی ہیں۔ لیکن وہ بے پناہ آرزو ان کے دل سے محو
نہ ہوگی اور ان کو اس پر عمل کرنا ہی پڑے گا۔ ایسے تکلیف دہ ایام گذارنے

سے کیا کام ہے؟ ...... وہ ہمیشہ نشیب والے راستے کو آدھا طے کر لیتی تھیں اور دروازے کے قریب پہنچ جاتیں۔ یہ سب اس سے پہلے ہو جاتا کہ وہ سوچ سکیں کہ کہاں جا رہی ہیں اور کیا کر رہی ہیں۔ اور جب وہ وہاں پہنچ جاتی تھیں تو دروازے کو تھامے کھڑی رہتیں اور اُن کے دل کی دھڑکن اتنی تیز ہو جاتی کہ ان کو اپنے مرنے کا خیال پیدا ہو جاتا مگر تھوڑی دیر کے بعد وہ حالت باقی نہ رہتی۔ اور وہ دروازے کو کھول کر سڑک پر نظر دوڑاتیں۔ وہ سڑک نیچی ہوتی ہوئی گاؤں میں بہت دور تک جاتی تھی اور ایک دن جب وہ یہ دیکھ رہی تھیں تو ایک چھوٹا سا لڑکا ایک جھونپڑی میں سے باہر نکلا۔ وہ حیرت زدہ رہ گئیں۔ اتنے عرصے تک وہیں پلا بڑھا تھا اور ان کو پتہ بھی نہ چلا۔ انہوں نے اسے دیکھا۔ کیسا خوبصورت بچہ تھا۔ وہ اسے دیکھتی رہیں۔ اور وہ دھوپ میں کھیلتا رہا اور اُن کو اس کی مسرت، تندرستی اور بچپن پر رشک آنے لگا۔ وہ کس کا بچہ ہو سکتا ہے؟ وہ یہ سوچ کر پریشان ہو گئیں کہ ان کو ان آدمیوں کے نام بھی نہیں معلوم جو سامنے ہی رہتے ہیں۔ ایک وقت تھا جب وہ گاؤں کے ہر شخص کے نام سے واقف تھیں مگر اسے بہت دن ہوئے!

کیا یہ ان کے لئے برا ہوگا کہ وہ دیوار کا سہارا لیتے ہوئے نیچے اتریں اور اس بچے سے دو باتیں کر لیں؟ ..... انہوں نے اپنا ہاتھ دیوار پر رکھ لیا اور دو ایک قدم چلیں۔ سب کچھ ٹھیک تھا! وہ دو قدم اور چلیں اور اب بھی سب ٹھیک تھا! تھوڑی دیر میں وہ بہت دور پہنچ گئی تھیں اور بچے سے باتیں کرنے میں مشغول تھیں۔ جو ان کو نیچی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا اور ان کے سوالات کا جواب نہ دیتا تھا اور آخر کار اُن کی محبت بھری توجہ سے پریشان ہو کر بھاگ گیا!

انہوں نے چاروں طرف دیکھا۔ گاؤں اب بھی بہت کچھ ویسا ہی تھا جیسا پہلے سوائے اس کے کہ اب جنگ کی یادگار بھی قائم کر دی گئی تھی انہوں نے وہ اب تک نہ دیکھی تھی۔ ... اور ان کی دلی تمنا تھی کہ اس کے قریب جا کر ان جانانِ وطن کے نام پڑھیں جو جنگ میں شریک ہونے گئے تھے اور کبھی واپس نہیں آئے۔ ان کو یاد آیا کہ وہ اپنا کمبل چھوڑ آئی ہیں اور معمولی گاؤں کی عورت کی مانند چل پھر رہی ہیں ......

اور وہ اب گاؤں کے اندر تھیں اور وہ رہی یادگار! ...

ابھی وہ یادگار کے نیچے لکھے ہوئے نام پڑھ رہی تھیں کہ گاؤں کا ڈاکٹر ادھر سے گذرا۔ اس کو اپنی آنکھوں پر شک ہوتا تھا۔

"غضب خدا کا!" اس نے کہا "تم!"

وہ آہستہ سے ہنسیں اور اپنی موجودگی کو بہ مشکل واضح کیا۔

"خیر۔ خیر۔ خیر" اس نے کہا "ڈر کبھی ختم نہیں ہوگا! تم یہاں چلی آؤ" ——— اپنی موٹر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ——— "اور میں تمہیں چڑھائی پر لے چلوں گا۔ تم جانتی ہو" اس نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا "یہ تو ہوتا ہی رہتا ہے! تم اپنی زندگی میں بغیر کمبل اوڑھے کہیں جاؤ گی بھی یا نہیں!" انہوں نے سوچا کہ یہ کیسی مضحکہ خیز باتیں کر رہا ہے اور ہنستی ہوئی موٹر کے اندر چلی گئیں۔ مگر ان کو تھوڑا سا خوف معلوم ہوا کیونکہ موٹریں بھی عجیب بے ڈھنگی چیزیں تھیں جن کو دینا ناتھ ہمیشہ ناپسند کرتے تھے اور پھر وہ جانتی تھیں کہ ڈاکٹر تیز چلانے میں مشہور ہے۔ وہ امید کرتی تھیں کہ ڈاکٹر خیریت سے ان کو گھر کے دروازے تک پہنچا دے گا مگر ان کو رنج ہوا جب موٹر آگے بڑھتی چلی گئی۔ موسم خوشگوار تھا اور دھیمی دھیمی ہوا مخالف رخ سے چل رہی تھی! ..... وہ اپنے دروازے پر بغیر کسی حادثے کے پہنچ گئیں۔ ڈاکٹر ان کے خوف کا مذاق اڑاتا ہوا چلا گیا۔ .....

انہوں نے دروازہ بند کر لیا اور سڑک پر سے ہوتی ہوئی گھر میں داخل ہوئیں۔ یہ تجربہ ان کے لئے دلچسپ تھا اور خوف انگیز بھی۔ لیکن تھکن ان کو ذرا بھی معلوم نہ ہوتی تھی۔ کس قدر عجیب! بہت ہی عجیب! اور ان کے لئے کتنا بطلان کن تھا کہ انہوں نے بغیر جان کو خطرے میں ڈالے ہوئے وہ تمام کام انجام دیئے جو اُن کو نہ کرنے چاہیئے تھے!

(۵)

دوسرے دن اور اس سے اگلے روز انہوں نے پھر یہی کوشش کی۔ سڑک کی دوسری طرف ایک اور گلی تھی جو چراگاہ کو جاتی تھی۔ ان کا جی چاہتا تھا کہ وہ وہاں جائیں اور معصوم جانوروں کو ادھر ادھر بھاگتا دیکھیں۔ جھاڑیاں پھر ہری ہو گئی تھیں اور نئی نئی کونپلیں اور پھول نکلنے شروع ہو گئے تھے۔ مکھیاں شہد جمع کرنے میں مشغول تھیں۔ آدھے راستے پر اس گلی میں ایک نشست تھی جہاں وہ آرام سے بیٹھ گئیں۔ ان کا خیال تھا کہ اس کو کسی ایسے شخص نے بنوایا ہوگا جو بوڑھی عورتوں کا ہمدرد و غمخوار ہوگا۔ دنیا میں بھی کتنے رحم دل آدمی بستے ہیں! .....

ایک دن صبح کو گلی سے لوٹتے ہوئے وہ مسٹر عربرنس سے

ملیں جو موٹر روک کر ان سے باتیں کرنے لگے۔ وہ انتہا سے زیادہ خلیق اور ملنسار تھے۔ یک بارگی طور پر، اس سے پہلے کہ کچھ گفتگو کریں، وہ پوچھ بیٹھے بیٹھے نہ کیوں نہیں؟ ہم گھر چل رہے ہیں، وہاں چائے پی لیں گے"؟

کیسا خلق اور بے تکلفی! کچھ پہلے سے نہیں سوچا گیا۔ بس جو خیال دماغ میں آگیا اس کو پورا کرنے کی سعی کی گئی۔ بغیر یہ جانے ہوئے کہ دوسرا ابھی قبول کرے گا یا نہیں!..... مگر وہ ان کے مدعو کرنے پر راضی ہو گئیں۔

انہوں نے تاشوں کا تخیل مسٹر عزیز سے حاصل کیا۔ وہ جانتے تھے کہ مسز سونی دوپہر کے وقت تنہائی محسوس کرتی ہوں گی اور انہوں نے رائے دی کہ وہ ان کی بہن اور بیوی کے ساتھ آکر تاش کھیل لیا کریں۔

"مگر میں تاش کھیلنا نہیں جانتی!" انہوں نے کہا۔

"تو ہم سکھا دیں گے"!

ایک زبردست خوف ان پر طاری ہو گیا "آپ جوا کھیلتے ہیں"؟ انہوں نے پوچھا۔

"نہیں"۔

اور انہوں نے تاش کھیلنے کا ارادہ کر لیا۔ چند دنوں کے بعد وہ اس میں ماہر ہو گئیں۔ مسٹر عزیز مذاق اڑایا کرتے اور کہتے تھے "تم تو چھپی رستم نکلیں"۔ جب ڈاکٹر کی بیوی نے یہ سنا کہ وہ تاش کھیلنے لگی ہیں تو انہوں نے بھی انہیں اپنے یہاں آنے کی دعوت دی اور اب ان کا دن اسی طرح گذرنے لگا۔

خادمہ ہی کی وجہ سے گھر میں ریڈیو لگوایا گیا تھا۔ ڈاکٹر کی بیوی کہا کرتی تھیں کہ جب نوبتیں بجنے کی آواز آتی تو ان کا جی چاہتا کہ وہ پھر کسی دن دلّی جائیں۔ لوگوں نے کہا تھا کہ دلّی بہت زیادہ تبدیل ہو گئی ہے اور اگر وہ وہاں گئیں تو معمولی سے معمولی گلی کو بھی نہ پہچان سکیں گی۔ آدمیوں کا ہجوم اور گاڑیاں بے شمار ہیں اور یہ ان کو خوف زدہ کرنے کے لئے کافی تھیں!..... انہوں نے سوچا کہ ایک بوڑھی عورت کے لئے گاؤں میں ہی قیام کرنا بہتر ہے۔

لیکن جب ان کو اپنی بھانجی کی شادی کا رقعہ موصول ہوا تو انہوں نے جانے کا مصمم ارادہ کر لیا حالانکہ کسی کو یقین نہ تھا کہ وہ ایسا کریں گی۔ ان کا دل دھڑک رہا تھا جب وہ دلّی جانے والی گاڑی کے لئے اسٹیشن کو جا رہی تھیں اور انہوں نے گارڈ سے خواہش ظاہر کی کہ وہ انہیں ہر اسٹیشن پر آکر دیکھ جایا کرے۔ دلّی میں ہجوم سے وہ گھبرائیں اور ان کو بے حد خوشی ہوئی جب وہ بخیریت پہنچ گئیں۔ یہ شور و غل کا شہر اُس دلّی سے بہت مختلف تھا جو انہوں نے بچپن میں دیکھی تھی انہیں دلّی بوڑھے آدمیوں کے لئے بالکل ناموزوں معلوم ہوئی حالانکہ جب انہوں نے کھڑکی سے باہر سر نکال کر دیکھا تو ان کو ہزاروں عمر رسیدہ لوگ چلتے پھرتے ملے۔ بہر حال وہاں رہنے میں یک گونہ کشش موجود تھی!....

دلی کا سفر پُر لطف رہا۔ شادی کی خوشی میں اُن کے آنسو نکل پڑے اور لوگوں سے ملنے ملانے میں ان کو انتہائی مسرت ہوئی اپنے بہت سے آدمی جن کو انہوں نے عرصے سے نہیں دیکھا تھا اور نہ ان سے باتیں کی تھیں۔ اب نظر پڑے۔ انہوں نے بتایا کہ وہ کس قدر تندرست ہو گئی ہیں۔ سب نے یہی کہا! اور جب شادی ہو چکی تو وہ سینما میں تماشہ دیکھنے گئیں جو پُر مذاق ہونے کے علاوہ بہت ہی مضحکہ خیز تھا! دینا ناتھ سینما جانا کتنا ناپسند کرتے تھے اور کس قدر ترش الفاظ انہوں نے لوگوں کے حسنِ انتخاب اپنی زبان سے نکالے تھے۔ مگر وہ اس سے محظوظ ضرور ہوئیں!

دو دن کے بعد وہ مکان پلوٹ آئیں۔ وہ اب دلی جانے کا ارادہ نہیں رکھتی تھیں بلکہ وہیں رہنے میں ان کو خوشی محسوس ہوتی تھی۔ اب اس چھوٹے سے گاؤں میں واپس آکر جہاں انہوں نے اپنی زندگی کے زیادہ لمحات گذارے تھے وہ اپنے ہمدرد ہمسایوں کے ساتھ رہنے میں خوش تھیں۔ باغ میں ٹہلنا ان کے لئے کافی تھا اور کبھی کبھی وہ اس پتلی گلی سے ہوتی ہوئی چراگاہ میں جا کر گاؤں کی ہر چیز کو دیکھ آیا کریں گی۔ گاؤں کے جھونپڑے سے اٹھتا ہوا دھواں ایک عجیب قسم کی جاذبیت رکھتا تھا۔ اور ملّاحوں کے گیت اپنے اندر دلکشی۔ ہر شخص کا یہ کہنا تھا کہ وہ تندرست ہیں.... گاؤں کا ہر رہنے والا یہ کہتا تھا کہ وہ صحت یاب ہو گئیں۔ اب ان کا جی چاہتا تھا کہ وہ اس مسرور دنیا میں رہیں۔!

وہ دروازے پر گاڑی سے اتریں۔ تھوڑی دیر باغ میں اِدھر اُدھر دیکھا۔ پیڑوں پر چڑیوں کا چہچہانا عجیب سماں پیدا کر رہا تھا۔ وہ سوچ رہی تھیں "دینا ناتھ کتنے خوش ہوتے اگر وہ مجھے اب خوش اور تندرست دیکھتے۔ کاش میں اُن کی زندگی میں تندرست ہو جاتی پھر ہم کتنے سکھ چین سے رہتے"!

(سینٹ جان جی اروِن سے ماخوذ)

منیب الرحمٰن

محصورِ محبّت

لفظ پہلے ہیں کہ معنی ہیں مقدّم، کیا خبر؟ ایک لفظ!
چھائی ہے مجھ پر ترے حُسن و محبّت کی سحر! لفظ پہلے ہے کہ معنی، کیا خبر؟
عقل کی سب نغمہ سازی گُم ہوئی! چھائی ہے مجھ پر ترے حُسن و محبّت کی سحر!
ہے نگاہوں میں مری اِک آفتاب ہے مُرادِ دل تُو ہی!
اُس کے آگے میرے احساسات کے نغموں کی نرمی ہیچ ہے، ہیچ ہے اب نغمۂ شام و سحر!
دہر کی ہر فتنہ سازی اور گرمی ہیچ ہے! ہیچ ہیں آنکھوں کے آگے بحر و بر!
کھا نہیں سکتا کبھی دھوکا مرا دل بھول کر! اب سمٹ کر کائنات،
ہے زباں پر ایک نام مجھ کو ہے اِتنی سی بات.
اور دل میں ایک نام ایک لفظ!
اور وسعت میں تفکّر کی مرے بس ایک نام! اور وہ ہے تیرا نام!

میراجی

غزل

سکونِ وصل بھی دل کی خلش مٹا نہ سکا
ترے قریب بھی رہ کر قرار آ نہ سکا

تجلیات کی نظارہ سوزیاں توبہ!
تمہارا دیکھنے والا نظر اُٹھا نہ سکا

ملا نہ لطفِ تماشا کسی کو دل کے سوا
جو میری آنکھ نے دیکھا بیاں میں آ نہ سکا

کسی کا دل ہی جل اُٹھنے کا اہل ہوتا ہے
نظر کی تُو بھی کہیں بجلیاں گرا نہ سکا

یہ کیا کہا کہ خدا کے سما گئے جلوے
اُسی حرم میں جہاں ایک بُت سما نہ سکا

وہ اک مقامِ تحیّر ہی ہے محبت میں
جہاں پہنچ کے مجھے تُو بھی یاد آ نہ سکا

بہارِ باغ سے کیا دشمنی ہے فطرت کو
یہ کیا ستم ہے کہ گل عمرِ خار پا نہ سکا

سمجھ سکے کوئی کیا مُشتِ خاک کی وسعت
یہ ذرّہ وہ ہے بیاباں میں جو سما نہ سکا

خدا کو بھول گیا ہائے شیخ کعبہ نشیں
بتوں کو دل سے برہمن مگر بھلا نہ سکا

خدا کے راز سمجھنے کا ادّعا اُس کو
بتوں کا راز ہی جس کی سمجھ میں آ نہ سکا

مآلِ عشق بھی تاباںؔ بُرا نہ تھا لیکن
وہ ابتدائے محبت کا لطف آ نہ سکا

ظفر تاباںؔ

آج ــــ اور کل

قمرزمانی صحنچی میں کھٹولی پر بیٹھی چھالیا کتر رہی تھیں۔ موٹے موٹے شیشوں کی کمانی دار عینک آنکھوں سے ہٹا کر پیشانی پر سرکا رکھی تھی۔ سرہانے کی طرف ایک لفافہ رکھا تھا۔ خط کا مضمون کئی بار پڑھ چکی تھیں۔ خیر سے لڑکا کلکتے سے گھر آ رہا تھا۔

قمرزمانی ہاتھوں سے تو چھالیا کتر رہی تھیں۔ مگر دھیان بچّے کے ساتھ ساتھ منزلیں طے کر رہا تھا۔ منہ سے دعائیں نکل رہی تھیں ..... صدقہ امام ضامن کا۔ خواجہ خضر کی نگہبانی۔ کالے کوسوں کا فاصلہ ہے۔ بچہ خیر سے گھر پہنچ جائے ..... آج کل کے لڑکے کیا کہیں، کسی کی سنتے ہیں؟ اکیلا ہی چل پڑا ہوگا۔ اچھا اللہ مالک ہے،

باہر کسی نے دستک دی۔ قمرزمانی نے فوراً سر پر اوڑھنی سرکا، عینک لگائی اور دروازے کی طرف دیکھا:۔

قمرزمانی۔ اے! کون ہے۔ بیٹی؟ چلی آؤ!

ڈیوڑھی کے دروازے سے ٹاٹ کا پردہ اُٹھا۔ میر نذرحسین داخل ہوئے۔ ساٹھ پینسٹھ کا سن۔ سفید شرعی ڈاڑھی۔ خال خال سیاہ بال بھی۔ ململی سی شیروانی۔ دھاریدار گیردن کا پائجامہ۔ جیب میں گھڑی گلے میں گھڑی کی باریک سی زنجیر۔ کندھے پر چارخانہ حاشیہ دار۔ سرخ رومال۔ نذرحسین نے آتے ہی نانی اماں کو سلام کیا۔ مزاج پوچھا۔ بچوں کا حال دریافت کیا۔ پھر پانوں کی ڈھولی۔ اُچپیاں بغچیاں رکھ دیں۔ یہی "بچہ" تھا جس کے متعلق نانی قمرزمانی پریشان ہو رہی تھیں۔ اس "لڑکے" کی آمد پر قمرزمانی نے شکر کیا۔ نذرحسین کے واری صدقے گئیں۔ پاس بٹھایا پیار کیا۔ سفر کا حال پوچھا۔

قمرزمانی۔ بھیا! ابھی ابھی یہ خط آیا تھا اور تم تو خط سے بھی پہلے پہنچ گئے"۔

نذرحسین۔ میں نے اترسوں خط ڈال دیا تھا۔ آج تقسیم ہو کر مل گیا۔ میں پرسوں رات سوار ہوا۔ اس وقت یہاں پہنچ گیا۔"

قمرزمانی۔ "کلکتے سے لکھنؤ۔ صرف دو دن میں"؟

نذرحسین۔ "ریل سے آیا ہوں۔ کلکتے سے لکھنؤ ریل آتی ہے اور ڈاک تو اور بھی تیز آتی ہے"۔

قمرزمانی۔ "ریل؟"

نذرحسین۔ "نانی جان! پہلے بھی دسیوں دفعہ عرض کیا ہے کہ اب تو ساری دنیا ریل سے سفر کرتی ہے"۔

قمرزمانی۔ "ہاں یاد آ گیا۔ ارے راستے میں بھائی سلیمان جاہ کی بغیا پڑتی ہے، ٹھیرے تھے؟"

نذرحسین۔ (مسکرا کر) "کہاں؟"

قمرزمانی۔ "فیض آباد سے اس طرف ــ تو فاتحہ کے لئے ٹھیرے تھے؟"

نذرحسین۔ "ریل چل رہی تھی۔ فاتحہ پڑھ لی تھی"۔

قمرزمانی۔ "ہاں ریل چلتی رہتی ہے"۔ (یہ کہہ کر قمرزمانی کسی گہری فکر میں چلی گئیں)

نذرحسین۔ "نانی جان! کس سوچ میں پڑ گئیں؟"

قمرزمانی۔ "کچھ نہیں۔ مجھے وہ وقت یاد آ گیا۔ جب تمہارے نانا ہمیں اور بچوں کو لے کر خالہ اماں کے ہاں عنت نگر چلے تھے۔ ہم سب کو بہلی میں سوار کیا۔ اسباب اور رخت سفر کے لئے رہرو ساتھ تھا۔ خود گھوڑے پر سوار ہوئے۔ کمر میں تلوار اور پیش قبض لگا تھا۔ نوکر چاکر بھی ساتھ تھے"۔

نذرحسین۔ "ہاں نانا جان کا واقعہ۔ وہ آپ نے سنایا تھا۔ چلیئے اُدھر بچّوں کے پاس تو چلیں"۔

قمرزمانی۔ "بچے ابھی مدرسے سے نہیں آئے ہوں گے۔ سنو تو سہی ...."

نذرحسین۔ "اچھا فرمائیے"۔

قمرزمانی۔ "ہاں! تو سب روانہ ہوئے۔ منزل منزل جا رہے تھے۔ رستے

میں چھ سات دن لگ گئے۔ ساون کی رُت آموں کی بہار تھی۔ سفر کا لطف آرہا تھا۔ اللہ بہشت نصیب کرے تمہارے نانا راستے میں اپنے دوست ملاقاتیوں سے مزاج پرسیاں کرتے۔ دعوتیں کھاتے جارہے تھے۔۔۔۔۔ (ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کچھ وقفہ کے بعد) ایک شام ایک بستی سے اس طرف دریا پڑا۔ مغرب میں سورج ڈوب رہا تھا۔ شفق نمودار ہوئی۔ تمام آسمان پر خونیں سائبان کی طرح چھا گئی۔ زمین کا رنگ بیر بہوٹی کا سا ہوگیا۔ برسات کے دن، کھلا میدان، دریا کا کنارا، چاروں طرف باغات میں درختوں کے پرے۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا۔ زمین آسمان کا یہ رنگ۔ یہ سماں دیکھ کر کچھ طبیعت لہک گئی۔ یا شاید کسی کارزار کی یاد سے سپاہیانہ خون میں جوش آگیا۔ تمہارے نانا نے فوراً حکم دے دیا کہ یہیں ڈیرے ڈال دو۔ مجھے کچھ پس وپیش بھی ہوا۔ مگر کیا مضائقہ تھا۔ بچے بہلی سے نیچے اُتر آئے۔ میں نے تمہاری اماں نسیمہ کو گود میں لے کر بہلی کا پردہ اُٹھا دیا۔ تمہارے نانا نماز میں مشغول ہوگئے۔ نوکر کچھ کھانے پکانے کی فکر کرنے لگے چونکہ سفر تھا میں بھی بچی کو مغلانی کے سپرد کر کے ذرا فرض ادا کرنے کے لئے مصلا بچھا بیٹھی۔

"ابھی وہ جنتی میاں نماز میں مشغول تھے کہ سامنے درختوں کی آڑ سے دس پندرہ آدمی بھالے، لاٹھیاں لئے نکلے۔ اور للکارتے ہوئے ہماری طرف بڑھے۔ نوکر تو چوکنے پہلے ہی تھے جو جس کے ہاتھ لگا لے کر اس گروہ کی طرف لپکا۔ میں نے بچوں کو سمیٹا بہلی میں بٹھایا اور تلوار سونت تمہارے نانا کے برابر جا کھڑی ہوئی۔ انہوں نے اطمینان سے نماز ختم کی۔ سلام پھیرا اور مختصر سی دعا کے بعد اُٹھ کھڑے ہوئے مجھ سے تلوار لی۔ اس اثنا میں نوکر اور رہزن روبرو ہوچکے تھے۔ لاٹھی چل رہی تھی۔ میں اپنا خنجر لئے ساتھ ہوئی۔ مگر تمہارے نانا یہ کہہ کر کہ کسی کو بچوں کے پاس بھی ضرور رہنا چاہئے۔ ہمیں چھوڑ کر ادھر بڑھے اور لڑنے والوں میں غائب ہوگئے۔

"پھر بھیا جو تلواریں چلی ہیں۔ صرف آوازیں آتی تھیں۔ دکھائی کچھ نہ دیتا تھا میں خنجر لئے بچوں کے پاس کھڑی تاؤ کھا رہی تھی۔ مجھے کہہ گئے تھے کہ بچوں کے پاس رہنا۔ مگر مجھ سے نہ رہا گیا۔ بچوں کو اللہ کے حوالے کر کے میں راستہ صاف کرتی ہوئی کارزار میں پہنچی تو کام تمام ہوچکا تھا۔

پندرہ بیس منٹ تلوار چلتی رہی۔ بہت سے رہزن مارے گئے جو بچے بھاگ کھڑے ہوئے۔ خاموشی چھا گئی۔ صرف میں خنجر لئے کھڑی تھی۔ میں نے چاندنی میں دیکھا تو لاشوں کا ستھراؤ لگ گیا تھا۔ تمہارے نانا وسط میں گھائل پڑے تھے۔ لہولہان، زخموں سے چُور۔ کسی بزدل کا نیزہ پشت میں تھا۔ مگر ساتھ ہی حملہ آور بھی تلوار کا اُلٹا ہاتھ کھا کر ڈھیر ہوا پڑا تھا۔

میں نے یہ حال دیکھا تو سینہ پھٹ گیا۔ کلیجہ شق ہوگیا۔ جھک کر انہیں دیکھا۔ اُٹھانے کی کوشش کی۔ نیزہ پشت سے باہر نکالا تو خون اُچھل کر میرے دامن سے لپٹ گیا۔ پھر سر اٹھا کر اپنے زانو پر رکھا۔ معلوم ہوا کہ کچھ ہوش باقی ہے۔ آنکھیں کھولیں، مسکرا دیئے میں نے پوچھا، خیر تو ہے، کیا ہوا؟ بولے، جا رہا ہوں، بچوں کو سنبھال کر واپس لے جانا۔ مجھے دو پھولے مٹی یہیں دے جانا، کہاں لئے لئے پھرو گی، کہا سنا معاف کرنا، خدا حافظ! اتنا کہا اور ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگئے۔ میں نے اتنا سُنا۔ مگر کچھ کہہ نہ سکی۔ وہ ہماری شام غریباں تھی اور ہمارا قافلہ سالار چپ پڑا تھا۔

صبح ہوئی۔ بستی والوں نے جب یہ ماجرا سُنا۔ ہل چل مچ گئی۔ ایک دنیا ٹوٹ پڑی۔ اپنا یہ حال تھا کہ آنکھ میں آنسو نہ منہ میں زبان۔ مرنے والے کو سنبھالوں یا باقی ماندہ زخمی جانثاروں کی مرہم پٹی کروں سہمے ہوئے بچوں کو لئے بیٹھی تھی کہ بھائی سلیمان جاہ ایک جمعیت لے کر آن پہنچے۔ پوچھنے لگے کہ بھابی جان! کیا ہوا؟ میں نے کہا بھائی دیکھ لو تمہارے سامنے ہے۔ اللہ انہیں اجر دے۔ انہوں نے تجہیز وتکفین کی۔ اس قافلہ سالار کے جنازے کو لا کر اپنے باغ میں سپرد گور کر دیا اور میں چھٹے روز ایک بہادر سپاہی کی موت کا تصور باندھے بچوں کی انگلی پکڑے یہاں آگئی۔۔۔۔۔ ہاں، تو بیٹے! جب تم وہاں سے گزرے تھے تو فاتحہ کے لئے ہاتھ اُٹھائے تھے؟"

نذر حسین۔ "ہاں نانی جان! مجھے وہ باغ معلوم ہے مزار کے سرہانے سرو دور سے دکھائی دیتے ہیں۔ چلئے اب تو وہ دیکھئے بچے سکول سے آگئے ہیں۔"

عباد اللہ

تنہائی

پھر کوئی آیا دلِ زار! نہیں، کوئی نہیں
راہرو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار،
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سوگئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزار[1]
اجنبی خاک نے دُھندلا دئے قدموں کے سراغ
گُل کرو شمعیں، بجھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفّل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا

فیض احمد

[1] "کیوں ترا راہگذر یاد آیا" (ادارہ)

اُردو شاعری میں مرثیے کی نشو ونما

پہلے پہل مرثیہ گو کا کام صرف یہی تھا کہ وہ اپنے اشعار میں مرنے والے کو یاد کرے اور حاضرین پر اس درجہ رقت کا عالم طاری کر دے کہ وہ رو پڑیں حاضرین کا رونا قدیم مرثیہ گو کے لئے خراج تحسین سمجھا جاتا تھا۔ اسی وجہ سے مرثیے کا درجہ پہلے بلند نہ سمجھا جاتا تھا حتیٰ کہ بعض لوگوں کا یہ قول تھا کہ بگڑا شاعر مرثیہ گو اور بگڑا گویا مرثیہ خواں ہو جاتا ہے۔ لیکن بعد میں مرثیہ بھی اردو شاعری کی ایک اہم صنف سمجھا جانے لگا۔

ڈاکٹر گراہم بیلی کے خیال کے مطابق مرثیہ اردو نظم کی بلند ترین قسم ہے اور یہ اعلیٰ اور شریف جذبات کو ابھارتا ہے۔ حیرت کا مقام ہے کہ مرثیہ جہاں رزمیہ اور المیہ پر حاوی ہے۔ وہاں اس میں قصیدہ اور مثنوی کی خصوصیات بھی بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔

مرثیے کی پہل کس نے کی؟ یہ ایک لاینحل مسئلہ ہے کیونکہ مرثیہ کے ابتدائی دور میں یہ رواج نہ تھا کہ لوگ شعراء کے تذکرے یا دیوان شائع کیا کریں اس لئے یہ امر معلوم کرنا بہت دشوار ہے کہ سب سے پہلے کس نے مرثیہ کہا۔

عہد جہانگیری میں زبانِ اردو اپنے بچپن میں تھی۔ اس وقت شجاع الدین نوری نے شمالی ہند میں آئمہ کرام کے مرثئے کہے۔ گو اردو زبان کا سرمایہ ابھی بہت کم تھا۔ پھر بھی نوری نے اچھے خاصے پیرائے میں مرثیہ کہا۔ نمونۂ کلام ملاحظہ ہو۔ مرثیہ کے متعلق کہتا ہے ؎

کوئی نظم اس میں تو کرتا نہ تھا ۔۔۔ ولے سب تعصب دبا ہم مٹا
نہ کچھ خوف کھایا نہ جھجکا ذرا ۔۔۔ و ہم مرثیہ سے پہل کر دیا
شروع میں کیا نظم سب واقعا ۔۔۔ دہم تک سب احوال پورا لکھا
میں جب اس کو لوگوں کے آگے پڑھا ۔۔۔ عجب حال عاشور خانہ میں تھا
جن و انس کرتے تھے سب واہ وا ۔۔۔ کہ دکھنی میں لکھا ہے کیا مرثیا
زباں اپنی میں کس نے ایسا لکھا ۔۔۔ کبھی اس سے پہلے سنا نے پڑھا

اماموں سے اس کا ملے گا صلا
کہ ہے نوری ہی موجد اس طرز کا

۱۰۵۳ھ ہجری میں سلطان عبداللہ شاہ دکن کا بادشاہ بنا۔ شیعہ ہونے کی وجہ سے اُس نے دکن میں مجالس عزا کو فروغ دیا اور خود بھی مرثیہ کہا۔ دو اشعار سنیئے۔

کروانے وسنان ماتم ثواب ہے بہت کرنا غم ۔۔۔ مدد ہوں گے امام ہر دم کی ہے امیدواری بھی
حسین کا دوکہ دل میں آن لگا یک چپٹ ناگم؟
کرے قطب عبداللہ سلطان دکوسوں شہریاری بھی

اسی دور کے ایک اور شاعر غواصی کے مرثیے کا ایک شعر سنیئے

غواصیا معطر عالم کوں سب کیا ہے ۔۔۔ گویا تو مرثیہ ہے ریحانِ کربلا کا

علی عادل شاہ نے بھی اچھے مرثیئے کہے۔ اب ہاشمی کے متعلق سنئیے۔ ایک مرثیئے کے شروع میں کہتا ہے۔ ؎

دلبندِ مصطفٰے کا تابوت لے چلے ہیں ۔۔۔ فرزندِ مصطفٰے کا تابوت لے چلے ہیں
سلطان دو جہاں کا سردار اولیا کا ۔۔۔ مظلوم کربلا کا تابوت لے چلے ہیں

بعض شعرا [illegible] ور مرثیہ گو تھے۔ مثلاً کاظم نے کثرت سے مرثیئے کہے۔ ایڈنبرا یونیورسٹی کے بیاض میں ان کے دس مراثی موجود ہیں۔ دو شعر سنئیے:۔

پیئے نہیں ابن حیدر آج پانی ۔۔۔ پوکاریں دیں کے رہبر آج پانی
کہاں روئے زمیں پر آج پانی ۔۔۔ مگر در حوضِ کوثر آج پانی

شاہی:۔

ہائے غریب یتیم ہمانے عابد تیری زاری ہے ۔۔۔ باپ کا مرنا دکھ کا بھرنا تس پر یو بیماری ہے
تیغ کھڑی ہے دشمن سر پر داد بیداد کہ بیماری ہے ۔۔۔ درد مصیبت عابد تم پر آج کتے بن بسیاری ہے

اس کے علاوہ مرزا ابوالقاسم اور مرزا بیجاپوری نے بھی مرثیئے کہے:۔

مغلیہ خاندان کے افراد میں ادبی ذوق بدرجۂ اتم موجود تھا۔ چنانچہ شعراء کی قدردانی ہوتی تھی۔ دکن میں ۱۰۹۸ھ ہجری سے ۱۱۳۱ھ ہجری تک مرثیہ کا بہت زور رہا۔ ذوقی جو بارھویں صدی ہجری کا ایک مشہور مرثیہ گو ہے۔ لکھتا ہے۔

اے شمعِ بزمِ مصطفےٰ گھر آج آتے کیوں نہیں   تاریک ہے ہم بن جہاں جلوہ دکھاتے کیوں نہیں

اشرف بھی اسی دور سے تعلق رکھتا تھا کلام ملاحظہ ہو:۔

ہوس گلگشتِ رضواں کی کرے کیوں عندلیبِ دل   محبت کی گلی میں شاہِ دیں کے ہے وطن میرا
ہوا ہے بسکہ زخمی خنجرِ داغِ غمِ شہ سوں   برنگِ لالہ ہے لبریزِ خوں دل کا چمن میرا

ولی اورنگ آبادی:۔

اے ہادیِ سنسار تو کیوں جا بسایا کربلا   اے واقفِ اسرار تو کیوں جا بسایا کربلا
اے نورِ چشمِ مصطفےٰ فرزندِ شاہِ مرتضیٰ   اے دلبرِ خیر النسا کیوں جا بسایا کربلا
تو دوستاں کا جان ہے تیرا تو ذکر ایمان ہے   تجھ پر ولی قربان ہے کیوں جا بسایا کربلا

مرثیہ کے اعتبار سے تو دکن میں اس صنف کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ لیکن فنّی نقطۂ نگاہ سے لکھنؤ نے مرثیے کو معراجِ کمال پر پہنچایا۔ سودا نے میاں مسکین کے مراثی کو معیاری مرثیے قرار دیا۔ چنانچہ کہتا ہے:۔

اسقاطِ حمل ہو تو کہیں مرثیہ ایسا   پھر کوئی نہ پوچھے میاں مسکین کہاں ہے

مسکین کا کلام ملاحظہ ہو۔

جفا کے دشت میں جب رہ گیا حسین غریب   اور اس کا نام فلک نے لکھا حسین غریب
جنگل میں با پسر و اقربا حسین غریب   شہید ہونے کو اترا ما حسین غریب

فضل نے اس کو کہا فاطمہ کے بیٹے آ   یہ دشت سونا ہے تجھ بن تو اس کو آ کے بسا
زمیں نے تجھ کو بلایا ہے کر اس میں آ کے سما   اور اپنا نام تو اس میں رکھا حسین غریب

مرزا گدا حسین گدا کا کلام بہت دردناک ہے کہتے ہیں:۔

جب آ کر بلا میں وہ گردش کی ماری   بہو فاطمہ کی علی کی پیاری
گنوا بادشاہی لٹا شہریاری   چلی شام کو قید ہونے بے چاری

فلک کو مخاطب کیا کہ ستم گر   تجھے کچھ بھی ہے شرم اے تیرہ اختر
نبوت کا ویراں کیا ظلم سو کر   اٹھے میرے وارث کئی ایک باری

ان کے علاوہ اسی دور میں عاجز، محب دہلوی، محزوں دہلوی احمد بریلوی اور مرزا جعفر علی حسرت استادِ جرأت نے بھی مرثیے کہے۔

میر تقی نے بھی مرثیہ کہا۔ لیکن وہ اس پائے کا نہ تھا کہ شہنشاہِ سخن کے دیوان میں جگہ پاتا۔ چند شعر سنئے:۔

(اس مرثیے کا رد مرزا سودا نے بھی لکھا)

دلوں پر محبوں کے حالت عجب ہے   مصیبت ہے ماتم ہے غم ہے تعب ہے
غرض کیا کہوں کس روش کا غضب ہے   حسین علی کی شہادت کی شب ہے
بجا ہے کہ لوہو کے دریا بہائے   یہ کشتی فلک کی لہو میں ڈبائے
شہِ تشنہ لب کا کسے غم سنائے   یہ کس منہ سے کہئے کہ وہ تشنہ لب ہے

ابتدائی دور میں مرثیہ غزل کی طرز پر لکھا جاتا تھا۔ اور بعض مراثی میں تو ردیف شروع سے ہی عنقا ہوتی تھی اور قافیہ موجود ہوتا تھا بعد میں مرثیے چار مصرعوں کی شکل میں لکھے جانے لگے۔ سودا مرثیہ گوئی کو نہائت مشکل فن سمجھتے تھے۔ آپ لکھتے ہیں۔

"لیکن مشکل ترین و فائق طریقہ مرثیے کا معلوم کیا کہ مضمون درد کو ہزار رنگ میں ربطِ معنی دیا اس باب میں محتشم کاشی کسو نے عز قبول نہیں پایا۔ پس لازم ہے کہ مرثیہ در نظر رکھ کر مرثیے کہے نہ کہ برائے گریہ عوام اپنے تئیں ماخوذ کرے"۔

مرزا سودا نے تقی کے مرثیے کا تو رد لکھ دیا۔ لیکن جب خود مرثیہ لکھنے لگے تو زمین کو بلند نہ کر سکے۔ بندش کی صفائی اور صحت الفاظ کا خیال نہ تھا۔ نہ "مرتبہ در نظر" اور نہ مضامین نو بنو کی تلاش۔ دو شعر سنئے

یارو سنو تو خالقِ اکبر کے واسطے   انصاف سے جواب دو حیدر کے واسطے
وہ بوسہ گہ بنی تھی پیمبر کے واسطے   یا ظالموں کی ورزشِ خنجر کے واسطے

اُس زمانے میں مرثیے کو مطلقاً کوئی اہمیت نہ دی جاتی تھی۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں۔ عوام میں "بگڑا شاعر مرثیہ گو اور بگڑا گویا مرثیہ خواں" کا مقولہ عام تھا۔

اس فن کو مذہبی فریضہ سمجھا جاتا تھا اور اس میں مبالغہ بالکل ناجائز تھا۔ یہی وجہ تھی کہ پہلے مرثیوں میں شعریت کا عنصر نہیں پایا جاتا۔ وہ صرف ایسے الفاظ استعمال کرتے تھے جن سے حاضرین رو پڑیں۔ اور حاضرین کے رونے سے مرثیہ گو یہ سمجھ لیتا تھا کہ اُس کی آخرت اچھی ہو گئی

ان مشکلوں کی وجہ سے بہت کم مرثیے لکھے گئے اور مرثیے میں سوائے حادثۂ کربلا کے اور کسی واقعہ کو نظم بند نہیں کیا گیا جس سے یہ بات ظاہر ہے کہ اگر حادثۂ کربلا نہ ہوا ہوتا تو شاید اردو شاعری میں مرثیہ ہی عنقا ہوتا۔ مرثیہ سنانے والے اور سامعین صرف مرد ہوتے تھے۔

لیکن سامعین اور مرثیہ خواں حضرات سے ایسی عجیب وغریب حرکات سرزد ہوتی تھیں کہ وہ سوائے عورتوں کے اور کوئی نہ کرسکتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مرثیہ ابھی ابتدائی مراحل میں تھا، اور اسے شاعری میں کوئی اہمیت حاصل نہ تھی۔

نوری نے مرثیے کی ایجاد کی۔ سودا اور اس کے متقدمین نے اُس کا علیحدہ خاکہ بنایا۔ اور میر ضمیر نے اردو مرثیے میں ایک نیا رنگ پیدا کیا۔ انہوں نے مرثیے کو صرف نوحہ نہیں رہنے دیا بلکہ بین اور مرثیت کے علاوہ مدح وقدح، فخر ومباہات، رزم اور بزم بھی نہایت شدومد کے ساتھ شامل کردی۔ جنگ کے ہتھیاروں اور گھوڑوں کے اوصاف میں شاعرانہ نازک خیالیوں کا اظہار کیا اور بلاخوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ میر ضمیر نے اردو مرثیئے کے دوسرے دور کا آغاز کیا۔ آپ نے واقعہ نگاری کو بھی مرثیے میں شامل کیا۔ مرثیے میں تشبیہات، استعارات اور مناظر قدرت کچھ اس طریق پر داخل کئے کہ ضمیر کے شاگرد مرزا دبیر اور میر انیس کو بھی اُن کی پیروی کرنی پڑی۔ میر ضمیر کی تشبیہہ کی مثال ملاحظہ فرمائیے۔

پنہاں زرہ میں ہوتی تھی اس طرح سے سناں — بجلی چمک کے ہوتی ہے جوں ابر میں نہاں
اس نیزۂ سیاہ سے تھا سب کو یہ گماں — تھا اژدہائے موسیٰ عمراں کی وہ زباں

اور مبالغہ کی مثال سنئے :-

گھوڑا وہ تیز رو ہے کہ ناگاہ ایک بار — اتنا کہا تھا وہم نے ہاں چل تو ایک بار
دونوں نے ہم عنانی و سرعت کی اختیار — آخر کہاں وہ اور کہاں وہم ہرزہ کار
کچھ کچھ تو ساتھ ساتھ وہ مقدور بھر گیا
پھر یہ خبر نہیں کہ کہاں تھا کدھر گیا

اسی دور میں میر انیس کے والد میر خلیق نے بھی اردو مرثیے کو پروان چڑھایا۔ میر خلیق کے مراثی میں زور بیان فصاحت اور روزمرّہ اتنی نمایاں حیثیت سے تھا کہ اُن کے اور اُن کے بیٹے کے کلام میں تمیز کرنا محال ہے چنانچہ مشہور ہے کہ میر خلیق کے کئی مراثی انیس کے دیوان میں شامل ہوگئے ہیں اور خلیق کے دیوان میں کئی مراثی انیس کے آگئے ہیں۔ دونوں کے کلام کی یکسانی کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ امر ممکن معلوم ہوتا ہے میر خلیق نے فوجوں کی آمد کی تصویر نہایت خوبی سے کھینچی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

پیاسے پہ مثل ابر اُمنڈ آئے دل کے دل — شعلہ صفت چمکنے لگے برچھیوں کے پھل
چلّوں پہ تیر رکھ کے چلے دم ورے کے بل — تیغیں اُپی ہوئی جو کھنچیں ہٹ گئی اجل

دن کو سیاہی شب ظلمات ہوگئی،
کھولے نشان شامیوں نے رات ہوگئی

مختصر یہ کہ میر ضمیر اور میر خلیق نے اردو مرثیے کے دور ثانی کا آغاز کیا اور وہ مرثیے جنہیں تعلیم یافتہ طبقہ بے پروائی سے دیکھتا تھا۔ اُن میں انہوں نے شعریت پیدا کی نوحہ کا اثر بھی زائل نہ ہونے دیا۔ اور اردو مرثیوں کو عوام کے علاوہ خواص کے لئے بھی مفید بنایا۔ پہلے پہل مراثی سوز سے پڑھے جاتے تھے لیکن بعد میں میر ضمیر نے انہیں تحت اللفظ پڑھنا شروع کیا اور یہ ایک حقیقت ہے کہ فصیح و بلیغ کلام تحت اللفظ پڑھا جائے تو زیادہ زیب دیتا ہے۔ اس کے برعکس جس کلام میں نقائص ہوں وہ ترنم سے ہی اچھا معلوم ہوتا ہے۔ مگر آخر الذکر کلام تعلیم یافتہ طبقے کو پسند نہیں آتا اور اُس سے کم علموں ہی کو رغبت پیدا ہوسکتی ہے۔

لیکن حاضرین کو رُلانے کی رسم اب تک جاری تھی خلیق کے چند دردناک اشعار سنئے :-

مرتا ہے باپ اے علی اکبر ابھی نہ جا — دل مانتا نہیں مرے دلبر ابھی نہ جا
اے لال سوئے نیزہ و خنجر ابھی نہ جا — ہے ہے نہ جا شبیہ پیمبر ابھی نہ جا
مضطر ہوں چین آئے پر آتا نہیں مجھے
رونے میں مُنہ ترا نظر آتا نہیں مجھے

اردو مرثیے کا ڈھانچہ میر ضمیر اور میر خلیق نے تیار کیا اور انیس اور دبیر نے اس میں زندگی کی روح پھونک دی۔ انیس اور دبیر دونوں حریف تھے۔ دونوں نے دل کھول کر زبان کو نئے سانچوں میں ڈھالا فصاحت و بلاغت کے دریا بہا دیئے اور اردو ادب کو اپنے علمی اور ادبی کارناموں سے مالامال کردیا۔ وہ آسمان ادب پر آفتاب بن کر چمکے۔ لیکن سچی بات تو یہ ہے کہ ان دونوں شعراء کے لئے ضمیر اور خلیق نے میدان تیار کر رکھا تھا۔

عام رائے یہ ہے کہ انیس کا کلام دبیر سے بہتر ہے کیونکہ انیس کا کلام، فصاحت، بلاغت اور روزمرّہ کی جان تھا۔ اس کے برعکس دبیر کے مراثی میں صحیح روح اور زور بیان کی کمی تھی بہرحال انیس و دبیر نے جذبات کی ترجمانی میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ انہوں نے مرثیوں کو اس رنگ میں لکھا کہ ہر شخص کے اظہار غم کا طریق قدرتی معلوم ہو۔

انیس ودبیر نے اتنے الفاظ کو رائج کیا کہ آج تک کسی اور شاعر سے بن نہ پڑا تھا ضمیر اور خلیق نے اردو مرثیے کی عمارت استوار کی۔ اور انیس اور دبیر نے اُس کی آرائش کی چنانچہ مرثیے کے اجزائے ترکیبی حسب ذیل قرار پائے۔

۱۔ چہرہ۔ تمہید کے طور پر پہلے شعریت کی بلند پروازیاں۔
۲۔ سراپا۔ جس شخص کا مرثیہ کہا ہو۔ اس کی شکل و صورت کی تفصیل۔
۳۔ رخصت۔ جنگ میں حصہ لینے کے لئے مرثیے کے ہیرو کا امام حسین سے اجازت طلب کرنا۔
۴۔ آمد۔ ہیرو کا جنگ میں شریک ہونا۔
۵۔ رجز۔ ہیرو کی زبان سے اپنا تعارف اور اپنے خاندان کی بزرگی اور عظمت پر فخر کرنا اور اپنے اسلاف نے کارہائے نمایاں کا بیان۔
۶۔ جنگ۔ دشمن سے لڑائی۔
۷۔ شہادت۔ اپنی شمشیر خارا شگاف کے جوہر دکھانے کے بعد شہید ہونا اور امام کو آواز دینا۔
۸۔ آہ و فغاں: لاش پر رشتہ داروں اور رفقاء کی آہ و زاریاں۔

انیس میں یہ تمام چیزیں موجود تھیں۔ اگرچہ موقع کو مدنظر رکھتے ہوئے بعض اوقات مناسب تبدیلیاں کی گئیں۔

انیس نے اپنے مراثی میں اتنی مہارت سے کام لیا کہ بچوں کی معصومانہ گفتگو عورتوں کی مایوسی جوانوں کا پرجوش کلام بوڑھوں کی سنجیدہ اور متین گفتگو سن کر بے ساختہ دل سے داد نکلتی ہے۔ پھوپھی کی محبت آمیز ناراضگی، ہمشیرہ کے حسرت آگیں شکوے، بچّی کے طفلانہ طعنے انہی کی زبان سے ادا کروانا۔ انیس ہی کا حصہ تھا۔ بیلی کی تاریخ ادب اردو میں انیس کے متعلق تحریر کیا گیا ہے کہ "ایسا ظاہر ہوتا تھا کہ جن واقعات کو وہ بیان کر رہا ہے۔ اُن کی جائے وقوع پر وہ خود حاضر تھا اور اس کے الفاظ گویا حرف بحرف وہی ہیں جو اُن افراد کی زبان سے نکلے تھے۔" واقعہ کربلا درپیش ہے۔ حضرت امام زین العابدین بیماری کی حالت میں حضرت علی اکبر رضی اللہ عنہ کے متعلق جب یہ سنتے ہیں کہ وہ جنگ پر جا رہے ہیں تو اس وقت حضرت علی اکبرؑ کی آمد پر امام زین العابدین کے جذبات کا عالم ملاحظہ ہو۔

فرمایا عصا لاؤ کہ برادر سے مل آئیں — غازی سے مجاہد سے دلاور سے مل آئیں
دریائے شہادت کے شناور سے مل آئیں — شبیر کے پیارے علی اکبر سے مل آئیں
بھائی کا نہیں کوچ یہ رخصت ہے نبی کی
ہم آپ چلیں گے کہ زیارت ہے نبی کی

حضرت علی اکبر کو نزع کی حالت میں حضرت امام حسین خیمہ میں لے آتے ہیں۔ اب دوسرے رشتہ داروں کے احساسات کو دیکھیئے۔

لاشے کے پاس ہائے پسر کہہ کے ماں گری — ہاتھوں سے دل پکڑ کے پھپھی نیم جاں گری
دل پہ ہر اک کے برقِ غمِ نوجواں گری — غش ہو کے یاں گری کوئی اور کوئی واں گری
چھوٹی بہن جو لاشے سے آ کر لپٹ گئی
اک حشر ہو گیا صفِ ماتم الٹ گئی

میر انیس نے رزم میں بھی کمال پیدا کیا۔ لڑائی کی تیاری، معرکے کا زور و شور ہنگامۂ میدانِ کارزار، نقاروں کی گرج، گھوڑوں کی ٹاپوں کی آوازیں مجاہدین کی تلواروں کی جھنکار، نیزوں کی لچک اور کمانوں کی کڑک اس عمدہ پیرائے میں بیان کرتے ہیں کہ جنگ کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھرنے لگتا ہے۔ فوج کی تیاری اور سامان کی تصویر یوں دکھاتے ہیں۔

اُمڈی ہوئی تھی فوج پہ فوج اور دل پہ دل — تھے برچھیوں کے صوت متفرق محل محل
خنجر وہ جن کی آب میں تھی تلخیٔ اجل — وہ گرز جس کے ڈر سے گرے دیو منہ کے بل
دو دو زرہ تھے پاس ہر اک خود پسند کے
حلقے میں تھے بچھے ہوئے حلقے کمند کے
وہ دھوم طبل جنگ کی وہ بوق کا خروش — گم ہو گئے تھے شور سے کروبیاں کے ہوش
تھرّائی یوں زمیں کہ اڑے آسماں کے ہوش — نیزے ہلا کے نکلے سواران درع پوش
ڈھالیں تھیں یوں سروں پہ سواران شوم کے
صحرا میں جیسے آئے گھٹا جھوم جھوم کے

دوسرا موقعہ بھی دیکھئے:۔

دریا کی طرح لشکرِ کیں مارتا ہے جوش — نیزے ہلا رہے ہیں سواران درع پوش
ہل من مبارز کا ہر اک صف میں ہے خروش — چلّے کھنچے ہوئے ہیں کمانوں کے تا بہ گوش
نیزے تنے ہوئے ہیں سنانیں چمکتی ہیں
ترکش کھلے ہوئے ہیں کمانیں کڑکتی ہیں

انیس کی طبع میں جدت تھی۔ اس نے مراثی میں مناظرِ قدرت کو نہایت خوش اسلوبی سے قلمبند کیا۔ دوپہر کے وقت تپش آفتاب کا منظر اور صبح و شام کے رنگین مناظر سے اُس نے اردو شاعری میں قابل قدر اضافہ کیا۔ اُس نے تخیل و محاکات کے امتزاجِ لطیف سے

دامن ادب کو مالا مال کر دیا جس کی نظیر پیش کرنے سے اردو زبان قاصر ہے
تپش آفتاب کا منظر ملاحظہ فرمائیے۔

گرداب پر تھا شعلۂ جوّالہ کا گماں — انگارے تھے حباب تو پانی شرر فشاں
مُنہ سے نکل پڑی تھی ہر اک موج کی زباں — تہ میں تھے سب نہنگ مگر تھی لبوں پہ جاں
پانی تھا آگ گرمیٔ روزِ حساب تھی
ماہی جو سیخ موج پہ آئی کباب تھی

انیس و دبیر سے قبل اردو شاعری میں واقعہ نگاری بالکل نہ تھی ضمیر نے اس کی کوشش کی لیکن ناکام رہے۔ انیس خطرات سے خوب واقف تھے وہ واقعہ کو ایسے کر اس میں زور بیان سے ایک عجیب تاثیر پیدا کر دیتے۔ واقعہ نگاری کو معراج کمال پر پہنچانا سچا آرٹ ہے۔ حضرت عبّاس اپنے گھوڑے پر سوار جب نہر فرات پر پہنچتے ہیں تو اس وقت گھوڑے کی کیفیت یوں بیان کرتے ہیں

دو دن سے بے زباں جو تھا آب و دانہ بند — دریا کو نہنا کے لگا دیکھنے سمند
ہر بار کانپتا تھا سمٹتا تھا بند بند — چمکارتے تھے حضرت عباس ارجمند
تڑپاتا تھا جگر کو جو شور آبشار کا
گردن پھرا کے دیکھتا تھا منہ سوار کا

یا جب حضرت امام حسین علیہ السلام کے رفقاء صف نماز سے لڑائی کے لئے اٹھتے ہیں تو اس موقعہ پر کہا۔

تیار جان دینے پہ چھوٹے بڑے ہوئے — تلواریں ٹیک ٹیک کے سب اٹھ کھڑے ہوئے

لیکن اس واقعہ نگاری کی دھن میں انیس و دبیر نے بعض مبالغہ آمیز واقعات بھی بیان کر دیئے۔ وجہ یہ تھی کہ سامعین اس وقت تک محظوظ نہیں ہو سکتے تھے جب تک کہ مبالغہ پورے زوروں پر نہ ہو۔ مرثیے میں تاریخی واقعات کو قلمبند کیا جاتا ہے اور اس میں مبالغہ نہایت نقصان دہ ثابت ہوتا ہے۔ انیس و دبیر نے کئی من گھڑت واقعات بھی بیان کر دیئے۔ بھلا اس واقعہ کے بیان نہ کرنے سے کس حد تک تسلسل ٹوٹ جاتا کہ حضرت امام حسین علیہ السلام اپنے فرزند کو غنیم کے پاس لے گئے کہ اسے پانی دو۔ اُن جیسے خود دار شخص کا یہ کام نہیں ہو سکتا پھر انیس و دبیر نے دل کھول کر اس واقعے پر خامہ فرسائی کی۔

دبیر نے حضرت کبریٰ کے شوہر کی موت پر ایک فرضی واقعہ لکھا ہے کہ انہوں نے اپنے باپ بھائی اور چچا سے کہا کہ تم ذرا یہاں سے چلے جاؤ تاکہ ؎

بالیں پہ بیٹھیں سر میں ذرا خاک ڈال لیں — ہم بھی کچھ اپنے دل کی تمنا نکال لیں

مرثیہ گو کا کام یہ ہے کہ وہ ممدوح کے اخلاق عالیہ کی تصویر کھینچے نہ کہ عوام کی تسلّی کے لئے مبالغہ آمیز اور من گھڑت واقعات بیان کرے۔

اردو مرثیہ میں رجز کا آغاز بھی انیس و دبیر سے ہوا بعض جگہ رجز کی ضرورت نہ ہوتی تھی لیکن پھر بھی یہ رجز کو کہیں نہ کہیں داخل کر ہی دیتے تھے۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کی زبان سے کہلواتے ہیں ؎

میں ہوں سردارِ شباب چمن خلد بریں — میں ہوں انگشترِ پیغمبر خاتم کا نگیں
میں ہوں خالق کی قسم دوشِ محمدؐ کا مکیں — مجھ سے روشن ہے فلک مجھ سے منور ہے زمیں
ابھی نظروں سے نہاں نور جو میرا ہو جائے
محفل عالم امکاں میں اندھیرا ہو جائے

اسی دور میں غزل کی طرز پر سلام اور نوحے کا رواج ہوا۔ انیس کے سلام بہترین سمجھے جاتے ہیں نمونہ ملاحظہ ہو۔

سلامی آنکھ سے رہ رہ کے خون دل ٹپکتا ہے — غم سجاد بیکس دل میں کانٹا سا کھٹکتا ہے

....

زمین کربلا پر فاطمہ کے پھول بکھرے ہیں — شہیدوں کی یہ خوشبو ہے کہ سب جنگل مہکتا ہے
کہا بانو نے شہ سے تیر چلتے ہیں کلیجے پر — سرہانے جب یہ بچہ نرگسی آنکھوں سے تکتا ہے

یہ بات بے خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ انیس و دبیر کے زمانے میں مرثیئے کی دنیا میں انقلاب برپا ہو گیا لیکن مرثیے کی تہ میں صرف دو باتیں ہی کارفرما تھیں۔ اول۔ احساس مذہب دوم۔ اوروں کو رُلانا اور اصول کے لحاظ سے مرثیہ جہاں سے چلا تھا وہیں کا وہیں رہا۔ لوگوں کو رلانے کے لئے خاندان رسالت کے کارہائے نمایاں اور مظلومین کی شہادت کے حالات ہوتے تھے۔ ان مرثیوں میں ہندوستانی معاشرت کے نقطۂ نگاہ سے حالات سنائے گئے ہیں اور دنیوی محبت کو ترجیح دی گئی جس نے شہید ہونے کے لئے اپنے آپ کو پیش کیا اُس پر خاندان کے تمام افراد نوحہ اور غم کا اظہار کرتے تھے۔ حالانکہ وہاں دنیوی محبت نہ تھی بلکہ دینی محبت کا جذبہ کارفرما تھا۔ دوسرا نقص ان مرثیوں میں یہ ہے کہ ممدوح کی سیرت اور اخلاق کا صحیح اندازہ نہیں کیا جا سکتا مثلاً جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں حضرت امام حسین کا غنیم سے اپنے فرزند کے لئے پانی مانگنا اُن کی خودداری کے منافی ہے۔ من گھڑت اور خانہ ساز واقعات سے ان مرثیوں میں حقیقت نگاری کسی حد تک نہ رہی۔

بہرحال جس طرح غالب کو غزل گوئی میں بلند مرتبت تصور کیا جاتا ہے، اسی طرح انیس و دبیر کو اردو مرثیے کی دنیا میں بے نظیر خیال کیا جاتا ہے۔

اس دور تک مرثیہ ایک اصطلاح سمجھی جاتی تھی۔ جس میں سوائے ائمہ کرام کے حالات کے اور کچھ نہ بیان کیا جا سکتا تھا۔ ہاں قطعات میں دوسروں کی موت پر بھی افسوس کا اظہار کیا جاتا تھا اور بسا اوقات جانوروں کی موت پر بھی قطعات کہے گئے تھے۔

بہرکیف ہمیں یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں کہ اس دور کے مرثیوں کے محاسن معائب سے بہت زیادہ تھے اور اس گلشن کی باغبانی میں انیس و دبیر نے جس محنت سے کام کیا وہ ادب اردو میں بے نظیر ہے۔

اردو مرثیہ کے تیسرے دور میں مرثیے میں غزل کی بحر کو استعمال کیا گیا۔ اس بحر کے استعمال سے غزل گو شاعروں کو تو آسانی ہوئی لیکن مرثیہ گو بہت مشکل میں پڑ گئے۔ کیونکہ ایک شعر میں علیحدہ مطلب ادا کرنا نہایت دشوار تھا۔ دوسری عظیم الشان تبدیلی یہ ہوئی کہ مرثیہ میں ائمہ کرام کی تخصیص اڑا دی گئی اور ہر شخص کی موت پر مرثیے کہے جانے لگے۔ اور مرثیے میں مرنے والے کی موت پر مادی اور غیر مادی نقصانات کا ذکر کیا جانے لگا۔ اس کے علاوہ "سلام" میں کچھ ترمیم کر کے اسے مرثیہ بنا دیا گیا۔

اس دور میں مومن نے اپنے معشوق کی وفات پر ایک طویل مرثیہ لکھا[۱]۔

ترکیب بند بمضمون مرثیہ معشوقہ حور ملک شیم حصلنی وصالہا فی جنت النعیم

خمیازہ عیش کا مرا دل کھینچتا ہے آج   آغوش رشک حلقۂ اہل عزا ہے آج

برباد شور رعد ہوا آب اشک پر   کیسا وفور شیون و جوش بکا ہے آج

جیتے رہے تو لال طمانچوں سے منہ کیا   تغییر رنگ شرم و خجالت فزا ہے آج

پانی کے بدلے منہ میں بھر آئے ہے لہو   لب کاٹنے میں ہائے کہاں وہ مزا ہے آج

مجھ کو نہ اپنے ساتھ عدم میں لئے گیا   ہر دم شکایت نفس نارسا ہے آج

آواز ہائے ہائے کی آتی ہے متصل   گرد دل طلسم گنبد ماتم سرا ہے آج

اتنے کہاں حواس کہ تدبیر مرگ ہو   اپنی خبر نہیں مجھے کیا جانے کیا ہے آج

اے دل خبر لے نغمۂ شادی کو کیا ہوا   لب پر ہمارے نالۂ وا حسرتا ہے آج

بیٹے مجھے جو روئے، وہ کہتے تھے بارہا   کیا روئیے اسی کا ہمیں سلسلہ ہے آج

اتریں گلے سے گھونٹ نہ آب حیات کے   دل آہ زندگانی سے کتنا خفا ہے آج

مرنا یہ کس کا جان سے بیزار کر گیا
ماتم میں مر رہا ہوں ہیں یہ کون مر گیا

دل کی طرح سے یہ بھی چلی جاں کو کیا ہوا   دم میں نہیں ہے دم مرے جاناں کو کیا ہوا

سر پیٹتا ہے شانہ پڑا دونوں ہاتھ سے   کیا جانے اس کی زلف پریشاں کو کیا ہوا

پیتی ہے اپنا خون دل افسوس سے حنا   اس دست رشک پنجۂ مرجاں کو کیا ہوا

شبنم کو پھر رہے جانب خور شید التفات   شرمندہ ساز مہر درخشاں کو کیا ہوا

دل میں شکن ہے زلف مسلسل کدھر گئی   برہم ہے حال کاکل پیچاں کو کیا ہوا

لذت فزا نہیں الم اس لب بکیا بنی   کچھ زخم بے مزا ہیں نمکداں کو کیا ہوا

گردش پہ اپنی نازاں ہے پھر روزگار کو   اس چشم رشک فتنۂ دوراں کو کیا ہوا

دعوے ہے شوخیوں کا غزالان دشت کو   اس خوش نظر کی جنبش مژگاں کو کیا ہوا

کتاں ہے سینہ چاک رخ ماہ دیکھ کر   اس ماہ غیرت مہ تاباں کو کیا ہوا

عیب و حجاب شمع رخان جہاں گیا
وہ مہر آسمان نکوئی کہاں گیا؟

یہ گلستاں سرائے تماشا نہیں رہا   وہ نوبہار گلشن دنیا نہیں رہا

افسوس کوئی پردہ نشیں پردہ در نہیں   وہ حسن جس سے عشق ہو رسوا نہیں رہا

حیف اپنی تلخ کامی و شوریدہ طالعی   جس سے کہ زندگی کا مزا تھا نہیں رہا

اے چرخ چاہئے سے لے ہے روزگار کو   کیا چاہیں روزگار تمنا نہیں رہا

اپنی خرابیوں کو کہاں جا کے روئیے   وہ شمع روئے انجمن آرا نہیں رہا

دل میں جگہ نہ ہونے کا کس سے گلہ کروں   وہ قدر دان شکوۂ بے جا نہیں رہا

کس کو گلے لگائیے اے شوق ہمکنار   وہ خوش گلوئے سینہ مصفا نہیں رہا

کس سے نباہیئے کہ سوائے وفا کے   دنیا میں ہائے نام وفا کا نہیں رہا

اب کس کو دیکھئے کہ کسی کو نہ دیکھئے   وہ پردہ سوز چشم تماشا نہیں رہا

اس نور چشم حسن کو کیونکر نہ روئیے   آنکھوں میں رہ سکے کوئی ایسا نہیں رہا

ہر دم جبین آئینہ آلودہ نم سے تھی   یہ آب و تاب حسن اسی مہ کے دم سے تھی

---

[۱] صاحب مضمون کے اصرار پر ہم نے مومن کی محبوبہ کے مرثیے کو شامل کر لیا ہے لیکن تمام و کمال۔ کیونکہ ہمیں صاحب مضمون کی رائے سے کچھ اتفاق نہیں ہے۔ ہماری رائے میں اس مرثیے میں اگرچہ تصنع کو بہت دخل ہے اور موجودہ انداز نظر کے مطابق چند فنی نقائص و لفظی رجحانات کا اظہار کر رہے ہیں پھر بھی جذبات کی جو شدت اس تصنع کے پردے کو چیر کر نمودار ہوتی ہے، اس کے لئے کچھ زیادہ باریک بینی کی ضرورت نہیں رہتی۔ خصوصاً پہلا، دوسرا، تیسرا، پانچواں، ساتواں، اور بارھواں بند جذبات کا بہت اچھا اظہار کر رہے ہیں۔

(ادارہ)

کیا ماجرا لکھوں میں کہ تابِ رقم نہیں　　ہیں نالہ ہائے صورِ صریرِ قلم نہیں
اٹھی ہے نعش خوش قدِ محشر خرام کی　　یہ حادثہ نزولِ قیامت سے کم نہیں
ایسا گیا کہ یاں تلک آنا محال ہے　　کہتے تھے ہم کہ اس کی طبیعت میں رم نہیں
جاکر رہیں گے عرش پہ اربابِ تعزیہ　　اس جوف میں سمائے یہ ایسا الم نہیں
وحشت مری نگاہ سے ہو کیوں نہ جلوہ گر　　آتا نظر وہ سلسلۂ خم بخم نہیں
پہنچا دیا ہے بے خودیوں نے قریبِ مرگ　　اے چارہ گر! اب آپ میں آئے تو ہم نہیں
یہ زندگانی اہلِ ہوس کو نصیب ہو　　میں ناتواں سزائے جفا و ستم نہیں
بیدادِ یکہ تازیِ ترکِ فلک نہ پوچھ　　کوئی نہیں جہاں میں جو پامالِ غم نہیں
اہلِ زمانہ دیدۂ بادام کی طرح　　وہ آنکھ پھوڑ ڈالتے ہیں جس میں نم نہیں
از بسکہ ہے جہاں سے اٹھ جانے کا خطر　　اب حضرتِ مسیح کے بھی دم میں دم نہیں

افسوس یوں وہ جانِ جہاں جائے ہائے ہائے
دینا تھا غسل خضر کو آبِ حیات سے

اس حور وش سے ہائے کیا ہے جدا ہمیں　　اس زندگی کے ہاتھ سے مرنا پڑا ہمیں
دل جو نہ جان کھا تو بھلا خاک کھائیے　　غم بھی دیا فلک نے تو کیا بے مزا ہمیں
شیریں نہیں وہ خون کہ پیتے ہیں جا بجا　　شکوہ ہے اپنے طالعِ شوریدہ کا ہمیں
چھلنی تو پاؤں ہو گئے اس جستجو میں ہائے　　بیجا ہے خاک چھانتے وہ کب ملا ہمیں
اس تک پہنچنے کی کوئی تدبیر ہی نہیں　　اے کاش خضر آن کے ہو رہنما ہمیں
اس گھر کو دے کے گلشنِ شداد سے مثال　　گرتے ہیں در پہ تا کہ اٹھا لے خدا ہمیں
جنبش نہیں کہ زخم کوئی کارگر لگے　　تیغِ مژہ کا لاکھ تصور بندھا ہمیں
بجلی نہ ایک بار گری ہم پہ بانصیب　　دن رات گو خیالِ تبسم رہا ہمیں
دامن پکڑ کے روئیں نہ کیوں ایک ایک کا　　جب چھوڑ جائے بیکس و تنہا قضا ہمیں
یہ جوشِ رشک خاک میں مل جائے اے خدا　　ہے اس سے ایسی مہر و وفا پر گلا ہمیں

کیا کیا کدورتیں ہیں دلِ ناصبور میں
کیوں نیند آ گئی اسے آغوشِ گور میں

میں مر رہا ہوں اس کی بلا کو خبر نہیں　　ناصح کی بات کون سنے نوحہ گر نہیں
مجھ پر بھی ہے عذابِ شبِ اولین گور　　اے موت آ کہ تابِ قلق تا سحر نہیں
ایسا کہ اس سے عرض کرے جا کے یہ پیام　　ملتا جہاں میں کوئی پیغامبر نہیں
یاں جوشِ غم میں موت سے بدتر ہے زندگی　　آپ آ کے دیکھ جائیے باور اگر نہیں
میرا لہو پیے جو گلا کاٹنے نہ دے　　ہمدم خیالِ تیغِ مژہ بے اثر نہیں
اے ہم نشیں تڑپنے نہ دے خاک پر ذرا　　ایسا تو آسمان بھی بیداد گر نہیں
پتھر پہ سر پٹکنے دے اے مہرباں کہ آج　　بازوئے نرم نرم وہ بالینِ سر نہیں۔

چھوڑ آستیں کہ جامۂ ہستی قبا کروں　　غمخوار دھیان آیا کہ میں جامہ در نہیں
بے چارہ بے قرار ہے درماں کی فکر میں　　آگاہ میرے درد سے مشفق مگر نہیں
بے فائدہ نہیں ہیں مری خاک بیزیاں　　اس کے حصول کی تجھے ہمدم خبر نہیں

اس سیم تن کو ہائے ملایا ہے خاک میں
گردوں نے گنجِ حسن چھپایا ہے خاک میں

ویراں ہے خانہ جلوۂ حیرت طراز کا　　آئینہ دیکھتا ہے منہ آئینہ ساز کا
ہاتھوں سے اپنے مہرۂ نرد پاک کھو دیا　　بگڑا ہے کھیل کیا فلکِ حقہ باز کا
پہلے ہی اذنِ عام کہا نعشِ یار پر　　غیرت سے انتظار نہ دیکھا نماز کا
سر پیٹتی ہیں حلقۂ ماتم میں قمریاں　　نخلِ عزا ہے آہ یہ کس سروِ ناز کا
کب پہنچے باغِ خلد میں ہم سے گنہگار　　ہے تنگ قافیہ ہوسِ ہرزہ تاز کا
زندہ ہی دفن کر دو مجھے دوستو کہ اب　　محتاج کون ہو اجلِ بے نیاز کا
ہے کفر مت کہو اب اسے کس سے وصال ہو　　اے محرم! آہ فائدہ افشائے راز کا
گستاخ نالے فتنۂ محشر جگائیں گے　　خوابِ عدم میں چین ہے گر خوابِ ناز کا
گر گلشنِ خلیل جلا دے تو کیا عجب　　شعلہ ہمارے سوزِ سمندر گداز کا
نادان دل کو مرگ کا اب تک یقیں نہیں　　اللہ کیا گمان تھا عمرِ دراز کا

خود کام ہے عجب مجھے مر جانے کا ترے
کام آئے نیر کیوں نہ لبِ جانفزا ترے

کھو دی خزاں نے رونقِ گلزار ہائے ہائے　　پژمردہ ہو گئے گلِ رخسار ہائے ہائے
پھرتی نہ تھی جو پردہ نشیں گھر میں بے حجاب　　نعش اس کی جا بجا ہے سرِ بازار ہائے ہائے
سروِ فتادہ قامتِ محشر خرام ہے　　کیا ہو گئی وہ شوخیِ رفتار ہائے ہائے
ہمخواب مہ جبیں کی مری آنکھ مند گئی　　کیا سو گئے ہیں طالعِ بیدار ہائے ہائے
وہ شمعِ پرتوِ مہ جلوہ تو بجھ گئی　　دن رات ہے فروغِ شبِ تار ہائے ہائے
ہے کچھ خبر بھی گھر مرا ویران ہو گیا　　سر پھوڑ دا پنا لے در و دیوار ہائے ہائے
اب پوچھے مجھ سے عاشقِ بیکس کی بات کون　　اس میں نہیں ہے طاقتِ گفتار ہائے ہائے
رونا ہوں جان کو ملک الموت کی ذرا　　کر بیر ساتھ تو بھی تو غمخوار ہائے ہائے
اے چرخِ یار کش تجھے پاسِ وفا نہیں　　میں اور رنجِ محنت و آزار ہائے ہائے
اس مہر وش کی مرگ نے خفاش کر دیا　　ہے اضطراب مانعِ دیدار ہائے ہائے

نظارہ ہے محرکِ ماتم ہزار حیف
ابرو ہوا ہلالِ محرم ہزار حیف

مدفن بنے زمینِ چمن وا مصیبتا　　معدوم ہو وہ تنگ دہن وا مصیبتا
جس نازنیں صنم پہ گراں تھا حریرِ چین　　اس کا غلافِ کعبہ کفن وا مصیبتا

دے منکر و نکیر کو نا چار وہ جواب — جو حور سے کرے نہ سخن وا مصیبتا
جس کو شکستنِ دلِ عاشق عذاب ہو — وہ اور جاں کنی کے محن وا مصیبتا
جو عرض مہر نازۂ مہ سے ہو سرنگوں — اُس پر جفائے چرخِ کہن وا مصیبتا
تشبیہہِ آئینہ سے جو ہوتا تھا آب آب — مل جائے خاک میں وہ بدن وا مصیبتا
دیتے تھے حور وش بھی جس آرام دل پہ جان — اُس کا غمِ ہلاک شُدن وا مصیبتا
جُھومر دھرے سے ٹوٹتے تھی جس کے ناتواں — وہ زیرِ بارِ تابِ شکن وا مصیبتا
پھولوں کو جس کی بو نے ملایا تھا خاک میں — ہے اس کی خاک وقفِ سمن وا مصیبتا
وہ خانہ باغِ عیش محل جس کا نام تھا — کہتے ہیں اُس کو بیتِ حزن وا مصیبتا

کیا اعتبار دہر کا عبرت کی جا ہے یہ
عشرت سرا کبھی کبھی ماتم سرا ہے یہ

کیا میرا سدِ راہ ہے سنگِ مزار حیف — چھاتی کا پتھر ان کی ہوا انتظار حیف
یارب زمیں پھٹے کہ سما جاؤں ورنہ کیا — لیلےٰ کو منہ دکھائے گا وہ مہ عذار حیف
ہوں غرقِ آبِ شرم کہ ڈوبا نہیں ہنوز — بے آبرو ہے وہ مژۂ اشک بار حیف
اے مرگ چشمِ لطف کہ حسرت سے مرتے دم — دیکھا کئے وہ میری طرف بار بار حیف
کہتے تھے ان کو جان قیامت ہے خاک ہے — کس مُنہ سے سر اٹھائیں گے ہم شرمسار حیف
دم کی لگی نہ آتشِ یاقوت کو ہوا — کیا خاک ہو گیا گہرِ آبدار حیف
جو گلرخوں کی گور پہ جاتا نہ تھا کبھی — چڑھتے ہیں اس کی گور پہ اب گل ہزار حیف
ہر دم زمیں کو زلزلہ میری طپش سے ہے — وہ شوخ خاک میں بھی رہا بے قرار حیف
اللہ مرگ کی بھی نہ بر آئی آرزو — مایوس ہو گیا دلِ امیدوار حیف
زندہ رہوں میں اور وہ مر جائے ہمنفس — کیا اعتبارِ ہستیِ بے اعتبار حیف

یہ نیم جاں بھی کاش اجل کی پسند ہو
شیون کا غلغلہ میرے گھر سے بلند ہو

وہ مہرِ جلوہ زیرِ زمیں اے فلک دریغ — گردوں نشیں ہو خاک نشیں اے فلک دریغ
ایسے مہِ دو ہفتہ کو رنجِ کسوف ہو — دوراں کا اعتبار نہیں اے فلک دریغ
ہرگز سوائے روزِ قیامت نہ ہو صعود — اتنا ہبوطِ زہرہ جبیں اے فلک دریغ
یوسف لقا و گرگِ اجل ہائے زمانہ، آہ! — عیسیٰ نفس ہو مرگ گزیں اے فلک دریغ
ظالم تری کدورتِ بے جا کو کیا کہوں — نایاب ہو وہ دُرِ ثمیں اے فلک دریغ
کیوں لے گیا بہشت میں اُس رشکِ حور کو — پیدا کہاں ہیں ایسے حسیں اے فلک دریغ
سوچا نہ کچھ اعادۂ معدوم ہے محال — نسیاں جو دم بدم ہے ہمیں اے فلک دریغ
سوزِ غضب سے ہے کرۂ نار سینہ میں — اک مشتِ خاک اور یہ کیں اے فلک دریغ
اُس کو کہ جس کا نقشِ قدم رشکِ مہر ہو — کرتے ہیں خاک مال کہیں اے فلک دریغ

یہ نالہ ہائے شعلہ فشان و زبانہ زن — پھونکیں گے تا بہ عرشِ بریں اے فلک دریغ

ہم پائمالِ مرگ بھی اب سر اٹھائیں گے
جیتے رہے تو حشر کو مہماں بلائیں گے

اے جوشِ نالہ کاوشِ ہر دم کہاں تلک — یوں موت سے شکایتِ پیہم کہاں تلک
اس مہروش کو روز کے رونے سے کیا حصول — اے اشکِ بے قرارئ شبنم کہاں تلک
گردن جھکی ہوئی بھی وہی بار دوش ہے — اے دل خیالِ ابروئے خوش خم کہاں تلک
جل جل کے میرے دل کی طرح خاک ہو گیا — اے آہ سینہ سوزئ ہمدم کہاں تلک
ہیں صحن اُس کے گھر کا سمجھتا ہوں گور کو — اللہ مجھ سے تنگ ہے عالم کہاں تلک
سینے کے سارے آبلے ناسور ہو گئے — اے دستِ عیش وصل کا ماتم کہاں تلک
ہے جستجوئے یار میں سعیِ رہِ عدم — اے شوق دیکھئے کہ ہے دم کہاں تلک
تاثیر کو بھی آگئی موت اُس کے ساتھ ہائے! — کھایا کروں امیدِ اثر سم کہاں تلک
اس زندگی سے میرا دم آیا ہے ناک میں — آخر تحملِ قلق و غم کہاں تلک
اللہ سینہ کوبیوں سے ہاتھ تھک گئے — پیٹیں گے اپنی جان کو یوں ہم کہاں تلک

اے مرگ اس عذاب سے آ کر چھڑا مجھے
مومن ہوں، قید خانہ ہے دار الفنا مجھے

اس مرثیے میں کئی نقائص ہیں۔ اول تو یہ کہ اس مرثیے میں جذبات کو گلدستۂ طاقِ نسیاں بنا کر الفاظ پر بہت توجہ دی گئی ہے۔ دوم یہ کہ اس میں تصنع بہت ہے اور مرثیے میں جذبات کی کمی اور تصنع کو بہت مذموم سمجھا جاتا ہے۔ محبوب کی موت پر جذبات میں تلاطم برپا ہونا ضروری ہے لیکن جذبات کی کمی کے علاوہ تصنع کو بھی داخل کر لیا گیا ہے[1]

اسی دور میں ہم غالب کو دیکھتے ہیں۔ غالب نے تین قابلِ ذکر مرثیے لکھے۔

اول:۔ زین العابدین عارف کی موت پر۔

دوم:۔ اپنے محبوب کی وفات پر۔

سوم:۔ دولتِ اسلامیہ کے انحطاط پر۔

پہلا مرثیہ نہایت دردناک ہے۔ اس میں عارف کو بار بار مخاطب کرنے سے مرثیت اور بھی بڑھ گئی ہے اور یہ مرثیہ کامیاب کہا جا سکتا ہے ؎

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستا کوئی دن اور — تنہا گئے کیوں اب رہو تنہا کوئی دن اور
آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں — مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور
جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے — کیا خوب قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور

[1] اس مرثیے کے آغاز میں ذیلی حاشیہ دیکھئے۔ (ادارہ)

ہاں اے فلک پیر جواں تھا ابھی عارف   کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور
تم ماہِ شبِ چار دہم تھے مرے گھر کے   کیوں پھر نہ رہا گھر کا وہ نقشہ کوئی دن اور

نادان ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنا کوئی دن اور

دوسرے مرثیے کی بنیاد عشق پر ہے۔ یہ اپنے محبوب کی وفات پر لکھا ہے۔ یہ مرثیہ نہایت دردناک ہے۔ اس میں شاعر الم و یاس کی انتہائی منزل پر پہنچ گیا ہے اور ردیف نے مرثیے کا رنگ دوبالا کر دیا ہے۔ آخری شعر بالخصوص قابلِ داد ہے۔ مرثیہ سنئے :-

درد سے میرے ہے تجھ کو بیقراری ہائے ہائے   کیا ہوئی ظالم تری غفلت شعاری ہائے ہائے
تیرے دل میں گر نہ تھا آشوبِ غم کا حوصلہ   تو نے پھر کیوں کی تھی میری غمگساری ہائے ہائے
کیوں مری غمخوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال   دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے
عمر بھر کا تو نے پیمانِ وفا باندھا تو کیا   عمر کو بھی تو نہیں ہے پائیداری ہائے ہائے
زہر لگتی ہے مجھے آب و ہوائے زندگی   یعنی تجھ سے تھی اُسے ناسازگاری ہائے ہائے
گل فشانی ہائے نازِ جلوہ کو کیا ہو گیا   خاک پر ہوتی ہے تیری لالہ کاری ہائے ہائے
شرمِ رسوائی سے جا چھپنا نقابِ خاک میں   ختم ہے الفت کی تجھ پر پردہ داری ہائے ہائے
خاک میں ناموسِ پیمانِ محبت مل گئے   اٹھ گئی دنیا سے راہ و رسمِ یاری ہائے ہائے
ہاتھ ہی تیغ آزما کا کام سے جاتا رہا   دل پہ اک لگنے نہ پایا زخمِ کاری ہائے ہائے
کس طرح کاٹے کوئی شب ہائے تارِ برشکال   ہے نظر خو کردۂ اختر شماری ہائے ہائے
گوشِ مہجورِ پیام و چشمِ محرومِ جمال   ایک دل تس پر یہ ناامیدواری ہائے ہائے

عشق نے پکڑا نہ تھا غالب ابھی وحشت کا رنگ
رہ گیا تھا دل میں جو کچھ ذوقِ خواری ہائے ہائے

اس کے بعد غالب کے اُس مرثیے کی باری آتی ہے جو اُس نے ہندوستان میں دولت اسلامیہ کی المناک تباہی پر لکھا۔ ان دنوں اتنی آزادی نہ تھی کہ صاف صاف خیالات کا اظہار کر دیا جائے۔ اس لئے غالب نے اس تباہی کی داستان تشبیہات اور استعارات کے پردے میں بیان کی ہے ملاحظہ فرمائیے ؎

ظلمت کدے میں میرے شبِ غم کا جوش ہے   اک شمع ہے دلیلِ سحر سو خموش ہے
نے مژدۂ وصال نہ نظارۂ جمال   مدت ہوئی کہ آشتیِ چشم و گوش ہے
مے نے کیا ہے حسنِ خود آرا کو بے حجاب   اے شوق یاں اجازتِ تسلیمِ ہوش ہے
گوہر کو عقدِ گردنِ خوباں میں دیکھنا   کیا اوج پر ستارۂ گوہر فروش ہے
دیدار بادہ حوصلہ ساقی نگاہ مست   بزمِ خیال میکدۂ بے خروش ہے
اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل   زنہار اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو   میری سنو جو گوشِ نصیحت نیوش ہے
ساقی بہ جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی   مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے
یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط   دامانِ باغبان و کفِ گلفروش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ   یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

یا صبح دم جو دیکھئے آ کر تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے

یہاں تک تو غالب اپنے دل کا مطلب استعارے میں چھپانے کی کوشش میں کامیاب رہا لیکن اس شعر میں ؎

داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی   اک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

حقیقت عریاں ہو گئی، اور مطلب نہ چھپ سکا۔ یہ نظم غالب کے تمام کلام میں ممتاز ہے اور اردو شاعری کو اس نظم پر فخر ہے۔

غالب دنیا سے اُٹھا تو حالی نے اس پر مرثیہ لکھا یہ مرثیہ ہندوستان کے گوشے گوشے میں مقبول ہوا۔ اس میں سب سے پہلے دو بندوں میں بے ثباتیِ عالم کی تصویر کھینچی ہے۔ پھر مطلع کہا

بلبلِ ہند مر گیا ہیہات   جس کی تھی بات بات میں اک بات

پھر مرحوم کے خصائل پر یوں روشنی ڈالی۔

نکتہ داں، نکتہ سنج نکتہ شناس   پاک دل، پاک ذات، پاک صفات
شیخ اور بذلہ سنج شوخ مزاج   رند اور مرجعِ کرام و ثقات

پھر شاعرانہ کمالات کو لیا ؎

نثر حسن و جمال کی صورت   نظم ہے غنج و دلال کی صورت
تہنیت اک نشاط کی صورت   تعزیت اک ملال کی صورت
قال اُس کا وہ آئینہ جس میں   نظر آتی تھی حال کی صورت

تمام کمالات کو اس طرح ظاہر کر کے غالب کی موت کی اہمیت کو اس طرح بیان کیا ہے۔

چشمِ دوراں سے آج چھپتی ہے   انوری و کمال کی صورت
لوحِ امکاں سے آج مٹتی ہے   غالبِ بے مثال کی صورت
ہوا اک ایک کارواں سالار   کوئی سالارِ کارواں نہ رہا
اہلِ ہند اب کریں گے کس پہ ناز   رشکِ شیراز و اصفہاں نہ رہا

اُٹھ گیا تھا جو مایہ دارِ سخن
کس کو ٹھہرائیں اب مدارِ سخن

حالی نے پھر غالب کی موت پر اردو ادب کے نقصانات کو بیان کر کے اپنا ذاتی نقصان یوں بیان کیا ہے۔

شعر میں نا تمام ہے حالی — غزل اس کی بنائے گا اب کون

حالی نے اسی اصول پر اپنے بھائی کا مرثیہ کہا۔ پھر علامہ شبلی نعمانی نے بھی اپنے بھائی کا ایک مرثیہ لکھا۔ جو مرثیے کی شرائط کے مطابق بہت اچھا ہے۔

ریاض نے اپنے بچے کی موت پر ایک مرثیہ کہا لیکن یہ زیادہ اہم نہیں ہے۔ ہاں منشی نوبت رائے نظر نے اپنے بیٹے کا جو مرثیہ لکھا۔ وہ بے عیب ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو۔

ہزار ناز سے اس لختِ دل کو پالا تھا — کبھی نہ دھوپ میں باہر اسے نکالا تھا
اسی سے خانۂ تاریک میں اجالا تھا — قمر تھا یہ تو نظر اس قمر کا ہالا تھا
مجھے بھی دفن کرو اس کے ساتھ تربت میں
یہ کس طرح سے رہے گا اکیلا غربت میں

منشی برج نرائن چکبست لکھنوی نے گوکھلے کی موت پر جو مرثیہ لکھا۔ اس کے دو بند ملاحظہ ہوں۔

وطن کی جان پہ کیا کیا تباہیاں آئیں — اُمنڈ اُمنڈ کے جہالت کی بدلیاں آئیں
چراغِ امن بجھانے کو آندھیاں آئیں — دلوں میں آگ لگانے کو بجلیاں آئیں
اس انتشار میں جس نور کا سہارا تھا
افق پہ قوم کی وہ ایک ہی ستارا تھا

اجل کے دام میں آنا ہے یوں تو عالم کو — مگر یہ دل نہیں تیار تیرے ماتم کو
پہاڑ کہتے ہیں دنیا میں ایسے ہی غم کو — مٹا کے تجھ کو اجل نے مٹا دیا ہم کو
جنازہ ہند کا در سے ترے نکلتا ہے
سہاگ قوم کا تیری چتا پہ جلتا ہے

منشی تلوک چند محروم نے علاوہ اور مرثیوں کے اپنی نوجوان بیوی کی موت پر بھی ایک مرثیہ لکھا۔ یہ مرثیہ درد والم میں ڈوبا ہوا ہے ایک بند ملاحظہ ہو۔

ذرا دھیان کرو میرے سوزِ غم کی طرف — چلے ہو تاروں کی چھاؤں میں کس عدم کی طرف
نظر اٹھاؤ ذرا میری چشمِ نم کی طرف — بڑھاؤ ہاتھ نہ لے جاں مرے قدم کی طرف
مجھے تو روکتے ہو بار بار رونے سے
رکو گے کیا نہ مرے زار زار رونے سے

یہاں تیسرے دور کا خاتمہ ہوتا ہے اور طرزِ نو کا آغاز۔

آغاز مرثیہ سے تیسرے دور تک مرثیہ جن منازل سے گذرا۔ اس سے ہم واقف ہیں۔ مرثیے نے کوئی خاص ترقی حاصل نہیں کی۔ پھر بھی یہ ارتقاء مایوس کن نہیں ہے اول سے آخر تک ایک عجیب بات چلی آئی ہے کہ ہر شاعر اور مرثیہ گو نے قدرت کو ظالم، جبار، قہار اور سفاک قرار دیا ہے۔ اور انسان کو بے کس بے یار و مددگار، مفلس اور بے بس سمجھا گیا ہے۔ ہمیں کسی مرثیے کا ایک بھی ایسا شعر نہ ملے گا جس میں قدرت کو کسی کی موت پر حق بجانب سمجھا گیا ہو۔ ہم تو کبھی کسی کی وفات پر کہہ دیتے ہیں۔ کہ "اچھا ہوا۔ زندگی کی کلفتوں سے تو آزاد ہو گیا"۔ لیکن آج تک کسی مرثیہ گو نے ایسا نہیں کہا۔

بہ ظاہر اس بات کے پیشِ نظر اقبال نے ضرورت محسوس کی۔ کہ مراثی میں حیات بعد الموت کا تخیل پیش کیا جائے تاکہ انسان اپنے آپ کو بے بس سمجھ کر مردہ دل نہ ہو جائے۔ پہلے جتنے مراثی کہے گئے۔ اُن کا مقصد حاضرین کو رُلانا تھا۔ تاکہ وہ رو کر دل کا غبار نکال لیں۔ لیکن اقبال کے مراثی میں ایک عجیب اثر پایا جاتا ہے کہ ان کے سننے یا پڑھنے سے انسان روتا تو ضرور ہے لیکن رو کر دل کا غبار نہیں نکلتا بلکہ اس شخص میں عمل کا احساس پیدا ہو جاتا ہے۔

قدیم شعراء فطرت کے مناظر کی تصویر کھینچتے تھے۔ لیکن اُن مناظر کو سراب سے زیادہ اہمیت نہ دیتے تھے۔ اقبال نے اُن مناظر کو اس پیرائے میں پیش کیا کہ ان کے دیکھنے سے قدرت جبار اور قہار معلوم نہیں ہوتی۔ ان مناظر کے مشاہدے سے دیکھنے والے کے دل کو تسکین ہوتی ہے۔

حالی نے غالب کا مرثیہ لکھا۔ لیکن وہ طرزِ قدیم میں تھا اس لئے ہم اُسے تیسرے دور میں رکھتے ہیں۔ اقبال نے بھی شخصی مرثیہ لکھا۔ جو داغ پر ہے۔ لیکن اُس کی طرز نئی ہے اس لئے اس مرثیے کو چوتھے دور میں رکھا گیا ہے۔ یہ امر ظاہر ہے کہ اقبال کے دل میں داغ کا بہت احترام تھا۔ پھر بھی وہ داغ کا مرثیہ بڑے اطمینان سے شروع کرتا ہے۔ سنئے ۔

عظمتِ غالب ہے اک مدت سے پیوندِ زمیں — مہدیِ مجروح ہے شہرِ خموشاں کا مکیں
توڑ ڈالی موت نے غربت میں مینائے امیر — چشمِ محفل میں ہے اب تک کیفِ صہبائے امیر

اس زبردست بنیاد پر وہ اپنے خیالات کو اس طرح استوار کرتا ہے۔

آج لیکن ہمنوا! سارا چمن ماتم میں ہے — شمعِ روشن بجھ گئی بزمِ سخن ماتم میں ہے

بلبلِ دلّی نے باندھا اس چمن سے آشیاں   ہم نوا ہیں سب عنادل باغِ ہستی کے جہاں

چل بسا داغ آہ! میّت اس کی زیبِ دوش ہے

آخری شاعر جہان آباد کا خاموش ہے

داغ کی موت سے جو نقصان ہوا۔ اس کی نوعیّت بھی ملاحظہ فرمایئے۔ ؎

اب صبا سے کون پوچھے گا سکوتِ گل کا راز   کون پوچھے گا چمن میں نالۂ بلبل کا راز

تخصیص کی وجہ بھی سنیئے :۔ ؎

اس چمن میں ہوں گے پیدا بلبلِ شیراز بھی   سینکڑوں ساحر بھی ہوں گے صاحبِ اعجاز بھی

اُٹھیں گے آزر ہزاروں شعر کے بتخانے سے   مے پلائیں گے نئے ساقی نئے پیمانے سے

لکھی جائیں گی کتابِ دل کی تفسیریں بہت   ہوں گی اے خوابِ جوانی تیری تعبیریں بہت

ہو بہو کھینچے گا لیکن عشق کی تصویر کون

اُٹھ گیا ناوک فگن مارے گا دل پر تیر کون

داغ کی موت سے اقبال کو شدید صدمہ ہوا اور اس نے اس صدمے کا اظہار بھی کیا۔ قدیم شعراء کی طرح مجلسِ عزا قائم نہیں کی۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ قدرت کے عالمگیر قانون کو پابند نہیں کیا جا سکتا۔ نیز وہ حیات بعد الموت پہ بھی ایمان رکھتا ہے۔ اس لئے کہتا ہے ؎

کھل نہیں سکتی شکایت کے لئے لیکن زبان   ہے خزاں کا رنگ بھی وجہِ قیامِ گلستان

ایک ہی قانونِ عالمگیر کے ہیں سب اثر

بوئے گل کا باغ سے گلچیں کا دنیا سے سفر

اِسی اصول پر اقبال نے غالب کا مرثیہ بھی کہا تھا۔

جنگ طرابلس میں ایک لڑکی فاطمہ غازیوں کو پانی پلاتے ہوئے میدان جنگ میں شہید ہو جاتی ہے۔ وہ شہادت کے مطلب سے آشنا تھی۔ اس لئے اُس نے بغیر کسی کے خوف کے اپنا فرض پورا کیا۔ اقبال اس کا مرثیہ کہتے ہوئے پہلے اُس کو خراجِ تحسین ادا کرتا ہے ؎

فاطمہ! تو آبروئے اُمّتِ مرحوم ہے   ذرّہ ذرّہ تیری مُشتِ خاک کا معصوم ہے

یہ جہاد اللہ کے رستے میں بے تیغ و سپر   ہے جسارت آفریں شوقِ شہادت کس قدر

یہ کہہ کر وہ کوشش کرتا ہے کہ اس ماتم میں سے پیغامِ عمل کا پہلو پیدا کیا جائے تاکہ انسان میں پھر ایک نئی زندگی کی نمود ہو۔ کتنا عظیم الشان سبق ہے ؎

فاطمہ گو شبنم افشاں آنکھ تیرے غم میں ہے   نغمۂ عشرت بھی اپنے نالۂ ماتم میں ہے

رقص تیری خاک کا کتنا نشاط انگیز ہے   ذرّہ ذرّہ زندگی کے سوز سے لبریز ہے

ہے کوئی ہنگامہ تیری تربتِ خاموش میں

پَل رہی ہے ایک قومِ تازہ اس آغوش میں

اقبال کے نزدیک موت کی کیا حقیقت ہے! وہ سوامی رام تیرتھ کے مرثیے کے اس شعر میں مضمر ہے ؎

چشمِ نابینا سے مخفی معنیٔ انجام ہے

تھم گئی جس دم تڑپ سیمابِ سیمِ خام ہے

ان مرثیوں کے علاوہ اقبال نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ، بلال رضی اللہ عنہ۔ عرفی، شیکسپیئر، رام، اور نانک پر بھی مرثیے کہے۔ لیکن اقبال کے مراثی کا شاہکار وہ مرثیہ ہے جو اُس نے اپنی والدہ کی موت پر لکھا۔ کیونکہ اس میں اُس نے حیات بعد الموت کے تخیل کو نہایت واضح طور پر بیان کیا ہے۔ مرثیے کے آغاز میں اس نے بے ثباتیٔ عالم کا مکمل نقشہ کھینچ دیا ہے اور یہ یقین کر لیا ہے کہ دنیا میں ایک عالمگیر طاقت کے تصرّف سے باہر کوئی شے نہیں۔ پھر جب دل بھر جاتا ہے تو کہتا ہے ؎

کس کو اب ہوگا وطن میں آہ! میرا انتظار   کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بے قرار

خاکِ مرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا   اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا

عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی   میں تری خدمت کے قابل جب ہوا تو چل بسی

اور پھر وہ دنیا کو قنوطیّت کی نگاہ سے دیکھنا شروع کرتا ہے ؎

آہ! یہ دنیا، یہ ماتم خانۂ برنا و پیر   آدمی ہے کس طلسمِ دوش و فردا میں اسیر

کتنی مشکل زندگی ہے کس قدر آساں ہے موت   گلشنِ ہستی میں مانندِ نسیم ارزاں ہے موت

زلزلے ہیں بجلیاں ہیں قحط ہیں آلام ہیں   کیسی کیسی دخترانِ مادرِ ایام ہیں

کلبۂ افلاس میں دولت کے کاشانے میں موت   دشت و در میں شہر میں گلشن میں ویرانے میں موت

موت ہے ہنگامہ آرا قلزمِ خاموش میں   ڈوب جاتے ہیں سفینے موج کی آغوش میں

نے مجالِ شکوہ ہے نے طاقتِ گفتار ہے

زندگانی کیا ہے اک طوقِ گلو افشار ہے

اگر انسان کے گرد و پیش صرف یہی خیالات آتے رہیں تو زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔ قدیم مرثیہ نگاروں کی طرح اس نے یہیں معاملے کو ختم نہیں کیا۔ بلکہ اُس نے صرف وہ پہلو دکھایا ہے جو ہمیں روز نظر آتا ہے لیکن دماغ اس امر کو تسلیم نہیں کر سکتا کہ انسان کی تخلیق صرف اِسی لئے ہوئی ہے کہ اُس پر ظلم و ستم کئے جائیں۔ بلکہ ؎

زندگی کی آگ کا انجام خاکستر نہیں!   ٹوٹنا جس کا مقدر ہو یہ وہ گوہر نہیں۔

اور دیکھئے کتنا صاف صاف کہے دیتا ہے کہ ؎

موت تجدیدِ مذاقِ زندگی کا نام ہے
خواب کے پردے میں بیداری کا اک پیغام ہے

اقبال صرف الفاظ کے جادو سے لوگوں کو فریب نہیں دیتا۔ بلکہ قدرت کے مناظر سے مثالیں دیتا ہے۔ مثلاً ؎

یہ اگر آئینِ ہستی ہے کہ ہو ہر شام صبح
مرقدِ انساں کی شب کا کیوں نہ ہو انجام صبح

اور پھر بغیر کسی پیچ کے حیات بعد الموت کے عالمگیر اصول کو اور صراحت اور وضاحت سے بیان کرتا ہے ؎

وہ فرائض کا تسلسل نام ہے جس کا حیات
جلوہ گاہیں اس کی ہیں لاکھوں جہانِ بے ثبات

مختلف ہر منزلِ ہستی کی رسم و راہ ہے
آخرت بھی زندگی کی ایک جولانگاہ ہے

[تعجب ہے کہ صاحبِ مضمون نے اس ضمن میں اقبال کے غیر فانی مرثیے گورستانِ شاہی کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ اس مرثیے میں جہاں اقبال عظمتِ رفتہ پر خون کے آنسو رو یا ہے وہاں اس نے ایک آنے والے دورِ جمال کی نوید بھی دی ہے۔ چند اشعار ملاحظہ کیجئے :-

پھلا بند

آسماں بادل کا پہنے خرقۂ دیرینہ ہے
کچھ مکدّر سا جبینِ ماہ کا آئینہ ہے

چاندنی پھیکی ہے اس نظارۂ خاموش میں
صبحِ صادق سو رہی ہے رات کی آغوش میں

کس قدر اشجار کی حیرت فزا ہے خامشی
بربطِ قدرت کی دھیمی سی نوا ہے خامشی

باطنِ ہر ذرّۂ عالم سراپا درد ہے
اور خاموشی لبِ ہستی پہ آہ سرد ہے

پانچواں بند

سوتے ہیں خاموش آبادی کے ہنگاموں سے دور
مضطرب رکھتی تھی جن کو آرزوئے ناصبور

قبر کی ظلمت میں ہے ان آفتابوں کی چمک
جن کے دروازوں پہ رہتا تھا جبیں گستر فلک

کیا یہی ہے ان شہنشاہوں کی عظمت کا مآل
جن کی تدبیرِ جہانبانی سے ڈرتا تھا زوال

رعبِ فغفوری ہو دنیا میں کہ شانِ قیصری
ٹل نہیں سکتی غنیمِ موت کی یورش کبھی

بادشاہوں کی بھی کشتِ عمر کا حاصل ہے گور
جادۂ عظمت کی گویا آخری منزل ہے گور

ساتواں بند

روح مشتِ خاک میں زحمت کشِ بیداد ہے
کوچہ گردِ نے ہوا جس دم نفس فریاد ہے

زندگی انساں کی ہے مانندِ مرغِ خوش نوا
شاخ پر بیٹھا کوئی دم چہچہایا اڑ گیا

آہ کیا آئے ریاضِ دہر میں ہم کیا گئے!
زندگی کی شاخ سے پھوٹے، کھلے مرجھا گئے

موت ہر شاہ و گدا کے خواب کی تعبیر ہے
اس ستمگر کا ستم انصاف کی تصویر ہے

سلسلہ ہستی کا ہے اک بحرِ ناپیدا کنار
اور اس دریائے بے پایاں کی موجیں ہیں مزار

اے ہوس! خوں رو، کہ ہے یہ زندگی بے اعتبار
یہ شرارے کا تبسم، یہ خسِ آتش سوار

چاند جو صورت گرِ ہستی کا اک اعجاز ہے
پہنے سیمابی قبا محوِ خرامِ ناز ہے

چرخِ بے انجم کی دہشتناک وسعت میں مگر
بیکسی اس کی کوئی دیکھے ذرا وقتِ سحر

اک ذرا سا ابر کا ٹکڑا ہے جو مہتاب تھا
آخری آنسو ٹپک جانے میں ہو جس کی فنا

آٹھواں بند

زندگی اقوام کی بھی ہے یونہی بے اعتبار
رنگہائے رفتہ کی تصویر ہے ان کی بہار

اس زیاں خانے میں کوئی ملتِ گردوں وقار
رہ نہیں سکتی ابد تک بارِ دوشِ روزگار

اس قدر قوموں کی بربادی سے ہے خوگر جہاں
دیکھتا بے اعتنائی سے ہے یہ منظر جہاں

ایک صورت پر نہیں رہتا کسی شے کو قرار
ذوقِ جدّت سے ہے ترکیبِ مزاجِ روزگار

ہے نگینِ دہر کی زینت ہمیشہ نامِ نو
مادرِ گیتی رہی آبستنِ اقوامِ نو ۔۔ ادارہ]

جس طرح اقبال نے اپنی والدہ کا مرثیہ کہا ہے ویسا ہی آغازِ اسلام کے شہرۂ آفاق عربی شاعر متنبّی نے اپنی والدہ کی وفات پر مرثیہ کہا تھا۔ کیا عجب کہ اقبال نے یہ تخیّل متنبّی سے ہی حاصل کیا ہو۔ موت ایک عجیب چیز ہے۔ اس کے بارے میں جتنے عمیق خیالات ظاہر کئے جائیں گے۔ اتنے ہی فائدہ مند اور تسلّی بخش ثابت ہوں گے۔ جب اس دلیل کو پیشِ نظر رکھا جائے کہ مرنے والا فنا نہیں ہوا۔ بلکہ ہم بھی تھوڑے عرصے کے بعد اُسی جہانِ لطیف میں پہنچ جائیں گے جہاں وہ گیا ہے۔ اور یہ احساس کہ مرنے والا ایک نئی زندگی سے سرفراز کیا گیا ہے۔ ہمارے غم ایک بڑی حد تک کم کر دیتا ہے۔ لیکن یہ امر صرف اس حالت میں ممکن ہے کہ ہمیں حیات بعد الموت پر اس موجودہ زندگی سے بھی زیادہ یقین ہو۔

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ مرثیے میں اقبال ٹامس گرے کی تقلید کرتا ہے حالانکہ یہ بات غلط ہے۔ جہاں تک اس خیال کا تعلق ہے کہ موت کے قبضے میں کائنات کا ذرّہ ذرّہ ہے۔ دونوں قدم بقدم چلتے ہیں۔ چنانچہ گرے گاؤں کے گرجا والے مرثیئے میں کہتا ہے ؎

Full Many a Gem of Purest Ray Serene,
The Dark, Unfathormed Caves of Ocean Bear:

Full Many a Flower Is Born to Blush Unseen,
And Waste Its Sweetness on the Desert Air.[1]

اور گرے کے تمام خیالات کو اس کے ایک مصرعے میں دکھایا جا سکتا ہے ؎

The Paths of Glory Lead But to The Grave.

اس سے ثابت ہوا کہ اقبال نے گرے کی پیروی نہیں کی۔ بلکہ اقبال طامس گرے سے ایک منزل آگے نکل گیا ہے[2]۔ انگریزی شاعری میں بعض عشقیہ نظموں میں تو حیات بعد الموت کا تصور پیش کیا گیا لیکن انگریزی مرثئے میں یہ تصور ہرگز بیان نہیں ہوا۔ اصل میں اسلام نے حیات بعد الموت کا تخیل پیش کیا۔ اس لئے اسلامی شعرا اس تخیل کو اچھی طرح پیش کر سکتے ہیں۔ یورپ پر تو ہمیشہ مادہ پرستی کے گھرے بادل چھائے رہے ہیں اس لئے ان کو اس تخیل سے مس پیدا نہیں ہو سکتا۔

عبدالسلام خورشید

[1] ان سطور کا فارسی ترجمہ ملاحظہ کیجئے (ادارہ)

بسا جواہر خوش آب در تہِ دریا
زنورِ خویش کند تیرہ غار ہا آباد۔
بسا گلے کہ شگفت است وکس ندید اُورا
کہ بوئے خویش بہ ویرانہ می کند برباد۔

[2] اس مصرعے کی پیروی تو ایک طرف، علامہ اقبال نے اس کا ترجمہ کرکے اسے اپنے مشہور مرثیے گورستانِ شاہی میں شامل کر لیا ہے ؎

بادشاہوں کی بھی کشتِ عمر کا حاصل ہے گور
جادۂ عظمت کی گویا آخری منزل ہے گور

دھنک

کرنوں کے چشموں سے بدری بنی رنگ کی کیاری
بدری کی چلمن سے جھانکی رنگوں کی متواری
جوبن پر ہے رنگ راج کی رنگیں راج کماری
چُندری اپنی اُڑا رہی ہے برکھا رُت کی کنواری
اِندر دیوتا چھوڑ رہے ہیں رہ رہ کر پچکاری
یا کر کے اشنان لکشمی سُکھا رہی ہے ساری

ساغر نظامی

رباعی

جلوہ گہِ ناز میں بلایا تو نے
دیدار کا پیغام سنایا تو نے
حائل ہیں درمیاں نگاہیں اے دوست
سو وہ بھی اگر تھا تو نے اٹھایا تو نے

سعید احمد اعجاز

غزل

اک ذرا عشقِ سُبک روح گرانبار سہی
نگہِ ناز میں کچھ شرم کے آثار سہی

تیرے ناکام اب اس درجہ بھی ناکام نہیں
کامرانی بھی ترے عشق میں بیکار سہی

بےخبر عشق میں جینے کے لئے جلدی کر
جان دینے کے لئے فرصتِ بسیار سہی

اور کچھ مصلحتیں شکوۂ بیداد کی تھیں
خیر، انکار نہ ممکن ہو تو اقرار سہی

جو سرِ بزم چھلک جائے وہ پیمانہ ہے
یوں تو گردش میں کئی ساغرِ سرشار سہی

تُو نے جادو کا جگانا بھی کبھی دیکھا ہے
آج وہ آنکھ نہ بیدار نہ ہشیار سہی

گردِ رہ سے وہ زیادہ نہیں، گو منزلِ عشق
کوہ و صحرا سہی، زنداں سہی، گلزار سہی

نگہِ شوق میں پھر بھی ہیں ترے ہی جلوے
نہ سہی دید، تری حسرتِ دیدار سہی

تیری آہستہ خرامی بھی سکونِ دل ہے
اس روش میں بھی تری شوخیٔ رفتار سہی

قتلِ عشاق کو درکار نہیں کچھ سرِ دست
خمِ ابرو کی لچکتی ہوئی تلوار سہی

بات کی بات میں تقدیر پلٹ جاتی ہے
زندگی بارِ غلامی سہی، بیگار سہی

رشکِ فردوس بنا لے گا جہنم کو بھی عشق
تیرے فردوس میں ہر کافر و دیندار سہی

اس قدر عشق نہیں زندہ دلی سے محروم
تجھ سے مایوس سہی، زیست سے بیزار سہی

کون اصرارِ محبت کو مگر سمجھائے
ترے انکار سے پیدا ترا اقرار سہی

عالمِ قدس کی پڑتی ہیں انہیں پرچھائیں
حسن بدمست سہی عشق سیہ کار سہی

کچھ نہ کچھ ہوش تو لازم ہے سرِ بزمِ جہاں
عشق کی بےخبری محرمِ اسرار سہی

کاروانوں کو وہ گم راہ نہ ہونے دے گا
عشق کی آخری منزل رسن و دار سہی

دُکھ گئیں چند رگیں، بول اُٹھا سازِ بہار
فتنہ پردازِ چمن گل نہ سہی خار سہی

پھر بھی ہے قابلِ تعزیر کہ مجرم ہے فراقؔ
ہم نے مانا کہ محبت کا گنہگار سہی

فراق گورکھپوری

خط

(۱)

جس طرح خوش آئند خیالات مٹتی ہوئی زندگی کو جگمگا دیتے ہیں۔ ویسے ہی صبح کے بھورے آسمان میں ستارے اب تک ٹمٹما رہے تھے۔

ایک بوڑھا آدمی سردی سے بچاؤ کے لئے اپنے پھٹے ہوئے لبادے کو بدن کے گرد لپیٹتا ہوا شہر کی گلیوں کو طے کرتا چلا رہا تھا۔ مکانوں کے اندر سے چکّی کے چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں اور چکّی کی گھر رگھر سے ملی ہوئی مزدور عورتوں کے گانے کی آوازیں شہر کی خاموشی میں ارتعاش پیدا کر رہی تھیں۔ وقتاً فوقتاً کسی کُتّے کے بھونکنے کی آواز یا کسی مزدور کے پاؤں کی چاپ سنائی دے جاتی تھی جو صبح سویرے اپنے کام پر جا رہا ہوتا۔ شہر پر موت کا سنّاٹا طاری تھا۔ وہاں کے زیادہ تر باشندے خواب کے آغوش میں بے خبر سوئے ہوئے تھے۔ بڑھتی ہوئی سردی نے خواب کی گرفت کو اور بھی زیادہ سخت کر دیا تھا۔ سردی باشندوں کو اس طرح لوری دے رہی تھی جس طرح جھوٹا دوست اپنے منتخب کردہ شکار کو معنی خیز مسکراہٹ سے مطمئن کرتا ہے۔

بوڑھا آدمی وقتاً فوقتاً کانپتے لیکن جمے ہوئے قدموں سے چلتا رہا۔ یہاں تک کہ شہر کے دروازے سے نکل کر وہ سیدھی سڑک پر آگیا اب وہ نسبتاً ہلکی رفتار سے چلنے لگا۔

سڑک کے ایک طرف درختوں کی قطار تھی اور درختوں کے جھرمٹ میں باغ عامہ۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی کیونکہ سرد ہوا اب بالکل سیدھی چل رہی تھی۔ باغ کے خاتمے پر ایک نئے طرز کی خوبصورت عمارت کھڑی تھی۔ اس عمارت کو دیکھ کر بڈھے آدمی کا جھرّیوں والا چہرہ خوشی اور اطمینان سے جگمگا اُٹھا۔ عمارت کے اوپر ایک تختے پر بڑے بڑے جلی حروف میں لکھا تھا "پوسٹ آفس" بوڑھا آدمی خاموشی سے اندر داخل ہوا اور برآمدے میں بیٹھ گیا۔ دو تین آدمی جو اندر کام میں مشغول تھے اُن کی آواز ہلکے ہلکے سنائی دے رہی تھی۔

"سپرنٹنڈنٹ پولیس" اندر سے ایک آواز آئی۔ بوڑھا آدمی اس آواز کو سن کر کھڑا ہو گیا اور غور سے سننے لگا۔

یکے بعد دیگرے نام اندر سے گونجتے گئے۔ کلرک خطوں پر انگریزی پتوں کو پڑھتا گیا اور منتظر پوسٹ مین کے سامنے پھینکتا گیا۔ مدّت کی عادت سے اس نے پتوں کو پڑھنے میں مہارت حاصل کر لی تھی "کمشنر سپرنٹنڈنٹ، دیوان صاحب، لائبریرین۔۔۔"

اس کارروائی کے دوران میں اندر سے کسی نے مذاحیہ انداز میں پکارا "کوچوان علی!"

بوڑھا آدمی اُٹھا اور تشکرانہ انداز سے آسمان کی طرف دیکھنے لگا اور پھر آگے بڑھ کر کھڑکی پر دستک دی۔

"گوکل بھائی!"

"کون ہے؟"

"تم نے کوچوان علی کا نام پکارا نا! یہ کیا میں موجود ہوں۔ میرا خط مجھے دے دو۔"

"یہ ایک پاگل ہے جناب جو اپنے خط کے لئے ہمیں روزتنگ کرتا ہے"۔ کلرک نے نئے پوسٹ ماسٹر سے کہا۔

بوڑھا آدمی آہستہ آہستہ واپس آگیا اور بنچ پر بیٹھ گیا جس پر وہ پانچ سال سے متواتر بیٹھا کرتا تھا۔

علی کسی زمانے میں ایک ہوشیار شکاری تھا۔ جیسے جیسے اس کو اس فن میں مہارت ہوتی گئی شکار سے اس کا شغف بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ آخر کار شکار کے بغیر اس کو ایک دن بھی گذارنا دشوار ہو گیا جس طرح کسی افیونی کو اپنی مقررہ مقدار نہ ملنے سے بے چینی ہوتی ہے وہی حال اس کا تھا۔ وہ شکار کو بہت دور سے پہچان سکتا تھا اس کی آنکھیں شاہین سے بھی زیادہ تیز نظر تھیں۔

لیکن جب اُس کی زندگی کی شام ختم ہو رہی تھی، اس نے اپنے پرانے طریقے کو یکایک چھوڑ دیا اور ایک نئی کروٹ لی۔ اس کی اکلوتی لڑکی مریم کی شادی ہوگئی اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ اسے چھوڑ کر پنجاب چلی گئی اور اب پانچ سال سے اس کی کوئی خبر نہیں آئی تھی۔

پوسٹ آفس جو دنیا کی سب سے غیر دلچسپ جگہ سمجھی جاتی ہے اس کی زیارت گاہ بن گئی۔ وہ ہمیشہ ایک خاص کونے میں بیٹھا کرتا۔ اور جب لوگوں کو اس کی عادت معلوم ہوگئی تو انہوں نے اس کا مذاق اڑانا شروع کیا۔ اگر اس کے نام کا کوئی خط نہ بھی ہوتا تو بھی وہ اس کا نام پکارتے اور اس کو اچھلتے کودتے آتے دیکھ کر لطف اٹھاتے لیکن غیر محدود اعتماد اور صبر کے ساتھ وہ ہر روز آتا اور خالی ہاتھ واپس جاتا رہا۔

ایک دن وہ حسب معمول وہاں بیٹھا تھا لیکن دروازے کے کھلنے پر بھی وہاں سے نہ ہلا۔

"پولیس کمشنر" کلرک نے پکارا اور ایک جوان شخص خطوط کے لئے اندر داخل ہوا۔

"سپرنٹنڈنٹ" دوسرا ڈاکیہ آیا اور اسی طرح کلرک وشنو کے ایک پجاری کی طرح وہ ہزاروں نام دہراتا گیا جن کا وہ مدت سے عادی تھا۔

آخر سب چلے گئے۔ علی بھی اٹھا اور پوسٹ آفس کو اس طرح سلام کرتے ہوئے جیسے وہ کوئی قیمتی یادگار ہو۔ چلا گیا —— وہ ایک قابل افسوس انسان تھا، اپنے زمانے سے ایک صدی پیچھے۔

"وہ آدمی پاگل ہے؟" پوسٹ ماسٹر نے علی کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

"کون؟ علی؟ جی ہاں!" ایک کلرک نے جواب دیا "وہ گذشتہ پانچ سال سے یہاں آتا ہے موسم کی تبدیلیوں سے بے پروا۔
لیکن اس کے پاس خطوط تھوڑے ہی آتے ہیں" کلرک نے ریمارک کیا۔
"غالباً اس نے اپنی گذشتہ زندگی میں بہت سے گناہ کئے ہیں یا کسی مقدس زمین پر خون بہایا ہے اور اس کا عذاب وہ اب بھگت رہا ہے" کلرک نے اپنے بیان کی تائید میں کہا۔
"پاگل بھی عجب آدمی ہوتے ہیں" پوسٹ ماسٹر نے محض بولنے کے خیال سے کہا۔

"ہاں! میں نے الہ آباد میں ایک پاگل کو دیکھا جو دن بھر مٹی بٹورتا رہتا تھا اور ایک اور ——— وہ دن بھر دریا کے کنارے سے پانی لے کر ایک پتھر پر ڈالتا رہتا تھا۔"
"یہ تو کچھ بھی نہیں۔ میں ایک آدمی کو جانتا ہوں جو دن بھر شہر میں گھوما کرتا ہے اور ایک ہاتھ سے اپنے گال پہ طمانچہ مارتا ہے اور پھر روتا ہے" کوئی کلرک بیچ میں بولا۔
اور پھر رفتہ رفتہ سارا ڈاک خانہ دماغی امراض کے بارے میں گفتگو کرنے لگا۔ تھوڑی دیر تک سننے کے بعد پوسٹ ماسٹر اٹھا اور اس نے کہا۔
"معلوم ہوتا ہے کہ پاگلوں کی ایک الگ دنیا ہوتی ہے۔ ان کے نزدیک ہم بھی پاگل ہوتے ہوں گے۔ میرا خیال ہے کہ پاگلوں کی دنیا بالکل شاعروں جیسی ہوتی ہوگی۔"
یہ آخری الفاظ کہتے ہوئے پوسٹ ماسٹر اس کلرک کی طرف دیکھ کر ہنسا جو اشعار لکھنے کا عادی تھا۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ اور پھر دفتر میں خاموشی چھا گئی۔

(۲)

بہت دنوں سے علی پوسٹ آفس نہیں آیا تھا کسی شخص کو اس سے ہمدردی نہ تھی لیکن سب جاننا چاہتے تھے کہ خلاف معمول بوڑھا کیوں نہیں آیا۔ آخر کار وہ آگیا لیکن اس کو سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی اور چہرہ اس کے آخری لمحوں کی خبر دے رہا تھا۔ اس روز وہ صبر نہ کر سکا۔
"ماسٹر صاحب" اس نے پوسٹ ماسٹر سے گڑگڑا کر پوچھا۔ "میری مریم کا خط نہیں آیا؟"
پوسٹ ماسٹر کہیں جانے کی جلدی میں تھا۔
"تم کیسے آدمی ہو بھئی؟"
"میرا نام علی ہے" علی نے پوسٹ ماسٹر کی بات پر توجہ نہ دیتے ہوئے کہا۔
"مجھے معلوم ہے! معلوم ہے! لیکن تم جانتے ہو کہ ہم نے تمہاری مریم کا نام رجسٹر میں درج نہیں کر رکھا!"
"تب بھائی اسے مہربانی سے نوٹ کر لیجئے۔ جب میں نہ ہوں گا تو آپ کو فائدہ ہوگا۔"

پوسٹ ماسٹر کا پارہ چڑھ گیا۔ "تم کو ذرا بھی عقل نہیں ہے!" وہ چیخا۔ "چلے جاؤ! کیا تمہارا خیال ہے کہ اگر تمہاری مریم کا خط آیا تو ہم اسے کھا جائیں گے؟" اور وہ جلدی سے چلا گیا۔

علی آہستہ آہستہ واپس آیا۔ وہ ہر قدم پر مڑ مڑ کر پوسٹ آفس کو دیکھتا جاتا تھا۔ اس کی آنکھیں بے چارگی کے آنسوؤں سے ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔ اس کا صبر ختم ہو چکا تھا اگرچہ اعتماد ابھی تک باقی تھا، اب وہ مریم کی خیریت کیونکر جان سکتا تھا؟

علی نے کسی کلرک کو اپنے پیچھے آتے ہوئے سنا اور وہ اس کی طرف مڑ گیا۔

"بھائی!" اس نے کہا

کلرک کو قدرے تعجب ہوا لیکن چونکہ وہ ایک اچھا آدمی تھا۔ اس نے کہا

"کیا ہے"؟

"اسے دیکھو" اور علی نے ٹین کا ایک بکس پیش کیا اور اس میں سے پانچ اشرفیاں نکال کر کلرک کے ہاتھوں پر رکھ دیں "حیران نہ ہو" اس نے سلسلہ قائم رکھا "یہ تمہارے کام آ جائیں گی۔ میرے لئے بیکار ہیں، لیکن کیا تم ایک کام کرنے کا وعدہ کرتے ہو؟"

"کیا"؟

"تم کو وہاں کیا نظر آتا ہے"؟ علی نے آسمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"آسمان"

"وہاں خدا ہے اور اس کی موجودگی میں تم کو یہ روپیہ دیتا ہوں اور جب میری مریم کا خط آئے تو وہ میرے پاس پہنچا دینا"۔

"لیکن کہاں؟ ــــ مجھے کہاں پہنچانا ہوگا؟" گھبرائے ہوئے کلرک نے پوچھا۔

"میری قبر پر۔"

"کہاں؟"

"میری قبر پر! یہ میرا آخری دن ہے! آخری دن" افسوس! میں نے مریم کو نہیں دیکھا اور نہ اس کا کوئی خط ہی پہنچا"۔

علی کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے کلرک آہستہ آہستہ اپنے ہاتھوں میں پانچ چمکتی ہوئی اشرفیاں لئے اس کو چھوڑ کر چلا گیا۔

(۲)

علی اس کے بعد سے کبھی نہیں دیکھا گیا اور نہ کسی نے اس کے بارے میں دریافت کرنے کی زحمت گوارا کی۔

اور ایک روز پوسٹ ماسٹر پر مصیبت پڑی۔ اس کی لڑکی دوسرے شہر میں بیمار پڑی ہوئی تھی اور پوسٹ ماسٹر کو اس کی خبر نہیں ملی تھی۔ جس کا وہ بے چینی سے انتظار کر رہا تھا۔ خطوط آئے اور میز پر پھیر دیئے گئے۔ اس نے ایک لفافہ جس کو اس نے اپنے نام کا قیاس کیا جھپٹ کر اٹھایا۔ لیکن ــــ لیکن یہ کوچوان علی کے نام تھا۔ پوسٹ ماسٹر کا غصہ اب فرو ہو چکا تھا۔ اور اس کی جگہ رنج اور فکر نے لے لی تھی۔ وہ فوراً سمجھ گیا کہ یہی وہ خط تھا جس کا علی انتظار کر رہا تھا۔ یہ ضرور مریم کا خط ہوگا۔

"لچھمی داس!" کیونکہ علی نے جس پوسٹ مین کو روپیہ دیا تھا اس کا نام یہی تھا۔

"ہاں، جناب!"

"یہ علی کا خط ہے، اب وہ کہاں ہے؟"

"میں پتہ لگا لوں گا جناب!"

پوسٹ ماسٹر کو دن بھر اپنا خط نہیں ملا۔ وہ ساری رات جاگتا رہا اور تین ہی بجے سے آفس میں جا کر بیٹھ گیا۔ "جب علی چار بجے آئے گا تو میں خود اسے اس کا خط دے دوں گا"۔ اس نے سوچا۔

اب پوسٹ ماسٹر کو علی کے دل کی حالت معلوم ہو چکی تھی۔ صرف ایک رات فکر کی گذار کر وہ بے چارے بوڑھے کے ساتھ ہمدردی کرنے لگا تھا جس نے پانچ سال یونہی رنج اور فکر میں گذارے تھے۔

پانچ کے گھنٹے کی آواز پر اسے دروازے پر ایک ہلکی سی دستک سنائی دی۔ اس کو یقین ہو گیا کہ یہ علی تھا۔ وہ تیزی سے اپنی کرسی سے اٹھا۔ باپ کا دکھا ہوا دل دوسرے باپ کو پہچاننے میں غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔

"اندر آؤ بھئی علی!" اس نے پکار کر اس بوڑھے کبڑے آدمی کی طرف جو باہر کھڑا تھا خط بڑھاتے ہوئے کہا۔ علی ایک لکڑی کے سہارے پر کھڑا ہوا تھا اور آنسو اس کے چہرے پر بہہ رہے تھے۔ ٹھیک اسی طرح جب کہ کلرک اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا ــــ اس کے خدوخال تب سخت تھے لیکن اب وہ رحم سے نرم ہو رہے تھے۔ اس نے اپنی آنکھیں اوپر اٹھائیں جن میں ایک غیر معمولی چمک دیکھ کر پوسٹ

ماسٹر حیران رہ گیا۔

لچھمی داس نے دوسرے کوارٹر سے آفس کی طرف آتے ہوئے پوسٹ ماسٹر کی آواز سن لی تھی۔

"وہ کون تھا جناب؟ بوڑھا علی؟" اس نے دریافت کیا۔ لیکن پوسٹ ماسٹر نے اس کی طرف توجہ نہ دی کیونکہ وہ پھٹی ہوئی آنکھوں سے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا جہاں سے علی غائب ہوا تھا۔ وہ کہاں گیا ہوگا؟ آخر کار وہ لچھمی داس کی طرف مڑا "ہاں! میں علی سے بول رہا تھا"

"بوڑھا علی مرگیا جناب! لیکن اس کا خط مجھے دے دیجئے۔"

"کیا کہا، تم کو اچھی طرح معلوم ہے؟"

"ہاں! وہ مرگیا" پوسٹ مین نے کہا جو ابھی پہنچا تھا۔ "وہ تو تین مہینے ہوئے کہ مرگیا"۔

پوسٹ ماسٹر بھونچکا رہ گیا۔ مریم کا خط ابھی تک دروازے پر پڑا ہوا تھا۔ کیا اس نے سچ مچ علی کو دیکھا تھا؟ کیا اس کے تصوّر نے اس کو دھوکا دیا تھا؟ یا غالباً یہ لچھمی داس تھا؟

(۴)

روز کا کام شروع ہوا۔ کلرک نے پتے پڑھنے شروع کئے۔ پولیس کمشنر، سپرنٹنڈنٹ، لائبریرین ــــ اور خطوں کو بے پروائی سے پھینکتا گیا۔ لیکن پوسٹ ماسٹر اب ان خطوں کو اس طرح دیکھ رہا تھا جیسے وہ کوئی زندہ چیزیں ہوں۔ وہ اب انہیں لفافوں اور کارڈوں کی شکل میں نہ دیکھتا تھا۔ اس نے اب خط کی قدر و قیمت کو جان لیا تھا۔

(۵)

شام کو تم نے لچھمی داس اور پوسٹ ماسٹر کو علی کی قبر کی طرف جاتے دیکھا ہوگا۔ انہوں نے قبر پر خط رکھا اور واپس ہوگئے۔

"لچھمی داس، کیا آج صبح تم سب سے پہلے آئے تھے؟"

"ہاں جناب!"

"تب کیونکر...... میری سمجھ میں نہیں آتا"۔

"کیا جناب؟"

"اوہ! کوئی بات نہیں"۔ پوسٹ ماسٹر نے تھوڑی دیر کے بعد کہا۔ آفس کے پاس آکر وہ لچھمی داس سے علیحدہ ہوا اور اندر چلا گیا۔ اس باپ کا دل علی کو نہ سمجھنے پر ملامت کر رہا تھا کیونکہ اُسے ایک اور رات انتظار کرنا پڑا۔ وہ آرام کرسی پر لیٹ کر انتظار کرنے لگا۔

علی امجد جعفری

اشعار

بہار آتی ہے جب اور پھول کھلتے ہیں گلستاں میں
دلِ غمدیدہ تیری شادمانی یاد آتی ہے

قریبِ شاخِ گل ہوتی ہے جب دستاں سرا بلبل
ہمیں بھی بھولی بسری اک کہانی یاد آتی ہے

جوانی اور بوئے گل میں یارب کیا تعلق تھا!
کہ بوئے گل سے پیری میں جوانی یاد آتی ہے

محروم

خزاں

یہ سُرخ و زرد دام ہے کہ بےخودی کا جام ہے
شفق کا اہتمام ہے کہ وصل کا پیام ہے! خزاں نمو کی شام ہے!

حیات آبجو سے تھی بہار رنگ و بو سے تھی
نمودِ گُل نمو سے تھی، نمو کا اختتام ہے خزاں نمو کی شام ہے!

گُلوں کے قہقہے نہیں چمن میں چہچہے نہیں
طیور ہیں۔ گئے نہیں۔ دنوں ہی کا قیام ہے خزاں نمو کی شام ہے!

فلک سے قافلہ چلا، ورود کوہ پر ہُوا
وہاں سے دیہہ کو ڈھلا چمن میں اب قیام ہے خزاں نمو کی شام ہے!

نہیں یہ سست بے سبب بہار تک ہی اس کی شب
مزے میں سو رہے گی اب کہ ختم اس کا کام ہے۔ خزاں نمو کی شام ہے!

امین حزیں

ساون

وہ پربت پر ہے اک بدلی کا سایا　　اندھیرا جنگلوں میں سنسنایا
پپیہا پیہو پیہو گنگنایا　　ہوا نے جھاڑیوں میں گیت گایا
وہ بگلوں نے بھی اپنے پر سنوارے
وہ مکھن کے کھلونے پیارے پیارے

وہ وادی میں ابابیلوں کی ڈاریں　　وہ بل کھاتی ہوئی پانی کی دھاریں
وہ بھولے بھولے بچوں کی قطاریں　　وہ جھولوں پر ملاروں کی پکاریں
وہ اک ننھی پھسل کر رو رہی ہے
چنریا بے دلی سے دھو رہی ہے

دھنک نے یک بیک چلہ چڑھایا　　پلٹ دی آن میں عالم کی کایا
پھٹی بدلی میں سورج مسکرایا　　چھوا چاندی کو اور سونا بنایا
ہوا نے دھیمے دھیمے گیت گائے
پہاڑوں کے پڑے جھیلوں میں سائے

وہ اک چرواہے نے مرلی بجائی　　وہ نظاروں کو انگڑائی سی آئی
یہ خنکی اور یہ آتش نوائی　　نیا چولا بدلتی ہے خدائی
ٹھٹھر کر بکریاں تھرا رہی ہیں
جگالی ہی سے من بہلا رہی ہیں

یہ سبزہ اور یہ نالوں کی روانی　　بھیر کر جھاگ بن جاتا ہے پانی
یہ بھیگے بھیگے پودوں کی جوانی　　مجھے ڈستی ہیں یہ گھڑیاں سہانی
زمیں پر بارشیں کیا ہو رہی ہیں
مری قسمت پہ حوریں رو رہی ہیں

وہ اب تک کیوں نہ آئے کیوں نہ آئے!　　وہ آئیں تو مجھے ساون لبھائے
مجھے وہ! اور انہیں پردیس بھائے　　کہاں تک راہ دیکھوں ہائے ہائے!
اڑے جاتے ہیں وہ بادل برس کر
مرے دل اب نہ رو کمبخت! بس کر

احمد ندیم قاسمی

چند لمحوں کی بات

ہوڑہ کا سٹیشن ابھی ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر ہو گا کہ ٹرین ایک دم سست ہو گئی اور بالآخر رک گئی۔ گاڑی کے ٹھہر جانے کی وجہ کچھ ہوئی ہو بہرحال میں نے اس موقعہ کو غنیمت جانا اور اپنے ڈبے سے نیچے اتر کر کھلی ہوا میں آ گیا۔ شام ہو چکی تھی اور چاند نکلا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا کہ اور بھی کئی مسافر میری طرح گاڑی سے اتر کر ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔ ان میں سے بعض نوجوان سگرٹ کے کش لگاتے ہوئے ایک عجیب شان اور فاتحانہ انداز سے زنانہ ڈبوں کے قریب ہو کر گذر جاتے اور کبھی کبھی ایک آدھ معنی خیز قہقہہ بھی لگاتے۔

مشرقی ہندوستان کی زرخیزی کے متعلق سنا تو کرتا تھا اور شاید پرائمری کی کسی جماعت میں جغرافیہ میں بھی پڑھا تھا۔ مگر اپنی آنکھوں سے اس زرخیزی کا آج پہلی بار مشاہدہ کرنے کا موقع ملا تھا۔ چاروں طرف ہریاول دکھائی دیتی تھی۔ اونچے اونچے درخت جن میں سے بہت سے کیلے کے تھے۔ جا بجا خاموش کھڑے تھے۔ چند ایک گھنی جھاڑیاں بھی ریل کی پٹڑی سے کچھ فاصلے پر نظر آ رہی تھیں۔

میں ٹرین کی اندرونی روشنی سے ذرا پرے چہل قدمی کرتا ہوا ایک جھاڑی کے قریب سے گذر رہا تھا کہ کسی نے آواز دی۔

"بابو!"

میں حیران ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ اتنے میں پھر وہی آواز آئی۔ اور اس کے ساتھ ہی دو چھوٹے چھوٹے بچے۔ ایک لڑکی اور ایک لڑکا۔ صرف ایک ایک کرتہ پہنے ہوئے اسی جھاڑی کے عقب سے نکل کر میرے سامنے آ کھڑے ہوئے۔

"کیا تمہیں نے مجھے آواز دی تھی؟" میں نے پوچھا

"ہاں"۔ لڑکے نے جواب دیا۔ اس کے لب و لہجہ سے میں سمجھ گیا کہ وہ دیہاتی ہے۔

"کہو۔ کیا بات ہے؟" میں نے کہا۔ "مگر پہلے یہ تو بتاؤ کہ تم اس وقت اکیلے یہاں کیا کر رہے ہو؟ کیا تم لوگ کہیں قریب ہی رہتے ہو؟"

"نہیں بھوک لگ رہی ہے"۔ لڑکے نے میرے سوال کو نظر انداز کرتے ہوئے کہا۔ "اور گھر میں کچھ نہیں۔ دیدی بھی بھوکی ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ لڑکا خاموش ہو گیا اور پھر دونوں میرے چہرے کی طرف تکنے لگے۔ ان کی منتظر آنکھوں سے معصومیت ٹپک رہی تھی۔ شبہ کرنے کی گنجائش ہی نہ تھی۔

میں نے سوچا "نہ معلوم بے چارے کب سے ترس رہے ہیں اور کہاں رہتے ہیں۔ بے سمجھ ہیں۔ میرے سوالوں کا کیا جواب دیں ان کو تو اس وقت پیٹ بھرنے کی فکر لگی ہے۔ اس خیال کے ساتھ ہی میرے دماغ میں ان لاتعداد افلاس زدہ گھروں کا نقشہ کھنچ گیا جہاں لوگوں کو نان شبینہ بھی میسر نہیں ہوتا۔ یہ دونوں خاموش بچے گویا اس مفلسی کے نشان تھے۔ ان کی پر امید نگاہیں میرے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ میں نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب کی طرف ہاتھ بڑھایا تاکہ انہیں کچھ دے دوں۔

"تم یہاں کیسے آ پہنچے؟" میں نے سوال کیا۔ "کیا تمہیں معلوم تھا کہ گاڑی یہاں سے گذرے گی؟"

"ہاں" لڑکے نے بدستور میرے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "گاڑی کئی بار یہاں سے گذرتی ہے۔ ہم اس کی چمک شام کے وقت دور سے اپنی جھونپڑی میں سے دیکھا کرتے ہیں" اور اس نے ہاتھ سے اپنی پشت کی طرف اشارہ کیا۔ "بہت اچھی معلوم ہوتی ہے۔"

"خوب" میں نے بٹوا نکالتے ہوئے کہا۔ "مگر آج تم اس کے اس قدر قریب کیسے آ گئے؟"

"دیدی نے کہا کہ گاڑی ٹھہر گئی ہے۔ شاید کسی دوسری گاڑی سے کراس ہو گا تم دونوں دیکھ آؤ۔ تمہاری طبیعت بہل جائے گی"۔

"تو ہو دیدی نے تمہیں یہ بتایا؟" اور مدعا یاد آنے پر کہ اس طرف

بہن کو دیدی کہتے ہیں میں نے پوچھا" دیدی تمہاری بہن ہے نا؟"

"ہاں — گاڑی ایک دفعہ پہلے بھی اسی طرح ٹھہری تھی — بہت دنوں کی بات ہے۔ ہم دیدی کے ساتھ دیکھنے آئے تھے۔"

"اسی جگہہ؟"

"نہیں" لڑکے نے جواب دیا" وہ بہت پیچھے تھی۔"

"اور اس دفعہ دیدی نے تمہیں اکیلے بھیج دیا؟" میں نے بٹوا ٹٹولتے ہوئے کہا۔ بٹوے میں نقدی قطعاً نہ تھی۔ صرف کچھ نوٹ تھے۔ میری آنکھوں کے سامنے پھر اسی مفلسی کا نقشہ پھر گیا۔ ایسی صورت میں سوچنا لاحاصل تھا۔ میں نے ایک پانچ روپے کا نوٹ نکالا اور اس لڑکے کے ہاتھ میں دے دیا۔

"تو۔ اسے سنبھال کر گھر لے جانا۔ دیدی کو دے دینا۔ وہ تمہیں بہت اچھا کھانا کھلائے گی۔"

میں اتنا کہہ کر وہاں سے چلنے لگا تھا کہ لڑکے نے جھاڑی کی طرف بھاگ کر پکارا۔

"دیدی! دیدی! یہ دیکھو!"

میں حیران ہو کر پھر وہیں کھڑا ہو گیا۔ کیا اُن کی بہن اُن کے ساتھ تھی؟ مجھے زیادہ سوچنے کی ضرورت نہ پڑی کیونکہ عین اسی وقت وہی لڑکا ایک نوجوان لڑکی کو جھاڑی کے پیچھے سے باہر کھینچ لایا۔

لڑکی نے جس کی پشت میری طرف تھی ایک بار مڑ کر مجھے دیکھا اور پھر سر جھکا لیا۔

"اسی بابو نے وہ نوٹ دیا ہے دیدی" لڑکے نے کہا۔ "بابو۔ یہ ہماری دیدی ہے۔"

میں چند قدم اُٹھا کر اُن تینوں کے قریب پہنچ گیا اور خاموش کھڑا ہو گیا۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ لڑکی کچھ کہے گی مگر اُس نے اپنی زبان سے ایک لفظ نہ نکالا اور بدستور اپنا سر دوسری جانب جھکائے رہی۔ اس کے لمبے لمبے۔ سیاہ اور چمکیلے بال اس کے شانوں پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس نے ایک نہایت سادہ سی ساری پہن رکھی تھی مگر اس سے اس کے سڈول جسم کی خوبصورتی نہ چھپ سکتی تھی۔ اس کے چھوٹے چھوٹے پاؤں برہنہ تھے۔ اور اس کے ہاتھوں کی انگلیاں اپنے چھوٹے بھائی اور بہن کے بالوں کے ساتھ کھیل رہی تھیں۔ یکایک وہ مڑی۔ ایک لمحے کے لئے اس کی آنکھیں میری آنکھوں سے ملیں اور پھر جھک گئیں۔

"آپ نے" اس نے نہایت دھیمی آواز میں کہا" آپ نے ہم غریبوں پر بہت دیا کی۔"

میں نے ایسی شیریں آواز کبھی نہ سنی تھی۔ وہ یقیناً آواز نہ تھی بلکہ ایک لطیف نغمہ۔ میں متحیر کھڑا ہوا اُس کے جھکے ہوئے چہرے کی طرف ہی دیکھے جاتا اگر مجھے یہ خیال نہ آتا کہ مجھے جواب میں کچھ کہنا چاہئے۔

"نہیں نہیں" میں نے کہا" اس بات کا ذکر نہ کرو۔ یہ تو ہم سب کا فرض ہے۔"

"آپ کون ہیں؟" اس نے سادگی سے پوچھا۔

"ایک پردیسی" میں نے قدرے مسکرا کر کہا۔

ایک بار پھر اس نے اپنی نگاہیں اوپر اٹھائیں اور مجھے دیکھا۔ میرا تمام جسم کانپ گیا۔

"شاید ہم دوبارہ کبھی نہ ملیں گے" میں نے اپنے آپ کو کہتے ہوئے سنا۔ نہ معلوم اس وقت مجھ میں کہاں سے قوتِ گویائی پیدا ہو گئی۔ "اس لئے کیا میں ایک بات پوچھ سکتا ہوں؟"

جواب میں اس نے صرف ایک معصومانہ انداز سے میری طرف دیکھا۔

"تمہارا نام کیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"اوما"

"اوما۔ کیا پردیسی کی ایک بات بھی مان لو گی؟" اور اس کے جواب کا انتظار کئے بغیر میں نے کہا" کیا اس وقت کوئی ایسی چیز تمہارے پاس ہے جو تم مجھے اپنی نشانی کے طور پر دے دو؟"

اُس نے اپنی مخصوص معصومانہ سادگی سے اپنی کلائی میری طرف بڑھا دی۔ اُس پر دو کانچ کی چوڑیاں ایک دوسرے سے ملی ہوئی چمک رہی تھیں۔ میں نے اپنا ہاتھ اٹھانا چاہا مگر رک گیا۔ اس کے نرم و نازک بازو کو چھونے کی مجھے ہمت نہ پڑی۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ اگر میں نے اُس کے بازو کو چھو لیا تو محض میرا ہاتھ لگ جانے سے وہاں نشان پڑ جائیں گے۔

"اوما!" میں نے کہا" کیا تم اپنے ہاتھ سے ہی . . . ؟" میرا فقرہ مکمل نہ ہو سکا۔

اُس نے آہستہ سے ایک چوڑی اُتاری اور مجھے دے دی۔

میں نے اس کو حفاظت سے کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔

عین اسی وقت ایک دھماکے کی سی آواز آئی۔ ایک اور گاڑی ہماری گاڑی کے دوسری طرف کراس کر رہی تھی۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے اس کا آخری ڈبہ بھی گذر گیا۔ ایک لمحے کے لئے ہم سب خاموش کھڑے رہے اور پھر جوں ہی میں نے اپنا سر موڑ کر اوما کی طرف دیکھا ہماری گاڑی کے انجن نے سیٹی دی۔ میں اس وقت تک یہ بھی بھول گیا تھا کہ کہاں کھڑا ہوں، گھبرا گیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں ایک خوشگوار خواب دیکھ رہا تھا اور اب کسی بے درد نے مجھے اس خواب سے بیدار کر دیا ہے۔ شاید اوما نے بھی اس وقت کچھ ایسا ہی محسوس کیا ہو کیونکہ ہم دونوں نے ایک دوسرے کو بیک وقت دیکھا۔ اس کی خوبصورت آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

یہ تمام واقعہ پانچ سات منٹ کے وقفے میں ہوا ہوگا۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ میں گھنٹوں سے وہیں کھڑا اوما سے باتیں کر رہا تھا اور اوما ایک اجنبی نہ تھی بلکہ ہم ایک دوسرے کو برسوں سے جانتے تھے۔ پھر ہمیں کیوں جدا کیا جا رہا تھا؟ کیوں؟

میں نے اپنے دائیں بائیں دیکھنا شروع کیا۔ لوگ لمبے لمبے قدم بڑھاتے ہوئے گاڑی کے ڈبوں کی طرف چلے جا رہے تھے، کیا مجھے بھی جانا ہوگا؟

"آپ جائیں گے؟"

یہ اوما کی آواز نہ تھی بلکہ میری قسمت کی پکار!

میں پھر مڑ کر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ اس دفعہ وہ بھی میری طرف دیکھ رہی تھی۔

"ہاں۔ اوما!" میں نے گلوگیر آواز میں جواب دیا۔ "اس کے سوا اور چارہ ہی کیا ہے!"

ایک خیال کے آتے ہی میں نے جلدی سے اپنی جیب سے فاؤنٹن پن نکالا اور اس کی طرف بڑھا دیا۔

"یہ لو۔ اوما! شاید اس کو دیکھنے سے میں تمہیں کبھی کبھی یاد آجاؤں اُس وقت تم خیال کر لیا کرنا کہ پنجاب کے کسی گوشے میں ایک ناچیز مگر تمہیں دیکھ لینے کی وجہ سے خوش قسمت ہستی ہے جس کا نام موہن ہے اور جس کی طرف سے یہ ایک حقیر تحفہ ہے"۔

انجن کی سیٹی پھر سنائی دی اور ساتھ ہی گاڑی کے چلنے کی آواز آئی۔ میں نے دیوانہ وار آگے بڑھ کر اُس کی آنکھوں کو چوم لیا اور پھر وہاں سے بھاگ کر چلتی گاڑی کے ایک ڈبے میں جا داخل ہوا۔ کھڑکی سے سر نکال کر دیکھا تو وہ تینوں اُسی جھاڑی کے قریب کھڑے تھے۔ اوما کا چہرہ گاڑی کی طرف تھا۔ مگر اب وہ بے چاری مجھے کہاں دیکھ سکتی تھی۔ گاڑی کی رفتار تیز ہوتی گئی مگر میں انہیں دیکھتا رہا۔ حتیٰ کہ اُن کے جسم صرف سائے بن کر رہ گئے اور پھر وہ بھی رات کی سیاہی میں کھو گئے۔

میں کلکتے گیا اور وہاں سے واپس بھی آگیا۔ اس بات کو برسوں گذر گئے۔ مگر اوما کی دی ہوئی چوڑی۔ اس اجنبی لڑکی کی یادگار میرے پاس اب بھی محفوظ ہے۔ کبھی کبھی جب میں اس کو نکال کر دیکھتا ہوں تو اُس رونے کے واقعات میری آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ اوما کا چہرہ ایک ستارے کی طرح چمکتا ہوا دکھائی دیتا ہے اور پھر اُسی شام کی سیاہی میں غائب ہو جاتا ہے۔ ایسے لمحات میں میں سوچا کرتا ہوں کہ کیا اوما بھی میری طرح میرا دیا ہوا قلم کبھی کبھی نکال کر دیکھتی ہوگی یا زمانے کے تغیرات نے مجھے اس کے دل سے بالکل محو کر دیا ہوگا! اس بات کا مجھے اس وقت خیال ہی نہیں آتا کہ شاید وہ اس دنیا میں موجود ہی نہ ہو کیونکہ جب تک میں زندہ ہوں وہ بھی میرے دل میں زندہ رہے گی۔

انور اعجاز قیصر

غزل

جو بھی اٹھا ہے ترے در سے پریشاں ہو کر
آخر الامر وہ پلٹا ہے پشیماں ہو کر

غلطی ہوتی ہے ہر فرد سے انساں ہو کر
قابلِ عفو ہوں تقصیر پہ نازاں ہو کر

"اور" سے بات۔ مجھے دیکھ کے خنداں ہو کر
کیا یہ مطلب ہے کہ اُٹھ جاؤں پریشاں ہو کر

تم ہو، پھولوں کی جوانی ہے تمہیں عشق سے کام
مجھ سے پوچھو کہ میں آتا ہوں بیاباں ہو کر

مُسکراتے ہوئے بچ بچ کے نکلنے والے
تیرا دامن نہ پکڑ لوں میں پریشاں ہو کر

حُسن مصروفِ تواضع ہے بہ صد نازِ وفا
فخر کرتا ہوں میں اُس شوخ کا مہماں ہو کر

سر و سامانِ امارت ہے ہوس کی دُنیا
چاہتا ہوں میں تجھے بے سر و ساماں ہو کر

ہوش دراصل ہے احساسِ خودی کا دشمن
عقل رہزن ہے مگر ایک نگہباں ہو کر

بوالہوس کا بھی گریبان سلامت نہ رہے
وصل ممکن ہو اگر چاک گریباں ہو کر

وہی ڈھلکا ہوا آنچل وہی بکھرے گیسو
آج آئی ہے اُدھر سے شبِ ہجراں ہو کر

ایک بُت سے وہ محبت ہے کہ توبہ توبہ!
میں کبھی جھوٹ نہ بولوں گا مسلماں ہو کر

میں اسی شان کو کہتا ہوں "پیامِ اُلفت"
تم نے جس شان سے دیکھا مجھے حیراں ہو کر

کہئے کل بزم سے رودادِ محبت کہئے
دیکھئے پھر مجھے انگشت بدنداں ہو کر

شاد عارفی

برکھا کی رُت آئی

رات اندھیری، میں تنہا، خاموشی سر سو طاری ہے،
خواب شیریں کی لذّت سے بے خود دنیا ساری ہے،
غفلت کے گہرے پردوں میں گُم ساری بیداری ہے،
میں اپنی دنیا میں لیکن بے چینی سی پاتی ہوں،
برکھا کی رُت آئی پیتم آؤ میں گھبراتی ہوں۔

کالے کالے بادل سارے گرج گرج دھمکاتے ہیں،
بجلی کے بے تاب شرارے گردوں پر لہراتے ہیں،
سرد ہوا کے ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے پیہم آتے ہیں
اپنے دل کو جھوٹے وعدے دے دے کر بہلاتی ہوں
برکھا کی رُت آئی پیتم آؤ میں گھبراتی ہوں۔

دہشت سے ہر اک ذرّہ سمٹا ہے اور تھرّاتا ہے،
تاریکی کا خوف مسلّط مجھ پر ہوتا جاتا ہے
جیسے دیکھو کوئی میری جانب بڑھتا آتا ہے،
جلد اپنے دامن میں تم لے لو، میں سہمی جاتی ہوں،
برکھا کی رُت آئی پیتم آؤ میں گھبراتی ہوں

علی احمد

دنیائے ادب
تازہ ترین رسائل کے اہم مضامین

[اس مضمون کو رسائل پر کسی قسم کی تنقید نہیں سمجھنا چاہیئے۔ کیونکہ اس میں فقط چند خاص اور اچھے مضامین نظم و نثر کا ذکر ہوتا ہے۔ معمولی یا ادنےٰ مضامین کا مطلقاً تذکرہ نہیں کیا جاتا]

(رسائل کا ذکر حروفِ تہجی کے اعتبار سے ہے)

داستان لاہور (اگست)

سرقہ۔ اس عنوان کے ماتحت بسنت سہائے صاحب نے ادبی چوریوں پر ایک دلچسپ مضمون لکھا ہے جس میں انہوں نے اس فرق کو نمایاں کیا ہے جو خالص چوری اور اکتساب یا پیروی میں پایا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ درحقیقت اس دنیا میں کوئی چیز نئی نہیں ہے اور جن چیزوں کو ہم بالکل نئی سمجھتے اور کہتے ہیں۔ وہ بھی گذری ہوئی نسلوں کے خیالات کا عکس ہوتی ہیں اور "جدت یا اچھوتا پن صرف اندازِ نظر کی شگفتگی ہی کا دوسرا نام ہے۔ اور اچھوتا ادب اور آرٹ وہی ہو سکتا ہے جس میں روایات سے بغاوت اور انحراف ہو"۔

اس کے بعد انہوں نے ایسے ادبی کارناموں کی متعدد مثالیں دی ہیں جنہیں بعد کے لکھنے والوں نے اکتساباً اپنا لیا۔ مثلاً پرانے عہدنامے میں ہاروت اور ماروت کا جو افسانہ ہے۔ اسے فرانسیسی ادیب اناطول فرانس نے تائیس کی صورت میں پیش کیا اور انگریزی ناول نگار رابرٹ ہچنز نے بھی اپنے مشہور ناول "گارڈن آف اللہ" میں اس کی پیروی کی ہے۔ اردو میں کشن پرشاد کول نے بیسوا کے نام سے جو ناول لکھا وہ بھی ہر طرح سے تائیس کا چربہ ہے (اگرچہ کول صاحب دیباچے میں اس سے انکار کرتے ہیں) اکتساب کی قریب تر مثالیں اردو نثر میں سید امتیاز علی تاج کے مشہور موضوع "چچا چھکن" اور یلدرم کے "مجھے میرے دوستوں سے بچاؤ" میں ملتی ہیں جو سٹیفن لیکاک کے ایک مضمون کا کامیاب چربہ ہے۔ پطرس نے بھی اپنے انداز میں ایک بڑی حد تک سٹیفن لیکاک کی پیروی کی ہے۔ اردو نظم میں پیروی کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔ جوش کی نظم "اقوام عالم کا ترانہ" انگریز شاعر سوئن برن کی ایک نظم کا چربہ ہے۔ تبسم کی نظم "پیمانِ وفا" رابرٹ برنز کی ایک نظم سے لی گئی ہے۔ راشد وحیدی کی نظم اجنبیت کا خیال انگریزی نظم STRANGERS YET سے ماخوذ ہے میراجی کی نظم "مجکو تینوں یکساں ہیں" کشمیری شاعر بابا عبدالرحمٰن کے کلام سے فیض یاب ہے حفیظ جالندھری کی نظم "بھائی کی یاد" (بہار کے پھول) انگریزی کی ایک نظم سے مستعار ہے۔ تاثیر کی نظم "دنیائے دل" ایف۔ ڈبلیو بارڈی لون کی ایک نظم کا لفظی ترجمہ ہے۔ صاحبِ مضمون کے خیال میں "صرف خیالات کا مستعار لینا مردود قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن فن کار کے لئے یہ ضروری ہے کہ وہ جو کچھ مستعار لے کر پیش کرے وہ دیکھنے والے کو از سرِ نو تخلیق کی ہوئی چیز نظر آئے گویا وہ فن کار اور لا کے خیالات کو دوسرا جنم دے دے۔ انہیں انفرادی احساسات، خیالات، جذبات اور تجربات میں یوں گھلا ملا کر ڈھال لے کہ ماخذ سے وہ شے بالکل مختلف ہو جائے"۔

ساقی (اگست)

طوطا۔ ایک ایکٹ کا نہایت شگفتہ ڈرامہ ہے۔ جسے شاہد احمد صاحب ایڈیٹر ساقی نے مشہور ڈرامہ نگار برنرد زانگ ہوبادصیا کی انگریزی سے ترجمہ کیا ہے۔ اور ترجمے میں اصل کی تمام خوبیاں برقرار رکھی ہیں۔ ایک عورت ہے، ایک اس کا ننھا سا شاعر بیٹا، کسی گذشتہ محبت کی نشانی۔ ایک شوہر ہے، شرابی، اور ایک جہاں گرد

ہے جو عورت کو حاصل نہ کر سکا اور جس نے اس کے لئے اپنا سب کچھ
کھو دیا۔ ڈرامہ نگار نے چند لمحات کی مختصر مدت میں ڈرامہ کا نشیب و
فراز ایسی خوبی سے دکھایا ہے۔ اور بحران اس قدر لطیف رکھا ہے کہ اس کی
صناعی پر حیرت ہوتی ہے۔ ٹکنیک بے حد اچھی اور مکالمہ نہایت پر اثر
ہے۔ زبان شاہد احمد صاحب کی قدرت بیان کا بہت اچھا نمونہ ہے۔

اُف یہ بچے! محترمہ عصمت چغتائی کے قلم سے ایک بلند پایہ
معاشرتی چربہ ہے۔ ہندوستانی گھروں کی "رونق" اور بے ترتیبی بچوں
ہی کے دم سے قائم ہے اور ایک بڑی حد تک اس میں بچوں کی ماؤں
کا "قدم" بھی شامل ہوتا ہے۔ پھر اگر گھر میں کوئی لکھی پڑھی "آپا" یا "بھائی
جان" بھی ہوں جنہیں اعلیٰ تعلیم نے اپنا رکھ رکھاؤ سکھا دیا ہو۔
تو اُن کی حالت بعض دفعہ بڑی قابل رحم ہو جاتی ہے۔ قابل مضمون نگار
نے اس دلکش خاکے میں گھریلو زبان کی بہت سی لطافتیں جمع کر دی
ہیں اور روزمرّہ کے چھوٹے چھوٹے خانگی واقعات کو ایسے دلکش پیرائے
میں بیان کیا ہے کہ سماں بندھ جاتا ہے۔ اور یہ بات تب حاصل ہوتی
ہے۔ جب ادیب زندگی سے براہ راست متاثر ہو کر لکھے۔ یہاں
ضمناً ہم اُس عجیب و غریب چیز کی نسبت کچھ کہنا چاہتے ہیں جسے فیشن
ایبل ادبی حلقوں میں "نیا ادب" یا "ترقی پسند مصنفین" کا نتیجۂ فکر کہا جاتا
ہے (ہمارے نوجوان طبقے میں ایک گروہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جو مزدوروں
اور کسانوں کی کہانیاں لکھتا ہے لیکن چونکہ یہ لوگ خود اُس ماحول کی پیداوار
نہیں ہوتے اس لئے ان کے نتائج فکر میں آورد اور تصنع بدرجۂ غایت
پایا جاتا ہے۔ اور بعض چیزیں تو بھونڈے اور بے کیف پراپیگنڈے کی
سطح تک گر جاتی ہیں۔ آرٹ اور آرٹ کی وہ لطافتیں جو ادب کے ہر
زندہ کارنامے کی جان ہوتی ہیں ان سے بالکل مفقود ہوتی ہیں۔ ایسے دوستوں
سے ہماری پُر خلوص گذارش ہے کہ "ترقی پسندی" صرف مزدور کی مظلومی
اور سرمایہ دار کی قہرمانی کی کہانیاں لکھنے کا دوسرا نام نہیں ہے بلکہ اس سے
مراد وہ رجحان ہے جو ہمیں زندگی سے براہ راست تعلق پیدا کرنا اور اس
سے متاثر ہونا سکھاتا ہے (موجودہ کہانی ہی کو لیجئے۔ اس کا ایک حصّہ
تعلیم یافتہ بن بیاہی نند اور بچوں سے لدی پھندی بھاوج کا مکالمہ ہے
بھاوج کی چہیتی بیٹی نے اپنی پھوپھی کے کمرے میں جا کر بیچاری کی کئی
چیزوں کا ستیاناس کر دیا تھا۔ دیکھئے:-

"اے چھوڑ دو میری لونڈیا کا ہاتھ اُتر جائے گا۔ آہ" وہ غرّائیں۔

"میری بلا سے ہاتھ ٹوٹ جائے۔ پھر تو یہ میرے کمرے میں
نہ آئے گی" میں نے جھنجوڑا۔

"اے ہٹو تم دام لے لینا۔ کتنے کی تھیں تمہاری چیزیں"

"کتنے کی تھیں تمہاری چیزیں" میں نے جل کر منہ چڑایا "کتنے کی بھی
تھیں ہم دام نہیں لیتے ہم تو آج اسے جی بھر کے دُھنیں گے۔
یہ آتی ہی کیوں ہے یہاں؟"

"اللہ اب چھوڑ دو گی بھی؟ چلو وہ تمہارے کمرے میں تھوکے گی بھی
نہیں۔ اور بھئی کہہ تو دیا دام لے لو اور کیا کروں؟" دلہن بھابی
لاچاری پر اُتر آئیں۔

"دام لے لو۔ دام لے لو۔ بکے جا رہی ہو۔ یہ نہیں دیکھتیں اس
نے کیسا ستیاناس کیا ہے میرے کمرے کا" میں نے نرم ہو کر کہا

"اچھا بھئی ...... اب نہیں کرے گی۔ اب کے سے جو آجائے
تو جی چاہے جتنا مار لینا۔ بس؟"

"اچھا اب کے تو ملزمہ تمہاری ضمانت پر چھوڑی جاتی ہے۔ اگر
اس کا چال چلن ....؟"

"ذرا ہوش میں۔ آؤ بڑی آئیں میری بچی کے چال چلن کو کہنے
والی ـــ اوئی ٹوٹا میری بچی کا کلّا" انہوں نے اس کا گال میری
گرفت سے چھڑا لیا۔

"اب کبھی نہیں آئے گی وہ" انہوں نے جاتے ہوئے کہا۔

"ہم کبھی نہیں آئیں گے" مینو شیر ہو گئی۔

"ٹھہر تو جا" میں نے رول لے کر دھمکایا اور بھاگیں دونوں
بے حیائی سے ہنستی رہیں۔

اور چند منٹ بعد کیا ہوتا ہے۔

"دیکھو۔ دیکھو۔ اب میں کہتی ہوں تجنی" ننّے پاس کے کمرے سے
آواز آئی۔

(پاس کے کمرے میں وہی ماں بیٹیاں ہیں اور جنی نند صاحبہ
کا لاڈ کا نام ہے۔ "ص")

"کیا کہتی ہو بٹی ننّے" میں نے پھر خیالات کے سلسلے کو جوڑا۔
جب سرد کار بھی ہوا ننّے

"ہائیں ـــ جنّی! یہ کرتا نہیں پہنتی۔ اسے آکے مار تو"
پھر کسی نے کہا "وہ آئی دیکھ آگئی جنّی ـــ لے اسے مار۔"

کروتا پہنو بچھڑ" وہی آواز بڑھی آگے۔
بھاڑ میں جائے کرمتا اور چولھے میں جائے جنتی۔ ہاں نہیں تو۔
جتنی نہ ہوتی، ان کی زر خرید لونڈی ہوگئی کہ اس سے "بی شادی"
اور "بہوتے" کی خدمات بھی لی جانے لگیں۔ خدا کی شان! میں
بڑبڑاتی رہی۔
"لو بس! اب جاؤ دکھا آؤ پھوپی جان کو" پھر بولیں۔
بڑی تھی مجھے غرض! ...... مگر ہمت تو دیکھو! ابھی ابھی ماں
بیٹیاں کان پکڑ کر کبھی نہ آنے کا وعدہ کر گئی ہیں اور دس منٹ
بھی نہیں گذرے کہ اس بے تکلفی سے آنے کو تیار۔ خیر
میں بے رخی سے پیٹھ موڑ کر آرام کرسی پر لیٹ گئی اور ....
پٹ پٹ چھوٹے چھوٹے پیر کمرے کی طرف آتے سنائی دئے
.... "دیکھئے پھوپی جان" بنو نے اپنی چمکیلی آنکھوں کے
وہ تمام تیر برسا کر کہا جن کا جادو وہ خوب جانتی ہے۔
دوسرے لمحے وہ ننھے جوتوں کے میری گردن پر سوار تھی۔
"ہماری فراک!" اس نے میری گردن میں گھٹنا اڑا کر ناک
پر رال ٹپکاتے ہوئے کہا۔ "دیکھئے!"
اُف یہ بچے!!!
میں نے چاکولیٹ کا تازہ بنڈل کھولتے ہوئے سوچا۔

اب انصاف سے کہئے۔ کیا یہ زندگی کی عکسی تصویر نہیں ہے۔
کیا وہ چھوٹے چھوٹے نازک بچے جن سے یہ کالم معمور ہے، کسی ایسے فن کار کے قلم کے رہین ہو سکتے تھے جو خود اُس ماحول کا ایک جزو نہ ہوتا جس کی فضا اس کہانی پر چھا رہی ہے۔ یقیناً نہیں۔ پھر کیوں ہر وہ ادبی کارنامہ ترقی یافتہ ادب نہیں جو زندگی سے، (اور زندگی عبارت ہے اس عالم ہست و بود کی بوقلموں کیفیتوں کا) براہ راست متاثر ہو کر اپنے اندر اُن احساسات و جذبات کی ایک جیتی جاگتی دنیا بسا لیتا ہے جس میں اس ادب کا خالق خود سانس لیتا ہے۔ ہمارے وہ "ترقی پسند" مصنفین جو خود بورژوا جماعت کے افراد ہیں۔ اُس ماحول کی ترجمانی کیوں کر کر سکتے ہیں جس میں ان کی اپنی نشوونما نہیں ہوئی میکسم گورکی بننے کے لئے میکسم گورکی کی زندگی بسر کرنے کی ضرورت ہے۔
اور جو لوگ اس سعادت سے محروم ہیں اور محروم رہ کر اُس زندگی کی ترجمانی کرنے کا بہانہ کرتے ہیں جو انہیں حاصل نہیں تو وہ یقیناً ترقی کی طرف نہیں بلکہ تنزل کی جاتے ہیں اور ہمارے ایوانِ ادب کو زندگی کی رونق بخشنے کی بجائے ایک مردہ خانہ بنائے دیتے ہیں۔

محترمہ عصمت کو اس خاکے میں جو غیر معمولی کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اس کی فضا ان کی اپنی زندگی کی فضا ہے اور اس کا مکالمہ اور واقعات ان کی اپنی معاشرت کے اجزا ہیں۔ اور آرٹسٹ کو اس سے بہتر مواد اور کہاں دستیاب ہو سکتا تھا!

برکھا رُت۔ از جان نثار اختر۔ برسات پر نئے رنگ کی ایک کیف آور نظم ہے جس میں شاعر نے چند نہایت چست بندشوں کے علاوہ بعض اچھوتے الفاظ بھی داخل کئے ہیں۔ مثلاً ساقی کی جگہ ساقیہ ایک خوش آئند تبدیلی ہے اور بعض تشبیہات بھی نادر اور ہندوستانی رنگ لئے ہوئے ہیں۔ مثلاً ؎

افق پر دھاریاں سی پڑ گئی ہیں
کسی نے چن لیا ہو جیسے آنچل

یا جیسے ؎
گھٹاؤں میں چمک یہ جگنوؤں کی
سیاہ آنچل پہ جیسے کامدانی

اور بعض اشعار محاکات کے نہایت دلفریب نمونے ہیں مثلاً
؎ جوانی کی اُمنگوں کا تقاضا — کھلے جوڑے پہ آنچل کون ڈالے
؎ یہ گرتی موریاں بجتا ہوا مینہ — یہ ہمسائے میں بچوں کی پکاریں

ایک چیز ہمیں کچھ کھٹکتی ہے وہ یہ کہ "کھلے آنچلوں" کو بہت دفعہ "باندھا" گیا ہے۔ نیز آخری بند میں وہ ساری ہندوستانی فضا ختم ہو کر رہ گئی ہے جو پہلے پانچ بندوں پر چھا رہی تھی۔ آخری بند کا شاعر نے قافیہ ہی جوش، آغوش، نوش، تجویز کیا ہے اور اس قافئے کی قید سے رہائی معلوم! اس ایرانی رجحان کا نتیجہ یہ ہوا کہ بند کا آخری شعر فارسی ہی میں لکھا گیا ہے۔

جوانی عشرتِ امروز خواہد
بکن افسانۂ فردا فراموش

بہر حال دیکھنے کی چیز ہے، اور اس دفعہ ہماری "دنیائے ادب" میں منقول ہے۔

مجلہ طیلسانئین حیدرآباد دکن (شمارہ اول و دوم ۳۹ء)
اقبال کی دعائیں۔ یہ بلند پایہ مضمون ڈاکٹر رضی الدین صدیقی کے قلم سے نکلا ہے۔ ہمارے خیال میں عنوان اگر اقبال اور خدا ہوتا تو بہتر

تھا۔ کیونکہ اس مضمون میں علامۂ مرحوم کے اُن بیشتر اشعار کا ذکر کیا گیا ہے۔ جو انسان اور خدا کے باہمی تعلقات اور راز و نیاز پر مشتمل ہیں۔

فاضل مضمون نگار نے اقبال اور خدا کے مخاطبات کے بیشتر پہلوؤں پر ایک وسیع نظر ڈالی ہے اور یہ واقعی ثابت کر دکھایا ہے کہ اقبال نے ذاتِ باری سے جس قدر مختلف پیرایوں میں خطاب کیا ہے۔ اس کی نظیر دیگر شعراء و مصنفین کے ہاں نایاب ہے۔ وہ نہ صرف اپنی قوم بلکہ بنی نوعِ انسان کی فلاح کے لئے اس قوت کاملہ کا دامن پکڑتے ہیں بلکہ جب ناز و نیاز پر اترتے ہیں تو ایک عاشق صادق کی طرح وہ سب کچھ کہہ ڈالتے ہیں جو ایک سچا بشر خدا کے سوا اور کسی سے نہیں کہہ سکتا اور پھر خدا اور انسان کے تعلقات کو انہوں نے جس نئے انداز سے دیکھا ہے وہ ہمارے سینوں میں امیدوں کی ایک نئی دنیا بسا دیتا ہے اور یہ جہان بلکہ یہ کائنات ہمیں اپنے زیر نگیں معلوم ہوتی ہے ؎ یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

عبادت کا جو تخیل اقبال نے پیش کیا ہے۔ وہ سراسر خلوص اور حضور قلب پر مبنی ہے مسجد قرطبہ میں شاعر نے ایک دعا مانگی تھی اس کے ایک دو شعر ملاحظہ کیجئے ؎

ہے یہی میری نماز ہے یہی میرا وضو ۔۔۔ میری نواؤں میں ہے خون جگر کا لہو
تجھ سے مری زندگی سوز و تب و درد و داغ ۔۔۔ تو ہی میری آرزو تو ہی میری جستجو

ایک اور جگہ بکمال نیاز یوں فرماتے ہیں ؎

تری نگاہ ناز سے دونوں مراد پا گئے ۔۔۔ عقل غیاب و جستجو، عشق حضور و اضطراب
تیرہ و تار ہے جہاں گردش آفتاب سے ۔۔۔ طبع زمانہ تازہ کر جلوۂ بے حجاب سے

اپنی قوم کے لئے کیا کچھ مانگتے ہیں ؎

بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل ۔۔۔ اس شہر کے خوگر کو پھر وسعت صحرا دے
رفعت میں مقاصد کو ہمدوش ثریا کر ۔۔۔ خودداری ساحل دے آزادی دریا دے
احساس عنایت کر آثار مصیبت کا ۔۔۔ امروز کی شورش میں اندیشۂ فردا دے

اور پھر جب ایک عالم اضطراب میں وہ تمام حدود و قیود کو توڑ خالقِ اکبر سے بے حجابانہ مصروفِ کلام ہوتے ہیں تو اُن کے دل کی تڑپ "نحن اقرب" کو یوں لبیک کہتی ہے ؎

گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کر ۔۔۔ ہوش و خرد شکار کر قلب و نظر شکار کر
عشق بھی ہو حجاب میں حُسن بھی ہو حجاب میں ۔۔۔ یا تو خود آشکار ہو یا مجھے آشکار کر
تو ہے محیط بے کراں میں ہوں ذرا سی آبجو ۔۔۔ یا مجھے ہمکنار کر یا مجھے بے کنار کر

میں ہوں صدف تو تیرے ہاتھ میرے گہر کی آبرو ۔۔۔ میں ہوں خزف تو تو مجھے گوہر شاہوار کر
باغ بہشت سے مجھے حکم سفر دیا تھا کیوں ۔۔۔ کار جہاں دراز ہے اب مرا انتظار کر
روز حساب جب مرا پیش ہو دفتر عمل ۔۔۔ آپ بھی شرمسار ہو مجھ کو بھی شرمسار کر

صاحب مضمون نے کلام اقبال میں سے بندہ و خدا کی گفتگو کے بیسوں اور اشعار پیش کئے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ اقبال اگر اور چند سال زندہ رہتے تو شاید کلیتہً خدا سے ہی مخاطب رہتے۔ لیکن اس کے باوجود ان کو احساس تھا کہ انہوں نے جو کچھ کہا، اس کے مقابلے میں جو وہ کہنا چاہتے ہیں کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ کیونکہ انسان کی مختصر زندگی اس کے لئے ناکافی ہے اور اس کے علاوہ کوئی ہستی انسانوں میں ایسی نہیں ہے جس سے وہ ان رموز کو کہہ سکیں اور جو ان کی اس امانت کی حامل ہو سکے ؎

تو مرا ذوق بیاں دادی و گفتی کہ بگو
ہست در سینۂ من آنچہ نگنجد بہ زباں

مجلہ عثمانیہ (جلد ۱۲ شمارہ ۱ و ۲)

ادب کا ترقی پسند نظریہ اور اردو۔ اس مختصر مضمون میں محمد عمر صاحب مہاجر نے ادب کے ترقی پسند رجحانات پر روشنی ڈالنے اور اردو ادب میں ان کے نشانات تلاش کرنے کی ایک بہت اچھی کوشش کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ

> "ایک ادیب یا شاعر جو کچھ لکھتا ہے وہ اگرچہ اس کی انفرادی قوت تخلیق کا نتیجہ ہوتا ہے لیکن اس کی تخلیقی قوت ہمیشہ غیر محسوس طور پر زمانے کے رجحان سے متاثر رہی ہے اور اس کی زبان جسے ہم الہامی زبان سے تعبیر کرتے ہیں دراصل زمانے کی زبان رہا کی ہے"۔

اور آگے چل کر ایک کامیاب ادیب کی یوں تعریف کرتے ہیں۔

> "سب سے کامیاب ادیب وہی ہے جو بہ یک وقت ہمارے ذوقِ حسن، ذوقِ فکر اور ذوقِ عمل کو مطمئن کرے"۔

اس تمہید کے بعد وہ دنیا کی ادبی تاریخ پر ایک اجمالی نگاہ ڈالتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ کس طرح زمانۂ قدیم میں ادب پر ایک خاص مذہبی جماعت کا قبضہ تھا اور اس کے بعد ادب کا رزمیہ دور آیا اور دنیا کی قدیم کتابیں مثلاً الیڈ، اڈیسی، رامائن، مہابھارت اس رزمیہ دور کی یادگار ہیں اس کے بعد جاگیری نظام اور کلیسائی نظام اور سرمایہ داری کا نظام اپنے اپنے دور میں ادب پر اثر انداز ہوتے رہے۔ اگرچہ ان کے تخریبی

میلانات کے خلاف انسانیت احتجاج بھی کرتی رہی۔ مثلاً اٹھارویں صدی کی رومانی تحریک جس کے انگریزی علم بردار ورڈس ورتھ، کیٹس، شیلی اور بائرن تھے، اسی قسم کا ایک خاموش احتجاج تھا۔ لیکن یہ احتجاج درحقیقت فرار کی قسم سے تھا۔ کیونکہ ان ادیبوں نے زندگی کی تلخ حقیقتوں کا مقابلہ کرنے کی بجائے رومانیت اور شعر میں ان سے پناہ حاصل کی اور

"اپنے لئے اور دوسروں کے لئے ایک ایسی خیالی دنیا تعمیر کی جہاں صرف جذبات اور احساسات کی رہنمائی کام کرتی تھی اس زمانے کے ادبی کارنامے انسانی فکر کے لئے شراب کا کام کرتے ہیں ..... اس ادب نے ہماری ایک بڑی ضرورت کو پورا کیا اور ہمارے وجدان کے لئے مسرت فراہم کی ..... لیکن زمانے کی رفتار کے ساتھ ساتھ ہم ادب میں زندگی کے دکھ کو دور کرنے کا راستہ ڈھونڈتے ہیں اور یہ راستہ ہم کو مصیبت اور تکلیف سے بچ کر ایک ذہنی حصار تعمیر کر لینے میں نہیں مل سکتا بلکہ ہم ادب سے اپنے میں اس دکھ کا مقابلہ کرنے کی قوت اور تاب پیدا کرنا چاہتے ہیں اور ہم کو یہ قوت اس وقت تک نہیں مل سکتی جب تک ادب میں واقعیت نہ ہو اور ادب اُن سارے نقوش کی نمایندگی نہ کرے جس سے اس وقت انسانیت دوچار ہو رہی ہے۔ ادب کا ترقی پسند نظریہ یہی ہے کہ جس طرح ہر ادب اپنے عصری میلانات کا آئینہ ہوتا ہے، ہمارا موجودہ ادب بھی ہماری ضروریات اور ہماری اجتماعی فکر کی مکمل نمایندگی کرے۔"

یہاں تک تو صاحبِ مضمون نے جو نظریہ پیش کیا ہے۔ وہ ہمارے نزدیک ایک بڑی حد تک درست ہے۔ لیکن آگے چل کر وہ ایک لغزش کے مرتکب ہوئے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ

"اقوامِ عالم اس وقت جس عہدِ اضطراب سے گذر رہی ہیں یہ دراصل ایک بہت بڑے سیاسی اور تمدنی انقلاب کا پیش خیمہ ہے۔ ایسی صورت میں ادب کا ترقی پسند نظریہ یہی چاہتا ہے کہ ادب میں وہ سارے میلانات پیدا کئے جائیں۔ جن سے یہ دور بن رہا ہے"

خیال فرمائیے بھلا میلانات بھی کہیں پیدا کئے جا سکتے ہیں وہ تو خودبخود ظاہر ہوتے ہیں جس ماحول میں کوئی ادیب نشوونما پائے گا۔ اگر وہ سچا فن کار ہے تو وہ اس سے بہتر کچھ نہیں کر سکتا کہ اس مخصوص ماحول کی ترجمانی کردے۔ "میلانات پیدا کرنے" کی اس غلط تلقین سے ہمارے نوجوانوں میں چند ایسے لکھنے والے پیدا ہو گئے ہیں جو موجودہ دور کو ایک ہی تحریک کے زیر اثر سمجھ کر ادب میں زبردستی وہ میلانات پیدا کرنا چاہتے ہیں جو اُن کے خیال میں اس تحریک کا لازمی نتیجہ ہیں۔ ہماری مراد لیبر تحریک اور اُس بے جان ادب سے ہے جس میں مزدور اور کسان کے جذبات و احساسات کی غلط، ناقص اور بھونڈی ترجمانی کی جاتی ہے۔

مضمون کے دوسرے حصے میں محمد عمر صاحب نے اردو ادبیات میں سے ایسی چند مثالیں دی ہیں جنہیں وہ ترقی یافتہ ادب کی نمائندگی کے قابل سمجھتے ہیں۔ ان میں وہ مولانا حالی کی تحریروں کو اولیت کا درجہ دیتے ہیں اور پھر اقبال کی نسبت کہتے ہیں کہ

"اقبال نہ صرف ہندوستان بلکہ ساری دنیا کا سب سے بڑا ترقی پسند شاعر ہے"

اس کو جس طرح انہوں نے ثابت کیا ہے اس سے ہمیں اختلاف ہو یا نہ ہو لیکن ان لوگوں کو ضرور ہو گا جو ترقی پسند ادب کے نام لیوا کہلاتے ہیں۔ اقبال کی اس خصوصیت کو ثابت کرنے کے لئے انہوں نے چار ساڑھے چار صفحے لکھے ہیں اور ان کے بعد جوش اور علی اختر کا نام لیا ہے اور اس شاعر کو جسے ملک میں شاعرِ انقلاب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے ایک چھوٹے سے پیراگراف میں ختم کر دیا ہے اور اس کے بعد احسان دانش۔ مخدوم۔ ماہر القادری۔ مجاز۔ میکش۔ وجد۔ ھمد۔ ساز۔ الطاف اور عدم کے نام گنوائے ہیں۔ نثر نگاروں میں ترقی پسند کون کون ہیں اور انہوں نے کس طرح ہمارے ادب کو متاثر کیا۔ یہ بحث بے حد تشنہ رہ گئی ہے۔ اور ہمیں افسوس ہے کہ صاحبِ مضمون نے محض پریم چند۔ اختر رائے پوری نیاز۔ رشید۔ انصار ناصری۔ شاہد احمد۔ سجاد ظہیر۔ فیاض محمود اور چند اور مصنفین کے نام لے دیئے ہیں اور مضمون کو جلدی سے ختم کر دیا ہے۔ حالانکہ شاید یہی حصہ۔ اگر اس پر توجہ کی جاتی تو مضمون کا سب سے دلچسپ حصہ بنتا۔ بہرحال ترقی پسند ادب کے متعلق ایک مخصوص زاویۂ نگاہ سے آشنا ہونے کے لئے اس مضمون کا مطالعہ مفید ثابت ہو گا۔

نگار (اگست)

اردو غزل گوئی از اختر اورینوی۔

اس مضمون میں درحقیقت بیدل عظیم آبادی کی غزلیہ شاعری

پر ایک اجمالی نگاہ ڈالی گئی ہے۔ لیکن اس کے پہلے حصے میں اردو غزل گوئی پر بحیثیت مجموعی ایک دلچسپ بحث بھی شامل ہے۔
آج کل اردو غزل کے بہت سے مخالف پیدا ہو گئے ہیں اور اُن کی تنقیدوں میں مغرب زدگی بہت نمایاں ہے۔ فاضل مضمون نگار نے ان کے اعتراضات کے چند نہایت معقول جوابات دیئے ہیں۔ اور دلائل سے ثابت کیا ہے کہ اردو غزل گوئی درحقیقت نظم کی ایک نہایت ترقی یافتہ صنف ہے جس میں اب بھی نئے نئے انداز پیدا ہو رہے ہیں۔ خام مواد اگر پرانا ہے تو کیا ہوا۔ زمانہ نئے نئے فنکار پیدا کر رہا ہے اور کرتا رہے گا جو اس مواد سے ایسے حسین و جمیل پیکر تراشیں گے جن سے آرٹ اور ادب کے صنم خانے ابدالآباد تک رونق اور زینت حاصل کرتے رہیں گے۔ وہ لکھتے ہیں کہ

"جہاں تک غزل کا تعلق ہے ادبِ عالم میں ایسے مرصع اعجاز بلیغ کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ ۔ ۔ ۔ غزل مختصر تصویروں کا ایک خوبصورت نگارخانہ ہے۔ ۔ ۔ ۔ غزل پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ کہ اس میں تسلسل اور منطقی ارتقا نہیں ہوتا۔ تسلیم ہے لیکن اس خصوصیت کو نقص کیوں کہئے۔ یہ کیا ضرور ہے کہ چونکہ یورپ کی عام شاعری میں تسلسل پایا جاتا ہے۔ ہماری شاعری کی ہر نوع میں یہ خصوصیت پائی جائے۔ غزل شاعری کی ایک منفرد شکل ہے۔ اس کی تعمیر میں ایک مخصوص ترکیب کو برتا جاتا ہے۔ اگر یہ خاص ترکیب دوسری ترکیبوں سے نہیں ملتی تو کیا حرج ہے۔ دیکھنا صرف یہ ہے کہ اس ترکیب سے حسن کاری اور مسرت آفرینی کو تو صدمہ نہیں پہنچتا۔"

آگے چل کر وہ حسن کاری اور مسرت آفرینی کے معیاروں پر بحث کرتے ہیں اور نتیجہ نکالتے ہیں کہ از بسکہ حُسن کاری اور مسرت آفرینی اضافی چیزیں ہیں اور ہم لوگ اپنی روایات سے وابستگی رکھتے ہیں اور ہمارا ماحول، ادبی ذوق اور میلانِ طبع ہمیں نظموں میں بھی شانِ تغزل تلاش کرنے کی دعوت دیتا ہے اس لئے غزل اپنا فنی مقصد یقیناً پورا کرتی ہے اور اس کے ساتھ اس میں ایسے اجزائے حسن بھی پائے جاتے ہیں جو اُسے عالمگیر اور لافانی صناعت کا درجہ بخشتے ہیں۔
اس اعتراض کا کہ غزل میں تجربے کی نہیں بلکہ ظن و قیاس کی باتیں ہوتی ہیں وہ یہ جواب دیتے ہیں کہ اگرچہ اردو غزل میں خالص تجربے کی شاعری بھی بکثرت ملے گی۔ لیکن تجربے کی غیر موجودگی میں اردو غزل اعلیٰ درجہ کا تخیل بھی پیش کرتی ہے اور چونکہ تخیل بھی تجربے ہی کی ایک شکل ہے اس لئے وہ صداقت سے دور نہیں اور دنیا کی بلند ترین ادبیات مثلاً گوئٹے کا "فاؤسٹ" شیکسپیئر کے رومانی ڈرامے، ملٹن کا "پیریڈائز لوسٹ" دانتے کا "جہنم" کالیداس کا "وکرم اروسی" یہ سب وجدانی اور تخیلی شاعری کی مثالیں ہیں۔
غزل میں جو مخصوص مضامین اور استعارے باندھے جاتے ہیں وہ درحقیقت ایک مخصوص واسطۂ اظہار کا درجہ رکھتے ہیں اور ظاہر ہے کہ ایسے واسطوں کے بغیر کوئی آرٹ اپنے کامل اظہار میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اگر ہمارے غزل گو ابھی تک خنجر و شمشیر جفائے محبوب اور شمع و پروانہ کے مضامین باندھتے ہیں لیکن اپنی بندشوں میں نئے نئے انداز اور اسالیب پیدا کرتے ہیں تو اس میں کیا قباحت ہے۔ اگر ایک ماہر معمار فنِ تعمیر کے قدیم طریقوں کی اساس پر ایک ایسی حسین عمارت بناتا ہے جس میں اس نے واسطۂ اظہار میں جدت اور سلیقہ برتا ہے تو ہم اس کے کارنامے کو بے حد پسند کرتے ہیں پھر کیا وجہ ہے کہ آج جو شعرا غزل میں نئے نئے انداز پیدا کر رہے ہیں اُن کی قدر نہ کی جائے۔
اختر صاحب نے غزل کی حمایت میں جس دلبری کا ثبوت دیا ہے وہ قابلِ داد ہے اور ان کے اکثر دلائل بہت وزن دار ہیں۔

نیا ادب (تازہ خاص نمبر)

انیسویں صدی میں ادب کا سماجی پس منظر

عنوان بہت طویل لیکن مضمون مختصر اور قابلِ قدر ہے۔
پروفیسر فیض احمد نے مغل دورِ حکومت کے آخری ایام اور انگریزی دور کے آغاز میں اردو ادب کی جو کیفیت تھی اس کا جائزہ لیا ہے اور بتایا ہے کہ بدلتے ہوئے سماجی حالات ہماری ادبیات پر کس طرح اثر انداز ہوئے۔ وہ بتاتے ہیں کہ کس طرح پرانے جاگیری نظام کی جگہ سرمایہ داری نظام نے لے لی۔ قبیلے بکھر گئے۔ کنبے نابود ہو گئے۔ فرد کی اہمیت زیادہ ہو گئی اور تعلیم کی عمومیت نے عوام کو کچھ سوچنے سمجھنے اور اخلاقیات جنسیات اور معاشیات کے متعلق نئے اندازِ نظر قائم کرنے کا موقعہ بہم پہنچایا نتیجہ یہ ہوا کہ ادب میں بھی یہی تبدیلیاں منعکس ہو گئیں اور درباری فضا اور خود فراموشانہ اندازِ خیال نے جو ایک زوال پذیر سلطنت اور سیاست

کے لوازم تھے۔ ردِ عمل کے طور پر ایک ایسے طرزِ خیال کو جگہ دی جس میں
قومی پستی کے احساس، اور نزع کی تڑپ کے علاوہ مذہبی مسابقت
اور اخلاقی اصلاح کے عناصر پائے جاتے تھے۔ لیکن ازبسکہ ہماری
سماج میں مغربی تہذیب نے نہیں بلکہ مغربی حکومت نے نفوذ کیا تھا
اور حکمران طبقہ سوشل طور پر ہم سے آج بھی بہت دُور ہے۔ اس لئے
ہم پر اور ہمارے ادب پر جدید مغربی رجحانات کا کوئی ایسا خوشگوار
اثر نہیں پڑا اور نئے اور پرانے نظامات کے درمیانی دور میں سے
گذرنے کا عرصہ غیر معمولی طور پر طویل ہو گیا ہے۔ صاحبِ مضمون نے
اس کیفیت کو کمال لطافت سے یوں بیان کیا ہے۔

"زندگی کے پرانے اقتصادی، سماجی اور جذباتی سہارے چھوٹ
گئے، خاندان میں یگانگت نہ رہی، اخلاق کی عمارتیں مسمار ہو گئیں،
مذہب کی جذباتی تسکین مفقود ہو گئی۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ
احساسات زیادہ تیز اور مشاہدہ کی قوت زیادہ وسیع ہو گئی۔
زندگی کی تلخیاں بڑھ گئیں اور پرانا اقتصادی اطمینان مفقود ہو گیا
عیش و آرام کی ترغیبات میں زیادتی ہو گئی اور اُن کے امکانات
کم ہو گئے۔ حوصلے بڑھے اور ہمتیں پست ہو گئیں۔ خیالات
روشن ہوتے گئے اور دنیا تاریک ہوتی گئی۔ ہمارے لئے یہ بھی
ممکن نہیں کہ دنیا کو بھول جائیں اور یہ بھی ممکن نہیں کہ اُسے اپنا
لیں۔ نوجوانوں کے لئے مغربی تہذیب ایک نئی روشنی لائی
اور ایک نئی تاریکی، چنانچہ نئے ادب میں ایک طرف اس حقیقت
کا بے جھجک مشاہدہ اور اسے بدلنے کی پرجوش آرزو ہے اور
دوسری طرف اپنی تنہائی اور بے کسی کا لامحدود احساس ہے،
ایک پرخلوص خود اعتمادانہ واثقیت اور ایک اس سے بھی
زیادہ پرخلوص یاس انگیز زوالیت، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم ایک
درمیانی دور میں سے گذر رہے ہیں۔ ہم میں نئے نظام کی خوبیاں
ابھی تک نہیں آئیں اور پرانے نظام کی برائیاں سب کی سب
موجود ہیں۔ ذہنی طور پر ہم یورپ کے سب سے ترقی پسند
شہر میں رہتے ہیں اور جسمانی طور پر ایک تیرہ و تار کوچے میں۔
چنانچہ ہمارے ادب میں ہمارے ذہن کی وسعت اور ترقی پسندی
ہے اور ہمارے جسم کا درد اور مکان کی تاریکی، اسی وجہ سے ہمارا
ادب اب زندگی سے بہت قریب ہے اور اس زندگی کی
آئندہ بہبودی کے ساتھ ہمارے ادب کی ترقی اور رفعت
لازمی ہے"۔

ہمایوں (اگست)

یہواہ۔ خدائے یہود کا ارتقا۔

مرزا محبوب بیگ صاحب نے یہ مضمون لکھ کر اردو کے سنجیدہ
ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ کیا ہے۔ قدیم ترین زمانے سے لے کر آج تک
"خدا" انسان کے غور و فکر کا سب سے اہم موضوع رہا ہے اور دنیا کی
مختلف اقوام نے اپنے اپنے ذہنی ارتقا کے بموجب خدا کے جو تصورات
قایم کئے ان کا مطالعہ بے حد دلچسپ ہے۔ ہماری تاریخی معلومات کے
مطابق یہود وہ پہلی قوم ہے جس نے خدا کے تصور میں توحیدِ کامل کو
داخل کیا۔ فاضل مضمون نگار نے اس مضمون میں بتایا ہے کہ یہود نے
کیونکر اس حد تک ترقی کی اور وہ پرستش کے کن کن مرحلوں سے گذر
کر خدا کے اس تصور تک پہنچے کہ وہ غیر مرئی ہے، اکیلا ہے اور مختارِ
مطلق، ہمہ آگاہ اور جزا و سزا پر قادر ہے۔ اگرچہ بظاہر مرزا صاحب نے ہربرٹ
سپنسر کا نقطۂ نظر پیش کیا ہے لیکن جا بجا مشرقی مذاہب، اسفار اور
کتبِ سماوی کے متعدد حوالے دے کر ثابت کیا ہے کہ مضمون میں خود ان
کے غور و فکر اور مطالعہ و تحقیق کا کافی حصہ شامل ہے۔

ابتدا میں وہ بتاتے ہیں کہ ہر قدیم الٰہی تصور کی طرح یہود کا تصورِ
معبود بھی چکنے اور نکیلے پتھروں میں مرکوز تھا۔ ان کے اولین پیغمبر
اور رہبر جب کبھی کسی مہم پر روانہ ہوتے یا کسی معرکے میں کامیاب
ہوتے تو موقعے کے مطابق وہ ان لمبوترے اور چکنے پتھروں پر جو بعض
دفعہ سایہ دار درختوں کے نیچے اور بعض اوقات چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں
پر نصب ہوتے تھے۔ چڑھاوے چڑھاتے منتیں مانتے اور ان کے
سامنے رقص بھی کرتے۔ قدیم اہلِ مصر، اہلِ روما اور اہلِ ہند کی طرح
یہود بھی ان میں سے بعض پتھروں کو لِنگ کی صورت میں پوجتے تھے۔
کیونکہ وہ انہیں افزائشِ نسل و فصل کی علامت قرار دیتے تھے۔ یہواہ
کا تصور بھی ابتدا میں شِو کے تصور سے ملتا جلتا تھا اور اس کی پرستش
بنجر زمینوں کو زرخیز اور بانجھ عورتوں کو باولاد کرنے کا ذریعہ سمجھی جاتی تھی
پرانے عہد نامے کے مطابق بنی اسرائیل جب موسیٰ کی قیادت میں مصر
سے واپس ہوتے ہیں تو یہواہ دن میں بادل کے ستون کی شکل میں اور
رات میں آگ کے ستون کی شکل میں ان کے آگے چلتا ہے (خروج

۳۳ : ۱۰)"

اس کے بعد اس امر کے متعدد ثبوت ملتے ہیں کہ یہواہ کے مخروطی بت کو پاس ادب کے خیال سے یا ایک جلال آمیز اور پر اسرار تقدس سے ممتاز کرنے کے لئے اسے "تابوتِ سکینہ" میں بند کر دیا گیا اور داؤدؑ نبی اسے گاڑی پر لاد کر یروشلم لے آئے اور پھر وہاں سے صیہون لے گئے اور یہاں وہ سلیمانؑ کے زمانے تک رہا اور سلیمان نے اس کے لئے پہلا معبد تیار کیا۔ پرانے عہد نامے اور دیگر اسناد کے متعدد حوالے دے کر فاضل مضمون نگار نے ثابت کیا ہے کہ

"بنی اسرائیل کا اصلی مذہب بت پرستی تھا۔ یہ بت شخصی اور قبائلی اسلاف کے نمائندے، اور عبارت پتھر یا لکڑی کے کندوں اور درختوں سے تھے اور روانگی مصر سے پہلے تک ان دیوتاؤں میں باہم مقابلہ، چشمک یا رقابت نہ تھی۔۔۔۔ لیکن مصریوں کی صحبت میں بنی اسرائیل کو یہ معلوم ہوا کہ بعض دیوتا بعض پر فوقیت رکھتے ہیں لہذا ان کے ارباب میں مسابقت شروع ہوئی۔ بالآخر یہواہ نام کے ایک دیوتا کو مقابلتہً زیادہ قبول نصیب ہوا۔۔۔۔ بنی اسرائیل کے قیام مصر کے زمانے میں خیمہ دیوتا۔ یہود آزار فرعون کے خاندانی اثرات سے پورے ملک میں سب سے زیادہ مقبول تھا۔ اس کی توثیق اس واقعے سے بھی ہوتی ہے کہ یہواہ مصر سے واپس ہوتے ہوئے خیمہ کی طرح تابوت میں بند ہو گیا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ مصری اسرار کی دھند میں لپٹ گیا، کیونکہ اس کے بعد نہ کسی آنکھ نے اس کا مشاہدہ کیا اور نہ اس کی کسی کو اجازت تھی۔"

اب سوال یہ ہے کہ ایسے دیوتا سے کامل توحید سے متصف اور زمان و مکان پر محیط خداوند خدا کا تصور کیسے حاصل ہوا۔ اور یہودیوں کی بت پرستی وحدانیت سے کیونکر مبدل ہوئی۔ اس سوال کے متعدد جوابات دیئے گئے ہیں۔ ان میں ایک یہ ہے کہ سامی نسل کے لوگ چونکہ صنم تراش نہیں تھے۔ اس لئے انہوں نے دیوتاؤں کے بت نہیں تراشے بلکہ انہیں لکڑی اور پتھر کے ٹکڑوں کی صورت میں پوجا اور پھر دیوتاؤں کی شکلوں کی یکسانی ان کی صوری موت کا باعث بن گئی۔ دوسری وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ واپسی مصر کے بعد بنی اسرائیل اپنے دیوتاؤں کو مندروں کی تاریکیوں میں چھپا کر رکھتے تھے اور پھر فرط احترام کے باعث اُن کا دیکھنا بھی متروک ہو گیا تھا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی صفات غیر متعین اور مخلوط ہوتی گئیں۔ اس خلط ملط سے وحدانیت کی زمین تیار ہوئی اور آخر یہواہ نے باقی دیوتاؤں کو شکست دے کر اپنے پجاریوں کے بل پر سلطنت کی تائید حاصل کی اور ارض اسرائیل میں یہواہ پرستی بلا شرکت غیرے جاری ہو گئی۔ مگر

"اس یہواہ پرستی کو توحید کاملہ کے مترادف نہیں سمجھنا چاہئے۔ اس لئے کہ یہواہ کی ارضی زندگی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی لیکن ہمسایہ ملکوں کی پیہم سامراجی تاختوں نے ان شرائط کی بہت جلد تکمیل کر دی۔ یہودیوں کا چھوٹا سا ملک مصر قدیم اور بابل و نینوا کے درمیان ایک ناگزیر شاہراہ تھا اور اسی لئے ہمیشہ پامال رہتا تھا۔۔۔۔ ۷۲۱ ق م میں نینوا کے شرغون دوم نے سلطنت اسرائیل کو ختم کر دیا اور ساتھ ہی یعقوب کے دس اسباط جو مذکورہ سلطنت میں بستے تھے ہمیشہ کے لئے نابود ہو گئے۔ یہ ایک بہت بڑا قومی حادثہ تھا اور اس سے یہود کے جسد قومی کی ریڑھ میں سردی کی لہر دوڑ گئی۔ موقع غنیمت تھا اور اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہواہ پرستوں نے اپنا پروپیگنڈا شروع کیا۔ وہ کہتے تھے کہ جب یہواہ بنی اسرائیل کے سامنے چلتا تھا تو دشمنوں کی فوج کسی شمار و قطار میں نہ تھی اور اب بھی اگر وہ اس کے ہو رہیں تو وہ سب دشمنوں کو فنا کر دے گا۔ یہ خیال اگرچہ بظاہر خام معلوم ہوتا ہے مگر وہ یہودی رقبے میں مستقل رفتار کے ساتھ پھیلتا گیا اور جب ۶۰۴ ق م میں فرعون نیکو دوم کی تاخت کے بعد، جس میں یوشیا مارا گیا اور بابل سے بخت نصر کا طوفان اٹھا اور وہ اپنی رو میں یروشلم، معبد یروشلم اور بنی اسرائیل کے باقی دو اسباط کو بہا لے گیا تو پوری قوم یک لخت اس جنون میں مبتلا ہو گئی۔ اس نے محسوس کر لیا کہ یہ خیال بالکل درست تھا۔ یوں یہودیوں نے اپنا سب کچھ کھو کر وہ چیز پائی جس نے انہیں اقوام عالم میں سب سے سربلند کیا۔ عقیدۂ توحید!"

سیاسیات یورپ کے بیس سال۔

آج کل جب کہ دنیا ایک جنگ عظیم میں مبتلا ہونے والی ہے، جناب "موسیٰ" کا یہ مضمون اپنے اندر بڑی دلچسپی اور اہمیت رکھتا ہے۔

صاحبِ مضمون نے نہایت لطیف پیرائے میں ۱۹۱۹ء سے لے کر آج تک کی اُن سیاسی چالوں پر نظر ڈالی ہے جو افرنگ کے کھلاڑی دنیا کی بساط پر چلتے رہے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ بظاہر جن مقاصد کی خاطر دول یورپ ۱۹۱۴ء کی جنگِ عظیم میں کود پڑے تھے اور جن عزائم کے ساتھ انہوں نے ۱۹۱۹ء کے بعد ایک طویل زمانۂ امن کی بنیاد رکھنے کا بہانہ کیا تھا، وہ آج ان سب میں ناکام نظر آتی ہیں۔ ایک مثال دیکھئے:۔

جب ملتِ اسلامی مسٹر ولسن کے تحفظ قومی کے اصول کی عملی شرح سے آشنا ہوئی اور سمرنا میں یونانی فوجوں نے یورپی تہذیب کا خونی مظاہرہ کیا ..... جب عرب قومیت متحدہ کے خواب کی تعبیر عراق و شام کی غلامی اور فلسطین کے وطن یہود میں منتقل ہونے کی صورت میں نمودار ہوئی ..... تو تائید ایزدی سے زیر دستوں نے زبردستوں کا منہ پھیر دیا سقاریہ کے خونیں میدان میں مصطفےٰ کمال نے نہ صرف یونان کو بلکہ یورپی استعمار کو شکست فاش دی اور جنگ عظیم کے فاتحین کی اکڑی ہوئی گردنیں جھکا دیں"۔

اس کے بعد مضمون نگار نے معاہدۂ وارسائی کے ردِّ عمل پر ایک نظر ڈالی ہے اور واضح کیا ہے کہ کس طرح اٹلی اور جرمنی میں نئے رہنما پیدا ہوئے اور انہیں اپنی ابتدائی کوششوں میں کہاں تک کامیابی حاصل ہوئی اور کیونکر اتحادی فاتحین نے روس سے ایک مستقل دشمنی اس بنیاد پر پیدا کی کہ وہ اب جنگ کو برادر کشی کا نام دیتا تھا۔ اور اس عقیدے کو نشر کرتا تھا کہ روسی مزدور کو جرمن یا انگریز مزدور سے کوئی پرخاش نہیں اور جنگ درحقیقت استعمار پسندوں اور سرمایہ داروں میں ہوتی ہے جو لاکھوں کروڑوں مزدوروں کو اپنی اغراض کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ دیکھئے مضمون نگار نے اس ہنسی ہنسی میں جس سے تلخی چھلک رہی ہے کیسی پتے کی باتیں کہی ہیں۔!

"مزدوروں نے بین الاقوامی جنگ کو گناہ اور جماعتی جنگ کو فرض جان کر سیاسی اور معاشرتی نظام کی بیخ کنی شروع کی اس سے ملک ملک اور شہر شہر آگ لگ گئی اور یہ اندیشہ ہوا کہ تہذیب کہن کی عزیز ترین متاع اس آگ کی نذر نہ ہو جائے اسے بچانے کے لئے مذہب اور اخلاق کے اجارہ دار، مشرق و مغرب کے سرمایہ دار متحد ہو گئے، .....

بالشویک تحریک نے جہاں مذہب پرست روس کو الحاد کا مرکز بنا دیا ..... اور سرمایہ داروں کے جسم سے کپڑے اور مردہ بادشاہوں کے کفن اتارے، وہاں مردہ قوموں کو ایک نیا درس حیات بھی دیا ..... لینن کے نعرۂ انقلاب کی گونج مشرق و مغرب میں سنائی دی اور چین سے مراکش تک ہر کوہ و دشت سے صدا آئی انقلاب! انقلاب! انقلاب! اگرچہ ان قائدین میں سے بعض کو کامیابی حاصل نہ ہوئی لیکن مشرقِ خوابیدہ اور عالمِ اسلام کا طویل جمود و سکوت جس پر موت کا گمان ہوتا تھا یکسر ٹوٹ گیا ..... ۱۹۲۹ء میں ساٹھ حکومتوں کے نمائندوں نے پیرس میں میثاقِ امن پر دستخط کئے اور ہر جنگ کا اقدام کرنے والی طاقت کے خلاف متحدہ کارروائی کرنے کا فیصلہ کیا۔ ۱۹۳۱ء میں جب جاپان نے چین پر حملہ کیا تو بڑی بڑی طاقتوں نے متحدہ طور پر اپنے فرائض سے پہلوتہی کرنے کا فیصلہ کیا ..... برطانی نمائندے نے دلائل سے ثابت کیا کہ جاپان ایسی زبردست طاقت کو معاہدہ کے احترام پر مجبور کرنا خطرہ سے خالی نہیں ..... ان حالات میں باد فرار خاموشی ہی بہترین پالیسی ہے اور اس سے دوسرے درجے پر اخلاقی دباؤ ..... جمعیتہ اقوام نے اخلاقی دباؤ کی تجویز قبول کی ..... اور جاپان سے اتنی بات کہنے کے لئے ڈھائی لاکھ الفاظ استعمال کئے کہ تم نے بہت برا کام کیا لیکن ہم تمہارے خلاف کارروائی کرنے کی جرأت اپنے میں نہیں پاتے خیر جو ہوا سو ہوا ہم نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ جاپان نے اس کا جواب اس طرح دیا کہ جمعیت کی رکنیت چھوڑ دی گویا یہ جتا دیا کہ نامردوں کی محفل میرے شایانِ شان نہیں"۔

اس کے بعد جناب "موسیٰ" نے حال کے واقعات کا جائزہ لیتے ہوئے جرمنی میں نازی جماعت کا اقتدار۔ علاقہ سار کی واپسی۔ حبش پر اطالیہ کا تصرف اور جمعیت اقوام کی بے بسی۔ تعزیرات کا ڈھونگ۔ ہسپانیہ کی خانہ جنگی۔ فلسطین کی بے چینی۔ چین اور جاپان کی آویزش۔ آسٹریا کا جرمنی سے الحاق۔ چیکوسلاویکیہ کا انجام اور یورپی جمہوریتوں کی دوست کشی پر ایک ناقدانہ نگاہ ڈالی ہے اور حبش کے سلسلے میں ایک دلآویز

سیاسی لطیفہ یہ بیان کیا ہے کہ جب چیکوسلو یکیہ کی قسمت بین الاقوامی فریب کے ترازو پر تل رہی تھی تو نجاشی نے اس بدقسمت ملک کے صدر کو اس مضمون کا تار دیا کہ میں نے سنا ہے کہ فرانس اور برطانیہ تمہاری امداد پر کمربستہ ہیں۔ مجھے اس مصیبت میں تم سے دلی ہمدردی ہے۔

آخر میں مسٹر چیمبرلین کی صلح جوئی پر چند بڑے مزیدار فقرے کسے گئے ہیں ملاحظہ ہوں:۔

"ابھی میثاق میونک کی سیاہی خشک نہ ہونے پائی تھی اور چیمبرلین برطانی پبلک کو اپنے اور ہٹلر کے دستخطوں والا کاغذ دکھا دکھا کر خراج تحسین وصول کر رہے تھے کہ واقعات نے ثابت کر دیا کہ اس تاریخی دستاویز کی قیمت کاغذ کے اس پرزے سے زیادہ نہیں جس پر کسی طفل مکتب نے املا کی مشق کی ہو۔ (چنانچہ) ایک صبح جب مسٹر چیمبرلین آنکھیں ملتے ہوئے اٹھے تو دیکھا کہ یورپ کا نقشہ بدل چکا ہے اور جہاں چیکو سلاویکیہ تھا وہاں جرمنی لکھا ہوا ہے۔ وہ اپنی تاریخی چھتری بغل میں دبائے دارالعوام کی طرف بھاگے اور وہاں ہانپتے ہوئے کہنے لگے۔ چیکوسلاویکیہ ختم ہو گیا۔ اس سانحۂ عظیم کا تقاضا ہے کہ ایک عظیم الشان مباحثہ منعقد کیا جائے جس میں ہم خود بھی تقریر کریں گے اور ہٹلر کی عہد شکنی کی پرزور مذمت کریں گے"۔

آگے اس انداز کے مضامین ہمایوں کے فاضل مدیر میاں بشیر احمد لکھا کرتے تھے۔ اور ہم سمجھتے تھے کہ یہ طرز بیان اب میاں صاحب موصوف کے لئے مخصوص ہو چکا ہے اور وہ اس عرصے کے تنہا شہسوار ہیں لیکن ہمیں کیا معلوم تھا کہ ہر۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "رامو سئے"۔

میاں صاحب سے ہم اس جسارت کے لئے معذرت خواہ ہیں کیا کریں زبان پر آئی ہوئی بات اور قلم سے ٹپکتا ہوا لفظ روکے سے رکتا نہیں۔

یہ لاہور ہے!

جناب بابر بٹالوی سے ناظرین ادبی دنیا آشنا ہیں ان کے دو تین بہت اچھے ڈرامے اور افسانے ہمارے ہاں شائع ہو چکے ہیں۔ اگست کے ہمایوں میں ان کا ایک نہایت دلچسپ سکیچ "یہ لاہور ہے!" شائع ہوا ہے اور ہمیں یہ کہنے میں ذرہ بھر تامل نہیں کہ یہ اپنے رنگ کی لاجواب چیز ہے۔ لاہور کے متعلق حسرت کاشمیری نے بھی بہت کچھ لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔ پطرس کا "لاہور کا جغرافیہ" بھی قبولیت عام کی سند حاصل کر چکا ہے اور زبان زد خلائق ہے۔ لیکن بابر بٹالوی نے اس سکیچ میں جس غائر مطالعہ حسن انتخاب اور لطافت احساس کا ثبوت دیا ہے۔ وہ کچھ انہیں کا حصہ ہے۔

لاہور، وہ بلدۂ شعر و شاعری، وہ منزل حسن و رعنائی، وہ مرکز صحافت و ادب، وہ مصدر علم و فن، وہ منبع حرکت و عمل، وہ منظر عشرت و نکبت اور وہ شہر غلاظت و عفونت، اپنی نیرنگیوں اور گوناگوں کیفیتوں کے لحاظ سے ہندوستان بھر کے شہروں میں ممتاز ہے۔ صاحب مضمون نے اس کے بے شمار مناظر اور شخصیتوں کی تصویر کشی ہے اور اپنے خندۂ نمک پاش سے اہل لاہور کے دل و جگر کی اچھی طرح تواضع فرمائی ہے۔ وہ اسٹیشن کے "کسمولینی" یعنی ریلوے قلی سے شروع ہوتے ہیں اور نگاہ شناس تانگے والے۔ پیشہ ور بائیسکل چور۔ فالتو بچوں۔ بے کار کتوں۔ میونسپل جنگلے سے لٹکے ہوئے پرانے کوٹوں اور بازار میں کھڑے ہو کر استنجا کرنے والے مردان مومن سے آپ کا تعارف کراتے ہوئے آپ کو اندرون شہر کی تنگ لیکن دلچسپ اور حسن پرور گلیوں میں لے جاتے ہیں جہاں

"اگر ہندوؤں کا محلہ ہو گا تو دو رویہ گدرائے بدن کی عورتیں ململ کی باریک سے باریک دھوتیاں باندھے مکانات کی ڈیوڑھیوں میں بیٹھی ایک دوسری سے تُو تُو میں میں کرتی نظر آئیں گی۔ اگر مسلمانوں کا محلہ ہوا تو آپ کو دو رویہ مسلمان عورتیں ململ کے باریک باریک کرتے پہنے ایک دوسری سے ہاتھ نچا نچا کر اونچی آواز میں باتیں کرتی نظر آئیں گی۔ دونوں محلوں میں ننگے بالے گلی کے عین وسط میں سے گزرنے والی نالی پر رفع حاجت کے لئے بیٹھے ہوئے دکھائی دیں گے۔ آپ کی طرّے دار پگڑی اور صاف ستھرے لباس کو دیکھ کر یا آپ کی ہیٹ اور سوٹ سے مرعوب ہو کر اور آپ کے نا آشنا چہرے پر نظر ڈال کر نالی پر بیٹھے ہوئے بچے گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوں گے اور اپنی قمیصیں اٹھائے ہوئے اپنی ماؤں کا رخ کریں گے۔ اتنے میں ان عورتوں میں سے ایک عورت کرخت آواز میں ان بچوں سے کہے گی۔ "جاؤ اٹھ کیوں کھڑے ہوئے۔ جاؤ بیٹھو۔" آپ اس عورت کی طرف دیکھیں گے وہ

آپ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بہ زبانِ بے زبانی کہے گی "کیا
تیورا کے دیکھ رہا ہے میری طرف تیرے جیسے کئی آتے ہیں یہاں
یہ لاہور ہے!!!" مگر آپ چونکہ بالکل اجنبی ہیں اس لئے آپ کا نوٹ
کرتے ہوئے وہ قدرے مسکرا کر کہے گی "بچوں نے سمجھا شاید
صفائی کا داروغہ ہے"۔ آپ دل میں کہیں گے میں اتنا گھٹیا ہوں
صفائی کا داروغہ یعنی مہتروں کا جمعدار۔ آپ منہ سے ہزار بولنا
چاہیں مگر نہ بول سکیں گے۔ آپ سوچیں گے کیا میری شکل وصورت
اور میرا لباس ان عورتوں کی نگاہ میں داروغہ صفائی کی شکل وصورت
اور لباس سے مشابہ ہے؟

پھر وہ آپ کو لاہور اور لاہوریت کے مختلف معنی سمجھاتے
ہیں اور ساتھ ساتھ لنڈے بازار کی سیر بھی کرائے جاتے ہیں جہاں کی
انیونی بند ریا کا قصہ بہت دلچسپ ہے۔ بابر صاحب کی باریک نظر
اس بازار میں جہاں کبھی حسن بکتا تھا، اب بھی اُس گئے گذرے زمانے
کے آثار دیکھ لیتی ہے اور انہیں اُن بے گناہ لوگوں کی روحیں
جنہوں نے گناہ کا پہلا سبق اسی بازار میں سیکھا تھا اب بھی وہیں منڈلاتی
نظر آتی ہیں۔

صاحبِ مضمون نے لاہور کے فقرا کا بہت گہرا مطالعہ کیا
ہے اور اُن کے فن کی جدید ترین ٹکنیک سے پوری آشنائی حاصل
کی ہے۔ اس برادری کی "فارورڈ" قسم خاص طور پر قابلِ توجہ ہے:۔

"آپ کو کئی فقیر ایسے نظر آئیں گے جن کے قد چھ چھ فٹ کے قریب
ہوں گے اور جن کے ہاتھ میں لوہے کا ایک بڑا دستہ پناہ یا مڑا
سا چوبی ڈنڈا ہوگا۔ آنکھوں میں ایک فقیرانہ شان کا نشہ ہوگا بس
میں آورد کوٹ کوٹ کر بھری ہوگی۔ مگر بظاہر کچھ جھکائے
رکھتے ہیں اور گلی کوچوں میں بالخصوص جہاں عورتوں کا جمگھٹا ہو
دل کھول کر دادِ فقر دیتے ہیں۔ اُن کا عاشقانہ چشم میں آنکھوں کو ادھر
اُدھر پھیرلانے کا مقصد صرف یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ کہیں قریب ہی
کوئی مرد تو موجود نہیں کیونکہ ان کے پیر و مرشد نے انہیں سب
سے پہلے یہ سبق دیا تھا ؎

ہر کہ ہست گمان مبر کہ خالیست — ہشیار کہ مرد خفتہ باشد

وہ کبھی کبھی انکھیوں سے کھڑکیوں کی طرف بھی بے نیازانہ انداز
سے ... سے دیکھتے ہیں اور اگر قریب ہو تو کسی کھڑکی
یا ڈیوڑھی میں کوئی تنہا لڑکی یا عورت نظر پڑ جائے تو اپنی دھیمی
مگر پُر شکوہ آواز میں سوز پیدا کرتے ہوئے ایک رازدارانہ انداز
میں ترنم سے کہیں گے "چل تُر چلیئے" اتنا کہہ کر اس عورت یا جوان
لڑکی کے چہرے پر اس دعوتِ فقر کے تاثرات تلاش کرنے کی
کوشش کریں گے۔ اگر اس لڑکی یا عورت کے چہرے پر غضبناک
قسم کی لہریں اُٹھنے لگیں تو فوراً کیفیتِ مزاج بھانپ کر ادھی
آواز میں گا دیں گے "شہر مدینے نوں"۔
یہ ڈراما وقت کے بہت قلیل عرصے میں ختم ہو جاتا ہے "چل
تُر چلیئے" ـــــ (وقفہ) "شہر مدینے نوں"۔

آگے چل کر آپ نے لاہور کے بوقلموں برقعوں کی قسمیں گنائی
ہیں اور ان کے خواص سے ہمیں آگاہ فرمایا ہے:۔

"لاہور کی سیر کرتے وقت اگر کوئی "برقع پوش" آپ کو دیکھتے ہی
"نقاب پوش" بھی ہو جائے تو سمجھئے کوئی جان پہچان ہے۔ کیونکہ لاہور
میں مسلمان عورتوں کا یہی دستور ہے کہ جہاں کہیں بیگانوں کو دیکھیں
گی نقاب الٹ دیں گی اور جونہی کوئی اپنا نظر آیا نقاب جھٹ سے
نیچے آرہی۔ یوں تو لاہور میں کئی قسم کے برقعے نظر آتے ہیں مگر ان
میں سے بعض خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ایک وہ برقع ہے جو
آپ کو بلدیہ کے باغات میں نظر آئے گا۔ آپ اُس برقعے کو کبھی
"نقاب پوش" نہیں دیکھیں گے۔ ایک وہ برقع ہے جو صرف
دوکاندار کے سامنے اٹھایا جاتا ہے اگر آپ بائیں کوئی چیز خریدنے
کے لئے اُس دُکان پر کھڑے ہو جائیں تو برقع اُس طرف سے
جس طرف آپ بائیں کھڑے ہیں اپنے چہرے کو نقاب کی آڑ
میں چھپانے کی ناکام کوشش کرے گا۔ یہ اس سے پرے
کہ ہم آشنا نہیں۔

ایک برقع وہ ہے جو آپ کو دیکھ دیکھ کر چھپنے کی کوشش کرتا
ہے اور ایک وہ جو آپ کو چھپ چھپ کر دیکھتا ہے۔ ایک برقع
کی نقاب کچھ اس طرح گرائی جاتی ہے کہ وہ ہوا کے لطیف سے
لطیف جھونکے سے اُٹھ اُٹھ جاتی ہے اور نقاب کی اوٹ میں
سے چہرے کا ایک چوتھائی حصہ صاف نظر آنے لگتا ہے۔ ایسے
برقعے عام طور پر بلنگے میں بیٹھے نظر آتے ہیں۔ ایک برقع ایسا بھی
ہے جس کا تعلق غروبِ آفتاب سے ہے۔ ادھر سورج نے منہ

پرسیاہ نقاب ڈالی اور ادھر یہ برقع ظہور میں آیا اور ایک برقع نصف شب کو جب آپ سینما دیکھنے کے بعد اپنی قیام گاہ کی طرف جا رہے ہوں نظر پڑتا ہے اور آخری برقع وہ ہے جو ایک عاشق نارسا کو اوڑھ کر چندیا کی تواضع کرانی پڑتی ہے۔"

پھر نمائش کا منظر دکھایا ہے۔ جہاں ساڑھیاں خراماں ہو کر نمائش کرتی ہیں اور سوٹ ان کے پیچھے پیچھے پھر کر نمائش دیکھتے ہیں۔ کالج کے ہوسٹلوں کی جھلک دکھائی ہے جہاں "دل پھینک" طلبا علم کی بجائے رومان کی طلب میں شمع کی طرح گھلتے ہیں اور فلمی ٹپے گا گا کر زندگی کا غم غلط کرتے ہیں۔ پھر لاریوں اور بستوں کے اڈے دکھائے ہیں جہاں کی ادب پرور فضا کا ثبوت آپ کو ان اشعار سے ملتا ہے۔ جو لاریوں کی پیشانیوں پر لکھے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ پھر لاہور کے خونچے والوں کی قسمیں اور ان کے رنگا رنگ سودے اور ان کی لہک دار صدائیں بیان کی ہیں اور ختم یوں کیا ہے کہ

> "اگر آپ دوپہر کا کھانا کھانے کے بعد بستر پر لیٹ کر آرام کرنا چاہیں اور آپ کی آنکھ لگ جائے تو فوراً تین شخص اونچی اونچی دھوتیاں اور لمبے لمبے ململ کے میلے کرتے پہنے چھوٹی سی ہتھ گاڑی پر لکڑی کا ایک بکس رکھے آپ کی کھڑکی کے عین نیچے آ کھڑے ہوں گے اور تینوں کے تینوں ایک بلند سمع خراش آواز میں ایک مختصر سی "میٹھی" لوری الاپنی شروع کر دیں گے۔ "ملائی والی اے ــ کھرتے والی اے ــ
> بمبئی والی اے"

برادرِ نسبتی کے عنوان سے سید علی منظور نے ایک ایسی نظم لکھی ہے جسے چند وجوہ کی بنا پر جدید شاعری کی بہترین نظموں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ جدید شاعری کے مفہوم کا تعلق صرف ہیئت کے انقلاب ہی سے نہیں ہے۔ جیسا کہ عام لوگ سمجھتے ہیں بلکہ موضوع کا انتخاب اور شاعر کا انداز نظر کسی نظم کو جدید بناتے ہیں۔ اس نظم میں سید علی منظور نے ہیئت کو ردیف و قوافی کا پابند رکھتے ہوئے موضوع ہی ایسا چنا ہے جو ہر شاعر کے بس کی بات نہیں ہے۔ آج کل کے غرض مندانہ زمانے میں لوگوں کے ذہن کچھ اس ڈھب پر ڈھل گئے ہیں کہ ان کے لئے دنیا کی بہت کم باتوں میں رومانیت رہ گئی ہے انہیں عشق و محبت میں بھی اسی وقت تک دلکشی نظر آتی ہے جب تک کہ یہ جذبہ سماجی پابندیوں سے مبرا دکھائی دے اور عاشقی کا قید شریعت میں آ جانا گویا شعریت کے حسرت ناک انجام کے مترادف سمجھا جاتا ہے۔ لیکن وہ لوگ بھول جاتے ہیں کہ اس کائنات میں تخلیق کے عمل اور تعلقات کے اضافے میں جس قدر شعریت ہے اور کسی شے میں نہیں سید علی منظور نے اس نظم کے ذریعے سے تعلقات کے ایسے ہی اضافے میں شعریت کی کامیاب تلاش کی ہے۔ اور آخری مصرعے میں "کہ ہوں مرے اور اس کے بچے پھپھیرے بھائی، ممیرے بھائی" سے تو آبا و اجداد کا وہ زمانہ یاد آ جاتا ہے۔ جب وہ ہندوستان میں نئے نئے آ کر آباد ہوئے تھے اور انہیں ضرورت تھی کہ آپس کی رشتہ داری کو بڑھایا جائے اور باہمی رشتوں کو استوار کر کے امن کی زندگی بسر کی جائے۔ گھریلو زندگی کی دلکشی کو بڑھانے میں یہ نظم جو تحریک دیتی ہے وہ اس کا ایک مبارک پہلو ہے۔

صلاح الدین احمد

شعر

چلتے ہو تو چمن کو چلئے سنتے ہیں کہ بہاراں ہے
پات ہرے ہیں پھول کھلے ہیں کم کم باد و باراں ہے

میر تقی

برکھارت

گھٹا رُت کی اُٹھی پھر اوّل اوّل   فضا کی گود میں بکھرا ہے کاجل
کلیجہ سرد ہے پیاسی زمیں کا   ہوُا جاتا ہے اب میدان جل تھل
اُفق پر دھاریاں سی پڑ گئی ہیں   کسی نے چُن لیا ہو جیسے آنچل
لچکتی آ رہی ہے تیز بجلی   برستا آ رہا ہے مست بادل
بھری ہیں راگنی سے سرد بوندیں   ہوا کے ساز پر بجتی ہے چھاگل
یہ کوُ کوُ کا ترانہ کس نے چھیڑا   گھنیرے کنج میں آنکھوں سے اوجھل!
یہ کیسی مے کی خوشبو آ رہی ہے   یہ کس نے کھول کر رکھ دی ہو بوتل

مبارک باد اے رندِ خرابات
مچلتی پھر سے آپہنچی ہے برسات

کہاں پانی کی اب ہلکی پھواریں؟   فضا میں جھومتی ہیں سبز دھاریں۔
یہ گرتی موریاں بجتا ہوُا ٹین   یہ ہمسائے میں بچوں کی پکاریں
ہواؤں میں اڑا جاتا ہے سبزہ   بچھی جاتی ہیں آموں کی قطاریں
گھنیرے باغ میں موروں کا جمگھٹ   کھلے میدان میں ہرنوں کی ڈاریں
یہ کشتی میں صدائیں مانجھیوں کی   بھرے دریا کے سینے پر ملاریں
سنبھالے گاگریں جمنا کے تٹ پر   نہانے آئیں برندابن کی ناریں
اُبلتی ہے گھٹاؤں کی جوانی   پھٹی پڑتی ہیں ساون کی بہاریں

مبارک باد اے رندِ خرابات!
مچلتی پھر سے آپہنچی ہے برسات

حسینوں کا ہے پھر باغوں میں جمگھٹ   ٹپکتی ہے نگاہوں سے لگاوٹ
مچل اُٹھیں جوانی کی اُمنگیں   نہ پردا ہے نہ آنچل ہے، نہ گھونگٹ
ببیپوں سے لدی ریشم کی ڈوری   گھٹاؤں میں یہ جھولوں کی سجاوٹ
ہوا میں راگنی سی گا رہی ہے   ملائم آنچلوں کی سرسراہٹ
یہ بوندوں کے ٹپکنے کا ترنّم   سہانی پتیوں پر نرم آہٹ
مموے کی یہ بیراگی صدائیں   جھنجھری کی یہ میٹھی گنگناہٹ
گھٹایوں گود پھیلائے ہوئے ہے   کھلی ہو جیسے میخانے کی چوکھٹ

مبارک باد اے رندِ خرابات
مچلتی پھر سے آپہنچی ہے برسات

بھرے ساون کی یہ چڑھتی جوانی   گھٹا ہے یا بلائے آسمانی
یہ شور انگیزیٔ دریا کا تلاطم   یہ طوفاں خیز موجوں کی روانی
گلی کوچوں میں ندی بہہ رہی ہے   سڑک پر آ گیا نالے کا پانی
جواریں لہلہائیں دھان لہکا   کسانوں کی مٹی اب سرگرانی
زمیں پر جم گئی اُڑتی ہوئی خاک   اُٹھی مٹی سے بوُ سوندھی سہانی
گھٹاؤں میں چمک یہ جگنوؤں کی   سیہ آنچل پہ جیسے کامدانی
یہ موسم ہے تو بے مانگے بھی ساقی   پلائے گا شرابِ ارغوانی

مبارک باد اے رندِ خرابات!
مچلتی پھر سے آپہنچی ہے برسات

ہوئے جلوے حسینوں کے نرالے   انوکھے رنگ باغوں میں اُچھالے
یہ دھانی چوڑیاں نکھرا ہوا رنگ   حسیں گردن میں یہ پھولوں کے مالے
ہوا میں اس طرف شب رنگ زلفیں   فضا میں اُس طرف بادل وہ کالے
جوانی کی اُمنگوں کا تقاضا   کُھلے جوڑے پہ آنچل کون ڈالے!
چمن میں آ رہی ہیں مالنوں کی   صدائیں دے رہے ہیں پھول والے
بندھی جاتی ہیں اب ساون کی جھڑیاں   گریں گے کوئی دم میں مینہ کے جھالے
گھٹاؤں سے وہ برسی نوجوانی   وہ ٹوٹے، دیکھ میخانے کے تالے

مبارک باد اے رندِ خرابات!
مچلتی پھر سے آپہنچی ہے برسات۔

کھلا ہے پھر سے میخانے کا آغوش   گھٹاؤں سے برستا ہے نیا جوش
سجی ہے پھر بساطِ بادہ نوشی   ہوئے ہیں جمع اصحابِ بلانوش
شریکِ بزم زرّیں مسندوں پر   حسینانِ گل آویز و گہر پوش
کھنکتے جام کی شیریں صدائیں   ہوئی ہیں آج پھر سے جنّتِ گوش
چلی ہے ساقیہ پھر رقص کرتی   صراحی بر کمر، پیمانہ بر دوش
خیالِ کعزوایماں دُور ہو، دُور   خدا کے واسطے اے عقل خاموش!
جوانی عشرتِ امروز خواہد   بکُن افسانۂ فردا فراموش!

مبارک باد اے رندِ خرابات
مچلتی پھر سے آپہنچی ہے برسات

(”ساقی“ بہ اجازت)

جاں نثار اختر ایم اے۔

برادرِ نسبتی

میں شاد ہوں اپنے بھائیوں سے، تو مجھ سے راضی ہیں میرے بھائی،
پھپھیرے بھائی، خلیرے بھائی، ممیرے بھائی، چچیرے بھائی
پھپھیرے بھائی کو دیکھتا ہوں، پھوپھی کی آتی ہے یاد صورت
وہی تکلّم، وہی تبسّم، وہی محبّت، وہی عنایت
خلیرے بھائی نے یاد مجھ کو دلایا گزرا ہوا زمانہ
وہ میری خالہ کا آ کے ہنسنا، وہ میری امّاں کا مسکرانا
میں جیسا ہوں دادھیال سے خوش، اسی طرح نانہیال سے خوش
چچیرے بھائی کے حال سے خوش، ممیرے بھائی کی چال سے خوش
کشیدہ خاطر نہیں ہے کوئی، ہیں اُن کا شیدا، وہ مجھ پہ مائل
جو سب کے سب رشتہ دار خوش ہیں، شگفتہ ہیں باہمی وسائل

کیا ہے قانون اور شریعت نے قائم اور ایک تازہ رشتہ
جدید یہ رشتہ دار میرے لئے محبت کا ہے فرشتہ

یہ نیک انساں حقیقی بھائی مری شریکِ حیات کا ہے
برادرِ نسبتی کا دلکش اضافہ کس درجہ جانفزا ہے
برادرِ نسبتی اِدھر خوش، مری شریکِ حیات اُدھر خوش
خوش اُن سے ہنس بول کر ہوں میں بھی غرض ہے اس وقت گھر کا گھر خوش
جدید یہ ارتباط ہوگا نئے نئے رابطوں کا حامل
اسی طرح پھیلتے رہے ہیں جہاں میں چھوٹے بڑے قبائل
وسیع ہوں گے اس اشتراکِ لطیف سے دونوں خانداں بھی
ریاضِ ہستی کی ہوں گے زینت نئے مکیں بھی نئے مکاں بھی
برادرِ نسبتی کے تیور بتا رہے ہیں کہ باوفا ہے
ابھی بہت رسم و رہ بڑھے گی، ابھی محبت کی ابتدا ہے

برادرِ نسبتی میں مجھ میں بڑھے نہ آئندہ کیوں صفائی
کہ ہوں مرے اور اُس کے بچے پھپھیرے بھائی ممیرے بھائی

علی منظور

(از ہمایوں، بہ اجازت)

نقد و نظر

فرہنگِ عامرہ

مشہور عالم مسخرے چارلی چپلن کے متعلق سنا ہے کہ ایک زمانے میں وہ ہر روز لغت سے دس لفظ اور ان کے معنی حفظ کیا کرتا تھا۔ اس کی اس غیر معمولی حرکت میں ایک خاص بات پنہاں ہے، کسی زبان کی اہم ترین کتاب اُس زبان کی لغت ہی ہوتی ہے لیکن ہم بظاہر یہ احساس لئے بیٹھے ہیں کہ لغت کبھی کبھی دیکھنے والی ایک معمولی اور غیر اہم سی چیز ہے۔ اردو زبان میں فرہنگ آصفیہ کے بعد سے کوئی خاص اچھی لغت شائع نہ ہوئی تھی۔ البتہ لوگوں کی نظریں انجمن ترقی اردو کی لغات کی جانب تھیں۔ یہ ڈکشنریاں جہاں تک ان کے حسن وخوبی کا تعلق ہے خوب ہیں لیکن ان میں دو باتوں کی کمی ہے پہلی یہ کہ ان کی قیمتیں ایک غریب طالب علم کیلئے بہت زیادہ ہیں۔ دوسرے یہ اپنی جامعیت کی وجہ سے بہت زیادہ لمبی چوڑی معلوم ہوتی ہیں۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ ایک ایسی لغت بھی شائع کی جائے جو الفاظ کی کثرت کے ساتھ ہلکی پھلکی اور روزمرہ کے استعمال کے قابل ہو۔ مولوی محمد عبداللہ خاں صاحب، خویشگی نے حال ہی میں فرہنگِ عامرہ کے نام سے ایک ڈکشنری مرتب کر کے شائع کی ہے۔ یہ مجلد ہے اور اس کا حجم پانسو بیاسی صفحے ہے اور قیمت دو روپے۔ لیکن اتنے صفحات کے باوجود اس کا وزن بہت کم ہے۔ اس میں عربی، فارسی اور ترکی کے چالیس ہزار الفاظ اُن کے اردو معانی کے ساتھ درج کئے گئے ہیں۔ بہتر ہوتا اگر اس کا حجم اور سائز بڑھا کر اس میں اردو ہندی کے مشکل الفاظ بھی شامل کر لئے جاتے۔ لیکن اس صورت میں بھی یہ لغت اردو زبان کے ہر طالب علم کے لئے ایک مفید کتاب ہو سکتی ہے۔ معانی کے ساتھ ہر لفظ کا صحیح تلفظ بھی اس میں درج ہے اور چیدہ چیدہ مقامات پر ہماری آزمائش کے مطابق رموز واوقاف کی اشاعت میں صحت کا بہت خیال رکھا گیا ہے۔ اس کی ایک مثال ہم یوں دے سکتے ہیں۔ چونکہ لغت ایک ایسی چیز ہے جس کا شعر وادب کی مانند جذبات سے کچھ تعلق نہیں ہوتا۔ اس لئے ہم نے اس میں "جذبہ" کی تلاش کی، اس لفظ کے معنی کے ساتھ اس کا تلفظ یوں درج تھا۔ (جَذْ۔ بَہ) یعنی ذال کی جزم کے ساتھ۔ اس کے بعد اسی لفظ کی جمع یعنی جذبات کو دیکھا تو تلفظ یوں تھا (جَذَ بَات) یعنی ذال کی زبر کے ساتھ۔ عام طور پر اردو کے وہ لکھنے والے جو عربی سے خاطر خواہ واقف نہیں ہوتے عموماً اپنی تحریر یا اشعار میں ایسی غلطی کر جاتے ہیں۔ مثلاً

مدتوں میں مرے گھر آئی ہے جذبات کی رات۔ یہاں ذال پر جزم استعمال کی گئی ہے اور یہ عربی قاعدے سے ناواقفیت کا اظہار ہے۔ اس کے علاوہ بھی ہم کئی روز سے وقتاً فوقتاً اس لغت کا استعمال کر رہے ہیں اور ہم نے اسے اب تک ہر طرح سے صحیح پایا ہے۔ امید ہے کہ اردو زبان کے مشتاق اس لغت کی قدردانی کریں گے۔ کیونکہ عربی اور فارسی کے علاوہ ترکی الفاظ کے سلسلے میں اس سے بڑھ کر آرام دہ لغت انہیں اور نہ مل سکے گی۔ ملنے کا پتہ:۔ مولوی محمد عبداللہ خاں خویشگی، فیروز منزل متصل جامع مسجد۔ خورجہ۔ یو۔ پی۔

عطرِ عروض۔

اردو شاعری اس نفسانفسی کے دور میں روز بروز ترقی کی تازہ منزلیں طے کر رہی ہے۔ موضوع میں جو نت نئی تبدیلیاں ہو رہی ہیں ہمیں اس جگہ اُن سے تعلق نہیں۔ البتہ ہیئت کے لحاظ سے جو انقلاب پیدا ہو کر مستقل حیثیت اختیار کر رہا ہے اس کے بارے میں ایک آدھ بات کہنی ہے۔

اصول وضوابط کے بغیر دنیا میں کوئی کام نہیں چل سکتا۔ ہماری قدیم شاعری اس کی مظہر ہے (اگرچہ اصول وضوابط کی غیر مدلل پابندی ہی سے اُس کا زوال بھی ہوا) آج کل اردو شاعری میں آزاد نظم کا چرچا ہے۔ لیکن آزاد نظم کے نااہل حامی یہ سمجھتے ہیں کہ بے راہ روی ہی اس

نظم کا دوسرا نام ہے یہ خیال بالکل غلط ہے۔ آزاد نظم کے لئے بھی ہمیں اپنی قدیم شاعری کے ضوابط کی واقفیت اُسی قدر ضروری ہے جس قدر نئی ہیئتِ شعری کو رائج کرنے کی۔ کیونکہ پہلے قوانین کو جانے بغیر نئے قوانین کی اچھی ساخت نہیں کی جاسکتی۔ اس لئے وقت کا تقاضا ہے کہ علم عروض پر شگفتہ اور صحیح کتابیں لکھی جائیں۔

مقام مسرت ہے کہ نواب احسان علی بہادر احسان آف باندہ نے علم عروض پر ایک مختصر رسالہ تالیف کیا ہے جس کا نام عطرِ عروض اور حجم تینتیس صفحات ہے۔ اس کی قیمت چار آنے ہے۔ اس رسالے کی دو سب سے بڑی خوبیاں اختصار اور جامعیت ہیں۔ ان تینتیس صفحات میں نواب صاحب موصوف نے علم عروض کی ہر ضروری بات کا مختصر اظہار نہایت سلجھے ہوئے طریق پر کر دیا ہے۔ اور اس لئے یہ رسالہ حوالے کے طور پر بھی ایک کار آمد چیز ہے۔ ہمیں امید ہے کہ شعرا اس سے پورا فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔ یہ رسالہ نظامی پریس لکھنو سے شائع ہوا ہے۔

رہنمائے تاریخِ اُردو

مولفہ حاجی محمد عبدالقادر صاحب۔ حجم ایک سو باون صفحات۔ کاغذ کتابت طباعت عمدہ۔ قیمت فی جلد ۱۲؍

اس کتاب کے شروع میں محترمی عبدالسلام صاحب ندوی نے دیباچے کے طور پر ذیل کی عبارت لکھی ہے۔

"اصنافِ شاعری میں فن تاریخ گوئی ایک نہایت مشکل فن ہے اور عمدہ اور دلچسپ تاریخوں کے نکالنے میں بہت کم شعراء کامیاب ہوئے ہیں تاہم شعرائے قدیم کا یہ ایک محبوب مشغلہ رہا ہے۔ اور تمام اساتذۂ فن نے اس کو اپنی شاعرانہ قوت کے اظہار کا ایک نمایاں مظہر قرار دیا ہے، بایں ہمہ افسوس ہے کہ اردو زبان میں جس قدر تاریخیں موجود ہیں۔ ان کو نہ کوئی خاص اہمیت دی گئی اور نہ ان کا کوئی مستقل مجموعہ تیار کیا گیا۔ لیکن مقام مسرت ہے کہ حاجی محمد عبدالقادر صاحب ریٹائرڈ وکیل بنارس نے اس طرف خاص توجہ کی اور اس موضوع پر ایک خاص کتاب "رہنمائے تاریخ اردو" کے نام سے لکھی جس میں شعرائے اردو سلاطینِ مغلیہ اور فرمانروایانِ اودھ کی وفات کی تاریخیں جمع کیں۔ اگر وہ اس میں ذرا اور بھی وسعت پیدا کر دیتے تو وفات کے علاوہ اور دوسری قسم کی تاریخوں کا ذخیرہ اس مجموعے کو اور بھی زیادہ مکمل کر دیتا، لیکن بہر حال اُن کی یہ کوشش مستحق تحسین ہے کہ تمام شعرائے اردو کی وفات کی تاریخیں ایک جگہ جمع کر دی ہیں اور ساتھ ساتھ اُن کے مختصر حالات بھی لکھ دیئے ہیں۔ ان تاریخوں سے پہلے ایک مقدمہ لکھا ہے جس میں فن تاریخ گوئی کے اصول و قواعد بتائے ہیں جو اس فن سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے بے حد مفید ہیں۔ ہم کو امید ہے کہ جو لوگ سخن کی اس صنف کے ساتھ شعرائے اردو کے حالات سے بھی دلچسپی رکھتے ہیں وہ اس کتاب کو نہایت شوق سے پڑھ کر مصنف کی کاوش اور محنت کی داد دیں گے۔"

مولانا عبدالسلام ندوی کی رائے سے ہمیں حرف بحرف اتفاق ہے اور اسی لئے ہم نے اس رائے کو جوں کا توں درج کر دیا ہے۔

ملنے کا پتہ:۔ محمد عبدالقادر ریٹائرڈ وکیل شہر بنارس۔ محلہ کنور پورہ کوٹھی خان بہادر مولوی محمد بشیر۔

"م"

ادبی دنیا میں اشتہار دینا کلید کامیابی ہے۔

فہرست مضامینِ ادبی دنیا لاہور

بابت ماہِ اکتوبر ۱۹۳۹ء

جلد ۱۷ — تصاویر: ۱۔ اُس کی آنکھیں اُس کے بال ۲۔ عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے — نمبر ۱۰

چندہ سالانہ مع محصول ڈاک اور وی پی پانچ روپے۔ ممالکِ غیر سے دس شلنگ

گیلانی الیکٹرک پریس ہسپتال روڈ لاہور میں باہتمام صلاح الدین احمد پرنٹر و پبلشر چھپ کر دفتر ادبی دنیا دی مال لاہور سے شائع ہوا۔

یہ سب مناظر
سحر فرانس
فرانس کی رنگین زندگی کا حسین مرقع
فطرت انسانی کا حیرت انگیز تجزیہ
محبت کی ولولہ انگیز داستانیں
امید و بیم کی کشمکش
جذبات و احساسات کا ارتعاش
کے مطالعہ سے آپ کی آنکھوں کے سامنے آجائیں گے
سحر فرانس
فرانس کے شہرۂ آفاق افسانہ نگار گائی ڈموپساں کے
۲۲ دلکش افسانوں کا مجموعہ ہے
جس کا ترجمہ طاہر قریشی بی۔ اے نے کیا ہے تعارف جناب عاشق بٹالوی بی۔ اے۔ ایل ایل۔ بی نے سپرد قلم کیا ہے۔ اور موپساں کی افسانہ نگاری پر ایک مبسوط محققانہ مقالہ حضرت شاہد احمد بی۔ اے آنرز ایڈیٹر ماہنامہ ساقی دہلی کے قلم کا مرہون منت ہے۔
اعلےٰ درجے کی کتابت وطباعت۔ دلکش سرورق۔ خوشنما جلد۔ ضخامت سوا تین سو صفحات۔ ظاہری و باطنی محاسن سے آراستہ
قیمت ایک روپیہ چار آنے
منگانے کا پتہ
منیجر ادبی دنیا
دی مال لاہور
کتاب میں مصنف و مترجم کی تصویریں بھی شامل ہیں

دنیائے کاروبار

لکشمی انشورنس کمپنی لمیٹڈ

کے ڈائرکٹروں نے حال ہی میں اس کی رپورٹ مختتمہ ۳۱ر دسمبر ۱۹۳۶ء میں یہ حقائق واضح کئے ہیں:۔

۲۶ر نومبر ۱۹۳۶ء کی منعقدہ غیر معمولی میٹنگ میں کمپنی کے آرٹیکل آف ایسوسی ایشن میں تبدیلی کی گئی تھی جس کی رو سے کمپنی کا فنانشل ایر ہر سال ۳۱ر دسمبر کو ختم ہوا کرے گا۔ یہ نئے انشورنس ایکٹ کی ضروریات کی وجہ سے کیا گیا ہے۔ اس وجہ سے جو حسابات اس رپورٹ میں پیش کئے جا رہے ہیں۔ وہ محض آٹھ ماہ کے ہیں۔

اس عرصہ میں بیمے کے لئے 7324 درخواستیں موصول ہوئیں جن کا زر بیمہ ۱۳۹۲۱۸۳۵ روپے تھا۔ نئے بزنس میں پالیسیوں کی تعداد ۵۳۶۴ تھی۔ جن کا زر بیمہ ۱۰۰۱۸۹۲۵ روپے تھا نیز مبلغ ۰ — ۵ — ۵۲۷۸۶۲ روپے کے لئے بیمہ کی درخواستیں واپس یا ملتوی کردی گئی تھیں۔ یا ان شرائط پر قبول کی گئی تھیں جو اشخاص بیمہ شدہ کو قبول نہیں تھی۔

دوران عرصہ زیر تبصرہ کل ۶ — ۷ — ۰۰ ۲۴۸۳۷ روپے وصول ہوئے جن میں سے ۳ — ۱۴ — ۲۱۲۳۱۵۶ روپے پریمیم کے ذریعے وصول ہوئے۔ اس میں ۳ — ۸ — ۱۲۹۱۱۱۶ روپے کا اضافہ ہوا اس لئے اس اضافے پر آمدنی ۳ — ۱۵ — ۱۰۹۲۵۸۳ روپے ہے۔

سال کے آغاز میں انوسٹمنٹ۔ ریزرو فنڈ ۶ — ۴ — ۳۸۲۸۴ روپے تھا۔ اس میں ایک لاکھ روپے کا مزید اضافہ کیا گیا۔ اور اب فنڈ ۶ — ۰ — ۸۲ ۳۵۷۷ روپے ہے۔ اس طرح ہم ضمانتوں اور ریلوے کے حصوں کی قیمت میں ہر قسم کی کمی کے لئے تیار ہیں۔ بلڈنگ فنڈ میں ۱۵۸۲۱ روپے کا مزید اضافہ کیا گیا ہے۔ اور اب یہ فنڈ ۳۸۷۹۰ روپے ہے۔

انوسٹمنٹ

ہمیں اس امر کا اعلان کرنے میں مسرت محسوس ہوتی ہے کہ کمپنی کی پالیسی باقاعدہ محتاط اور ترقی کناں ہے۔

۳۱ر دسمبر ۱۹۳۶ء کو گورنمنٹ اور ریاستی ضمانتوں میں لگے ہوئے روپے کی مقدار ۹ — ۹ — ۴۳۷۳۱۶ ہے جس میں سال گزشتہ کے اس مد میں لگے ہوئے روپے سے ۷ — ۸ — ۶۷۶۸۸۴ روپے زائد ہیں۔ ہندوستان میں جائداد کے رہن کی صورت میں اس وقت ۶ — ۲ — ۲۷۴۴۳۸۶ روپے لگے ہوئے ہیں۔ جو سال گزشتہ کے اس مد میں لگے ہوئے روپے سے ۱۱ — ۷ — ۶۲ ۱۱۹۲ روپے کم ہے، گورنمنٹ گارنٹی شدہ اور سٹیٹ گارنٹی ریلوے حصوں اور ریزرو بنک کے حصوں میں اس وقت ۳ — ۱۲ — ۱۳ ۱۵۴۵ روپے لگے ہوئے ہیں یہ رقم اس مد میں لگی ہوئی سال گزشتہ کی رقم کے برابر ہے۔

کلیمز

عرصۂ زیر نظر کے دوران ۸۵ کلیمز جن کی مالیت ۰ — ۱۲ — ۲۷۸۶۸ تھی موت کی وجہ سے کئے گئے۔ ان میں بونس شامل ہیں۔ لیکن دوسری دفعہ بیمہ کی گئیں رقوم شامل نہیں مبلغ ۶ — ۱۴ — ۱۶۴۷۳۹ روپے کے کلیمز سال گزشتہ کے بقایا تھے۔ اس سال میں کئے گئے۔ اور سال گزشتہ کے بقایا کلیمز کے سلسلے میں ۰ — ۶ — ۳ ۲۵۰۵۰ روپے عرصۂ زیر نظر میں ادا کئے جا چکے ہیں۔ اور اب ۶ — ۱۲ — ۲۲۸۴۶۸ روپے بقایا ہیں جس میں دوبارہ کئے گئے بیمے کی واجب الوصول رقوم شامل نہیں۔ ۵۲ کلیمز جن کی مالیت ۰ — ۴ — ۸۰۴۶۷ تھی جنہیں دوبارہ بیمہ کیا جانا شامل نہیں تھا تکمیل کی وجہ سے ظہور پذیر ہوئے یہ تمام کلیمز عرصۂ زیر نظر میں پوری پابندی کے ساتھ فی الفور ادا کئے گئے ہیں:۔

ایڈورٹائزنگ مینجر

بزم ادب

ہمعصر ساقی نے ہمارے حصۂ "دنیائے ادب" پر مندرجہ ذیل حوصلہ افزا الفاظ میں اظہار رائے کیا ہے شاہد احمد صاحب مدیر ساقی کشادہ دلی اور قدر شناسی کی خوبیوں سے بہرۂ وافر رکھتے ہیں، ادبی دنیا کی ناچیز خدمات کی داد دینے میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔ ہم ان کی اس قدر افزائی کے لئے ان کے بے حد ممنون ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

"اردو کے مشہور رسالہ "ادبی دنیا" لاہور نے اردو کی جو قابل قدر خدمات انجام دی ہیں وہ ہمارے لئے باعث فخر ہیں اور جس عمدگی اور شائستگی سے شائع ہو رہا ہے ہمارے لئے لائق رشک ہے لطیفی ادیب منصور احمد مرحوم کے بعد گمان تھا کہ ادبی دنیا اسی شان سے شائع ہوتا رہے گا لیکن خدا کا شکر ہے کہ صلاح الدین صاحب نے اس اندیشے کو غلط ثابت کر دیا۔ پرچہ اب بفضلہ بڑی آب و تاب سے شائع ہو رہا ہے اور ترویج و ترقی اردو کی بہت سی راہیں تلاش کر رہا ہے۔ چند ماہ ہوئے کہ "ادبی دنیا" میں ایک نئے مستقل عنوان کا اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ عنوان ہے۔ "دنیائے ادب" اور اس کے ذیل میں اردو کے تازہ ترین رسائل کے اہم مضامین کا تذکرہ اور ان پر تبصرہ کیا جاتا ہے۔ یہ بہت مفید تجویز ہے جس کے لئے ہمیں صلاح الدین احمد صاحب کا شکر گذار ہونا چاہیئے۔ انگریزی میں "دی لٹریری ڈائجسٹ" اور اسی طرح کے اقتباسی رسائل شائع ہوتے ہیں جن کا مقصد اعلیٰ درجے کے تازہ مضامین کو مختصراً پیش کرنا ہے۔ اردو میں ایسا کوئی رسالہ شائع نہیں ہوتا۔ "ادبی دنیا" میں دوسرے رسالوں کے خاص خاص مضامین نظم و نثر پر مبسوط تبصرہ کیا جاتا ہے اور بتایا جاتا ہے کہ کس رسالے میں کونسا مضمون کس پائے کا شائع ہوا ہے۔ گویا ادبی معلومات کا ذخیرہ ہوتا ہے جس سے ہر صاحب ذوق کو مستفیض ہونا چاہیئے۔ اسی عنوان کے تحت پسندیدہ مضامین نقل بھی کئے جاتے ہیں۔ امید ہے کہ یہ ضروری سلسلہ جاری رہے گا اور اہل ذوق میں وقعت کی نظر سے دیکھا جائے گا۔"

"ادبی دنیا" عام طور پر ۸۰ صفحات پر شائع ہوتا ہے لیکن ہماری بڑھتی ہوئی ضروریات کے پیش نظر پچھلے مہینے سے اس کی ضخامت ۸۸ صفحات کر دی گئی تھی۔ ہمارا ارادہ تھا کہ "دنیائے ادب" اور "نقد و نظر" دونوں عنوانات کے ماتحت صفحات کی تعداد مستقل طور پر بڑھا دی جائے چنانچہ گذشتہ ماہ کا حصۂ "دنیائے ادب" خاص طور پر مفصل تھا۔ لیکن کسے خبر تھی کہ جنگ عظیم یکبیک چھڑ جائے گی اور کاغذ گراں ہو جائے گا۔ کاغذ کی گرانی کا اثر اخبارات و رسائل بری طرح محسوس کر رہے ہیں۔ اگرچہ ڈمی کاغذ جس پر ادبی دنیا کے مضامین چھپتے ہیں بہت زیادہ گراں نہیں ہوا لیکن سرورق اور تصاویر کے کاغذ کی قیمت تقریباً دگنی ہو گئی ہے۔ اس زائد خرچ کے باعث ہم نے صفحات کی موجودہ تعداد کو بڑھانے کا ارادہ فی الحال ملتوی کر دیا ہے۔ لیکن مضامین کی کثرت اور مستقل عنوانات کی جدید ضروریات کو مدنظر رکھ کر فیصلہ کیا ہے کہ رسالے کی کتابت نسبتاً باریک کر دی جائے۔ چنانچہ نومبر سے ادبی دنیا کی لکھائی قدرے باریک ہو جائے گی۔

ہمیں رسالہ زمانہ کے گذشتہ نمبر سے یہ معلوم کر کے دلی رنج ہوا کہ منشی دیا نرائن صاحب نگم ایڈیٹر زمانہ کی اہلیہ محترمہ نے اس دار فانی سے کوچ کیا۔ مرحومہ بہت قابل، ہمدرد اور سلیقہ شعار خاتون تھیں اور بقول جناب نگم انہوں نے گذشتہ پینتیس چالیس برس میں اردو زبان کی جو خدمت کی وہ بہت کچھ اُن کی رفیق زندگی کی دلسوزی اور اعانت کی مرہون ہے۔ ہماری دعا ہے کہ مرنے والی جنت الفردوس میں جگہ پائیں۔

اس دفعہ کے افسانوں اور ڈراموں میں محترمہ عصمت چغتائی کا ڈراما "انتخاب" خاص طور پر قابل توجہ ہے۔ عصمت صاحبہ ادبی دنیا کی بزم میں پہلی بار شامل ہو رہی ہیں۔ "انتخاب" کا مکالمہ نہایت چست اور بے ساختہ ہے اور پلاٹ میں بھی ایک لطیف ندرت اور جدت پائی جاتی ہے۔ ہم تہذیب و معاشرت کے جس درمیانی اور بے قرار

دور میں سے گذر رہے ہیں۔ وہ ایسی ہی ڈرامائی صورتوں اور کیفیتوں سے معمور ہے۔ اگرچہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ہماری موجودہ معاشرت میں اعلیٰ درجے کے افسانوی یا ڈرامائی مواد کی جستجو شرمندہ حاصل نہیں ہوتی۔ کیونکہ سوسائٹی میں عورت کا وجود گویا عنقا ہے۔ لیکن ایک باریک نظر آرٹسٹ کے لئے ہماری اس نیم آزاد معاشرت کی کم آمیزیوں میں بھی بہت سے ڈرامائی سانحے پوشیدہ ہیں عصمت چغتائی نے اس کیفیت سے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔

"ڈراما کا رومانی شاعر" جائنٹ ایڈیٹر کے قلم سے ایک بسیط اور دلکش مقالہ ہے اور ان کے مخصوص انداز نظر اور طرز تحریر کا ایک کامیاب نمونہ۔ امید ہے کہ اس سلسلے کے دیگر مضامین کی طرح اسے بھی دلچسپی سے پڑھا جائے گا۔

سید مسیح الزمان صاحب نے اردو کی دو یادگار کتابوں "فسانۂ عجائب اور باغ و بہار" پر ایک نہایت دلچسپ تبصرہ کیا ہے۔ اور اس میں چند نئی باتیں بھی کہی ہیں۔ یہ مضمون اس دفعہ کا انعامی مضمون قرار پایا ہے۔

ادبی دنیا کا آئندہ سالنامہ کاغذ کی حوصلہ شکن گرانی کے باوجود اپنے روایتی انداز میں دسمبر کے وسط میں شائع ہوگا۔ ہمارے قلمی معاونین کو اپنے مضامین جلد سے جلد بھیج دینے چاہئیں تاکہ کتابت اور صحت اطمینان اور فراغت سے کی جا سکے۔ تصاویر کا انتخاب شروع ہو چکا ہے اور ہم اپنے ناظرین کو اتنا یقین دلا سکتے ہیں کہ اس دفعہ کی تصاویر انشاء اللہ اپنی نظیر آپ ہی ہوں گی۔

صلاح الدین احمد

اس نمبر کے انعامی مضامین

انتخاب (ڈراما)	دس روپے
اردو کی دو یادگار کتابیں (مضمون)	دس روپے

شہاب ثاقب

ستارہ آسماں سے ٹوٹ کر سوئے زمیں آیا
وطن کو چھوڑ کر گویا فلک کا ہمنشیں آیا

اسے بے تابیٔ الفت یہاں پر کھینچ لائی تھی
جہانِ رنگ و بو کی ہر ادا میں دلربائی تھی

وہ کچھ نالاں رہا کرتا تھا اُس خاموش بستی سے
اسے خود عار سی آنے لگی تھی اپنی ہستی سے

فلک اس کی نگاہوں میں سراسر تنگ داماں تھا
جہاں کا نور سے معمور ہونا حشر ساماں تھا

وہ اُترا اور فضا کی وسعتوں میں کھو گیا آخر!
خموشی سے زمیں کی شورشوں میں سو گیا آخر!

منیب الرحمٰن

آئینۂ عالم

ہیگ کا قصرِ امن

پورے چالیس سال گذرے کہ زارِ روس کے ایما پر ۱۸۹۹ء میں ہالینڈ کے شہر ہیگ میں پہلی بین الاقوامی صلح کانفرنس منعقد ہوئی بڑی بڑی قوموں کے نمائندے ایک شاہی کٹیا میں جو گھنے جنگل میں واقع تھی جمع ہوئے اور انہوں نے امن عالم کے مسئلے پر وہ دلچسپ باتیں شروع کیں جو کوئی اثر دکھائے بغیر آج تک جاری ہیں۔ کچھ سال بعد مشہور امریکن دولت مند اینڈریو کارنیگی کی فیاضی کی بدولت اُس کٹیا نے ایک نہایت عظیم الشان محل کی صورت اختیار کرلی اور اس میں تمام قوموں کی طرف سے بڑے بڑے قیمتی تحفے اور نادر اشیا جمع ہونے لگیں۔

اب کہ دنیا ایک خوفناک جنگ کے شعلوں میں لپٹتی جارہی ہے۔ یہ شانتی محل جو اپنے خوبصورت باغیچوں میں گھرا کھڑا ہے۔ بظاہر نہایت وقار سے دنیا کو امن کا پیغام دے رہا ہے۔ مگر اس کے نقش و نگار پر ایک عجیب مضحکہ خیز کیفیت رقص کررہی ہے۔ ہیگ کا شہر بجائے خود اس قسم کے محل کے لئے ایک نہایت موزوں مقام ہے جس طرف دیکھو شاندار مگر متین انداز کی عمارات نہایت تمکنت سے کھڑی ہیں۔ بازاروں میں کسی قسم کا بے جا شور و غل نہیں ہے۔ اور ہر چیز پر خاموشی اور امن کا ایک غیر معمولی اثر پایا جاتا ہے۔ ایسے شہر میں بلاؤں اور فسادات کا خیال تک نہیں آتا بلکہ وہ گرم اور پرجوش مناظرے بھی جو امن کے محل میں آئے دن ہوتے رہتے ہیں، اس فضا میں کچھ ناموزوں معلوم ہوتے ہیں۔

آپ کو محل کی سیر کے دوران میں ایسی ایسی بے نظیر چیزیں دکھائی دیتی ہیں کہ آپ یہ سمجھنے لگ جاتے ہیں کہ شاید دنیا کی مختلف قومیں جنہوں نے یہ نادر تحائف امن کی بارگاہ میں پیش کئے ہیں۔ واقعی صلح اور امن کی پرستار ہیں۔ اندرونی صحن میں جس کے چاروں طرف بالاخانے ہیں اور جو خود ایک بہت لمبے چوڑے چبوترے پر بنا ہے سنگ سفید اور سنگ سیاہ کے دو لاجواب فوارے عین ایک دوسرے کے سامنے بنائے گئے ہیں۔ ان میں سے ایک اٹلی اور دوسرا روس کا تحفہ ہے اور ان کی بے عیب سفیدی اور سیاہی برف اور گہری روشنائی کا دلکش مقابلہ پیش کرتی ہے۔

یہاں تقریباً ہر روز زائرین سیاحوں کے گروہ کے گروہ ہفت زبان رہنماؤں کے ساتھ آتے ہیں اور چمکتی ہوئی گیلریوں میں سے گذرتے ہوئے مختلف کمروں میں ان نادر اشیا کا ملاحظہ کرتے ہیں جو گذشتہ چالیس برس سے دنیا کے کونے کونے سے یہاں آکر جمع ہورہی ہیں۔ دروازوں پر بہت بڑے بڑے مشرقی گلدان جوڑے جوڑے پایوں پر رکھے ہیں اور ان پر طرح طرح کے دلفریب نقش و نگار دیکھنے والے کو محو حیرت کردیتے ہیں۔ ایک دیوار پر ایک بہت بڑا منقش چینی پردہ آویزاں ہے جس پر قد آدم تصویریں سنہری تاروں سے بنائی گئی ہیں اس پردے نے ایک پوری دیوار کو ڈھانپ رکھا ہے اور بیان کیا جاتا ہے کہ یہ پچاس ہنرمند چینی عورتوں کی شب و روز محنت سے سات سال میں تیار ہوا تھا۔ یہ ہیں امن و امان اور اُس سے پیدا ہونے والے صنعتی کمال کے فنی نتائج۔

رفیع الشان کونسل ہال میں سورج کی روشنی کو بلند و بالا

کھڑکیوں کے رنگین شیشوں کے ذریعے داخل کیا جاتا ہے۔ یہ شیشے برطانیہ کا تحفہ ہیں۔ ہال کے دوسری جانب ایک بہت بڑا خالی فریم لٹک رہا ہے۔ اور اُس عجوبۂ روزگار تصویر کا انتظار کر رہا ہے۔ جو گذشتہ جنگِ عظیم سے پہلے فرانس نے پیش کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ اس وعدے کے عین بعد جنگ آ گئی اور جنگ کے بعد اب تک فرانس بہت مصروف رہا ہے۔

قصرِ امن کا شاید سب سے دلچسپ عجوبہ پینتالیس لاکھ روپے کا وہ چیک ہے جو لوہے کے بادشاہ کارنیگی نے اس کی تعمیر کے لئے عطا کیا تھا۔ اس چیک کے بغیر یہ محل بنتا ہی کیونکر! اسے ایک شیشے کے کیس میں رکھا گیا ہے اور سیاح ایک دوسرے کو ہٹا ہٹا کر اور اپنی گردنیں اونچی کر کر کے کاغذ کے اس قیمتی ٹکڑے کی زیارت کرتے ہیں۔ گویا دولت اور امن دونوں کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہیں۔

برازیل نے لکڑی کے کام کے ایسے بہت سے نادر تحائف ارسال کئے ہیں جن میں نقاشی اور آرائشی کاٹ کا فن بدرجۂ کمال پایا جاتا ہے۔ قصر کے عظیم الشان کتب خانے میں بین الاقوامی قانون کی ہزاروں ضخیم کتابیں نہایت خوبصورت مطلّا چرمی جلدوں میں بندھی ہوئی صندل، اخروٹ، شاہ بلوط اور مہاگنی کی شاندار چوبی الماریوں میں سج رہی ہیں اور کتب خانے کی نگراں لڑکیاں سفید بُراق لباس پہنے ہوئے آپ کو ان کتابوں کا ملاحظہ کرواتی ہیں۔ کتب خانے میں بین الاقوامی قوانین کی کتابوں کا بہترین مجموعہ موجود ہے اور ان سے ان اہم معاملات اور مقدمات کا فیصلہ کرنے میں مدد لی جاتی ہے۔ جو دنیا کے مختلف ملک وقتاً فوقتاً ہیگ کی بین الاقوامی عدالت عالیہ میں فیصلے کے لئے پیش کرتے ہیں۔ قصرِ امن کے عجائب میں سے شاید سب سے زیادہ متاثر کرنے والا عجوبہ سیح اندیز کا وہ بلند و بالا مجسمہ ہے جو داخلے کے ہال میں قصر کی شان و شوکت کی طرف سے پیٹھ پھیرے کھڑا ہے۔ یہ اس عظیم الشان مجسمے کا مثنیٰ ہے جو توپ کے گولوں کی دھات سے ڈھالا گیا تھا اور جنوبی امریکہ میں چلی اور ارجنٹائن کی پہاڑی سرحد پر ایک پائیدار صلح کی یادگار میں قائم کیا گیا تھا۔
یہ صلح ان دونوں ممالک میں ایک نہایت خونریز جنگ کے بعد ہوئی تھی اور حسنِ اتفاق سے آج تک قائم ہے۔

ہیگ کا قصرِ امن دنیا کے لئے خواہشِ امن کی ایک آرزوئے مجسّم ہے، ایک ایسی آرزو جس نے اب تک حقیقت کا لباس نہیں پہنا۔ امن ابھی ایک سایہ گریزاں ہے اور بس۔ بہت دیر گذری جنگ کرمیلک کے آغاز سے ذرا پہلے ایک مشہور برطانوی مدبّر نے امن اور صلح کی وکالت کرتے ہوئے کہا تھا "موت کا فرشتہ ہمارے قریب منڈلا رہا ہے۔ ہمیں اس کے پروں کی پھڑپھڑاہٹ تک سنائی دے رہی ہے"۔ آج بھی وہی کیفیت طاری ہے۔ اگرچہ پروں کی پھڑپھڑاہٹ مسلّح ہوائی طیاروں کی خوفناک بھنبھناہٹ میں تبدیل ہو گئی ہے۔ لیکن امن کا فرشتہ کہاں ہے۔ وہ آج پہلے سے بھی زیادہ دور افق کے سحابی دھندلکے میں غائب ہے۔

ایک امریکن کروڑپتی نے امن کے نام پر یہ رفیع الشان محل بنا کر کھڑا کر دیا۔ وہ غیر اہم صلح جُو قومیں جنہیں اس جہانِ خراب میں کوئی پوچھتا نہیں۔ اس محل کی تزئین و آرائش میں شوق سے حصہ لیتی ہیں۔ اس کی مرمت اور خبرگیری کا باقاعدہ اہتمام کیا جاتا ہے۔ اس کے وسیع ہال زائرین کے لئے چشم براہ رہتے ہیں۔ لیکن امن کا فرشتہ! ــــ وہ کہاں ہے؟ میں نے اُسے راہگذارِ کارنیگی پر کہیں خراماں نہیں دیکھا۔ شاید وہ ہماری دنیا سے دُور، کسی اور دنیا میں کسی اور راہگذار پر محوِ خرام ہے۔

(آر۔ ایم۔ فاکس)

صلاح الدین احمد

یہودیوں کو صبر کی تلقین

پروفیسر البرٹ آئن سٹائن نے مندرجہ ذیل خطبہ اپنے گھر واقع پرنسٹن سے جیوئش نیشنل ورکرس الائنس کے لئے براڈ کاسٹ کیا۔

"میں نہایت مسرت کے ساتھ اس قومی اجتماع کا خیر مقدم کرتا ہوں اور اس موقع پر ان مصائب و آلام کے پیش نظر جو ہمیں ہر طرف سے گھیرے ہوئے ہیں چند الفاظ کہنا ضروری سمجھتا ہوں۔

انگلستان نے کسی حد تک اپنے قابلِ احترام عہد و پیمان کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ یہ عہد و پیمان انگلستان نے ہمارے ساتھ ان نازک لمحات میں کئے تھے۔ جب اسے تباہی اور بربادی کے امکانات نے ہر طرف سے گھیر رکھا تھا۔ لیکن اس کے موجودہ طرز عمل کے لئے بھی ویسے ہی نازک لمحات ذمہ دار ہیں۔

"یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ قوموں کی زندگی کا انحصار خصوصاً ان کے برے ایام میں صرف ایک بات پر ہوتا ہے اور وہ بات ان کی اپنی قوت بازو پر بھروسہ اور استقلال ہے۔ ہماری قوم اپنے ان اوصاف پر فخر کرنے میں حق بجانب ہے۔ کیونکہ قوم یہود نے فلسطین میں اپنے نوآبادکاروں کے ذریعے سے جو قربانیاں دی ہیں اور جس بے غرضی کے ساتھ دوسرے ملکوں کے یہودیوں نے انہیں رضاکارانہ امداد بہم پہنچائی ہے۔ وہ ان کی غیر معمولی تعمیری قوت کا ثبوت ہیں۔

"مجھے وہ وقت اچھی طرح یاد ہے جب ہماری قوم کے بڑے بڑے جغادری اور پھونک پھونک کر قدم رکھنے والے مدبر کہا کرتے تھے کہ اس بنجر اور غیر آباد علاقے پر کسی قسم کی محنت کرنا یا اس سے امیدیں وابستہ کرنا بے سود ہے۔ آج اسی بنجر علاقے کے بڑے بڑے قطعے بہشت نما باغوں میں تبدیل ہو چکے ہیں اور ہمارے قریباً پانچ لاکھ بھائی جن میں ایک خاصی تعداد ان نا امید جغادری مخالفوں اور ان کی اولاد کی بھی شامل ہے اپنی مادرِ وطن کے آغوش میں نئے سرے سے اکٹھے ہو گئے ہیں۔

"اب چند الفاظ مجھے انگلستان کے متعلق بھی کہنے ہیں۔ ان کے متعلق تمہاری تلخ کامی بجا سہی لیکن یاد رکھو کہ انگلستان کے مخالف ہمارے بدترین دشمن ہیں اور باوجود تمام شکایات کے انگلستان کی طاقت کو بحال رکھنا ہمارا اولین فرض ہے۔

"اور پھر یہ بھی سوچو کہ دنیائے عرب کی بھلائی بھی اسی میں ہے کہ انگلستان آمری ملکوں کی فاتحانہ ہوس کاری سے محفوظ رہے۔ اس اہم نکتے کا احساس اب جلدی عربوں کو بھی ہونے والا ہے۔

"ہمیں اس بات کی کوشش کرنی چاہئے کہ ہم لوگ یاس اور تلخ کامی کے بجائے عقل و خرد سے کام لیں۔ عربوں کی موجودہ کشمکش خودکشی کے مترادف ہے جس میں غیر ملکی اثر کارفرما ہے۔ لیکن حقائق کی منطق جلد ہی ان پر واضح ہو جائے گی خصوصاً اس وقت جب ہمیں اس بات کا احساس ہو جائے گا کہ ہماری بھلائی بھی اسی میں ہے کہ ہم عربوں کے ساتھ ایماندارانہ اتحاد و عمل کا برتاؤ کریں۔

"اس سے بڑی مصیبت اور کوئی نہیں ہے کہ عربوں اور یہودیوں میں ایک مستقل نااتفاقی قائم رہے۔ باوجود اس برے سلوک کے جو ہمارے ساتھ اب تک روا رکھا گیا ہے ہمیں عربوں کے ساتھ ایک منصفانہ اور مستقل صلح کی کوشش کرنی چاہئے۔

"اور ساتھ ہی یہ بھی خیال رہے کہ ہمیں اپنی قسمت کے فیصلے کے لئے ہر وقت انگلستان کی طرف نظریں نہیں جمائے رکھنا چاہئے بلکہ واقعات سے بے پروا ہو کر ہمیں اپنا کام دگنے جوش اور نہایت خاموشی کے ساتھ جاری رکھنا چاہئے۔ ہم جانتے ہیں کہ مدافعت کی کمزوری کا راستہ بھی تباہی و بربادی کی اسی منزل پر لے جاتا ہے۔ جس پر ایک فاتح اور جنگ جو قوم پہنچتی ہے لیکن ہم دوسروں کو اس سچائی کا قائل ہونے پر مجبور نہیں کر سکتے۔ ہمارا کام صرف اتنا ہے کہ ہم اپنی جگہ پر استقلال کے ساتھ جمے رہیں اور ایک لمحے کے لئے بھی ہمت نہ ہاریں۔

"یہی جذبۂ ایمان و یقین ہمارے آباؤ اجداد کو بدترین مصائب میں کامیاب و کامران کرتا رہا ہے یہاں تک کہ ہماری تعمیری قوت ہزارہا سال کے دوران میں انسانی تہذیب و تمدن کو ترقی دینے میں بہت حد تک ممد و معاون ہوئی ہے۔ ہمیں آج بھی اسی ہمت اور استقلال کا ثبوت دینا چاہئے۔ تاکہ ہماری اولاد بھی ہمارے متعلق اسی طرح فخر کر سکے۔"

مظفر احمد

دُعا

دلِ تاریک کو پُر نُور کردے! مری رگ رگ میں برقِ طور بھر دے!

مجھے دے شام کے خاموش نغمے مجھے معصوم انوارِ سحر دے!

جو تجھ کو دیکھ لے ہر ایک شے میں مجھے اپنے کرم سے وہ نظر دے!

جلا دے جو خس و خاشاکِ باطل مری آہوں کو وہ برق و شرر دے!

فلک کے ہر ستم پر مسکرا دوں مجھے وہ ہمّتِ قلب و جگر دے!

خزانے میں ترے لاکھوں گہر ہیں مجھے عشق و محبّت کا گہر دے!

مجھے اپنے خُمستانِ کرم سے مئے عرفاں کے دو اک جام بھر دے!

اثر کی التجا تجھ سے یہی ہے

دعائے صبحگاہی میں اثر دے!

اثر صہبائی

روما کا رومانی شاعر

کیٹولس

جولیس سیزر کی شوکت اور سسرو کی خطابت کو ایک دنیا جانتی ہے۔ لیکن قدیم روما کے انہی دو بڑے آدمیوں کے عہد میں کیٹولس کی شعریت بھی وہاں کی معاشرت کا لازمہ تھی۔ ان ہمنوں کے باہمی تعلق کو ظاہر کرنے کے لئے کیٹولس ہی کا ایک انتخاب دیا جا سکتا ہے۔ اپنے کلام میں وہ ایک جگہ سسرو کے متعلق لکھتا ہے:-

"روما کے اُن تمام عالم سپوتوں میں سے،
"جو اس وقت ہیں، جو پہلے ہو چکے اور جو آیندہ ہوں گے،
"کوئی بھی تیرا مقابلہ نہیں کر سکتا۔
"اُس لئے میں جو ایک معمولی غزل خواں ہوں۔
"تجھے کہ وکلا میں بہترین ہے۔
"تیرے مرتبے کے مطابق دھنباد کہتا ہوں"۔

لیکن سیزر کے بارے میں اُس کی رائے اور طرح کی تھی:-

"اے سیزر میں تیری صورت بھی نہیں دیکھنا چاہتا،
"مجھے اس کی پروا ہی نہیں کہ تو گورا ہے یا کالا،
"کیونکہ مجھے تیری خوشنودی منظور نہیں ہے"۔

ہمیں ان راؤں سے ایک قسم کی ثانوی دلچسپی ہی ہو سکتی ہے کیونکہ اگرچہ باقی رومن شعرا کی طرح کیٹولس نے بھی ہنگامی شاعری سے احتراز نہ کیا، اور سسرو کی ہجو یہ تلخی کی مثالیں لاطینی شاعری میں پیش کیں مگر اس کی ادبی حیثیت کو سمجھنے کے لئے اس کی عشقیہ شاعری ہی ہمارا محل نظر ہوگی۔ البتہ اُس کی عشقیہ شاعری کو دیکھنے سے پہلے ہمیں چند اور باتوں کو ایک سرسری نظر سے معلوم کر لینا چاہئے۔

جب اہلِ روما نے ۲۵۰ قبل مسیح میں کارتھیج والوں پر قابو پا لیا، تو وہ یونانی ادب کے پختہ نمونوں کی مدد سے اپنے قومی ادب کی ساخت کی طرف رجوع ہوئے۔ رومن ادب کا ابتدائی زمانہ (۲۵۰ سے ۱۰۰ ق م) ایک خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اسی زمانے میں رزمیہ اور المیہ صنفوں میں الفاظ اور مختلف لسانی صورتوں کی نشوونما ہوئی، اور اور اسی سے روما کی بلند شاعری کی تعمیر ہو سکی۔

گویا جب تک اہلِ روما کا تعلق یونان کے جوہر خداداد سے نہ ہوا اُن کا اپنا کوئی علم ادب ہی نہ تھا۔ یونانی اثرات کے بغیر اُن کا کوئی ادب پیدا بھی نہ ہو سکتا تھا اور اگر ہوتا بھی تو اُس کی حیثیت اس ادب سے بہت مختلف ہوتی جو اب ہمارے سامنے ہے۔ کیونکہ اہلِ روما نوعِ انسانی کا ایک ایسا گروہ تھے جن کے دلوں میں حُب الوطنی کا احساس تھا، جن کے سینوں میں بہادری کا جوہر چمک رہا تھا اور جو اپنے زمانے میں حکومت اور قانونی نظام کے بہترین طریقے جانتے تھے۔ لیکن انہیں اپنی زندگی اور اس کے نشوونما کے اظہار کے لئے نظم و نثر کی ضرورت نہ تھی۔ علم ادب سے اس بے پروائی کا سبب لاطینی نسل کی انفرادی خصوصیات ہیں۔

یونانی تخیل پرست اور ذہانت کے دیوتھے۔ نظری باتوں میں انہیں حد درجہ دلچسپی تھی لیکن لاطینیوں کو عمل مرغوب تھا عام ضروریاتِ زندگی کے علاوہ جنگیں، ملک گیری، حکومت اور قوانین و ضوابط ہی اُن کی توجہ کو اس درجہ اپنی طرف لگائے رکھتے تھے کہ انہیں گویا نازک خیالی کی فرصت ہی نہ ملتی تھی۔ وہ زندگی کی تند و تلخ حقیقتوں میں ہی

اُلجھے ہوئے تھے اور اُن کے ماحول اور ضروریاتِ زندگی کے لحاظ سے اگر ان میں کسی طرح کی شاعرانہ اہلیت تھی بھی تو اُس پہ روزمرّہ کے واقعات کا ایک پردہ پڑا ہوا تھا۔

لیکن اس کے باوجود، غیر ملکی تاثرات کے ہوتے ہوئے بھی، اُن کی اپنی خصوصیات شروع سے آخر تک نمایاں اور ممتاز رہیں کیونکہ جس طرح ایک فرد کی زندگی ہوتی ہے۔ اُسی طرح ایک قوم کی زندگی بھی ہوتی ہے۔ ایک فرد ہی کی طرح ایک قوم کی بھی سیرت ہوتی ہے۔ اُس میں جوشِ حیات اور ایک روح ہوتی ہے۔ اسی وجہ سے یونانی تاثرات کی اندھا دھند درآمد کے باوجود رومن خصائص دب نہ سکے۔ رومن محض اثر لینے والے ڈھیلے ڈھالے لوگ نہ تھے۔ ان کا مردانہ زور اور قوّت غیر ملکی اجزا کو اپنے ڈھب پر ڈھال لیتا تھا۔ کسی سے کوئی چیز مستعار لینے کا اُن کا اپنا ایک علیحدہ ہی انداز تھا۔ وہ غیر سے لی ہوئی چیز پر بھی اپنا ایک نقش ثبت کر دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ روما کی سنگ تراشی کے نمونے یونانی سنگ تراشی کے نمونوں سے یکسانی کے باوجود ملتے جلتے نہیں ہیں۔ اس خصوصیت میں رومن لوگ پنجابیوں سے مماثلت رکھتے تھے۔

رومن سیرت جس قدر بدلتی تھی اُسی قدر اُس کی انفرادی خصوصیات نمایاں ہو جاتی تھیں۔ رومن آرٹ اور رومن ادب میں یہ خصوصیت قدم قدم پر ظاہر ہوتی ہے۔ اس لئے رومن ادب سے پہلے رومن سیرت اور اس کے ماحول اور اُس کی فضائے بعید کو دیکھنا چاہیئے۔

روما کا ادب عوام الناس کی اپیل سے اس قدر مبرّا تھا کہ اُسے دیکھ کر خیال ہوتا ہے کہ اس میں عام لوگوں کی زندگی کی کوئی جھلک ہی نہ ہوگی۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ رومن ادب میں صرف بڑے لوگوں اور اُمرا ہی کو بار ہے۔ پھر بھی رومن ادب محض پیٹ بھرے، مزے سے زندگی گذارنے والوں ہی کا کھلونا نہ تھا۔ اس میں حقیقت کی کمی نہ تھی۔ یہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کو ظاہر کرتا تھا۔ اور اس سے سماج اور حکومت کے مفاد و مقاصد کا پورا پورا اظہار ہوتا تھا۔

تنظیم روما کی روح کا دوسرا نام تھا۔ روما کے شہری خصائص کی بنیاد گھریلو حلقے میں رکھی گئی تھی۔ گھر بار گویا ایک چھوٹی سی حکومت ہوتا تھا اور گرہستی کے اتحاد کا بہت شدید اور گہرا احساس کیا جاتا تھا۔

گھر بار، سماج اور روزمرّہ کی زندگی کے علاوہ بھی رومن ذہن کی اس گہری، عملی خصوصیّتِ جبلّی کی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ یونانی تخیّل پسند تھے اور ان کا ادب بھی نظری باتوں ہی کا مظہر رہا، رومن عمل پسند تھے اسی لئے ان کے ادب سے اُن کے زمانے کے حالات اور واقعات کا بہت سا علم ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک رومن اور باتوں کی طرح علم کو بھی اپنے عملی زاویہ نظر ہی سے دیکھتا تھا۔ ایتھنز کے برعکس روم میں علم کو علم کے طور پر حاصل کرنے کا بہت ہی کم رجحان تھا۔ یونان کی اندھی، نہ بجھنے والی پیاس کا وہاں نام بھی نہ تھا۔

کسی قوم کی سیرت کو جانچنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس بات پر غور کیا جائے کہ اُن کے کون کون سے خیالات اور اصول تہذیب و تمدن کے آئندہ زمانوں میں بھی زندہ رہے۔ کوئی قوم مستقبل کے لئے علم و فن کا جو سرمایہ چھوڑ جاتی ہے، وہی اس کی سیرت کے شدید ترین اجزا کا اظہار کرتا ہے۔ یونان نے اپنے فن کارانہ خیالات و احساسات کے لحاظ سے بیشتر حُسن کے تخیّل کا ورثہ چھوڑا۔ اور روما نے اپنے عملی رجحانات کے لحاظ سے تنظیم کا ورثہ چھوڑا۔ رومنوں نے فن کار کی حیثیت سے نہیں بلکہ حاکموں کی حیثیت سے اس دنیا میں اپنی قسمت کی بلندی کو حاصل کیا۔ جب تک اُن کی مملکت وسیع نہ ہو لی اُن میں آرٹ اور ادب کے لئے کسی طرح کا فطری ذوق پیدا ہی نہیں ہوا۔

زندگی کے ایک اور پہلو میں بھی اہلِ روما کی عملی ذہنیت کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے یعنی اُن کا مذہب بھی ان کے اسی رجحان کا اظہار کر رہا ہے۔ مذہب ایک ایسی چیز ہے کہ قوموں کی ابتدائی نشو و نما میں ہی یہ ادب میں داخل ہو کر اس پر چھا جاتا ہے۔ اور مصنف یا شاعر اس کے ماحول کا ایک جزو بن جاتا ہے۔ رومن مذہب بھی ابتدا میں روحانی ہونے کی بجائے عملی تھا۔ اس مذہب کی بنیاد ابتدائی وحشی اقوام کے سحر و ساحری پر ہے۔ قدرت کی طاقتیں، روحوں کی پوجا، خواب، علم غیب اور جادو ٹونا — ان ابتدائی اعتقادات میں لپٹے لپٹائے رومن مذہب اس کوشش میں رہا کہ وہ کائنات کے معمّے کو انسان کے مفاد کی بجا آوری کے لئے حل کرے۔ پہلی صدی عیسوی کے زمانے تک جو وہم پرستی اور

ایک سے ایک نہ ملنے والے خیالات اور تصورات روما میں ظاہر ہو گئے تھے ان کے مقابلے میں یہ مذہب اپنے دیہی ماخذ اور سادگی کے لحاظ سے ایک نمایاں تضاد رکھتا ہے۔

اہلِ روما نے جن دیوتاؤں کا تصور باندھا۔ وہ ناموں اور شکلوں کے لحاظ سے اکثر مبہم ہی رہے اور یہ نکتہ قابلِ غور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مدتیں گذر گئیں اور لاطینی دیوتاؤں کے نہ بت بنے نہ مندر۔ ایک پجاری بعض اوقات صرف اسی قدر جانتا تھا کہ وہ ایک طاقت سے مخاطب ہے اور اُس طاقت کا نام اور نوعیت اُسے معلوم ہی نہیں ہوتے تھے۔

رومن مذہب کے اصولوں میں جن اخلاقی مقاصد کو پیشِ نظر رکھا گیا تھا۔ وہ بھی کلیتہً عملی تھے۔ وہ اصول اس بات کی ضمانت تھے کہ سماجی نظام پختہ اور محکم و استوار رہے گا۔ رومن مذہب کے مطابق دیوتا انسانوں سے ایسے فرائض کی بجا آوری کے متوقع ہوتے تھے۔ جن پر گھریلو اور اجتماعی زندگی کا دارو مدار تھا۔ یہ اصول ایسے تھے جو ایک گھر میں ایک باپ مقرر کرتا ہے یا ایک قبیلے میں اُس کا سردار مقرر کرتا ہے ۔۔۔ تابعداری، باپ دادا اور پردادا کی عزت، حاکم کی عزت اور قوانینِ ملک کی حرمت اور پاس، بہادری، ایمانِ محکم، شرافت اور تندہی۔ اس رجحان کی وضاحت کے لئے ایک اور نکتہ بھی لکھا جاسکتا ہے کہ اہلِ روما عموماً کسی وصف پر ہی دیوتا کا تصور قائم کر لیتے تھے۔ مثلاً تابعداری کا دیوتا یا گھریلو امن و راحت اور ہم آہنگی کا دیوتا، یہی رجحان ہندوستان میں آریاؤں کا بھی رہا ہے۔ کیونکہ ان کی گھریلو زندگی اور طریقِ حکومت بھی باپ کی برتری پر قائم تھا۔

یہی قومی سیرت جس کا یہاں کئی نقاطِ نظر سے سرسری جائزہ لیا گیا ہے۔ روما کے تمام تخلیقی کاموں میں جھلکتی ہے جو حال گھر کا تھا، وہی حکومت کا تھا، وہی حال مذہب کا تھا، وہی فنِ تعمیر اور انجنیئرنگ کا تھا اور وہی حال تحریر کا تھا۔ ہر جگہ ایک ہی سیرت نمایاں تھی عملی، باوقار۔ رومن ادب میں بھی وہی نقوش ہیں جو رومن قانون میں تھے، اُن کی بنائی ہوئی سڑکوں میں تھے اور ان کی عمارتوں کی محرابوں میں تھے۔ وہی ٹھوس انداز، وہی ایک پختہ مقصد، وہی فطری باقاعدگی۔ رومن ادب میں بھی ان کی اور تخلیقات کی مانند ایک ایسا استدلال اور وقار ہے جسے آج تک سب ملک اور قومیں تسلیم کرتی رہی ہیں۔

اور اب اُن کی شاعری کے متعلق ذرا زیادہ گہری باتیں۔

روما کی غزلیہ شاعری زیادہ تر واقعاتی ہے یعنی اس کا محرک عموماً کوئی ایسا واقعہ ہوتا ہے جس سے شاعر کو غور و تفکر یا اظہار کے لئے کوئی موضوع ہاتھ آجاتا ہے اور وہ اپنے احساس یا خیال کو گیت یا نظم کی مناسب صورت دے دیتا ہے۔ لیکن ہر قسم کے واقعات گیت یا غزلیہ شاعری کے محرک نہیں ہوتے بعض باتیں ایسی بھی ہوجاتی ہیں جو شاعر کو قطعہ، ہجو یا بیانیہ نظم پر اُکساتی ہیں۔

یہ اشارہ تو پہلے بھی ہوچکا کہ روما کی شاعری تمام تر یونانی شاعری کی خوشہ چین ہے۔ اور غزلیہ شاعری کی بحروں کے لئے بھی روما کے شاعر یونانی شعراء کے مرہونِ منت ہیں۔ اگر یونانی تخلیقاتِ شعری کی رہنمائی نہ ہوتی تو گویا کیٹولس اور ہوریس کے نغمے کبھی نہ لکھے جاتے لیکن یونانی بحروں کے اختیار کرنے سے ہم روما کے شعراء پر کسی قسم کی ادبی چوری کا الزام نہیں لگا سکتے۔ کیونکہ اس کی مثال بالکل ویسی ہے جیسے اردو میں بحروں کو فارسی سے لیا گیا۔ بلکہ اردو میں تو شاعرانہ روایات بھی اہلِ فارس ہی کی ممنون رہیں "تاوقتیکہ اجتہاد کرنے والے شاعروں اور ادیبوں نے مقامی رنگ اور خالص ہندوستانی ماحول کی ترجمانی کی حمایت میں عملی قدم نہ اٹھائے۔

اگرچہ روما کے شعراء اکثر یونانی نظموں کے ترجمے یا اُن کی پیروی کرتے ہیں لیکن اس کے باوجود روما کی غزلیہ شاعری میں ایک ایسی نمایاں انفرادیت ہے جس کی بنا پر ہم اسے خالصتاً رومن ذہانت کا ایک زوردار اظہار کہہ سکتے ہیں کیٹولس ہی کو لیجئے اُس کی ایک نظم سیفو ہی کی ایک نظم کا چربہ ہے۔ لیکن اس کے باوجود مغربی نقادوں کی نظر میں بہت کم ایسے شاعر ہیں جو اس کے شعر کے حسن اور احساس کی گہرائی کے مدِمقابل کہے جاسکیں۔

یونان کی غزلیہ شاعری کی دو بڑی قسمیں تھیں۔ ایک شخصی یا ذاتی جس میں شاعر کے اپنے خیالات اور احساسات کا اظہار محبت کے گیتوں کی صورت میں ہوتا تھا یا مےخواری کے گیتوں کی صورت میں، جن میں زندگی کے متعلق اُس کے اپنے اندازِ نظر کی وضاحت ہوتی تھی۔ دوسرے اجتماعی گیت، یہ گیت عام دلچسپی کے کسی امتیازی واقعے کو دھوم دھام سے منانے اور گانے اور ناچنے والوں کے ایک گروہ کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کرنے کو لکھے جاتے تھے۔

اور یونان اور روما کی شاعری میں سب سے بڑا فرق بھی شاید یہی ہے کہ

یونانی شعراء اپنی چیزیں گانے کے لئے لکھتے بلکہ موسیقی اُن کا ایک لازمہ ہوتی تھی، لیکن روما کے شاعر موسیقی کا کوئی خاص لحاظ نہ رکھتے تھے۔ باقی شاعری کی مختلف اصناف کے لحاظ سے رومن شعراء پوری طرح یونانیوں کے پیرو تھے۔

آخری صدی قبل مسیح کے پہلے پچاس سالوں میں اسکندریہ کی تحریکِ ادبی کا اثر یونان کی طرح روما میں بھی بہت نمایاں طور پر ہوا۔ اور روما کے سب سے بڑے اور پہلے غزلیہ شاعر کیٹولس کے کلام میں بھی اس تحریک کے اثرات ظاہر ہیں۔

جولیس سیزر کے زمانے میں سیاسیات کا میدان اختلافات سے پُر تھا، اس زمانے میں لوگوں کی ذہانت میں ایک جھجک تھی اور اخلاق میں ایک ایسا انتشار جس کی مثال دنیا کی تاریخ کے بہت کم وقفوں میں ملتی ہے۔ اس زمانے میں تقریر و تحریر کے لحاظ سے صرف خطابت کے فن کا بول بالا تھا اور ایسے جذبات کی کمی تھی جن سے بلند شاعری کی نشوونما ہوتی ہے۔ چونکہ اس زمانے کی عام شاعری میں تخریب اور زوال کے رجحانات نمایاں تھے اس لئے کیٹولس کی جذبات سے لبریز بے باکی وقت اور ماحول کے اثرات سے ایک آزادی اور فراخی حیثیت میں خصوصاً ممتاز ہے۔

اسکندریہ میں اُس زمانے میں ادب کے معنی محض ایسی علمیت کے لئے جانے لگے جو شعریت سے یکسر عاری ہوتی تھی اور جس سے سوائے ایک بیزاری کے اور کسی طرح کا کیف حاصل نہ ہو سکتا تھا، فنِ نظم نگاری کی باقاعدگی، اندازِ بیان کا ناپ تول، زبان کی خشک جانچ پڑتال، حقیقت سے اغماض، سیدھی سادی دیومالا کو خواہ مخواہ اُلجھا کر تلمیحات کے اُلجھے ہوئے جال کو اور اُلجھا دینا ـــ یہ سب اسکندریہ کی تحریکِ ادبی کی خصوصیات تھیں۔ لیکن اس طرح کی خصوصیات اسکندریہ ہی کا خاصہ نہیں ہیں۔ ان کی مثال ہر ادب میں مل سکتی ہے۔ جب کبھی لوگ روایات کے جال میں اس درجہ گرفتار ہو جاتے ہیں کہ انفرادی تحریک طبعی کا آزادانہ بہاؤ رک جائے تو ہر ملک و قوم کے ادب میں اسی طرح تجدید کی کوئی راہ باقی نہیں رہتی اور ادب و شعر میں سے اخلاص اور سادگی مفقود ہو جاتی ہے اور روایات سے یہ اندھا دھند وابستگی زوال ملی کا نشان ہوتی ہے۔ اردو ادب میں نوابانِ اودھ کے زوال نے ایسی ہی صورتِ حال پیدا کر دی تھی۔ صنائع بدائع اور رعایاتِ لفظی کا لکھنوی دورِ اسکندریہ کی اس تحریکِ ادبی سے ایک زبردست مماثلت رکھتا ہے۔

کیٹولس کے زمانے میں روما ایک ایسا شہر تھا جس پر بے حد متضاد کیفیات طاری تھیں۔ اگر ایک طرف قوم اور سماج کے عادات و اطوار میں ایک نفاست تھی۔ اور خیالات میں ایک بڑھتی ہوئی وسعت، تو دوسری طرف بدنظمی بھی تھی، قتل و غارت اور خونریزی بھی تھی اور سیاسی مناقشات بھی تھے۔ یہ ایک ایسا زمانہ تھا جب لوگ علمی ادبی اور جسمانی اور نفسی دونوں قسم کی کیفیات سے لطف اندوز ہونے کے لئے دنیا کی ہر بات سے بیگانہ ہو کر اندھے بن سکتے تھے۔ اور اس زمانے کے حالات کو سسرو کی تقریروں اور سیلسٹ کی تاریخوں کے ساتھ ہی ساتھ کیٹولس کا کلام بھی بہت واضح کرتا ہے کیونکہ کیٹولس اپنی شاعرانہ طبیعت کو لئے ہوئے جوانی کے نشے میں مست ہو کر اس ماحول میں پوری طرح ڈوب گیا اور شیلے کے اس مصرعے کے مطابق کہ

دُکھ میں سیکھتے ہیں جو باتیں گیتوں میں سکھلاتے ہیں۔

اس نے بھی ایسے نغمے سنائے جن سے رومن ادب کا نام زندہ ہے۔

شاعر پیدا ہوتے ہیں، بنائے نہیں جاتے۔ لیکن اگر کوئی شاعر تاریخ کے کسی ہنگامہ خیز دور میں پیدا ہو تو اُسے اپنے ماحول سے بہت مدد ملتی ہے۔ بسا اوقات ایسے شاعر ہوئے ہیں کہ جن کی تخلیقی قوت کو زمان و مکان، اتفاقات اور ماحول سے کوئی تعلق نہ تھا۔ لیکن یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ کسی قوم یا ملک پر جب کوئی نازک دور گذر رہا ہو تو اُس میں لگاتار ایک کے بعد ایک اچھے شاعر کا ظہور ہُوا ہے۔ یہ دیکھا گیا ہے کہ شاعری کا پھول یا تو اُس وقت کھلتا ہے جب ایک قوم کی تمام حیاتی قوتیں پوری طرح بیدار ہوں، یا زوال ملی اپنی آخری منزل میں ہو۔

اس نظریے کو واضح کرنے کے لئے قدیم ہندوؤں میں سے ایک آدھ مثال ہی کافی ہوگی۔ بکرماجیت کے نورتن اُس وقت ہوئے جب اُجین کی سلطنت بلندی کے انتہائی درجے پر تھی۔ آریاؤں نے ویدوں کی مناجاتیں اُس وقت بنائیں جب اُن کی قوتیں زندگی کے ہر پہلو میں نہایت جوش و خروش کے ساتھ سرگرمِ عمل تھیں۔ مغل جب فتح کے ہنگامی دور سے گذر چکے تو اکبر کے نورتن ظاہر ہوئے اور عرفی سا شاعر۔ اور زوال کی مثال دیتے ہوئے غالب سے بڑھ کر اور کسے پیش کیا جا سکتا

ہے ہ مغلیہ سلطنت کے آخری دم تھے کہ اردو میں وہ جوہر پیدا ہوا ۔ جس
کو بھی کئی صدیوں تک اپنا لوہا منوائے رکھنا ہے۔ اس نظریے کی
مثال ہمیں قدیم روما میں بھی ملتی ہے۔ روما کے فرمانروا اشولا کی موت
۸۷ قبل مسیح میں ہوئی اور اس کے عین بعد آدھی صدی تک جو ہنگامہ
خیزیاں رہیں اُن میں رومن شاعری کے چار جوہر پیدا ہوئے کیٹولس،
لوکریٹیس، ہوریس اور ورجل۔

دوسری پیونک جنگ میں فتح حاصل کرنے سے جو نتائج برآمد
ہوئے۔ منجملہ اُن کے ایک یہ بھی تھا کہ بہت تھوڑے عرصے میں ہی وہ تمام
علاقہ رومن اثرات کے ماتحت آگیا جو اپے نائنز اور کوہستان ایلپس کے
درمیان واقع ہے۔ یہ علاقہ آج بھی جدید اطالیہ کے لئے ایک ڈھال کا حکم رکھتا
ہے۔ ان اضلاع میں سے ہی دریائے پو بہتا ہوا گذرتا ہے۔ رومن فتح کے
بعد دریائے پو کے شمالی علاقے نے بھی جنوبی حصے کی طرح بہت جلد
فاتحوں کا اثر قبول کر لیا۔ کیلٹ لوگوں کو مار کر پہاڑوں کی طرف بھگا دیا
گیا اور اصل اطالیہ کے ہر حصے سے لوگ نقل مکان کر کے دریائے پو
کے قرب وجوار میں آکر آباد ہونے شروع ہو گئے۔ اس طور پر جتنی آبادیاں
بنیں اُن میں سے ہر ایک رومن اثرات کا ایک زبردست مرکز تھی۔
انہیں میں سے ایک شہر ویرونا بھی تھا۔

یورپ میں ویرونا کی شہرت رومیو اور جولیٹ کے لافانی افسانہ
محبت سے ہے۔ لیکن اس شہر میں اس کے علاوہ اور بہت سی
خصوصیات بھی ہیں۔ دانتے نے اپنی جلاوطنی کا زمانہ یہیں گذارا تاریخی
لحاظ سے اس کی اہمیت جتانے کو یہی کافی ہے کہ انیسویں صدی کے
پہلے آدھے حصے میں ویرونا کے قلعے ہی کی وجہ سے شمالی اطالیہ پر آسٹریا
کا قبضہ رہا۔ ہمارے موجودہ نقطۂ نظر سے یہ پرانی تاریخی باتیں تو کسی خاص
دلچسپی کا باعث نہیں ہو سکتیں، لیکن اب بھی یہاں آثار قدیمہ کے متوالوں
کے لئے دلکشی کا کافی سامان ہے۔ ملکی فتوحات کے سلسلے میں اہل روما
کے لئے یہ شہر خاص اہمیت رکھتا تھا۔ لیکن ہمیں اس وقت
اس کی سیاسی حیثیت سے کم ہی تعلق ہے۔ ہمیں اسے ایک شاعر کی
جنم بھومی کے لحاظ سے دیکھنا ہے اور اس لئے اس کے نیچرل حسن اور
قدرتی مناظر کا ذکر بہتر رہے گا۔ یوں تو اطالیہ کے تمام شہر ہی حسن فطرت کا
نمونہ ہیں لیکن ویرونا کو ان میں بھی ایک امتیاز حاصل ہے۔ اس کا درجہ
ان سب میں بلند ہے۔ ایف اے رائٹ لکھتے ہیں کہ شہر کے درمیانی
ایمفی تھیٹر کے بلند مقام سے نظر دوڑائی جائے تو شہر کی دیواروں کے
ساتھ ساتھ دور تک سرسبز جنگلوں والی پہاڑیاں دکھائی دیتی ہیں۔ اور
اُس جنگل سے دور ایک لامتناہی سلسلہ برفانی پہاڑوں کا نظر آتا ہے۔
ویرونا کا شہر بنفسہ خوبصورت اور دلکش ہے لیکن گردونواح کے علاقے
کی جاذبیت سے اس دلکشی میں ایک معتدبہ اضافہ ہو گیا ہے۔ پہلے
زمانے کی طرح یہ آج بھی انگوری بیلوں اور زیتون کے درختوں کی ایک
چھوٹی سی جنت ہے۔ یہاں کے شہتوت کے درخت اور میٹھی میٹھی خوشبو
والے لارل کے پیڑ گویا ایک شاعر کو حسین آوازوں اور حسین مناظر سے
مانوس بنا کر تحریک شعری دینے کے لئے ہی پیدا ہوئے ہیں۔

اسی شہر یا اس کے قریبی علاقے میں آج سے انیس سو سال پہلے
سن چوراسی قبل مسیح میں روما کا غزلیہ شاعر گائی اُس ولیری اُس کیٹولس
پیدا ہوا۔ کیٹولس اپنے باپ کا دوسرا بیٹا تھا۔ اُس کا باپ اُن رومنوں
میں سے تھا جو روما کے شہری ہوتے ہوئے سسالپائین گال میں تاجرانہ
حیثیت سے اقامت گزین ہو گئے تھے لیکن یہ تاجر کوئی معمولی آدمی نہ تھا۔
بلکہ اسے حاکم وقت سیزر تک کی دوستی حاصل تھی۔

کیٹولس ویرونا کے شہر میں ۸۷ قبل مسیح میں پیدا ہوا اور ۵۴ قبل
مسیح میں مر گیا۔ گویا موت کے وقت وہ ابھی جوان ہی تھا اور اس بات کو
اُس کی نظموں کا مطالعہ کرتے ہوئے مدنظر رکھنا چاہئے۔ وہ نوجوانی میں ہی
روما میں وارد ہوا جہاں وہ اچھی سے اچھی سوسائٹی میں آزادانہ ہر ایک
سے ملتا رہا اور صرف صحت کی خرابی کو دور کرنے یا قرض خواہوں سے بچنے
کے لئے ہی اُس نے روما سے باہر قدم رکھا، باقی تمام عرصہ اس نے یہیں
گذارا۔ جب کبھی صحت یا قرض کے سلسلے میں اُسے روما کو چھوڑنا پڑتا
تو وہ یا تو ایک چھوٹے سے جزیرے سرمیو میں جا کر ٹھہرتا یا اپنی ٹبرٹائن
جاگیر میں قیام کرتا۔

کیٹولس کی فطرت میں ایک جوش تھا اور تمام جوشیلی طبیعتوں
کی طرح جہاں اُس کا جذبۂ محبت شدید تھا۔ وہاں اُس کا احساس نفرت
بھی اُسی قدر تند و تیز تھا۔ روما میں اُس نے سسرو اور دوسرے
مشاہیر سے دوستی بھی پیدا کی اور سیزر اور دوسرے چند اشخاص سے
نفرت اور دشمنی بھی قائم کی۔ اُس کی زندگی ایک ایسے انسان کی زندگی

تھی جو ادبیش بھی دیتا ہو اور جسے علم ادب سے بھی لگاؤ ہو سیاسیات
سے اُسے مطلقاً رغبت نہ تھی اور اس لئے اُس کی دوستی اور دشمنی
محض ذاتی وجوہات کی بنا پر ہوتی تھی۔ اُس کی زندگی میں دو واقعات
ایسے گذرے ہیں جنہیں اہم کہا جا سکتا ہے، کیونکہ ان دو باتوں
نے اس کے جوہرِ طبع پر ایک گہرا اثر کیا۔ لیسبیہ کے لئے اُس کی
محبت اور اس کے بھائی کی موت۔ لیسبیہ کی محبت ہر شے پر چھا جانے
والا ایک ایسا جذبہ تھا کہ جس کی شدّت کو بے اعتنائی اور بے وفائی
کے صدمات بھی کم نہ کرسکے۔ لیکن پہلے ہم اُس کی ذہنی نشوو نما
کے ابتدائی دور کے متعلق کچھ جان لیں پھر اس والہانہ جذبے کی
باتیں ہوں گی۔

کیٹولس کا باپ ایک امیر آدمی تھا اور ممکن ہے کہ اُسے ابتدائی
تعلیم گھر پر ہی ایک معلّم کے ذریعے سے دلوائی گئی ہو جسے گریمیٹی کس
کہا جاتا تھا۔ لیکن زیادہ امکان اس بات کا ہے کہ سردیوں کے موسم میں
وہ سکول کی تعلیم کے لئے جاتا رہا ہوگا جہاں چھڑی کے ذریعے سے "معلمانِ
چوب پرست" نے اُس کے ذہن پر رومن تنظیم کے نقوش ثبت کئے ہوں
گے۔ یونان اور روما کا طریقۂ تعلیم ہمارے آج کے طریقۂ تعلیم سے ایک
بات میں خصوصاً مختلف تھا۔ وہ لوگ بچوں کے ذہنوں کو سنجیدہ کتابوں
سے بھرنے کے خلاف تھے اور وہ باقاعدگی کے ساتھ تعلیم کو سولہ سال
کی عمر میں شروع کرتے تھے۔ حالانکہ سولہ سال کی عمر میں ہمارا زمانۂ تعلیم
آدھے سے زیادہ گذر چکا ہوتا ہے اور طالب کو علم سے بجا طور پر متنفر کر چکا
ہوتا ہے۔ رومن تعلیم کا سب سے اہم حصہ خطابت تھی۔ وہ جانتے تھے
کہ خطابت لوگوں کو ترغیب دینے کا علم ہے، اپنا ہم خیال بنانے کا علم،
اور پبلک زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کا ایک یقینی ذریعہ۔ بلکہ ایک اچھا
خطیب بعض دفعہ قوموں اور ملکوں کو اپنی رو میں بہالے جاتا ہے۔ اس
علم یعنی خطابت کے چھا جانے والے پہلو کی مثال آج بھی یورپ میں
زندہ ہے۔ اطالیہ میں مسولینی اور جرمنی میں ہٹلر صرف اپنی قوتِ زور
خطابت کے بل پر چھائے ہوئے ہیں۔ گویا اس وقت جنگ اور
بے امنی کی جو مصیبت دنیا پر آئی ہوئی ہے وہ خطابت ہی کے فن
کی مرہونِ منّت ہے۔ روما میں خطابت کے ساتھ ہی ثانوی تعلیم میں یونانی
ادب کا مطالعہ بھی شامل تھا اور ظاہر ہے کہ کیٹولس نے خطابت کی
بجائے ادب کی طرف بہت زیادہ توجہ دی۔ اور یونانی شعراء اور اُن کے
کلام سے کما حقہٗ واقف ہوگیا۔ فلسفے میں البتہ معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی
تربیت کم ہوئی تھی۔ کیونکہ نوجوانی ہی میں اُس کے افعال و حرکات سے
ظاہر ہوتا ہے کہ اُسے ضبطِ نفس کی عادت نہ تھی۔ شاعرانہ فطرت اور
ایک امیر باپ کا سہارا، ایک اچھے خاصے بڑے شہر میں ایک نوجوان
اِن دو خصوصیتوں کے ہوتے ہوئے جن ترغیبات کا شکار ہو سکتا ہے
وہ کسی بڑی عمر والے عالم کے لئے پُرخطر نہیں ہوسکتیں۔ کیٹولس کی ابتدائی
نظموں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ ان دنوں اُس کی زندگی کس ڈھب
پر بسر ہوئی ہوگی۔ لیکن اس میں کوئی حیرانی کی بات بھی نہیں ہے کیونکہ
بعد میں جاکر عیسائیت کی وجہ سے ضبطِ نفس اور گناہ و ثواب کے جو
خیالات رفتہ رفتہ تمام یورپ میں پھیل گئے رومن لوگ اُن سے یکسر
بے بہرہ تھے اور اپنی آزادروی کے لحاظ سے وہ ان پابندیوں کو
غلاموں کا کام تصور کرتے تھے۔ کیٹولس بھی رومن تھا اور اُسے بھی کسی
قسم کی عشق بازی میں کوئی ذہنی رکاوٹ نہ تھی۔ اس کے اخلاقی خیالات
بھی رومنوں ایسے ہی تھے۔ چنانچہ نوجوانی ہی سے وہ اُس راستے پر
چل دیا جو پہلے آسان دکھائی دیتا ہے لیکن جس میں آگے چل کر "دو چار
سخت مقام آتے ہیں" اور مشکلیں آن پڑتی ہیں۔ کیٹولس کی سب سے
پہلی مرکزِ نظر کا نام جُووَین ٹیس تھا۔ اس کے متعلق جو نظم ہے اس
سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ واقعہ زمانۂ تعلیم کے ابتدائی دور میں ہوا ہوگا۔
اور قیس بن عامری کی طرح شاعر نے مکتب کو مکتبِ عشق بنا دیا ہوگا۔
ایک روز جووین ٹیس کھیل رہی تھی کہ کیٹولس نے چپکے سے اُسے
چوم لیا۔ لیکن اس حرکت کی اُسے سزا ملی اور اُس نے (نظم میں) عہد کیا
کہ اب وہ کبھی اپنی منظورِ نظر کی اجازت کے بغیر اسے نہیں چومے گا۔

ممکن ہے کہ کیٹولس کا یہ پہلا پیار محض ایک رومانی جذبہ ہی
ہو لیکن اُن تین نازنینوں کے بارے میں ہم یہ نہیں کہہ سکتے جن کے
نام اِپسی تھیلا، آمیانہ اور اَوفیلینا تھے۔ کیونکہ ایک نظم میں پہلی سے
وعدہ کرتا ہے کہ اگر تم مجھے مقررہ جگہ پر آج آکر ملوگی اور کہیں اور نہ چلی
جاؤگی تو میں تمہیں دس جام شراب کے پلاؤں گا ــــــ ممکن ہے
کہ وہ دس جام پینے کے لئے آئی ہو اور دس کی بجائے اس نے گیارہ نوشِ
جان کرلئے ہوں۔ لیکن دوسری دو نازنینوں کے معاملے میں یہ کامیابی
شاعر کو حاصل نہ ہوئی کیونکہ وہ اپنی ایک اور نظم میں شاکی ہے کہ ہم اُس
کی تعریف ضرور کریں گے جو روپیہ پیسہ لے کر اُس کا پورا عوض نہ دیتی

۱؎ نظم آخر میں دیکھئے۔ م

ہے کیونکہ وہ کم سے کم ایمانداری تو برتتی ہے لیکن تم تو اپنے وعدے توڑنے کے لئے ہی کرتی ہو، یا تو مانتی ہی نہیں ہو یا لینے کو سب کچھ لے لیتی ہو لیکن اس کے بدلے میں کچھ نہیں دیتی، اور یوں تم ایک رنڈی سے بھی بدتر ہو۔"

بائیس سال کی عمر میں کیٹولس ویرونا کے نوجوانوں میں ایک ممتاز حیثیت اور شہرت کا مالک بن گیا تھا۔ اور اس کی بے باک نظموں نے اس کی عشق بازی کی بھی دھوم مچادی تھی اور یہ شہرت یا رسوائی اُسے ناپسند نہ تھی۔

۶۲ ق۔ م میں سسالپائین گال میں ایک نیا گورنر میٹی لُز مع اپنی بیوی کلوڈیہ کے آیا۔ اہلِ روما میں سرکاری کاموں پر جاتے ہوئے اپنی گھروالیوں کو ساتھ لے جانا ممنوع تھا۔ لیکن کلوڈیہ ایک ایسی بیوی ـــ یا عورت ـــ تھی جس کے لئے اصول و قوانین اور قواعد و ضوابط کوئی اہمیت نہ رکھتے تھے۔ چنانچہ ویرونا میں اُس کی ملاقات نوجوان شاعر کیٹولس سے ہوئی اور اس ملاقات نے شاعر کی زندگی میں ایک زبردست انقلاب پیدا کردیا۔ اس ملاقات کے ایک سال بعد ہی وہ موسم بہار میں کلوڈیہ کے پیچھے پیچھے ہی روما کو روانہ ہوا اور پُرامن زندگی کو روما کے ہنگاموں اور پُرخطر معاملات کے لئے چھوڑ دیا۔

اس زمانے میں روما کے سیاسی حالات میں اہم تبدیلیاں ہو رہی تھیں، لیکن کیٹولس کو اُن سے کچھ خاص واسطہ نہ تھا۔ کیونکہ اُس کا رجحان طبع ہی اور باتوں کی طرف تھا۔ سیاسی حالات کی تبدیلی کے بارے میں صرف اسی قدر کہنا کافی ہوگا کہ روما میں جولیس سیزر کو جو محض ایک جرنیل تھا بہت زیادہ رتبہ حاصل ہوگیا اور اُس کی حیثیت گویا ایک ڈکٹیٹر کی ہوگئی اور پھر ملکی انتظامات کو مستحکم کرکے وہ مصر کی فتح کو روانہ ہوا اور اُس وقت تک نہ لوٹ سکا جب تک کہ کیٹولس کی موت کو پانچ سال نہ گذر چکے۔

کلوڈیہ ان تمام سیاسی ہنگاموں سے اپنے شوہر میٹی لَس کے ذریعے سے آگاہ ہوتی رہی اور اس کے اردگرد جو نوجوان شعراء کا جھرمٹ تھا وہ بھی ان واقعات کو جانتا رہا لیکن اُنہیں سیاسیات سے دلچسپی نہ تھی اور وہ سوائے اس کے کہ اپنے ملک کے لیڈروں کے متعلق ہجویہ یا طنزیہ قطعے لکھیں اور کوئی کام نہ کرتے۔

اس زمانے کے روما میں ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ ان لوگوں میں بھی ایک نمایاں ادبی ذوق پیدا ہوگیا تھا جن کا کام صرف حکومت کرنا ہی تھا اور یہ روما کی تاریخ میں ایک نئی بات تھی۔ اگر کوئی امیر آدمی یا حاکم وقت خود نہ بھی لکھ سکتا تو کسی فلسفی یا شاعر کو اپنی سرپرستی میں لے کر اپنی ادب نوازی اور علم دوستی کا ثبوت مہیا کرتا تھا اسی لئے کلوڈیہ نے بھی کچھ تو اپنی امارت کی شان دکھانے کو اور کچھ اپنی عشرتوں میں اضافہ کرنے کو اپنے آس پاس بہت سے نوجوان شاعروں کا ایک جھرمٹ اکٹھا کر رکھا تھا۔ ان میں سے سب سے بڑے یعنی فیوریس بی بکلس کی عمر تینتالیس سال کی تھی اور سب سے چھوٹا یعنی ایسینی لیس پولیو سولہ سال کا تھا۔ ان کے علاوہ کیٹولس، کیلوس، کیلبس اور وارو۔ سب بیس سال کے اندر ہی تھے۔ چونکہ یہ سب شاعر ایک جگہ اکٹھے ہوگئے تھے اس لئے ان سب کی دلچسپیاں اور مقاصد باہم دگر ملتے تھے۔ یہ لوگ اسکندریہ کی تحریکِ ادبی کے معترف تھے۔ اور اپنے فن کو اہم سمجھ کر دیکھتے تھے اور باہم ایک دوسرے سے شاعری اور نظم نگاری کے اصول و ضوابط کے متعلق بحث و تمحیص کرتے رہتے تھے۔ کیٹولس بھی اگرچہ ان بحثوں میں برابر کا حصہ دار تھا اور شاعری کے خبط میں اپنے وقت کا کافی حصہ صرف کرتا تھا لیکن زیادہ تر اُسے کلوڈیہ اور اس کے ساتھ کے چند اور رونقِ محفل افراد کے ساتھ رقص و سرود میں دلچسپی تھی اور اپنے والد سے حاصل ہونے والے وظیفے کے باوجود اس کی عشرت پرستانہ فضول خرچی روز بروز اُسے قرض خواہوں کے جال میں لئے جارہی تھی۔ اسی واسطے اُس نے اپنی دیہاتی حویلی بھی رہن رکھی اور اسی لئے وہ کچھ عرصے کے لئے روما کو چھوڑ کر اپنے چند اور ساتھیوں کے ساتھ مقدونیہ اور بتھینیہ میں قسمت آزمائی کے لئے گیا۔ لیکن اس میں کچھ کامیابی نہ ہوئی۔ اس لئے ۵۶ ق م میں وہ وطن کو لوٹ آیا اور کچھ عرصہ ویرونا اور سرمیو جزیرے میں رہتا رہا۔ اس زمانے میں اُس نے اپنے کلام کا دوسرا مجموعہ شائع کیا اور چند لمبی نظمیں بھی لکھیں۔ لیکن صرف شعر و سخن ہی اُس کی توجہ کو اپنی طرف نہ لگئے رہے بلکہ نسائی دلکشی اب بھی اُس کے لئے پہلے زمانے کی طرح ہی دلچسپی کا باعث رہی۔ اس زمانے میں اُس نے اپنی ایک پہلی محبوبہ آمیانہ کے ساتھ باہمی رضامندی سے از سرِ نو تعلق پیدا کیا۔ یہ وہی آمیانہ تھی جسے وہ ایک زمانے میں رنڈیوں سے بدتر قرار دے چکا تھا اور کلوڈیہ کے مقابل میں تو اُسے ہیچ سمجھتا تھا۔ لیکن اب بھی کیٹولس وہی کیٹولس تھا اور آمیانہ وہی آمیانہ۔ اس لئے رشک

حسد اور بے وفائی کی وجہ سے دونوں میں نہ نبھ سکی۔ آمیانہ کے سلسلے میں کیٹولس کو سیزر اور اُس کے ایک ماتحت افسر میمورا سے شکایت تھی کیونکہ اندازہ ہے کہ ان دونوں سے آمیانہ کا میل جول اختلاط کے درجے تک پہنچا تھا۔ اور میمورا اور سیزر دونوں کی کیٹولس نے اپنی ہجویہ نظموں کے ذریعے سے خوب خبر لی تھی۔ میمورا کی تو خیر کوئی خاص بات نہ تھی لیکن سیزر کی ہجو ممکن تھا کہ کیٹولس کے حق میں مُضر ثابت ہوتی لیکن سیزر ایک ایسا انسان تھا جس میں حکومت کی اہلیت کے علاوہ کشادہ دلی اور خوش مذاقی کی صفات بھی تھیں۔ سیاسیات میں جب اس کے حریفوں نے اُس پر بداخلاقی کے الزامات لگائے تو اس نے نہ صرف ناپسندیدگی کا اظہار کیا بلکہ نہایت تندہی سے اُن کا استیصال کیا۔ لیکن اُس کی اپنی فوج کے سپاہی اس کے متعلق فحش گیت بنا کر گایا کرتے تھے اور وہ اس کی پروا نہ کرتا تھا۔ اسی طرح کیٹولس اور دوسرے شعرا نے اُس کی ہجو میں جو نظمیں لکھیں انہیں اُس نے مسکرا کر سنا، حالانکہ وہ اس کی شہرت کو مستقبل میں نقصان پہنچا سکتی تھیں۔ اُس نے صرف اس قدر انتقام لیا کہ کیٹولس کو ایک کھانے کی دعوت پر بلا بھیجا۔ ظاہر ہے کہ اس دعوت نے کیٹولس کے دل پر سیزر کی زندہ دلی کا نقش بٹھا دیا ہوگا۔

لیکن ہم اِن ماحول کے واقعات کی رو میں کہیں سے کہیں نکل آئے۔ ابھی ہمیں کیٹولس اور اُس کی محبوب ترین عورت کلوڈیہ کے تعلقات کے بارے میں جسے وہ لیسبیہ کہتا ہے، چند اور باتیں بھی کہنا ہیں۔

محبت کے افسانے بوڑھے، جوان، مرد عورت سب ہی کے من بھاتے ہیں۔ ان کہانیوں میں سب سے بڑھ کر ہمہ گیر اور زوردار احساسات کے لئے ایک اندھی دلکشی ہوتی ہے۔ یہ تو ہوئی عام افسانہائے عشق کی بات۔ لیکن اگر کسی داستان کا ہیرو یا ہیروئن اپنے زمانے کے سماجی، سیاسی، ادبی یا کسی اور حلقے میں ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہو، تو اس صورت میں اُس پریم کہانی کی اہمیت پہلے سے کہیں بڑھ جاتی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ لیلیٰ افسانہ یا "جانِ افسانہ" کی نجی زندگی کی پوشیدہ سے پوشیدہ تفصیلات بھی مؤرخ اور واعظ کے لئے ایک خاص قدر و قیمت کی حامل ہو جاتی ہیں اور اگر ہیرو علم ادب سے تعلق رکھتا ہو، کوئی مصنف ہو، کوئی شاعرِ رومانی ہو، جس کے کلام ہی میں اُس کی زندگی کی تفصیلات موجود ہوں، جس کے اشعار ہی اس کے اوّلین احساسِ محبت سے لے کر ناکامی کی تلخی اور برگشتگیٔ خاطر کا پتہ دے رہے ہوں، تو اس صورت میں ادبی نقاد کا تعلق بھی اس افسانۂ محبت سے اُسی حد تک ہو جاتا ہے جس حد تک کہ ہیرو اور اس کے زمانے کا ہو۔ کیونکہ ادبی نقاد کی نظر میں محبت کا جذبہ اور اُس جذبے کا افسانہ بھی اُسی قدر اہم ہے جس قدر کہ شعر کی صورت میں محبت کا اظہار۔

انہی وجوہات کی بنا پر کیٹولس اور لیسبیہ کے المناک واقعاتِ عشق بھی ایک خاص دلچسپی رکھتے ہیں۔ اس معاملۂ عشق سے عورت مرد کی ازلی جنگ کے کئی پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے اور مرد عورت کی یہ جنگ ہمیں کسی طرح بھی غیر حقیقی نہیں معلوم ہوتی کیونکہ ہمارے موجودہ دور میں بھی عورتوں اور مردوں میں ویسی ہی کشمکش پیدا ہے جیسی کہ قدیم روما میں تھی اور اب تو ذکور و اناث میں یہ تگ و دو کی حالت جسے نرم لہجے میں ایک شکراب سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، مغرب سے نکل کر پھیلتی ہوئی ہندوستان میں بھی نئی تعلیم اور اُس کے متعلقات کی بدولت روز بروز گہرے رنگ پکڑتی جا رہی ہے۔

عیسوی سمت سے پہلی صدی کے روما کے حالات میں ایک خلفشار سی پیدا ہو چکی تھی۔ پرانے قوانین اور طرزِ زندگی تہذیب و تمدن کے پیچیدہ مارگراں کے نیچے پستے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ جنگ ہنی بال اور فتح عالم سے روما کی سیاسی اور سماجی زندگی میں رفتہ رفتہ ایک پریشانی اور بے ترتیبی پیدا ہو رہی تھی۔ فتح عالم نے نئے علاقوں کی طرف حاکموں کی توجہ کو اس درجہ منعطف کر دیا تھا کہ گھر کے حالات پر اُن کا قابو ڈھیلا ہو گیا تھا۔

سیاسی لحاظ سے اس انتشارِ حکومت کا بُرا نتیجہ نکلا۔ بغاوتوں، بلووں اور انقلابات کی ایک زنجیر بنتی گئی، قتل عام ہوتے رہے، خون بہایا گیا اور خانہ جنگیاں ہوتی رہیں اور یہ بدنظمی پانچ نسلوں تک جاری رہی لیکن سماجی لحاظ سے اس بدنظمی کا نتیجہ اور بھی بُرا ثابت ہوا۔ گھریلو زندگی کی بنیادیں متزلزل ہو گئیں اور یہ مطمئن اور شاداں طرزِ حیات سیزر اور سسرو کے روما میں سیدھے سادے انداز اور ٹھوس اور مفید اصولوں سے جتنی دور ہو گئی اُس کی مثال ہمیں تاریخ عالم میں اور کبھی کہیں نہیں ملتی۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے، رومن گھروں کے دستورِ حیات

کی بنیاد باپ کی برتری پر تھی۔ باپ ہی گھر کا مالک ہوتا تھا، اور اُس کی بیوی، اُن کے بچے (لڑکے لڑکیاں) اور اُن کے لڑکوں کی اولاد، یہ سب گھر کے مالک کے ماتحت زندگی گذارتے تھے۔ نظری طور پر اُسے کنبے کے افراد پر موت وحیات کا اختیار تھا اور چونکہ اقتصادی لحاظ سے وہی ہر شئے کا مالک ہوتا۔ نیز سماجی رائے اُسی کا ساتھ دیتی، اس لئے اُسے ایک طرح کی خود مختارانہ قوّت حاصل ہوتی تھی۔ "خاندان" میں ہر آزاد اور غلام فرد شامل سمجھا جاتا تھا، گویا بڑے میاں کے گھر کی چھت کے نیچے رہنے سہنے اور کھانے پینے والے ہر فرد کو اُن کے اختیارِ کلّی کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑتا تھا۔ اس قسم کے نظامِ حیات میں گھر کے مالک کے لئے بھی نقصانات تھے کہ وہ ہر طرح کی حرف گیری سے بالا ہو کر من مانی کرسکتا تھا اور دوسرے افراد کے لئے بھی نقصان تھا کہ وہ کسی طرح کا اختیار بھی نہ رکھتے تھے۔ اور اُن کی ہر بات دوسرے کی رضا کے تابع ہوتی تھی۔ بہر حال ان خامیوں کے باوجود یہ نظام بے نظمی اور بے راہ روی سے یقیناً بہتر تھا۔ لیکن جولیس سیزر سے بہت پہلے سے اس نظام کو زوال آنا شروع ہو چکا تھا۔ یہاں تک کہ ۱۲۳ قبل مسیح اور ۷۸ قبل مسیح کے درمیانی وقفے میں بیویاں اور بیٹیاں اپنے گھر والوں کے اختیار سے عملی طور پر یکسر آزاد ہو چکی تھیں۔

لیکن روما میں اس گھریلو اور سماجی انقلاب کا نتیجہ غیر تسلی بخش ثابت ہوا اور روما کے سینیٹ میں بھی ایک رکن نے یہ تلخ نوائی کر ہی دی کہ "جس دن ہم نے عورتوں کو اپنے برابر کا بنا دیا، اُسی دن سے وہ اپنے کو ہمارا مالک بنا لیں گی" اور یہ بات بھی ایک طرح سے سچ ہی تھی کیونکہ اس دور کی نئی آزاد عورتوں نے مردوں سے کہیں بڑھ چڑھ کر آزادی کی زندگی اختیار کر لی۔ اور ان کی بے حیائی اس قدر بڑھ گئی کہ اس کا برداشت کرنا روما کے مردوں کی حد سے بھی باہر ہو گیا۔

جمہوریت کے آخری اور سلطنت کے ابتدائی سالوں کے رومن لٹریچر میں ان آزاد منش عورتوں کے شرمناک رویے کے متعلق بہت سے مخالفانہ حوالے موجود ہیں لیکن ان عورتوں میں اکثریت عیاشانہ رجحانات کے باوجود غیر معمولی ذہانت کی مالک تھی۔ اسی قسم کی عالی دماغ اور ہرجائی عورتوں میں سے ایک وہ عورت بھی تھی جسے کیٹولس لیسبیہ کے نام سے پکارتا ہے۔ بلکہ یہ عورت اس آزاد گروہ کے پیشروؤں میں سے تھی اور اِس لحاظ سے اُسے روما کی نسائی آزادی کی رہنما کہا جاسکتا ہے۔

اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ آپ سے اُس ڈرامے کے تمام خاص کرداروں کا باقاعدہ تعارف کرا دیا جائے جسے کیٹولس کی رومانی زندگی" کہا جاسکتا ہے۔

ہیرو۔ کیٹولس
ہیروئن۔ کلوڈیہ یعنی کیٹولس کی نظموں والی لیسبیہ۔
ہیروئن کا شوہر۔ میٹی لُس۔
ہیرو کا دوست۔ کےلیُس رُوفس۔

اور اِس جھرمٹ میں ایک نمایاں حیثیت اختیار کرتے ہوئے اپنے زمانے کا مشہور عالم وکیل، سیاست دان اور نکتہ ور سِسَرو۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ کلوڈیہ اور اس کا خاوند دونوں روما کے دو قدیم ترین اور ممتاز ترین خاندانوں سے تعلق رکھتے تھے اور یہ چاروں افراد اپنے بے باک اور پُرجوش چلن کے باوجود اپنی سماج کے درخشندہ ستارے تھے۔ اور ان پانچوں کی زندگی پبلک کی نگاہوں میں روزِ روشن کی طرح عیاں تھی۔

کلوڈیہ کے خاندان کے تمام افراد میں ایک خصوصیت نمایاں تھی۔ سب کے سب مدمغ متکبّر، خود بین اور خود کام ہوتے تھے اور دوسروں کی رائے سے یکسر بے نیاز۔ لیکن اس کے باوجود سب میں کوئی نہ کوئی ادبی یا فنّی ذوق موجود ہوتا تھا اور یہ بات ان کے طبقے کے لوگوں میں ذرا ایک امتیازی شئے تھی۔ خود کلوڈیہ میں بھی ان خصوصیات کا وہ جوہر پورے جوبن پر تھا جس کی وجہ سے اس کا خاندان ہمیشہ لوگوں کے لئے توجہ کا باعث بنا رہا۔ وہ عام روایات اور ملکی اور قومی رسم و رواج کے خلاف پوری شدّ و مد سے بغاوت کرتی تھی اور ایک ایسی عورت تھی جس کا رفیقِ حیات اگر میٹی لُس ایسے دنیادار سپاہی پیشہ کی بجائے سِسَرو سا جوہرِ خداداد کا مالک ہوتا تو اس کی ذہانت کو اس کے شوہر کی بہ نسبت بہت زیادہ سمجھ سکتا اور اُس سے ہمدردی کرسکتا۔ اور عقل و دانش کے لحاظ سے میٹی لُس اور اُس کے خاندان کے دوسرے افراد کا اندازہ کرنا ہو تو اس کے لئے بہت سے لفظ ہیں "ملّا"، گودی، بودم، بے دال، احمق۔

وغیرہ۔ لیکن اگر حماقت کے علاوہ جو اور خصائص تھے اُن کو تسلیم نہ کیا گیا تو میٹیلس سے ناانصافی ہوگی۔ اپنے سپاہیانہ فن میں وہ اچھا خاصا انسان تھا۔

کیٹولس اس رومانی ڈرامے کے وقت بائیس سال کا تھا۔ اور معمولی معاملاتِ عشق میں تجربہ کار بھی تھا جیسا کہ اس کی اُن نظموں سے پتہ چلتا ہے جو اُس نے ایپسی تھلیبہ اور ادفی لینہ وغیرہ سے مخاطب ہو کر لکھی ہیں۔ لیکن ان تجربوں کے باوجود وہ ابھی نوجوان تھا اور شہری عشق کی اُلجھنوں سے ناواقف۔ یہ بات اسی سے ظاہر ہے کہ وہ روما کی سماج کی خاتون ـــ کلوڈیہ کی توجہات کی تاب نہ لا سکا اور اس ترغیب میں ایسا اُلجھا کہ اس نے اُس کے دل پر ایک غیر فانی نقش ثبت کر کے ہی چھوڑا۔

کلوڈیہ کیٹولس سے عمر میں دس سال بڑی تھی اور اس کی کیفیت ایک ایسی عورت کی تھی جس میں ہر طرح کی دلکشی بھی ہو اور جو اپنے رجحاناتِ طبع کی تکمیل میں کسی طرح کی عام اور خاص رکاوٹوں کو خاطر میں نہ لاتی ہو۔ صورت شکل میں وہ حسین تھی، اس میں کوئی شک نہیں ہو سکتا۔ لیکن کیٹولس نے اس کا کوئی واضح سراپا اپنے کلام میں نہیں چھوڑا۔ البتہ اس کے نازک پاؤں، نفیس ہاتھوں، چھوٹی سی سیدھی سی ناک اور چمکتی ہوئی سیاہ آنکھوں کا ذکر اُس نے کیا ہے۔

ایف۔ آر۔ رائٹ جو کیٹولس کا مترجم ہے ایک جگہ لکھتا ہے کہ اولین نظم جو کیٹولس نے لیسبیہ کو مخاطب کر کے لکھی ہے، یہ ہے:

دیوتاؤں کی طرح مجھ کو نظر آتا ہے
سامنے بیٹھ کے جو دیکھتا ہی جاتا ہے
تری صورت کو، تری میٹھی صدا سنتا ہے
قہقہے کی ترے مستانہ ادا سنتا ہے
مرے سینے میں مرا دل بھی لرز اُٹھتا ہے
آہ! اک جذبۂ بسمل بھی لرز اُٹھتا ہے
گھٹ کے رہ جاتی ہے سینے ہی میں آواز مری
دیکھ لیتا ہوں جو اک لمحہ بھی صورت تیری
گویا منہ ہی میں نہ تھی ایسے زباں ہوتی ہے
آگ سی جسم میں اک میرے تپاں ہوتی ہے
میری آنکھوں کو نظر آتی نہیں کوئی شے
اور کانوں میں بھی اک شور چلا آتا ہے!
لیکن افسوس کہ قسمت میں نہیں لکھا ہے،
دُکھ ہی سہتا رہوں میں بیٹھا یہیں، لکھا ہے
زندگی دکھ سے رہائی نہیں دیتی مجھ کو،
موت بھی دور دکھائی نہیں دیتی مجھ کو!

اس نظم میں احساسات کی شدت ہے لیکن یہ کیٹولس کی اپنی نظم نہیں ہے۔ یہ نظم سیفو کی ہے۔ جب یونانی شاعرہ کی محبوبہ اتھیس اُسے چھوڑ کر چلی گئی تھی تو اس کے فراق میں اُس نے یہ شعر کہے تھے۔ رومن ادب وشعر پر یونانی ادب وشعر کے اثرات کی ایک مثال یہ نظم بھی ہے۔ کیٹولس نے سیفو کی نظم کا لفظی ترجمہ کیا ہے۔ ایف۔ آر۔ رائٹ کے خیال میں یہ نوجوانی کی بے پروائی تھی جس نے کیٹولس کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ دوسرے کے خیالات واحساسات کو اپنے مقصد کی تکمیل کے لئے استعمال کرے۔ لیکن کیٹولس نے شاید اس امر کا خیال نہیں کیا کہ سیفو نے یہ نظم اپنی ہم جنس کے متعلق لکھی تھی۔ نیز اس کے جذباتِ محبت کی نوعیت بھی کلوڈیہ کے لئے کیٹولس کے جذبات سے مختلف تھی چونکہ سیفو نے اپنی نظم لیسبوس کی ایک لڑکی کے متعلق لکھی تھی اس لئے کیٹولس نے ترجمے کے وقت اپنی نظم میں اپنی محبوبہ کا نام بھی "لیسبیہ" کے پردے میں چھپا لیا اور آئندہ وہ اپنی طبعزاد نظموں میں بھی اُسے اسی نام سے مخاطب کرتا رہا۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس پہلی نظم کا اظہارِ عشق کلوڈیہ کے من بھا گیا۔ کیونکہ دوسری نظم سے پتہ چلتا ہے کہ شاعر اپنی محبوبہ کا قرب حاصل کر چکا ہے،

یہ نظم اُس نے اپنی محبوبہ کے پالتو پرندے کے متعلق لکھی ہے۔ "تیتم کا پنچھی" ـــ لیکن اس پنچھی کی زندگی بقول جناب رائٹ کلوڈیہ کے جذبات کی زندگی کی مانند نہایت مختصر تھی کیونکہ تیسری نظم کا عنوان "تیتم کے پنچھی کی موت" ہے۔ ان نظموں کے عنوانات ہی سے ظاہر ہے کہ ابھی کیٹولس ایک سیدھا سادا عاشق تھا جو اپنے جذبات کا اظہار اپنی محبوبہ کے پالتو پنچھی میں دلچسپی لے کر ہی کر لیتا ہے۔ لیکن اگلی نظم کا عنوان اور اندرونی مواد ظاہر کرتا ہے کہ اُس کو اب کلوڈیہ نے اپنا عاشق تسلیم کر لیا ہے۔ یہ نظمیں ہیں "بوسوں کی کہانی" اور "پریم ملاوا" ـــ اور یہ نظمیں ممکن ہے کہ اُس نے ویرونا کو چھوڑنے کے بعد کلوڈیہ کے تعاقب میں روما پہنچ کر لکھی ہوں گی۔ ان نظموں میں جوانسال محبت کے پرجوش جذبات

کو بہت لطف ست کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ان میں سے پہلی نظم ذیل میں درج کی جاتی ہے۔

بوسوں کی کہانی

کتنی بار بھنورا جا بیٹھے رس پاکر ہر بار ؟
کتنی بار بتا دے پریمی کرلے تجھ کو پیار ؟
اتنی بار بتاؤں، آؤ کرلے پریمی پیار،
جتنے ہیں صحرا میں ذرّے، اتنی ۔ اتنی بار!
چھپ کر رات کو پریمی پریتم بھولیں سب سنسار،
اُن کو دیکھیں جتنے تارے، اتنی ۔ اتنی بار،
چاہے پریمی پیار!
جب تاروں سے بڑھ کر تیرے ہونٹوں کا امرت پائے
تب یہ تیرا پیاسا پریمی من کی آگ بجھائے،
تب جائے، پاگل پن پریمی کے دل سے تب جائے
دُکھ چنتا پھر لوٹ کے اپنے پاس کبھی نہ آئے،
گن لے جب آکاش کے تارے، سمجھے پریم آدھار،
پھر تو جانے، جی بھر دیں پریمی کا کتنے پیار،
رس پاکر، ہر بار!
اور دوسری نظم یہ ہے:۔

پریم بلاوا

پریتم پیاری! آؤ جئیں اور پریم کریں جگ منڈل میں،
گیانی اس پر باتیں بنائیں، دھیان میں اُن کو لائیں نہیں!
سورج چاند ستارے سارے اس آکاش کے جنگل میں،
دیکھو، پچھم میں چھپ جائیں، اپنا روپ دکھائیں نہیں!
دن بیتے، اندھیارا چھائے، سورج ڈوبے مغرب میں،
صبح سویرے لوٹ کے آئے، جوت جگائے پورب میں۔
لیکن جیون جوتی کا کچھ رنگ انوکھا ہے جگ میں،
بجھ جائے تو رین اندھیرا، نیند کا جادو رگ رگ میں!
سب دنیا گر میری مانے، پریم ڈگر کو اپنا لے،
کوئی نہ ہو پھر جھگڑا باقی، ٹوٹیں برچھی اور بھالے۔
جب تک آئے نہ پریم بلاوا، بولے نہ میٹھے بول کوئی،
جگ کے باسی چین سے سوئیں، نیند نہ توڑے ڈھول کوئی۔
مورکھ سب گیانی اگیانی، پریم کو کیوں بھولے ہیں، ہائے!
یوں تو دُکھ میں جیون بیتے موت سندیسہ سکھ کا لائے!
جس دم میری جیون جیوتی تھر تھر کانپے اور بجھ جائے،
روتی صورت لے کر اس دم کوئی نہ میرے گھر پر آئے۔
آئیں جگ کے سارے پریمی، اپنی مٹھی میں کو لے آئیں،
آکر سب آنند سے بیٹھیں، پریم کے میٹھے گیت سنائیں۔

ان نظموں سے کیٹولس کی محبت کے جس دور کا اظہار ہوتا ہے وہ مسرّت سے لبریز تھا۔ وہ نوجوان تھا اور اُس نے اپنے جذبات کی سادگی میں یہ خیال ہی نہ کیا تھا کہ جس عورت کی محبت کا وہ امیدوار ہے وہ بیاہتا ہے اور وہ شاید یہ سمجھتا تھا کہ اس کے لئے کیٹولس کی خاطر اپنے خاوند کو بھلا دینا ایک بالکل قدرتی بات ہے۔ لیکن جب کلوڈیہ کا جی کیٹولس کی پرستش سے بھر چکا اور وہ اوروں کی طرف متوجہ ہونے لگی تو وفاداری کے متعلق کیٹولس کا نظریہ بدلنے لگا۔

اُس کی ایک اور نظم سے ظاہر ہوتا ہے کہ کچھ سالوں کے بعد وہ اپنے جذبات کی اُسی نوجوانی والی پہلی شگفتگی کو دوبارہ گرفت میں لانے کی کوشش کر رہا ہے اور تصور میں اپنی محبوبہ کو اپنے دوست کے ہاں چھپ کر ملتا ہے اور اپنے آپ کو ایک قانع اور صابر عاشق کی صورت میں دیکھتا ہے (یہ سب کچھ نظم میں ہی ہوتا ہے)، اور وہ کہتا ہے۔

"مجھے معلوم ہے میں ہی پریمی ہو نہیں سکتا،
مجھے اُس کی وفا نا آشنائی دیکھنی ہوگی،
حسد اور رشک کو اب دل میں آنے ہی نہیں دوں گا،
کہ اندھا بن کے اس کی بے وفائی دیکھنی ہوگی۔"

لیکن حقیقت یہ تھی کہ نہ وہ اندھا تھا، نہ صابر، اور راحت و آرام کا تو اُس کے دل میں نام بھی نہ تھا۔ ویرونا میں کلوڈیہ کی طبیعت جو شہری دلچسپیوں کی عادی تھی، وہاں کی سیدھی سادی فضا سے بیزار ہو کر کسی دلگی کی تلاش میں تھی، اور یہ بات اُسے کیٹولس کی شکل میں مہیا ہو گئی اور وہ اپنا وقت جو بے مصرف گذر رہا تھا، عشق بازی میں بتانے لگی۔ لیکن شہر میں لوٹ کر اس کو یہ سوچ تو تھی ہی نہیں کہ وقت کیونکر کاٹا جائے بلکہ سوچ یہ تھی کہ شہر کی بے شمار دلچسپیاں اور مشغلے جو نظر کے سامنے ہیں ان کے لئے کہاں سے فالتو وقت مہیا کیا جائے

اب اسے عشق بازی کے لئے ایک شخص کی تلاش نہ تھی بلکہ اس کی جستجو تھی کہ اپنے متوالوں کے جھرمٹ کو کیونکر مطمئن رکھا جائے۔ سنہ ۶۰ ق۔م میں کلوڈیہ کے خاوند میٹی لس کو سیاسی مصروفیات کے جال نے بالکل اپنا قیدی بنا لیا اور کلوڈیہ کے سر سے شوہر کا رہا سہا بارِ گراں بھی اُتر گیا۔ اس کے ارد گرد نوجوانوں کا جھرمٹ تھا اور اس جھرمٹ کا ہر جوان کیٹولس کو رقیب کی صورت میں نظر آتا تھا۔ لیکن کلوڈیہ کو اُس کی خود پرستی اور خود بینی و خود کامی کے باوجود اس کی داد دینا ہو گی کہ وہ کیٹولس ایسے عاشق سے بھی گذارہ کر سکی۔ وہ کلوڈیہ کو اپنی ملکیت سمجھتا تھا۔ جیسا کہ عام عشاق کا احمقانہ طریقہ ہوتا ہے۔ وہ اپنی نظموں میں اپنے رقیبوں کو تنبیہہ کرتا ہے کہ وہ اس کی محبوبہ سے الگ رہیں اور اس کی یہ باتیں دیکھنے والوں کو مضحکہ خیز تو معلوم ہوتی ہیں لیکن وہ اس کے حالِ زار کو دیکھتے ہوئے ضبط کرتے ہیں اور رحم کھاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں لڑائی جھگڑے، شکراب، سبھی طرح کے مناقشے ہوتے ہوں گے اور پھر ایک دوسرے کا دل رکھنے کو صلح صفائی بھی ہو جایا کرتی ہو گی۔ چنانچہ اس زمانے کی تمام نظموں سے شکوہ و شکایت کی تلخی اُمڈی پڑتی ہے۔

جب تک میٹی لس زندہ تھا، کلوڈیہ ایسی عورت کو بھی ذرا سوچ سمجھ کر اور سماجی رکھ رکھاؤ سے چلنا پڑتا تھا۔ بلکہ جب وہ کسی نوجوان کو اپنے سے دور ہی رکھنا چاہتی تھی تو خاوند کی موجودگی اس وقت مفید ثابت ہوتی تھی، کسی ناخواستہ عاشق سے علیحدہ رہنے کا پختہ بہانہ، لیکن ۵۹ سنہ ق م میں میٹی لس اغلباً سیاسی اور ملکی معاملات کی پیچیدگی سے تھک تھکا کر راہیٔ ملک عدم ہوا، اور کلوڈیہ سماجی رواج کے مطابق محض ظاہری طور پر اپنے بھائی سیکسٹس کلوڈیس پلوشر کی محافظت میں آ گئی۔ لیکن حقیقتاً وہ خود مختار تھی پینتیس سال کی ایک جوان بیوہ جو کافی دولت مند بھی تھی۔ کلوڈیہ کا بھائی سسرو کا دشمن تھا اور اس وجہ سے جو بات پیدا ہوئی وہ بھی ابھی معلوم ہوئی جاتی ہے۔

یہ بات پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی ہے کہ اس کے خاوند کی موت کے بعد کلوڈیہ کا سب سے زیادہ منظورِ نظر ایک شخص مارکس کیلیئس رُدفس تھا۔ سسرو اس شخص کا مربّی تھا۔ اور کیٹولس یارِ غار، اور یہ حضرت رُدفس اُس ہنگامہ پرور دور میں بھی ایک قسمت آزما اور چلتا پرزہ ہونے کے لحاظ سے ایک ممتاز شخصیت کے مالک تھے۔

کیٹولس کے دل پر اس بات سے کیسی گذری ہو گی، اس کا اندازہ ان سطور سے لگایا جا سکتا ہے جو اس نے روفس کو مخاطب کر کے لکھی تھیں۔ لیکن اگرچہ اس کی خودداری اور وقار کو اس انتخاب سے ایک مہلک صدمہ پہنچا تھا، پھر بھی وہ اپنی محبوبہ پر گذشتہ بندھنوں کی وجہ سے اِس بری طرح فریفتہ ہوا تھا کہ کسی صورت اس قیدِ محبت سے آزاد ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ کلوڈیہ کے متعلق وہ جب لکھتا ہے تو اُسے بُرا بھلا بھی کہتا ہے لیکن اُس پر اُسے پیار بھی آتا ہے۔ گویا وہ اپنے احساسات کی غلامی کو تسلیم بھی کرتا ہے۔ اور اس کے خلاف بغاوت بھی،

"اس دل کو نہیں اب پاس ترا، چاہے تو سچا سونا ہے"
میں تجھ کو پوجتا جاؤں گا، مجھ کو تو رونا دھونا ہے
اپنی من مانی کرتی جا، جو ہونا ہے وہ ہونا ہے!"

ایک اور نظم میں بھی یہی بات ہے،

"یہ بات یہاں کہہ دیتا ہوں، ہاں، اب میں تجھ کو جان چکا،
اب قدر ہے کم اس دل میں تری، بڑھ کر ہے جوشِ محبت کا!"

اور آخر ایک ٹکڑے میں وہ نفرت اور محبت کی اس بے پناہ کشمکش کا اظہار کرتا ہے۔

"محبت بھی ہے مجھ کو اور نفرت بھی مگر اس کا سبب کیا ہے
"مجھے معلوم ہی کب ہے، یہ حالت ایک بپتا ہے"

کلوڈیہ اور اس کے متوالوں کا جھرمٹ رنگ رلیاں مناتے ہوئے کس ڈھب سے زندگی گذارتا تھا۔ اس کا اندازہ سسرو کی ایک تقریر سے بھی ہو سکتا ہے۔ کلوڈیہ کی ایک بڑی حویلی پیلاٹائن پہاڑی پر دریائے ٹائبر کے نزدیک تھی۔ وہیں وہ اپنے رسیا شاعروں کے ساتھ اپنی دولت اور اپنے حسن کے بل پر جیسے بھی چاہتی تھی دادِ عیش دیتی تھی اُس کا روپیہ پیسہ اور اس کا بستر، دونوں پر اُس نوجوان شاعر کا پورا پورا اختیار ہوتا تھا جو اُن لمحوں میں اُس کا منظورِ نظر ہوا اور یوں سردیوں کی راتیں گذرتی تھیں۔ گرمیوں میں سب کے سب سمندر کے ساحل پر جا پہنچتے تھے اور وہاں کے حماموں میں وہی عشرت پرستی کے سلسلے اس اندھے طور پر جاری رہتے تھے کہ اُس وقت کے روما کے لوگوں کو بھی حیران کر دینے کو کافی تھے۔ لیکن ہم سسرو کی تقریر ہی سے اس سلسلے میں مدد لیتے ہیں۔ کلوڈیہ نے اپنے عاشق روفس پر مقدمہ دائر کیا کہ اُس نے

اُسے زہر دینے اور اُس سے روپیہ اینٹھنے کی کوشش کی ہے۔ بہ سسرو
اپنے موکل کے حق میں سینیٹ کی عدالت کو مخاطب کرکے کہتا ہے۔
"حضرات! اس مقدمے میں ہمیں صرف کلوڈیہ سے نبٹنا
ہے۔ وہ ایک ایسی عورت ہے جو نہ صرف عالی خاندان بلکہ مشہور بھی ہے
اس سے متعلق میں کوئی ایسی بات نہ کہوں گا جس کا کہنا میرے موکل
کے خلاف عائد کردہ الزام کو جھٹلانے کے لئے ضروری نہ ہو۔ اگر وہ یہ نہ
کہے کہ اُس نے کیلیس کو روپیہ قرض دیا، اگر وہ اس پر زہر خورانی کا الزام
نہ لگائے، تو اُس صورت میں ہم سے گستاخی ہوگی اگر ہم ایک ایسی
خاتون کے بارے میں اُس انداز سے ہٹ کر گفتگو کریں جس کا تقاضا
رومن خواتین کی حرمت کرتی ہے۔ لیکن اگر کلوڈیہ کو نظرانداز کرتے ہوئے
ہمارے مخالفوں کے پاس نہ تو کیلیس کے خلاف کوئی الزام ہے۔
نہ کوئی ایسا ذریعہ جس سے وہ اس کی مخالفت کرسکیں تو اس
کے سوا اور کوئی طریقِ کار نہیں رہ جاتا کہ ہم کیلیس کے وکلا ہیں، اُن
لوگوں کو دنداں شکن جواب دیں۔ اور میں دنداں شکن جواب دیتا اگر
مجھ میں اور اس خاتون کے خاوند (معاف کیجئے گا میرا مطلب بھائی سے
تھا، مجھ سے زبان کی یہ لغزش ہمیشہ ہو جاتی ہے) ہاں تو اگر مجھ میں اور
اس خاتون کے بھائی میں دشمنی نہ ہوتی تو میں دنداں شکن جواب دیتا
لیکن صورتِ حال کے مدِنظر میں نرمی سے کام لوں گا تاکہ میں ادائیگیِ
فرض کی حدود سے نہ بڑھنے پاؤں۔ صرف وہی باتیں کہوں جن کا تقاضا
یہ مقدمہ کرتا ہے۔ کیونکہ مجھ میں ہمیشہ سے اس ایک بات کی کمی رہی
ہے کہ عورتوں سے میرے تعلقات خوشگوار رہیں خصوصاً کلوڈیہ
سے، جو ہر کسی سے ہنس بول کر ملتی ہے اور کسی سے بھی رکھائی کرکے
دشمنی نہیں پیدا کرتی۔

"لیکن سب سے پہلے میں اُس سے پوچھوں گا کہ وہ کون سے
انداز میں جرح پسند کرے گی۔ کیا میں اُس سے پرانے فیشن کے سخت
اور متین انداز میں نبٹوں یا نرمی کے ساتھ مہذب اور متواضع انداز
میں! اگر اُسے متین انداز پسند ہے تو مجھے ماضی کے سایوں سے ان
حضراتِ دراز ریش میں سے کسی کو بلانا پڑے گا جو لمبی لمبی داڑھیاں
لٹکائے رکھتے تھے۔ اور جسے میں بلاؤں گا اُس کی داڑھی میں وہ نرمی
اور لطافت نہ ہوگی جو کلوڈیہ کو بھاتی ہے، بلکہ اُس کی داڑھی سخت
ہوگی، ایسی سخت جیسی کہ ہمیں مجسموں میں نظر آتی ہیں اور میری بجائے
وہ ریشائیل انسان اس خاتون سے بات کرے گا۔ تاکہ کہیں یہ مجھ سے
ناراض نہ ہو جائے۔ تو کیوں نہ ہم اس خاتون ہی کے خاندان کے کسی
بڑے بوڑھے کو یہاں از سرِ نو کھڑا کریں اور کسی اور کی بجائے اُس
اندھے اپیئس کو لے آئیں۔ کیونکہ وہ اپنی آنکھوں سے یہ حالت نہ دیکھ سکے گا،
اور اس لئے اُسے دکھ کم ہوگا۔ اگر وہ اندھا اپیئس یہاں آسکے تو وہ کلوڈیہ سے
اس انداز میں مخاطب ہوگا۔ اے عورت کیلیس سے تیرا تعلق؟ یہ تو ابھی لڑکا ہے،
نوجوان، اور تیرے لئے نامحرم ہے۔ اول تو تو نے اس سے اتنی خلا ملا ہی کیوں رکھی کہ تو
روپیہ قرض کے طور پر دیا، اور دوسرے کیا وجہ تھی کہ تجھے اس سے
زہر خورانی کا ڈر تھا! کیا تو نے اپنے باپ کو مشیرِ حکومت کی حیثیت
میں نہیں دیکھا، کیا تو نے نہیں سنا کہ تیرا چچا، تیرا دادا، تیرا پردادا اور اس کا
باپ — یہ سب بھی مشیرانِ حکومت تھے۔ کیا تو یہ نہیں جانتی کہ
میٹلس تیرا خاوند تھا، وہ میٹلس جو بہادر بھی تھا اور مشہور بھی اور
ایک ممتاز محبِ وطن، جو لوگوں کی نظروں میں آتے ہی شان اور
لیاقت اور وقار میں اپنے سب ہم وطنوں سے بازی لے گیا! ایسے
اونچے خاندان میں بیاہی جا کر اور خود بھی ایک شاندار خاندان کا فرد
ہو کر بھی کیلیس میں اور تجھ میں اتنی گہری کیوں چھنتی تھی؟ کیا وہ تیرا
رشتہ دار تھا! تیرے کنبے میں سے تھا! تیرے خاوند کا دوست تھا!
نہیں! ان میں سے وہ کوئی بھی نہ تھا۔ پھر اس حالت میں تیرے اُس سے
ملنے کا سبب نفس پروری اور عاقبت نااندیشی کے سوا اور کیا ہو سکتا
ہے! اگر ہمارے خاندان کے بڑے بوڑھوں کی یاد تیرے دل پر
اثر نہ کرسکتی تھی تو کیا میری بیٹی بھی تیرے سینے میں گرہستی کی خوبیوں کی
جوت نہ جگا سکتی تھی! وہی خوبیاں جو کہ عورت کی اصلی شان ہیں!
تو اپنے باپ، دادا یا مجھ سے لے کر موجودہ نسل تک کے تمام خاندان
کے مرد و عورتوں کی خوبیوں کو اختیار کرنے کی بجائے اپنے بھائی کے عیبوں
ہی کو کس لئے اپنا مسلک بناتے ہوئے ہے! کیا میں نے اپنے ملک
کو پائیرس کے ساتھ اسی لئے صلح نہ کرنے دی تھی کہ تو رسوا کرنے والی
عشق بازی میں روز و شب مشغول رہے! کیا میں نے شہر کی آب
رسانی کا انتظام اس دن کے لئے کر دیا تھا کہ تو اُسے ناپاک کاموں کے
لئے استعمال کرے! کیا میں نے بڑی سڑک اس لئے بنوائی تھی کہ اس پر
تو اور تیرے متوالے چلتے نظر آئیں؟"

"لیکن حضرات! میں یہ کیا کہہ رہا ہوں! ایسی معزز شخصیت کو

یہاں ٹالنے میں مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں وہ یک بیک میرے مؤکّل کیلیئس کی طرف مخاطب ہو کر سختی کے ساتھ اُسی کا جائزہ لینا نہ شروع کر دے۔ لیکن میں ابھی تھوڑی دیر میں آپ ہی اس طرف آؤں گا اور اصل بات چھیڑوں گا کیونکہ مجھے اپنے آپ پر پورا بھروسہ ہے کہ میں کیلیس کے کردار کو سخت سے سخت محتسب کی نظروں میں بھی ہر الزام سے مبرّا ثابت کر دکھاؤں گا۔ اب رہی تیری بات، اے کلوڈیہ! (اب سے میں بغیر کسی دوسرے فرضی کردار کو بیچ میں لائے ہوئے اپنی شخصیت میں تجھ سے مخاطب ہوں گا)۔ اگر تو چاہتی ہے کہ میں اپنے افعال، اپنے الفاظ، اپنے لگائے ہوئے الزامات، اپنی تھوپی ہوئی تہمتوں، اپنی خفیہ کارگزاریوں کے بارے میں مطمئن کر دے تو تجھے لازم ہے کہ میرے مؤکّل سے اپنی اس گہری شناسائی، اس گہری دوستی اس گہری دل بستگی کی وضاحت کرے۔ میرے مؤکّل پر الزامات لگانے والے ببانگِ دہل چند باتوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ وہ تعیّش پرستی کا ذکر کرتے ہیں، حمّاموں کی بات کرتے ہیں، دعوت ہائے طعام، عشق بازی اور بدکاری، گانے بجانے اور پکنک اور تفریحی کشتیوں کا بیان کرتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی ساتھ اُن کے مُنہ سے یہ بات بھی نکل جاتی ہے کہ وہ تیری ہدایات کے بغیر کوئی بات نہیں کہتے ہیں۔ چونکہ تیری تیز اور لااُبالی اُفتادِ طبع نے تجھے اس عدالت میں لا کھڑا کیا ہے۔ اس لئے یا تو تجھے ان تمام باتوں سے انکار کر کے انہیں غلط ثابت کرنا چاہئے، ورنہ مان لینا چاہئے کہ تیرے الزامات اور تیری شہادت دونوں بے بنیاد ہیں۔ لیکن اگر تو چاہے کہ میں تجھ سے زیادہ مہذّبانہ طریقے پر بات کروں تو میں یہ کروں گا کہ اُس جاہد اور تقریباً وحشی بڑے میاں کو علیحدہ کر دوں گا۔ اور تیرے موجودہ رشتہ داروں میں سے کسی ایک کو چُن لوں گا۔ اور کسی اور کی بجائے تیرے سب سے چھوٹے بھائی کو چُن لوں گا۔ جو اپنے رنگ میں شائستگی کا نمونہ ہے، اور تیرا بہت دلدادہ بھی ہے جتیقتاً وہ ایک ناقابلِ توجیہہ قسم کی کمزوری کی وجہ سے، شاید اس وجہ سے کہ رات کو اُسے اکیلے ڈر لگتا ہے، ہمیشہ تیرے ساتھ ہی سوتا رہا ہے۔ بالکل ایسے جیسے کہ کوئی ننھا بھائی اپنی بڑی بہن کے ساتھ سوتا ہو۔ فرض کرو کہ وہ تجھے یوں کہتے ہیں، یہ تمام ہنگامہ کس لئے؟ اتنا غضب میں کیوں آتی ہو؟ اور اپنے جوش و خروش سے ایک ذرا سی بات کو اتنی اہمیّت کیوں دے رہی ہو؟ تم نے اپنے ایک نوجوان ہمسائے سے آنکھیں لڑائی ہیں، اُس کے رنگ۔ روپ، اُس کی شکل و صورت، اُس کی آن بان، اس کی آنکھوں نے تمہیں موہ لیا ہے، اور تم اُس سے ملنے کی اکثر مشتاق رہی ہو، اور لوگوں نے بعض دفعہ اُسے اور تمہیں ایک ہی گھر میں بھی دیکھا ہے، تمہارے ایسے رتبے کی عورت کو اُس کے ساتھ دیکھا ہے، لیکن اپنی تمام دولت کے باوجود تم اُس کی توجہات کو نہیں اپنا سکیں، اگرچہ وہ ابھی تک اپنے سخت گیر باپ کی ماتحتی میں ہے، پھر بھی تمہارے تحفوں کو پاؤں تلے روندتا ہے، وہ اُن سے گھن کھاتا ہے، اُس کی نظروں میں اُن کی کوئی قدر و قیمت ہی نہیں ہے۔ تم کسی اور ہی جگہ چلی جاؤ۔ ٹائبر کے قریب تمہاری ایک حویلی ہے، اور اس جگہ جہاں ہمارے شہر کے تمام نوجوان نہانے جاتے ہیں تم نے بڑی محنت اور توجہ سے اپنے لئے ایک رہنے کی جگہ بنائی ہے، وہاں تمہیں ہر روز اپنے آپ کو تسلّی دینے کا کوئی نہ کوئی موقع مل جائے گا۔ اُس بےچارے کو کیوں مصیبت میں ڈالتی ہو جو تمہیں پسند ہی نہیں کرتا؟"

اس تقریر میں سسرو نے کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھی۔ کسی بات کو دبانے کی ذرا سی کوشش بھی نہیں کی۔ کیلیس پر لگائے ہوئے الزامات سے اُس کو بری ثابت کرنے کے لئے اُس نے پوری صاف گوئی اور بےباکی سے کام لیا ہے۔ آگے چل کر وہ کہتا ہے:۔

"اب میں کلوڈیہ کے خلاف کچھ بھی نہیں کہہ رہا ہوں لیکن اگر کوئی ایسی عورت ہو جس کا جسم کلوڈیہ کے جسم سے مختلف ہو اور وہ ہر شخص کے سامنے اپنے آپ کو پیش کر دیتی ہو، اور جو ہمیشہ کسی نہ کسی کو اپنی التفاتِ خاص کے لئے حاصل کر لیتی ہو اور اس بات کو لوگوں کی نظروں سے چھپاتی بھی نہ ہو، جس کا گھر بار، جس کے باغ باغیچے، جس کے حمّام ناجائز نفس پروری کے لئے کھلے رہتے ہوں، یہی نہیں، بلکہ جو نوجوانوں کو اپنے خرچ پر رکھتی ہو اور اپنے دھن دولت کو اس مصرف میں لاتی ہو کہ اس سے اُن نوجوانوں کی تواضع کرے جن کے کنجوس ابّا جان انہیں بہت ہی کم جیب خرچ دیتے ہوں، اگر کوئی ایسی عورت ہوگی جو ایسی عیّاشی کی زندگی گذارتی ہو، اور اپنی طبعی شہوانیت کا اظہار اپنے چلن کی شوخی اور بےباکی سے کرتی ہو، اپنی دولت کو فضول خرچیوں میں ضائع کرتی ہو، اور اگر اس کی مستی اُسے تھگی تک پہنچا دے، تو کیا اُس شخص کو ہم عیّاش کہیں گے۔

جو اُس عورت سے ذرا آزادانہ میل جول رکھتا ہو؟ . . . . . .
لیکن کیا کلوڈیہ کی ہمسائگی میں ان باتوں کی بھنک ہی نہیں؟ کیا لوگ اس معاملے میں چُپ کا روزہ رکھے ہوئے ہیں؟ کیا ساحل کا پانی کچھ کہتا ہی نہیں؟ ساحل کا پانی نہ صرف کچھ کہتا ہے بلکہ وہ چلّا چلّا کر پکار رہا ہے کہ ایک عورت کا چلن اتنا بڑھ گیا ہے کہ وہ نہ صرف علیحدگی، خلوت، تاریکی اور اسی قسم کی گناہوں کی پردہ پوشی کرنے والی چیزوں کی تلاش نہیں کرتی بلکہ اسے دن دہاڑے لوگوں کے سامنے حد سے بڑھی ہوئی بدنام کرنے والی عیاشیوں میں حصہ لینے سے ایک خاص لطف ملتا ہے۔ اگر کوئی شخص یہ خیال کرے کہ نوجوانوں کو رنڈیوں سے آزادانہ میل جول نہیں رکھنا چاہئے تو وہ شخص یقیناً سختی سے کام لے رہا ہوگا۔ میں ایسے شخص کی حمایت تو کرہی نہیں سکتا۔ البتّہ مجھے اتنا ضرور کہنا پڑے گا کہ وہ شخص نہ صرف موجودہ زمانے کی آزادی کا مخالف ہے بلکہ ہمارے باپ دادا جو کچھ جائز سمجھتے اور کرتے رہے ہیں وہ اس کا بھی مخالف ہے۔ کیا کبھی کوئی ایسا وقت بھی آیا ہے جب یہ باتیں نہ ہوتی رہی ہوں؟ جب ان باتوں کو بُرا جان کر ممنوع قرار دیا گیا ہو؟ ایسی باتیں کب نہیں ہوتی رہیں؟ مختصراً یہ کہ کسی نے بھی وہ زمانہ دیکھا ہے کہ جب جائز باتوں کو ناجائز سمجھا جا رہا ہو؟

یہاں میں آپ سے ایک بات پوچھتا ہوں۔ میں کسی خاتون کا نام نہیں لوں گا، بلکہ ہر شخص اس کے متعلق اپنا اندازہ لگا سکتا ہے۔ اگر کوئی غیر شادی شدہ عورت اپنے گھر میں ہر کسی کی نفس پرستی کے لئے صلائے عام دے دے، اور صاف طور پر اپنے آپ کو رنڈی مان لے اور اکثر اوقات محض اجنبیوں کے ساتھ تفریحی مقامات پر چلی جایا کرے اگر وہ عورت یہ سب باتیں روما میں کرے، اپنی حویلی میں کرے، اور اُس ساحل پر کرے جہاں ایسی ہی باتیں ہوتی ہیں، قصہ کوتاہ، اگر وہ نہ صرف اپنی چال ڈھال سے بلکہ اپنے لباس سے، نہ صرف اپنی آنکھوں کی چمک سے بلکہ اپنی بات چیت کی آزادی اور اپنے بوسوں سے، اپنی ہم آغوشیوں سے، حماموں اور تفریحی کشتیوں میں اپنے چلن سے اپنے آپ کو نہ صرف ایک رنڈی بلکہ ایک بے باک رنڈی بن کر دکھائے، تو اگر کوئی شریف نوجوان اتفاقاً اس کے ساتھ دیکھا جائے تو کیا ہم اُس نوجوان کو عیاش تصور کریں گے؟

یہ عورت تھی لیسبیہ یعنی کلوڈیہ جو روما کے سب سے بڑے

غزلیہ شاعر کی محبوبہ تھی۔ سسرو کی اس تقریر سے اچھی طرح ظاہر ہے کہ اس میں عورت کی مقررہ خوبیوں میں سے کوئی بھی خوبی نہ تھی۔ لیکن اس میں اپنے رنگ کی ایک ایسی دلکشی تھی جس کی تاب کم سے کم کیٹولس نہ لا سکتا تھا لیکن آخر کار لیسبیہ کی بے وفائیوں سے تنگ آکر کیٹولس کی یہ حالت ہوئی کہ

اُس آگ کا دھواں بھی نہیں اب دماغ میں
سودائے زلف و عارض زیبا نہیں رہا تاثیر

اُس وقت خدا سے اُس کی یہی دعا تھی کہ وہ اس کی روح کو صفائی بخشے اور اُسے اس مہلک مرض سے رہائی دے۔ اُس کی ایک نظم اس کے ذہن کی اسی کیفیت کو ظاہر کرتی ہے۔

ترکِ تعلق

بُھلا دے اے عاشق ناشاد! چھوڑ اب اس حماقت کو،
جو کھویا، بھول جا اُس کو، کہ یوں پائے گا راحت کو
یہ مانا ہم نے سورج نیر تاباں اور درخشاں تھا
مگر بیتے، وہ دن بیتے کہ لمحہ لمحہ شاداں تھا
وہ دن بیتے کہ جب تو اُس کے پیچھے پیچھے جاتا تھا
جب اُس کے اور تیرے دل میں بس اک دھیان آتا تھا
وہ عورت جس کو تو نے اس وفاداری سے چاہا ہے
مقابل آج تک جس کا سنا ہے اور نہ دیکھا ہے
وہ دن تھے جب ترا سورج درخشاں اور تاباں تھا
وہ دن تھے جبکہ گوشہ گوشہ تیرے دل کا فرحاں تھا۔
مگر اب وہ نہیں ویسی، زمانہ ہو چکا تیرا،
بدل دے کیفیت دل کی، نہ اُس کے پیچھے پیچھے جا۔
بنا لے دل کو پتھر اور رجو دکھ آئے اُسے سہہ لے،
دکھوں کے جال میں اب زندگی کو مت اُلجھنے دے۔

خدا حافظ مری جھوٹی محبت! اب خدا حافظ
مری محبوبا اے بے رحم عورت! اب خدا حافظ
میں دل کو آج سے فولاد کے ایسا بناؤں گا
ملے گر اور رستے تو دل میں رنگش تک نہ لاؤں گا

مگر آئے گا ایسا ایک دن جس دن کہ تو ہوگی
اکیلی، اور نہ ہوگا پاس تیرے کوئی بھی پریمی
خدا حافظ، مگر میں سوچتا ہوں، زندگی تیری
کسے معلوم مستقبل میں کروٹ کس طرح لے گی
ترے گھر کون آئے گا، کسے ہنس کر ملے گی تو،
کسے وحشی بنائے گی یہ تیرے جسم کی خوشبو،
ترے حسن و ادا کو کون جی بھر بھر کے دیکھے گا،
وہ ہوگا کون جو ان رس بھرے ہونٹوں کو چومے گا۔
مگر خاموش ہو جا، تھام لے دل کو نہ رو پریمی!
اور اپنے دل میں بھر لے آج سے سختی چٹانوں کی۔

اختر شیرانی نے بھی اپنی ایک نظم "ہرجائی" میں کچھ اسی قسم کی بات لکھی ہے۔ چند اشعار موازنے کی دلچسپی کے لئے دیکھئے:۔

عشق میں تجھ کو بھی اپنا ہم زباں سمجھا تھا میں
تیرے دل کو درد دل کا راز داں سمجھا تھا میں
تیرے سینے میں تھا رقصاں حرص کا آتشکدہ
جس کو نور شمع عشق جاوداں سمجھا تھا میں
تیرے ذوق شعر سے منکر نہیں لیکن اسے
آسمانی رفعتوں کا ترجماں سمجھا تھا میں
کون واقف تھا تری ہستی ہے وقفِ این و آں
آہ! تجھ کو ماورائے این و آں سمجھا تھا میں
آہ! تو نکلی فریب حسن کی زندہ مثال۔
تجھ کو اک حسن حقیقت ترجماں سمجھا تھا میں
تو وہ ساغر تھی ہر اک کے ہونٹ جس کو چھو سکیں
ساغر خورشید و مہ کا ہم عناں سمجھا تھا میں
ہر مکاں نکلا تری جلوہ گری سے آشنا
تیرے ہر جلوے کو نور لامکاں سمجھا تھا میں
ایک ناگن بن کے لہراتی ہے تو افکار میں
حسن کی اک سلسبیل بے کراں سمجھا تھا میں

۵۶ھ ق م میں جب کیٹولس اٹلی سے لوٹا تو اُسے کلوڈیہ کے مقدمے کے حالات سے آگاہی ہوئی اور اُس نے اپنے عشق کے بندھنوں کو ہمت سے کام لے کر توڑ ڈالا۔ شاید اسی زمانے میں اس نے سسترو کے متعلق وہ قطعہ لکھا ہو جو اس مضمون کے شروع میں دیا گیا ہے۔ اس زمانے میں اُس نے کلوڈیہ کے متعلق وہ نظمیں بھی کہیں جن میں اُسے جی بھر کر گالیاں دی گئی ہیں لیکن ان گالیوں کے باوجود وہ اُسے نہ بھول سکا بلکہ ممکن ہے کہ کلوڈیہ نے اُسے از سر نو اپنے جال میں پھنسانے کی کوشش کی ہو مگر اس کوشش کا جواب اُس کی ایک نظم میں ہے جو اس نے اپنے ان دو دوستوں کو مخاطب کر کے کہی جنہوں نے کلوڈیہ کی پیغامبری کی ہوگی۔

۵۴ھ ق م میں کیٹولس مر گیا۔ چھ سال بعد اُس کا دوست کیلیس بھی مر گیا اور اس سے پانچ سال بعد سسترو بھی ختم ہوا۔ صرف کلوڈیہ زندہ رہ گئی۔

کیٹولس کے کلام سے اس کے جذبات کی شدت، اُس کی طبیعت کی نرمی، اُس کے مزاج کی شگفتگی، اُس کے ذہن کی اچانک بدلتی ہوئی کیفیتیں، ان سب کا اظہار ہوتا ہے۔ اگر احساس کی تندی اور تیزی کو شاعری کی ممتاز خصوصیت قرار دے دیا جائے، تو کیٹولس کا کلام اس لحاظ سے روما کے دوسرے شعراء کے مقابلے میں کسی طرح کم نہیں ہے بلکہ زیادہ ہے۔

انگریزی نقاد جناب میکائیل کی نظر میں کیٹولس کا شمار دنیا کے بہترین غزلیہ شاعروں میں ہے۔ نقاد میکائیل کی نظر میں دنیا کے بہترین غزلیہ شاعر تین ہیں۔ یونان کی شاعرہ سیفو، انگلستان کا باغی شاعر شیلے اور قدیم روما کا رومانی شاعر کیٹولس۔ کیٹولس کے کلام میں آہ بھی ہے اور آورد بھی۔ لیکن اُس کی آہ میں جذبات کی گہرائی اور سادگی کوئی معمولی بھلا دینے والی بات نہیں ہے۔

اب چند نظمیں اور دیکھئے:۔

دوست سے

زندگی روٹھ چکی ہے مجھ سے،
مشکلیں ختم نہیں ہوتی ہیں۔
درد بڑھتا ہی چلا جاتا ہے،
ہر گھڑی درد ہے دل کا، اور میں

گرچہ آسان تھی یہ بات تجھے،
کچھ تو آرام مجھے ہو جاتا۔
تو نے کوشش ہی نہیں کی اس کی،
ترے دو لفظ تھے دارو دل کا۔

رنج ہے اس کا مجھے، ہاں، اب بھی
مجھ کو دو لفظ ہی کہلا بھیجو،
دل پہ ہے ایک اداسی چھائی،
کچھ تو آرام ملے اس دل کو

لیسبیہ کی محبت میں پوری تسکین نہ مل سکنے سے کیٹولس کے دل میں جو خلا پیدا ہوئی، اُسے بھائی کی گہری محبت کے جذبے نے پُر کیا۔ یہ نظم اُس نے اپنے ایک سفر کے دوران میں اس قبر پر جا کر کہی تھی۔ اس سے شاعر کے دلی احساسات کے علاوہ رومنوں کی ایک رسم کا پتہ بھی چلتا ہے یعنی وہ اپنے گذرے عزیزوں کی قبروں پر جاتے ہوئے ان کے لئے تحفے تحائف بھی لے جایا کرتے تھے۔

بھائی کی قبر

کئی سرزمینوں کو چھوڑا ہے پیچھے
سمندر کئی پار میں نے کئے ہیں۔
مرے بھائی! آیا ہوں تیری لحد پر
کہ جس پر غم و رنج چھائے ہوئے ہیں۔

تری روح کے واسطے چند تحفے۔
میں ساتھ اپنے اس وقت لایا ہوا ہوں
تری روح کے ساتھ جواب ہے سایہ
میں کہنے کو دُکھ سُکھ کے آیا ہوا ہوں۔
چرا کر تجھے اندھی دیوی، یہاں سے
جہاں لے گئی، رات چھائی ہوئی ہے۔
وہاں میری آنکھیں نہیں دیکھ سکتیں
تری شکل، جو دل کو بھائی ہوئی ہے۔

اسی واسطے چند تحفوں کو لے کر،
ترے آخری گھر پہ آیا ہوا ہوں۔
یہ تحفے مرے آنسوؤں سے ہیں بھیگے،
بس اب الوداع! یاں سے میں جا رہا ہوں!

وعدہ

تو کہتی ہے، چاہت اپنی بھرپور مسرّت سے ہوگی
تو کہتی ہے، اس چاہت سے ظاہر ہے رنگ ہمیشہ کا
میں کہتا ہوں، یہ بات تری اک قول بنے پکا سچا،
جو بات کہی ہے ہونٹوں سے یہ گونجے تیرے دل میں بھی
اور جیون کے رستے پہ سدا، ہاتھوں میں تھامے ہاتھوں کو،
دونوں چلتے جائیں، دل پہ چاہت کا سنہری بندھن ہو

محبت کی مسرّت

آرزو میں جب اچانک اک نشے کا رنگ ہو،
زندگی میں اس سے بڑھ کر کوئی راحت ہے کہاں؟
میری آنکھیں دیکھتی ہی جائیں تیرے روپ کو،
میں یہ کہتا ہوں کہ بہتر اس سے دولت ہے کہاں؟
آرزوئیں میرے دل کی آخری دم پر ہی تھیں،
جب اچانک لوٹ کر تو پاس میرے آگئی
اب تو میرے دل میں غم کا نام بھی باقی نہیں،
عیش ہے، اب عیش ہے، دن عیش کا، رات عیش کی،
اس سے بڑھ کر کوئی نعمت دیوتاؤں نے نہ دی،
مجھ سی خوش بختی کہاں پائے گا کوئی آدمی؟

میراجی

چل چلاؤ

بس دیکھا، اور پھر بھول گئے
مت جانو ہمیں تم ہرجائی،

جب حسن نگاہوں میں آیا
ہرجائی کیوں؟ کیسے؟ کیسے؟

من ساگر میں طوفان اُٹھا
کیا داد جو اک لمحے کی ہو وہ داد نہیں کہلائے گی؟

طوفان کو چنچل دیکھ ڈری آکاش کی گنگا دودھ بھری۔

اور چاند چھپا، تارے سوئے، طوفان مٹا، ہر بات گئی
جو بات ہو دل کی آنکھوں کی،

دل بھول گیا پہلی پوجا، من مندر کی مورت ٹوٹی
تم اس کو ہوس کیوں کہتے ہو؟

دن لایا باتیں انجانی، پھر دن بھی نیا اور رات نئی،
جتنی بھی جہاں ہو جلوہ گری اُس سے دل کو گرمانے دو۔

پیتم بھی نئی، پریمی بھی نیا، اور سپنے نئے، ہر بات نئی۔

اک پل کو آئی نگاہوں میں جھلمل جھلمل کرتی پہلی
ہر شئے فانی، ہر شئے فانی۔

سندرتا اور پھر بھول گئے
ہر جذبہ فنا ہو جائے گا۔

جب تک ہے زمیں
ہر منظر ہر انساں کی دنیا، اور میٹھا جادو عورت کا،
جب تک ہے زماں
اک پل کو ہمارے بس میں ہے، پل بیتا سب مٹ جائے گا
یہ حسن و نمائش جاری ہے!
اس ایک جھلک کو چھلتی نظر سے دیکھ کے جی بھر لینے دو
اس ایک جھلک کو چھلتی نظر سے دیکھ کے جی بھر لینے دو
تم اس کو ہوس کیوں کہتے ہو؟
کیا داد جو اک لمحے کی ہو وہ داد نہیں کہلائے گی؟

ہم اس دنیا کے مسافر ہیں،
اور قافلہ ہے ہر آن رواں۔
ہے چاند فلک پر اک لمحہ!
ہر بستی، ہر جنگل، صحرا، اور روپ منوہر پربت کا،
اور اک لمحہ یہ ستارے ہیں!
اک لمحہ من کو لبھائے گا، اک لمحہ نظر میں آئے گا۔
اور عمر کا عرصہ بھی، سوچو، اک لمحہ ہے!

میراجی

انتخاب

کردار

خالہ بی۔ چالیس پینتالیس سال کی امیر بیوہ بھاری بھرکم اپنی عمر سے زیادہ جوان اور خوبصورت نظر آتی ہیں۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے بردباری اور غرور ٹپکتا ہے کن پٹیوں پر ہلکے ہلکے سفید بالوں کی جھلک پیدا ہو گئی ہے۔ چھوٹے سے دہانے میں اگلے تین مصنوعی دانت کسی طرح اصلی بتیس سے کم خوبصورت نہیں۔ چال میں ایک دبدبہ ہے اور تمکنت۔

شمیم ۔۔۔ خالہ بی کی بھانجی۔ خالص ہندوستانی رنگ اور معمولی نقشہ کا مجموعہ سیدھی سادی بچی خالہ بی کے دباؤ میں رہنے والی کبھی سید سے منہ بات نہیں کرتی۔ لوگ کہتے ہیں اس کا معدہ خراب رہتا ہے اس لئے اس قدر چڑچڑی اور کھسیانی ہوتی رہتی ہے۔ اللہ جانے۔

واجد ۔۔۔ شمیم سے سال ڈیڑھ سال بڑا بھائی۔ سیدھا سادہ۔ جلد باز۔

عالم ۔۔۔ واجد کا بچپن کا دوست جمن اور ہم جماعت۔ ذرا قد میں لمبا ہے لیکن دبلا اور ذرا کرخت ساخت کا بنا ہوا جسم۔ ناک نقشہ بالکل عام انسانوں جیسا۔ بہت بے تکلف۔ گویا اپنے ہی گھر میں رہتا ہے۔

نوکر ۔۔۔ ننھی فرید اور حسب ضرورت صرف نام لینے کے لئے۔

اسٹیج ۔۔۔ شمیم کا کمرہ اور ایک عام ہندوستانی بی بی کے بیٹھنے کا برآمدہ جس میں چار تختوں کا فرش ہے اور ادھر ادھر حسب ضرورت کرسیاں وغیرہ رکھی ہیں۔

زمانہ ۔۔۔ جو بھی آپ کو پسند ہو۔

(وقت شام شمیم اپنے کمرے میں بیٹھی کچھ پڑھ رہی ہے۔ ایک دروازہ پشت پر ہے اور دو دائیں اور بائیں طرف، بائیں طرف کا دروازہ کھلتا ہے اور خالہ بی نظر آتی ہیں۔ وہ کچھ دیر شمیم کو منتظر نظروں سے دیکھتی ہیں اور پھر اندر آ جاتی ہیں)

خالہ بی۔ اے شمیم یہ نہا دھو کر گیلے بالوں سے اندر آ کر بیٹھ گئیں؟ بال بھی سکھائے۔ ذرا باہر ہی نکلو۔ توبہ ہے۔

شمیم۔ جی خالہ بی ابھی جاتی ہوں۔

خالہ بی۔ تو آخر اس قدر شام گئے نہانے کا کونسا فیشن نکالا ہے جب ذرا سی بھی دھوپ نہیں رہتی گھر میں تو بیگم غسل کرنے چلتی ہیں۔ گیلے بال! غضب خدا کا ذرا سی دیر میں سردی لگ جائے۔

شمیم۔ (بالوں میں انگلیوں سے کنگھی کر کے) سوکھ تو چلے اب۔

خالہ بی۔ خاک سوکھ چلے! ذرا اپنا ڈیل ڈول دیکھو اور یہ بے احتیاطیاں۔

شمیم۔ (ذرا تنگ آ کر) کہہ تو دیا کہ ابھی جاتی ہوں باہر۔

خالہ بی۔ تم جانو میں تو بھئی تمہارے ہی بھلے کو کہتی ہوں۔ اپنے پالے کا سب ہی کو درد ہوتا ہے۔ یہ کہو محبت سے مجبور ہوں اور تم سمجھتی ہو کہ ۔۔۔۔

شمیم۔ (نصیحت کے طوفان سے ڈر کر) یہ میں نے کب کہا! (جانے کے لئے اٹھتی ہے) جا تو رہی ہوں

خالہ بی۔ اب کیا سردی میں مرنے کو جاؤ گی! ادھری ہے دھوپ تمہارے لئے اس وقت! اب بیٹھی ہو تو بیٹھی رہو۔ ننھی سے کہتی ہوں انگیٹھی یہیں لے آئے (دروازے کی طرف مڑ کر) ننھی ۔۔۔ اے ننھی ۔۔۔ کتنی دفعہ کہا کہ اللہ کی بندی منہ سے بولا کر دکہ بس چلی آ رہی ہیں (ننھی کی آواز دروازے کے پاس آتی ہے اور وہ اندر جھانکتی ہے) ذرا لپک کے کوئلے انگیٹھی میں ڈال کے تو لے آؤ۔ ہاں ۔۔۔ سنو ذرا دیکھ لانا یہ نہیں کہ دھواں پھیلے ۔۔۔ اور ہاں میری شال اگنی

پر پڑی ہوگی وہ بھی لیتی آنا خود سے، موئی انگلیاں اینٹھی جاتی ہیں۔ کیا بلا کی سردی ہے ــــ اور شمیم تم کچھ پہنے بھی نہیں ہو۔ کیا کچھ برف کٹ رہی ہے۔

شمیم۔ (خاموشی سے ایک صدری کھونٹی پر سے اتار کر پہننے لگتی ہے)

خالہ۔ بیٹی میں تو تمہارے ہی بھلے کو کہتی ہوں ..... (ننھی کو کو آتا دیکھ کر) اے بس آ بھی چکو، تو بیگم کہ بس چل رہی ہیں دلہن کی چال (ننھی انگیٹھی لا کر رکھ دیتی ہے) ذرا ادھر سرکاؤ کیا سونی جلاؤ گی! .... آؤئی .... اے ذرا ادھر .... میں کہتی ہوں۔ (خود دوپٹے سے پکڑ کر سرکاتی ہیں) دل جلانے سے بہتر ہے انسان ہاتھ جلالے ... لو شمو ذرا سرک کر بیٹھو ..... ہاں .... (ننھی سے) اے بی میرا منہ کیا کھڑی تک رہی ہو (شمو سے) ہاں تو تمہارے ہی بھلے کے لئے کہتی ہوں، تم سمجھتی ہوگی میرا بھی کچھ فائدہ ہے۔

شمیم (خواہ مخواہ رنجیدہ ہو کر) جی نہیں تو!

خالہ۔ واجد اور تم ــــ دونوں ہی میری زندگی کا آسرا ہو ــــ میرا جو کچھ ہے تمہارے ہی لئے ہے۔ تم لوگوں کے علاوہ اور کون بیٹھا ہے میرا ــــ تم سمجھتی ہوگی میں تمہاری دشمن ہوں۔

شمیم۔ آپ تو یوں ہی کہہ دیتی ہیں۔ میں کیوں سمجھتی کچھ؟

خالہ! تو پھر کیا تم مجھے اپنا ہمدرد سمجھتی ہو؟ اگر ایسا ہے تو پھر بھول بھول کیوں جاتی ہو؟ جو بات میں کہتی ہوں وہ ...... ؟

شمیم۔ کیا بھول جاتی ہوں؟

خالہ۔ یہی کہ میں نے تم سے کتنی دفعہ کہا کہ بھئی عالم کو منع کر دو ــــ خواہ مخواہ ــــ یوں ہی .....

شمیم۔ (کچھ برا مان کر) کیا خواہ مخواہ؟

خالہ بی! یہی کہ وہ یہاں ــــ نہ آیا کرے ــــ اب ــــ تم جانتی ہی ہو ــــ کہ ......

شمیم۔ (کچھ نہ سمجھ کر) ایں؟

خالہ بی! اب تم کوئی ننھا بچہ نہیں ہو کہ کچھ نہ سمجھو میں کہتی ہوں وہ آخر کیوں آتا ہے یہاں؟

شمیم (دردمانسی ہو کر) تو خالہ بی کیا میں بلاتی ہوں اُسے؟

خالہ بی۔ تو منع کر دو نا۔

شمیم۔ منع کر دوں ــــ وہ مانے بھی جب میں اُسے کچھ کہتی ہوں تو کہہ دیتا ہے تمہارا گھر نہیں ہے، تم خود نکل جاؤ یہاں سے ــــ آپ کیوں منع نہیں کرتیں؟

خالہ بی۔ تم اُسے اپنے کمرے میں تو نہ آنے دو۔ نہ تم منہ لگاؤ گی اور نہ وہ آئے گا۔

شمیم۔ (چڑ کر) میں کب منہ لگاتی ہوں اُسے ــــ واہ! واجد کا دوست ہے۔ برسوں سے آتا ہی ہے اور مجھے تو آپ دیکھتی ہیں پریشان ہی کرتا ہے۔ میں تو خدا سے چاہتی ہوں وہ نہ آئے۔

خالہ بی۔ کچھ بھی ہو۔ اُس کا اس طرح گھس گھس کر آنا اچھا نہیں، لوگ نہ جانے کیا کیا کہنے لگتے ہیں۔

شمیم۔ کیا کیا؟

خالہ بی۔ ہاں جتنے منہ اتنی باتیں ــــ اور بھئی کوئی کسی کا منہ تھوڑی بند کر دیتا ہے۔

شمیم۔ کیا کہیں گے لوگ؟ وہ ہمیشہ سے جب سے بالکل چھوٹا سا تھا ہمارے یہاں آتا ہے۔

خالہ بی۔ اب تم تو ــــ بس بچہ بنی جاتی ہو۔ جب کی اور بات تھی بیٹی۔

شمیم۔ کیا بات تھی جب کی؟

خالہ بی۔ یہی کہ بھئی کھاتے پیتے گھر کا لڑکا ہے کسی دن اچھی خاصی جگہ لگ جائے گا ــــ اور اب ــــ

شمیم۔ (چہرے پر شکنیں ڈالے) اب کیا ہوگیا؟

خالہ بی۔ اب یہ بات ہے کہ اُس کے ابا مقدمے میں ہار گئے، مکان الگ ــــ

شمیم۔ پھر اس سے کیا ہوتا ہے؟

خالہ بی۔ (دبی زبان میں) پھر! پھر بس یہی ہوتا ہے کہ کوڑی کوڑی کو محتاج ہیں ــــ اور کیا؟

شمیم۔ تو ہم کیا کریں ــــ وہ کوئی ہمارے سر پر تو آن نہیں پڑا ــــ اپنا کھاتا ہے۔ ہمیں کیا؟

خالہ بی۔ اے ہے تم تو بس دیوانی ہو۔ بیٹی اب اور بات ہے ــــ بھئی ــــ اُونہہ! لوگ خواہ مخواہ باتیں بنانا شروع کر دیں گے۔ ویسے تمہارے خالو کا ارادہ تھا کہ ہاں بھئی کسی لائق ہوگیا تو دیکھا جائے گا ــــ مگر اب تو ــــ بھئی لوگ کیا جانیں۔

—— وہ سمجھیں گے اب بھی وہ اسی خیال سے آتا ہے۔

شمیم۔ (جل کر) ہونھ! آتا ہے۔ وہ کیوں آتا؟ جی ہاں!

خالہ بی۔ ہاں ہاں مگر لوگ کیا جانیں کہ اب ہمارا ارادہ رشتہ کرنے کا نہیں۔ خواہ مخواہ پیغام آنے بند ہو جاتے ہیں کہ بھئی اب تو ایک جگہ طے ہی ہو گئی۔ تم کیا جانو دنیا کی باتوں کو۔

شمیم۔ (سنجیدگی سے) اچھا — (عالم کو داہنے دروازے سے جھانکتا دیکھ کر گھبرا جاتی ہے۔ وہ جلدی سے بھاگ جاتا ہے) اچھا —

خالہ بی — میں — میں — ہا — ہاں۔

خالہ بی۔ (خوش ہو کر) ہاں بیٹی تم سمجھدار ہو — اور تمہارے ہی بھلے کی کہتی ہوں۔ ذرا بال سکھا لو تو باہر آؤ — میں ذرا کھانے والے کا کروں جا کے (چھلانے کو) کب تک کھل رہا ہے سکول تمہارا؟ کچھ کپڑے وغیرہ بھی ٹھیک کئے یا یونہی؟ ساڑھیاں تو کلکتے سے منگوا لو۔ غنی کو جمپر دے دو — آج آیا تھا تم سو رہی تھیں۔ پورے سال کا انتظام کر لو — اے ہاں، بیچ میں تو ضرورت نہ پڑے تمہارا ہی فائدہ ہے۔ (جاتی ہیں)

عالم۔ (اکڑتے ہوئے دوسرے دروازے سے داخل ہو کر) فائدہ — فائدہ بس ہر وقت فائدہ۔ جب دیکھو فائدہ۔ ہونہہ! بنئے کی سی روح پائی ہے — قسم خدا کی؟

شمیم۔ (اسے دیکھ کر تیوریاں چڑھاتی ہے)

عالم۔ کہاں گیا — وہ جن؟

شمیم۔ میچ دیکھنے۔

عالم۔ میچ دیکھنے؟ اور ہمیں لائبریری میں بٹھا گیا پڑھنے کو کہ امتحان آرہے ہیں! قسم خدا کی!

شمیم۔ (جلدی بات ختم کرنے کو) تو کیا ہوا جو آج پڑھ لیا — اب چلے جاؤ میچ دیکھنے۔

عالم۔ اب چلے جاؤ۔ ہونہہ! گویا میرے لئے رات بھر میچ ہوتا رہے گا۔ آخر اس باجی کو حق کیا کہ خود تو جائے میچ دیکھنے اور ہمیں بٹھوائے تین گھنٹے — (تین انگلیاں ہلا کر) خدا کی قسم تین گھنٹے ثبت کے — متواتر! سوچو ذرا — تین — اتنی دیر میں نہ جانے کتنے میچ دیکھے جا سکتے ہیں۔

شمیم۔ (ٹالنے کو) تو اب واہ بد سے لڑنا ہے ارادہ مانع تو نہ چاٹو — جاؤ۔

عالم۔ (کھڑے ہی کھڑے) دماغ! ہونہہ گویا آپ کے بھی دماغ ہے! —— خوب! خالی ہنڈیا بھلا میں کیا چاٹوں گا۔

شمیم۔ (بہانہ پا کر) ہوگا — خیر جاؤ میں اس وقت — (کتاب پڑھنے لگتی ہے) فضول بکواس۔

عالم۔ فضول — اور بکواس — دو لفظ بدتمیزی کے؟ (کتاب چھین کر پھینکتے ہوئے) ہم تین گھنٹے پڑھ کر آرہے ہیں — کتاب دیکھ کر جی متلا رہا ہے — بس ——

شمیم۔ (غصے سے) بھئی ہو چکی بدمذاقی — ہر وقت یہی —— خیر جاؤ یہاں سے — (کتاب اٹھا کر جھاڑتی ہے) جاؤ نا

عالم۔ ضرور! (بیٹھ جاتا ہے) تم ہو کون بھیجنے والی!

شمیم۔ (غرور سے بڑبڑا کر) نہ جاؤ میری بلا سے —

عالم۔ بلا سے! تم خود بلا ہو — ہونہہ! گویا بڑی ——

شمیم۔ (مذاق بڑھانا نہیں چاہتی لہٰذا چپ ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھ کر بیٹھ کر پڑھنے لگتی ہے)

عالم۔ خیر بھئی پڑھو —— (اٹھ کر اس کی پشت پر الماری میں کتابیں دیکھنے لگتا ہے کن انکھیوں سے اسے دیکھتا جاتا ہے — قریب آ کر آہستہ سے اس کا ایک بال پکڑ کر کھینچتا ہے —— شمیم صرف سر کھجاتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد عالم پھر ایک بال توڑتا ہے۔ وہ بال سمیٹ کر جوڑا باندھ لیتی ہے۔ عالم ایک سگریٹ سلگاتا ہے۔ بجھتی ہوئی دیا سلائی اس کی انگلی سے لگا دیتا ہے۔ شمیم اچھل پڑتی ہے۔ اور مڑ کر اسے گھورتی ہے۔ عالم بے تعلقی سے کرخت چہرہ بنائے کتابوں کو گھورتا ہے)

شمیم۔ بے ہودہ کہیں کے میں خالہ بی سے کہہ دوں گی۔ بے حیا کہیں کے گھنٹہ بھر سے کہہ رہی ہوں جاؤ، جاؤ سنتے ہی نہیں — کوئی اور ہوتا تو کبھی نہ آتا پھر اس کمرے میں۔

عالم۔ بدتمیز خود اور بے حیا بھی پرلے درجے کی۔ بس۔ کوئی اور ہوتا تو پکڑ کے تمہیں ٹھونکتا بری طرح کوئی تمہارے یہاں آئے اور تم ٹھونتی سجا کر بیٹھ جاؤ۔

شمیم۔ میں کہتی ہوں جب کمبخت کسی کی یہاں ضرورت نہ ہو تو۔ تو پھر کوئی کیوں آئے؟ لعنت ہے۔

عالم۔ لعنت خود تمہارے منہ پر۔ پڑھنا خاک نہیں آتا

ہیں ٹالسٹائی۔

شمیم۔ اللہ مجھے یہ ٹالسٹائی ہے! (دکھاکر) ہارڈی ہے۔

عالم۔ وہ ہارڈی ہوں یا پہاڑ ڈی تمہارے بس کا روگ نہیں۔ کیوں دماغ کھپا رہی ہو ــــ اس سے تو بہتر ہے کہ جاکر روٹی پکانا سیکھو جو کسی کام بھی آئے۔

شمیم۔ روٹی پکانا سیکھو تم جسے باورچی گیری کرنی ہو۔

عالم۔ یہی تو خرابی ہے پڑھی لکھی لڑکیوں میں کہ گھر کے کام کاج سے نفرت کرنے لگتی ہیں۔

شمیم۔ (بے پروائی سے) ہونے دو خرابی تمہاری بلا سے۔

عالم۔ تمہاری بلا سے! لیکن پھر بھی اگر پکانا پڑے تو؟ کیا کرو تم؟

شمیم۔ کیوں پکانا پڑے؟ خدا کرے تمہیں بھیک مانگنا پڑے تو!

عالم۔ کسی وقت ــــ نہ ہو نوکر تو کون پکائے؟

شمیم۔ تم پکاؤ اور کون؟ جاؤ یہاں سے بک بک نہ کرو۔ ورنہ کہتی ہوں خالہ بی سے۔

عالم۔ کہہ دو ــــ کہہ دو ہزار دفعہ کہہ دو ــــ نہیں جاتے۔

(پیچھے کے دروازے سے واحد آتا ہے)

واحد۔ (آکر بغیر سوچے سمجھے) ہاں نہیں جاتے؟ کیوں جائیں!

عالم۔ (شیر ہو کر) ہاں کیوں جائیں۔ بے شک!

شمیم۔ تمہارے تو اچھے بھی جائیں گے میرے کمرے سے۔

واحد۔ قطعی نہیں۔ بیٹھ جاؤ عالم ــــ لو (بیٹھ کر) نہیں جاتے کر لو کچھ

عالم۔ (فوراً نقل کرتے ہیں) ہاں کر لو کچھ!

شمیم۔ تم نہ جاؤ ــــ میں خود جاتی ہوں۔ (جانے لگتی ہے)

واحد۔ نہ۔ نہ۔ تم بھی نہیں جا سکتیں۔ لینا عالم اسے (شمیم جلدی سے بھاگ جاتی ہے۔ لیکن دونوں بچوں کی طرح اُسے پکڑ کر لے آتے ہیں۔ ایک ایک بازو دونوں پکڑے لفٹ رائٹ کرتے آتے ہیں شمیم کچھ چڑ کر ہنس رہی ہے کچھ واپس جانے کی کوشش کر رہی ہے)

شمیم۔ چھوڑو بھئی۔ (دونوں اُسے چوکی پر بٹھا کر دونوں طرف سے گھس کر بیٹھ جاتے ہیں)

واحد۔ ہوں ــــ اب بولو ــــ

عالم۔ ہاں اب بولو۔ چلیں بھاگ کے! سمجھی تھیں۔ ہم تو مر ہی گئے ہیں۔

شمیم بھئی کیا بدتمیزی ہے (گرفت سے نکل جاتی ہے)

(دونوں پکڑ لیتے ہیں) چلیں کہاں؟

شمیم۔ (تھک کر) چھوڑو تو ــــ کہیں نہیں۔ بھئی جا نہیں رہی ہوں یہیں بیٹھوں گی کرسی پر۔

واحد۔ اچھا ــــ لو۔ چھوڑ دو عالم ــــ ہاں بات کیا تھی (وہ ذرا ہلتی ہے تو ایک دم دونوں اُسے دبوچ لیتے ہیں)

شمیم۔ بھئی خدا قسم میں رو دوں گی۔ (کتاب اٹھا کر) اب کے جو تم نے چھوا تو مار دوں گی۔ لو ــــ اب آؤ۔ (عالم اور واحد کتاب کو ڈر کر دیکھتے ہیں اور ایک دوسرے کے قریب سرک کر فرمانبردار بچوں کی طرح بیٹھ جاتے ہیں)

شمیم۔ بات یہ تھی۔

عالم۔ نہیں ــــ بات دراصل یہ تھی۔

شمیم۔ قطعی نہیں ــــ یہ ہوا کہ ــــ

عالم۔ ہوا ہی نہیں ــــ قطعی نہیں (شمیم اُسے بولنے کا موقعہ دیتی ہے) یہ ہوا کیا ہوا شمیم بتاؤ نا اس نے سارا بھلا دیا ــــ اونہہ!

شمیم۔ ہوا کچھ بھی نہیں۔

واحد۔ ہیں ــــ کیا اُلو پن ہے! آخر جب ہوا ہی نہیں تو پھر تمہیں کیا حق جو عالم کو کمرے سے نکال رہی تھیں۔

عالم۔ (بھیگی بلی کی طرح) نہیں دیکھو اب۔

شمیم۔ بھئی یہ بات تھی کہ میں نے کہا میرے کمرے میں سے جاؤ ــــ

واحد۔ کیوں؟ صاحب کیوں جاؤ ــــ یعنی بات کچھ بھی نہیں اور جاؤ! (ہاتھ چلا کر) کیوں!

شمیم۔ بھئی میری مرضی میں نہیں چاہتی ــــ

عالم۔ (زور سے قہقہہ لگا کر) ذرا ان کی سننا (نقل) "نہیں چاہتی"! گویا انہیں چاہنے اور نہ چاہنے کا حق بھی ہے کچھ۔ ارے یہ کیسے! ــــ

واحد۔ ہاں یہ کیسے؟

شمیم۔ بھئی میں نہیں پسند کرتی۔

عالم۔ ناپسند ــــ لو ــــ (نقل کندھے سے ٹھوکا دے کر) اب لو، اب تک تو چاہا ہی کرتی تھیں اب پسند کرنے بھی چلیں ــــ یہ کیسے؟ ــــ بھائی تم تو بس جو خالہ بی کہتی تھیں۔ اور چاہتی

تھیں وہی کرتی تھیں۔ اب یہ سوراج کیسے مل گیا!

شمیم۔ واہ ـــــ یہ کیوں ـــــ واہ مزا دہو۔

عالم۔ اب ہکلانے سے کیا ہوتا ہے۔ کیا معلوم نہیں ہے حقیقت تمہاری کیوں وجّن ہم انہیں غلام کہتے ہیں نا ـــــ غلمٹا۔

واجد۔ (ٹائی کو سینے پر سجاتے ہوئے) بے شک!

شمیم۔ کیوں آخر؟

واجد۔ ایسے ہی۔

شمیم۔ تم خود کمینے غلام۔ بدتمیز۔ کمبخت۔ بس۔ اب ہوئے ٹھیک!

عالم۔ اور کچھ؟ او دیکھو بھلا پھول سے جھڑ رہے ہیں۔ بس۔ میرا بس چلے تو ایسی چھوکریوں کی زبان کاٹ لوں۔ قسم خدا کی!

شمیم۔ تمہارا بس چلنے ہی کیوں لگا تھا۔ خدا گنجے کو ناخن ہی نہیں دیگا۔

عالم۔ یہ ہیں تو لمبے لمبے ڈائنوں جیسے (اس کی انگلیاں جن میں لمبے ناخنوں پر روغن لگا ہے پکڑ کر) یہ دیکھو ـــــ کیوں وجّن؟

شمیم۔ (غصے) سے کتاب مار کر ہٹاؤ ہاتھ بدتمیز ـــــ میں کہتی ہوں بہتر ہے چلے جاؤ یہاں سے۔

واجد۔ کیوں ـــــ اوں؟ ـــ آخر وجہ بھی ہو کچھ۔ یا یونہی، اور تم جو آئیں ہمارے کمرے میں تو پھر ہم بھی نکالیں گے ـــــ اور مار کے نکالیں گے۔ پھر نہ کہنا ـــــ

عالم۔ ہاں ـــــ آؤ تم ذرا باہر دیکھو کیسا ٹھیک بناتے ہیں ـــــ اور اب کے آجائیں تمہاری مس شاہ ـــــ یار وجّن میرے سگریٹ چرا چرا کے لے جاتی ہے۔ کلمچڑی!

واجد۔ (چڑانے کو) اور وہ کون ہیں؟ ـــــ مس ـــــ مس پھیلپھڑسی ـــــ اُن سے ہماری شادی کرا دو۔ سُنا؟

شمیم۔ (روہانسی ہو کر) بھئی میں خالہ بی سے کہتی ہوں جا کر کہ مجھے سنبھل بھیج دو۔ ہاں نہیں تو اب کے بورڈنگ میں رہوں گی۔

واجد۔ پھر بات کیا ہے؟ عالم! (آنکھ مار کر تم جاؤ ذرا۔ ہمیں بتائے گی شمو (اس کے گلے میں باہیں ڈال کر) ہاں ـــــ ہماری تو بہن ہے کیوں!

عالم۔ خیر ـــــ اچھا ـــــ (جاتا ہے)

شمیم۔ (اٹھ کر گیلری کی طرف اُچک اُچک کر دیکھتے ہوئے کہ گیا یا نہیں) میں ـــــ یہ بات تھی ـــــ خالہ بی نے کہا (پھر دیکھتی ہے) ـــــ وہ۔

واجد۔ کیا! واقعی کوئی بات ہے! ارے بلاؤ عالم کو۔ اس سے کوئی بات چھپ سکتی ہے۔

شمیم۔ (روک کر) نہیں۔ اسے نہ بلاؤ۔ سنو تو۔

واجد۔ کہو بھی ـــ کہہ بھی چکو پھر۔ بتا تو دوں گا ہی۔

شمیم۔ خالہ بی کہتی ہیں ـــــ وہ ہمارے یہاں نہ آئے۔

واجد۔ کیوں نہ آئے! وہ میرا دوست ہے۔ میں جہاں جا سکتا ہوں وہ بھی جا سکتا ہے۔ وجہ کیا؟

شمیم۔ وہ کہتی ہیں۔ اُس کا باپ مقدمہ ہار گیا۔ اور جانے کیا کیا۔ بھئی مجھے نہیں معلوم۔

واجد۔ ارے مقدمہ ہارے باپ اور آنا عالم کا بند ہو۔ وہ مقدمہ ہی کرنے والا تھا ـــ پھر بھلا عالم سے ـــــ

شمیم۔ جانے کیا۔ بھئی وہ کہتی ہیں۔ عالم نہ آئے۔

واجد۔ آخر کیوں!

شمیم۔ وہ کہتی ہیں کہ لوگ نہ جانے کیا کہیں گے۔

واجد۔ کیا کہیں گے۔ کہ وہ کیوں آتا ہے؟ پھر کیا ہوا کہنے دو۔

شمیم۔ ہاں وہ کہتی ہیں۔ لوگ باتیں بنائیں گے۔

واجد۔ (کچھ سوچ کر) کیا یہی کہیں گے کہ وہ یہاں ـــــ تم سے ـــــ تمہارے ـــــ

شمیم۔ (چڑ کر) بھئی میں کب کہہ رہی ہوں۔ ـــ واہ!

واجد۔ (بگڑ کر) کیا سمجھا ہے تم نے میرے دوستوں کو؟ کوئی وہ غنڈے ہیں؟ کیا قصہ ہے! معاف کیجئے گا میرے دوست لفنگے نہیں۔ وہ قطعی تمہارے ـــــ وہ میرے دوست ہیں نہ کہ آپ کے ـــــ آپ۔

شمیم۔ (قریب قریب رو کر) بھئی ـــــ اُلٹا مجھی سے لڑنے لگے ـــــ یہ بھی کوئی بات ہے!

واجد۔ خوب۔ شہہ۔ میں ابھی کہتا ہوں۔ ضرور آئے گا۔ عالم ضرور ـــــ ایسے ہی آئے گا۔ سمجھیں۔ (پکار کر) عالم ـــــ ارے عالم۔

شمیم۔ خدا کے لئے اُس سے تو نہ کہو۔

واجد۔ کیوں نہ کہوں! میں نے آج تک اس سے کوئی بات چھپائی ہی نہیں ـــــ عالم! (اٹھ کر دروازے میں سے جھانکتا ہے)

ارے کہاں گیا؟ ۔۔۔ شاید ۔ (سنجیدہ ہو جاتا ہے)

شمیم ۔ (اداسی سے) ہاں مجھے بھی آہٹ معلوم ہوئی تھی ۔۔۔ شاید وہ سُن رہا تھا ۔

واجد ۔ (غصّے سے) یہ بہت ۔۔۔ یہ حد ہے ۔ میں اپنے دوستوں کی اس قسم کی ہتک برداشت نہیں کر سکتا ۔ میں آج ہی بورڈنگ چلا جاؤں گا ۔۔۔ فوراً ۔۔۔ کیا سمجھا ہے ؟

شمیم ۔ تم تو ایسے غصّے ہو رہے ہو گویا میں نے ہی کچھ کیا ہو ۔

واجد ۔ میں یہ ذلت برداشت نہیں کر سکتا ۔ انتہا ہے ۔ اس قسم کی باتیں ۔۔۔ بس آج ہی ۔۔۔

عالم ۔ دلہن کی کھڑکی سے ، ار ۔۔۔ بھئی ہو چکیں پرائیویٹ باتیں ؟ آجائیں اب ؟

واجد ۔ (ایک دم گھوم کر) عالم ۔۔۔ ارے آؤ ۔۔۔ یہ دیکھو ۔۔۔ ابھی ۔

عالم ۔ (آکر کرسی پر ٹھاٹ سے لیٹتے ہوئے) کیا کر رہی تھی میری بدبلا یہ شمیم بی ۔۔۔ یار دلہن پر بہت ہی سر چڑھتی جا رہی ہے ۔ اب ذرا اکڑا پکڑو اسے ۔

واجد ۔ ہم سمجھے تم ہماری باتیں سُن رہے تھے ۔۔۔ عالم سچ بتاؤ تم یہاں کیوں آتے ہو ۔۔۔ کیا صرف اس سے باتیں کرنے ؟

عالم ۔ صرف اِس سے باتیں کرنے کون بے وقوف آسکتا ہے ۔ اسے سوائے زبان درازی کے اور کیا باتیں آتی ہیں ؟

واجد ۔ پھر !

عالم ۔ پھر کیا ! کیسا بھدا سوال ہے ۔ ارے بھئی ہم آتے ہیں یہاں باجرے کی کھچڑی کھانے ، دال بھری روٹیاں کھانے ، گیرم کھیلنے اور شلغم کا اچار کھانے ۔۔۔ اور ہاں (ایک دم سے) یار بہت دن سے اچار ہی نہیں بنا ۔۔۔ کل باجرے کی کھچڑی کے ساتھ رہے ۔ کیوں ؟

واجد ۔ (خوشی سے) تو پھر تم اس کے پاس تو نہیں آتے ۔۔۔ صرف اس سے باتیں کرنے ۔ اور ۔۔۔

عالم ۔ مہا بے وقوف ہو تم ۔ ان کی کھوپڑی میں ہے ہی کیا سوائے سلوٹی جمپ اور سپنک کے ۔

شمیم ۔ کیوں جی یہ ہماری کھوپڑی میں ۔ جی ہاں گویا بڑے وہ ۔۔۔

عالم ۔ کچھ ہی کیا گوور ہے ۔

شمیم ۔ اب دیکھو واجد میری کوئی سہیلی کبھی تم سے اس قدر بدتمیزی کرتی ہے ؟ جو یہی ۔۔۔

عالم ۔ کر سکتی ہے بدتمیزی تمہاری کوئی پاجی سہیلی ٹھونکیں نہ ہم اسے ڈنڈوں سے ، سر پھاڑ دیں ۔ کیوں ۔۔۔ دلہن ۔۔۔ یار سچ کہتا ہوں ۔۔۔ بڈا کو تو ایک دن پٹنا پڑے گا ہیں ۔

واجد ۔ اور کیا ۔ مگر سنو تو خالہ بی کہتی ہیں ۔

شمیم ۔ کیا ہے دلہن ۔ پھر تم ۔۔۔

واجد ۔ کچھ نہیں ہم سنو رہتا ہیں گے ۔ ایک ایک بات (عالم سے) ہم سمجھے تم ہماری باتیں سن رہے تھے ۔

عالم ۔ (بے پروائی سے) سن ہی جو رہے تھے ۔

واجد ۔ ارے ۔۔۔ پھر ۔ تم ۔ ہم سمجھے غصّے ہو کر چلے گئے ۔

عالم ۔ غصّے ہو کر ؟ یہ کیوں ؟ خالہ بی جیسے تمہاری بزرگ ہیں ویسے ہی میری ۔ وہ مجھے کتنا ہی دھتکاریں پروا نہیں ۔ وہ ایک دروازے سے نکالیں دوسرے سے واپس آجاؤں یہی کرتا ہوں ۔۔۔ ابھی اُن سے شمیم کے کمرے میں کبھی نہ آنے کا وعدہ کر کے باہر سے گھوم کر آگیا ۔۔۔ (زور سے ہنستا ہے) اور کیا لے ۔۔۔ خدا قسم اور کیا ؟

(واجد خوشی سے مسکراتا ہے اور شمیم بھی اپنی ہنسی روک رہی ہے)

(۲)

(شام ۔ برآمدے میں چوکیوں کے فرش پر خالہ بی بیٹھی چھالیہ کتر رہی ہیں ۔ عالم اوندھا ایک کشن پر کہنیاں ٹکائے بچھو کے ڈنک کی طرح ٹانگیں اوپر کو اٹھائے ہے ۔ وہ صرف سفید پتلون اور قمیص پہنے ہے ۔ چھالیہ کی ٹوکری میں سے دانے چن چن کر کھا رہا ہے)

خالہ بی ۔ کب کھلے گا تمہارا کالج ؟

عالم ۔ یہی کوئی پندرہ تک کھل جائے گا ۔ سوچ سوچ کر خون خشک ہو رہا ہے کہ ختم ہو گئیں چھٹیاں ۔

خالہ بی ۔ اوئی خیر ! اتنے بڑے ہو گئے پڑھنے سے دم نکلتا ہے ۔

عالم ۔ کیا کروں خالہ بی مزدور آدمی ہوں ، مزدوروں جتنی چاہو محنت لے لو ۔ دماغی محنت

نہیں کی جاتی۔ ابا امتحان زبردستی دلوا رہے ہیں۔ کھوپڑی بالکل کھکل ہے۔ نجومی نے بتایا تھا لڑائی میں کام آؤ گے۔
علم تمہاری قسمت ہی میں نہیں۔

خالہ بی۔ اے ہٹو۔ ان نجومیوں کا کیا ہے۔ جھوٹے نگوڑے۔

عالم۔ نہیں خالہ بی جھوٹ نہیں بعض وقت تو یہ پتے کی بات بتا جاتے ہیں۔ میرے دوست کو بہت ٹھیک بتایا۔

خالہ بی۔ (کچھ سوچتے ہوئے مگر ٹال کر) اے ہٹو بھی

عالم۔ مذاق سے نہیں خالہ بی ان کی بعض باتیں بالکل ٹھیک بیٹھتی ہیں۔

خالہ بی۔ (سروتہ دوسرے ہاتھ میں لے کر اپنا ہاتھ دیکھتے ہوئے) بھلا کیسے بتا دیتے ہیں یہ لوگ؟

عالم۔ ہاتھ کی لکیریں دیکھ کر۔۔۔ لائیے میں دیکھوں۔

(ہاتھ پکڑ کر غور سے دیکھتا ہے۔ خالہ بی عجیب نظروں سے سانس روکے اُس کے چہرے کو تکتی ہیں)

عالم۔ ہوں۔ آ۔ یہ۔ ہوں ٹھیک ۔۔ اچھا ۔۔۔

خالہ بی۔ (انتظار سے تھک کر) اے خاک پتہ چلتا ہوگا لکیروں سے؟

عالم۔ چلتا کیوں نہیں؟۔۔۔ یہ دیکھئے۔۔۔ آں۔۔۔

خالہ بی۔ اے پھر بتاؤ بھی کچھ۔

عالم۔ (ڈھنگی سے لکیروں پر نشان بنا کر) روپیہ بہت۔

خالہ بی۔ کیا نئی بات بتائی۔۔۔ مگر وہ بھی اب میں نے بچوں کے نام کر دیا۔

عالم۔ ہوں ۔۔۔ مگر ۔۔۔ چین نہیں ۔۔۔ سکون قلب میسّر نہیں ۔۔۔۔۔

خالہ بی (چہرے کا رنگ بدلتا ہے) ہوں ۔۔۔ اور ۔۔۔۔

عالم۔ بہت ۔۔۔ اے بہت ۔۔۔ کمزور دل ۔۔۔ تکلیف ۔۔۔

خالہ بی۔ (ٹھنڈی سانس لے کر) دل تو بہت دن سے کمزور ہو گیا ہے۔

عالم۔ اور ۔۔۔ شاعرانہ ۔۔۔ خواب ۔۔۔ تخیّل بہت بلند۔

خالہ بی۔ (لڑکیوں کی طرح ہنس کر) ارے!

عالم۔ (دیکھتے ہوئے) کیوں؟

خالہ بی۔ اے یہی بلند تخیّل ۔۔۔ نظم نہ نثر لکھنے کا تو بہت شوق تھا۔ چھپی بھی دو ایک جگہہ ۔۔۔ اخباروں میں۔ وہ تو کہو اب گھر کے جھگڑوں سے فرصت نہیں ملتی اور کچھ ڈھنگ کی بات بتاؤ تو جانیں۔

عالم۔ جی ۔۔۔ اور ۔۔۔ الجھن ۔۔۔ پریشان دماغ بالکل فلاسفوں کا سا۔ خیالات کی بھرمار۔

خالہ بی۔ (غم زدہ تبسم سے) اور؟

عالم۔ اور (ایک دم پھٹ سے) دو بچے ۔۔۔ نہیں ۔۔۔ تین۔

خالہ بی۔ (شرما کر ہاتھ کھینچتے ہوئے) ہٹ دیوانے ۔۔۔

عالم۔ کیوں کیا ہوا ۔۔۔ آپ شادی کریں تو ۔۔۔ (ہنس کر) اچھا لائیے دیکھنے تو دیجئے (ہاتھ پکڑ لیتا ہے)

خالہ بی۔ تو ڈھنگ ڈھنگ کی باتیں بتاؤ نا۔

عالم۔ آپ دیکھنے بھی دیں ۔۔۔ اور پھر آپ کہیں گی "ہٹ دیوانے"

خالہ بی۔ لے تو پھر ۔۔۔ یہ بھی کوئی بات ہے۔

عالم۔ اچھا ۔۔۔ ہوں (غور سے دیکھ کر) ناکامی ۔ پہلی محبت میں ناکامی

خالہ بی۔ (ایسے نظریں زمین پر گاڑ دیتی ہیں گویا پکڑی گئیں)

عالم۔ اور ۔۔۔ اور ۔۔۔ آپ ماریں گی ۔۔۔ ورنہ بتا دیتا (ایک دم سے) کیا عمر ہوگی آپ کی ۔۔۔

خالہ بی۔ بیالیسواں سال لگا تھا پچھلے رجب۔

عالم۔ (بنانے کے لئے) ہیں ۔۔۔ مگر اے ۔۔۔ میں آپ کو ہمیشہ تیس برس کا سمجھتا تھا ۔۔۔ بلکہ اس سے بھی کم ۔۔۔ یعنی آپ شمیم کی بڑی بہن معلوم ہوتی ہیں۔ بھئی خدا کی قسم (تعجب)!

خالہ بی۔ سب یہی کہتے ہیں ۔۔۔ بکتے ہیں (کچھ دلچسپ باتیں معلوم کرنے کے لئے) اور کچھ؟

عالم۔ بھئی آپ ماریں گی پھر ۔۔۔

خالہ بی۔ کیا؟ ۔۔۔ کیا بات ہے؟ کہو تو۔

عالم۔ شادی۔ بہت جلد ۔۔۔

خالہ بی۔ (شرم سے گلابی ہو کر) اونہہ۔ اے ہٹ لڑکے۔

عالم۔ مجھے کیا معلوم بھئی ہاتھ کہتا ہے۔ دل کا حال کسے معلوم؟ ۔۔۔ اور (خالہ بی ہاتھ جھوٹ نہیں کہتا ۔۔۔ ہاں ۔۔۔ (زور زور سے ہنستا ہے، خالہ بی بھی مسکراتی ہیں) بھئی ۔۔۔ خوب ۔۔۔

شمیم۔ (آ کر) خالہ بی دھوبن ساری میری نیلی شلوار پھاڑ لائی۔ یہ بھی کوئی بات ہے!

خالہ بی۔ (غیر شاعرانہ موضوع سے چڑکر) اے تم نے ہی پھیلی ہوئی دی ہوگی۔

عالم۔ لاؤ تمہارا ہاتھ بھی دیکھ دوں شمیم۔

شمیم۔ نہیں بھئی رہنے دو۔ (خالہ بی سے) بالکل ثابت دی تھی۔ اور اب سارے پانچے غائب۔

عالم۔ (اس کا ہاتھ پکڑ کر جو بے خبر باتیں کر رہی ہے) اے ہے بس پیٹ چکیں شلوار کی جان کو۔ ادھر تو سنو۔ ذرا — یہ دیکھو — یہ۔

شمیم۔ (ہاتھ کھینچ کر) چھوڑو بھئی میں نہیں دکھاتی۔

خالہ بی۔ کیا حرج ہے کوئی کھا جائے گا تمہارا ہاتھ۔ دکھا دو نا!

شمیم۔ (ہاتھ ڈھیلا کرکے) اُونہ — بھئی مجھے نہیں اچھا لگتا۔ مجھے کام الگ ہے۔

عالم۔ ہُوں (غور سے ہاتھ دیکھ کر) غریبی — پریشانی۔ ذلت — ڈانٹیں . . . . .

شمیم۔ سب جھوٹ۔ لگے باتیں بنانے۔ جھوٹ سارا۔

عالم۔ جھوٹ؟ — ارے یہ دیکھو یہ دن رات کی جوتیاں یہاں کی الگ (ہاتھ کھینچتی ہے) اور سُنو — جوان موت۔ اُف!

شمیم۔ ہونے دو۔ بھئی چھوڑو۔ (ہاتھ کھینچتی ہے)

عالم۔ اور — امتحان میں فیل! روپے کا نقصان — دشمن گھات میں۔

شمیم۔ تم خود فیل ہو جاؤ خدا کرے — ہٹو۔

عالم۔ ٹھیرو ابھی — (ہاتھ بے کار اس قدر موڑتا ہے کہ شمیم رونے پر آجاتی ہے) اور او — فو — ہ۔

شمیم۔ ہوں — جھوٹ

عالم۔ کیا جھوٹ — ایک ایک بات ٹھیک — اور یہ یہ — تیرہ غضب خدا کا۔ لعنت اللہ ہے — توبہ — اللہ۔

خالہ بی۔ کیا تیرہ۔؟

عالم۔ اجی بچے — ایک دم تیرہ خدا کی قسم تیرہ بچے!!

شمیم۔ (زور سے ہاتھ چھڑا کر) بدتمیز۔ زمانے بھر کے (اٹھ کر بڑبڑاتی چلی جاتی ہے)

عالم۔ ارے — سنو تو — اور تو سنتی جاؤ۔

خالہ بی۔ بڑی بدمزاج ہوگئی ہے۔

عالم۔ بڑی۔ صاحب انتہا ہے۔ (اٹھتا ہے) حد ہے اور آپ ڈانٹتی بھی نہیں اسے (جانے لگتا ہے)

خالہ بی۔ کہاں چلے؟

عالم۔ ذرا کتابیں لینا ہیں — شمیم کے کمرے میں بھول گیا تھا اُس دن (چلا جاتا ہے)

خالہ بی۔ (نفرت اور غصّے سے اُسے جاتا دیکھتی ہیں، زور زور سے چھالیہ کترتی ہیں، ہلکی سی رذالت اور نفرت کی ملی جلی جھلک سی چہرے پر نظر آتی ہے۔ ڈلی کا بڑا سا ٹکڑا ایک پرمعنی کھٹاکے سے کاٹتی ہیں۔ گویا دہ مار ا دشمن کو)

(۳)

(اُسی خالہ بی والے برآمدے میں، خالہ بی باندان کھولے چیتھڑوں سے اُسے صاف کر رہی ہیں۔ کپڑوں میں خلاف معمول ہلکی سی رنگینی نے اُن کے ہلکے گلابی چہرے کو بلا کا دلکش بنا دیا ہے۔ عالم چست پاجامہ اور باریک ململ کا کرتا پہنے ایک صوفے پر ایسے لیٹا ہے کہ اُس کے پیر گھٹنوں تک نیچے لٹک رہے ہیں۔ واجد شمیم کے گھٹنے پر سر رکھے اُس سے دور لیٹا ہے شمیم کتاب پڑھ رہی ہے)

واجد۔ خالہ بی، مٹر پلاؤ نہیں پکا بہت دن سے۔ کل پکے۔

عالم۔ مٹر پلاؤ نہیں، پائے پکیں۔

واجد۔ لاحول ولاقوۃ پائے بھی کوئی کھانے کی چیز ہیں۔ اس سے کیچڑ نہ کھاؤ۔ کیوں بھئی شمو کیا پکے؟ — پائے یا مٹر پلاؤ؟

شمیم۔ (جلانے کو) کچھ بھی نہ پکے بس اُرد کی دال۔

واجد۔ ہٹ بدتمیز — (اس کی کتاب اپنے سر سے ٹکراتی دیکھ کر) اونہہ — اب ہٹاؤ اس کتاب کو دے کر دور پھینک دیتا ہے)

شمیم۔ بھئی تم کون ہوتے ہو۔ (اٹھ کر کتاب لینا چاہتی ہے۔ مگر عالم اٹھا کر اپنے سر کے نیچے رکھ لیتا ہے۔) لاؤ میری کتاب دو — میں اپنے کمرے میں جا رہی ہوں۔ تم لوگوں کے پاس بیٹھنا ہی حماقت ہے۔

عالم۔ نہیں دیتے — ہمارے سر میں درد ہے۔

شمیم۔ (کشن پھینک کر) لو یہ تکیہ۔

عالم۔ اوچھا خالہ بی! کیسا زور سے تکیہ مارا ہے ویسے ہی سر میں درد ہے

واجد۔ کیا واقعی درد ہے؟

عالم۔ (سنجیدگی سے۔ سر سہلا کر) ہاں۔ دھوپ میں جانے سے ہوگیا۔

واجد۔ (چمکار کر) شمّو جاؤ بام لاکر مل دو اس کے (اُسے منہ بناتے دیکھ کر) کیسی خراب ہو تم۔ ارے میں آپ لاکر مل دوں گا۔ عالم اتنا کام کرتا ہے تمہارا اور تم ذرا سے میں مرنے لگتی ہو۔ (جاتا ہے)

خالہ بی۔ ادھر آؤ عالم میں دیکھوں۔

عالم۔ (پاس آکر لیٹتے ہوئے) یہاں ہے — کنپٹیوں کے پاس

خالہ بی۔ اے کاہے سے ہوگیا!

عالم۔ نہ جانے۔

خالہ بی۔ (کشن رکھ کر بڑی نرمی سے اُس پر عالم کا سر رکھتی ہیں — اور اُس کی پیشانی پر ہاتھ پھیرتی ہیں) ٹھہرو۔ ارے ننھی — او ننھی۔

ننھی۔ (دور سے) جی آئی۔

خالہ بی۔ اے آنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ فرید سے کہہ دو کل کے لئے آج ہی پائے لے آئے اور سنو — ابھی مسالہ پیسنا شروع کر دو۔ آتے ہی چڑھا دینا۔ رات بھر پکیں گے۔ سنا؟ — اور ذرا سا خمیر چھوڑ دینا۔ (ننھی کی طرف سے مطمئن ہو کر محبت سے) کچھ مٹھاس بھی پکواؤں! تمہیں میٹھے ٹکڑے پسند ہیں — کیوں عالم؟

عالم۔ جی ہاں اور (مٹر پلاؤ بھی) وجّن کو پسند ہے۔

واجد۔ (بام لاتا ہے) لو شمیم اب ذرا مل تو دو۔

خالہ بی۔ لاؤ میں مل دوں — (بام لے کر اس کی پیشانی پر ملتی ہیں) (بڑے انہماک سے اس کی پیشانی اور کنپٹیوں کو ملتی ہیں۔ شمیم کچھ دیر باؤلوں کی طرح بیٹھی رہتی ہے پھر اُٹھ کر چل دیتی ہے۔

واجد۔ میں ذرا کپڑے بدل آؤں تم تو چلو گے نہیں سر میں درد ہے۔ میں ذرا یوسف کے ساتھ سینما جا رہا ہوں۔ آج غضب کی اچھی پکچر ہے۔

عالم۔ (آنکھیں بند کئے) ہوں۔ (واجد جاتا ہے عالم آنکھیں بند کئے خاموش لیٹا رہتا ہے)

خالہ بی۔ (ذرا جھک کر) بخار تو نہیں (دوسرا ہاتھ اس کی گردن پر رکھ کر دیکھتی ہیں۔ پھر اپنا ماتھا چھوتی ہیں) نہیں پنڈا تو ٹھنڈا پڑا ہے۔ کیسا ہے اب جی؟

عالم۔ (ویسے ہی آنکھیں بند کئے) بڑا سکون مل رہا ہے — آہا — ہا — سی۔ (آنکھیں بند کئے انگلیوں سے کھیلتا ہے)

خالہ بی۔ (پیشانی پر سے اس کے بال ہٹا کر غور سے اسے دیکھتی ہیں۔ دوسرے ہاتھ سے اس کے گریبان کے کھلے ہوئے بٹن کو بند کرتی ہیں۔ آنکھیں اور بھی سیاہ اور دلکش ہو جاتی ہیں اور ہونٹ لرزنے لگتے ہیں۔ سر جھک جاتا ہے۔ گرم گرم سانس کو کان کے نیچے محسوس کر کے عالم آنکھیں کھول دیتا ہے۔ خالہ بی کی آنکھوں سے آنکھیں چار ہوتے ہی گھبرا کر اور آنکھیں پھاڑ دیتا ہے۔ اُن کی آنکھیں نہ جانے کیا کیا کہہ جاتی ہیں — اور وہ ایک دم بڑبڑا کر اٹھ کھڑا ہوتا ہے اور نہ معلوم کس غیر انسانی شے سے ڈر کر چاروں طرف دیکھتا ہے۔ خالہ بی کے چہرے کی سُرخی لہروں کی طرح دم بدم اونچی نیچی ہوتی ہے۔ وہ اس کی طرف دیکھتی ہیں)

عالم۔ (گھبرا کر پیشانی چھو کر) ارے — بالکل غائب۔ سر میں بالکل درد نہیں رہا جیسے .... جیسے — (شرمندہ ہو کر سر جھکا دیتا ہے)

خالہ۔ (ذرا چہرے کی سرخی کو دبا کر) کہاں چلے؟ سر کا درد ایسا بھی کیا کہ — جادو سے اچھا ہوگیا۔

عالم۔ جی — جی — ہاں۔ اب بالکل اچھا ہے۔ گویا کبھی نہ ہوا — اُڑ — گیا — دماغ۔ (سر پکڑ کر جانے لگتا ہے)

خالہ بی۔ بیٹھو — چائے بنواؤں!

عالم۔ (بغیر نظر ملائے) جی نہیں چائے تو اور گرم ہوگی — (دروازے کی طرف بڑھتا ہے)

(شمیم داخل ہوتی ہے)

عالم۔ (اسے دیکھ کر ہمت بندھ جاتی ہے) ارے شمیم — وجّن کہاں ہے!

شمیم۔ کمرے میں اپنے اور کہاں! (بے تعلقی سے اپنی چادر اٹھا کر جانے لگتی ہے جو بھول گئی تھی۔)

عالم۔ (اس کے جانے سے گھبرا کر) سنو تو! اور اگر تم میری کتاب پڑھ چکی ہو تو دے دو۔

شمیم۔ (بالکل دروازے کے پاس سے) اب کل ہی تمہارے کمرے پر بھجوا دوں گی اس وقت تو نہیں۔

عالم۔ (بچنے کے لئے بالکل اس کے قریب جا کر) مگر دیکھو ۔۔۔ (شمیم چلی جاتی ہے) سنو تو ۔۔۔

خالہ بی۔ (اُسے جاتا دیکھ کر) عالم!

عالم۔ (بغیر پورا مڑے ہوئے) جی۔

خالہ بی۔ میں نے پایوں کو کہہ دیا ہے ۔۔۔ اور خمیری روٹی تمہیں پسند ہے ۔۔۔ عالم ۔۔۔ وہ منشی جی کل تک ۔۔۔ آجائیں گے ۔۔۔ میرا ۔۔۔

عالم۔ کون منشی جی؟ منشی جی؟

خالہ بی۔ ہاں ۔۔۔ وہ خط ۔۔۔ تمہاری ۔۔۔ جیب ۔۔۔

عالم۔ (اطمینان کی سانس لے کر) وجن ۔۔۔ تم ۔۔۔ میں بھی چلوں گا سینما۔

خالہ بی۔ ابھی تو سر میں درد تھا۔ اور ابھی سینما کی تیاری ہونے لگی!

عالم۔ اب نہیں رہا۔

واجد۔ کیا کرو گے جا کر اور بڑھ جائے گا۔ تم لیٹو اور آج بورڈنگ نہ جاؤ یہیں سو رہو۔ میرے کمرے میں۔ میں کہہ دوں گا مانیٹر سے ۔۔۔ اچھا۔

عالم۔ (جلدی سے) نہیں ۔۔۔ بالکل ٹھیک ہوں میں دیکھنا چاہتا ہوں یہ پکچر ۔۔۔ چلو۔

واجد۔ تم جاؤ ۔۔۔ خالہ بی تین روپے دے دیجئے۔

خالہ بی۔ (رکھائی سے) میرے پاس کہاں رکھے ہیں اس وقت تین روپے۔

واجد۔ (ارادہ ڈھیلا ظاہر کرنے کے لئے کوٹ اتارنے لگتا ہے) تو بس پھر ہٹاؤ سینما کو بھی۔

عالم۔ میرے پاس ہیں (ہیٹ اور شیروانی لے کر) چلو تو ۔۔۔

(دونوں جاتے ہیں۔ عالم اپنے ہاتھ کی لرزش کو ہیٹ ہلا ہلا کر چھپاتا ہے۔ خالہ بی دونوں کو جاتا دیکھتی ہیں ۔۔۔ بالکل بے خبر ہو کر کہ وہ اپنے ہاتھ میں لکیروں کو گھورنے لگتی ہیں ۔۔۔ ہلکی امید بھری مسکراہٹ آجاتی ہے)

(۴)

(اپنے کمرے میں شمیم بہت پریشان اور حسب معمول بھری بیٹھی ہے۔ کسی نئی بات نے اُسے حیرت زدہ بھی بنا دیا ہے جی چاہتا ہے رو دے مگر ضبط کرتی ہے)

شمیم۔ (خود بخود) مکار کہیں کا۔

(کتاب کھول کر ایک مسلا ہوا کاغذ نکالتی ہے اور پڑھ کر غصے سے پھاڑنا چاہتی ہے لیکن دو ٹکڑے کر کے آگے نہیں پھاڑتی اور واپس رکھ دیتی ہے۔ پھر چند چھوٹے پرزوں کو جوڑ کر پڑھنا چاہتی ہے آہٹ سنائی دیتی ہے تو جلدی سے دری کا کونا اُٹھا کر چھپا دیتی ہے۔ واجد آتا ہے)

واجد۔ (آکر پیار سے اس کی پیٹھ پر ہاتھ مار کر) شمو بیٹے کیا حال چال ہے؟ ۔۔۔ بڑے موٹے ہوتے جا رہے ہو۔ (بسورتی شکل دیکھ کر) روز مارونا مدام رونا۔ اور بھی کچھ کام ہے تمہیں؟ اللہ کی بندی! (اُسے روتے دیکھ کر) ۔۔۔ ارے یہ ہوا کیا ۔۔۔ (گھبرا کر بیٹھ جاتا ہے) کیا ہوا آخر!

شمیم۔ (رو کر) وجن گھر چلو ۔۔۔ آج ہی چلو آپا کے پاس سنبھل؛ میں نہیں ٹھہر سکتی ایک گھڑی بھی یہاں۔

واجد۔ کوئی بات بھی ہوئی ہو۔ کیا خالہ بی نے ڈانٹا؟

شمیم۔ نہیں۔ (خاموشی)

واجد۔ پھر ۔۔۔؟ (پیار سے) بھئی یہ کوئی بات نہیں ہے۔ ہم تمہارے دوست ہیں ۔۔۔ صرف تیرہ دن تو کالج کھلنے میں رہ گئے ہیں ۔۔۔ اور اب کہتی ہو چلو۔ کیوں آخر!

شمیم۔ (دری کا کونا الٹ کر کاغذ کے پرزے نکال کر) لو ۔۔۔

واجد۔ (ٹھیک طرح سے بیٹھ کر کاغذ جوڑ جوڑ کر پڑھنا شروع کرتا ہے؛ اُلجھ کر) کیا پڑھوں؟ خالہ بی کا خط ہے۔ کیا تمہیں کچھ لکھ کر ہدایات دی ہیں؟

شمیم۔ جی نہیں ۔۔۔ ذرا پڑھئے تو پھر کہئے گا ۔۔۔ یہ دیکھئے یہ۔

واجد۔ (غور سے دیکھ کر) کیا؟ ۔۔۔ ہاں۔ عالم ۔۔۔ اور یہ کیا ہے؟ ابا ایک تو خالہ بی کا خط۔ دوسرے پھٹا ہوا ۔۔۔ پھر کوشش کرتا ہے "ٹھوکر ۔۔۔ نہیں" "ٹھکرا نامت"۔ (چکرا کر)

یہ کیا گڑبڑ ہے —— ہیں۔ "اُمیدیں" —— "واسطہ" نہیں "وابستہ"۔ "مایوسی"۔ "مایوس نہ کرنا" (کچھ دیر مدہوشی سی پڑھتا ہے)

ہوں —— زبان —— زبانی کہنے کا موقع نہ ملا ——

شمیم۔ اور یہ —— (دوسرا ٹکڑا دیتی ہے)

واجد۔ (پڑھ کر رنگ سیاہ پڑ جاتا ہے۔ کانوں میں خون کی تیزی سے جھنجھناہٹ ہونے لگتی ہے۔ ڈری ہوئی نظروں سے شمیم کو دیکھتا ہے۔) مگر —— تعجب! —— مگر یہ ہے کیا معاملہ؟ عالم —— صرف ایک سال بڑا ہے مجھ سے —— کہاں ملا تمہیں یہ ——؟

شمیم۔ میرے کمرے میں —————— شاید عالم کی جیب سے گر پڑا۔

واجد۔ (حیرت سے) پاگل؟ خالہ بی یقیناً —— اور —— مجھے یقین نہیں آتا —— عالم —— (تھوڑی دیر دونوں خاموش رہتے ہیں پھر واجد کے چہرے پر بجائے پریشانی کے غصے اور نفرت کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنے ہونٹ چبانے لگتا ہے) کمینہ۔ مجھے وہم بھی نہ ہوا تھا۔ شمو ہم ابھی چلے جائیں گے بلکہ میں ابھی جا کر فون کرتا ہوں۔ حیدر صاحب کو کو "فوراً کار بھیج دیں اپنی" —— اچھا!

شمیم۔ اور کالج ——؟

واجد۔ کالج پندرہ کو کھلے گا پھر ہم جائیں گے اور تم بھی بورڈنگ چلی جانا۔ میں یوسف کے ساتھ رہ لوں گا۔ اچھا ہے خود بخود مکار —— دوست بنتا ہے۔ اور .... شمو تمہیں کوئی رنج نہیں۔ کوئی پروا نہیں —— کیوں؟

شمیم۔ (رنجیدہ سر جھکائے غرور سے) نہیں۔

واجد۔ تو پھر چلو تیار ہو جاؤ۔

شمیم۔ اور خالہ بی؟ ان سے تو کہہ دو۔

واجد۔ (غرور سے) ہمیں خالہ بی سے واسطہ؟ ہمیں کوئی ضرورت نہیں اُن سے کہنے کی۔ ٹھیک کر لو تم اپنے تھوڑے سے کپڑے —— میں جا رہا ہوں پندرہ منٹ سے زیادہ نہیں لگیں گے۔ (جاتا ہے)

(شمیم تھوڑی دیر خاموش بیٹھی رہتی ہے۔ پھر اٹھ کر الماری میں سے کپڑے نکال کر ایک اٹیچی میں رکھتی ہے۔ دو ایک چیزیں اور کتابیں میز پر سے اٹھا کر ڈال لیتی ہے۔ ایک فریم جس میں عالم اور واجد کی تصویر ہے اٹھا کر رکھنا چاہتی ہے، پھر کچھ سوچ کر عالم کی تصویر نکال دیتی ہے اور واجد کی رکھ لیتی ہے —— پھر کچھ سوچ کر عالم کی تصویر دیکھتی ہے۔ ہچکچاتی ہے مگر پھر بے پروائی سے سب کپڑوں کے نیچے اُسے بھی ڈال دیتی ہے۔ پیروں کی چاپ سنائی دیتی ہے اور عالم کی آواز دور ہی سے آتی ہے)

عالم۔ وجّن —— وجّا —— ن —— کہاں ہو! (آتا ہے شمیم بے تعلقی سے کپڑے رکھتی ہے) ارے شمو دوست! —— وہ کہاں ہے —— وجّن؟ (اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیتا ہے)

شمیم۔ (اس کا ہاتھ کندھے پر سے ہٹا کر) مجھے نہیں معلوم۔

عالم۔ (اس کی ترش روئی سے قطعی متاثر نہ ہو کر) ار —— اور مجھے کہا تھا کہ آج سینما چلیں گے۔ وجّن بھی کیا بے وقوف انسان ہے (شمیم کا چہرہ دیکھ کر) ارے بھئی شاباش ہے! نہ جانے اتنا غصہ کرکے لڑکی جیتی کیسے ہے۔ میں تو دو دن میں مر جاؤں آہا —— ذرا آپ کا مُنہ ملاحظہ ہو —— وا —— ہ —— وا۔ (مُنہ اونچا کرتا ہے اُس کا)

شمیم۔ (اس کا ہاتھ جھٹک کر) اُونہہ! (دور میز کے پاس سے سامان لینے چلی جاتی ہے)

عالم۔ (ایک کرسی پر بیٹھ کر) کب تک آئے گا واجد؟ بھلا یہ بھی کوئی انداز ہے؟ —— (کچھ یاد کرکے) ارے ہاں! سنو تو شمو۔ یہ —— ذرا ادھر دیکھو (چہرے پر مسرت ناچ رہی ہے۔ کمر پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ شمو ایک نظر دیکھ کر نظر پھیر لیتی ہے) ارے دیکھو —— بولو۔ کیا ظاہر ہو رہا ہے؟ کچھ شان ہمارے چہرے پر؟

شمیم۔ (کٹکتے ہوئے لہجے میں) جی ہاں معلوم ہے آج آپ کا چہرہ بڑا شاندار ہو رہا ہے۔

عالم۔ (اس کے بولنے ہی سے خوش ہو کر) رعب پڑ رہا ہے کچھ؟

شمیم۔ (طنز سے ہنس کر) آپ کا ہی رعب ہمارے اوپر نہ پڑے گا تو پھر

کس کا پڑے گا؟ بھلا آپ.....

عالم۔ (ہنس کر) اچھا تو تمہیں معلوم ہو گیا!۔۔۔ وہ۔۔۔

شمیم۔ (اس کی دیدہ دلیری سے مجروح ہو کر) جی ہاں معلوم ہو گیا۔۔۔ بس یا اور کچھ کہنا ہے ابھی آپ کو؟

عالم۔ (حیران ہو کر) عجب دیوانی لڑکی ہے۔ ارے بھئی انسان کسی وقت تو سیدھے منہ بات کر لیا کرے۔ بس ہر وقت نخرے ہیں کہتا ہوں میں تو وہ۔۔۔ خط۔

شمیم۔ (بات کاٹ کر) جی ہاں۔۔۔ وہ خط۔ (اٹھ کر جلدی سے کچھ الماری میں سے نکالنے لگتی ہے)

عالم۔ ارے تو بھونکتی کیوں ہو۔۔۔ تم کیوں جل گئیں؟ جیسے تمہارا میں نے کچھ لے لیا۔ دوسروں کی ترقی سے اس قدر نہ جلا کرو۔ اپنی اپنی قسمت ہے۔ کہتی تو ہو گی نکھٹوؤں کے ایسے ہی بھاگ ہوتے ہیں۔ چھپّر پھاڑ کے خدا قسم! انتخاب ہی تو ہے۔۔۔ لڑ گئی تقدیر (اس کی شعلہ فشاں آنکھوں سے بچ کر) اونہہ نہ جانے اچھی خاصی لڑکی ایک دم سے چڑیلوں کا روپ کیسے دھار لیتی ہے!۔۔۔ مگر تم نے کیسے دیکھا؟ ۔۔۔ شاید یوسف نے واجد کو بتایا ہو۔۔۔ خط تو میری جیب میں ہی پڑا ہے۔ (ٹٹول کر) شاید بھول آیا۔ کچھ ایسا بولایا کہ سیدھا بھاگا کہ تم لوگوں کو بتا دوں۔۔۔ چھوڑو ان باتوں کو یہ تو بتاؤ آج پکا کیا ہے؟

شمیم۔ (جس کے آنسو باوجود ضبط کے نہیں رکتے غصے سے کانپ جاتی ہے) نکل جاؤ۔۔۔ نکل جاؤ میرے کمرے سے۔۔۔ بڑے۔۔۔ بڑے آئے دوست بنتے ہیں۔۔۔ جاؤ۔۔۔ خدا را چلے جاؤ۔۔۔

عالم۔ (اس کو واقعی غصے دیکھ کر) شمّو!

شمیم۔ ابھی کچھ اور کہنا ہے؟۔۔۔ جاؤ یہاں سے خدا کے لئے۔

(واجد داخل ہوتا ہے)

عالم۔ (اسے دیکھ کر زور سے قہقہہ لگا کر) یار وجن پاگل ہو گئی ہے۔ یہ آج۔۔۔ ارے دیکھتے ہو اس بلی کو؟ خدا کی قسم!

واجد۔ (اپنے پیارے دوست کی جلسازی سے منہ اترا ہوا ہے۔ نفرت سے) شمّو تیار ہو تم؟

عالم۔ یہ۔۔۔ کیا کہیں جا رہے ہو تم لوگ؟ آخر۔۔۔ بتاؤ بھی تو کچھ!

واجد۔ (کچھ نہ سن کر شمیم سے) وہ۔۔۔ کار آتی ہی ہو گی۔

عالم۔ واجد کچھ کہو گے بھی یا تم۔۔۔؟

واجد۔ (غصے کو ضبط کر کے) میں کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ بس تھوڑا سا سامان لے لو شمیم۔

عالم۔ لیکن۔ واجد تمہیں یہ ہو کیا گیا ہے؟ کچھ۔۔۔

واجد۔ مجھے؟۔۔۔ جی مجھے سودا ہو گیا ہے۔ (شمیم سے) وہ سوٹ کیس بس اور۔

عالم۔ (اس کے غصے سے بوکھلا کر) مگر۔۔۔ میں وہ۔ خط لایا تھا۔ کہ۔ وہ۔ یہ کہنا تھا کہ۔

واجد۔ کیا ابھی تمہیں کچھ اور کہنا ہے۔ ہاں وہ خط۔۔۔ پھر!

عالم۔ (مردہ ہو کر) مگر تم۔۔۔ تم اتنے غصے۔۔۔ اتنے غصے ہونے کی وجہ؟ ایسے گویا۔۔۔

واجد۔ (چوٹ سے تلملا کر) بیشک ہم کیوں غصے ہوں۔۔۔ ہمیں کیا حق؟ ہم ہوتے کون ہیں؟ اور۔ (رنجیدہ قہقہہ لگاتا ہے) واقعی! (ایک دم سنجیدہ ہو کر) ہمیں کیوں ہو۔ (پھر بے تکے پن سے ہنستا ہے)۔۔۔ کیا وجہ؟ آہا۔

عالم۔ (جس کی سمجھ میں نہیں آتا کیا کرے) مگر۔۔۔ یہ کہہ کیا رہے ہو تم؟ ۔۔۔ تم نے دیکھا کب۔۔۔ تم۔۔۔

واجد۔ ہاں ہم نے دیکھا۔۔۔ اور وہ خوش خبری بھی مل گئی ہمیں اور اسی وجہ سے ہم لوگ اس وقت اس قدر مسرور نظر آ رہے ہیں۔ (طعن سے) اور ہاں آپ کو مبارکباد تو دینا بھول ہی گئے۔

عالم۔ (اپنے روٹھنے کی باری سمجھ کر) مجھے نہیں چاہیئے تمہاری مبارک باد۔۔۔ لے کے پہلے۔۔۔ تو۔۔۔

واجد۔ بے شک۔ بے شک۔ (کار کی آواز سن کر) اٹھو شمو۔

عالم۔ مگر۔

واجد۔ (اٹیچی اٹھا کر شمیم کی کمر میں پیار سے ہاتھ ڈال کر اسے لے جاتا ہے)

عالم۔ (عجیب پریشانی کے عالم میں ڈھیلا ڈھالا کھڑا رہ جاتا ہے۔ گویا کسی نے اسے کچل دیا ہو۔ پیشانی پر ہاتھ پھیرتا ہے گویا یہ معلوم کرنے کے لئے کہ یہ خواب ہے یا بیداری۔ کار کی آواز پر گھبرا کر چونکتا ہے۔ مگر دور اس کا بھورن سُن کر بے ست ہو کر کرسی پر گر جاتا ہے)

سر پر دونوں ہاتھ رکھ کر کچھ سوچتا ہے کہ اتنے میں اُسے پھٹے ہوئے پرزے نظر آتے ہیں۔ پہلے بے پروائی سے پھر آنکھیں جھپکا کر غور سے دیکھتا ہے۔ انہیں جوڑ کر پڑھتا ہے تو آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں۔)

ارے ــــ او ــــ رے ــ یہ ــ مگر ــ

(پھر دیکھتا ہے سب حقیقت سمجھ جاتا ہے ــــ جلد جلد جیبیں ٹٹول کر ایک خط نکالتا ہے۔ تھوڑی دیر خوفناک نظروں سے خلا میں گھورتا ہے پھر مٹھیاں بھینچ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ دروازہ کھلتا ہے اور خالہ بی خراماں خراماں خوشرنگ لباس میں داخل ہوتی ہیں)

خالہ بی۔ (بالکل بدلی ہوئی آواز میں کہ چوبیس برس قبل کی خالہ بی کی معلوم ہوتی ہے) تم سیدھے ادھر چلے آئے؟ ــــ ہیں ۔۔۔۔!

عالم۔ (جیسے مسحور ہے دو قدم پیچھے ہٹ جاتا ہے)

خالہ بی۔ (اس کی پریشانی سے نہ گھبرا کر) میں نے منشی جی کو بلا لیا ہے۔ وہ کل آجائیں گے اور سب طے ہو جائے گا۔ بہتر ہے کہ ہیہ ہو۔

عالم۔ (بے وقوفوں کی طرح) ہبہ! ۔۔۔۔

خالہ بی۔ ہاں ــ اور بنک میں شاید ہنیسٹھ ہزار رہ گیا ہے ــــ باقی کے حصے خرید لئے تھے۔ کاغذات سب میرے صندوقچے میں ہیں۔ (نیچی نظر کئے ہوئے) اور مکانات۔

عالم۔ (بدحواسی سے) اوں۔ خط۔ (پھٹے ہوئے خط کو ٹٹول کر) یہ ــــ یہ یہ ــــ (خود اپنے ہاتھ کا خط دیکھ کر) یہ ــــ اور ــــ میں ــــ یہ۔

خالہ بی۔ (بڑے پیار سے) ہاں ــ ہاں ــ یہ کیسا خط ہے؟

عالم۔ (جواب بھی کھویا ہوا ہے) یہ خط ــــ میرا ــــ ہے۔ تقرر ہو گیا میرا ــــ اور (گھبرا کر اُجڑے ہوئے کمرے کو دیکھ کر) اور ــــ یہ ــــ

خالہ بی۔ (خوشی سے) کہاں ہوا تقرر ــــ دہلی ہی میں ــ یا کانپور؟

عالم۔ (کچھ نہ سن کر جیسے کسی غائب ہستی سے) وہ ــــ میں خود ہو جاتا ــــ پاگل! ــ واجد! (سانس بھر کر) شمو!

خالہ بی۔ (اُس کے قریب آکر) عالم!

عالم۔ (اُن کی عجیب آواز سے چونک کر) خالہ بی ــــ

خالہ بی۔ (ناامید نہ ہونے کی کوشش کر کے) عالم ــــ میں تمہاری خاموشی ــــ

عالم۔ (جلدی سے) خالہ بی ــــ

خالہ بی۔ (کانپتی آواز میں) عالم تمہیں ــــ تم۔

عالم۔ (بات کاٹ کر جلدی سے) خالہ بی ــــ خالہ بی۔

خالہ بی۔ (نڈھال ہو کر گردن جھک جاتی ہے) عا ــــ آلم۔

(عالم بغیر کچھ کہے سنے جلد جلد خط جیب میں رکھتے ہوئے تیزی سے نکل جاتا ہے)

(خالہ بی کچھ دیر حیرت سے اُسے جاتا دیکھتی ہیں۔ اُس کے جاتے ہوئے پیروں کی آواز کو ایک نغمے کی طرح کان لگا کر سنتی ہیں۔ ذرا دیر میں اُن کی نظر اس کی ٹوپی پر پڑتی ہے جو وہ گھبراہٹ میں بھول گیا۔ وہ عجیب انداز میں بڑھ کر اُسے اُٹھا لیتی ہیں۔ ایک متبرک اور نازک مجسمے کی طرح اسے دیکھتی ہیں۔ اُن کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں پھیکی ہو کر بند ہونا شروع ہوتی ہیں ــــ اور بڑے بڑے بے رونق آنسو رخساروں پر ڈھلک آتے ہیں۔ گردن ذرا پیچھے گر جاتی ہے اور وہ ٹوپی کو آہستہ آہستہ ایسے سہلاتی ہیں جیسے دل شکستہ ماں اپنے بے جان بچے کو ٹٹولتی ہے۔ وہ قدموں کی چاپ بھی نہیں سنتیں۔ دروازے میں عالم نظر آتا ہے۔ وہ شاید ٹوپی لینے آیا ہے جسے بھول گیا تھا۔ تھوڑی دیر غیر فیصلہ کن انداز میں کھویا ہوا سا کھڑا رہتا ہے ــــ اور ــــ پھر ــ)

(اسٹیج ٹوٹ جاتی ہے)

عصمت چغتائی
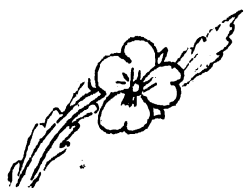
ایک گیت

جوبن کا مان

مان نہ کر تو مان   جوبن کا مان

چنچل جوبن، بالا جوبن
مدھ ماتا، متوالا جوبن
چڑھنے دے پروان

جوبن کا مان   مان نہ کر تو مان

برہ کی آگ

آگ لگی ہے آگ   برہ کی آگ

راکھ ہوا جائے تن جل جل
خون بہائیں آنکھیں پل پل
رو رو ہوں ہلکان

جوبن کا مان   مان نہ کر تو مان

بے بس کا زور

زور نہیں کچھ زور   بے بس کا زور

سیکھ لیا جی نے دکھ سہنا
ٹک ٹک تکنا چپ چپ رہنا
مشکل کر آسان

جوبن کا مان   مان نہ کر تو مان

قیوم نظر

اُردُو کی دو یادگار کتابیں

باغ و بہار، اور فسانۂ عجائب

ابھی تیرھویں صدی ہجری کو شروع ہوئے زیادہ زمانہ نہیں گذرنے پایا تھا اور ہندوستانیوں کی سیاسی قوتیں ایک نئی اور تازہ قوم کی سرگرمیوں کے مقابلے میں پسپا ہوکر پوری طرح نیست ونابود نہیں ہوئی تھیں کہ زبانِ اردو کی فطری کشش نے ہندوستان کے جدید فاتحوں کو اپنی طرف متوجہ کرکے اپنی بز رگداشت پر مجبور کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ اردو جس کا تمام سرمایہ شاعروں کے دیوانوں پر منحصر تھا۔ اور جس میں نثر آرائی اس وقت تک معیوب سمجھی جاتی تھی بہت جلد ایک وسیع اور مستقل زبان بن گئی اور وہی اردو جس میں بارھویں صدی ہجری کا آفتاب غروب ہونے سے پیشتر نثر کی معدودے چند کتابیں بھی نظر نہ آتی تھیں چند ہی سالوں میں قصوں، کہانیوں، تذکروں، تاریخوں اخلاق اور تصوف کی تصنیفات کے بیش بہا خزانوں سے مالامال ہوگئی۔

یہ وہ زمانہ تھا جب تمام ہندوستان طوائف الملوکی کا گہوارہ بنا ہوا تھا۔ دہلی کبھی کی اُجڑ چکی تھی اور لکھنؤ میں بہ ظاہر کچھ شان وشوکت باقی رہ گئی تھی۔

اس زمانے میں اگرچہ اردو کی بساط میں کچھ اضافہ ہوا اور اس وقت کی علمی اور ادبی یادگاروں میں سے کئی ایک ایسی بھی ہیں جن کی وجہ سے اردو نثر کو ارتقائی منزلوں سے گذرنے میں زیادہ آسانیاں حاصل ہوگئیں لیکن ان سب میں اس مضمون کے موضوع "باغ وبہار" اور "فسانہ عجائب" کو خاص طور پر امتیاز حاصل ہے۔

مرزا رجب علی بیگ سرور اور میر امن دونوں تقریباً ایک ہی زمانے کی پیداوار ہیں لیکن مختلف ماحول میں رہنے کے باعث ان کے طبائع میں زمین وآسمان کا فرق ہوگیا ہے۔ اور یہی وہ فرق ہے جو ان کی دونوں کتابوں میں ایک خاص اور نمایاں حیثیت کے ساتھ جلوہ گر ہے اور ادبیاتِ اردو کے مطالعہ کرنے والوں کو اس امر کی ترغیب دیتا ہے کہ وہ ان دونوں کا بالمقابلہ مطالعہ کریں۔

فسانۂ عجائب، باغ وبہار کے ٹھیک تیئیس برس بعد لکھی گئی۔ باغ وبہار کے آخر میں میر امن نے اپنی کتاب کے نام اور اس کی تاریخ کی بابت لکھا ہے "جب یہ کتاب فضلِ الٰہی سے اختتام کو پہنچی۔ جی میں آیا کہ اس کا نام بھی ایسا رکھوں جس میں تاریخ نکلے۔ جب حساب کیا ۱۲۱۵ھ کے آخر میں لکھنا شروع کیا تھا باعث عدم فرصتی کے ۱۲۱۷ھ میں انجام ہوئی۔ اسی فکر میں تھا کہ دل نے کہا باغ وبہار نام اچھا ہے کہ ہم نام تاریخ اس کی نکلتی ہے تب میں نے یہی نام رکھا۔" اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ میر امن نے باغ وبہار کی تکمیل تین سال کے عرصے میں کی۔

"فسانۂ عجائب" کی طرح باغ وبہار ایک تصنیف نہیں بلکہ ایک ایسا ترجمہ ہے جو غالباً خود بھی ایک دوسرے ترجمے پر مبنی ہے۔ میر محمد عطا حسین خاں تحسین نے نواب شجاع الدولہ کے متوسلوں میں شامل ہونے کے بعد جب فیض آباد کی سکونت اختیار کی تو امیر خسرو کی چہار درویش کا ترجمہ کرنا شروع کیا۔

یہ کام نواب آصف الدولہ کے عہد میں بھی جاری رہا لیکن نواب کی وفات موقوعہ ۱۷۹۷ء سے قبل اختتام پا چکا تھا۔ کیونکہ اس میں نواب کی تعریف میں جو قصیدہ لکھا گیا ہے اس سے نیز دیباچے سے ظاہر ہوتا ہے کہ کتاب کے اختتام کے وقت نواب آصف الدولہ بقیدِ حیات تھے اس لحاظ سے ڈاکٹر ہیوم ہارٹ کا یہ خیال صحیح معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سنہ تصنیف تقریباً ۱۷۸۰ء ہے۔

اگرچہ تحسین کے کارنامے نے "نو طرز مرصع" کے نام سے کافی شہرت حاصل کرلی تھی لیکن اس کا اسلوب نہایت رنگین اور پرتکلف تھا

اس لئے اردو زبان وادب کے ایک محسن ڈاکٹر گل کرائسٹ نے
میر امّن سے فرمائش کرکے چہار درویش کا ترجمہ کرایا جو باغ و بہار کے
نام سے مشہور ہوا اور جو موجودہ مضمون کا موضوع ہے۔ اس ترجمے کے
علاوہ اردو میں چہار درویش کے اور بھی ترجمے ہوئے تھے جن کی تفصیل
کتب خانوں میں موجود ہے اور جو تعداد میں پانچ ہیں۔ اس سے ہمیں
امیر خسرو کی کتاب "چہار درویش" کی مقبولیت کے اس غیر معمولی درجے
پر حیرت ہوتی ہے۔

اگرچہ مرزا رجب علی بیگ سرور نے فسانۂ عجائب
کا قصہ جیسا کہ انہوں نے دیباچے میں بیان کیا ہے۔ ایک
ہی سال میں قلم بند کیا ہے۔ لیکن وہ ایک عرصہ قبل ہی اس
قصے کو لکھنو کی ایک صحبت میں سنا چکے تھے اور ان سے وہیں ان کے
احباب نے اس کو قلم بند کرنے کی فرمائش کی تھی چنانچہ اسی وقت سے
ان کو اس کا خیال تھا اور جب وہ ربیع الثانی سنہ ۱۲۴۰ھ میں تلاش معاش
کی خاطر کانپور پہنچے تو وہاں اس کو تحریر میں لانے کا موقع ملا۔ ایک ہی
سال میں اس کو اختتام تک پہنچا کر حسب ذیل تاریخ لکھی۔

جس نے کہ سنا اس کو جی میں بیگانہ کہنے — یا رب یہ فسانہ ہے یا سحر ہے بابل کا
تاریخ سرور اس کی منظور ہوئی جو ہم — بے ساختہ جی بولا نشتر ہے رگ گل کا
سنہ ۱۲۴۰ھ

یہ بات ادبی انصاف کے خلاف ہے کہ ایک ترجمے کا ایک تصنیف
سے مقابلہ کیا جائے لیکن میر امّن کی باغ و بہار ایک ایسا ترجمہ ہے جو اصل
چہار درویش اور نو طرز مرصع دونوں سے غالباً کئی امور میں جدا ہے۔ میر
امّن نے نہ صرف اسلوب میں نو طرز مرصع سے علیحدگی اختیار کی بلکہ بعض اصولی
امور میں بھی وہ آزاد نظر آتے ہیں۔ مثلاً نو طرز مرصع میں قصے کے ہیرو بادشاہ
(جس کے ذریعے سے چاروں درویشوں کے مطلب بر آتے ہیں) کا نام فرخندہ
سیر لکھا ہے لیکن باغ و بہار میں اس کو ہر جگہ آزاد بخت کے نام سے یاد کیا
گیا ہے میر امّن نے باغ و بہار کو لکھتے وقت جس قسم کی آزادی اختیار کی اس
کے متعلق تفصیل وار بحث کرنے کی ضرورت نہیں یہاں صرف اس امر کا
اظہار ضروری ہے کہ وہ بالکل آزاد ترجمہ ہے، ایک ایسا ترجمہ جس میں میر امّن
نے اپنی قوت متخیلہ سے اس قدر کام لیا ہے کہ وہ قریب قریب تصنیف
کا مرتبہ حاصل کر چکا ہے۔

فسانۂ عجائب کے متعلق بھی فی الحال کوئی تصفیہ نہیں کیا جا سکتا
کہ آیا وہ ذاتی قوت متخیلہ کا نتیجہ ہے یا کسی قدیم فسانے کا ترجمہ لیکن اس کے
مطالعے سے ایک بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ باغ و بہار کی طرح اس میں
اس کے مصنف نے اپنی طبیعت اور اپنے زمانے کی مخصوص کیفیتوں کے
اثرات نمودار کر دیئے ہیں اور چونکہ دونوں بالکل قریبی زمانے میں لکھی گئی
ہیں اس لئے ان کا مقابلہ ناانصافی نہیں ہے۔

قریب قریب ایک ہی زمانے کی پیداوار ہونے کے علاوہ
یہ دونوں فسانے موضوع کے لحاظ سے بھی بالکل متحد ہیں لیکن اس بارے
میں بھی وہ اپنی خصوصیات کے لحاظ سے اس قدر مختلف ہیں کہ اس
حیثیت سے ان کا مقابلہ کرنا ایک خاص دلچسپ ادبی مشغلہ معلوم ہوتا
ہے۔ ایک ایسا ادبی شغل جس کے لئے کوئی صاحب ذوق مجبور ہوئے
بغیر نہیں رہ سکتا۔

تاریخ ادبیات اردو میں ان دونوں کتابوں کا مرتبہ ایک اور نقطۂ
نظر سے بھی اہم ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ کتابیں اردو کے دو خاص دبستانوں
کے کارنامے ہیں یعنی باغ و بہار ایک دہلوی کا کارنامہ ہے اور فسانۂ عجائب
ایک لکھنوی کا۔ اس لحاظ سے جب ہم دونوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں
دونوں دبستانوں کے نقطۂ خیال کا خاص طور پر اندازہ ہوتا ہے جس طرح
باغ و بہار میں میر امّن کی ذہنیت کے علاوہ دلّی کے مخصوص اثرات کی
جھلک نظر آتی ہے فسانۂ عجائب سے اس کے مصنف کی قلبی کیفیات کے
علاوہ اس کے ہم وطنوں کے دماغی رجحانات کا پورا پتہ چلتا ہے۔

مقابلے کے یہ دو تین اسباب تو ایسے تھے جو غیر ارادی طور پر ان
دونوں کتابوں میں ان کے مصنفین کی جانب سے پیدا ہو گئے لیکن ایک
دو سبب ایسے بھی ہیں جو عمداً اختیار کئے گئے اور جن کی وجہ سے ان دونوں
کا مقابلہ ایک ادبی فرض کی حیثیت حاصل کر لیتا ہے۔

پہلا سبب تو یہ ہے کہ فسانۂ عجائب عمداً باغ و بہار کے مقابلے
میں لکھی گئی اس لئے کہ سرور نے اپنے دیباچے میں میر امّن پر طعن کر کے
علی الاعلان اظہار کر دیا ہے اگرچہ اس ہیچ میرز کو یہ یارا نہیں کہ دعوے اردو
زبان پر لائے یا اس افسانے کو بہ نظر نثاری کسی کو سنائے مگر شاہجہان آباد کہ مسکن
اہل زبان کبھی بیت السلطنت ہندوستان تھا۔ دلی چندے بود و باش
کرتا فصیحوں کو تلاش کرتا تو فصاحت کا دم بھرتا جیسا میر امّن صاحب نے
چار درویش کے قصے میں بکھیڑا کیا ہے ہم لوگوں کے ذہن و حصے میں یہ
زبان آئی ہے۔ دلی کے روڑے ہیں محاورات کے ہاتھ منہ توڑے ہیں

پتھر پڑیں ایسی سمجھ پر۔ یہی خیال انسان کا خام ہوتا ہے مفت میں نیک بد نام ہوتا ہے۔ بشر کو دعوے کب سزاوار ہے کاملوں کو بیہودہ گوئی سے انکار بلکہ ننگ و عار ہے۔ مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار بگوید۔ وہی مثل سننے میں آئی کہ اپنے منہ سے دھنّا بائی۔" سرور نے اس قول کا عملی ثبوت فسانۂ عجائب میں پیش کیا ہے۔ چنانچہ ہم یہاں اس کا پہلا ثبوت پیش کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ جس طرح میر امّن نے کتاب کے شروع میں اپنے وطن دلی کی تعریف لکھی ہے۔ سرور نے بھی آغازِ کتاب میں لکھنؤ کی تعریف کی ہے اور اس میں خاص طور سے رنگینی اور عبارت آرائی سے کام لیا ہے۔

دوسرا سبب یہ ہے کہ جس طرح میر امّن نے قدیم طرزِ انشا پردازی کو چھوڑ کر بالکل علیحدہ اور آزادانہ اسلوب استعمال کیا سرور نے بھی عمداً ایک ایسا طرزِ بیان اختیار کیا جو ہر طرح سے میر امّن کی طرزِ تحریر کا متضاد تھا۔ اگرچہ فسانۂ عجائب اور باغ و بہار جس زمانے کی پیداوار ہیں وہ اردو زبان کا ابتدائی دور تھا اور اس وقت فنِ افسانہ ارتقائی منزلوں سے گذر رہا تھا۔ ان ارتقائی منازل میں اردو کے افسانے چند متعین اصولی خصوصیات پر منحصر تھے اور فسانۂ عجائب و باغ و بہار دونوں میں وہ تمام خصوصیتیں موجود ہیں جو اس وقت قصوں اور داستانوں کے لئے اجزائے لاینفک کا مرتبہ رکھتی تھیں ان میں سے ایک خصوصیت یہ ہے کہ قصہ گو اپنی وسیع معلومات اور قوی حافظے کی مدد سے اثنائے بیان میں ایک قسم کی چیزوں کی پوری پوری فہرست اور کیفیات پیش کر دیتا ہے۔ اگرچہ یہ فہرستیں اور کیفیتیں بعض مواقع پر ناگوار بھی معلوم ہونے لگتی ہیں لیکن ان کے ذریعے سے کسی تنقیدی نظر سے مطالعہ کرنے والے کو کئی قسم کی آگاہی حاصل ہو سکتی ہے۔ جس طرح مناقب بازی میں کمال اور کامیابی مختلف الموضوع اشعار کے یاد ہونے پر منحصر ہے۔ داستان گوئی کے ماہر کے لئے مختلف النوع اشیا کی تفصیلی معلومات کی کما حقہٗ واقفیت اور پوری فہرست کا ورد زبان ہونا ضروری ہے قصے کو طول دینے اور سامعین کو اس میں محو رکھنے کے لئے ہوشیار قصہ گو کو اس قسم کے گُر سے ضرور کام لینا پڑتا ہے۔ اس پر عمل کرتے وقت وہ اس تیزی سے متعدد نام گنا جاتا ہے اور ایک ہی سانس میں اتنی کائنات پیش کر دیتا ہے کہ سامعین بجائے ناموں کی کثرت سے بیزار ہونے کے اس کے کمالِ استادی اور مہارت کی داد دینے لگتے ہیں۔

استاد قصہ گو اپنی قابلیت کے اظہار اور اپنی اسی قسم کی طاقت صرف کرنے میں نہایت ہوشیاری سے کام لیتے ہیں۔ وہ اپنے لفظی مرقعوں میں متانت قایم رکھنے کے لئے اپنی تمام معلومات ایک ہی مرحلے میں نہیں صرف کر دیتے بلکہ کبھی ایک قسم کی چیزوں کا ذکر کرتے ہیں اور کبھی دوسری قسم کی اور ایک ہی قسم کے اشیا میں بھی سب کا نام ایک ہی دفعہ نہیں گنا جاتے بلکہ کچھ آئندہ کے لئے بھی اٹھا رکھتے ہیں مثلاً بعض دفعہ انہیں کسی باغ کا ذکر کرنا ہوتا ہے تو اس سے پہلے جتنے باغوں کا تذکرہ کرتے ہیں ان سب کے لوازمات کا معمولی اظہار کرتے ہیں اور جب اس خاص باغ کا بیان آتا ہے تو اپنی ساری معلومات پیش کر دیتے ہیں تاکہ سننے والوں پر اس کی اہمیت ظاہر ہو جائے۔ اردو کے ہر قدیم قصے میں داستان گوئی کی اس خصوصیت کے آثار کثرت سے نمایاں ہیں۔ چنانچہ باغ و بہار اور فسانۂ عجائب میں بھی اس کا ثبوت موجود ہے۔

اگرچہ سرور کو اپنے طبع زاد قصے میں اپنے خارجی معلومات پیش کرنے کا میر امّن سے جن کا قلم ایک خاص فضا میں محدود تھا۔ زیادہ موقع اور آزادی حاصل تھی اور اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے جو کچھ بھی خارجی مرقعے پیش کئے ہیں ان میں اپنے کمال کو معراج تک پہنچا دیا ہے لیکن ہر قسم کی چیزوں کی پوری فہرست اور معلومات پیش کرنے میں میر امّن سے پیچھے رہ گئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ فسانۂ عجائب میں اس چیز کا فقدان نہیں لیکن باغ و بہار کے مقابلے میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ فسانۂ عجائب میں یہ عنصر تکمیل کو نہیں پہنچ سکا اور اس کے علاوہ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ سرور کی نظر روزمرہ کی ضروریات اور معمولی چیزوں پر بہت گہری نہیں پڑتی تھی۔ کوئی وجہ نہیں کہ وہ شخص جو ایک طبعزاد افسانہ قلمبند کر رہا ہو اور قلمبند کرنے سے پہلے اس کو دوست احباب کو سنا بھی چکا ہو قصہ سنانے والوں کے اس عام گُر سے ناواقف رہے اور اگر واقف بھی ہو تو اس قدر بے پروائی سے کام لے۔ اس کے خلاف ایک ایسا شخص جو دوسروں کی فرمائش پر ایک پہلے سے لکھے ہوئے قصے کا ترجمہ کر رہا ہو دورانِ تحریر میں معمولی معمولی چیزوں کے متعلق نہایت تفصیل کے ساتھ بے ساختہ لکھ جائے۔ مؤخر الذکر کی یہ بے ساختگی ظاہر کرتی ہے کہ وہ ان باتوں کو اول الذکر سے زیادہ جانتا ہے۔ جب ہم فسانۂ عجائب اور باغ و بہار میں جو تفصیل و اہمیت

معلومات پیش کی گئی ہیں ان کا مقابلہ کرنے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو ہمیں ایک سرسری نظر میں معلوم ہوتا ہے کہ بعض جگہہ دونوں کتابوں کے مصنفوں کو ایک ہی قسم کی اشیا کے ذکر کا موقع ملا ہے۔ چنانچہ دونوں کتابوں میں اقسامِ طعام کا ذکر ہے۔ اس ضمن میں میر امّن کے قلم سے حسب ذیل نام پے بہ پے نکل جاتے ہیں:۔

"پلاؤ، قورما پلاؤ، ہفت جن پلاؤ، کوکو پلاؤ، زردہ، قلیہ، دوپیازہ، نرگسی، مادری، روغن جوش، روٹیاں، باقرخانی، تنکی، شیرمال، گاؤ دیدہ، گاؤ زبان، نان نعمت، پراٹھے، کباب، کوفتے، مرغے کے خاگینے، ملغوبہ، شب دیگ، دم پخت، حلیم، ہریسہ، سنبوسے، ورقی، قبولی، فیرینی، شیر برنج، بلائی، حلوہ، فالودہ، آبشورہ، مساق عروس، لوزیات، مربے، آچار، دہی کی قلفیاں،

اس کے خلاف سرور کی زبان سے کھانے کے بہت کم نام نکلتے ہیں۔ مثلاً پلاؤ، قلیہ، زردہ، قورمہ، شیرمال، فرنی، کباب (مسلمانوں کے کھانے) پوری، کچوری، مٹھائی، اچار (ہندوؤں کے کھانے)

کھانے کے اقسام کی طرح دونوں نے شکاری جانوروں کا بھی ذکر کیا ہے چنانچہ میر امّن نے باز، بہری، صرد، باشہ، عقاب کے نام اور سرور نے باز، بہری، باشہ، عقاب کے نام پیش کئے ہیں۔

اسی طرح زنانہ ملازمین کا تذکرہ بھی دونوں میں مشترک ہے۔ باغ و بہار میں اس موقع پر اردبیگنیاں، قلماقنیاں، حبشنیاں، ارکنیاں، کشمیرنیاں، ترکنیاں وغیرہ کے نام ہیں جو زیادہ تر نسلی امتیاز پر مبنی ہیں۔ مثلاً دائی، مغلانیاں، لونڈیاں، باندیاں یہی سرور کے یہاں بھی قریب قریب موجود ہیں۔

سرور انہیں چیزوں کی تفصیل پیش کرتے ہیں جو ان کی انشاپردازی میں انہیں استعمال کرنی پڑتی ہیں۔ وہ خارجی حالات کی ترجمانی کرنے اور واقعے کو رنگینی کے ساتھ بیان کرنے میں اُستاد ہیں۔ دونوں کتابوں کو بغور مطالعہ کرنے پر ہم جس نتیجے پر پہنچتے ہیں وہ یہ ہے کہ میر امّن کی نظر گھریلو اور معمولی اشیاء پر زیادہ پڑتی ہے جس کی وجہ سے ان کی تحریروں میں اس قسم کی اشیاء کی کثرت ہے۔ اس کے خلاف سرور کی اکثر قیمتی معلومات علمی دنیا کے متعلق ہیں جو میر امّن کی علمی دنیا سے بالکل علٰحدہ ہے۔ ایک اپنی عملی معلومات سے روزمرّہ کی زندگی کا نقشہ کھینچ کر ہماری زندگی کے عملی شعبے کو تقویت بخشتا ہے اور دوسرا اپنی علمی معلومات کے ذریعے سے ہمارے دماغ کی علمی فضا کو وسیع کرنے اور اس پر اپنی قابلیت کے نقوش ثبت کرنے میں محو رہتا ہے۔

اردو قصّوں اور داستانوں کی ایک اور خصوصیت یہ ہے کہ ان میں پڑھنے یا سننے والے کی دلچسپی کو زیادہ کرنے کے لئے کئی دیگر قصے اور داستانیں بیان کی جاتی ہیں۔ جہاں قصہ گو دیکھتا ہے کہ سامعین اکتانے لگے ہیں۔ اصلی قصہ کہتے کہتے ایک ایسی بات کہہ جاتا ہے جس کی توضیح کسی دوسرے قصے میں پائی جاتی ہے۔ چنانچہ اس کے بعد وہ دوسرا قصہ شروع کر دیتا ہے اس طرح سامعین کی دلچسپی از سرِ نو تازہ ہو جاتی ہے۔ اس ضمن میں قصے کو سُن چکنے کے بعد ان کے دلوں میں پھر گذشتہ قصے کا باقی ماندہ حصہ سننے کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو زبان میں داستانیں بہت طویل ہو گئی ہیں۔ ان قدیم قصوں پر نظر ڈالنے سے نہ صرف داستان گویوں کے اس استادانہ کمال یعنی اس قصے کو طویل بنانے کا فائدہ پیش نظر ہو جاتا ہے بلکہ ایک اور ادبی فائدہ نمایاں ہونے لگتا ہے وہ یہ ہے کہ قصہ گو کے زمانے کی معاشرتی جھلکیں آشکار رہتی ہیں۔ وہ اپنے زمانے کے کسی درباری کے حالات بیان کرتا ہے اور کہیں کسی تاجر کی زندگی کے اسرار پر روشنی ڈالتا ہے کہیں شکاری کے حالات پیش کرتا ہے۔

ایشیائی افسانوں کی ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان میں فوق الفطرت عنصر کو بہت زیادہ دخل ہے۔ کچھ وجہ اس کی یہ ہے کہ ایشیائی قوموں کے خیالات مذہبی رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں[1] اور ان کی معاشرت میں جگہہ جگہہ توہمات کو دخل ہے لیکن قصوں میں اس کی کثرت کا ایک بڑا سبب یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب قصہ گو سمجھتا ہے کہ وہ قصے کو زیادہ دلچسپ نہیں بنا سکتا تو وہ یکایک ایک ایسا نیا طرز اختیار کرتا ہے کہ تمام سامعین متحیر ہو جاتے ہیں اور چونکہ ان کے دل و دماغ پہلے سے اس نت نئی اور غیر معمولی اشیا کے تذکرے سے مانوس بلکہ ان کے حقیقی ہونے پر یقین کامل رکھتے ہیں اس لئے قصہ گو اپنے اس کمال کی نما طرح داد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

اس زمانے میں مسلمان عاملوں کا جنّوں کا قبضے میں لانا اور ان سے کام لینا کوئی غیر معمولی بات نہیں سمجھی جاتی تھی اگر کوئی شخص دریا میں ڈوب جاتا تو عام لوگ یہی سمجھتے تھے کہ کسی جن نے اس کو غائب کر دیا ہے۔ اگر کوئی عورت بیمار ہو جاتی تو اس کے گھر والوں کو یقین ہو جاتا کہ اس پر کسی دیو یا پری کا سایہ ہو گیا ہے۔ چنانچہ ان تمام باتوں سے بچنے کے

[1] مغرب میں بھی یہی بات ہے۔ فقط تاریخی، احول اور طبعی رجحانات کی وجہ سے اُن توہمات اور فوق الفطرت باتوں سے دلبستگی نے مختلف صورت اختیار کر لی ہے، ایسی کہ پہلی نظر میں اصلیت پہچانی نہیں جاتی — ادارہ

لئے کئی ذرائع اختیار کئے گئے تھے جن میں سب سے بڑا ذریعہ عاملوں اور ملاؤں کے تعویذ وغیرہ کا تھا۔

یہ بات تو نہ صرف باغ و بہار کے مصنف و مترجم کے زمانے میں رائج تھی بلکہ آج کل بھی ہندوستانیوں کی ذہنیتیں اس سے متاثر ہیں اور چونکہ باغ و بہار میں صرف انہیں کی وفاداری کے ساتھ نمائندگی کی گئی ہے اس لئے اس کا آج کل پڑھنے والا بھی اس سے اسی طرح متاثر ہو سکتا ہے جس طرح وہ شخص متاثر ہوا ہوگا جس کو باغ و بہار کے تصنیف کئے جانے کے بعد ہی سب سے اول سننے یا دیکھنے کا موقع حاصل ہوا ہو۔

جذبۂ عشق کی ترجمانی کرنا آغازِ کائنات ہی سے انسان کا ایک دلچسپ مشغلہ رہا ہے اور جوں جوں تمدن میں ترقی ہوتی گئی ہے اظہارِ عشق کے ذریعے نفیس اور مکمل ہوتے گئے ہیں۔ دنیا کی کسی زبان کا ادب اس عنصر سے محروم نہیں۔ کسی وحشی قوم کا جاہل سے جاہل فرد اور کسی مہذب قوم کا کوئی عالی دماغ شخص بھی محبت کے عالمگیر اثرات اور اس کے ہوشربا واقعات میں دلچسپی لئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی بنا پر ہر زبان کے ادیب اپنے کارناموں میں عشق و محبت کے عنصر کو شامل رکھنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

ہر زبان و ادب کا عشقیہ عنصر اس کے بولنے اور لکھنے والوں کے ذہنی ارتقاء کے ساتھ ترقی کرتا جاتا ہے جو قوم تہذیب و تمدن کے لحاظ سے جس قدر زیادہ ترقی یافتہ ہو اس کے ادب کا عشقیہ عنصر بھی اسی تناسب کے ساتھ نفیس اور مکمل ہوگا۔

اردو کے ادبی کارناموں میں جو عشقیہ عنصر پایا جاتا ہے وہ ہندوستان کے ترقی یافتہ ذہنوں کی پیداوار ہے شاہجہاں کے زمانے میں ہندوستانیوں کا ذہنی ارتقاء معراجِ کمال کو پہنچ چکا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم اردو ادب میں عشق و محبت کے وہ بدصورت مرقع نہیں پاتے جو کسی دوسری زبان سے بکثرت فراہم کئے جا سکتے ہیں۔

چونکہ اردو زبان نے ایسے ملک اور ایسے انسانوں کے درمیان جنم لیا۔ جو تہذیب و تمدن میں کافی طور پر ترقی کر چکے تھے اس لئے وہ اپنے وطن اور ابنائے وطن کی ہستیوں کے تمام ترقی یافتہ شعبوں سے بہت جلد متاثر ہو گئی اس کی ابتدا کے وقت اس کے بانیوں میں عشق و عاشقی نہ صرف درجۂ کمال کو پہنچ چکی تھی بلکہ حد سے متجاوز ہونے کے باعث بعض عیبوں سے بھی روشناس ہو چکی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اردو ادب میں نہ صرف عشق و عاشقی کے مکمل مرقعے پیش کر دیئے گئے۔ بلکہ اس سے متعلقہ وہ تمام بدعنوانیاں اور سرمستیاں بھی جلوہ گر ہو گئیں جو کسی قوم کے کافی ترقی کر چکنے کے بعد عیش و عشرت میں پڑ جانے کی وجہ سے اس کے دل و دماغ پر حاوی ہو جاتی ہیں۔

سیّد مسیح الزمان جائسی

بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ جس وقت اردو میں نثر کی آمد ہوئی اس وقت سماجی اور ذہنی تخریب و زوال کا دور دورہ تھا۔ ہندو تہذیب خارجی اثرات اور مقامی ہیجانات کے نیچے دب چکی تھی۔ اور اُس تہذیب کو بھی زوال آرہا تھا جسے مغلوں نے نو سو سال کی محنت سے رائج کیا تھا۔

ادارہ

روحِ انقلاب کا فرمان

اُٹھو اور اُٹھ کے نظامِ جہاں بدل ڈالو
یہ آسماں، یہ زمیں، یہ مکاں بدل ڈالو

یہ بجلیاں ہیں پُرانی، یہ بجلیاں پھونکو
یہ آشیاں ہے قدیم، آشیاں بدل ڈالو

ہزار سال کے تاروں کا کیا کریں گے ہم
ہزار سال کی یہ کہکشاں بدل ڈالو

فلک پہ ہنستے ہوئے بادباں ہوں اور کشتی
فضا میں روتے ہوئے بادباں بدل ڈالو

خسِ کہن سے یہ سیلاب تو نہیں رُکتا
زمانِ نوح کی سب کشتیاں بدل ڈالو

انگیٹھیاں ہوں بدستِ شمیم و نکہتِ گُل
کچھ اس طرح روشِ گلستاں بدل ڈالو

حیات کوئی کہانی نہیں حقیقت ہے
اس ایک لفظ سے کُل داستاں بدل ڈالو

پکڑ کے شیب کی رگ میں بھر شباب کا خون
دلِ ضعیف سے قلبِ جواں بدل ڈالو

نظامِ قافلہ بدلا تو کیا کمال کیا
مزاجِ رہبرِ کارواں بدل ڈالو

ہر ایک ذرّے سے پیدا کرو نئی دُنیا
نئے جہاں سے پُرانا جہاں بدل ڈالو

ساغر نظامی

ایک رات کی بات

یہ کہانی میرے دوست ارشد کے متعلق ہے۔ ارشد آدمی تو دل گردے والا ہے اور جھوٹ کی کہئے تو اکثر لوگوں سے کچھ زیادہ جھوٹا بھی نہیں لیکن ایک چھت والی گلی سے رات کے وقت گذرنے سے بہت ڈرتا ہے اور اس بارے میں جو کچھ اُس نے ہمیں بتایا وہ ہماری سمجھ میں تو آتا نہیں جب کبھی اُس گلی کا ذکر آئے تو وہ کچھ سہم سا جاتا ہے اور اگر اُسے اس بزدلی کا احساس دلایا جائے تو ایک بے باک سی ہنسی ہنسنے کے بعد اقرار کر لیتا ہے کہ واقعی رات کے وقت اُس گلی سے گذرتے ہوئے وہ ڈرتا ہے کیونکہ اُسے وہاں ایک عورت سے مڈبھیڑ ہونے کا خدشہ ہے اور اسی لئے وہ اب کبھی بھی اُس راستے سے گذرنے کی جرأت نہیں کرتا۔ وہ جس انداز سے اپنے خوف و ہراس کا اعتراف کرتا ہے۔ اُسے دیکھ کر بیزاری، بے یقینی اور کچھ حقارت سی محسوس ہوتی ہے اور جی چاہتا ہے کہ اس ڈرانے والے اور جوڑے چکلے جوان کو مردوں کی نوع سے ہی خارج کر دیا جائے۔ پھر اُس کی اُس بہادری اور شجاعت کا خیال کرتے ہوئے جو اس نے شمیر کے شکار میں اکثر دکھائی ہے اُس کے پراسرار خوف پر جو اُسے رات کے وقت اُس چھت والی گلی میں ایک عورت کے ملنے کے خدشے سے پیدا ہوتا ہے حیرت ہوتی ہے۔

موجودہ زمانے میں جب کہ سیر و سفر کے لئے ہزاروں سہولتیں میسر ہیں۔ اس ذکر کی کچھ ضرورت محسوس نہیں ہوتی کہ وہ چھت والی گلی دو اونچی دیواروں سے گھری ہوئی ہے یہ گلی نواب فرحت اللہ بیگ کے محل اور حبیب منزل کے درمیان سے گذرتی ہے۔ لوگوں سے سُنا ہے کہ اس گلی پر کبھی لکڑی کی ہلکی سی چھت ہوا کرتی تھی جو شاید نواب فرحت اللہ بیگ جب کبھی مرزا حبیب کے مکان پر جانا چاہتے ایک دیوار سے دوسری دیوار پر ڈال دی جایا کرتی تھی لیکن آج یہ سب کچھ ایک گذرے ہوئے افسانے سے زیادہ نہیں۔ نواب کا اجڑا ہوا اور ویران محل کھنڈروں کی سی کیفیت لئے ہوئے کسی گذرے ہوئے زمانے کی یاد دلانے کے لئے باقی رہ گیا ہے۔ اور حبیب منزل میں مرزا حبیب کی بجائے اب کوئی اجنبی سکونت رکھتا ہے۔ لیکن اس گلی کو اب بھی نواب صاحب کی جاگیر ہی تصور کیا جاتا ہے گو نواب صاحب اب شہر سے باہر اپنے نئے محل "فردوس بریں" میں رہتے ہیں لیکن نواب صاحب یہ بات تسلیم کرانے کے لئے کہ یہ گلی شارع عام نہیں بلکہ اُن کی ملکیت ہے سال میں ایک بار اپنے نوکروں کو بھیج کر گلی کے دونوں دروازوں پر تالے لگوا دیتے ہیں اس خاص دن کا انتخاب نواب صاحب کی اپنی مرضی پر منحصر ہے اور سال کے باقی تین سو چونسٹھ دن یہ گلی عام لوگوں کے لئے کھلی رہتی ہے اور لوگ کچہری روڈ سے سیدھے چند منٹوں میں افغان روڈ پر پہنچ جاتے ہیں اور انہیں ڈاک خانے والے چوک کا چکر کاٹنے کی زحمت گوارا نہیں کرنی پڑتی۔ یہاں اُس بوڑھے کا ذکر کر دینا کچھ نامناسب نہ ہوگا جو سال کے تین سو چونسٹھ دن بغل میں جھاڑو دبائے اس گلی کا چکر کاٹتا رہتا ہے وہ کبھی جھاڑو دیتا ہوا آ کر ایک لکڑی کے چھوٹے سے مندر نما چبوترے پر سستانے کے لئے بیٹھ جاتا ہے اور پھر جونہی کسی کو کوئی چھلکا، گنڈیری یا سگریٹ زمین پر پھینکتے دیکھتا ہے صاف کرنے کے لئے اُٹھ بھاگتا ہے اور ہر گذرنے والے کو نہایت ادب اور تپاک سے سلام کرتا ہے۔

اور اب سنئے قصہ سے کوئی چھ ماہ پہلے کی بات ہے۔ مئی کا مہینہ تھا۔ ایک رات جب کہ لوگ چین سے سو رہے تھے۔ ارشد کو اُس گلی سے گذرنے کا اتفاق ہوا۔ وہ افغان روڈ سے کچہری روڈ کی طرف جا رہا تھا۔ رات کافی گذر چکی تھی۔ فضا تاریک اور ٹھنڈی تھی اور نیند میں ڈوبے ہوئے لکھنؤ کی خاموشی اور سکوت کو گھڑیال کی آواز برہم کر رہی تھی۔ اُس کے قدم بے فکری سے آگے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ جن کی چاپ دیواروں سے ٹکرا کر اک گونج پیدا کر رہی تھی۔ ابھی وہ

آدھا راستہ ہی گیا ہوگا کہ اُسے محسوس ہُوا کہ کوئی اور بھی اُس کے سوا اس گلی میں چل رہا ہے اُس نے دیکھا کہ یہ ایک عورت تھی جو اُس سے کچھ قدم دور تھی۔ اور اُس کی طرف ہی آ رہی تھی۔ وہ چل نہیں رہی تھی بلکہ لڑکھڑاتی ہوئی دیوار سے ٹکراتی ہوئی ڈولتی آ رہی تھی۔ ایک آوارہ عورت عصمت فروش، رات کی رانی ——!

ارشد آگے گذر گیا۔ اُسے اُس کا چہرہ تک دیکھنے کی بھی خواہش نہ تھی، ایک آواز ایک شرمیلی سی آواز نے اُسے پکارا۔ لیکن وہ چلتا گیا۔ دو قدم تین قدم پھر ایک آواز نے پکارا یہ پہلے سے بلند تھی وہ مڑا اگر کچھ بے دلی سے، وہ شرمیلے اور آرزو انگیز الفاظ جو ایسی عورتیں نوجوانوں کو پھسلانے اور لبھانے کے لئے استعمال کرتی ہیں انہیں سب جانتے ہیں اور ارشد بھی ایسے الفاظ پہلے کئی بار سن چکا تھا لیکن اُس پر کبھی بھی اِن کا اثر نہ ہُوا تھا اور اُسے اسی وجہ سے اپنے حلقۂ احباب میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا لیکن اس نے "دیکھئے تو . . . . !" کچھ ایسی شرمیلی ادا کے ساتھ کہا کہ اُسے اُس پر کسی اعلیٰ خاندان کی بہو بیٹی ہونے کا گمان ہُوا۔ اُس کی آواز بہت ہی شیریں تھی، ترغیب اور اشارے کے اثر سے خالی ہوئی نہ تھی۔ اُس میں ایک دلکشی، ایک آرزو جھلک رہی تھی۔ یہ آواز ارشد کے کانوں تک پہنچی اور اس کی صاف ستھری بے تکلف نزاکت نے اُسے پلٹنے پر مجبور کر دیا۔

"فرمایئے ؟" ارشد نے جواب دیا۔

وہ جواب سُن کر کچھ اس انداز اور نزاکت سے اُس کی طرف بڑھی کہ اُسے وہاں سے چل دینے کی جرأت نہ ہوئی۔ وہ درمیانے قد کی دُبلی پتلی سی عورت اُس کے پاس آ کر ٹھہر گئی۔ اس کے نقش و نگار اور لباس سادہ تھے۔ اس کے یوں کھڑے ہونے میں ایک امیرانہ سنجیدگی اور متانت تھی۔ اُس نے سیاہ رنگ کی معمولی قسم کی ساڑھی پہن رکھی تھی۔ اس کے ہونٹوں پر ایک سادہ اور بے کیف تبسم تھا۔

"آپ کیا چاہتی ہیں؟" ارشد نے ایک دفعہ پھر اخلاقاً پوچھا۔

"بس یہی" اُس گڑیا نے کہا کہ مجھے اس راستے سے اکیلے گذرتے ہوئے ڈر لگتا ہے۔ اگر آپ کچہری روڈ تک اپنے ہمراہ چلنے کی اجازت بخشیں تو بہت ہی ممنون ہوں گی"۔ اس وقت وہ بہت ہی سنجیدہ اور بارعب معلوم ہو رہی تھی۔

"شوق سے چلئے" یہ کہہ کر وہ مڑ کر چل دیا۔ مگر وہ ملکۂ شب اپنے مخصوص انداز میں جس طرح کہ وہ اکیلی چل رہی تھی۔ آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتی رہی اور ارشد اُس کی رفتار کا ساتھ دیتا رہا۔

"اگر آپ واقعی اکیلے چلتے ہوئے خطرہ محسوس کرتی ہیں تو کیا ایک اجنبی کے ساتھ اس قدر تاریک اور سنسان راستے پر اکیلے چلنا ایک شریف عورت کے لئے اس اندھیرے سے زیادہ پرخطر نہیں ؟" ارشد نے یونہی کچھ کہنے کی غرض سے کہہ دیا۔

وہ یہ سُن کر مسکرائی اور کہنے لگی "میں نے گذرتے ہوئے آپ کو دیکھ لیا تھا۔ اور میں جان گئی تھی کہ آپ کسی آراستہ کمرے میں تو پرخطر ہو سکتے ہیں لیکن اس سنسان چھت والی گلی میں بالکل بے ضرر ہیں جیسا کہ اکثر وہ لوگ نہیں ہوتے —— جنہیں میں جانتی ہوں"۔ وہ بہت آرام سے چل رہے تھے اور ابھی ان کو آدھے سے زیادہ راستہ طے کرنا تھا لیکن ارشد یہ کہنے پر آمادہ نہ ہو سکا کہ "ذرا جلدی کیجئے"۔ اس کے دل میں اس ستم رسیدہ کے لئے جو کسی طرح سے ستم رسیدہ تھی، رحم کے جذبات پیدا ہو رہے تھے۔ وہ اُسے آزردہ کرنا نہ چاہتا تھا۔ اُسے مایوس کرتے ہوئے ڈرتا تھا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ عورت اس کی دلچسپی کا باعث نہ تھی۔ وہ محض تہذیب اور اخلاق کو مدِّنظر رکھتے ہوئے اس کے ساتھ جا رہا تھا۔

"تو کیا آپ کو واقعی ایسے پُرخطر انسانوں سے واسطہ پڑا ہے ؟"

"ہاں ایک سے" اس نے آہستگی سے جواب دیا۔

ارشد اس قدر دراز قد تھا اور وہ اس قدر چھوٹی تھی کہ اس کی آواز کہیں نیچے سے اوپر کی طرف آتی ہوئی سنائی دیتی تھی۔ اس لئے وہ اُس کا جواب نہ سُن سکا۔ دراصل وہ اب اُس سے بیزار ہو چکا تھا اور ایک تھکان سی محسوس کرنے لگا تھا۔

"ہاں ایک کے ساتھ" اُس نے دہرایا۔ "اسی لئے تو میں اس راستے سے رات کے وقت اکیلے گذرتے ہوئے ڈرتی ہوں۔ اس بات کو گذرے کئی سال ہوئے لیکن اُس رات کی ہر بات مجھے ایسے یاد ہے گویا وہ ابھی ابھی ہوئی ہو"۔

"آپ واقعی بہت ڈر گئی ہونگی ؟" ارشد نے یونہی جواب دیا۔

"نہیں صاحب، مجھے اُس دن بیس روپے کی ضرورت تھی۔ بیس مجھے مل چکے تھے اور دس ابھی درکار تھے۔ میں اُن دنوں اکثر ایک رات میں دس پندرہ بنا لیتی تھی لیکن اُس رات میں سے بھی زیادہ حاصل کرنا چاہتی تھی۔

کیونکہ صبح مکان کا کرایہ ادا کرنا تھا۔ ورنہ مکان سے نکالے جانے کا ڈر تھا"
وہ یہ کہتی رہی۔ اب راستہ ختم ہونے کو تھا اور اُدھر اس کی باتوں کی رفتار تیز ہو چکی تھی، وہ کہہ رہی تھی "بس اسی جگہ پر جہاں آپ مجھے آج ملے ہیں وہ مجھے ملا تھا۔ اس کا قد چھوٹا تھا۔ وہ کوئی شریف آدمی نہ تھا۔ مگر مجھے تو اُس وقت روپوں کی ضرورت تھی اور آج کل یہ معلوم کرنا بھی تو بہت مشکل ہو گیا ہے کہ کون مالدار ہے اور کون نہیں۔ لیکن جونہی میں نے اُسے غور سے دیکھا مجھے اُس کی مفلسی کا یقین ہو گیا میں نے سوچا کہ اب غلطی کرکے بدتہذیبی سے کوئی فائدہ نہیں اس لئے میں اُس کے ساتھ ساتھ چلتی رہی۔ اُس نے یونہی موسم کی خنکی کا ذکر چھیڑا۔ گو میں اُسے دیکھنا بھی پسند نہ کرتی تھی۔ لیکن یہ محسوس ہو رہا تھا کہ وہ مجھے کہیں لئے جا رہا ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ شرافت سے کام لیجئے لیکن اس نے میری ایک نہ سنی۔ اب مجھے ان بیس روپوں کی سلامتی پر بھی شک گذرنے لگا جو پہلے سے میرے پاس موجود تھے۔ میں چاہتی تھی کہ اُس کے بجائے کوئی اور وہاں سے گذرتا۔ بھلا اتنی رات گئے کس نے گذرنا تھا۔ یہ نہیں تو کوئی گشت والا سپاہی ہی اُدھر آنکلتا۔
اس لئے میں کچہری روڈ تک پہنچنے کے لئے جلد جلد قدم بڑھاتی رہی لیکن ابھی آدھا راستہ ہی طے کیا ہوگا کہ اُس نے مجھے بازو سے پکڑ کر ٹھیرا لیا۔ میں نے اُس کی آنکھوں کی طرف نگاہ بھر کر نہ دیکھا جس کا مجھے خوف تھا وہی ہوا اُس نے مجھ سے کہا کہ جو کچھ پاس ہے نکال دو۔ میں مکر گئی کہ میرے پاس تو کچھ بھی نہیں۔ اس نے میرے بیگ کو مجھ سے چھیننا چاہا لیکن میں نے تسمے کو زور سے پکڑے رکھا۔ کچھ دیر تک تو یہ کشمکش جاری رہی پھر وہ کہنے لگا کہ میں تمہیں کوکین دے کر ابھی ٹھیک کر لیتا ہوں۔ میں نے شور مچا کر پولیس کے حوالے کرنے کا خوف دلایا۔ اُس نے یہ سُن کر مجھے چھوڑ دیا۔ میں کچہری روڈ کی جانب بھاگنے لگی۔ میں اپنے دل کی دھڑکن کے باعث اُس کے پاؤں کی آواز سُن نہ سکی۔ لیکن وہ ضرور میرا تعاقب کر رہا ہوگا کیونکہ ابھی میں سڑک کے قریب ہی پہنچی تھی کہ پیچھے سے کسی نے میرے مُنہ کو ہاتھ سے بند کر دیا۔ میں نے اُس کی آتشیں سانس کو اپنی گردن پر محسوس کیا پھر ایک تیز اور عجیب سا درد میرے شانے میں اُٹھا جیسے کسی نے تیز چاقو گھونپ دیا ہو۔ مگر وہ واقعی ایک تیز چاقو تھا جس نے میرے شانے میں ایک تڑپا دینے والا درد پیدا کر دیا لیکن مجھے اس درد کا نہ جانے کیوں احساس نہ تھا۔
میں اُس کشمکش اور ہنگامے میں کچھ سمجھ نہ سکی کہ کیا ہو رہا ہے۔ شانے میں اک اجنبی سا احساس۔ اُس کی گرم گرم سانس اور کہیں دور سے بولنے والے گھڑیال کی آواز یہ سب باتیں کچھ اس قدر باہم ملی جُلی تھیں کہ میں اب وضاحت سے بیان نہیں کر سکتی کہ کیا ہوا۔ مگر اتنا مجھے ضرور یاد ہے کہ گھڑیال کے دوبارہ بجنے سے پہلے میں جا چکی تھی لیکن زندگی میں تو کبھی یہ خیال بھی نہ آیا تھا کہ موت اس طرح ہوتی ہے"
یہ سُن کر ارشد نے جب مڑ کر دیکھا تو وہ عورت غائب تھی اور وہاں دیوار کے سوا کچھ بھی نہ تھا — ارشد سر پر پاؤں رکھ کر چھت والی گلی سے بھاگ نکلا۔ جب وہ دوڑ رہا تھا تو اس نے کہیں دور سے گھڑیال کی آواز سنی۔ اس وقت ایک بج رہا تھا۔

(مائیکل آرلن)

مجید لشاری

غزل

ایک ناکام مسرت کے سوا کچھ بھی نہیں
دل ترے دردِ محبت کے سوا کچھ بھی نہیں

ایک موہوم حقیقت کے سوا کچھ بھی نہیں
میں تری ذات سے نسبت کے سوا کچھ بھی نہیں

یہ صراحی، یہ فروغِ مے گلرنگ، یہ جام
چشمِ ساقی کی عنایت کے سوا کچھ بھی نہیں

عقل کی مصلحت اندیش سیاست کی قسم!
عشق پروانے کی جرأت کے سوا کچھ بھی نہیں

آدمی کیا ہے فقط ایک مسلسل آواز
زندگی حرف و حکایت کے سوا کچھ بھی نہیں

تیری دزدیدہ نگاہی نے مجھے سمجھایا
زیست اک لمحۂ عشرت کے سوا کچھ بھی نہیں

تو کہ افسوس و ندامت کے سوا سب کچھ ہے
میں کہ افسوس و ندامت کے سوا کچھ بھی نہیں

بس کہ نازک ہے محبت کا فسانہ ماہرؔ
شاعری رمز و اشارت کے سوا کچھ بھی نہیں

ماہر القادری

غزل

کوئی مآلِ محبّت مجھے بتاؤ نہیں!
میں خواب دیکھ رہا ہوں مجھے جگاؤ نہیں

کسی کی یاد ہے اِن کی مہک سے وابستہ
مجھے یہ پھول خدا کے لئے سُنگھاؤ نہیں

محبّت اور جوانی کے تذکرے نہ کرو
کسی ستائے ہوئے کو بہت ستاؤ نہیں

یہ کہہ رہا ہے محبّت کی کاوشوں سے دل
یہ میرے ہنسنے کے دن ہیں مجھے رُلاؤ نہیں

اُجڑ کے پھر نہیں بستا جہانِ دل اختر
بہارِ باغ کو اِس پر دلیل لاؤ نہیں

اختر انصاری

سودا

افراد:-

پہلا راہب، دوسرا راہب، تیسرا راہب، جون (ایک دیہاتی)

اور شیطان

منظر:- خانقاہ۔ تیسرا راہب پتھر کی بنچ پر بیٹھا کچھ پڑھ رہا ہے اس کے پیچھے ایک کھڑکی ہے۔

[دوسرا راہب داخل ہوتا ہے]

دوسرا راہب۔ بھائی اب تو شک وشبہ کی گنجائش تک نہیں رہی۔

تیسرا راہب۔ واقعی!

دوسرا راہب۔ اب تو کوئی شک ہو ہی نہیں سکتا۔

تیسرا راہب۔ میرا بھی یہی خیال ہے۔

دوسرا راہب۔ بات صاف ظاہر ہے —— بالکل ظاہر!

تیسرا راہب۔ اور ہوتی کیوں نہ؟

دوسرا راہب۔ آپ کا مطلب ہے کہ —— ؟

تیسرا راہب۔ معجزے کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔

دوسرا راہب۔ لیکن ——

تیسرا راہب۔ کیا تمہیں ان پر یقین نہیں؟

دوسرا راہب۔ میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ مگر بھائی ——

تیسرا راہب۔ مگر بھائی کیوں نہیں؟ وہ مقدس ہیں۔ روزہ رکھتے ہیں۔ موٹا لباس پہنتے ہیں۔ عورتوں سے انہیں نفرت ہے۔ ایک بار ایک حسینہ نے انہیں دیکھنے کی جرأت کی تو انہوں نے چابک سے اس کی کھال ادھیڑ کر رکھ دی۔

دوسرا راہب۔ مگر پھر بھی بھائی . . . . .

تیسرا راہب۔ پھر بھی کیا!

دوسرا راہب۔ ہم اُسے خوب جانتے ہیں —— ہاں مگر آسمانی اولیا کے بارے میں تو ہم کچھ بھی نہیں ہے۔

تیسرا راہب۔ بے شک، ایسی بات تو ہمارے وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتی تھی —— تم کہتے ہو کہ یہ بالکل سچ ہے۔؟

دوسرا راہب۔ ہاں، بالکل سچ۔

تیسرا راہب۔ اوہ! چند دنوں سے میں دیکھ رہا تھا، ایک دن میں مشرقی جانب کی کھڑکی میں سے دیکھ رہا تھا کہ اچانک میری آنکھیں چندھیانے لگیں۔ میں نے خیال کیا کہ دھوپ کی تیزی کی وجہ سے ہے۔ مگر یہ دھوپ نہ تھی۔ کچھ اور تھا۔

دوسرا راہب۔ اب تو تمہیں بھی شک نہیں رہا۔

تیسرا راہب۔ بالکل نہیں۔

دوسرا راہب۔ [اس کے پاس بیٹھ جاتا ہے اور آہ بھرتا ہے] مجھے اس کا حسد نہیں۔

تیسرا راہب۔ [تکلف سے] اور نہ مجھے۔

دوسرا راہب۔ لیکن تم مغموم کیوں ہو!

تیسرا راہب۔ مغموم؟ مغموم تو کوئی بھی نہیں۔

دوسرا راہب۔ چہرہ اترا ہوا ہے

تیسرا راہب۔ اوہ! یونہی، دکھائی دیتا ہے۔

دوسرا راہب۔ مگر بھائی آخر تمہیں ہے کیا!

تیسرا راہب۔ [آہ بھرتا ہے] اب ہم —— وہ اور میں —— مل کر پھولوں کو پانی نہ دے سکیں گے۔ نہ ہم باغ کو درست نہ کر سکیں گے۔ کیاریوں کو کون سینچے گا!

دوسرا راہب۔ یہ کیوں؟ وہ آخر ہمارا بھائی ہے۔ یہ امتیاز وہ ہم سے توروا نہیں رکھ سکتا۔

تیسرا راہب۔ کیوں نہیں؟ وہ اب ولی ہے اور ہم معمولی راہب، وہ آسمانی باپ کی بادشاہت میں داخل ہو چکا ہے، مقدس باپ کا بیٹا۔۔۔

[زور سے گھنٹی کی آواز سنائی دیتی ہے]

دوسرا راہب۔ بھائی! دیکھنا دروازے پر کوئی ہے۔ اب اس غم انگیز بات کو بھول جاؤ۔ اور مسکراتے ہوئے آنے والے کا خیر مقدم کرو۔

تیسرا راہب۔ غم کو بھول جاؤں؟ صرف اس لئے کہ دروازے پر کوئی گھنٹی بجا رہا ہے۔

دوسرا راہب۔ کیوں نہیں بھائی! دنیا ہمارے دروازے پر کھڑی ہے۔ دنیا والوں میں سے ایک کو ابھی ہم دیکھیں گے۔ وہ ہم سے دنیا کی باتیں کرے گا۔ دلفریب دنیا کی۔ جسے ہم تیاگ چکے ہیں۔۔۔ مسکراؤ۔ بھول جاؤ اس غم کو، اٹھو، جاؤ اور آنے والے کا مسکراتے ہوئے خیر مقدم کرو۔

تیسرا راہب۔ آج مجھ سے مسکرایا بھی نہیں جاتا۔ میرے دل و دماغ پر ایک بوجھ ہے۔

[جون داخل ہوتا ہے]

جون۔ بڑے راہب اندر ہیں؟

دوسرا راہب۔ نہیں، وہ اندر نہیں ہیں۔

جون۔ اندر نہیں؟

دوسرا راہب۔ دوست بات کیا ہے؟ تم گھبرائے ہوئے سے معلوم ہوتے ہو

جون۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ تم لوگوں نے یہ کیا شعبدہ بازی شروع کر رکھی ہے؟

دوسرا راہب۔ دوست خداوند خدا تمہیں معاف کریں، یہ ناراضی کیسی؟

تیسرا راہب۔ بھائی آخر ناراض ہونے کی وجہ بھی تو ہو؟

جون۔ تم میں سے ایک شعبدہ بازی کرتا پھرتا ہے۔ اور ہم اسے پسند نہیں کرتے۔

تیسرا راہب۔ شعبدہ بازی؟

جون۔ شعبدہ بازی، یا تمہاری اصطلاح میں معجزہ، ہم باز آئے ان معجزوں سے۔ ہم جو مذہب کے نام سے تنگ ہیں۔ تم ان شعبدہ بازیوں سے ہمیں مرعوب کرنا چاہتے ہو!

تیسرا راہب۔ [دوسرے راہب سے] بھائی! یہ کیا کہتا ہے۔ میں تو خاک بھی نہیں سمجھ سکا۔

دوسرا راہب۔ [جون سے] دوست تم نے تو ہمیں حیران کر دیا ہم منتظر تھے کہ تم ہمیں اُس وسیع اور پرفریب دنیا کا حال سناؤ گے۔ اپنی فریب کاریوں اور گناہوں کے لئے ہم سے دعا کے طالب ہو گے۔۔۔ اور۔۔۔

جون۔ اب زمانہ بدل چکا ہے حضرت! ہمیں ان چیزوں کی اب ضرورت ہی نہیں رہی۔

دوسرا راہب۔ دوست پھر ہمیں بتاؤ کہ ان باتوں سے تمہارا مطلب کیا ہے۔ تم کیا چاہتے ہو!۔۔۔ اچھا تم ہمیں دنیا کا حال ہی سناؤ۔

جون۔ وہ بھی آ گیا، شعبدہ باز۔۔۔ آ گیا!۔۔۔ او خدا!۔۔۔

[ڈرتا ہے اور بھاگ جاتا ہے]

تیسرا راہب۔ بڑے راہب آ گئے!

دوسرا راہب۔ ہاں! آ گئے۔

تیسرا راہب۔ اُس نے اُنہیں شاید کھڑکی سے ہی دیکھ لیا ہے۔

دوسرا راہب۔ اب اس بات کو یہیں رہنے دو۔

تیسرا راہب۔ یہیں رہنے دوں؟ کیوں؟

دوسرا راہب۔ اس قصے کو بڑھا کر خانقاہ کی پرسکون فضا کو مکدر نہیں کیا جا سکتا۔

[بڑا راہب داخل ہوتا ہے۔ اس کے سر کے گرد ایک نورانی ہالہ ہے۔ وہ سٹیج پر سامنے آتا ہے۔ اور گزر کر دوسرے راستے سے باہر چلا جاتا ہے]

دوسرا راہب۔ [دہراتا ہے] خانقاہ کی پرسکون فضا کو مکدر نہیں کیا جا سکتا۔

تیسرا راہب۔ مگر بات تو بڑھ چکی ہے۔

دوسرا راہب۔ میں بھی جانتا ہوں۔

تیسرا راہب۔ میں نے یہ نورانی ہالہ تین دن قبل دیکھا تھا۔ بالکل مدھم سا، مگر میں یہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ یہ بڑھ کر۔۔۔ اتنا تیز اور روشن ہو جائے گا۔

دوسرا راہب۔ ہاں صرف تین دن میں ایک انقلاب عظیم رونما ہو گیا۔

تیسرا راہب۔ تین دن قبل تو یہ مدھم تھا۔ مگر اب ——

دوسرا راہب۔ گذشتہ رات سے تو یہ شعلوں کی طرح چمک رہا ہے۔
ایک مافوق الفطرت چیز۔ اس مادیّت کے زمانے میں ایک اچنبھا۔
لوگ کیا کیا کہہ رہے ہیں اور کیا کہیں گے۔ ابھی ایک کی ہی باتیں
سنی ہیں۔ خدا جانے باقی کیا چرچا کر رہے ہوں گے۔

تیسرا راہب۔ (مغموم لہجے میں) افسوس!

دوسرا راہب۔ ہم بھی تو اُن کے چہرے کو تک نہیں سکتے۔

تیسرا راہب۔ بالکل نہیں۔ غیر معمولی، مافوق الفطرت۔

دوسرا راہب۔ ایسا معجزہ تو صدیوں میں بھی رونما نہیں ہوا ہوگا۔

تیسرا راہب۔ [غم انگیز لہجے میں] نہیں بھائی! بے چارہ۔ ہمارا بھائی!

دوسرا راہب۔ وہ خود بھی تو کھویا ہوا سا ہے۔

تیسرا راہب۔ اور ہمیں یہاں دیکھ کر وہ آگے بڑھ گیا۔ ورنہ وہ اس
جگہ آکر اکثر بیٹھا کرتا تھا۔

دوسرا راہب۔ ہاں وہ اپنی حالت سے خود بھی پریشان سا ہے۔

تیسرا راہب۔ آؤ پھر ہم چلیں۔ وہ یہاں بیٹھ کر چند لمحے آرام کرے۔ اُسے
یہاں سکون اور راحت میسّر ہوگا۔

[وہ اُٹھ کر چلے جاتے ہیں]

تیسرا راہب۔ (جاتے ہوئے) بے چارہ ہمارا بھائی!

دوسرا راہب۔ [ادھر اُدھر دیکھ کر] اب وہ واپس آجائے گا!

[دونوں کے پاؤں کی چاپ جوں ہی بند ہوتی ہے تو بڑا راہب
آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا داخل ہوتا ہے۔ وہ بغیر موزوں کے
کھڑاؤں پہنے ہے۔ وہ بنچ پر جاکر بیٹھ جاتا ہے۔ سر کو جنبش دیتا
ہے کہ شاید نورانی ہالہ غائب ہو جائے۔ مگر بے فائدہ۔ وہ آہ بھرتا ہے
پھر ایک کتاب کھول کر پڑھنے لگتا ہے۔ اس کے لب ہلتے ہیں۔
پھر گنگناہٹ پیدا ہوتی ہے۔ گنگناہٹ بڑھ کر صاف الفاظ
سنائی دینے لگتے ہیں]

بڑا راہب ...... آخر کار شیطان کو پاؤں تلے کچل ڈالو۔

[شیطان داخل ہوتا ہے۔ اس کے سر پر دو سینگ ہیں۔ بدن
پر لمبے بال اور بکرے کی طرح داڑھی۔ اس کی آواز پر سماوی آواز کا
شبہ ہوتا ہے]

بڑا راہب [کھڑا ہو کر دونوں ہاتھ اوپر اٹھا لیتا ہے] پناہ مانگتا ہوں
اس کے نام کی جو ——

شیطان۔ مجھ پر لعنت نہ بھیجئے

بڑا راہب۔ پناہ مانگتا ہوں ——

شیطان۔ مجھے مت پھٹکاریئے۔ ورنہ پچھتائیے گا۔ میری سن لیجئے

بڑا راہب۔ پناہ ——

شیطان۔ سنئے تو!

بڑا راہب۔ تم کہنا کیا چاہتے ہو؟

شیطان۔ خداوندی بادشاہت سے اخراج کے وقت مجھے ایک
روح عطا کی گئی جس کے نفس سے کبھی رات اور سحر منوّر ہوا کرتی تھی۔

بڑا راہب۔ پھر —— ؟

شیطان۔ اب ہم اندھیرے میں سر پٹکتے پھرتے ہیں۔

بڑا راہب۔ تو مجھے اس سے کیا مطلب؟

شیطان۔ اُس روح کے لئے جو اپنی روشنی کھو چکی ہے۔ میں آپ
سے یہ نورانی ہالہ خریدنے آیا ہوں اور اس کے بدلے میں ——

بڑا راہب۔ مردود! دور ہو جا!

شیطان۔ ہیں اس کے عوض ——

بڑا راہب۔ دور ہو جا!

شیطان۔ اس کے عوض آپ کو جوانی دوں گا۔

بڑا راہب۔ میں تجھ سے کوئی سودا نہیں کر سکتا۔

شیطان۔ میں آپ کا ایمان نہیں مانگتا، صرف یہ نورانی ہالہ مجھے
دے دیں۔

بڑا راہب۔ یہ سماوی نور تجھ ایسے جہنمی کے لئے نہیں ہے۔

شیطان۔ مگر میری پیشکش۔ جوانی! ——

بڑا راہب۔ مجھے ضرورت نہیں۔ زندگی ایک دکھ ہے۔ گناہ کی
دنیا میں سرگردانی کا نام جوانی ہے۔ میں نے عمر بھر جذبات کا
مقابلہ کیا۔ اب تو مجھے اُسی گناہ کے سمندر میں دھکیلنا
چاہتا ہے!

شیطان۔ (مسکراتا ہے) دھکیلنا!

بڑا راہب۔ ہاں! ہاں دھکیلنا چاہتا ہے!

شیطان۔ [قہقہہ لگا کر ہنستا ہے اور کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے] حضرت!
موسم بہار کا نظارہ کیجئے اور قدرت کی بوقلمونی سے لطف اندوز

ہو جیئے۔

بڑا راہب۔ یہ میری عبادت کا وقت ہے۔

شیطان۔ [ہنستا ہے] دیکھئے، پہاڑی کی سرسبز چوٹی پر حسین و رعنا چھوکریاں اٹھلاتی ہوئی چڑھ رہی ہیں۔ دامنِ کوہ میں سبزے کی بہار کیسی روح پرور ہے!

[بڑا راہب لبادے سے چابک نکال لیتا ہے]

بڑا راہب۔ مقدس خانقاہ میں عورتیں؟ میں اُن کی ابھی خبر لیتا ہوں۔

شیطان۔ [روکتے ہوئے] حضرت! ایسا ظلم نہ کیجئے۔ وہ تو بہت دور ہیں۔ قدرت کا شاہکار، جنسِ لطیف اور آپ کا چابک۔ نہیں نہیں! حضرت وہ دیکھئے ایک نے گلاب سے اُلجھ کر دامن کو چاک کر لیا ہے۔

بڑا راہب۔ میں اس کی جا کر خبر لوں گا۔ بے شرم کہیں کی۔

شیطان۔ غصہ تھوک دیجئے! ذرا دیکھئے اس کی کلائی۔ دامن چھڑانے کی کوشش کر رہی ہے، شرم سے چہرہ لال ہو رہا ہے۔ ماتھے پہ پسینے کے قطرے کیسا غضب ڈھا رہے ہیں، بال گویا ناگ ہیں کہ ڈسنے کو بے تاب ہیں، یہ حسین مخلوق اور چابک! حضرت! عقل سے کام لیجئے۔

بڑا راہب۔ اگر اس کمبخت نے مقدس زمین پر قدم رکھا تو اس کی کھال اُدھیڑ دوں گا۔

شیطان۔ وہ اکیلی نہیں، اس کی سہیلیاں بھی ساتھ ہیں۔ سات خوبصورت لڑکیاں ہیں! [بڑا راہب چابک مضبوطی سے تھام لیتا ہے] اُن کے ہاتھوں میں پھولوں کے گجرے! واہ وا! کیا کہنے!

بڑا راہب۔ بکواس بند کر دو ——

[شیطان دیوار کے سہارے سے کھڑا ہو جاتا ہے اور مسکراتا ہوا کھڑکی سے باہر دیکھتا ہے]

شیطان۔ پتوں پر سورج کی کرنیں انہیں اور بھی حسین بنا رہی ہیں۔ وہ کافرہ اب گھاس کے مخملیں فرش پر بے خود ہو کر بیٹھ گئی ہے۔ وہ دیکھئے اس کی سکھیاں پھول لا لا کر اس کے بالوں میں گوندھ رہی ہیں۔

بڑا راہب [بڑا راہب کھڑکی سے دور باہر تکتا ہے اور بے اختیار ہو کر] کیا رنگ ہے؟

شیطان۔ بالکل سیاہ۔

بڑا راہب۔ میں اس کے بالوں کا رنگ نہیں پوچھتا۔ میرا مطلب پھولوں سے تھا۔

شیطان۔ خوب! سمجھا! زرد رنگ ہے۔

بڑا راہب۔ [آہ بھر کر] زرد۔

شیطان۔ ایک سولہ سال کی۔ دوسری سترہ کی۔ تیسری پندرہ کی اور چوتھی سولہ کی، سب کی سب کم سن، الھڑ اور دوشیزہ! میں تمہیں بیس سال کا نوجوان بنا سکتا ہوں۔ پھر تم ان میں سے کسی کو پسند کر لو، جوانی —— حیاتِ تازہ!

بڑا راہب [داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے] میں اور جوان؟ ناممکن۔

شیطان۔ ناممکن! میرے لئے ہر ایک بات ممکن ہے۔ مگر میری نجات؟

بڑا راہب۔ لیکن یہ کیسے ممکن ہے؟

شیطان۔ مجھے یہ نورانی ہالہ دے دیجئے، ستاروں کے نمودار ہونے اور شفق پھولنے کے درمیان جب چاند بادل کے سمندر میں تیر رہا ہو۔ مجھے اس پہاڑی کے دامن میں ملئے۔

بڑا راہب۔ ایسا ہرگز نہ ہوگا۔

شیطان۔ موسمِ بہار، ان مہ طلعتوں کا رقص، دیکھئے۔ ان کی ساعدِ سیمیں اور بلوریں ساقیں ——

[بڑا راہب چابک بلند کرتا ہے]

شیطان۔ [ذرا سنجیدگی سے] چالیس یا پچاس ایسے موسمِ بہار لطف اندوزی کے لئے میسر آسکیں گے۔

بڑا راہب۔ یہ ہرگز ہرگز نہ ہوگا۔

شیطان۔ نفس کُشی کی زحمت سے ہمیشہ کے لئے نجات مل جائے گی۔ ان کا بے خود رقص، مستانہ ہوائیں، بہار کی فیاضی، روح کو تر و تازگی عطا کر رہی ہے۔ جوانی کا خون اُن کی نس نس سے پھوٹا پڑتا ہے۔

بڑا راہب۔ مجھے کیا! میں اب اُن کی طرف دیکھوں گا بھی نہیں!

شیطان۔ دیکھو! دیکھو!! ان کے وہ سرو قد، بادِ بہار اُن کے کالے بالوں سے اٹھکیلیاں کر رہی ہے۔

بڑا راہب۔ ہرگز نہیں! میرا چابک اُن کے لئے موجود ہے۔

[شیطان آہ بھرتا ہے۔ لڑکیاں زور زور سے ہنستی ہیں جن کی

مدھم آواز دور پہاڑی سے بڑے راہب کے کانوں میں بھی آتی ہے۔ جیسے بہت سی چاندی کی تھیلیوں کا منہ کھول دیا گیا ہو۔ ایک نقرئی سا نغمہ]

[اس کے چہرے پر خوف سا چھا جاتا ہے]

بڑا راہب۔ کہاں؟ [پس منظر میں دُور ایک لڑکی کے قہقہوں کی آواز سنائی دے رہی ہے ــــ چاند کے بربط سے پھوٹتے ہوئے نغموں کا سیلاب] دامنِ کوہ میں، کہاں؟

شیطان۔ چنار کے اس درخت کے نیچے۔

بڑا راہب۔ [سنبھل جاتا ہے] وہ درخت آج ہی کاٹ دیا جائے گا اور جلا دیا جائے گا۔

شیطان۔ [مایوسانہ لہجے میں] افسوس!

بڑا راہب۔ تم ایک راہب کو نہیں بہکا سکتے۔

شیطان۔ مگر وہ تو اب خانقاہ کی طرف آ رہی ہیں۔

بڑا راہب۔ کیا کہا؟

شیطان۔ حضرت! اپنا چابک ذرا اٹھائیے ــــ

بڑا راہب۔ مگر ــــ انہوں نے کوئی قصور بھی تو نہیں کیا۔ کہ میں انہیں سزا دوں۔

شیطان۔ وہ پھولوں کا ایک ہار بنا کر لائی ہیں جو اُن کے نرم و نازک ہاتھوں کی صنعت کا نمونہ ہے۔ کاش کہ آپ جوان ہوتے ــــ نوجوان!

بڑا راہب۔ شیطان! مجھے ترغیب نہ دے۔ مجھے نہ بہکا۔

[پس منظر میں لڑکیوں کا گانا سنائی دے رہا ہے۔ شیطان کھڑا مسکرا رہا ہے ــــ راہب ایک بار کھڑکی کی طرف جاتا ہے۔ اور پھر تھک کر بنچ پر آن بیٹھتا ہے۔ لڑکیاں گاتی ہوئی کھڑکی کے قریب سے گذرتی ہیں۔ کھڑکی کے سامنے ایک درخت کو ہلاتی جاتی ہیں۔ پتے گرتے ہیں۔ لڑکیاں گاتی ہوئی آگے بڑھ جاتی ہیں۔ راہب بیٹھا گانا سن رہا ہے]

بڑا راہب۔ [ہاتھ پیشانی پر رکھ دیتا ہے] اس گانے سے تو میرا سر درد کرنے لگا ــــ نہیں، شاید ہالہ اتنا بوجھل ہے کہ دردِ سر ہو رہا ہے۔ کتنا بھاری ہے یہ ہالہ ــــ

[شیطان آگے بڑھ کر بڑے راہب کو ہالہ اتارنے میں مدد دیتا ہے شیطان ہالہ اُتار لیتا ہے۔ راہب خاموش بیٹھا ہے]

شیطان۔ حضرت آداب عرض ہے! یاد رکھئے، جب چاند بادلوں کے سمندر میں تیر رہا ہو ــــ

[باہر نکل جاتا ہے۔ کھڑکی کے سامنے درختوں سے پتّے جھڑ جھڑ کر نیچے گر رہے ہیں۔ گانا بدستور سنائی دے رہا ہے راہب خاموش بیٹھا ہے۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب کیفیّت ہے]

[پردہ آہستہ آہستہ گرتا ہے]

(انگریزی سے ترجمہ)

شیر محمد اختر

آئینۂ حیرت

غزل

کوئی اس زندگی سے خوش کہاں ہے
وہی نالہ، وہی آہ و فغاں ہے

ستم سہنا کسی سے کچھ نہ کہنا،
بہت دشوار ہے آساں کہاں ہے!

جنونِ شوق میں یہ بھی نہ دیکھا
کوئی ہم پر کہاں تک مہرباں ہے

نہیں معلوم کیا اتنا بھی ہم کو
یہ فصلِ گُل ہے یا دورِ خزاں ہے

کسی کی زندگی آساں بھی ہوگی
یہاں تو ہر قدم اک امتحاں ہے

لحد میں بھی ملے گا چین کیونکر
زمیں وہ بھی تو زیرِ آسماں ہے

طبیعت کا نہ پوچھو حال حیرتؔ
ذرا سی بات بھی دل پر گراں ہے

عبدالمجید حیرتؔ

زندگی

عطیہ نے اُکتا کر کتاب کو میز پر رکھ دیا۔

سامنے میز پر کتابوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ انگیٹھی پر اور الماریوں میں کتابوں کی قطاریں کھڑی تھیں ـــــ اس کے ہونٹوں پر ایک حقارت بھرا تبسم آ گیا۔ ناک پر ہلکی سی سرخی جھلک گئی۔ بھویں سمٹیں اور ماتھے پر ایک شکن سی پیدا ہو گئی ـــــ وہ یوں محسوس کر رہی تھی جیسے وہ خود کسی کتاب کا ایک جزو ہو۔ یا کوئی اُکھڑا ہوا ورق۔ جیسے وہ کسی کتاب میں جی رہی ہو۔

عطیہ اُٹھ بیٹھی اور سامنے کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔

باہر کالے کالے دھندلے سے مکانوں میں مدھم سی بتیاں ٹمٹما رہی تھیں۔ جیسے وہ اندھیرے سے جھگڑ جھگڑ کر اکتا چکی ہوں۔ اوپر گدرے گدرے سے آسمان پر ایک میلا اور بھدا سا چاند ٹنگا ہوا تھا۔ نیچے ایک تنگ سی سڑک یوں گھومتی ہوئی جا رہی تھی جیسے چلتے چلتے کھو گئی ہو، دور ایک چکی کراہ رہی تھی۔

بائیں طرف ایک بھدا سا مکان کھڑا تھا۔ چوبارے میں کوئی بیٹھا ہوا ایک ٹوٹے ہوئے ہارمونیم پر انگلیاں پھیر رہا تھا۔ عطیہ کی ناک حقارت سے سکڑ گئی۔ بھویں تن گئیں۔

پڑوسی نے بھدّی سی آواز میں گانا شروع کر دیا۔

"آگ لگے اس من میں آ.... گ"

عطیہ نے اپنا منہ موڑ لیا۔ "اس سے زیادہ اور کیا آگ لگے گی" اُس نے جی میں سوچا۔ "بے چارہ!" وہ آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ خدا جانے بال بنانے کے لئے یا آگ لگانے والی کو دیکھنے کے لئے۔ آئینے میں دو کالی کالی شوخ آنکھیں مسکراتے ہوئے اُسے کہہ رہی تھیں "تم کتنی حسین ہو"!

"ہاں بہت!" اس نے اپنے آپ سے کہا "ایک معمولی سے کلرک کی زندگی حرام کر رکھی ہے ـــــ آگ لگی ہے ـــــ اور ابھی اور جلنے کی تمنا ہے" اس کے منہ سے بے ساختہ ایک نقرئی سا قہقہہ نکل گیا۔ "بے چارہ شام کو باہر آنے جانے سے بھی رہا"!

گلی میں پاؤں کی چاپ سُن کر وہ لپک کر کھڑکی میں گئی۔ نیچے کوئی راہ گیر جا رہا تھا۔ "پگلی" اُس نے اپنے آپ سے کہا۔ "پروفیسر صاحب تو آرٹ پر لکچر دے رہے ہوں گے اور میں یہاں خواہ مخواہ پریشان پھر رہی ہوں ـــــ خدا جانے یہ ادبی جلسے کب ختم ہوں گے کبھی مشاعرہ ہے کبھی بحث اور کبھی خدا جانے کیا"! اس نے کنکھیوں سے پڑوسی کی طرف دیکھا۔

وہ دونوں کہنیاں باجے پر ٹیکے ٹھوڑی ہاتھ میں لئے بیٹھا تھا۔ سفید سے چہرے پر کالے خمدار بال لپٹے ہوئے تھے۔ دو موٹی موٹی آنکھیں اُسے چک کے پیچھے ڈھونڈھ رہی تھیں۔

عطیہ نے جھجک کر اپنی آنکھیں پھیر لیں "کیا یہاں بیٹھ کر گھورنے کے سوا اسے کوئی کام نہیں؟ ـــــ اس طرح بیٹھ کر لوگوں کو گھورتے رہنا! ـــــ جاہل! ـــــ کیسی گنواروں کی نگاہیں ہیں ـــــ کلرک ہے نا!" اُس کے ہونٹوں پر نفرت کی لہر دوڑ گئی ـــــ "سمجھتا ہوگا۔ یوں دیکھنے سے خدا جانے کیا ہو جائے گا؟ ـــــ پگلا! ـــــ میں اسے کیا سمجھتی ہوں"؟ ـــــ

عطیہ نے چک اٹھا کر نیچے دیکھا۔ گلی سنسان پڑی تھی۔ کبھی کبھار کوئی راہ گیر یوں گزرتا جیسے کسی پرانے کھنڈر میں بھوت چل پھر رہے ہوں۔

"تم کوئی اس سے ڈرتی تھوڑی ہو" کسی نے عطیہ کے کان میں کہا۔ "میں بھی پگلی ہوں" عطیہ کے دل نے کہا اور وہ مسکرا دی۔ اُس کے ہاتھوں نے بڑھ کر چک کو لپیٹ کر باندھ دیا ـــــ "لو اب جی بھر کر من میں آگ لگاؤ" اُس نے آئینے میں دیکھ کر کسی کو کہا ـــــ "بے چارے کو صرف ایک ہی گیت آتا ہے"۔

عطیہ نے کتاب میز پر رکھ دی۔ اس کا سر گھوم رہا تھا۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے الفاظ اس کی آنکھوں کے سامنے ناچ رہے ہیں۔

سامنے آرام کرسی پر اکرام بیٹھا پڑھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں کتاب پر جمی ہوئی تھیں۔ کتاب کی پشت پر "کیوپڈ اور سائکی" لکھا ہوا تھا۔ وہ سنہری الفاظ بھی بتّی کی روشنی میں جھلملا رہے تھے۔ عطیہ کا جی چاہتا تھا کہ ان کتابوں میں سے کوئی نکل کر اُس کے پاس آ بیٹھے اور اُس سے باتیں کرے مگر وہ گونگے الفاظ صرف ناچ ناچ کر اُسے پریشان کرنا ہی جانتے تھے۔

اُس نے مڑ کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ پڑوسی چارپائی پر بیٹھا اپنا باجہ صاف کر رہا تھا۔ کھڑکی کی چک اوپر بندھی ہوئی تھی۔ پاس ہی دیوار پر لٹکا ہوا کلنڈر ہوا سے ہولے ہولے جھول رہا تھا۔

"آگ لگے اس من میں آگ۔

آگ لگے اس من میں آ۔۔۔۔۔ آگ"

پروفیسر نے اپنا سر اُٹھایا اور منہ بنا کر کہنے لگا۔ "اُوہ کتنی جہالت ہے۔ ان لوگوں کو من میں آگ کے سوا کچھ سوجھتا ہی نہیں اندھے کہیں کے!"

"اپنے گھر بیٹھا گا رہا ہے۔ ہمارا کیا لیتا ہے"؟

"نہیں ویسے ہی بات کر رہا ہوں۔ یہ لوگ بالکل عقل کے اندھے ہیں۔ بدمذاق بازاری گانے گائے اور سو رہے۔ احمق ——"

"حسن کو تو یہ لوگ پہچانتے ہیں"۔ اُس نے کتاب کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تم نے کیوپڈ اور سائکی پڑھی ہے عطی"؟

عطیہ کو نفی میں سر ہلاتے ہوئے دیکھ کر اکرام نے کتاب میز پر رکھ دی۔ "یہ دیکھو" اُس نے ایک تصویر نکال کر اُسے بغور دیکھتے ہوئے ... یہ سائکی ہے —— کتنی حسین ہے —— ایک ایک خم سے ...ن ٹپک رہا ہے۔ دیکھو کتنی مُوثر آنکھیں ہیں۔ تم سے ملتی جلتی سی ..." ...رام نے غور سے تصویر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"مجھ سے"؟ عطیہ نے مسکراتے ہوئے دُہرایا۔

عطیہ اکرام کے منہ کی طرف دیکھ رہی تھی اس کا جی چاہتا تھا کہ آنکھیں کتاب سے اُٹھیں اور کسی شوخی بھری چمک سے اُسے اُس بات کا یقین دلا دیں۔ مگر اکرام کی آنکھیں سائکی کے جسم کے اُبھار اور خم میں کھوئی ہوئی تھیں۔

"ہاں تم سے" اکرام نے تصویر کو بغور دیکھتے ہوئے کہا۔ "دیکھو تو!"

اکرام خدا جانے کتاب سے کہہ رہا تھا یا تصویر سے۔

اکرام کے الفاظ منہ سے نکلتے ہی یوں گم ہو گئے جیسے وہ شرم کے مارے اس کمرے کے کونوں میں چھپ گئے ہوں اور عطیہ نے یوں محسوس کیا جیسے کوسوں دور کوئی کچھ کہہ رہا ہو۔ ایک ہلکی سی سرخی عطیہ کے رخساروں پر جھلک گئی۔

آئینے سے نکل کر ایک مسکراتا ہوا چہرہ اُس کے روبرو آ کھڑا ہوا۔ وہ شوخ آنکھیں مسکراتے ہوئے اُسے کچھ کہہ رہی تھیں۔

دور بھدّی سی آواز میں کوئی گا رہا تھا۔

"آگ لگے اس من میں آ۔۔۔۔۔ آگ"

"سب زبانی باتیں ہیں"۔ اُس کے دل میں کسی نے کہا۔ اُس کی گردن مڑ گئی۔ سامنے پڑوسی بیٹھا گا رہا تھا۔ لالٹین کی مدھم روشنی میں اُس کی آنکھیں چمک چمک کر اُسے کچھ کہنا چاہتی تھیں۔

عطیہ نے اپنا منہ پھیر لیا۔ سامنے اکرام بیٹھا غور سے تصویر کو دیکھ رہا تھا۔

"یہ دیکھو یہ کیوپڈ ہے" اُس نے ورق اُلٹا کر کہا۔ "کتنا خوبصورت سر ہے! جیسے خدا نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہو"۔

"اپنے ہاتھوں سے" عطیہ کے مُنہ سے بے اختیار نکل گیا اور وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ سامنے پڑوسی کے سفید سے چہرے پر کالے کالے بال لپٹے ہوئے تھے۔ اور وہ کھُب جانے والی آنکھیں اُسے گھور رہی تھیں۔

عطیہ بولی: "اپنے ہاتھوں سے تو خدا نے سبھی کو بنایا ہے"۔

"ہاں ہاں سبھی کو" اکرام نے تصویر کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"تو پھر آپ کتاب میں کیا ڈھونڈھ رہے ہیں"؟ عطیہ نے پوچھا۔

"اوہ تم نہیں سمجھیں۔ میرا مطلب ہے کہ یہ انسانی تخیل کا بہترین نمونہ ہے۔ دیکھو کتنا حسین مجسمہ ہے"۔

"تخیل!"

"ہاں۔ ہاں تخیل"۔

"کل تو آپ کہہ رہے تھے ——"

"کیا؟"

"کہ دنیا اتنی حسین ہے۔ اتنے دکھ اور اتنی تکلیفوں کے باوجود اتنی حسین ہے کہ اگر میں خدا ہوتا تو بھی اس سے بہتر دنیا نہ بنا سکتا۔"

"ہاں۔ ہاں۔ یہ ماتھو لینٹ کا خیال ہے۔ کتنا اچھوتا خیال ہے۔ ہے نا؟"

"....۔ آگ لگے اس من میں آگ...."

"اوہ۔ کیسی بے سُری الاپتا ہے۔ کتنا گندا پڑوس ہے۔ بات تک کوئی مشکل ہے۔ گنوار ---- یہ لوگ حُسن سے واقف نہیں۔ جانتے ہی نہیں کہ زندگی کیا ہے۔ جہالت میں اپنی عمر گنوا رہے ہیں....۔"

عطیہ اکرام کا منہ تک رہی تھی۔ مگر اس کے کانوں میں "آگ لگے اس من میں آگ" سنائی دے رہا تھا۔ پروفیسر صاحب کچھ کہہ رہے تھے۔ خدا جانے کیا کہہ رہے تھے۔ باہر ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی۔ جیسے کسی کا منہ چڑا رہی ہو۔ دیوار پر ٹنگے ہوئے کلنڈر پر ایک تصویر جھول رہی تھی۔ جیسے عطیہ کو کسی بات پر چھیڑ رہی ہو۔

عطیہ چونک پڑی۔

"میں کہتی ہوں۔ اگر زندگی بذاتِ خود حسن سے بھری پڑی ہے تو آپ حسن کو ان کالی نیلی جلدوں میں کیوں ڈھونڈھ رہے ہیں؟"

"اوہ"۔ پروفیسر نے سر کھجلاتے ہوئے کہا "خوب ---- اگر زندگی بذاتِ خود حسن سے بھری پڑی ہے تو لوگ حسن کو کتابوں میں کیوں ڈھونڈتے پھرتے ہیں ---- کیسا اچھوتا خیال ہے ---- خوب ---- ہوں! ---- اس مرتبہ میں اسی موضوع پر افسانہ لکھوں گا ---- کیسا بلند خیال ہے!"

"افسانہ ---- خیال ----"

عطیہ اٹھ بیٹھی جیسے کوئی خواب میں چل پھر رہا ہو ---- سامنے آئینے میں دو حسین آنکھیں اس کی طرف دیکھ رہی تھیں ---- "سائیکی" ---- کسی نے اس کے کان میں کہا۔ اس کے ہونٹوں پر خواہ مخواہ ایک تبسم جھلک گیا۔ وہ مسکرا پڑی "تم کتنی حسین ہو" آئینے میں سے کسی نے اسے کہا ----

"زندگی کتنی حسین ہے" اس کے جسم کا کوئی حصہ کہہ رہا تھا۔ "میں بھی کیسی پگلی ہوں" اس نے اپنے آپ سے کہا اور پھر مسکرا دی۔ وہ مڑی۔ سامنے پروفیسر صاحب کاغذ پر پنسل سے کچھ لکھ رہے تھے۔ ان کے ماتھے پر تیوری دیکھ کر وہ بے اختیار ہنس پڑی

"کیوپڈ" اس نے دل ہی دل میں کہا۔

پروفیسر چونک پڑا۔

"کیوں۔ کیا ہے؟ کیسا اچھوتا تخیل ہے ---- افسانہ پڑھو گی تو معلوم ہوگا"

عطیہ کے پاؤں کھڑکی کی طرف چلے ----

سامنے پڑوسی بیٹھا گا رہا تھا۔

عطیہ نے ایسے محسوس کیا جیسے اس کے دل کے تاروں کو کوئی چھیڑ رہا ہو۔ اس کی آنکھیں کسی اثر سے چمک اٹھیں۔ پڑوسی کی دو اداس آنکھوں نے اس کی طرف دیکھا عطیہ کے جسم کی رگ رگ کسی تال پر جھوم رہی تھی۔ اس کے بدن میں ایک لرزش تھی۔ وہ مسکرا پڑی۔

اس کی آنکھیں شرم سے جھک گئیں۔ چہرے پر سرخی کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس نے اپنی نگاہ ہٹا کر دائیں طرف کر لی۔

باہر کالے کالے پھیلاؤ میں ننھی ننھی بتیاں چمک چمک کر جل رہی تھیں۔ آسمان پر سنہری چاند میں کوئی بیٹھا اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ نیچے روپہلی چاندنی میں ایک پتلی سی سڑک دوڑتی ہوئی کہیں جا رہی تھی جیسے اسے کوئی راستہ دکھا رہی ہو۔ دور کہیں کوئی بچی اسے بلا رہی تھی۔ "عطّی.... عطّی...."

ممتاز مفتی

شعر

اک بات کہیں تم سے؟ خفا تو نہیں ہو گے؟
پہلو میں ہمارے دلِ مضطر نہیں ملتا

داغ

غزل

ایک دھوکا ہے نفس کا زیر و بم میرے لئے
موت سے بڑھ کر ہے مرجانے کا غم میرے لئے

اس طرح تقسیم کر دی زندگی کی کائنات
ہر خوشی تیرے لئے اور یہ عالم میرے لئے

دیکھئے اب موت کیا لاتی ہے میرے واسطے
زندگی تو لائی تھی میرا غم میرے لئے

ہجر و غفلت کا تو میں اے دوست خوگر ہو گیا
اب نئی ایجاد کر طرزِ غم میرے لئے

اے سحر تیری خوشی کیا ہو کہ تیرے پاس بھی
اور کیا ہے جز فغاں ہمدم میرے لئے

وادیٔ آفاق میں ہر گام پر جلوے ترے
جو بجو دریا بہ دریا میں یم میرے لئے

کس لئے اغیار کے رخ پر ہی جم کر رہ گئی
اور اک تکلیف اے ستم کرم میرے لئے

یا الٰہی! کس طرح کہہ دوں کہ میں آزاد ہوں
کیا نہیں پابندیٔ دیر و حرم میرے لئے

میں بھی اپنے غم کا پھر شکوہ نہ ہرگز کر سکوں
کر دیا دنیا کو بھی پابندِ غم میرے لئے

باقی صدیقی

دنیائے ادب

تازہ ترین رسائل کے اہم مضامین

اس دفعہ جگہہ کی کمی کے باعث دنیائے ادب کچھ مختصر ہے۔ آیندہ ماہ سے ادبی دنیا کی لکھائی باریک کی جارہی ہے۔ اس لئے دنیائے ادب کے لئے زیادہ صفحات کی گنجائش نکل آئے گی اور جن رسائل کے مضامین کا ذکر اس دفعہ نہیں کیا جاسکا، ان پر آیندہ نمبر میں تبصرہ کیا جائے گا۔

(اس مضمون کو رسائل پر کسی قسم کی تنقید نہیں سمجھنا چاہئے۔ کیونکہ اس میں فقط چند خاص اور اچھے مضامین نظم و نثر کا ذکر ہوتا ہے۔ معمولی یا ادنیٰ مضامین کا مطلقاً تذکرہ نہیں کیا جاتا)

(رسائل کا ذکر حروف تہجی کے اعتبار سے ہے)

اردو (سہ ماہی۔ جولائی تا ستمبر)

بنیادی ہندوستانی

ہندوستان کے لئے ایک مشترکہ زبان رائج کرنے کے سوال پر جو خیال آرائی آج کل ہو رہی ہے اُس کے ضمن میں پروفیسر محمد اجمل خاں صاحب نے بنیادی انگریزی کی مثال لے کر بنیادی ہندوستانی کا مسئلہ پیش کیا ہے اور اس پر ایک عالمانہ بحث کی ہے۔

سب سے پہلے انہوں نے یہ بات سلجھانے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستان کی صوبجاتی بولیوں میں سے کون سی زبان بنیادی زبان بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ اس کے بعد انہوں نے بنیادی زبان کی معاشرتی اور علمی ضروریات گنوائی ہیں۔ اور پھر چند اصول پیش کئے ہیں جن پر اس مختصر مشترکہ زبان کی عمارت اُٹھائی جاسکتی ہے اور ایک دلچسپ نکتہ یہ پیدا کیا ہے۔ کہ درحقیقت ہندوستان کی بنیادی زبان یا کم از کم شمالی ہند کی بنیادی زبان آج سے صدیوں پیشتر بن چکی ہے اور یہ بولی سنسکرت اور اس کی ترقی یافتہ بیٹی فارسی کے پیٹ سے مدت ہوئی جنم لے چکی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم آپس کے بے معنی اختلافات اور تعصب اور جہالت کی بدولت اپنی اس انمول دولت سے بے خبر ہیں۔

اس قابلِ قدر مضمون کا شاید سب سے دلچسپ حصہ وہ ہے جہاں پروفیسر صاحب نے جدولیں بنا کر ہندوستان کی مختلف بولیوں کے ہم معنی الفاظ درج کئے ہیں اور پشتو۔ پنجابی۔ برج۔ کھڑی بولی۔ اودھی۔ پوربی۔ بہاری۔ بنگالی۔ آسامی۔ اڑیہ۔ تامل۔ تلنگی۔ مرہٹی۔ گجراتی اور ہندوستانی کے باہمی مقابلے سے یہ ثابت کیا ہے کہ اگر الفاظ کی زیادہ سے زیادہ مماثلت کو اہلیت کا معیار سمجھا جائے تو ہندوستانی ان تمام زبانوں سے بازی لے جاتی ہے۔ کیونکہ الفاظ کی جو صورت اس میں پائی جاتی ہے۔ وہ دوسری بولیوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد سے مطابقت رکھتی ہے اور یہی حال گرامر کا ہے۔ شمالی ہند کی اکثر بولیاں سنسکرت یا سنسکرت کی ترقی یافتہ صورت فارسی سے نکلی ہیں اور فارسی کا رنگ اگر ہندوستانی پر چڑھا ہوا ہے تو اسے بدیسی رنگ نہیں سمجھنا چاہئے کیونکہ فارسی سنسکرت سے جدا نہیں ہے۔ اتنا فرق ضرور ہے کہ جب سے سنسکرت ہندوستان میں آئی۔ اسے سیاسی مصلحتوں کے باعث پھیلنے کا موقعہ نہ ملا اور یہ آکاش بانی بن کے رہ گئی۔ جگت بانی نہ بن سکی۔ اس کے برعکس سنسکرت کی مشرقی شاخ نے ایران میں جاکر نہ صرف خود ترقی کی بلکہ ہمسایہ ملکوں کے تمدن اور معاشرت سے بھی میل جول پیدا کیا اور نئے نئے خیالات اور تصورات کو اپنا لیا۔ ترقی اور حرکت قدرتی طور پر ہر چیز کو نکھارتی ہے اور زبان کے معاملے میں تو یہ قاعدہ بڑی شدّت سے جاری ہے۔ پس فارسی نے اسی طریقے سے ترقی کر کے اپنے الفاظ میں جن کا ماخذ قدیم سنسکرت تھا ایک لوچ اور حسن پیدا کر لیا اور جب ہندوستانی نے ایک طرف سے اندرپرستھ اور دوسری طرف سے شیراز کے سرمایۂ زبان و ادب کو۔ دونوں ہاتھوں سے لوٹا تو اس کا دامن ایسے ایسے انمول الفاظ سے بھر گیا جن کی موزونیت۔ مٹھاس۔ رس اور گہرائی کو بھارت دیس کی دوسری زبانوں کے بول کبھی نہیں پہنچ سکتے۔ اس کیفیت کو صاحبِ مضمون نے

بڑی تفصیل سے بیان کیا ہے جس میں سے چند سطریں یہاں پیش کی
جاتی ہیں۔

"مسلمانوں کی آمد کے بعد" اسی وحدتِ انسانی، اسی اُخوت
ومساوات کے جذبے نے ہندوستان میں ایک ایسی
زبان پیدا کر دی جس کے کئی ناموں میں سے ایک نام اردو
بھی ہے زمانۂ قدیم میں جو کام سنسکرت کر سکتی تھی لیکن مذہبی
فرقے کی تنگ نظری کی وجہ سے نہ کر سکی وہ کام فارسی کو کرنا
پڑا یعنی دارالسلطنت کے قریب کی بولی کو عام طور پر
ہندوستان کی مشترک زبان بنا دیا گیا! اور جو لوگ فارسی سے
ناآشنا تھے انہوں نے بھی ہندوستان کے دور دراز گوشوں
میں رہنے کے باوجود اردو زبان کے ذریعے سے فارسی
لٹریچر اور ہندوستان کے مشترک تمدن سے فائدہ اٹھایا اور
تمام لوگوں کی بولی یعنی برج بھاشا نے فارسی طرزِ انشا
فارسی بحروں اور فارسی اصطلاحات کو اتنا جذب کیا کہ وہ
ہندوستانی ہو گئیں ...... یہ فارسی زبان کی فتح تھی
اسے عرب سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ اسے عربی زبان
کے قواعد سے کوئی تعلق نہ تھا۔ یہ ایران کے اُن باشندوں
کی زبان تھی جو اسلام کی جمہوریت ومساوات کے سیلاب
میں بہہ تو گئے تھے لیکن باوجود اس کے اُن کا تمدن اپنی ٹھوس
بنیادوں پر قایم تھا کہ آخر کار خود عربوں کو ایرانی رنگ ڈھنگ
اختیار کرنا پڑا .... لیکن فارسی کی یہ فتح حقیقت میں نگاہوں
کے لئے کسی اور قدیم ترین زبان وتمدن کی فتح ہے۔ وہ زبان و
تمدن کون سا تھا؟ اس کا جواب تاریخ ادبیات سنسکرت سے مل سکتا ہے
سنسکرت زبان کے محققین معترف ہیں کہ جس منبع سے فارسی، پہلوی
اور ژند نکلی ہیں وہی سنسکرت کا بھی سرچشمہ ہے حقیقت
سے بُعد ہونے کی وجہ سے ہم تنگ نظر بن جائیں تو یہ
دوسری بات ہے ورنہ یہ کہے بغیر چارہ نہیں کہ سنسکرت
کی بہترین اور ترقی یافتہ صورت فارسی ہے۔ اس لئے کہ جتنے
ماہرین لسانیات ہیں سب قائل ہیں کہ زندہ زبانیں ہمیشہ
ترقی کرتی رہتی ہیں اور ترقی کے سفر کے دوران میں اپنے
تیز اور بھدے کناروں کو گھس گھسا کر اتنا درست کر لیتی
ہیں کہ وہ انسان کی فطری لطافتِ گفتگو کا نمونہ بن جاتے ہیں"۔

آگے چل کر انہوں نے ہندوستانی زبان کے مختلف رنگوں پر
ایک سیر حاصل بحث کی ہے اور بنیادی ہندوستانی کے لئے موزوں
ترین زبان اُس بولی کو ثابت کیا ہے جو شمالی ہندوستان کے شہروں
میں بولی جاتی ہے اور جسے کانگرس نے تسلیم کرکے یہ حق دیا ہے کہ وہ
بین الصوبجاتی زبان تسلیم کی جائے کہ اسی میں ہندوستان کی دو بڑی
قوموں کا تمدن اور معاشرت پوری شان سے جلوہ گر ہے۔ لکھتے ہیں:

"ہندوستان کی مختلف ہندیوں اور فارسی اور سنسکرت
نے مل کر ہندوستانی زبان کی گرامر اور لغت کو تعمیر کیا ہے۔
اس تعمیر میں سینکڑوں سال صرف ہوئے ہیں اور رفتہ رفتہ
ہندوستان کی مختلف بولیوں نے ایک ایسی عالی شان
زبان بنائی ہے جس میں ہندی زبانوں کی فطری سادگی اور
لوچ، فارسی کی روانی وسلاست، عربی کا ایجاز وشکوہ
اور سنسکرت کا ذخیرۂ الفاظ اور طرزِ بیان سب کچھ شامل ہے
اور اب تو یورپ کی سائنس بھی ہندوستانی زبان کے
سرمایۂ علم کو بڑھا رہی ہے اور اس بلند عمارت کی مختلف
اینٹوں کو ہندوستان کی مختلف قوموں کا تمدن ایک
دوسرے سے پیوستہ کر رہا ہے۔ خطرہ ہے کہ اگر کسی نے
ایک اینٹ بھی الگ کرنے کی کوشش کی تو ہماری مشترکہ
قومیت ہی تباہ نہ ہو جائے"۔

آخر میں فاضل مقالہ نگار نے بنیادی ہندوستانی کے لوازم پر
ایک نگاہ ڈالی ہے اور تجویز پیش کی ہے کہ بنیادی ہندوستانی کے آٹھ
نو سو الفاظ چُن کر اُن کی تدریجی ریڈریں بنائی جائیں اور بنیادی انگریزی
کے الفاظ کی فہرست سامنے رکھ کر آسان اور روزمرّہ کی ہندوستانی
کے الفاظ سے اُس کا مقابلہ کرکے ضروری الفاظ کا انتخاب کر لیا جائے
پھر ان ہندوستانی لفظوں کی فہرست سے جو بنگالی، اودھی، پنجابی،
گجراتی اور پشتو وغیرہ میں رائج ہیں ان کا مقابلہ کیا جائے اور مشترک الفاظ
کی فہرست بنائی جائے۔

"اس طرح بنیادی انگریزی کے مقابلے میں بنیادی ہندوستانی

کا کام زیادہ آسان اور مستقل بنیادوں پر ہوگا۔ اس لئے کہ نہ
صرف ہندوستان کی مختلف زبانوں میں ہزاروں لفظ مشترک
ہیں بلکہ گرامر کے قواعد بھی ملتے جلتے ہیں اور جو کام بنیادی
انگریزی والے ہزار سال میں کریں گے وہ کام چند مہینوں
کی محنت سے ہمارے سامنے یہ بات ظاہر کر دے گا
کہ ہندوستان میں بنیادی ہندوستانی سینکڑوں سال
سے بن رہی ہے اور اس کا بہت کچھ کام ہو چکا ہے۔"

ہندوستانی (جولائی تا ستمبر)

شاہ سراج کی اردو شاعری

مولوی عبدالقادر صاحب سروری نے کہ اس سے پہلے سراج
کے کلام کا انتخاب "سراج سخن" کے نام سے شائع کر چکے ہیں۔ یہ بلند پایہ
مضمون لکھا ہے۔ اور اس کے ذریعے اردو داں طبقے کو ایک ایسے
سچے شاعر کے کلام سے آشنا کرایا ہے جسے دو صدیوں کے دھندلکے
نے ہماری آنکھوں سے اوجھل کر رکھا ہے۔

شاہ سراج الدین سراج اورنگ آباد دکن کی سرزمین میں
اُس وقت پیدا ہوئے جب "ولی دکنی کے نغمے اس کی فضا میں گونج
رہے تھے"۔ وہ ایک صاحب دل انسان تھے اور شاعر کہلانے سے
پہلے تصوف و سلوک کی بہت سی منزلیں عالمِ ہوش و عالمِ جذب میں طے کر چکے تھے
اور عین اُس وقت جب اُن کی شاعری اوجِ کمال پر تھی۔ انہوں نے اپنے
مرشد کے ایما پر اسے ترک کر دیا لیکن اس اثنا میں انہوں نے جو کچھ کہا،
وہ سوز و گداز، لطفِ بیان اور اثر آفرینی کے لحاظ سے بہت بلند ہے اور
اس میں غزل۔ مثنوی اور دیگر اصنافِ سخن کی کوئی قید نہیں۔
سروری صاحب لکھتے ہیں:۔

"اُن کے کلیات کے پڑھنے سے واضح ہوتا ہے کہ ان کی شاعری
حسن خیال اور لطفِ گفتار کا ایک ایسا دلنواز مجموعہ ہے جس کا
مطالعہ ہر زمانے میں شوق سے کیا جائے گا۔ سراج اردو
کے اُن شعراء میں سے ہیں جو دماغ سے نہیں بلکہ دل سے
شاعری کرتے تھے ...... طبعاً وہ بہت عزلت پسند
واقع ہوئے تھے۔ پھر اُن کے روحانی میلانات نے انہیں
نہ صرف اس عالم، بلکہ اس کے سارے کمالات کے متعلق
بہت زیادہ رجائی نہیں رہنے دیا تھا۔ یہ ایسے اسباب تھے
جن کی وجہ سے وہ بحیثیت شاعر کے اپنی پوری وسعت کو
نہ پہنچ سکے۔ ولی ایک بحرِ ذخار تھے، ایک سیلاب رواں تھے
جس کے بہاؤ کی زد میں ہر چیز آ جاتی ہے۔ ان کے مقابلے
میں سراج کی طبیعت ایک معین رفتار ندی کی سی تھی، جو
خاموش سُروں میں اپنا نغمہ سناتی ہوئی گذرتی ہے اور جس زمین
پر پہنچتی ہے، اُسے گلزار بنا دیتی ہے۔ ولی کی ہمہ گیر اور مغلوب کن
ذکاوت کے مقابلے میں اُن کی شاعری کی ایک سرایت کرنے
والی خصوصیت جسے وہ خود "سوز" سے تعبیر کرتے ہیں، بے حد
نمایاں ہے۔ ان دونوں کی شاعری کے مقابلے کے لئے اگر
ہم کو مشہور الفاظ مستعار لینے کی اجازت ہو تو ہم کہیں گے کہ
ولی کی شاعری "واہ" اور سراج کی شاعری "آہ" ہے"۔

سراج کی شاعری کے کسی قدر تفصیلی جائزے کے بعد صاحبِ
مضمون نے بعض اساتذہ کے کلام میں سے چند مثالیں ایسی بھی دی
ہیں جن کا خیال بلکہ جن کی صورت تک سراج کے ہاں پہلے سے موجود
ہے۔ سراج اردو کے پہلے دَور کے شاعروں میں سے تھا۔ اس لئے اس
کے ہاں جذبات کی فطری سادگی اور بیان کی سلاست بدرجۂ غایت پائی
جاتی ہے۔ بعد میں آنے والے شعراء نے قدما کے گلشن معانی سے اکثر
خوشہ چینی کی ہے۔ ہاں مضامین کی نوک پلک سنوارنے میں ندرت اور
جدت ضرور دکھائی ہے کہ یہ ترقی زبان اور توسیع بیان کا لازمی نتیجہ تھا،
مثالیں ملاحظہ کیجئے:۔

میر:۔ ظلم و ستم سے خون کیا پھر دبا دیا
برباد کیا گئی ہیں میری جانفشانیاں
مارا مجھے بھی سان کے غیروں میں اُن نے میر
کیا خاک میں ملائیں مری جانفشانیاں
سراج:۔ دامن تلک بھی ہائے مجھے دسترس نہیں
کیا خاک میں ملی ہیں مری جانفشانیاں
میر:۔ فیض اے ابر، چشم تر سے اُٹھا
آج دامن وسیع ہے اُس کا
سراج:۔ گوہرِ اشک سب سمائے ہیں۔
آج دامن وسیع میرا ہے۔

میر:- چمن میں گُل نے جو کل دعوئے جمال کیا
جمال یار نے منہ اُس کا خوب لال کیا

سودا:- برابری کا تری گُل نے جب خیال کیا
صبا نے مار تھپیڑے منہ اس کا لال کیا

سراج:- جس پھول نے ترے سیں کیا دعوئے جمال
وہ پائمالِ آفتِ بادِ خزاں ہوا

میر:- مجھ دِوانے کی مت ہلا زنجیر
کہیں ایسا نہ ہو کہ پھر غل ہو

سراج:- دیوانے کو مت شورِ جنوں یاد دلاؤ
ہرگز نہ سناؤ اُسے زنجیر کی آواز

میر:- ہم فقیروں سے بے ادائی کیا آن بیٹھے جو تم نے پیار کیا

سراج:- ہم فقیروں پر ستم ہائے رہو خوب کرتے ہو جو کرتے ہو تم

غالب:- نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانئے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

سراج:- مینائے تن میں بُوجھ غنیمت مئے حیات
جیوں دورِ جام، دورِ فلک بے درنگ ہے

غالب:- میں گیا بھی واں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں، صرفِ درباں ہوگئیں

سراج:- عوض نقدِ دعا کے مفت ہے دشنام اُس لب میں
ارے دل، عشق کے سودے میں پھر تکرار مت کیجو

سراج اور شعرا کی بہ نسبت میر سے بہت قریب تھا۔ لیکن بقول صاحبِ مضمون "میر کا مابہ الامتیاز 'یاس' ہے۔ وہ اس مضمون کے بادشاہ ہیں۔ اس کے مقابلے میں سراج کے پاس ایک احساسِ قناعت، تسلیم و رضا، سپردگی، بلکہ درد میں بھی لذت کی چاشنی موجود ہے۔"

دونوں کے اندازِ نظر کا یہ لطیف فرق مندرجہ ذیل اشعار کے مقابلے سے کسی قدر واضح ہو جائے گا:-

سراج:- اپنی قسمت کے غم و رنج نہیں شاکر ہوں سراج
جو منجم نے ازل کے مری تقویم کیا

میر:- یاں کے سفید و سیاہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے
رات کو رو رو صبح کیا، یا دن کو جوں توں شام کیا

سراج کے ہاں درد و سوز کے مضامین کی کثرت ہے کہ یہ ان کی اُفتادِ طبیعت کا اقتضا تھا۔ اس کیفیت کے چند اشعار سنئے اور دیکھئے کہ اسلوبِ بیان میں کیسی ندرت ہے۔ افسوس کہ آج کل یہ سادہ اسالیب بہت کم یاب ہیں:-

اے جانِ سراج ایک غزل درد کی سن جا
مجموعۂ احوال ہے دیوان ہمارا

زنجیر بھلی، قید بھلی، موت بھی جیوں توں
دیوانے پنچھ حق نہ کرے کس کوں گرفتار کسی کا

تڑپناں تلملاناں، غم میں جلناں، خاک ہوجاناں
یہی ہے افتخار اپناں، یہی ہے اعتبار اپناں

دوانے دل کوں سمجھاتا ہوں لیکن
کہاں لگ ہو کوئی حائل کسی کا [illegible]

جل گیا شوق کے شعلوں میں سراج
اپنی دانست میں بے جا نہ کیا

خونِ دل آنسوؤں میں صرف ہوا
گر گئی یہ بھری گلابی سب

آخری شعر میں درد کی تصویر استعارے کے رنگوں میں کھینچی ہے مگر ایسی خوبی سے کھینچی ہے کہ استعارہ تصویر کا سماں باندھ دیتا ہے۔

"دل کا استعارہ گلابی سے شاید انوکھا نہ ہو لیکن خونِ دل کے آنسوؤں کی شکل میں ضائع ہو جانے کو بھری گلابی کے گر جانے سے تعبیر کرنا، جو لطف رکھتا ہے وہ صاحبانِ ذوق سے پوشیدہ نہیں۔"

سراج کے کلام میں جو اثر آفرینی ہے اس کا زیادہ تر سبب یہ ہے کہ وہ خود اپنے پہلو میں ایک درد آشنا دل رکھتے تھے اور اکثر اہلِ حال کی طرح عشقِ مجازی کے زینے سے منزلِ حقیقت تک پہنچے تھے اور اُن کا عقیدہ تھا کہ دنیا کا یہ میلا اور اس کی رنگینیں ایسی چیزیں نہیں ہیں کہ ان کی طرف سے آنکھیں بند کر لی جائیں:-

فرماتے ہیں:-

گر حقیقت کی سیر ہے خواہش
راہِ عشقِ مجاز لازم ہے

~~~

سراج یہ مجھے اُستادِ مہرباں ۔ کہا
کہ علمِ عشق سے بہتر نہیں ہے کوئی علوم

~~~

ہرگز نہیں ہے اُس کوں حقیقت کی عاشقی
جس نے مزا چکھا نہیں عشقِ مجاز کا

~~~

روشن ہے سبب عشق ۔ کیفیتِ عالم
آئینہ دل ساغرِ جمشید ہوا ہے

~~~

سراج کی اچھوتی استعارہ بندی کا نمونہ آپ نے دیکھا تھا۔ اب ایک نادر تلمیح بھی دیکھئے:-

مشتاق ہوں تجھ لب کی فصاحت کا ولیکن
رانجھا کے نصیبوں میں نہیں ہیر کی آواز

یہاں دو باتیں توجہ طلب ہیں اول ہمارے ہاں اب ایسی زندہ تلمیحات کا رواج جو ہمارے اپنے دیس کی ہوں بہت کم ہو گیا ہے۔ متاخرین نے جہاں فرہاد شیریں اور لیلےٰ مجنوں کی تلمیحوں سے اپنے اشعار کی زینت بڑھائی وہاں انہوں نے ہندوستان جیسی حسن پرور اور عشق خیز سرزمین کی روایات سے بہت کم فیض حاصل کیا۔ متقدمین میں یہ بات نہیں تھی وہ بے تکلف اپنے جذبات کی آئینہ داری کے لئے اپنے دیس کی تلمیحوں، استعارہ و تشبیہات سے استفادہ کرتے تھے۔ ایک نادر تشبیہہ ملاحظہ کیجئے:-

رخسارِ یار حلقہ کاکل میں یوں ہے یا سورج اماوس کی رات میں

دوسری توجہ طلب بات یہ ہے کہ آج سے دو صدیاں پہلے بھی پنجاب کے مشہور رومان ہیر رانجھا کی صدا اس دیس سے ڈیڑھ ہزار کوس کا سفر کر کے جنوبی ہند کی فضاؤں میں بس گئی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سفر کے وسائل بڑے دشوار تھے۔ لیکن ہمتیں شاید بہت بلند تھیں۔ اولوالعزم لوگ جہاں جاتے اپنی دیس، ولسو ... کر گئے کہانیاں، ضرب الامثال اور زبان و تمدن کے دوسرے لوازم اپنے ساتھ لے جاتے۔ اور یہی وجہ ہے کہ ہماری اردو زبان گنگا جمنا کی وادیوں میں پیدا ہوئی تو زیادہ تر دکن کی سانولی سلونی سرزمین میں پروان چڑھی اور پھر سارے ہندوستان پر چھا گئی۔ خیر! کہاں کی بات کہاں پہنچی! اب چلتے چلتے سراج کا ایک مستزاد سن جائیے کہ بقول سروری اس میں جو لطفِ نغمہ موجود ہے۔ امید ہے کہ ایک دفعہ پڑھنے کے بعد عرصے تک کانوں میں گونجتا رہے گا۔

ہر صبح فلک پر ملکِ عالمِ بالا۔ قدر دیکھ سجن کا
تسبیح کریں سبحنہ اللہ تعالےٰ من کا لئے منکا
تجھ چہرۂ زرتار کے تاروں کی جھلک دیکھ آنکھوں کو نہیں تاب
شاید کہ سدا رہے عالم میں اجالا سورج کی کرن کا
اے سرو یہی داغ جدائی کی خبر لے رکھ عزمِ تماشا
پھولا ہے عجائب یہ ہزارا، گل لالہ جھولی کے چمن کا
دیدار کی سمرن سے مجھ آنکھوں کو سراج آج پھر کیوں نہ پھراویں
پلکوں کی سرانگلی ستی ہے ہات میں مالا آنسو کے رتن کا

صلاح الدین احمد

نقد و نظر

عہدِ حاضر کے بڑے لوگ

حصہ اوّل (ہندوستان)

از محمد مرزا دہلوی کتابی سائز کے ایک سو اٹھائیس صفحے قیمت آٹھ آنے

اس کتاب میں ہندوستان کے چار بڑے آدمیوں کے سوانح حیات اور ان کے کارناموں کا مختصر جامع اور دلچسپ جائزہ لیا گیا ہے۔ بڑے آدمیوں کی زندگی بچوں سے لے کر بوڑھوں تک کے لئے دلچسپی اور سبق آموزی کا باعث ہوتی ہے۔ ہندوستان کے وہ بڑے آدمی جنہوں نے ہمارے ملک کی تحریکِ آزادی میں حصہ لیا ہے۔ ہمارے لئے ایسی قابلِ قدر ہستیاں ہیں، جن کے ایثار و قربانی اور خدمتِ خلق کے جذبے کا احسان ہمیشہ کے لئے ہماری گردنوں پر رہے گا۔ اس لئے ضروری ہے کہ ہم اُن کی زندگی کے ہر پہلو سے واقف رہیں۔ اس کتاب میں جن لوگوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اُن کے نام یہ ہیں:-

۱۔ مہاتما موہن داس کرم چند گاندھی، ۲۔ رئیس الاحرار مولانا محمد علی ۳۔ دیش بندھو چترنجن داس، ۴۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح۔

مؤلف کے الفاظ میں اس کتاب کے مقصد کو یوں واضح کیا جا سکتا ہے

"اس صدی کے نامور سیاسی رہنماؤں کی ان خصوصیات اور ان کارناموں کو روشنی میں لایا جائے جن سے عہدِ حاضر کی جدید ہنگامہ خیز بین الاقوامی سیاست عبارت ہے"۔

یہ کتاب اس سلسلے کا پہلا حصّہ ہے۔ امید ہے کہ جناب محمد مرزا دہلوی جلد ہی اس کے باقی حصّے بھی شائع کریں گے جن میں سے دوسرے حصّے میں ایشیا، تیسرے میں یورپ اور چوتھے میں امریکہ کے "بڑے لوگوں" کے حالات، ان کی سیاسی تعلیمات اور اُن کے قومی کارناموں کی تفصیلات درج ہوں گی۔

ہمیں امید ہے کہ ہندوستانیوں کی سیاسی بیداری اور بین الاقوامی شعور کو مزید تحریک دینے میں جناب محمد مرزا دہلوی کی یہ کوشش پوری طرح بار آور ہوگی کیونکہ اس میں دوسری خوبیوں کے ساتھ غیر جانبداری کی ناو[illegible] بھی موجود ہے۔

ملنے کا پتہ:- ادارۂ ادبیہ دریا گنج

مدراس میں اردو

ملنے کا پتہ۔ مکتبۂ ابراہیمیہ حیدر آباد

دو سو صفحات قیمت ایک روپیہ۔

جناب نصیر الدین ہاشمی [illegible] ہوا ایک کتاب "دکن میں اردو" تالیف کی تھی۔ اس کتاب [illegible] تحریک پا کر جناب محمود شیرانی نے "پنجاب میں اردو" اور جناب نوا[illegible] حسین خیال مرحوم نے "مغل اور اردو" لکھی۔ گویا سید محی الدین قادری [illegible] جیسے نقاد کے الفاظ میں جناب ہاشمی کی کتاب "دکن میں اردو" ایک [illegible] آفریں کتاب ثابت ہوئی۔ "مدراس میں اردو" اسی کتاب کا ایک [illegible] جس میں بہت سے اضافے کے بعد اسے علیحدہ شائع کیا گیا [illegible] کی دلکشی اور قبول عام کا جال ہندوستان کے کونے کونے میں پھیلا ہوا [illegible] اسی بات کو ثابت کرنے میں جناب ہاشمی کی یہ کتاب ایک اہم [illegible] قدر کوشش ہے۔ جناب مؤلف "عرضِ حال" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں کہ "صوبۂ مدراس میں اس وقت تلنگی، کنڑی، تامل [illegible] بانیں بولی جاتی ہیں، مگر ان میں سے کسی ایک کو بھی پورے صو[illegible] ن قرار نہیں دیا جا سکتا۔ اگر کوئی زبان پورے صوبۂ مدراس [illegible] آتی ہے تو وہ صرف "ہندوستانی" ہے۔ اس کتاب کے مطا[illegible] معلوم ہو سکتا ہے کہ علاقۂ مدراس میں ہندوستانی زبان [illegible] طرح زمانۂ دراز سے بولی جاتی رہی ہے اور کس طرح بیسیوں [illegible] اور نثار خاکِ مدراس سے پیدا ہوئے ہیں جن کے کارنا[illegible] قدر کے مستحق ہیں"۔

ہمارے خیال میں [illegible] عین اس وقت شائع ہوئی ہے جب کہ اس کی از حد ضرورت [illegible] وقت اردو کے مخالفین جس خود بیں اور غیر مدلل طریق پر ہندوستانی [illegible] سوں میں ایک نامقبول زبان کو زبردستی